بھول بھلیاں تیری گلیاں
فائزہ افتخار

پروین بیگم کا جی آج صبح سے کہیں نہ لگ رہا تھا۔
بلکہ یہ کیفیت تو کل رات سے تھی۔
اور کوئی کام وہ اتنا دل جمعی سے نہیں کرتی تھیں جتنا دل لگا کے سویا کرتیں۔
ایسی گہری اور طویل نیند ہوا کرتی ان کی کہ لوگ رشک کیا کرتے، بلکہ وہ بے چارے، جو نیند کی کمی کا شکار تھے، وہ تو باقاعدہ حسد کرنے پہ مجبور ہو جاتے۔ ان کی گہری اور میٹھی نیند کو ان کے بچے بھی متاثر نہ کر سکے۔ اب تو چھوٹا والا حسان بھی تین سال کا ہو چلا تھا ورنہ بچے جب چھوٹے تھے تب رات کو کئی کئی بار جاگتے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کے روتے رہتے۔ اوپر کے پورشن میں رہنے والے ان کے جیٹھ کے سارے بچے بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے مگر ان کے پہلو میں بے سدھ لیٹی ان کی ماں پروین بیگم تب تک نہ اٹھتیں جب تک ان کے شوہر سراج دین انہیں جھنجھوڑنے پہ مجبور نہ ہو جاتے۔
لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی کہ رات وہ معمول کے مطابق بستر پر لیٹیں تو ہمیشہ کی طرح تکیے پر سر رکھتے ہی دنیا سے بے خبر ہونے کے بجائے دیر تک کروٹیں بدلتی رہیں۔
رات چونکہ آنکھ دیر سے لگی تھی، اس لیے صبح بیدار ہونے پہ عجیب سی کسلمندی اور جھنجلاہٹ کا غلبہ تھا۔ وہ باورچی خانے کی ملکہ کہلائی جاتی تھیں۔ دن میں تینوں وقت کا کھانا بڑے اہتمام اور ذوق و شوق سے بناتیں لیکن آج ناشتہ تیار کرتے ہوئے نہ وہ ذوق و شوق نظر آ رہا تھا نہ جوش و خروش۔ جیسے تیسے احسن کو ناشتہ کرایا۔ لنچ باکس بھرنے کے بجائے ایک نوٹ پکڑا دیا حالانکہ وہ اس کے کینٹین سے کھانے پینے کو خود بھی پسند نہیں کرتی تھیں اور ان کے شوہر بھی اس کے خلاف تھے۔
حسان کو دلیہ کھلانے کے بجائے فیڈر منہ سے لگا دیا۔ ان کی ساس شوکت جہاں ناشتے میں ابلا ہوا انڈا لینے کی عادی تھیں لیکن آج انہیں یہ آسان ترین ناشتہ بنانا بھی دوبھر لگ رہا تھا۔ کچی سی زردی والا ہلتا جلتا انڈا۔ جس پہ سے چھلکا بھی صفائی سے نہ اترا تھا، لا کے شوکت جہاں کے سامنے رکھا تو وہ چشمے کے پرے اپنی آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھنے لگیں، پھر اس پیالی کو پرے سرکا کے خالی چائے کا کپ ہی لبوں سے لگا لیا۔ ایک تو صبح صبح بحث و تکرار کرنے کا موڈ نہیں تھا، دوسرا اس وجہ سے بھی پروین بیگم کو رعایت مل گئی کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا ورنہ وہ اپنا کام ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے انجام دینے کی عادی تھیں اور یہ تو صرف ایک ابلا انڈا تھا۔

"ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔۔۔ شاید طبیعت ٹھیک نہ ہو۔" انہوں نے نظرانداز کرنا چاہا مگر کر نہ سکیں۔ احسن کو اسکول بھیجنے کے بعد پروین بیگم کا معمول تھا دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنا' کیونکہ سراج دین دس بجے کے قریب فیکٹری کے لیے نکلتے تو دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر جاتے۔ جوانی میں ہی السر کا مرض لگ چکا تھا جسے پرہیز کے باعث قابو میں کر رکھا تھا۔ پروین بیگم بڑی احتیاط اور اہتمام کے ساتھ ان کے لیے کم تیل میں ٹھنڈی تاثیر کی سبزیاں اور مرغی کا گوشت کم نمک مرچ کے ساتھ پکایا کرتیں' کیونکہ گائے یا بکرے کا گوشت بھی انہیں منع تھا اور گرم مسالاجات بھی۔

لیکن شوکت جہاں نے بڑے اچنبھے کے ساتھ دیکھا وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں برآمدے میں رکھی ڈائننگ ٹیبل کی چیئر پر بیٹھی۔ وہ کسی الجھن کا شکار نظر آرہی تھیں۔ فجر کی نماز کے بعد وہ لمبے وظائف پڑھنے اور دیر تک تلاوت کرنے کی عادی تھیں اس لیے بہو سے اس کی الجھن بعد میں دریافت کرنے کا سوچتے ہوئے دوبارہ عبادت میں مگن ہو گئیں۔

"کیوں؟ کھانا کیوں نہیں تیار ہوا؟"

سراج دین کی تیز آواز پہ وہ چونکیں اور گھڑی کی جانب نظر اٹھا کر دیکھا۔ پونے دس بج رہے تھے۔

"ایک دن بازار کا کھا لیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔" یہ دوسری جھنجلائی ہوئی آواز ان کی بہو پروین کی تھی۔

شوکت جہاں تخت سے اتریں اور اپنے سلیپر پہنتے ہوئے باہر نکلیں۔

"فرق تو پڑے گا۔ ہاں مگر تمہاری صحت یہ نہیں' اس لیے تمہیں کوئی پروا نہیں ہے۔" ان کا چھوٹا بیٹا سراج دین جو بچپن سے غصّے کا تیز اور تنک مزاج تھا' بیوی پہ برس رہا تھا۔

"کیوں شور مچا رکھا ہے صبح صبح؟" انہوں نے ناگواری سے ٹوکا۔

"اماں! دیکھیں' اس نے آج پھر کھانا وقت پہ تیار نہیں کیا۔"

"پھر۔۔۔ پھر سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" پروین بیگم کے آگ ہی تو لگ گئی اس الزام پہ۔ "بات تو یوں کر رہے ہیں جیسا یہ میرا روز کا معمول ہو۔ کبھی مہینوں بعد ایسا اتفاق ہوتا ہو گا' وہ بھی کسی نہ کسی وجہ سے اور آج تو عرصے بعد ایسا ہوا ہے ورنہ سردی ہو یا گرمی' طبیعت خراب ہو یا ٹھیک' میں نے کبھی اس معمول میں سستی نہیں دکھائی۔"

"دکھانا بھی نہیں چاہیے۔ سارا دن گدھوں کی طرح کام کرتا ہوں۔ کیا یہ میرا حق نہیں کہ مجھے کھانا تو میری مرضی کا ملنا چاہیے اور یہ کبھی کوئی میرا نخرہ نہیں ہے بلکہ مجبوری ہے۔ بازار کا کھانا کھا کر میری طبیعت بگڑ جاتی ہے۔"

"جانتی ہے وہ' اسی لیے خاص پرہیزی کھانا تمہارے لیے الگ بنتا ہے۔" شوکت جہاں نے پھر مداخلت کی۔

"کوئی احسان نہیں کرتی۔ فرض ہے یہ اس کا۔ میں بھی اس بیماری کے ساتھ سارا دن محنت مشقت کرتا ہوں۔ کس کے لیے؟۔۔۔ بیوی اور بچوں کے لیے ہی نا!"

"تم بھی کوئی احسان نہیں کرتے۔ یہ فرض ہے تمہارا۔"

"اماں! ایک تو آپ۔۔۔" سراج دین زچ ہو گئے۔ "میں اپنی بیوی سے بات کر رہا ہوں۔ آپ آرام کیجیے جا کر۔" اس بار وہ بڑے مہذب لہجے میں بدتمیزی کرتے ہوئے بولے۔

شوکت جہاں کو غصہ آگیا۔ "پہلی بات تو یہ کہ تم اپنی بیوی سے بات نہیں کر رہے تھے بلکہ اس پہ چلّا رہے تھے' دوسری بات یہ کہ یہ بیوی تم کہیں سے بھگا کے یا اٹھا کے نہیں لائے تھے' میں بیاہ کے لائی تھی اسے تمہارے لیے' یہ میری ذمہ داری ہے کہ کہیں اسے غلط دیکھوں گی تو ٹوکوں گی بھی۔۔۔ اور کہیں اس کے ساتھ غلط ہوتا دیکھوں گی تو روکوں گی بھی۔۔۔ اور تیسری بات یہ کہ تم کون ہوتے ہو مجھے آرام کا مشورہ دینے والے۔ کیا تم مجھے میرے کمرے تک محدود کر کے اس گھر سے لاتعلق قرار دینا چاہتے ہو؟"

"ہمیشہ۔۔۔" سراج دین نے ہتھیلی پہ مکا مارتے ہوئے کہا۔ "ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ جب میں کوئی بات کرنا چاہوں آپ اسی طرح دخل دیتی ہیں' بات کا رخ اپنی جانب موڑ کے اسے ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب انسان اپنے گھر میں' اپنی ہی بیوی سے کوئی بات تک نہیں کر سکتا۔"

وہ تلملاتے ہوئے اپنی گھڑی اور دوسرے لازمی چیزیں اٹھائے ان کے پاس آئے۔ اسی ناراض ناراض سے انداز میں سر ماں کے سامنے جھکایا۔

"چلیں' ماریے پھونک۔۔۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔"

"جیتے رہو۔" شوکت جہاں' جو گھڑی کلائی سے باندھنے' پرس جیب میں ڈالنے اور چشمہ آنکھوں پہ لگانے کے دوران ہی آیات قرآنی کا ورد زیرِ لب کرنے لگی تھیں' اپنی مسکراہٹ دبا کے بیٹے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پھونک مارنے لگیں۔

"ہاں' اب بتاؤ' کیا بات ہے؟" بیٹے کے جانے کے بعد وہ پروین بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

"کچھ نہیں اماں جی! کچھ بھی نہیں۔" ان کے لہجے میں وہی کسلمندی جھلک رہی تھی' جو صبح سے ان کی ہر ہر حرکت سے واضح تھی۔

"جب تم جانتی ہو کہ بازاری کھانے اسے موافق نہیں تو کیوں غفلت برتی ہو؟ کیوں نہیں کھانا تیار کیا؟ ایک بندے کا پرہیزی سادہ کھانا تیار ہونے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔"

"یہ بات نہیں اماں جی۔ بس وقت تو تھا۔ بس۔۔۔"

"وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ کیا وجہ تھی؟"

"آپ بھی عجیب ہیں اماں جی!" پروین بیگم کچھ سوچ کے مسکرا دیں۔ "میاں صاحب مجھ سے سوال جواب کریں تو آپ ڈھال بن جاتی ہیں' لیکن بعد میں خود آڑے ہاتھوں لینا نہیں بھولتیں۔" واضح طور پہ انہوں نے اپنی ساس کا سوال ٹالتے ہوئے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"تم سے بازپرس کرنا میرا حق ہے۔ اپنے ہاتھوں بیاہ کر لائی ہوں۔ ہاں مگر مردوں کا اپنی بیویوں پہ اونچی آواز میں چلّانا بھی مجھے پسند نہیں۔ ٹھیک ہے' کبھی کوئی شکایت بھی ہوتی ہے' غصہ بھی آجاتا ہے۔۔۔ لیکن ایسے معاملات اپنے کمرے کے بند دروازے کے پیچھے نمٹا لیتا ہی عقلمند میاں بیوی کا شیوہ ہے۔ یوں اونچی آوازوں کے ساتھ گھر بھر میں اپنے جھگڑے کا چرچا کرنا جہالت کی نشانی ہے اور میں اس کی نوبت نہیں آنے دینا چاہتی۔ اور پھر یہ بھی ہے پروین بیگم! کہ سراج تو غصّے کا تیز ہے ہی' تم میں بھی برداشت بس ایک حد تک ہی ہے۔ قسم کھا کے بتاؤ' اگر میں یوں درمیان میں آکے بات ختم نہ کرایا کروں تو تم اور کتنی دیر چپ رہ سکتی ہو؟"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگیں۔

"عورت کی زبان کھل جائے تو مرد کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔ تمہاری زبان نہ کھل جائے اس لیے مجھے تمہاری حمایت میں اپنی زبان کھولنا پڑتی ہے۔ تمہارے اندر جو لاوا اُبل رہا ہوتا ہے' وہ میری ہمدردی پا کے خود بخود دھیما ہو جاتا ہے۔ ہاں مگر میں بری بن جاتی ہوں بیٹے کی نظروں میں۔"

"اس کا مطلب ہے اماں جی! کہ آپ صرف بات ختم کرنے کی نیت سے میری طرف داری کرتی ہیں' سچ میں میری ہمدرد نہیں ہیں آپ؟" پروین بیگم نے گلہ کیا۔

شوکت جہاں مسکرا دیں۔ "میں اس بات سے انکار نہیں کروں گی کہ ایسا میں صرف بات ختم کرنے کی نیت سے ہی کرتی ہوں۔ سراج جیسا بھی ہے' ماں کا اتنا لحاظ تو کرتا ہے۔ میری مداخلت بری لگے تب بھی غصے میں آکر اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے' میرے منہ نہیں لگتا لیکن اگر بات ختم کرنے کے لیے میں تمہارے بجائے اس کی طرف داری کروں گی تو یہ بات اتنی آگے نکلے گی کہ سنبھالے نہیں سنبھلے گی۔ پھر یہ میاں بیوی کے عام سے جھگڑے سے بڑھ کر ساس بہو کی روایتی چپقلش میں بدل جائے گی۔"

"نہیں اماں جی! ایسا نہیں ہو سکتا۔" پروین بیگم نے پورے وثوق سے کہا۔ "ایسا کبھی بھی نہیں ہو گا۔ آپ کو اتنے سالوں بعد تو اندازہ ہو جانا چاہیے۔ آخر ہمارا سات سالوں کا ساتھ ہے۔"

"تم میرے ساتھ اچھی ہو کیونکہ میں تمہارے ساتھ اچھی ہوں۔" شوکت جہاں نے سچائی کے ساتھ حقیقت بیان کی۔ "جس دن میں تمہاری غلطیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کے سراج کے ہاتھ میں تھمانے لگوں گی اور اس کے غصے کو ہوا دینے لگوں گی تب دیکھیں گے تمہارا دعوا کہاں تک سچا ہے۔" شوکت جہاں اس بحث میں سچ مچ بھول گئیں کہ انہیں پروین بیگم سے کیا پوچھنا تھا۔

اسی لیے تو ان کی اپنی اس بہو سے زیادہ بنتی تھی کہ دونوں کے مزاج میل کھاتے تھے۔ گھنٹوں بات سے بات نکال کر گفتگو کرتے نہیں تھکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے پانچ سال پہلے دونوں بیٹوں کی گھرداری الگ کرنے کے بعد اپنی اس بہو کے ساتھ رہنا پسند کیا تھا ورنہ بڑی والی بھی بری نہ تھی۔ بلکہ کئی لحاظ سے پروین سے بہتر ہی تھی۔

زیادہ تعلیم یافتہ۔ زیادہ بہتر فیملی بیک گراؤنڈ رکھنے والی۔ عزت تو وہ بھی اس کی بے حد کرتی تھیں لیکن شوکت جہاں کو اس کا لیے دیے رہنے والا مزاج اور خصوصاً اس کی کم گوئی نہیں بھاتی تھی۔ انہیں چاہیے تھا کوئی ایسا جو ان کی ہر ضروری اور غیر ضروری بات توجہ سے سنے اور ان کی بڑی بہو' معراج دین کی بیوی رخشندہ کو ایسے میں اچانک کوئی نہ کوئی کام یاد آجاتا۔

جبکہ انہیں سننے والے کے ساتھ ساتھ بولنے والا بھی چاہیے تھا' جس کے ساتھ لمبی لمبی بحثیں کرنے کا مزہ بھی آئے اور رخشندہ عادی تھیں نپی تلی گفتگو کی۔

شوکت جہاں خاصی مجلسی خاتون تھیں' خاندان کی دور پرے کی عزیز خواتین سے بھی روابط تھے' اور محلے میں تو اچھے تعلقات تھے ہی۔۔۔ کوئی نہ کوئی دن بھر میں ملنے آیا رہتا۔ کبھی کبھی تو باقاعدہ محفل سی جایا کرتی اور رخشندہ کو میل ملاپ محض خوشی غمی کے مواقع کی حد تک ہی گوارا تھا اور تو اور اپنے میکے سے بھی اس کے تعلقات رسمی اور سرسری سے تھے۔ شوکت جہاں کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا عالم تو یہ تھا کہ بہوؤں کے میکے والوں کی آمد پہ بھی کھل جاتی۔ یہی عادت کچھ کچھ پروین بیگم میں بھی تھی۔ انہیں بھی گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت اچھی لگتی تھی۔ وہ ساس کے معمولات سے اکتاتی نہیں تھیں۔

اور ایک وجہ اور بھی تھی۔

اور وہ وجہ تھی۔۔۔ وصی۔

ان کا ساڑھے تین سال کا نواسا' وصی۔

حالانکہ پانچ سال پہلے جب انہوں نے بڑے کے بجائے چھوٹے والے بیٹے کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا تب اس وجہ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اپنی اکلوتی بیٹی زہرہ کی شادی کرنے کے فوراً بعد ہی انہوں نے دونوں بیٹوں۔۔۔ کے پورشنز الگ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شادی کے دو سال بعد زہرہ ایک حادثے میں چھ ماہ کے وصی کو چھوڑ کے دارِ فانی سے کوچ کر گئی تھی۔ اس کے جانے کی نہ تو عمر تھی نہ وقت۔ کتنا ہی عرصہ شوکت جہاں کو سنبھلنے میں لگا۔ ننھا وصی کبھی ددھیال تو کبھی ننھیال میں وقت گزارتا۔ ان کا داماد اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بوڑھے دادا' دادی اکیلے اس چھ ماہ کے بچے کو پالنے کے قابل ہوتے تو جی جان سے پالتے مگر دادا فالج کے مریض تو دادی جوڑوں کے درد کی سو دو دن سے زیادہ نہ رکھ پائے۔

دوسری جانب شوکت جہاں بھی بیٹی کی جوان مرگی سے نڈھال تھیں۔ پروین بیگم خود پورے دنوں سے تھیں۔ رخشندہ کے ماتھے کے بل کسی سے چھپے نہ رہ سکے۔ انہیں اس معصوم بچے کا وجود اس گھر میں کھٹک رہا تھا اور اسے سنبھالنا دوبھر لگ رہا تھا۔ ان کے اپنے اوپر تلے کے چار بچے تھے ایسے میں ایک چھ ماہ کے بچے کی اضافی ذمہ داری اٹھانے پہ وہ تیار نہ تھیں۔

کچھ اور ماہ گزرے تو وصی کے باپ نے دوسری شادی کرنے میں دیر نہ لگائی اور اس شادی کے چند دنوں بعد ہی وصی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ننھیال آگیا۔ تب تک پروین بیگم کے ہاں حسان کی پیدائش ہو چکی تھی بلکہ وہ تین ماہ کا ہو رہا تھا۔ انہوں نے وصی کی پرورش کا ذمہ لے لیا اور شوکت جہاں نے ایک بار پھر اپنے دور اندیش فیصلے کی داد دی۔ انہیں انسان کے پرکھنے میں کبھی دھوکا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

پچھلے ڈیڑھ دو سال سے وصی بھی احسن اور حسان کے ساتھ برا بھلا پل ہی رہا تھا۔ یہ کہنا تو غلط ہو گا کہ پروین بیگم نے اپنے بچوں سے بڑھ کے یا اپنی اولاد کے برابر اس کا خیال رکھا مگر ہاں مقدور بھر کوشش ضرور کی اور اس کی وجہ سے ان کی ساس ان کی گرویدہ تھیں یا شاید دل ہی دل میں ممنون اور احسان مند بھی جب ہی اپنے بیٹے کے مقابلے میں وہ ہمیشہ بہو کا ساتھ دیتیں۔ جیسا کہ آج ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"پروین! ذرا میرون رنگ کے دھاگے کی نلکی تو دینا۔"

وہ بڑی بے دلی سے سالن تیار کرنے کے لیے پیاز کاٹ رہی تھیں جب ان کی جیٹھانی رخشندہ نے نیچے آکر پوچھا۔

"میرون۔۔۔" وہ ہاتھ روک کے سوچنے لگیں۔ "ہاں' شاید ہو۔۔۔ دیکھ لیجیے ناں بھابی! مجھے تو آج سامنے رکھی ہوئی چیزیں بھی نظر نہیں آرہیں' خاک ڈھونڈ پاؤں گی میں میرون دھاگے کی نلکی۔ اماں جی کے کمرے میں رکھا ہے ڈبہ' خود ہی ڈھونڈ لیجیے۔"

"کیوں بھئی' ایسا کیوں؟"

"پتہ نہیں' بس یونہی کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ دل بجھا بجھا سا ہے۔ صبح میاں صاحب سے بھی اسی لیے کھٹ پٹ ہو گئی کہ معمول کے مطابق کھانا کیوں نہیں تیار کیا۔ اب آپ ہی بتائیے' انسان ہوں' کبھی کبھار اگر۔۔۔"

وہ پتہ نہیں کب تک بولتی رہتیں مگر رخشندہ جو کم بولنے کے ساتھ ساتھ کم سننے کی بھی عادی تھیں' گھبرا کے یہ کہتے ہوئے نکل گئیں۔

"اچھا' میں خود ہی دیکھ لیتی ہوں۔"

پروین ایک سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔۔۔ بےزاری سے انہوں نے سامنے رکھی سبزی کی ٹوکری اور چولہے پہ دھری دیگچی میں سرخ ہوتی پیاز کو دیکھا۔ دل چاہ رہا تھا' سب چھوڑ چھاڑ بس تکیے میں منہ دے کر لیٹ جائیں۔ چپ چاپ۔۔۔ بالکل اکیلے۔۔۔ مگر یہ گھرداری جان چھوڑے تب ناں۔

"تمہیں دھاگے کی کیا ضرورت آن پڑی! خیر سے درزی سلامت تو ہیں شہر کے؟"

شوکت جہاں نے طنزیہ انداز میں رخشندہ کو دیکھا۔ رخشندہ' پیسہ خرچنے کی شوقین تھیں۔ ان کے مطابق اگر ملازمہ سے ہر کام تنخواہ دے کر کروایا جا سکتا ہے۔۔۔ درزی کے بل بھر کے کپڑے سلوائے جا سکتے ہیں تو خود کو ہلکان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ شاہ خرچیاں ان کی ساس کو پسند نہ تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بچوں کے چھوٹے چھوٹے فراک اور نیکریں' اپنے روزمرہ کے پہننے والے کپڑے بیبیاں خود ہی سیتی بھلی لگتی ہیں۔

"اور آپ ٹھیک ہیں؟"

ساس کا طنز اور سوال دونوں نظرانداز کر کے وہ ڈبے میں سے مطلوبہ رنگ تلاشتے ہوئے مصروف اور رسمی انداز میں کہنے لگیں۔ "قیمہ بھرے کریلے اور کڑھی پکائی ہے۔ بھجواتی ہوں آپ کے لیے۔"

یہ کہہ کے وہ نکلنے لگیں کہ شوکت جہاں کی آواز پہ رکنا پڑا۔

"بارہ بجے ہی بھجوا دینا' آج صرف چائے ہی پی ہے میں نے بھوک جلدی لگ جائے گی اور پروین بی بی تو خیر سے

اب ٹھک ٹھک روانہ ہوئی ہیں کچن کی جانب۔ وہاں سے بھی کب سے صرف برتن پٹخنے کی آوازیں ہی آرہی ہیں۔ نجانے دھیان کدھر ہے آج اس کا۔ صبح سراج تو اچھی طبیعت صاف کرنے والا تھا اس کی اگر جو میں بیچ میں نہ آتی۔"

انہوں نے فخریہ اپنی کارکردگی اور افادیت جتائی کہ دیکھو میرا ساتھ اس بہو کے لیے کتنا فائدہ مند ہے لیکن رخشندہ بس یونہی رواداری میں مسکرادیں۔ انہیں بھلا اس افادیت سے کیا لینا دینا تھا۔ معراج دین صاحب کے منہ میں تو ویسے ہی زبان نہیں تھی اور بیگم کے سامنے تو وہ پلکوں کو جنبش دینا تک بھول جاتے تھے۔

"ذرا تم پتہ کرو، میکے میں لڑ بھڑ کر آئی ہے کیا سے؟ خیر وہاں ہے کون سوائے ایک ماں اور بھابھی کے اور بھابھی اللہ میاں کی گائے۔۔۔ آئے۔۔۔ کہیں وہ والی خبر تو نہیں؟"

اچانک انہیں نیا ہی خیال سوجھا۔

"کیسی خبر؟" نہ چاہتے ہوئے بھی رخشندہ کو دلچسپی ظاہر کرنا پڑی۔ سامنے شوکت جہاں تھیں، ان کی ساس۔۔۔ کوئی دیورانی نہیں تھی جس کی بات ان سنی کرکے، ادھوری چھوڑ کے وہ باہر نکل جاتیں، اس لیے بڑی مجبوری کے عالم میں دروازے کے پاس کھڑی پوچھ رہی تھیں۔

"اے ہئے۔۔۔ وہی والی۔ یاد نہیں، پہلے دونوں بچوں کی دفعہ بھی شروع شروع میں ایسے ہی ہر ایک کو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی رہتی تھی۔ بھئی مجھے تو بہوؤں سے ایسی سن گن لینا پسند نہیں۔ لاج لحاظ نہیں رہتا۔ ہاں تم ذرا پتہ کرو کتنے دن چڑھے۔۔۔؟ اس بار بیٹی ہو تو میرے سراج پہ اللہ کی رحمت بھی نازل ہو جائے گی۔"

"لو یہ نئی مصیبت۔۔۔ اب میں دائیوں کی طرح عورتوں سے ان کے دن چڑھنے کی رپورٹیں لیتی پھروں۔"

رخشندہ نے کوفت سے سوچا اور ٹالنے کے سے انداز میں حامی بھرتے ہوئے نکلنے کو تھیں ———— کہ ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی نے گھر کے پرسکون ماحول کو منتشر کر دیا۔

گھر میں فون لگے چند مہینے ہی ہوئے تھے لیکن اب تک کوئی بھی عادی نہ ہوا تھا اس اچانک بجنے والی گھنٹیوں کا۔ ایک پل کے لیے تو رخشندہ بھی چونک گئیں۔

پروین بیگم چھری ہاتھ سے رکھ کے حسان کی فکر کرنے لگیں جسے ابھی ابھی سلا کے کام نمٹانے آئی تھیں۔

سب سے بری حالت ہوتی تھی شوکت جہاں کی۔ ان کو تو ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز زہر لگا کرتی۔ اب بھی ایک ہاتھ سینے پہ رکھے، دوسرا کان پہ جمائے توبہ توبہ کر رہی تھیں۔ تیسری بیل پہ پروین نے برآمدے میں رکھے سیاہ ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اٹھا لیا تھا لیکن ان کے حواس اب تک قابو میں نہ آئے تھے۔

"ایک گلاس پانی تو پلانا۔"

رخشندہ نے کولر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کے انہیں پیش کیا۔

"توبہ۔۔۔ کیا صور اسرافیل کانوں میں پھونکنے کو لا رکھا ہے سراج نے۔ جب بجتا ہے دل دہل جاتا ہے، ہول اٹھتے ہیں مجھے کہ نجانے کیا خبر آئی ہے۔ ایسی منحوس گھنٹی ہے اس کی جیسے خطرے کا سائرن۔"

"اماں جی۔۔۔ اماں جی۔۔۔!" پروین بیگم متوحش انداز میں بھاگتی آئیں۔

"الٰہی خیر۔۔۔" وہ مزید گھبرا گئیں۔

"صبح سے میرا دل یونہی نہیں گھبرا رہا تھا۔ میں نہ کہتی تھی کہ کوئی بات ہے ضرور۔۔۔ کچھ ہونے والا ہے۔"

وہ روتی دھوتی شوکت جہاں کے بستر پہ دھم سے بیٹھ گئیں۔ رخشندہ نے پانی کا گلاس تپائی سے اٹھا کے اب پروین کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اے کچھ بول بھی۔۔۔ کیا ہوا؟" شوکت جہاں کی آواز لرز رہی تھی۔ "یا اللہ۔۔۔ میرے سراج، معراج کی خیر رکھنا۔" "میری اماں کا فون تھا۔" پروین نے دوپٹہ کا ہولہ سا بنا کے منہ پہ رکھتے ہوئے اپنی ہچکیاں روکیں۔

"ساجدہ کو ہسپتال لے گئے ہیں، اس کی حالت بہت خراب ہے۔" ہچکیاں ایک بار پھر شروع ہو گئیں۔

"ساجدہ۔۔۔ تمہاری بھابھی؟"

پروین نے اثبات میں سر ہلایا۔ ساجدہ بے شک ان کے بڑے بھائی نوید مراد کی بیوی تھی مگر ان سے عمر میں کم تھی، اس لیے وہ بھابھی کہنے کے بجائے نام لے کر ہی پکارتیں۔

"اس کے ہسپتال جانے میں ابھی خاصا وقت تھا۔" رخشندہ نے کہا۔ "تم نے تو اکتوبر کا دوسرا ہفتہ بتایا تھا نا اور ابھی تو۔۔۔ ہاں پورے پانچ ہفتے باقی ہیں۔ تو کیا وقت سے پہلے ہی۔۔۔؟"

"وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔"

"ہائے۔۔۔" شوکت جہاں نے دہل کر سینے پہ ہاتھ رکھا۔ دھان پان، نازک سی، نفیس سی ساجدہ کی صورت آنکھوں میں پھر گئی جسے نوید مراد کی دلہن بنے ابھی سال بھر ہی ہوا تھا۔ رخشندہ بھی متفکر ہو گئیں۔

"مجھے ابھی وہاں جانا ہے اماں جی!"

"ہاں، کیوں نہیں۔ میں بھی ساتھ چلتی ہوں بلکہ رخشندہ! تم بھی معراج اور سراج کو فون کر کے بتا دو اور ہمارے ساتھ ہی چلو۔"

"فون میں کر دیتی ہوں اماں جی! اور ساتھ بھی ضرور چلتی لیکن بچے اسکول میں ہیں۔ گھر بند کر کے کیسے چل پڑیں۔"

"ہاں، احسن بھی اسکول میں ہے۔"

"آپ اماں جی کے ساتھ ابھی چلیے۔۔۔ حسان کو سویا رہنے دیں، اوپر بچیاں بھی کھیل رہی ہیں۔ رضا اور احسن اسکول سے آجائیں تو میں بچوں کو کھانا کھلا کے نکل آؤں گی۔ سب ہی بچے گھر پہ رہیں گے، ساتھ والوں کی آپا جی کو بٹھا جاؤں گی۔"

"وصی کو بھی اوپر ہی لے جاؤ، صحن میں بیٹھا ہوگا طوطے کے پنجرے کے پاس۔"

شوکت جہاں کے اس نئے آرڈر پہ وہ بغیر کسی تاثر کے سر ہلا کے رہ گئیں۔ اس ردعمل سے شوکت جہاں کی خاص تسلی نہ ہوئی۔

"کہیں نیچے اکیلے نہ چھوڑ دینا بن ماں کے بچے کو۔ ننھی سی جان ہے ڈر کے مارے ہولتا رہے گا۔"

"ہاں ظاہر ہے۔" وہ بڑبڑائیں۔ روکھا پھیکا مزاج ہوتا ایک طرف۔ ایسی بے دردیا کٹھور تو ہرگز نہ تھیں، نہ ہی اس معصوم بچے سے کوئی دشمنی تھی جو موقع پاتے ہی نکالتیں۔

☼ ☼ ☼

ٹھیکیدار نوید مراد پھٹی پھٹی آنکھوں سے پکے فرش پہ خون میں لت پت پڑی ساجدہ کو دیکھ رہا تھا۔

ماربل کا فرش اس نے چند ماہ پہلے ہی بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ سفید جھاگ سا صحن اور برآمدہ۔۔۔ چمکتی ہوئی سیڑھیاں کتنی اچھی لگتیں اور آج اسی خوش نما فرش پہ گاڑھا گاڑھا سرخ خون جھر جھر بہہ رہا تھا۔

"اے کوئی اٹھاؤ اسے۔۔۔ نوید۔۔۔ پروین۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔ ارے میں مر گئی۔"

یہ پروین بیگم اور نوید مراد کی ماں تھیں جو سینہ پیٹتے ہوئے واویلا کر رہی تھیں۔

"اے نوید! کھڑا کیا تک رہا ہے۔ اٹھا اس بدنصیب کو۔۔۔ مر جائے گی۔۔۔ ہسپتال لے کر جا۔۔۔ ارے رسولن، نی ثریا۔۔۔!"

وہ ہمسائیوں کے نام پکارتے ہوئے ننگے پیر باہر کی جانب بھاگیں۔

نوید مراد جیسے سکتے کے عالم میں کھڑا نیچے گرے بے ہوش وجود کو دیکھ رہا تھا۔

ساجدہ جسے اس کی زندگی میں شامل ہوئے ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا تھا یا یوں کہیے کہ زندگی کو زندگی کی طرح محسوس کرنا اس نے ابھی ابھی سیکھا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے خود کو یتیمی کے دور میں اور ماں کو بیوگی کی چادر

اوڑھے دیکھا۔ ہوش سنبھالتے ہی خود کو ذمہ داریوں میں جکڑا پایا۔ سارا لڑکپن' فرائض اور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے گزرا اور نوجوانی کے ابتدائی کئی سال بھی۔

کڑی محنت اور مشقت کے دہ سال۔

جن میں خود اس کے اپنے لیے ایک پل نہ تھا۔ وہ سارے سال اس نے اپنے قدم جمانے' اپنی بیوہ ماں کے سر پہ چھت قائم کرنے اور چھوٹی بہن کے لیے جہیز اکٹھا کرنے میں گزار دیے۔

اس کی اس جدوجہد کا کچھ انعام تو ملا ہی تھا۔ پروین بیگم کا رشتہ اچھے گھرانے میں ہو گیا۔ بہت عزت کے ساتھ بہت دے دلا کر اس نے بہن کو رخصت کیا تھا۔ ذاتی مکان۔۔۔ ٹھیکیداری کا منافع بخش کام۔۔۔ سب کچھ حاصل ہو گیا' تب اس نے اپنے بارے میں سوچا۔

ماں اور بہن نجانے کہاں سے چھانٹ کے یہ ہیرا لائی تھیں اس کے لیے۔ اس نے پہلی بار ساجدہ کو دیکھا تھا تو مبہوت رہ گیا تھا۔ یہ تو اس نے سوچا تک نہ تھا کہ اب جب اس کی عمر اڑتیس سال سے اوپر ہو چلی ہے اور کڑی مشقت کے شب و روز نے اس کے ظاہر پہ اثر انداز ہو کے اسے عمر سے کہیں بڑا ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے' اسے اتنی حسین اور کم عمر بیوی مل سکتی ہے لیکن یہ پروین بیگم کا کارنامہ تھا۔ ایک غریب سے گھرانے کی انیس بیس سالہ خوبصورت اور سلیقہ شعار لڑکی وہ اپنے بھائی کے لیے ڈھونڈ کر لائی تھیں۔

ساجدہ عادت کی بھی اچھی تھی۔ نوید مراد کی ماں' مزاج کی قدرے تیز تھیں لیکن ساجدہ نے ان کے ساتھ بھی ہنس کے نباہ کر لیا۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی اس نے نوید مراد کو خوش خبری سنائی تھی اور تب سے اس کے پیر زمین پہ نہ ٹک رہے تھے۔ یہ احساس ہی کتنا خوش کن تھا کہ وہ جو عرصے سے بوجھ اٹھانے کا عادی ہے' کوئی اس کی بھی ذمہ داریاں بانٹنے والا آ رہا ہے۔ کوئی اس کا بھی سہارا بننے والا ہے۔

"لیکن شاید میری خوشیوں کی عمر اتنی ہی تھی۔"

نوید مراد نے بجھتی ہوئی آنکھوں سے ساجدہ کے نیم مردہ وجود کو دیکھا اور اس کی لرزتی ٹانگوں نے اس کا بوجھ مزید سہارنے سے یکسر انکار کر دیا۔

جس وقت اس کی ماں' شمشاد محلے کے لوگوں کو اکٹھا کر کے روتی پیٹتی اندر لا رہی تھیں' وہ کھڑے قدموں نیچے گر رہا تھا۔ رسولن اور ثریا زخمی ساجدہ کو سنبھالنے آگے بڑھیں اور شمشاد اپنے بیٹے کو۔

"میرے پتر کو خوشیاں راس نہیں آئیں۔ نجانے کس موئے کی بد نظر کھا گئی۔ ہائے۔۔۔ لوگوں کے ہاں ڈھیر لگے ہیں پوتے پوتیوں کے' مجھے کملی نے تو کبھی جلاپا نہ کیا پھر میرے گھر کے پہلے پہلے "جی" آنے کی خبر پہ لوگوں کے سینے پہ سانپ کیوں لوٹ گئے۔ کس کے تعویز گنڈے کام دکھا گئے۔"

نوید مراد کو اس کا کوئی پڑوسی پانی کے چھینٹے مار کے ہوش میں لا رہا تھا۔ ایک اور پڑوسی جو اپنی گاڑی نکال لایا تھا اور اب دو تین عورتوں کی مدد سے ساجدہ کو اٹھا کے گاڑی میں لٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور ادھر شمشاد بی بی اپنے بین کرنے میں مصروف تھیں۔

"اٹھو نوید بابو! اسپتال جانا ہے۔"

حاجی نور محمد نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

وہ خالی خالی نظروں سے اب تک فرش پہ گرے خون کو دیکھ رہا تھا۔ ساجدہ اب وہاں نہیں تھی مگر اس کی خون میں لت پت چپل ابھی وہیں پڑی تھی۔

"جلدی کرو شاباش۔۔۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔ خون بہت بہہ رہا ہے' حالت ٹھیک نہیں بی بی کی۔"

"دیر تو ہو گئی حاجی صاحب!"

بہت دیر بعد وہ اتنا کہنے کے قابل ہوا۔ اس کی ویران آنکھوں میں امید کی ذرا سی بھی رمق نہیں تھی۔۔۔ وہ خود کو کسی خوش فہمی میں بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

"وہ نہیں بچے گی۔" آنسوؤں سے بھری آواز کے ساتھ وہ سر ہلا کے کہہ رہا تھا۔ "میں جانتا ہوں۔۔۔ وہ نہیں۔۔۔"

اس سے آگے الفاظ ہمت ہار گئے۔

"استغفر اللہ۔" حاجی نور محمد نے سرزنش کی۔ "کیوں کفر بولتے ہو۔ اللہ کی ذات سے ناامیدی؟ اس کا کرم مانگو' گڑگڑا کے مانگو' عاجزی سے مانگو۔ نہ کہ اپنے طور پہ ایسے اندازے لگاتے رہو۔"

وہ زبردستی اسے گھسیٹتے ہوئے باہر تک لے گئے' ورنہ وہ کسی بھی طرح وہاں سے اٹھنے پہ آمادہ نہ تھا۔ نجانے اس کی کون سی حس تھی جو اسے بار بار یہ اشارہ کر رہی تھی کہ وہ ساجدہ کو کھونے والا ہے۔

"مونا ڈارلنگ!"

"اونہوں' کتنی بار کہا ہے کہ مجھے ایسے مت پکارا کریں۔"

منزہ نے ناک چڑھا کے کہا۔ وہ اس وقت ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی اپنے لمبے گھنے بال سلجھا رہی تھی۔

"کیوں بھئی' کیا برائی ہے مونا نام میں؟ منزہ کے بجائے مجھے تمہیں پیار سے مونا پکارنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

مظہر نے بیڈ پر لیٹے لیٹے تکیے سے ذرا سا سر اٹھا کے کہا۔

"مونا نام میں برائی نہیں لیکن یہ جو آپ اس کے آگے دم چھلا لگا دیتے ہیں' وہ سخت زہر لگتا ہے۔"

"تو کیا کہوں' جان من۔۔۔ جان تمنا۔۔۔ سویٹ ہارٹ۔۔۔ کیا کہوں؟"

"سوہا کی ماں۔" منزہ نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "شادی کے تین سال بعد آپ مجھے اس نام سے پکارتے اچھے لگیں گے۔ سوہا کی ماں۔ ذرا بات سننا۔۔۔ کیوں' کیسا ہے؟"

"ایکدم بوگس۔۔۔ بکواس۔۔۔ تم میرے لیے ڈارلنگ تھیں' ہو اور رہو گی۔ بھلے سوہا تو سوہا۔۔۔ ماہا' روحا اور نیہا تک کی ماں بن جاؤ۔"

مظہر نے اسے تکیہ کھینچ مارا تھا۔

"توبہ کیجیے۔۔۔ ماں جی نے سن لیا تو شامت آ جائے گی۔ چار چار لڑکیاں۔"

وہ بظاہر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی مگر اس کی ہنسی میں کھنک کے بجائے جو تپش تھی' وہ مظہر بھٹی کو با آسانی محسوس ہوئی۔

"کیا ماں جی نے اس دن کے بعد دوبارہ ایسی کوئی بات کی؟" اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا مگر منزہ ٹال گئی۔

"آپ نے تو قافیے ملا کے نام تک سوچ لیے۔ ارادے نیک نہیں لگ رہے جناب کے۔"

"ارادے تو سو فیصدی نیک ہیں۔ بیٹا ہو یا بیٹی' دونوں اللہ کی رحمت ہیں اور مجھے جی جان سے قبول مگر ابھی نہیں۔ کم از کم مزید دو سال تک تو بالکل بھی نہیں۔"

"لیکن ماں جی۔۔۔ ان کی خواہش ہے مظہر!" منزہ نے دبے الفاظ میں کہنا چاہا۔ "انہوں نے تو سوہا کے تین چار ماہ کا ہوتے ہی کہنا شروع کر دیا تھا اور اب ماشاء اللہ وہ بھی دو سال کی ہونے والی ہے۔"

"ماں جی کی بات چھوڑو' تم یہ بتاؤ' اس بار سوہا کی برتھ ڈے کیسے منائی جائے۔ چھ دن ہی تو رہ گئے ہیں۔"

"گھر میں سب مل کے کیک کاٹ لیں گے اور کیا کرنا ہے۔"

اس نے رخ پھیرتے ہوئے دوبارہ آئینے کے سامنے توجہ کی اور بال آگے کی جانب لا کے ڈھیلی سی چوٹی کرنے لگی۔

"کیوں بھئی' ہماری شہزادی کی سالگرہ ہے۔ ہم تو دھوم دھام سے منائیں گے' سارا گھر سجائیں گے' سارے شہر کو بلائیں گے۔"

"رہنے دیجیے نا۔ پچھلے سال اپنے سارے شوق آپ نے پورے کیے تو تھے۔ اس بار سادگی سے ہی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔"

"بس ایک سال میں ہی سارے چاؤ پورے ہو گئے؟ میں ہر سال اپنی بیٹی کی برتھ ڈے اسی دھوم دھام سے مناؤں گا۔"

"پلیز مظہر! سمجھا کریں۔ پچھلی بار بھی کم باتیں نہیں بنی تھیں۔ ماں جی کو کتنا برا لگا تھا انہوں نے صاف صاف جتایا تھا کہ بیٹیوں کے ایسے چوچلے اٹھانا اس خاندان کی روایت نہیں۔ تب تو پہلی پہلی بار کی رعایت تھی' اب دوبارہ کریں گے تو زیادہ ناراض ہوں گی۔"

"مجھے ان کی ناراضی کی پروا نہیں۔ وہ وقتی غصہ ہوتا ہے۔"

"آپ کو نہیں لیکن مجھے ہے۔ میرے لیے ان کا غصہ وقتی نہیں ہوتا۔ مجھے سارا دن ان کے ساتھ گزارنا ہوتا ہے۔"

منزہ کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ ساس کی جلی کٹی باتوں پہ پردہ ڈالے رکھے۔ مظہر اس کے بارے میں حد درجہ حساس تھا اور اسے گھر میں ہونے والی کسی بھی تلخی کے بارے میں بتانے کا مطلب تھا' ایک نہ ختم ہونے والی محاذ آرائی شروع کرنا۔ منزہ کا دل اس شور شرابے اور گالم گلوچ سے بڑا گھبراتا تھا۔ وہ خود پہ ہونے والے کٹیلے طنز بھی سہہ لیتی۔ نت نئے توہین آمیز خطاب بھی برداشت کر لیتی۔ حتیٰ کہ ایسے ایسے الزام بھی اپنے سر بخوشی لے لیتی جو سراسر جاہلانہ ہوتے لیکن یہ اس کی برداشت سے باہر تھا کہ مظہر اس کی خاطر اپنی ماں سے تو تو میں میں کرے' اس کی بہن ماں کی حمایت میں میدان میں اترے اور منزہ کے خاندان کی پچھلی سات پشتیں کھنگالے' اس کی ساس سینہ کوبی کرتے ہوئے محلہ اکٹھا کر لے اور مظہر آخر کار واہیات گالم گلوچ پہ اتر آئے۔ بہرحال وہ اپنے خاندان کے کسی بھی فرد سے اس معاملے میں کم تو نہ تھا۔

یہی وجہ تھی وہ اپنے طور پہ اس کی نوبت آنے ہی نہ دیتی لیکن آج مظہر اپنی ضد پہ اڑا رہا تو اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں کہنا ہی پڑا اور آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ مظہر سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"تم بھیگی بلی بنی کیوں سنتی رہتی ہو۔ منہ میں زبان نہیں ہے کیا؟"

اب اس سوال کا جواب وہ کیا دیتی' منہ میں زبان تو اس کے بھی تھی لیکن مظہر کے لیے یہ ماننا بہت مشکل تھا کہ اسے اس زبان کو سختی سے بند رکھنے کی کتنی کڑی تربیت دی گئی تھی۔ اس کے ہاں تو دو کے بدلے چار اور وہ بھی کراری سنانے کا رواج تھا۔ اس ریت کو نبھاتے ہوئے یہ تخصیص روا نہ رکھی جاتی کہ سامنے کوئی بڑا ہے یا چھوٹا۔ بس دل کی بھڑاس نکالنا ضروری ہے۔ تین سال ہو گئے تھے اسے اس گھر میں نباہ کرتے ہوئے لیکن اب تک وہ خود کو یہاں کے طور طریقوں میں ڈھال نہ سکی تھی۔ جنگل کا قانون چلتا تھا یہاں۔ جس کا جو جی چاہتا کرتا۔ بے مجال کسی کی جو روک سکے اور جو کوئی روک ٹوک کرنے کی جرات کرتا تو منہ کی کھاتا۔ مظہر ان لوگوں کی ٹکر کا تھا' اس لیے ساری کسر بے چاری منزہ کی ذات پہ نکالی جاتی۔

"اچھا اس بار میری بات مان لیں اور ویسے بھی خوشی منانے کا اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ سارے اپنے ہماری اس خوشی میں دل سے شریک ہوں۔ کسی ایک کے دل میں بھی گلہ یا غبار ہو تو خوشی کے رنگ پھیکے لگنے لگتے ہیں۔"

"مجھے تو تمہارے سامنے ویسے بھی سارے رنگ پھیکے لگتے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر پٹری سے اترا۔ منزہ کے لیے اس کی یہ دیوانگی تھی کہ کم ہونے کا نام نہ لیتی تھی اور یہی وجہ تھی گھر میں منزہ کے خلاف بڑھتی کدورت کی۔ بھلا جس خاندان میں بیوی کو جوتی کی نوک پہ رکھنے کی روایت ہو۔ وہاں ایک عام سی غریب سے گھر کی لڑکی کو سر پہ بٹھا لیا جائے۔ یہ آسانی سے ہضم ہونے والی بات ہے؟

"اب چھوڑ دو آئینے کا پیچھا۔ میری آنکھوں میں دیکھو نا خود کو' سنورنے کا مزا بھی آئے گا۔"

اسے کاجل لگاتے دیکھ کے اس نے کہا۔

"آپ کی آنکھوں میں دیکھنے بیٹھ گئی تو گئی کام سے۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شام کے چھ بج رہے ہیں' مجھے کچن کا کام بھی دیکھنا ہے۔ آٹھ بجے تک کھانا لگ جاتا ہے۔"

"آج باہر سے کھا لیں گے۔"

مظہر نے قریب سے کنی کترا کے گزرتی منزہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے برابر گرا لیا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" وہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔ "ابھی چار دن پہلے باہر کھانا کھایا تھا۔ روز روز ہوٹلنگ کوئی اچھی عادت نہیں۔ ویسے بھی رات کا کھانا بنانا میری ڈیوٹی ہے۔ اگر مجھے باہر جانا بھی ہوا تو یہ ڈیوٹی ادا کر کے جاؤں گی۔ باقی گھر والوں کو تو کھانا کھانا ہے نا۔"

"تمہیں سب کی پروا ہے' سوائے میرے۔" مظہر نے روٹھے ہوئے انداز میں اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔

"آپ کی پروا ہے... بالکل ہے' اسی لیے باقی سب کی پروا بھی کرنا پڑتی ہے۔ اب اچھے بچوں کی طرح بستر کا پیچھا چھوڑیں۔ نہا کر وہ شلوار سوٹ پہن لیں جو باتھ روم میں' میں نے لٹکا رکھا ہے۔ آفس سے آتے ہی لیٹ جاتے ہیں گندے..."

"کیا کروں' وہاں پتا نہیں کیسے سات گھنٹے گزارتا ہوں تمہارے اور سوہا کے بغیر۔ گھر آ کے اور کچھ کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا' سوائے تم سے باتیں کرنے کے اور تم ہو کہ تمہیں میری شکل دیکھتے ہی سارے کام یاد آتے ہیں۔ کتنی بار کہا ہے' تم دن کو کھانا بنا لیا کرو۔ رات کا ماں جی یا شمیم بنا لیا کرے گی۔"

"اچھا سوچوں گی۔" اس نے ایسے کہا جیسے یہ ڈیوٹی بدلنا اس کے اختیار میں ہو۔ نصرت اور شمیم نے ٹائمنگ خوب سوچ سمجھ کے سیٹ کی تھیں پھر وہ اسے بدلنے پہ کیوں آمادہ ہوتیں۔ ایک تو اس طرح ان کے لاڈلے مظہر کو بیوی کے چرنوں میں بیٹھنے کا موقع کم سے کم ملتا تھا' دوسرے ان کی بھی کام کی بچت تھی۔ زیادہ کام ہوتا ہی رات کو تھا۔ مظہر' اس کا بھائی اصغر اور ان کے ابا سب رات کے کھانے پر اکٹھے ہوتے۔ لامحالہ کھانا زیادہ مقدار میں بھی پکتا اور اہتمام کے ساتھ بھی۔ دن کو تینوں مرد گھر میں نہیں ہوتے تھے۔ شمیم رات کا کوئی نہ کوئی بچا ہوا سالن گرم کر لیتی' کم ہوتا تو چٹنی یا رائتہ ساتھ بن جاتا۔ بازار سے چار پانچ روٹیاں آ جاتیں لیکن یہ سب باتیں وہ مظہر کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اگر اس کے تھوڑے بہت کام سے گھر میں سکون قائم تھا تو یہی بہت تھا۔ مظہر تو لڑ جھگڑ کے بھول جاتا' اگلے دن معمول کے مطابق آفس چلا جاتا۔ پیچھے رہ جاتی وہ اور اس کی دو سالہ معصوم بچی سوہا جن پہ شمیم اور نصرت عتاب کی طرح سارا دن برستی رہتیں۔

"اب کیا سوچنے لگی ہو۔" مظہر نے چٹکی بجا کے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"یہی کہ آپ میرا کس قدر وقت ضائع کرتے ہیں۔ اب تک میں گوشت چڑھا کے چاول تک بھگو چکی ہوتی۔ بس باتوں میں لگا لیتے ہیں۔"

"باتوں میں نہ لگایا ہوتا تو یہاں تک لاتا کیسے؟"

اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔ منزہ جھینپ گئی۔

"خوش قسمتی تھی آپ کی جو میں آپ کی باتوں میں آ گئی۔"

"میں نے اس سے کب انکار کیا ہے۔" وہ مخمور نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔

منزہ کو اپنا آپ سخت بے بس محسوس ہوا۔ اب اس کا بھی اٹھنے کو جی نہ چاہ رہا تھا مگر ایک منٹ بھی مزید گزرتا تو باہر سے ماں جی کے بڑبڑانے کی آواز اندر تک آ جاتی تھی۔

"نہانے کے بعد کچھ دیر سوہا کو باہر گھما لائیں۔ قریب کے پارک میں ہی لے جائیں۔ سلائیڈ لے لے گی۔ آج موسم خاصا خوشگوار ہے۔" اس نے مظہر کو مصروف کرنا چاہا۔

"مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ موسم خوشگوار ہے۔ تم بھی ساتھ چلو نا پھر شاید..."

"اووف..." اس بار وہ سچ مچ زچ ہو گئی۔ "میں کیسے جا سکتی ہوں۔ اچھا کھانے کے بعد اکٹھے واک کے لیے

نکلیں گے۔ ابھی تو سوہا کو لے جائیے۔"

وہ جلدی سے کہتی باہر نکلنے لگی، مبادا وہ پھر نہ ہاتھ تھام لے۔

"بال تو کھولو یار! گیلے گیلے ہی باندھ لیے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے نا، کتنے پسند ہیں مجھے تمہارے کھلے ہوئے بال۔"

اس نے پیچھے سے ایک اور فرمائش داغی۔

"ماں جی سے سخت جھاڑ پڑے گی اگر میں کچن میں کھلے بال لیے گھس گئی تو۔"

"ایک تو ماں جی تمہارے حواسوں پہ بری طرح سوار ہیں۔" اس نے جھنجلا کر کہا اور سوئے اتفاق اس وقت تک منزہ کمرے کا دروازہ کھول چکی تھی اور سامنے نصرت بی بی شاید دستک دے کر بلانے کی نیت سے ہی ہاتھ بلند کیے کھڑی تھیں۔

"یہ نہیں کرنا، ماں جی ناراض ہوں گی۔ وہ نہیں کرنا، ماں جی کو برا لگے گا۔ ارے یار! تم میری بیوی ہو یا ماں جی کی۔"

وہ اپنی ماں کی موجودگی سے بے خبر دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

"دفع دور... تجھے مبارک یہ پھاپھا کٹنی... میں تیری جگہ ہوتی تو مر کے بھی ایسی گنوں کی پوری کو بیوی نہ بناتی۔ یہ تو تیری مت ماری گئی تھی۔ ادائیں دکھا دکھا کے الو بنا لیا تھا اس چلتر نے۔"

"ماں جی... وہ... مظہر تو مذاق..." منزہ نے گھبرا کے کہنا چاہا، مگر وہ اسے ایک دھکے کے ساتھ پرے کرتی اندر گھس آئیں۔ وہ لڑکھڑا کے دروازے سے جا لگی۔

"کیوں... کیا کچھ مشہور کر رکھا ہے اس کٹنی نے میرے متعلق۔ کون سی سچی جھوٹی شکایتیں لگاتی ہے۔ میری تو زبان جل جائے جو سارا دن اس پیلے منہ والی سے کلام بھی کیا ہو۔ اچھی طرح پتا ہے مجھے ان چار جماعتیں پڑھی لڑکیوں کا... مردوں کو انگلیوں پہ نچانا اچھی طرح جانتی ہیں۔ کالج میں جاتی کس لیے ہیں۔ یہی کرتوت سیکھنے اور لڑکے پھنسانے، جیسے میرا بچہ پھنسا لیا۔"

"ماں! چپ ہو جاؤ، جس بات کا پتا نہیں، اس کے بارے میں الٹا سیدھا بول کے کیوں اپنا اور میرا سر کھاتی ہو۔"

مظہر بھی آپے سے باہر ہو گیا۔

"اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا میری آنکھیں نہیں ہیں۔ سب نظر آتا ہے مجھے، کیسے اس کے ساتھ زیادتیاں ہوتی ہیں۔ وہ میری پسند سے اس گھر میں آئی ہے، اس بات کا بدلہ لیتی ہو تم اور شمیم۔ وہی تو فساد کی جڑ ہے، سارا دن لگائی بجھائی کر کے تمہارے کان بھرتی رہتی ہے۔"

"یہ کام تمہاری اس آوارہ بیوی کا ہے۔ میری شمیم کو کیا پڑی ہے۔ اس کے تو کام ہی نہیں ختم ہوتے۔ سارا دن گدھے کی طرح لگی رہتی ہے اس گھر کے کاموں میں، اسے کہاں فرصت ان حرکتوں کی۔"

"تو کیا میں نے کہا تھا اسے گھر کے کاموں میں جتا دو۔ بیاہ دیا ہوتا وقت پہ، اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ بابا جی کتنے شوق سے مانگ رہے ہیں اپنے منظور کے لیے۔ ہاں کیوں نہیں کر دیتی ہو؟ کیا کرنا ہے اسے گھر بٹھا کے۔ بتیس سال کا تو کر دیا ہے۔"

"ڈوب مر، کیسے بہن کی عمر گنوا رہا ہے۔ اور دل نہیں کانپتا منظور کے لیے ہاں کرنے کا، کہتے ہوئے۔ وہ ہکلا ہی رہ گیا ہے۔ میری شمیم کے لیے۔ میری لڑکی مجھ پہ بھاری نہیں۔ ابھی اس کا باپ بھی زندہ ہے۔ اور ماں بھی۔ تیری اس چالاک بیوی کی طرح یتیم نہیں ہوئی نہ بھائیوں کے آسرے پہ جا پڑی ہے۔ جو آنکھ مٹکا کر کے اپنا بندوبست کرتی پھرے۔ جیسے اس بدچلن نے کیا تھا۔ بھائیوں کے چنگل سے نکلنے کے لیے۔"

"یا اللہ...!" منزہ نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے اور ڈوبتے دل کے ساتھ وہیں دیوار کے ساتھ لگ کے بیٹھ گئی۔ مظہر اب دوبدو لڑ رہا تھا۔

یہ سب منزہ کے لیے اب نیا نہیں رہا تھا۔ تین سالوں سے دیکھتی آ رہی تھی، لیکن ہر بار اسے نئے سرے سے تکلیف ہوتی تھی۔ خاص طور پہ مظہر کو یوں جاہل اور لڑاکا عورتوں کی طرح ماں اور بہن سے مقابلے بازی کرتے دیکھنا اس کی برداشت سے باہر ہوتا تھا۔

جان نچھاور کرنے والے، بے حد خیال رکھنے والے، پڑھے لکھے خوبرو شوہر کا یہ روپ اسے اوپرا اوپرا سا لگتا۔ وہ ناگواری سے اسے دیکھنے لگی۔ لیکن اس وقت مظہر کو پرواہ ہی کہاں تھی۔ بعد میں نادم ہو کر وہ ہر بار منزہ سے وعدہ کرتا تھا کہ آئندہ بدکلامی نہیں کرے گا، لیکن لڑتے وقت اسے ہوش ہی کہاں رہتا تھا۔

منزہ نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ سات بجنے والے تھے۔ اسے بہت سے کام تھے۔ ان لوگوں کی تو عادت تھی۔ لڑنے بھڑنے کے بعد یوں نارمل ہو جاتے جیسے یہ بھی روزمرہ کے کاموں کا ایک حصہ ہو۔ ظاہر ہے سب کو کھانا وقت پہ چاہیے تھا اور وہ باہر جانے سے گھبرا رہی تھی... وجہ تھی شمیم... جو اسے ہرگز نہ بخشتی۔

اللہ اللہ کر کے نصرت بی بی کی بھڑاس نکلی۔ وہ اپنے نصیب کو کوستی، منزہ کو بددعائیں دیتی، کمرے سے نکلیں۔ منزہ نے ناراض نظروں سے مظہر کو دیکھا۔ وہ نظریں چراتا باہر نکل گیا۔

"میں ذرا سوہا کو گھما کے لاتا ہوں۔"

وہ اس خالی کمرے کو تکنے لگی۔ جہاں صرف ایک منٹ پہلے گھمسان کا رن پڑا تھا۔ اس وقت خالی کمرہ کتنا پُرسکون لگ رہا تھا جیسے اس کے در و دیوار سوائے مظہر اور منزہ کی پیار بھری سرگوشیوں اور ننھی سوہا کی قلقاریوں کے اور کسی آواز سے آشنا ہی نہ ہوں۔

اس کے جہیز کے بیڈ پہ اس کے ماہر ہاتھوں سے کاڑھی صاف ستھری بیڈ شیٹ بچھی تھی۔ تکیے بے ترتیب تھے۔ ایک سائیڈ ٹیبل پہ لیمپ اور مظہر کا لائٹر اور سگریٹ کی ڈبیا رکھی تھی۔ دوسری پہ سوہا کی وہ تصویر، جس میں وہ چند ماہ کی تھی۔

سامنے کی دیوار کے ساتھ دو کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ ان پہ بھی منزہ کے ہاتھ کے بنے کشن اور میٹ سجے تھے۔ بائیں جانب کی دیوار کے ساتھ الماری تھی۔ اور دائیں جانب ڈریسنگ ٹیبل اور سوہا کا کاٹ رکھا تھا۔ ایک کونے میں ٹرالی پہ چودہ انچ کا کلر ٹی وی بھی تھا۔ جسے دیکھنے کے لیے وہ رات کو پہیوں والی ٹرالی کھینچ کے بیڈ کے سامنے لے آتے کہ اتنی چھوٹی اسکرین والے ٹی وی پہ دور سے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔

بیڈ کے اوپر دیوار پہ دونوں کی شادی کی تصویر لگی تھی۔ دونوں کے چہرے خوشی سے جگمگا رہے تھے۔ آنکھوں میں کچھ خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کی فتح مندی اور سرشاری تھی اور کچھ نئے خوابوں کے رنگ بھی جھلملا رہے تھے۔ دونوں کی پسند کی شادی تھی، لو میرج... جو ہو تو گئی تھی مگر اتنی آسانی کے ساتھ بھی نہیں۔ زیادہ رکاوٹیں مظہر کے گھر والوں کی جانب سے تھیں۔ وہ کسی مال دار گھرانے کی لڑکی لانا چاہتے تھے۔ جو لمبا چوڑا جہیز لا سکے۔ حالانکہ خود وہ کوئی رئیس ابن رئیس نہ تھے۔ ہاں بس نیا نیا پیسہ ہاتھ لگا تھا۔ مظہر کے ابا کا کاروبار جو سالوں سے دھکیلے کھا رہا تھا۔ اچانک کچھ عرصے سے ابھرنا شروع ہو گیا۔

دوسری طرف حیرت انگیز طور پہ مظہر نے ایک بڑی ڈگری بھی لے لی، ورنہ ان کے خاندان میں پڑھنے لکھنے کا خاص رجحان نہ تھا۔ اسے اچھی فرم میں معقول ملازمت کیا ملی، نصرت اور اس کی بیٹی شمیم کے قدم گویا زمین پہ پڑنا بھول گئے۔ نو دولتیوں والے سارے رنگ ڈھنگ اپنا لیے گئے۔ کرائے کے مکان سے اٹھ کے ذاتی کوٹھی میں چلے آئے۔ گاڑی بھی خرید لی گئی، موٹر سائیکل بھی چھوٹے والے اصغر کو لے دی گئی۔ اوپر کے کاموں کے لیے ملازمہ بھی رکھ لی گئی اور گھر بھی تقریباً سب ہی اشیائے ضرورت و آسائش سے بھر دیا گیا۔ مگر اپنی خو بو نہ بدل سکے وہ لوگ۔

بے دریغ گالم گلوچ اور ہاتھا پائی کا وہی عالم تھا۔ حتیٰ کہ اتنی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد مظہر بھی خود کو بدل نہ پایا تھا۔ گھر سے باہر وہ ایک مہذب، سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ مگر گھر کے اندر ہی بن جاتا جو گھر کے باقی مکین تھے۔

منزہ ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی اور چھوٹی بہن۔ ماں باپ ایک کے بعد ایک کر کے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ بھائی مقدور بھر خیال ضرور رکھتے' لیکن بھابیوں کا مزاج دھوپ چھاؤں جیسا تھا۔ جو بھی تھا بہرحال گھر کے ماحول میں وہ ترشی اور تنگی نہ تھی۔ جو یہاں کا خاصا تھی۔ چھوٹی موٹی چپقلش اور تلخ کلامی ہونا الگ بات تھی۔ مگر تہذیب کا دامن نہ چھوڑا تا کہ تنگ دستی کے باوجود منزہ کے والدین نے ساری اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا تھا۔ اب ان کی وفات کے بعد بھائی بھی اسے کالج میں پڑھا رہے تھے۔ حالانکہ بھابیاں چاہتی تھیں' برا بھلا جیسا بھی رشتہ ملے' اسے بیاہ دیا جائے۔

ان ہی دنوں اس کی ملاقات مظہر سے ہوئی۔ مظہر اپنے رزلٹ کے انتظار میں تھا اور پارٹ ٹائم جاب کے طور پر اس بڑے جنرل اسٹور کا سپروائزر تھا جہاں کالج کے بعد کبھی کبھی منزہ کسی کام سے آ جایا کرتی تھی۔ کبھی کوئی نوٹس فوٹو اسٹیٹ کروانے' کبھی کسی فرینڈ کے ساتھ کولڈ ڈرنکس پینے تو کبھی کسی ضرورت کے وقت فون کرنے۔

اس دن اسے اپنی ایک سہیلی کو فون کرنا تھا' جو کئی دن پہلے اس کی کتاب لے گئی تھی اور اب کالج سے غیر حاضر تھی۔ "مجھے ایک فون کرنا ہے۔"

کاؤنٹر پہ مظہر کو کھڑے دیکھ کے وہ جز بز ہوئی' یہ اسمارٹ اور ویل ڈریسڈ لڑکا جو کہیں سے اس اسٹور کا سیلز مین نہیں لگتا تھا۔ اکثر اسے نظر آیا کرتا تھا۔ اس وقت اس کے نروس ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ یہ لڑکا جب بھی اسے دیکھتا' ایک دوستانہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آ جایا کرتی تھی۔ منزہ ماتھے پہ بل ڈال کے رخ پھیر لیا کرتی۔ اس سے زیادہ سخت رویہ' وہ اس لیے نہیں اپنا سکی کہ وہ لڑکا بھی اس مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس نے کبھی کوئی اوچھی حرکت نہیں کی تھی۔ لیکن آج اسے پبلک فون والے کاؤنٹر کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہاں کھڑے سیلز مین کو ہٹا کر وہ خود کھڑا ہو گیا۔ منزہ نے یہ حرکت بطور خاص محسوس کی تھی اس لیے کنفیوز ہو گئی۔ اس کا پراعتماد لہجہ مظہر بھٹی کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے ڈگمگا گیا جسے مظہر نے اپنی مخصوص دوستانہ مسکراہٹ سے سہارا دینے کی کوشش کی۔

"ضرور کیجیے۔"

"میں کیسے لینے آ سکتی ہوں۔ تمہیں پتہ تو ہے' گھر سے صرف کالج کے لیے ہی نکل سکتی ہوں۔" اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔

"تو... اور کتنا انتظار کروں تم پتہ نہیں کب ٹھیک ہو گی اور ادھر اگزامز سر پہ ہیں' مجھے نوٹس بنانا ہیں۔" اس بار اس کے لہجے میں خفگی بھی تھی۔

"نہیں میں نہ تو آ سکتی ہوں نہ کسی کو بھیج سکتی ہوں۔ کوئی اتنا فارغ نہیں بیٹھا میرے گھر میں جو رحمان پورہ سے ماڈل ٹاؤن تمہارے گھر تک ایک کتاب لینے جا سکے۔" اس نے غصہ ظاہر کیا۔

"نہیں' بس مجھے نہیں پتا' کسی بھی طرح میری کتاب ایک دو دن تک میرے گھر بھجواؤ' ورنہ میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھوں گی۔ تم ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہو۔"

فون بند کر کے وہ اپنے بگڑے موڈ کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب مینگو جوس کی ٹھنڈی بوتل اس کے سامنے آئی' اس نے چونک کے دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"مینگو جوس..."

"مگر میں نے تو نہیں منگوایا۔"

"جانتا ہوں' یہ آپ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ہے۔"

"میرے غصے سے آپ کو کیا مطلب؟"

"مطلب تو ہے' دراصل آپ کے پورے چہرے بلکہ آپ کی ساری پرسنالٹی میں صرف یہ آپ کی ناک ہے جو

کم نہیں لیتی ہے۔ یعنی بس گوارا ہی ہے اور غصے میں یہ جس طرح چمک جاتی ہے' وہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

منزہ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتی رہی' جو کمال بے تکلفی سے اپنی رائے دے رہا تھا۔

"آپ... آپ..." اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا' آخر وہ اس شخص کو کیسے تو کیا کہے۔

"بے حد فضول انسان ہیں آپ؟"

اتنا کہہ کر وہ غصے سے تلملاتی وہاں سے نکل گئی۔ مگر اس جلدی میں وہ دو باتیں بھول گئی۔ ایک تو اپنی فائل اور دوسرا فون کال کرنے کے پیسے دینا۔

انہی دو وجوہات کی بنا پہ وہ اگلے روز پھر وہاں تھی۔ اس بار احتیاطاً اپنی ایک دوست کو ہمراہ لائی تھی۔

"سنیے میں کل اپنی فائل اس کاؤنٹر پہ بھول گئی تھی۔"

ان دونوں کو اندر آتا دیکھ کے مظہر ایک بار پھر لپک کے اس طرف آن کھڑا ہوا اور منزہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسی سے دریافت کرنا پڑا۔

"صرف فائل' آپ اور بھی کچھ بھول گئی تھیں... چچ چچ' آپ سے یہ امید تو نہیں تھی کہ آپ اسے دبانے کی کوشش کریں گی۔" اس کی سیاہ مسکراتی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"یہ رکھیے اپنے دو روپے... مجھے کیا ضرورت ہے آپ کی اتنی بڑی رقم دبانے کی۔" اس نے غصے سے کاؤنٹر پہ پیسے رکھے۔ "اب میری فائل واپس کیجیے۔"

"جی ضرور... لیکن آپ سب ہی چیزیں ایک بار دے کر واپس مانگ لیا کرتی ہیں؟" اس نے بھی فوراً سوال کیا۔

"جی کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے' مجھے ایسی عادت نہیں' نہ میں کسی کو کچھ دے کر واپس لیتا ہوں' نہ کسی کی دی ہوئی چیز کبھی لوٹاتا ہوں۔"

"تو میں کیا کروں... مجھے کیا لینا دینا آپ کی عادتوں سے۔" وہ رکھائی سے کہتے ہوئے اپنی فائل اٹھا کے جانے والی تھی کہ مظہر نے اپنا ہاتھ اس کی فائل پہ رکھ دیا۔ وہ رک گئی۔

"یہ اچھا ہے مس منزہ! بڑی پرسنل چیز کا لین دین کرتا ہے ہمیں... دل کا۔"

اسے قطعی امید نہیں تھی کہ وہ اس کی دوست کی موجودگی میں اس دھڑلے اور بے باکی سے یہ اظہار کر دے گا۔ حیرت کا حملہ اتنا شدید تھا کہ وہ کوئی رد عمل تک ظاہر نہ کر سکی۔ حمیرا کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے نکل گئی۔

حمیرا کو وہ اپنے ساتھ کسی اور وجہ سے لے کر گئی تھی' لیکن اسے ساتھ لے جانا ہی دراصل مظہر سے مزید رابطے کا ذریعہ بن گیا۔ وہ تو شاید اس دن والے واقعے کے بعد دوبارہ وہاں کا رخ بھی نہ کرتی' لیکن مظہر نے حمیرا کے ذریعے اسے مختلف پیغامات بھیجنا شروع کر دیے۔

"یار منزہ! وہ شخص سیریس ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہے تم سے۔ تمہیں غلط فہمی ہے کہ وہ تم سے فلرٹ کر رہا ہے۔" حمیرا نے پرزور سفارش کی۔

"اچھا...؟" وہ ہنس پڑی۔ "وہ صرف اس کی بے اختیاری تھی اور کچھ نہیں۔ وہ خود شرمندہ ہے اور معذرت کر رہا ہے۔ تم اس سے ایک بار ملو تو سہی' وہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بہت ڈیسنٹ اور سلجھا ہوا ہے۔"

"ہاں... سلجھا ہوا۔" منزہ نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"ایجوکیٹڈ بھی ہے۔ یہاں صرف ٹائم پاس کے لیے مینجمنٹ کر رہا ہے۔ اس کے انکل کا اسٹور ہے ورنہ آج کل وہ کئی ملٹی نیشنل کمپنیز میں اپلائی کر رہا ہے۔ بہت برائٹ فیوچر ہے اس کا۔"

"تو میں کیا کروں؟" اس نے شانے اچکا کے بے نیازی جتانا چاہی۔

"ارے پاگل! وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہے تم سے۔" حمیرا نے دوبارہ جتایا۔ "بلکہ شرمندہ ہے کہ اس کا وہ طریقہ غلط تھا۔ اب ڈھنگ سے تمہارے ہاں اپنے گھر والوں کو رشتہ مانگنے کے لیے بھیجنا چاہتا ہے۔"

ایڈریس مانگ رہا تھا تمہارا۔ دے دوں کیا؟"

"تمہیں پتا ہے نا حمیرا۔! میری امی ابو۔۔۔" وہ سر جھکا کے آنسو پینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "ان کے بغیر میری حیثیت ڈانواڈول سی ہے اس گھر میں۔ بھابیاں کسی بھی وقت مجھے بھائیوں کی نظر میں بے وقعت کر سکتی ہیں' بس کوئی بہانا ملنے کی دیر ہے۔ میں انہیں بہانہ دینا نہیں چاہتی۔"

"کہیں نہ کہیں تو انہیں تمہاری شادی کرنا ہی ہے۔ وہ تو شکر ادا کریں گی کہ اتنی جلدی تم سے چھٹکارا ملا۔ ایسا اچھا رشتہ بغیر کسی جدوجہد کے خود چل کے گھر آیا ہے۔ تم خوامخواہ ڈر رہی ہو۔ اور پھر جب تم نے کچھ غلط کیا ہی نہیں تو تمہارے ساتھ غلط کیسے ہو گا؟"

حمیرا کا کہنا درست تھا بہت ڈرتے ڈرتے اس نے اپنا ایڈریس مظہر تک بھجوایا تھا اور دو تین دن بعد ہی اس کے والدین اس کے گھر رشتہ لینے آ گئے تھے۔ اگرچہ ان کے انداز میں خاص گرم جوشی نہیں تھی۔ بہت روکھے پھیکے طریقے سے انہوں نے یہ بات واضح طور پر جتاتے ہوئے رشتہ طلب کیا تھا کہ یہ سراسر ان کے بیٹے کی ذاتی پسند ہے۔ اس کے باوجود بھابیوں نے دبے دبے ہلکے پھلکے طنز کے علاوہ اور کچھ نہ کہا تھا۔ مظہر بھٹی کا رشتہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ صرف دو مہینے تک ان کی منگنی رہی اور اس دوران مظہر اس کی تمام تر احتیاطوں کے باوجود مسلسل رابطے میں رہا۔ وہ اپنے آپ کو اس کی محبت میں مبتلا ہونے سے روک نہ سکی۔

منگنی کے اس مختصر دورانیے میں مظہر کے گھر والوں نے ہر ممکن طریقے سے منزہ کے بھائیوں کو زچ کرنے کی کوشش کی کہ کسی طریقے سے وہ لوگ متنفر ہو کے خود رشتہ ختم کر دیں۔ اس سے پہلے کہ اس کی نوبت آتی' منزہ نے اس بات کا ہلکا سا گلہ مظہر سے کر دیا۔ اس نے نجانے اپنے ماں باپ پہ کیا منتر پھونکا کہ اگلے چکر میں وہ منہ پھلائے بیٹھے شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے۔

وہ دلہن بن کے مظہر کی زندگی میں شامل ہو تو گئی' لیکن اس الزام کے ساتھ۔۔۔ کہ اس نے شادی سے پہلے محبت کی پینگیں بڑھا کے مظہر کو پھنسایا تھا' حالانکہ حقیقت تو یہ تھی کہ پہلے پہل یہ دیوانگی ایک طرفہ تھی' یعنی صرف مظہر کی جانب سے۔۔۔ اس کی انوالومنٹ تو منگنی کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اور اب شادی کے بعد تو مظہر ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ کب اور کیسے وہ اس سے اتنی بے پناہ محبت کرنے لگی تھی۔ ہاں بس اسے اظہار کا ڈھنگ نہ آتا تھا' اور مظہر ہمہ وقت اظہار محبت پہ مائل۔۔۔ یہ رنگ ڈھنگ اس کی ماں نصرت اور نسیم کو ذرا نہ بھاتے تھے۔ شادی کے تین سال بعد بھی دونوں کے عشق کا وہی عالم دیکھ کے ان کی مایوسی رفتہ رفتہ طیش میں بدل رہی تھی۔ جسے نکالنے کا بہانا ہر دوسرے دن مل ہی جاتا۔

● ● ●

"اماں جی' ساجدہ بچ تو جائے گی؟"

پروین نے شوکت جہاں سے یوں پوچھا جیسے وہ غیب کا علم جانتی ہوں۔

شوکت جہاں نے ایک گہری سانس بھر کے اپنی بہو کو دیکھا جس کی آنکھوں میں بیک وقت خوف اور امید کے سائے جھلک رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے سوال کا کیا جواب دیں۔

ایک طرف اس کی آنکھوں کا خوف انہیں بھی واہموں میں مبتلا کیے دے رہا تھا تو دوسری جانب وہ امید کے اس رنگ کو پھیکا بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھیں۔

"اللہ سے دعا کرو۔ وہ بہتر ہی کرے گا۔" اسے تسلی دینے کے بعد انہوں نے خود بھی تسبیح کے دانے گرانے شروع کر دیے۔

وہ سب اس وقت فاطمہ میموریل ہسپتال کے گائنی سیکشن کے آپریشن تھیٹر کے باہر ٹھنڈے کوریڈور میں موجود تھے۔ ان کے علاوہ یہاں اور بھی بہت سے ایسے لوگ تھے مگر شاید کسی کی بھی آنکھوں میں خوف اس قدر نمایاں نہ تھا۔ ان میں سے کسی کی حالت ساجدہ جیسی خراب بھی تو نہیں ہو گی۔

یہاں پہنچنے سے پہلے ہی ڈاکٹرز ساجدہ کو آپریشن تھیٹر تک لے جا چکے تھے۔ قبل از وقت پیدائش ایسا مسئلہ نہ تھا مگر ایک تو ساجدہ پہلے ہی وضع حمل میں کمزوری کا شکار تھی' دوسرا اس حادثے میں اس کا بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز پہلے ہی بتا چکے تھے کہ اس کے گرنے کی وجہ سے بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور وہ فوری آپریشن کر کے بچے کو بچا سکتے ہیں مگر ماں کی حالت نازک ہے اور اس کے بچنے کے چانسز کم ہیں۔

پروین کی ماں شمشاد ذرا پرے اپنی جیٹھانیوں کا ٹولہ لے کر کھڑی تھی اس کی شوکت جہاں سے کم بنتی تھی اس لیے بیٹی کو ساس کے ہمراہ آتے دیکھ کر اس نے ناک بھوں چڑھائی اور رواجی سی سلام دعا کے بعد الگ کھڑی ہو گئی۔

"نی رسولن! یہ سارا تعویذ گنڈوں کا اثر ہے۔ نوید چاہے مانے یا نہ مانے۔ بڑا سخت وار ہوا ہے۔ کسی موئے کا داؤ لگ گیا ہے۔"

وہ ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کس پہ شک ہے تجھے شمشاد بہن؟"

رسولن نے کن انکھیوں سے اس کی سمدھن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی تھوڑے ہیں مجھ سے جلنے والے۔ سارے زمانے کو آگ ہی لگی ہے شمشاد کے گھر کی۔ ساروں کو تپ ہے کہ اس کی بیٹی اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں بس کیسے گئی؟ روز لڑ جھگڑ کے میکے کیوں نہیں آ بیٹھتی؟ تب بھی بڑی تکلیف ہوئی تھی جب نوید نے اپنا مکان بنایا تھا اور جب میں اس کرموں والی کو بیاہ کے لائی تب تو سمجھو' حاسدوں کے اندر بھانبھڑ جل اٹھے۔ شادی پہ جو خرچا ہوا' جیسی دھوم دھام مچی' جیسی سوہنی ووہٹی آئی۔ ہائے ہائے مت پوچھ' کیسے میرا بچہ نظروں میں آ گیا۔ بدبخت کہاں کسی کو ہنستے بستے دیکھ سکتے ہیں۔ بس دبا گئے تعویذ میرے ویہڑے کی کیاری میں۔"

"تو نے کھود کے دیکھا تھا؟"

"اس کی کیا ضرورت؟ کیا مجھے پتہ نہیں؟ ایک زمانہ دیکھ رکھا ہے میں نے۔ سارا پتہ ہے کیسے لوگ اپنے اندر کی ساڑ (جلن) نکالتے ہیں۔"

"پر وہ تھا کون؟ کس سے تیری خوشیاں برداشت نہ ہوئیں؟"

"دو تین تو میرے شریکوں میں سے ہیں جو ہر وقت داؤ لگانے پہ تیار رہتے ہیں۔ محلے داروں میں سے بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ ساروں کو یہ کھٹکتا تھا کہ میری نوں (بہو) میرے آگے زبان کیوں نہیں چلاتی۔ اس نے آتے ہی مجھے اک پاسے (طرف) کیوں نہیں لگا دیا۔ باقی ساجدہ کے پیکوں میں سے مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ بھرجائی۔ نہ ماسی۔۔۔ نہ چاچی۔ اللہ کرم کرے۔ میں اپنی نوں اور پوترے کو صحیح سلامت گھر لے جاؤں' پھر حاضری دیتی ہوں بڑے پیر سرکار کے پاس۔ ایسا مکو ٹھپوں گی (بندوبست کروں گی) کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت مانگے گا شمشاد کے گھر تعویذ ڈالنے والا۔"

وہ سینہ ٹھونک کے اعلان کر رہی تھی۔ اس کی آواز بار بار جوش جذبات سے بلند ہو جاتی تھی اور آس پاس کے لوگ متوجہ ہو کے اس کی گفتگو میں دلچسپی لینے لگتے تھے۔ پروین نے اپنی ساس کے سامنے ماں کے اس طرز عمل پہ شرمندگی محسوس کی۔ شوکت جہاں کے لیے اندر زندگی اور موت کی جنگ لڑتی عورت ایک لحاظ سے اجنبی تھی مگر وہ آتے ہی وضو کرنے کے بعد اب تک متواتر نوافل پڑھ رہی تھیں تسبیح کر کے دعائیں مانگ رہی تھیں۔

پروین چپکے سے ان کے قریب سے اٹھی اور ماں کے پاس پہنچی۔ ساس سے بے حد محبت ہونے اور شادی کے بعد بھی اب تک اس سے دبنے کے باوجود وہ کبھی کبھار اس کی عادتوں پہ دبی دبی ناپسندیدگی ظاہر کر دیا کرتی تھی۔ شمشاد بی بی تو ہمیشہ سے ایسی تھی مگر ایک سلجھے ہوئے گھرانے کی بہو بننے کے بعد اور خصوصاً شوکت جہاں جیسی ساس کے ساتھ اتنے سال گزارنے کے بعد پروین کے مزاج میں بہت تبدیلی آ چکی تھی۔

"اماں! یہ کیا محفل سجا رکھی ہے۔ ادھر آ کے آرام سے بیٹھو۔"

اس نے سرگوشی کی۔ جواباً "اماں نے اپنی آواز کم رکھنے کا کوئی تکلف نہ کیا۔

"وہاں کدھر آ کے بیٹھ جاؤں۔ ایک تو تو ہر جگہ نون کا نقطہ ساتھ لیے پھرتی ہے۔"

اس نے کن اکھیوں سے تلاوت کرتی شوکت جہاں کو دیکھ کر کہا۔

"ایک تو تیری ساس منت کے لیے تھے اکیلا نہیں بھیج رہی۔ بلا کی طرح ساتھ چمٹی رہتی ہے۔ بھلا اس کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے بغیر ادھر کے کون سے کام رک جانے تھے۔"

"کمال کرتی ہو اماں! دنیا داری اور تعلق داری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے جو میری ساس کو نبھانا اچھی طرح آتا ہے۔ اور میں جانتی ہوں 'وہ کسی وجہ سے نہ آپاتیں' تب بھی تمہیں ہی سب سے پہلے اعتراض ہوتا۔ ایک تو وہ مارے محبت اور خلوص کے ساتھ چلی آئیں۔ اس پہ بھی باتیں بنا رہی ہو۔"

"تیری زبان نہیں تھکتی ساس کے گن گاتے ہوئے۔ سارے زمانے سے وکھری لڑکی پیدا کی ہے میں نے۔ اوروں کی لڑکیاں میکے آ کے ماؤں سے دکھ سکھ کرتی ہیں۔ اپنی ساس کے رونے روتی ہیں۔ ایک یہ شہزادی ہے ساس کے پیچھے ماں سے لڑنے بیٹھ جاتی ہے۔"

"میں لڑ نہیں رہی' صرف اتنا کہہ رہی ہوں 'اس طرح راستے کے درمیان کھڑے ہو کر جھمگٹا لگا کر بیٹھنا اس موقع پہ اچھا نہیں لگ رہا۔ بے چاری ساجدہ کی کیا حالت ہے۔ اس بارے میں تو سوچو۔ میری ساس کے پاس نہیں بیٹھنا تو بے شک مت بیٹھو۔ جا کر بھائی جان نوید کو ہی تسلی دو۔ دیکھو' کیسے رنگ اڑا ہوا ہے ان کا۔"

اس نے صرف آواز دبا کے کہنے پہ ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ماں کو بازو سے تھام کر بھائی کے نزدیک لے بھی آئی۔

"میرا لعل...... میرا بچہ...... تجھے خوشیاں راس نہ آئیں۔"

اس نے نوید کا سر سینے سے لگا کر واویلا مچانا شروع کر دیا۔ تلاوت میں مشغول شوکت جہاں نے ذرا کی ذرا آنکھ اٹھا کے ایک ناپسندیدہ نگاہ اس جانب ڈالی اور پھر تاسف سے سر ہلا کے دوبارہ تلاوت کرنے لگیں۔

"ہائے ہائے' ابھی تیرا گھر بسے وقت ہی کتنا ہوا تھا۔ حاسدوں سے برداشت نہ ہوا۔"

اس کی تان آ جا کے یہیں ٹوٹ جاتی۔

"بے چارہ میرا بیٹا کیسے برداشت کرے گا۔ اتنا سا تھا جب باپ کا سایہ اٹھا' گڈیاں اڑانے' کنچے کھیلنے کی عمر میں کام دھندا کرنے لگا۔ لڑکا سا تھا جب بہن کو شان سے بیاہا' گھر بنایا۔ ساری ذمہ داریاں پوری کر کے جب اپنی گرہستی بسانے کا وقت آیا تو...... ہائے ہائے...... قسمت دغا دے گئی۔"

پروین کا دل چاہا' ایک جھٹکے سے ماں کو بھائی سے الگ کر دے۔ یا اس کے منہ پہ ہاتھ ہی رکھ دے۔

"توبہ' دیکھے ہیں ڈرامے اس شمشاد کے۔" اس کی پکی سہیلی' نزدیکی ہمسائی رسولن نے ثریا کے کان میں پھونکا۔

"نری نحوست پھیلا رکھی ہے۔ کیسی کیسی باتیں کر رہی ہے۔ یہ نہیں کہ بیٹے کو تسلی دے۔ الٹا کچھ ہونے سے پہلے ہی اسے ڈرا رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جن تعویذ گنڈوں کا رونا یہ رو رہی ہے۔ یہ ہو نہ ہو' اسی نے ساجدہ پہ ڈالے ہوں گے۔ ورنہ سوچنے والی بات ہے۔ شریک شمشاد کے اور وار اس کی نوں پہ کریں گے؟ ان کا بس چلتا تو شمشاد کی ہی نہ چکی مروڑتے' پر یہ ساری حیاتی بھلا کس کے قابو آئی ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہے تو رسولن! بڑی بی بی بچی ہے یہ ساجدہ۔ کبھی اس کی اونچی آواز نہیں سنی مگر اس سے بھی شمشاد کو سو شکایتیں تھیں۔ سب سے بڑی خار تو یہ تھی کہ نوید زنانی کا مرید بن گیا تھا۔ اسے بڑی تکلیف تھی کہ نوید آخر پورے سال میں ایک دفعہ بھی زنانی سے لڑا کیوں نہیں۔ اس کی گت کیوں نہیں پٹی' میں نے تو کہا بھی کہ اب کیوں روتی ہے۔ اتنی ہلکی عمر کی اور اتنی سوہنی وہٹی لانے کی ضرورت کیا تھی۔ اب بھگت' پر وہ شمشاد ہی کیا جو بھگت لے۔ وہ تو بھگتانے والوں میں سے ہے۔ جس بڑے پیر سرکار کا نام لے رہی ہے اسی کے تعویذ اس نے ساجدہ کا پتا صاف کرانے کے لیے خود اپنی کیاری میں دبائے ہوں گے۔"

دونوں اپنے اپنے ماہرانہ تجزیے بیان کر رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"مونا ڈارلنگ!"

منزہ کے کانوں کے قریب یہ گنگناہٹ ابھری تو اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر گئی۔ وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ آخری ہاتھ لگا کر اس نے آٹے کو کپڑے سے ڈھانپا اور دو قدم آگے بڑھ کے سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔ مظہر بھی اس کے پیچھے سائے کی طرح لگا آگے بڑھ آیا۔

"مونا ڈارلنگ...... سویٹ ہارٹ...... جان من!" وہ مسلسل اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔

منزہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی اور پیچھے مڑ کے اسے مصنوعی ناراضی سے دیکھنے لگی۔

"پھر وہی حرکت؟ آپ باز نہیں آئیں گے۔"

"پھر اتنی خوبصورت؟ تم باز نہیں آؤ گی۔"

"اف' کتنا مشکل ہے آپ کو سمجھانا۔"

"اف' کتنا مشکل ہے تم پر سے نظر ہٹانا۔"

"اب آپ یہاں سے جائیں گے یا نہیں؟"

"اب تم میرے پاس آؤ گی یا نہیں؟"

"شام کے سات بجنے والے ہیں' مجھے کھانا تیار کرنا ہے۔ روٹیاں پکانی ہیں۔ امی کے لیے سویاں بنانی ہیں۔ انہوں نے کھانا کھانے سے منع کیا ہے۔ ابھی میں کیسے آ سکتی ہوں۔"

"شام کے سات بجنے والے ہیں' مجھے تمہیں حال دل بتانا ہے۔ کچھ تمہارے دل کا سننا ہے۔ تمہیں یہ بتانا ہے کہ اس گلابی سوٹ میں تم کس قدر خوبصورت لگ رہی ہو۔ ابھی میں اکیلا کیسے رہ سکتا ہوں؟"

وہ مسلسل اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتا' اسی کی باتیں اس پہ لوٹا رہا تھا اور وہ زچ ہو رہی تھی۔

"دو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں یہ بات سمجھاتے ہوئے مگر مجال ہے جو آپ سمجھ جائیں۔"

تنگ آ کر اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور سارا غصہ سبزی پہ نکالنے لگی۔ اسے بے دردی سے چھیلتے کاٹتے ہوئے وہ بڑبڑا رہی تھی۔ مظہر سے لاکھ محبت رکھنے' اور اس کی محبت پہ نازاں رہنے کے باوجود کبھی کبھار وہ اس کی دیوانگی' بالفاظ دیگر ڈھٹائی سے عاجز آ جایا کرتی تھی۔

"کتنی بار کہا ہے کہ امی کو پسند نہیں آپ کا یوں سارے گھر میں میرے پیچھے پیچھے منڈلانا۔ وہ بغیر کسی لحاظ کے سب کے سامنے ہی شروع ہو جاتی ہیں۔ بے شرمی اور بے حیائی کا طعنے سنتے ہوئے اس قدر شرم محسوس ہوتی ہے مگر آپ باز نہیں آتے۔ حالانکہ آپ کو اپنے گھر کا ماحول مجھ سے بہتر سمجھنا چاہیے۔"

وہ ساس کی شکایتیں کرنے میں حد درجہ محتاط رہا کرتی تھی' مگر کبھی کبھار مظہر اسے برداشت کی حد تک توڑنے پہ مجبور کر دیتا تھا۔ اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس کم ہوتا تھا' یوں بھی وہ صبح نو بجے گھر سے نکلتا تو شام چھ ساڑھے چھ بجے لوٹتا۔ جو بھگتنا ہوتا۔ بے چاری منزہ کو ہی بھگتنا پڑتا۔ اگر وہ اس کی مکمل تفصیل کبھی اسے بتا دیتی تب اسے احساس ہوتا۔ مگر اس احساس کے نتائج خاصے خوف ناک نکلتے۔

وہ اپنی حرکتیں تو کیا چھوڑتا اور کیا خاک احتیاط کرتا۔ البتہ آستینیں پلٹ کے ماں اور بہن پہ ضرور چڑھ دوڑتا۔ اس کی چہیتی بیوی کی آنکھ میں آنسو لانے کے جرم میں' اور ان سب سے اس کا بڑا جی گھبراتا تھا۔ یوں تو ہفتے میں دو تین بار بھائی بھائی میں' باپ بیٹے میں۔ میاں بیوی میں۔ ماں بیٹے میں۔ بہن بھائی میں۔ تو تو میں میں ہو ہی جایا کرتی تھی۔ چونچیں لڑانے کا سارے خاندان کو خبط تھا مگر کسی تنازعہ کی وجہ وہ بنے یہ اسے منظور نہ تھا۔ وہ جانتی تھی جب کبھی اس کی لاکھ احتیاط کے باوجود ایسا ہو جاتا ہے تو اس کی ذات کس کس طرح گھسیٹی جاتی ہے۔ اس کے

مرحوم والدین تک کو نہیں بخشا جاتا۔ اور پھر جس طرح مظہر بیاری کی طرح ماں کے سامنے زبان چلاتا تھا۔ ایسے آپ کو کوستے اور بددعا ... رہتا ... اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتا۔ ایسے میں مظہر کے اس رویے کو تو نہیں جانتا تھا۔ وہ تو جس مظہر کی دیوانی تھی۔ وہ ایک سلجھا ہوا روشن خیال مہذب تعلیم یافتہ نرم خو اور محبت کرنے والا نوجوان تھا۔

"تمہیں سارے زمانے کی پروا ہوتی ہے سوائے میرے۔ فلاں کو برا نہ لگ جائے فلاں ناراض نہ ہو جائے کبھی میرے بارے میں سوچ کر ڈر نہیں لگا کہ کہیں تمہاری اس حرکت پر میں ناراض نہ ہو جاؤں۔ میں یعنی کہ تمہارا مجازی خدا۔ تمہارا سر تاج؟"

"نہیں کیونکہ میں جانتی ہوں' آپ مجھ سے خفا ہو ہی نہیں سکتے۔"

اس کے لہجے میں اس کی پراعتماد مسکراہٹ میں اور اس کی آنکھوں میں مان ہی مان بھرا تھا۔ مظہر کی محبت کا مان۔

"اور اگر ہو گیا تو...؟ سوچ لو۔"

"میں نے کہا ناں' ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" اس نے چولہا جلایا اور دیگچی اوپر چڑھا دی۔

"ہو بھی سکتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

"آپ مجھے دھمکا رہے ہیں۔"

"نہیں' ذہنی طور پر تیار کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کبھی میں تم سے اتنا ناراض ہو جاؤں کہ تمہارے ہزار منانے کے باوجود نہ مانوں' عمر بھر کے لیے تم سے منہ پھیر لوں۔"

پتہ نہیں وہ واقعی اپنی خفگی کی دھمکیاں دے رہا تھا یا پھر اسے ستانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو بھی تھا۔ منزہ کو ایک دم اپنا دل ڈوبتے ہوئے محسوس ہوا۔ وہ تڑپ کے پلٹی۔ ہاتھ میں پکڑا کفگیر دیگچی سے ٹکرایا۔ اور وہ دیگچی جس میں اس نے گرم تیل میں پیاز سرخ ہونے کے لیے چڑھا رکھی تھی۔ الٹ کے اس کے دائیں بازو پہ گری۔ شکر ہے کہ تیل اتنا گرم نہیں تھا کہ اس کے بازو کی نازک جلد جھلس کر رہ جاتی پھر بھی مظہر نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام کے بازو ٹھنڈے پانی کے نل کے نیچے رکھا۔ وہاں ایک گہرا سرخ دھبہ نظر آ رہا تھا۔ اور منزہ کی نگاہوں میں بے پناہ درد۔

"دھیان سے کام کیا کرو یار! دیکھو جلا لیا ناں خود کو۔ بہت درد ہو رہا ہے۔"

مظہر اس کی نگاہوں سے جھلکتے گلہ آمیز درد کی حقیقت سے واقف تھا' اس کے باوجود دانستہ انجان بن کے پوچھا۔

"ہاں۔ بہت درد ہو رہا ہے مگر آپ کو کیا؟ درد دینے سے پہلے سوچنا تھا۔ شرم تو نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔"

بہت ضبط کرتے ہوئے بھی اس کے آنسو چہرے پہ پھیل گئے۔

"یار! تم چاہتی کیا ہو؟ کیا میں ہر وقت شرماتا رہوں؟ جب دیکھو مجھے شرم نہ آنے کے طعنے دیتی رہتی ہو۔ تم سے پیار جتاتے ہوئے شرم کروں۔ اپنی وفا کا یقین دلانا ہو تو شرم کروں' تمہاری تعریف کرنی ہو تو شرم کروں' آخر کتنی شرم کروں۔ میں شرمیلا نیگو رن جاؤں یا پھر لاج ونتی؟"

وہ اس کی توجہ اپنے الفاظ سے ہٹانے کے لیے ادھر ادھر کی ہانکنے لگا۔ اس کا نتیجہ حسب خواہش نکلا۔ باوجود اس سے ناراض ہونے کے وہ ہنس پڑی۔

"یہ ہوئی ناں بات۔ اب لگ رہی ہو میری موٹا ڈارلنگ! اس پیارل سے چہرے پہ شبنم کے قطرے بھلے لگتے ہیں جان' آنسو نہیں۔ اور خبردار جو کبھی میرے سامنے' میرے ہوتے ہوئے' میری زندگی میں کبھی تم نے آنسو بہائے تو... سمجھیں...۔"

وہ اس کے آنسو صاف کر رہا تھا جب شمیم نے اپنی اچانک قسم کی انٹری دی۔ ویسے وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار بھی کچن میں نہیں جھانکتی تھی مگر اپنی بے چین فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جب مظہر بیوی کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آتا تھا تب اس کا چھاپہ مارنا ضروری ہوتا تھا۔

"توبہ۔ ادھر تو جب دیکھو قسم چپکی رہتی ہے۔" اس نے سٹپٹا کے پلٹنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ جیسے کوئی بہت ہی واہیات منظر دیکھ لیا ہو۔ منزہ گھبرا کے پیچھے ہٹی۔ مظہر نے بھی برا سا منہ بنا کے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"امی! خود ہی آ کے دیکھ لو۔ کتنا دودھ ہے اور کتنا نہیں۔ میں تو نہیں جا سکتی اندر۔"

اس نے کچن کے دروازے پہ کھڑے کھڑے ماں کو آواز دی۔

"کیوں' اندر کرفیو لگا ہوا ہے۔ یا تیرے جانے پہ پابندی ہے؟ کون پیدا ہوا ہے تجھ پہ پابندیاں لگانے والا۔ دو وقت ہانڈی پکانے سے کوئی باورچی خانے کا مالک نہیں بن جاتا۔"

نصرت حسب عادت اپنی مرضی کے مطلب نکالتے ہوئے زور زور سے بولتی اس طرف آئی۔ منزہ کو اچانک اپنی کلائی پہ جلن کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ ڈبڈبائی نظروں سے اس نے مظہر کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہاں سے جانے کی التجا کی جسے وہ نظرانداز کر گیا۔ اچھی طرح جانتا تھا' اس وقت یہاں سے کھسک لینے کا مطلب ہے۔ منزہ کو اپنی ماں اور بہن کے نرغے میں نہتا چھوڑ دینا۔

"کیا بات ہے؟ کس نے منع کیا ہے اندر جانے سے؟" نصرت نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

"زبان سے تو منع نہیں کیا' لیکن جس بے حیائی کے ساتھ یہ دونوں ہر وقت اور ہر جگہ رومانس لڑتے پھراتے ہیں۔ اس کے بعد مجھ جیسی شریف لڑکی تو کمرے میں بند ہو کے ہی گزارا کر سکتی ہے۔ توبہ۔ نہ کوئی لحاظ' نہ شرم۔ نہ خوف خدا۔ گھر میں چھوٹے بڑے سب موجود ہیں اور یہ... یہ تو جب دیکھو طوطا مینا بنے رہتے ہیں۔ کسی شریف گھر کی لڑکی ہوتی تو اتنا سوچتی کہ گھر میں بوڑھا سسر' جوان دیور اور کنواری نند موجود ہے۔ کوئی بھی کسی وقت اندر آ سکتا ہے۔ کیا عزت رہ جائے گی میری ان سب کی نظروں میں۔؟ مگر اسے عزت کا احساس ہوتا تو رونا کس بات کا تھا۔"

"عزت کا احساس کرنے والی ہوتی تو آنکھ مٹکا کر کے لڑکے کیسے پھنساتی۔" نصرت نے نفرت سے اسے دیکھا۔

"بس...!" مظہر نے دخل دیا۔ "بہت ہو گیا۔" شمیم کو عادت ہے بات بڑھا چڑھا کے بیان کرنے کی۔ اور آپ ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتی ہیں۔ پہلے جان تو لیں کہ اصل بات کیا ہے۔ بغیر کسی وجہ کے شور مچا دیا ہے۔"

"اس بد ذات چھوٹے گھر کی لڑکی سے کیا گلہ' جب میرا اپنا بیٹا ہی بے دید ہو چکا ہے۔ اس بے شرم کی صحبت میں اس کے دیدے بھی ڈھل گئے ہیں۔ کیسے ماں کو لال لال ڈیلے نکال کے گھور رہا ہے۔"

"اور ابھی جب بیوی کو دیکھ رہا تھا تب پوز دیکھنے والے تھے۔ لگ رہا تھا جیسے کھڑے کھڑے قربان ہو رہا ہو اس حسن بانو پہ۔ واری صدقے جا رہا تھا۔" شمیم حسد سے چور چور لہجے میں بولی۔

"مظہر ذرا دیکھنے' سوہا کمرے میں اکیلی ہے۔"

منزہ نے اسے یہاں سے بھیجنا چاہا تاکہ بات آگے نہ بڑھے۔ مگر اس کا بھی الٹا مطلب نکالا گیا۔

"بس بچے سنبھالنے پہ لگا دو اس جوان مرد کو یا پھر اپنے چونچلے اٹھوانے میں مصروف رکھو۔ کیسی سیکھ رکھا ہے تم نے میرے اچھے بھلے بیٹے کو گھر گھسنا بنا کے رکھ دیا ہے۔ یا تو تمہارے ناز نخرے اٹھاتا رہتا ہے یا اس بچی کو گود میں اٹھا کے پھرتا رہتا ہے۔ جسے تو نے تین سالوں میں پیدا کر کے بڑا معرکہ انجام دیا ہے۔ اور دوں کو تو جیسے بیویاں ملتی ہی نہیں ہیں۔ نہ ان کے اولادیں ہوتی ہیں' اسی لیے ان کے دماغ نہیں الٹتے۔ بس ایک یہ زمانے سے نرالا ہے جسے ترس ترس کے عورت ملی ہے اور وہ سوکھی سڑی بچی' ان دونوں کو ہی چومتا چاٹتا رہتا ہے۔"

نصرت کی زبان برداشت سے باہر ہو گئی تو مظہر نے بھی لحاظ کا دامن چھوڑ دیا۔

"شرم تو آپ کیجیے۔ اپنی عمر کا لحاظ نہیں رہا۔ چلو منزہ تو غیر ہے۔ بہو ہے اس لیے نظروں میں کھٹکتی ہے۔ اب اپنی ہی پوتی کو بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا ہے۔ میں اپنی اولاد کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا۔"

"ہائے ہائے بڑی اولاد پیدا کی ہے۔ تیری اس مہارانی نے بچوں کے ڈھیر نہیں لگا رکھے جو منہ بھر بھر کے اولاد

کہہ رہا ہے۔ تین سالوں میں ہاتھ بھر کی چھوکری پیدا کی ہے۔ وہ بھی غلطی سے ہوگئی ہوگی ورنہ ایسی عورتوں کو گھر بنانے یا خاندان بنانے سے کیا مطلب۔ یہ تو عیش کرنے دنیا میں آتی ہیں؟ ایک مرد چاہیے ہوتا ہے انہیں ہروقت موج مزے کے لیے۔"

نصرت کے طعنوں کا رخ آج کل ہمیشہ اسی جانب مڑجاتا تھا کہ تین سال کے عرصے میں وہ کوئی بیٹا کیوں نہیں پیدا کرسکی۔

"حد ہوتی ہے بدزبانی کی بھی۔"

"ماں کو بدزبان کہہ رہا ہے۔ بے غیرت۔۔۔"

"یہ عشق میں اندھا ہوچکا ہے امی، اسے اب غیرت سے کیا مطلب؟" شمیم نے بڑھاوا دیا۔

"تم اپنی بکواس بند کرو۔ یہ تم ہو آگ لگانے والی۔ ایسا کون سا غضب ہوگیا تھا جو امی کو آوازیں دے دے کر بلالیا۔ فسادن۔"

وہ بہن کو جاہل عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر طعنے دینے لگا۔ منزہ کو اس منظر سے گھن محسوس ہوئی۔ اس نے اپنا رخ تبدیل کرلیا اور اس سارے جھگڑے سے لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے دوبارہ سے پیاز کاٹ کر ہنڈیا چڑھانے لگی۔

"میں فسادن ہوں؟ آگ لگاتی ہوں؟ آگ تو تمہاری اس معشوقہ کو لگی ہوئی ہے۔ دیکھو امی، کہہ رہا ہے ایسا کیا غضب ہوگیا ہے۔ اس کے لیے تو یہ کوئی بات ہی نہیں اور مجھ سے پوچھو کیسے پیروں تلے زمین کھسک گئی تھی۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر۔"

منزہ کو اپنا آپ پستی کی گہرائیوں میں گرتا محسوس ہوا۔ اس نے اس سختی سے لب دانتوں تلے دبائے کہ وہاں سے خون رسنے لگا۔

"اور کیا، میری معصوم حیادار بچی۔۔۔ تم لوگوں کو یہ عاشقی معشوقی والے کھیل کھیلنے ہوتے ہیں تو اپنے کمرے میں جاکے کھیلا کرو اپنی بیٹی کے سامنے۔ اس کو برباد کرو۔ میری بچی کا دماغ کیوں خراب کرتے ہو، مظہر، تجھے اتنا خیال نہیں آتا کہ کنواری جوان بہن کے سامنے، توبہ توبہ۔۔۔ اس شرموں والی کا کیا حال ہوا ہوگا۔"

منزہ کا جی چاہا، وہ چیخ چیخ کر ماں اور بھائی کو اس "شرموں والی" کنواری کے کرتوت بتائے۔ سارا دن بند کمرے میں وہ سی ڈی پلیئر پہ کیا کچھ دیکھتی ہے۔ لمبی دوپہروں میں ٹیلی فون پہ کون سی دوستیاں نبھاتی ہیں۔ سب کچھ بتائے مگر وہ نہ ایسا کرسکتی تھی نہ کرنے کی ہمت پائی تھی۔

"بات کا بتنگڑ بنانا کوئی اس شمیم سے سیکھے۔ یہی کرتوت تو اس کا گھر نہیں بسنے دے رہے۔ پتہ نہیں کب جان چھوٹے گی اس بلا سے۔"

مظہر اسے خونخوار نظروں سے گھورتا کچن سے نکل گیا اور وہ سینے پہ دو ہتھڑ مارتی اونچی آواز میں روتے ہوئے ماں سے لپٹ گئی۔

"دیکھا امی۔۔۔ کیا کچھ کہا۔ مظہر نے۔ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ جسے میں نے گودوں کھلایا ہے، لاڈ اٹھائے ہیں۔"

جذبات میں وہ اتنا سب کہہ گئی ورنہ اول تو وہ کسی کے سامنے آسانی سے تسلیم نہ کرتی تھی کہ وہ مظہر سے عمر میں بڑی ہے اور جو لوگ جانتے تھے انہیں بڑے آرام سے جھٹلادیا کرتی کہ کوئی خاص فرق نہیں، اوپر تلے کے ہیں ہم دونوں۔"

"آج یہی مجھے طعنے دے رہا ہے۔ گھر نہ بسنے کی بددعائیں دے رہا ہے۔ مجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔"

"تو کیوں دل پہ لیتی ہے، وہ تو اندھا ہوچکا ہے اس۔۔۔ کے عشق میں۔۔۔" نصرت نے بلاتکلف موٹی سی گالی دی۔

منزہ سلیب پہ گرا تیل صابن لگے کپڑے سے صاف کرتی رہی۔ اس نے بے حسی کا فن نیا نیا سیکھا تھا اور آج کل وہ اسی کی کڑی پریکٹس کرتی رہتی تھی۔

"بہن کو شادی نہ ہونے کا طعنہ تو دے دیا بے غیرت نے مگر یہ نہ سوچا کہ یہ اس کی شرافت ہے، اگر وہ بھی تیری بیوی کی طرح باہر نکل کر، کالجوں میں پڑھ کے پڑھے لکھے، اچھی نوکری پہ لگے کاٹھ کے الوؤں سے دیدے چار کرنے والی ہوتی تو آج تیرے سے پہلے اس کا گھر بسا ہوتا۔ مگر میں نے اپنی لڑکی کو یہ تربیت نہیں دی۔ ایسی شریف بہن بیٹیاں گھر بیٹھی چبھتی نہیں۔ وہ ایسی ہوتی ہیں، جنہوں نے زمانے میں تھرتھلی مچا رکھی ہوتی ہے اپنے کرتوتوں سے اور جن کے گھر والے بدنامی کے خوف سے انہیں چار کپڑوں میں رخصت کرواتے ہیں۔"

ایک ہی سانس میں اس نے منزہ کو کالج میں پڑھنے، مظہر سے پسند کی شادی کرنے اور جہیز نہ لانے کے پہارے طعنے دے ڈالے اور کچھ ہلکی پھلکی ہو کر شمیم کے ساتھ کچن سے نکلی۔ منزہ نے ایک گہری سانس بھر کے خود کو پرسکون کرنا چاہا۔ مگر ناکام رہی۔ ایک پھانس سی سینے میں اٹک رہی تھی۔ اس نے پورا دھیان لگا کے کھانا پکانا شروع کردیا۔ عموماً وہ کھانا پکانے کے دوران تین چار بار کمرے کے چکر لگالیا کرتی تھی کہ ایسا کرنے کی مظہر کی خاص تاکید ہوتی تھی۔ لیکن آج اس نے پوری طرح کچن میں مصروف رہنے کی کوشش کی، یہ ایک طرح سے مظہر سے اظہار ناراضی تھا۔ وہ کتنی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ اسے نند کی تنقید اور ساس کے طعنے اتنے برے نہیں لگتے جتنا، مظہر کا اس کی خاطر ان لوگوں سے جھگڑا کرنا اس کا دل دکھانے کا باعث بنتا ہے اور وہ ہر بار ایسا نہ کرنے کا وعدہ کرنے کے بعد پھر یہی کچھ کر ڈالتا تھا۔

مصروف رہنے کے لیے اس نے نصرت کے لیے سویاں بنانے کے بعد میٹھے میں کسٹرڈ بھی بنا ڈالا۔ سلاد بھی دیر تک محنت سے سجائی اور دو طرح کی چٹنی تیار کی۔

پورے سوا آٹھ بجے وہ تھک کے چور، پسینے میں شرابور کچن سے نکلی۔ کمرے کا دروازہ کھلتے ہی تیز پرفیوم کی مہک نے اس کا استقبال کیا۔ بیڈ پہ سوہانیے وائٹ اور پنک فراک میں ملبوس ہم رنگ جرابیں اور سفید شوز پہنے۔ گالی کلپ لگا کے پونی ٹیلز بنائے بیٹھی تھی۔ یقیناً "اسے مظہر نے تیار کیا تھا۔ منزہ نے اس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، وہ بھی نک سک سے درست آئرن اسٹینڈ کے نزدیک کھڑا تھا۔ آفس سے آنے کے بعد وہ عموماً" آرام دہ شلوار قمیص پہن لیا کرتا تھا۔ علاوہ اس دن کے جب ان کا آؤٹنگ کا پروگرام ہوتا۔ اس وقت وہ تازہ کی شیو کے ساتھ گرے پینٹ اور گرے لائننگ والی وائٹ شرٹ میں تیار کھڑا اس کا سوٹ پریس کررہا تھا۔

"اب یہ کون سا نیا ڈرامہ ہے؟"

"ہم ڈنر کے لیے باہر جارہے ہیں۔"

"شوق سے جائیے۔" وہ بھنا کے بیڈ پہ گرگئی اور تکیہ درست کرکے لیٹنے کی تیاری کی۔

"شوق سے ہی جارہے ہیں۔" وہ آگے بڑھ کے اسے اٹھانے لگا۔

"جلدی کرو، تمہارا بلیک اور گرے سوٹ نکال کر پریس کردیا ہے۔ کیا ہے یار۔۔۔ اتنا کھنگالا کوئی وائٹ اور گرے سوٹ ہی نہیں ملا تمہارا، ورنہ دونوں میچنگ ڈریسز پہنتے۔ چلو، ہری اپ۔ بارہ بج رہے ہیں تمہاری شکل پہ، صرف منہ ہاتھ دھونے سے کام نہیں بنے گا۔ شاور لے لو۔ فریش ہوجاؤ گی۔"

اس کے قطعی انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے منزہ کا کوئی بہانا نہیں چلے گا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے وہ اٹھ کے بیٹھ گئی البتہ چہرے سے موڈ کی خرابی اب تک ظاہر ہورہی تھی۔

"اگر باہر ڈنر کا موڈ تھا تو کم از کم مجھے بتا تو دیتے۔ میں اتنا اہتمام نہ کرتی۔ جو امی نے کہا تھا بس اتنا کرتی۔"

"ہاں سوچا تھا مگر۔۔۔" وہ کان کھجانے لگا۔ "تم سے ڈر لگتا ہے یار۔"

"ہاں۔ بڑی خونخوار ہوں ناں میں۔ پنجے مارتی ہوں۔" وہ ڈرنے کی اس ایکٹنگ پہ چڑ گئی۔ یہی طعنے تو سارا دن سنتی تھی کہ شوہر اس سے دبتا ہے۔ یہ حقیقت تو صرف وہی جانتی تھی کہ مظہر اس کی محبت میں لاکھ دیوانہ سہی مگر کرتا اپنے دل کی تھا۔ وہ لاکھ کچھ سمجھائے، وہ اپنی بات پہ اڑا رہتا۔

"آپ کیوں کرتے ہیں ایسا؟"

"میری قسمت تو شروع سے خراب رہی ہے۔ بچپن سے محنت مزدوری کرنی پڑی، جوانی گل گئی، مشقت کرتے ہوئے بندہ ملا تو ایک سے ایک نکھٹو۔ سارے کچے شہدے ایک بھی کام کا ملا ہوتا تو زندگی سنور گئی ہوتی۔ چلو اور کچھ نہیں تو بڑھاپا ہی سنور جاتا اگر لڑکی ہی کام کی پیدا ہوئی ہوتی۔ میرے ساتھ کی زیبا، نمو اور مہو کو دیکھو۔ چار پانچ سے کم لڑکیاں کسی کی پیدا نہیں ہوئیں۔ ایسا اللہ کا فضل رہا۔ چار پانچ میں سے دو تین اچھے "ٹک" تو نکل ہی آتے ہیں اور نمو کی تو چاروں کی چاروں چھپائی کا مال۔ گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں اس کے دروازے کے سامنے اور ہمارے۔۔۔ سائیکلوں، رکشوں والے۔ سارے مفت خورے۔ پانچ سو ہزار کی عیاشی کرنے والے۔ مصیبتوں سے یہ ایک پارٹی ہاتھ لگی ہے اور اس پہ بھی رانو کے نخرے۔ بیٹھ کے کھانا پسند ہے اسے۔ ارے شریف زادیوں والے چھچھن۔"

کمرہ ٹھیک حالت میں لاتے لاتے پتہ نہیں کب تک اس کی بڑبڑاہٹ جاری رہتی کہ برابر کے کمرے میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی پہ اسے باہر نکلنا پڑا۔

جب فون سن کر دوبارہ کمرے میں آئی تو رینا باتھ روم سے آچکی تھی اور اب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔

"چھب تو اچھی ہے۔ سانچے میں ڈھلا جسم ہے۔"

پیچھے سے اس کا عکس اور سراپا جانچتے ہوئے شمع نے ناقدانہ انداز میں سوچا۔

"اصغر کا فون آیا تھا، آج آنے کا کہہ رہا تھا۔ مگر میں نے منع کر دیا کہ رانو کی طبیعت ٹھیک نہیں، کل آنا۔"

"کل کیوں؟ دو چار دن کے لیے ٹال دینا تھا۔"

رینا نے اصغر کے نام پہ ناک چڑھائی۔ اس کی ماں کی رائے اس کے بارے میں جو بھی رہی ہو۔ اس کا ذوق اور پسند اس کی نظر میں خاصے بلند تھے۔ اصغر جیسا گاؤدی، واجبی سی شکل وصورت اور معمولی تعلیم یافتہ لڑکا اس کی نظروں میں نہ جچتا تھا۔ جسے نہ بات کرنے کی تمیز تھی نہ عشق جھاڑنے کا سلیقہ، تعریف بھی کرتا تو اس انداز میں کہ رینا کا دل اسے کس کے طمانچے مارنے کو چاہتا۔

"کس لیے ٹال دیتی؟ رزق کی دشمن! پہلے کون سا لائنیں لگی رہتی ہیں تیرے عاشقوں کی جو میں اسے بھی چلتا کروں۔"

"زہر لگتا ہے مجھے۔ الو۔۔۔"

"یہ الو ہی ہمارے دانے پانی کا وسیلہ بنتے ہیں۔ کسی سیانے کو کیا پڑی ہے۔ جو ادھر وقت ضائع کرے۔"

اس نے دبے الفاظ میں اسے اس کی کم مائیگی کا احساس دلانا چاہا۔ وہ خود اپنے وقت کی قتالہ تھی۔ اب بھی جسم ضرور بھاری ہو کے ڈھل گیا تھا، مگر رنگ روپ وہی تھا۔ سرخ وسفید۔ چمک دار، اور بڑی بڑی شربتی آنکھیں بھورے لمبے بال۔ جو اب اتنے گھنے نہ رہے تھے اور ڈائی افورڈ نہ کر سکنے کی وجہ سے مہندی سے بار بار رنگنے کے بعد ان کا شہد رنگ بھی کہیں چھپ گیا تھا۔ پھر بھی اپنے آگے اسے اپنی ہی اولاد بھی نہ جچتی تھی۔ رینا، جس کا اصل نام تو زرینہ تھا اور جو ماں کے لیے رانو تھی۔ مگر خود کو وہ رینا کہلانا پسند کرتی تھی۔ کوئی بہت گئی گزری صورت والی لڑکی بھی نہ تھی۔ ہاں ماں کی طرح رنگ اتنا گورا نہ تھا، بچپن میں تو اچھا خاصا پکا رنگ تھا۔ لڑکپن اور پھر جوانی کے آتے آتے شمع نے مختلف ٹوٹکوں کے ذریعے خاصا صاف کر دیا تھا۔ نقش تیکھے تھے اور سانولے چہرے کے نمک کے ساتھ اور بھی کٹیلے لگتے مگر کوئی بھی نقش اپنی جگہ بے مثال نہ تھا۔ نہ آنکھیں شربتی، نہ نیلی۔ نہ جھیل کی آب نہ کٹاؤ دار۔۔۔ نہ گلاب کی پنکھڑی سے۔۔۔

نہ رخساروں پہ گھیرے بھنور بنتے تھے نہ ہی مسکراہٹ کوئی بہت گدگدانے یا دل لبھانے والی تھی۔

پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ ویسے تو دس جماعتیں پڑھ رکھی تھیں مگر ڈائجسٹ اور ناول پڑھنے کا چسکہ تھا اس

یہ سب جاننے کے باوجود وہ ایک بار پھر اسے سمجھانے سے خود کو روک نہ سکی۔

"سوری کہہ تو رہا ہوں، بس پتہ ہی نہیں چلتا، کوئی مجھے کچھ کہے۔ برداشت کر سکتا ہوں مگر تمہیں برا بھلا کہے تو میں پاگل ہونے لگتا ہوں۔ تمہاری آنکھ کا ایک آنسو میرا سارا ضبط، ساری برداشت بہا کے لے جاتا ہے۔"

"آپ کی یہ محبت مجھے بڑا خوار کرتی ہے۔" وہ بے بسی سے مسکرا دی۔

"کان پکڑ کے، معافی مانگ لوں؟ کہو تو۔۔۔ سب کے سامنے ایک پیار بھرا گیت گنگنا کے مناؤں اپنی موٹا ڈارلنگ کو۔" وہ چڑانے لگا اور وہ چڑ گئی۔

"ہاں، تاکہ جو کسر رہتی ہے، وہ پوری ہو جائے۔ میرا نہیں تو سوہا کا خیال کر لیں۔ وہ بڑی ہو رہی ہے۔ ایسی باتوں کا اس پہ برا اثر ہو گا۔"

"اچھا بابا! اب استانی جی کا چغہ اتارو اور میری ڈارلنگ کے لبادے میں آجاؤ۔ اس اسٹائلش سے بلیک اور گرے سوٹ میں، لائٹ سا میک اپ کر کے بلیک اسٹونز والی جیولری پہن کے، یہ کالی گھٹائیں کھلی چھوڑ کے، میرے ساتھ باہر چلو اور جلنے والوں کے اندر شعلے بھڑکا دو۔"

منزہ جانتی تھی۔ وہ ایک گھنٹہ مزید بھی لیکچر دے گی تب بھی وہ بدلنے والا نہیں۔ اس لیے خاموشی سے اٹھ کے واش روم چلی گئی۔

☆ ☆ ☆
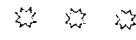
"رانو، اٹھ جا اب شام ہو چلی ہے۔"

"اوہو کتنی بار کہا ہے مجھے رانو شانو مت کہا کریں۔ رینا کہہ کر پکارا کریں۔"

اس نے جھنجھلا کر کمبل اتارا تھا۔

"رینا کہوں یا ریما۔ رہنا تو تو نے وہی ہے۔" شمع نے اسے بازو سے پکڑ کے بٹھایا۔

"ذرا گھڑی پہ نظر مار، چھ بج رہے ہیں۔ دو تین گھنٹے تو تجھے لیپا پوتی کے لیے چاہیے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہیں بھی اتاولے سے۔ ابھی آن کھڑے ہوں گے دروازے پہ تو بستر پہ اینڈتی رہ جانا۔"

"ذرا چین نہیں اس گھر میں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بستر سے اتر کر چپل پاؤں سے اڑسنے لگی۔

"نہ دن کو سکون ملتا ہے نہ ہی رات کو آرام کہاں مروں جا کر۔"

"اس محل میں جا کر مرجا جو تیرا باپ تیرے لیے کھڑا کر گیا ہے۔" شمع کو ہمیشہ سے اس کی سستی پہ تاؤ آتا تھا۔

"باپ کبھی ملا تو پوچھ لوں گی اس سے اس محل کا پتہ۔" رینا نے ایک دھماکے کے ساتھ باتھ روم کا دروازہ بند کیا۔

"میرے نصیب، میرے حصے میں یہی "روڑی کا مال" رہ گیا تھا۔ نہ شکل نہ صورت، نہ آواز اور نہ کوئی اور گن۔ چھپر پھاڑ کے بولتی ہے۔ بس چارپائی تڑوالو سارا دن۔۔۔ وی سی آر پہ فلمیں دکھا لو! سہیلیوں کے ساتھ انار کلی اور شادمان کے چکر لگوالو۔ کام کے وقت جان نکلتی ہے۔ ایک انڈا وہ بھی گندا۔"

باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھ دیکھ کے شمع بڑبڑاتی رہی۔ دروازے پہ میڈونا کا پوسٹر لگا تھا۔ کمرے کی دیگر دیواروں پہ بھی کئی پوسٹرز لگے تھے۔ مشہور فلمی ہیروئنوں کے۔ ماڈلز کے۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ میک اپ کے سامان کا ڈھیر لگا تھا اور اسی حساب سے گرد کا بھی ڈھیر۔

دو پٹ کی لوہے کی الماری میں شاید جگہ کم پڑ گئی تھی اس لیے بہت سے استری شدہ لباس ہینگر میں لٹکے دیواروں پہ کیل ٹھونک کے لٹکائے گئے تھے۔ سنگل بیڈ کے ساتھ رکھی ریک میں ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔ نچلے خانے میں کیسٹیں اور اس سے نچلے میں فیشن میگزین رکھے تھے۔ بیڈ کے نیچے مختلف رنگوں اور ڈیزائن کی درجن بھر اونچی ہیل سینڈلیں بے ترتیبی سے رکھی تھیں۔

شمع اٹھ کے اس کا کمبل تہ کرنے لگی۔

لیے باتیں بھی اچھی کرلیا کرتی تھی۔ اشعار سینکڑوں کے حساب سے یاد تھے۔ گفتگو میں برمحل ٹانک دیا کرتی تو ذوق کی داد بھی وصولتی۔ مگر ایسے اعلا ذوق پرستار ملتے کب تھے۔ یہاں تو ٹھمکوں پہ واروپے دالے جمع ہوتے اور رانو تربیت لینے کے باوجود رقص کے معاملے میں وہ پھسڈی تھی۔ آواز بھی سروں سے ناآشنا تھی۔ اس لیے شمع کی نظر میں وہ واقعی اس کا "گندہ انڈا" تھی۔

"مجھے تو اصغر میں کوئی برائی نظر نہیں آتی بلکہ پچھلے تین سالوں میں تیرا ایسا کوئی دیوانہ مجھے نظر نہیں آیا۔ پتا نہیں کس ادا پہ مرمٹا ہے۔ تو سب سے بڑی ناشکری ہوگی اگر اس کو ہاتھ سے جانے دیا۔"

"مجھے اس کی صورت دیکھ کے خار چڑھتی ہے۔ اس کی باتیں سن کر میرا پارہ ہائی ہوجاتا ہے۔"

"ہمیں کسی کی صورت اور باتوں سے کیا لینا دینا۔ صورت اور باتیں تو ہماری بِکتی ہیں۔ ہمارا مطلب صرف۔ اس کی جیب سے ہونا چاہیے اور اصغر کی صرف جیب ہی نہیں بھری ہوتی بلکہ اس میں اتنا حوصلہ بھی ہے کہ وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزاروں روپیہ تجھ پہ لٹا سکے اور تجھے کیا چاہیے۔"

"اب میں کیا بتاؤں کہ مجھے کیا چاہیے۔ کوئی نہیں سمجھے گا۔"

وہ بالوں میں ہیئر برش پھیرتی سوچ رہی تھی اور اس کے ذہن کے پردے پہ ایک شبیہ ابھر رہی تھی۔ یہ شبیہ اس سجیلے نوجوان کی تھی جس سے وہ پرسوں کی پارٹی میں ملی تھی۔ بہت ہاتھ پیر مارنے کے بعد شمع نے اسے اس فنکشن میں کام دلوایا تھا۔ کسی کی پرموشن کی خوشی میں دی جانے والی پارٹی تھی۔ خالص مردانہ محفل' اس لیے رقص و سرود کا اہتمام بھی کیا گیا۔ بک کی جانے والی چار لڑکیوں میں سے ایک وہ بھی تھی۔

جدید انداز کے سلے بلیک نیٹ کے اس سوٹ میں جو جتنا چھپا رہا تھا۔ اتنا عیاں کررہا تھا۔ وہ ماں کی ہدایتوں کو گرہ سے باندھے گئی تو شکار کی نیت سے تھی مگر خود شکار ہوگئی تھی۔

وہ تھا ہی ایسا۔ بالکل اس کے خوابوں کے شہزادے جیسا۔

جتنا خوبرو' اتنا باوقار

جتنا ذہین' اتنا مہذب

اور جتنا خوش ذوق' اتنا خوش گفتار

اس کی نظریں وہاں موجود باقی مردوں کی طرح بھوکی اور للچائی ہوئی نہیں تھیں۔ وہ ان کی طرح اوچھے مذاق اور چھچھوری حرکتیں نہیں کررہا تھا ورنہ اس محفل میں بہت سے ایسے اعلا سرکاری افسران تھے۔ سوسائٹی کے قابل عزت بزنس مین تھے۔ جو اپنی شخصیت پہ چڑھا وقار اور شائستگی کا پردہ ان چار کڑکتی بجلیوں کو دیکھتے ہی تار تار کرکے پھینک چکے تھے۔ ہر بہانے سے ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور فحش کلامی ہورہی تھی۔

ایسے میں اسے چند منٹ ہی سہی مگر اس نوجوان سے باتیں کرکے اچھا لگا' اور یقیناً" اسے بھی اچھا لگا تب ہی تو جاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"رینا! آپ مختلف ہیں۔ ان تینوں سے بہت مختلف۔ بلکہ منفرد اور انفرادیت میری کمزوری ہے۔"

کل سے وہ اسی ایک ستائشی فقرے کے سحر میں گرفتار تھی۔ آج کا فنکشن بھی اسے پرسوں ہی ملا تھا۔ اسی محفل کے دوران وہ بک کرلی گئی تھی اور آج اسی آس پہ بڑے دل سے تیار ہورہی تھی کہ پھر اس سے ملاقات کا امکان تھا۔

"فیاض صاحب کا قریبی دوست لگ رہا تھا۔ آنا تو ضرور چاہیے اسے اور اس بار میں پرسوں والی غلطی نہیں دہراؤں گی۔ اس کا فون نمبر ضرور لوں گی اور یہاں آنے کی دعوت۔۔۔ نہیں؟ یہاں نہیں۔ میری ماں سے مل کے اس پہ کیا خاک اچھا تاثر پڑے گا۔ میں اس کے ذوق انفرادیت کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی۔"

"گاڑی آگئی ہے رانو۔ واہ۔۔۔ ڈرائیور کے ٹور ہی دیکھنے والے ہیں۔"

ماں کی بات پہ وہ کلس کے رہ گئی۔ "بس آپ کی اڑان ان ڈرائیوروں تک ہی محدود رہی۔"

"وہ تو لمبی اداری بار لے کوئی گورنر کوئی وزیر پھنسا لے۔" شمع نے جل کے طعنہ دیا۔

اس کی امیدیں رنگ لائی تھیں۔ وہ آج کی محفل میں بھی موجود تھا۔

"آپ نے کہا تھا' آپ ایسی محفلوں میں کم ہی شرکت کیا کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج بھی۔۔۔"

بڑی ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے شستہ لب و لہجے کے ساتھ کہا۔ کمال کی اداکارہ تھی وہ۔ اپنے کوٹھے سے اترتے ہی اس کی جون تبدیل ہوجایا کرتی تھی۔ وہاں اپنی ماں اور اپنے قبیل کی دیگر سے بات چیت کرتے ہوئے وہ وہی ٹیپیکل بازاری زبان استعمال کرتی مگر وہاں سے نکلتے ہی وہ رانو سے رینا بن جانے میں دیر نہیں کرتی تھی۔

"اگر میں کہوں کہ آپ کے لیے' صرف آپ سے ملنے کی خاطر تو کیا آپ مان لیں گی؟"

وہ اسی مسکراہٹ کے وار کررہا تھا جس سے وہ پہلے ہی گھائل ہوچکی تھی۔

"ماننا پڑے گا۔ کیونکہ آپ منوانے کے فن سے آشنا ہیں۔"

"اور آپ اپنا دیوانہ بنانے کے فن سے۔"

"ایسی کیا خاص بات ہے مجھ میں؟"

اس کے اندر فطری خواہش جاگی۔ اپنی تعریف سننے کی۔

"کچھ تو خاص ہے جو آپ کو اس محفل میں سب سے ممتاز کرتا ہے۔ آپ بیوٹی ود برین ہیں۔ دلکشی اور ذہانت کا ایسا امتزاج کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔ آپ سے بات کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔"

"مگر لوگ تو۔۔۔ لطف حاصل کرنے کے لیے صرف ہماری باتوں پر اکتفا نہیں کرتے۔" وہ اداس ہوگئی۔

"بلکہ بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ وہ تو صرف ہمیں ناچتے گاتے' دل لبھاتے' ادائیں بکھیرتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔"

"میں ان میں سے نہیں ہوں مس رینا۔ میں "تماش بین" نہیں ہوں۔ میری یہاں موجودگی کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ میں اس شہر میں نیا ہوں۔ اور کچھ ہی عرصے کے لیے آیا ہوں۔ دو ماہ بعد میری پوسٹنگ دوبارہ اسلام آباد ہوجائے گی۔ میرے اپنے شہر میں' تب تک کے لیے یہاں اکیلا پن محسوس نہ ہو' اس لیے یاروں دوستوں کی صحبت میں وقت زیادہ گزارتا ہوں۔ اب ان کی مرضی ہے' جہاں وہ لے آئیں۔ آج کل تو میں ان کے رحم و کرم پر ہوں۔"

بے تکلفی کچھ اور بڑھی' دوستی کے اگلے مراحل طے ہوئے۔ فون نمبرز کا تبادلہ ہوا۔

"آپ چاہیں تو اس اجنبی شہر میں آپ کو رفاقت کے چند حسین پل ہم بھی بخوشی دے سکتے ہیں۔"

رینا نے اس کی ساحر آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"زہے نصیب' اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے۔"

اگلی ملاقات کے لیے وقت اور مقام بھی طے کرلیا گیا۔

☼ ☼ ☼

"یار! اس چھمک چھلو سے تمہارے تعلقات کچھ زیادہ ہی نہیں بڑھتے جارہے۔"

اگلے دن آفس میں اس کے قریبی دوست فیصل بختیار نے اس سے کہا تھا وہ بھی اسی کے گریڈ کا ایک اعلا سرکاری عہدے دار تھا۔ بال بچے دار آدمی تھا اور اپنی فیملی کے ساتھ کل اسی ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے آیا تھا۔ جہاں جعفر محمود' رینا کے ساتھ بیٹھا تھا۔ رینا کو ساتھ دیکھ کے فیصل نے اسے متوجہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ آخر فیملی ساتھ تھی مگر آج آکر ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس کا نام رینا ہے۔ رینا۔۔۔ تم جانتے ہو' مجھے عورتوں کو الٹے سیدھے القاب دینا پسند نہیں ہے۔ خواتین کا

احترام کرنا سیکھو فیصل۔"

"خواتین کا؟ بہت کرتا ہوں مگر جو احترام کے قابل ہوں۔ یہ بازاری عورتیں اپنا احترام کروانے 'باجی یا بھابھی' کہلوانے نہیں باہر نکلتیں۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو؟"

"میری عقل ٹھکانے پہ ہے اور حواس بھی۔ فکر مت کرو۔ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم سوچ رہے ہو۔ کوئی عشق وشق کا چکر نہیں ہے۔"

"پھر یہ روز روز کا ملنا، ساتھ ڈنر کرنا۔ یقیناً" تحفے تحائف اور رقمیں بھی بٹور رہی ہوگی۔ مفت میں تو وہ اپنا ایک سیکنڈ نہ ضائع کرے۔"

"رینا ایسی لڑکی نہیں ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں اسے لڑکی نہیں مانتا۔ یہ چیزیں نہ خواتین کی صف میں شمار ہوتی ہیں نہ انہیں عام لڑکیوں جیسا سمجھو۔ پتہ نہیں کس چکر میں پھنس گئے ہو۔ یار! یہ سب دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ ہاں عیش کرو۔ ڈالر ڈانس دیکھو۔ زیادہ پسند آجائے تو چند گھنٹے خرید ڈالو۔ مگر قیمت ادا کرنے کے بعد دوبارہ مڑ کے پیچھے مت دیکھو۔ یہ جونک ایک بار چمٹ جائے تو مشکل سے چھوڑتی ہے۔"

"میں نے کہا ناں، وہ اوروں سے مختلف ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو، اس سے قبل کتنی کال گرلز سے واقفیت رہ چکی ہے تمہاری جو تم تقابل کرنے پہ اتر آئے ہو۔"

"کال گرل؟ ربش۔۔۔ وہ صرف آئی مین۔۔۔ وہ ایک ڈانسر ہے اور بس۔" اس نے جھٹلانا چاہا۔

"یہ تم اتنے وثوق سے اس لیے کہہ رہے ہو کہ ابھی تک تم نے صرف ڈانس ہی دیکھا ہے اس کا۔ وہ ایک ڈانسر نہیں، ایک طوائف ہے اور طوائف کا سب کچھ برائے فروخت ہوتا ہے۔ اس کی ادائیں، اس کا وقت، اس کی ہنسی۔ اس کی محبت، اس کی آواز اور اس کا جسم بھی۔ کبھی قیمت لگا کے دیکھو تب اندازہ ہوگا، تم کتنے غلط ہو اور میں کتنا صحیح۔"

"وہ جو بھی ہے، مجھے اس کی حقیقت جاننے کے لیے ایسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی اصل زندگی میں وہ جو بھی ہے جیسی بھی ہے، اس سے مجھے کیا لینا دینا۔ فی الحال وہ میری ایک اچھی دوست ہے۔ اچھے دوستوں کی طرح ہم کچھ وقت اچھا گزار لیتے ہیں اور بس۔"

"ارے یار! ہم سب مر گئے ہیں کیا؟ دوستی کرنے کے لیے تجھے وہی ملی؟"

"اس میں ایک عجیب سی کشش ہے اور سچ بتاؤں، مرد اور عورت کی دوستی محض ایک ڈھکوسلہ ہے۔ یہ صرف کشش ہی تو ہے سو یہی کشش جو اس کے اور میرے درمیان ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہاں ذہانت اور خوبصورتی کی کمی نہیں۔ بہت سی لڑکیاں ہیں خود میری اپنی فیملی میں، مگر وہ جس ماحول سے ہے۔ وہاں یہ وصف کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی بات نے مجھے اٹریکٹ کیا ہے۔ اس میں بے باکی، خود اعتمادی، ذہانت، برجستگی، ادائیں سب ہی کچھ ہے۔"

"اسی سے تو ڈر لگ رہا ہے، کہیں تم لٹو ہی نہ ہو جاؤ۔"

"اتنا کمزور نہیں ہوں میں، ویسے بھی میں نے آج تک جو کیا ہے، انجام کو مد نظر رکھ کر کیا ہے۔ اس دوستی کے آغاز سے پہلے ہی میں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور وہ انجام یہ ہے کہ دو ماہ بعد میں واپس اسلام آباد چلا جاؤں گا۔ اور پھر وہ کہاں، ہم کہاں، زندگی کے ایک مختلف تجربے کے طور پر یہ یاد رہے گی یہ دوستی۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا؟"

"کوئی خیر خبر آئی وہاں سے؟"

معراج دین نے فیکٹری سے آتے ہی رخشندہ سے سوال کیا جب کہ سراج دین ابھی بہن کی سسرال کا معاملہ تھا، بغیر کچھ پوچھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"میں نے فون کیا تھا۔ فی الحال تو خطرہ ہے۔ شاید آپریشن ہو۔"

"اماں سے بات ہوئی؟ کیسی ہیں وہ؟ طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟"

شوہر کا اتنا فکرمند ہونا رخشندہ کو پسند نہیں آیا۔ کون سا اماں جی ہفتوں یا دنوں سے کہیں گئی ہوئی تھیں۔ چند گھنٹے ہی گزرے تھے۔ مگر اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی ناپسندیدگی ظاہر نہیں ہونے دی۔

"میں نے ہسپتال میں فون کیا تھا۔ اماں جی سے بات کیسے ہوتی۔ ہاں پروین سے ان کا پوچھا تھا، ٹھیک ہیں وہ۔"

اتنا لمبا جواب دیتے ہوئے رخشندہ کے چہرے کے زاویے بگڑ رہے تھے مگر معراج دین کی تسلی کرانے کے لیے یہ ضروری تھا ورنہ سوال در سوال کا ایک رابطہ شروع ہو جاتا۔

کھانے کی میز پہ انہوں نے پھر سے ذکر چھیڑ دیا۔ پروین کے گھر نہ ہونے کی وجہ سے رخشندہ نے ان کے کہنے پہ کھانا نیچے ہی لگا دیا تھا تاکہ سراج دین کو دقت نہ ہو۔

"سراج! تم دوبارہ ہسپتال گئے؟"

"نہیں۔"

"جانا چاہیے تھا۔"

"ایسا ضروری بھی نہیں، میرا بار بار حاضری لگوانا۔ وہ بیٹھی ہے ناں صبح سے دھرنا مار کے۔"

"پھر بھی۔۔۔ تعلق داری بھی کوئی چیز ہے، تمہارا رشتہ ہے ان لوگوں سے۔"

"رشتہ نہیں ہے بھائی صاحب، صرف واسطہ ہے۔ رشتے خون کے ہوتے ہیں۔" سراج دین نے ہڈی بھنبھوڑتے ہوئے اپنا فلسفہ بیان کیا۔

"یہ کیا بات ہوئی، اس طرح تو میاں بیوی کا رشتہ بھی کوئی رشتہ نہ ہوا۔ خون کا تعلق جو نہیں ہوتا۔"

"نہیں خیر۔ اس رشتے کو تو میں مانتا ہوں، مگر لازم نہیں ہے کہ بیوی کے ساتھ ساتھ اس کے درجن بھر رشتے داروں کو بھی ہم اپنی زندگی کا حصہ بنا لیں۔ اور پھر رشتے دار کسی کام کے بھی تو ہوں۔ میرے وہاں جانے سے کترانے کی اہم وجہ میری ساس محترمہ ہیں۔" انہوں نے ایسا برا منہ بنایا جیسے منہ میں کنکر آگیا ہو۔ "اس عورت کا سامنا کرنے سے بہتر ہے۔"

"بہرحال وہ تمہاری ساس ہے۔ اور کچھ نہیں تو الفاظ استعمال کرنے میں ہی محتاط رہو۔ دل کا تو میں علاج نہیں کر سکتا۔"

"میں جانتا ہوں، یہ عورت ایک نہ ایک دن پروین کا دماغ خراب کر کے رہے گی۔ وہ میری ساس نہیں، میری خوشحال ازدواجی زندگی پہ ہر وقت لٹکتی ایک خطرے کی تلوار ہے۔ پھر میں کیسے خود کو اس کی عزت کرنے پہ مجبور کروں۔ اماں کا حوصلہ ہے جو صبح سے اسے جھیل رہی ہیں۔ اپنی بہو کی محبت میں۔"

"واقعی اماں کو اتنا وقت وہاں نہیں رہنا چاہیے۔ وہ خود بیمار رہتی ہیں، ہسپتال کا ماحول۔ بہتر ہوتا کہ پروین کو تم ساتھ لے جاتے۔ اماں بعد میں ہمارے ساتھ چکر لگا لیتیں۔ رخشندہ! کھانے کے بعد چکر لگا لیتے ہیں ہم بھی ہسپتال کا۔"

"ہم۔۔۔" وہ متذبذب نظر آئی۔ "میں کیسے جا سکتی ہوں۔ پروین تو سب بچوں کو میرے حوالے کر کے گئی ہے۔ میں کس کے حوالے کر کے جاؤں۔"

اسے بروقت بہانہ سوجھا تھا اور وہ بھی ایسا جس پہ کوئی اعتراض نہ کر سکا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔"

”میں نکل رہا ہوں بس۔۔۔“ سراج دین نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اماں کو لیتا آتا ہوں۔ پروین کو میں جانتا ہوں‘ وہ ٹلنے والی نہیں۔ ابھی وہیں مورچہ لگائے گی۔ اس عورت کو گھر اور بچوں کی فکر نہیں۔ صرف میکے کا درد جاگا رہتا ہے۔ جب تک نوید کی شادی نہیں ہوئی تھی تب مصیبت تب اسے میکے کی ویرانی اور بھائی کے اکیلے پن کا رونا ستاتا تھا۔ بھاگ بھاگ کے میکے جا بیٹھتی تھی۔ اللہ اللہ کر کے سالے صاحب کو بڑھاپے میں جو رو ملی تو وہ موت کے دہانے پہ ہیں‘ اللہ ہی کرم کرے اس پہ بھی اور مجھ پہ بھی۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو سراج۔“

معراج دین پہ ماں کا زیادہ اثر تھا۔ انہیں بھائی کے لہجے اور الفاظ‘ دونوں پہ ناگواری محسوس ہوئی‘ اس لیے فوراً ٹوک دیا۔

”اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ پروین کی فطرت ہی ایسی ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ صرف میکے والوں کے لیے پریشان رہتی ہے۔ یہاں بھی سب سے اس کا لگاؤ صاف نظر آتا ہے۔ وصی کو کیسے ماں کی طرح پال رہی ہے جب کہ حسان بھی ابھی اس کی گود میں ہے۔ اماں کو اپنی ماں اور مجھے سگا بھائی سمجھ کے تعظیم کرتی ہے۔ رخشندہ سے بھی کبھی اونچ نیچ نہیں ہوئی۔ تمہیں ایسی بیوی کی قدر کرنی چاہیے۔ بہت کم لوگ ایسی محبت کرنے والی فطرت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔“

ایسا کہتے ہوئے انہوں نے بے ارادہ ہی رخشندہ کو دیکھا جو برتن ٹرے میں رکھ رہی تھی۔ تب ان کا قطعاً ارادہ اپنی شریک حیات کی کج روی اور روکھے پن پہ طنز کرنے کا نہیں تھا مگر اس بات پہ جس طرح رخشندہ نے انہیں کڑی نظروں سے دیکھا‘ وہ اندر ہی اندر گھبرا کے رہ گئے۔

”بھئی میرا مطلب تھا کہ ہماری اماں بہوؤں کے معاملے میں اور ہم دونوں بیویوں کے معاملے میں خاصے خوش قسمت رہے ہیں۔ اور تم اماں کو بے شک لے آؤ لیکن اگر پروین رکنا چاہے تو بچوں کی فکر مت کرنا۔ رخشندہ ہے ناں‘ اس نے کبھی اپنے اور تمہارے بچوں میں فرق نہیں کیا۔“

انہوں نے اپنی بے ساختہ کہی جانے والی بات کا پورا پورا ازالہ کرنے کی کوشش کی‘ مگر ایسا کرنے کی کوشش میں وہ رخشندہ کو اور ناراض کر بیٹھے۔ اس نے کچن میں جا کر برتن ایک زبردست شور کے ساتھ سنک میں پھینکے تھے۔ اپنے چار بچوں کے ساتھ ساتھ دیورانی کے دو اور ساس کے لاڈلے نواسے کی ذمہ داری بھی رات بھر کے لیے لینا اسے دوبھر لگ رہا تھا۔ شوہر پہ بھی جی بھر کے غصہ آ رہا تھا‘ جس نے بغیر اس سے مشورہ کیے ان تینوں کی اضافی ذمہ داری اس پہ ڈال دی تھی۔ مگر دس منٹ بعد جب وہ کچن سے نکلی تو اس کے چہرے پہ کچھ دیر قبل والی ناگواری کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ حسان کا فیڈر‘ حسن کا نائٹ سوٹ وغیرہ ان کے کمرے سے لے کر اوپر جا رہی تھی۔

”ماما! آج حسن‘ حسان اور وصی ہمارے ساتھ ہی سوئیں گے؟“

ثناء جو سب سے بڑی تھی‘ اپنی خوشی کا بے ساختہ اظہار کرنے لگی۔

”حسن! تم میرے ساتھ سونا۔ مزے مزے کی باتیں بھی کریں گے۔“ یہ پیش کش ثوبان نے کی تھی جو حسن کا ہم عمر تھا اور دونوں میں دوستی بھی خوب تھی۔

”اگر ایسی بات ہے تو میں تم دونوں کو اکٹھے سونے نہیں دوں گی۔ ساڑھے نو بجے سے پہلے پہلے سب کا سونا ضروری ہے۔“

”ماما‘ صبح چھٹی ہے۔ پلیز۔۔۔“

اس نے کہیں نہ کہیں تو انہیں سلانا تھا۔ ساری رات گود میں تو لے کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس لیے بظاہر احسان کرتے ہوئے اجازت دے دی۔ وصی کو سمیط کے ساتھ لٹایا اور ثنا چونکہ سب سے بڑی اور سمجھ دار تھی اس لیے ننھے حسان کی ذمہ داری اسے دی۔

”اگر رات کو تنگ کرے تو مجھے دے جانا۔ ویسے پروین تو یہی کہتی ہے کہ ساری رات آرام سے سویا رہتا ہے۔“

”بچے سو گئے؟“ معراج دین نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اندر جھانکا۔

”بس سونے ہی والے ہیں۔“ رخشندہ نے سب کے کمبل باری باری کھولتے ہوئے کہا۔ معراج دین آہستہ سے چلتے ہوئے سمیط کے بستر تک آئے‘ جہاں نیند سے بھری آنکھیں لیے تین سال کا وصی سمیط سے چمٹا لیٹا تھا۔ اسے شاید پہلی بار موقع ملا تھا نانی کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ سونے کا‘ اس لیے خوشی کے ساتھ ساتھ عجیب سی بے اعتباری بھی تھی۔ تب ہی تو بری طرح اس سے چپکا ہوا تھا۔ معراج دین کو اسے دیکھ کر زہرہ کی یاد ستانے لگی۔ انہوں نے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”وصی کو دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔“

”تو مت دیکھا کریں۔“ یہ جملہ رخشندہ نے دل ہی دل میں کلستے ہوئے کہا تھا‘ البتہ زبان سے فقط اتنا کہا۔

”بچے کے سامنے ایسی بات مت کریں۔“

”اوہ ہاں۔۔۔“ وہ خائف ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تعلیم یافتہ بیوی کی سمجھ داری کے قائل بھی۔

ان کے جانے کے بعد رخشندہ نے سب ہی بچوں کو دودھ کا گلاس دیا اور باری باری ان کے ماتھے چوم کر شب بخیر کہتی نکل گئیں۔

”امی نے مجھے پیار نہیں کیا۔“ سمیط کو پیار کرتے دیکھ کر وصی جو تکیے پہ سر رکھ کے لیٹ چکا تھا۔ بڑے اشتیاق سے اپنی باری لینے اٹھا تھا۔ مگر تب تک رخشندہ آگے بڑھ کے ثنا کے بستر تک پہنچ چکی تھی۔ حسن بڑا تھا۔ وہ شاید ماں اور تائی کے فرق کو پہچانتا تھا اس لیے اس نے رخشندہ کا ثوبان کو پیار کرنا اور اس کو نہ کرنا‘ اتنا محسوس نہیں کیا۔ حسان سو چکا تھا صرف وہی تھا جس کا ننھا ذہن اس سوال میں الجھا ہوا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اسے نانو کی نرم گرم سی آغوش بے تحاشا یاد آنے لگی۔ اس نے نائٹ بلب کی روشنی میں سمیط کو دیکھا جو گہری نیند میں جا چکا تھا۔ اسے خوف کا احساس اور بھی ستانے لگا۔

”ثنا آپی۔۔۔“ وہ دبی آواز میں اسے پکارنے لگا۔

”اوں۔۔۔ ہاں‘ کیا بات ہے؟“ وہ بھی شاید غنودگی کے زیر اثر تھی۔

”ثنا آپی! ڈر لگ رہا ہے۔“

”سو جاؤ آرام سے وصی‘ ڈر کیسا؟ سب ہی ہیں کمرے میں۔ دیکھو‘ حسان تم سے چھوٹا ہے مگر کتنا بہادر ہے۔“

”اس کے پاس آپ ہیں آپی۔ آپی! میں بھی آپ کے پاس آ جاؤں۔؟“

”یہاں اتنی جگہ۔۔۔ اچھا بھئی آ جاؤ۔“

”ڈر لگتا ہے۔ اندھیرا ہے‘ آپی آپ لے جاؤ‘ گودی اٹھا کے لے جاؤ۔“

نو سالہ ثناء اسے بمشکل گود میں اٹھا کے لائی۔ حسان کو پرے سرکا کے جگہ بنائی اور ان دونوں کے درمیان پھنس کے لیٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

”مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔“

آپریشن تھیٹر سے ڈیڑھ گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ایک نرس بڑے عجلت بھرے انداز میں نکلی تھی اور نوید مراد کو اطلاع دے کر اسی عجلت بھرے انداز میں دوبارہ اندر چلی گئی تھی۔

”نرس۔۔۔ وہ۔۔۔ بات سنیں۔“

وہ ساجدہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر دروازہ دوبارہ بند ہو چکا تھا۔

”مبارک ہو پروین۔۔۔!“ شوکت جہاں نے سب سے پہلے اپنا فرض نبھایا۔

”خیر مبارک اماں! اصل مبارک موقع تو وہ ہوگا جب اس بچی کی ماں جیتی جاگتی‘ اپنی اولاد کو گود میں لیے ہمارے

سامنے ہوگی۔"

پروین نے اپنے آنسو پونچھے۔ اسے نرس کے انداز سے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ بے ساختہ در آنے والے اندیشوں کو شدومد سے جھٹلا رہی تھی۔

"لڑکی ہوئی ہے؟" شمشاد بھی قریب آگئی۔ وہ اپنی کسی رشتے دار خاتون کے ساتھ الگ سر جوڑے بیٹھی تھی۔ "ساجدہ کا کیا بتایا ہے؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا اماں۔" نوید مراد نے مایوسی سے جواب دیا۔ اس کا دل لمحہ بہ لمحہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ بیٹی کی پیدائش نے بھی اس کے اندر خوشی کا کوئی احساس پیدا نہیں کیا تھا' وہ صرف ایک بار' بس ایک بار یہ سننا چاہتا تھا کہ ساجدہ اب خیریت سے ہے۔

"چلو' اللہ بہتر کرے گا۔" شمشاد نے بڑی سی جمائی لے کر کہا۔ اسے نیند پہ قابو پانا مشکل لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہی ہوگی۔ آخر لڑکی بھی تو اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہی پیدا کی ہے۔"

اس کے بعد وہ شوکت جہاں کے نزدیک بیٹھ کر سنانے لگی۔

"ویسے تو ہمارے ہاں پہلوٹی کے لڑکے پیدا ہونے کا رواج ہے۔ پھر بھی۔ چلو جو اللہ کی مرضی' میرا بھی پہلا لڑکا ہوا اور خیر سے میری پروین کے دونوں ہی لڑکے۔"

"اللہ کی قدرت کسی رواج کو نہیں مانتی بہن۔" انہوں نے متانت سے جواب دیا۔ "لڑکا ہو یا لڑکی' سب اللہ کی دین ہے۔ کوئی رحمت تو کوئی برکت کا باعث بنتا ہے۔ بس دعا کیجیے۔ زندگی والی' قسمت والی ہو۔ اپنی ماں کی صحت کا وسیلہ بنے۔ اللہ اس ننھی سی جان کے صدقے اس کی ماں کو زندگی دے دے۔"

"آمین..." پروین نے صدق دل سے کہا تھا۔ اسے اپنی بھاوج ساجدہ ویسے بھی بہت پسند تھی۔ اس کی ماں کے ساتھ گزارا کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ مگر وہ ہمہ وقت مسکراتی ملتی اور اب تو اور اس کا سنجیدہ فطرت بھائی' اس کے لبوں پہ بھی اب مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔

"ساجدہ بی بی کے ساتھ کون ہے؟" ڈاکٹر اپنا اوور آل بازو پہ ڈالے پژمردہ چہرے کے ساتھ آپریشن تھیٹر سے نکلی۔

"جی' میں... میں شوہر ہوں اس کا۔"

نوید مراد دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا۔

"ہمیں افسوس ہے۔ ہم آپ کی بیوی کو نہیں بچا سکے۔ وہ بہت کمزور تھیں اور چوٹیں شدید نوعیت کی تھیں۔ خون کی کمی ان کا جسم برداشت نہیں کر سکا۔ ہم نے کوشش تو بہت کی مگر ویسے وہ بچ بھی جاتیں تو ان کا دماغ متاثر ہو چکا تھا۔ شاید ایک طویل عرصے کے لیے کومے میں چلی جاتیں۔"

وہ پوری وضاحت کے ساتھ بتا رہی تھی' مگر نوید مراد تو ڈاکٹر کے پہلے ہی فقرے پہ چکرا کے رہ گیا تھا۔

● ● ●

فضا میں اگربتیوں اور مرجھائے ہوئے پھولوں کی باسی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

پھر اس خوشبو پہ دیگ میں پکے پکوانوں کی خوشبو حاوی ہونے لگی۔

"پروین! تو اپنا اور باجی کا کھانا ادھر کمرے میں ہی لگوا لے۔ دیگ کھل گئی ہے۔ میں باہر صحن اور برآمدے میں برادری اور محلے کی عورتوں کو دیکھتی ہوں۔" شمشاد نے اندر آکر کہا۔

"نہیں پروین بیٹا! میرے لیے تکلیف نہ کرنا۔" شوکت جہاں نے نرمی سے منع کرنا چاہا۔ انہیں مرگ والے گھر میں کھانا کھانا ہمیشہ بھاری لگتا تھا اور یہ تو موت بھی جوان جہان ساجدہ کی تھی جو چند منٹ کی بچی کو اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔

غریب گھر کی یتیم' صابر بچی... جس نے شادی کے بعد ابھی تو خوشیوں کا ذائقہ چکھا تھا۔ ابھی تو اس کا دل آسودگی سے آشنا ہوا تھا اور اتنی جلدی اس کی زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔

ابھی تو اس نے اپنی ننھی سی بچی کے نرم گرم وجود کو چھوا تک نہ تھا' اس کے گلابی گالوں پہ اپنے لب تک نہ رکھے تھے۔

اسے لوری نہ سنائی تھی۔

اسے بازوؤں میں بھر کے جھولے نہیں دیے تھے۔

ابھی تو اسے اس کی قلقاریاں سننی تھیں۔

اس کی انگلی تھام کے اسے پاؤں پاؤں چلنا سکھانا تھا۔

اس کے ننھے ننھے پھولے ہوئے فراک سینے تھے اور اس کے ریشمی سنہری بالوں کی پونیاں بنانی تھیں مگر...

مگر وہ تو یہ تک نہ جانتی تھی کہ اس کی گڑیا کے بال بالکل سورج کی کرنوں جیسے سنہری ہیں۔

اور... اور وہ تو اس بات سے بے خبر تھی کہ درد اور تکلیف کے جس سفر سے گزر کر وہ اس دوسرے جہان میں پہنچی ہے' اس سفر میں وہ ایک بچی کو پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

یہ درد صرف شوکت جہاں ہی کی نہیں' بلکہ یہاں موجود بہت سے لوگوں کی آنکھیں بھگو رہا تھا۔

کچھ ایسے بھی تھے جن کی آنکھیں غم کی شدت سے بنجر ہوگئی تھیں جیسے نوید مراد۔

ساجدہ کی موت کی خبر سننے سے لے کر اب تک یعنی اس کی تجہیز و تکفین سے لوٹ کر آنے کے بعد... اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں بہا تھا لیکن ہاں... اس کا دل تھا جو قطرہ قطرہ خون بن کر پگھل رہا تھا... ختم ہو رہا تھا۔

اس نے ابھی تک اپنی بیٹی کا چہرہ تک نہ دیکھا تھا۔ اسے اتنا ہوش ہی نہیں تھا۔ قبرستان سے آنے کے بعد وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اور کچھ ایسے بھی تھے جو رسم دنیا سمجھ کے روئے بھی' چلائے بھی اور اب سکون سے بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں بگھار رہے تھے۔ ان میں سے ایک نوید مراد کی ماں' ساجدہ کی ساس شمشاد تھی۔

"یوں تو پہلی روٹی میکے سے آتی ہے' رواج یہی ہے مگر میری نوں وچاری کے "پچھلے" ذرا ماڑے (کمزور) ہیں۔ میں نے نوید سے کہا' نہ اتنا خرچا ڈال غریب بندوں پہ۔ ہم خود دیگیں منگوا لیتے ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہمیں کوئی کمی ہے؟"

وہ پلاؤ' قورمہ اور نان دسترخوان پہ ملازمہ سے رکھواتے ہوئے باآواز بلند سنا رہی تھی اور نان کا پہلا نوالہ توڑتی ساجدہ کی بڑی بھاوج کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ اس نے کن اکھیوں سے اپنی خالہ ساس کو دیکھا۔ وہ بھی برے برے منہ بنا رہی تھی۔

"اور دیکھ نا بھرجائی...!" اب شمشاد اپنی کسی دور کی بھابھی کے پاس بیٹھے ہوئے قدرے کم آواز میں کہہ رہی تھی مگر یہ آواز اتنی بہرحال ضرور تھی کہ دس پندرہ لوگوں تک آسانی سے پہنچ جائے۔

"وہ ایک آدھ دیگ بھجوا بھی دیتے تو کیا ہوتا؟ الٹا برادری میں ہماری ناک کٹتی۔ ہمارے سارے رشتے دار دوسرے شہروں' پنڈوں سے آنے والے... اس کے علاوہ بھی ہم لوگ اپنے گھر آئے' کسی بندے کو بغیر روٹی کھلائے واپس نہیں جانے دیتے۔ اتنے بندوں کی روٹی یہ کیا بھیجتے... بھیجتے بھی تو کوئی شوربے والا سالن یا چنوں والے چاول... میری جوان نوں مری ہے' میں لوگوں کو چنوں والے چاول کھلاؤں گی؟ کوئی عزت ہے اس میں...؟ دیکھو یہ دو دیگیں مرغی کے قورمے کی... ایک دیگ بکرے کے گوشت کے پلاؤ کی... یہ ڈیڑھ دو سو روغنی نان... یہ ان لوگوں کو وارے کھاتا تھا...؟ مگر ناں جی... کوئی احسان نہیں مانتا۔ ان چھوٹے لوگوں کی اکڑ ہی بڑی ہوتی ہے۔ دیکھو ذرا' ایک نوالہ نہیں توڑا اب تک۔ اتنا ہی نخرہ تھا تو پلیٹیں بھر کے اپنے سامنے رکھنے کی لوڑ کیا تھی۔ ایسے بوتھے سوجا کر بیٹھے ہیں جیسے ان کی لڑکی کو میں نے مارا ہو۔ خود ہی فاقے کرا کرا کے اسے ہڈیوں کی مٹھ بنا رکھا تھا۔ ذرا جان ساہ نہیں تھا' اس میں کہ بچہ جن کر بچ سکتی۔ یہ تو ذرا سو ہرے آکر کوئی ماس بوٹی چڑھا تھا' ورنہ میکے میں کیا جڑتا تھا

اسے..... ایک بیٹا ہیں بغیر تڑکے کی دال ڈال کے سارا ٹبر بریکیاں (نوالے) لگانے والا.....

وہ بڑے بڑے لقمے منہ میں رکھتی جس رفتار سے قورمے کا صفایا کررہی تھی' اسی رفتار سے یہ دل دکھانے والی باتیں بھی سنا رہی تھی جیسے جیسے اس کا بیان طویل ہوتا جارہا تھا' اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جارہی تھی۔

پہلے دس..... پھر بیس..... پھر پچاس عورتوں تک سنے گئے ان طعنوں پہ دل برداشتہ ہوکر ساجدہ کی خالہ نے اپنا برقعہ سنبھالا اور اپنے ساتھ آئی بہو بیٹیوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب ہی شمشاد کی تیز زبان کی زہریلی دھار سے اچھی طرح واقف تھیں مگر نظر انداز کرتی رہیں۔ اب اس کی بدزبانی برداشت کرنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ ساجدہ ہی نہ رہی تھی جس کے لحاظ میں وہ اس کی کڑوی کسیلی پی جایا کرتے تھے اور آج..... آج تو حد ہوگئی۔ وہ پہلے سے کئی گنا بڑھ کے ذلت آمیز سلوک کررہی تھی اور وہ بھی اس موقع پہ..... اتنے لوگوں کے سامنے.....

شاید اس کی وجہ یہ ہوکہ جیسے ساجدہ کی بھابھیاں..... خالہ' چچی اور ممانی اب شمشاد کو برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں' اسی طرح اب ساجدہ کی وفات کے بعد شمشاد نے بھی اپنا رہا سہا لحاظ اور مروت ایک طرف رکھ دیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے کوئی تعلق' واسطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

انہیں بغیر سلام دعا کے باہر نکلتے دیکھ کے شمشاد کو ذرا ٹھنڈ پڑی۔

"دیکھا..... کتنی بے غیرت ہیں یہ ساریاں..... لڑکی کیا مری..... باقی سارے رشتے ختم..... چلو مجھے نہ پوچھتیں..... نہ بات کرتیں..... میں کون سا ترسی بیٹھی ہوں۔ میری جوتی کو پروا نہیں ان منحوسوں کی مگر وہ جو اندر بیٹھا ہے بدنصیب..... میرا بیٹا....."

ایک بڑی سی ڈکار لینے کے بعد اس نے دوپٹہ آنکھوں پہ رکھ لیا اور ہل ہل کر سسکنے لگی۔

"وہ ان کا بھی کچھ لگتا ہے' اس کو ہی دو بول تسلی کے بول جاتیں۔ وہ ذرا سی بچی..... ان کی لڑکی کی ہی اولاد ہے۔ جاتے جاتے اس کو بھی نہیں پوچھا۔ چلو اچھا ہوا۔"

اس نے سسکیاں اعتدال پہ لاتے ہوئے دوپٹہ آنکھوں سے ہٹایا اور سامنے رکھا' ایک اور نان اٹھالیا۔

"دفع دور ایسے ناتے (ننھیال والے) تم سارے گواہ ہو۔ یہ خود رشتہ توڑ کے نکلے ہیں اس گھر سے۔ اب ترسیں گے بچی کی شکل دیکھنے کو۔ میں تو اسے ان لوگوں کے پاس نہ پھٹکنے دوں گی۔ یہ بھی یاد رکھیں گے..... شمشاد سے "آڈا" لگایا ہے۔"

وہ یک طرفہ محاذ کھول رہی تھی۔ حالانکہ دوسری جانب بچی کے لیے ترسنے یا تڑپنے کا ایسا کوئی امکان کہیں بھی نہ تھا۔ نہ تو اس کے سگے نانا' نانی زندہ رہے تھے' نہ کوئی ماسی..... یعنی ماں سی۔ جن کو نواسی یا بھانجی کی کشش یہاں واپس کھینچ لاتی ایک بار پھر ذلیل ہونے۔

☼ ☼ ☼

"اچھا ہوا اماں جی! آپ گھر آگئیں۔ مجھے تو ڈر تھا کہ پروین اپنے ساتھ آپ کو بھی وہیں نہ چپکا لے۔"

سراج دین کے کہنے پہ شوکت جہاں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"میری چھوڑو' میں نے گھر واپس آکر اچھا کیا یا نہیں مگر تمہیں آج کی رات وہاں رکنا چاہیے تھا۔"

"وہ کس خوشی میں۔" اس نامعقول قسم کے سوال پہ انہیں غصہ ہی تو آگیا۔

"خوشی..... ؟ کیا وہاں خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ بے وقوف انسان! مرگ ہوئی ہے وہاں..... تمہاری بیوی کی بھابھی کی۔ تمہارا بڑا سالا ہے وہ انسان' جس کی زندگی کو اتنا بڑا دھچکا لگا ہے۔ خوشی میں تم بھلے نہ رکتے' غم میں ایسی باتوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے' اسی دنیا کے رہنے والے ہیں ہم بھی..... تم بھی..... اور وہ لوگ بھی جو ایسی کوتاہیوں پہ سو سو باتیں بناتے ہیں۔ کیا پروین کے رشتے دار دبے الفاظ میں اسے یہ بات محسوس نہیں کروا رہے ہوں گے۔"

"دبے الفاظ میں کیوں؟" سراج دین نے طنزیہ کہا۔ "ایسے مہذب نہیں ہیں وہ..... منہ پھاڑ پھاڑ کے جتا رہے ہوں گے۔ اللہ موقع دے ان لوگوں کو زبان کے زنگ اتارنے کا۔"

"جب یہ بات جانتے ہو پھر رک جاتا تھا ایک رات۔ آخر تم اس گھرانے کے داماد ہو۔ تمہاری بھی کوئی ذمہ داری بنتی ہے۔ نوید کو ہوش ہی کہاں ہے جو کچھ کرے گا اور وہ ٹھہرا اس گھر کا اکلوتا مرد۔ تم ہوتے تو کل ہونے والے ختم قرآن شریف وغیرہ کا انتظام دیکھ لیتے۔"

"اور وہ جو ہیں..... میری ساس محترمہ....." سراج دین کے لہجے میں تنفر ہی تنفر تھا۔ "ان کا مشہور زمانہ مقولہ 'شمشاد سو مردوں پہ بھاری ہے۔'" "ہاں جی! آپ جو بار بار ایک ہی بات میرے دماغ میں زبردستی کیوں ٹھونسنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں اس جگہ دو منٹ سے زیادہ نہیں گزار سکتا۔ یہ دو منٹ بھی میں نوید جیسے شریف اور بھلے انسان کی وجہ سے گزار لیتا ہوں' ورنہ پروین کی ماں جیسی عورت میں چند سیکنڈ بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔"

"شرم کرو سراج دین! تمہارا انداز بھی برا ہے' لہجہ بھی اور الفاظ بھی۔ میں نے تمہیں یہ تربیت نہیں دی۔" شوکت جہاں نے ٹھہر کا تو وہ ذرا ڈھیلے ہوگئے۔

"یہ آپ کی تربیت ہی تو ہے کہ میرے دل میں جو بھی ہے' میں اس عورت کے منہ پہ اس کا اظہار کرنے سے گریز کرتا ہوں۔"

"تمہیں دل بھی صاف رکھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہوکہ یہ چیز تمہارے اور پروین کے تعلقات پہ اثر انداز ہو۔"

"اثر انداز تو ہوتی ہے۔" انہوں نے اعتراف کیا۔

"پروین سے سچ برداشت نہیں ہوتا اور اپنی ماں کے بارے میں تو بالکل بھی نہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ کون جانتا ہوگا ان کے بارے میں۔ اس کے باوجود بحث پہ اتر آتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس بے چاری کے سامنے بھی اپنے بے کار خیالات کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے۔ چہ چہ..... کیا گزرتی ہوگی اس پہ..... کیسے سنتی ہوگی وہ..... ؟ کوئی بیٹی اپنی ماں کے بارے میں یہ سب نہیں سن سکتی۔ کتنے بے حس انسان ہو تم۔ تمہیں ضرورت کیا ہے پروین کے سامنے اس کی ماں کی خامیاں نکالنے کی۔ تمہیں پروین سے مطلب ہونا چاہیے۔ اس کی ماں کیسی ہے' اچھی یا بری..... ؟ اس پر کڑھ کڑھ کے اپنا گھر کیوں خراب کرتے ہو۔ پروین ایک اچھی لڑکی ہے۔ سادہ لوح ہے' معصوم ہے..... تمہارا گھر بار' تمہارے بچے سب کچھ ذمہ داری سے سنبھال کر بیٹھی ہے' تمہاری ماں کی عزت کرتی ہے اور تمہیں کیا چاہیے۔"

"بالکل..... یہی تو میں کہنا چاہ رہا ہوں..... کچھ بھی نہیں اور کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے۔ کوئی لمبی چوڑی رشتہ داریاں اور تعلق داریاں نہیں نبھانا مجھے۔ ابھی آپ نے خود کہا ہے کہ تمہیں صرف پروین سے مطلب ہونا چاہیے تو..... میرا صرف اس سے واسطہ ہے' اس کے پورے خاندان سے تعلقات خوشگوار رکھنے کا میں نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔"

"واہ..... کیسی بات پکڑی ہے' تم تو میرے منہ میں ہاتھ دیے بیٹھے ہوکہ ادھر میری زبان پھسلے' ادھر تم پکڑو۔" شوکت جہاں نے ناراض انداز میں داد دی۔

"تم کبھی نہیں سدھر سکتے۔" وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھنے لگیں۔

"میرا ہی دماغ خراب ہے جو تم پہ سر کھپاتی ہوں۔"

"تو میں نے منع تھوڑا ہی کیا ہے اماں جی! آپ بیٹھیں نا' کیجیے شوق سے سر کھپائی۔"

سراج دین کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دونوں شانوں سے تھام کے ماں کو واپس اپنے بیڈ پہ بٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔

"میں سدھروں یا نہ سدھروں' وہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ آپ اپنی کوشش جاری رکھیے' یہ آپ کا حق ہے اور فرض بھی۔"

"ہاں..... نہ حق ادا ہوپاتا ہے' نہ ہی فرض پورا کرپاتی ہوں۔" وہ بیٹھ گئیں مگر بدستور خفا خفا سی تھیں۔ سراج کی

مسکراہٹ بھی انہیں موم نہیں کر رہی تھی۔

"بچپن سے تو ایسا ہے' ایسا ہی بحث کرنے والا۔۔۔ اپنی من مانی کرنے والا۔۔۔ ضدی اور گستاخ۔ اب خیر سے بال بچوں والا ہو گیا ہے' اب تو شرم کر۔ اب بھی یونہی ماں سے بحث کرتا رہتا ہے۔ کل کو تیرے بچے کیا خاک عزت کریں گے میری۔"

ان کا طرزِ تخاطب یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اوپر سے وہ بھلے خفا نظر آ رہی ہوں مگر اندر سے بیٹے کا لمس پاتے ہی پگھل گئی تھیں۔ ان کے پیار کا انداز یہی تھا کہ وہ سراج دین کو "تم" کی بجائے "تو" کہہ کر پکار رہی تھیں۔

"کیوں نہیں کریں گے' ٹانگیں نہ توڑ کے رکھ دوں گا میں نالائقوں کی۔"

"جب باپ کو میرے ساتھ جو تیں لڑاتا دیکھیں گے تو خود بھی یہی کریں گے اور بڑا آیا ٹانگیں توڑنے والا میرے پوتوں کی۔ ٹانگیں تڑوا کے کیا کوئی عزت کرنے لگتا ہے؟"

"جب آپ سب جانتی ہیں تو سمجھتی کیوں نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ٹانگیں تڑوا لینے کے بعد واقعی کوئی عزت کرنے نہیں لگ جاتا۔ یہ واحد جذبہ ہے جو زبردستی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ آپ مجھے پروین کی ماں کی عزت کرنے پہ مجبور نہیں کر سکتیں' اس لیے ایسی کوشش کیا بھی نہ کریں۔"

شوکت جہاں نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کبھی کبھی انہیں اپنا بیٹے کا مؤقف درست لگتا تھا۔ شمشاد جس مزاج اور فطرت کی عورت تھی' اس کا اندازہ انہیں بخوبی تھا اور آج اس کا ایک افسوس ناک مظاہرہ وہ دیکھ بھی چکی تھیں۔ انہیں بھی کوئی شوق نہیں تھا سراج دین کے دل میں شمشاد کے لیے عزت و احترام اور پیار و محبت کے جذبات جگانے کا۔ ہاں مگر وہ دل سے پروین کو پسند ضرور کرتی تھیں اور اس کی خوشی کے لیے چاہتی تھیں کہ سراج اپنی سوچ کچھ تبدیل کر لے۔ اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو کم از کم اس کا بے دھڑک اظہار کرنے میں ہی محتاط رہے۔ دنیا داری کے لیے ہی کچھ لحاظ سے کام لے مگر وہ اس پہ بھی تیار نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"بڑی خاموشی ہے آج تو گھر میں۔"

اتوار کا دن تھا' پونے ایک بجے اصغر جاگا اور انگڑائیاں لیتا کمرے سے نکلا۔

"بتی گئی ہوئی ہے۔" شمیم نے برا سا منہ بنا کے اطلاع دی۔

"تو کیا اس گھر کے بندے بھی بتی سے چلنے لگے ہیں کہ لائٹ گئی تو سارے ٹھس۔"

وہ بڑی سی جمائی لے کر صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ جاتی سردیوں کے دن تھے' اب ہیٹر' سویٹر اور شال وغیرہ کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی تھی مگر پنکھے کے بغیر بھی با آسانی گزارا ہو جاتا تھا' اسی لیے صبح سے لائٹ نہ ہونے کے باوجود اصغر کی نیند میں کوئی خلل نہ پڑا تھا۔

روشنی کے لیے لاؤنج کے پردے ہٹا دیے گئے تھے۔ کھڑکی کے ساتھ رکھے بڑے سے تخت پہ نصرت سبزیوں کا ڈھیر پھیلائے بیٹھی تھی اور شمیم بیزار سی شکل بنائے سنڈے میگزین میں سے اپنی دلچسپی کی کوئی چیز تلاش کر رہی تھی۔

"بتی آ رہی ہو تو ذرا رونق رہتی ہے اور کچھ نہیں تو شمیم کا ڈیک ہی بجتا رہتا ہے۔ ٹی وی پہ بھی شور شرابا ہوتا رہتا ہے' فریج کی آواز' ڈیپ فریزر کی آواز' اب سویرے سے الو بول رہے ہیں۔"

نصرت نے شمیم کے بیان کی وضاحت کی۔

"آج تو اوپر بھی بڑی خاموشی ہے۔"

اصغر نے بھائی بھابھی کے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

"دلیلی مجنوں سویرے ہی سویرے سیر سپاٹے کرنے نکل گئے ہیں۔" شمیم نے پہلے سے بھی زیادہ برا منہ بنا کر کہا۔

"آخر چھٹی ہوئی ہے پکنکیں منانے کی۔ تیار شیار ہو کے' نیا جوڑا پہن کے' منہ لال کر کے' ہاٹ پاٹ میں کباب اور تلی مچھلی بھرتے ہوئے چھمک چھلو نے ایک بار بھی ساس نند کو ساتھ لے جانے کی صلاح نہیں دی۔۔۔۔ ہم انسان نہیں' ہمارا دل نہیں کرتا باہر جانے کو' گھومنے پھرنے کو۔ اماں نے تو ابا کے دم پہ عیش کر لیے' میرے بارے میں کسی نے کبھی نہیں سوچا۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے' کون سا میرے سارے ارمان پورے ہو گئے ہیں۔ میرا بھی دل کرتا ہے باہر جانے کو مگر میری قسمت میں اس جیل میں بیٹھ کے ٹی وی دیکھنا اور گانے سننا رہ گیا ہے اور ایک وہ حرافہ ہے۔۔۔ کیسے عیش کر رہی ہے یہاں آ کر' ٹھاٹ دیکھو ذرا۔۔۔ ایک سے ایک نیا کپڑا۔۔۔ سیر سپاٹے۔۔۔ کھانا پینا۔۔۔"

"اس کو کیا الزام دینا' جب اپنا سکہ ہی کھوٹا ہے۔" نصرت نے آہ بھری۔

اگرچہ وہ منزہ پہ دل کی بھڑاس باقاعدگی سے نکالتی رہتی تھی مگر دل سے یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے مظہر کو کوئی خاص پٹی نہیں پڑھا رکھی بلکہ اس کے حسن اور عشق نے ضرور اس کے بیٹے کی آنکھوں پہ پٹی باندھ رکھی ہے۔ دل ہی دل میں وہ پکا ارادہ کیے بیٹھی تھی کہ اصغر کی دفعہ وہ ایسی غلطی نہیں کرے گی۔ ایسی حسن بانو کو ہرگز بہو نہ بنا کے لائے گی کہ اس کے آگے اصغر کو ماں بہن نظر آنا ہی بند ہو جائے۔ ویسے بھی ان کے اللے تللے اصغر کی بدولت ہی چلتے تھے۔ مظہر کو باپ کی دکانداری نما کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اعلا تعلیم یافتہ تھا اور ایک اچھی ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پہ تھا۔ وہ ہر ماہ ماں کو اخراجات کے لیے معقول رقم ضرور دیتا تھا مگر اس کی تنخواہ اتنی بھی نہیں تھی کہ بیوی اور بیٹی کے اخراجات کے بعد ان کی فرمائشیں پوری کرتا۔ یہ بھی اس کی اچھائی تھی کہ اپنی جاب پہ لگ جانے کے بعد اس نے کبھی پلٹ کے چھوٹے بھائی سے سوال نہ کیا تھا' نہ ہی باپ کے کاروبار سے ہونے والی آمدنی میں سے اپنا حصہ طلب کیا تھا مگر اس کی اس اچھائی کا کبھی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ یہ لوگ اچھائیاں تسلیم کرنے والے نہیں بلکہ کمزوریاں اچھالنے والے تھے۔

"بھابھی کا گلہ کر رہی ہے' یہ بتا کہ بھائی نے تجھے جھوٹے منہ بھی پوچھا؟ وہ پوچھ لیتا تو بھابھی کیا کر لیتی مگر اسی کی تو شہہ ہے اس چھوکری کو۔ جانتی ہے کہ میاں مٹھی میں ہے۔"

"غلطی تو ساری میرے اپنے بیٹے کی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ایسا جورو کا غلام نکلے گا۔"

وہ چبا چبا کے کہتی اس بے دردی سے شلجم کاٹنے لگی' جیسے چھری کی زد میں سبزی نہیں' منزہ کی گردن ہو۔

"جن کے دل میں ماں اور بہنوں کی قدر ہوتی ہے' آسمان سے اتری حوریں بھی ان کو نہیں بدل سکتیں۔ اب مجھے ہی دیکھ' تیرا باپ کیا بیچتا ہے میرے آگے۔ نری شکل و صورت ہی نہیں' خاندان بھی تگڑا تھا میرا۔ تیرے دادکے (ددھیال) تو "تیلی" تھے پیچھے سے اور ہم زمین دار لوگ۔ بس مقدر میں لکھا تھا تیلیوں کے گھر بسنا' بس گئی۔ تیرا باپ تو میرے پیر بھی دھو دھو کے پیتا تو کم تھا مگر اس کے کلیجے میں رہ رہ کے اپنے ماں پیو کی پیڑ (درد) جاگتی رہتی تھی۔ میں نے تو نہ فائدہ اٹھایا اپنی خوبصورتی کا۔ صبر کے ساتھ گزارا کیا۔ اس آس پہ کہ چلو میری اولاد بھی اپنے باپ پہ جائے گی۔ میری اولاد بھی بیوی کے بجائے ماں کی سنا کرے گی مگر۔۔۔"

وہ ہل ہل کے افسوس میں جھومنے لگی۔ یہ اس کا افسوس کرنے کا منفرد اور مخصوص انداز تھا۔

"جوانی ساس کے ساتھ صبر کرتے گزار دی اور اب بڑھاپا بہو کو برداشت کرنے میں خوار ہو رہا ہے۔"

اس کے بیان کی تصدیق شمیم اور اصغر اس لیے نہ کر سکے کہ اپنے ہوش میں انہوں نے اپنے ددھیال والوں کو زیادہ دیکھا ہی نہ تھا۔ آنا جانا' ملنا ملانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ نصرت نے بہت جلدی ان لوگوں سے چھٹکارا پا لیا تھا اور تردید کرنے کا حوصلہ ان میں اس لیے نہ تھا کہ اس صورت میں ماں کا اگلا پچھلا سارا غصہ ان دونوں پہ نکل سکتا تھا۔ "یہ تو مجھے بددعا لگی ہے کسی کی جو ایسے بیٹے پیدا ہوئے ہیں۔"

اس نے اصغر کو گھورتے ہوئے کہا جو سنڈے میگزین کے ٹائٹل پہ چھپی ماڈل کا کلوز اپ۔۔۔ کچھ اور کلوز کرتے ہوئے بڑا مگن سا بیٹھا تھا۔ اس جملے کی کاٹ نے اسے توجہ ہٹانے پہ مجبور کیا۔

"اب میں نے کیا کیا ہے؟"

"نہیں تُو نے تو کچھ نہیں کیا۔ تُو نے تو ابھی کرنا ہے۔" پھر اس نے شمیم کو مخاطب کیا۔

"اگر بیویاں آنے سے بیٹے خراب ہوتے ہیں تو بتا تیرے اس چھوٹے بھائی کو کون سی بیوی نے خراب کیا ہے۔ پہلے یہ بھی تیسرے چوتھے دن ہمیں گاڑی میں بٹھا کے کبھی شادمان آئس کریم کھلانے، کبھی انار کلی شاپنگ کرنے تو کبھی نہر پہ لے جاتا تھا۔ اب مہینہ مہینہ گزر جاتا ہے، کبھی نہیں پوچھا۔ خرچ کے علاوہ دوسرے پیسے دیتے ہوئے سو سو بہانے بھی کرنے لگا ہے۔ ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے میں نے بازار کا چکر نہیں لگایا۔ یہ ہاتھ میں کچھ دے تو جاؤں۔"

مظہر گھر پر نہیں تھا، اس لیے آج اصغر کی شامت آ گئی۔

"ناشتہ ملے گا یا باہر سے کر آؤں۔" وہ ماں کی تفتیش نظر انداز کرتا ہوا چپل پہننے لگا۔

"اتوار والے دن تو باہر کا ناشتہ ہی اچھا لگتا ہے۔ میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ فضل کے سری پائے کھاتے ہیں یا پھر وارث والوں کی نہاری۔"

شمیم فوراً تیار ہو گئی۔

"میں نے ایک دوست کی طرف بھی جانا ہے تو گھر بیٹھ۔"

"بس۔۔۔ دیکھ لیا۔" نصرت نے فوراً جتایا۔

"گھر ہی تو بیٹھی ہوں۔ پتہ نہیں اور کتنا عرصہ گھر بٹھانا ہے۔" شمیم موقع ملنے پہ اپنی شادی نہ ہو سکنے کا طعنہ دینے میں کبھی نہ جھجکتی تھی۔

"اب یہ بھی میرا قصور ہے۔ ایک تو چھٹی والے دن ہی گھر سکون سے بیٹھنے کا موقع ملتا ہے، تم دونوں کو یہ بھی گوارا نہیں۔ ہاتھ پیر ہلا کے ناشتہ بنا کر دیا نہیں جاتا۔۔۔ زبان چلا کر طعنے ضرور دیے جاتے ہیں پھر روتا روتے ہیں کہ بیٹے پوچھتے نہیں، اسی لیے تو وہ بھی چھٹی والے دن بیوی بچے کو لے کر گھر سے نکل جاتا ہے۔"

بھوکے پیٹ بھی اس کی آواز چھت پھاڑنے لگی۔ نصرت کیوں بیٹے سے دبتی، چھری ایک جانب پھینک کر وہ تخت سے اتری۔

"ہاں تُو تو اس کی حمایت کرے گا، تجھے کھلی چھوٹ جو دے رکھی ہے اس نے کہ باپ کی جائیداد جیسے مرضی اجاڑ۔ کوئی تجھے پوچھنے والا نہیں، اس لیے زیادہ ہی کھلتا جا رہا ہے۔ تیرے تو شادی سے پہلے ہی پر پرزے نکلے ہوئے ہیں، عورت لانے کے بعد تو تو ہمیں نچائے گا۔"

"پتہ نہیں کون کس کو نچاتا ہے، کون بد قسمت آتی ہے تم دونوں کے ہتھے چڑھنے۔"

"تو نہ لانا۔۔۔ میں کون سا گھسنے دوں گی۔ ایک زن مرید کافی ہے میرے سینے پہ مونگ دلنے کو۔ تو اپنی پسند کی بیوی لایا تو میں باہر سے چلتا کر دوں گی۔ جہاں مرضی ہو، وہیں رہنا۔ میں نے ادھر جورو کے غلاموں کا اڈا نہیں کھولنا۔"

"واہ۔۔۔ کیوں جاؤں میں؟" وہ باہر نکلتے نکلتے رک گیا۔

"اچھا ہوا اپنے ارادے منصوبے پہلے بتا کر ہوشیار کر دیا ہے۔ بیوی تو میں اپنی پسند کی لاؤں گا۔ تم دونوں کا بس چلے تو کوئی لولی لنگڑی لا کے میرے متھے مار دو یا گونگی بہری جو تمہارے آگے دم نہ مار سکے گھر میں تمہاری ٹکر کی بیوی لاؤں گا۔ بھابھی جیسی نہیں جو دبک کے کمرے میں بیٹھ جاتی ہو اور اس گمان میں مت رہنا کہ لا کے کہیں اور بساؤں گا، یہ گھر میرے باپ نے بنایا تھا اور مکمل میں نے اپنی محنت سے کیا ہے۔ اپنی پڑھائی چھوڑ کے اس کاروبار میں لگا اور ہزار کی جگہ لاکھ کما کر دیے۔ یہ کمروں میں بچھے قالین، صوفے، ٹی وی، اے سی، باہر کھڑی گاڑی۔۔۔ کچن میں رکھا اونچا لمبا فریج اور دوسری مشینیں۔۔۔ بینک میں رکھا زیور۔۔۔ یہ سب میری کمائی سے بنا ہے۔ گیا تو سب ساتھ لے کر جاؤں گا اور دیکھوں گا کون دوبارہ بنوا کے دیتا ہے۔ اس شمیم کو بٹھانا پھر میری گدی پہ جس کے آگے بیٹے نظروں میں نہیں سماتے یا پھر مظہر سے مانگنا جس سے کبھی بنا کے نہیں رکھی۔ دیکھتا ہوں اپنی تنخواہ میں سے یہ شاہانہ خرچے پورے کرے گا۔ مجھے دھمکی دے رہے ہیں گھر سے نکالنے کی۔ ہونہہ۔۔۔ اچھی طرح کرتا ہوں، میں ان کی پسند سے شادی۔"

وہ اچھی طرح دھاڑنے کے بعد گھر سے نکل گیا۔ اتنے آرام سے کبھی نصرت نے کسی کی باتیں نہیں سنی تھیں مگر اب سنانے والے اصغر نے باتیں ہی ایسی کی تھیں۔ چپ چاپ سننے بغیر چارہ ہی کوئی نہ تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے اس نے بھی بڑے کی طرح کوئی گھیر لھار رکھی ہے۔"

شمیم نے اپنا قیاس ظاہر کیا۔

"ہائے۔۔۔ قسمت میری۔۔۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے پھر سے جھومنے لگی۔

"چل بھئی بچے۔۔۔ میں بھی تیری ماں ہوں۔ دیکھتی ہوں کون سی رضیہ سلطانہ بیاہ کے لاتا ہے تُو۔۔۔ ہونہہ میری ٹکر کی لائے گا۔۔۔؟ دوسرے دن ہی ٹکر مار کے کونے نہ لگا دیا تو نصرت نام نہیں۔"

"بتی آ گئی۔" شمیم اچھل کے کھڑی ہوئی۔

"ٹی وی لگا، شاید کوئی اچھی فلم آ رہی ہو۔"

نصرت جو دوپٹہ گول کر کے آنکھوں پہ رگڑتے ہوئے آنسو نکالنے کی تگ و دو میں مصروف تھی، فوراً سب بھول بھال گئی۔

☆ ☆ ☆

وہاں سے جلا بھنا اصغر سیدھا گوالمنڈی پہنچا۔

لاہوری کلچوں کے ساتھ مرغ چھولے اور پائے کھاتے ہوئے وہ مسلسل ریتا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"بس ایک بار وہ مان جائے، ایک بار ہاں کہہ دے، ایمان سے اپنی تو لائف بن جائے۔"

زندگی میں پہلی بار کسی پہ اس کا دل آیا تھا اور دل بھی ایسی جگہ آیا تھا کہ وہ برا پھنسا۔

لڑکپن میں ہی باپ کی بیماری کی وجہ سے اس کے ساتھ کام پہ جانا شروع کر دیا۔ باپ کی شہر میں چلتی ہوئی اسپیئر پارٹس کی دکانیں تھیں۔ بڑا بھائی مظہر کالج میں پڑھتا تھا اور پر ہجوم قسم کے بازار کی تنگ تنگ سی دکانوں میں بیٹھ کے اسپیئر پارٹس بیچنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ ایک تو اصغر کی پڑھائی میں دلچسپی کم تھی، دوسرا اس کا دماغ بھی دو کو چار اور چار کو آٹھ میں بدلنے میں ذرا زیادہ چلتا تھا، اس لیے باپ نے ریٹائر ہونے سے پہلے پہلے اسے اس کاروبار میں سیٹ کر دیا اور اس نے بھی مایوس نہیں کیا۔ کہاں سے کہاں پہنچایا ان دکانوں کو، اب وہ بڑے بڑے شورومز میں تبدیل ہو چکی تھیں اور وہ بھی شہر کی معروف اور مہنگی مارکیٹس میں۔

مگر ان سب میں وہ زندگی کی ہر رنگینی اور لطافت سے دور رہا۔ ماں اور بہن کی فرمائشیں پوری کرنے میں ہی مشین بنا رہا۔ ہوش آیا جب مظہر اپنی پسند کی بیوی لے کر آیا۔ اسے منزہ پسند آئی تھی، یہ الگ بات کہ اس نے بھی ماں کے سامنے اس کی تعریف کرنے یا اس کی حمایت میں ایک لفظ کہنے کی غلطی کبھی نہیں کی تھی۔ ان ہی دنوں گھر میں آئے دن ہونے والی چپقلش سے بیزار ہو کے اس نے دوستوں کے ساتھ باہر وقت گزارنا شروع کر دیا اور تب ہی وہ ریتا سے ملا۔

ریتا کا تعلق اس بازار سے تھا، یہ الگ بات کہ وہ وہاں رہتی نہیں تھی۔ اس کی ماں شمع کی بڑھاپے کی اولاد تھی۔ پیسے۔۔۔ شمع نے جوانی کے بچے کھچے ایام میں ایک عام سے، مڈل کلاس آدمی پہ ہی صبر شکر کر کے گھر بسا لیا تھا۔ اولاد تو تھی نہیں کہ کسی بیٹی کے بل بوتے پہ ہی اپنا کوٹھا آباد کرتی، اس لیے یہی غنیمت لگا کہ عمر کے اس حصے میں بھی کسی شریف آدمی کی بیوی بن کے زندگی گزارنے کا موقع مل رہا ہے، اس رو کھی پھیکی۔۔۔ گزارے لائق زندگی کو پہلا جھٹکا تب لگا جب شادی کے تیسرے سال اس کے ہاں رانی کی پیدائش ہوئی جبکہ وہ ایسی کوئی بھی امید چھوڑ چکی تھی۔

اگر رانی بچپن میں ذرا سی بھی خوبصورت ہوتی تو ضرور شمع کا دل للچا جاتا' وہ اس بڈھے بدصورت شوہر پہ لعنت بھیج کر طلاق لے کر دوسرے دن ہی کوٹھے پہ آجاتی مگر لڑکی بالکل اپنے باپ پہ تھی۔

رانی چھ سات سال کی تھی جب اس کے باپ کی وفات ہوئی' پینتالیس سالہ شمع جیسے تیسے گزارا کرنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ رانی کے جوان ہونے کا انتظار۔ اس نے اچھا بھلا مکان چھوڑ کے پچھلے محلے جانا گوارا نہ کیا۔ ویسے بھی اب وہاں کے لوگ عام رہائشی علاقوں میں دھڑلے سے آباد ہو چکے تھے۔ البتہ اس کے مراسم وہاں والوں سے پھر استوار ہو گئے۔ گھر کا ماحول قریباً قریباً وہی تھا۔ رانی اسی ماحول کے اثرات لے کر بڑی ہوئی۔ اب وہ اپنی بچپن کی ان سہیلیوں کے ساتھ محفلیں سجانے لگی جو اس کی ماں کی سہیلیوں کی بیٹیاں تھیں۔

ایسی ہی کسی محفل میں اصغر سے ملی اور وہ جی جان سے اس پہ فدا ہو گیا۔ حالانکہ وہاں موجود بہت سی لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت نہیں تھی مگر دل کا کیا کیجیے' اصغر کا دل اسی پہ آگیا۔

وہ گاہے بگاہے وہاں جانے لگا' تحائف کے ہمراہ۔۔۔ عیاش فطرت نہ تھا بلکہ واقعی عاشق ہو بیٹھا تھا اس پہ' اس لیے شادی کا ذکر بھی کر بیٹھا۔

شمع شاید اس کی توقع نہ کر رہی تھی' اس لیے حیران ہوئی۔

"شادی۔۔۔؟ تم جانتے ہو لڑکے! کیا کہہ رہے ہو؟ رانی میری اکلوتی بیٹی ہے اور ابھی تو اس کا وقت شروع ہوا ہے۔ اس کی شادی کرنے کا مطلب پتہ ہے؟ میرا کباڑہ۔۔۔ ایسا گھاٹے کا سودا۔۔۔؟ ہاں کوئی منافع بخش بات کرو تو سوچا بھی جائے۔"

اصغر گڑبڑا کے رہ گیا۔ شمع سے اس کی لڑکی کا ہاتھ مانگتے ہوئے یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ کس طرح کی صورت سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ رہا ہے۔ طوائفیں بھی بیٹیاں دیتی ہیں مگر ان شرائط پہ نہیں جن پہ شریف زادیاں بیاہی جاتی ہیں۔

"جو آپ چاہیں' ویسا ہی ہو گا آنٹی جی! آپ کو تو پتہ ہے کتنا بڑا کاروبار ہے میرا۔ ذاتی گھر' گاڑی۔۔۔"

"بس بس رہنے دو' تم اپنی چند لاکھ کی جائیداد کا رعب کیا ڈال رہے ہو۔ پچیس تیس لاکھ تو میری رانی ویسے بھی اگلے دو تین سالوں میں مجھے کما کر دے دے گی۔" "میں اسے بہت خوش رکھوں گا۔"

"تو ادھر کون سا کیڑے کاٹ رہے ہیں اسے اور تم کیا جانو ہم جیسوں کو خوش کیسے رکھا جاتا ہے۔"

"آپ ایک بار رینا سے پوچھ تو لیں۔"

اصغر کو آس تھی' وہ رینا کی خریدی ہوئی مسکراہٹ اور توجہ کو محبت سمجھ رہا تھا۔

اس کی اس بات پہ شمع کو ہنسی آگئی جس کو اس نے کمال مہارت سے چھپا لیا۔

اصغر کے بارے میں اپنی بیٹی کے اصل خیالات سے وہ بخوبی واقف تھی۔ پھر بھی اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' بات کروں گی۔ یہ بات کان کھول کے سن لو' وہ راضی بھی ہوئی تب بھی میں سارا نفع نقصان ذہن میں رکھ کے ہاں کروں گی۔ اور ہاں۔۔۔ تم اپنی طرف سے رانی سے ایسی کوئی بات نہ کرنا۔ ورنہ سارا معاملہ بگاڑ مجھے اچھی طرح آتا ہے۔"

اس نے دھمکی دی۔ دراصل اسے ڈر تھا کہ اصغر سے شادی کی پیش کش کا سن کر رانی بدک نہ جائے وہ پہلے ہی اس احمق عاشق سے خار کھاتی تھی۔ ماں کے رعب میں برداشت کر لیتی تھی۔ لیکن اصغر کو واقعی امید بندھ گئی۔

"جو بھی ہے' شادی تو رینا سے ہی ہو گی۔ چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔ کیا ہے یہ کاروبار۔۔۔ یہ دکانیں یہ پیسہ۔۔۔ یہ گھر۔۔۔ سب اس کے نام کر دوں گا اگر وہ زندگی میرے نام کر دے۔ ویسے بھی شادی جس سے ہو گی میرا سب کچھ اس کا ہی ہو جائے گا تو رینا کیوں نہیں۔"

جیسے جیسے اس کا پیٹ بھرتا جا رہا تھا' وہ اپنے ارادے کو مزید پختہ کرتا جا رہا تھا۔

رینا اس وقت جعفر محمود کے ہمراہ ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھی۔ نیوی بلیو ساڑھی اس نے بڑے اسٹائل سے باندھ رکھی تھی جو اس کے بے حد قاتل تناسب والے فگر پہ خوب جچ رہی تھی۔ یہ رنگ بھی اس کی دہکتی ہوئی رنگت کو نکھار رہا تھا۔

کانوں میں اس نے نیلم کے وہ ٹاپس پہن رکھے تھے جو کچھ دیر پہلے جعفر محمود نے اسے دلائے تھے' یہ ساڑھی بھی پچھلی کسی ملاقات کا تحفہ تھی۔ دوسرے بہت سے تحائف کی طرح۔

"آپ کبھی مجھے اپنے گھر کیوں نہیں لے کر جاتے۔"

رینا نے جعفر کو بڑی کھلی ڈلی آفر کی۔ ریسٹورنٹ اور شاپنگ سینٹرز پہ ہونے والی گفتگو ڈیڑھ گھنٹہ کی ملاقاتوں سے اس کی تسلی نہ ہوتی تھی۔

"گھر۔۔۔؟ وہ کس لیے بھئی؟ کیا ضرورت ہے۔ مل تو لیتے ہیں ہم۔" وہ ذرا سا گھبرا گیا پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتا ہوا کچھ سنبھل کے کہنے لگا۔

"اوے' اتنا ڈرتے کیوں ہیں آپ' آپ تو یہاں اکیلے رہتے ہیں نا' آپ کی فیملی تو اسلام آباد ہوتی ہے۔"

"ہاں' میں اکیلا رہتا ہوں اسی لیے تمہیں اپنے گھر لے جانا نہیں چاہتا۔ یہ مناسب نہیں لگتا۔"

اس کی بات رینا کو ہواؤں میں اڑانے لگی۔ وہ کوئی ایسی بھولی بی بی یا پارسا بھی نہ تھی۔ اس کے ساتھ اکیلے گھر جانے کی فرمائش اس نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی کی تھی۔ وہ اپنے اور جعفر کے دوستانہ تعلقات کو اب کوئی نیا موڑ دینا چاہتی تھی۔ کوئی بہت ہی جذباتی موڑ۔

مگر اس کی توقع کے برعکس جعفر نے اسے اپنے گھر لے جانے سے معذرت کر لی۔ اسے برا لگا۔ مگر اس کی وجہ جان کر اس کا سارا گلہ جاتا رہا۔ اسے لگا آج جعفر محمود جیسے نفیس' عزت دار اور پڑھے لکھے انسان نے اسے ایک بازاری عورت سمجھنے کی بجائے جو ایک باعزت عورت والا احترام دیا ہے۔ اس کے بعد وہ یقیناً اپنی منزل کو پا لے گی۔

"پہلے صرف پسندیدگی کا اظہار ہوا تھا۔ اب وہ میری عزت بھی کرتا ہے۔ میری' یعنی رینا کی' جسے پتہ ہی نہیں عزت کیسے کی جاتی ہے۔ جب وہ مجھ جیسی لڑکی کو عزت دے سکتا ہے تو محبت کیوں نہیں۔ وہ دن دور نہیں جب یہ شخص مجھ سے محبت کا اظہار کر رہا ہو گا۔ میرا ساتھ طلب کر رہا ہو گا۔ اسی دن کا تو انتظار ہے مجھے۔"

وہ مسرور ہو کے سوچنے لگی۔

جعفر محمود سے اس کے بڑھتے تعلقات' باقاعدگی سے ملنا ملانا یہ سب اس کی شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا' وہ جان گئی تھی جعفر کے مزاج میں کتنی نفاست' شائستگی اور وقار ہے۔ وہ اس کے سامنے شائستگی کے ساتھ آتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس عام سی شکل و صورت۔۔۔ مگر پرکشش سراپا اور مکمل ذہانت رکھنے والی لڑکی کا اسیر ہونے لگا تھا۔

بے شک یہ سب رینا بہت سوچ سمجھ کے کر رہی تھی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ جعفر محمود صرف ایک خواب تھا۔ ایک ایسا خواب' جو ہر طوائف عمر کے ایک حصے میں ضرور دیکھتی ہے یعنی ایک مالدار' صاحب حیثیت' صاحب جائیداد اور عزت دار شخص کے نام کا حوالہ پا کر معتبر ہونے کا خواب۔

جعفر [illegible] بھی اب اس خواب سے بڑھ کے بہت کچھ ہو چکا تھا۔ وہ شدت سے اسے چاہنے لگی تھی۔ ہر نیا دن اس شدت میں اضافہ کر جاتا۔

نئی ملاقات اس محبت کو دو آتشہ کر جاتی۔

جتنی یہ محبت زور پکڑتی جا رہی تھی۔ جعفر کو پانے کی طلب بھی اتنی ہی منہ زور ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" جعفر نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔

"جو میں سوچ رہی ہوں' وہ کیسے کہہ دوں؟" اس نے آہستہ مگر شوخ آواز میں کہا تو جعفر کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے رینا کی یہی محتاط سی بے باکی۔۔۔ باادب سی شوخی تو پسند تھی۔

"کہہ دوں' کیا؟" رینا نے سرگوشی کی۔

"اوں ہوں..." وہ آگے کو جھکا اور اس کی جذبے لٹاتی آنکھوں میں جھانکا۔
"کچھ باتیں ان کہی رہنے دو... اچھا لگتا ہے۔"
ہر بار وہ اس کی کسی نہ کسی انداز میں کی ہوئی پیش قدمی پہ یونہی بند باندھ دیا کرتا تھا اور ریتا ہمیشہ جھجک کر چپ ہو جاتی' یہ جھجک بھی جعفر کی بارعب شخصیت کو سامنے پا کے اس کے اندر عود کر آتی' ورنہ وہ ایسی کہاں تھی۔
"وہ مرد ہو کے اتنے محتاط' اتنے باادب ہیں۔ اپنی عورت کو اتنا کھلا ہوا دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔ مجھے فی الحال ان کی پہل کا انتظار صبر کے ساتھ کرنا ہو گا ورنہ مجھے لیلیٰ' سوہنی اور برکھا کی صف میں کھڑا کرنے میں وہ ایک پل کی دیر نہیں لگائیں گے۔"
یہی سوچ کر وہ دل کی بات ہونٹوں تک لاتے لاتے رہ جاتی۔
دوسری جانب جعفر نے بھی شاید یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ ریتا کو اس خاص حد سے بڑھنے نہیں دے گا۔ یہ حد جو اس سے دوستی کے نام پہ خود عائد کر رکھی تھی۔
جعفر مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا اور اب اپنی اعلا سرکاری ملازمت کی وجہ سے اپر کلاس کا کہلاتا تھا۔ اس کے خاندان کا ماحول تعلیم یافتہ مگر روایتی تھا۔ بعض کے ہاں اب تک پردے کی پابندی ہوتی تھی۔ وہ کو ایجوکیشن میں بھی نہ پڑھا تھا اس لیے صنفِ نازک سے دوستی کا ارمان ضرور رہا مگر پورا نہ کر سکا۔ اب کلاس امپروو کر جانے کے بعد اس کا حلقۂ احباب بھی تبدیل ہوا مگر اسلام آباد میں اپنی فیملی کے درمیان رہتے ہوئے وہ ایسی دوستیاں کھلے عام افورڈ نہ کر سکتا تھا۔ لاہور میں اکیلے رہنے کا موقع ملا۔ چند بے فکر دوستوں کی بدولت ریتا سے بھی ملاقات ہوئی تو برسوں پرانی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔
کسی حسینہ سے فلرٹیشن کا تجربہ حاصل کرنے کی خواہش جو شاید ہر مرد کے اندر کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی مقدار میں ہوتی ہے۔
کہیں بڑھ کے ہوس اور عیاشی تک جا پہنچتی ہے۔
اور کہیں جعفر کی طرح صرف وقت گزاری کی بے ضرر سی تمنا۔
زیادہ بازاری ناز و ادا اور کھلا پن اس کی نفیس فطرت اور ذوق پہ گراں گزرتا تھا۔ دوسری جانب اپنی فیملی اور دوسرے ملنے ملانے والوں میں پائی جانے والی گھریلو' سادہ اور ___ جھجکتی شرماتی خواتین میں بھی وہ کوئی کشش محسوس نہیں کرتا تھا۔
ریتا کی صورت میں اس کی وقتی تسکین ہو رہی تھی۔ وہ شوخ اور بے باک ضرور تھی مگر چھچھوری اور بھونڈی حرکتیں کرنے والی کوئی عام بازاری لڑکی نہیں لگتی تھی۔
اب جعفر کی شامیں خوشگوار گزرنے لگیں۔ کبھی کسی ریسٹورنٹ میں' کبھی کسی پارک میں' کبھی لانگ ڈرائیونگ کرتے ہوئے تو کبھی شاپنگ کرتے ہوئے۔ اس شہر میں اس کے جاننے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اسی لیے اسے کوئی خوف بھی نہ تھا۔ آج کل وہ بتیس سال کی عمر میں' بائیس سال کی عمر والی تازگی محسوس کر رہا تھا۔
مگر کچھ دنوں سے ریتا کے انداز اسے چونکانے لگے تھے۔ شاید وہ اس دوستی' اس ہلکے پھلکے فلرٹ کو کسی اور رشتے یا کسی اور تعلق میں بدلنا چاہتی تھی۔ یہ وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نوبت یہاں تک نہ پہنچے کہ اسے ریتا سے صاف الفاظ میں بات کرنی پڑے۔ جب تک معاملہ چل رہا ہے' چلنا چاہیے۔ دوستی کی صورت میں وہ کبھی بھی اپنی راہیں الگ کر سکتا ہے' واپس اپنے شہر لوٹتے ہوئے آرام سے بائے بائے کر سکتا ہے مگر محبت وجبت ___ اگر ریتا نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا تو مصیبت ہو سکتی تھی۔
"پرسوں میں تم سے نہیں مل سکوں گا۔"
اس بار اس نے ویک اینڈ ساتھ گزارنے سے معذرت کر لی۔

"وہ کیوں...؟ اپنے گھر جا رہے ہیں کیا؟"
"نہیں' کچھ دوستوں نے مل کر شکار پہ جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ ساتھ تو دینا پڑے گا۔ آخر دوستی کا معاملہ ہے۔"
"اور یہاں معاملہ کون سا ہے؟" ریتا نے بڑی آس سے پوچھا۔ شاید جواب ملے۔ "دل کا۔"
مگر وہ صاف کنی کترا گیا۔
"یہاں معاملہ مزاج آشنائی کا ہے' یعنی انڈر اسٹینڈنگ کا تم تو میری بات سمجھ سکتی ہو۔ خفا نہیں کرو گی نہ ہی ناراض ہو گی مگر ان دوستوں کو سمجھانا مشکل ہے۔"
ریتا کا موڈ ہو رہا تھا ناراض ہونے کا۔ مگر جعفر کے مان بھرے انداز پہ وہ چپ کر گئی۔ اس کا "مزاج آشنائی" اور "انڈر اسٹینڈنگ" کا دعوا خود کیسے جھٹلا دیتی۔

❦ ❦ ❦ ❦

"بس... یہ خالی ٹاپس ہے..."
شمع نے ہاتھ پہ نیلم جڑے ٹاپس اچھالے جیسے ان کا وزن کر رہی ہو اور ناک چڑھائی۔
"مشکل سے ڈیڑھ دو تولے کے ہوں گے۔ ساتھ میں کوئی ہار' انگوٹھی کچھ بھی تو نہیں ہے۔ لینا تھا تو پورا سیٹ لیتی۔"
"اس کی قیمت اس کے دو تولے سونے میں نہیں' اس میں لگے ان ذرا ذرا سے پتھروں میں ہے مگر تم یہ سب کیا جانو۔"
اس نے ماں کے ہاتھ سے جھپٹ کر دوبارہ کانوں میں پہن لیے۔
"سب جانتی ہوں میں... یا تو وہ لونڈا تجھے الو بنا رہا ہے یا پھر تو مجھے الو بنا رہی ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"یا تو وہ تجھے بے وقوف بنا رہا ہے یا پھر تو مجھے وہ سب دکھانا نہیں چاہتی جو اس سے بٹورا ہے۔ اپنے پاس دبا کے رکھنا چاہتی ہے۔ یہی بات ہے نا؟"
اس نے ٹٹولتی نظروں سے بیٹی کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھا' جہاں آج کل ایک انوکھی سی چمک تھی اور شمع کے محدود تجربے اور علم کے مطابق چہرے پہ چمک صرف "مال" سے ہی آتی ہے۔
"اس کے کہنے پہ تو محفلیں سجانا چھوڑے بیٹھی ہے۔ ایک فون آتا ہے اور بھاگ جاتی ہے اس کے پاس... کئی کئی گھنٹے گزار کے آتی ہے۔ ایسے ہی تو کوئی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ خوب نواز رہا ہو گا تجھے۔ مگر تو کمینی' یہ ساڑھی' یہ بندے... یہ ٹکے ٹکے کی چیزیں مجھے دکھا دیتی ہے۔ اصل مال کو ہوا نہیں لگنے دیتی۔"
"ایسی کوئی بات نہیں۔"
"میں نہیں مانتی۔"
"تو مت مانو... میرا کیا جاتا ہے۔" اس نے خاص پروا نہ کی اور ساڑھی کا پلو سمیٹتی اٹھ گئی۔ اس کے ہر انداز سے سرشاری اور بے نیازی چھلک رہی تھی۔
"اگر تیری بات مان بھی لوں' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خبیث انسان تجھے الو بنا رہا ہے۔"
"یہ آج الو کیوں سوار ہیں تمہارے ذہن پہ۔" وہ بار بار کی تکرار سے اکتا گئی۔
"جو نظر آ رہا ہے وہ کہوں گی۔ یہ تیرے کمانے کے دن ہیں' زندگی کے مزے لوٹنا ہمارا مقصد نہیں' بلکہ زندگی کے مزے لوٹنے والوں کو لوٹنا ہمارا پیشہ ہے' سمجھیں' اب اپنی یہ تفریح' یہ مزے' یہ سیر سپاٹے' یہ عاشقی معشوقی' ان سب کو لگام دے اور سیدھی طرح کام پہ دھیان دے۔"
"کتنی بار کہا ہے' میرے سامنے یہ الفاظ مت استعمال کیا کرو۔" وہ چلا اٹھی۔

"کمائی، پیسہ ان کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا تمہیں۔"

"اور تجھے جو ہری ہری سوجھ رہی ہے، دیکھنا کتنا خوار کرے گی تجھے۔ ماں ہوں تیری، اچھا برا سمجھانا میرا فرض ہے۔"

"ماں مت کہا کرو خود کو، اور نہ کسی فرض کی بات کرو۔"

"پہلے تو تو اپنے کام اور زندگی سے اتنی بیزار نہیں تھیں۔ یہ پٹی بھی اسی افسر نے پڑھائی ہوگی۔ دیکھ رہی ہوں جب سے وہ پلے پڑا ہے تیرے مزاج ٹھکانے نہیں رہے۔ کسی کام جوگی نہیں رہی تو۔"

"تو پھر لعنت بھیجو مجھ پہ، چھوڑ دو مجھے میرے حال پہ، اب میں تمہارے کسی کام کی جو نہیں۔"

اس کے موڈ کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا تھا شمع کے اعتراضات نے۔

"کیسے چھوڑ دوں۔ اولاد ہے میری اور وہ بھی اکلوتی، میرے بڑھاپے کا سہارا، کیسے برباد ہونے دوں۔"

"کوئی برباد نہیں ہو رہی میں۔ پتہ نہیں تمہیں جعفر سے کیا چڑ ہے۔ فضول فضول سے لوگ آئیں تو ان پہ نثار ہوتی ہو۔ ہر گامے ماجھے سے تعلقات بڑھانے کی تاکید کرتی ہو اور جو زندگی میں پہلی بار ذرا ڈھنگ کا بندہ ملا ہے تو وہ کھٹکنے لگا ہے۔"

"ہمیں ڈھنگ کے بندے سے نہیں، ڈھنگ کے پیسے سے سروکار ہے۔" شمع کے پان سے رنگے ہونٹوں پہ مکروہ مسکراہٹ پھیلی۔

"یہ گامے، ماجھے، کھلی شلواریں پہننے والے، میلی گردنوں اور پھٹی ایڑیوں والے جو بات بات میں ننگی گالیاں دیتے ہیں۔ جن کو تو برا کہہ رہی ہے ان سے ہی ہمارے ٹھاٹ باٹ ہیں۔ کم از کم ان کے ہاتھ جیب میں جاتے ہیں تو بھرے ہوئے تو نکلتے ہیں۔ نواب، جاگیردار، زمیندار، سیاستدان، یہ ہماری جیسیوں کے نصیب میں کہاں۔ یہ تو اونچے درجے کی "کوٹھی" والیوں نے بک کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے نصیب میں یہ نئے نئے امیر ہوئے یا نئے نئے جوان ہوئے "گامے ماجھے" ہی رہ جاتے ہیں۔"

"اف...ف..." رینا سر پکڑ کے تکیے پر گر گئی وہ لباس تبدیل کر کے باتھ روم سے بھی نکل آئی تھی مگر شمع کی وہ رٹ ابھی تک جاری تھی۔ اب وہ کیا بتاتی ماں کو کہ یہ تحائف بھی وہ خود ہی لے دیتا ہے ورنہ اصل میں تو ان کے درمیان لینے دینے والی کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اس کے بارے میں جو جذبات رینا کے دل میں تھے شاید وہ معاوضہ طے کرنے میں آڑے آتے تھے۔ اس کا بس چلتا تو جعفر محمود کی محبت پانے کے صدقے وہ اپنا آپ اس پہ نچھاور کر ڈالتی۔ بن مول اس کی بن جاتی۔ مگر شمع کا منہ بند رکھنے کے لیے وہ جعفر کے اکثر و بیشتر شاپنگ کرانے کی مہربانی کو قبول کر لیتی اور شمع کی تسلی اس پہ بھی نہ ہو رہی تھی۔

"اچھا چل، اتنا ہی دل آگیا ہے اس پہ تو ٹھیک ہے، لگی رہ۔ تیری عمر بھی ایسی ہے۔ آخر جوانی مجھ پہ بھی آئی تھی۔" وہ بیٹی کے پاس لیٹ کے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

رینا نے سکون سے آنکھیں موند لیں اور شدت سے یہ خواہش کی کہ ماں کی انگلیاں اس کے بالوں میں ہی پھنسی رہیں۔ مگر وہ خود غائب ہو جائے۔ اپنی نصیحتوں سمیت۔

"لگتا ہے وہ افسر زیادہ ہی گھبرو ہے۔ ہے نا۔" اس نے رینا کو گدگدانے کی کوشش کی۔ وہ کسمسا کے "اوں... ہوں" کرنے لگی، مگر اس کے لبوں پہ پھیلی مسکراہٹ ماں کے قیاس کی تصدیق کر رہی تھی۔ شمع نے یہ دوستانہ رویہ اس کے اندر کے راز اگلنے کے لیے ہی اپنایا تھا۔ اب وہ بیٹی کے چہرے پہ محبت کے رنگ دیکھ کر دانت کچکچا رہی تھی۔

"تو دوستی اس سے لگائے رکھ، میں منع نہیں کرتی مگر اپنے کام کو خراب نہ کر۔ کیا وہ تیرے لیے اپنے دفتر میں حاضری لگانا چھوڑ سکتا ہے؟ کبھی بھی نہیں... وہ کیوں اپنی ملازمت گنوائے گا۔ پھر تجھ پہ روک ٹوک کس لیے؟"

"اوہو... میں نے کب کہا کہ اس نے مجھے روکا ہے۔ بس میرا دل ہی نہیں چاہتا۔"

"دل کو سمجھا... ورنہ..." اس نے پینترا بدلنا چاہا مگر پھر مصلحتاً دوبارہ لہجے میں رس گھول لیا۔

"ورنہ یہ دل تجھے بڑا خوار کرے گا۔ ایسی جگہ دل لگانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ویسے ایک بات کہوں۔ دوستی ہی کرنی ہے تو اصغر کیا برا ہے۔ وہ تو گاما اچھا نہیں لگتا۔ شکل صورت بھی ٹھیک ہے۔ پیتا پلاتا بھی نہیں۔ عاشق ہے تجھ پہ کبھی تو دیکھ لے۔"

وہ بیٹی کے جذبات کو ٹٹولنے لگی۔

"دفع... وہ بھی کوئی انسان ہے۔ لیچڑ... لسوڑا... منہ کھول کے دیکھتا رہتا ہے۔" رینا کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

"نہ پڑھا لکھا ہے نہ ہی دماغ ہے اس کا۔ بھوسا بھرا ہے کھوپڑی میں۔"

"نہ تو پڑھا لکھا کے کر کیا تو نے منشی لگوانا ہے۔ اور جب تھوڑا بہت پڑھ کے بھی وہ مہینے کے لاکھ دو لاکھ کما سکتا ہے تو بے وقوف کیسے ہوا۔ مرد کا دماغ پیسہ کمانے میں چلے تو ٹھیک ہے۔ اور معاملوں میں نہ ہی چلے تو اچھا۔ اور عورت کے سامنے تو بالکل بھی نہیں چلنا چاہیے۔ جو مرد کھوپڑی میں بھوسے کی بجائے عقلیں لیے پھرتے ہیں وہ پیسہ اجاڑنے جوگے نہیں ہوتے۔ ہمیں بھوسہ بھری کھوپڑیاں ہی وارا کھاتی ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے، مانا کہ اصغر دوسروں کی نسبت پھر بھی اچھا ہے۔ کم عقل اور چیونگم کی طرح چپک جانے والے لوگ مجھے پسند نہیں مگر اصغر کو صرف اس لیے برداشت کر لیتی ہوں کہ وہ دوسروں کی طرح پیسے نچھاور کرنے کے بعد مجھے اپنی پراپرٹی نہیں سمجھنے لگتا، مگر، مگر کسی کو مجبوراً برداشت کرنا اور بات ہے۔ کسی کو پسند کرنا اور بات... اور کسی سے دل لگا لینا بالکل ہی الگ بات۔ اس جیسے بے وقوف اور کم علم، کم عقل انسان سے تو میں جھوٹ موٹ کی محبت بھی نہیں جتا سکتی۔"

"زیادہ باتیں نہ بنا۔ جیسے میں تو ابھی ابھی پیدا ہوئی ہوں۔" شمع نے ہاتھ نچا کے کہا۔

"تیری طرح قصے کہانیوں کی موٹی موٹی کتابیں نہیں پڑھ رکھیں مگر محبت وحبت کے بارے میں اتنا تو تیری ماں بھی جانتی ہے کہ اس کام میں عقل کا کیا دخل؟ یہ تو کام ہی بے عقلی کا ہے۔" اس نے بھونڈے پن سے آنکھ ماری۔ جس پہ ناگواری محسوس کرتے ہوئے رینا نے منہ پہ چادر تان لی۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔"

"زیادہ مکر نہ کر..."

"کوئی عشق وشق نہیں ہوا مجھے جان بخشو میری۔"

چادر کے اندر سے اپنے بندھے ہاتھ نکال کر رینا نے التجا کی۔ اس کا دماغ شمع نے اپنی باتوں سے پلپلا کر دیا تھا اور اب اسے واقعی سکون کی ضرورت تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

مظہر نے منزہ کو بیک یارڈ میں واشنگ مشین لگائے ڈھیروں ڈھیر کپڑوں کے درمیان کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"کپڑے دھو رہی ہوں۔"

"وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں مگر تم کیوں دھو رہی ہو۔ ملازمہ کہاں ہے؟"

"چار دن کی چھٹی پہ گئی تھی۔ آج ساتواں دن ہے۔ ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا کپڑوں کا۔ درجنوں تو سوہا کے ہیں۔ اتنی سی بچی دن میں کئی بار کپڑے گندے کر دیتی ہے۔ آپ کو بھی دن میں دو بار تبدیل کرنا ہوتے ہیں۔ اس کے انتظار میں بیٹھ گئی تو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پچھلے چھ سات روز سے گھر کے سارے کام تم کر رہی ہو۔ کچن کی ذمہ داری تو پہلے ہی تمہارے سر پہ ہے۔"

"نہیں، برابر والوں کی ماسی روزانہ آکر صفائی وغیرہ کردیتی ہے۔ البتہ کپڑوں کی دھلائی سے اس نے معذرت کرلی تھی اور رہے برتن وغیرہ تو دھل جاتے ہیں مل جل کر۔"

"اچھی طرح جانتا ہوں کتنے مل جل کر دھلتے ہیں۔" مظہر نے ذرا یقین نہ کیا۔

"اور اس ڈھیر میں مجھے اپنے، تمہارے اور سوہا کے کپڑوں کے علاوہ امی اور شمیم کے بھی کئی ایک کپڑے نظر آرہے ہیں۔ یہ پینٹ اصغر کی ہے۔ اور یہ شرٹیں بھی...... یہ دونوں شلوار سوٹ اباجی کے ہیں اور یہ پردے، یہ بھی میرے خیال میں......"

"میرے ساتھ کر یہ سارا حساب کتاب، محلے والوں کو کیوں سنا رہا ہے۔"

شمیم نے مظہر کو پچھلی جانب جاتے دیکھ کر نصرت کو خبر دینے میں دیر نہ لگائی تھی اور نصرت نے بھی عین موقع پہ چھاپہ مارنے میں توقف نہ کیا۔

"اگر دھلائی سارے گھر کے کپڑوں کی ہو رہی ہے، تو شمیم کو بھی ساتھ لگنا چاہیے تھا، یہ اکیلی کیوں دھوبی گھاٹ کھول کر بیٹھے۔ یا پھر ملازمہ کے آنے کا انتظار کرلینا چاہیے تھا۔"

"انتظار ہی کر رہے ہیں ایک ہفتے سے، میں نے نہیں کہا تھا نواب زادی کو کہ مشین لگائے۔ اس نے اپنی مرضی سے لگائی ہے۔ بغیر مجھ سے پوچھے۔"

"ہاں اور اپنی مرضی سے ہی یہ سب کے کمروں سے میلے کپڑے بھی اکٹھے کرکے لائی ہے۔ بغیر آپ سے پوچھے۔" مظہر منزہ کے اشاروں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔

"اس نے اپنی ضرورت کے تحت مشین لگائی ہوگی اور شمیم نے لا لا کر ڈھیر لگا دیے۔ پردے تک اتار کے پھینک دیے۔"

وہ بہن کی عادت سے واقف تھا اس لیے بالکل درست اندازہ لگایا۔

"پرے کرو یہ سب۔" اس نے منزہ کو گرج کر کہا۔

"چار دن اور ملازمہ نہ آئی تب بھی گزارا ہو سکتا ہے۔ کپڑوں کی کمی نہیں ہے ان کے پاس۔"

"کیا ہو گیا ہے مظہر؟" اسے واقعی یہ بات پسند نہ آئی۔ بعض اوقات مظہر بہت ہی بے بنیاد باتوں پہ بھڑک اٹھتا تھا۔

"اپنے گھر کا کام ہی کر رہی ہوں۔ ان سب کے کپڑے دھونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر میں ان کی بیٹی جیسی ہوں۔"

"اور جو حقیقی بیٹی ہے اس کو تو بڑا فرق پڑتا ہے ہل کے پانی پینے سے بھی۔"

"تمہیں میری بڑی تکلیف ہے۔ گھڑی گھڑی مجھے کوسنے لگ جاتے ہو اپنی اس سگی کے کلیجے میں ٹھنڈ ڈالنے کے لیے۔"

شمیم اب تک اندر کھڑی سن گن لے رہی تھی۔ تڑپ کے سامنے آئی۔

"جس نے ماں کو منٹ میں پرایا کر دیا۔ وہ بہن کو کیا سمجھے گا۔"

اس ایکٹنگ نے غالباً مظہر کو بھی کچھ کچھ متاثر کر دیا۔ اس کا طیش دھیما ہوا۔

"تم امی کے کپڑے دھو لو، وہ ماں ہیں، ان کی خدمت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر شمیم کے اپنے ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ اس کا ڈھیر اسے واپس کرو۔ چاہے دھوئے یا پھینکے۔ باقی یہ کپڑے، یہ پردے یہ سب کچھ لانڈری بھجوا دو۔ اتنے بھاری کپڑے تم کیسے دھوؤ گی۔"

"ماں پہ بھی اتنا احسان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ نخرے تو ایسے اٹھائے جا رہے ہیں۔ مہارانی کے جیسے دس نوکروں سے اٹھ کے آئی ہو۔ اپنے گھر چاہے مشین پہ دھونا بھی نصیب نہ ہوتا ہو۔ ڈنڈے سے کوٹ کوٹ کے اور برش سے رگڑ رگڑ کے دھوتی ہوگی۔"

نصرت بڑبڑ کرتی اندر پلٹ گئی۔

"تم نے اپنی انہی حرکتوں کی وجہ سے سب کی عادتیں خراب کی ہوئی ہیں۔"

اب اس کی ناراضی کا رخ منزہ کی طرف تھا۔ وہ چپ چاپ اپنا کام کرنے لگی۔

"اب آپ اصغر کی شادی بھی کر ہی دیں۔ اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے بھی کوئی ہونا چاہیے کب تک ماں اور بھابی کے سہارے عیش کرتا رہے گا۔"

اندر آکے اس نے ریموٹ اٹھاتے ہوئے ماں کو مشورہ دیا۔

"عیش کراتا بھی تو ہے۔ تم تو چند ہزار کچن کے خرچے کے لیے دیتے ہو۔ بجلی کے اتنے بڑے بڑے بل، نوکروں کی تنخواہیں، اور باقی کے خرچے، یہ سب وہی پورے کرتا ہے۔"

"کون سا، پلے سے کرتا ہے۔ اباجی کا جما جمایا کاروبار ہے۔ مجھے ساری خبر ہے۔ مہینے میں ڈیڑھ لاکھ تک آمدنی ہوتی ہے۔ کبھی اس سے بھی زیادہ چالیس پچاس ہزار بھی اگر یہاں لگا دیتا ہے تو فائدے میں ہے۔"

"محنت بھی اس کی ہے۔" نصرت کی ساری ہمدردیاں اصغر کے ساتھ تھیں۔

"اس سے مجھے انکار نہیں۔" مظہر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا۔ "اور اسی لیے کبھی ایسا حساب نہیں کیا۔ مگر میں اس کی کمائی کے رعب میں آنے والا نہیں۔ اور ایسا برا کیا کہا ہے میں نے۔ اس کی شادی کرنے کا ہی کہا ہے۔" بڑے کے بعد اب چھوٹے کی شادی کا ذکر، شمیم پہلو بدلنے لگی۔

"میں کیوں اپنا بڑھاپا خوار کروں۔ میں کیوں کروں اس کی شادی۔ کرلے گا وہ بھی خود ہی، تمہاری طرح...... لے آئے گا کوئی حور پری میرے سر پہ بٹھانے کے لیے۔"

کچھ دیر پہلے اصغر کی حمایت میں بولنے والی نصرت کے لہجے میں اب شکوے تھے۔

"یعنی اس نے کوئی پسند کرلی ہے؟"

مظہر کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اصغر صرف دو کو چار بنانے میں ہی دلچسپی رکھتا ہے۔ یہ نہ پتا تھا کہ اسے زندگی بنانے کا خیال بھی آگیا ہے۔ اس نے اصغر سے کھل کے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

اصغر نے اس کے کمرے میں بلا کر بات کرنے پہ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، ہے تو خاص بات، سنا ہے تم بڑے چھپے رستم نکلے ہو۔"

مظہر کے تکا لگانے پہ اصغر گھبرا گیا۔ اور نزدیک کھیلتی سوہا کو گود میں اٹھا کے گدگدانے لگا۔ مظہر اس کی اس حرکت سے سمجھ گیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

"سوہا! چاچو کے ساتھ جوائے لینڈ جائے گی۔ آئس کریم کھائے گی، پیارا پیارا فراک لے گی۔ چلو جی۔"

سوہا سے وہ واقعی پیار کرتا تھا مگر اس وقت صرف مظہر کے اگلے سوال سے بچنے کے لیے سوہا کے بہانے نکلنے کے چکر میں تھا۔

"جائے گی، ضرور جائے گی۔" مظہر نے اسے کھسکنے نہ دیا اور پکڑ کر دوبارہ اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"آئس کریم بھی کھائے گی، فراک بھی خریدے گی مگر پہلے چاچو کا پول کھولے گی۔"

"پول......" اصغر کا رنگ اڑ گیا۔ جس پہ مظہر کھٹکا وہ کوئی سولہ سترہ سالہ نوخیز لڑکا نہ تھا جو گلی محلے میں شروع کیے کسی معاشقے کی خبر گھر تک پہنچنے پہ گھبرا رہا تھا۔

"تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے کہیں ڈاکا ڈالا ہو۔ جس کی مخبری میں کرنے والا ہوں، ابے...... یار کیا تو ڈرنا کیا۔ اپنے بڑے بھائی سے سبق حاصل کر۔" اس نے بے تکلفی کی فضا پیدا کرتے ہوئے اس کی جھجک ختم کرنا چاہی۔

اصغر کچھ شرماتا، کچھ کھسیاتا اسے دیکھنے لگا۔ مظہر کا صحت مند خوش باش چہرہ، کھلی کھلی مسکراہٹ، جگمگاتی

آنکھیں۔ سلیقے سے سجا کمرہ جس کا کونا کونا مکینوں کی محبت کا گواہ تھا۔ بیڈ پہ بیٹھی کھلونوں سے کھیلتی ایک دو سالہ پیاری سی بچی' چائے کی ٹرے لے کر اندر آتی ایک تعلیم یافتہ 'سلجھی ہوئی حسین شریکِ حیات

سب کچھ کتنا مکمل تھا۔

اور قابلِ رشک بھی۔

اس کے دل میں اپنی خوشگوار ازدواجی زندگی کا آغاز کرنے کی خواہش اور بھی قوی ہو گئی۔ وہ منزہ کے روپ میں رینا کو اور مظہر کے روپ میں خود کو دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے وہ؟" مظہر نے ٹٹولا۔

"وہ..... رینا ہے اس کا نام۔" کان کھجاتے ہوئے اصغر نے کہا۔ ساتھ ہی کن اکھیوں سے بھابھی کی طرف دیکھا۔

"ہوں..... نام تو خوبصورت ہے' کیوں منزہ! اور خود کیسی ہے وہ؟"

"اچھی ہے۔"

"امی کیا کہتی ہیں؟"

"ابھی کچھ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

"تو بات کرو یار! کیا لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔ دیر کرتے رہے تو امی لے آئیں گی۔ خاندان کی کسی بانو یا ثریا کو' جو شمیم سے بھی دو ہاتھ آگے ہو گی۔ گھر گھر نہیں پانی پت کا میدان بن جائے گا۔ تمہیں تو پتہ ہی ہو گا ہمارے خاندان میں کیسی کیسی رضیہ سلطانائیں اور جھانسی کی رانیاں ہیں۔ یار..... میری بیوی' بے چاری مسکین۔ اس کا کیا بنے گا۔ ایسی "خاندانی" بلا کو دیورانی تو اسے چٹکی میں مسل دے گی۔ ہمت کرو اور امی کو بتا دو۔"

"ڈر لگتا ہے۔"

"مرد بن یار! میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔" مظہر نے حوصلہ دیا۔ اصغر نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا اور تصدیق چاہی۔

"وعدہ؟ اور اگر بعد میں پیچھے ہٹ گئے تو.....؟"

"میں تمہیں پیچھے ہٹنے والوں میں سے لگتا ہوں؟ ایسا ہوتا تو آج منزہ میرے ساتھ نہ ہوتی۔ اس کے لیے کیا امی اور شمیم نے کم پھڈا کیا تھا۔ سو سو اعتراض تھے ان کے۔"

"وہ اعتراض الگ تھے مگر رینا..... میں جانتا ہوں امی کبھی نہیں مانیں گی۔"

"ایسی کیا بات ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔" اب مظہر کو بھی کسی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس کا اندازہ تھا شاید منزہ کے میکے والوں سے بھی گئے گزرے خاندان سے ہو گی۔ کیا پتا کوئی جاب وغیرہ کرتی ہو کیونکہ نصرت کے خیالات ملازمت کرنے والی لڑکیوں کے بارے میں بھی اچھے نہیں تھے۔

"وہ دراصل رینا جو ہے نا' نہیں وہ نہیں اصل میں اس کی ماں۔" وہ پھر رک گیا۔

"ہاں کیا ہے اس کی ماں کو؟ دوسری شادی کر رکھی ہے یا مطلقہ ہے؟"

مظہر نے ایک اور اندازہ لگایا۔ دوسری شادی کرنے والیوں اور مطلقاؤں کے بارے میں بھی اس کی ماں نادر شاہی فرمودات نشر کرتی رہتی تھی۔

"نہیں..... وہ..... وہ کوٹھے والی ہے۔"

"کیا.....؟" مظہر کے لبوں تک آتا چائے کا کپ اچھل گیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم نے کوٹھوں پہ آنا جانا شروع کر دیا؟ کوئی پوچھنے والا نہیں اس لیے جو دل چاہے کرتے پھرو گے۔"

ابھی تک دوستانہ انداز میں گپ شپ کرتا وہ یکدم بھڑک کر اس پہ آنکھیں نکالنے لگا۔ اصغر اگرچہ چھوٹا تھا عمر

میں' مگر گھر کا ماحول ایسا تھا کہ چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ اور ڈر' بڑوں کا چھوٹوں پہ رعب کم ہی نظر آتا تھا۔ وہ بھی ہرگز اسے نہ دبتا اور جواباً آنکھیں نکال سکتا تھا۔

لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ وہ اکیلا کمزور پڑ رہا تھا۔ جانتا تھا رینا کی خواہش کر کے اس نے کوئی قابلِ فخر یا لائقِ تحسین کارنامہ نہیں انجام دیا۔ اسے اب حمایتوں کی ضرورت تھی نہ کہ مخالفین کی۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ مظہر کی ڈانٹ ڈپٹ خاموشی سے سن لی جائے۔

اس کے برعکس منزہ شوہر کے غیض و غضب پہ ڈر گئی۔ اسے خطرہ تھا کہ اب تک مسکرا مسکرا کے باتیں کرتے دونوں بھائی اچانک گتھم گتھا نہ ہو جائیں۔

"تم بازاری عورتوں کے چکر میں پڑے کیسے؟"

"رینا ایسی نہیں ہے۔" وہ تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا.....؟ اس کی ماں کوٹھے والی ہے۔ اور وہ خود کیا ٹیوشن پڑھاتی ہے؟ کسی مدرسے میں استانی لگی ہوئی ہے۔"

"وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے۔"

"آج کل طوائفوں میں بھی ڈگریاں لینے کا رواج ہے۔ کوئی نئی بات نہیں۔" وہ متاثر نہ ہوا۔

"وہ اپنی ماں سے مختلف ہے۔"

"ہاں ماں ٹھمریاں گاتی تھی' یہ ری مکس گاتی ہو گی۔ ماں مجرے کرتی تھی یہ ڈسکو کرتی ہو گی۔"

مظہر نے اپنی کسیلی زبان کے جوہر دکھانے شروع کیے تو اصغر برداشت نہ کر سکا۔

"بس کرو میں زیادہ بکواس نہیں سنوں گا۔"

"ابھی تو تم پتا نہیں کیا کچھ سنو گے امی سے۔ ابا جی سے' سارے خاندان سے' ہر ملنے ملانے والے سے' یہ بات ذرا منہ سے نکال کے تو دیکھو۔" اس نے چیلنج کیا۔

"تم نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کہا تھا کہ میرا ساتھ دو گے۔" اصغر نے پھر التجائیہ انداز اختیار کیا۔

"ہاں کہا تھا..... تمہاری شادی تمہاری پسند کی جگہ کرانے میں تمہاری مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ گھر میں تم کسی بھی طوائف کی لڑکی کو لا کے بٹھا دو گے تو میں برداشت کر جاؤں گا۔ تمہیں کوئی محبت نہیں ہوئی گدھے..... تم کسی غلط جگہ پھنس گئے ہو۔ ہو تو بے وقوف ہی۔"

"اب یہ بے وقوف سب کو بتائے گا کہ وہ اصل میں ہے کیا۔"

اصغر نے گلا پھاڑ کے اعلان کیا۔ سوہا سہم کے رونے لگی تو منزہ نے فوراً اسے گود میں اٹھا لیا۔

"واقعی گدھا تھا' میں جو اتنے سالوں سے سارے ٹبر کا بوجھ ڈھوتا رہا۔ میری خوشی کا وقت آیا تو کوئی ہاتھ آگے نہیں کر رہا۔ نہیں تو نہ سہی' میں بھی اب گدھا بن کے اتنے لوگوں کا بوجھ نہیں اٹھاؤں گا۔ اپنی اپنی کریں سب' اور میں اپنی کروں گا۔"

رینا کا عشق اس کے سر چڑھ کے بول رہا تھا' اسی لیے وہ اس کی جانب سے شادی کا اقرار سننے سے پہلے ہی یک طرفہ جنگ لڑنے لگا۔

"یہ پاگل ہو گیا ہے۔" اس کے نکلنے کے بعد مظہر نے منزہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ پیار سے سمجھاتے تو شاید....."

"رہنے دو..... یہ الٹی کھوپڑی ہے۔ آرام سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے۔ امی ایک جھٹکے میں ٹائٹ کر دیں گی۔"

"لیکن آپ نے سنا اس نے کیا دھمکی دی ہے۔ امی کا سارا رعب دبدبہ ایک طرف' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے بیشتر خرچے اصغر نے اٹھا رکھے ہیں۔ اگر اس نے واقعی ہاتھ کھینچ لیا تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا

ہو سکتا ہے۔ سارا بزنس اس کے ہاتھ میں ہے۔ عملی لحاظ سے بھی اور قانونی طور پہ بھی۔ میرا خیال ہے امی یہ دھمکی قبول نہیں کریں گی۔ تمہیں کو پتا ہے ابھی۔۔۔ اور اس کے لیے سالوں سے جمع ہو رہا ہے جہیز اور سیروں سونا اصغر سے لے کر ہی بن رہا ہے۔"

"ہوں' یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے مگر ایک طوائف کی بیٹی۔۔۔ یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔ کیا پتہ وہ لڑکی کردار کی کیسی ہو۔ شاید خود بھی اسی پیشے سے منسلک ہو یا اصغر اس بات سے انجان ہو یا ہمیں انجان رکھنا چاہ رہا ہو۔"

"جو بھی ہے' آپ اس مسئلے سے الگ رکھیں خود کو۔" منزہ نے نصیحت کرنا فرض جانا حالانکہ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھی کہ مظہر ایسا ہرگز نہیں کرے گا۔

☼ ☼ ☼

ساجدہ کو گزرے نو دن بیت چکے تھے' گھر کا اب تک وہی ماحول تھا۔

شمشاد کے زیادہ تر عزیز اقارب دور دراز کے شہروں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے تو گویا یہاں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ غالباً دسویں کا ختم شریف کروا کے واپس لوٹنے کا ارادہ تھا۔ آدھے دن تک ناشتے چلتے رہتے۔ ایک شور سا بپا رہتا۔ عجیب ابتری اور افراتفری کا سا عالم تھا۔ یہ سب دیکھ کے پروین کا دم الجھتا' وہ اپنے گھر کے پُرسکون ماحول کی عادی ہو چکی تھی۔ یہاں اگر رکی تھی تو صرف بھائی کے لیے جو سنبھل ہی نہ پا رہا تھا۔ ننھی سی بچی کی ذمہ داری بھی فی الحال پروین نے سنبھال رکھی تھی۔ شام ہونے لگتی تو محلے کے لوگ اور دوسرے ملنے جلنے والے ایک بار پھر تعزیت کے لیے اکٹھے ہونے لگتے۔ وہی ماتمی فضا کچھ دیر کے لیے قائم ہوتی۔ چار آنسو بہا کے دو سرد آہیں بھر کے وہ گپ شپ میں مشغول ہو جاتیں۔

"کل دسواں ہے۔ ساجدہ کے میکے والے آئیں گے یا نہیں؟"

"میری جاتی ہے جوتی۔ قل پہ تو آئے نہیں۔ اتنی اکڑ ہے کنگلوں میں۔" شمشاد نے ناک چڑھا کے جواب دیا۔

"اس کے بھائی تو آئے تھے۔"

"آئے ہوں گے۔ کوئی احسان کیا تھا مجھ پہ یا میرے بیٹے پہ۔ ان کی گھر والیاں تو نہ آئیں۔ ان کو کیا موت آئی تھی۔"

"سنا ہے تم سے کوئی کھٹ پٹ ہوئی تھی۔" کسی نے ٹوہ لینا چاہی۔

"کھٹ پٹ کیا ہونی ہے۔ ویسے ہی منہ چھپاتی پھر رہی ہیں۔ ساجدہ بڑی بھولی تھی۔ ان کی باتوں میں آ کے مرد کی کمائی چھپ چھپا کے دے تو دیتی تھی' میکے' پر مجھے بعد میں بتا دیتی تھی۔ میرے پاس سارا حساب ہے کہ بھانوں سے یہ ساجدہ سے کتنا پیسہ بٹور چکے ہیں اور پچھلے مہینے ساجدہ کی بھائی کے پچھاوں میں کسی کی شادی تھی۔ وہ نند سے ہی لے کر گئی تھی۔ سارا زیور۔۔۔ ورنہ اس کے پاس تو چاندی کی تار تک نہیں تھی۔ اب ساجدہ نہیں رہی تو نیت بدل گئی ہو گی ان لوگوں کی۔ دبا کے بیٹھ گئے ہیں اور میرے متھے نہیں لگنا چاہتے۔ نہیں تو نہ سہی' میں نے اپنی پوتی کے صدقے معاف کیا۔"

ویسے تو شاید کوئی اس من گھڑت کہانی پہ یقین کر ہی لیتا مگر اس کے اتنی آسانی سے پیسہ اور زیور بخش دینے والی بات یہ سب جان گئے کہ ایسا کچھ سرے سے ہوا ہی نہیں۔ شمشاد وہ عورت تھی جو گلے کے حلق میں انگلی ڈال کر اپنا مال نکلوا سکتی تھی۔

ادھر شمشاد اپنی ہم مزاج عورتوں کے درمیان محفل سجائے بیٹھی تھی ادھر پروین چند دن کی کمزور' نازک سی بچی کو ہاتھوں میں لیے دکھ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کل۔۔۔ یا شاید پرسوں اسے واپس اپنے گھر جانا تھا۔ اس کے اپنے بچے' اپنا گھر اس کا منتظر تھا۔ وہاں بھی اس کی ضرورت تھی۔

ننھی سی جان کو بھی تو ضرورت ہے کسی کی۔ کون اس کا خیال رکھے گا۔ اماں سے کوئی امید رکھنا فضول ہے اور اس کے نخرے اٹھانا۔۔۔ سے بھی وہ خواہ مخواہ گھبراتی ہیں۔ ورنہ اس عمر کے بچے کو ہو جاتا ہے۔ یہ شروع کے چند سال مشکل ہیں۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن یہ شروع کے دن' یہ آخر کیسے گزریں۔ کیا بنے گا اس معصوم کا۔ آپ نے تو اب تک نظر بھر کے دیکھا تک نہیں اپنی اولاد کو۔

پھر سے کمبل میں لپٹی بچی کو اٹھا کے نوید مراد کے پاس لے آئی۔

"بھائی جان! آپ کا دل نہیں چاہتا اپنی بیٹی کو دیکھنے کو۔ ایک نظر ڈالیں تو سہی۔ دیکھیں نا کتنی پیاری ہے۔ بالکل ساجدہ جیسی۔"

نوید مراد نے ان آخری الفاظ پہ رخ ہی پھیر لیا۔

تو پروین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

وہ نادانستگی میں اس کے غم کو تازہ کر گئی تھی۔

"اسے لے جاؤ پروین!"

"کہاں لے جاؤں۔ یہ اس کا گھر ہے۔ اس کے باپ کا گھر۔ جہاں اسے اللہ نے بھیجا ہے۔ میں کون ہوتی ہوں اسے یہاں سے لے جانے والی۔"

"اللہ نے اسے اکیلے کیوں بھیجا ہے پروین!"

نوید مراد کہنی موڑ کے آنکھوں پہ رکھتے ہوئے لیٹ گیا۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

"اللہ کی اللہ ہی جانے۔۔۔" پروین نے لمبی آہ بھری اور اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔ بچی کو احتیاط سے اس کے برابر میں لٹا دیا۔ پھوپھی کی گرم آغوش سے نکلتے ہی وہ اپنی باریک آواز میں رونے لگی۔ کمبل میں لپٹے ہاتھ پر پیچ کر کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

نوید مراد کے اندر کچھ ترخ ترخ کے ٹوٹنے لگا تھا۔

"دیکھیں تو سہی اسے۔ ایک بار تو دیکھیں۔ آپ کا غم ختم نہ ہو گا تو کم ضرور ہو جائے گا۔ دیکھ تو لیں کہ اللہ نے آپ سے آپ کی ایک عزیز چیز واپس لی ہے تو کتنی پیاری چیز دی بھی تو ہے۔"

نوید مراد نے بھیگی پلکیں کھولیں اور گردن موڑ کے اپنے پہلو میں لیٹے اس ننھے منے وجود کو دیکھا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گیا تھا اور اسے بازوؤں میں لے کر پیار کر رہا تھا۔

بچی کے رونے میں اور شدت آ گئی تھی۔

"اس کا اب تک نام بھی نہیں رکھا۔ کتنی بری بات ہے۔ ساجدہ ہوتی تو ناراض ہو جاتی۔ کوئی اچھا سا نام بتائیں نا؟"

"ساجدہ کو وشمہ نام بہت پسند تھا۔" اس نے بچی کی نرم پیشانی پہ اپنے لب رکھ دیے۔

❂ ❂ ❂

سراج دین' بیگم شوکت جہاں کے بار بار احساس دلانے پہ یہاں آئے تھے اور اب اپنے سالے نوید مراد کے سامنے سنجیدہ سے بیٹھے تھے۔ نوید مراد کی حالت قطعاً "ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے اس اعلیٰ حیثیت اور نازک مزاج بہنوئی کی خاطر مدارت اور آؤ بھگت اسی انداز میں کرتا جس طرح پہلے کرتا آیا تھا۔ وہ اسی افسردہ حالت میں سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔

دوسری جانب سراج دین کو بھی رسمی آداب نبھانے کا خاص سلیقہ نہ تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ نوید کی بیوی کی وفات سے لے کر اب تک' یعنی پندرھویں روز تک وہ اس سے کم و بیش چھ بار مل چکے ہیں۔ ہر بار تعزیتی کلمات کیسے ادا کریں۔

ہر بار وہی مکالمے رٹو طوطے کی طرح دہرانا کوئی ضروری بھی نہیں "

جب اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر پروین نوید مراد کو بلانے جا رہی تھی تب اس نے چپکے سے اپنے میاں سے کہا تھا۔

"بھائی جان کو طریقے سے سنبھال لیجیے گا۔ ان کے زخموں پہ ہمدردی کا پھایا۔۔۔"

تب بات کاٹتے ہوئے سراج الدین نے کھردرے لہجے میں اپنا یہی زرین قول سنایا تھا جس کے بعد وہ خاموشی سے منہ لٹکا کر چلی گئی اور ابھی تک دوبارہ اندر نہیں آئی تھی۔

سراج دین کوفت کے عالم میں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بے دلی سے ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہے تھے۔ گاہے گاہے ایک اچٹتی نظر سامنے بیٹھے نوید مراد پہ بھی ڈال لیتے۔ جو یہاں موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہ تھا۔ باہر سے ہند کو بولنے والی ملازمہ کی سنگلاخ گفتگو کانوں پہ پتھر کی طرح برس رہی تھی جس سے وہ نجانے کیسے فیض یاب کر رہی تھی۔ شمشاد بیگم تو حسب عادت محلے کے سفارتی دورے پہ نکلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی چند روز کی بچی کے رونے کی نحیف سی آواز بھی سنائی دیتی۔

"کہاں رہ گئی پروین۔" سراج دین نے رسٹ واچ پہ ٹائم دیکھا اور برا سا منہ بنا کے بڑبڑائے۔

"ایسا کون سا سازو سامان لے آئی تھی جو سمیٹنے میں اتنا وقت لگ گیا۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" نوید مراد اپنے خیالوں سے چونکا اور یہ کہتے ہوئے اٹھا مگر اتنے میں پروین چائے کی ٹرالی گھسیٹتے ہوئے اندر آ گئی۔

"اس تکلف کی ضرورت کیا تھی۔" وہ کسمسائے اور ساتھ میں زیر لب وہی بڑبڑانے کی عادت۔۔۔

"اب مزید آدھا گھنٹہ برباد۔"

پروین نے گھبرا کے اپنے بھائی کے چہرے کی جانب دیکھا۔ لیکن شاید وہ اپنی غائب دماغی کی وجہ سے اس بڑبڑاہٹ پہ غور نہ کر سکا۔

"آپ فیکٹری سے سیدھا یہیں آ رہے ہیں۔ چائے ابھی تک نہیں پی ہو گی اس لیے میں لے آئی۔"

وہ کپ آگے بڑھاتے ہوئے منت بھری نظروں سے شوہر کو دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہوں نہ

"خدارا کچھ دیر بڑبڑاہٹ پہ قابو۔۔۔ رکھیں۔"

"ساجدہ ہوتی تو کبھی تمہیں کھانا کھائے بغیر لوٹنے نہ دیا تھا اس نے۔" نوید مراد کی کھوئی کھوئی آواز نے ماحول میں افسردگی گھولی۔

"اور آج تم میکے میں مہمان ہو مگر تمہاری میزبانی کرنے والی بھابھی نہیں ہے۔ پروین۔۔۔۔ تمہیں خود چائے بنا کے لانا پڑی ہے۔"

اس کی آواز کپکپا گئی تو پروین بھی دوپٹہ منہ پہ رکھ کے سسکنے لگی۔ سراج سے چائے کا گھونٹ حلق میں اتارنا مشکل ہو گیا۔

"اس میں رونے والی کیا بات ہے۔ پروین! ایسا ہی ہے تو تم چائے نہ بناتیں۔ ویسے گھر میں بھی بناتی رہتی ہو۔ دن میں کئی کئی بار' یہاں بنا لی تو رونے بیٹھ گئیں۔"

اپنی جانب سے شگفتگی کا مظاہرہ کر کے ماحول کو ہلکا پھلکا بنانا چاہا مگر واضح طور پر پروین کو یہ لن ترانی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ وہ اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے انہیں شکایت آمیز نگاہوں سے تکنے لگی۔ وہ کھسیا کے چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھانے میں مگن ہو گئے۔

"وشمہ کہاں ہے؟" نوید نے پوچھا۔

"ابھی ابھی سلا کے آئی ہوں۔ روئے چلے جا رہی تھی۔ شاید پیٹ میں درد ہے۔"

"یہ کون ذات شریف ہیں۔؟" بھگویا ہوا آدھا بسکٹ کچھ زیادہ ہی نرم ہو کے چائے کے کپ میں غڑاپ ہو چکا تھا۔ اسے چمچ سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے سراج نے سرسری سا پوچھا۔

"بھائی جان کی بیٹی!" پروین کی آواز اب تک روئی روئی سی تھی۔

"اوہ۔۔۔ ہاں اچھا اچھا میں تو بھول ہی گیا۔"

"اچھا بی بی۔۔۔ اماں ہین جل ساں۔"

ہند کو۔۔۔ یا شاید سرائیکی بولنے والی کرخت نقوش کی ملازمہ نے پردہ اٹھا کے جھانکتے ہوئے اطلاع دی۔

"ابھی سے؟" پروین گڑبڑا گئی۔ "اماں کو تو آلینے دو۔ یہ میرے شوہر آئے بیٹھے ہیں مجھے لے جانے کے لیے مجھے ابھی اپنے گھر کے لیے نکلنا ہے۔"

جواباً "اس پیتل کے رنگ والی ملازمہ نے جس کے چہرے کے نقوش اور مردانہ ہاتھ پیر بھی غالباً" کسی دھات کے سانچے میں ڈھل کر تیار ہوئے تھے۔ ترخ ترخ کرتے الفاظ سے بھرپور تقریر سنا ڈالی جس کا لب لباب یہ تھا۔

"اماں کے نہ آنے کا پتا نہ جانے کا۔ وہ اگر رات تک واپس نہ آئی تو میں بیٹھی تو نہیں رہ سکتی۔ صبح کی کام پہ نکلی ہوں۔ بچے گھر پہ راہ تک رہے ہیں۔ گھر جا کر بھی ان کی بھی روٹی پانی کا بندوبست کرنا ہے۔ مرد بھی شکی مزاج اور ہتھ چھٹ ہے۔ دیر سے گئی تو۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"اسے تو چپ کراؤ۔۔۔" اس کی تقریر ناقابل برداشت حد تک طویل ہو گئی تو سراج نے ناگواری سے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔

"رخصت کرو بھئی اسے۔ بٹھا کے کیا لینا ہے۔"

"اماں گھر پہ نہیں ہیں' میں جا رہی ہوں۔ بچی گھر میں اکیلی ہے۔ ویسے تو سو رہی ہے لیکن جاگ گئی تو بھائی جان کیسے سنبھالیں گے۔ اس کے لیے فیڈر کیسے بنائیں گے۔" بات کرتے کرتے اس کے آنسو بہہ نکلے۔

"طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی بچی کی۔"

سراج نے نہ ہاں کہا نہ ناں' بس لاتعلقی سے گھڑی دیکھتے رہے۔ یہ انداز بھانپ کر نوید نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"تم فکر مت کرو پروین۔۔۔ میں وشمہ کو سنبھال لوں گا اور اماں کون سا دوسرے شہر گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔ تم بے فکر ہو کے اپنے گھر جاؤ۔ تمہارے بچے بھی تمہارے انتظار میں ہوں گے۔"

ان کلمات کو سراج نے نکلنے کا عندیہ جانا۔ چابیاں میز سے اٹھائیں اور کھڑے ہو گئے۔

"چلیں۔۔۔؟" پروین نے یوں سر ہلایا جیسے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو اندر سے اپنی چادر لانے گئی تو بستر پہ بے خبر سوئی وشمہ کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ بے اختیار اسے پیار کرنے لگی۔۔۔ وہ ذرا سا کسمسائی تو ڈر کے پرے ہو سکی۔

"اے ہے' کہیں جاگ ہی نہ جائے' کیسی آفت مچا کے تو سوئی ہے۔ کچی نیند سے جاگ گئی تو پریشان کرے گی بھائی جان کو۔ یہ اماں بھی نا بس۔۔۔ حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری کی بھی۔ اب انہیں گھر میں ٹکنے کی عادت ڈال لینا چاہیے۔ بھائی جان کو کام دھندے پہ بھی نکلنا ہو گا یا بچی کی پالن ہی کرتے رہیں گے۔ کتنا سمجھایا تھا انہیں رات کو مگر سب بے سود۔ اب بھی تین گھنٹے ہو رہے ہیں کچھ اتا پتا نہیں کہاں ہیں' کیوں ہیں اور کب تک ہیں۔"

وہ وشمہ کی ننھی گلابی انگلیاں دھیرج سے سہلاتے ہوئے کڑھ رہی تھی۔

"چلو آ جاؤ بھئی۔"

کمرے کے باہر سے سراج دین پوری آواز کے ساتھ چلائے تھے۔ بچی نے نیند میں چونک کے ہلکا سا جھٹکا لیا تھا۔ پروین گھبرا کے اسے تھپکنے لگی۔

"ایک تو میاں صاحب۔۔۔ جب بلائیں گے حلق پھاڑ کے۔"

بچی کو کروٹ دے کر سلانے کے بعد اس نے ہلکا سا ایک تکیہ اس کے بازو پہ رکھا تاکہ اسے دسراہٹ کا احساس ہوتا رہے اور دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ مبادا دوسری آواز نہ آ جائے۔

وہ لوگ گیٹ سے نکل رہے تھے اور شمشاد بیگم خراماں خراماں چلتی اندر آرہی تھیں۔ ہاتھ میں کھوئے والی قلفی تھام رکھی تھی۔ جسے نوید سے بچوں کی طرح چاٹا جا رہا تھا۔ پروین کو شوہر کے سامنے ماں کی اس حالت پہ خفت محسوس ہوئی۔

"دیکھیں ذرا اماں کو شوگر کی مریض ہیں۔ گھر پہ ہم لوگ پرہیز کراتے ہیں اور باہر جاکے قلفیاں کھاتی ہیں۔"
اس نے دبے لہجے میں نوید سے کہا۔

"اماں کو کوئی روک سکتا ہے؟" نوید کے انداز میں جو پیغام تھا وہ افسوس کے عالم میں سر ہلا کے رہ گئی۔ سراج دین کے چہرے کے تاثرات بھی تمسخرانہ تھے۔ کم از کم پروین کو تو ایسا ہی لگا۔

ان تینوں کو سامنے دیکھ کر شمشاد بیگم ذرا سٹپٹا گئیں۔ ابھی قلفی تھوڑی سی باقی تھی۔ مگر فوراً" نیچے پھینک کر منہ اس سے چپ چپاتے ہوئے ہاتھ چکن کی نفیس چادر سے ہی پونچھ ڈالے۔

"واہ... سراج باؤ آیا ہے۔ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔"

"میں تو کہہ رہا تھا کہ مسجد میں اعلان کراؤ۔ اماں جہاں ہوں گی سُن کر آجائیں گی مگر آپ کی صاحب زادی مانی ہی نہیں۔"

سراج دین نے سراسر مذاق اُڑاتے ہوئے کہا مگر وہ اسے بھی داماد کی خوش مزاجی سمجھیں اور اچھا خاصا مزاد قہقہہ لگایا۔ نزدیک سے گزرتا آئس کریم والا چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔

"کیا کروں اوروں کی خوشی غمی میں بھی جانا ہی پڑتا ہے۔ ساری زندگی اپنے ہی سیاپے تو نہیں نمٹانے ہوتے۔"
وہ اپنے مخصوص جاہلانہ انداز میں باہر جانے کی توجیہہ بیان کرنے لگیں۔

"میں دوسروں کا خیال رکھتی ہوں ان کے کام آتی ہوں تب ہی تو دوسرے میرے گھر کی بات کو اپنا سمجھتے ہیں۔ اب دیکھ لو ساجدہ کے مرنے پہ کتنی برادری اکٹھی ہوئی۔ ماشاءاللہ اتنا بڑا جنازہ نکلا کہ دنیا دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس سے پہلے اس محلے میں اتنا بڑا جنازہ کبھی نہ اٹھا تھا۔ قل دسویں کے ختم بھی ایسی دھوم دھام اور شان سے کیے کہ برادری نے انگلیاں منہ میں دبالیں۔"

وہ جھومتے ہوئے اپنی قصیدہ خوانی کر رہی تھیں۔ پروین کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ ماں کی ان لن ترانیوں کے طعنے اگلے کئی روز اسے سننا پڑتے۔

نوید مراد کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ نجانے ساجدہ کے ذکر پہ یا اس انداز کے ذکر پہ۔

"اللہ کا کرم ہے... کوئی بڑائی کی بات نہیں۔"

اب یہ خاتون انکساری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ایسا کرتے ہوئے اور بھی مضحکہ خیز لگ رہی تھیں۔ پروین نے فوراً" یہاں سے نکلنے کو ہی غنیمت جانا۔

"چلئے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے ساتھ کھڑے منہ بناتے شوہر کو ٹھوکا دیا ورنہ ماں کو آتے دیکھ کر سوچا تھا۔ چند منٹ کے لیے کسی کونے میں لے جاکر اتنی تاکید تو کر دے کہ آئندہ یوں گھنٹوں کے لیے گھر سے غائب نہ ہوں۔ دو ہفتے کی ننھی سی بچی کی ذمہ داری ہے سر پر۔

"لے... ایویں ہی... بغیر روٹی ٹکر کے چل پڑو گے۔ نوید سے کیا دیکھ رہا ہے کھڑا کھڑا۔ روک بہن کو۔ جوائی سوہرے گھر سے بھوکے اٹھ جائے یہ کوئی قاعدے کی بات ہے۔ نا سراج باؤ اندر چلو ایسے نہیں جانے دوں گی۔"
وہ اپنے ان چپچپاتے ہاتھوں سے داماد کا بازو تھام کے اندر لے جانے لگیں۔

"ابھی کھانے کا وقت ہی کہاں ہوا ہے اماں۔" پروین نے نرمی سے انکار کیا۔ وہ شوہر کے تیور بھانپ رہی تھی۔ جسے ایک منٹ بھی مزید یہاں کھڑا رہنا دوبھر لگ رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنا بازو جھٹکے سے چھڑا کے بھاگنے کے موڈ میں ہے۔ اس سے پہلے کہ واقعی ایسا ہو تا وہ خود یہاں سے انہیں لے جانا چاہتی تھی۔

"اماں جی! میں نے آلو کی بھجیا اور مونگ کی دال بنا کے رکھ دی ہے۔ چاول بھگوئے ہوئے ہیں ابال لیجئے گا۔"

اس نے تو جاتے جاتے آخری ہدایت دینا بھی فرض جانا مگر شمشاد بیگم نے اس سے اپنی ذہنی سطح کے مطابق مطلب اخذ کیا۔

"اچھا اچھا... آلو دال پکے ہیں۔ اسی لیے تو اپنے میاں کو کھانے پہ نہیں روک رہی۔ مجھے بتاتی کہ سراج باؤ نے آنا ہے میں سویرے ہی دو تین مرغیاں اور بکرے کا گوشت لے آتی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ نوید ابھی آجاتا ہے چوک سے کباب اور کھانا لے کر آتا ہے گرما گرم۔"

"شکریہ میں بازار کا کھانا نہیں کھاتا۔" سراج دین نے چبا چبا کر کہا۔

"آپ کو پتا تو ہے اماں کہ میاں صاحب السر کے مریض ہیں۔ ہم چلتے ہیں کھانا پھر کبھی سہی بھائی جان اور وشمہ کا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔"

"ہاں اب بڈھی عمرے (ادھیڑ عمری) میں نے اوروں کا ہی تو خیال رکھنا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ بچے میرا خیال رکھیں۔ یک ہا... چنگا پتر خیر نال جاؤ۔"

نوید نے بھی آگے بڑھ کے بہن کے سر پہ ہاتھ رکھا جو پچھلے پندرہ دن سے اپنا گھر بار بچے سب بھلائے اس کی دل جوئی اور اس کی بچی کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔

"اووف..." گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی سراج دین نے گہری سانس لی۔

"تمہاری اماں نے گیٹ پہ پورا آدھا گھنٹہ ضائع کرا دیا۔ تھکا ہارا فیکٹری سے آیا تھا اوپر سے تمہیں لانے کی ڈیوٹی مگر انہیں ان باتوں کا خیال ہو تو رونا کس بات کا ہے۔"

"آپ کو تو بلاوجہ رونا آجاتا ہے میری اماں کو دیکھ کر۔" وہ دل کی شکایت لبوں تک لائے بغیر نہ رہ سکی۔

"بلاوجہ... یہ بھی اچھی کہی پروین بیگم خیر اس پہ ایک بھرپور مناظرہ پھر سہی فی الحال اس قصے کو رہنے دو۔ اتنے ہفتوں بعد گھر جا رہی ہو۔"

"کتنے ہفتوں بعد؟ دو ہی ہفتے تو ہوئے ہیں۔" تنک کر جواب دیا۔

"ایک تو تم عورتیں میکے میں رہ رہ کر کبھی جی نہیں بھرتا۔"

"اپنی خوشی سے نہیں رہ رہی تھی۔ آگے پیچھے کبھی دو دن اکٹھے نہیں گزارے۔ سوائے احسن کی پیدائش پہ کہ پہلے بچے کی دفعہ میکے میں رہنا ہی پڑتا ہے رواج کے مطابق میں تو بھائی جان کی شادی کے موقع پر بھی صرف ایک رات رکی تھی۔ اور میرا تو اکلوتا بھائی... مگر آپ کے مزاج ہی نہ مل رہے تھے۔ خیر وہ خوشی کا موقع تھا۔ مگر غم کے موقع پہ مصلحت اور خود غرضی سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ یہ ایسا موقع تھا کہ آپ میرے یہاں رکنے پہ ناراض نہ ہو کر اپنی وسیع القلبی کا ثبوت دے سکتے تھے مگر آپ ہیں کہ... بس مسلسل طعنے دیے جا رہے ہیں جیسے میں یہاں میلا دیکھنے رکی تھی۔"

"ہو گئی شروع... کس کا اتنا دماغ ہے جو تم سے بحث کرے۔ ایک زبان ہی تو تیز چلانا جانتی ہو۔"
اس نئے الزام پہ وہ تلملا کے مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سراج نے گھور کے اسے دیکھا۔

"اتنے دنوں بعد گھر جا رہی ہو مگر منہ بنا ہوا ہے شوہر سے تو کبھی تمیز یا ادب سے بات کرنے کی توفیق نہیں ہوئی نہ کہیں سے تمہیں یہ تربیت ملی۔ اب اماں جی کا بھی لحاظ نہیں رہا تمہیں؟"

"انہیں کیا کہہ دیا میں نے؟" وہ حق دق رہ گئی کہ اس سارے بحث مباحثے میں اس کی ساس کا تو ذکر سرے سے کہیں تھا ہی نہیں۔

"ایک بار بھی تم نے ان کی خیریت تک نہیں دریافت کی مجھ سے؟ آخر ماں کی جگہ ہیں وہ۔ اتنا چاہتی ہیں تمہیں۔ اور بہو صاحبہ ہیں کہ جھوٹے منہ ان کا نام تک نہیں لیا۔"

اس بے بنیاد الزام پہ پروین کو سچ مچ تکلیف ہوئی۔ جتنی تکلیف اس سے پہلے کی باتوں پہ ہوئی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف۔

وہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ بلاناغہ صبح شام گھر پہ فون کر کے ان کی خیریت دریافت کرتی ہے۔ دوائی؟ کیا کھایا؟ آرام؟ وغیرہ۔ ہر چھوٹی چھوٹی بات پوچھتی ہے اور ابھی سراج کے آنے سے دس بارہ منٹ پہلے ہی اس نے ان سے بات کر کے فون رکھا تھا۔ وہ ان کی خیریت سے لاعلم نہیں تھی جو دریافت کرتی۔ مگر وہ یہ سب ان کو بتا نہ سکی۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی۔

"اتنی سی بات چبھ گئی کہ میں نے ان کی والدہ کی خیریت دریافت کیوں نہیں کی۔ یہ اعتراض تو میں بھی کر سکتی ہوں میاں صاحب' بلکہ میرے پاس تو اعتراض کرنے کی توجیہہ زیادہ تگڑی ہے۔ میری اماں سامنے کھڑی تھیں اور آپ نے رواداری میں حال چال پوچھنا تو درکنار سلام بھی مارے باندھے منہ ہی منہ میں بدبدا کے کیا تھا۔ کیا سارے اصول و قواعد صرف مجھ پہ' یعنی ایک عورت پہ لاگو ہوتے ہیں؟ آپ یعنی مرد اس سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ چلیں۔۔۔ میرے پاس تو تربیت کی کمی ہے بقول آپ کے' پھر بھی اپنے طور اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے کر گزارے لائق حسن سلوک کر رہی ہوں اپنے سسرالی عزیزوں سے مگر میاں صاحب آپ کے پاس تو تربیت دینے والی ہستی بھی ہے۔ پھر آپ کیوں نہ استفادہ حاصل کر سکے۔"

یہ سب باتیں وہ دکھی دل کے ساتھ سوچتی ہی رہی۔ زبان پہ لانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ سراج دین ان لوگوں میں سے نہ تھے۔ جو آئینہ دیکھ کر سنبھل جایا کرتے ہیں۔ خود کو سنوار لیا کرتے ہیں۔ وہ آئینے میں حسب منشا عکس نظر نہ آنے پہ آئینہ ہی پتھر مار کے توڑ دینے والے لوگوں میں سے تھے۔

گھر پہنچ کر بچوں کو دیکھ کر وہ سب بھول بھال گئی۔

دیر تک انہیں سینے سے بھینچے رہی۔ جیسے مدتوں بعد مل رہی ہو' حالانکہ ان پندرہ دنوں میں اماں جی کا کئی بار آنا ہوا تھا اور وہ صرف اس سے ملوانے کی خاطر بچوں کو بھی ساتھ لیتی آئی تھیں۔

"اور تم تو اچھی رہیں؟"

شوکت جہاں نے فوراً "سب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔ اس نے سرشاری سے سر ہلا دیا۔ میاں کی بے رخی کا ملال کچھ کم ہونے لگا تھا وہ محبت و عقیدت سے ساس کا گھٹنا دبانے لگی۔

اگرچہ فون پہ روزانہ ہی بات ہو جاتی اور سب حالات کا علم بھی ہوتا رہتا تھا اس کے باوجود انہوں نے میکے سے آئی بہو سے ہر شخص کی بابت پوچھا تھا۔ حتیٰ کی ننھی سی وشمہ کے بارے میں بھی۔ جب کہ شمشاد بیگم نے رسماً بھی داماد سے چلتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ اپنی اماں کو میرا سلام کہنا۔

"بچے تمہارے بغیر خاصا اداس رہے۔ بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی سنبھالنے میں' خصوصاً حسان اور وشی کو۔۔۔۔ دن بھر تو کھیلتے رہتے تھے خوب مزے میں۔ بے چاری ثنا بہلائے رکھتی تھی۔ اچھی عادت کی بچی ہے۔ ماں پہ نہیں پڑی۔"

بات کرتے کرتے انہوں نے آخری فقرہ ذرا آواز دبا کے کہا۔ پروین کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ تائید میں سرہلا کے ٹانگیں دابتی رہی۔ شوکت جہاں پھر سے اصل موضوع پہ آگئیں۔

"مگر رات ہوتی نہیں کہ دونوں کا رونا بسورنا شروع' ایک کہے مما' دوجا پکارے ماما' حسن گو بڑا ہے۔ رو کر یا چلا کر اس نے تمہاری ضد نہیں کی مگر چپ چپ اداس سا رہا۔ جیسے تم سے ضد کر کے یا فرمائش کروا کر اپنی منواتا تھا ویسے اس نے تائی سے ایک بار نہیں کہا کہ چپس بنا دیں' شربت چاہیے وغیرہ۔۔۔ اور نہ اس بھلی مانس نے اپنے منہ سے کہا۔ چلو اللہ بھلا کرے اس کا۔ جیسے بھی سہی اتنے دن بچوں کو سنبھالا تو سہی' ماں جیسی محبت اور توجہ نہ دی مگر خیال تو رکھا۔ کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ دل میں تنگ ہوئی بھی ہو تو زبان سے نہیں کہا۔"

یہ ان کی عادت تھی کسی سے گلہ دل میں نہ رکھتیں فٹ سے کہہ ڈالتیں' اسی طرح کسی کی اچھی بات کی تعریف کرنے میں بھی بخل سے کام نہ لیتیں۔ یہ سب باتیں انہوں نے فون پہ کبھی پروین سے نہیں کی تھیں کہ وہ بچوں کے بارے میں سن کر پریشان نہ ہو۔ اب ساری تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔

"وقت پہ بچوں کو تیار کروا کے' ناشتہ کروا کے اسکول بھیجتی رہی۔ ان کے کپڑے لتے' نہانے دھونے کا انتظام کرتی رہی۔"

وہ اس کے احسان ایک ایک کر کے گنوا رہی تھیں۔

"مہربانی ہے بھابھی کی۔ میں ان کا شکریہ ادا ضرور کروں گی۔" وہ دل سے ممنون ہوئی حالانکہ ایسی ڈیوٹیاں وہ مہینے میں دو تین بار پورے پورے دن کے لیے ضرور ادا کیا کرتی تھی' جب رخشندہ کسی دوست کے ہمراہ تبلیغی درس یا شاپنگ وغیرہ کے لیے بچے گھر پہ چھوڑ کے جایا کرتیں البتہ پروین کا یہ پہلا موقعہ تھا۔

"ہاں یاد سے کرنا۔ ایسے تکلفات کو بہت اہمیت دیتی ہیں ہماری بہو صاحبہ۔۔۔ حالانکہ اپنوں میں کیسا احسان ۔۔۔۔ خیر۔"

انہوں نے بات سمیٹی اور پھر حسب عادت دوسری پھیلائی۔

"تم کیوں چپ چپ سی ہو۔ میں ایک گھنٹہ بھی کہیں گزار آؤں تو سنانے کے لیے دس باتیں ہوتی ہیں' اس حساب سے تو پندرہ دنوں میں ہزاروں باتیں جمع ہو چکی ہوں گی۔"

"یہ پندرہ دن کیسے گزرے ہیں اماں جی! آپ بھی جانتی ہیں۔" اس کی آواز سے ہی دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"صبر کرو بیٹی' جانے والے چلے گئے۔ اب آنسو ان کو واپس نہیں لا سکتے۔ بس مغفرت کی دعا کرو۔"

"جانے والوں پہ تو صبر کیا جا سکتا ہے اماں جی' جو باقی رہ گئے ان کے حال پہ دل کیسے صبر کرے۔ وہ ذرا سی بچی' بن ماں کی بچی۔۔۔ اس کی صورت آنکھوں میں پھرتی ہے تو صبر نہیں آتا۔ کیسے بلکے گی وہ ننھی سی جان۔"

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہی ذات پاک پرورش کا وسیلہ بھی بنا دے گا۔"

"اماں سے اس عمر میں بچی کیا پالی پوسی جائے گی۔ بھائی جان سارا دن گھر پہ نہیں ہوں گے۔ دوسری کوئی عورت گھر پہ نہیں۔ مجھے تو سوچ سوچ کے ہول اٹھتے ہیں۔"

"ہاں وہی والا مسئلہ۔" انہیں زہرہ کے جانے کا وقت یاد آ گیا۔ وہ بھی چند دن کے وصی کو گود میں لے کر یونہی آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں۔

"شمشاد بہن کو چاہیے تھا چند سالوں کے لیے بچی ننھیال میں رہنے دیتیں۔ یہی شروع کے دن مشکل ہیں۔ ذرا سیانی ہو تو واپس لے آتیں۔"

"ایسا ہو سکتا تو مشکل کیا تھا مگر ننھیال میں نانا' نانی تو ہیں نہیں' بھائی بھاوج ہیں۔ وہ بھی روکھے سے۔ ایک تو حالات اچھے نہیں' ان لوگوں کے۔ دوسرا دل بھی تنگ ہیں۔ حالات کی تو خیر ہے اگر وہ وشمہ کو تین چار سال سنبھالنے کی ہامی بھرتے تو بھائی جان ہر ماہ معقول رقم اخراجات کے لیے دے ہی آیا کرتے۔ لیکن ان کے دلوں میں خدا ترسی اور محبت تو بھری نہیں جا سکتی' خون سفید ہو گیا ہے سگے رشتوں کا۔ ایک بار بھولے منہ سے نام نہیں لیا انہوں نے بچی کا۔ ایسے بھی ہوتے ہیں ماموں' اور ایسی بھی ہوتی ہیں ممانیاں۔"

ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنا احسان جتانا چاہا کہ کیسے نند کے بچے کو کلیجے سے لگا کر پالا ہے۔ آخر وہ بھی تو ممانی ہے۔

"ہاں سچ ہے۔ کون لیتا ہے کسی کی ذمہ داری۔" شوکت جہاں کے الفاظ پہ پروین کو دھچکا سا لگا۔ (کیا اس نے یہ ذمہ داری جی جان سے نہیں لی تھی)

اس کے ہاتھ ان کی ٹانگوں پہ سست سے پڑ گئے۔

☆ ☆ ☆

"گیارہ بج رہے ہیں اور ابھی تک سارا گھر الٹا پڑا ہوا ہے۔ نہ صفائی ہوئی ہے نہ پھیلاوا سمیٹا ہے۔ نہ ناشتے کے برتن دھلے ہیں اور تو اور ہانڈی تک نہیں چڑھائی جب کہ تمہارے سسر ناشتہ نہیں کرتے اور ٹھیک بارہ بجے لاٹ صاحب کو گرم گرم پھلکوں کے ساتھ تازہ سالن چاہیے ہوتا ہے۔ اب کیا میں اپنا کلیجہ ٹوٹے ٹوٹے (ٹکڑے) کر کے ان کے آگے رکھوں گی۔"

"بھلئے لوکے 'اتنا تردد نہ کر۔ جلی ہوئی چیز مجھے کہاں ہضم ہوتی ہے۔"

سسر صاحب کہاں کم تھے۔ نصرت بی بی کی چیخ پکار اور پھر کلیجہ کھانے کے لیے رکھنے کی پیش کش سن کر انہوں نے اپنے کمرے سے با آواز بلند یہ تبصرہ نشر کیا۔

"بس تم اندر بیٹھے ٹی وی دیکھتے رہو یا" "چٹکریاں" (طنز) کرتے رہو۔ غضب خدا کا۔ تین تین نوکر لگے ہوئے ہیں گھر میں۔ پہلے کپڑے دھونے والی کچھ دن نہیں آئی تو بڑا احسان کر کے بیگم صاحبہ نے مشین لگائی اور ساتھ اپنے خصم سے ساس کو ذلیل بھی کروایا۔ اب وہ بد بخت صفائی والی ملازمہ چوٹ لگا کر گھر بیٹھ گئی ہے تو اتنا نہیں ہوا اس سے کہ وقت پہ صفائی ہی کر لے کون سا روز کام ہے۔ اپنے گھر کبھی ملازم نصیب نہیں ہوا۔ ادھر آ کے ایسے پھیل گئی ہے جیسے کبھی ہل کے پانی نہ پیا ہو۔"

"میں کرنے ہی والی تھی امی جی! بس آپ کے اٹھنے کا انتظار تھا۔" منزہ نے نصرت بی بی کے پل بھر کے لیے خاموش ہوتے ہی جلدی سے وضاحت پیش کرنا چاہی۔

"کیوں؟ کیا مجھے دکھا کے صفائی کرنی تھی یا ہانڈی روٹی کرنا تھی؟ میرے سر پہ کوئی احسان چڑھانا تھا؟ تمہارا گھر نہیں ہے یہ؟ میں بارہ بجے اٹھتی تو تم بارہ بجے تک ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی رہتیں۔"

"ظاہر ہے..... سوہا کو کسی کے سپرد کر کے ہی میں کام کر سکتی ہوں۔" اس نے تحمل سے جواب دیا۔

"لو' اور سنو' یہ اچھے نخرے ہیں۔ پہلے اسے بچی کے لیے آیا لگوا کے "دو تین چار ہزار روپے کی" پھر ان سے جھاڑو پونچھا کرواؤ۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کے کچن میں کیسے جاتی۔ ساتھ بھی نہیں لے جا سکتی اسے گرمی دانے نکلے ہوئے ہیں۔"

"توبہ' جیسی ماں نازک پری ویسی بیٹی نخریلی۔" شمیم بھی بھاڑ سا منہ کھولے جمائی لیتی اپنے کمرے سے برآمد ہوئی۔ ان دونوں ماں بیٹی کو رات دیر تک وی سی آر پر فلمیں دیکھنے اور مل کر خاندان بھر کے بخیے ادھیڑنے کی لت تھی۔ سو دن چڑھے تک سو کر نیندیں پوری کی جاتیں۔ ایسے میں منزہ۔ کام کا آغاز کرتی تو کیسے کرتی۔ اسے خود بھی احساس تھا۔ کچن میں مظہر کے ناشتے کے جھوٹے برتن رکھنے گئی تو وہاں کھڑا ہونا دو بھر لگ رہا تھا۔ رات کسی وقت شمیم نے چائے بنائی تھی اور ساتھ ہی شاید کچھ تلا بھی تھا۔ گھی کی چکنائی' چینی کے بکھرے دانے۔ چائے کے خشک ہوتے بھورے نشانات' ان سب پہ جمع چیونٹیاں اور منڈلاتی مکھیاں یہ سب دیکھنا اس کی صفائی پسند طبیعت کی برداشت سے باہر تھا' لیکن مظہر کو ناشتے کی ٹیبل پہ اکیلا چھوڑ کر یہاں کی صفائی کرنے کا مطلب تھا۔ سویرے سویرے اسے ناراض کرنا اور ایسا رسک وہ نہیں لے سکتی تھی۔

کل چھٹی کا دن تھا۔ مظہر گھر پہ ہی تھا۔ اس لیے سوہا کو اس کے پاس کھیلتا چھوڑ کے اس نے سب کے جاگنے سے قبل سارے کام نمٹا لیے تھے۔ ناشتے کی تیاری مکمل تھی۔ آٹا گندھا ہوا۔ آملیٹ کے لیے پیاز اور ہرا مسالا کترا ہوا۔ انڈے پھینٹے ہوئے۔ کچن اور لاؤنج کی مکمل صفائی' باہر کار پورچ اور برآمدہ بھی دھو ڈالا تھا اور آج وہ خود اس قدر پھیلاوا دیکھ دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔ سوہا کو گرمی دانے چبھ رہے تھے۔ مشکل سے اسے سنبھالتے ہوئے فقط اپنے کمرے کی صفائی کی تھی۔

"ہم نے تو چھوٹے چھوٹے بچوں کو کمر پہ لاد کے بھی صفائیاں کی ہیں۔ گود میں اٹھا کر بھی ہانڈی روٹی کی ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں پتہ نہیں کیسی ہیں۔"

"اور اکیلے کمرے میں کیا سوہا کو جن بھوت کھا جاتے؟" شمیم جب بولتی ایسے ہی بنا سوچے سمجھے بولتی۔ منزہ کا دل کانپ گیا۔

"اللہ نہ کرے۔ مگر سو خطرے ہوتے ہیں' بچی بجلی کی کسی چیز یا سوئچ میں ہاتھ دے ڈالے۔ خدانخواستہ باتھ روم میں پھسل جائے۔ کوئی غلط چیز منہ میں ڈال لے۔"

اس نے وہ خدشات گنوانا چاہے جن کے تحت وہ سوہا کو اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔ مگر نصرت نے بے زاری سے ہاتھ ہلا دیا۔

"بچی نہ ہوگئی آفت ہوگئی۔ دو سال کی اینڈیا اور سارے گھر کا کام دھندا روکے ہوئے ہے۔"

نصرت کی آواز میں تنفر اور بے زاری تھی۔

"رہنے دو امی! سب ڈھکوسلے ہیں۔ کام نہ کرنے کے بہانے' ورنہ ایسا ہی اندر بیٹھے ہیں' اس کی نیت ہوتی کام کی تو بچی کو ان کے پاس بٹھا دیتی۔ وہ کیا منع کر دیتے۔"

منزہ نے شمیم کے منہ لگنا مناسب نہ جانا' اور چپ چاپ سوہا کو دادی کے پاس بٹھا کے جھاڑو اٹھالی۔

کچن میں برتن دھوتے ہوئے بھی اسے نصرت اور شمیم کی آوازیں بدستور آتی رہیں۔ حالانکہ پانی کا نل کھلا ہوا تھا۔ برتنوں کی اٹھا پٹخ بھی جاری تھی۔ بیچ بیچ میں وہ چولہے پر رکھی دیگچیوں میں ڈوئی چمچہ چلا رہی تھی اور اس کی پوری شعوری کوشش یہ تھی کہ وہ یہ تبصرے نہ سن پائے لیکن واقعہ کچھ یوں تھا کہ نصرت اور شمیم دونوں ہی یہ دل جلی باتیں ایک دوسرے کو سنانے کے لیے نہیں کرتے تھے۔ مقصد اس کے کانوں میں ڈالنا ہی ہوتا تھا۔ شاید اس کی وجہ ان کے خیال میں یہ ہو کہ مظہر کی میٹھی دل لبھانے والی پیار بھری باتوں کی زیادتی کا اثر زائل ہو جائے۔

"بیچ گھرانے کی لڑکی جو بھی بیاہ کے لایا یونہی پچھتایا جیسے کہ ہم پچھتا رہے ہیں۔"

"آپ نے بھی تو من مانی کرنے کی چھوٹ دے رکھی ہے اولاد کو' اب بھی وقت ہے اصغر کی لگامیں کس لیں امی۔ ورنہ وہ بھی لے آئے گا کوئی روتی بسورتی پھٹکار ماری شکل والی۔ غریبنی جو یہاں کھلا کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا دیکھ کے پھٹ پڑے گی۔" شمیم نے صلاح دی۔

"ایویں ہی لے آئے گا۔ میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے یتیم غریب۔ مگر بدنیت لڑکیوں کا..... اللہ کی شان' کوارٹروں میں رہنے والیاں کوٹھیوں میں آ کے راج کریں۔ سوکھی روٹی چٹنی کے ساتھ رگڑ کے کھانے والیاں ہوٹلوں میں دعوتیں اڑائیں۔ چھینٹ وائل پہننے والیاں ادھر آ کے چکن بریزے اور گل احمد کی لان پہنیں' کیوں بھئی؟"

یہ ٹھیک تھا کہ منزہ کے میکے والوں کے حالات اچھے نہ تھے اور لڑکپن میں ہی ماں باپ کی وفات ہو جانے کی وجہ سے وہ بھائی بھابیوں کے آسرے پہ تھی۔ جنہوں نے مقدور بھر اس کا خیال ضرور رکھا لیکن وہ خود ہی ان پہ زیادہ بوجھ نہ ڈالتی تھی۔ ضرورت کی چیزوں کے لیے بھی اس نے دل کو مار رکھا تھا۔ مگر ایسے برے حالات بھی نہ تھے جن کا نقشہ اس کی ساس کھینچ رہی تھی۔ بس سفید پوش سلیقے اور رکھ رکھاؤ والے لوگ تھے۔ شاید یہ منزہ کے صبر کا ہی صلہ تھا کہ اسے مظہر جیسا چاہنے والا اور قدردان شوہر نصیب ہوا' جس نے بساط بھر سہولت اور آسائش اسے مہیا کر رکھی تھی۔ یہ صلہ اللہ تعالیٰ نے بخشا تھا مگر اس کا کریڈٹ بھی نصرت بی بی خود لینا چاہ رہی تھی اور یہ بھی گوارا نہ تھا اس جیسی کم ظرف عورت کو کہ کسی کو اس کے اس کی اولاد یا اس کے گھر کے وسیلے سے ذرا سی خوشی اور آسانی بھی نصیب ہو جائے۔ منزہ کے چہرے پہ پھیلا سکون اور آسودگی اسے انگاروں پہ جلا دیتی تھی۔

"اب تو میں لاؤں گی کسی سیٹھ کی لڑکی' حالانکہ مظہر اصغر سے زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ کپڑے بھی فیشنی پہنتا ہے۔ دفتر میں باؤ بن کے کام کرتا ہے۔ انگریزی میں گٹ پٹ کرتا ہے۔ سیٹھوں کی چھوکریاں ایسے گھبرو لڑکوں کو پسند کرتی ہیں اس کا رشتہ ڈھونڈنے جاتی تو کسی کروڑ پتی کی لڑکی تو مل ہی جاتی' مگر برے نصیب' جانے کس کی بددعا لگی اسے کہ ککھ پتی کی لڑکی اٹھا لایا۔ خیر اصغر اتنا سوہنا نہیں مگر کماتا تو اس سے دگنا ہے۔ کروڑ پتی نہ سہی' لکھ پتی کے گھر تو رشتہ ہو جائے گا۔ کیسی شان سے بارات جائے گی۔ مظہر کی تو بارات لے جاتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ سو سے اوپر ایک بندہ بھی ہو گیا تو لڑکی کے بھائیوں کو غش نہ پڑ جائے اور انتظام کیا کیا تھا ان فقیروں نے۔ گلی میں تمبو تان کے بٹھا دیا تھا۔ ہونہہ' اصغر کی شادی تو میں ایسی جگہ کروں گی جہاں بارات کسی اونچے ہوٹل میں جائے گی۔ جو اپنی لڑکی کو کم از کم پچاس تولے اور لڑکے کی ماں بہن کو "ورتن" (پہناونی) میں دس دس تولے سونا ڈالیں گے اور جو لڑکی کے نام زمین جائیداد' مکان' دکانیں لگا کر رخصت کریں گے۔ دیکھنا تم۔"

ساس کے ان ارادوں پہ اندر کام کرتی منزہ کو ہنسی آگئی۔ اسے اصغر اور مظہر کے مابین ہونے والا مکالمہ یاد آ گیا جب چھاتی ٹھونک کے اصغر نے اعلان کیا تھا۔

"شادی تو میں ربنا سے ہی کروں گا چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ کوئی مائی کا لال مجھے اس سے نہیں روک سکتا۔ چاہے وہ کہیں کی بھی ہے۔ کسی میں ہمت ہے تو مجھے منع کر کے دکھائے۔ میں ربنا کو اس گھر میں لاؤں گا۔ جس کو اعتراض ہے وہ خود نکل جائے یہاں سے۔"

"کاش۔۔۔ ایسا ہی ہو جائے۔"

منزہ ہاتھ روک کر سوچنے لگی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ میری بلا سے اصغر کروڑپتی کی لاڈلی سے شادی کرے یا کسی طوائف کی بیٹی سے۔ مگر ان کے غرور کو تو ٹھیس لگنی چاہیے۔"

بہت متحمل مزاج سہی۔ بہت صابر سہی۔ مگر تھی تو بندہ بشر۔ جس کے صبر کی بہرحال ایک انتہا ضرور ہوتی ہے اور نصرت کے کافی دیر سے جاری طعنے اسے اس انتہا تک لے آئے تھے کہ وہ صبر کھونے لگی تھی ان کے دل کی بھڑاس نکالنے کا یارانہ تھا۔ اور نہ فطرت میں یہ چیز موجود تھی بس دل میں چپکے سے دعا مانگ بیٹھی۔

"اللہ۔۔۔ اصغر کی سن لینا۔ وہ اسی ربنا سے شادی کر کے لے آئے تو کیسی مات ہو ان کے اونچے ارادوں کو جو امیرزادی کو میرے مقابل کھڑا کر کے دراصل یہ مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے اور دن رات ذلیل کرنے کے لیے اور بہانے تلاشنے کی کوشش کرنا چاہتی ہیں۔ اللہ کرے، وہی طوائف زادی ان کی بہو بن جائے۔ پھر تو ہو گی میری۔"

یہ دعا مانگتے ہوئے کہیں بھی اس کے دل میں یہ وسوسہ نہ تھا کہ یہ دعا اگر قبولیت پا گئی تو اس کے حق میں کتنا ... ہو گا۔

* * * *

"میں نے یہ زندگانی۔۔۔ سنگ تیرے بتانی۔

تجھ میں بسی ہے میری جاں۔

ہائے جیا دھڑک دھڑک، جیا دھڑک دھڑک جائے۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی سنور رہی تھی۔ گنگنا رہی تھی۔

"یا اللہ خیر! آج تو سروں سے چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔"

شمع نے زیتون کا تیل پنڈلیوں پہ ملتے ہوئے کہا۔ حسبِ توقع ربنا کی گنگناہٹ تھم گئی اور اس کا ہاتھ بھی۔ اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس سے نظریں ہٹا کے اس سے ذرا پیچھے جھلکتے ماں کے عکس کو بغور دیکھا۔ اس باسی میدے کی سی رنگت والے چہرے پہ اور سانپ کی جیسی آنکھوں میں کھوج ہی کھوج تھی۔

ربنا جانتی تھی کہ آج کل اس کی ماں کی ساری توجہ اس جانب ہے کہ اس کے جعفر محمود سے تعلقات کس نہج پر جا رہے ہیں۔ چونکہ نہ وہ کبھی یہاں آیا تھا نہ ہی بلاوے کے بعد بھی آنے کا امکان تھا۔ اس لیے وہ متجسس تھی کہ کسی بہانے اندر کی بات کا پتہ چلے۔ کہیں لمبی اڑان بھرنے کی تیاری میں نہ ہو۔

ربنا نے ایک گہری سانس بھری۔ ہئیر برش دوبارہ لہرئیے بالوں میں چلنے لگا اور وہی مدھم گنگناہٹ۔

تجھے دیکھ دیکھ سونا

تجھے دیکھ دیکھ جاگنا

"ہاں وہ تو جیسے چوبیس گھنٹے تیرے گوڈے سے لگا بیٹھا رہے گا۔ تو اسے دیکھ دیکھ جاگے گی اور دیکھ دیکھ سوئے گی۔"

اس کے ہاتھ تیزی سے تیل کے مساج میں مصروف تھے اور زبان اسے بولنے پہ اکسانے میں۔

"جب آپ کے پاس ایک الگ کمرہ موجود ہے تو اپنے حسن کے نکھار کے ٹوٹکے وہاں بیٹھ کر کیوں نہیں آزماتیں۔" بجائے تنک کے جواب دینے کے وہ خاصے ٹھنڈے لہجے میں مخاطب ہوئی مگر اسی ٹھنڈے لہجے کی مار بھی شمع کو بری طرح تپا گئی۔

"کیوں یہاں میرا آنا منع ہے؟ کسی وزیر، گورنر کا کمرہ ہے یہ؟ اور حسن کے ٹوٹکے میں نے کیا آزمانے ہیں۔ یہ مصیبتیں ان کو مبارک جو پوری سوری شکلیں لے کر پیدا ہوئی ہیں۔ ان کو ہی دو دو گھنٹے لگتے ہیں شیشے کے سامنے مکھی کی طرح چپک جاتی ہیں سنگھار میز سے۔"

وہ لڑکیوں بالیوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کے اپنی ہی بیٹی سے الجھ رہی تھی۔ جیسے وہ اس کی ہم عمر ہو۔

"یہ تیل تو کم بخت پٹھوں اور جوڑوں کے درد کی وجہ سے لگا رہی ہوں۔"

"ان کا بہترین علاج یہ ہے کہ انہیں دن میں دو تین بار تکلیف دے لیا کریں۔ بیٹھ بیٹھ کر جوڑ جڑ جاتے ہیں۔ یہی حال رہا تو چلنے پھرنے سے بھی رہ جاؤ گی والدہ محترمہ۔"

ربنا نے خاصا چبا چبا کر کہا۔

"کوئی کم تکلیف نہیں دی ان ٹانگوں کو۔ ان ٹانگوں نے تھرک تھرک کے ساری ساری رات گھنگھرو چھنکا کے بھوکوں کے پیٹ بھرے ہیں۔ اسی لیے تو اب رہ گئی ہیں بے چاری، مگر آج کل کی اولاد کو کیا احساس ماں باپ کی ساری قربانیاں ایک منٹ میں بھول کر خود غرض بن کر اپنی دنیا آپ بسانے چل نکلتے ہیں۔"

اس نے بھولا سا منہ بنا کر جتانے کی کوشش کی۔

"اب کون چلا گیا اپنی دنیا آپ بسانے کے لیے؟"

وہ سب سمجھ رہی تھی مگر سمجھ کے بھی نظرانداز کرتے ہوئے اطمینان سے آئی لائنر لگا رہی تھی۔

"گیا تو نہیں مگر جانے کو پنکھ ضرور پھیلا رہا ہے۔" شمع نے کن اکھیوں سے اس کی تیاری دیکھی۔

"بس اب گیا کہ گیا۔ پیچھے رہ جائے گا وہ مالی جو ساری عمر اس پودے کو اپنا خون پلاتا رہا مگر پھول توڑ کے لے گیا کوئی اور۔۔۔"

اچانک ربنا کو جو ہنسی کا دورہ پڑا تو شمع کو خود پہ طاری کیا خودساختہ یاسیت اور مظلومیت کا نقاب اتارنا پڑا۔ اب وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ جو ہنس ہنس کے دوہری ہوتی بیڈ پہ بیٹھ گئی تھی۔

"میں نے کیا کوئی لطیفہ سنایا ہے؟"

"لطیفہ نہیں، کسی گھسی پٹی بلیک اینڈ وائٹ فلم کی بیوہ ماں والا ڈائیلاگ سنایا ہے۔ اور قسم سے۔ یہ ڈائیلاگ آپ کے منہ سے سن کر ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے وحیدہ رحمان کے مکالمے ہیلن رٹ کے سنا رہی ہو۔"

"مرجا تو اور تیری وحیدہ رحمان۔" شمع نے جل کر کوسا۔

"اور ہیلن کے ساتھ اتنی رعایت کیوں؟ سگی ہے کیا؟" ربنا نے اور جلایا۔

"ہاں سگی ہے۔ تیری دادی لگتی ہے۔"

"واقعی؟ اس کا مطلب ہے ننھیال ہی نہیں، ددھیال بھی خاصا گنی ہے میرا۔"

اس نے استہزائیہ قہقہہ لگایا اور رسی نما دوپٹہ گلے میں ڈال کر ہاتھ میں اورنج کلر کا خوبصورت پرس تھاما۔

"جا رہی ہوں میں، دروازہ بند کر لینا۔"

"ادھر کون سے خزانے دفن ہیں۔ اللہ نے ایک سبب بنایا تھا رزق روٹی کا۔ اب وہ بھی ختم ہونے والا لگ رہا ہے۔ میں پوچھتی ہوں تیرے یہ سیر سپاٹے کبھی ختم ہوں گے یا نہیں؟

شمع نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی تیاری دیکھی۔ سیاہ فٹنگ والے اور خاصے کھلے گریبان والے لباس پہ جا بجا نارنجی موتیوں کا ہلکا سا کام تھا، اسی رنگ کا پرس، سینڈل اور جیولری۔ نارنجی شیڈ ہی کی چمکدار لپ اسٹک نے اس کے لب بھی بھڑکیلے بنائے ہوئے تھے۔ یوں تو شمع کو وہ ہمیشہ عام سی لگی، مگر آج کل کچھ تھا جو اسے خاص بنا رہا تھا۔

"گھر پہ ٹکوں؟ بی بیوں کی طرح کشیدہ کاری کروں؟ حلوے بھونوں' نیاز بانٹوں محلے میں؟ یا پھر آس پڑوس کے بچوں کو سپارے پڑھاؤں؟ کیا کروں گھر بیٹھ کر؟"

"میں نے کب گھر گھرہستن بننے کو کہا۔ ضرور باہر نکل مگر کچھ کمانے نکل۔ عیش کرنے نہیں تو جس راہ پہ چل رہی ہے اس پہ کچھ نہیں رکھا۔"

"بور مت کرو' کچھ نہیں ہوتا مجھے اور جس راہ پہ اب تک آپ چلاتی رہی ہو مجھے۔ اس میں بھی کچھ نہیں رکھا سوائے ذلت کے۔ کسی ایک آنکھ میں اب تک میں نے اپنے لیے خلوص نہیں دیکھا۔ عزت نہیں دیکھی۔ ہر جگہ دھتکار' بے عزتی اور ان سب کے بدلے' ملتا بھی کیا ہے' چند ہزار' یہ گلا سڑا فلیٹ' یہ بوسیدہ فرنیچر' یہ جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا بدبودار قالین' یہ سیل سے خریدے گئے سستے اور بھڑکیلے کپڑے۔ جھوٹے زیورات' کھانے کے لیے وہی دال روٹی۔ پارٹیوں میں گئے تو کھالیے مرغ مسلم' اور بریانیاں ورنہ.... گرمی کے تین مہینے یہ تھکا ہوا اے سی چلانا پڑے تو بجلی کا بل نکالنے کے لیے مجھے کتنی راتیں.... چھی...."

اس نے فرش پہ تھوکا اور ہاتھ میں تھاما پرس پرے پھینک کر پھر سے بیٹھ گئی۔

"کچھ ملتا ہو تو انسان کیچڑ میں خوشی خوشی گرے بھی' مگر پتہ نہیں تمہیں اس زندگی سے اتنی محبت کیوں ہے۔"

وہ آپ جناب سے بات کرتے کرتے پھر ایک بار "تو" اور "تم" پہ آگئی۔ شمع کے سامنے وہ زیادہ دیر تک خود پہ شائستگی کا یہ خود ساختہ نقاب نہیں اوڑھ سکتی تھی۔

"اس سے تو اچھا ہوتا تم مجھے چار جماعتیں اور پڑھنے دیتیں۔ کسی دفتر میں سیکریٹری لگ جاتی تو اس سے زیادہ ہی کمالیتی۔ بے شک اس نوکری کی آڑ میں وہی کچھ کرنا پڑتا جو اب کر رہی ہوں' مگر میں کہلاتی تو ایک پڑھی لکھی ورکنگ ویمن' اچھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تو ہوتا' ناچنے والی' محفلیں سجانے والی۔ یہ تعارف تو نہ ہوتا میرا۔"

"اپنے پیشے سے کیسا شرمانا رانی' اور پھر دیکھ کیسا مزے کا کام ہے۔ دن چڑھے تک سوتی ہے تو.... اچھے اچھے کپڑے پہنتی ہے۔ جہاں جاتی ہے' لوگ سو سو تعریفیں کرتے ہیں۔ دفتر میں لگ کے تیری کون سی عزت ہو جانی تھی۔ ادھر دیکھتی ہوں میں بس اسٹاپ پہ کھڑی ہوئی ہیں دفتروں میں جانے والیاں۔ ہر شہدا لفنگا چھیڑ کر ہی گزرتا ہے۔ حق حلال کی کمانے والیوں کو یہ لوگ ماں بہن سمجھ کے عزت نہیں کرنے لگ جاتے۔"

"نہ کماتی میں حق حلال کی۔ میں نے کب کہا کہ دفتر میں بیٹھ کے میں نے کوئی نیک پروین بن جانا تھا۔ تب تو یہی زندگی گزارنا پڑتی۔ بلکہ اس سے بھی بری۔ مرد گھر سے باہر کسی شریف عورت کا وجود اسے گوارا نہیں۔ مگر.... مگر یہ نہ ہوتی میں۔ بس یہ نہ ہوتی۔"

وہ ہتھیلی پہ مکا مارتے ہوئے بے بسی سے کہہ رہی تھی۔ آج سے پہلے اس نے اس طرح کھل کے اپنی اس حیثیت سے نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شمع کو تشویش ہونے لگی۔

"بیاہ کردوں تیرا؟"

"بیاہ....؟" رینا کا قہقہہ بلند ہوا۔

"کیسا بیاہ؟ وہ جو تم نے کیا تھا؟ مگر اس قسم کا مایوس تجربہ کرنے کے لیے ابھی میری کافی عمر پڑی ہے۔ چالیس کے قریب پہنچ جاؤں گی۔ کام ملنا بند ہو جائے گا تو ڈھونڈ لوں گی۔ میں بھی کوئی بڈھا کھوسٹ دیہاڑی باز یا دکاندار' جو تین چار سال بعد مر کھپ جائے گا اور میں اس کے بچے پالنے کے لیے "ہاف ریٹ" پہ پھر سے کام تلاش کرنا شروع کردوں گی یا نئے "نگ" پالش کرنے کا کام شروع کردوں گی۔ یا پھر اس قسم کی شادی جو اس سے پہلے آنٹی زرقون اور میڈم جھمی کرچکی ہیں اپنی بھتیجیوں کی۔ وہی پیپر میرج' ایگری منٹ والی۔ ایک سال یا چھ مہینے کی شادی۔ جس میں جہیز دینے کی بجائے لینا پڑتا ہے۔ کیا میرا بھی کوئی ایسا رشتہ آیا ہوا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آواز میں' الفاظ میں۔ زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔ جسے نظر انداز کر کے شمع نے جواب دیا۔

ایسے رشتے تیرے لیے آتے تو رونا کس بات کا تھا۔ جھمی نے یونہی تو ڈیفنس میں بنگلہ نہیں لے لیا اور

زرقون کے گھر کے آگے بھی تین تین گاڑیاں ایسے ہی نہیں کھڑیں۔ اپنی لڑکیوں کے لیے زمیندار' وڈیرے اور بڑے بڑے سیاستدان داماد ٹھیرے تھے اس نے۔ کیا ہوا جو نکاح نامے پہ دستخط کرتے ہوئے ایک اور معاہدہ بھی طے پا گیا تھا کہ یہ خفیہ شادیاں سال بھر سے زیادہ نہیں چلیں گی۔ ایسا داماد مجھے بھی مل جاتا تو وارے نیارے ہوجاتے۔ فی الحال تو رزدھو کے تیرے لیے یہ ایک ہی رشتہ آیا ہے۔ کوئی بہت تگڑی آسامی نہیں ہے ہاں مگر عاشق بڑا تگڑا ہے تیرا' اس لیے جو کچھ ہے سب تجھ پہ وارنے کو ایک دم تیار ہے۔ جو یہ بڑے بڑے زمیندار اور وزیر سال بھر کی شادیوں کے بدلے دیتے ہیں۔ بس یہ ہے کہ تجھے زندگی بھر اس کی بیوی بن کر چولہا چکی کرنا ہوگی۔"

"اونہہ.... چولہا چکی.... پھر کیا کروں گی میں اس دولت کا جو وہ میرے نام کرے گا۔ اگر مجھے بعد میں چولہا چکی ہی کرنی ہے۔"

"یہ پوچھو گی نہیں' وہ دیوانہ ہے کون؟"

مجھے کوئی ضرورت نہیں' پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔ اچھی بھلی نکل رہی تھی۔ خواہ مخواہ ٹوک کر راستہ کھوٹا کردیا۔"

اس نے دوبارہ پرس اٹھایا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اتنی محنت سے سجایا سنورا چہرہ پژمردہ لگنے لگا تھا۔ تھپتھپا کے بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کبھی کبھی کھوٹا سکہ ہی کام آتا ہے میری شہزادی۔" شمع نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔

"خیر' تو چاہتی ہے تو ایک چانس لے کر دیکھ لے۔"

"کیسا چانس؟" رینا اس بے معنی گفتگو میں الجھنا نہیں چاہتی تھی لیکن شمع نے ایک بار پھر اسے ٹھٹھک کر رک جانے پہ مجبور کردیا۔

"اپنا سکہ چلانے کا۔" اس نے لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا۔

"وہ کرے گا تجھ سے شادی؟"

اس سوال پہ رینا کے دل نے ایک بیٹ مس کی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پہ ٹھہر گیا۔ وہ اپنے دل کی اس البیلی' ان چھوئی ادا پہ حیران ہوئی۔

"کیا اس جیسی لڑکی کا دل بھی ایسے سوال پہ شرما کے گھبرا جاتا ہے؟" یہ سوال اس نے اپنے آپ سے کیا تھا۔

"جواب نہیں دیا تو نے؟" یہ سوال اس کی ماں نے کیا تھا۔ اس کے پاس ان دونوں سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ اور وہ جواب ہی تلاش کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سنیے' مجھے اماں کے ہاں اتارتے جائیے گا۔"

پروین نے کھانا ٹفن میں پیک کر کے اپنے میاں کے سامنے رکھتے ہوئے جھجک کر کہا۔

سراج دین ناشتے کے بعد نیپکن سے ہاتھ پونچھ رہے تھے۔ ایک گہری نظر اس پہ ڈالی تو احساس ہوا کہ آج وہ سویرے سویرے ہی خاصے معقول حلیے میں تھی' ورنہ صبح بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرنا.... ناشتہ کروانا' لنچ باکس بھرنا.... اس کا ناشتہ.... میاں کا الگ ناشتہ.... دوپہر کے کھانے کی تیاری کہ سراج دین کھانا صبح ہی ساتھ لے جاتے تھے.... ملازمہ سے صفائی کا آغاز بھی نو ساڑھے نو بجے کروانا ہوتا.... اس ساری افراتفری میں پروین کو کبھی صبح اٹھ کر منہ دھونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ کہیں بارہ بجے کے قریب کام ختم ہوتے تو ہوش ٹھکانے آتے اور حلیہ سنوارا جاتا مگر آج صاف ستھرا' استری شدہ لباس پہنا ہوا تھا۔ بال بھی گوندھ کے بنائے گئے تھے۔ ہلکی سی لپ اسٹک بھی نظر آرہی تھی۔ سراج دین' پروین کو زیادہ غور سے دیکھنے کے خاص عادی نہ تھے' ورنہ یہ بات پہلے ہی نوٹ کرلیتے۔ اب احساس ہوا کہ آج سارے کام بھی معمول سے ذرا جلدی نمٹ گئے تھے۔

"وہ کس خوشی میں؟"

معترضانہ نگاہوں سے یہ سارا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا گیا۔

"کسی خوشی میں بھی نہیں۔۔۔۔ مجبوری میں جانا پڑے گا اور اکثر ہی جانا ہوا کرے گا۔" پروین نے پہلے ہی واضح کردیا تاکہ وہ ذہنی طور پہ تیار رہیں۔

"اماں بیمار رہتی ہیں' بچی بہت چھوٹی ہے' کیسے چلے گا گھر؟ میں نے سوچا ہے' دوسرے تیسرے دن چکر لگا لیا کروں گی۔"

"اور یہ گھر۔۔۔۔ یہ گھر کیسے چلے گا پروین بیگم؟"

"میں نے کہا تو ہے کہ دوسرے تیسرے دن جایا کروں گی اور وہ بھی صرف چند گھنٹوں کے لیے جیسے آج جا رہی ہوں' اپنے صبح کے معمول کے سب ہی کام نمٹا کر اور ان شاء اللہ بچوں کے اسکول سے لوٹنے سے پہلے پہلے آجاؤں گی۔"

"یہ جھکیے کسی اور کو دینا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس لفظ پہ وہ بھڑک اٹھی۔ مزاج میں تیزی تو پروین کے بھی تھی۔ آخر شمشاد بی بی کی بیٹی تھی۔ ہاں بس خود کو سنبھال کے رکھنا آتا تھا اور کبھی کبھی سارا تحمل سراج دین کسی ایک تلخ فقرے یا نامناسب رویے سے ہوجاتا۔

"یہ دوسرا تیسرا ہر روز میں بدل جایا کرے گا۔ کسی اور گھر کا انتظام چلانے کے لیے میں اپنے گھر کا بیڑہ غرق نہیں کر سکتا۔"

ناشتے کے بعد دیر تک اخبار پڑھنے بلکہ چاٹنے کی عادت تھی' مگر اب بحث سمیٹتے ہوئے اخبار بھی تہہ کرکے ایک جانب رکھ دیا اور حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کس قدر بے حس انسان ہیں آپ۔" پروین کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"ایسے موقعوں پہ تو دشمن بھی رعایت کر جاتے ہیں' آپ کو میرے میکے والوں سے نجانے کیا کدورت ہے' جو بھڑاس نکل ہی نہیں پا رہی اور ایسی کوئی پرخاش ہے بھی تو اس معصوم بچی کو تو بخش دیں' اسی پہ ترس کھالیں۔"

"واہ۔۔۔ بہت اچھے۔۔۔ کوئی سن لے تمہاری فریادیں تو پتہ نہیں میرے بارے میں کیا کیا سوچ کہ کیسا ظالم' جابر' تشدد پسند قسم کا شوہر ہے۔ کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ بھی کہہ ڈالو۔"

"ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے۔"

"ہاں ابھی تو کچھ کہا نہیں۔۔۔۔ رعایت کردیں۔۔۔ بچی کو بخش دیں۔۔۔ ترس کھالیں۔۔۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی مظلوم کسی ظالم یا شیطان کے سامنے رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔ اچھی ڈرامے بازی ہے۔"

"یہ کیا تکرار شروع کر رکھی ہے صبح صبح؟"

شوکت جہاں اپنے کمرے سے نکل آئیں۔

"اماں جی! دیکھیے میاں صاحب کو۔ میں نے صرف کہا کہ مجھے چند گھنٹوں کے لیے میکے چھوڑ آئیں تو باتیں سنانے لگے۔"

پروین ساس کی ہمدردی حاصل کرنے لپک کے شکایت کرتی ان کے پاس آئی مگر انہوں نے کڑی نظروں سے گھورا۔ اپنے کمرے میں چائے پیتے پیتے جہاں انہوں نے سراج دین کی دھاڑ سنی تھی' وہاں پروین کا مسلسل زبان چلانا اور حجت کرنا بھی سنائی دے رہا تھا اور وہ بہوؤں کے معاملے میں لاکھ روشن خیال اور وسیع القلب ہوں' ان کا شوہر کے آگے تن کے کھڑے ہونا پسند نہیں کرتی تھیں' بلکہ صرف بہو ہی کیوں' انہیں بیٹی کے معاملے میں بھی یہ روش پسند نہ تھی' اسے بھی ہمیشہ یہی نصیحت کی۔

"مرد کو عورت اپنی خدمت' خاموشی اور حکمت عملی سے قابو میں کرتی ہے۔ دوبدو جواب دینے والی۔۔۔۔ شوہر کو اپنی زبان کے ہاتھوں زچ کرنے والی عورت آخر میں ہمیشہ گھاٹے میں رہتی ہے۔"

اور آج پروین ان کی یہ نصیحت فراموش کر بیٹھی تھی' اس لیے انہوں نے حسب سابق اس کی حمایت کرنے سے گریز کیا۔

"آپ سامنے ہوں تو میں "میاں صاحب" ہو جاتا ہوں اور ابھی آپ کے پیٹھ پیچھے مجھے کینہ پرور' سنگ دل اور بے حس کہا جا رہا تھا۔"

بیٹے نے بھی شکایت پیش کی۔

"بچے جوان ہو رہے ہیں' تم دونوں کا بچپنا ختم نہیں ہوا۔ سالوں ہو گئے تم لوگوں کے جھگڑے نمٹاتے ہوئے۔۔۔۔ اب اتنا دم نہیں رہا۔ خود ہی کچھ ہوش کرلو' دنیا جہان کے مرد کمانے نکلتے ہیں گھر سے مگر کوئی بیوی بچوں پہ یوں سو سو احسان دھر کے نہیں نکلتا جیسے تم نکلتے ہو سراج۔ جب تک حلق پھاڑ کے سارے گھر میں دہشت نہ پھیلا لو' گھر سے باہر قدم نہیں دھرتے ہو اور تم پروین۔۔۔۔ اچھی بیبیاں میاں کو ہنستے مسکراتے دعاؤں میں گھر سے رخصت کرتی ہیں' نہ کہ تمہاری طرح کوستے ہوئے۔"

"مگر اماں جی۔۔۔ میں تو۔۔۔" پروین نے منمنا کے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی مگر شوکت جہاں نے ڈپٹ کے خاموش کرا دیا۔

"چپ رہو' شکر کرو بیٹوں کی ماں ہو۔۔۔ بیٹی بھی ہوتی تو کیا اثر لیتی ان سب تماشوں سے۔۔۔۔ کل کو بیاہ کے اگلے گھر جاتی اور خود بھی یہ سب کرتی۔"

ان کی اس بات پہ پروین کے دل کو دھچکا لگا۔

اسے آج سے پہلے کبھی ساس کا ڈانٹنا ڈپٹنا برا نہیں لگا تھا۔ وہ ساس بن کے نہیں' ہمیشہ ماں بن کے غلطیوں کا احساس دلایا کرتی تھیں۔ ابھی بھی وہ اس کے ساتھ ساتھ سراج دین کا بھی فضیحتا کر رہی تھیں لیکن ان کا یہ فقرہ پروین کے دل میں بڑے درد کے ساتھ کھب گیا تھا۔

"یہی سب کرتی۔۔۔؟ کیا کرتی۔۔۔؟ یعنی ایسا کیا کرتی ہوں میں؟ ٹھیک ہے کبھی کبھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے لیکن میں صرف سچ ہی تو کہتی ہوں۔۔۔۔"

اس کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کے طرز عمل میں واقعی کوئی برائی نہیں تھی۔ پروین کے باپ کو گزرے عرصہ بیت چکا تھا مگر جو بھولی بسری یادیں اس کے ذہن میں زندہ تھیں' ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ سر جھکائے ایک کونے میں دبکا کھڑا ہوتا اور اس کی ماں شمشاد بی بی پوری طاقت کے ساتھ چلا چلا کر اس کی ماں' بہن ایک کر رہی ہوتی۔۔۔ کوسنے اور بددعائیں دے رہی ہوتی۔ اسی کی بیٹی ہونے کے باوجود اس نے ہمیشہ یہ منظر یاد آنے پہ گھن محسوس کی تھی اور ایسا کچھ بھی نہ کرنے کا عہد بھی کیا تھا خود سے۔

خوش قسمتی سے سسرال کا ماحول ایسا ملا کہ اس کے اندر چھپی فطری اچھی عادات اور بھی نکھر کے سامنے آئیں۔ شوکت جہاں کے مشفق برتاؤ سے اس نے بہت کچھ سیکھا بھی اور گرہ سے باندھا بھی۔ انہی کی تربیت کے سہارے سراج دین جیسے اکھڑ مزاج' تند خو اور تلخ زبان شوہر کے ساتھ مقدور بھر صبر و برداشت والی زندگی بھی گزار لی اور آج ایک سچی اور حق کی بات پہ شوہر کو آئینہ دکھانے کی کوشش کیا کی کہ اس کی ساری پچھلی اچھائیاں اور کارگزاریاں اندھے کنویں میں ڈال دی گئیں۔ وہ شاکی ہو کر ساس کو دیکھنے لگی۔

"چلو میاں تم تو اپنے کام پہ سدھارو' بھلے لوگ خوش خوش گھر سے نکلتے ہیں کہ دن کا آغاز اچھا ہو' ہر کام برکت والا ہو۔"

"ساری بات تو یہ ہے کہ اپنا سکون درہم برہم ہوا ہے۔" پروین اب سارے گلے شکوے دل ہی دل میں کر رہی تھی۔ "اچھی طرح سمجھا دیں اسے' میرے منہ نہ لگا کرے اور اپنا دل گھر میں لگانے کی کوشش کرے۔"

وہ نکلتے نکلتے بھی کہنا نہ بھولے۔

"اتنے سالوں میں تمہیں تو سمجھا نہ سکی۔" وہ بڑبڑانے لگیں اور پھر بیٹے کے نکلنے کے بعد پروین کی جانب نظر

اٹھائی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔۔۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں اور سر جھکائے لب کچل رہی تھی۔ ان کا دل موم ہو گیا۔ قریب آ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"چلو جانے دو اب پتا تو ہے تمہیں اس کی عادت کا۔ کیوں دل پہ لیتی ہو۔"

پروین ابھی دل ہی دل میں گلے کر رہی تھی ان سے۔۔۔ اب اتنی سی ہمدردی پاتے ہی سب بھول بھال کر ساس کے گلے لگ گئی اور سسکنے لگی۔

"اماں جی! دیکھیں نا مجھے طعنہ دے رہے ہیں کہ میرا دل گھر میں نہیں لگتا۔ کیا میں باہر گھومتی پھرتی ہوں۔۔۔ سیر سپاٹے کرتی رہتی ہوں۔۔۔ سہیلیاں بنا رکھی ہیں میں نے؟ اس گھر کے علاوہ اور میری زندگی میں ہے ہی کیا۔ پہلے پھر بھی میکے ہو آیا کرتی تھی، مہینے میں ایک آدھ رات رک بھی جاتی تھی لیکن بچوں کا اسکول شروع ہونے کے بعد تو گھنٹے بھر کا چکر بھی مہینے میں ایک دو بار ہی لگ پاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ طعنے۔۔۔ میں کوئی شوق سے تو نہیں جا رہی وہاں۔۔۔ مجبوری ہے۔ میری بھائی کی گھرہستی اجڑی ہے، ان کی دلجوئی بھی ضروری ہے اور ان کی ننھی سی بچی کی دیکھ بھال بھی۔۔۔ کیا میں سب بھول کر اپنے گھر کی خوشیوں میں مگن رہوں۔"

"نہیں میری بچی! کسی بھی بیٹی یا بہن کے لیے آسان نہیں ہوتا میکے کے درد بھول کر اپنے گھر کی خوشیوں میں مگن رہنا۔"

شوکت جہاں نے شفقت سے اس کی پشت سہلائی۔

"میں یہ بات سمجھ سکتی ہوں کیونکہ میں بھی کسی کی بیٹی اور کسی کی بہن رہ چکی ہوں مگر ایک مرد یہ بات نہیں سمجھ سکتا۔ خاص طور پہ سراج جیسا مرد۔ اسے صرف اپنے گھر کے سکون اور خوشیوں سے مطلب ہے اور وہ ان میں کسی کی ساجھے داری برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے ڈر ہے کہ تم ان لوگوں پہ توجہ دو گی تو اس کا گھر اور بچے ڈسٹرب ہوں گے۔"

"مگر وہ غلط سوچ رہے ہیں اور میں انہیں یہی بتا رہی تھی۔"

"ہر شخص میں اتنا ظرف نہیں ہوتا کہ وہ اپنی غلطی کو غلطی مان لے۔ اگر اسے یہ خدشات ہیں تو تم اس سے لڑ جھگڑ کے ان خدشات کو ہوا کیوں دے رہی ہو۔ اس کے دل میں یہ خیال پختہ ہو گا کہ جن کے ذکر سے ہی دونوں میاں بیوی میں تلخی اور بدمزگی پیدا ہو گئی ہو اور تمہارے اپنے گھر کے لیے بہت برا ہو گا۔"

وہ بیٹے کو جانتی تھیں، رگ رگ سے واقف تھیں، اس لیے پروین کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر کے سمجھا رہی تھیں۔

"لیکن اماں جی!"

"میں مانتی ہوں مشکل ہے مگر تمہیں کرنا تو ہو گا۔ فی الحال کچھ دنوں کے لیے میکے جانے کا ذکر مت کرنا۔ ابھی وہ ضد میں آیا ہوا ہے، میں بعد میں اسے منا لوں گی، اس کا موڈ اور موقع دیکھ کر۔"

"ضرورت تو اب ہے، اور ابھی میں چپ چاپ پیچھے ہٹ جاؤں۔"

"یہ تو تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم کسے اولیت دیتی ہو، اپنے گھر کو۔۔۔ یا میکے کو۔ میں تمہیں غلط نہیں کہہ رہی، نہ ہی تمہارا مطالبہ ناجائز ہے۔ یقیناً غلط میرا بیٹا ہے مگر مصلحت بھی کوئی چیز ہے بیٹی! اگر کوئی بات تمہارے گھر پہ اثر انداز ہوتی ہے تو وہ کتنی ہی درست کیوں نہ ہو، اس سے احتراز کرو۔ شوہر اور گھر سب سے اہم ہے۔ اس کی ضد ختم ہو گی تو خود تمہیں اجازت دے دے گا۔"

"تب تک وہ بن ماں کی بچی، وہ اجڑا گھر انتظار کرتا رہے گا۔" پروین بڑبڑائی۔

"پالنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے پروین! یہ مت بھولو جس نے پیدا کیا ہے، وہی پالے گا بھی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ باپ ہے، دادی ہے، کوئی غیر تو نہیں وہ۔ آخر ان کی بھی کوئی ذمہ داری ہے۔ میں چلوں اب۔"

وہ گھٹنوں پہ ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اٹھ گئیں۔

"دماغ پچّی ہو گیا۔ ایک چائے کا کپ اور پلا نا۔ ذرا تازہ دم ہو جاؤں تو وظیفہ شروع کروں۔"

پروین نے سر جھکائے دھیرے سے گردن ہلا دی اور ان کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے نکل آئی۔

"امی! دودھ۔۔۔"

وصی کی آواز پہ ساس پین میں چائے کا پانی چڑھاتی پروین نے پلٹ کے دیکھا۔

"ابھی دیتی ہوں بیٹا!" اس نے فوراً دوسرا چولہا جلایا دودھ گرم کرنے کے لیے مگر شوکت جہاں جو سست رفتاری سے چلتی اپنے کمرے کی جانب جا رہی تھیں، ان کی تیز سماعتوں تک وصی کی یہ بات پہنچ گئی۔

"لو دیکھو بھلا۔ کیا وقت ہو گیا اور ننھے سے بچے کو ابھی تک دودھ نہیں ملا۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے بلاوجہ کی کل کل کا۔"

وہ تو تبصرہ کر کے اندر چلی گئیں مگر پروین جس کا آئینہ سا دل ہلکا سا دھندلا ہونے کے بعد ابھی ابھی صاف ہوا تھا پھر سے جگہ جگہ سے چٹخنے لگا۔

"وصی کے معاملے میں کسی نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اس کا باپ اور دادی زندہ ہیں اور ان کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ وہ مل کے پال لیں گے اسے۔ تب اماں جی کا یہ توکل کہاں تھا کہ جس نے پیدا کیا ہے، وہی پال لے گا ۔۔۔ مگر تب تو وصی کے لیے رو رو کے ہلکان ہوتی تھیں۔ آخر گھلا کے ہی رہیں اور تب اسے میری گود میں ڈالتے ہوئے میاں صاحب کو یہ فکر کیوں نہیں ستائی کہ اس کی وجہ سے میرے اپنے بچے اور گھر متاثر ہو گا۔ حسان بھی تو چند ماہ کا تھا۔ ایک ساتھ دو ننھے بچوں کی پرورش کر لی میں نے، تب گھر کے حالات ڈسٹرب نہ ہوئے۔ اب جب کہ بچے بڑے ہو گئے ہیں، مجھ پہ ذمہ داری بھی کم ہے، اب ایک اور بن ماں کی بچی کو اگر میری ضرورت ہے تو سب کو نت نئی تاویلیں سوجھ رہی ہیں۔"

وہ کڑھ کڑھ کر سوچتی رہی۔ سوچ سوچ کر کڑھتی رہی اور چولہے پہ رکھا دودھ کڑھ کڑھ کے کم ہوتا گیا۔

☼ ☼ ☼

جعفر محمود بڑے مسرور و مگن انداز میں ڈرائیو کرتا ہوا اپنے گھر لوٹا تھا اور گاڑی سے نکلتے ہی ٹھٹک گیا تھا۔ مین ڈور کے سامنے رینا بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔

"تم یہاں ہو؟" اس کے محاورتاً نہیں، حقیقتاً ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ گھبراہٹ کے عالم میں وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ اپارٹمنٹ اسے گورنمنٹ کی جانب سے ملا تھا۔ آس پاس اسی کے گریڈ کے دوسرے افسران رہائش پذیر تھے اور وہ ان اکا دکا میں سے تھا جو فیملی کے بغیر رہ رہے تھے۔

"ہاں، میں۔۔۔ کیسے ہیں آپ جعفر؟ کب آئے شکار سے؟"

بے تابی اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ ہر انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ابھی۔۔۔ ابھی کل ہی واپس آیا ہوں۔" جعفر نے اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

"بس تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔"

"آپ کے منہ سے جھوٹ اچھا نہیں لگتا جعفر۔" رینا عجیب انداز میں مسکرائی۔

"آپ کا ملازم کہہ رہا ہے کہ آپ کو شکار سے واپس آئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔"

"ہاں مگر پھر اگلے ہی روز مجھے اسلام آباد واپس جانا پڑا۔ گھر میں کچھ مسئلہ تھا، وہاں سے کل ہی لوٹا ہوں۔ اس جاہل بندے کو کیا پتہ؟"

جعفر نے رینا کے عقب سے نمودار ہوتے اپنے ملازم کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ وہ بھی مالک کا نبض شناس تھا، فوراً اس وضاحت میں اضافہ کیا۔

"وہ جی۔۔۔ بی بی ہوراں نے پوچھیا ای شکار سے واپس آنے کا تھا، میں کی کردا؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اندر چلو تم۔" جعفر نے اسے چلتا کیا۔

"میں تو پریشان ہی ہو کے رہ گئی تھی جعفر! آپ کے گھر کا نمبر بھی خراب تھا‘ آفس کا نمبر آپ نے دیا ہی نہیں کبھی۔ کم از کم آپ اسلام آباد جانے سے پہلے اطلاع ہی کردیتے۔ اینی وے... خیریت تو تھی وہاں؟"

"میں نے کہا نا کوئی گھریلو پرابلم تھا۔" جعفر نے پل بھر میں اسے ایک حد یاد دلائی‘ وہ کچھ خفیف سی ہوگئی۔

"آؤ‘ میں تمہیں ڈراپ کر آؤں؟"

"جی؟" وہ حیران رہ گئی۔ وہ ہمیشہ اسے اپنے گھر لانے یا بلانے سے پرہیز کیا کرتا تھا‘ یہ حقیقت اس پہ اچھی طرح روشن تھی لیکن یہ توقع نہ تھی کہ اگر وہ آ ہی جائے گی... تو وہ دروازے سے لوٹا دے گا۔

"کم آن..." جعفر نے اس کے تاثرات کی پروا کیے بغیر ہاتھ سے اشارہ کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھا۔

یہ وہی جعفر محمود تھا جو آگے بڑھ کے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا کرتا تھا۔ اس کے بیٹھنے کے دوران اس کا آنچل تھام کر اس کی گود میں رکھنے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ کا رخ کرتا تھا‘ جو ہمیشہ ریسٹورنٹ میں اس کی سیٹ خود درست کرکے بٹھاتا تھا اور جس نے اسے پہلی بار عزت‘ احترام اور شائستگی جیسے رویوں سے روشناس کرایا تھا‘ یہ وہی جعفر محمود تھا جو آج اجنبی انداز میں اکھڑا اکھڑا نظر آرہا تھا۔

رینا کا دل بجھ گیا۔

"میں خود چلی جاؤں گی۔" یہ گویا ناراضی کا اظہار تھا۔

"اوکے۔ ایز یو وش۔" جعفر نے جیسے اللہ کا شکر ادا کیا تھا اور جھٹ گاڑی سے نکل آیا۔ اس نے مروتاً بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا۔

رینا کو اس قدر سبکی کا احساس اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سب سے پہلے احترام کے معنی سکھانے والا بھی وہی اور ذلت کے اس شرمناک احساس کو دلانے والا بھی وہی۔

"تم کہو تو میں اپنے ملازم سے کہہ کر ٹیکسی منگوا دوں؟" جعفر سے شاید اس سے زیادہ رکھائی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا‘ اس لیے یہ پیشکش کی۔

"شکریہ..." رینا نے بھیگی آواز میں کہا اور اس کے قریب سے گزر کے جانے لگی۔ نجانے اس کے چہرے پہ کیسی شکستگی تھی کہ جعفر سے رہا نہ گیا اور ہزار خود کو سمجھانے کے باوجود پاس سے گزرتی رینا کا بازو تھامنے سے خود کو روک نہ سکا۔

"سوری... دراصل میں کچھ پریشان ہوں‘ تھکا ہوا بھی ہوں‘ ورنہ..."

"اٹس اوکے۔" وہ اتنے سے التفات پہ بھی موم ہوگئی۔

"لیکن آپ چاہیں تو اپنی پریشانی مجھ سے شیئر کرسکتے ہیں۔ دل ہلکا ہوجائے گا۔"

"کیوں نہیں لیکن اس وقت میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں رینا! تم تو میری مزاج آشنا ہو۔ آئی ہوپ کہ تم مائنڈ نہیں کروگی۔"

اس نے ایک بار پھر ترپ کا پتہ استعمال کیا۔ یعنی رینا سے مزاج آشنائی اور دوستی کا دعوا... وہ مغرور سی ہوگئی۔

"ٹھیک ہے‘ میں چلتی ہوں۔ آپ آرام کیجیے۔ میں کل فون کروں گی۔ بہت اداس ہو رہی ہوں۔ کل ملیں گے نا۔" "ہاں کل نہیں تو پرسوں۔" جعفر نے ٹال مٹول سے کام لیا۔

"میں بالکل ہلکا پھلکا ہو کے‘ ہر فکر‘ ہر پریشانی سے آزاد ہو کر تم سے ملنا پسند کروں گا۔ میں خود تمہیں فون کرکے بلواؤں گا۔"

اس نے آس دلائی اور رینا نے آس کا یہ سہارا مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے باوجود وہاں سے نکلتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

جعفر نے بعد میں اپنی بے مروتی اور رکھائی پہ پردہ ڈال دیا تھا‘ وہ بہل بھی گئی تھی لیکن اب کوئی چیز دل کو کھٹک رہی تھی۔

کچھ دن پہلے جب وہ ملا تھا... شہرت جانے سے قبل... تب کوئی اور ہی تھا...

جعفر محمود... یہ اور تھا۔ اس کے انداز بھی بدلے ہوئے تھے اور تیور بھی۔

اور یہ کیا سوچ کے گھر سے نکلی تھی۔ آج شمع سے ہونے والی گفتگو نے اسے ایک فیصلہ کن نتیجے تک پہنچنے میں مدد دی تھی۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ ہرحال میں جعفر سے اپنے اور اس کے تعلقات کی بابت کوئی حتمی فیصلہ کرکے رہے گی۔ اس کے سامنے نہ صرف اپنی محبت تسلیم کرے گی بلکہ یہ اعتراف اس سے بھی کروالے گی اور ہوا کیا...؟

"کیا جعفر بدل گیا ہے یا اس کا دل... یا پھر میرے دن بدل گئے ہیں؟ نہیں نہیں‘ ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ شخص کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ کسی کا دل نہیں دکھا سکتا۔ پریشانیاں کس پہ نہیں آتیں۔ ذہنی طور پہ ڈسٹرب ہوگا اور بس... دیکھنا‘ کل خود فون کرے گا۔ اپنے رویے پہ معذرت پیش کرے گا اور پھر شام کو ملنے بھی آئے گا۔ میں بھی خوب نخرے دکھاؤں گی‘ جب قدر ہوگی میری اور میرا خیال ہے وہی درست موقع ہوگا یہ بات چھیڑنے کا۔ میں اس کے دل میں چھپی اپنی چاہت ابھار کے رہوں گی۔"

وہ اپنے خیالوں میں مگن‘ دل کو خوش فہمیوں سے بہلاتی چلتی جارہی تھی۔ کئی خالی ٹیکسیاں اور رکشے اس کے نزدیک سے گزر کے چلے گئے مگر اس کا دھیان ان تک نہ گیا۔

وہ پیدل چلتی رہی۔

پھر ایک وائٹ بالینو کے ہارن پہ وہ بری طرح چونکی۔ ہڑبڑا کے ادھر ادھر دیکھا۔ راؤنڈ اباؤٹ کے بالکل سامنے کھڑی تھی وہ... ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی طرحدار حسینہ نے جھنجلا کر ——— سر ہلایا اور ٹرن لے کر آگے بڑھ گئی۔ رینا اپنی غائب دماغی کی کیفیت سے کچھ کچھ باہر نکلی اور ہاتھ دے کر نزدیک سے گزرتی ٹیکسی کو روکا۔

پیلی ٹیکسی اسے بٹھائے اس جگہ سے دور لے جارہی تھی اور جن راستوں سے پیدل گزر کے وہ یہاں تک آئی تھی‘ انہی جانے پہچانے راستوں پہ اب وہ وائٹ بالینو دوڑ رہی تھی۔

پھر وہ جعفر محمود کے اپارٹمنٹ کے سامنے رک گئی۔

"ہائے سویٹ ہارٹ‘ میں کب سے تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کے والہانہ اظہار کیا اور اس کی جانب کا دروازہ کھولا۔

وہ ایک ابھرتی ہوئی ماڈل تھی۔

کمرشلز میں نظر آنے والی نہیں بلکہ ریمپ پہ کیٹ واک کرنے والی اور مہنگے فیشن میگزینز کے لیے فوٹوشوٹ کروانے والی ماڈل۔

"ہائے جیفی...!" اس نے نزاکت سے اپنا مہکتا ریشمیں گال جعفر محمود کے چہرے کے ساتھ مس کیا۔ وہ مسحور ہوگیا۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تم میرا انتظار اتنا بے چینی سے کررہے ہوگے۔"

اس نے جعفر کو گیٹ کے پاس کھڑے دیکھ کر کہا جبکہ وہ رینا کو رخصت کرنے کے بعد تک یہاں اس لیے کھڑا رہا کہ کہیں وہ واپس نہ آجائے۔

اس کے کانونٹ لب و لہجے پہ جعفر بالکل ہی ریشہ خطمی ہوگیا۔ رینا سے پہلے بھی ایک آدھ لڑکی سے اس کی شناسائی رہ چکی تھی لیکن رینا جیسی پیشہ ور "دوست" نے اس کی جھجک دور کردی تھی۔ بہتر سے بہترین کی طمع پیدا ہوگئی تھی اس کے اندر‘ اس لیے سومیہ جیسی الٹرا ماڈ اور ہائی سوسائٹی کی جان کہلائی جانے والی ماڈل سے راہ و رسم بڑھانے میں اسے خاص وقت نہ لگا اور اس کے ساتھ گزارے چند دن ہی اسے رینا کے ساتھ گزارے دو مہینے بھلا گئے۔ اب رینا سے دوستی اسے اپنی حماقت لگا کرتی۔

"پتا نہیں کیا سوچ کر میں نے اس عام سی شکل وصورت والی بازاری لڑکی کو سر پر چڑھا لیا تھا جسے چار لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ بھی نہ تھا اور جس کی نظر ہر دم میری جیب پہ ہوتی تھی۔"

اب اسے رینا کی وہ باتیں بھی جاہلانہ اور سوقیانہ لگنے لگیں جن کو سننا اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ ناز و انداز سے اچکا کر اشعار پڑھنا۔۔۔ وہ مدھم گنگناہٹیں۔۔۔ وہ فدا ہو جانے والی مسکراہٹیں۔۔۔ سب کسی طوائف کے نخرے لگنے لگے۔

اب سومیہ کی فراٹے بھرتی انگریزی، مغربی طور طریقے، بے باک ادائیں اور بے حجابانہ لباس بھانے لگا تھا اور پھر ایک بات اور بھی تھی۔ رینا ساتھ ہوتی تو وہ خود سے بھی شرمندہ رہتا۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے شاپنگ مالز میں گھومتے ہوئے یا کسی مہنگے ریستوران میں بیٹھے ہوئے بھی وہ چور نظروں سے اِدھر اُدھر تکتا رہتا کہ کہیں کوئی شناسا نہ نکل آئے۔ کوئی ایسا شناسا جو نہ صرف اسے جانتا ہو بلکہ رینا کی حقیقت سے بھی واقف ہو اور سومیہ کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومتے ہوئے اسے یہ خدشہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا کوئی جاننے والا مل جاتا تب بھی وہ فخریہ سومیہ کا تعارف کراتا اور سومیہ کو تو سب ہی جانتے تھے، اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ لوگوں کی رشک آمیز نظریں اور حاسدانہ تبصرے پا کر خوامخواہ مغرور ہو جاتا تھا۔

"مجھے پرسوں سنگاپور جانا ہے ایک فوٹو شوٹ کے لیے۔۔۔ تم چلو گے جیفی؟"

جعفر کے سومیہ پہ لٹو ہو جانے کی تو ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ دیہاتی پس منظر رکھنے والا یہ اعلا سرکاری عہدیدار خوبصورت ماڈرن اور بے باک حسیناؤں سے دوستی رکھ کے اصل میں اپنے اس احساسِ کمتری کو دبانے کی کوشش کرتا تھا جو اس اچانک مل جانے والی حیثیت سے اس میں عود کر آیا تھا۔ وہ کسی گئے گزرے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ زمین دار لوگ تھے اور قدرے غیر تعلیم یافتہ۔۔۔ فطری طور پر وہ صنفِ نازک کی انہی خصوصیات سے متاثر ہوتا تھا جو اس کے ہاں کی خواتین میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ لیکن سومیہ کا اس پہ حد سے بڑھتا التفات خود جعفر کی سمجھ سے بھی بالاتر تھا۔ وہ یہ بات سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ سومیہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو کسی نہ کسی عاشق کو دم چھلا بنا کے رکھنے میں فخر اور تسکین محسوس کرتی ہیں۔ عرصے بعد اسے جعفر کی شکل میں ایک باادب، باحضور ٹائپ کا پرستار ملا تھا، اسی لیے وہ اس سے چند دن کی دوری بھی برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"میں۔۔۔ میں وہاں کیا کروں گا؟"

"وہی۔۔۔ جو یہاں کرتے ہو۔" اس نے جعفر کے کالر سے کھیلتے ہوئے شریر نظروں سے اسے دیکھا۔

"مگر آفس۔۔۔"

"میں ضروری ہوں یا آفس؟" سومیہ نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی تھی۔ وہ ہنس کر چپ ہو گیا۔ وہ ایسی چیز نہیں تھی جسے صاف جواب دے کر ناراض کرنے کا رسک لیا جا سکتا۔

"پھر تم چل رہے ہو نا میرے ساتھ؟"

"پرسوں جانا ہے تمہیں؟ اتنی جلدی میں کیسے۔۔۔"

"ٹھیک ہے، میں پرسوں کی فلائٹ سے جا رہی ہوں اور تم سٹرڈے کو میرے پاس ہو گے۔ او کے۔"

وہ انکار نہ کر سکا۔

وعدے کے مطابق اس نے ان پانچ دِنوں میں ویزے اور ٹکٹ کے مسائل نمٹائے اور کچے دھاگے سے بندھا اس کے پیچھے پیچھے سنگاپور پہنچ گیا۔

آزاد فضاؤں میں ان کی آزاد دوستی اور بھی پروان چڑھنے لگی اور ایسے میں ان رنگین شب و روز کے دوران اسے ایک پل کے لیے بھی رینا کا خیال نہ آیا، جسے وہ اگلی ملاقات کا لارا دے کر آیا تھا اور جو ہر روز اس کا ٹیلی فون نمبر ملاتی اور ہر بار اسے نہ پا کے نئے وسوسوں کا شکار ہوتی، جعفر نے تو شاید ایک بار بھی نہ سوچا ہو گا کہ واپس جا کر اگر رینا سے اس کا سامنا ہوا تو وہ اس سے اپنی غیر حاضری کا کیا بہانا کرے گا مگر قدرت نے اس کی یہ مشکل آسان کر دی۔ اب اسے رینا سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

نہ جھوٹ۔۔۔ نہ سچ۔

اس کے پاکستان لوٹنے سے پہلے ہی اس کی اور سومیہ کی خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ فلمی صحافت کے نمایاں روزناموں، ہفت روزوں اور ماہناموں میں ان کے تعلقات کی سنسنی خیز خبریں بمعہ تصویروں کے جگمگا رہی تھیں۔

جن دنوں وہ سنگاپور میں اس کے ساتھ گلچھرے اڑا رہا تھا، ایک فلمی صحافی بھی اپنے ذاتی نوعیت کے کام کے سلسلے میں وہاں موجود تھا۔ اس نے ذاتی نوعیت کے کام کو تو پس پشت ڈالا اور پہلے اپنے پیشہ ورانہ تقاضے پورے کرتے ہوئے ان کے بارے میں چٹپٹی خبریں اور رنگین و سنگین تصویریں پاکستان پہنچائیں۔ وہ بہت بڑا افسر سہی مگر عوام کے لیے اجنبی فرد تھا جبکہ سومیہ شوبز کی شخصیت تھی، جانی پہچانی۔ نوجوان نسل میں سے اکثریت کے خوابوں کی ملکہ۔۔۔ اس کے ساتھ دوستی نے یہ رنگ دکھایا کہ اب وہ بھی اس کے حوالے سے مشہور ہو چکا تھا۔

یہ خبر رینا نے بھی پڑھی۔

ایک بار نہیں، بار بار پڑھی۔

اس کے باوجود اسے یقین نہیں آتا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جعفر تو مجھ سے۔۔۔ اور اگر وہ مجھ سے محبت نہیں بھی کرتے تب بھی وہ اس سومیہ نام کی چھپکلی کو کیسے چاہ سکتے ہیں؟ وہ کتنے نفیس طبع اور ستھری شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایسی اوچھی حرکتیں نہیں کر سکتے۔ یہ تصویریں ان کی ہو ہی نہیں سکتیں۔"

وہ آنکھوں دیکھی بات کو جھٹلا رہی تھی۔

ان تصاویر کو غلط قرار دے رہی تھی جس میں جعفر محمود کہیں جام ہاتھ میں لیے سومیہ کے لبوں سے لگا رہا تھا تو کہیں ڈانس فلور پہ اسے بانہوں میں لیے جھوم رہا تھا۔ یہ واقعی سچ تھا مگر وہ یقین نہ کر پا رہی تھی کیونکہ اس کے سامنے جعفر نے اب تک اپنا وقار نہیں کھویا تھا۔ خود وہ اپنے بارے میں حد درجہ محتاط رہتی تھی کہ کہیں اس کی معمولی سی لغزش جعفر جیسے خاندانی اور معزز انسان کو اس سے متنفر نہ کر دے، اس لیے بہت سنبھل سنبھل کے رہا کرتی۔ یوں جعفر بھی سنبھلا ہی رہا۔

لیکن سومیہ کو اسی احساسِ کمتری کا سامنا نہ تھا جن سے رینا دوچار تھی۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ۔۔۔ اس کا دادا۔۔۔ اس کا نانا۔۔۔ اس کے دادا کا دادا اور نانا کا نانا سب سرمایہ دار تھے۔ اس ملک کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جو تھا تو صرف دو فیصد مگر باقی کے اٹھانوے فیصد پہ حاوی تھا۔ یہ اپنی برائیاں بھی فخر سے پیش کرنے والے لوگ تھے۔ سومیہ میں کچھ تو اپنے طبقے کی خصوصیات تھیں، کچھ شوبز نے اسے اور نڈر اور بے باک کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ نے جعفر کو بھی احتیاط اور روایت پسندی کا دامن چھوڑ دینے پہ مجبور کر دیا تھا۔

رینا، جعفر کی سنگت میں خود کو سنوارنا، نکھارنا چاہتی تھی مگر اس کا یہ عمل کتنا سست رہا۔

اور جعفر، سومیہ کی سنگت میں کتنی جلدی بگاڑ کے عمل سے کامیاب ہو گزرا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ بڑبڑائی اور اخبار کے دو ٹکڑے کر کے پرے پھینک ڈالے۔

آج تیسرا دن تھا، اخبارات کو چٹخارے دار بنانے کے لیے ان کا اسکینڈل چھپ رہا تھا۔ ہر روز نئی سے نئی خبر سامنے آ رہی تھی، اس کے باوجود وہ جعفر کی منتظر تھی۔ اس سے اصل بات جانے بغیر وہ اس خبر پہ یقین کر کے بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔

"آ جائیے جعفر صاحب! خدا کا واسطہ ہے جلدی واپس آ جائیے اور آ کے ان سب افواہوں کی تردید کر دیں۔"

وہ روز تصورات کی دنیا بسا کے اس سے منت کرتی۔

اور پھر جعفر محمود آگیا۔

الیا ہی۔۔۔

اس کے دوستوں اور خیر خواہوں نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے اور سومیہ کے تعلقات کس طریقے سے دنیا کے سامنے افشا کیے جا رہے ہیں۔ سومیہ کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ سال میں دو یا تین ایسے اسکینڈل بننا اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔ ابھی تو محض دوسرا سال تھا اس کا اس شعبے میں۔ جعفر کے ساتھ مشہور ہونے والا افیئر محض چوتھا۔۔۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا کا نام دیتی تھی وہ اس جعفر کی تشویش کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ سنگاپور سے ہی دبئی کے لیے فلائی کر گئی' جہاں اسے انٹرنیشنل برانڈ کی جیولری کے لیے ماڈلنگ کرنا تھی۔

اصل مصیبت تو جعفر پہ آن پڑی تھی۔ وہ اپنے اس شوق کو بے ضرر مانتا تھا۔ اسے قطعی امید نہ تھی کہ اس وجہ سے اسے یہ دن دیکھنا پڑے گا۔ اسے اپنے خاندان والوں کے سخت ردعمل کا بھی ڈر تھا اور اپنی بیوی کے بھی۔

اس کی بیوی مدیحہ۔۔۔ جو اس کی عم زاد بھی تھی اور جو اس کی تین بیٹیوں کی ماں بھی تھی۔

مدیحہ' ایک اٹھائیس سالہ تعلیم یافتہ' سلجھی ہوئی' باوقار' نرم مزاج' خوش گفتار' سلیقہ شعار اور قبول صورت خاتون۔

جو اپنی جملہ خصوصیات کے باوجود شادی کے دس سالوں کے بعد بھی جعفر محمود کے معیار کی کسوٹی پہ پوری نہ سکی۔

کیونکہ وہ قبول صورت بلکہ کسی حد تک خوش شکل ضرور تھی مگر خود نمائی نہیں تھی اس میں' دلربائی نہیں تھی۔ بی اے پاس ضرور تھی مگر سرگودھا گرلز ڈگری کالج سے اسلامیات اور اردو جیسے مضامین کے ساتھ۔ اس کا لہجہ ہی اپنے دیہاتی پس منظر اور گھریلو ماحول کی وجہ سے صاف نہیں تھا تو انگریزی کیا بول پاتی۔

باقی رہا اس کا سلیقہ۔۔۔ اس کی بردباری۔۔۔ اس کی نرم مزاجی اور اطاعت پسندی تو ان سب سے اس کے شوہر کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اسے جو چاہیے تھا' وہ مدیحہ دینے سے قاصر تھی۔ اس کے باوجود اس نے کبھی یہ احساس مائیگی مدیحہ کو ہونے نہیں دیا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ مدیحہ اس کی بیوی ہی نہیں' اس کی بڑی بہن کی نند بھی تھی۔

وٹے سٹے کا مسئلہ۔۔۔ وہی پرانا مسئلہ۔۔۔

گھریلو ماحول سازگار رکھنے کے لیے وہ اپنی ناپسندیدگی اس پہ ظاہر نہیں کرتا تھا۔ ویسے بھی یہ ناپسندیدگی شاید بھی نہیں۔ مدیحہ ایک بیوی اور ایک بہو ہونے کے ناتے ناپسندیدہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ دراصل نا آسودگی جو جعفر کو مدیحہ کی ذات سے ملتی تھی مگر اس کا ازالہ وہ کبھی شائنہ' کبھی رینا تو کبھی سونی سے دوستی رکھ کے کر رہا تھا۔ مدیحہ کو اسی لیے اس نے ہمیشہ اسلام آباد میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رکھا اور خود جہاں پوسٹنگ ہوتی۔ وہاں بہلانے کے سامان ڈھونڈ لیتا۔ لاہور میں یہ رنگین مزاجی زیادہ رنگ لائی۔ رینا وہ لڑکی تھی جس سے اس کی دوستی ماہ تک چلی اور پھر سومیہ جس کے ساتھ وہ اس حد تک آگے چلا گیا کہ تین دن اور چار راتیں اس کے ساتھ ہوٹل کے ایک کمرے میں گزاریں۔

اور اب اسے ان تین دنوں اور چار راتوں کا حساب دینا تھا۔

وہ کوئی سیلبرٹی تو تھا نہیں' جو وطن واپسی پہ پریس کانفرنس کر کے ان افواہوں کی تردید کرتا۔ الٹا وہ تو صحافیوں سے بچتا بچاتا اپنے گھر پہنچا تھا۔

اسے یہ حساب اپنے گھر والوں کو دینا تھا۔

وہ اپنے ماں باپ اور بیوی کے سامنے جوابدہ تھا۔

لیکن ان سے پہلے سوال کرنے آگئی رینا۔

٭ ٭ ٭

بہت عرصے بعد یہ دن آیا تھا کہ کھانے کی ٹیبل پہ سب اکٹھے تھے' ورنہ سب کے کھانے کے مختلف اوقات تھے۔ ناشتے کے بھی اور رات کے کھانے کے بھی اور دوپہر کو تو ویسے بھی اصغر اور مظہر دونوں ہی گھر پہ نہ ہوتے تھے۔ شمیم اور نصرت کا ناشتہ ہی بارہ بجے تک چلا کرتا تھا۔ منزہ کھانا تیار کرتے ہی سب سے پہلے سسر کو دیتی پھر اپنا اور اپنی بیٹی کا ٹرے میں لے کر اپنے کمرے میں آجاتی۔

اگرچہ رات کو سب کا کھانے کے وقت ایک تھا لیکن اکثر و بیشتر حالات سازگار نہ ہوتے تھے۔ کبھی مظہر کی ماں سے تلخ کلامی ہوئی ہوتی اور وہ منزہ کو کھانا کمرے میں لانے کا کہہ دیتا۔ کبھی شمیم' بھابھی سے یا کسی بھائی سے جڑی بیٹھی ہوتی اور احتجاجاً کھانے سے واک آؤٹ کر جاتی۔ نصرت' چہیتی بیٹی کا ساتھ دینے پیچھے پیچھے چلی جاتی۔ کبھی دونوں بھائیوں میں ٹھن جاتی اور اگر ان میں سے بھی کچھ نہ ہوا ہوتا تو مظہر کے والد جو عموماً اپنے کمرے تک محدود رہتے تھے' اچانک اصغر کی گوشمالی کرنے لگتے۔ بیٹھے بٹھائے انہیں سارے کاروبار کا حساب یاد آجاتا۔

اصغر پچھلے کئی سال سے ان کے کاروبار کے سیاہ و سفید کا مالک تھا اور بلاشبہ اس نے لاکھوں کے کروڑوں بنا ڈالے تھے لیکن وہ باپ کو حساب دینے کا روادار نہ ہوتا۔ یوں گھر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی محاذ کھلا ہی رہتا۔

آج سارا فساد نجانے کہاں سو گیا تھا جو شام سے گھر کے تمام افراد کے اکٹھے ہونے کے باوجود اب تک امن تھا اور تو اور شمیم جسے اپنے ہی گھر کے لوگوں میں سے کسی دو کا آپس میں ہنسنا بولنا تک ناگوار لگا کرتا تھا' وہ بھی چپ تھی۔ اگرچہ گاہے بہ گاہے اس کی بیزار سی نظریں مظہر کو یہ احساس ضرور دلا جاتیں کہ اس کی اور منزہ کی خوش گپیاں اور چہلیں اس کے دل کو کتنی تکلیف اور جلن دے رہی ہیں مگر وہ مظہر ہی کیا جو اس کے مقابلے پہ نہ آئے۔ منزہ کے بار بار تیکھی نظروں سے گھورنے کے باوجود وہ متواتر التفات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

کبھی اسے سیب کی قاش کاٹ کر دیتا۔

کبھی کل کی شاپنگ یا آؤٹنگ پلان کرنے لگتا۔

کبھی اس کے نئے سوٹ کی تعریف تو کبھی ہیئر اسٹائل کی۔

بالآخر منزہ نے کچن میں پناہ لینے کو ہی آخری حل جانا۔ رات کا کھانا وہ معمول کے مطابق بنا چکی تھی مگر آج خلاف معمول سب اہل خانہ کو اکٹھے پا کر اس نے مزید کچھ اہتمام کرنا چاہا۔ طاہری دم پہ تھی' دوپہر کا دال گوشت بھی رکھا تھا۔ اس نے فریزر سے کباب نکال کر ڈی فروسٹ کرنے کے لیے رکھے اور تلنے کے لیے انڈہ پھینٹنے لگی۔ دوسرے چولہے پہ اس نے کسٹرڈ کے لیے دودھ بھی چڑھا دیا تھا۔

پندرہ منٹ بعد جب وہ کھانا ٹیبل پہ لگا رہی تھی تو کسٹرڈ کا باؤل جیلی اور اسٹرابیری سے سجا کے فریج میں رکھ چکی تھی۔ سب کھانے کے دوران باتیں کرنے کے عادی تھے' اس لیے آدھ پون گھنٹہ تو لگنا ہی تھا۔ تب تک سویٹ ڈش بھی ٹھنڈی ہو جاتی۔

سب کو اطمینان سے ایک ہی ٹیبل کے گرد بیٹھے دیکھ کر منزہ کے دل کو یک گونہ مسرت ہو رہی تھی۔ اسے اپنے میکے کی یاد آرہی تھی۔ اس کی امی کی زندگی میں وہاں کا ماحول بھی ایسا ہی محبتوں بھرا ہوا کرتا تھا۔ یہاں تو شاید وہ سالوں میں اتفاقاً یہ منظر دیکھ پاتی تھی جبکہ وہاں کا یہ معمول تھا۔ اس کی امی بہت معاملہ فہم اور سمجھ دار خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے تدبر سے ساری بہوؤں کو سنبھال رکھا تھا۔ کبھی کسی قسم کی اونچ نیچ یا تنازعہ نہ کھڑا ہوتا تھا۔ ان کے بعد یگانگت اور اتفاق کی وہ فضا تو نہ رہی مگر چونکہ بھائی اسی ماں کی تربیت کا نمونہ تھے اور بھابھیاں بھی تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی تھیں' اس لیے کسی تلخی کی صورت میں بھی وہ صورت حال ہرگز نہ پیدا ہوتی جو یہاں معمولی باتوں پہ بھی ہو جاتی تھی۔

آج اسے یہ گھر اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔

بالکل اپنے میکے کے گھر کی طرح......

"امی! آپ رات کے وقت چاول نہیں کھاتیں' کہیں تو روٹی پکا لاؤں آپ کے لیے؟"

"جب پتا ہے کہ رات کو چاول مجھے تکلیف دیتے ہیں تو پھر پکانے کی ضرورت کیا تھی۔"

اسی قسم کے جواب سے بچنے کے لیے وہ عموماً ساس کو مخاطب کرنے سے پرہیز کیا کرتی تھی' آج ان کو... دیکھ کر پوچھ بیٹھی اور جلا ہوا جواب سن لیا۔

"پکانے والی کی اپنی پسند سب سے اوپر ہوتی ہے امی! بھابھی کو چاول کتنے پسند ہیں' آپ کو نہیں پتا۔"

شمیم کو کافی دیر سے اس موقع کی تلاش تھی مگر اس کا یہ وار اس کے باپ نے ضائع کر دیا۔

"تمہاری ماں کو چھوڑ کر چاول اس گھر میں سب کو پسند ہیں بلکہ میں غلط کہہ گیا۔ پسند تو اسے بھی بہت ہیں... سانس کی تکلیف کی وجہ سے پرہیز کرنا پڑتا ہے لیکن ہم سب کو تو دمہ نہیں ہے۔ ہم کیوں بریانی' پلاؤ وغیرہ سے محروم رہیں۔"

وہ چاولوں سے بھری پلیٹ پہ رائتہ انڈیلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ نصرت نے خشمگیں نگاہوں سے اپنے شوہر کو گھورا۔

"دمہ ہو میرے دشمنوں کو' مجھے تو الرجی ہے الرجی۔" وہ اپنی سانس کی تکلیف کو زیادہ ظاہر نہیں کرتی تھیں صرف اور صرف پرہیز سے بچنے کے لیے' ورنہ معمولی سر درد کو بھی بڑھا چڑھا کے بتانا ان پہ ختم تھا۔

"کھاؤ' ٹھونسو تم لوگ چاول مگر میرے لیے بھی تو کچھ پکنا چاہیے تھا۔ یہ ڈیڑھ دو کلو مرغی اس طاہری نے لی۔ چار بوٹیاں مسالہ بھونتے ہوئے میرے لیے نکال لیتی۔ روٹی کیا میں رائتے میں ڈبو کے کھاؤں گی۔"

"وہ دوپہر کا سالن ہے..." منزہ نے کہنا چاہا۔

"ہاں وہ جس میں گنتی کی تین مریل چانپیں پڑی ہیں۔ ویسے بھی دوپہر کا سالن مجھ سے نہیں کھایا جاتا۔"

وہ روٹھنے کا پروگرام بنا رہی تھیں اور منزہ کا دل بجھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی جیسے پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں سے کے ایک جگہ پہ اکٹھے ہونے کے باوجود کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔ کھانے کے دوران بھی نہیں ہوگی۔

"اوہو ماں میری... ناراض کیوں ہوتی ہو۔"

اصغر نے کھانے سے سر اٹھا کے کہا۔

"کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ مجھے بتاؤ' ابھی منگواتا ہوں۔"

"رہن دے' رہن دے۔ سامرلوں کی کباب پہ روٹی رگڑ کے۔ گلے میں پھنس رہا ہے سوکھا۔"

"اوہو کہہ تو رہا ہوں جو چاہیے بتادو' ابھی منگواتا ہوں۔ بازار کون سا دور ہے۔ مجید اسائیکل دوڑاتا جائے گا دس منٹ میں واپس آئے گا۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ذالٹ نکالا۔ مظہر نے چمچہ منہ میں ڈالتے ہوئے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایک چکن پیس منگوا دے... ناغے کا دن ہے' ورنہ سیخ کباب بھی منگواتی۔"

"میرے لیے بھی ایک پیس۔" شمیم نے فوراً فرمائش کی۔ حالانکہ وہ ایک پلیٹ چاول ختم کر کے دوسری بھرے بیٹھی تھی۔

"اباجی! آپ کھاؤ گے کچھ؟"

"میرے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں' وہ منگوا دو اور پیسٹری وغیرہ۔" وہ میٹھے کے شوقین تھے اور بلا کے سگریٹ نوش بھی۔ "بھابھی آپ؟"

اگرچہ اس کے اس سوال پہ شمیم اور نصرت دونوں نے کڑے تیور سے اسے گھورا تھا کہ منزہ کو اس پیشکش کرنے کی ضرورت کیا تھی لیکن وہ ڈھیٹ بنا بھابھی کے پر تکلف انکار کے بعد بھی اصرار کر رہا تھا۔

"چلیں' آئس کریم ہی کھالیں۔"

"نہیں' میرا گلا خراب ہے۔" وہ ساس اور نند کے ڈر سے جھجک رہی تھی۔

"چل چھڈ دی اصغر! رہن دے۔ نخرے ہی نہیں ختم ہوتے ادھر تو۔" نصرت نے ناک بھوں چڑھائی۔

"چاچو! میں کھاؤں گی آئس کریم۔" سوہا نے اپنے ٹوٹے پھوٹے توتلے لہجے میں فرمائش کی۔

"او کیوں نہیں میری شہزادی' میری رانی۔" وہ سوہا سے واقعی بے حد لاڈ کرتا تھا۔ کوئی دکھاوے کی بات نہیں تھی' اس لیے اسے سوہا کو گود میں لے کر بھینچتے ہوئے دیکھ کر مظہر نے کچھ نہ کہا لیکن جب مجید کو پیسے پکڑانے کے بعد فرداً فرداً سب کی فرمائش نوٹ کرواتے ہوئے اس نے مظہر سے بھی پوچھا تو وہ رہ نہ سکا۔

"تم کھاؤ گے کچھ؟" اس دن کی تلخ کلامی کے بعد اصغر نے بڑے بھائی کو مخاطب نہ کیا تھا' اس لیے قدرے جھجک کے پوچھا۔

"میرا جواب تم سن چکے ہو۔ میری طرف سے انکار ہے۔" اس نے خاصا چبا چبا کے کہا۔

"لے' ابھی تو پوچھا ہے اس نے' تو نے پہلے انکار کب کیا ہے؟"

نصرت نے ٹوکا تو اس نے ماں کی جانب رخ کیا۔

"میں کسی اور انکار کی بات کر رہا ہوں۔"

اب کے اصغر بھی ٹھٹکا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مظہر سے یہ ذکر نہ چھیڑنے کی التجا کی۔ منزہ بھی شوہر کا موڈ بھانپ کر اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔

"اور اسی لیے کہہ رہا ہوں' مجھ پہ اب یہ فیاضی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ چاپلوسیاں ان کے ساتھ کرو جن کی تمہیں حمایتیں درکار ہیں۔ حالانکہ یہ کوششیں فضول ہی ہیں۔ کھاپی کے ڈکار سب مار لیں گے' تمہاری ضد کسی نے نہیں ماننی۔"

منزہ نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کے گویا خاموش رہنے کی درخواست کی تھی۔

شمیم کی تیز نظروں نے یہ حرکت بھانپ لی۔ پہلے اس نے ماں کو ٹھوکا دیا پھر کان میں کھسر پسر کرنے لگی۔

مظہر کہنی پھیلا کے اب آرام سے کھانا کھا رہا تھا۔ سب سے پہلے اس کے ابو نے سوال اٹھایا۔

"کس قسم کی ضد؟ کوئی پھڈا تو نہیں ہو گیا؟ کوئی دکانوں کا مسئلہ...... کوئی کاروبار کا پھڈا؟"

انہیں فوری طور پر اپنے اس کاروبار کی فکر لاحق ہوئی جس سے وہ عملی طور سے کئی سال پہلے دستبردار ہو چکے تھے۔ "یہ تیری زنانی کیا اشارے کر رہی ہے؟"

نصرت نے گھور کے گویا منزہ کی جان نکالی۔ وہ چپ چاپ چاولوں کی خالی ڈش اٹھا کے کچن میں چلی گئی جو ایسے حالات میں اس کی واحد پناہ گاہ تھی۔

بیٹھے بٹھائے سارا ماحول خراب ہو گیا تھا اور اس بار ذمہ دار یقیناً اس کا شوہر تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور بجھے دل کے ساتھ باہر سے آتی آوازیں سننے لگی۔

"اس نے کیا کرنا ہے' کرنے والی تو اب آئے گی۔" مظہر' اصغر کی بے چینی کا مزہ بھی لے رہا تھا اور گھر والوں کے تجسس کا بھی۔

"کون... آنے والی ہے؟"

نصرت نے بلا تکلف موٹی سی گالی دیتے ہوئے للکارا۔

"آپ کی چھوٹی بہو... جناب اصغر بھٹی کی بیگم!" اس نے شوشہ چھوڑا۔

"ہائے ہائے' میں مرجاواں۔"

نصرت نے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔ شمیم بھی پوری بات جانے بغیر واویلا مچانے لگی۔

ان سب سے بے نیاز ان کے والد بھٹی صاحب یوں سر جھٹک کے دوبارہ کھانے میں مگن ہو گئے جیسے کھودا پہاڑ'

نکا! جو ہا والا معاملہ ہو۔

"وے اصغرے! تو نے شادی کرلی۔ کون ہے وہ منحوس ڈائن جس نے میرے بیبے بچے کو پھانس لیا۔ ہائے اس کو ڈھائی گھڑی کی آئے..... کبھی نہ بسے ماں کا دل اجاڑنے والی..... چپ چپاتے شریف لڑکوں سے شادیاں کرنے والی۔"

"کسی نے نہیں کی شادی۔" وہ چیخ اٹھا پھر مظہر کو شانے سے پکڑ کر بدتمیزی سے جھنجوڑا۔

"کیا بکواس لگادی ہے ادھر۔ کیوں شوشے چھوڑ رہے ہو؟"

"آرام سے۔" مظہر نے سرد لہجے میں تنبیہہ کی اور اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"اتنے بھڑک کیوں رہے ہو' غلط کیا کہا ہے میں نے۔ کیا تم شادی نہیں کرنا چاہتے؟ کیا تم اپنی مرضی سے اپنی نہیں چن بیٹھے؟ اور کیا اس سے شادی کرنے کے لیے حمایت مانگنے نہیں آئے تھے تم میرے پاس بھکاری بن کے۔"

"کوئی بھیک نہیں مانگی میں نے' خود مختار ہوں میں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کسی کے آگے من من کرکے اجازتیں مانگنے کی۔ مجھے جب شادی کرنا ہوگی جس سے کرنا ہوگی' میں ڈنکے کی چوٹ پہ کروں گا۔

اس کے واضح اعلان کے بعد کچھ دیر کے لیے سکوت چھا گیا۔

شمیم ماں کا چہرہ تکتے ہوئے اس کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کررہی تھی' جبکہ نصرت کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اس نے اصغر کے الفاظ اور انداز دونوں پہ غور کیا۔

الفاظ اسے اٹل اور بے لچک لگ رہے تھے جبکہ انداز باغیانہ۔

اس نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے فوراً پینترا بدلا۔

"ہاں ہاں' کیا ضرورت ہے تجھے چھپ۔ کے کچھ کرنے کی۔ کوئی ڈر پڑا ہوا ہے۔ گج وج کے ویاہ کروں گی میں اپنے پتر کا جس کو ساڑا (جلن) ہوتا ہے' ہو۔"

نصرت نے مظہر کو گھورا' جس کے اطمینان میں ذرا فرق نہ پڑا تھا اور جو جانتا تھا کہ پوری بات جاننے کے بعد اس کی ماں کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ البتہ اصغر کو ماں کے اس رویے سے خاصی تقویت ہوئی۔

"مجھے پتہ تھا میرا ساتھ ضرور دیں گی۔ یہ مظہر تو..... یہ تو بس ایسے ہی مجھے ڈراتا دھمکاتا....." وہ سوچ رہا تھا۔

"اگر میں غلط ہوں تو ثابت کرو۔" مظہر نے اس کی بات کاٹی۔

"موقع اچھا ہے' سب موجود ہیں' شاباش..... بتاؤ انہیں سب کچھ' وہ سب کچھ جو مجھے بتایا ہے۔ اس کے بعد امی سے پوچھو کہ وہ تمہارا ساتھ دیں گی یا نہیں۔" "بات کیا ہے اصغر؟" نصرت بھی اب ٹھٹکی۔

"وہ..... بس ایسے ہی امی..... ! رہنے دو..... یہ تو ایسے ہی..... مجھ سے ہی غلطی ہوئی جو بڑا بھائی جان کے اس سے مشورہ کرنے چلا گیا۔" وہ دانت کچکچا کے اسے دیکھنے لگا جو دل جلانے والی مسکراہٹ سجائے سامنے بیٹھا تھا۔

"چھوڑو ساری باتیں' مجیدا آنے والا ہوگا۔ آپ کھانا کھاؤ بس۔ اس کے بعد نکلتے ہیں سیر کرنے۔ فالودہ کھاتے ہیں۔" اس نے ماں کا دھیان بٹانے کی کوشش کی جواب ایک ہی جگہ اٹک گیا تھا۔

"فالودہ رہنے دے اور مجھے اصل بات بتا' کون سی حور پری پسند کرلی ہے تو نے؟"

"ملوادوں گا میں کسی دن' اس وقت یہ بات ختم نہیں ہوسکتی؟" وہ جھنجلا گیا۔

"ہوسکتی ہے' بالکل ہوسکتی ہے۔"

مظہر اپنی کرسی پیچھے کی جانب دھکیلتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا کھانا بھی ختم ہوچکا تھا اور کام بھی۔

"اور یہ بات میں ختم کردیتا ہوں۔ امی کو یہی جاننا ہے نا کہ وہ حور پری کون ہے' وہ حور ہے یا پری..... یہ تو مجھے نہیں' نام اصغر نے شاید ریما بتایا تھا کہ شہنا۔"

"ریتا....." اصغر بے اختیار کہہ اٹھا۔

"ہاں ہاں ریتا..... اور باپ کون ہے یہ بھی نہیں پتہ۔ نہ مجھے' نہ اصغر کو' نہ خود ریتا بی بی کو۔"

اس نے نصرت کو پہلا دھچکا دیا۔

"ہاں البتہ خاصی معروف ہے اور مشہور بھی۔ بہت نامی گرامی طوائف رہ چکی ہے۔"

"ستیاناس۔" نصرت نے اپنے سینے پہ دوہتڑ مارا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کافی دن نہیں ہوگئے تمہیں اپنی ماں کے ہاں گئے ہوئے؟"

رخشندہ نے ٹٹولتے ہوئے انداز میں پروین سے پوچھا۔

سلائی مشین پہ اس کا ہاتھ سست سا پڑ گیا۔

"نہیں' کوئی اتنے دن تو نہیں' ابھی ہفتے کو تو گئی تھی۔"

"اور آج بدھ ہے۔" رخشندہ نے گویا اطلاع دی۔

"پتا ہے۔" پروین کو جانے کیوں غصہ آگیا۔ سلائی مشین پہلے سے دگنی رفتار سے چلنے لگی۔

(توبہ..... اتنے سالوں بعد اب رخشندہ بھابھی کھلنے لگی ہے۔ سب سمجھ رہی ہوں میں..... مجھے بولنے پہ اکسا رہی ہیں..... ٹٹول رہی ہیں۔ اس دن سن گن مل گئی ہوگی نا میاں صاحب سے میرے جھگڑے کی۔ اب تفصیل جاننے کے لیے تمہید باندھی جارہی ہے' ورنہ یہی رخشندہ بھابھی تھیں کہ کوئی جیسے یا مرے' ان کی بلا سے۔ گھر میں کیا ہورہا ہے اور کیا نہیں' انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام اور اپنے میاں اور بچوں سے تعلق واسطہ۔ اب کیسے موقع دیکھ کے اس وقت نیچے اتری ہیں جب اماں جی سو رہی ہیں۔ چاہتی ہیں کہ ادھر میرے منہ سے کوئی گلہ نکلے' ادھر یہ بات پکڑلیں اور مجھے جتائیں کہ دیورانی بی بی! اور کرو خدمتیں ساس کی..... اور جی حضوری کرواپنے میاں کی..... مجھے کیا پڑی ہے ایسے جھوٹے ہمدردوں کے سامنے اپنا آپ ہلکا کرنے یا اپنی کوئی کمزوری ان کے ہاتھ میں دینے کی۔)

وہ بظاہر پورے دھیان سے فراک کے گھیرے پہ لیس لگا رہی تھی اور دل ہی دل میں جٹھانی کی کسی بات کا تسلی بخش جواب نہ دینے کے ارادے باندھ رہی تھی۔

رخشندہ کو بھی اس کے پکے پن پہ تاؤ سا آگیا۔

"میں کل اپنے میکے جارہی ہوں۔"

ایسا بھی پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی پروگرام سے یوں قبل از وقت کسی کو مطلع کررہی تھی' ورنہ عین وقت پہ دھماکہ کیا جاتا۔

"بچوں کی چھٹیاں ہیں' ضد کررہے تھے۔ سوچا' ایک آدھ ہفتہ رہ آؤں۔"

"ایک آدھ ہفتہ....." بالآخر وہ پروین کا مصنوعی انہماک توڑنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

اب پروین کو فکر لاحق ہوئی۔

وہ پچھلے چار روز سے اپنے میکے نہیں جاسکی تھی۔ مصلحتاً اس نے سراج دین سے جانے کا تقاضا بھی نہیں کیا تھا اور پچھلے چار روز سے وہ کوشش کررہی تھی کہ گھر میں کسی قسم کی کوئی تلخی نہ ہونے پائے۔ نہ کسی بات پہ سراج دین سے الجھ رہی تھی تاکہ اس کا موڈ خوشگوار رہے۔ ایسا کرکے وہ اپنی ساس کی ہدایت پہ ہی عمل کررہی تھی۔ (چاہے یہ نصیحت اس وقت اسے کتنی گراں ہی کیوں نہ گزری تھی لیکن اس پہ عمل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔)

جمعہ کو اس کا جانے کا ارادہ تھا۔ سوچا تھا' بچوں کی چھٹیوں کا کہہ کر انہیں بھی دو دن کے لیے ساتھ لے جائے گی لیکن رخشندہ نے اپنے جانے کا کہہ کر اسے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ وہ اماں جی کو اکیلے گھر میں چھوڑ کے خود میکے کیسے رہنے جاسکتی تھی۔ سراج دین کی اجازت ملنا یا نہ ملنا تو بہت بعد کی بات تھی' خود وہ بھی ایسا کرنے کی خود میں

ہمت نہیں پاتی تھی۔

"آپ کل ہی جا رہی ہیں بھابھی؟" اس نے مرے مرے انداز میں پوچھا۔

"ہاں' ارادہ تو یہی ہے۔ تمہیں پتہ ہے' میں کتنی موڈی ہوں۔ ہو سکتا ہے رات ساری پیکنگ کر کے رکھنے کے بعد صبح جانے کا ارادہ تبدیل ہو جائے لیکن شاید ایسا نہ ہو۔ بچے اداس ہو جائیں گے۔ اب تو جی چاہے نہ چاہے جانا ہی پڑے گا' بچوں کی خاطر۔"

وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں دراصل یہ جتا رہی تھی کہ وہ سارے معاملات میں کتنی خود مختار ہے۔ اس کی طرح کوئی بھی پروگرام بنانے کے لیے شوہر اور ساس کی اجازت کی محتاج نہیں بلکہ صرف اور صرف اپنے موڈ کی تابع ہے۔

"اور ڈیڑھ ہفتہ ہی رہیں گی؟"

"ہو سکتا ہے دو تین دن پہلے آ جاؤں یا تین دن مزید لگ جائیں۔ کیوں تم ابھی سے اداس ہونے لگیں؟"

"جائیں' شوق سے جائیں۔ میں بھلا کیوں اداس ہونے لگی۔"

اس نے روکھے انداز میں کہتے ہوئے دانتوں سے دھاگا توڑ کر فراک سمیٹا اور اٹھتے اٹھتے بڑبڑانے لگی۔

"میرے کون سے کام رک رہے ہیں آپ کے بغیر..... بھئی اپنی مرضی کی مالک ہیں۔"

اب پچھلے دس منٹ سے وہ ٹیلی فون سیٹ کے قریب تذبذب کے عالم میں بیٹھی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ میاں کو فون کر کے جانے کی اجازت لے یا نہیں۔

کچھ دن پہلے ہونے والی عزت افزائی کے بعد دل تو نہ چاہ رہا تھا یہ بات چھیڑنے کو۔ جواب وہ جانتی تھی کہ کیا ہو گا۔ یہی کہ "ابھی وہاں سے آئے دن کتنے ہوئے ہیں جو دوبارہ میکے کی ہڑک جاگ اٹھی ہے۔" اس طعنے سے بچنے کے لیے وہ انتظار کر رہی تھی کہ کم از کم ایک ہفتہ گزر ہو جائے تو ذکر کرے۔

دوسری جانب یہ احساس بھی تھا کہ رخشندہ کے کل چلے جانے کی صورت میں وہ اگلے دو ہفتے تک گھر سے بندھ کر رہ جائے گی اور ادھر اس کی ننھی سی بھتیجی' وہ معصوم بن ماں کی بچی..... وہ اجڑا ہوا' بکھرا ہوا گھر۔ اس کا غم زدہ بھائی۔ ان سب کا کیا ہو گا اتنے دن تک اگر وہ بھی پرسان حال نہ ہوئی۔

بہت ہمت کر کے بالآخر اس نے فیکٹری کا نمبر ملا ہی لیا۔ (یوں بھی بنا کسی بات کے ذلیل تو ہوتی ہی رہتی ہوں آج کسی وجہ سے ہو جاتی ہوں۔)

"خیریت.....؟ تم نے اس وقت فون کیسے کیا؟"

ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا' اس لیے سراج دین کا چونکنا فطری تھا۔

"جی..... جی سب خیریت ہے۔ بس یونہی فون کیا تھا۔" نمبر ملا تو بیٹھی تھی' اب دوسری جانب سے آتی کھردری لاتعلق سی آواز سن کر مدعا بیان کرنے کی ہمت کھو رہی تھی۔

"خیریت ہے تو کیا منڈی کے بھاؤ جاننے کے لیے یہاں کا نمبر ملایا ہے؟ اماں جی تو ٹھیک ہیں نا؟"

طنز کرتے کرتے اچانک ماں کا خیال ستایا۔

"جی وہ بالکل خیریت سے ہیں۔"

"پھر بچے..... بچے تو سب گھر پہ ہی ہیں نا؟"

اب بچوں کا وہم ستانے لگا۔

"جی اور کہاں ہوں گے اس گرمی میں' اندر کمرے میں کھیل رہے ہیں۔"

"تو فون کس لیے کیا ہے' جلدی پھوٹو' میں یہاں فارغ نہیں بیٹھا ہوا۔"

"وہ..... آپ سے پوچھنا تھا....." ہچکچاتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا۔

"کیا؟" سخت بے زاری سے کہا گیا۔

"یہی کہ آپ کیسے ہیں؟" اس بے زاری اور اکتاہٹ میں ڈوبے لہجے نے پسپا کر دیا۔

"اصل بات بولو پروین بیگم! صرف میرا حال پوچھنے کے لیے تم نے اتنے سالوں میں ایک بار بھی فون کرنے کی زحمت نہیں کی۔ تب بھی نہیں' جب میری طبیعت خراب ہوتی تھی۔ اب اپنے ضروری کاموں سے وقت نکال کر کیوں کرنے لگیں؟ مطلب کی بات کرو۔"

"مجھے..... مجھے اماں کی طرف جانا ہے۔"

اس نے یوں جلدی سے کہا جیسے اس ایک سیکنڈ میں نہ کہا تو دوبارہ کہنے کی مہلت نہ ملے گی۔

جواباً دوسری جانب ایک گہری خاموشی چند ثانیے کے لیے چھا گئی۔

"یہ بات گھر میں نہیں ہو سکتی۔ شام کو آتا ہوں پھر دیکھتے ہیں۔"

خلاف توقع خاصے ٹھنڈے انداز میں کہا گیا' ورنہ اسے تو سراج کے بھڑک اٹھنے کی پوری پوری امید تھی۔

"مجھے کل صبح نہیں' ابھی جانا ہے۔"

یہ نرمی پروین کی ہمت بندھا گئی۔

"کیوں' ابھی کیوں۔ ایسی کیا افتاد آن پڑی؟"

"جانا تو مجھے دو چار روز بعد تھا لیکن رخشندہ بھابھی کل سویرے بچوں سمیت اپنے میکے جا رہی ہیں اور ان کا کوئی پندرہ روز تک رہنے کا پروگرام ہے۔ ایسے میں' میں اتنے دن گھر سے نکل نہیں پاؤں گی۔ بھائی صاحب تو ساتھ جاتے نہیں بھابھی کے۔ ان کے کھانے پینے کا بھی خیال رکھنا ہو گا اور اماں جی....."

"ٹھیک ہے' ہو آؤ..... مگر کیسے جاؤ گی؟"

اتنی جلدی اجازت..... اور وہ بھی اتنے غیر متوقع انداز میں۔ خوشی کے مارے پروین کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ تو ابھی مزید منتیں کرنے کے ارادے باندھ رہی تھی۔

"رکشے میں۔"

"بچے ساتھ ہوں گے؟"

"اگر آپ اجازت دیں تو؟"

"چلو' لے جاؤ۔" وہ اور فیاض بنے۔

"مگر رکشے میں نہیں' میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ فیکٹری شہر کی حدود سے باہر تھی۔ وہاں سے گاڑی آنے میں خاصا وقت لگتا اور دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ ایسے میں رش بھی زیادہ ہوتا' معمول سے زیادہ ہی وقت لگتا گاڑی گھر تک پہنچنے میں اور وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"گاڑی آنے میں گھنٹہ لگ جائے گا' رکشہ موڑ سے مل جائے گا' ابھی ملازمہ کو بھیج کو منگوا لوں گی۔"

"مگر بچے..... اچھا خیال رکھنا' پہلی بار رکشے میں لے جا رہی ہو۔ ایک تو تمہارے بے وقت کے پروگرام....."

مزید کچھ کہے بغیر سراج دین نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ واپسی کے بارے میں پوچھتے پوچھتے رہ گئی کہ وہ لینے آئیں گے یا وہ خود ہی بھائی کے ساتھ چلی آئے۔

"چلو وہاں جا کے دوبارہ فون کر لوں گی۔"

اس نے جلدی جلدی چند کپڑے بیگ میں ٹھونسے' بچوں کے کپڑے تبدیل کروانے کا وقت نہیں تھا۔ سوچا وہاں جا کے نہا دھو لیں گے۔ ملازمہ کو رکشہ لانے کا کہہ کر بچوں کو کھیل چھوڑنے کو کہا' نانو کے گھر جانے کا بتایا اور خود اماں جی کے کمرے کا رخ کیا۔

چونکہ میاں سے اجازت مل چکی تھی' اس لیے انہوں نے کیا تعرض کرنا تھا۔

وہ بڑی سرشار سی' اتنی چلچلاتی دھوپ میں رکشے میں تین بچوں اور ایک بیگ کے ساتھ ٹھنسی ہوئی بیٹھی تھی۔

بیگ میں وہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت فراک پڑے تھے جو اس نے ان چار دنوں میں وشمہ کے لیے سیے تھے۔

☆ ☆ ☆

واپسی پہ دیر سے ہی سہی مگر سراج دین خود اسے لینے آئے۔ نوید مراد نے بہن کے کہنے پہ فون کر کے باقاعدہ اصرار کے ساتھ بلایا تھا۔ نہ بلایا ہوتا تب بھی سراج نے آنا ہی تھا۔ اپنی والدہ بیگم شوکت جہاں کی طرح وہ بھی بچوں کے معاملے میں خاصے وہمی انسان تھے۔ پتہ نہیں کس موڈ میں آ کر انہیں رکنے میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ بعد میں فکر مند ہی رہے اور ان کے گھر پہنچنے تک دو بار فون کر کے پوچھ چکے تھے اسی لیے رات گیارہ بجے خود لینے آ گئے۔

"اتنی دیر...؟" پروین نے پوچھا کیونکہ وہ فیکٹری سے بہت لیٹ آتے تب بھی رات کے سات ساڑھے سات بج جاتے تھے۔

"فیکٹری سے نہیں گھر سے آ رہا ہوں۔"

وہ سمجھ گئی کہ سیدھا یہاں آنے کے بجائے وہ پہلے گھر گئے ہوں گے' نہا دھو کے' کھانا کھا کر' لباس تبدیل کر کے یہاں آئے ہیں۔ اس کا دل بجھ گیا۔ نوید مراد نے خاص بہنوئی کے لیے پرتکلف کھانا تیار کروایا تھا۔

"آج رات کا کھانا آپ کی پسند کا بنا تھا۔ بھائی جان نے خود آپ کو کھانا ہم سب کے ساتھ کھانے کی دعوت دی تھی۔ ہم سب بلکہ بچے بھی آپ کے انتظار میں اب تک بھوکے بیٹھے ہیں۔" اس نے شکوہ کیا۔

"تو چلو' کھاتے ہیں۔" وہ خوش دلی سے کھانے کی ٹیبل کی جانب بڑھے۔ پروین کا دل خوشی سے اچھل کے رہ گیا۔

(یعنی گیارہ بجے تک بھی انہوں نے کھانا نہیں کھایا' گھر جانے کے باوجود.... صرف ہمارے ساتھ کھانے کے لیے۔)

آج سراج دین کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ نوید مراد سے بھی کھانے کے دوران خاصی گپ شپ رہی۔ ساس سے حسب معمول خشک اور لیا دیا رویہ رہا لیکن غنیمت رہی کہ ان کی بے سروپا باتوں کو نظر انداز کر دیا۔ نہ برے برے منہ بنائے' نہ طنز کیا' نہ ہی جھنجلاہٹ کے مارے کھانا چھوڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اور تو اور جاتے جاتے پروین کی گود میں سوتی ننھی سی وشمہ کے گال انگلی سے چھو کر اس کے بارے میں بھی دریافت کیا۔

"آج تو صاحب انسانیت کی جون میں ہیں۔" وہ سرشاری سے مسکرائی۔

واپسی پہ سارا راستہ یہ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہ ہوئی۔

"اماں جی ٹھیک کہتی ہیں۔ صبر اور خاموشی وہ ہتھیار ہیں جن سے مرد کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ میں میاں صاحب کو کبھی بھی زیر نہیں کرنا چاہتی۔ ہاں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ میری خوشی کا خیال رکھ لیا کریں۔ میری جائز خواہشات مان جایا کریں۔"

اس کی یہ ساری سرشاری' یہ خوشی صبح ناشتے کے وقت بھک سے اڑ گئی' جب رخشندہ میٹھی پوریاں لیے نیچے اتری۔

"یہ خاص اہتمام کس خوشی میں؟"

شوکت جہاں نے دبا دبا طنز کیا۔ بہوؤں پہ طنز کرنا ان کی عادت نہ تھی لیکن رخشندہ کے معاملے میں وہ کبھی کبھی ایسی ہو جایا کرتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ اس کی بہت سی عادتیں ان کے نزدیک ناپسندیدہ تھیں۔ پروین ان کے اتنا قریب تھی کہ انہیں اسے ٹوکنے کے لیے ڈھکے چھپے الفاظ کی ضرورت نہ ہوتی تھی جبکہ رخشندہ کو وہ نہ ٹوک پاتیں'

نہ بدل پاتیں۔ جب غبار زیادہ بڑھ جاتا تو یونہی ہلکے پھلکے طنزیہ مذاق سے جتا دیتیں جیسے اب کر رہی تھیں۔

"بھئی! تمہارے وہ جیم' مکھن.... وہ روکھے توس کیا ہوئے؟ بہت ہوا تو کسی دن انڈے تل لیتی ہو۔ یہ آج اتنے اہتمام کے ساتھ میٹھی پوریاں.... کوئی خاص بات ہے کیا؟"

رخشندہ اپنی عادت کے مطابق اس طنز کا جواب دینے کی بجائے ناشتے کی ٹیبل پہ پلیٹ خاموشی سے رکھنے لگیں۔ البتہ سراج دین بے ساختہ کہہ اٹھے۔

"لگتا ہے بھابھی میکے جانے کی خوشی میں یہ ناشتہ کھلا رہی ہیں سب کو۔ اس بار پروگرام بھی تو لمبا بنا ہے۔"

"واقعی بہو! میکے جا رہی ہو' کب؟"

اس بار وہ خاموش رہی۔ شوکت جہاں کا دل برا ہونے لگا۔ سراج دین بھانپ گئے کہ ماں کو یہ اطلاع ابھی ابھی ملی ہے۔

"میرا خیال ہے آج ہی جا رہی ہیں' دو ہفتوں کے لیے۔ آپ کو نہیں پتا؟"

"نہیں' مجھے تو نہیں بتایا بہو بیگم نے۔" ان کی آواز میں ملال کے ساتھ ساتھ گلہ بھی شامل ہو گیا۔

"لو بتاؤ بھلا' آج انہیں جانا ہے اور ہمیں خبر تک نہیں۔ بھئی اجازت مانگنے کا رواج تو گئے زمانوں کی بات تھی۔ اب کیا بڑے بزرگوں کو اپنے آنے جانے سے باخبر رکھنا بھی پرانے دور کی روایت کہلایا جانے لگا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ اماں جی!" رخشندہ نے ان کے سامنے رکھی پلیٹ میں پوری رکھی اور نرم لہجے میں کہنے لگی۔

"اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں آپ کو بغیر بتائے گئی ہوں یا وقت کے وقت گھر سے نکلتے ہوئے بتایا ہو۔ کئی دن پہلے ہی بتا دیا کرتی ہوں۔"

"تو آج یہ دن کدھر سے چڑھ آیا؟" وہ بدستور ناراض لگ رہی تھیں۔ ابھی تک ایک لقمہ نہ توڑا تھا۔ پروین یہ ساری گفتگو بے نیازی سے سنتے ہوئے ننھے وصی کو پراٹھا کھلانے میں مگن تھی۔

"وہ اس لیے کہ میں کہیں جا ہی نہیں رہی۔"

اس کی اس بات پہ پروین چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

سراج دین کا ہاتھ چائے کی پیالی لبوں تک لے جاتے رہ گیا۔

"کیوں سراج؟" شوکت جہاں نے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"مجھے پروین نے بتایا تھا۔" وہ شانے اچکا کے سارا معاملہ اس پہ ڈال گئے۔

اب وہ بہو کو استفہامیہ انداز میں گھورنے لگیں۔

"میں تو.... بھابھی نے.... کیوں بھابھی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ کل آپ کہہ نہیں رہی تھیں کہ آپ صبح اپنے میکے جانے والی ہیں' دو ہفتے رہیں گی.... بچوں کی چھٹیاں ہیں' وغیرہ وغیرہ۔"

"میں تو صرف یہ ذکر کر رہی تھی کہ بچوں کی چھٹیاں ہیں' ان کا دل چاہ رہا ہے جانے کو۔ کوئی حتمی پروگرام تو نہیں بنایا تھا۔"

پروین اس غلط بیانی پہ تاؤ کھا کے رہ گئی۔ اسے زندگی میں پہلی بار رخشندہ کی صورت اس قدر مکروہ لگی۔

"آپ نے تو یہاں تک کہا کہ اگر موڈ بنا تو دو تین دن مزید بھی لگ سکتے ہیں اور...."

"اور میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ میں ہوں ہی موڈی۔ موڈ نہ ہوا تو نہیں جاؤں گی' بھول گئیں۔ ہاں کل دل چاہ رہا تھا جانے کو۔ بس باتوں باتوں میں پروین سے تذکرہ کیا کہ شاید چلی جاؤں۔ یہ شاید کچھ اور سمجھی۔"

اب اس نے ساس کی جانب رخ کر کے وضاحت کی اور خالی پلیٹ ہاتھ میں لیے اوپر چلی گئی۔

"وہ اماں جی! بھابھی نے اتنے وثوق سے.... وہ سچ میں یہ کہہ رہی تھیں کہ...."

پروین بھی ہکلا کے اپنی پوزیشن صاف کرنے لگی مگر شوکت جہاں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے منع کر دیا۔

"چھوڑو اس بات کو' یہ بھی کوئی مسئلہ ہے بحث کرنے کا۔ صبح کا وقت ہے' بے کار کے مباحثے میں کیوں خراب کرنا۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھار مغالطہ۔ کہنے والا کچھ اور کہتا ہے' سننے والا کچھ اور سمجھتا ہے اور رخشندہ تو یوں بھی گول مول بات کرنے کی عادی ہے۔ جانے دو۔"

"نہیں اماں جی! آپ ہر بار اس کی غلطی کی پردہ پوشی کر کے بات ختم کرنے کی کوشش مت کیا کیجیے۔" سراج نے پیالی میز پہ پٹخی۔

"اس نے جان بوجھ کے بھابھی کی بات کو غلط معنی پہنائے اور جھوٹی افواہ پھیلائی۔"

"چپ کرو تم' فضول کے الزامات۔ نجانے کیا فتور بھرا ہے تمہارے دماغ میں۔" انہوں نے جھڑکا۔

"میرا دماغ خراب ہے اور یہ فرشتہ ہے جو غلطی کر ہی نہیں سکتی' جھوٹ بول ہی نہیں سکتی۔" وہ تلملائے۔

"جھوٹ کون نہیں بولتا' سب بولتے ہیں۔ کبھی مصلحتاً' کبھی ضرورتاً' کبھی کسی مجبوری کے تحت۔۔۔ اور غلطی کس سے نہیں ہوتی' سب سے ہوتی ہے۔ کبھی غیر ارادی طور پہ' کبھی ارادتاً' مجھ سے' تم سے' سب سے غلطی ہی ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ پروین نے زندگی بھر کوئی جھوٹ نہ بولا ہو گا لیکن عقل سے کام لو۔ وہ کوئی فطرتاً تو جھوٹی نہیں' نہ لگائی بجھائی کرنے والی عادت ہے اس کی۔ اتنا تو ساس ہونے کے ناتے میں بھی جانتی ہوں اور شوہر ہونے کے ناتے تمہیں بھی پتا ہو گا۔ بھلا رخشندہ کے جانے کی جھوٹی اطلاع گھر میں پھیلانے سے اسے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بلاوجہ دروغ گوئی کیوں کرے گی وہ؟"

"بلاوجہ نہیں' اس کے پاس جواز تھا یہ سب کرنے کا۔" انہوں نے پروین کے رنگ اڑے چہرے کی جانب غصے سے دیکھا۔

"اسے فائدہ اٹھانا تھا اور وہ یہ کہ اس بہانے یہ ایمرجنسی میں اپنی ماں کے ہاں جانے کا پروگرام بنا سکے۔"

"میری بات تو سنیں۔" اس نے کہنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

"تم اپنا اعتبار کھو چکی ہو' اس لیے اب منہ کھولنے کی کوشش مت کرو۔"

"الٹا سیدھا مت بولو سراج! ذرا سی بات پہ تم اسے بے اعتبار قرار دے رہے ہو۔ شرم کرو' بیٹا! شانوں تک آنے لگا ہے اور تم ایسی عاقبت نااندیشی کی باتیں کر رہے ہو۔ ارے اپنے میکے ہی تو گئی تھی وہ' کہیں اور تو نہیں۔۔۔"

"ضرور جائے۔۔۔ سو بار جائے مگر اتنا بڑا ڈرامہ رچا کے ہرگز نہیں' اس لیے مجھے اس کے میکے کے نام پہ تکلیف ہوتی ہے۔ میری ان لوگوں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے لیکن جن عورتوں کو میکے کا خبط سوار ہوتا ہے' وہ اسی طرح میکے کی خاطر دوسرے ہر رشتے کو دھوکا دیتی ہیں۔ میکے کی محبت اسے لے ڈوبے گی اماں!"

وہ وارننگ دیتے تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

پروین پراٹھے کا نوالہ ہاتھ میں لیے بے آواز آنسو بہا رہی تھی اور وصی منتظر تھا کہ کب وہ نوالہ اس کے منہ میں ڈالے۔

"لاؤ' میں کھلاتی ہوں۔" شوکت جہاں نے نوالہ اس کے ہاتھ سے لیا' وہ چپ چاپ بیٹھی رہی مگر وصی نے نانی کے ہاتھ سے کھانے سے انکار کر دیا۔

"مامی۔۔۔!" وہ ٹھنک کے بولا۔

پروین نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کیے اور ساس کے ہاتھ سے نوالہ لے کر وصی کے منہ میں ڈالا۔

"سراج کا دماغ خراب ہو چکا ہے' اس کی بات کا برا کیا ماننا بیٹی۔! بس کرو' رو کر اپنا اور میرا دل برا مت کرو۔"

وہ اس کے علاوہ اور کس انداز میں تسلی دیتیں۔

"ان کا دماغ خراب نہیں ہوا اماں جی! بہت اونچے سنگھاسن پہ جا بیٹھا ہے۔ وہ صرف اسے سچ مانتے ہیں جو خود کہتے ہیں' صرف اسے درست جانتے ہیں جو خود سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں باقی سب غلط ہیں۔ بار بار وہ یہی ایک بات دہراتے ہیں کہ میکے کی محبت مجھے برباد کر ڈالے گی۔ کیسے؟ آپ بتائیے کیسے؟ کیا محبت بھی برباد کر ڈالتی ہے؟

میکے کی محبت کیا ہوتی ہے؟ محبت تو محبت ہوتی ہے۔۔۔ رشتوں کی محبت' اپنوں کی محبت۔ جیسی محبت مجھے اپنے شوہر' بچوں اور گھر سے ہے' آپ سے ہے' اور جیسی محبت مجھے اپنی ماں اور بھائی سے ہے۔ جب وہ محبت بری نہیں تو یہ محبت کیوں بری ہے؟ یہ مجھے کیوں لے ڈوبے گی؟"

"ان سوالوں میں مت الجھو پروین!"

اس کی بات اتنی چونکا دینے والی تھی کہ ان کا اپنا ذہن جھٹکے کھا گیا۔ انہیں پروین کے سوالوں سے تنفر اور بغاوت کی بو آنے لگی' اسی لیے اسے سنبھالنے لگیں۔

"محبتیں واقعی کبھی بھی نقصان نہیں دیتیں لیکن ہر محبت کا خانہ الگ ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف خانوں کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی اہم ہو جاتا ہے تو کبھی کوئی۔ اس وقت تمہارے نزدیک زیادہ اہم تمہارا میاں اور بچے ہونے چاہئیں۔ تمہیں باقی سب کے مقابلے میں انہیں اولیت دینی چاہیے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں اور یہی صلاح دوں گی تمہیں۔ آگے تم خود سمجھ دار ہو۔ اپنا اچھا برا جانتی ہو۔"

اسے نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی جتا دیا کہ وہ کوئی اس کے ساتھ جبر نہیں کر رہیں تاکہ اس کا پہلے سے باغی ذہن مزید متنفر نہ ہو جائے۔

"ماما۔۔۔" کمرے سے آئی حسان کی آواز نے پروین کو چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر آنے پہ مجبور کیا' ورنہ ساس کے اٹھ کے جانے کے بعد سے وہ یونہی بے دھیانی میں چھوٹے چھوٹے نوالے توڑ کے وصی کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ احسن اور حسان کب کے ناشتے سے فارغ ہو کے اندر جا چکے تھے۔

"ماما! جلدی آئیں' یہ حسان مجھے تنگ کر رہا ہے۔ ہوم ورک نہیں کرنے دے رہا۔"

اب احسن نے بھی پکارا تو اسے اٹھنا پڑا۔

"مامی۔! ناچھتہ (ناشتہ)۔" وصی نے اس کا آنچل پکڑا۔ وہ احسن کو "دو منٹ' ابھی آئی" کہتے کہتے رک گئی۔ دزدیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر درشت لہجے میں اس سے اپنا پلو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"خود کھاؤ' مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

اپنی اولاد کے مقابلے میں باقی سب کو پسِ پشت ڈالنے کا سبق اسے ابھی ابھی پڑھایا گیا تھا' جس پہ عمل کرنے کا وہ پورا پورا ارادہ رکھتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

ریناکو دیکھ کے ہی جعفر کو آگ لگ گئی۔ موڈ پہلے ہی خاصا بگڑا ہوا تھا' اسے سامنے پا کے خطرناک ہو گیا۔

"اپنے ایک سوال کا جواب لینے آئی ہوں۔"

اس نے یہ تمام درشتی برداشت سے پیتے ہوئے کہا۔ حالانکہ آدھا جواب وہ اپنی بے گانگی اور خراب رویے سے دے ہی چکا تھا۔

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" وہ منہ موڑ کے اپنے ملازم کو آواز دینے لگا۔

"فضل! کتنی بار کہا ہے کسی کو اندر بلانے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیا کرو۔ ہرا یرا غیرا منہ اٹھا کے اندر گھس آتا ہے۔"

پچھلی بار بھی اس کے تیور بدلے ہوئے تھے کیونکہ اس کا دل بدل چکا تھا۔ اب وہ کسی اور کے حسن کا اسیر تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنا رکھ رکھاؤ نہیں کھویا تھا اور اب اگر وہ رینا کے ساتھ زیادہ ہی رکھائی اور بدتمیزی سے پیش آ رہا تھا تو اس لیے کہ سومیہ کے ساتھ گزارے وقت کا اسے جو خمیازہ بھگتنا پڑ رہا تھا' اس کے نتیجے میں وہ سب سے بے زار تھا۔ رینا تو کیا سومیہ تک کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ فی الحال وہ اپنے صنفِ نازک والے شوق کو کوستے ہوئے آئندہ کسی بھی قسم کے رنگین چکر میں نہ الجھنے کا عہد کر رہا تھا کہ رینا کی آمد ہوئی اور وہ زیرِ عتاب آ گئی۔

”صاب۔! وہ۔۔۔ میں تو۔۔۔“ وہ گڑبڑا گیا۔ اب کیا کہتا کہ ریتا نے منت ہی اس انداز میں کی تھی کہ وہ اسے اندر لانے پہ مجبور ہو گیا۔

”دفع ہو جاؤ اب۔۔۔ شکل گم کرو اور تم۔۔۔ تم بھی۔“

اس نے حقارت سے چٹکی بجاتے ہوئے اسے بھی نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس معزز، مہذب شخص کے بدلتے رنگ ڈھنگ دیکھتی رہی، جس کی شیریں بیانی اور رکھ رکھاؤ پہ ہی تو مرمٹی تھی وہ، جس طرح وہ اسے دیکھتا تھا۔

جس طرح وہ اسے احترام سے مخاطب کرتا تھا۔ وہ سب انداز۔۔۔ وہ سب اطوار اسے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔

”سنا نہیں تم نے، میری شکل کیا دیکھ رہی ہو؟“

”دیکھ رہی ہوں، انسان کتنی جلدی بدل جایا کرتے ہیں۔“

”میں اس وقت تمہاری بے کار کی باتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”اب ہماری باتیں بے کار ہو گئی ہیں صاحب۔۔۔!“ وہ ذرا سا مسکرائی۔ اس کی یہ مسکراہٹ جعفر کو مزید تپا گئی۔

”تم یہاں سے جاتی ہو یا میں دھکے دے کے نکلواؤں۔“

اس قدر تذلیل۔۔۔ اتنی بے عزتی۔۔۔ اور وہ بھی اس ہستی کے ہاتھوں، جس سے ہمیشہ پذیرائی کے ہی سپنے دیکھے ہوں۔

اس کے قدم لڑکھڑا سے گئے۔

”چلی جاؤں گی جعفر صاحب! چلی جاؤں گی۔ پہلے یہ تو جان لوں کہ آپ کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ۔۔۔ جو میں نے جانی۔۔۔؟ یا پھر وہ۔۔۔ جو یہ اخبار دکھا رہے ہیں؟“

اس نے اخبار آگے کیا جس میں سومیہ کے ساتھ اس کے تعلق کی خبریں چٹ پٹے الفاظ میں تحریر تھیں۔

جعفر محمود نے اس کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ کر دو ٹکڑے کر دیا۔

”بکواس ہے یہ سب۔۔۔ کچھ نہیں لگتی یہ سومیہ میری۔ نہ ہی میں اس سے کوئی شادی وادی کر رہا ہوں۔“

”سچ۔۔۔؟ میں پہلے ہی کہتی تھی، آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ تو۔۔۔ آپ تو۔۔۔“

وہ احمق بی پھر سے خوش گمان ہونے لگی تھی کہ اس کی سرد نگاہوں سے جھلکتی نفرت نے اس کی زبان پہ گویا قفل ڈال دیے۔

”سومیہ کے چکر میں پھنسنا میری زندگی کی سب سے بڑی حماقت تھی اور تم سے شناسائی سب سے سنگین غلطی۔ میں دونوں پہ پچھتا رہا ہوں۔ ایک سے تعلق نے رسوائی دی تو تم سے تعلق رکھنے پہ میرا اپنا آپ مجھے شرمندہ کرتا رہا کہ آخر میں کیچڑ کے اس ڈھیر میں گرا کیسے؟“

اور ریتا کو کسی نے دونوں ہاتھوں سے بدبودار کیچڑ سے بھرے گڑھے میں اوندھے منہ دھکا دے کر گرا دیا۔

”کتنا سمجھایا مجھے میرے دوستوں نے کہ یہ تمہارا اسٹینڈرڈ نہیں۔ یہ دو ٹکے کی ناچنے والیاں۔۔۔ یہ محفلیں سجا کے اوباشوں کو خوش کرنے والیاں۔۔۔ یہ سستی قسم کی عیاشیاں تمہارے جیسے انسان کو زیب نہیں دیتیں۔ پتہ نہیں میرا وقت خراب تھا یا پھر میرا دماغ خراب تھا جو تمہیں سر پہ چڑھائے پھرتا رہا۔ بات سنو، تم میرے دل سے اسی وقت اتر گئی تھیں جب سومیہ نے مجھے گرین سگنل دیا تھا۔ اس دن سے لے کر آج تک میں نے ہزار بار خود کو کوسا ہے اتنے گندے ذوق پہ اور اب جبکہ میں سومیہ کے قبیل کی حسیناؤں سے بھی دس گز کے فاصلے پہ رہنے کا عہد کر چکا ہوں تو تمہارے جیسی سڑک چھاپ لڑکی جس کے پاس نہ صورت ہے، نہ شکل۔ چار آنسو بہا کے مجھے پھر سے اس حماقت پہ مجبور نہیں کر سکتی۔ سنا تم نے۔“

اس کی اس طویل بات کے دوران دوبار کال بیل بج چکی تھی۔ فضل اس کے قریب سے بھاگتا ہوا بیرونی

دروازے تک گیا اور پھر الٹے قدموں واپس لوٹا۔

”وہ صاب۔۔۔! آپ کے گھر والے آئے ہیں۔“

”گھر والے۔۔۔ اسلام آباد سے۔۔۔؟“ وہ ہڑبڑا گیا۔ سارا رعب جو وہ ریتا پہ انڈیل رہا تھا، جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”آہو جی، وہ آپ کے اباجی، وڈے بھرا ہوراں جی اور آپ کی بیگم صیبہ جی۔۔۔“

”بیگم صاحبہ۔۔۔؟“ ریتا کے لیے یہ ایک اور انکشاف تھا۔

”دفع ہو جاؤ تم۔“ اس کا بس نہ چل رہا تھا، غلیظ گالیوں کے ساتھ ساتھ ٹھڈے مارتا ہوا اسے باہر سڑک پہ نکال پھینکے۔

”فضل! اسے پیچھے سے نکال دو، گیٹ میں کھولتا ہوں۔“

ریتا کو بازو سے پکڑ کر اس نے فضل کی جانب دھکیلا، جو اس گفتگو کو سن کر یہ اندازہ تو لگا ہی چکا تھا کہ یہ مہمان لڑکی کون ہے۔ اپنے بازوؤں میں اس گرتی سنبھلتی لڑکی کو سمیٹتے ہوئے اس کی باچھیں چر گئیں۔ وہ مشکور انداز میں باہر کی جانب نکلتے صاحب کی پشت کو تکنے لگا، پھر اچانک اسے وہ آرڈر یاد آیا۔

”چلو آؤ، میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں باہر کا رستہ دکھاتا ہوں۔“

اصلیت کھلنے پہ اس کا انداز تخاطب بھی بدل گیا۔ اب وہ بھی اسے مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھا جیسے قسمت سے ہاتھ آنے والے اس خزانے سے محروم ہونے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

”چھوڑ مجھے۔“ ریتا نے ایک جھٹکے سے اپنا آپ چھڑایا اور جعفر کے پیچھے پیچھے لپکی۔

”اوئے۔۔۔“ فضل بھی اس سے غافل نہیں تھا۔ اس نے دو قدم اچھل کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اپنی طرف گھسیٹا اور اسی طرح گھسیٹتا ہوا کچن میں لے گیا۔ دروازہ زور سے بند کرنے کے بعد اس نے ریتا کو دیوار سے لگاتے ہوئے اس کے لبوں پہ اپنا مضبوط ہاتھ جما دیا۔

پہلی بار اسے شدید قسم کا خوف محسوس ہوا۔

وہ مجہول سا نظر آنے والا غریب ملازم اس وقت اس بند کمرے کی تنہائی میں کوئی غنڈہ بدمعاش نظر آ رہا تھا۔ اس کی خوف زدہ آنکھیں دہشت کے مارے پھیل گئیں۔

اس کا خوف بے جا نہیں تھا۔ اس وقت فضل کی آنکھوں میں جو کچھ تھا، اس سے اس جیسی لڑکی انجان نہیں ہو سکتی تھی لیکن فضل بھی بے بس تھا۔ وہ اپنے مالک کے گھر میں تھا اور صرف مالک ہی نہیں، مالکوں کے مالک۔ یعنی ان کے بزرگ بھی گھر میں موجود تھے۔ وہ اس حسن اور جوانی کی تپش سے صرف آنکھیں اور ہاتھ ہی سینک سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ ریتا کے ہونٹوں سے نیچے سرک کر اس کی گردن تک آن پہنچا۔ باہر سے آتی ہلکی ہلکی آوازوں نے ریتا کو دسراہٹ کا احساس دلایا۔ وہ بھانپ گئی کہ فضل کی نیت ڈانواں ڈول سہی لیکن اس وقت وہ بے بس اور لاچار ہے۔ اپنے مذموم ارادوں پہ عمل نہیں کر سکتا۔ یہ احساس اس کی ہمت بڑھا گیا۔ اپنے سوکھے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے التجا کی۔

”کیا میں ایک نظر باہر جھانک لوں؟“

”مروانا ہے مجھے، صاب کا پتہ نئیں تجھے۔“ وہ ہلکے سے غرایا۔

”بس ایک بار، کھڑکی سے ذرا پردہ ہٹا کے۔“ اچانک ہی اس کے اندر جعفر محمود کی بیوی کو دیکھنے کی خواہش جاگی تھی اور یہ خواہش اتنی طاقت ور تھی کہ وہ اسے دبا نہ پا رہی تھی۔

فضل نے کھڑکی پہ لگا پردہ سرکانے سے پہلے ٹیوب لائٹ آف کر دی۔

باہر سے آتی آوازیں واضح نہیں تھیں مگر منظر بے حد واضح تھا۔

جعفر محمود فق چہرے کے ساتھ گردن جھکائے کھڑا تھا۔ وہ کہیں سے بھی باوقار اور پراعتماد افسر نہیں لگ رہا تھا

جس کی قربت نے ربنا کو اس کی اوقات سے بڑھ کے خواب دیکھنے پہ مجبور کیا تھا۔ نہ ہی اس جعفر میں کچھ دیر پہلے والے جعفر کی جھلک تھی جو بڑے کروفر اور طنطنے کے ساتھ ربنا کو آئینہ دکھا رہا تھا۔

یہ جعفر تو اپنے سامنے بیٹھے ان تین نفوس کے سامنے نظر تک اٹھانے کے قابل نہ لگ رہا تھا۔

ان میں سے ایک عمر رسیدہ مگر بارعب شخص یقیناً جعفر کا باپ تھا جس کے چہرے پہ غصے کے ساتھ ساتھ ملال بھی تھا۔

دوسرا شخص جو اتنا عمر رسیدہ نہیں تھا مگر بارعب اس سے بڑھ کے لگ رہا تھا اور جس کی آتشیں نظریں مسلسل جعفر کے وجود کو چھید رہی تھیں۔

تیسرا وجود وہ نسوانی وجود... جو بہت عام سا تھا' اسے معمولی قرار دینے والے شخص کی نصف بہتر خود اتنی معمولی ہوگی' یہ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی دراز قامت مگر قدرے بھاری جسامت والی وہ اٹھائیس انتیس سال کی عورت اپنے عام سے نقش والے گندمی چہرے پہ ایسے سپاٹ تاثرات لیے ہوئے تھی جیسے یہ معاملہ اس کے شوہر کا نہیں کسی غیر کا ہو۔ وہ یہاں موجود تینوں مردوں سے لاتعلق نظر آئی۔ بے زاری سے نظریں گھما گھما کے ڈرائنگ روم کی آرائش کا جائزہ لے رہی تھی پھر اچانک اس کی نظریں کچن کے اس گلاس ونڈو پہ جا پڑیں جو یہاں سے متصل تھا۔

ربنا نے گڑبڑا کے پردہ گرا دیا۔

کچن میں خاصا اندھیرا تھا' شیشے بھی گہرے رنگ کے تھے۔ اس کے دیکھے جانے کا امکان صفر کے برابر تھا پھر بھی وہ بری طرح گھبرا گئی۔

اس کا خیال درست تھا' جعفر کی بیوی واقعی یہ اندازہ نہیں کرپائی تھی کہ شیشے کے اس پار کوئی انہیں دیکھ رہا ہے۔

لیکن اس کا ڈر بھی بے وجہ نہ تھا' وہ پردہ گرتا دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

"چل نکل اب... بھاگ یہاں سے۔" فضل' صاحب کی بیگم کو کچن تک آتے دیکھ کر ربنا کو بھگانے لگا۔ اس کا سارا ٹھرکی پن اڑن چھو ہو چکا تھا۔ اب صرف اپنی نوکری بچانے کی فکر تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے پچھلے دروازے کا رستہ دکھاتا' بیگم صاحبہ کچن میں داخل ہو چکی تھیں۔

"کون ہو تم...؟ وہ اخبار والی...؟"

اس عام سی نظر آنے والی عورت کے لہجے میں ایسا کروفر تھا جو پکار پکار کر اعلان کر رہا تھا کہ اس کی حیثیت اور مقام معمولی نہیں۔

ربنا اس سے مرعوب ہوگئی۔

"وہ تو نہیں لگ رہی ہو' کون ہو؟"

"میں' ربنا..." اس نے خشک ہوتے حلق کو تر کرتے ہوئے کہا۔

"اکثر آتی ہو؟" وہ اتنے ٹھنڈے انداز میں پوچھ رہی تھی کہ ربنا کو حیرت ہو رہی تھی۔

"نہیں' پہلی بار آئی ہوں۔"

"وہ لائے ہیں تمہیں؟"

"خود آئی ہوں۔"

"کیا کرنے؟" پہلی بار اس کا لہجہ درشت ہوا۔

"وہی جو آپ کرنے آئی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اس کے ابرو چڑھ گئے۔

"پوچھنے آئی ہوں کہ میری محبت اور وفا میں کون سی کمی رہ گئی تھی جو وہ اس عورت سے لینے گئے تھے۔"

ربنا کے اس جواب پہ مدیحہ نے اپنے منہ پہ ایسے ہاتھ رکھا جیسے اپنا بے ساختہ نکلتا قہقہہ روک رہی ہو۔

"تمہاری اس بات پہ دل کھول کے ہنسنے کو جی چاہتا ہے مگر ڈرتی ہوں یہ آواز سن کر باہر والوں کو تمہارے یہاں ہونے کا پتہ نہ لگ جائے۔"

"آپ کیوں ڈرتی ہیں؟ پتا چلنے دیں۔"

"تم میرے بھائی اور سسر سے انجان ہو' اس لیے ایسی بات کہہ سکتی ہو۔ میں ڈرتی ہوں کیونکہ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ جو اصل فساد کی جڑ ہے' وہ تو نجانے کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ جب بھی ہاتھ آئی' حشر اس کا بھی کم برا نہیں ہوگا لیکن اس وقت تم ہاتھ لگ گئیں تو ساری بھڑاس تم پہ نکل جائے گی اور میں تمہارے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دینا چاہتی۔"

"سوکن ہوں میں تمہاری پھر میرے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں؟"

مدیحہ نے ایک بار پھر اپنی ہنسی روکی۔

"پہلے تمہاری یہ غلط فہمی دور کردوں کہ تم میری سوکن ہو۔ اگرچہ خود کو میری سوکن بتاتے ہوئے تمہاری گردن بڑے فخر سے اٹھی تھی مگر ایسا لمحے بھر کا فخر کس کام کا جو گردن ہی کٹا ڈالے اور یہ خوش فہمی بھی دور کرلو کہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تین تین بیٹیوں کی ماں ہوں۔ مجھے تمہارے انجام سے نہیں' بددعاؤں سے ڈر لگتا ہے۔"

کسی چودھرائن کی طرح دبنگ لہجے میں بات کرتے کرتے اچانک اس کی آواز بھیگ گئی۔

"میں تمہیں نہیں' اپنی بیٹیوں کا مستقبل بچانا چاہتی ہوں۔ بھاگ جاؤ یہاں سے' ورنہ میرا بھائی تمہارا وہ حشر کرے گا کہ..."

اس کے ادھورے فقرے نے ہی ربنا کی ٹانگوں کو لرزا ڈالا۔ اس نے نظر کھڑکی کے پار ڈالی۔ مہین جالی کے پردے کے اس پار سب دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔

اس نے مدیحہ کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا اور فضل کے پیچھے خاموشی سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھا وہ شخص مدیحہ کا بڑا بھائی' جعفر محمود کا سالا اور اس کا سگا تایا زاد ہی نہ تھا بلکہ اس کا سب سے بڑا بہنوئی بھی تھا۔

دونوں کی عمر میں کوئی سولہ سترہ سال کا فرق تھا۔ جب بڑی آپا کی شادی ہوئی تب جعفر کی عمر بارہ برس رہی ہوگی۔ اس کے والد پہلے سے اپنے بڑے بھائی کے رعب میں تھے۔ بیٹی دے کر اور دب گئے۔ یوں بہنوئی کو اس گھر کے سب سے محترم اور بزرگ فرد کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ بعد میں اسی کی چھوٹی بہن مدیحہ سے جعفر کی شادی ہوئی۔ رشتے برابر ہو جانے کے بعد بھی مکرم باجوہ کی حیثیت جعفر سے اوپر ہی رہی۔

اس وقت بھی وہ گرج رہے تھے اور وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔ سالوں بیت گئے تھے یوں گردن سینے سے لگا کر ان کی باتیں سنتے ہوئے اور یہ تب زیادہ گراں گزرتا جب مدیحہ سامنے ہوتی۔

اس معمولی عورت کے سامنے وہ یہ سبکی برداشت نہیں کرپاتا تھا جو ادل بدل کے رشتوں میں زبردستی اس کے سر منڈھ دی گئی تھی۔ وہ ایسے پل میں بظاہر لاکھ لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرتی مگر اسے یہی لگتا جیسے وہ اس کی بے بسی کا دل ہی دل میں مزا لے رہی ہو۔

وہ اچانک کسی وجہ سے اٹھ کے کچن میں گئی تو اس نے خود کو ریلیکس محسوس کیا۔ اب وہ زیادہ شرمندہ ہوئے بغیر بہنوئی یا سالے... مکرم باجوہ سے جھاڑ سن سکتا تھا مگر جب اسے کچن میں گئے دو تین منٹ سے زیادہ ہوگئے تو اچانک اسے ربنا کا خیال آیا۔

وہ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنے لگا۔ اسے وہم لاحق ہوگیا کہ ربنا ابھی گئی نہیں' کچن میں ہی ہے اور ہو نہ ہو' مدیحہ نے نہ صرف اسے پکڑ لیا ہے بلکہ ابھی اسے سب کے سامنے بھی لانے والی ہے۔ اسی ڈر نے اسے بولنے تک کی ہمت نہ

دی‘ جب اس کے بہنوئی نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

”تم استعفیٰ دو اور ہمارے ساتھ چلو۔ بیوی‘ بچوں‘ گھربار‘ زمین‘ جائیداد سب کے ہوتے ہوئے یوں دربدر کے ٹکے ٹکے کی نوکری کیا کرنی۔“

اتنا کہہ کر وہ اور اس کے اباجی آرام کرنے گیسٹ روم میں چلے گئے۔ وہ اٹھ کے کچن کی طرف لپکا مگر اتنے میں مدیحہ وہاں سے نکل آئی۔

وہ وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اخذ کرنا چاہا۔

وہاں ہمیشہ کی طرح ایک سرد اور جامد خاموشی تھی‘ وہ بغیر کچھ کہے اس کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔

”بھائی جی‘ اندر چلے گئے؟“

”ہاں اور جاتے جاتے حکم سنا گئے ہیں کہ استعفیٰ دے دو جیسے میری زندگی میری اپنی نہ ہو۔ سب کام ان کے مشورے سے ہی کرنے ہوں گے۔“

وہ زہرخند لہجے میں کہتا جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگا۔

”آپ اپنی زندگی بھی جی رہے ہیں اور بہت خوب جی رہے ہیں۔ میں ابھی ابھی نمونہ دیکھ کے آ رہی ہوں۔“

جعفر کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”گھبرایئے مت‘ بھگا دیا ہے آپ کی اس ناکام معشوقہ کو مگر میں ساری زندگی یہی کام کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ مجھے اپنا گھربار بھی دیکھنا ہے‘ بچیوں کو بھی سنبھالنا ہے‘ ان کی بھی تربیت کرنی ہے۔ کب تک بھاگ بھاگ کے آپ کے پھیلائے بکھیڑے سمیٹتی رہوں گی‘ بس کیجیے اور بھائی جی کی بات مان لیں۔“

اس کے لہجے میں نرم سی دھمکی تھی جسے فی الوقت مانے بغیر اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

”کدھر اتنی گرمی میں لور لور کرتی آ رہی ہے‘ کہاں گئی تھی اتنی شکر دوپہر میں؟“

شمع نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر فکرمندی سے پوچھا۔ اس کی حالت ہی اتنی ابتر ہو رہی تھی بلکہ وہ تو پچھلے تین دنوں سے حال بے حال پھر رہی تھی۔ پہلے تو شمع طنزیہ جملے کس کس کے اسے بولنے پہ اکساتی رہی‘ پھر خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ جو بھی تھی‘ جیسی بھی تھی‘ بہرحال ماں تو تھی۔

بھری دوپہر میں اڑی ہوئی رنگت‘ پسینے پسینے ہوتے جسم اور پپڑی ہوتے ہونٹ لے کر وہ گھر میں داخل ہوئی تو شمع کے دل کو وسوسے ستانے لگے۔

”بیٹھ ادھر۔۔۔ لگتا ہے لو لگ گئی ہے۔ لے شربت پی۔“ اس نے پنکھے کے نیچے بٹھاتے ہوئے اپنے دوپٹے سے اس کا پسینہ صاف کرتے ہوئے شربت کا گلاس تھمانا چاہا مگر اس کے ہاتھ نہ اٹھے۔

”امی! میرا۔۔۔ میرے لیے کون سا رشتہ آیا ہے؟“

”ہیں۔۔۔؟ رشتہ۔۔۔؟“ اس غیرمتوقع سوال پہ وہ حیران رہ گئی۔

”ہاں‘ اس دن خود تو کہہ رہی تھی کہ میرے لیے ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔“

”ہاں وہ۔۔۔“ شمع کو اصغر کی پیشکش یاد آ گئی۔

”میری وہاں شادی کرا دو۔“

”کیا کہہ رہی ہو رانی؟“

”کل کروا دو۔۔۔ چاہے ابھی۔۔۔ اسی وقت۔“

”ہوش میں تو ہے تو۔“ شمع نے اسے جھنجوڑا۔

”ہاں‘ اب تو آیا ہے ہوش۔ میں بہت ہلکی ہوں میری ماں! شہتیر کے ٹوٹے چھلکے کی طرح ہلکی۔۔۔ مجھے بھاری کر دو‘ کسی ایک کا کر دو مجھے‘ ورنہ میں خود کو مار لوں گی۔“

”پاگل نہ بن رانی! ہاں ہاں کر دوں گی شادی‘ کر دوں گی۔ تو آرام کر‘ تیری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ اس نے ریتا کو

لٹانا چاہا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی۔ میری شادی کر دو ورنہ۔۔۔ ورنہ میں مار ڈالوں گی خود کو۔“

اس نے سامنے رکھا سیب کاٹنے والا چاقو اٹھا لیا۔

◆ ◆ ◆

اصغر گاڑی میں نہیں‘ گویا ہوائی جہاز میں بیٹھ کے جا رہا تھا۔ تیس منٹ کا راستہ اس نے پندرہ منٹ میں طے کیا اور دوڑتا ہوا‘ کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر تک پہنچا۔

کال بیل پہ رکھی اس کی انگلی باقاعدہ مرتعش تھی۔ وہ اپنے ہیجان کو کنٹرول نہیں کر پا رہا تھا۔

تیسری بیل پہ دروازہ کھلتے ہی شمع کا ستا ہوا چہرہ نظر آیا۔

”میں۔۔۔ میں آ گیا۔“ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے کہا تو سامنے کھڑی شمع کا چہرہ بجھتا ہوا محسوس ہوا۔

”مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟“

مگر کوئی بھی جواب دینے کے بجائے وہ ذرا سا پرے ہٹ کر اسے راستہ دینے لگی۔

”بیٹھو‘ رانی کو بلاتی ہوں۔“ وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کے خود نکل گئی۔

اصغر بیٹھ تو گیا مگر جیسے انگاروں پہ۔۔۔ اسے اک پل چین نہ تھا۔ بار بار پہلو بدلتے ہوئے‘ کانٹے اگے حلق کو تر کرتے ہوئے‘ بے چینی سے کبھی دروازے تو کبھی گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے وہ بیک وقت اضطراب اور بے پناہ مسرت کا شکار لگ رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت تب سے تھی‘ جب سے اس نے شمع کو فون پہ یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔

”رانی تم سے شادی کرنے پہ تیار ہے اور یہ شادی جلد سے جلد کرنا چاہتی ہے۔ تم انتظام کر لو اور۔۔۔ اور یہاں آ جاؤ۔“

آخری الفاظ اس نے قدرے اٹک کر اور بجھے دل کے ساتھ کہے تھے جو اسے صاف محسوس تو ہوئے مگر وہ اس پہ غور کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ فی الحال تو اسے بلیوں اچھلتے دل کو قابو کرنا تھا‘ خود کو یہ یقین دلانا تھا کہ وہ واقعی اتنا خوش قسمت ہے۔ اس کے بعد اس نے یہاں پہنچنے میں دیر نہیں کی تھی۔

”مگر یہ۔۔۔ یہ ریتا پتہ نہیں کیوں اتنی دیر لگا رہی ہے۔“ وہ اٹھ کے ٹہلنے لگا۔ بس نہ چل رہا تھا کہ یہاں سے نکل کر خود ریتا کے کمرے میں پہنچ جائے اور اس کے چرنوں میں بیٹھ کے اس مہربانی کا شکریہ ادا کرے۔

”دروازہ کھول رانی۔۔۔! وہ آ گیا ہے۔“ شمع نے مری مری آواز کے ساتھ کہتے ہوئے مری مری سی دستک اس کے کمرے کے بند دروازے پہ دی۔

”اکیلا؟“ صبح سے دی گئی ہر دستک اور پکار کے جواب میں پہلی بار اس کی آواز سنائی دی گئی جس پہ شمع کی جھنجلاہٹ ایک بار پھر عود کر آئی۔

”نہیں تو کیا جج لے کر آتا؟ تیرے جیسیوں کو دولہے مل جائیں‘ وہی نصیب کی بات ہے‘ بارات کہاں سے آنی ہے۔ چل آ اب باہر نکل‘ اندر بیٹھا ہے وہ۔“

”اکیلا کیوں آیا ہے؟ مولوی کہاں ہے نکاح پڑھانے والا؟ اس سے کہو واپس جائے‘ نکاح خواں اور گواہوں کے ساتھ واپس آئے۔“

”پاگل ہو گئی ہے۔“ شمع کا دماغ پھر اسی طرح گھوما جیسے اس کے منہ سے پہلی بار شادی کی خواہش سن کر گھوما تھا۔

”بچوں کا کھیل نہیں ہے شادی‘ جو بیٹھے بٹھائے تیرے تالی بجا دینے سے ہو جائے۔ پہلے باہر نکل‘ اس سے مل‘ بات چیت کر۔ جو طے کرنا ہے‘ کر لے۔ بعد میں سر پکڑ کے رونا نہ پڑے۔“

”سودے بازی کا خیال دل سے نکال دو‘ ورنہ کہیں تمہیں سر پکڑ کے رونا نہ پڑے۔“ ریتا کی سرد آواز ابھری۔

"یہ تو دیکھ لیا ہوگا کہ مجھے موت سے اب ڈر نہیں لگتا۔ اگر وہ زندگی نہ ملی جس کی مجھے خواہش ہے تو ہنستے ہنستے زہر پی لوں گی۔ دھمکی یہ نہیں ہے کیونکہ میری شادی ہو یا موت، دونوں تمہارے لیے ایک برابر ہیں۔ دونوں صورتوں میں تمہارے ہاتھ سے گئی۔ اسی لیے مرنے مارنے کی دھمکی کو تم خاطر میں لانے والی نہیں۔ یہ میں جانتی ہوں۔ دھمکی یہ ہے کہ اگر میں مری تو اپنی موت تمہارے سر ڈال کے مروں گی۔ بڑی سڑتی رہنا جیل میں۔"

"مرن جوگی۔ اولاد ہے یا دشمن۔" شمع کلس کے بولی۔ "کون سے جنم کا بدلہ لینے پہ تلی ہے۔"

"میرے جنم کا۔" رینا نے اسی زہر بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے جنم دے کر تم نے ہی اس دشمنی کا آغاز کیا تھا۔ مجھے نہ اس سے ملنا ہے، نہ کچھ طے کرنا ہے۔ سوائے اس کے کہ چھپ کے نہیں رہوں گی، کسی درشتہ کی طرح۔ اپنے گھر میں، اپنے سگوں کے ساتھ رہے۔ جاؤ کہہ دو۔"

اس نے آخری الفاظ چلا کے کہے اور اس کے ساتھ ہی کوئی چیز اٹھا کے دروازے پہ ماری۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھے اصغر نے بلند آواز میں کہے یہ آخری الفاظ "جاؤ کہہ دو" بھی سنے اور اس دھماکے کی آواز بھی سنی۔ وہ بے ساختہ اچھل گیا۔ بے یقینی کا شکار اس کا دل مختلف وسوسوں میں گھر گیا۔

"کہیں اس نے انکار تو نہیں کردیا؟ مجھے جانے کا تو نہیں کہہ رہی؟"

اس کے یہ اندیشے مزید مستحکم ہوئے۔ جب اس نے اندر سے آتی شمع کی روئی روئی آنکھوں کو دیکھا۔

"تم ابھی جاؤ اور۔۔۔"

"مگر آپ نے ہی کہا تھا کہ میں فوراً پہنچوں۔ آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا چاہتی ہیں۔"

وہ بات کاٹ کے احتجاجاً بولا۔

"ہاں تو شادی کیا میں کراؤں گی؟" شمع نے سارا غصہ اس پہ نکالنا چاہا۔ "کیسے احمق انسان ہو۔ نہ نکاح خواں، نہ گواہ، نہ وکیل، نہ سہرا، نہ ہار پھول، نہ شادی کا جوڑا، نہ کوئی زیور۔۔۔ نکاح پڑھوانے آئے ہو یا میرے چنے پڑھنے؟"

اس کا تنکتا ہوا انداز بھی اصغر کو برا نہ لگا بلکہ اسے تو جیسے کسی نے حیات نو کی نوید سنادی ہو۔

وہ پھر سے جی اٹھنے والوں جیسا ہو گیا۔

دل چاہا ابھی اس عورت کے آگے جھک جائے جو دنیا جہاں کا تنفر آنکھوں میں لیے اسے دیکھ رہی تھی اور کیوں نہ دیکھتی، اس کی عمر بھر کا سہارا وہ پل میں سمیٹ کر چل دینے والا ہے۔

"میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔"

"ایک منٹ" شمع نے اسے روکا۔ رینا نے کسی بھی قسم کی سودے بازی سے منع کیا تھا لیکن اس کے سارے مطالبے اور شرطیں ماننے کی پابند نہیں تھی۔ ماں وہ تھی یا یہ؟

"رانی بھگائی ہوئی لڑکیوں کی طرح نہیں رہے گی۔ میں اسے شان سے رخصت کر رہی ہوں اور تم اسے شان کے ساتھ ہی اپنے گھر لے کر جاؤ گے۔"

یہ کڑی شرط سن کر ایک لحظے کے لیے اصغر کے قدم لڑکھڑا گئے۔

"کیوں، بس اتنا ہی حوصلہ ہے؟" شمع سے اس کی بدلتی کیفیت چھپ نہ سکی اور اس نے طنزاً کہا۔ "ٹھنڈا پڑ گیا عشق؟ منظور ہے تو جلدی بولو، ورنہ بہت سے کھڑے ہیں لائن میں۔ جو دل والے بھی ہیں، پیسے والے بھی اور ہمت والے بھی، سمجھے۔"

"وہ میرے ساتھ میرے گھر میں رہے گی۔" اصغر نے فوراً یہ دعوا کیا۔

"جسے اعتراض ہوگا، وہ خود گھر سے نکل جائے گا۔ یہ گھر میری وجہ سے چل رہا ہے، سارا کاروبار میرے ہاتھ میں ہے۔ کسی کی مجال نہیں جو میری یا میری بیوی کی جانب ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے۔"

"ہوں۔۔۔ اور حق مہر بھی میری مرضی کا۔" اس نے دوسرا پتہ پھینکا۔

"جتنا مرضی لکھوالیں۔" اصغر نے سینہ پھلا کے کہا۔ اس وقت وہ کچھ بھی ماننے یا کرنے کو تیار تھا۔

دستخطوں کے کڑے حق مہر سے وہ گھبرائے جس کا چھوڑنے کا ارادہ ہو۔ میرا تو جو کچھ ہے، سب رینا کا ہے۔ چاہے جس کاغذ پہ بھی دستخط کروالو۔"

اب وہ قدرے مطمئن ہوئی۔

مکرم باجوہ اسے فتح کیے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

اس لشکر کا سپہ سالار وہ خود تھا جبکہ مطمئن چہرہ لیے اس کا بوڑھا باپ اور فاتحانہ چمک لیے ہوئے اس کی بیوی اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے، جیسے کسی مفتوح کو نرغے میں لیے ہوں یا اسے یرغمال بنا کے لے جا رہے ہوں۔

جعفر محمود کے چہرے پہ سنگلاخ سنجیدگی تھی۔ وہ تقریباً سارے رستے خاموش رہا تھا۔ اس کے والد نے اور بہنوئی مکرم باجوہ نے تو اسے مخاطب تک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، البتہ مدیحہ گاہے بہ گاہے اسے بولنے پہ اکساتی رہی تھی۔ کبھی کسی بچے کے متعلق بات کی، کبھی چائے پانی کے بارے میں پوچھ کے۔ جن کا ردعمل بے زاری اور سرسری سی دلچسپی کے ساتھ ظاہر کرتا رہا۔ علاوہ ہوں ہاں کے اس نے زیادہ بات کرنا گوارا نہ کیا۔ وہ تو یہ بھی نہ کرتا اگر مکرم باجوہ اگلی سیٹ پہ اور پچھلی سیٹ پہ، دائیں جانب کندھے سے کندھا جوڑ کے اس کا باپ نہ بیٹھا ہوتا۔

"میرا کیریر۔۔۔ میری جاب۔۔۔ سب ختم ہوگیا۔ اب عمر بھر ان لوگوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کے جینا ہوگا۔ آغاز تو ہو ہی چکا ہے، مجھ سے استعفیٰ پہ دستخط کروائے گئے۔ یہ شہر چھڑوایا۔ اب واپس لے جا کے نظربند کردیں گے اور شاید زبردستی زمینداری بھی کروائی جائے۔ کیا میری غلطی اتنی بڑی تھی کہ مجھ سے اپنی زندگی خود جینے کا حق چھین لیا جائے۔ میری تعلیم، میری قابلیت سب رل جائے گی۔ یہ تعلیم میں نے سرکاری عہدے، سبز پلیٹ والی گاڑی اور پوزیشن کے لیے ہی تو حاصل کی تھی۔"

اسے رہ رہ کے رینا اور سومیہ کے چہرے یاد آرہے تھے پھر یہ چہرے آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔

اور مل کے ایک عفریت کا روپ دھار لیا۔

ایک ایسا عفریت جس نے اس کی شخصیت کے اعتبار، اپنوں کے اعتماد، بھرم، عزت اور ساکھ سب کو نگل لیا تھا۔

"بچیاں بہت خوش ہوں گی، جب انہیں یہ پتہ چلے گا کہ آپ اب ہمیشہ ان کے پاس رہیں گے۔"

مدیحہ نے ہلکی سی سرگوشی کے ساتھ کہا۔

"جب سے پیدا ہوئی ہیں، کسی مہمان کی طرح آپ کا انتظار کرتی رہی ہیں۔ مہینے میں ایک بار ہوا کی طرح آئے اور چلے گئے۔ اچھا ہوا! اب وہ بڑی اور سمجھ دار ہو رہی ہیں۔ باپ کا سر پہ ہروقت موجود ہونا بھی ضروری ہے۔"

اس کی سنجیدگی اور مدبرانہ انداز سے جعفر محمود کو جی بھر کے کوفت اور بے زاری محسوس ہوئی۔ اس کا جی چاہا، چلتی گاڑی سے چھلانگ مار دے اور عمر بھر، دن رات، حاوی رہنے والی اس بور اور خشک ترین عورت سے تو چھٹکارا مل جائے۔ اسے عورت کے اس بے رنگ روپ سے شدید چڑ تھی۔

اور اب اسے پتہ نہیں کب تک اسی بے رنگی کو سینے سے لگا کر جینا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ پلیٹ میں کیا ڈھک کے رکھا ہے؟"

نصرت کی تیز نگاہوں سے بھلا کیا چھپتا تھا اور منزہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ڈھکن اتار کے دیکھا۔

چھوٹی سی پلیٹ میں بھنے ہوئے گوشت کی دو بوٹیاں تھیں۔

"سوہا کے لیے ہے۔۔۔ وہ کریلے نہیں کھاتی نا!" اس سے پہلے کہ نصرت پلٹ کے اسے گھورتی وہ فوراً وضاحت دینے لگی۔

"تو کھلاؤ۔۔۔ اتنے نخروں کا عادی کیوں بنا رہی ہو۔" ماں سے پہلے بیٹی نے جواب دیا۔

پتہ نہیں یہ ماں بیٹی ایک دوسرے کا سایہ کیوں بنی رہتی تھیں۔ جہاں شمیم ہوتی، وہیں نصرت کھنچی کھنچی آتی اور نصرت کا دم چھلا بن کے شمیم ساتھ چپکی رہتی۔ ابھی بھی ماں کو کچن کا رخ کرتے دیکھ کے وہ بھی ٹی وی پہ چل رہا دلچسپ پروگرام فوراً چھوڑ کے پیچھے چلی آئی۔

"ہانڈی بے برکتی ہوجاتی ہے۔ تمہاری ماں نے تمہیں اتنا بھی نہیں بتایا کہ پکتی ہانڈی میں سے کچھ نہیں نکالنا چاہیے۔ توبہ... ابھی سے بچوں کو سر چڑھا رکھا ہے۔"

شمیم پلیٹ اٹھا کے کڑاہی میں الٹنے لگی جس میں منزہ کریلے گوشت بھون رہی تھی۔ اس کی کیا مجال تھی کہ وہ اس کا ہاتھ روک پاتی یا ٹوک دیتی۔ اسے اس کے سارے نخرے یاد دلاتی، البتہ نصرت نے بڑے آرام سے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"چل رہن دے۔ خوامخواہ بچی بھوکی رہے گی۔ دو ڈھائی سال کی بچی سے کہاں کھائے جاتے ہیں کریلے۔"

منزہ کو حیرت ہوئی مگر زیادہ نہیں کیونکہ نصرت بہرحال سوہا کی دادی تھی۔ منزہ سے اسے بھلے ہی خدا واسطے کا بیر ہو اور وہ بے شک کبھی کبھی اسی کو کلسانے کے لیے سوہا کو بھی برا بھلا کہہ ڈالتی تھی مگر محبت تو تھی اسے اپنے بیٹے کے خون سے جس کا بے ساختہ اظہار اکثر و بیشتر اس کی مختلف حرکتوں سے ہوجاتا تھا۔ سو سو احسان جتاتے ہوئے، باتیں دھرتے ہوئے بھی وہ پوتی کو سنبھال لیتی تھی۔ جب منزہ کے کاموں میں مصروف ہوتی۔

جو تھوڑی بہت حیرت منزہ کو ہوئی، وہ اس بات پہ تھی کہ نصرت نے آخر نک چڑھی بیٹی کے سامنے یہ حمایت کیسے کرلی۔

"دنیا سے نرالی بچی نہیں ہے۔" نصرت کو واقعی ماں کا اپنی پوتی کے لیے دلار پسند نہ آیا۔ اس نے آج تک اپنے دل میں اس ننھی پیاری سی بچی کے لیے وہ محبت محسوس نہ کی تھی، جو پھوپھیوں کے دل میں ہوا کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو منزہ کو اس کے عورت ہونے پہ شبہ ہونے لگتا تھا۔ بھلا کوئی عورت اتنے پیارے معصوم سے بچے کو ایک نظر بھر کے بھی پیار سے نہ دیکھے تو حیرت ہی ہوگی۔

"اور کیا پتہ سوہا کے لیے نکال کے رکھی ہے یا اپنی زبان کا چسکہ پورا کرنے کے لیے۔ امی! آپ بھی ہر کسی کی ڈرامے بازی میں آجاتی ہیں۔"

اس بار اس کی شرانگیزی کام کرگئی۔

نصرت نے پلیٹ اٹھائی اور اسے جتایا۔

"سوہا کو میرے پیارے بھتیجے میں کھلاتی ہوں اسے۔ ویسے اس کی شکل سے تو نہیں لگتا کہ اس نے کبھی گوشت یا پھل کھایا ہوگا۔ ڈھائی سال سے اوپر ہورہی ہے مگر وہی ہاتھ بھر کی۔ جیسی ماں ہوئی ویسی بیٹی، ورنہ میرے خاندان کی تو صحت اور حسن ہی دیکھنے لائق ہوتا ہے کیونکہ میں نے بچوں کو اپنے منہ کا نوالہ بھی کھلایا ہے لیکن جن بچوں کی ماؤں کا اپنا پیٹ نہ بھرتا ہو اور جو بچوں کا نام لے کر خود سب ہضم کر جائیں، وہ کیا بڑھیں پھلیں گے۔"

وہ حسب عادت دل دکھانے والی باتیں کرکے، پلیٹ اٹھا کے باہر چل دی۔

منزہ اتنے سالوں سے یہ سب سن سن کر بھی عادی نہ ہوپائی تھی۔ ہر بار اس کا دل نئے سرے سے دکھ جاتا، ہر بار ہی اس کی آنکھیں اس بے عزتی سے جھلملا اٹھتیں۔ اس نے پورا دھیان ہنڈیا بھوننے کی جانب لگانے کی کوشش کی لیکن باہر سے آتی ماں بیٹی کی گفتگو بار بار دھیان ہٹا دیتی۔

"دیکھو تو بچی کی شکل کیا نکل آئی ہے؟ کچھ کھاتی پیتی ہو تو لگے اور لگے تو نظر بھی آئے۔"

"چھوڑو بھی امی! ماں پہ پڑی ہے یہ۔ رونی غریب صورت، سوکھی سڑی۔"

"ماں کو تو فاقے سکھا گئے، یہ تو ماشاءاللہ سے کھاتے پیتے لوگوں کا خون ہے۔ سیٹھ کی پوتی، سیٹھ کی بھتیجی۔"

"مگر سیٹھ کی بیٹی تو نہیں ہے۔" نصرت کو سیٹھانی کہلوانے کا بڑا شوق تھا۔ فرمائش کرکے اس نے گھر کے باہر نیم پلیٹ پہ اپنے شوہر کے نام کے آگے لفظ "سیٹھ" کندہ کرایا تھا۔

"باپ تو اس کا ملازم ہی ہے نا!"

"ملازم کیوں ہونے لگا؟ باؤ ہے باؤ... افسر لگا ہے میرا مظہر۔"

آج نصرت کے دل میں نجانے کہاں سے بیٹے کی بھولی بسری محبت نے جوش مارا، ورنہ منزہ سے شادی کے جرم میں وہ ہر وقت اس کے خلاف محاذ کھولے رہتی تھی۔ یہ سن کر شمیم تنک گئی۔

"ونہہ افسر، جورو کا غلام ہے اور وہ جو دوسرا سیٹھ بنا پھرتا ہے اسے دیکھنا، زن مریدی کے سارے ریکارڈ توڑے گا۔ ابھی سے اس طوائف زادی کے عشق میں آنکھیں ماتھے پہ رکھ لی ہیں۔"

"مجھے آنکھیں واپس لانی بھی آتی ہیں۔ تو فکر نہ کر۔"

"فکر کیسے نہ کروں۔ دیکھا نہیں، کیسے اس دن تن کے اعلان کیا تھا اس نے کہ مجھے شادی کرنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔"

"اجازت تو کیا اسے شادی کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔"

"ان خیالوں میں نہ رہنا امی! وہ بھلا رہے گا شادی کے بغیر؟ یہ بیٹیاں ہوتی ہیں جو ماں باپ کی عزت سمیٹے دہلیز پہ بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ اسے کسی کا کیا ڈر یا خوف۔"

موقع ملتے ہی وہ اپنی شادی نہ ہونے کا گلہ ضرور کردیتی تھی۔

"تو ابھی تک اپنی ماں سے واقف ہی نہیں ہے۔ میں اتنے آرام سے بیٹھنے والی نہیں۔ غضب خدا کا، ناچنے گانے والی ادھر کی مالکن بن کے آجائے، کیا یہ میں ہونے دوں گی۔"

"تب تو اصغر کے سامنے فوراً دب گئی تھیں۔"

"تو کیا اینٹ اٹھا لیتی، وقت کی نزاکت بھی دیکھنی ہوتی ہے۔ وہ اس دو ٹکے کی چھوکری کے پیچھے پاگل ہورہا ہے۔ دیکھا نہیں، مظہر کی مخالفت کرنے پہ کیسا مرنے مارنے پہ تلا بیٹھا تھا۔ مجھے بیٹا ہاتھ سے نہیں گنوانا۔ اوپر سے میٹھی بن کے اس کے اندر کا عشق زہر کرنا ہے اور اس کے لیے بڑا اچھا توڑ سوچا ہے۔"

"وہ کیا؟" شمیم نے دلچسپی لی تو نہ چاہتے ہوئے بھی منزہ تک ہاتھ روک کے غور سے سننے لگی۔

"اپنے شاہ جی۔" نصرت نے آواز دبا کے کہا۔

"ایسے تگڑے اور ظالم تعویذ لاؤں گی، سارا عشق ہرن ہوجائے گا۔"

"شاہ جی کے تعویذ ابھی تک مظہر کا عشق تو ہرن نہ کرسکے۔" شمیم کے انداز میں مایوسی تھی۔

"وہ تو تعویذ ہی ہلکے والے تھے۔ یہ غریبن میرا لیتی ہی کیا ہے، پڑی رہے کونے میں۔ صرف اس کی زبان بندی کے تعویذ لیے تھے شاہ جی سے اور دیکھ لو، کتنا اثر ہے۔ کچھ بھی کہہ لو، اس کے منہ میں پڑی چمڑے کی زبان ہلتی تک نہیں۔ اس سے بھاری تعویذ میں خود ہی نہیں لیتی اس کے لیے... ترس آجاتا ہے۔"

بڑی شان سے اپنی نرم دلی اور خدا ترسی کا مظاہرہ کیا گیا۔

"لیکن وہ بدمعاش عورت... وہ ناچنے گانے والی بے حیا... اس کے ساتھ تو جو کرو وہ کم ہے۔ تین دن کے اندر اندر گھل کے ختم نہ ہوگئی تو بے شک نام بدل دینا۔"

"تین دن؟"

"شاہ جی تو دشمن کا نام و نشان تین گھنٹوں میں بھی مٹا دیں۔ اتنا علم ہے ان کا لیکن فیس بھی اتنی ہی ہوتی ہے، جتنا جلدی کا کام کراؤ۔"

"ہائے امی! چار پیسے زیادہ خرچ کرلو مگر یہ قصہ جلدی ختم کرو۔ تین دنوں میں تو کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔"

شمیم کو ریتا کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹانے کی زیادہ ہی جلدی تھی، اس لیے بے تابی سے بولی۔

"وہ بدقماش عورت یہاں آگئی تو ہمارا تو سمجھو بوریا بستر گول... ایسی گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی عورتیں ہم جیسی سیدھی سادی گھریلو عورتوں کو منٹ میں کونے لگا دیتی ہیں۔"

"وہ کیا کونے میں لگائے گی' میں اسے قبر میں پہنچا دوں گی۔ تین دنوں کی تو بات ہے' تو کیوں فکر کرتی ہے۔"
نصرت کو اپنے شاہ جی اور ان کے تین دنوں میں بندہ ٹھکانے لگا دینے والے زود اثر تعویذ پہ حد سے زیادہ اعتماد تھا
لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ تین دن بعد وہ جس وجود کو قبر میں سلانے کے عزم کا اظہار کر رہی تھی' وہ اس وقت اس کے گھر کی دہلیز پہ کھڑا تھا۔

"یہ تو اصغر کی گاڑی کا ہارن لگتا ہے۔"
شمیم پھلوں کے چھلکے سمیٹنے لگی۔ سارا دن کھاتے پیتے رہنے کے باوجود وہ سب پہ یہی ظاہر کرنا پسند کرتی تھی کہ اس کی خوراک چڑیا جتنی ہے۔ صوفے کے نیچے پھلوں والی ٹرے کھسکانے کے بعد وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ اتنی دیر میں تین بار کال بیل بجائی جا چکی تھی۔

"خیر تو ہے..... ایک تو آج شام سے بھی پہلے گھر واپس آ گیا ہے' اوپر سے کبھی ہارن تو کبھی بیلیں....."
نصرت' سوہا کے منہ میں آخری نوالہ ڈالنے کے بعد گردن اونچی کر کے دیکھنے لگی۔
شمیم نے دروازہ کھولا تو سامنے اصغر کے بجائے ایک سجی سجائی دلہن کو پایا۔
وہ بڑی طرح ٹھٹک کے وہیں جم گئی۔
جبکہ دوسری جانب سے کمال کی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ دلہن اسے کسی بے جان اور بے کار چیز کی طرح ایک طرف ہٹاتی آگے بڑھی۔ اب چونکنے اور ہڑبڑا کے اٹھنے کی باری نصرت کی تھی۔
وہ اپنے سنگھار' لباس اور زیورات کی وجہ سے ضرور دلہن لگ رہی تھی لیکن اس میں دلہنوں والی کوئی بات نہیں تھی۔

نہ اس کے چہرے پہ حیا کے رنگ تھے۔
نہ اس کے قدموں میں جھجک تھی۔
نہ اس کے روپ میں خوشی اور سرشاری جھلک رہی تھی۔
اس کے برعکس وہ اندر آتے ہی بڑے مالکانہ تاثر اور ناقدانہ انداز میں ان دونوں اور گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کون ہے تو؟" نصرت کا دل چیخ چیخ کر اس آنے والی آفت کا تعارف کرا رہا تھا مگر وہ جھٹلاتے ہوئے کڑک کر اس سے پوچھ رہی تھی۔
"تمہاری چھوٹی بہو رینا!"
اصغر نے اندر داخل ہوتے ہوئے جواب دیا اور رینا جو اپنی تمام تر بے خوفی کے باوجود اس کڑک دار لہجے سے خائف ہو چلی تھی' مسکرا کے اس کے بازو میں ہاتھ ڈال کے کھڑی ہو گئی۔ اس کے اس بے ساختہ عمل سے جہاں اصغر نے خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کیا کہ سارے راستے وہ اس کی بے گانگی سے مایوس ہی ہوتا آ رہا تھا' وہیں خود رینا کو بھی اپنی ذات کی مضبوطی کا احساس ہوا۔
"غارت ہو ایسی راہ چلتی بدمعاش بہو پر۔" نصرت ہوش میں آئی اور آتے ہی سینہ کوبی شروع کر دی۔
"اندر آنے کی ہمت کیسے کی اس نے۔ یہ شریفوں کا گھر ہے' ایک قدم بھی اور بڑھایا اس نے تو وہ جوتے لگاؤں گی' وہ جوتے لگاؤں گی...!"
"بس امی...! بہت ہو گیا۔ یہ کون سا انداز ہے نئی دلہن کے استقبال کا؟" اصغر نے ناگواری سے کہا۔
"کیسی نئی دلہن' کون سی نئی دلہن۔" وہ ہاتھ نچا کر پوچھنے لگی۔
"تجھ سے پہلے نجانے کتنوں کی دلہن بن چکی ہو گی۔"
"اونہہ..... وہ بھی..... دلہن ایک رات کی۔" شمیم نے خاصا چبا کے کہتے ہوئے اپنا فلمی اسٹائل گھسیڑا' جو اب تک خاموش کھڑی رینا کو جھلسا کے رکھ گیا۔

زمانے بھر کا غبار تو اس کے اندر پہلے ہی بھرا تھا' ہو گئی شروع۔ اس نے وہ وہ زبان استعمال کی..... جو پیڑھی سے اپنی ماں کے قبیل کی مختلف آنٹیوں' نانیوں سے سنی وہ گالیاں اس تواتر سے استعمال کیں جو اس کے خاندان میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ نصرت جیسی اول درجے کی بدزبان عورت بھی انگلیاں دانتوں تلے دبانے پہ مجبور ہو گئی۔
اور اپنے کمرے میں دبک کے بیٹھی منزہ نے تو استغفار اور لاحول پڑھتے ہوئے بے ساختہ دونوں کانوں کو ہتھیلیوں سے ڈھانپ دیا۔
سوہا کو وہ پہلے ہی ٹی وی پہ کارٹون لگا کے دے چکی تھی تاکہ اس کا دھیان باہر کی جانب نہ جائے۔ اس کے باوجود بچی ہر ایک منٹ بعد باہر سے آتے ہنگامے پہ چونک چونک جاتی اور ماں کی جانب حیران سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتی۔
"اللہ! یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی ہائے۔"
شمیم نے ذرا جو رینا کو تھم کے سانس لیتے دیکھا تو واویلا مچا دیا۔
"یہ بازاری عورت میرے بھائی کے سامنے مجھے واہیات گالیاں دے رہی ہے۔ میری عزت نجانے کس کس چوبارے پہ رول رہی ہے' کس کس بدذات کے ساتھ مجھے نتھی کر رہی ہے اور یہ بے غیرت' ایسے ہوتے ہیں بھائی..... جو بہن کی درگت بنتے چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے ہیں۔"
"اس کی آنکھوں میں جادو کی سلائی پھیر دی ہے اس کٹنی نے' ورنہ بوتھا دیکھ اس کا' کوئی حسن پری بھی نہیں ہے۔ اس کا تو مجرا دیکھنے کے لیے آنے والے پیسہ نچھاور کرنے کے بجائے الٹا لیتے ہوں گے اس سے۔ ایک میرا ہی بیٹا' الو کا پٹھا نکلا جو اس کو سر پہ بٹھا کے لے آیا۔"
اب واویلا کرنے کی باری رینا کی تھی۔ اپنے وہ سارے قیمتی زیورات نوچ نوچ کے پھینک دیے' جو اصغر شمع کے شارٹ نوٹس پہ خرید کے لایا تھا۔ اس کی ڈرامے بازی دیکھ کے وہ ماں بیٹی بھی دنگ رہ گئیں۔ بھلے کتنی ہی تیز طرار رہ چکی ہوں مگر ایک بازاری عورت کے پینترے اور رنگ ڈھنگ سے مقابلہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔
"اس لیے لائے تھے تم مجھے' یہ عزت کروانے کے لیے۔ تم تو کہتے تھے یہ گھر میرا ہے' اس کی ہر چیز پہ میرا اختیار ہو گا اور یہاں تو مجھے قدم آگے بڑھانے کی اجازت نہیں مل رہی۔ جھوٹے..... چار سو بیس..... فراڈی...!"
وہ اس طرح حلق پھاڑ رہی تھی کہ باوجود اس کے کہ اس علاقے میں بنے کنالوں کے رقبے پہ پھیلے بنگلے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پہ تھے پھر بھی اس کی آواز کم از کم آس پاس کے چار چار گھروں تک تو ضرور پہنچی ہو گی۔
"اس کا دماغ کیوں خراب کر رہی ہے' مجھ سے بات کر۔"
"تم سے بات کرنا اپنی جوتی اپنے سر مارنا ہے۔"
"اری چل..... دفعان ہو..... یہاں میں نے تیرے لیے قبر نہیں کھود رکھی جو دندناتی ہوئی گھس آئی ہے۔"
"یا اللہ....." منزہ کانوں پہ ہاتھ رکھے رکھے تھک گئی۔ یہ آوازیں تھیں کہ پردے پھاڑ کے اندر گھسی چلی آ رہی تھیں۔ نہ یہ نئی آنے والی دیورانی ہمت ہار رہی تھی' نہ شمیم تھک رہی تھی' نہ ہی اس کی ساس کا توپ خانہ اسلحے سے خالی ہو رہا تھا۔ اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔
شام کے چھ بجنے والے تھے۔ عموماً اس وقت تک مظہر کی واپسی ہو جاتی تھی لیکن آج وہ صبح ہی بتا گیا تھا کہ کسی ضروری کام کی وجہ سے دیر سے لوٹے گا۔
"اور اگر عین اس جنگ کے موقع پہ مظہر کی انٹری ہو گئی تو....."
یہ خیال اسے لرزا گیا۔
فی الحال یہ جنگ عورتوں کے درمیان تھی اور اصغر خاموش تماشائی بنا دیکھ رہا تھا' اس لیے محض زبانی کلامی حملے ہو رہے تھے لیکن اگر مظہر آ جائے اور رینا کو دیکھ کر' اس کی ننگی زبان کے جوہر سن کر بپھر جائے..... پھر دونوں بھائی

گھتم گتھا ہو جائیں گے۔ منزہ یہ نوبت نہیں آنے دینا چاہتی تھی اس لیے اس نے فوری طور پہ ایک فیصلہ کیا۔

اپنے، سوہا کے اور مظہر کے دو دو جوڑے بیگ میں ٹھونسے۔ بچی کی چند مزید ضروری چیزیں رکھیں اور کمرے سے نکل آئی۔ اس کا میکہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ رکشے میں جانے پر زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگتے اور راستہ بھی سنسان نہیں تھا اس لیے اسے شام کے وقت اکیلے نکلتے میں جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ مظہر نے اسے اتنی محبت اور اعتماد بخش رکھا تھا کہ اسے شوہر سے اجازت لینے جیسے تکلفات کی بھی خاص ضرورت نہ تھی نہ ہی یہ خوف کہ وہ اس سے بازپرس کرے گا۔ اصل اور کڑا مرحلہ یہاں سے نکلنے کا تھا۔ ریتا کی وجہ سے آیا جلال نصرت اس پہ بھی الٹ سکتی تھی لیکن وہ جو کر رہی تھی گھر کی بہتری کے لیے کر رہی تھی۔

اس وقت گھر کا ماحول ایسا ہرگز نہیں تھا کہ مظہر جیسا لوز ٹمپر شخص مداخلت کرتا۔ وہ معاملہ سلجھانے والوں سے نہیں بگاڑنے والوں میں سے تھا۔ ایک بیوی ہونے کے ناتے وہ اپنے شوہر کی تمام اچھائیوں اور برائیوں سے واقف تھی۔ گھر میں دونوں بھائیوں کے درمیان مار پیٹ ہوتی نتیجے کے طور پہ بیوی کے عشق میں ڈوبا اصغر اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے انہیں گھر سے نکلنے کا حکم دے۔ اس سے کہیں بہتر تھا کہ وہ ساس کی چار باتیں سن لے مگر نہ صرف خود یہاں سے چلی جائے بلکہ مظہر کو ایک دو دن یہاں سے دور رکھے۔ معاملہ ٹھنڈا ہونے کے بعد وہ یہاں آئے۔

"لو! ایک اور آگئی۔ اندر اور کتنی دبا رکھی ہیں؟"

ریتا نے اسے کینہ توز نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا۔ منزہ اندر ہی اندر سمٹ کے رہ گئی۔ اسے یہ نظریں اپنے آرپار گھستے ہوئے محسوس ہوئی تھیں جس کی وجہ جاننے سے وہ قاصر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا یہ لڑکی یہاں کوئی پرانے بدلے چکانے آئی ہو۔ ساس اور نند سے اس کا معرکہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ پہل ان کی جانب سے ہوئی تھی لیکن وہ بے ضرر۔۔۔ اس نے تو کلام تک کرنے کی زحمت نہیں کی تھی پھر اس پہ حملے کا مطلب؟

"یہ میری بہو ہے، زبان سنبھال کے بات کرنا۔۔۔ شریفوں کی لڑکی ہے اور شریفوں کے گھر رہ رہی ہے۔ تیری طرح کوٹھے کی پیداوار نہیں ہے۔ ہم اپنی بہوؤں کی عزت کرنا بھی جانتے ہیں اور کروانا بھی۔ خبردار جو اس کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا کہا تو۔۔۔"

منزہ ساس کے اس بیان پہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا اس نے صرف ریتا کو بے وقعت کرنے کے لیے کہا ہے۔

"امی جان!" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

"بڑی بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، گھر سے فون آیا ہے، کیا میں چلی جاؤں، رات وہیں رکوں گی۔"

اور کوئی موقع ہوتا تو نصرت ادھیڑ کے رکھ دیتی اسے، ابھی بھی زیر لب بڑبڑا اٹھی۔

"کم بخت میکے میں رپورٹ دینے جا رہی ہے۔ پیٹ ہے بھی تو اتنا سا۔ کمر کے ساتھ لگا ہوا، کوئی بات اندر ٹکے تو کیسے۔"

لیکن فی الوقت اسے اپنا کلہ مضبوط کرنا تھا۔ اسے حمایتی درکار تھے۔ وہ اصغر اور اس کی اس بارود بھری بیوی کے خلاف اپنی ٹیم کی نفری زیادہ کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے مظہر ہی تھا جو اصغر پہ بھاری پڑ سکتا تھا۔ ابھی اس سے اور منزہ سے بنا کے رکھنے میں ہی بھلائی تھی اس لیے فوراً اجازت دے دی۔

"جاؤ جاؤ۔۔۔ دیر نہ کرو، میں فون کروں گی تمہاری بھابھی کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔"

اس بات پہ منزہ زیادہ فکرمند نہیں ہوئی کہ ان کے فون کرنے سے بھابھی کی بیماری والا جھوٹ کھل نہ جائے، اس لیے کہ وہ جانتی تھی اس کی ساس ایسا فون کبھی نہیں کرے گی۔

اجازت ملنے پہ وہ خدا کا شکر ادا کرتی وہاں سے نکلی۔

☼ ☼ ☼

"مل گئی تمہیں فرصت؟"

شمشاد بیگم نے پروین کو آتے دیکھ کے پہلا طنزیہ وار کیا۔ پروین کے قدم سست پڑ گئے۔ اس نے گھبرا کے ماں کو اشاروں ہی اشاروں میں اپنے پیچھے آتے سراج دین کے بارے میں خبردار کرنا چاہا مگر وہ کون سا انجان تھی، ہاں بے نیاز ضرور تھی، ہر مصلحت سے۔

"دے دی اجازت تمہاری ساس اور میاں نے کہ جاؤ پل بھر کو بیمار ماں کو بھی دیکھ آؤ۔ دکھی بھائی کا حال پوچھ آؤ۔" سراج دین کی پیشانی میں پڑی سلوٹوں میں یک بیک دو گنا اضافہ ہو گیا۔

"آپ میری والدہ کا نام کیوں لے رہی ہیں؟ جو کہنا ہے، مجھ سے کہیں۔ ہاں میری اجازت نہیں تھی اسے۔"

"کیوں نہیں تھی اجازت؟ میاں! تم بیٹی کے باپ نہیں ہو اس لیے لگا سکتے ہو ایسی پابندیاں۔ کوئی میرے دل سے پوچھے، اکلوتی بیٹی مہینہ مہینہ شکل نہ دکھائے اور وہ بھی ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے تو کیا گزرتی ہے۔ کیا پتھر کا کلیجہ ہے تمہارا، ماں کو بیٹی سے الگ کر رکھا ہے۔"

"ایک مہینہ تک نہ ملنے سے ماں بیٹی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہو تو کیا فائدہ ایسے رشتے کا۔" وہ بھی دوبدو بولے۔

"چھوڑیے نا، ختم کیجیے یہ بحث۔ اماں! آپ بھی بس۔۔۔ میاں صاحب کیوں پابندی لگائیں گے۔ گھر کے اور بچوں کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ کیسے نکلوں اور ایسی کوئی نئی بات بھی نہیں۔ میں ہر ہفتے میکے آنے کی عادی بھی نہیں ہوں۔ اکثر ہی مہینہ مہینہ ہو جاتا ہے۔ یہ میری اپنی روٹین ہے، آپ اس کا الزام کسی اور کو کیوں دے رہی ہیں۔"

"کیوں نہ دوں، گھر کے کام تم نے خود تو سر پہ لادے نہیں ہوں گے۔ یہ دوسروں کے طریقے ہی تو ہیں تمہیں گھر پہ قید رکھنے کے، ورنہ دوسروں کی بھی بیٹیاں ہیں۔ گھر بار والی، بال بچے والی، سسرال والی۔۔۔ ان کے گھر بھی بستے ہیں اور میکے کی رونق بھی بنی رہتی ہے پھر پہلے کی بات اور تھی۔ ساجدہ زندہ تھی، اب ہمارا کون پوچھنے والا ہے؟ میں بڈھی جان، بھائی تمہارا پریشان اور وہ ہاتھ بھر کی بچی۔ ایسے میں تم سگی ہو کے بھی مہینہ مہینہ خبر نہ لو تو کیا میں شکایت تک نہ کروں۔"

"تم شام تک رک کے شکایتیں، گلے اور شکوے سنو، شوہر اور ساس کے خلاف دل میں غبار بھرو۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔ ٹھیک شام سات بجے ہارن دوں گا، تیار رہنا۔"

سراج دین نے ساس کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے پروین سے کھردرے لہجے میں کہا اور واپسی کے لیے پلٹ گئے۔

شمشاد بیگم داماد کی پشت پہ بھی بڑبڑانے سے باز نہ آئی۔

"لو اور سنو، سات بجے کی واپسی کا آرڈر بھی دے دیا۔ نوید تو آتا ہی آٹھ بجے تک ہے۔ اب اتنے دنوں بعد آئی ہو اور بھائی سے ملے بغیر واپس چلی جاؤ گی۔ توبہ ہے، ظلم ہے، ظلم۔"

"اماں! چپ بھی کرو۔" پروین نے ہاتھ جوڑے۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے اور پھر دور جانے کا یقین ہو جانے کے بعد اس نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔

"اگر دو منٹ آپ خود پہ قابو رکھ لیں تو کیا بگڑ جائے گا آپ کا۔ پتہ بھی ہے کہ میاں صاحب مزاج کے تیز ہیں۔"

"بس کر۔۔۔ بس کر۔۔۔ میاں صاحب، میاں صاحب کر کر کے تُو نے اس کا دماغ ساتویں آسمان پہ پہنچا رکھا ہے اور میں ایسے ایسوں کے مزاج رکھتی ہوں اپنی جوتی کے نیچے۔"

"وہ آپ کے داماد ہیں۔" اس نے نزاکت کا احساس دلانا چاہا مگر بے سود۔

"تو کیا سر پہ بٹھا لوں، وہ باتیں سناتا جائے اور میں بچھتی جاؤں۔ بہت لحاظ اور عزت کر لی میں نے۔ آج صبر نہیں ہوا۔ بہت دل دکھا ہوا تھا میرا، پورا ایک مہینہ۔۔۔"

"وشمہ! کیسی ہے؟" پروین نے موضوع بدلنا چاہا۔

"آفت ہے پوری۔ چھٹانک بھر کی لونڈیا اور نتھ ڈال کے رکھ دی ہے۔ مجھے نہ دن کو چین لینے دیتی ہے' نہ رات کو آرام سے سوتی ہے۔ کبھی الٹیاں۔۔۔ کبھی پوٹیاں۔۔۔"

"ارے' بیمار ہے وہ؟"

"نہیں' بیمار کیسی؟ بخار وخار تو نہیں ہے۔ ویسے ہی دودھ ہضم نہیں ہوتا۔ یہ منحوس ڈبے کا دودھ کہیں پچتا ہے بچوں کو۔ یہ بھی پیتے ہی الٹ دیتی ہے۔ دن میں ستر دفعہ کپڑے گندے کرتی ہے' میں تو بڑی تنگ ہوں۔"

"سو رہی ہے کیا؟"

"توبہ کر' یہ سونے والی شکل ہے۔ ساتھ والوں کے ہاں بھیجا ہے۔ ان کے بچے خوش ہوتے ہیں کھیل کے۔ لے جاتے ہیں دو دو گھنٹے کے لیے۔"

"میرے بچے بھی بہن سے ملنے کے شوق میں آئے ہیں۔ لے آئیں نا اماں! شام تک یہ بھی کھیل لیں بچی سے۔"

"لے آوں گی' ابھی رہنے دو وہیں۔ نرا شور شرابا۔" وہ سخت بے زار لگ رہی تھی۔ بالآخر پروین کے بار بار کہنے پہ لے کر آئی۔

پروین بچی کا چہرہ دیکھ کے ہی دھک سے رہ گئی۔ بچی کی عمر چار ماہ ہو چکی تھی مگر چہرہ بالکل بلی کے ایک دن کے بچے کے برابر لگ رہا تھا۔ گال پچکے ہوئے' رنگت پھیکی اور آنکھیں بے جان۔ نہ ہنستی' نہ کھیلتی' نہ ہی روتی۔ وہ نحیف سی لاغر بچی منہ سے کمزور اور مری مری سی آواز نکال رہی تھی جیسے کوئی زخمی چڑیا کراہ رہی ہو۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا حال ہو گیا وشمہ کا؟ اچھی بھلی صحت مند تھی۔" پروین کے آنسو ہی تو چھلک پڑے اسے ہاتھوں میں لیتے ہوئے۔

"بن ماں کی بچی کا اور کیا حال ہوگا۔" شمشاد بیگم نے بھی زبردستی کی رقت خود پہ طاری کی۔

"صحت بنے تو کیسے' ایک تو دودھ نہیں ٹھہرتا اس کے پیٹ میں اور دوسرا یہ نہ سوتی ہے' نہ چپ کرتی ہے۔ ساری ساری رات رونا۔ دیکھو ذرا رو رو کے گلا بھی بیٹھ چکا ہے۔ اب تو آواز بھی نہیں نکل رہی رونے کی۔ اچھا تو بتا کیا کھائے گی دوپہر کو اور بچے کیا کھائیں گے شوق سے۔"

"کمال کرتی ہیں اماں! بچی اتنی بیمار ہے اور آپ۔۔۔ آپ اس قدر مطمئن اور لاپروا۔ کم از کم کسی ڈاکٹر کو تو دکھایا ہوتا؟" "لے۔۔۔ نہ بخار' نہ خسرہ۔۔۔ ڈاکٹر کے پاس کیوں لے کر جاتی۔"

"صرف بخار ہونے سے ہی تو بچے بیمار نہیں ہوتے۔ اس کا وزن اس کی عمر کے لحاظ سے آدھا بھی نہیں رہا۔ جان بالکل ختم ہو چلی ہے۔ رنگ پیلا اور۔۔۔ اور۔۔۔"

وہ اسے سینے سے لگا کر رو پڑی۔ ایک مہینے تک نہ آسکنے کا سب سے زیادہ ملال اب ہو رہا تھا۔ کوئی واضح پابندی تو نہ لگائی تھی سراج دین نے لیکن اس تلخی کے بعد وہ خود ہی اکڑ گئی اور ضد میں آ کے کتنے ہی دن میکے جانے کا نام نہ لیا۔ دل ہی دل میں کڑھتی اور جلتی رہی لیکن انتظار تھا کہ کس دن میاں صاحب کو خود خیال آتا ہے اور وہ لے جاتے ہیں۔

"یہ بوتل لگا منہ سے' شاید پی لے۔"

شمشاد بیگم نے وہی فیڈر اس کے منہ میں ٹھونسنا چاہا جو وہ ہمسایوں کے گھر سے واپس لائی تھی۔ فیڈر ڈھکن کے بغیر تھا اور اس میں موجود دو ڈھائی اونس دودھ جم کے پھٹ رہا تھا۔ پروین نے غصے میں آ کے بوتل دیوار پر دے ماری۔

"خراب دودھ دے رہی ہیں آپ اسے۔ یہ تو دیکھنے سے بھی صاف نظر آ رہا ہے اور یہ فیڈر۔۔۔ لگتا ہے جیسے کبھی ٹھیک سے دھلا ہی نہیں۔ پلاسٹک تک پیلی پڑ چکی ہے اس کی اور نپل۔۔۔ توبہ۔۔۔ بچی کی ایسی حالت نہ ہو تو اور کیا ہو۔"

اس کے بعد اس نے بچی کو لٹایا اور اس کے بدبودار کپڑے اتارنے لگی۔ سخت گرمی کے موسم میں اسے ریشمی فراک پہنایا گیا تھا جو پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ اس کی نازک جلد سرخ ہو رہی تھی۔ گردن سے بندھا رومال تھے سے اکڑا ہوا اور بدبو کے بھبکے اڑا رہا تھا۔ پیمپر اتارا تو وہ بھی غلیظ۔ ننھی ریشز سے بچی کی جلد چھلی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ظلم کیا اماں۔۔۔ ! بن ماں کی بچی کے ساتھ یہ لاپروائی۔ ارے اس سے تو اچھا تھا کسی یتیم خانے میں داخل کرا دیتے یا پھر کسی بے اولاد کو دے دیتے۔"

وہ بچی کو وہیں بستر پہ روتا چھوڑ کے خود سر ہاتھوں میں گرا کے سسکنے لگی۔

"ایسی سنگ دلی۔۔۔ بھائی جان بھی بس بیوی کے عاشق بنے اسی کو رو رہے ہیں۔ اب چلی گئی جانے والی' کب تک سوگ مناتا ہے۔ جو زندہ ہیں' ان کی تو خبر لو۔"

"اب تو یوں ماں کی میت پیٹنے بیٹھ گئی ہے۔" شمشاد بیگم کو اس کا رونا ذرا پسند نہ آیا۔ اس کا تو خیال تھا۔ بیٹی اس سے ہمدردی جتائے گی کہ اس عمر میں نہ صرف گھر سنبھالا ہوا ہے بلکہ بچی کو بھی پالنا پڑ رہا ہے۔

"اتنا درد جاگ رہا ہے تو' تو لے جا اسے اپنے ساتھ' میں کسی غیر کو کیوں دوں۔ تو اللہ رکھے اولاد والی ہے لیکن بیٹی کی ماں تو نہیں۔ لے جا اسے اپنی بیٹی بنا کے اور پال لے جس طرح پالنا ہے۔ مجھ بڈھی سے تو یہ سیاپے نہیں دیکھے جاتے۔ کون سے چار چار نوکر رکھ کے دیے ہیں نوید نے۔"

اس بات پہ پروین خاموش ہی رہی اور چپ چاپ بچی کو نہلانے لے گئی۔

"ہاں' اب کیوں بولے گی؟ ماں کو باتیں سنانا آسان ہے۔ خصم کو سر چڑھایا ہوا ہے اور ساس۔۔۔ وہ تو ہتھیلی کا چھالا ہے۔ ان کو ناراض تو نہیں کر سکتی۔ ارے وہ نہیں رہ رہا تیری نند کا بیٹا۔ نند۔۔۔ گھر کا گند۔۔۔ اس گند کی نشانی کو کلیجے سے لگا کے پال سکتی ہے تو بھائی کے بیٹی کو کیوں نہیں۔"

"کوئی کلیجے سے لگا کے نہیں پال رہی۔" پروین نے باتھ روم کے کھلے دروازے سے چلا کے کہا۔

"ہاں پال ضرور رہی ہوں' صرف خوفِ خدا کے نام پہ اور ضروری نہیں خدا کا خوف میرے گھر کے دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ہو۔ لڑکی ذات ہے یہ۔۔۔ کیسے پرائے گھر میں لے جا کے پال لوں۔ ایک میرے سوا وہاں سب غیر ہیں' اس کے لیے اور وصی کی بات نہ کرو۔۔۔ ایک میرے علاوہ باقی سب اپنے ہیں اس کے۔"

اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں جگہ بناتا وہ گلہ اور تناور ہو گیا۔ جب اس نے یہاں آتے ہوئے وصی کو ساتھ لے جانا چاہا بلکہ وہ خود بھی ساتھ جانا چاہتا تھا۔ اب بڑا ہو گیا تھا اور پروین سے اٹیچ ہونے کی وجہ سے ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہنا چاہتا تھا لیکن اس کی ساس اور شوہر دونوں نے اجازت نہیں دی۔

"پالنے پوسنے کے لیے مجھے ماں کا درجہ دے دیتے ہیں لیکن میرا کوئی حق بھی اس پہ رہنے نہیں دیتے' اتنی بے اعتباری۔۔۔"

شام تک کا وقت کیسے گزر گیا' اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ کلینک میں ہی کئی گھنٹے لگ گئے۔ وشمہ کو ڈائریا تھا اور ڈی ہائیڈریشن کی وجہ سے پانی کی بے حد کمی بھی ہو رہی تھی جسم میں۔ ڈرپ کے ساتھ دو تین انجکشن لگے تو جیسے منٹوں میں اس نے بچی کے اندر نئی جان آتے دیکھی۔ چائلڈ اسپیشلسٹ نے اس کے لیے ایک خاص فارمولے پہ بنا دودھ تجویز کیا۔ صفائی کا خاص خیال رکھنے کو کہا۔ اسے ماں سے توقع تو نہیں تھی' اس کے باوجود انہیں تاکید ضرور کی' پانی اور فیڈر ابال کے استعمال کرانے کی۔

بھائی سے بھی فون پہ طویل بات کر کے وشمہ کی ذمہ داری ڈھنگ سے نبھانے کی التجا کی۔

"ہو سکے تو کسی معقول خاتون کا انتظام کر دیجیے اس کی دیکھ بھال کے لیے۔ اماں کی ایک تو عمر ہو گئی' دوسرے ان کا اپنا مزاج ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایات اور حفظانِ صحت کے اصولوں کو وہ فضول کے چوچلے گردانتی ہیں۔ اگر کچھ پیسے زیادہ بھی خرچ کرنے پڑیں تو کوئی بات نہیں۔ اولاد سے بڑھ کے قیمتی کیا ہوتا ہے۔"

فون رکھ کے اس نے ٹائم دیکھا۔ سات بجنے میں فقط دس منٹ تھے۔ اس کا تقریباً سارا دن ڈاکٹر کے پاس گزر

گیا تھا۔ بچوں نے کیا کھایا' کیا کھیلا' اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

"اور اگر میں آج بھی اکڑ کے بیٹھی میاں صاحب کو نخرے دکھاتی رہتی تو۔۔۔؟ اگر میں آج بے شرم بن کے خود یہاں آنے کی فرمائش نہ کرتی تو۔۔۔؟ اگر میاں صاحب آج شرافت سے بات ماننے کی بجائے مجھے واپس لے جاتے تو۔۔۔؟ تو شمہ کا کیا ہوتا۔ ڈاکٹر تو پہلے ہی باتیں سنا رہا تھا کہ بچی کو لانے میں اتنی دیر کیوں کی لیکن ایسا ہونا ہی تھا۔ مجھے آنا ہی تھا۔ اللہ نے اس بن ماں کی بچی کے لیے کوئی وسیلہ تو بنانا تھا۔"

وہ گہری سانس لے کر اٹھی اور بچوں کو تیار رہنے کے لیے کہنے کو چل پڑی۔ سراج دین کسی بھی وقت ہارن بجا سکتے تھے۔

✡ ✡ ✡

وہ اندر آنے کے بعد کہیں نہیں رُکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اپنی ماں جی کو سلام کرنے بھی نہیں گیا تھا۔

اس نے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا اور دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ اے سی آن کرنے کے بعد اس نے کوٹ بیڈ پہ پھینکا اور خود بھی وہیں چت لیٹ گیا۔

سامنے کی دیوار پہ تین تصویریں لگی تھیں۔ ایک بڑی اور دو نسبتاً "چھوٹی۔

سب سے بڑی تصویر اس کی شادی کی تھی جس میں وہ روایتی شیروانی اور کلاہ باندھے رسمی سے انداز میں مسکرا رہا تھا اور اس کے ساتھ مدیحہ کھڑی تھی۔ گہرے سرخ بھڑکیلے عروسی لباس میں ملبوس' ڈھیروں سونا لادے۔ اس کے لبوں پہ سجی شرگیں سی مسکراہٹ جعفر محمود کو سراسر فاتحانہ محسوس ہوئی۔ اس نے چڑ کے نظر ہٹائی۔

دوسری تصویر میں وہ تینوں بچیوں کے ساتھ یوں کھڑی تھی جیسے کوئی جاگیردارنی اپنی جاگیر کے ساتھ۔ اس مسکراہٹ میں اسے فاتحانہ چمک کے ساتھ ایک چیلنج سا بھی محسوس ہوا۔

تیسری تصویر میں وہ اپنی بڑی بیٹی کے ساتھ تھی۔ چند دن کی بچی کے ساتھ زرد چہرہ لیے ہوئے اور اس نقاہت کے عالم میں بھی وہی فاتحانہ سرور' وہی چیلنج دیتا انداز۔۔۔ وہی غرور' وہی فخر۔۔۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھا اور اپنا رخ تبدیل کر کے دوبارہ لیٹ گیا تاکہ نہ وہ تصویریں نظر کے سامنے آئیں' نہ ہی اس کا جی جلے۔ وہ جی جو پہلے ہی خاصا جل چکا تھا۔

"تو یہ ہے میری زندگی۔۔۔ یہ سجا سجایا پنجرہ۔۔۔ یہ زمین جائیداد جس کا میں اکلوتا وارث ہوں مگر ان شرائط پہ جو میرے ابا جی اور تایا جی نے عائد کر رکھی ہیں۔ میری بیوی۔۔۔ میری بچیاں۔۔۔ یہ میرے لیے کسی خوشگوار اور خوشحال زندگی کی علامت نہیں ہیں۔ انہیں مجھے کسی ذمہ داری کی طرح' کسی کڑے قول کی طرح ہر حال میں نبھانا ہے۔ یہ بات زبردستی مجھے سمجھائی گئی ہے۔ بھلا زبردستی بھی دل بستے ہیں۔ مدیحہ سے شادی کرتے وقت ہی ماں جی نے مجھے باور کرا دیا تھا کہ ہم تمہاری شادی نہیں کر رہے۔ تمہاری بڑی آپا کا مستقبل محفوظ کر رہے ہیں۔ مدیحہ کی خوشگوار زندگی تمہاری بہن کی خوشگوار زندگی کی ضمانت ہوگی۔"

اور اس کے نوخیز جذبے وہیں ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ مدیحہ کا چہرہ دیکھے بغیر' اسے جانچے پرکھے بغیر ہی وہ اس سے اکتا گیا۔ یہ کیسا زندگی کا ساتھی ملنے جا رہا تھا اسے جس کے ساتھ ساتھ نہیں چلنا تھا بلکہ سر پہ لادے پھرنا تھا۔ شاید وہ اپنے دل میں مدیحہ کے لیے گنجائش پیدا کر ہی لیتا۔ اگر یہ چیز دھمکی کی صورت اس پہ تھوپی نہ جاتی۔

اس کے ابا جی نے ساری عمر تایا جی سے ڈرتے ہوئے گزاری تھی پھر اپنے خوبرو اور لائق بیٹے مکرم باجوہ کے لیے ان کی بڑھتی عمر کی قبول صورت اور کند ذہن بہن کا رشتہ لے کر انہوں نے چھوٹے بھائی کو بالکل ہی زیربار کر لیا۔ اپنے باپ کی دیکھا دیکھی وہ بھی تایا اور پھر بہنوئی کے رعب میں آگیا۔ اس کی بہن سے شادی کرنے کے بعد وہ اپنی "سالے" والی پوزیشن سے اوپر نہیں ابھر سکا تھا۔

اسی لیے کسی بے زبان مویشی کی ہنکایا ہوا جب وہ اسے یہاں لایا تو وہ دم تک نہ مار سکا۔

"آپ سیدھے یہیں آگئے؟"

جیسے بنا اس کی مرضی جانے وہ اس کی زندگی میں آئی تھی' اسی طرح بغیر اجازت کے کمرے میں بھی آگئی۔

"ہاں جی پوچھ رہی تھیں آپ کا۔"

وہ خاموش ہی رہا۔

مدیحہ اس کے شوز اٹھا کے ایک جانب رکھنے کے بعد کوٹ ہینگ کرنے لگی۔

"اس طرح آڑے ٹیڑھے کیوں لیٹے ہیں۔ سیدھی طرح آرام سے لیٹیے' تکیہ دوں۔"

اس کا دل تو بہت چاہا کہ چلا کے کہہ اٹھے۔

"اب کیا میں اپنی مرضی سے لیٹ بھی نہیں سکتا۔"

لیکن اس وقت ایک لفظ تک کہنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کرنے کے باوجود مدیحہ نے پیش قدمی ترک نہیں کی۔ اپنے گھر اور اپنے لوگوں میں آنے کے بعد وہ اپنے قدم اور بھی مضبوط محسوس کر رہی تھی۔

"یہ لیجیے تکیہ۔" اس نے تکیہ آگے بڑھایا اور جعفر کی جانب سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہونے کے بعد خود اس کا سر دھیرے سے اٹھا کر تکیہ رکھنا چاہا۔

اس بار وہ خود پہ ضبط نہ کر سکا اور تکیہ اس کے ہاتھوں سے چھین کر دور پھینکا۔

"پاپا۔۔۔" اسی وقت آٹھ سالہ تحریم اندر داخل ہوئی۔ تکیہ اس پہ جا لگا۔

"تحریم۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟ آنکھ میں لگا ہے۔"

اگلی آواز مدیحہ کی تھی جو تحریم کو آنکھ پہ ہاتھ رکھتے دیکھ کر اس کی جانب لپکی تھی مگر اس سے پہلے جعفر زقند بھر کے اس تک پہنچ گیا۔

تحریم باپ کی طرح اونچے قد کاٹھ کی تھی' اس کے باوجود اس نے بیٹی کو گود میں اٹھا لیا۔

"سوری بیٹا! سوری میری جان۔۔۔ زور سے تو نہیں لگا۔ پاپا نے تکیہ آپ کو نہیں مارا تھا جانو!"

وہ بار بار اس کی موٹی موٹی آنکھیں چوم رہا تھا۔

"تو کیا ماما کو مارا تھا پاپا؟"

اس کے سوال پہ وہ سن ہو گیا۔

"ہم کھیل رہے تھے بیٹا!" مدیحہ نے بات سنبھالی۔

"جیسے میں اور تقدیس' تطہیر کھیلتے ہیں تکیوں اور کشنز کے ساتھ۔"

"ہوں۔" جعفر نے اس کے ماتھے پہ آئے بال پیچھے کیے۔

"لیکن ماما! ہمیں تو آپ منع کرتی ہیں' اچھا تو آپ دونوں بھی نائی ہو گئے ہیں۔"

اس نے ہلکا سا کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔ جعفر کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اور ایسے میں وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ اس کے پیچھے کھڑی مدیحہ کے چہرے پہ وہی مسکراہٹ تھی۔ وہی فاتحانہ اور فخر و غرور سے بھرپور مسکراہٹ جس میں کسی کو زیر کر لینے کی آسودگی تھی۔

✡ ✡ ✡

"زہے نصیب' زہے نصیب۔"

منزہ کی آواز سنتے ہی مظہر کی ساری کلفت اور تکان دور ہو گئی۔ اب وہ بشاشت بھرے لہجے میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"آج میری جانم نے فون کرنے کی زحمت کیسے کر لی؟"

"آہستہ۔۔۔ آپ آفس میں بیٹھے ہیں۔"

"سویٹ ہارٹ! یہ میرا کیبن ہے۔ میرا پرائیویٹ اور پرسنل کیبن۔ یہاں بیٹھ کے میں اپنی بیوی سے ہر طرح کی پرائیویٹ اور پرسنل بات کر سکتا ہوں۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"میں بھائی جان کے ہاں سے فون کر رہی ہوں۔"

"جانتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" وہ حیران ہوئی' کچھ پریشان بھی کہ شاید اس کے میکے آنے کی خبر اس سے پہلے ساس صاحبہ نے دی ہو اور اگر انہوں نے فون کیا ہو گا تو پھر اور بھی بہت کچھ بتایا ہو گا۔ اصغر کی اچانک شادی اور ریتا کی آمد کے متعلق بھی۔

"وہ ایسے کہ اول تو اپنے گھر سے تمہیں کبھی فون کرنے کی توفیق نہیں ہوئی یا یوں کہہ لو' ہمت نہیں ہوئی۔ بہ ضروری کام کے لیے کر بھی لیا تو ڈرے ڈرے انداز میں چار لفظ مجبوراً کہے اور ریسیور رکھا۔۔۔۔"

"آپ کبھی سسرال میں رہیں تو آپ کو پتہ چلے۔" وہ آہستگی سے اپنی مجبوری بیان کر گئی۔

"خیر۔۔۔ ہماری تو جناب بڑی عزت ہے اپنے سسرال میں۔ آپ ہی نکمی ٹھہریں جو اپنی قدر نہ کروا سکیں۔ ہم تو اپنی سسرال کی آنکھوں کا تارا ہیں' سر پہ بٹھاتے ہیں وہ اور خوب آؤ بھگت کرتے ہیں۔"

اس کے اترانے پہ منزہ کو ہنسی آ گئی۔

"تو آ رہے ہیں نا پھر آؤ بھگت کرانے۔"

"تم رات رک رہی ہو؟"

"جی۔۔۔ شاید کل کا دن اور رات بھی۔"

"خیریت؟ یہ اچانک پروگرام کیسے بنا؟ صبح تو تم نے ذکر نہیں کیا تھا۔"

"بس یونہی' میرا دل چاہ رہا تھا۔ سوہا بھی ضد کر رہی تھی۔"

"سچ سچ بتاؤ' گھر میں تو کوئی بات نہیں ہوئی؟ کسی کے کچھ کہنے پہ تو تم گھر سے نہیں نکلی ہو؟"

"نہیں بھئی! میں سچ کہہ رہی ہوں اور گھر میں پہلے بھی آئے دن کوئی نہ کوئی بات ہوتی رہتی ہے۔ کیا اس سے پہلے میں ناراض ہو کر گھر سے نکلی ہوں اور آج تو امی کا موڈ بھی بہت اچھا تھا' اسی لیے انہوں نے بغیر کسی سوال جواب کے جانے کی اجازت دے دی۔"

اس نے مصلحتاً "سب اچھا ہے" کی رپورٹ دی۔

"حیرت کی بات یہ نہیں کہ انہوں نے اجازت دے دی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تم نے اجازت مانگ لی۔ کہاں سے لائیں اتنا حوصلہ؟"

وہ مذاق اڑانے کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"اچھا چھوڑیے یہ سب' سیدھے یہیں آ جایئے گا۔ سوہا کے لیے وہ چاکلیٹس ضرور لایئے گا جو آپ اکثر لاتے ہیں۔ یہاں کی مارکیٹ سے نہیں ملی' بھائی جان گئے تھے لینے۔"

"ہاں ڈھیر ساری لے آؤں گا ایک ہی دفعہ۔"

"اتنی کیا کرنی ہیں' گرمی میں پگھل جاتی ہیں۔ بس دو تین کافی ہیں۔"

"یہاں بھی تو بچے ہیں۔ ایک ایک ان کو دے دینا۔ باقی فریج میں رکھ لینا۔ کافی دور ہے وہ شاپ جہاں سے میں یہ چاکلیٹس لاتا ہوں۔ پتہ نہیں دوبارہ جانا ہو سکے یا نہیں۔ ایک ہی بار اسٹاک کر لینا۔"

"اچھا۔" وہ غائب دماغی سے سر ہلا بیٹھی۔ یہ وضاحت کچھ اوپر سے گزر گئی تھی۔

"میں امی کو فون کر کے بتا دیتی ہوں کہ آپ آج گھر نہیں جائیں گے۔ اچھا اللہ حافظ۔"

"تمہیں بہت جلدی ہے مجھے اللہ حافظ کرنے کی۔" وہ جھنجلا کے بولا۔

"ابھی میرا دل کر رہا ہے تم سے بات کرنے کو۔ یہاں تو ساس یا نند کی صورت میں تمہارے سر پہ کوئی تھانیدار مسلط نہیں ہے پھر کیا جلدی ہے تمہیں۔"

"آپ کے کام کا حرج نہیں ہو رہا؟ آپ تو دیر تک آفس میں اسی لیے رکے ہیں نا کہ آج کام زیادہ ہے۔"

"ہاں کام زیادہ ہے اور وقت کم۔ میں اکتا گیا ہوں یار! مجھے نہیں لگتا کہ میں یہ مکمل کر پاؤں گا۔" وہ تھکا تھکا سا بولا۔

"چلیں باقی کل کر لیجیے گا۔"

"تم بات کرو نا مجھ سے۔" اس کے لہجے میں عجیب سی تڑپ اور پیاس تھی۔

"فون بند کریں گے تو یہاں سے نکلیں گے اور نکلیں گے تو جلدی پہنچیں گے۔ باقی باتیں واپس آ کے کر لیجیے گا۔ کال خاصی لمبی ہو گئی ہے۔"

"دراصل اس وقت تم سے بات کر کے وہی لطف آ رہا ہے جو منگنی اور شادی کے دورانیے میں فون پہ چوری چھپے بات کرنے میں آتا تھا۔ ایسا لگ رہا ہے گیا وقت لوٹ آیا ہو۔ مجھے تھوڑی سی دیر اور اس وقت میں جی لینے دو مونا ڈارلنگ!"

اس کے بوجھل لہجے اور گہری سانسوں کے آگے وہ بے بس پڑ گئی اور خود بھی گئے وقت کی مہک میں کھو گئی۔

"میں تمہیں بہت چاہتا ہوں مون!"

"میں جانتی ہوں۔"

"کاش کہ تم سچ مچ جان سکو۔"

"آپ کچھ زیادہ ہی رومانٹک نہیں ہو رہے۔" اس نے ٹوکا۔

"ایک بار مجھے آئی لو یو کہو نا۔" وہ سنی ان سنی کرتا ہوا یہ فرمائش کر رہا تھا جس پہ وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"اوں ہوں۔۔۔ یہاں میں اکیلی نہیں۔"

"بہانے مت بناؤ۔ تم اکیلی ہو' ورنہ اتنی دیر تک بات نہیں کرتی۔۔۔ بولو نا۔۔۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بہت عجیب لگ رہا ہے۔"

"پہلی بار تو نہیں کہہ رہی۔"

"ہاں مگر فون پہ۔۔۔"

"ہاں فون پہ کبھی نہیں کہا اور میں سننا چاہتا ہوں' ہر طرح سے سننا چاہتا ہوں۔ تمہیں سامنے بٹھا کے بہت بار سنا ہے۔ ایک بار فون پہ بھی کہہ دو پلیز۔۔۔ میری جان نہیں ہو۔"

"اف۔۔۔ کبھی کبھی بہت تنگ کرتے ہیں آپ۔"

"اچھا اب نہیں کروں گا' بس تم میری یہ فرمائش پوری کر دو۔"

"نہ آپ کبھی تنگ کرنے سے باز آئیں گے' نہ فرمائش کرنے سے۔"

"پکا والا وعدہ۔ نہ آج کے بعد تنگ کروں گا' نہ کوئی اور فرمائش کروں گا۔ بس یہ ایک۔۔۔ آخری بار۔۔۔"

"آئی لو یو۔۔۔" اس نے فوراً کہہ دیا اور اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا کہ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح شرما کے ریسیور رکھ دیا۔

اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے رخسار چھوئے جو حدت سے تمتما رہے تھے۔ مظہر کی جانب سے ایسی وارفتگیاں معمول کی بات تھی۔ وہ اپنی محبت کے اظہار کے معاملے میں بہت فراخ دل تھا لیکن آج۔۔۔ آج کچھ خاص ہی بات تھی۔۔۔ معمول سے ہٹ کر۔۔۔ آج وہ اس حد سے بڑھے التفات اور کھلم کھلا اظہار عشق سے چڑنے کی بجائے ایک عجب سا سرور محسوس کر رہی تھی۔ ایک ایسا سرور جو دل کو کیف و انبساط دینے کے ساتھ ساتھ ہلکا سا گداز اور سوز بھی بخش دیتا ہے۔

شاید یہ واقعی اس گئے وقت کی یادوں کا اعجاز تھا جب محبت کے اولین دنوں میں وہ نوخیز دوشیزہ خود کو سراہتے

جذبوں کی حکایتیں سن کر ایسے ہی شرم سے سرخ اور خوشی سے سرشار ہو جاتی تھی۔

وہ کمرے سے نکل کر کچن میں جانا چاہتی تھی تاکہ بھابھی کی مدد کرے جو اس کی اچانک آمد کی وجہ سے کچھ زیادہ کرنے میں مصروف ہو گئی تھیں لیکن اس کے نکلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔

"ہیلو۔"

"مجھے اللہ حافظ کہے بغیر ہی فون رکھ دیا؟" دوسری جانب مظہر تھا۔

"حد کرتے ہیں آپ۔"

"نہ ہی مجھ سے اپنے پیار کا جواب سنا۔ بیگم صاحبہ! لگتا ہے آپ کا دل بھر چکا ہماری محبتوں سے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔" وہ برا مان گئی۔

"آئی لو یو۔۔۔ آئی لو یو۔۔۔ آئی لو یو۔۔۔"

"بس بس۔۔۔ بس کیجیے، مجھے یقین آ گیا۔ کیا اب میں فون رکھ سکتی ہوں صاحب!"

"تم سے اللہ حافظ سنے بغیر تو میں نہیں جانے والا۔"

"اللہ حافظ۔۔۔ فی امان اللہ۔۔۔ اللہ کے سپرد۔"

اس کی تسلی کی خاطر وہ تین چار بار کہہ گئی۔

ریسیور رکھنے کے بعد بھی دیر تک ایک آسودہ اور سرشار سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ سجی رہی۔

"کیا بات ہے، لگتا ہے سیاں جی نے پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں۔"

اس کے گل رنگ چہرے اور مسکراتے لبوں کو دیکھ کے ثناء بھابھی نے چھیڑا۔

وہ خاصی بے تکلف تھی منزہ سے، شاید عمر کے کم فرق کی وجہ سے۔ ورنہ صائمہ بھابھی سے تو احترام والا رشتہ تھا۔

وہ مسکرا کے سر جھٹک کے رہ گئی اور چپ چاپ ان کے آگے سے قیمہ اٹھا کے کوفتے بنانے لگی۔

"مظہر نے پوچھا نہیں کہ اچانک پروگرام بنانے کی کیا وجہ تھی؟"

"میں نے ٹال دیا۔ اب اصل بات کیسے بتاتی؟"

"بھلا ہے تمہارا میاں جو آسانی سے ٹل جاتا ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

"ایک تمہارے بھائی صاحب ہیں جو بال کی کھال اتارنے کے ماہر ہیں۔"

"کم تو مظہر بھی نہیں، البتہ میرے ساتھ ان کا رویہ مختلف ہوتا ہے۔ میں تو خود حیران ہوتی ہوں بھابھی! دوسروں کے لیے شعلہ بنے رہنے والا شخص میرے لیے شبنم کیسے بن جاتا ہے۔ میری کسی بھی بات پہ انہیں غصہ نہیں آتا۔"

"ماشاءاللہ کہو ماشاءاللہ۔" ثناء نے فوراً ٹوکا۔

"خدا اس کی محبت کو نظر بد سے بچائے اور خاص طور پہ تمہاری ساس اور نند کی نظر بد سے کہ وہ تو نظر بد ہے۔"

دونوں پھر قل قل کر کے ہنس پڑیں۔

"ایک بات ہے منزہ! اگر مظہر تمہاری ہر بات اتنے ہی تحمل سے سن لیتا ہے تو تمہیں اصغر کے اس نئے کارنامے کے متعلق بتا دینا چاہیے تھا۔ تم تو اسے "جائے وقوعہ" سے ہی کھینچ لائی۔"

"کیا کرتی بھابھی! آپ میری ساس کے مزاج سے واقف نہیں۔ وہ ہر مصلحت سے عاری ہیں۔ مظہر تو غصے کے تیز ہیں ہی، اصغر بھی کم بدلحاظ نہیں اور امی نے بجائے مصالحت کے اس جھگڑے کو اور اچھالنا تھا، یہ سوچے بغیر اس کا نتیجہ خطرناک نکل سکتا ہے۔ مظہر سے ویسے تو ان کی کم بنتی ہے لیکن اس معاملے میں چونکہ دونوں کا ردعمل ایک سا ہوتا، اس لیے اصغر کے خلاف ٹیم بن جاتی اور مظہر کو اپنے مقصد کے لیے انہوں نے اور بھی بھڑکانا تھا،

اصغر کو دبانے کے لیے انہیں اشتعال دلا کے اپنی طرف سے استعمال کرنا تھا۔"

"پوری امریکہ ہیں تمہاری ساس تو۔" ثناء نے جھرجھری لے کر کہا۔ اس کی یہ بات منزہ کو پھر سے ہنسنے پہ مجبور کر گئی۔

دونوں کی بکھری ہنسی کے درمیان کہیں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

"لو آ گیا پھر سے فون۔۔۔ تمہارے عاشق کا ہوگا۔" ثناء نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں، اب نہیں۔ وہ تو میرے اللہ حافظ کہنے کے انتظار میں تھے۔" منزہ نے بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے سرخ ہوتے چہرے پہ دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔

اتنے میں گھنٹی چوتھی بار بجنے کے بعد بند ہو گئی۔ شاید کسی نے فون ریسیو کر لیا تھا۔

"توبہ۔۔۔ کتنا ہنساتی ہیں بھابھی آپ۔"

اس سے پہلے کہ ثناء کچھ اور کہتی، اس کے شوہر نے بلند آواز میں اسے پکارا۔

"ذرا یہ پیاز دیکھنا، سرخ ہونے والے ہیں۔ اس میں یہ گوشت ڈال کے بھون لینا۔ میں بات سن آؤں۔"

"جی، خیریت؟" وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اندر آئی، جہاں جمشید فون کے نزدیک رکھی کرسی پہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھا تھا۔

"آپ نے آواز دی تھی۔" وہ نزدیک آ کے دھیرے سے بولی۔ پہلے تو اس قدر اونچی آواز میں چلا کے اسے آواز دینا ہی ثناء کو چونکا گیا اور اب یہ نڈھال سا پژمردہ انداز۔

"ہاں وہ۔۔۔ منزہ کے سسرال سے فون آیا تھا۔" اس نے سر اٹھا کے دیکھا تو وہ اپنے شوہر کی بے تحاشا سرخ ہوتی آنکھیں دیکھ کے ڈر گئی۔

"اس کے دیور کا تھا۔ مظہر۔۔۔ مظہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" جمشید نے بہت دقت کے ساتھ غم سے ٹوٹتے لہجے میں کہا لیکن شاید کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ الٹا اسے غصہ سا آ گیا۔

"توبہ کس قدر جھوٹا اور بکواس شخص ہے یہ منزہ کا دیور۔ شرم بھی نہیں آتی اسے اس قسم کا بےہودہ مذاق کرتے ہوئے اور وہ بھی اپنے ہی سگے بھائی کے متعلق۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی منزہ فون پہ مظہر سے بات کر رہی تھی۔"

"وہ مذاق نہیں کر رہا، فون کے بعد وہ یہیں آنے کے لیے نکلا ہوگا کہ۔۔۔"

"لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے تو۔۔۔" ثناء بات کرتے کرتے رک کے وال کلاک کی جانب دیکھنے لگی۔ تقریباً سوا گھنٹہ ہو چکا تھا منزہ کو فون پہ بات کرتے ہوئے۔ اسے کچن میں مل جل کے کھانا پکاتے اور خوش گپیوں کے دوران وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا تھا اور اب جب احساس ہوا تو اس کی لرزتی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے صاف انکار کر دیا۔

وہ کانپتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"سوا گھنٹہ، واقعی اب تک تو وہ پہنچ بھی چکا ہوتا۔"

"تم منزہ کو کسی بہانے وہاں لے جانے پہ تیار کرو۔ کہو کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ ہاں کہو اس کی ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ شاید یہ اطلاع وہ کسی اور کو بھی دینا چاہتا تھا لیکن ثناء کا دل اس حکم پہ الجھ کے رہ گیا۔

"بہانے سے۔۔۔ بہانے سے کیوں؟ سچ سچ بتایئے کیا۔۔۔ کیا وہ۔۔۔؟ وہ زیادہ زخمی ہے؟"

وہ کسی بدترین اندیشے کو زبان پہ لانے کی ہمت نہ کر سکی۔

"بچوں کو برابر والوں کے ہاں بھیج دو، میں بھائی صاحب کو بھی فون کر دوں۔ اکٹھے نکلتے ہیں۔"

جمشید نے اس کا سوال نظرانداز کیا اور وحشت زدہ چہرے کے ساتھ ایک نمبر ملانے لگا۔ اس کا بڑا بھائی بیوی کے ساتھ خاندان میں ہونے والی کسی تقریب میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ شاید اسی سے رابطہ کر کوشش ہو رہی تھی۔ ثناء نے کریڈل پہ ہاتھ مار کے لائن منقطع کی۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں' وہ کس ہاسپٹل میں ہے؟"

"کسی میں بھی نہیں۔ ہم منزہ کے گھر جا رہے ہیں۔ مظہر کو گھر لایا جا چکا ہے۔"

جمشید نے سر جھکا کے کہا اور آہستگی سے ثناء کا ہاتھ ہٹا کے دوبارہ نمبر ڈائل کرنا چاہا۔

"اوہ۔۔۔ شکر ہے میرے اللہ۔" ثناء نے کھل کے سانس لی جو جمشید کے انداز کی وجہ سے سینے میں ہی کہیں ا گئی تھی۔

"یعنی خطرہ نہیں ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں منزہ کو بتا دیتی ہوں۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے آخر؟"

وہ بتانے کے لیے اٹھی مگر اس سے پہلے جمشید فون پرے پھینک کر اٹھا اور اس کا بازو سختی سے پکڑ کے وا کھینچا۔

"اسے ابھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن کیوں؟ آپ خود ہی تو کہہ رہے ہیں وہ ہاسپٹل سے واپس گھر آ گیا ہے۔ یعنی چوٹیں معمولی نوعیت کی گی' جب ہی تو اتنی جلدی ہاسپٹل سے۔۔۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ہاسپٹل سے واپس آ چکا ہے۔" جمشید کی انگلیاں ثناء کو اپنے بازو میں اندر تک محسوس ہوئیں۔

"میں نے۔۔۔" اس کی آواز اچانک بھرا گئی۔

"میں نے کہا ہے کہ اسے ہاسپٹل سے گھر لایا جا چکا ہے۔"

وہ مزید ضبط نہ کر سکا اور ثناء کے شانے پہ سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

◆ ◆ ◆

"ارے بھائی! آپ جو مرضی کہہ لیں۔۔۔ جورو کا غلام' بیوی کا دیوانہ جو دل چاہے' میں برا نہیں مانوں گا۔"

مظہر کی زندگی سے بھرپور آواز ثنا کو اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر اس کا جاندار قہقہہ ہوئے سامنے بیٹھی منزہ کو شرارت سے آنکھ مارنا اور منزہ کا سب کے سامنے اس حرکت پہ سرخ ہو کے آ دکھانا۔

ثنا جس خشک تولیے سے چہرہ ڈھانپے ہوئے تھی' وہ بھی گیلا ہونے لگا۔ بے بسی کے شدید احساس ہوتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پانی کے چھپکے منہ پہ مارنے شروع کیے۔ وہ ان روئی روئی آنکھوں کے سا کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی اس لیے پچھلے سات آٹھ منٹ سے واش روم میں بند ان آنسوؤں کے مٹانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ہنوز ناکام تھی۔

اس نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہا۔ آنکھوں میں جو ہلکی سی سرخی اب تک تھی۔ سو تھی مگر پہ دکھ اور الم کے یہ نشان۔۔۔

"منزہ بچی تو نہیں جو سمجھ نہ سکے۔ لیکن فی الحال اسے لاعلم رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ اسے یہاں سے وہا لے جانا محال ہو جائے گا۔ نجانے کیا کر گزرے۔"

اس نے یہ سوچ کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی کہ شاید اس سے چہرے پہ بشاشہ تھوڑے اثرات نمودار ہو سکیں مگر اس کوشش میں اس کی آنکھوں کے گوشے پھر سے بھیگنے لگے۔

"ثنا! جلدی کرو۔" جمشید نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بھاری آواز میں حکم دیا۔

وہ تولیے سے چہرہ خشک کرتی باہر نکلی۔

جمشید عجیب وحشت زدہ انداز میں سامنے کھڑا تھا۔

"جمیل بھائی جان کو خبر دے دی ہے' وہ بھابی کے ساتھ وہیں پہنچ رہے ہیں۔ تم منزہ کو لاؤ۔۔۔ ہمیں بھی فوراً پہنچنا چاہیے۔"

"ایسا کریں' آپ جائیں۔ میں اور منزہ۔۔۔"

"دیکھو ثنا! اسے پتہ تو چلنا ہی ہے۔ زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ تم اسے لے آؤ۔"

"لیکن ہم تینوں اکٹھے جائیں گے تو اس کے دل میں کھٹک پیدا ہو جائے گی۔ ویسے بھی وہ مظہر کے اب تک نہ پہنچنے کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ہو چکی ہے۔ میں نے ابھی دیکھا ہے' فون کے نزدیک بیٹھی مسلسل نمبر ملا رہی ہے۔ خدانخواستہ اسے ذرا سا بھی شک ہو گیا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ وہاں جا کے خود ہی۔۔۔ اسے یہ اطلاع دینا ہم میں سے کسی کے لیے بھی مشکل ہو گا۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ جمشید بھی اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔

"زندگی میں اس نے بھلا کون سی خوشی دیکھی تھی اس ایک خوشی کے علاوہ۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن۔ چھوٹی سی تھی جب ماں باپ کے سائے سے محروم ہوئی۔ سسرال ملا تو وہ بھی بے قدرا۔۔۔ ایک مظہر ہی تو تھا اس کی زندگی میں' اب وہ بھی۔"

"بس کیجیے۔۔۔ آپ کی حالت دیکھ کے وہ ویسے بھی شک میں پڑ سکتی ہے۔ ایسا کریں آپ اس کا سامنا کیے بغیر نکل جائیں۔ میں آپ کے پیچھے اسے لے کر آتی ہوں۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ثنا نے اپنے شوہر کے شکستہ قدموں کو دکھ سے دیکھا اور ایک بار پھر بہت مشکل سے امڈ آنے والے آنسوؤں کو روکا۔

منزہ اس کے لیے ایک بے ضرر سی نند رہی تھی۔ جب وہ بیاہ کے آئی تو وہ کالج میں پڑھتی تھی مگر بڑی بھابی کلثوم نے اس کا بچپن بھی دیکھ رکھا تھا۔ وہ خود بتاتی تھیں کہ وہ بچپن سے ہی بڑی صابر و شاکر اور صلح جو رہی ہے اس لیے اکلوتی نند ہونے اور بھائیوں کی لاڈلی ہونے کے باوجود بھابیوں کے لیے کبھی مسئلہ نہیں بنی۔

شادی کے بعد کم کم آتی مگر جب آتی بھابیوں کا خلوص لے کر لوٹتی۔ لیکن اس وقت ثنا کو منزہ کے لیے اپنے دل میں ہمیشہ سے بڑھ کے پیار محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل اس کے دکھ میں ویسے ہی دکھی تھا جیسے کسی سگے کے لیے ہوتا ہے۔

"کیا کر رہی ہو منزہ؟"

اس نے پردہ ہٹا کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ پریشان سی صورت لیے صوفے پہ بیٹھی تھی' ٹیلی فون سیٹ گود میں دھرا تھا۔

"مظہر اب تک نہیں پہنچے۔ آفس میں فون کیا تو پتہ چلا کہ کب کے نکل چکے ہیں۔"

"کہیں رک گیا ہو گا۔۔۔ مارکیٹ میں یا کسی دوست کے ہاں۔"

"نہیں' وہ سیدھے گھر آتے ہیں۔ اگر کہیں جانا بھی ہو تو کم از کم مجھے اطلاع دیے بغیر تو نہیں۔ پھر بھی ان کے جن دو دوستوں کے نمبر مجھے آتے تھے میں نے وہاں بھی فون کیا ہے۔"

"تو پھر؟" ثنا کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔

"ایک تو ملے نہیں۔۔۔ دوسرے کچھ عجیب گول مول سی باتیں کر رہے تھے۔"

"کیا مطلب؟" وہ خوفزدہ ہو گئی کہ کسی دوست نے۔۔۔

"پتہ نہیں کہہ رہے تھے اسی کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ آپ بھی آ جائیں' پتہ نہیں کیا کیا۔ مجھے تو نشے میں لگ رہے تھے۔ آواز بھی لڑکھڑا رہی تھی حالانکہ وہ ایسے ہیں تو نہیں خیر مظہر سے بات کروں گی' کیسے شرابیوں سے دوستی کر رکھی ہے۔" "گھر کا نمبر مسلسل بزی مل رہا ہے۔"

"اچھا؟ تم نے وہاں بھی کیا؟" دل ہی دل میں ثنا نے شکر کیا نمبر بزی ملنے پہ۔۔۔۔
"ہاں۔۔۔۔ حالانکہ وہ مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں جاتے۔"
اس فکر کے عالم میں بھی اس کے لہجے سے فخر اور محبت بھرا مان جھلک رہا تھا۔ ثنا خوامخواہ ہی منہ پھیر کے سیٹ کرنے لگی۔
"کسی کسی جگہ جانا اتنا ضروری ہوتا ہے کہ انسان چاہتے ہوئے بھی اطلاع نہیں دے پاتا منزہ!"
"جی۔۔۔۔ لیکن بھابی!"
"اچھا چھوڑو یہ سب۔ اٹھو ذرا میرے ساتھ آؤ۔ مارکیٹ تک جانا ہے۔"
وہ خود پہ قابو پا کے پلٹی۔ منزہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔
"میں کیسے جاؤں بھابی؟ مظہر اب تک نہیں پہنچے اور۔۔۔۔"
"ارے پانچ منٹ کا کام ہے۔ یہ تمہارے بھائی جان۔۔۔۔ بغیر بتائے نکل گئے۔ اب میں کس کے ساتھ جاؤں بلکہ ایسا کرتے ہیں، مارکیٹ کے اس طرف تو تمہارا گھر ہے۔ وہاں بھی نظر مار آتے ہیں شاید مظہر وہیں ہو۔"
"نہیں۔۔۔۔ وہ وہاں کیوں جانے لگے، جب انہوں نے مجھ سے یہاں آنے کے لیے کہا ہے۔"
"ضروری نہیں منزہ! کہ انسان جو کہے، وہ پورا بھی کر دکھائے۔ کبھی کبھی کوئی مجبوری ایسی ہو جاتی ہے کہ ارادے سب وعدے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سنجیدہ ہو گئی۔
"ہو سکتا ہے تمہارے فون کے بعد تمہاری ساس نے فون کر دیا ہو اور تمہارے دیور والا سارا قصہ سنا دیا، مظہر سے رہا نہیں گیا ہو گا اور وہ وہاں پہنچ گیا ہو گا۔"
"ہاں۔۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے۔" وہ بے چینی سے کھڑی ہو گئی۔
"پھر تو ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔ کہیں حالات قابو سے باہر نہ ہو جائیں۔ مجھے دیکھ کے مظہر پھر بھی رُک جاتے ہیں۔"
وہ فوراً چادر اوڑھنے لگی۔ ثنا دکھ سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
"یہ مان، یہ استحقاق اب کس پہ جتاؤ گی منزہ؟ تمہاری ذات کو یہ غرور دینے والا اس بار تمہارے لیے رُک نہ۔۔۔۔ لیکن پتہ نہیں، پتہ نہیں وہ کس دل سے گیا ہو گا تمہیں چھوڑ کر۔"
منزہ کے کہنے کے باوجود اس نے سوہا کو اپنے بچوں کے ساتھ گھر پہ چھوڑ دیا۔ اپنے میکے فون کر کے وہ یہ خبر دے چکی تھی۔ سب کے سب منزہ کے گھر روانہ ہو چکے تھے اور ثنا کی خالہ یہاں بچوں کے پاس رکنے آ رہی تھیں۔

✻ ✻ ✻

"ہائے میرا مظہر، میرے کلیجے کا ٹکڑا، میرا گبھرو سوہنا۔"
نصرت کو غش پڑ رہے تھے اور وہ سینہ پیٹ پیٹ کر بین ڈال رہی تھی۔ اس کی چیخ و پکار سن کر اپنے تو اپنے غیروں کی بھی آنکھیں بھر آ رہی تھیں۔ وہ بار بار جھکتی اور دیوانہ وار مظہر کا چہرہ چومنے لگتی۔
"ہائے کوئی سہرا لاؤ۔۔۔۔ میرے بیٹے کو سہرا باندھو۔۔۔۔ کوئی ہار لاؤ، اسے ہار ڈالو پھولوں کے۔"
اسے بار بار اپنی وہ زیادتیاں یاد آتیں جو وہ منزہ کی ضد میں مظہر کے ساتھ کر گزرتی تھی۔ وہ ساری تلخیاں ساری جھڑپیں اور وہ زور زور سے اپنا سر پیٹنے لگتی۔
"مجھے پتہ ہوتا مظہر، تو نے ماں سے اتنا سخت ناراض ہو جانا ہے، ہمیشہ کے لیے چلے جانا ہے تو میں کبھی تجھے کچھ نہ کہتی۔ ذرا ناراض نہ کرتی۔ ماں صدقے شہزادے، ماں کو معاف کر دے۔ میرے کلیجے کی ٹھنڈ۔۔۔۔ واپس آ جا۔ اب تجھے کچھ نہیں کہتی، کچھ نہیں کہتی۔ اللہ پاک کی قسم! بس تو ایک بار واپس آ جا۔"
"امی۔۔۔۔ امی! ہوش کرو۔" شیم نے بمشکل اس کے بازو قابو کر کے مزید سینہ کوبی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔
"نصرت! اب تیرا بیٹا نہیں آنے والا۔ تیرا کوئی وعدہ، کوئی قسم اسے نہیں لا سکتی۔" ایک اور رشتے دار عورت نے اسے باور کرایا۔

"اس طرح بین ڈال ڈال کے اسے تکلیف مت دو۔ اس کا آخری سفر آسان کرو۔ دعا کرو اس کی مغفرت کے لیے، اس کی بخشش کے لیے۔"
یہ ایک اور خاتون تھیں جو ذرا معقول مشورہ دے رہی تھیں مگر شیم کو اس اندوہناک سانحے پہ اس معقولیت کا مظاہرہ ذرا نہ بھایا۔ وہ الٹا ان خاتون کے پیچھے پڑ گئی۔
"خالہ! ہمارا بھائی بڑا نیک تھا۔۔۔۔ بخشا ہوا، اس نے کون سے گناہ کیے تھے جو ہم بخشش کروانے بیٹھیں۔ اب ہم روئیں بھی نہ؟ جس کا دل پھٹا ہو وہی جانتا ہے کیسے آنسو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ میری ماں نے اپنا سب سے بڑا، سب سے لائق، سب سے پیارا بیٹا کھویا ہے۔ وہ کیسے صبر کرے۔"
وہ زار زار روتے ہوئے چلا رہی تھی۔ ایک اور عورت نے پہلی خاتون کو ہاتھ دبا کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ [illegible] کے خاموش بیٹھ گئیں۔
"اس کی بیوی نہیں پہنچی اب تک؟" کسی نے پوچھا۔
"آ رہی ہو گی بدنصیب۔" نصرت نے ایک اور ماتمی چیخ ماری۔ وہاں بیٹھی منزہ کی بڑی بھابی کلثوم اپنی والدہ کی گود میں سر چھپا کے بلک پڑی۔
"اسے کیا پتہ کہ اس کے سر کا سائیں، اس کا شوہر اسے اس جوان عمر میں کیسا روگ لگا کے گیا ہے۔"
شیم نے روتے روتے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا جو اس وقت ڈرامہ بالکل نہیں کر رہی تھی اور زندگی میں پہلی بار وہ منزہ کے لیے کوئی ہمدردانہ جملہ کہہ رہی تھی۔
"ہائے مظہر تو تو اس کی ساری باتیں مانتا تھا۔ وہ جو کہتی تھی کرتا تھا۔۔۔۔ مجھے بڑا غصہ آتا تھا تیری اس حرکت پہ۔۔۔۔ لیکن ماں صدقے، تو اسی کی خاطر رک جاتا۔ اس کی بات مان لیتا۔ تو نے تو اس کا خیال بھی نہ کیا۔ اپنی ذرا سی بچی کے لیے بھی نہ سوچا۔ کیا بے گاان دونوں کا۔"
"اللہ کی ذات صبر دینے والی ہے بہن!" انہی معقول خاتون سے ایک بار پھر رہا نہ گیا اس واویلے پہ۔
"وہی سب کا پالنے والا ہے۔ بس دعا کرو، اللہ انہیں صبر دے۔" شیم نے ایک بار پھر کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔
"یہ کون ہے؟" کسی نے شیم کو ٹہوکا دے کر پوچھا۔ نصرت نے بھی نظر اٹھائی۔
وہ رینا تھی جو اپنا دلہن کا لباس تبدیل کر کے، زیور اتار کے، میک اپ صاف کر کے اب اپنے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔ سادہ سے موتیا رنگ کے شلوار قمیص میں دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ بہت معمولی شکل وصورت کی لگ رہی تھی۔
"یہ۔۔۔۔ یہ ہے وہ پچھل پیری، وہ منحوس ادھر اس نے اپنے سبز قدم میرے گھر میں رکھے ادھر میرے گھر میں دریاں بچھ گئیں۔"
وہ جونڈھال اور ادھ موئی سی بیٹے کے نزدیک بیٹھ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح لپکی اور زمین پہ سوگوار انداز میں بیٹھی رینا پہ جھپٹی۔
"اس کی نحوست کھا گئی میرے بیٹے کو۔ ایسی ٹکر ماری بس والے نے کہ اگلا سانس بھی نہ لے سکا بدنصیب، یہ کھا گئی ہے میرے گھر کی خوشیاں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اسے پیٹنے لگی۔
"اصغر۔۔۔۔" رینا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے اصغر کو مدد کے لیے بلایا۔
وہ بڑے ٹوٹے ہوئے انداز میں گھر کے باہر مختلف انتظامات میں مصروف تھا۔ دل تھا کہ بڑے بھائی کی اس اچانک اور افسوسناک موت پہ پھٹا جا رہا تھا مگر وہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کام دیکھ رہا تھا کہ اس کا باپ تو مظہر کی ڈیڈ باڈی گھر آتے ہی غش کھا کے گر پڑا تھا اور اس وقت اس کے دوست انہیں ہاسپٹل لے کر گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ایک دوسرے دوست کو قبرستان کے لیے ہدایات دے رہا تھا جب اندر سے عجیب سا شور اٹھا۔ اس

نے خاص دھیان نہ دیا کہ وقفے وقفے سے اس کی ماں کے بین بلند ہو رہے تھے لیکن رینا کی آواز اور پھر اصغر کی پکارنے اسے پلٹ کر اندر بھاگنے پہ مجبور کر دیا۔

وہ پچاس عورتوں کے درمیان نصرت کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہی تھی۔ کئی عورتیں نصرت کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ بری طرح بپھری ہوئی تھی اور دھکیل دھکیل کے انہیں پرے کر رہی تھی۔

''امی... امی کیا ہو گیا ہے؟'' وہ پیچھے سے آ کے اس کے ساتھ چمٹ گیا اور دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

''دے اصغر! اسے کہاں سے لے آیا... اپنے بھائی کی موت کو۔''

''امی! بھائی کی اتنی ہی زندگی تھی۔ وہ اتنی ہی لکھوا کے لایا تھا۔''

وہ آنسو بھی بہا رہا تھا اور ساتھ ساتھ غم و غصے سے پاگل ہوتی ماں کو قابو بھی کیے ہوئے تھا۔ اس کے اشارے پہ رینا اپنا دوپٹہ زمین سے اٹھا کر جان بچا کے کمرے میں بھاگی۔

''کیوں؟... کیوں لایا تھا وہ اتنی زندگی۔'' وہ تھک کے نیچے بیٹھی رونے لگی۔

اصغر بھی وہیں بیٹھ گیا۔ دونوں کچھ گھنٹوں پہلے ہونے والے جھگڑے کو یکسر فراموش کیے اپنے اس درد مشترک کا سوگ منا رہے تھے۔ انہیں اس شور میں باہر رکتے رکشے کی آواز نہیں آئی تھی مگر رکشے سے اترتی منزہ کو باہر تک نصرت کے بین سنائی دیے۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

وہ سہمی ہوئی نظروں سے کبھی نظریں چراتی ثنا کو تو کبھی سامنے اپنے بڑے سے گھر کے پورے کھلے لوہے کے سیاہ گیٹ کو دیکھ رہی تھی۔

گیٹ کے باہر سے ہی اندر ہونے والی ساری ہلچل دکھائی دے رہی تھی۔ بڑے سے لان اور پورٹیکو میں قناتیں لگی تھیں۔ وہ ثنا سے ایک بھی لفظ پوچھے بغیر ڈولتے ڈگمگاتے قدموں سے اندر بڑھنے لگی۔

دریاں بچھی تھیں۔ بہت سے شناسا اور اجنبی مردوں کے چہرے نظر آئے۔ سب سوگوار انداز میں بیٹھے تھے۔ وہ گیٹ پہ کھڑی دور سے ہی اندر بیٹھی بے شمار عورتوں کو دیکھ رہی تھی۔ نصرت اور شمیم کی آہ و بکا سن رہی تھی۔ اس کے ایک اندازے کی تصدیق تو ہو گئی تھی مگر دوسرے.....

''کون.....؟'' اس کے دل نے بڑے ڈرے ڈرے انداز میں سوال اٹھایا۔

اندر ایک کونے میں دو پولیس والے مظہر کے خالہ زاد بھائی کے ساتھ باتیں کرتے نظر آئے۔

کہیں مظہر کا وہ غصہ تو رنگ نہیں لے آیا..... جس سے میں ہمیشہ دہل دہل جاتی تھی۔

اسے خیال گزرا کہ دونوں بھائیوں میں جھگڑا کوئی انہونی صورت تو اختیار نہیں کر گیا تھا۔ کہیں مظہر نے طیش میں آ کے اصغر کی اس نئی نویلی بیوی کو تو.....

''بھٹی صاحب کو ہسپتال سے لے آئے ہیں؟'' گزرتے ہوئے ایک پڑوسی کی آواز کانوں میں پڑی۔ وہ مظہر کے ابا جی کے بارے میں اصغر کے کسی دوست سے پوچھ رہا تھا۔

''اوہ..... تو کیا ابا جی.....'' اب اس کا دھیان سسر کی جانب گیا اور حیرت کی بات تھی کہ اگرچہ سسرال میں ان کا رویہ باقی سب کی نسبت غنیمت تھا اور وہ دل سے ان کا احترام کرتی تھی' اس کے باوجود اس بات پہ اس نے اپنے دل میں دکھ کے ساتھ ساتھ اندر کہیں ایک سکون سا بھی اترتے محسوس کیا۔ کم از کم اس کے وہ بدترین اندیشے تو غلط ثابت ہوئے کہ مظہر کے ہاتھوں اصغر کی بیوی نہ ماری گئی ہو۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے دل کو اس بے حسی اور خود غرضی کے مظاہرے پہ ڈانٹا۔ اپنے سسر کی صورت اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔

''بھالی...! یہ کیا ہو گیا؟ ابا جی تو بھلے چنگے تھے۔'' مرکزی دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس نے پلٹ کر دکھ اور بے یقینی سے ثنا کو دیکھا۔ جو کب سے رو کے آنسو کھل کے بہا رہی تھی۔

منزہ کے آنسو بھی بے اختیار ہو گئے۔ اب اس کے قدموں میں تیزی آ گئی۔

''اندر داخل ہوتے ہی اس نے لاؤنج میں عورتوں کے ہجوم کے درمیان لٹے پٹے انداز میں بیٹھی نصرت کو دیکھا۔

''امی.....

اس وقت اس عورت کے چہرے پہ اتنے گہرے دکھ تھے کہ منزہ پل میں اس کی ساری زیادتیاں' سارے مظالم بھول گئی۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ بھاگ کے اس سے لپٹ جائے اور اسے تسلی دے..... کوئی دلاسہ دے۔

شمیم بھی سوگوار انداز میں چارپائی کے پائے پہ سر رکھے نظر آ رہی تھی جس پہ سفید چادر اور گلاب کی پتیوں سے ڈھکا وجود رکھا تھا۔ وہ ثنا سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے آگے بڑھی۔

''امی! یہ یہ کیا ہو گیا؟''

''ہائے میری بچی' ہم برباد ہو گئے۔'' نصرت نے اسے دیکھ کے دونوں بازو بلند کیے۔ اصغر جواب تک ماں کی گود میں سر رکھے آنسو بہا رہا تھا' اٹھ کے بھائی کو دیکھنے لگا جو رو رہی تھی' غم زدہ اور اداس بھی لگ رہی تھی۔ مگر وہ سب اسے نظر نہ آیا جس کی توقع تھی اور جس کا ڈر تھا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے ذرا دور کھڑی ثنا کی جانب دیکھا۔ وہ لب کچلتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔ اصغر ایک سرد آہ بھر کے ماں سے الگ ہو کے سوچنے لگا۔

''یہ کڑا مرحلہ ابھی باقی ہے۔''

دوسری جانب منزہ' نصرت کے گلے لگتے ہی جھجک سی گئی۔ وہ والہانہ اسے چوم رہی تھی اور اسے سینے سے لگا لگا کے دھاڑیں مار رہی تھی۔ منزہ کے لیے اس کا یہ روپ باعث حیرت تھا۔

''بس کرو نصرت! اپنی بہو کو ہی دیکھ لو کتنے صبر اور حوصلے سے کام لے رہی ہے۔'' انہی خاتون نے ایک بار پھر کہا۔

''اور کیا..... تمہارا دکھ بھی کم بڑا نہیں مگر اس کے آگے تو ساری زندگی پڑی ہے۔''

منزہ یہ تبصرہ سن کے الجھ گئی اور ٹکر ٹکر سب کا منہ دیکھنے لگی۔ اب اس نے غور کیا کہ کلثوم بھالی جو خاندان کی کسی تقریب میں شرکت کرنے گئی ہوئی تھیں' وہ بھی نظر آ رہی تھیں۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کے میکے سے بھی سب پہلے سے موجود تھے۔

ثنا بھالی کے میکے والے بھی موجود تھے۔ خود اس کی اپنی سگی خالہ اور چچی بھی بیٹھی تھیں۔ کلثوم بھالی اس کی نظروں کی تاب نہ لا کے منہ ڈھانپ کے رونے لگیں۔ منزہ جس نے کچھ دیر قبل وہاں کھڑے ان گنت اندازے لگا لیے تھے اب بالکل گنگ تھی۔

اس کا ذہن جیسے بالکل ماؤف ہو چکا تھا..... کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے یکسر محروم۔

''مظہر' وہ اب تک نہیں آئے؟'' بہت دیر بعد وہ اٹک اٹک کے اصغر سے پوچھنے لگی۔

''انہیں تو اطلاع دے دی ہو گی؟'' وہ سوال کر رہی تھی۔

کئی عورتوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ کئی کی نگاہوں میں ترحم اور ہمدردی تھی۔ سب کے چہروں کے عجیب و غریب تاثرات دیکھتی ہوئی اچانک اس کی نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔

اصغر کے ایک دوست اور اس کے بھائی جمشید کا سہارا لے کر اندر آتے ہوئے وہ اس کے سسر تھے۔

اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ جمشید نے بہن کو دیکھ کے سر جھکا لیا تھا۔

منزہ نے پلٹ کے چارپائی پہ ابدی نیند سوئے وجود کو دیکھا۔ اصغر نے اسے پکڑنا چاہا مگر وہ اٹھ کے پل بھر میں یہ چھ سات قدموں کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے سفید چادر کا کونا الٹا۔

''مظہر.....''

اس کی دلدوز چیخ وہاں موجود سینکڑوں لوگوں کا سینہ چیر گئی۔

☼ ☼ ☼

اپنے کمرے میں موجود رینا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے ٹہل رہی تھی۔ آج تیسرا دن تھا اس نے اصغر کی ہدایت پہ کمرے سے جھانک کے نہیں دیکھا تھا۔

اور کوئی حالات ہوتے تو وہ اصغر کے اس حکم کو رکھتی اپنے جوتے کی نوک پہ اور جان بوجھ کے نصرت اور شمیم کو کلسانے کے لیے بار بار ان کے سامنے آتی لیکن یہ موقع ہی ایسا نازک تھا۔

اصغر اس بری طرح بکھرا ہوا تھا کہ اس موقع پہ وہ کسی بے وقوفی کا مظاہرہ کر کے بازی اپنے خلاف نہیں الٹ سکتی تھی۔ الٹا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی دلجوئی کرتے ہوئے یہ احساس دلا رہی تھی جیسے اس کے غم میں برابر کی شریک ہو۔

رات گئے جب اس کے کمرے میں لوٹنے کا وقت ہوتا تو وہ ہل ہل کے سیپارے پڑھنے میں مصروف ہو جاتی۔ اسے دن بھر کمرے میں بند رہنے کا۔ نصرت اور شمیم کے اہانت آمیز رویے کا گھر آئے عزیز و اقارب کے طرح طرح کے تبصروں کا اصغر کے تین دن سے ذرا سا بھی وقت نہ دینے کا، غرض کسی بات کا گلہ اس نے اب تک نہ کیا تھا اور اصغر کے پہلے سے جیتے دل کو اور بھی مٹھی میں کر لیا تھا۔

تیسرے دن تک بھائی کی موت کا غم بھی قدرے ہلکا ہو گیا تھا۔ اب اسے ماں کا طرزِ عمل سنگدلانہ اور غیر حقیقی لگنے لگا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی رینا کو دیکھا جو دوپٹہ ماتھے تک لپیٹے سیپارہ غلاف میں رکھ رہی تھی۔

"چلے گئے مہمان؟" قریب آتے ہوئے اس نے بڑی دلسوزی سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ تھکا تھکا سا بیٹھ گیا۔ یوں تو تین دن سے تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا لیکن جو رشتے دار پچھلے تین دنوں سے یہیں رہ رہے تھے وہ بھی ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔

ہر وقت سسکیوں، آہ و بکا سے لرزتی دیواروں والا یہ دو منزلہ گھر ایک دم سنسان مگر سوگوار سا سکوت لیے نظر آ رہا تھا۔

"امی کا غصہ کچھ کم ہوا؟" وہ چپ رہا۔

"میں جاؤں ان کے پاس؟"

"سر تڑوانے؟"

"ایسے کب تک چوروں کی طرح اندر چھپی رہوں۔ اب تو مجھے بھی لگنے لگا ہے جیسے بھائی جان کی موت میری وجہ سے ہوئی ہے۔"

وہ رقت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ تین دن سے وہ اصغر کے آنسو پونچھ رہی تھی، اب بہا رہی تھی تو اصغر بھلا کیسے برداشت کرتا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو رینا! مظہر کا جانا واقعی قیامت سے کم نہیں لیکن یہ تقدیر میں لکھا تھا۔ اس میں تمہارا کیا قصور؟"

"اگر تم مجھے یونہی چھپا چھپا کے رکھتے رہے تو مجھے ایسا ہی لگے گا بلکہ دوسروں کو بھی لگے گا۔ سب مجھے مجرم سمجھیں گے۔"

"ہاں، مجھے اندازہ ہے لیکن اس وقت....."

"گھر کی بات ہے اصغر! اور امی کون سا غیر ہیں۔ بزرگ ہیں میری، ماں کی جگہ اور پھر ایسے وقت میں ان کی ذہنی حالت بھی ٹھیک نہیں وہ کچھ کہہ لیں گی، ماریں گی تب بھی میں برا نہیں مانوں گی۔"

وہ یقین دلا رہی تھی مگر اصغر بے یقین سا تھا۔ اسے اپنی ماں سے رینا کی پہلی ملاقات یاد آ رہی تھی، وہ نصرت کو خاصی بھاری پڑی تھی۔

"یاد نہیں، اس دن ستر عورتوں کے سامنے انہوں نے مجھے ادھیڑ کے رکھ دیا تھا مگر میں نے اف تک نہیں کی تھی۔" رینا نے اس دن کا حوالہ دیا۔ اصغر کچھ کچھ یقین لے آیا۔

"واقعی تمہارا ظرف بڑا ہے، بہت حوصلہ ہے تم میں۔"

"یہ ظرف اور حوصلے کی نہیں، محبت کی بات ہے اصغر جی!" اس کے اندر کی طوائف انگڑائی لے کے بیدار ہوئی اور اپنے مطلب کے لیے اس پہ نثار ہونے لگی۔

"مجھے امی کے پاس جانے دیجیے۔ اب تو مہمان بھی چلے گئے۔ وہ میرے ساتھ جو بھی کریں گی۔ میں سہہ لوں گی۔ کون سے دیکھنے والا؟ گھر کی بات گھر میں ہی رہے گی لیکن کم از کم ان کے دل کا سارا غبار تو نکل جائے گا۔"

"تم کتنی اچھی ہو رینا!" وہ اس کے ہاتھ تھام کے عقیدت سے چومنے لگا۔

"اچھے تو آپ ہیں اصغر جی! جو مجھے اس گھر کی عزت بنا کے لائے اور مجھے پیار کے ساتھ ساتھ عزت اور اعتبار بھی دیا۔ اس گھر کے سکون کی خاطر تو میں کچھ بھی کر گزروں گی۔"

وہ نیک بیبیوں کی طرح دوپٹہ سر پہ اوڑھے کمرے سے نکلی۔ مگر نصرت کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اس کی چال میں طنطنہ آ چکا تھا۔ دوپٹے کا پلو ایک جھٹکے سے اس نے پیچھے پھینکا اور زور سے دروازہ کھولا۔

شمیم، نصرت کو دوا کھلانے کے بعد سہارا دے کر بستر پہ لٹا رہی تھی۔ دونوں اس کی اس اچانک اور دھماکہ خیز آمد پہ حیران ہو کے اسے دیکھنے لگیں۔ شمیم نے گردن گھما کے وال کلاک کی سمت دیکھا۔ رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔

"تو.... ؟ تیری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں گھسنے کی؟ یہ تیرے کسی یار کا کمرہ نہیں ہے جہاں دندناتی ہوئی گھس آئی ہے۔"

تین دن سے رو رو کے نصرت کا گلا بیٹھ چکا تھا اس کے باوجود اس نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگانا چاہا۔ رینا جانتی تھی کہ وہ اسے دیکھ کے یونہی مشتعل ہو جائے گی، اس لیے جان بوجھ کے نہ صرف اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ آئی تھی بلکہ اس دروازے کو بھی کھلا رہنے دیا تھا۔

نصرت کی آواز بڑی آسانی سے گھر پہ چھائے ماتمی سناٹے کو چیرتے ہوئے اصغر کے کانوں تک پہنچنا تھی اور اسے اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آنے میں بس ایک آدھ منٹ ہی لگنا تھا، وقت کم تھا مگر وہ اس ایک آدھ منٹ کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے عین نصرت کے سر پہ پہنچ کر اس نے بڑے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں مگر قدرے کم آواز میں اس کے چہرے پہ نظریں گاڑ کے کہا۔

"رسی جل گئی، بل نہیں گیا۔ کیوں ری بڈھی ڈائن.... ! ایک بیٹے کو دفنا کے تیرا دم خم نہیں نکلا؟ ابھی تک وہی اکڑ؟.... خیر بڑی دیکھی ہیں تیرے جیسی تھکی ہوئی عورتیں۔ میں نے بھی اگلے ہی جھٹکے میں ساری اکڑ نہ ختم کی تو نام بدل دینا۔"

اس سے آگے اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ نصرت کسی زخمی شیرنی کی طرح اس پہ پل پڑی تھی۔ اسی وقت اصغر اندر داخل ہوا اور رینا کو ماں سے چھڑانے لگا۔

"دماغ خراب ہو چکا ہے امی کا۔" وہ شمیم کو مدد کے لیے بلا رہا تھا مگر وہ الٹا اس پہ چڑھ دوڑی۔

"دماغ تمہاری اس آوارہ بیوی کا خراب ہوا ہے۔"

"میں جتنا لحاظ کر رہا ہوں، اتنا ہی دونوں بڑھتی جا رہی ہو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے رینا کو نصرت سے الگ کیا اور دھکا دے کر ماں کو بستر پہ گرانے کے بعد سسکتی ہوئی رینا کو بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ بھی کسی زخمی چڑیا کی طرح اس کے سینے سے لگی ہچکیاں لے رہی تھی۔

بستر پہ گرنے کے انداز میں بیٹھی نصرت پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی یہ ڈرامے بازی دیکھ رہی تھی۔

منزہ یہ شور سن کے اپنے کمرے کے دروازے تک آئی مگر صورت حال کا اندازہ کرنے وہیں رکی رہی.... اس کے پیچھے ثنا تھی و آج رات اس کے پاس رک رہی تھی۔ پچھلی دو راتیں کلثوم بھابی نے اس کے ساتھ گزاری تھیں۔

"تین دِنوں سے جینا عذاب کر رکھا ہے تم دونوں نے۔ ٹھیک ہے۔ مظہر جوان موت مر گیا۔ مجھے بھی اکلوتے بھائی کا غم ہے۔ مگر میں یہ غم دوسروں پہ نہیں نکالتا پھر رہا۔ اس بے چاری کا کیا قصور ہے جو اسے منٹ منٹ پہ پیٹ ڈالتی ہو۔ کتنے دنوں سے کمرے میں چوروں کی طرح قید ہے۔ یہ سب دکھانے کے لیے میں اسے یہاں لایا تھا۔

"نہیں، تو اسے ماں کو ذلیل کروانے لایا تھا۔"

"ذلیل تو یہ بیچاری ہو رہی ہے۔ کتنے شوق سے آئی تھی یہ تمہارے پاس اور کیا حال کر کے رکھ دیا ہے۔"

"شوق سے؟ یہ شوق سے آئی ضرور تھی مگر ایک دکھی ماں کے کلیجے میں سوئی چبھونے۔۔۔۔ تجھے نہیں پتا اس نے میرے ساتھ کیا کیا باتیں کی ہیں۔" وہ رونے لگی۔

"رہنے دو امی! رہنے دو۔ میں مظہر نہیں ہوں جس کے سامنے کچھ بھی بول دو گی۔ ایک منٹ پہلے تو یہ نکل کر اپنے کمرے سے ایک منٹ میں اس نے کون سے تیر مار دیے ہیں۔"

"امی صحیح کہہ رہی ہیں اصغر۔۔۔۔! یہ ذلیل۔" شمیم نے گواہی دینا چاہی مگر اصغر نے اسے بری طرح ڈپٹ کے رکھ دیا۔

"تُو تو منہ نہ ہی کھول تو اچھا ہے۔ یہ تو ہی ہے ماں کو نئی نئی باتیں سکھانے والی۔ ورنہ امی تو مظہر کے غم میں چور بیٹھی تھیں۔ تیری پڑھائی پٹی میں آ کے ہی یہ نیا ڈرامہ کھیلا گیا ہے۔"

وہ اسی طرح رینا کو سینے سے لگائے لگائے کمرے سے نکلا۔ اس نے بالکل سامنے کھلے دروازے پہ کھڑی منزہ اور اس کی بھابی کی جانب آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا تھا البتہ وہ دونوں دیکھ چکی تھیں۔

دیکھ چکی تھیں کہ کیسے نکلتے ہوئے رینا نے پلٹ کے نصرت اور شمیم کو فاتحانہ مسکراہٹ سے نوازا تھا۔

ثنا نے تعجب سے کچھ جتاتے ہوئے منزہ کو دیکھا۔ وہ بے دلی سے ثنا نے اچکا کے رہ گئی اور ایک گہری تھکی ہوئی سانس لے کر دروازہ بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کس قسم کی عورت کو گھر لے آیا ہے تمہارا دیور؟" ثنا نے اس کے برابر بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے اچنبھے سے پوچھا تھا۔

منزہ کوئی بھی جواب دیے بغیر بیڈ شیٹ کے بڑے بڑے نیلے پھولوں پہ انگلیاں پھیرتی رہی۔ کلمہ سے شاید ہی اس کے ہونٹوں سے کوئی لفظ ادا ہوا ہو۔ وہ سکتے کی کیفیت میں نہیں تھی مگر اس کی گویائی جیسے ساظ کی چاہ کھو بیٹھی تھی۔

کل سے وہ اسی گم صم کیفیت میں کسی معمول کی طرح چل پھر رہی تھی اور اس سے پہلے کا دن۔۔۔۔ یہ تو خود اسے بھی یاد نہیں تھا کہ کیسا گزرا تھا۔ اسے فقط اتنا یاد تھا کہ سفید چادر کے ہٹاتے ہی اسے مظہر کا پُرسکون چہرہ نظر آیا تھا اور اور اس کے بعد۔۔۔۔ بس یہاں اس کی یادداشت ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد کا پہلا منظر جو اسے یاد آتا تھا شاید یہی وہ منظر تھا جو اسے ہوش کی دنیا میں واپس لایا تھا۔ اس کی بھابی نے بری طرح بلکتی سوہا کو اس کی گود میں ڈالا تھا اور کہا تھا۔

"منزہ، بس کرو بس کرو منزہ!" وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھیں اور روتی ہوئی سوہا اپنے ننھے منے گیلے ہاتھ اس کے گالوں پہ مار مار کے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ادھر دیکھو منزہ! یہ تمہاری بیٹی، یہ معصوم بچی اس نے بھی باپ کھویا ہے مگر اس بدنصیب کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا غم سنا رہا ہے کوئی بھائی کا، تم اپنے شوہر کا مگر اسے کون دیکھے؟ اس ڈھائی تین برس کی یتیم بچی کو کون دیکھے گا۔ جسے یہ بھی نہیں پتہ کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے۔ وہ تو صرف اسی بات پہ رو رو کے ہلکان ہو رہی ہے کہ اس کی ایک آواز پہ اپنے سارے کام چھوڑ کے اس کی جانب لپک کر آنے والے پاپا اس کے بار بار بلانے پہ بھی اٹھ کیوں نہیں رہے؟ اس کی ساری فرمائشیں پوری کرنے والے، ہر بات ماننے والے پاپا اس کے بلا کے جگانے پہ بھی جاگ کیوں نہیں رہے تھے اور، اور کچھ لوگ اس کے پاپا کو اٹھا کے اس سے دور کیوں لے گئے ہیں؟ اٹھو منزہ! کم از کم تم تو اسے دیکھ لو۔ مظہر مجبور تھا۔۔۔۔ اللہ نے اسے زندگی ہی اتنی دی تھی لیکن تم، تم کیسے اس سے لاپروا ہو سکتی ہو؟ کیسے اپنے غموں میں اسے بھول سکتی ہو؟"

کاظم بھابی کی باتیں اسے سوہا کی جانب کھینچ رہی تھیں۔۔۔۔ وہ اپنی بیٹی کو سینے سے بھینچ کر ایسے روئی کہ حلق پھاڑتی سوہا تک سہم کے چپ ہو گئی تھی۔

اس کے بعد اس نے ایک گہری چپ سادھ لی تھی۔ وہ یا تو مظہر کے ایصالِ ثواب کے لیے کچھ نہ کچھ پڑھتی نظر آتی یا کسی معمول کی طرح چھوٹے موٹے کام نبٹاتی۔ اس خاموشی میں بھی اس کے چہرے پہ بلا کی حکایتیں ہوتیں۔ جن کو دیکھنے والے سمجھ جاتے اور آہ بھر کے رہ جاتے۔

ابھی بھی جب ثنا کے بار بار بلانے پہ بھی منزہ بس ایک خاموش نظر اس پہ ڈال کے رہ گئی تو ثنا کا دل یکدم دکھ سے بھر گیا۔ اس کا دل چاہا ہاتھ جوڑ کے اس سے التجا کرے کہ وہ کم از کم اسے تو اس نظر سے نہ دیکھا کرے۔ یہ نظر جو سہارنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

"کیا مظہر اس عورت سے مل چکا تھا؟" اس نے ایک اور کوشش کی اسے بولنے پہ اکسانے کی۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے پاس ہی سوئی ہوئی سوہا کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"اگر مل لیتا تو شاید تمہیں اور اپنی بیٹی کو اس عورت کے ساتھ اس چھت کے نیچے رکھنے پہ کبھی تیار نہ ہوتا۔"

وہ تب بھی چپ رہی۔

"اس نے تو تمہاری ساس اور نند جیسی عورتوں کو بھی مات دے دی۔۔۔۔ تمہارا کیا حشر کرے گی؟۔۔۔۔ کبھی سوچا؟"

اس بار منزہ نے اسے یوں دیکھا جیسے ان سب باتوں کا مقصد پوچھ رہی ہو۔ ثنا اس کا سوال بھانپ کے ہلکا سا کھنکھاری۔۔۔۔ جیسے کسی بات کا، کسی بہت خاص بات کا آغاز کرنے والی ہو۔

"منزہ! میرا بلکہ تمہارے بھائیوں کا بھی، ہم سب کا خیال ہے کہ مظہر کے بعد اب تمہارا یہاں رہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔"

وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھی اور گھائل نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ثنا اس کے ہاتھ پہ اپنے ہاتھ کا محبت بھرا دباؤ ڈالتے ہوئے گویا ہوئی۔

"گھبراؤ مت، ہم جانتے ہیں ابھی تمہارا جانا ذرا معیوب لگے گا۔۔۔۔ ابھی ہم تمہیں نہیں لے جا رہے۔ کم از کم مظہر کے چہلم تک یا پھر اپنی عدت پوری کرنے تک تو تمہیں یہیں رہنا ہو گا۔"

منزہ نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے مظہر کے حوالے سے قل، تدفین، چہلم اور عدت جیسے الفاظ گزشتہ تین دنوں سے اسے مسلسل تکلیف دے رہے تھے۔

"پہلے سے اس لیے بتا رہی ہوں تاکہ تم ذہنی طور پہ تیار رہو۔ یہ تمہارا گھر نہیں ہے منزہ! سسرال وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ ایک شوہر کا رشتہ ہوتا ہے جو سب سے باندھ کے رکھتا ہے۔ سارے سسرالی رشتے اس سے وابستہ ہوتے ہیں اور جب وہی نہ رہے تو۔۔۔۔

ہاں جہاں پیار، محبت، خلوص اور ہمدردی ہو وہاں بھی گزارا ہو جاتا ہے جبکہ اس گھر کے مکین ان اوصاف سے قطعاً عاری ہیں اور سب سے بڑھ کے یہ آوارہ عورت یہ تو تمہیں کھا جائے گی۔ منزہ! اس لیے اب خود کو یہاں سے جانے کے لیے آمادہ کرنا شروع کر دو۔ یہی تمہارے اور تمہاری بچی کے حق میں بہتر ہو گا۔"

منزہ بغیر کچھ کہے بت کی مانند بیٹھی رہی۔ ثنا تو دو تین کروٹیں بدلنے کے بعد سو گئی مگر اس کی نیندیں تو تین راتوں سے روٹھی ہوئی تھیں۔ اب اس کی باتوں سے اسے اپنی رہی سہی زندگی بھی روٹھتی نظر آنے لگی۔

"میں اب کبھی مظہر سے نہیں مل سکتی۔ کبھی اسے دیکھ نہیں پاؤں گی۔ ابھی تک میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہی کامیاب نہیں ہو سکی اور آپ، آپ مجھے ان دیواروں سے، اس گھر سے بھی دور کرنا چاہتی ہیں۔

کیا اب میں یہ سب بھی کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی یہ سب جو مجھے مظہر کی یاد دلاتا ہے۔ مجھے یہ احساس دلاتا ہے کہ مظہر نہیں ہے مگر اس کا سب کچھ اب بھی میرے پاس ہے' میرے اردگرد......

یہ الماری جس میں اس کے کپڑے ٹنگے ہیں' یہ آئینہ' جس میں اس کا عکس رہ گیا ہے' یہ کنگھا جو روز اس کے بالوں کو سنوارتا تھا۔

یہ تولیہ جو اس کے بدن کی نمی جذب کرتا تھا۔ یہ رومال جو اس کے پسینے سے مہک رہے ہیں۔ یہ تکیہ' یہ چادر' یہ کمبل' یہ چشمہ' یہ کرسی یہ سب...... یہ سب بھی میں نہیں دیکھ سکوں گی؟"

آنسو ٹپ ٹپ اس کی گود میں گرنے لگے۔ اسے لگا آج مظہر کی وفات کے تیسرے دن' بہت سی موتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ وہ ان سب کا ماتم کر رہی تھی۔

"کیا آج کے بعد مجھے اجنبی چھت کے نیچے' اجنبی دیواروں کے درمیان' اجنبی چیزوں کے ساتھ جینا ہوگا؟ نہیں' میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے ایک عزم کے ساتھ اپنے آنسو پونچھے۔

"مظہر کو روکنا میرے اختیار میں نہیں تھا لیکن اس کی یادوں کے ساتھ' اس کی نشانیوں کے ساتھ جینا میرے اپنے اختیار میں ہے۔ میں اس سے کبھی محروم نہیں ہوں گی۔"

☼ ☼ ☼

کافی عرصے بعد پروین' سراج دین کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی تھی ورنہ وہ اکیلی ہی جایا کرتی۔ یا جب ساجدہ زندہ تھی تب اس کے ساتھ بازار جانے میں بھی مزہ آیا کرتا تھا۔

رخشندہ کا مزاج ایسا تھا کہ وہ خود ہی الگ تھلگ رہنا پسند کرتی تھی۔ اسے اپنے ساتھ بازار جانے کی دعوت دیتے ہوئے پروین خود ہی جھجک جاتی۔ اتنے سالوں کے ساتھ نے بھی دونوں میں دیورانی جٹھانی والا دوستانہ رشتہ پیدا نہ ہونے دیا تھا۔

حالانکہ اس عرصے میں دونوں کے مابین ہلکی سی تلخ کلامی کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔

آج جب بچوں کے اصرار پہ وہ انہیں جوائے لینڈ لے کے آئے اور پروین کے ایک بار کہنے پہ ہی صنعتی نمائش کا ایک چکر لگا لینے پہ راضی ہو گئے تو پروین کی تو سمجھو دلی مراد بر آئی۔

اس کے گھر سے صنعتی نمائش خاصی دور پڑتی تھی۔ اکیلے آنے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ جوائے لینڈ کا پروگرام بنتے ہی اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ اس کے بالکل ساتھ ہی لگی نمائش میں ضرور جائے گی۔

سراج دین کا موڈ بھی کبھی کبھار ہی اچھا ہوتا تھا۔ اتفاق سے آج بھی تھا۔ بچوں نے جوائے لینڈ میں جی بھر کے تھکایا بھی تھا اس کے باوجود اب تک بے زار نہ ہوئے تھے۔

معراج کے چاروں بچے بھی ہمراہ تھے اور وصی تو خیر ہر وقت ساتھ ہوتا ہی تھا۔

"یہ دیکھیں ان ٹراؤزرز کے ساتھ یہ شرٹس اچھی لگیں گی؟"

اس نے سراج سے رائے لینا چاہی۔ پہلے وہ بے رغبتی سے سرسری نظر ڈالتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئے پھر کچھ خیال آنے پہ آہستہ سے کہنے لگے۔

"حسن' حسان کے لیے لے رہی ہو؟"

"نہیں' وصی کے لیے بھی لے رہی ہوں۔ تینوں کے دو دو سوٹ لے لیتی ہوں۔"

"رضا اور عمیر بھی ساتھ ہیں۔ برا لگے گا اگر......"

"ٹھیک ہے' میں پانچوں کا ایک ایک سوٹ لے لیتی ہوں۔" پروین نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ اور سیلز مین سے رضا اور عمیر کے سائز بھی نکلوانے لگی۔

"اور چچی' ہمارے لیے......" ثمرہ نے لاڈ سے کہا۔

"یہ گلے اسٹال پہ بڑے پیارے سندھی اور بلوچی ڈریسز ہیں۔ وہ دیکھتی ہوں تمہارے اور حمرہ کے لیے۔"

پروین نے مسکراتے ہوئے اس کے گال تھپتھپائے۔

اسے ثمرہ سے خاص انس تھا۔ وہ تھی ہی پیار کے قابل۔ سب سے گھل مل جانے والی' سب کا خیال رکھنے والی رخشندہ سے بالکل مختلف مزاج کی۔

حمرہ اور ثمرہ کے لیے بلوچی فراک اور سندھی کڑھائی والے کرتے دیکھتے ہوئے اسے گھیردار سا' شیشے کے کام سے سجا ایک ننھا منا چھوٹا سا فراک نظر آیا۔ وہ اشتیاق سے اسے اٹھا کے دیکھنے لگی۔

"اس سے چھوٹا سائز ہے؟"

"نہیں باجی! یہ سب سے چھوٹا سائز ہے۔ ایک سال تک کے بچے کا۔"

"مجھے اس سے چھوٹا چاہیے' تقریباً" تین چار مہینے کی بچی کا۔"

"اس میں تو اور سائز نہیں' یہ جامنی دیلوٹ والا لے لیں۔ یہ چھ مہینے کی بچی کا سائز ہے۔"

"بڑا لگ رہا ہے۔" وہ ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔ فراک تو یہ والا بھی بہت خوب صورت تھا۔

"باجی! یہ بھی تو دیلوٹ کا۔ سردیاں آتے آتے پورا آ ہی جائے گا۔" چرب زبان سیلز مین ہر حربہ آزما رہا تھا اسے بیچنے کے لیے۔

"آف سیزن ہونے کی وجہ سے سستا بھی مل رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے' ایک یہ رکھ دیں اس میں پنک یا ریڈ کلر ہے؟"

"یہ اتنا سا فراک کس کے لیے لے رہی ہو؟" اب تک خاموش کھڑے سراج دین نے سیلز مین کے پلٹتے ہی خشک لہجے میں پوچھا۔

"وشمہ کے لیے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"آنٹی ساجدہ کی بیٹی؟ وہ چھوٹی سی' پیاری سی؟ سچ کتنی اچھی لگے گی اس فراک میں۔" ثمرہ سن کر خوشی سے بولی۔

"لے لوں؟" پروین نے آہستگی سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"لے لو...... بلکہ لے چکی ہو۔" شاہانہ بے پروائی سے اجازت دیتے ہوئے جتایا بھی گیا۔

"کیا فرق پڑتا ہے' جہاں سب کے لیے اتنا کچھ لیا ہے' ایک اس بیچاری کے لیے بھی۔ دو تین سو روپے کے لیے میں کیوں منع کرنے لگا۔" پروین کا دل اس انداز پہ بجھ سا گیا۔

"یہ لیں باجی! آپ کی قسمت اچھی ہے اس ڈیزائن میں یہ سرخ رنگ کا آخری پیس بچا ہے' پیک کردوں؟"

"نہیں' رہنے دو۔" پروین نے آنسو اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت بڑا ہے۔"

سراج نے بھی پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ اس نے لیتے لیتے وہ فراک کیوں چھوڑ دیا۔ وہ خاموشی سے باقی چیزوں کی پے منٹ کرنے لگے۔ پروین ہمیشہ کی طرح دل ہی دل میں گلہ کر کے رہ گئی۔

"میں یہ فراک وشمہ کے لیے اپنی خوشی سے لے رہی تھی میاں صاحب' ترس کھا کے نہیں۔ یہ ایک تحفہ تھا جسے آپ نے عطیہ یا خیرات بنا دینا چاہا۔ ورنہ اس کے باپ نے اس کے لیے کسی چیز کی کمی تو نہیں رکھی ہوئی۔"

پھر اس کا دل شاپنگ میں نہ لگ سکا۔ صرف بچوں کی خوشی کی خاطر ان کی چیزیں خریدیں اور ان کی فرمائشیں پوری کیں۔ ضرورت کی وہ سب چھوٹی موٹی چیزیں جن کی لسٹ وہ راستے بھر ذہن میں ترتیب دیتی آئی تھی سب رہنے دیں۔

سراج کے ایک آدھ بار کے اصرار کے باوجود اپنی بھی کوئی چیز نہ خریدی جو ان کا موڈ خراب کر گئی۔

واپسی پہ وہ خاصے غصے میں نظر آ رہے تھے۔ یہ بھڑاس گھر آ کے نکلی۔

"الٰہی خیر۔" شوکت جہاں افشاں و خیزاں اپنے کمرے سے باہر آئیں جہاں سراج دین چیزیں پٹختے ہوئے دھاڑ رہے تھے۔

"کیا ہوا ہے سراج! اچھے بھلے گئے تھے تم؟"

"مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں اماں جی! میں تو اچھا بھلا ہی گیا تھا' اسے خیال ہونا چاہیے کہ ایک مرد اگر ہفتے کے دن جان توڑ محنت کرنے کے بعد چھٹی کا دن آرام اور سکون سے گزارنے کے بجائے اپنی فیملی کو تفریح کی غرض سے باہر لے جا کر لور لور پھر رہا ہے تو اس بات کی قدر کرنی چاہیے' احسان مند ہونا چاہیے اس کا' نہ کہ منہ پھلا کر پھرنا چاہیے۔"

"تمہیں بتاؤ پروین! کیا ہوا ہے آخر؟"

مگر وہ کوئی جواب دینے کی بجائے ہاتھوں پہ سر گرا کے بیٹھ گئی۔ میاں کی بات پہ اس کا دل کس بری طرح دکھا لیکن پھر بھی وہ اس دکھ کو پی گئی تھی' پلٹ کر جتایا نہیں تھا' صرف اتنا قصور تھا کہ خود پہ ملمع چڑھا کے اپنی مرضی کے خلاف ان کے ساتھ ہنس بول نہیں سکی تھی اور اس بات کو وہ اتنا بڑھا گئے۔

اسے یہ تو محسوس ہو گیا تھا کہ وہ غصے میں ہیں لیکن گھر آتے ہی اس غصے کا مظاہرہ دیکھنے کو ملے گا' اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ ذہنی طور پہ ساس کی بازپرس کے لیے بھی تیار نہیں تھی اس لیے کوئی جواب نہ دے سکی۔

"یہ کیا بتائے گی اب.....؟ جو عورت ہر جگہ میکہ ساتھ ساتھ اٹھائے پھرنے کی عادی ہو' اس کے اپنے گھر کے حالات کیسے سدھر سکتے ہیں۔"

"کیا بہن شمشاد کو بھی ساتھ لے گئے تھے تم لوگ؟"

سراج کی بات سے شوکت جہاں نے یہی نتیجہ اخذ کیا جسے سن کر وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔

"میرا دماغ خراب نہیں ہے۔"

پروین نے تڑپ کے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"سر پہ سوار ہونے کے لیے کسی کا ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے اماں جی! میکہ اور میکے کی فکر اس کے سر پہ چوبیس گھنٹے تلوار کی طرح لٹکتی رہتی ہے۔"

"تم ہی سمجھنے کی کوشش کرو سراج! اس کے میکے کے حالات ہی ان دنوں ایسے ہیں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ان سے لاتعلق نہیں رہ سکتی' اور کیوں رہے۔ وہ اس گھر کی بہو بعد میں بنی' پہلے ان کی بیٹی ہے۔ اتنے سال تک تمہیں اس سے ایسا کوئی گلہ نہیں ہوا۔ اب اگر ہو رہا ہے تو اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرو اور پروین تم! جب تمہیں پتہ ہے کہ اس کا احساس مر چکا ہے۔ اس پہ دوسروں کے جذبات اثر نہیں کرتے تو کیوں اس کے سامنے وہ ذکر کرتی ہو؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اماں جی!" پروین نے اپنے لب کھولے۔ "میں نے صرف وشمہ کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ لینا چاہا تھا۔"

شوکت جہاں کو یہ سن کر شدید صدمہ پہنچا۔ وہ کئی ثانیے تک خاموش کھڑی تاسف سے سراج دین کو دیکھتی رہیں جو بے زاری اور تنفر سے سر جھٹک رہے تھے۔

"سراج! مجھے تم سے اس چھوٹے پن کی امید نہیں تھی۔"

"چلو بات ہی ختم' اس عورت کو ٹسوے بہا کر ہمدردیاں سمیٹنا خوب آتی ہیں۔"

"وہ ذرا سی بچی..... اس سے بھی ایسا سلوک۔ اسے اپنی سسرالی رشتے دار کی بجائے ایک عام بچی کی نظر سے دیکھو' تمہارے دل میں اس کے لیے ضرور جگہ پیدا ہو گی مگر تم نے تو خوامخواہ کا بیر پال رکھا ہے پورے سسرال سے۔ کیا فرق پڑتا اگر یہ اس بچی کے لیے کچھ خرید لیتی۔ اس کا پورا حق ہے تمہاری کمائی پہ اور یہ حق بھی ہے کہ وہ اسے جیسے چاہے' جہاں چاہے خرچ کرے۔"

"پہلے اس سے پوری بات تو پوچھیں اماں جی! اس کے بعد مجھ پہ الزام عائد کریں۔ اس سے پوچھیں کیا میں نے ایک بار بھی' ایک بار بھی منع کیا اس تحفے کو دینے سے..... کسی قسم کا کوئی بھی اعتراض کیا؟ ناک بھوں چڑھائی یا بتایا۔ میں نے تو اسی وقت جیب سے پیسے نکال لیے تھے مگر اسے بہانہ چاہیے اپنے میکے کی وجہ سے میرے ساتھ تعلقات بگاڑنے کا۔ خود ہی پسند کیا ہوا لباس پیک کرنے سے منع کر دیا اور منہ پھلا کے پھرنے لگی۔ منت کی کہ اللہ کی بندی اپنے لیے ہی کچھ لے لو مگر مزاج ہی ٹھکانے پہ نہ تھے۔ پتہ نہیں یہ اس قسم کی حرکتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہے۔"

وہ بک جھک کے باہر نکل گئے۔ شوکت جہاں نے سوالیہ انداز میں پروین کو دیکھا۔

"کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟"

"اماں جی! یہ سچ ہے انہوں نے زبان سے منع نہیں کیا مگر..... مگر آپ کبھی ان کا انداز دیکھتیں۔ جیسے کوئی بھیک دے رہا ہو۔"

"کیا کرتی پروین!" انہوں نے شاید پوری بات نہیں سنی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی کہ زبان سے منع نہیں کیا مگر انداز..... بیٹی! اب تم مرد کا ہر انداز زد میں لاؤ گی' اس کی ذرا ذرا سی بات پکڑو گی تو وہ زچ نہیں ہو گا تو کیا ہو گا؟ اور مرد بھی سراج دین جیسا تنگ مزاج۔"

"مگر اماں جان!"

"اور سچ پوچھو تو سراج میں مزاج کی کڑواہٹ کے علاوہ کوئی خاص قابل ذکر خامی ہے بھی نہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی خامیوں سے سمجھوتہ کر لینے والی عورتوں کے گھر ہی ہنسی خوشی بسے رہتے ہیں۔ تم کیوں نہیں اس کے مزاج میں ڈھل جاتی؟"

جواباً پروین ایک طویل آہ بھر کے رہ گئی جیسے اپنے سمجھوتوں' ور مزاج کی بے بسی کی تفصیل بتانے سے قاصر ہو۔ "وہ دل کا برا نہیں ہے۔ بس اپنی مرضی اور مزاج کے خلاف کچھ ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ احتیاط کیا کرو' تمہارے ہی حق میں بہتر ہے۔"

"کتنی احتیاط کروں اماں جی! میں ان کے سامنے اپنے گھر والوں میں سے کسی کا ذکر نہ بھی کروں' صرف ان کے ہونے کا احساس ہی میاں صاحب کا پارہ ہائی کر دیتا ہے۔"

"خیر ایسا ہمیشہ سے تو نہیں تھا۔ تمہارے بھائی نوید سے تو اس کا خاصا دوستانہ رہا ہے۔" شوکت جہاں نے اس کا یہ الزام قطعی بے بنیاد قرار دیتے ہوئے جھٹلایا۔

"اور اب انہی کی معصوم بے ضرر سی بچی سے خوامخواہ کا عناد پالے بیٹھے ہیں۔" وہ چڑ کے بولی تو شوکت جہاں نے بغور اس کا جھنجھلایا ہوا چہرہ دیکھا۔

وہ ان کا بہت لحاظ کرتی تھی' اس سے پہلے اس نے کبھی اتنی حجت نہیں کی تھی۔ انہوں نے بھی اپنی عزت اپنے ہاتھ والے سنہرے اصول کو یاد کرتے ہوئے اس بلاوجہ کی بحث کو سمیٹنے کا ارادہ کیا۔

"برا مت ماننا بیٹی! اسے اس بچی سے دشمنی کیوں ہونے لگی' ہاں چڑ ضرور ہو سکتی ہے' وہ بھی شاید تمہارے رویے کی وجہ سے' ورنہ گھر میں اور بھی بچے ہیں اس کے اپنے سگے بچوں کے علاوہ۔ میں نے اسے کبھی کسی بچے کے ساتھ سختی سے پیش آتے نہیں دیکھا۔"

وہ اٹھنے لگیں مبادا یہ بحث تلخی نہ اختیار کر جائے جس کا خدشہ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ پروین کے جواب پہ رک گئیں۔

"اگر ان کا رویہ سب ہی کے ساتھ ایک جیسا ہوتا تو یہ گلہ میرے دل میں جگہ بناتا ہی کیوں؟ میں اسے ان کے مزاج کا حصہ جان کے تسلیم کر لیتی لیکن باقی سب کے ساتھ اتنا مشفقانہ رویہ اور وشمہ کا نام آتے ہی....."

"بیٹی! بات کڑوی ضرور ہے مگر ہے سچ۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہ آخری بات کرنے رک گئیں۔

"وہ اس کے اپنے سگے بہن بھائیوں کے بچے ہیں' اس کا اپنا خون۔ ان کے لیے جو محبت اس کے دل میں ہے وہ کسی اور کے لیے پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اس قدرتی امر کو سنگدلی یا بے حسی کا نام دینا درست نہیں۔"

وہ چلی گئیں اپنی دانست میں بحث ختم کر کے مگر پروین کے ذہن میں کلبلاتے سوال اب بھی اسی طرح موجود تھے۔

"اور یہی قدرتی احساس اگر میرے دل میں کسی بھی عورت کے دل میں ہوتا تب اسے کیا نام دیا جاتا۔ عورت کے لیے یہ ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے کہ وہ سگے رشتوں کو 'خون کے رشتوں کو پس پشت ڈال کے ان رشتوں کو سر آنکھوں پہ بٹھائے جو کبھی اس کے نہیں ہو سکتے جیسے.....

جیسے اماں جی..... جن کو میں نے ہمیشہ اپنی ماں سے بڑھ کے پایا لیکن آخر تو وہ اپنے بیٹے کی ہی ماں نکلیں۔"

✲ ✲ ✲

"منزہ نے یہ بے کار کی ضد کر کے اچھا نہیں کیا۔" جمشید نے گھر واپس پہنچ کر نڈھال انداز میں بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"سچ پوچھیں تو مجھے بھی اس کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا۔"

ثنا نے تائید کی البتہ جمشید سے بڑے والے بھائی جمیل نے غیر جانب داری سے کہا۔

"وہ ہماری چھوٹی بہن ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اب اتنی بھی چھوٹی نہیں رہی۔ بہت سمجھدار اور باشعور ہے۔ ویسے بھی عمر سے زیادہ غم جھیلنے کے بعد انسان عمر سے زیادہ سمجھ بوجھ پالیتا ہے۔ اس نے بھی کچھ سوچ سمجھ کے ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا۔"

"وہ بے شک سمجھ بوجھ والی ہوگی بھائی جان!" ثنا نے کہا۔ "مگر یہ فیصلہ اس کی سمجھ داری نہیں۔ میں صرف اس کی بھابی ہی نہیں 'دوست بھی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس گھر میں سوائے مظہر کے اس کو کوئی بھی تھامنے والا نہیں ہے۔ مظہر اس کی ڈھال تھا اور اس کی بے پناہ چاہت اس کے لیے سب سے بڑا سہارا۔ اب نہ ڈھال ہے نہ سہارا۔ وہ لوگ بھیڑیے ہیں بھیڑیے 'کھا جائیں گے اسے چیر پھاڑ کے۔"

"بہر حال ہم اسے مجبور تو نہیں کر سکتے۔" جمیل ہمیشہ سے ہر معاملے سے لاتعلق رہنے کا عادی تھا۔ ثنا کی اس منظر کشی نے بھی اس پہ خاص اثر نہیں کیا تھا۔ کلثوم البتہ خاصی متاثر نظر آ رہی تھیں۔

"اس کی ساس تو ویسے آج کل خاصی سدھری ہوئی ہے۔ حالانکہ دو دھاری تلوار ہے لیکن اس مہینے ڈیڑھ مہینے میں 'میں جتنی بار گئی ہوں 'اس کا الگ ہی رنگ ڈھنگ دیکھا ہے۔ شاید جوان بیٹے کی موت نے سارا دم خم نکال دیا ہے۔"

"بھابی! اس گمان میں مت رہیں۔ وہ کبھی بھی اپنے اصل میں لوٹ سکتی ہیں۔ میں نے منزہ کو بھی خبردار کیا تھا کہ اس کی چار دن کی اپنائیت سے دھوکا مت کھائے اور وہ شمیم 'اور سب سے بڑھ کے وہ دیورانی وہ دونوں بھی ہیں۔" ثنا کے لہجے سے فکر مندی عیاں تھی۔

"میں نے تو بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پہ ڈٹی رہی۔" جمشید نے شانے اچکائے۔

"میں اسے اس کے حال پہ بھی تو نہیں چھوڑ سکتا۔ ٹھیک ہے اسے اپنا شوق پورا کر لینے دو 'جو بات ہم سب مل کے نہ منوا سکیں 'شاید وہ فیصلہ وقت کروا دے۔ ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں 'آج تو چہلم تھا مظہر کا۔"

□ □ □ □
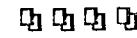
آج وہ اس کمرے میں بالکل اکیلی تھی

اپنی شادی کے تقریباً "چار سالوں میں آج رات.....

اگرچہ مظہر کے بغیر جو رات اس نے گزاری تھی وہ آج سے چالیس دن پہلے گزر چکی تھی مگر پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے میں اس کی تنہائی کا خیال کر کے کوئی نہ کوئی اس کے پاس ہوتا تھا۔

کبھی کلثوم بھابی رات کو رک جاتیں۔ کبھی ثنا دو چار دن گزار جاتی 'کبھی خالہ 'تو کبھی اس کی ساس۔

وہ اکیلی ہوتے ہوئے بھی تنہا نہیں ہوتی تھی۔ سب کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا دھیان

بٹائے رکھیں۔

اور آج وہ بالکل اکیلی تھی۔

بالکل اکیلی۔

اتنی اکیلی کہ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا ساتھ دینے کے لیے مظہر کی کوئی یاد یا اس کی خوشبو بھی موجود نہ ہو۔

ہر طرف پھیلی باسی پھولوں کی مہک 'اگربتیوں کی تیز خوشبو 'اور دیگی پکوانوں کی مسالے دار خوشبوئیں شاید مظہر کے جسم کی خوشبو ان میں کہیں دب گئی تھی۔

وہ خوشبو جو اتنے دنوں سے منزہ کو اس کے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

وہ بے قرار ہو کے پاگلوں کی طرح کمرے میں اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ پھر وہ سوئی ہوئی سوہا کے نزدیک رک گئی۔ وہ بیڈ پہ وہیں سوئی ہوئی تھی جہاں سونے کی عادی تھی یعنی بالکل درمیان میں دائیں جانب مظہر سوتا تھا اور بائیں جانب منزہ۔

اس وقت دائیں جانب گاؤ تکیہ رکھا تھا اس نے تاکہ سوہا کروٹیں لیتی ہوئی بیڈ سے نیچے نہ جا گرے۔ منزہ نے الماری کھولی۔

مظہر کی الماری جس میں بہت سے استری شدہ کپڑے ہینگر میں لٹکے ہوئے تھے۔ کچھ تہہ لگے ہوئے پڑے تھے۔ اس نے وہ بلیک کوٹ نکالا جو مظہر نے وفات سے پہلے آخری بار اس کے ساتھ ڈنر پہ جاتے ہوئے پہنا تھا۔ یہ اب تک ڈرائی کلین ہونے نہ جا سکا تھا۔

منزہ نے وہ کوٹ ہینگر سے اتارا گاؤ تکیے پہ پھیلایا دو قدم پیچھے رک کر غور سے دیکھا۔

پھر بیڈ کے نیچے سے اس کے وہ جوتے نکالے جو اس نے ایکسیڈنٹ کے وقت پہنے ہوئے تھے۔ مظہر کی عادت کے عین مطابق اس نے جوتے کمرے میں اِدھر اُدھر پھینکے۔

موزے بھی یہاں وہاں گرائے..... اس کے بعد وہ پھر سے کھڑی ہو کے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

ابھی بھی اس کے چہرے سے مکمل اطمینان نہ تھا۔ پھر وہ بھاگ کے واش روم گئی۔ تولیہ بھگو کے لائی اور بیڈ کے ایک سرے پہ گول مول کر کے پھینک دیا۔

مظہر کے واش روم کے سلیپر پانی سے بھرے ہوئے لا کے کارپٹ پہ رکھے۔ ڈریسنگ ٹیبل سے اس کا فیورٹ کلون اٹھا کے کمرے میں اسپرے کیا۔

اب وہ سائڈ دراز سے اس کے سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر نکال رہی تھی۔ سگریٹ سلگا کے اس نے ایش ٹرے میں رکھا۔ جیسے جیسے سگریٹ سلگتا جا رہا تھا دھواں پھیلتا جا رہا تھا اور کمرے کی فضا میں ایک مانوس سی مہک پھیل رہی تھی۔

منزہ نے منہ اوپر کر کے ایک گہرا سانس بھرا۔ اب وہ مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ایک آسودہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ نظر آ رہی تھی اور یہ مسکراہٹ اتنے عرصے کے بعد اس کے چہرے پہ بہت اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو امی؟"

شمیم پہلے تو ماں کو کروٹیں بدلتے دیکھتی رہی 'پھر اٹھ کے چپل پہن کے باہر نکلتے دیکھا تو پوچھنے لگی۔

"منزہ کے کمرے میں۔"

"کیوں؟" وہ تنک کے بولی۔

"آج اکیلی ہے بے چاری۔"

"اکیلی کیسی؟ بچی نہیں ہے وہ..... اور سوہا بھی تو ہے۔ اکیلی تو میں ہو جاؤں گی۔"

"تو اس اکلاپے کا درد کیا جانے..... اور اللہ کرے نہ ہی جانے۔" نصرت کے لہجے میں درد تھا۔

"جا باپ کے کمرے میں چلی جا' اگر ڈر لگ رہا ہے تو۔"

وہ شمیم کے مزاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چلی گئی۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر پھر سوئے ہوئے کی نیند خراب ہونے کے خیال سے رُک گئی۔ ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھل گیا۔

اندر زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ باہر روشنی سے آنے کی وجہ سے اسے صاف نظر نہیں آیا مگر کوئی عجیب احساس تھا جو اسے بے چین کر گیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کے لائٹ آن کی۔

اندر کا منظر دیکھ کے وہ بے ساختہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے رہ گئی۔

"ہائے میرے ربا۔۔۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے بے ساختہ کہہ اٹھی۔

پورے کمرے میں مظہر کے ہونے کا احساس سرا سر رہا تھا۔

اس مظہر کے ہونے کا احساس جس کے نہ ہونے کا یقین وہ کئی راتوں سے خود کو دلا رہی تھی اور ابھی بھی باور کراتے کراتے اٹھ کے یہاں تک آئی تھی۔

ہر جانب مظہر کی خوشبو پھیلی تھی۔

اس کے سگریٹ کے دھوئیں کی۔

اس کے استعمال میں رہنے والے باڈی ٹالک کی' کلون کی' آفٹر شیو لوشن کی۔۔۔

اس کے کپڑے ہر جگہ بکھرے تھے۔

بیڈ پہ کوٹ۔۔۔ بیڈ کے نیچے شوز۔۔۔

کارپٹ پہ موزے۔۔۔

صوفے پہ ٹائی۔۔۔ صوفے کے ساتھ باتھ روم سلیپر۔۔۔

وہ بھی پانی سے بھرے ہوئے۔

بالکل اسی طرح جیسے بھرے ہوئے گیلے' پچ پچ کرتے سلیپر وہ کمرے کے قالین پہ لانے کا عادی تھا۔

اور منزہ۔۔۔ وہ بیڈ کے پائنتی پہ سر رکھے نیچے بیٹھی تھی۔ اس نے پلکیں موند رکھی تھیں مگر ان کی ہلکی ہلکی لرزش اور لبوں پہ کبھی مدھم تو کبھی گہری ہوتی میٹھی سی مسکان ظاہر کر رہی تھی کہ وہ سو نہیں رہی۔

اس نے اپنے ہاتھوں میں مظہر کی شرٹ بھینچ رکھی تھی جس کا کالر اس کے لبوں سے مس ہو رہا تھا۔ بار بار ایک گہری سانس لے کر جیسے اس کالر سے اٹھنے والی مہک کو اپنے اندر سمو رہی تھی۔

نصرت بے قراری سے اندر لپکی اور اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"منزہ۔۔۔ نی منزہ! ہوش کر۔"

دو تین بار بری طرح جھنجوڑنے کے بعد اس کے ماتھے پہ ہلکی سی شکن نمودار ہوئی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب۔۔۔

اس نے کسمسا کر نصرت کے ہاتھ ہٹانے کے لیے اپنے شانے جھٹکے مگر نصرت نے اسے تقریباً "ہلا ڈالا۔"

"نی شودائن۔۔۔ ہوش کر۔۔۔"

منزہ نے بمشکل آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں نجانے کیسا سحر تھا کہ نصرت کو زبردست خوف نے گھیر لیا۔ اس کے پورے بدن نے ایک جھرجھری لی تھی۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے منزہ کی آنکھوں کے مست مست سرور اور ہونٹوں کی پراسرار مسکراہٹ کو دیکھنے لگی۔

"منزہ۔۔۔ منزہ! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"شش۔۔۔" منزہ نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "بڑی کچی نیند ہے ان کی۔"

اس کی نظروں کی طرح ان کے لہجے اور آواز میں بھی خمار جھلک رہا تھا۔ شاید وہ اس وقت اپنے ہوش میں تھی۔ "نہیں جھلیے' اس دفعہ بڑی گوڑی نیند دے سویا ہے میرا پتر۔" نصرت دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتی بولی۔

"بہت تھک گئے ہیں۔" وہ اس کی بات پہ دھیان دیے بغیر بیڈ پہ رکھے گاؤ تکیے پہ پھیلے کوٹ کو اپنی انگلیوں سے سہلانے لگی۔

"سوہا کی چاکلیٹ لینے بہت دور چلے گئے تھے' بہت دور۔ بہت ساری لائے ہیں۔ کہہ رہے تھے فریزر میں رکھ لینا۔ پتہ نہیں۔۔۔ پتہ نہیں دوبارہ جا سکوں یا نہیں۔"

اسی بے ہوشی انداز میں بات کرتے کرتے اچانک وہ پھپک کے رو پڑی۔

شاید اپنی ہی کوئی بات اسے ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔ ہوش کی بے درد اور سفاک دنیا۔ جو اسے وہ سب یاد دلا رہی تھی۔ اس کے رکے ہوئے آنسوؤں کے بند توڑ رہی تھی۔

"امی! کیا انہیں پتا چل گیا تھا؟"

وہ روتے روتے پوچھنے لگی۔

"ہک ہا۔۔۔" نصرت جواب میں سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

"پتہ تھا انہیں۔۔۔ سب پتہ تھا۔" اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ "وہ جانتے تھے' اسی لیے اس دن فون پہ ایسی باتیں کر رہے تھے۔" وہ نصرت سے ایسے اپنے دل کا حال کہہ رہی تھی جیسے وہ اس کی سنگی سہیلی ہو' ورنہ پہلے معمول کی عام بات چیت بھی وہ اس کے ساتھ بہت محتاط ہو کے کیا کرتی تھی۔

"کاش' مجھے پتہ ہوتا' پہلے سے پتہ ہوتا تو میں۔۔۔" نصرت نے اپنی حسرت بیان کی۔

"تو کیا آپ اسے روک لیتیں؟"

"ناں پتر! اللہ کا بلاوا آیا ہو تو کون روک سکتا ہے کسی کو۔ لیکن مجھے پتہ ہوتا تو۔۔۔ تو میں۔۔۔ میں اس سے۔۔۔"

نصرت کو ایک بار پھر ساری تلخیاں یاد آگئیں۔ ہمیشہ خود کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرنے والی کو اس وقت ہر معاملے میں زیادتی اپنی نظر آ رہی تھی۔

"تیرے سے تو وہ بڑا خوش خوش گیا ہے' بڑا راضی۔ تجھے تو سکون ملنا چاہیے۔" وہ رشک سے اسے دیکھنے لگی۔

"وہی تو نہیں ملتا۔" منزہ کے لبوں نے نامحسوس سی سرگوشی کی۔

"اپنی اولاد میں دل لگانے کی کوشش کر۔"

"اس میں بھی وہی نظر آتے ہیں۔" نصرت کے مشورے پہ اس نے بے چارگی سے کہا۔

"سویرے میں تجھے تیرے بھائی کے گھر چھوڑ آؤں گی۔"

اس دوسرے مشورے پہ وہ کرنٹ کھا کے اچھلی تھی۔

"آپ۔۔۔ آپ مجھے گھر سے نکال رہی ہیں؟ یہاں سے بھیج رہی ہیں؟ ہمیشہ کے لیے نکال رہی ہیں؟"

وہ چلانے لگی تو نصرت گھبرا کے وضاحتیں دینے لگی۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔ میں تو۔۔۔"

مگر وہ اس کی کوئی بھی وضاحت سننے کے بجائے کسی پارے کی طرح کمرے میں پھر رہی تھی۔ آنسوؤں کی لڑیاں اس کی آنکھوں سے اور بے ربط لفظ اس کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔۔۔ یہ گھر۔۔۔ ہاں گھر میرا نہیں ہوگا' نہ سہی۔۔۔ گھر آپ کا ہے مگر یہ کمرہ میرا ہے' میرے مظہر کا ہے۔۔۔ وہ لائے تھے مجھے یہاں۔۔۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

"میری بات تو سن۔۔۔"

نصرت اپنے تھل تھل کرتے وجود کے ساتھ اسے پکڑنے کی اپنی سی کوشش کرنے لگی مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ ایک وحشیانہ سے جنون کے ساتھ وہ کمرے میں یہاں سے وہاں ہو رہی تھی۔

"یہاں وہ سوتے تھے۔" وہ بیڈ پہ سے تکیے اٹھا کے پھینکنے لگی۔

"ان تکیوں میں ان کے بالوں کی مہک ہے۔"

"اور یہاں۔۔۔ یہاں بیٹھتے تھے۔۔۔ ٹی وی دیکھتے تھے۔"
اب وہ صوفے پہ ایک سیکنڈ کے لیے بیٹھی تھی پھر اٹھ کے کھڑکی تک آئی۔۔۔ پردے ہٹائے۔
"اور یہاں کھڑے ہو کر۔"
"یہ کیسا شور مچا رکھا ہے آدھی رات کو۔"
کمرے کا دروازہ بھڑ سے کھول کر اچانک اصغر اندر داخل ہوا اور ناگواری سے پوچھنے لگا۔ اس کے عقب میں ربنا کھڑی نظر آرہی تھی۔ اپنے چہرے پہ وہی ازلی جی کلسانے والی تلخ مسکراہٹ لیے۔ دونوں کی آنکھوں اور انداز سے کہیں یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ سو رہے تھے اور منزہ کے واویلے نے ان کی پرسکون نیند میں خلل ڈالا ہے۔ ویسے بھی آدھی رات تک جاگنے کی بیماری تھی ربنا کو۔۔۔ اور اصغر کو اس کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ وہ اس وقت بھی سنگھار کیے ہوئے تھی۔
"دیکھو اصغر۔۔۔ یہ امی۔۔۔ امی مجھے یہاں سے نکال رہی ہیں۔" منزہ فریاد کرتی اس کے نزدیک آئی۔
اس کی بات سن کر ربنا واضح انداز میں چونکی تھی۔ اس کے ماتھے پہ ایک پُرسوچ سی شکن پیدا ہوئی تھی۔
اصغر سوالیہ انداز میں ماں کو تکنے لگا جو بےچارگی سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔
"میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔۔۔ یہ مظہر کا گھر ہے۔۔۔ میں کیسے جا سکتی ہوں۔ وہ اکیلے ہو جائیں گے۔ میں چھوڑ جاؤں انہیں۔"
وہ بلک بلک کر روتی اصغر کا گریبان تھام کے کہہ رہی تھی۔ روتے روتے اس نے اپنا سر اصغر کے سینے سے ٹکا دیا۔ بالکل کسی معصوم یتیم بچے کی طرح جو ہمدردی پاتے ہی کسی سے لپٹ جاتا ہے۔ اصغر دل کا برا نہیں تھا۔ ویسے بھی منزہ کے لیے وہ ابتدا سے ہی باقی گھر والوں کی نسبت نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اس کے آنسو دیکھ کے وہ پگھل گیا۔ اس کا ہاتھ بےساختہ منزہ کے سر پہ ٹھہر گیا۔
"بھرجائی! کوئی نہیں بھیج سکتا تجھے یہاں سے۔ یہ صرف مظہر کا ہی نہیں، تمہارا اور سوہا کا گھر بھی ہے۔ میرے ہوتے ہوئے کون نکال سکتا ہے تمہیں۔"
ربنا سر سے پیر تک سلگ گئی، اس کے بنے سنورے وجود سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ میک اپ سے لتھڑے نقوش ٹیڑھے میڑھے ہو کے بگڑ گئے۔
"یہی بات تو میں اس بدنصیب کو سمجھا رہی تھی۔" نصرت نے کہا مگر ربنا تڑخ کر بولی۔
"سمجھانے والی بات تو کوئی سمجھاتا نہیں۔"
"کیا مطلب؟ کون سی بات؟"
"اتنی کاکی نہیں ہے یہ تمہاری بدنصیب جو جانتی نہ ہو کہ یہ عدت سے ہے۔"
اس نے گم صم کھڑی منزہ کو زہریلی نظروں سے تکتے ہوئے کہا جو اصغر کا بازو زور سے بھینچے کھڑی تھی اور اس کی نگاہیں کارپٹ کے نقش و نگار کو گھور رہی تھیں، لب نیم وا تھے۔ آنسو چہرے پہ ٹھہر چکے تھے۔
"مجھے تو دن رات اصیل نہ ہونے کے طعنے دیتے نہیں تھکتے تم سارے کے سارے اور خود ان شریف زادی کے لچھن دیکھو۔ عدت میں بھی چین نہیں۔۔۔ نہ گلے میں دوپٹہ ہے نہ آنکھ میں شرم۔ کیسے چپک کے کھڑی ہے بدبخت!"
جس کے متعلق یہ ہرزہ سرائی کی گئی تھی وہ جیسے سن کے بھی نہ سن رہی تھی۔ اس کی حالت میں سرمو فرق نہ تھا جبکہ اصغر اچھل کے رہ گیا تھا۔ بےساختہ اس نے اپنا ہاتھ نہ صرف اس کے سر سے ہٹا لیا تھا بلکہ اپنا بازو بھی ایک جھٹکے سے چھڑوا لیا تھا۔
اور نصرت۔۔۔ وہ تو تھرا کے رہ گئی تھی۔
اس نے ان تینوں سالوں میں منزہ کو کون سا، چرکہ نہیں لگایا تھا۔ کون سے بھالے نہیں چبھوئے تھے اسے جلانے کے لیے کون سا حربہ نہیں آزمایا تھا مگر اس کے کردار پہ چھینٹا اڑانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ بہت ہوا تو پسند کی شادی کرنے کا طعنہ دے دیا۔
"خدا کا خوف کر بےحیا عورت!" وہ ربنا کے لتے لینا چاہتی تھی مگر اس نے موقع نہ دیا۔
"کیوں کوئی غلط بات کی ہے میں نے؟ تمہارا کیا خیال ہے سارے اصول تم لی بیوں کو پتہ ہیں؟ میں بھی پیدائشی مسلمان ہوں۔ کانوں میں اذان ہمارے ہاں بھی دی جاتی ہے۔ سپارہ ہمارے ہاں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ پتا ہے مجھے دین کی ساری باتوں کا۔ کیا یہ عدت میں نہیں ہے؟ کیا اس کا اصغر کے سامنے آنا، اس کے سینے سے لگ کر رونے کے ڈرامے کرنا یہ سب غلط نہیں ہے؟"
وہ کمر پہ ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔ اصغر اپنی جگہ چور سا بن گیا۔
"عدت ہے" نصرت نے کہا۔ "ہاں وہ عدت میں ہے مگر عدت میں بیٹھی عورت پہ اتنے گندے الزام لگانے سے پہلے کچھ تو سوچو۔ وہ چالیس دن سے اپنے کمرے میں بند ہے۔ کمرے سے نکلتی ہے تو منہ سر لپیٹ کے۔ تپ چڑھا تو دوائی تک لینے ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی تھی۔ یہ پاس کھڑا ہے تیرا بندہ، اس سے پوچھ 'سامنے آئی تھی اس کے؟ آج یہ ہوش میں نہیں ہے، دماغ پھرا ہوا ہے اس کا۔۔۔ اس کی حالت تو دیکھ۔۔۔ اسے اپنا ہوش نہیں ہے۔ دین دنیا کا کیا ہوش ہوگا۔ اس حالت میں تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ ہاں پر تیرے جیسے بندے نہیں کرتے۔"
"لو۔۔۔ نیا ڈرامہ۔۔۔ ہوش میں نہیں ہے۔" وہ منہ بگاڑ کے نصرت کی نقل کرنے لگی۔ "نشہ شروع کر دیا ہے غم میں؟"
"ربنا۔۔۔!" اصغر ضبط نہ کر سکا۔
خلاف توقع اس للکار پہ وہ شاک میں آگئی۔ اس کا خیال تھا، اس نے اصغر کو پوری طرح مٹھی میں کر لیا ہے۔ اب وہ اس کے آگے دم نہیں مارے گا، اس لیے پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔
اصغر میں بھی بس اتنا ہی حوصلہ تھا، اسے پلٹتے دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو منایا تھا۔ وہ بھی الٹے پاؤں اس کے پیچھے گیا۔
نصرت نے منزہ پہ توجہ دی۔
وہ اب بھی اسی حالت میں کھڑی تھی۔ بازو نیچے لٹک رہے تھے۔ ابرو اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ خالی خالی نظریں نیچے کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔
نصرت کو اس کے بارے میں تشویش ہونے لگی۔ اس سے پہلے کے دِنوں میں اس کا رویّہ ایسا نہ تھا۔ دکھ اور غم کے اثرات تو فطری تھے لیکن وہ یوں ہوش سے بیگانہ نہیں ہوتی تھی۔
وہ اس کا ہاتھ تھام کے بیڈ تک لائی۔
منزہ کسی معمول کی طرح چلتی اس کے پیچھے آئی۔ نصرت نے اسے پکڑ کے بیڈ پہ لٹایا، وہ لیٹ گئی۔
اس کا تکیہ درست کیا، چادر اوڑھائی۔ وہ اب بھی پوری آنکھیں کھولے دیکھ رہی تھی۔
کیا دیکھ رہی تھی؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔
شاید وہ خود بھی نہیں۔
"میں نے ایسے ہی ایک بات کی تھی کہ سویرے تجھے تیرے بھائی کے گھر چھوڑ آتی ہوں۔ میرا خیال تھا دو چار دن اپنوں میں رہے گی، تیرا دل بہلے گا، دھیان بٹے گا اور تو نے الٹا مطلب لے لیا لیکن۔۔۔ لیکن اب سوچ رہی ہوں، یہ الٹا مطلب ہی صحیح ہے۔ تجھے وہیں رہنا چاہیے۔ ادھر اب تیرا کون ہے۔"
وہ اس کی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

❖ ❖ ❖ ❖

"بات مت کریں مجھ سے۔"
ربنا نے نخوت سے اصغر کا ہاتھ جھٹکا۔

"دیکھو میری رانی! تمہیں بھابھی کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

اس نے احساس دلانا چاہا تو رینا نے پینترا بدلا اور ساری خفگی اور نخرے بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے شا... سے اپنا سر ٹیکا اور لگی آنسو بہانے۔

"تم صحیح کہتے ہو' مجھے یہ بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

اتنی جلدی اسے پسپائی اختیار کرتے دیکھ کر اصغر کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اسے اپنی مردانگی پہ ناز ہونے لگا۔ اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب مرد سب سے زیادہ احمق پن کا ثبوت دیتا ہے۔ اپنی مردانگی کی دھاک بٹھا... زعم میں وہ دماغ کے سارے دروازے بند کرلیتا ہے۔ ان ہی بند دروازوں پہ قفل لگاتے ہوئے رینا نے اپنی ... ظاہر کی۔

"مجھے منزہ سے ہمدردی ہے بلکہ ترس آتا ہے اس جوان جہان بیوہ پہ۔۔۔ لیکن اس وقت میں نے جو کچھ کہا... تو میں نے کہا تھا' نہ منزہ کو سنایا تھا۔ وہ بات ایک چاہنے والی بیوی نے ایک دوسری عورت کے لیے کی تھی۔"

"بھابھی دوسری عورت نہیں ہے' وہ بیچاری بڑی مسکین اور شریف' بے زبان عورت ہے۔ اس کے بار... میں ایسا سوچنا بھی مت۔"

"میں سوچنا نہیں چاہتی لیکن تمہارے عشق نے میری مت ماردی ہے اصغر! ساری سمجھ' سوچ کنویں... ڈوبی ہے۔ بس مجھ سے نہیں برداشت ہوا جب اس نے تمہیں چھوا۔"

اصغر کا سینہ اور چوڑا ہوگیا۔ اس کی مردانگی اب چاہے جانے کے تمغے سے بھی سج گئی تھی۔

"وہ میرے لیے امی اور شمیم کے جیسی ہے۔"

"میں جانتی ہوں' اس لیے میں نے تمہیں تو ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ تم پہ پورا اعتبار ہے مجھے۔۔۔ ہاں مگر کس... پہ نہیں۔ میں کسی کو موقع نہیں دوں گی کہ وہ تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے۔"

اصغر نے یہ ڈائیلاگ کہے تو کئی بار تھے اور نجانے کتنوں سے کہے تھے مگر سننے پہلی بار تھے۔ وہ ہواؤں ... اڑنے لگا' اور اس پرواز کے دوران بھی اس نے ہلکی سی مزاحمت کرنے کی جرأت کی۔

"مگر بھابھی۔۔! تم اس کے بارے میں ایسا مت سوچو۔ میں تو تمہیں کہوں گا کہ اس سے بنا کے رکھو۔ پور... میں ایک وہی ہے جو دل کی صاف اور نیت کی کھری ہے۔ ہمیشہ مشکل وقت میں تمہارے کام آئے گی۔"

رینا نے تسلی دیتی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سرہلا دیا مگر دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

"مشکل وقت۔۔۔؟ مشکل وقت میں ساتھ دیتا ہے صرف اور صرف پیسہ۔۔۔ یا پھر طاقت اور حیثیت۔۔۔ ان تینوں میں سے کیا ہے جو تمہاری اس مسکین بیوہ بھابھی کے پاس ہوگا؟ میرا کیا دماغ خراب ہے۔ جو میں آلتو فالتو لوگوں سے دوستیاں گانٹھنے اور بہناپے جوڑنے میں اپنی جوانی گلاؤں۔ میں تو الٹا ہر اس شخص کے قدم اکھاڑوں... جو پیسہ' طاقت اور حیثیت حاصل کرنے کے میرے مقصد میں روڑے اٹکائے گا پھر چاہے وہ تمہاری بھابھی... تمہاری ماں یا تمہاری بہن۔۔۔ یا پھر خود تم۔"

☆ ☆ ☆

"یہ کیا کہہ رہی ہو ثنا؟" جمشید' بہن کا حال بیوی کی زبانی سننے کے بعد ششدر تھا۔

"میں بھی یقین نہیں کررہی تھی۔ اور پھر اس کی ساس' اس پہ تو مجھے ویسے ہی اعتبار نہیں تھا اس لیے خود جا... دیکھ آئی ہوں اور یقین کیجیے' منزہ کی حالت واقعی بہت تشویش ناک ہے۔"

"لیکن اسے یکایک ہوا کیا؟ اگر صدمے نے اس کے ذہن پر اثر ڈالا ہے تو یہ ڈیڑھ ماہ بعد ہی کیوں؟ ایسا ردِ عمل اسے مظہر کی وفات کی خبر ملتے ہی دکھانا چاہیے تھا۔"

"ہم سمجھ رہے تھے' اس نے خود کو سنبھال لیا ہے' مگر درحقیقت خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ہی اس کا یہ حا... ہوا ہے اور ڈیڑھ ماہ بعد کیوں ہوا ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مظہر کی کمی کا احساس گزرتے وقت کے ساتھ شد... اختیار کرتا جارہا ہے۔ ہر آنے والا دن اسے تنہا ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔"

"وہ تنہا نہیں ہے۔ یہ تنہائی اس نے خود منتخب کی تھی۔ اب میں اس کی ایک نہیں سنوں گا اور اسے یہاں لے آؤں گا۔ پتا نہیں وہ بے رحم لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک کررہے ہوں گے جو وہ اس حال تک پہنچی۔"

"کوئی کچھ نہیں کررہا۔" ثنا نے گہری سانس لے کر بتایا۔ "جس جس نے جو جو کرنا تھا' مظہر کی زندگی میں کرلیا۔ اور مظہر کی محبت کے سہارے منزہ نے ہنسی خوشی سب کچھ جھیل بھی لیا۔ اب کسی میں دم خم نہیں رہا۔ اس کی ساس بیٹے کے غم میں ادھ موئی ہوگئی ہے۔ لگتا ہی نہیں یہ وہ عورت ہے جس نے منزہ کا جینا حرام کررکھا تھا۔ اس کی منزہ کے لیے محبت اور فکرمندی میں بناوٹ نہیں ہے اور یہ بناوٹی محبت جتا کر اسے ثابت بھی کیا کرنا ہے۔ وہ بدل چکی ہے لیکن پھر بھی میں یہ کہوں گی کہ منزہ کی ذہنی حالت اس گھر میں رہ کے کبھی بھی بہتر نہیں ہوسکے گی۔ بلکہ خراب ہوتی جائے گی۔"

"میرا ایک دوست بہت اچھا سائیکاٹرسٹ ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ پھر ہم منزہ کو لے آتے ہیں۔ اس کا علاج کتنا بھی مہنگا ہو۔ ہم ضرور کرائیں گے۔ میں اس عمر میں اسے ہوش و حواس سے بے گانہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ میری ایک ہی بہن ہے۔ میری سب سے چھوٹی بہن' میرے ماں باپ کی نشانی۔" جمشید کی آنکھیں بھر آئیں۔

ثنا نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

"حوصلہ رکھیں۔ وہ جلد صحت یاب ہوجائے گی' ان شاءاللہ۔ ہم اس کے علاج اور دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ آپ دیکھیے گا۔ وہ دوبارہ زندگی کی جانب لوٹے گی' ہمارے لیے نہ سہی' اپنی بیٹی سوہا کے لیے۔"

اور اسی شام وہ دونوں منزہ کو لے آئے' وہ اس وقت اس کیفیت میں نہیں تھی کہ آنے سے انکار کرتی یا مزاحمت کرتی۔ نصرت ہی اس کا سامان اور سوہا کی چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں پیک کرتی رہی۔

"یہ منزہ کا اپنا گھر ہے۔" جاتے ہوئے اس نے جمشید اور ثنا کو روک کے کہا۔ "اور سوہا کا بھی۔ وہ میرے بیٹے کی نشانی ہے' مجھے اس میں اپنا بیٹا نظر آتا ہے۔ اگر یہاں سے جانے میں منزہ کی بھلائی نہ ہوئی تو میں کبھی اسے نہ جانے دیتی۔ جب اس کا دل ٹھہرے گا۔ صبر آئے گا تو اسے بتانا' یہ گھر اب بھی اس کا ہے۔ مظہر کا کمرہ اب بھی اور ہمیشہ اس کے لیے خالی رہے گا۔"

ثنا نے خاموشی سے سرہلا دیا۔

سیڑھیوں پہ کھڑی رینا نے انہیں نکلتے دیکھ کے اطمینان بھرا سانس لیا اور واپس اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

□□□□

منزہ صدمے کے زیر اثر تھی اور کئی راتوں کی بیداری۔۔۔ اور مسلسل ڈپریشن نے اس کی دماغی حالت پہ اثر ڈالا تھا' قابل ڈاکٹروں کی توجہ بہترین علاج' سکون آور دواؤں کے استعمال اور سب سے بڑھ کے ثناء اور جمشید کی بھرپور محبت نے اسے دنوں میں صحت یابی کی جانب لوٹانا شروع کردیا۔

دوسرے تیسرے دن بڑے بھائی جان بھی کلثوم بھابھی کے ساتھ آجاتے' کبھی مل جل کے تفریح کا پروگرام بن جاتا۔ بڑے بھائی جان کے پاس گاڑی تھی۔ وہ بچوں کو اور منزہ کو ساتھ بٹھالیتے۔ جمشید اور ثنا اپنی موٹر سائیکل پہ پیچھے پیچھے چلتے۔ اس کا دل جانے کو نہ بھی آمادہ ہوتا تو اتنے پیار کرنے والے بھائیوں بھابیوں سے زیادہ دیر تک انکار نہ کرپاتی۔ سوہا یہاں آکے خوش رہنے لگی تھی۔ اور اس کی خوشی دیکھ کر منزہ کو بھی اپنے غم بھولنے لگتے۔

اگرچہ رات کی تنہائیاں بڑی ظالم ہوتیں' سارے دن کا بہلایا ہوا دل باغی ہونے لگتا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ... رے سے اپنے سارے زخم ادھیڑ کر خود کو پھر سے ڈپریشن میں مبتلا کرتی' مسکن ادویات اپنا اثر دکھاتیں اور نیند کی وادی میں اتر جاتی۔

وہ ایسی ہی ایک صبح تھی جب وہ خلافِ معمول ذرا جلدی جاگ گئی ورنہ دوا کے زیر اثر آج کل وہ دیر تک سوئی رہتی تھی۔

بچے اسکول جاچکے تھے۔ سوہا کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ سوہا کو ڈھونڈتے ہوئے جمشید کے کمرے تک آئی' اس کی آواز باہر کوریڈور تک آرہی تھی۔ شاید وہ آفس جانے کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔

"اخراجات بڑھتے جارہے ہیں' تنخواہ پوری نہیں پڑتی۔ اس پہ منزہ کے علاج کے لیے جو قرضہ اٹھایا' وہ بھی چکانا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا۔ یہ سب کیسے ہوگا؟"

اس کی تشویش میں ڈوبی آواز سن کر اس کے بڑھتے قدم تھم گئے۔

"میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ قرضہ مت لیں۔ میں کوئی زیور بیچ دیتی ہوں۔"

منزہ نے دانتوں میں لب دبا کے وہیں دیوار سے ٹیک لگالی۔ بڑے بھائی جان کی نسبت جمشید کے حالات ذرا نرم تھے' مگر نوبت قرضے اور زیورات بیچنے تک آجائے گی اس کا اسے اندازہ نہ تھا۔ اس نے حساب لگانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی چند ہزار کی تنخواہ میں بچوں کی فیس' مکان کا کرایہ' بجلی پانی کے بل اور کچن کے اخراجات پہ خرچ کرنے کے بعد کتنا بچاپاتے ہوں گے۔ وہیں کھڑے کھڑے اسے احساس ہوگیا کہ بچانا تو درکنار شاید یہ تنخواہ ان کے کنبے کے اخراجات کے لیے بھی ناکافی رہتی ہوگی۔ اس پہ اس کا اور سوہا کا اضافی خرچہ اس کا مہنگا علاج' دوا' پھل' سوہا کا دودھ' ڈائپرز' کھلونے' اور اس کا دل بہلائے رکھنے کے لیے اکثر و بیشتر باہر کے تفریحی پروگرام' پتہ نہیں انہوں نے خود کو کتنا زیربار کیا ہوگا۔

اسے اپنی بے حسی پہ غصہ آنے لگا۔ وہ ان کے حالات سے ناواقف نہیں تھی۔ مگر مظہر نے اسے کبھی کسی چیز کی تنگی نہ ہونے دی تھی۔ اس کی تنخواہ اچھی خاصی تھی جس میں سے اسے گھر کے کسی خاص خرچے کے لیے کچھ نہ نکالنا ہوتا سوائے کچن کے اخراجات کے لیے ایک مخصوص رقم ماں کو دینے کے علاوہ۔۔۔ باقی بل وغیرہ سب اصغر ہی ادا کرتا۔ ہر چیز کی فراوانی تھی۔ خوشحالی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیسہ اس پہ اور سوہا پہ لٹاتا تھا۔ منزہ تو جیسے تنگ دستی کا مطلب ہی بھول گئی تھی۔ اس کا دھیان اس جانب گیا ہی نہیں کہ اس کے اضافی خرچے کی وجہ سے بھائی کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

"آپ اس دوسری ملازمت کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ وہاں کی تنخواہ یہاں سے قدرے زیادہ ہی ہے۔"

ثنا کی آواز پہ اس نے دوبارہ کان کمرے کی طرف لگائے۔

"مگر اس ملازمت کا کوئی بھروسہ نہیں۔ مستقل بنیاد پہ نہیں دے رہے۔ میں صرف دو ہزار زائد کی خاطر اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا۔ خدانخواستہ یہ ملازمت بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ یہاں میں گیارہ سال سے کام کررہا ہوں اور اپنی محنت اور ایمان داری سے میں نے اپنی ایک ساکھ بنائی ہے۔ اب تو ترقی کے چانسز بھی بہت زیادہ ہیں۔ اور جن ملازمین کو کمپنی کویت بھیجنے والی ہے۔ اس لسٹ میں سب سے اوپر میرا نام ہے۔"

"یہ تو میں پچھلے دو سال سے سن رہی ہوں۔"

"میں جلد بازی کرکے اتنا سنہری موقع نہیں گنوا سکتا۔ کچھ سختی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ٹل جائے گی۔"

"ان شاء اللہ" ثنا نے پورے یقین سے کہا۔

وہ دبے پاؤں واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور بیڈ کے نیچے سے بیگ نکال کر اپنا اور سوہا کا سامان پیک کرنے لگی۔

اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ صرف بھائی بھابی کی باتیں سن کر نہیں کیا تھا' وہ یہ فیصلہ پہلے ہی کرچکی تھی کہ اسے اسی گھر میں لوٹنا ہے جہاں مظہر اسے اتنے ارمانوں سے لے کر گیا تھا۔ اور اب جب کہ اس کی ساس کا رویہ بھی اس کے ساتھ تبدیل ہوچکا ہے تو وہ اس عورت کو اپنی اکلوتی پوتی کی جدائی کا درد کیوں دے' جو عورت اس کے محبوب شوہر کی ماں ہے۔ اپنے سسرال لوٹنے کا فیصلہ کرنے کی ایک وجہ سوہا بھی تھی۔ وہ جانتی تھی سوہا ننھیال میں رہ کے بھی پل ہی جائے گی۔ بھائی بھابی اس میں اور اپنے بچوں میں کوئی فرق نہیں رکھتے۔ یہاں رہ کے اس کی تعلیم و تربیت اور پرورش میں کوئی کمی نہیں رہے گی۔ محبت' توجہ' آسائش سب میسر ہوگا مگر اس گھر کے در و دیوار اسے باپ کا احساس نہیں دلا سکیں گے۔ وہ بھی یہاں آکے اگرچہ رو بہ صحت ہورہی تھی لیکن یہ بھی اندازہ کرچکی تھی کہ یہاں ہر شخص مظہر کے ذکر سے دانستہ گریز کرتا ہے چاہے اس کی وجہ منزہ کی صحت کا خیال رکھنا ہی کیوں نہ ہو مگر اسے یہ بات کبھی کبھی بری طرح چبھتی تھی' اور سوہا' وہ یہاں رہی تو اپنے اس باپ سے ہمیشہ کے لیے انجان رہ جائے گی۔ جسے اس نے ڈھائی سال کی عمر میں کھویا تھا۔ جب کہ اپنے ددھیال میں وہ باپ کے نہ ہوتے ہوئے بھی اسے پائے گی۔ اپنی دادی میں' چچا میں' دادا میں' وہاں وہ بوڑھے ماں باپ ہوں گے جو زندگی کی آخری سانسوں تک اپنے سب سے پیارے بیٹے کو یاد کرتے رہیں گے' اس کی چھوٹی سے چھوٹی باتیں پوری تفصیل سے اسے بتاتے رہیں گے۔ اور یہی وہ چاہتی تھی۔

وہاں ہر دیوار پہ مظہر کی تصویر لگی ہوگی۔ اس کے استعمال میں رہنے والی چیزیں ہوں گی۔ جن کی مدد سے وہ سوہا کے لیے اس کے باپ کو اجنبی نہیں رہنے دے گی۔

وہ مظہر کی یاد کو اس کی اکلوتی اولاد کے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے وہیں لوٹنے کا فیصلہ کئی دن پہلے کرلیا تھا۔ صرف اس پہ عمل کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ پہلے وہ بھائی' بھابی کو یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ اب وہ سنبھل چکی ہے اور نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے تاکہ وہ زیادہ اعتراض نہ کریں اس کے فیصلے پہ۔

مگر اب ان سب کا وقت نہ تھا۔ وہ اپنی وجہ سے اتنے پیار کرنے والے بھائی بھابی کو مشکل میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

٭ ٭ ٭

"بسم اللہ!"

نصرت کو اس نے اپنے آنے کی اطلاع فون پہ دے دی تھی۔ وہ جو ان دونوں کے آنے کی امید دوسرا مہینہ ختم ہونے کے بعد چھوڑ ہی چکی تھی' جیسے نئے سرے سے جی اٹھی۔ پوتی کو دیکھنے کی تڑپ میں بے قراری سے گیٹ کے آس پاس ٹہل رہی تھی۔ ان دونوں کو رکشے سے اترتے دیکھ کر والہانہ انداز میں یہ کہتی آگے بڑھی۔

اور منزہ کو اسے دیکھ کے دھچکا سا لگا۔

ان دو مہینوں نے اس عورت کو جیسے نچوڑ ڈالا تھا۔

ساری چربی گھل گئی تھی۔ چمکتی ہوئی گندمی رنگت جھائیوں بھری سنولاہٹ میں تبدیل ہوچکی تھی۔ مہینے میں دوبار بڑے اہتمام سے رنگے جانے والے بال' جو ہر وقت سرسوں اور چنبیلی کے تیل میں بھگو کر گوندھے جاتے تھے۔ اب سوکھے' بے رونق' بکھرے ہوئے تھے۔ سفید بالوں نے سیاہی کو ڈھانپ لیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے کسی بیماری کی نشان دہی کررہے تھے۔

"امی! آپ کو کیا ہوا؟ بیمار رہی ہیں کیا؟"

وہ تشویش سے پوچھنے لگی۔ جب کہ نصرت سوہا کو بازوؤں میں بھرے چٹاچٹ چومے جارہی تھی۔

"بس ایویں ہی۔ بڑھاپا سو بیماریوں کی جڑ۔"

وہ ٹال گئی مگر منزہ اندر ہی اندر جی بھر کے شرمندہ ہوئی اور یاد کرنے لگی کہ ان دو ماہ میں اس نے بھلا کتنی بار انہیں فون کیا تھا۔

"چل آتو اندر۔۔۔ بڑا اچھا کیا جو تو واپس آگئی۔"

"میں واپس آنے کے لیے ہی گئی تھی امی۔۔۔ یقین کیجیے۔"

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی اندر بڑھنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ پورٹیکو میں اصغر کی گاڑی کے ساتھ ایک نئی ٹیوٹا کرولا کھڑی نظر آرہی تھی۔ پورے بنگلے پہ نیا رنگ و روغن اور عام سے لان کی تو شکل

بدل گئی تھی، جا،باسئی مورتیں اور قد آدم گملے عین درمیان میں نصب فوارہ..... جھولا۔
وہ دو ماہ کے قلیل عرصے میں ہونے والی اس تبدیلی پہ حیران تھی۔ اندر پہلا قدم رکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ ہر نظر آنے والی تبدیلیاں بہت معمولی تھیں اور ان تبدیلیوں کے مقابلے پہ کچھ بھی نہیں جو اندر رونما ہو چکی تھیں۔

لاؤنج جس میں ایک صوفہ سیٹ، نصرت کا تخت جس پہ بیٹھ کے وہ سبزی بنایا کرتی اور ٹی وی دیکھا کرتی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل اور ٹی وی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اب ایک پرتعیش لونگ روم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پورے فرش پر وال ٹو وال کارپٹ بچھے نظر آرہے تھے۔ دیواریں مہنگے آرائشی سامان سے سجی تھیں۔ جابجا بیش قیمت کرسٹل ڈیکوریشن پیسز رکھے تھے۔ اس نے یونہی سوہا کی انگلی مضبوطی سے تھام لی۔
"مجھے پتا تھا تونے آنا ہی ہے..... تو یہاں سے دور رہ ہی نہیں سکتی۔"
نصرت پورے وثوق سے کہتی اس کو لیے سیڑھیوں کا رخ کرنے لگی۔
منزہ رک گئی۔ "امی! آیئے آپ کے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ میں بعد میں اوپر چلی جاؤں گی۔ آپ کہاں سیڑھیاں چڑھیں گی۔"
نصرت کو سانس کی تکلیف تھی۔ سیڑھیاں اترنے چڑھنے میں دقت ہوتی تھی، اس کا خیال کر کے اس نے یہ بات کہی۔
"میرا کمرہ..... وہ بھی اوپر ہی ہے اب۔" نصرت نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو منزہ کو حیرت ہوئی۔
"اوپر کیوں ؟"
جب اس کی شادی ہوئی تو مظہر نے خود اوپر والے پورشن میں جانا پسند کیا تھا، وہ منزہ کو اس چخ چخ سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ نچلے پورشن میں بنے کمرے زیادہ کشادہ اور آرام دہ تھے۔
"اس لیے کہ تمہارے اولڈ فیشن ساس سسر اور وہ گنوار نند میرے اس ویل ڈیکوریٹڈ گھر سے میچ نہیں کر رہے تھے۔"
ماسٹر بیڈ روم جو کبھی نصرت کے استعمال میں تھا، اس کا دروازہ کھول کے رینا باہر نکلی، اور بڑی نخوت سے یہ جواب دیا۔
منزہ کو اس کا لہجہ اور الفاظ بہت کھلے مگر مصلحتاً ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے سلام میں پہل کی جس کا جواب سر ہلا کے دیا گیا۔
"بڑی جلدی دل بھر گیا تمہاری بھابھی کا..... لے کر تو بڑے نخرے سے گئی تھی۔ دو مہینے میں ہی دیوالیہ ہو گئے کیا؟"
"میں وہاں کچھ دن رہنے ہی گئی تھی۔"
اس نے تحمل سے جواب دیا جسے سن کر رینا نے واہیات سا قہقہہ لگایا۔
نصرت اس کا بازو پکڑ کے کھینچنے لگی۔
"چل شاوا..... چل اوپر چل کے باتیں کرتے ہیں۔"
"ہاں ہاں جاؤ، مائی کو بڑی جلدی ہے، باتیں سنانے کی۔ ایک تم ہی تو تھیں جو چپ چاپ سب سن لیتی تھیں۔ دو مہینے سے یہ کسی کو کھری کھری سنا نہیں سکی۔ اب نکالے گی اگلی پچھلی کسریں۔"
"میرے منہ نہ لگ طوائف زادی۔"
نصرت نے اس کو خونخوار نظروں سے گھور کے کہا۔
"جاؤ تم جا کے اس غریب زادی کے منہ لگو جو بھائی بھابی کے دھتکارے جانے کے بعد پھر اسی دہلیز کو چاٹنے آگئی ہے جس پہ بڑے طنطنے سے تھوک کر گئی تھی۔"

منزہ کے ہوش اڑ گئے۔ واپسی پہ اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا تصور بھی اس نے نہ کیا تھا۔
نصرت اس کا ہاتھ تھام کر اوپر لے جانے لگی۔

☼ ☼ ☼

جمیل کو منزہ کے واپس سسرال لوٹنے کی خبر ملی تو کلثوم کے ساتھ فوراً جنید کے ہاں آپہنچا۔ وہاں پہنچ کے ایک نئی خبر سننے کو ملی اور کافی عرصے بعد یہ کوئی اچھی خبر سننے کو ملی تھی۔
جمشید کی کمپنی اسے فیملی سمیت کویت بھیج رہی تھی اور بہت اچھی تنخواہ اور مراعات کے ساتھ۔ خبر بے شک خوش کن تھی۔ مگر منزہ کے اچانک ضد کر کے جانے کے عمل نے دونوں کو اتنا رنجیدہ کر رکھا تھا کہ وہ ڈھنگ سے خوش بھی نہ ہو پا رہے تھے۔
"پاگل ہو تم ثناء! منہ لٹکا کے ایسے بیٹھی ہو جیسے خدانخواستہ..... کیا ہو گیا ہے جبکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ بیٹھے بٹھائے کیا سنہری موقع ہاتھ لگا ہے، بچوں کا مستقبل سنوارنے کا۔"
کلثوم نے سمجھانا چاہا۔
"مگر بھابھی..... وہ منزہ..... پتہ نہیں کیوں اس نے اچانک واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شاید ہماری محبت اور خلوص میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ جمشید تو بجھ کے رہ گئے ہیں۔ اتنے مان سے وہ بہن کو لائے تھے مگر اس نے اپنی ضد کے آگے ان کی ایک نہ سنی۔"
"کمی تمہاری محبت اور خلوص میں نہیں ثناء..... ! تمہارے حالات میں تھی۔"
"کیا مطلب بھابھی؟"
"مطلب یہ ثنا بی بی! کہ منزہ اونچے گھر کی بہو تھی۔ مظہر اللہ بخشے اس کا دیوانہ تھا..... ہر آسائش اس کے اور بچی کے قدموں میں ڈھیر کر رکھی تھی اور سسر بھی صاحب جائیداد تھا۔ اتنی بڑی کوٹھی..... اور خود منزہ کے اپنے کمرے میں ہر سہولت اے سی، فریج..... اتنی گرمی میں اس سے گزارا نہیں ہو رہا ہو گا تمہارے ایئر کولر سے اور پھر رکشوں پہ سفر کرنے کی وہ عادی کہاں ہے۔ تم لوگ پیار محبت، خلوص تو دے سکتے ہو، وہ عیش و آرام تو نہیں دے سکتے جن کی وہ عادی ہو چکی تھی۔"
"نہیں، ایسی بات نہیں ہے بھابھی !"
ثناء کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی لیکن اس نے کمزور سی مزاحمت ضرور کی۔
"ہم نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی جس حد تک ممکن ہو سکا....."
"بھئی۔ تم نے تو اپنی حد کے مطابق ہی کرنا تھا..... جتنا ممکن ہوتا..... مگر وہ اپنا اور سوہا کا فائدہ کیوں نہ دیکھتی پھر مظہر کی تنخواہ بھی خاصی تھی اور باپ کی طرف بھی اس کا حصہ نکلتا ہے۔ خاصا جوڑ رکھا ہو گا اس نے۔ وہاں مزے سے بینک سے نکلوا نکلوا کے خرچ کرے گی۔ تم بے کار میں فکر مند ہو رہی ہو۔"
کلثوم ثنا سے یہ سب کہہ رہی تھی اور دوسرے کمرے میں جمیل الگ ہی شوشے چھوڑ رہا تھا۔
"تم تو بے وقوف ہو جمشید! جذبات میں آکر تم منزہ کے ساتھ بھلا نہیں بلکہ اس کا کباڑہ کر رہے تھے۔"
"میں سمجھا نہیں، میں اس کا کباڑ! کر رہا تھا؟"
جمشید کو واقعی بہت برا لگا۔
"اور کیا؟ تم بہن کو لاڈ میں یہاں لے تو آئے مگر یہ نہیں سوچا کہ اس طرح تم اسے اور اس کی اولاد کو اس کے جائز حق سے محروم کر رہے ہو۔ میں نے پہلے بھی ایک آدھ بار اس کا احساس دلانا چاہا مگر تمہاری بھابھی نے روک دیا کہ نجانے اس سے تم لوگ کیا مطلب اخذ کرو کہ کہیں اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد تو نہیں لیکن اچھا ہوا منزہ کو خود عقل آگئی۔ اس نے بروقت فیصلہ کر لیا، ورنہ جتنا وقت گزرتا، اتنی مشکل ہوتی اسے اپنا حق لینے میں۔"

"حق؟"

"ہاں حق۔۔۔ مظہر کی جائیداد پہ اس کی بیوہ اور بیٹی کا جو حق بنتا ہے وہ حق۔ بنگلہ، فیکٹری، دکانیں۔۔۔ ان سب میں اصغر کے ساتھ ساتھ مظہر بھی برابر کا حصہ دار ہے۔ دو تو بھائی تھے وہ۔ اگر منزہ کو تم یہاں رکھ لیتے تو چھوٹے کے لیے تو میدان صاف ہو جاتا۔ ہر چیز پہ وہ اکیلا قابض ہو جاتا۔ منزہ کا یہ فیصلہ دانش مندانہ ہے۔"

"آپ کی بات غلط نہیں ہے، واقعی اس جانب میرا دھیان نہیں گیا لیکن ضروری تو نہیں منزہ نے یہی سوچ کر وہاں جانے کا فیصلہ کیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا دھیان بھی نہ گیا ہو۔ وہ ان معاملات میں خاصی کوری ہے، بہت سادہ ہے وہ۔"

"اولاد اچھے اچھوں کی سادگی چھڑوا دیتی ہے میاں! اپنی اولاد کا مفاد سامنے ہو تو انسان کو خود بخود عقلیں آ جاتی ہیں اور پھر یہ کون سا کوئی غلط کام ہے۔ اس کا جائز حق ہے۔ تم کیوں جذبات میں آ کے اس کا راستہ کھوٹا کرتے ہو۔ بچی کے آگے ساری زندگی پڑی ہے۔ اچھا ہے بچی کی پرورش سہولت سے ہو جائے گی۔ تم اطمینان سے اپنی روانگی کا انتظام کرو۔"

"اگر منزہ کو اس کا حق مل جائے تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو گی لیکن۔۔۔ پردیس میں اس کی فکر رہے گی۔ شوہر کے بغیر سسرال میں کیا مقام رہتا ہے عورت کا۔"

"فکر کیسی؟ میں بڑا بھائی ہوں۔ تمہارا ہی نہیں، اس کا بھی۔ مجھے بھی اس کی فکر ہے۔ میں دانستہ اس سے الگ الگ اس لیے رہا کہ اسے ان سہاروں کی عادت نہ پڑ جائے۔ اس کی عمر کیا ہے ابھی۔۔۔ ایک پوری زندگی ہے اسے۔۔۔ اور یہ جینے کے لیے اسے حوصلہ چاہیے۔ اگر وہ تمہارے میرے سہارے پہ جیتی رہی تو کر چکی حوصلہ۔ یہ قدم اس نے خاصا حوصلہ مندانہ اٹھایا ہے۔ میں تو بہت خوش ہوا ہوں اس کے اس فیصلے سے۔ اب میں ضرور اپنا ہاتھ اس کے لیے آگے بڑھاؤں گا۔ اب اسے اس کی ضرورت ہے۔ تم بے فکر رہو۔۔۔ میں تمہاری غیر موجودگی میں اس کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔ برابر خبر گیری کرتا رہوں گا۔ تمہارے چلے جانے سے اس کا میکہ ختم نہیں ہو گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی جان! شرمندہ مت کیجیے۔ اس کے لیے ہی نہیں، میرے لیے بھی آپ ماں باپ کی جگہ ہیں۔ مجھے آپ پہ پورا اعتماد ہے۔ اب میں ہر پریشانی سے آزاد ہو کے جا سکوں گا، ورنہ سچی بات ہے کہ اتنی اہم خوش خبری کے بعد بھی میں بجھا بجھا سا تھا۔ یہ کامیابی پانے کے بعد بھی وہ جوش و جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا جو کرنا چاہیے تھا۔"

"تو اب کرو۔۔۔ کھل کے کرو۔"

جمیل نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

"جی بھائی جان۔! سوہا بھی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"جی۔۔۔ جاتی رہتی ہوں۔ ابھی پچھلے ہفتہ رات بھی رہ کے آئی تھی بھائی جان کے ہاں۔"

"جی کیوں نہیں بہت خیال رکھتے ہیں بھائی جان! فون بھی کرتے رہتے ہیں۔"

"نہیں، کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہیں بالکل بھی نہیں۔"

"بس آپ دعاؤں میں یاد کرتے رہا کیجیے۔"

"بچوں کو میری طرف سے بہت پیار دیجیے گا۔"

"اللہ حافظ۔"

بات کر کے اس نے فون رکھا اور سامنے صوفے پہ بیٹھی رینا پہ ایک نظر ڈالی جو دانتوں سے کتر کتر کر سیب کھا رہی تھی۔

جمشید کو کویت گئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران گاہے بہ گاہے اس کے فون آ جاتے تھے۔ کبھی بڑے بھائی جان کا بھی آ جاتا جسے سننے کے لیے اسے نیچے آنا پڑتا۔ رینا نے اوپر کے پورشن سے لائن کٹوا دی تھی۔ ان چند مہینوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ رینا کا راج پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔

"اپنے بھائی کو کہنا، آئندہ اس وقت فون نہ کیا کرے۔"

اس نئے آرڈر پہ وہ جاتے جاتے پلٹی۔

"پہلے رات کے وقت فون کرنے پہ اعتراض تھا، اب میں نے دن کا کہا ہے تو اس پہ بھی اعتراض۔"

"تو یہ چن کر اسی وقت فون کیوں کیا جاتا ہے، جب میں آرام کر رہی ہوتی ہوں۔ ارے اس بچی کو تو پکڑو، بال والی گڑیا کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کہیں اسکرین پہ نہ دے مارے۔"

منزہ نے سوہا کو گود میں اٹھا لیا اور جانے لگی۔

"رات کو کھانے پہ کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ ذرا کچن کا چکر لگا لینا۔ کک بھی ایسا نکما ملا ہے کہ کوئی چیز ڈھنگ کی نہیں بناتا۔ ذرا تم خود سر پہ کھڑے ہو کے پکوانا اور میٹھا اپنے ہاتھ سے بنانا۔ بلکہ پلاؤ بھی خود بنانا۔"

"تیرے باپ کی نوکر نہیں ہے یہ۔" نصرت نے سیڑھیوں سے نیچے جھانک کر کہا۔

اگرچہ رینا کے آگے اس کی خاص چلتی نہیں تھی۔ گھر میں ہوتا وہی تھا جو وہ چاہتی تھی۔ سب کچھ اکیلے اصغر کی مٹھی میں تھا اور اصغر رینا کی مٹھی میں۔ سب سیاہ و سفید کی مالک وہ تھی اور اپنے اختیارات کا خوب خوب فائدہ بھی اٹھاتی تھی۔ لیکن جب بھی موقع ملتا، نصرت اپنی بھڑاس ضرور نکال لیتی۔ خصوصاً منزہ کی ڈھال بننے کے لیے تو ہر وقت تیار رہتی۔

"نوکر تو یہ تمہارے باپ کی بھی نہیں۔ اصغر نے بتا رکھا ہے مجھے، کیسے تم ماں بیٹی نے اسے کولہو کا بیل بنا رکھا تھا اور وہ بھی شوہر کی زندگی میں، میں نے اس گھر میں چھ نوکر رکھ چھوڑے ہیں، جب کہ پہلے ان چھ کا کام یہ اکیلی نمٹاتی تھی۔ اب اگر ضرورت کے وقت میں نے اسے کوئی کام کہہ دیا تو غلط کیا کیا ہے۔ آخر یہ میرے گھر میں رہتی ہے۔ کھاتی ہے، پیتی ہے۔"

"تیرا گھر۔۔۔؟ یہ گھر میرے مظہر کا بھی ہے۔"

"تو جاؤ بلاؤ اسے۔ کہو آ کے سنبھالے اپنا گھر۔"

وہ اطمینان سے کاؤچ پہ نیم دراز ہو کے باقی کا سیب کھانے لگی۔

اس دل جلانے والی بات پہ جہاں منزہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ وہیں نصرت کے منہ سے گالیوں کا طوفان بہہ نکلا۔

"امی! کیوں اپنا دماغ خراب کر رہی ہیں، اس پہ کیا اثر ہوتا ہے۔"

شمیم کمرے سے نکلی اور ماں کو پکڑ کے کھینچنے لگی جو اب بولتی بولتی کوسنے اور بددعائیں، غلیظ گالیاں دیتی دیتی بے حال ہو رہی تھی۔

منزہ بھی تھکے تھکے انداز میں سوہا کو اٹھائے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"کون کہتا ہے، رینا کی زندگی بدل گئی۔"

اس نے ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"کوئی کہتا ہے کہ رینا اب ایک عزت دار، شریف گھرانے کی بہو ہے۔ وہی بازاری گالیاں۔۔۔ وہی گندی زبان۔۔ تم سے ساس جی! تمہارے ہوتے ہوئے میں اپنے میکے کے لیے اداس نہیں ہو سکتی۔"

"میں نے کہا ہے ناں، اس بدذات کے منہ مت لگا کرو۔ یہ ایسے ہی کلسا کلسا کے مار دے گی تمہیں جیسے اس نے ابا جی کو مارا ہے۔"

شمیم کی بات پہ رینا اچھل کے بیٹھ گئی۔

"اے بڈھی شوخی۔! تیرا باپ تیرے کسی کرتوتوں کے ہاتھوں مرا ہو گا۔ میرا نام نہ لگا۔ ویسے بھی جس کی ایسی

بیوی ہو اُسے تو عرصہ پہلے مرجانا چاہیے تھا۔"

اور سچ تو یہ تھا کہ بھٹی صاحب نہ اپنی بیوی کی جھگڑالو طبیعت کے ہاتھوں مرے، نہ اصغر کے ایک بازاری عورت گھر پہ لانے اور سب کچھ اس کے حوالے کرنے سے موت کا شکار ہوئے۔ انہیں تو مظہر کی بے وقت جدائی نے مار ڈالا تھا۔ مظہر کے بعد وہ بمشکل تین ماہ ہی جی سکے۔

☼ ☼ ☼

"مامی.... مامی...."

وصی پتہ نہیں کب سے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ جان بوجھ کے نظرانداز کرتے ہوئے سلائی میں مگن تھی۔ تاوقتیکہ اماں جی کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ وہ شاید کمرے سے نکل رہی تھیں۔ اور ان کا یہیں ہونا تھا۔ ناچار پروین نے دانتوں سے دھاگا توڑتے ہوئے اس پہ نظر کی۔

"کیا بات ہے وصی! کیوں تنگ کر رہے ہو؟" اس کی آواز دبی ہوئی مگر خشک تھی۔

وصی چند سیکنڈ خاموشی سے اس کا چہرہ تکتا رہا جیسے اس اجنبی مامی میں اپنی اس پرانی مامی کو ڈھونڈ رہا ہو.... جیسے اس تبدیلی کی وجہ تلاش کر رہا ہو۔

پروین اس کی معصوم نظروں کے معصوم سوالوں کی تاب نہ لا سکی اور دوبارہ بڑے دھیان سے سلائی کرنے لگی۔ اچانک اسے اپنے ماتھے پہ وصی کے ننھے سے گرم ہاتھ کا نرم لمس محسوس ہوا۔

اس کے ہاتھ تھم گئے۔

بڑے تعجب سے اس نے وصی کو دیکھا جو اب گھٹنوں کے بل آگے کو جھکا ہوا تھا اور بڑی تشویش سے اس کے ماتھے کو ہاتھ لگا کے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہے وصی؟"

اس بار اس کا لہجہ اتنا کھردرا نہیں تھا۔ اس گیلے گیلے لمس کی حدت نے اسے اندر سے گداز کرنا شروع کر دیا تھا۔

"مامی! آپ کو بخار ہے؟"

"نہیں تو.... میں...." وہ کہنے لگی تھی کہ

"کس کو بخار ہے؟"

شوکت جہاں نے نزدیک آتے ہی وصی کی یہ بات سنی تو پوچھنے لگیں۔

"مامی کو۔" وصی چھلانگ مار کے نیچے اترا اور اپنی اس دریافت یا انکشاف پر پُرجوش ہو کے بتانے لگا۔ "مامی کو بخار ہے، مجھے پتا ہے۔"

"ارے واقعی، بتایا کیوں نہیں پروین تم نے۔ صبح ناشتہ وغیرہ میں بنا دیتی، اور اب بھی یہ سلائی کا کام کیوں لے بیٹھی ہو.... بہت ضروری چاہیے تو لاؤ میں کر دیتی ہوں۔"

"نہیں اماں جی....! ایسی کوئی بات نہیں، کوئی بخار وخار نہیں ہے۔"

"لو.... ایسے ہی بھلا.... بچہ یونہی تو نہیں کہہ رہا۔"

"بچہ ہی تو ہے، پتہ نہیں کیا کہے جا رہا ہے۔ میں تو اچھی بھلی ہوں۔"

"مامی! آپ کچھ بول نہیں رہی تھیں۔"

وصی نے اپنے اندازے کی وجہ بتائی تو پروین کا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ اس کے اندر کا چور دبکنے لگا مگر شوکت جہاں نے اس بات کو سرسری سا لیا۔ یا شاید وہ اصل بات کی تہہ تک ہی نہ اتر سکیں۔

"ارے میرے بدھو میاں!" وہ ہنس کے وصی کو گود میں لیے وہیں پروین کے پاس بیٹھ گئیں۔

"کوئی بات نہ کر رہا ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیمار ہے۔ اب جس طرح تم بولتے ہو اور جس قدر بولتے ہو کوئی اور کیسے بولے۔"

"امی گرم بھی ہیں۔" وہ اپنی بات میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "اور اداس بھی۔"

اس بات پہ شوکت جہاں نے غور سے بہو کا چہرہ دیکھا۔ جس کے رویے میں بتدریج آتی تبدیلی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اور تو اور آج ذرا سے وصی نے بھی محسوس کر لیا اور برملا کہہ بھی دیا۔

"کیا سراج سے کوئی کھٹ پٹ ہوئی؟"

انہوں نے لہجہ سرسری رکھنا چاہا مگر پروین کا جواب بہت کچھ جتلایا ہوا تھا۔

"اب کہاں کوئی کھٹ پٹ ہوتی ہے؟ آپ کی نصیحت پہ پورا پورا عمل کر رہی ہوں۔"

اور واقعی پچھلے کچھ مہینوں سے اس کا میکے میں جانا نہ جانے کے برابر تھا۔

شوکت جہاں کو ندامت نے آن گھیرا جیسے اسے اس کے میکے سے دور رکھنے کی ذمہ دار وہی تو تھیں۔

"بہت دنوں سے تم اپنی اماں کے ہاں نہیں گئیں؟"

"دنوں سے نہیں اماں جی! مہینوں سے۔"

بہت ضبط کرتے کرتے بھی پروین کی آواز بھرا گئی۔ اپنی اس کمزوری کا اثر زائل کرنے کے لیے اس نے سلائی مشین پہ سر جھکا لیا۔

"فون پہ بات تو ہوئی ہوگی۔ کیسی ہیں شمشاد بہن؟"

"جی ٹھیک ہیں۔"

اس نے کہا حالانکہ دل تو چاہا کہ اس سوال کے جواب میں کوئی تنتناتا ہوا جواب دے مارے۔ جیسے جیسے.... بہت بری بقول آپ کے بیٹے کے۔" مگر لحاظ مانع آگیا۔ ویسے بھی اس کے اکھڑے رویے اور سرد مہری کو مسلسل نظرانداز کرتے ہوئے، وہ بڑی اعلا ظرفی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ آج کی بات نہیں۔ کافی عرصہ سے وہ ان سے اور گھر کے باقی لوگوں سے یونہی الگ تھلگ سی تھی اور وہ جان کے بھی انجان بنی حسبِ سابق رویّہ اپنائے ہوئے تھیں۔

"اور وشمہ؟"

"مجھے نہیں پتا۔"

وشمہ کے نام پہ اسے بہت کچھ یاد آگیا اور اس نے ایک دم سلائی کا کام روک کے آدھی سلی قمیص گول مول کر کے رکھ دی۔

"پروین! کس بات کی سزا دے رہی ہو خود کو؟"

"سزا....؟ خود کو....؟ کیا میں نے ایسا کچھ کیا ہے، جس کی سزا ملنی چاہیے؟"

ان کے دل سوزی سے پوچھے سوال پہ اس نے الٹا سوال کر دیا۔

"نہیں۔" شوکت جہاں نے فوراً کہا۔ "مگر اب تم جو کچھ کر رہی ہو، اس حماقت کے بدلے تمہیں واقعی سزا ملنی چاہیے اور وہ بھی مجھ سے۔"

انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ان کے لہجے میں ایک استحقاق بھری سختی تھی۔

الفاظ میں مان بھری دھمکی۔

جب کہ اس کے برعکس اس کے لمس میں ایک محبت بھری شفقت تھی جس نے پروین کو پل میں پگھلا ڈالا۔

وہ ان کے گلے لگ کے رونے لگی۔

"نانی.... مامی کو کیا ہوا نانو!"

وصی روہانسا ہو گیا۔

"ششش۔۔۔ چپ۔۔۔ بچہ پریشان ہو رہا ہے۔ دیکھو تو۔۔۔ اتنی بڑی ہو کے ننھی منی کی طرح ماں سے لپٹ
رہی ہے۔ چلو چپ کرو اب۔"

پروین نادم سی مسکراہٹ کے ساتھ آنسو صاف کرنے لگی۔

"تم دونوں میاں بیوی تماشا ہو پورے۔"

وہ مصنوعی خفگی سے کہہ رہی تھیں۔ پروین نے شکایت بھری نظر ان پہ ڈالی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں، کم وہ بھی نہیں۔ اور کم تم بھی نہیں۔ دونوں انتہا پسند ہو۔ اور شدت پسند
اب بتاؤ بھلا، تم نے جو ضد پکڑی ہوئی ہے، اس کا کیا اثر ہوا سراج پہ؟ ذرا برابر بھی نہیں۔ پھر کیا فائدہ
جلانے کا۔"

"میں نے سوچا، انہیں خود ہی احساس ہوگا۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"مگر ہوا تو نہیں۔۔۔ اب چھوڑو یہ ضد اور اٹھو تیار ہو جاؤ۔"

"کہیں جانا ہے؟"

"ہاں، میرے ساتھ چلنا ہوگا تمہیں۔ ابھی بچوں کے آنے میں خاصا وقت ہے۔ ان کی چھٹی تک آجا
اور اگر بالفرض دس پندرہ منٹ کی دیر سویر بھی ہو گئی تو رخشندہ ہے ناں گھر پہ۔۔۔ تم بس دس منٹ لگاؤ
میں۔"

اور وہ واقعی مزید کوئی سوال کیے بغیر دس منٹ میں ہی تیار ہو کے اپنے کمرے سے نکل آئی۔

"چلیں اماں جی۔۔۔!" وہ چادر اوڑھتے ہوئے بولی۔

"آپ صبح میاں صاحب سے کہہ دیتیں بازار جانے کا تو وہ گاڑی بھجوا دیتے۔"

"صبح میرا کہیں جانے کا ارادہ نہ تھا اور ویسے بھی مجھے بازار نہیں جانا ہے۔ رہی گاڑی تو رکشے ٹیکسی
میں کیا مضائقہ ہے۔"

"رکشہ تو رہنے دیتے ہیں۔ ٹیکسی منگوا لیتی ہوں، کسی کو بھیج کے۔ ہاں واپسی پہ تایا جان کے ہاں
چھوڑنے آجائے گا۔"

"یہ تمہارے تایا جان کہاں سے آگئے بیچ میں۔ کرشن نگر کہاں، راوی روڈ کہاں"

"میں سمجھی آپ زیتون آپا کی عیادت کے لیے جانا چاہ رہی ہیں۔"

"اس کی عیادت کی بھلی کہی تم نے۔ چھبیس سال ہو گئے اس کے بیاہ کو، چلن نہ چھوڑا اس نے۔
مہینے بیماری کا بہانہ بنا کے بال بچوں سمیت میکے میں ڈیرے جما لیتا اس نے اپنا وتیرہ بنا لیا ہے۔ جب
صاحب کی کوئی بہو سال بھر سے زیادہ نہیں ٹک سکی۔"

"اور راوی روڈ۔" اس نے اٹک کے پوچھا۔ وہاں تو اس کا میکہ تھا۔

"تمہاری اماں کی مزاج پرسی کر آتے ہیں۔"

"نہیں اماں جی!" وہ جھجک کے دوبارہ بیٹھ گئی۔ اسی طرح چادر اوڑھے اور پرس ہاتھ میں تھامے
"میاں صاحب برا مانیں گے۔"

"خوامخواہ برا مانیں گے۔ دو ڈھائی ماہ بعد جا رہی ہو اور اس سے پہلے بھی جو گئی تھیں تو گھڑی بھر کو۔ جب
خسرہ نکلا تھا۔ اور اس سے پہلے عید کے دوسرے دن دو گھنٹے کے لیے۔ شاید اس سال میں یہی دو تین
تمہارے، وہ کچھ کہہ کر تو دیکھے۔"

"لیکن میں نے ان سے پوچھا نہیں ہے، وہ اس بات پہ فساد کھڑا کر دیں گے۔"

"میرے ساتھ کہیں بھی جانے کے لیے تمہیں اس کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی وہ مجھ
ہوا۔"

"اماں جی۔۔۔! میں چلی جاؤں گی۔ کل پرسوں ہی ان سے بات کر کے چلی جاؤں گی وعدہ آپ کے سمجھانے پہ میں
نے یہ ضد چھوڑ دی ہے لیکن آپ اس طرح میاں صاحب سمجھیں گے۔ میں نے آپ سے شکایت کی ہے یا کوئی
بنا رکھا ہے۔"

"جاتی رہنا تم بھی۔۔۔ خیر سے بچوں کے ساتھ جانا۔ بے شک ایک آدھ دن رہ آنا مگر ابھی تو میرے ساتھ چلو۔
بہن شمشاد سے چند ایک ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"اماں۔۔۔؟ کون سی بات؟"

"تم چلو تو۔۔۔ تمہارے سامنے ہی کروں گی۔ پتا چل جائے گا۔ جاؤ جا کے برابر والوں کے ملازم کو ٹیکسی لانے
کو بھیجو۔ اور کہنا بھاؤ کر کے لائے۔"

شمشاد کی پکی تھیں، اسے لے کر ہی نکلیں۔

✲ ✲ ✲

"نوید کا بیاہ کر دو؟"

شوکت جہاں کا مشورہ سن کر شمشاد بیگم اچھل ہی تو پڑیں۔ بڑی ناگواری اور اچنبھے سے انہوں نے یہ بات
کی اور پروین کو یوں دیکھنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

"سن لو اپنی ساس کی لن ترانی۔۔۔ سٹھیا گئی ہے بڑھیا۔"

خود پروین کے لیے بھی یہ بات غیر متوقع تھی۔ وہ بھی حیرت سے انہیں دیکھ کے رہ گئی۔ جب کہ وہ اطمینان سے
چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد کہنے لگیں۔

"کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں کہہ دی میں نے۔ کیا دنیا میں عقدِ ثانی نہیں ہوا کرتے۔"

"کیا نہیں ہوا کرتے؟" شمشاد نے بیٹی کو ٹھوکا دے کر اس کی وضاحت چاہی۔

"میرا مطلب ہے، دوسری شادی کوئی ایسی انہونی بھی نہیں۔ لوگ تو بلاوجہ اور بے ضرورت بھی کر ڈالتے ہیں۔
جب کہ یہاں ایک ٹھوس وجہ موجود ہے۔ نوید کے آگے زندگی پڑی ہے۔ کب تک ساجدہ کی یاد میں اکیلا رہے
گا۔"

"نوید کا خیال مجھے بھی ہے لیکن وشمہ کے بارے میں بھی تو سوچنا ہے۔" وہ منمنائی۔

"وشمہ ہی تو اصل وجہ ہے نوید کی دوسری شادی کے لیے۔"

"وشمہ۔۔۔؟"

"ہاں بہن۔۔۔! آپ کب تک اکیلی اس کی نگہداشت کریں گی۔ آپ کی عمر بھی نہیں ابھی اتنی سی بچی کو پالنے
کی۔"

"جیسے یہ سال سوا سال گزر گیا۔ باقی کے سال بھی گزر جائیں گے۔ لڑکیوں کو بڑے ہونے میں کون سی دیر لگتی
ہے۔ یہ کون سا بیٹا ہے جس کے جوان ہونے کے انتظار میں آنکھیں گل جائیں۔ دیکھنا۔۔۔ اور کچھ سالوں بعد دیوار
کی ہوگی۔"

"اور یہی کچھ سال اس کی تربیت کے لیے ضروری ہیں۔"

"نوید نے نوکرانی رکھی ہوئی ہے آپا۔۔۔!" شمشاد نے بڑی نخوت سے جتایا۔ "اللہ نے بڑا دے رکھا ہے میرے
بیٹے کو۔ خدانخواستہ کسی کے آسرے پہ نہیں بیٹھا۔"

اس نے واضح طور پر بیٹی کو اس کے عدم تعاون کا طعنہ دیا تھا۔ جہاں پروین سر جھکا کے رہ گئی وہیں شوکت جہاں
جتاتی ہوئی بات کو نظر انداز کر کے متانت سے سر ہلا کے کہنے لگیں۔

"ماشاءاللہ۔۔۔ ماشاءاللہ"

"ہر مہینے تنخواہ دیتا ہے وہ بچی کو پالنے کی۔"

"میں صرف پال پوس کر بڑا کر دینے کی بات نہیں کر رہی' تربیت کرنے کی بات کر رہی ہوں۔ تربیت والی آیا نہیں کرے گی۔۔۔ یہ ماں کا فرض ہے۔"

"ماں نہیں ہے قسمت میں تو کیا کرے' بدنصیب۔۔۔ سوتیلی ماں نے بھی کبھی ماں والے فرض نبھائے"

"سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں' آپ نیت تو کیجیے' ارادہ تو باندھیے۔ مل جائے گی کوئی نہ کوئی نیک خاتون۔"

"نہ نوید مانے گا نہ میرا دل راضی ہے۔"

شمشاد بیگم نے فوراً" صاف انکار کیا۔

"ہاں اماں جی! اس بات پہ تو میرا دل بھی نہیں ٹھہر رہا۔"

پروین کی جانب سے بھی اختلاف سامنے آیا۔

"مگر وجہ؟" انہوں نے تحمل سے دریافت کیا۔

"وجہ وہی سوتیلی ماں۔"

"اور کیا۔۔۔؟ ایک تو پہلے ہی سے قسمت کی ماری ہے یہ کہ پیدا ہوتے ہی یتیم ہو گئی' اب میں اس سے باپ بھی چھین لوں۔۔۔ نہ جی ناں۔"

"وجہ وہی سوتیلی ماں۔"

"اور کیا۔۔۔؟ ایک تو پہلے قسمت نے اس بے چاری کے ساتھ ناانصافی کی۔۔۔ پیدا ہوتے ہی یتیم کر دیا' اس سے باپ بھی چھین لوں۔۔۔ نہ جی ناں۔۔۔"

"کیسی بات کر رہی ہیں آپ بہن!"

"سولہ آنے درست کہہ رہی ہوں' نوید کو اس عمر میں دوبارہ بیوی لا دوں۔۔۔ تاکہ وہ ماں تو ماں' بیٹی کو بھی بھول جائے۔ میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ رہنے دو جی آپ۔۔۔ پل جائے گی وشمہ بھی۔ بغیر ماں کے بھی جی جاتی ہیں لڑکیاں۔۔۔ ہوتی ہی ڈھیٹ ہیں۔ یہ بھی جی لے گی۔ دیکھ لینا مگر میرے جیتے جی اس کے سر پہ سوتیلی ماں نہیں آئے گی۔ بالکل بھی نہیں۔"

اس کے دو ٹوک اعلان کے بعد شوکت جہاں نے مدد طلب انداز میں بہو کو دیکھا۔ مگر وہ بھی آمادہ نظر نہ آئی تو فی الحال مزید اصرار کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

بعد میں بھی وہ گاہے بہ گاہے پروین کے ذریعے ان تک یہ بات پہنچاتی رہیں۔ پروین کو بھائی کی اجاڑ' بے رونق زندگی کا احساس دلایا وہ بھی کچھ کچھ سوچنے پہ مجبور ہوئی مگر وشمہ کے لیے سوتیلی ماں لانے کا تصور اتنا بھیانک تھا کہ وہ بھائی کی زندگی میں بہار لانے کی خواہش کو کچل دیتی۔ ہاں پھر وشمہ جب دو سال کی ہوئی' پھر ڈھائی کی تب شمشاد بیگم کو اپنے دعوے کی حقیقت معلوم ہوئی۔ جب اسے قدم لگے۔ اور وہ گھر کے ہر کونے میں جانے کی کوشش کرنے لگی۔ کبھی دروازہ کھلا دیکھ کے باہر نکل جاتی۔ کبھی سیڑھیاں چڑھنے لگتی۔ تب انہیں واقعی لگا کہ ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اس آفت بچی کے پیچھے بھاگنے کی سکت نہیں ہے۔ آیا تو صبح نو بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک ہوتی اور اتنے وقت کی بھی وہ اچھی خاصی تنخواہ لیتی جو ہر ماہ اس کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے شمشاد کا دل جلتا۔ بالآخر کار ایک روز اس نے خود پروین سے کہہ ڈالا۔

"بھئی' مجھ سے مصیبت اٹھائی نہیں جاتی۔ نوید رات جلدی سو جاتا ہے۔ سویرے اس نے کام پہ جانا ہوتا ہے۔ اور یہ فتنی۔۔۔ ساری دوپہر سوئی رہتی ہے۔ ہو رے وہ مسٹنڈی آیا اسے افیم کھلا کے سلاتی ہے۔ اور رات تک پھر اس نے جاگنا ہوتا ہے اور مجھ بڈھی کو جگانا ہوتا ہے۔ میں سوچتی ہوں' تیری ساس اتنا زور دیتی ہے۔ آزمانے میں کیا جاتا ہے' کر دیں نویدے کی شادی۔"

"اماں۔۔۔! یہ کوئی کھیل ہے' جو صرف آزمانے کے لیے آپ بھائی جان کی شادی کر دیں گی؟ اگر آزمائش میں پوری نہ اتری تو۔۔۔؟"

"تو نکال باہر کریں گے۔۔۔ کو۔۔۔"

شمشاد نے موٹی سی گالی دے کر کہا۔

"مجھے اب نوں لانے کی کوئی چاہ نہیں ہے۔ نویدے کے لیے بیوی نہیں' وشمہ کے لیے ماں لانی ہے۔ لے آئیں گے کوئی غریب بڑی (غریب) اگر نہ سنبھال سکی بچی کو تو دفع دور۔۔۔"

"سوچ لو اماں۔ سوتیلی ماں ڈائن سے کم نہیں ہوتی۔"

"فکر نہ کرو۔ میرے ادھر ہوتے ہوئے کون سی ڈائن آنے کی ہمت کرے گی۔"

"بھائی جان مان جائیں گے؟"

"منوا لیں گے۔۔۔" (پتہ نہیں)

"وہ تو اپنی پہلی شادی کے لیے اتنی مشکل سے مانے تھے' کہتے تھے اب چالیس کے قریب ہو گیا ہوں اب کیا سہرا باندھنا' اب کہاں مانیں گے۔"

"میں منوانے پہ آؤں تو کیا نہیں منوا سکتی' تو ابھی اپنی ماں کو جانتی کتنا ہے۔"

اس نے بڑے فخر سے دعوا کیا مگر نوید مراد کے سامنے اس کے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

وہ دوسری شادی کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

"اگر اتنی بھاری ہے یہ لڑکی تو ٹھیک ہے میں یتیم خانے ڈال آتا ہوں۔"

ماں کی ساری دلیلیں سننے کے بعد اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تو شمشاد کو آگ لگ گئی۔

"ہاں بڈے ویلے ماں کے سر میں کھے (خاک) ڈلوا' دنیا تھو تھو کرے گی۔ دادی سے اکو اک (اکلوتی) پوتری نہ پالی گئی۔"

"تو پھر مجھے دوسری شادی کا کوئی نہ کہے۔"

وہ کہہ کر اٹھ گیا' لیکن اب شمشاد کو بھی ضد سوار ہو گئی۔ اس نے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت نوید کے سامنے یہی ذکر چھیڑ چھیڑ کے اسے زچ کر ڈالا۔

❖ ❖ ❖ ❖

"اب کیا ہو گا؟"

نصرت کو گزرے آج بارھواں دن تھا اور ان بارہ دنوں میں وہ بارہ ہزار مرتبہ یہ بات سوچ چکی تھی۔

پتہ نہیں مظہر کے جانے کے بعد نصرت نے یہ تین سال کیسے گزارے تھے۔ ورنہ پچھتاوا اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہا تھا اور یہ گھن تیسرے سال اسے کھوکھلا کر گیا۔ جاتے جاتے اس نے منزہ کا ہاتھ تھام کے کہا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا بڑا دل دکھایا تھا میں نے تمہارا۔۔۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ تیرے مکرنے سے بات بدل تو نہیں جائے گی۔ جو میں نے تیرے ساتھ کیا اور جو مظہر کے ساتھ کیا اس پہ۔۔۔"

"بس کریں امی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے نصرت کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے خاموش کرنا چاہا۔

"کہہ لینے دے مجھے۔۔۔ دل ہلکا کر لینے دے۔ ہلکی ہو جاؤں گی تو سفر آسان ہو گا۔ مظہر تو اتنی جلدی چلا گیا۔ ماں کو صفائی کا موقع بھی نہ دے سکا۔ اس کے دل میں کتنے گلے رہ گئے ہوں گے۔ خیر جاؤں گی اس کے پاس تو خود ہی منا لوں گی مگر تجھ سے تو گناہ بخشوا لوں۔"

"اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔"

اس نے یہ بات صدقِ دل سے کہی' پچھلے تین سالوں سے یہ عورت اللہ کے بعد اس زمین پہ اس کا سب سے بڑا سہارا بنی ہوئی تھی۔ یہ عورت جس نے شادی کے بعد کے تین سال اس کے لیے عذاب کر دینے میں کوئی کسر نہ

چھوڑی تھی۔

”مظہر آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور میں بھی آپ کو اپنی ماں سے بڑھ کے سمجھتی ہوں۔ جو بیت گیا بیت گیا۔ اگر کوئی تلخی تھی بھی تو ان تین سالوں میں آپ نے جو محبت دی ہے۔ اس کے سامنے کیا حیثیت ہے ان باتوں کی۔“

”اگر مجھے ماں سمجھتی ہے تو پھر میری ایک بات مانے گی؟“ نصرت نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پہ قابو پاتے ہوئے بڑے مان سے کہا۔

”ضرور امی۔۔۔! آپ حکم کریں۔“

”میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔۔۔ اگر میری آنکھیں بند ہو جائیں گی تو۔۔۔“

”آپ کو کچھ نہیں ہو گا امی!“ اس نے بات کاٹی۔

”نے۔۔۔ بھلی نہ ہووے تو۔ اک نہ اک دن تو مجھے جانا ہی ہے مگر تو وعدہ کر۔۔۔ کہ میرے جانے کے بعد تو ایک دن ادھر نہ رہے گی۔“

”کیا مطلب امی؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تو سوہا کو لے کر اپنے میکے چلی جانا۔“

”مگر۔۔۔ مگر میں۔۔۔“

وہ یاد دلانا چاہتی تھی وہ سارے دعوے۔۔۔ جو کبھی نصرت نے کیے تھے کہ یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ اس کا رہے گا۔

”میرے بعد اِدھر تیرا کوئی آسرا نہیں رہے گا۔ تو رُل جائے گی۔ تیرے بھائی اچھے ہیں، سنبھال لیں گے تجھے۔“

”مگر امی! میں بہت دعووں کے ساتھ ان کے گھر سے نکلی تھی۔ اب گئی تو کیا سمجھیں گے وہ۔“

”جو بھی سمجھتے رہیں۔۔۔ مگر یہاں نہ رہنا تم۔“

”اور شمیم؟“

”اس کے تو بھائی کا گھر ہے، پڑی رہے گی کسی کونے میں۔“

نصرت کے چہرے پہ آنسو پھیل گئے شاید شمیم کا گھر نہ بس سکنے کا غم تازہ ہو گیا تھا۔

”وہ اکیلی ہو جائے گی امی!“

”نہیں ہوتی۔ اس کا اللہ مالک ہے۔ بس تم نہ رہنا اِدھر۔ ورنہ برباد ہو جاؤ گی۔“

”آپ کا وہم ہے امی! رینا کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ اصغر اچھے دل کا ہے۔ ہماری سوہا کو کتنا پیار کرتا ہے۔ میرا بہت لحاظ کرتا ہے وہ ہمارا خیال رکھے گا امی!“

”یہی تو دکھ ہے۔۔۔ اس میں ابھی لحاظ ہے۔ بھائی کی اولاد سے منہ نہیں موڑ سکتا وہ۔۔۔ اور تیری بھی عزت کرتا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ تیرا خیال رکھے گا لیکن اس کا خیال رکھنا اس کی ذلیل بیوی کو برا چبھے گا۔ وہ ناگن ہے منزہ! میں نہیں چاہتی کہ مظہر کی عزت پہ نام آئے تو سمجھ رہی ہے نا۔“

وہ ہکا بکا رہ گئی۔ کیونکہ وہ نصرت کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

”شمیم بہن ہے۔ اس کے ساتھ رینا جو بھی برا کر لے۔ کم از کم اس کی عزت تو محفوظ ہو گی بھائی کے گھر۔ اسی طرح تم اپنے بھائی کے گھر محفوظ رہو گی۔ میری بات پر غور کرنا۔“

اس بات کے تیسرے دن ہارٹ فیل ہو جانے سے نصرت کی وفات ہو گئی۔

منزہ کو اس کی آخری نصیحت بار بار یاد آتی رہی۔

”میرے مرنے کے بعد ایک دن بھی یہاں مت رہنا۔“

لیکن وہ جاتی تو کیسے۔۔۔؟ کتنا اصرار کرتے تھے بھائی اور بھابھیاں مگر وہ بڑے طمطراق سے سسرال میں رہنے کا اعلان کر کے وہاں سے آئی تھی، پھر جلد ہی بھائیوں نے بھی سمجھوتا کر لیا۔ اب وہ اپنے منہ سے کیسے ان کے ہاں آنے کی بات کرتی۔

جمشید کا تعزیتی فون بھی آیا۔ جمیل بھائی جان بھابھی کلثوم کے ساتھ وفات پر آئے لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔

مظہر کے مرنے پہ وہ خود کو صرف اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اب خود کو بے سائباں بھی تصور کرنے لگی۔

رینا کی جانب وہ ایسے دیکھتی جیسے بکرا قصائی کی جانب دیکھتا ہے مگر فی الحال وہاں خاموشی تھی۔ اصغر کے تو سائے سے بھی بدکنے لگتی۔ وہ سوہا کو آواز دیتا تو منزہ اسے گود میں چھپا کے کمرے میں بند ہو جاتی کہ کہیں چاچا بھتیجی کے لاڈ کے مظاہرے رینا کو مشتعل نہ کریں۔

یہی سب سوچتے سوچتے اچانک اسے باہر آہٹ کا احساس ہوا اس کا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔

اس نے سوئی ہوئی سوہا پہ کمبل درست کیا اور وال کلاک پہ وقت دیکھا۔ رات کا سوا ایک بج رہا تھا۔

”کون ہو سکتا ہے؟“

وہ سوچنے لگی۔ اتنے میں ایک اور آہٹ سنائی دی، جیسے کرسی گھسیٹی گئی ہو۔ اسے شمیم پہ غصہ آنے لگا جو اس کے ہزار کہنے پہ بھی اس کے کمرے میں سونے پہ تیار نہ ہوئی تھی۔

شمیم بھی ان گزرے سالوں میں بہت بدل چکی تھی۔ مگر منزہ کے ساتھ اس کے تعلقات سرد کے سرد تھے۔ اگرچہ وہ اب اس کے ساتھ بدزبانی نہیں کرتی تھی۔ مگر بلا ضرورت کلام بھی نہ کرتی تھی۔ سوہا کے لیے بھی اس کے دل میں کوئی خاص جگہ نہ تھی۔ رینا کی اجارہ داری قائم ہونے اور ماں کے پسپائی اختیار کر لینے کے بعد اس نے جیسے ہر چیز میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی، عجیب نفسیاتی مریضہ بن کے رہ گئی تھی اور ماں کی وفات نے اسے ایک گہری چپ سادھ لینے پہ مجبور کر دیا تھا۔

بہت ہمت کر کے منزہ نے کمرے کی لائٹس آف کیں اور پردہ سرکا کے ٹیرس پہ جھانکا۔

وہاں ایک کرسی پر ٹانگیں رکھے اور دوسری پہ شمیم بیٹھی ہوئی تھی۔

”شمیم کیا کر رہی ہو یہاں؟“

اس نے آواز دی۔ مگر وہ پلٹ کے دیکھنے یا کسی بھی قسم کا کوئی ردِ عمل ظاہر کرنے کی بجائے کسی سنگی مجسمہ کی طرح بیٹھی تھی۔ منزہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

”رات کے اس پہر تم ٹیرس پہ کیا کر رہی ہو۔ چلو اٹھو۔۔۔ سردی بھی کس قدر ہو رہی ہے۔“

منزہ نے اس کے کسی بھی قسم کی حرکت نہ کرنے پہ خود اس کا ہاتھ پکڑ کے اٹھانا چاہا۔۔۔ جو برف کی طرح سرد تھا ”تم کتنی ٹھنڈی ہو رہی ہو شمیم۔۔۔! بیمار ہو جاؤ گی۔“

شمیم کوئی مزاحمت کیے بغیر اس کے پیچھے معمول کی طرح چلنے لگی۔ منزہ نے اسے اس کے بستر پر لٹایا۔ کمبل اوڑھایا اور سونے کی تاکید کرتی چلی گئی۔

اس کے بعد بھی دو تین بار اس نے شمیم کو اسی طرح رات گئے ٹیرس پہ بیٹھے دیکھا تو اٹھا کے اندر لے آئی۔ اس کی ذہنی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اپنے آپ سے بالکل بے گانہ ہوتی ہوئی وہ کئی کئی پہر کچھ کھاتی بھی نہ تھی۔

منزہ کو اس کی خاصی فکر رہنے لگی، اپنی فکر کے ساتھ ساتھ۔۔۔

اس رات بھی وہ سوہا کو سلا کے لیٹی ہی تھی کہ باہر ایک عجیب سے شور نے اسے ہڑبڑا کے اٹھنے پہ مجبور کیا۔

وہ فوراً کھڑکی تک آئی۔ پردہ ہٹا کے باہر دیکھنے پہ ایک عجیب ہی منظر آیا تھا۔

شمیم ٹیرس پہ تھی مگر کرسی پہ نہیں بیٹھی تھی۔ نیچے گری ہوئی تھی۔ جبکہ دونوں کرسیاں اوندھی گری ہوئی تھیں۔

اصغر اس کی کمر پہ ٹھڈے رسید کر رہا تھا اور رینا دونوں بازوؤں کو سینے پہ باندھے اس کے ایک قدم پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”اصغر! یہ کیا کر رہے ہو؟“

وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکلی اور جا کے دونوں ہاتھوں سے اس کو بچانے کی کوشش کرنے لگی اس کوشش میں اسے بھی کئی ضربیں لگیں۔

"ہٹ جاؤ بھابھی! مجھے آج اسے ٹھیک کر لینے دو۔ ماں کو مرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں یہ بے حیا سوگ والے گھر کا بھی لحاظ نہیں کر رہی اور آدھی رات کو چھت پہ ... بتا مجھے کہاں بھگایا ہے؟"

شمیم چپ چاپ مار کھا رہی تھی اور الزام سن رہی تھی۔ اس نے اپنے بچاؤ میں کچھ کرنے، صفائی میں ایک لفظ تک کہنا تو دور کی بات ایک آنسو تک نہ بہایا تھا۔

"کیسا گندا ذہن ہے تمہارا اصغر! اپنی بڑی بہن کی بارے میں ایسا سوچتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔"

"تو یہ دوسری کرسی سجائے رات کے اس وقت ماں کے چنے پڑھ رہی تھی؟"

ریتا نے اصغر کو مزید بھڑکانا چاہا۔

"اصغر! تم اس کی بات پہ کان مت دھرو۔ اس کا اب تمہارے خاندان سے کیا واسطہ... اور کیا پروا اس کو عزت کی ... مجھے تو شک ہے شمیم کو بڑھاوا دینے والی یہی ہے۔"

"چل تو اپنے کمرے میں۔"

وہ دونوں شمیم کو دھکے دیتے اس کے کمرے میں لے گئے۔ اور وہ خود پہ لگے الزام پہ ششدر بیٹھی رہ گئی، اندر سے آتی آوازوں سے صاف لگ رہا تھا وہ اسے زدو کوب کر رہے ہیں

"شمیم کے بھائی کا گھر ہے یہ... بیٹھی رہے گی وہ عزت سے؟"

مرتی ہوئی ساس کی بات اسے یاد آئی اور ساتھ ہی یہ احساس اسے کپکپا گیا کہ یہ گھر اس کے تو کسی بھی اپنے کا نہیں ہے۔ اگر شمیم کے لیے یہ سائبان تنگ ہو سکتا ہے تو اس کی ذات تو کسی بھی وقت زد میں آ سکتی ہے۔

وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آئی اور کپکپاتی انگلیوں سے جمیل بھائی کے گھر کا نمبر ملانے لگی۔

☼ ☼ ☼

اس کی ہمت نہ ہو رہی تھی دوبارہ اوپر جانے کی، نجانے کیسا عجیب سا خوف تھا جو اس کی ہڈیوں تک میں اترا جا رہا تھا۔

اس نے اصغر کی مار جہاں جہاں شمیم کے لگتے دیکھی تھی۔ اسے اپنے بدن کا وہ حصہ بے طرح دکھتا محسوس ہو رہا تھا۔ کچن کے بند دروازے سے لگی وہ اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسوؤں نے اس کا چہرہ اور گردن اور ٹھنڈے پسینے نے اس کے کپڑے تک بھگو کر رکھ دیے تھے۔ اسے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پتہ نہیں کب اصغر اور ریتا نیچے اترے ہوں گے۔

پتہ نہیں شمیم کا اس وقت کیا حال ہو گا؟

وہ اب تک وہیں پڑی ہو گی یا...

منزہ اتنی پتھر دل کبھی بھی نہ رہی تھی لیکن اس وقت وہ شمیم کی ہر تکلیف بھلائے بس اپنی فکر میں تھی۔ اسے ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ اسے شمیم کے پاس جانا چاہیے، اس کا حال جاننا چاہیے، اس وقت تو ایک ہی خیال تلوار کی طرح سر پہ لٹک رہا تھا۔

"مجھے یہاں سے نکلنا ہے... سوہا کو لے کر ابھی اور اسی وقت نکلنا ہے ورنہ یہ مظہر کا گھر نہیں ہے۔ یہ میرا گھر نہیں ہے یہ سوہا کا گھر بھی نہیں ہے۔ یہ... یہ... تو گھر ہی نہیں ہے مجھے یہاں ایک منٹ بھی اور نہیں رکنا۔"

وہ خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دل ہی دل میں دہراتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بس چلیں بھائی جان... مجھے لے جائیں یہاں سے... جلدی کریں بھائی جان!"

وہ سوئی ہوئی سوہا کو کاندھے پہ ڈالے جمیل کا ہاتھ پکڑے باہر نکلنے لگی۔

"بات کیا ہے منی! کیا ہوا ہے؟ کچھ تو بتاؤ...؟"

وہ اصل بات جانے بغیر اسے لے جانے پہ تیار نہیں تھا۔

"بس مجھے یہاں سے جانا ہے۔ آپ مجھے لے جائیں۔"

وہ بے حد خوفزدہ لگ رہی تھی۔ سہمی ہوئی۔ زرد... یخ۔

"کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے منزہ...؟" کلثوم نے بھی ہمدردی سے پوچھنا چاہا۔

وہ تینوں اس وقت ریتا کے سجے سجائے لونگ روم میں کھڑے تھے۔ صبح کے آٹھ بجے تھے اور یہ وقت اصغر اور ریتا کے جاگنے کا نہیں ہوتا تھا اس کے باوجود کلثوم کے سوال پہ وہ سہم کر ان کے بیڈ روم کے بند دروازے کو تکنے لگی۔

"لگتا ہے تمہاری دیورانی نے کوئی بکواس کی ہے؟ یا پھر وہ تمہاری سڑیل نند اس نے کچھ کہا ہے؟ کچھ تو بتاؤ۔"

کلثوم نے خود ہی اندازے لگائے مگر شمیم کے ذکر پہ منزہ پہ پھر سے لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ بھابھی کے گلے لگ کے رو پڑی۔

"شمیم... ! اسے بہت بہت مارا انہوں نے... وہ..." اس کی ہچکیوں کے ساتھ کہی بات جمیل کے پلے پوری طرح نہیں پڑی۔ جتنا وہ سمجھ سکا۔ اس پہ ہی آپے سے باہر ہو گیا۔

"کیا کہا؟ انہوں نے تم پہ ہاتھ اٹھایا؟... اتنی جرأت ان لوگوں کی...؟ میں ایسے خاموشی سے تمہیں نہیں لے کر جاؤں گا میں ان کی..." وہ طیش میں آ کر دروازے کی جانب بڑھا مگر منزہ نے بازو سے تھام کے منت کی۔

"نہیں... نہیں بھائی جان! مجھے نہیں اس نے شمیم کو۔ بس آپ مجھے لے جائیں نا، ورنہ وہ مجھے بھی شمیم اس کی سگی بہن ہے۔ اور... اور میں تو کچھ بھی نہیں۔"

وہ ریتا کی زبان کے جوہر جانتی تھی اور یہ بھی کہ اصغر رات سے نشے میں دھت ہے۔ وہ دونوں جمیل کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے اس لیے اس نے روکنا چاہا۔

"اب تمہیں احساس ہوا کہ تم ان کی کچھ بھی نہیں لگتیں۔ جب میں اور جمشید تمہیں سمجھاتے تھے تب تمہاری عقل میں یہ بات نہیں بیٹھتی تھی، بعض لوگ ٹھوکر کھا کے ہی ہوش میں آتے ہیں۔"

"حد کرتے ہیں آپ۔" کلثوم نے ٹوکا۔

"یہ کون سا وقت ہے ان طعنوں کا۔ اس کی حالت تو دیکھ کے ہی غصہ آ رہا ہے کہ پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا رہا ہے اور یہ بے وقوف چپ چاپ برداشت کرتی رہی۔"

"یہ سوچیں کہ اب ایسا کیا ہوا ہو گا جو اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی۔"

"آپ بس مجھے یہاں سے لے جائیں مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں یہاں بالکل غیر محفوظ ہوں۔ یہ گھر... یہ گھر مظہر کا ضرور تھا لیکن اب وہ مجھے بچانے کے لیے یہاں نہیں آ سکتا۔ ہم چلتے ہیں بھابھی...!"

وہ سوہا کو ایک کاندھے سے دوسرے کاندھے پہ منتقل کرتے ہوئے جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ جیسے فوراً سے پیشتر اس اذیت کدہ سے نکلنا چاہتی ہو۔

"یوں...؟ ایسے ہی...؟ خالی ہاتھ...؟" کلثوم نے اس کا ہاتھ تھاما اور اوپر کا رخ کیا۔

"اپنا سامان تو لے لو۔"

"بھابی! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے صرف یہاں سے جانا ہے۔" وہ ایک دم قدم آگے بڑھانے پہ آمادہ نہ ہوئی بلکہ کلثوم کا ہاتھ بھی کھینچ کے واپس لانے کی کوشش کی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو منی؟" جمیل ذرا جزبز ہوا۔

"ہم تمہیں لے جانے ہی آئے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو گی مگر اپنا اور بچی کا سامان تو لے لو۔ کلثوم! یہ تو

بے وقوف ہے اور اس وقت جذباتی بھی ہو رہی ہے۔ مگر تم دھیان سے اس کے تمام زیورات اور قیمتی اشیاء پیک کر لینا۔ فرنیچر اور دوسرے بھاری سامان کے لیے میں ٹرک منگواتا ہوں۔ اور منی' مظہر کے کوئی ضروری کاغذات' وغیرہ ہیں کیا؟ کوئی سیونگ کاؤنٹس' کوئی بینک یا پراپرٹی ڈاکومنٹس وغیرہ۔"

منزہ گم صم کھڑی یوں ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہی۔ جیسے وہ کوئی اجنبی زبان میں بات کر رہا ہو۔ یا کسی اور سے مخاطب ہو۔

"تمہارے بھائی جان تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں منزہ؟"

کلثوم نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ جیسے ہڑبڑا کے چونکی۔

"پیپرز؟ نہیں شاید.... پتہ نہیں.... مگر آپ ٹرک کیوں...."

"تمہارے جہیز کا سامان کیا یہیں چھوڑ دیں؟"

"جہیز....؟"

وہ ماؤف ہوتے دماغ پہ زور ڈال کر سوچنے لگی کہ اس کے جہیز کو کون سا سامان اس کے پاس ہے۔ دونوں بھائیوں نے متوسط طبقے کی اوقات کے عین مطابق مناسب سا ہی جہیز دیا تھا' نہ فریج تھا نہ وی سی آر نہ ہی کوکنگ رینج' ہاں جمشید نے قسطوں پہ ایک چھوٹا سا ٹی وی ضرور لیا تھا اور جمیل نے ایک لوکل کمپنی کی واشنگ مشین تحفے میں دی تھی۔ فرنیچر بھی درمیانہ سا تھا اور صرف بیڈ روم کے استعمال کے لیے تھا۔ جسے اگلے ہی سال مظہر نے چینج کر لیا تھا اور اسٹائلش سا خاصا مہنگا والا بیڈ روم سیٹ اور صوفہ خریدا تھا۔ پرانا والا کہاں گیا۔ یہ منزہ نے جاننے کی کوشش ہی نہ کی۔ کمرے میں رکھے فرنیچر کے ساتھ ساتھ وہاں بچھے قیمتی قالین' بھاری پردے' آرائشی فانوس' روم فریج' ٹی وی' سی آر' ڈیک اور الماری میں سے کچھ بھی تو اس کے جہیز کا نہ تھا' ہاں اسٹور روم میں پڑے صندوق اور اس میں بھرے بستر' کمبل اور رضائیاں' استری اسٹینڈ اور اس پہ رکھی استری ضرور اس کے جہیز کی تھی۔ جو چند ایک برتن اس کے جہیز کے تھے کچن میں زیرِ استعمال تھے وہ ریتا نے کب کے ملازموں میں بانٹ دیے تھے۔

یہ حقیقت اس نے دبے لفظوں میں بیان کرنا چاہی۔

"تو کیا ہوا؟ ہے تو سب کچھ تمہارا ہی۔ تمہارے میاں کی کمائی کا ہے۔ تم کیوں دوسروں کے لیے چھوڑ کے جاؤ اور وہ بھی ان کے لیے جن کو نہ ضرورت ہے ان چیزوں کی' نہ ہی کوئی قدر۔"

"اور کیا....؟ تمہارے لیے یہ صرف لکڑی اور لوہے کی بے جان چیزیں نہیں ہیں۔ مظہر کی یادیں' اس کی نشانیاں ہیں۔ ان پہ صرف تمہارا حق بنتا ہے۔"

کلثوم کی بات سیدھا اس کے دل کو لگی۔

"واقعی ریتا کے لیے یہ سب کاٹھ کباڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ میرے جاتے ہی وہ ان سب چیزوں کو بھی نوکروں میں تقسیم کر دے گی۔ یا گلی میں پھینک دے گی۔" اس نے مزید کوئی تعرض نہ کیا اور چپ چاپ سب کچھ ہوتے دیکھتی رہی۔

کلثوم نے ہی الماری میں سے اس کے اور سوہا کے کپڑے اور دیگر اشیاء نکال کر سوٹ کیس میں پیک کیے' بچا سامان اس نے اسٹور میں رکھے خالی کارٹن میں ٹھونسا۔

"یہ اپنا زیور دیکھ لو منزہ یہی ہے نا سارا۔"

"ہوں...." وہ کسی گہرے خیال سے چونکی۔

یہ سب تماشا اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔

"جی.... یہی ہے۔" ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب جب بھائی بھابھی کے آنے سے ذرا ڈھارس بندھی تو وہ شمیم کے پاس جانے کی ہمت کرنے لگی۔

"شمیم...." ذرا سا دروازہ کھول کے اندر جھانکتے ہوئے اس نے آواز دی۔ "شمیم.... کہاں ہو تم؟"

وہ پورا دروازہ کھول کے اندر آگئی مگر شمیم اسے نظر نہ آئی۔

وہ ٹھٹک گئی تھی کہ کھلے دروازے کے پیچھے دیوار سے کمر ٹکائے اسے زمین پہ بیٹھے دیکھا۔

اس کے خشک ہونٹوں کے ایک سرے سے خون بہہ کر جم چکا تھا۔ اس کے گرد آلود بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔

اور مٹی سے اٹے ہوئے چہرے پہ آنسوؤں کے خشک ہوتے نشانات عجیب گنڈ مڈ راستے بنائے ہوئے تھے۔

"شمیم...." وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

منزہ کے پاس اس سے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ تسلی کے چند بول' نہ ہمدردی کے کچھ الفاظ۔

"میری اماں مر گئی۔"

اچانک شمیم کے اندر سے ایک کراہٹ ابھری۔

"میری ماں مر گئی۔ میں یتیم ہو گئی۔"

اس کے آنسو خشک تھے۔ مگر اس کے لہجے میں بین تھے۔ منزہ بری طرح رو پڑی۔

"مجھے معاف کرنا شمیم! مجھے تمہیں چھوڑ کے واپس جانا پڑ رہا ہے۔ میں اتنی کم ظرف نہیں ہوں کہ جس عورت نے اتنے دن تک میرا خیال رکھا' میری حفاظت کی میری ڈھال بنی رہی۔ میری دلجوئی کرتی رہی' اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی میں اس کی بیٹی کو چند دن بھی نہ سنبھال سکوں اور اس کو سہارا دینے کی بجائے اپنا راستہ الگ کر لوں' مگر مجھے یہ کم ظرفی دکھانی پڑ رہی ہے۔ کیونکہ میں ایک عورت ہوں۔ مجھے اپنا عورت پن' اور اپنی بیوگی کی حرمت بہت عزیز ہے' مجھے اسے بچانا ہے۔ مجھے جانا پڑ رہا ہے۔ شمیم مجھے تمہیں اس حال میں ان درندوں میں چھوڑ کے جانا پڑ رہا ہے مجھے معاف کر دینا۔"

اس نے روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ شمیم چند سیکنڈ اپنی ویران آنکھوں سے اس کے بندھے ہاتھ دیکھتی رہی پھر اس کے لب حرکت میں آئے۔

"میری ماں مر گئی۔"

منزہ کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اٹھی اور تیر کی طرح اس کے کمرے سے نکل گئی۔

"سامان تو پیک ہے۔" کلثوم نے اس کے اندر آتے ہی اطلاع دی۔ وہ حیرت سے اپنے کمرے کو دیکھنے لگی جسے اس نے اور مظہر نے مل کے کتنی محبت اور شوق سے سجایا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل اور کارنر ٹیبلز بالکل خالی اور اجڑی ہوئی پڑی تھیں۔ کلثوم نے بستر کی چادر تک کھینچ لی تھی اور کمبل بھی۔ دیواروں پہ سے تصویریں تک اتار لی تھیں۔

یہ اجڑی ویران دیواروں والا کمرہ اسے یکسر اجنبی محسوس ہوا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا' یہاں اسے کمرے سے وابستہ کوئی جذبہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"یعنی یہ آخری وابستگی بھی گئی اس گھر سے۔ پہلے مظہر.... پھر امی اور اب.... یہ کمرہ.... شاید اچھا ہی ہوا۔ اب یہاں سے جاتے ہوئے اتنی تکلیف بھی نہیں ہو گی۔"

"تمہارے بھائی جان مظہر کے کچھ کاغذات کی بات کر رہے تھے۔"

"ایسے کوئی کاغذات نہیں ہیں بھابھی! مظہر اپنی جاب میں مگن تھے۔ ان کا کبھی دھیان ہی نہیں گیا اس جانب۔"

"تم سیف چیک تو کرو۔"

ان کے اصرار پہ وہ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اٹھی اور مظہر کی ذاتی استعمال کی چابیوں کا گچھا اٹھا کر سیف چیک کرنے لگی۔

منزہ اور سوہا کی چند تصاویر۔ اس کی تعلیمی اسناد۔۔۔ کچھ دفتری امور سے متعلقہ فائلز اور بس۔۔۔"
سیف دوبارہ لاک کرنے سے پہلے اس نے دفتری فائلز کے علاوہ باقی سب کچھ سمیٹ کر اپنے بیگ میں رکھا اور چابیاں لٹکاتے لٹکاتے رک گئی۔ اگلے ہی لمحے آٹھ چابیوں۔ لاوہ کی چین بھی اس کے بیگ میں تھا۔ جس کے سرے پہ دو نقرئی ہندسے جگمگا رہے تھے۔ M-M
نیچے سے آتے شور پہ وہ متوجہ ہوئی۔
"لگتا ہے جمیل ٹرک لے کر آگئے تم سوہا کو اٹھاؤ۔ نیچے چلتے ہیں۔ وہ خود مزدوروں کے ساتھ کمرہ خالی کروا دیں گے۔"
"بھابی میں تو کہتی ہوں اس کی ضرورت نہیں ہے خواہ مخواہ ہیں۔۔۔" لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ نیچے سے آتی اصغر کی چیخ و پکار نے اسے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔
دونوں فوراً" سیڑھیوں کی جانب لپکیں۔
"تم کس کی اجازت سے میرے دروازے تک ٹرک لائے ہو؟"
وہ اب نشے کی حالت سے خاصا باہر آچکا تھا مگر سرخ ہوتی آنکھوں اور بوجھل غصیلی آواز کے ساتھ منزہ کو اب بھی اتنا ہی خوفناک لگ رہا تھا جتنا رات کو۔
"مجھے یہاں سے اپنی بہن کو لے جانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"
"تم شوق سے اپنی بہن کو لے جاسکتے ہو۔ مگر سامان کو ہاتھ مت لگانا۔ تم نے جہیز میں جو پرانی لکڑیاں دی تھیں اب تک کباڑیا بھی راکھ کرچکا ہوگا۔ یہ سب سامان اس گھر کا ہے۔"
"یہ سامان میری بہن کے استعمال میں ہے۔ اس کے مرحوم شوہر کی ملکیت۔۔۔ تم کون ہوتے ہو اسے لے جانے سے منع کرنے والے۔"
"بھائی جان رہنے دیں۔ کیوں بات بڑھاتے ہیں۔"
وہ کمزور سی آواز میں انہیں منع کرنے لگی۔
"تم چپ رہو۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں اس سے دبنے کی۔"
"اف ز! یہ کیا ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ سویرے سویرے۔"
رینا بھی کمرے سے نکل آئی۔ نائٹ ڈریس میں ملبوس، مندی آنکھوں کے ساتھ صبح کے ساڑھے دس بجے کو وہ کمال معصومیت کے ساتھ سویرے سویرے کہہ رہی تھی۔
"تم اندر چلو رینا! میں ان سے نمٹ کے آتا ہوں۔ بڑے ٹھسّے سے آئے ہیں یہ اصغر کے گھر سے سامان لے جانے والے۔"
"کیا کروں اندر جاکر۔۔۔ نیند تو خراب کرہی دی ہے۔"
اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی تو منزہ نے بے اختیار نظریں جھکالیں۔ وہ اس وقت جس نائٹی میں ملبوس تھی، وہ اسے ڈھکنے کے لیے ناکافی تھی۔
"بے غیرت۔۔۔ ادھر اچھل اچھل کے چلا رہا ہے۔ پیچھے کھڑی بیوی کی بے حیائی نہیں نظر آرہی۔"
کلثوم نے بھی بڑبڑا کے تبصرہ کیا۔
"دیکھو اصغر! بدزبانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے مظہر سے تمہارے رشتے کا احساس ہے، اس لیے لحاظ کررہا ہوں، ورنہ دیکھتا ہوں تم کیسے مجھے یہ سامان لے جانے سے روکتے ہو۔"
"کون روک رہا ہے تمہیں۔ لے جاؤ، جو لے جانا ہے۔ لے جاؤ۔" رینا نے شاہانہ انداز میں مداخلت کی۔
"رینا! تمہیں کچھ نہیں پتہ، تم اندر جاؤ۔ یہ بھرجائی کا بھائی۔۔۔ اسے تو لے جا ہی رہا ہے، ساتھ ساتھ یہ سارا سامان۔۔۔"

"کون سا سامان؟" اس نے اصغر کی بات کاٹی۔
"یہ کاٹھ کباڑ، یہ لکڑیاں کا فرنیچر۔۔۔ یہ پرانا فریج اور ٹی وی۔۔۔ کیا کرنا ہے ہم نے اس کا۔۔۔ لے جانے دو۔ غریب آدمی کا بھلا ہو جائے گا۔"
اس بات پہ جہاں جمیل تلملا کے رہ گیا، وہیں منزہ کا سر اور جھک گیا۔ وہ رینا کی جانب سے ایسی ہی دل جلی باتوں کی توقع کرکے خوفزدہ تھی۔
اصغر کے ہونٹوں پہ لطف لینے والی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔
"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ میرے بھائی کی نشانی ہے۔"
"کم آن اصغر! کن باتوں میں پڑ رہے ہو۔ جانے والوں کی نشانیوں کو سینے سے لگانے سے کیا ملے گا۔ آنے والوں کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ویسے بھی ہم نے اوپر والا پورشن سیٹ تو کرنا ہی تھا۔ تم اپنی اس بھابھی کا خیال کرکے رکے ہوئے تھے۔ چلو اچھا ہے، بھابھی محترمہ کو بھی خیال آگیا۔ جانے دو اسے اور لے جانے دو جو سوغات لے جانا چاہتے ہیں۔"
"تمہارا دل کتنا بڑا ہے رینا۔۔۔!" اصغر متاثر ہی تو ہو گیا۔
"جاؤ۔۔۔ لے جاؤ۔۔۔ میری رینا نے اجازت دے دی ہے۔"
منزہ کو پتہ نہیں کس چیز سے گھن محسوس ہوئی۔ ایک عجیب کراہیت کا سا احساس ہونے لگا۔
"رہنے دیں بھائی جان! کسی چیز کو ہاتھ مت لگائیے گا۔ میں اب یہاں سے اپنی بیٹی کے سوا کچھ نہیں لے کر جاؤں گی۔"
"جذباتی مت بنو منزہ۔۔۔! یہ تمہاری اپنی چیزیں ہیں۔ کسی کی بکواس کی وجہ سے۔۔۔"
جمیل نے سمجھانا چاہا مگر رینا نے استہزائیہ قہقہہ لگا کے اس کی بات کاٹ دی۔
"ہاں ہاں بھابھی۔۔۔! بات مان لو اپنے بھائی کی۔ اب یہ غریب بار بار تمہارا جہیز کہاں بناتا رہے گا۔" منزہ نے تڑپ کے اسے دیکھا۔
"ظاہر ہے لے جا رہا ہے تو ساری عمر سرپہ تو بٹھا کے نہیں رکھے گا۔ کہیں نہ کہیں رخصت ہی دے گا۔ ہو سکتا ہے تمہارا اپنا ارادہ ہو کسی سے نکاح پڑھوانے کا، جب ہی بھائی کو بلوا کر بوریا بستر سمیٹ رہی ہو۔ لے جاؤ سارا سامان۔ نئی شادی پہ پرانے شوہر کا تحفہ سمجھ لینا۔" اس نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔
منزہ کو زور کا چکر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کے گر جاتی، کلثوم نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے لے کر آگے بڑھ گئی۔
"چاچو۔۔۔"
ماں کی انگلی تھام کے باہر نکلتی سوہا نے پیچھے مڑ کے اصغر کو دیکھ کے مسکراتے ہوئے پکارا۔
اصغر کو عین اسی لمحے اپنے نشے کے سارے اثرات زائل ہوتے محسوس ہوئے۔
"کدھر۔۔۔؟" رینا نے اس کا بازو تھام کے آگے جانے سے روکا۔
"وہ۔۔۔ سوہا۔۔۔ اسے پیار تو دے دوں۔"
"اسے تمہارے پیار کی ضرورت ہوتی تو اس کی ماں خود ہی یہاں رہتی اور اسے بھی رکھتی۔ دفع کرو۔۔۔ جانے دو انہیں۔ اتنے سال تم نے پلکوں پہ بٹھایا، بھرجائی بھرجائی کرتے منہ سوکھتا تھا تمہارا اور آج یہ سب کیا کرایا کنویں میں ڈال کے بھائی کی گھر چل پڑی۔ لوگ تو تمہیں ہی باتیں رکھیں گے کہ بیوہ بھابھی کو چار دن سنبھال نہ سکا۔ اب لوگوں کو کیا بتایا جائے کہ بھابھی اپنی راہ نکالنے کے لیے نند کا استعمال کررہی تھی، اسے خراب کررہی تھی۔"
"ہاں، بس یہ بات نہ ہوتی تو میں کبھی اسے یہاں سے نکلنے نہ دیتا لیکن بھرجائی نے اس گھر کی عزت اچھال کے اچھا نہیں کیا۔ میں کتنا مان دیتا تھا اسے۔۔۔ اور سوہا۔۔۔ اسے تو ہمیشہ اپنی اولاد ہی سمجھا تھا۔"

"چلو بھول جاؤ سب۔۔۔ بلکہ وقت خود بھلا دے گا' جب اپنی اولاد ہوگی تو۔۔۔"
"یہ تو صحیح کہا تم نے۔"
وہاں پھر سے مسکراہٹیں پھیل رہی تھیں۔ قہقہے اور سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔ یہ یکسر فراموش کرتے ہوئے کوئی اس دہلیز پہ چند لمحے قبل ہی اپنے آنسوؤں کے نشان چھوڑ کے گیا ہے۔

✡ ✡ ✡
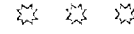
"یہ کیسی قید ہے اباجی؟"
کئی ماہ تک جلنے کڑھنے اور خاموش احتجاج کرنے کے بعد بالآخر وہ پھٹ پڑا۔
"جعفر بیٹا! قید کیسی؟ تیری زمینیں ہیں' تیری جاگیر ہے یہ ساری۔۔۔ راکھا بننے کے مزے لوٹ۔"
محمود باجوہ نے اپنے بیٹے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا جس کے لہجے سے سرکشی اور بغاوت کی بو آ رہی تھی۔
"مجھے یہ مزے لوٹنے ہوتے تو میں اتنی تعلیم کیوں حاصل کرتا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں اباجی! کہ مجھے زمین جائیداد سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"
"تیرے پاس ہے نا' اس لیے۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔ "اسی لیے قدر نہیں ہے۔ پاگلا۔۔۔ اپنی زمین اپنی عزت ہوتی ہے۔ اس کی خاطر تو جان لینے اور جان دینے تک کا سودا کرنا پڑتا ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ تجھے دلچسپی نہیں ہے۔ نہیں ہے تو اب لینا شروع کر۔"
"آپ نے خود مجھے ملازمت کرنے کی اجازت دی تھی۔" اس نے یاد دلانا چاہا۔
"ملازمت کرنے کی دی تھی' حرام کاریاں کرنے کی نہیں دی تھی۔" نرمی سے بات کرتے کرتے محمود باجوہ ایک دم گرجے۔ جعفر محمود کا سارا طنطنہ ہوا ہو گیا۔
"تو اپنا گھر تو خراب کر رہا تھا' ساتھ ساتھ بہن کی گھرہستی بھی اجاڑنے چلا تھا جس بے چاری کا کہیں بڑے وسیلے جا کے جوڑ ملا تھا۔"
"ہونہہ۔۔۔ جوڑ۔۔۔ اس بے جوڑ رشتے کے احسان تلے دبا کے ہی تایا جی اور اب بھائی صاحب شیر ہو رہے ہیں۔"
"بکواس بند کرو' اب تمہیں اپنے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں رہی اور کیوں رہے' بازاری لوگوں میں اٹھ بیٹھ کر تم نے اپنا بیڑہ غرق کر لیا ہے۔"
"میری اس ایک غلطی کے طعنے کب تک دیں گے آپ؟" وہ زچ ہوا تھا۔
"کیا میں کوئی سولہ سترہ سال کی لڑکی ہوں جسے کسی غلطی کی پاداش میں آپ ٹانگیں توڑ کے چار دیواری میں بٹھا دیں گے۔"
"تم مرد ہو' اسی لیے تمہاری ٹانگیں سلامت نظر آ رہی ہیں۔" ان کا لہجہ بدستور سخت تھا۔
"خاندان کی عزت کے معاملے میں مرد اور عورت دونوں کی ذمہ داریاں ایک سی ہیں۔ تم یہ ذمہ داری نبھا نہیں سکے' اس لیے۔۔۔"
"بس کیجیے اباجی! ایسا کون سا دنیا سے نرالا کام کر لیا ہے میں نے۔ مکرم بھائی صاحب کیا کچھ نہیں کرتے۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی' میرا منہ مت کھلوایے۔ سب جانتا ہوں میں۔ جاگیرداروں کے شوق کس قسم کے ہوتے ہیں۔"
"مکرم کا نام لینے کی گستاخی مت کرو۔" وہ تھے کہ اپنے لاڈلے بھتیجے اور سر چڑھے داماد کا نام سننے پہ راضی نہ تھے۔

"میں کچھ نہیں جانتا' زیادہ دن نہیں رہ سکتا یہاں۔" جعفر محمود نے رکھائی سے اعلان کیا۔
"ڈگری پوائنٹ پہ استعفیٰ تو دلوا دیا ہے مگر یہ نہ سمجھیں کہ میں باقی کی عمر آپ کے داماد کا اسسٹنٹ بن کے گزار دوں گا۔ ہر چیز پہ تو وہ قابض ہیں۔ میرے کرنے کے لیے یہاں ہے ہی کیا؟"
"تم نے شروع سے ہی اس کام میں دلچسپی نہ لی تھی۔ میں کیا باپ دادا کی جاگیر مٹی ہونے دیتا۔ یہ تو مکرم کا احسان ہے کہ اپنی زمینوں کے ساتھ ساتھ میری بھی دیکھیں۔ تم کچھ عرصہ اس کے ساتھ ساتھ رہو' سیکھو کہ اتنی لمبی چوڑی جاگیروں اور جائیدادوں کو کیسے سنبھالتے ہیں۔ آخر کل تمہیں ہی یہ ذمہ داری اٹھانی ہے۔"
"کل۔۔۔ کل کس نے دیکھی ہے۔ آپ بہت بھولے ہیں اباجی! مکرم بھائی صاحب اتنی آسانی سے ہاتھ آئی [illegible] جانے نہیں دیں گے۔"
"تمہیں بہت فکر ہو رہی ہے اپنے حق کی۔ پہلے اپنی آوارگی کے شوق میں اور گھر' بچوں اور بیوی سے دور رہنے کے لیے اپنی مرضی سے سب کچھ اس کے حوالے کیا تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ تم مکرم پہ اپنا غصہ نکال رہے ہو اور اس وجہ سے بے کار کے الزام لگا رہے ہو اس پہ۔"
وہ کچھ دیر کھڑا بے بسی سے مٹھیاں بھینچتا رہا اور اس کے بعد ایک جھٹکے سے مڑ کے کمرے سے نکل گیا۔
اپنے کمرے میں آ کے اس نے زور سے ہینڈل گھما کے دروازہ کھولا۔ حساب کی کاپی پہ جھکی مدیحہ اور تحریم ایکدم سے اچھل گئیں۔
"کیا ہوا؟"
مدیحہ نے اس کا لال بھبوکا ہوتا چہرہ اور اضطراری کیفیت دیکھ کر پوچھا۔
جواب میں جعفر نے اسے ایسی خونخوار اور کھا جانے والی نظروں سے گھورا کہ وہ چپ کر گئی اور دوبارہ تحریم کو پڑھانے لگی۔
"تھرٹی فور کو ایٹ سے ڈیوائڈ کرو تو۔۔۔"
"تم اپنا یہ ٹیوشن سینٹر کہیں اور جا کے نہیں کھول سکتیں؟ جہالت تو ختم ہے اس عورت پہ۔ بچیوں کا الگ کمرہ ہے مگر یہ عین اس وقت انہیں اندر گھسائے دماغ چاٹنے لگتی ہے جب میرا آرام کا موڈ ہو۔"
اس کی بڑبڑاہٹ کے جواب میں مدیحہ نے ایک گہری سانس لی اور وضاحت پیش کی۔
"آپ کو پتہ تو ہے تقدیس کو ٹمپریچر ہے۔ میں ابھی ابھی اسے سلا کے آئی ہوں۔ تطہیر کو بھی اماں جی کے کمرے میں چھوڑا ہے اور اسے یہاں لا کے پڑھا رہی ہوں تاکہ اس کی نیند ڈسٹرب نہ ہو۔"
ایک لمحے کے لیے وہ چپ ہوا۔ اس کے بعد مزید گلے۔
"سب کے آرام کا خیال ہے۔ ایک میرے آرام کے علاوہ۔"
"میں کہاں جا کے پڑھاؤں اسے۔" وہ بھی زچ سی ہو گئی۔
"آپا آئی ہوئی ہیں۔ ان کے بچے کھیل کود میں مصروف ہیں۔ بھائی صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھک میں ہیں۔ اماں جی کے ساتھ والے کمرے میں آپا نے اپنے بچوں کو آیا ٹھہرائی ہوئی ہے۔ اتنا بڑا گھر ہے اور کہیں جگہ نہیں' جہاں میں سکون سے بچی کو پڑھا لوں۔ تحریم کا حساب کا پرچہ ہے صبح اور اسے تیاری کرنی ہے۔"
"ایک تو تمہارے بھائی صاحب کو اپنے گھر چین نہیں ہے۔"
"معاف کیجیے گا۔ اس وقت جو یہاں بیوی بچوں سمیت موجود ہیں' وہ میرے بھائی صاحب نہیں' آپ کے بہنوئی صاحب ہیں۔" مدیحہ نے بھی فوراً ترخ کے جواب دیا۔
"وہ اپنے چچا کے گھر یا بہن کے سسرال میں رہنے نہیں آئے۔ یہ ان کی بیگم ہیں جن کا دل گھر میں نہیں لگتا۔"
اس کے چبا چبا کے کہنے پہ جعفر کو شدید غصہ آ گیا۔ وہ نوٹ کر رہا تھا کہ اب مدیحہ اس کے آگے دوبدو جواب دینے لگی ہے۔ پہلے والا ادب لحاظ تو جیسے اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے خیال میں بیوی کی نظر میں بے وقعت

کرنے میں اباجی اور مکرم پادو پیش پیش تھے۔

"یہی ہے دوسرے بچوں کو اودھم مچاتے اور کھیلتے دیکھتی ہے۔ اس کا بھی تو پڑھائی سے اچاٹ ہوتے ہیں اس لیے نہ والان میں جا کے پڑھا سکتی ہوں نہ باغیچے میں اور نہ ہی باہر ہال کمرے میں۔ کم از کم آپ تو اس کا دھیان کرلیں۔"

"تمہیں بڑا دھیان ہے۔"

"ہاں ہے۔ مجھے اپنی بچیوں کی پڑھائی کا خیال نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا؟"

"اتنا ہی خیال ہوتا تو یہاں اس قصبے میں رہنے کے اپنے بھائی کے احمقانہ فیصلے پہ سر نہ جھکا دیتیں۔ یہاں وہ کون سی اعلا تعلیم حاصل کرلیں گی۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم اسلام آباد جا کے دوبارہ سیٹل ہوسکتے ہیں۔ اعلا تعلیمی اداروں میں بچیوں کو پڑھا سکتے ہیں۔ اس حویلی سے دور ایک صاف ستھرے ماحول میں۔ یہاں گھر کے مکینوں کی زیادہ تعداد اجڈ اور گنوار ملازموں کی خانہ بدوش عورتوں اور ان کے ریں ریں کرتے بچوں کی صحبت میں ہماری بچیاں کس قسم کی تربیت حاصل کریں گی۔"

"یہ آپ بچیوں کے لیے کہہ رہے ہیں یا پھر...؟"

مدیحہ نے بڑے جھجکتے انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے مدیحہ!" وہ بھنا گیا۔

"اور آپ کی نیت۔" بڑے آرام سے جواب دے کر وہ تحریم کا بیگ بند کرنے لگی۔

"جاؤ، تم جا کے کھیلو۔ باقی پڑھائی ذرا ٹھہر کے۔" تحریم کے جانے کے بعد جعفر نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

"دیکھو مدیحہ! میں مانتا ہوں۔ پوری دیانت داری سے یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میری اس خواہش کے پیچھے صرف بچیوں کا محفوظ مستقبل نہیں ہے لیکن میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ایسا بھی کچھ نہیں ہے، جیسا تم سمجھ رہی ہو میں... میں بس یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

وہ اتنا بے بس نظر آرہا تھا کہ مدیحہ کو یک بارگی اس پہ ترس سا آنے لگا۔

"میں تمہارے بھائی کی مٹھی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے اب۔"

"نہ بھائی صاحب مانیں گے نہ اباجی۔"

"تم منا سکتی ہو۔" وہ بڑی آس سے اسے دیکھنے لگا۔

"لیکن آپ تو استعفیٰ دے آئے تھے۔"

"کوئی کاروبار شروع کرلوں گا... کچھ بھی مگر یہ زمینوں، فصلوں اور قرضوں کے حساب کتاب میرے بس کی بات نہیں اور مدیحہ! اگر تم بھی اپنے بھائی کی طرح یہ سمجھتی ہو کہ مجھے زبردستی اس حویلی میں قید رکھ کے تم مجھ پہ تسلط قائم کرسکتی ہو تو تمہاری یہ سوچ غلط ہے۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے ہمارے درمیان ایسے فاصلے آسکتے ہیں جو تمہیں پچھتانے پہ مجبور کرسکتے ہیں لیکن اگر... اگر غلامی کے اس احساس سے چھٹکارا مل جائے تو شاید... شاید حالات میں بہتری ہو۔ اگر ذہن و دل کو تازہ ہوا ملے تو..."

"یعنی تمہیں حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہاری ڈور کو ایک بار پھر ڈھیل دینا ہوگی۔" مدیحہ نے اس کی ساری بات سننے کے بعد سوچا۔

"یہ تو بہت بڑا رسک ہے۔ پتا نہیں مجھے یہ رسک لینا چاہیے یا نہیں۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"ہاں... کچھ نہیں... دیکھوں گی۔ بات کرتی ہوں بھائی صاحب سے۔"

☆ ☆ ☆

"نانو..."

وصی ابھی نیند سے جاگا تھا اور آنکھیں مسلتا کمرے سے نکلا۔ نانی اسے کہیں نظر نہیں آئیں تو اس کے انداز میں وحشت سی آگئی۔ نہ صرف نانی بلکہ اسے امی بھی کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔

"نانو... نانی...!"

صحن کے درمیان کھڑا ہو کے وہ حلق پھاڑ کے چلایا اور پھر رونے لگا۔

باتھ روم میں نہانے کے بعد اپنے گیلے بال تولیے میں لپیٹتی ہوئی پروین کا دل ایک بار تو کانپ ہی اٹھا۔

"یا اللہ خیر۔"

وہ افتاں و خیزاں باتھ روم سے باہر نکلی۔

"کیا ہوگیا اماں جی کو۔ ابھی اچھا بھلا تو مصلے پہ چھوڑ کے آئی تھی۔" وصی کے بھیں بھیں کر کے رونے اور نانو کو پکارنے پہ یہی اندیشہ آسکتا تھا دل میں۔

"اماں جی...!" وہ بھی پکارتی ہوئی باہر آئی۔ دیکھا تو صحن میں وصی آنسوؤں اور چیخوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

"امی..." اسے دیکھتے ہی وہ دوڑ کے آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"امی... آپ کدھر تھیں؟"

"نانو کو کیا ہوا ہے وصی؟ کہاں ہیں نانو؟" وہ بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اسے ہلا ہلا کے پوچھنے لگی جو اس کی ٹانگوں سے الگ ہونے پہ تیار نظر نہ آتا تھا۔

"نانو نہیں مل رہیں امی! آپ بھی نہیں مل رہی تھیں۔" وصی ڈر گیا۔

"میں نہا رہی تھی بیٹا! نانو... نانو کہاں ہیں؟"

وہ بھی کچھ پریشان سی ہوئی۔ اتنے میں رخشندہ نے اوپر سے جھانکا۔

"وصی کو کیا ہوا ہے؟ گر گیا ہے کیا؟"

"بھابھی! اماں جی پتہ نہیں کہاں چلی گئیں۔"

وہ اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے فکر مندی سے بتانے لگی۔

"وہ بھلا کہاں جائیں گی۔"

رخشندہ کا اطمینان قابل دید تھا۔

"یہی تو پریشانی کی بات ہے۔ وہ بغیر بتائے کہیں جاتی نہیں بلکہ اکیلی تو کہیں بھی نہیں پھر..."

قریب تھا کہ وہ رو دیتی کہ رخشندہ نے کہا۔

"ابھی میں نے اوپر سے دیکھا تھا، سبزی والے سے بھاؤ تاؤ کر رہی تھیں۔" اتنا کہہ کر وہ جھپاک سے اندر غائب ہوگئی۔ پروین کی جان ہی جل کے رہ گئی۔

"بڑی جلدی اطلاع دی ہے... ایک تو رخشندہ بھابھی نہ سمجھ میں آنے والی چیز ہیں۔"

ابھی وہ اسی پہ کڑھ رہی تھی کہ شوکت جہاں سبزی کی ٹوکری اٹھائے اندر آگئیں۔

"نانو مل گئیں... نانو مل گئیں..."

وصی بھاگ کر اب کے ان کی ٹانگوں سے ایسے ہی چمٹ گیا جیسے پروین کے چمٹا ہوا تھا۔

"کہاں کھو گئی تھیں تیری نانو...!"

وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے اسے الگ کرنے لگیں۔

"ارے... وصی رو رہا تھا۔"

یہ سوال انہوں نے وصی سے کرنے کی بجائے پروین سے کیا جو اسے بری طرح کھلا۔ آج کل وصی سے ہر سوال اس کی پیشانی کو ایسے ہی شکن آلود کر دیتا تھا۔

"میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ نہ مارا ہے۔"

بہت ضبط کرتے ہوئے بھی وہ خود کو یہ کہنے سے روک نہ سکی۔

"میں نے کب کہا کہ تم اسے مارو گی؟ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کیا؟" وہ بھی حیران ہوئیں اس جواب پہ۔

"مگر یہ رو تو ایسے رہا ہے جیسے کسی نے اسے بری طرح پیٹا ہو۔ لے کر مجھے بھی پریشان کر کے رکھ دیا۔"

"بچے روتے ہی ہیں' اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔"

وہ سبزی کی ٹوکری میں سے تازہ گاجر نکال کے اپنی چادر سے پونچھتے ہوئے وصی کو تھمانے لگیں۔

"آپ بھی تو بغیر بتائے باہر نکل گئیں۔ میں نہا رہی تھی' اتنے میں یہ جاگا اور آپ کو نہ پا کے اس نے گھر سر پہ اٹھا لیا۔ بھابھی تک باہر نکل آئیں۔"

"ہائے... ننھی سی جان...!" وہ سبزی وغیرہ وہیں چھوڑ وصی کو سینے سے لگا کے بیٹھ گئیں بلکہ جیسے چھپا لیا۔

"میرا بچہ... کیسا ڈرا ہو گا خود کو اکیلا پا کے۔"

اب وہ چٹاخ پٹاخ اس کے گال چومنے لگیں۔

پروین کی نظروں کے سامنے کچھ دن پہلے کا منظر گھوم گیا۔ وہ کچھ خریداری کرنے بازار گئی تھی۔ واپسی پہ فارغ ہو گئی تو اماں کے ہاں جانے کا ارادہ باندھ لیا۔ سراج دین نے گاڑی اور ڈرائیور بھیجا ہوا تھا۔ بازار سے سیدھی بھائی کے گھر آ گئی۔

اندر قدم رکھتے ہی اسے ننھی وشمہ کی دردناک چیخیں سنائی دیں۔ وہ سامان کے بھرے تھیلے وہیں پھینک کر اندر کی جانب لپکی۔

"اماں! کیا ہوا وشمہ کو۔"

مگر خالی کمرے میں اماں کہیں نظر نہ آئیں۔ اس نے دھیان دیا۔ آواز کچن سے آ رہی تھی۔

"لگتا ہے اماں کھانا پکاتے پکاتے اسے بھی اندر لے گئیں مگر کوئی جواب کیوں نہیں دے رہیں اور آپا کہاں ہے؟"

کمرے سے کچن تک کا چند قدموں کا فاصلہ طے کرتے ہوئے اس نے کتنی ہی باتیں سوچ لیں۔ اوپر سے اس کی چیخیں دل دہلائے دے رہی تھیں۔ اس نے بھی تین تین بچے پالے تھے۔ صاف محسوس کر سکتی تھی کہ یہ بچوں کا عام رونا نہیں ہے۔ ضرور اسے کوئی چوٹ لگی ہے اور کچن میں داخل ہوتے ہی اس کے اندیشے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

وشمہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی اندر آ گئی تھی اور میز کے پائے تھام کے کھڑی بھی ہو گئی ہو گی۔ میز پہ رکھی دودھ کی دیگچی اس نے میز پوش کھینچ کے اپنے اوپر گرا لی تھی۔

"وشمہ...!" پروین نے لپک کے اسے گود میں اٹھایا۔ "میری جان...." وہ اسے جگہ جگہ سے ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ ہاتھوں' بازو اور ٹانگوں پہ جہاں جہاں دودھ گرا تھا' وہ جگہ سرخ ہو رہی تھی مگر شکر ہے کہ دودھ اتنا زیادہ گرم نہیں تھا کہ اس کی جلد جھلس جاتی۔ پانچ سات منٹ بعد شمشاد بیگم جھومتی جھامتی اندر داخل ہوئی تو پروین نے خوب لتے لیے۔

"حد ہو گئی اماں! اتنی سی بچی کو اکیلا چھوڑ کے آپ ہمسایوں کے گھر میاں بیوی کی لڑائی دیکھنے گئی ہوئی تھیں اس قدر لاپروائی۔"

"سلا کے گئی تھی اسے۔ مجھے کیا پتہ گھنٹہ تھپکنے کے بعد بھی یہ پندرہ منٹ ہی سوئے گی۔ پتہ نہیں اس کو دن میں نیند کیوں نہیں ہے۔"

"جلتے جلتے بچی ہے یہ...."

"سو پہ کا ابال کے رکھا ہوا ہے دودھ۔ نہیں جلتی۔" اس نے وشمہ کا بازو پکڑ کے سرسری سا دیکھنے کے بعد کہا۔

"آپا کو کیا موت پڑی ہے؟"

"اس کے اپنا بچہ ہونے والا ہے' وہ بھی ساتواں۔"

"او ہو... کب تک آئے گی؟"

"اللہ جانے۔ آتی بھی ہے کم بخت یا نہیں۔ اچھا دفع کر اس کو۔ پتہ ہے صدیقا نجمہ کو طلاق دینے والا تھا' وہ تو بچے کے پیار نے [illegible] ہو گئے تو...."

"آپ کو ابھی بھی صدیقا اور نجمہ کی پڑی ہوئی ہے۔ یہ آپ کی پوتی ہے اماں!"

"نوید کی بھی تو بیٹی ہے۔ اس کے کلیجے میں کیوں نہیں درد جاگتا۔"

"ہاں... کام وام چھوڑ کے اسے سنبھالنے گھر بیٹھ جائیں۔"

"سنبھالنے والی لے آئے نا۔ تو کیوں نہیں زور دیتی۔"

"میں تو نہیں کہتی۔" اس نے صاف جواب دے دیا۔

"کیوں' تجھے کیا اعتراض ہے؟ وہ کوئی پہلی پہ سوت لا کے تو نہیں بٹھا رہا۔ رنڈوے دوسری شادی نہیں کرتے؟ جب تو بیوہ کا رشتہ بھی لوگ عدت پوری ہونے سے پہلے کر ڈالتے ہیں۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہے۔ پہلے مجھے بھی آپ کی طرح ڈر تھا کہ سوتیلی ماں نجانے کیسی ثابت ہو پھر اماں جی کی باتوں نے امید دلائی کہ اللہ پہ بھروسہ کرتے ہوئے یہ قدم اٹھانے میں کوئی حرج نہیں اور اب جو حالت اس کی دیکھ رہی ہوں' اس کے بعد خیال آتا ہے کہ سوتیلی ماں جو بھی کرے گی' اس سے برا کیا کرے گی۔"

"کیا مطلب؟ زیادہ طعنے نہ دے وڈی سیانی بی بی سا" شمشاد بیگم فوراً طیش میں آ گئی۔

پروین کو ماں کا یہ انداز تخاطب ہمیشہ کی طرح گراں گزرا کتنا سمجھانے کی کوشش کرتی تھی' اب بیٹے کی خوشحالی اور حالات یکسر بدل جانے کے بعد بھی وہ اس ماحول سے نکلنے پہ راضی نہ تھی۔ پروین نے ماں کے غصے کو نظرانداز کرتے ہوئے اصل بات بتائی۔

"میں دل سے چاہتی ہوں کہ بھائی جان دوسری شادی کر لیں۔ لیکن میں خود ان پہ زور نہیں ڈالوں گی۔ میں چاہتی کہ یہ دوسری شادی وہ میری فرمائش یا میرے زور دینے پہ کریں کیونکہ یہ ڈر تو بہرحال ہے ہی کہ نئی ماں جانے کیسی نکلے۔ دوسری ماں جوا ہوتی ہے۔ اگر خدانخواستہ... سارا الزام تو بھائی جان میرے سر ہی ڈالیں گے۔"

"میں تجھے غلط تو نہیں کہتی سیانی بی بی۔"

"لیکن اس مسئلے کا کوئی حل بھی تو نکالنا ہو گا۔"

وہ وشمہ کو تھپکنے لگی جو روتے روتے اس کی گود میں سو گئی تھی۔ سوتے میں بھی اس کی ہچکیاں نہیں تھم رہی تھیں۔

"کیا سوچنے لگیں تم؟"

شوکت جہاں نے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے شانے پہ ہاتھ دھر کے پوچھا تو وہ اپنے خیالوں سے باہر آئی۔ نحیف اور کمزور سی نانی کی گود میں چڑھا وصی کتنا سرشار لگ رہا تھا۔

"بس... کچھ نہیں... وہ... یہ وصی کو دیکھیں... اتنا بڑا ہو کے ابھی تک آپ کی گود میں چڑھتا ہے۔ اب بھلا رہ جاتا ہے آپ سے... نیچے اتار دیں اسے اماں جی!"

انہوں نے اسے اور بھی اپنے ساتھ لپٹا لیا اور یونہی اٹھائے ہوئے اندر چلی گئیں۔ پروین دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر کمرے سے آتی وصی کی ہنسی کی آواز سنتی رہی۔

”ضروری نہیں بن ماں کے سب ہی بچوں کا حال ایک سا ہو۔ وصی کے باپ نے دوسری شادی کرلی،
اپنے ساتھ رکھنے پہ رضامند نہ ہوا مگر یہاں اسے سر آنکھوں پہ بٹھانے والے بہتیرے ہیں۔ پوتے
کہیں بڑھ کے لاڈلا ہے یہ اماں جی کا۔ دونوں ماموں بھی خیال رکھتے ہیں اور وشمہ... نہ ننھیال والے
پوچھنے آئے، نہ دادی نے اصل سے سود پیارا والی مثال کو سچ کر دکھانے کی کوشش کی پھر ایسا بھی تو ہو سکتا
جیسے ... معاملہ الٹ ثابت ہوا۔ ویسے ہی سوتیلی ماں کے معاملے میں بھی سب الٹا ہی ہو۔ وشمہ کو ماں کا
جائے اور نوید بھائی جان کو ایک مخلص اور محبت کرنے والی شریک حیات۔“

اس نے کئی روز سے ادھیڑبن کا شکار اپنے دل کو اس ایک نتیجے پہ ٹھہرا ہی لیا۔

■ ■ ■ ■

”بھائی جان! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“

وہ ابھی یہاں آ کے خود کو صحیح طرح سنبھال بھی نہ پائی تھی کہ جمیل کی بات نے اس کے ہوش اڑا دیے۔

”میں نے وکیل سے بات کرلی ہے، کل تم میرے ساتھ چلنا اور چند ضروری کاغذات پہ دستخط کر دینا۔“

”مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟“

”حق ضرورت کے لیے نہیں جاتا۔ حق تو حق ہوتا ہے۔“

”کیسا حق؟“

”کیا بے وقوفوں والے سوال کر رہی ہو۔ مظہر کی جائیداد پہ تمہارا اور سوہا کا پورا حق ہے۔“

”مگر مظہر بے چارے کون سی جائیداد بنا پائے۔“

”باپ کی جائیداد میں اس کا جو حصہ نکلتا ہے، میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتیں۔“

”مکان اور فیکٹری میں نکلتا ہے مگر ابا جی نے جو مکان آج سے پچیس سال پہلے تعمیر کیا تھا، اس میں اور اِس
کوٹھی میں بہت فرق ہے۔ اس میں یہ سب تبدیلیاں اصغر نے وقتاً فوقتاً کرائی ہیں۔ لاکھوں لگا ہے اس
”وہ لاکھوں اس نے پلے سے نہیں لگایا۔ اسی مشترکہ کاروبار کی کمائی سے لگایا ہے۔“

”لیکن محنت تو اسی اکیلے کی تھی۔ مظہر ہمیشہ کاروبار سے الگ رہے۔“

”عجیب عورت ہو، اس ذلیل انسان کی حمایت کرتی جا رہی ہو اور اپنی اولاد کا جائز حق نظرانداز کر رہی
جمیل بھی اس بحث سے اکتا گیا۔

”میں تو انصاف کی بات کر رہی ہوں، اس نے اس کاروبار کو اپنی برسوں کی محنت اور وقت دے کر اس مقام
ہے، ورنہ ابا جی تو ایک معمولی دکان کے مالک تھے۔“

”تم پتہ نہیں کون سے انصاف کی بات کر رہی ہو۔ قانون کی نظر میں مظہر ہر چیز میں برابر کا شریک ہے۔
تھے یہ اور ماں کی وفات بھی ہو چکی ہے۔“

”مجھے ایسے کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

”تمہاری بیٹی کو تو ضرورت ہے۔“

”کیسی ضرورت؟ کیا آپ اس کا خرچہ نہیں اٹھا سکتے۔“ اس نے بھائی کے چہرے پہ نظریں گاڑ کے کہا
گیا۔

”لعنت ہے مجھ پہ جو میں تمہارا بھلا سوچنے نکلا تھا۔ تم الٹا مجھ پہ ہی شک کرنے لگی۔ میرا کیا مفاد ہو سکتا
بات سے؟ یا مجھے اس تین چار سال کی بچی کا خرچہ چبھنے لگا ہے۔“ وہ غصے میں آ کے تیز تیز بولنے لگا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں تو...“

”رہنے دو... تم اپنا مطلب اپنے پاس رکھو۔ اتنے مان سے میں تمہیں یہاں لے کر آیا... جی جان سے
اور تمہاری بچی کی ذمہ داری سنبھالنے پہ تیار ہوں... ہاں صرف سوہا کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے یہ کر

تم تو میری نیت پہ شک کرنے لگیں جیسے میں اپنے لیے یہ جائیداد ہتھیانا چاہتا ہوں۔“

اس نے لاکھ صفائی دینے کی کوشش کی مگر جمیل کچھ سننے پہ تیار نہ ہوا اور کمرے سے نکل گیا۔ جمشید کا فون آیا تو
منزہ نے اسے بتایا۔

”میں نے تو ان کے بھلے کے لیے یہ کہا تھا۔ یہ کوئی چند ہزار کا فرنیچر یا پرانے استعمال شدہ ٹی وی اور ... کی بات
نہیں جسے اصغر اتنی آسانی سے لے جائے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا جرائم پیشہ لوگوں میں ہے اور بیوی بھی وہ جس قماش کی
ہے اس کے بعد اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ بھائی جان یا ان کی فیملی میری وجہ سے
کسی مشکل میں پڑے۔ دوسری بات یہ کہ وہ کیس اتنا آسان نہیں، جتنا وہ سمجھ رہے ہیں۔ ان کے پاس ہے کیا جو وہ
وکیلوں اور عدالتوں کے چکر میں پڑ کے پیسہ لٹائیں گے۔ آپ انہیں سمجھائیں کہ جائیداد میں حق وغیرہ کی بات
... جھنجھٹ میں پڑ کے حاصل وصول کچھ نہیں ہونے والا۔ الٹا مصیبت گلے پڑے گی۔“

جمشید بات کی تہہ تک اتر گیا اور بھائی کو سمجھانے کا وعدہ بھی کرلیا منزہ سے۔

”تمہیں منزہ نے بھرا ہے؟“ جمیل چھوٹتے ہی بولا۔

”اس نے صرف آپ کو سمجھانے کی بات کی تھی اور یہ ایسا غلط بھی نہیں۔ آپ خود سوچیں۔ چار پانچ... یا شاید
اس سے بھی زیادہ برسوں تک وکیلوں کی فیسیں اور عدالت کی پیشیاں بھگتانے کی سکت ہے آپ میں؟“

”ایک لحاظ سے تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن غلط میں بھی نہیں۔ دراصل یار... !“

جمیل کچھ دھیما پڑا اور جمشید کو احساس ہوا کہ اصل بات کوئی اور ہے۔

”میں نے سوچا تھا، منزہ کو اس کا حصہ مل جائے گا تو اسے اور اس کی بچی کو تحفظ ہی حاصل ہوگا۔ دونوں کے نام
سے کوئی پراپرٹی خرید دوں گا۔ فلیٹ لے کر وہیں سیٹل کر دوں گا۔“

”کیا؟“ جمشید حیرت سے اچھل گیا۔

”الگ فلیٹ میں؟ مگر کیوں؟ ایک اکیلی عورت، ننھی سی بچی کے ساتھ اکیلی... کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ میں نے
اس ماہ بھی منزہ اور اس کی بیٹی کے لیے جیب خرچ بھیجا ہے۔ اگلے ماہ سے خرچہ دگنا بھیج دوں گا۔ آپ کو تردد کرنے
کی ضرورت نہیں۔ آپ کے گھر میں اتنی جگہ تو ہوگی کہ وہ دونوں سر چھپا کے کہیں رہ لیں۔ باقی کا سارا خرچہ میں
اٹھالوں گا۔“

”بات دو وقت کے کھانے یا رہنے کی نہیں ہے جمشید! جیسے اکیلی عورت کا ہمارے معاشرے میں رہنا برا سمجھا
جاتا ہے، ایسے ہی ایک گھر میں کسی غیر مرد کی موجودگی میں رہنا بھی اچھا نہیں جانا جاتا۔“

”غیر مرد؟“

”بھول گئے... ؟ ایک بار ذکر تو کیا تھا کہ کلثوم کا چھوٹا بھائی آسٹریلیا سے واپس آگیا ہے اور سکھر اپنے گھر رہنے کے
بجائے یہیں ہمارے ہاں رہ رہا ہے کیونکہ وہ اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس یہاں سیٹ کر رہا ہے۔“

جمشید کو یہ بات سن کر چپ لگ گئی۔ اسے بھائی کی خود غرضی پہ جی بھر کے افسوس ہو رہا تھا اور اس سے بھی
کہیں زیادہ افسوس اپنے اتنے دور رہنے پہ۔

”ابھی تو وہ دوبارہ آسٹریلیا گیا ہوا ہے بزنس کے ہی کسی سلسلے میں مگر اگلے ہفتے واپس لوٹ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے
چند دن اور لگ جائیں مگر خاندان والے اور محلے والے باتیں کریں گے۔“

”تو آپ اپنے سالے کو ساری صورت حال بتا دیں۔ شریف کی اولاد ہے تو خود نکل جائے گا۔ مرد ذات ہے،
صاحب حیثیت ہے، کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ اس کی خاطر کیا آپ بہن کو بے گھر کریں گے؟“

”کیسی بات کر رہے ہو، وہ کیا مجھے بہن سے بڑھ کے عزیز ہوگیا۔ میں منزہ کو بے گھر نہیں کر رہا، صرف یہ چاہ رہا تھا
کہ اگر اس کا حصہ مل جاتا تو وہ کہیں سیٹ ہو جاتی لیکن ایک تو وہ مان نہیں رہی، دوسرا یہ طریقۂ کار بہت وقت طلب
نکل رہا ہے۔ عرفان کو میں جب کہوں، وہ چلا جائے گا۔ وہ کہاں عادی ہے ایسے گھروں میں رہنے کا۔“

"تو مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ اس نے بہن کی فرمائش پہ اوپر والا پورشن تعمیر کرنا شروع کیا ہے۔ میں نے سوچا ہے کاروبار سیٹ ہونے کے بعد گھر وغیرہ بنا کے شادی کر کے وہاں سیٹ ہو جائے گا۔ ہم اوپر کا پورشن کرائے پہ اٹھا دیں گے۔ اضافی دس پندرہ ہزار آجایا کریں گے۔"

"اور......؟"

"اور بچے بھی عادی ہو گئے ماموں کے دیے عیش و آرام اور آسائشات کے۔ اس ایک سال میں ہمارا آدھا خرچہ ہی اس نے اٹھا رکھا ہے۔"

جمشید کو بھائی کی سوچ سے کراہیت محسوس ہوئی۔ بہت مشکل سے اس نے خود کو کوئی سخت جملہ کہنے سے روکا۔

"میں کوشش کرتا ہوں منزہ کو اپنے پاس بلوانے کی۔"

"تب تک تو سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس نے تو کاشف کو اولیول کے بعد باہر پڑھنے کے لیے بھیجنے کا وعدہ بھی کر لیا ہے اور تم جانتے ہو' ایسی رشتے داریوں میں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات ہوتی ہے۔ ادھر وہ یہاں سے نکلا۔ ادھر بہن اور بھانجے بھانجیوں کی محبت کا خمار اترا۔ مجھے منزہ کی بھی فکر ہے۔"

جمشید نے اسپیکر آن کر رکھے تھے۔ ثنا کچھ فاصلے پہ بیٹھی ساری گفتگو سن رہی تھی اور مسلسل پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ بار بار وہ بولنے کے لیے منہ کھولتی مگر جمشید اشارے سے منع کر دیتا۔ اب کے وہ خاموش نہ رہ سکی۔

"آپ منزہ کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ کیوں نہیں دیکھتے۔ اس جانب کیوں نہیں دھیان جاتا آپ دونوں بھائیوں کا۔"

جمیل کے ساتھ ساتھ جمشید بھی بری طرح چونکا۔

"کیا؟"

"اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟ کیا وہ باقی کی ساری زندگی یونہی آپ دونوں بھائیوں کے لیے مسئلہ بنے رہے گی۔ آپ دونوں فون پہ میں کیا کروں..... میں کیا کروں کی گردان کرتے رہیں گے۔ اگر آپ دونوں ہی جی جان سے اس کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہیں' دونوں کو ہی اپنے اپنے مفادات عزیز ہیں۔ ایک نوکری چھوڑ کر بہن کے پاس نہیں آسکتا کہ اپنا مستقبل خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا' دوسرا تھوڑے سے مالی مفاد کے لیے بہن کو نظر انداز کر رہا ہے تو پھر دنیا کے سامنے اس دکھاوے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی شریف بندے سے اس کا نکاح پڑھا دیجیے۔ نکاح نے بھلا کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ یقیناً اللہ نے اس کی زندگی میں بہت سی آسانیاں اور خوشیاں لکھی ہوں گی۔ وہ اپنی نئی زندگی میں بہت مگن رہے گی۔"

اس وقت تو دونوں بھائیوں میں اس مسئلے پہ بحث ہوئی۔ بعد میں دونوں ہی متفق ہو گئے۔

جمیل نے ثنا کی تجویز کلثوم کے سامنے رکھی۔

وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"ثناء غلط نہیں کہہ رہی۔ اسلام میں بھی بیوہ کی جلد شادی کر دینے کا حکم ہے اور ابھی اس کی عمر کیا ہے ستائیس اٹھائیس سال۔ ٹھیک ہے' اللہ کا نام لے کر رشتہ ڈھونڈتے ہیں۔"

"اسے رشتہ مل جائے گا؟"

"کیوں نہیں' لاکھوں میں ایک ہے ہماری منزہ۔ سیرت کے لحاظ سے بھی اور صورت کے لحاظ سے بھی۔ سگھڑ' سلیقہ شعار' صبر والی اور محبت والی۔ جہاں جائے گی' برکت لے کر جائے گی۔"

"تو پھر..... تو پھر تم عرفان سے کیوں نہیں بات کرتیں منزہ کی؟" کلثوم کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

● ● ●

جمیل کا حوصلہ کلثوم کی چند سیکنڈ کی خاموشی سے بڑھا۔

"منزہ کا جوڑا اچھا رہے گا عرفان کے ساتھ۔"

"آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" وہ اچانک پھٹ پڑی۔

"آپ میرے بھائی کے متعلق بات کر رہے ہیں۔"

"ہاں..... اور میں اپنی بہن کی بات کر رہا ہوں۔ کیا غلط ہے اس میں؟"

"صحیح کیا ہے؟ کوئی تک بھی تو ہو۔ بھلا عرفان سے منزہ کا کیا جوڑ؟"

وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ بس نہ چل رہا تھا کہ ابھی اسی وقت جا کے منزہ کو یہاں سے غائب کر دے۔

"کیوں' تم ابھی تو خود کہہ رہی تھیں کہ منزہ لاکھوں میں ایک ہے۔ اسے رشتوں کی کیا کمی ہے؟"

جمیل نے چند منٹ پہلے کہی اس کی بات یاد دلائی۔

"ہاں کمی نہیں ہے۔ بہت رشتے مل جائیں گے۔ طلاق یافتہ' رنڈوے یا بڑی عمر کے کنواروں کے..... میرے کنوارے اور کروڑ پتی بھائی پہ آپ کی نظر کیسے گئی؟ اس کے لیے کیا ایک اٹھائیس سالہ بیوہ ہی رہ گئی ہے وہ بھی ایک چھ سالہ بچی کی ماں۔"

"اس کے علاوہ بھی اس میں کئی خوبیاں ہیں' ابھی تو تم اسے صورت اور سیرت کے لحاظ سے یکتا قرار دے رہی تھیں سگھڑ' سلیقہ شعار' صابر اور محبت کرنے والی کہہ رہی تھیں اور یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ وہ جہاں جائے گی برکت لے کر جائے گی۔"

"بکواس کر رہی تھی میں۔" کلثوم کی آواز بلند ہوئی۔

"اپنی ہمدردی کا اور خدا ترسی کا اچھا نتیجہ دیکھ لیا میں نے۔ اچھا ہوتا اگر میں دوسری بھابیوں کی طرح اس کی جھوٹی سچی شکایتیں لگا کے آپ کا دل اس کی جانب سے میلا کرتی' اس کی دوسری شادی کبھی نہ کرنے کا پکا بندوبست کرتی تاکہ وہ ساری عمر میرے گھر اور بچوں کی چاکری کرتی رہے۔ مگر میں الو کی پٹھی' ایک نمبر کی بے وقوف پرلے درجے کی احمق اس کی دلجوئی کے لیے کیا کیا نہ کیا۔"

"آپ نے سگے بھائی ہو کر وہ کچھ نہ کیا جو میں نے بھابھی بن کے کیا۔ مگر یہی میری غلطی تھی جو ہو گیا' اسے کافی سمجھیں' میں کوئی ظالم قسم کی بھابھی ہوں نہ بننا چاہتی ہوں اور اسے بھی میرے لیے ایک بے ضرر نند رہنے دیں۔ خطرہ بنا کے پیش مت کریں۔"

"کیسا خطرہ؟"

"مجھے اپنے بھائی سے زیادہ عزیز کوئی نہیں۔ ایک مثالی بھابی بننے کے شوق میں بہن ہونے کے فرض کو نہیں بھول سکتی۔ ایک بہن ہونے کے ناتے میرے بھی کوئی ارمان ہیں۔ میں اپنے خوبرو اور ویل سیٹلڈ بھائی کے نصیب منزہ جیسی لڑکی سے کیسے پھوڑ دوں؟ جب کہ بڑے بڑے امیر گھرانے اپنی اکلوتی کم عمر لڑکیوں کے لیے اس پہ آس لگائے بیٹھے ہیں۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا کلثوم کہ یہ واقعی تم ہو۔" جمیل نے تاسف سے کہا۔

"میں تمہیں کیا سمجھتا تھا مگر آج تمہاری باتیں سن کر خیال آرہا ہے کہ میں کتنا غلط تھا۔ وہ سب ایک دھوکا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا تم کبھی اس کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہ کرتیں۔ کبھی اس سے ہمدردی اور محبت نہ جتاتیں تب شاید تمہارے یہ تحقیر آمیز الفاظ مجھے اتنے برے نہ لگتے۔"

"کیا کہا ہے میں نے..... جو آپ کو اتنا برا لگ گیا۔ ذرا باہر نکل کے دیکھیں سنیں کہ لوگ منزہ کے بارے میں کیا کچھ کہتے ہیں؟"

"کیا کہتے ہیں؟"

جمیل کے اندر بھائیوں والی غیرت یکایک بیدار ہوئی۔

"یہی کہ وہ ایک منحوس لڑکی ہے۔ شادی کے بعد جس گھر میں گئی۔ چند سالوں کے اندر اندر اسے اجاڑ کے نکلی۔ پہلے شوہر، سسر اور پھر ساس۔۔۔ یہ تو میری اچھائی تھی کہ میں نے ان چہ میگوئیوں کو نہ کبھی اس تک پہنچنے دیا نہ آپ تک۔ میں کیسے آنکھیں بند کر کے اپنے بھائی کے لیے نحوست مول لوں۔"

"کلثوم تم ان لغو باتوں پہ یقین رکھتی ہو؟"

"یقین رکھتی ہوں یا نہیں۔۔۔ یہ الگ بات ہے' اس مسئلے کو جانے دیں۔ بلکہ اس بات کو یہیں ختم کر دیں تو بہتر ہو گا آپ کے اور میرے لیے بھی اور منزہ کے لیے بھی۔ کیونکہ مجھے تو کسی قیمت پہ ماننا نہیں۔ اگر آپ بار بار زور دیں گے تو اس سے صرف ہمارے درمیان تلخیاں ہی پیدا ہوں گی اور منزہ کو بھی ابھی یہیں رہنا ہے نجانے کب تک' اس سے میرے اور اس کے تعلقات بھی خراب ہوں گے۔"

"اب اور خرابی کہاں رہ گئی ہے۔" جمیل بڑبڑایا۔

"تمہاری محبت کی اصلیت کھل گئی ہے کلثوم! اور میں اب منزہ کے سلسلے میں تم پہ مزید اعتبار نہیں کر سکوں گا۔"

"کیا مطلب؟ ارے میرے سارے کیے کرائے کو پانی میں غرق کر رہے ہیں آپ؟ میں نے صرف اپنے بھائی سے اس کا رشتہ کرنے پہ اعتراض کیا ہے نا۔۔۔ کوئی دشمنی تو نہیں کر رہی اس سے۔۔۔"

"بہرحال مجھے منزہ کی شادی کرنا ہے۔"

"ضرور کیجیے' اب تو میں بھی یہی چاہوں گی۔ عرفان کانوں کا کچا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اس کے آنے کے بعد اسے ایسی پٹی پڑھائیں کہ وہ خود۔۔۔"

باقی کی بات اس نے بڑبڑاتے ہوئے مکمل کی مگر مفہوم پوری طرح جمیل کی سمجھ میں آ گیا۔

وہ بپھر گیا۔

"مجھ میں ابھی اتنی غیرت زندہ ہے' اپنی بہن کو کسی کے سامنے یوں پیش نہیں کرتا پھروں گا۔ تمہارے بارے میں ایک خوش فہمی تھی اس لیے منزہ کے لیے عرفان کی بات کر بیٹھا ورنہ۔۔۔ خیر۔۔۔ بے فکر رہو۔۔۔ منزہ کو میں جلد عزت سے رخصت کر دوں گا مگر تم کچھ عرصہ عرفان کو یہاں آنے سے روکے رکھنا۔ میں نہیں چاہتا کہ منزہ کی موجودگی میں وہ یہاں رکے۔"

"یہ کیا پابندی ہوئی؟ کیا جب تک منزہ کی شادی نہیں ہو گی میرا بھائی اپنی بہن کے گھر نہیں آ سکتا۔" وہ پیچ و تاب کھا کے رہ گئی۔

"آئے ضرور آئے۔۔۔ میں نے صرف رکنے یا رہنے سے منع کیا ہے۔"

"واہ۔۔۔ کیا شان سے منع فرمایا جا رہا ہے۔ کس منہ سے منع کروں گی میں اسے۔ لاکھوں لگا کے وہ اوپر کا پورشن بنوا رہا ہے۔ جس کے بارے میں آپ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

یہاں آ کے جمیل بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے اندر کی غرض اور تن آسانی نے اس کے قدم لڑکھڑا دیے۔ بہن کا مقدمہ لڑتے لڑتے وہ تھکن محسوس کرنے لگا۔

✡ ✡ ✡

"بھابی! گاجریں کش کر دی ہیں' دودھ ڈال کر چڑھا دوں یا آپ خود حلوہ بنائیں گی؟"

کلثوم کے دل سے ابھی تک رات والی بحث کی تلخی زائل نہیں ہوئی تھی اس لیے جب منزہ نے معمول کے انداز میں آ کر اس سے سوال کیا تو وہ اجنبی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

منزہ کو ایسا لگا جیسے کسی دھیان میں گم ہونے کی وجہ سے وہ اس کی بات سن نہیں سکی اس لیے اس نے اپنا سوال دہرایا۔

کلثوم کی پیشانی یکایک بے شمار سلوٹوں سے اٹ گئی۔

"سن لیا ہے۔۔۔ بہری نہیں ہوں۔"

"کیا ہوا۔۔۔ بھائی جان سے کوئی کھٹ پٹ ہو گئی ہے؟" اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں اتنا خوش ہونے والی بات نہیں ہے۔ یہ کھٹ پٹ تو شاید اب روز کا معمول ہو گی۔ مسکراہٹیں بچا کے رکھو۔"

"بھابھی میں تو۔۔۔" اتنے درشت لہجے اور سخت الفاظ پہ وہ دم بخود رہ گئی۔ پھر خیال آیا کہ ضرور جھگڑا سنجیدہ نوعیت کا ہو گا موڈ خراب ہو گا بھابی کا۔۔۔ اس لیے چڑچڑی ہو رہی ہیں۔ اس لیے یہ ذکر چھوڑ کے پھر سے گاجروں پہ آ گئی۔

"آپ نے کل کہا تھا کہ آپ گاجر اور بادام کے حلوے بنا کے رکھیں گی۔۔۔ کباب بھی فریز کریں گی۔ آپ کے مہمان آنے والے ہیں اس لیے میں نے کبابوں کا مسالا بھی تیار کر دیا ہے اور گاجریں بھی کش کر دی ہیں۔ صبح دودھ والے سے پانچ کلو دودھ بھی زیادہ لے لیا تھا۔ آپ فارغ ہیں تو میں کام شروع کر دوں۔ یا آپ۔۔۔"

وہ آرام سے پوچھتی ہوئی ساتھ ساتھ ان کے بیڈ کی پھیلی ہوئی چادر اور کمبل درست کرنے لگی۔

"تمہیں اتنے تردد کی کیا ضرورت تھی۔ بھائی میرا آ رہا ہے۔۔۔ پھر تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔"

"او۔۔۔" منزہ جیسے سارا معاملہ بھانپ گئی۔

لگتا ہے بھائی جان بھابی سے ان کے بھائی کی آمد کے بارے میں ہی کوئی بحث کی ہے۔ یہ بھائی جان بھی بس۔۔۔ کبھی کبھی بہت عجیب سے ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کے جذبات کی قطعی پروا نہیں کرتے۔ عورتیں تو یوں بھی اپنے میکے والوں کے لیے بے حد حساس ہوتی ہیں۔ اس لیے غصہ آ رہا ہے بھابی کو۔"

اس نے سوچا اور اپنی بھابی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ان کے قریب آئی اور مسکرا کر ان کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی ہماری بھابھی کے بھائی ہوئے تو ہمارے بھی خاص مہمان ہوئے ناں۔"

وہ آج کل جس یاسیت کے زیر اثر رہتی تھی' اس میں یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ خاصی اوپری سی لگ رہی تھی۔

"لگتا ہے بھائی کے ارادوں کی بھنک پڑ گئی ہے جب ہی ہنسی چھپائے نہیں چھپ رہی۔" اس نے تلخی سے سوچا اور اپنے شانے سے منزہ کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"اگر گاجریں کش کر دی ہیں تو حلوہ بنانے کو دل چاہے' بے شک بنا لو' نہ دل چاہے مت بنانا۔۔۔ مگر میرے بھائی کے لیے یہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں وہ نہیں آ رہا۔"

رکھائی سے بولتے بولتے کلثوم نے آخری الفاظ اس کی جانب بڑی گلہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہے جیسے اس کے نہ آنے کا ذمہ دار اسے ٹھہرانا چاہتی ہو۔

"کیوں؟"

منزہ کی عادت نہیں تھی اتنے سوال کرنے کی' مگر وہ تو اتنا چاہتی تھی کہ کلثوم اپنا دل ہلکا کر لے اور اسے یہی سوال بری طرح کھل گیا۔

"یہ جا کے تم اپنے بھائی سے پوچھو۔" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔

"میں سمجھاؤں گی بھائی جان کو۔"

"کیا۔۔۔ کیا سمجھاؤ گی؟"

"یہی کہ۔۔۔ یہی کہ وہ میرا مطلب ہے کہ۔" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"رہنے دو۔۔۔ رہنے دو۔" کلثوم نے بے زاری سے ہاتھ جوڑے۔

"یہ میرا اور میرے بھائی کا معاملہ ہے۔ ویسے میں خود بھی نہیں چاہتی کہ ابھی وہ یہاں آئے۔ کم از کم اس کے

لیے تو اچھا ہے۔ ہمارے لیے چاہے ہو نہ ہو۔۔۔۔ اکبر کا داخلہ ہو جاتا آسٹریلیا میں لیکن آئے کیسے وہ یہاں تو جال بچھے پڑے ہیں پھندے لگا رکھے ہیں۔"

وہ بڑبڑاتی رہی اور منزہ کچھ سمجھ میں نہ آنے پہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ گئی۔ پھر دروازے تک جاتے جاتے رک کر پلٹی۔

"آج دوپہر میں کیا پکے گا بھابی؟"

یہ سوال وہ روزانہ پوچھا کرتی تھی۔ دوپہر کا کھانا تیار کرنے کی ذمہ داری اس نے از خود اپنے ذمے لے رکھی تھی۔

"کھانا میں خود بناؤں گی۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی رہنے دیں۔"

"طبیعت ٹھیک ہے اور اگر خراب بھی ہو تو اپنے گھر کے کام تو کرنے ہی ہوتے ہیں' کسی کے آسرے پہ تو نہیں ڈالے جا سکتے۔"

منزہ چپ کھڑی رہ گئی اور اس چپ نے کلثوم کے اندر رات سے بھڑکتے الاؤ کو ذرا اشانت کیا۔ وہ مزید بولی۔

"ویسے بھی بچے دوپہر کو ہی ٹھیک طرح سے کھانا کھاتے ہیں اور میرے ہاتھ کے ذائقے کے عادی ہیں۔ کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں کم کم کھا رہے ہیں اس لیے کھانا میں ہی بناؤں گی۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔"

اس نے غیر محسوس طریقے سے اسے گھر کے معاملات سے الگ رہتے ہوئے اپنے کمرے تک محدود رہنے کا اشارہ دیا۔

☆ ☆ ☆

"ماما' آپ کیوں رو رہی ہیں؟" سوہا نے اپنی ننھی منی ہتھیلیوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

"کچھ نہیں بیٹا! سر میں درد ہو رہا ہے۔" منزہ نے آنکھیں رگڑتے ہوئے اس کے ہاتھ چومے۔

"لائیں' میں سر دبا دوں۔" وہ ماں کا سر دبانے لگی۔

"نہیں' میری جان!۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم نے ہوم ورک کر لیا؟"

"آپ نے کروایا ہی نہیں۔"

"چلو' پھر آؤ' پڑھتے ہیں۔" وہ اس کا بیگ کھولنے لگی۔

"ماما' آج آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟" سوہا کا دھیان پڑھتے ہوئے بھی ماں میں اٹکا تھا۔

"میرے پیٹ میں درد تھا۔۔۔ لکھواے فار۔۔۔۔"

"سر میں بھی درد۔ اور پیٹ میں بھی درد۔۔۔۔ مامی سے آپ کے لیے دوائی لاؤں۔"

"دھیان سے کیوں نہیں پڑھ رہی ہو۔ ابھی ان سب کے اسپیلنگ بھی یاد کرنے ہیں۔" وہ ڈانٹنے لگی تو وہ چپ چاپ سر جھکا کے اپنی ننھی انگلیوں میں پنسل دبا کے اے بی سی لکھنے لگی۔ منزہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔

"ماما! آج سونیا اور اکبر بھائی آپ سے پڑھنے کیوں نہیں آئے۔۔۔۔ میں پوچھ کے آؤں؟" سوہا کو ایک اور خیال آیا۔

"وہ اپنی ماما سے پڑھ رہے ہوں گے۔"

"کیوں ماما! وہ تو روز آپ سے پڑھتے ہیں۔"

"جب ہم یہاں نہیں تھے تب بھی وہ اپنی ماما سے پڑھتے تھے۔"

"اور اب پھر اپنی ماما سے پڑھیں گے؟ ہے نا؟ تو کیا ہم یہاں سے جا رہے ہیں؟"

"خاموشی سے پڑھو سوہا! مجھے تنگ مت کرو۔"

وہ چڑ کے ڈانٹنے لگی' آج صبح سے اس کا دل دکھا ہوا تھا۔ کلثوم کی باتوں سے وہ حد درجہ آزردہ تھی۔ اگرچہ ثنا کی نسبت کلثوم سے وہ بہت زیادہ قریب نہیں تھی کیونکہ شادی کے کچھ عرصے بعد جمیل بیوی اور بیٹے کو لے کر الگ ہو گیا تھا۔

ثنا سے جمشید کی شادی ہوئی تو دونوں نند بھابی میں خوب گھٹنے لگی' ثنا تھی بھی کچھ ایسے ہی دوستانہ اور پرخلوص مزاج کی۔ مزاج کلثوم کا بھی برا نہیں تھا۔ وہ بھی کبھی اس کے لیے روایتی بھابی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اور اس گھر میں لانے کے بعد بھی اس نے بہت خندہ پیشانی سے اسے قبول کیا تھا۔ پھر اس کا صبح کا رویہ یہاں آ کر اس کی سوچیں الجھنے لگتیں۔

"اگر بھابی کی بھائی جان سے کوئی لڑائی یا رنجش ہوئی ہے تو وہ اس کا غصہ مجھ پہ کیوں نکال رہی ہیں۔۔۔۔ مجھے یہ بھی لگتا اگر وہ صرف غصہ نکالتیں ڈانٹ لیتیں مگر انہوں نے مجھ سے اتنی طنزیہ باتیں کیوں کیں؟"

مجھے اس گھر میں پرایا ہونے کا احساس کیوں دلایا؟ جبکہ میں نے گھر پہ کوئی حق ملکیت نہیں جتایا۔ بلکہ ان کی ممنون و مشکور رہی ہوں کہ مجھے اس عفریت کدے سے نکال کر یہاں پناہ دی۔ پھر یہ سلوک کیوں؟

کیا بھابی بھائی جان کے تنازعے کی وجہ میں ہوں؟ مگر میں نے ایسا کیا کیا ہے؟ شاید سوہا کی وجہ ہے۔۔۔۔ مگر یہ معصوم کسی کا کیا لیتی ہے۔۔۔۔ یا پھر میری ہی وجہ ہے؟۔۔۔۔ آخر ایسا کیا ہو گیا کہ انہیں ہم دونوں کا وجود کھل رہا ہے؟"

ان سوچوں میں غلطاں وہ سارے دن کمرے تک محدود رہی۔ سوہا کو جمیل نے اسی اسکول میں داخل کرا رکھا تھا' جہاں اس کے اپنے بچے پڑھتے تھے۔

وہ ابھی نرسری کلاس میں تھی اور سب ہی بچے پیدل ہی اسکول آتے جاتے تھے کیونکہ اسکول گھر سے زیادہ فاصلے پہ نہیں تھا۔

جن دنوں کلثوم کا بھائی عرفان یہاں تھا' وہ اپنی گاڑی پہ چاروں کو لاتا لے جاتا تھا۔ آج بھی ٹھیک پونے دو بجے کال بیل مسلسل بجنا شروع ہوئی تو وہ کمرے سے نکلی تھی۔

اکبر نے نہ صرف سونیا اور سوہا کا بیگ اٹھا رکھا تھا بلکہ سوہا کو بھی گود میں اٹھا رکھا تھا۔ جبکہ سویرا نے سوہا کی واٹر بوتل اپنے کاندھے پہ لٹکا رکھی تھی۔

منزہ کو بے اختیار چودہ سالہ اکبر پہ پیار آیا تھا۔ وہ اسی طرح آدھے راستے تک اسے گود میں اٹھا کے لاتا تھا۔ شروع میں تو منزہ نے منع کیا تو کلثوم نے خود کہا تھا۔

"رہنے دو نا منزہ! سوہا پھول سی تو ہے' اس کا وزن ہی کتنا ہے بھلا۔ اکبر بہنوں کے لیے ایسا ہی حساس اور ذمہ دار بچہ ہے۔ پچھلے سال تک سونیا کو بھی گود میں اٹھا کے لاتا تھا۔ میں نے تو کہہ دیا ہے عرفان سے کہ بھیا ہمیں لیزنگ پہ گاڑی نکلوا دو بینک سے قسطیں تمہارے بہنوئی بھرتے رہیں گے ایڈوانس' گاڑی آ جائے تو میں اور تم ڈرائیونگ سیکھ لیں گے۔ کبھی تم لینے جانا' کبھی میں۔"

"مگر بھابی! بھائی جان نے وہ گاڑی کیوں بیچی؟"

"وہ بھی کوئی گاڑی تھی۔۔۔۔ کھٹارا۔۔۔۔ پھنس کے آتے تھے۔ ہم تو اب ہنڈا اکارڈ لیں گے۔۔۔۔ دیکھنا۔"

"تب تک سوہا کی ہنڈا اکارڈ میں ہوں ۔۔۔۔" اکبر اسے بازوؤں پہ جھلاتے ہوئے کہنے لگا۔

آج۔۔۔۔ آج نجانے ایسا کیا ہوا تھا کہ کلثوم نے کچن سے نکل کر اکبر کو کڑی نظروں سے گھورا۔

"اتارو اسے۔۔۔۔ پسینے پسینے ہو رہے ہو۔۔۔۔ یہ کوئی طریقہ ہے اتنی بڑی لوتھا کی لوتھا کو اتنا لمبا راستہ گود میں اٹھا کر لاتے ہو۔"

"تھک جاتی ہے نا ماما!" اکبر نے اتارتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اپنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی پھوپھو کو دیکھا۔ جس کے بارے میں شاید اس کی ماں انجان تھی۔۔۔۔ یا شاید جانتی تھی کہ وہ کھڑی سب سن رہی ہے۔

"زیادہ عادتیں خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے سویرا اور سونیا بھی تو چل کے آتی ہیں۔ سونیا اس سے ڈیڑھ دو سال ہی تو بڑی ہے۔"

سوہا کی سمجھ میں تو نہیں آیا مگر اتنا احساس ضرور ہوا کہ اس کی وجہ سے اکبر بھائی کو ڈانٹ پڑ رہی ہے۔ وہ سہم کر اس سے دور ہٹتی ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

منزہ کو اپنے بدن پہ اس کے جسم کی ہلکی سی کپکپاہٹ اور ننھے سے دل کی تیز دھڑکن بری طرح محسوس ہوئی۔ اسے اسی طرح اپنے ساتھ چپکائے اندر لے گئی۔

کچھ دیر بعد باہر سے ٹیبل پہ کھانا لگنے اور بچوں کو بلانے کی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ آج اسے اس گھر سے اتنی اجنبیت محسوس ہو رہی تھی کہ اسے اپنا آپ بن بلائے مہمان جیسا لگنے لگا اور اس کا بالکل دل نہ چاہا۔ خود یا سوہا کو کھانے کے لیے باہر بھیجے۔

"ماما.... کھانا۔"

سوہا منہ ہاتھ دھو کر یونیفارم تبدیل کرنے کے بعد اب منتظر تھی کہ وہ اسے باہر کھانے کے لیے لے کر جائے۔

"آج تمہاری پسند کا کچھ نہیں بنا۔ دودھ کے ساتھ بسکٹ لے لو۔" اس نے بہلانا چاہا۔ شاید وہ آزمانا چاہ رہی تھی کہ بھابی اسے یا سوہا کو کھانے کے لیے بلاتی ہیں یا نہیں۔

"مجھے بھوک لگی ہے ماما!" وہ رونے لگی۔

"پھپھو! ماما کہہ رہی ہیں کھانا لگ گیا ہے۔ آپ کیوں نہیں آرہیں؟" سویرا نے اندر جھانک کے کہا۔

یعنی میرے خدشات بے بنیاد تھے۔ بھابی کا موڈ کسی اور ہی وجہ سے خراب تھا....

وہ فوراً خوش امید ہوگئی اور دل سے ساری بدگمانی پل میں جھٹکتی سوہا کا ہاتھ تھام کے باہر نکلی تھی۔

کلثوم ڈائننگ ٹیبل پہ ماتھے پہ ہزار بل ڈالے بیٹھی تھی۔

"بھئی کھانے کا وقت جب یہی ہے تو خود نکل آیا کرو۔ مجھے کھاتی ہوئی بچی کو اٹھا کر بھیجنا پڑا۔"

"میں آرہی تھی بھابی! وہ سوہا کو چینج...."

"یہ لو اکبر....! تم یہ آملیٹ لے لو مجھے پتہ ہے کہ تم کدو شوق سے نہیں کھاتے لیکن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے کچھ اور نہیں بنا سکی۔" کلثوم نے اس کی بات پہ توجہ دیے بغیر بیٹے سے کہا۔

"ماما میں کدو نہیں کھاؤں گی۔"

سوہا بھی کھانے پینے میں بہت نخرے کرتی تھی۔ منزہ نے اس کی عادتیں بدلنے کی بہت کوشش کی تھی مگر ناکام رہی تھی۔

"آؤ میں آپ کو جیم لگا دیتی ہوں سلائس پہ۔"

"مجھے سینڈوچ بنا دیں کچپ کے ساتھ۔" منزہ اٹھنے لگی کہ کلثوم بڑبڑائی۔

"کسی آئے گئے کے لیے کباب بنا کے رکھنے پڑتے ہیں فریزر میں.... یونہی ایک ایک کر کے ختم ہوئے جاتے ہیں۔"

وہ بیٹھ گئی۔

"لاؤ میں خود آپ کو کھلاتی ہوں۔ آپ ایک بار کھا کر تو دیکھو، یہ بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ پتہ ہے آپ کے پاپا کو تو بہت پسند تھے۔ وہ بہت مزے لے لے کر کھاتے تھے۔"

"سچ؟.... پاپا کو کدو بہت پسند تھے؟" سوہا کے لیے باپ کا ذکر کسی خواب کی مانند تھا۔

"ہاں ان کے فیورٹ تھے اور آپ ہیں کہ کھا نہیں رہیں پاپا کو کتنا برا لگے گا۔"

"نہیں.... میں کھاؤں گی۔" اس نے منہ کھول دیا اور منزہ نے روٹی کا چھوٹا سا نوالہ بنا کے اسے کھلا دیا۔

"پھوپھو! آپ مجھ سے آدھا آملیٹ لے لیں.... سوہا کو پسند ہے۔"

اکبر نے ماں کو سراسر نظرانداز کرتے ہوئے آفر کی۔

"نہیں اکبر بھائی! مجھے تو کدو اچھا لگتا ہے.... میں تو یہی کھاؤں گی۔"

اپنے آنسو اندر اتارتے ہوئے وہ سوہا کو چھوٹے چھوٹے لقمے کھلاتی رہی۔ اس کی شکل سے صاف لگ رہا تھا وہ زہر مار کر رہی ہے۔

کلثوم نے ایک بار بھی منزہ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ خود کھانا کیوں نہیں کھا رہی اور یہ بات اسے زیادہ دکھ دے رہی تھی۔ کھانے کے بعد وہ چپ چاپ سوہا کو لے کر کمرے میں چلی آئی تھی۔ نہ کوئی بچہ اسے کھیلنے کے لیے بلانے آیا نہ کوئی اور....

اسے یقین تھا کہ شام کو سونیا اور سویرا اپنا اپنا ہوم ورک لے کر جو اندر اس کے پاس آتی ہیں، وہ بھی یقیناً "ماں کے کہنے پہ" نہیں آئیں گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

"اتنی جلدی؟.... بھابی اتنی جلدی آپ مجھ سے بیزار ہوگئیں۔ حالانکہ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ میرا وجود کسی کو ناگوار نہ گزرے پھر بھی.... مجھے امید نہیں تھی کہ آپ جیسی دردمند دل رکھنے والی اور خیال رکھنے والی بھابھی بھی میرے ساتھ ایسا دل آزار سلوک کر سکتی ہیں شاید آپ بری نہیں.... میرے نصیب ہی برے ہیں۔"

وہ سوہا کو ہوم ورک کراتے ہوئے آزردگی سے سوچتی رہی۔

"پھوپھو! جمشید چاچو کا فون ہے آپ کے لیے...."

سویرا نے یہ خبر دی تو اسے دھند کے بادل چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ جیسے کسی اپنے نے اچانک بہت اداسی کے عالم میں ہاتھ تھام لیا ہو۔

"ہیلو بھائی جان!" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"کیا ہوا منی؟" جمشید کا لہجہ ویسا ہی تھا۔ ہمیشہ کی طرح پیار اور شفقت سے بھرا۔

"کچھ نہیں.... بہت دنوں بعد آپ سے بات ہوئی نا اس لیے دل بھر آیا۔"

"میں بھی تمہارے اور سوہا کے لیے بہت اداس ہوں۔ کوشش کر رہا ہوں مگر پھر بھی آتے آتے ابھی دو تین سال اور لگیں گے۔ بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ فیملی سمیت سیٹل ہونا آسان بات نہیں ہے۔"

"آپ اپنا دل وہیں لگانے کی کوشش کیجئے۔"

"دل تو شاید لگ جاتا.... اگر تم اپنے گھربار میں مگن اور خوش ہوتیں۔"

"آپ میری وجہ سے اپنی جاب کو نقصان نہ پہنچائیں۔ پتہ نہیں یوں واپس آکر پھر ایسی ملازمت ملے یا نہ ملے۔ میں ٹھیک ہوں خوش ہوں۔"

تھوک نگلتے ہوئے اس نے کہا جو کم از کم اس وقت تو سراسر جھوٹ تھا۔

"یہ آپ دونوں کیسی باتیں لے بیٹھے ہیں۔ لائیں مجھے دیں فون۔"

پیچھے سے ثنا کی آواز آئی۔ اس کی آواز نے ہی منزہ کی طبیعت کا بوجھل پن دور کر دیا۔

"بھابی سے بات کروائیے۔"

"ہاں بھئی لو.... میں کون ہوتا ہوں دو زمانے سے نرالی نند بھابی کے درمیان میں آنے والا۔"

جمشید نے ہنستے ہوئے ریسیور ثنا کو پکڑا دیا۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی کھٹک گئی۔

"کیا ہوا تمہیں؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

"مجھے.... مجھے کیا ہونا ہے۔" پہلے اس کا دل چاہا۔ ثنا سے سب کہہ ڈالے.... جمیل بھائی جان کی بے اعتنائی.... کلثوم بھابی کی بے رخی اور بدلتے اطوار اپنی بے کسی و بے بسی....

مگر یہ سب کہنا اسے اول درجے کی کم ظرفی لگا۔ آخر اتنے دنوں سے یہی کلثوم بھابی اس کے ساتھ اتنی محبت سے پیش آرہی تھیں۔ یہی بھائی تھا جو اس گھر سے اور اس عورت کے چنگل سے چھڑا کے لایا تھا۔ اسی گھر میں سوہا کو اتنی توجہ اور محبت ملی تھی.... پھر وہ ایک دن میں سب بھلا کے گلے شکوے کرنے پہ اتر آئے۔ یہ سب سوچ کے اس نے اپنا غم اندر ہی اندر اتار لیا۔

"تمہاری آواز سے لگ رہا ہے جیسے...."

"بس ایسے ہی..... رات ٹھیک طرح سے سو نہیں پائی‘ سر میں درد ہو رہا ہے شاید اس لیے آواز بوجھل لگ رہی ہو۔"

"اچھا سنو‘ تمہیں تو پتہ ہے مجھے گھما پھرا کے بات کرنا نہیں آتی۔ ہم سب نے تمہاری شادی کے بارے میں سوچا ہے اور اس سلسلے میں....."

"کیا؟....." وہ بات کاٹ کے چلا اٹھی۔

"آپ نے یہ سوچا بھی کیسے؟"

"دھیرج سے منزہ! آرام اور تحمل سے سنو۔ یہ ہم نے تمہاری بھلائی کے لیے ہی۔"

"آپ سے یہ بات کلثوم بھابی نے کی ہو گی؟" وہ ایک بار پھر بات کاٹ کر بولی۔

"لگتا ہے جمیل بھائی جان کو ایک ہی مہینے میں میں بوجھ لگنے لگی ہوں۔ ان دونوں نے ہی آپ کے کان میں یہ بات ڈالی ہو گی اور آپ کو یہ فرض سونپا ہو گا کہ آپ مجھے تیار کریں۔"

"بالکل غلط‘ اتنا عمدہ خیال تمہارے جمیل بھائی جان اور کلثوم بھابی کو زندگی بھر نہیں آ سکتا۔ یہ نیک خیال صرف اور صرف میرے ذہن کی پیداوار ہے اور میں اس کا کریڈٹ کسی اور کو نہیں لینے دوں گی۔"

ثنا نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا اور منزہ چونکہ جانتی تھی کہ وہ مذاق نہیں کرتی اس لیے چپ کر گئی۔

"میں مانتی ہوں مظہر جیسے ساتھی کو بھلانا مشکل ہے مگر جب تم اس کے بغیر رہ سکتی ہو تو اس کی یادوں کے بغیر بھی رہ سکتی ہو۔"

"میں اللہ کی رضا میں راضی ہوں۔ اس کے آگے دم مارنے کی میری کیا مجال..... میں نے اسے قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا مگر اس کی یادوں سے مجھے جدا کرنے کا فیصلہ جس کا بھی ہے مجھے بالکل قبول نہیں۔"

"تم جذباتیت سے سوچ رہی ہو۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا۔ ابھی تمہارے پاس وقت ہے۔"

"وقت؟..... آپ مجھے سوچنے کے لیے وقت بے شک نہ دیں صرف اتنی مہلت دے دیں کہ میں اپنے اور اپنی بچی کے لیے کسی مستقل ٹھکانے کا بندوبست کر سکوں۔ ابھی مجھ میں اتنی سکت ہے کہ میں اپنی اولاد کا بوجھ اٹھا سکوں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے منزہ!" ثنا کو غصہ آ گیا۔

اس کا منزہ سے تعلق ایسا تھا کہ وہ اس سے تلخ ترش بھی بول لیتی تھی..... ڈانٹ ڈپٹ بھی کر لیتی تھی..... مگر کبھی منزہ کو برا نہیں لگتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ کبھی اس کا برا نہیں چاہ سکتی۔

"اس وقت تم حد سے زیادہ زود رنج ہو رہی ہو۔ تمہیں ہر شخص اپنا دشمن نظر آ رہا ہے حالانکہ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ مانا کہ مظہر ایک مثالی شوہر تھا مگر تم بھی ایک مثالی بیوی تھیں اور میں حلفیہ کہتی ہوں کہ اگر اس کی جگہ تم مری ہوتیں تو وہ اب تک دوسری شادی کر چکا ہوتا۔"

"ثنا!..... بس کرو۔" جمشید شاید اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے بات کرنے دیں جمشید.....! میں اسے اس خود فریبی کے اندھیرے سے باہر لانا چاہتی ہوں۔ دیکھو منزہ! ابھی تمہاری عمر کیا ہے..... صرف اٹھائیس سال اور تمہاری کوالی فیکشن کیا ہے‘ ڈگری کے لحاظ سے صرف گریجویشن اور پریکٹیکل زیرو اس دنیا میں کیسے سروائیو کرتے ہیں تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتیں اور دعوے کر رہی ہو خود اپنا اور اپنی بیٹی کا بوجھ اٹھانے کا۔"

ٹھیک ہے تم کہیں تین چار ہزار والی جاب کر کے فی الحال اپنا اور سوہا کا خرچہ اٹھا سکتی ہو۔ لیکن تم اکیلے اور خود مختار زندگی گزارنا افورڈ نہیں کر سکتیں..... مکان کا کرایہ‘ بجلی پانی کے بل اس کے علاوہ تم جاب پر جاؤ گی تو بچی سنبھالنے کا مسئلہ اور سب سے بڑا مسئلہ ایک جوان عورت کا اکیلے رہنا۔

تمہیں اندازہ تو ہو گا کہ اس سے کیا کیا پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہاں! ان چار ہزار کمائے پیسوں کے ساتھ خرچہ پورا کرتے ہوئے تم بھائی جان کے گھر رہ سکتی ہو مگر کب تک؟ کل سوہا بڑی ہو گی اس کے تعلیمی اور دوسرے اخراجات بڑھیں گے مگر تمہاری آمدنی وہیں کی وہیں رہے گی کیونکہ ایک سمپل بی اے کو اس سے زیادہ ملنے کی امید بھی نہیں رکھنی چاہیے۔

اور سب سے بڑی بات کہ یہ کوئی زندگی ہے کہ تم صبح سے شام تک کما کما کے ہلکان ہو جاؤ‘ اس کے باوجود جس چھت کے نیچے تم اتنا عرصہ گزارو گی وہ تمہاری نہیں ہو گی۔

آج کل کے بچے سگے والدین کو برداشت نہیں کر پاتے کل کو اکبر وغیرہ بڑے ہوں گے‘ شادی شدہ ہوں گے تب بھی تو تمہیں جوان بچی کو لے کر وہاں سے نکلنا ہو گا سوچو منزہ! سوچو۔"

"بس بھی کریں بھائی! میں نہیں سوچنا چاہتی۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ میں نہیں سوچنا چاہتی۔ مگر رات بھر رہ رہ کے ثنا کے الفاظ یاد آتے رہے اور اس کی تاکید بھی۔

"سوچو منزہ! سوچو اپنے لیے نہ سہی سوہا کے لیے سوچو۔"

☼ ☼ ☼

"یہ بچیوں کا کمرہ ہے پنک اور وائٹ کمبی نیشن کے ساتھ‘ انہیں یقیناً پسند آئے گا اس کے ساتھ ان کا اسٹڈی روم ہے۔" جعفر نے ایک اور دروازہ کھولا۔

"یہیں ان کا ٹیوٹر شام کو انہیں پڑھانے آیا کرے گا۔ نہ تمہیں یہ مسئلہ درپیش ہو گا کہ بچیاں کہاں بیٹھ کر سکون سے پڑھیں نہ تمہیں خود پڑھانا پڑے گا۔"

مدیحہ ایک خاموش نظر اس پہ ڈال کے اثبات میں سرہلا کے رہ گئی۔

"میں نے اسی لیے اپنا اور تمہارا بیڈ روم بچیوں کا روم اور اسٹڈی وغیرہ اوپر والے پورشن میں بنوائے ہیں تاکہ کوئی یہاں رہنے آئے بھی تو ہم اور ہماری بچیاں ڈسٹرب نہ ہوں۔ ڈرائنگ روم‘ گیسٹ رومز اور سرونٹ کوارٹر نیچے ہیں۔"

کوئی سے اس کی مراد اس کے اور مدیحہ کے گھر والے تھے۔

"یہ ہمارا بیڈ روم اس گھر کا سب سے خوب صورت گوشہ ہے یا نہیں؟"

وہ تائیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مدیحہ انکار نہ کر سکی۔ واقعی اس کمرے کا انٹیریئر دیکھنے کے لائق تھا۔

"یہ سلائیڈنگ ونڈو ہمیں سامنے کا حسین منظر دکھاتی ہے اور ہر صبح سورج بھی یہیں سے طلوع ہو کر ہمیں گڈ مارننگ کہا کرے گا۔"

وہ پردے ہٹا کے کہہ رہا تھا اور مدیحہ حیرت کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ ان گزرے سالوں میں اس نے کبھی جعفر محمود کو اپنے سامنے اتنا پُرجوش نہیں دیکھا تھا۔ وہ جس جعفر محمود سے واقف تھی وہ ایک بے زار‘ بددل اور اکتایا ہوا شخص تھا۔ اور یہ جعفر محمود جو اس کے سامنے تھا ایک زندہ دل پُرجوش اور امنگوں سے بھرپور لگ رہا تھا۔

"کیا یہ سب وہاں سے نکل آنے کا اثر ہے۔" اس نے خود سے سوال کیا پھر نفی میں جواب بھی خود ہی دے دیا۔

"وہ عمر قید کے بعد تو وہاں سے نہیں نکلے ہیں۔ ساری عمر ہی ہاسٹلز میں گزاری..... تعلیم کے لیے بیرون ملک بھی رہے پھر شادی کے فوراً بعد سے سول سروس کی وجہ سے کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر میں پوسٹنگ رہی۔ اسی اسلام آباد میں تین چار سال رہ کے گئے ہیں۔ پھر واپس آ کر اتنے ایکسائٹڈ؟ کہیں اس کی وجہ کوئی اور تو نہیں؟..... کوئی اور؟" ایک شک سرسراتا ہوا اس کے ذہن کو چھو کر گزرا۔

"تمہیں پسند آیا یہ گھر؟"

وہ مڑ کے اس سے پوچھ رہا تھا جو تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ اس شک کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی، کامیاب نہ ہو پا رہی تھی۔

"گھر؟۔۔۔ ابھی یہ گھر کہاں ہے، یہ تو مکان ہے۔" اس نے چاروں طرف سجے سجائے ہر سہولت و آرام و آسائش سے مزین در و دیوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاید تم سچ کہہ رہی ہو میں تو مکان ہی سجا سکتا ہوں۔ گھر تو اسے تمہیں بنانا ہے تم نے اور ہماری بیٹیوں نے۔" جعفر نے اس کے نزدیک آ کر شانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی تو گھر تھا جو ہم چھوڑ آئے۔" ہلکا سا گلہ اس کے لبوں پہ آ ہی گیا حالانکہ جعفر کا یہ ارادہ کبھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچتا اگر وہ اسے اپنی خواہش کا نام نہ دیتی اور بھائی اور سسر کے سامنے ڈٹ کے کھڑی نہ ہو جاتی۔

"ہر وہ جگہ جہاں سر چھپانے کو چھت مل جائے، گھر نہیں ہوتی مدیحہ! گھر وہ احساس ہے جو آپ میں ملکیت کی تسکین پیدا کرتا ہے۔ یہ میرا گھر ہے مدیحہ تمہارا گھر ہے ہمارا گھر ہماری بیٹیوں کا گھر۔"

"ملکیت کی تسکین؟۔۔۔ کیا واقعی یہاں سب کچھ میرا ہو گا؟"

"سب کچھ حتیٰ کہ یہ گھر بھی تم کہو تو میں یہ گھر تمہارے نام کر دوں؟"

"کیا اس سب کچھ میں آپ بھی شامل ہیں جعفر؟" اس کے سوال پہ وہ ثانیے بھر کو خاموش ہوا۔

"تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟"

"آپ نے کبھی ڈھنگ سے دلایا ہو تا۔"

"کیا؟"

"یقین۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"ہا۔۔۔ پہلے مجھے خود تو یقین آ جائے۔" وہ گہری سانس بھر کے انگڑائی لینے لگا۔

"ابا جی کی وجہ سے میں تو سخت یاسیت کا شکار تھا۔ مجھے لگ رہا تھا میں حویلی کی دیواروں سے اور بھائی جی کی مرضی سے کبھی نکل ہی نہیں سکوں گا مگر یہ ہوا۔۔۔ بہت جلدی ہوا اور سب تمہارے تعاون سے ممکن ہوا ہے مدیحہ! اس کے لیے میں ہمیشہ تمہارا ممنون رہوں گا۔ کبھی تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔"

"تم میرا احسان مت یاد رکھو جعفر! میری محبت اور میری وفا ضرور یاد رکھنا۔"

وہ دل ہی دل میں کہہ کے رہ گئی۔ آج اس کا یہ گلہ اور بھی بڑھ گیا تھا کہ جعفر اسے اپنی محبت اور وفاداری کا یقین دلانے کے معاملے میں ہمیشہ ٹال مٹول کر جاتا ہے۔

"مائنڈ بدلتے کبھی دیر نہیں لگتی۔" اس نے شانے اچکائے۔

"مجھے آپ کے پل پل بدلتے ذہن اور دل دونوں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔"

"میں نے ذہن کی بات کی ہے دل کی نہیں۔"

"تو کیا آپ کے دل و دماغ الگ الگ رہتے ہیں؟"

"کیا مصیبت ہے یار!" وہ جھنجلا کے اٹھ گیا۔

"ہر وقت بحث پہ کیوں تلی رہتی ہو تم۔ میں تمہیں گھر دکھانے لایا تھا کہ تمہیں اس پہ کوئی اعتراض ہو یا کمی نظر آئے تو میں شفٹ ہونے سے پہلے پہلے پوری کر لوں مگر تمہیں تو میری ہر بات پہ اعتراض ہے، کمی مجھ میں ہی نظر آتی ہے۔"

"بھڑک کیوں رہے ہیں؟"

"تو اور کیا کروں؟ تم پچھلے آدھے گھنٹے سے بھڑکانے کی ہی کوشش تو کر رہی ہو۔" اس نے غصہ کے عالم میں اپنے سن گلاسز اور چابیاں اٹھائیں۔

"چلو اب۔"

♣♣♣♣

"آؤ بوا۔۔۔ بڑی جلدی آ گئیں اس بار، تمہارا تو ریکارڈ ہے کہ جب تک پانچ چھ بار پیغام نہ بھیجو، بلاوے نہ دو تب تک آتیں ہی نہیں اس بار ایک ہی فون پہ، تعجب ہے۔"

کلثوم نے صبح سویرے حمیدی بوا کی آمد پہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ حمیدی بوا ان کی خاندانی رشتے کرانے والی خاتون تھیں۔ کلثوم کا رشتہ جمیل سے اور کلثوم کے دوسرے بہن بھائیوں کا رشتہ بھی اسی نے کروایا تھا۔ کل ہی کلثوم نے حمیدی بوا کے پڑوس میں فون کر کے اپنے ہاں آنے کا پیغام دیا تھا اور آج دن کے پونے دس بجے ہی وہ برقعے کے بٹن کھولتی ہانپتی کانپتی سامنے بیٹھی تھیں۔

"وقت وقت کی بات ہے بٹیا! ایک وقت تھا کہ حمیدن کو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، ایک وقت میں درجنوں عمدہ رشتے میری جیب میں پڑے رہتے تھے۔ اپنی لڑکیوں کے اچھے بر کے لیے باپ میری ہتھیلی پہ قرضہ اٹھا اٹھا کے بھی منہ مانگا معاوضہ رکھتے تھے اور مائیں اپنے بیٹوں کے لیے نیک بہوویں لانے کے لیے میرے آگے ناک رگڑتی تھیں۔۔۔ مگر اب۔"

انہوں نے ایک طویل سرد آہ بھری اور کلثوم کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگیں۔

"اب تو لڑکے لڑکیاں خود ہی آنکھ مٹکا کر کے اپنا اپنا بر ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ماں باپ تک کو تکلیف نہیں دیتے، پھر حمیدن کی روزی روٹی کا کہاں خیال کریں گے اور اگر کسی بدنصیب کا عشق نہ چل سکے تو اماں باوا جا بھاگتے ہیں ان کم بختی مارے شادی دفتروں میں جو ہزاروں روپیہ بٹور کے فراڈ کرتے ہیں۔ اب وہ طنطنہ کہاں تمہاری حمیدی بوا میں کہ دس بلاووں کا انتظار کرے۔ پڑوس کے چھوکرے نے تمہارے پیغام کا بتایا تو میں تو سویر ہوتے ہی گھر سے نکل گئی۔ تین بسیں بدل کے پہنچی ہوں۔ ایک تو تمہارا گھر بھی اللہ میاں کے پچھواڑے ہے، بدن کی چولیں ہل گئیں۔"

"ہمارا گھر تو شہر کے بیچوں بیچ ہے بوا! تم ہی راوی پار جا بسی ہو۔"

"ہاہا۔۔۔ اب کیا کریں، شہر کے اندر تو کٹیا کے کرائے بھی آسمان سے باتیں کر رہے ہیں وہاں کم از کم کرایہ تو کم ہے۔ ہاں بس یہ ہے کہ کہیں آنا جانا ہو تو مشکل ہوتی ہے۔"

"رکشہ کر لیتیں بوا!"

"رکشہ؟۔۔۔ توبہ۔۔۔ توبہ! ہمارے محلے سے یہاں تک کا رکشے کا کرایہ اتنا بنتا ہے جتنا میری کٹیا کا مہینے بھر کا کرایہ۔۔۔ ہاں تم کچھ دے دلا دو تو شاید واپسی پہ یہاں سے رکشہ لے کر آدھا رستہ تو سکون سے کاٹوں، پھر آخری اسٹاپ تک کی بس پکڑ لوں گی۔۔۔ اے بٹیا! چائے وائے تو پوچھ لیتیں بڑھیا کو۔" کلثوم اٹھنے لگی تو پیچھے سے آواز دی۔

"میں تو جلدی میں نہار منہ ہی اٹھ کر بھاگی۔۔۔ ناشتہ تک نہیں کیا۔"

کلثوم نے جلدی سے چائے کا پانی رکھ کے توے پر پراٹھا ڈالا۔ چائے تیار ہونے تک پراٹھا اور فرائی انڈا تیار کیا۔ رات کا سالن گرم کر کے ٹرے میں رکھا اور بوا کو پیش کرنے کے بعد وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی کہ کب وہ اصل مدعا سننے کے موڈ میں آتی ہیں۔

"میرا تو بس نہ چل رہا تھا کہ میں رات کو تمہارے فون کا سنتے ہی نکل پڑوں۔ بڑی مشکل سے دن نکلنے کا انتظار کیا۔"

بوا نے صرف ابتدائی چند لقمے ہی خاموشی سے لیے اور پیٹ میں کچھ جاتے ہی اس کی زبان پھر روانی سے چل پڑی۔

"ایسا نہیں ہے کہ حمیدی کا کام بالکل ہی چوپٹ اور ٹھنڈا پڑا ہے۔ آ جاتے ہیں کوئی نہ کوئی مگر تمہارے فون کا سن کر تو دل خوش ہو گیا۔ عرصے بعد کسی رشتے کو کرانے میں دل بھی لگے گا اور محنت بھی۔ بھئی آخر عرفان میاں جیسے نوجوان کے لیے ہم کوئی ایری غیری تو پسند کرنے سے رہے۔ ہاں بس آسمان کی حور لائیں گے تم دیکھنا۔"

"انشاء اللہ مگر بوا میں نے فی الحال آپ کو عرفان کے لیے زحمت نہیں دی۔"

"ہائیں... تو پھر؟" بوا کا لقمہ حلق میں اٹک گیا۔

"اے بی بی! اب بیاہ کرو گی اپنے بھائی کا خیر سے یہی تو عمر ہوتی ہے۔ تمہارے ماں باپ بھی نہ رہے اب اور گھر بار کا کر دو۔"

"کر دیں گے بوا! کر دیں گے وہ بھی ہو جائے گا۔ اس کی مجھے فکر نہیں۔ اسے رشتوں کی کیا کمی ہے۔ لوگ منہ سے کہہ رہے ہیں اپنی بیٹیوں کے لیے۔"

"بے غیرتوں کے یہی چلن ہوتے ہیں۔ اپنے منہ سے کہہ کر ہم غریبوں کے پیٹ پہ لات مارتے ہیں ہمارے وقتوں میں ایسا ہوتا تھا کہ لڑکی کے ماں باپ کو کوئی لڑکا اپنی بٹیا کے لیے بھا گیا مگر وہ خود اپنے منہ سے بھلا کوئی اشارہ کنایہ کریں توبہ کرو ڈوب مرنے کا مقام ہوتا تھا۔ اس بات سے ہم جیسوں کو دگنے پیسے ملتے تھے اس طرح اس لڑکے کے گھر والوں کا دھیان ہمارے ہاں لگا۔ مگر انہیں بھنک نہ پڑے کہ ہم نے خود کہا ہے۔"

"بوا... اب میری بھی سنو گی یا نہیں۔" کلثوم نے اکتا کر کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں سنوں گی... آئی کس لیے ہوں؟"

"مجھے اپنی نند کے لیے رشتہ چاہیے۔"

"نند؟... تمہاری تو ایک ہی نند تھی۔"

"تھی نہیں ہے۔"

"ہاں وہی جو بچہ... بدنصیب بیوہ ہو گئی تھی نا۔"

"ہاں بوا اور ابھی اس کی عمر کیا ہے۔ جوان ہے۔ خوب صورت ہے' مزاج کی بھی اچھی ہے' جہاں جائے گی بس جائے گی' کیا قصور ہے اس کا جو بھائیوں کے در پہ جوانی برباد کرے۔"

"یہ تو تم نے بڑی نیک بات سوچی ورنہ آج کل کی بھاوجوں کو نند پہ ایک بار خرچا کرنا کھلتا ہے کہاں کہ دوبارہ اسے رخصت کرنے کا سوچیں..."

"پھر ہے کوئی رشتہ؟" اس نے بڑی آس سے پوچھا۔

"ابھی تو ذہن میں نہیں۔ میں تو عرفان کا سوچ کر بڑے ارمانوں سے حسین اور امیر گھرانوں کی بیٹیوں کے رشتے اکٹھے کر کے لائی تھی اب جا کے نئے سرے سے دیکھتی ہوں اپنی کاپی ہاں آتے رہتے ہیں کئی دوہاجوؤں کے رشتے... دیکھتی ہوں جا کر۔"

"دوہاجو؟... بوا کوئی اچھا رشتہ نہیں ہے؟"

"دوہاجو کا رشتہ کیا برا ہے؟ تمہاری نند بیوہ ہے' رنڈوے سے شادی ہو جائے تو کیا زمانے سے الگ ہو گا؟ میں نے پچھلے سال دو سال اٹھارہ سال کی کنواریوں کے رشتے رنڈوؤں سے کرائے ہیں۔ بھئی ایک بیوی کے مرنے سے کون سے بال جھڑ جاتے ہیں مرد کے جو کنواری عورت سے شادی نہیں ہو سکتی۔ مرنے والی مر گئی۔ کوئی بھوت تو چمٹ کے نہیں بیٹھا اس مرد سے۔"

"مگر... مگر بوا! آپ منزہ کو بھی تو دیکھیں وہ اتنی کم عمر ہے' بلکہ جتنی عمر ہے اس سے کہیں کم نظر آتی۔ صورت بھی لاکھوں میں ایک ہے' پڑھی لکھی بھی ہے۔"

"ایسی بیواؤں کو کنوارے مردوں کے رشتے تب ملتے ہیں جو ان کے پلے کچھ ہو' کوئی جائیداد' مکان وغیرہ۔"

"ہاں... وہ تو نہیں ہے۔"

"ارے ہاں..." بوا کو اچانک کوئی خیال آیا۔

"اس کا تو بال بچہ بھی ہے ناں؟"

"ہاں ایک بیٹی ہے چھ برس کی۔" کلثوم نے دھیمے لہجے میں بتایا جیسے منزہ کی کوئی خامی بڑے شرمندہ انداز میں بتا رہی ہو۔

"وہ تو اپنے ددھیال میں ہی ہو گی۔" بوا نے قیاس ظاہر کیا۔

"نہیں اس کے ساتھ ہی ہے۔"

"اے لو..." بوا بدک گئیں۔

"اس کا ٹنٹا کیوں پال لیا۔"

"بیٹی ہے وہ اس کی بوا!" کلثوم کو نجانے کیوں برا محسوس ہوا۔

"ان کا بھی تو خون ہے اور بیوہ یا تو عزت سے چار دیواری میں بیٹھ کے اولاد پال پوس کر جوان کرے یا پھر عقد ثانی کرے۔ اگر تمہیں نند کا گھر دوبارہ بسانا ہے تو پہلے بچی ان کے حوالے کرو جن کی امانت ہے۔"

"اور اگر وہ امانت لینے سے انکاری ہوں تو پھر؟"

"کیوں بھلا؟... ان کے بیٹے کی اولاد ہے... مرے ہوئے بیٹے کی آخری نشانی... انہیں تو سر آنکھوں پہ بٹھانا چاہیے۔"

"اگر زندہ ہوتے تو سر آنکھوں پہ بٹھاتے... بلکہ بٹھایا بھی ہے' مظہر کو گزرے تو چار برس ہونے کو آئے اس کی ساس نے بہو اور پوتی کو کلیجے سے لگا کر پالا! مگر وہ بے چاری گزر گئی تو منزہ پہ سسرال کی دیواریں تنگ ہونے لگیں' دیور' دیورانی نے جینا دوبھر کر دیا تھا۔ وہاں تو بچی کا رہنا ناممکن ہے۔"

"اور بچی کے ہوتے ہوئے اچھا رشتہ ملنا ناممکن۔ لڑکا ہوتا تو شاید بات بن جاتی۔ مرد سوچتا ہے' چلو پلا پلایا لڑکا مل جائے گا تو کل بازو بنے گا... نہ بھی بنا تو چار جماعتیں پڑھ لیں' ذرا قد نکال لیا تو خود اپنا ٹھکانہ کر لے گا اس لیے بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ ماں کو لوگ پھر بھی قبول کر لیتے ہیں مگر بٹی والی سے نکاح پڑھواتے ہچکچاتے ہیں کہ ایک تو پرائی بچی کی ذمہ داری ہی بڑی پھر پالنا پوسنا بعد میں دے دلا کر بیاہنا الگ یہ تو مشکل کام ہے۔"

وہ زچ ہو کر بولی۔

"آسان ہوتا تو گھر بیٹھے خود نہ کر لیتی۔ تمہیں اسی کام کے تو پیسے ملیں گے کہ اس مشکل کو آسان کر کے دکھاؤ مگر خدا کا واسطہ ہے' ٹیڑھے میڑھے' اونگے بونگے رشتے نہ لانا۔ مجھے منزہ کا گھر بسانا ہے' اسے بوجھ کی طرح سر سے نہیں اتار پھینکنا۔ اچھے لوگ ہوں... لڑکا شریف اور کچھ پڑھا لکھا بھی ہو' پتہ ہے نا کہ منزہ بی اے پاس ہے۔"

"ہاں ہاں پتہ ہے اور بھی بہت کچھ پتہ ہے۔" بوا بڑبڑائیں۔

"میرے بھی آگے دو بیٹیاں ہیں' منزہ کے سلسلے میں کوئی زیادتی ہو گئی تو اللہ نہ کرے' نتیجہ مجھے بھی بھگتنا پڑ سکتا ہے اس لیے دیکھ بھال کے رشتہ لانا بوا بس سمجھنا کہ اپنی بیٹی کا گھر بسا رہی ہو۔" کلثوم نے منت کی۔

کچھ خدشات کے زیر اثر وہ منزہ کی موجودگی سے خائف ضرور ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے کچھ دنوں سے اس کا رویہ بھی نہ چاہتے ہوئے اس سے بدل گیا تھا مگر اس کے دل میں ابھی بھی اس کے لیے کوئی برے جذبات نہ تھے نہ وہ اس کا برا چاہتی تھی۔

"کرتی ہوں کوشش تم کوئی ہزار پانچ سو روپے تو دو۔"

"ہزار پانچ سو؟... رشتہ تو لاؤ بوا... پھر لیتی رہنا ہزاروں فی الحال یہ دو سو رکھ لو... اور ہاں یہ جوڑا تمہارے لیے نکال کے رکھا ہے گرم ہے اور بالکل نیا مجھے تنگ ہو گیا۔"

"چلو ابھی کے لیے اتنا کافی ہے مگر بٹیا! آئندہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہر بار تمہاری طرف سے ہاں۔" وہ برقعہ سنبھالتی اٹھیں۔

اسی وقت منزہ اپنے کمرے سے نکلی حمیدی بوا کو اس نے پہلی نظر میں پہچان لیا حالانکہ کافی عرصے بعد آمنا سامنا ہو رہا تھا۔ جمیل اور جمشید کے رشتے اسی نے کرائے تھے۔

"یہ آج یہاں کیسے؟" منزہ کھٹکی۔ بوا بھی برقع کے بٹن بند کرتے کرتے ٹھٹھک کے اسے دیکھنے لگیں۔ اس کے سلام کا جواب دیتے ہی کہا۔

"یہی ہے ناں منزہ؟... اے لو یہ تو ویسی کی ویسی ہے عمر تو چھو کے نہیں گزری نہ عمر کا اثر نہ بیوگی کے غم کا۔ ویسی کی ویسی حسین بھئی کلثوم! اب میری مشکل آسان ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اچھی صورت کا تو جیسے کال پڑ چکا ہے۔ اب تمہارے مطلوبہ معیار تک شاید پہنچ ہی جاؤں۔" انہوں نے منزہ کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور نکل گئیں۔

معاملے کی تہ تک پہنچتی منزہ کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔

کلثوم کو اس کی فق رنگت اور گم صم انداز دیکھ کے بہت تاسف ہوا۔ مگر اب یہ ناگزیر ہو چکا تھا۔

سب ہی متفق تھے کہ منزہ کی آئندہ زندگی بہتر انداز میں گزرے۔

"بھابی... یہ؟" اس نے پوچھنا چاہا۔

"ہاں... وہ حمیدی بوا۔"

کلثوم نے نظریں چرا کے خود کو مصروف کرنا چاہا۔

"میں جانتی ہوں مگر یہ جاننا چاہتی ہوں کہ یہاں کیوں آئیں؟"

"میں نے بلوایا تھا۔" کلثوم نے بغیر نظریں اٹھائے کمزور لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟" اس کی نسبت منزہ کا لہجہ پست نہیں تھا۔

"تمہارے بھائی کے کہنے پہ۔" کلثوم بھی اب کمزور نہ رہ سکی اور چلّا کے کہا۔

"میں اتنی چبھنے لگی ہوں آپ کو؟"

"ایسی بات نہیں۔" اس نے تحمل سے کام لینے کی کوشش کی۔

"ہم تمہارا بھلا چاہتے ہیں اور صرف ہم نہیں، جمشید کی بھی یہی خواہش ہے اور زندگی کی خوشیاں حاصل کرنا تمہارا بھی حق ہے۔ تم کیوں خود پہ زندگی کے دروازے بند کرتی ہو۔"

"حق؟... مجھے میری مرضی سے جینے کا حق تو دے دیں اور میری خوشی کس میں ہے یہ آپ لوگ کیا جانیں۔"

"دیکھو منزہ! زندگی بھائی بہنوں کے آسرے پہ نہیں گزرتی۔ اولاد جوان ہو رہی ہو تو بیوگی اتنی پہاڑ سی نہیں لگتی مگر تمہارے آگے ایک لمبی زندگی پڑی ہے اور بغیر مرد کے اور اپنے گھر کے اس زندگی کو گزارنا تمہارے لیے نہیں ناممکن ہے۔ تمہارے دونوں بھائی تمہارے لیے پریشان رہتے ہیں، ٹھنڈے دل سے سوچو، مثبت انداز میں... اس سے صرف تمہاری ہی نہیں ہم سب کی زندگیاں آسان ہوں گی۔" وہ دوٹوک انداز میں کہہ کر چلی گئی۔

منزہ کو لگا اس کے پاس کہنے کو اب کچھ نہیں رہا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئی۔

اسے لگا جیسے اس کے سامنے مظہر کا بے جان وجود پڑا ہو، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس وجود سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کے روئے۔

✲ ✲ ✲

"ذرا جلدی چلائیں..." پروین نے کوئی تیسری بار کہا تو سراج دین چڑ گئے۔

"اب کیا تمہارے بھائی تک پہنچنے کی جلدی میں میں گاڑی نہیں دے ماروں۔"

"اللہ نہ کرے... خیر کا کلمہ منہ سے نکالا کرو بیٹا!" شوکت جہاں بھی ساتھ ہی تھیں، دہل کے بولیں۔

"اسے سمجھائیں... مسلسل تیز ڈرائیونگ کے مشورے دے رہی ہے۔"

"آرام سے بیٹی... ٹریفک بھی تو دیکھو کس قدر ہے۔ اللہ خیر کرے گا۔" انہوں نے دوپٹے سے آنسو پونچھتی پروین کو تسلی دی۔

"چار گھنٹے ہو گئے ہیں اسے گھر سے نکلے... اماں بتا رہی تھیں، آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا ہے نہیں مل رہی۔"

"اتنی سی بچی کتنی دور جا سکتی ہے بھلا؟"

"کوئی اٹھا کے لے گیا ہو گا... ہائے میری وشمہ۔" وہ پھر رو پڑی۔

"اللہ پہ یقین رکھو وہ بہتر کرے گا۔"

"بھائی جان پہ پہلے کیا کم آزمائشیں ہیں جو یہ... ایک تو وہ پہلے ہی بیمار رہنے لگے ہیں... آئے دن کوئی نہ کوئی تکلیف..."

"اسے اپنا خیال رکھنا چاہیے۔"

"خیال رکھنے والا کون ہے؟"

"جب اور کوئی نہ ہو تب ہی تو اپنا خیال خود رکھنا پڑتا ہے۔"

"ہائے اماں جی... دروازے کے آگے پولیس کھڑی ہے اور... اور اتنا رش۔"

دور سے دیکھ کے ہی پروین کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ساس کا کاندھا تھام کے کپکپاتے لہجے میں کہنے لگی۔

"گھبرا کیوں رہی ہو، بچے لاپتہ ہو جائیں تو پولیس آتی ہی ہے، نوید نے بلوائی ہو گی۔"

اس بار سراج دین کا لہجہ بھی قدرے نرم اور دلاسا دیتا ہوا تھا۔

تینوں گاڑی سے نکلے گھر کے باہر تک شمشاد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جس کی وجہ سے پروین نے بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑ ڈالے۔

شوکت جہاں اسے بمشکل سہارا دے کر اندر تک لائیں، جہاں شمشاد صحن کے بیچوں بیچ بیٹھی سینہ پیٹ پیٹ کر بین ڈال رہی تھی۔ ان تینوں کو ہی کسی انہونی کا احساس ہوا۔ پروین تو کھڑے قدموں وہیں گر گئی۔

"ہائے میری پھول سی بچی... میری اکلوتی پوتی... اچھی بھلی کھیل رہی تھی باہر پتہ نہیں کون بدبخت اٹھا کے لے گیا۔

ہائے اسے کسی کی آئی آئے کتے کی موت مرے حرامی میرے نوید کی خوشی کسی سے ہضم نہیں ہوتی۔ اس کا پیسہ دیکھ کر رال ٹپک پڑی کسی مردار کی اٹھا کے لے گیا اس کی اکلوتی بچی دیکھو اب آتا ہو گا فون بیس تیس لاکھ لے کر ٹلیں گے حرام خور۔"

"ہاں آپ نے وشمہ کو اتنی دوپہر میں نکلنے کیسے دیا؟"

"نکل گئی مجھ سے پوچھ کے تھوڑا نکلی تھی۔ میرے کہنے میں کہاں ہے وہ۔"

"شمشاد بہن! تین سال کی بچی کیا کسی کے کہنے میں ہو گی۔ اسے اس بات کی کیا سمجھ کہ اسے کس بات سے روکا جا رہا ہے اور ٹوکا جا رہا ہے اور یہ اس کے بھلے کے لیے ہے یا نہیں۔ بچوں پہ نظر رکھنی پڑتی ہے اور وشمہ کو تو جب دیکھو باہر پھر رہی ہوتی ہے کبھی ننگے پیر کبھی بغیر گرم کپڑوں کے کتنی بار گاڑی یا رکشہ کے نیچے آتے آتے بچی ہے۔"

کسی پڑوسن نے سچ اگلنے کی جرات کی۔

"ہاں تو بچ گئی ناں... آئی تو نہیں۔" شمشاد اس پہ گویا جھپٹ پڑی۔

"ادھر دہ مل نہیں رہی ہمیں اپنی مصیبت پڑی ہے یہ فساد پھیلا رہی ہے... جا، جا اپنے گھر، تو جا کے اپنے بال بچوں پہ نظر رکھ۔"

وہ ہی نہیں، دو تین اور عورتیں بڑبڑ کرتی وہاں سے اٹھ گئیں۔

"نوید بھائی جان!" رشتے کا ایک بھائی... کم عمر سا لڑکا بھاگتا ہوا اندر آیا۔

"ایک آدمی باہر آیا ہے، اس نے بتایا ہے کہ ایک تین سال کی بچی ادھر ریلوے اسٹیشن کے پاس اس کے بھائی کو ملی ہے جو ریڑھی پہ لنڈے کے کپڑے بیچتا ہے۔ اس نے مسجد میں اعلان سنا ہے تو پتہ کرنے آیا ہے۔ وشمہ کی تصویر دیکھ کے اس نے پہچان لیا ہے۔ پولیس پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ آئیں ہم بھی ساتھ چلیں وشمہ کو لینے۔"

نوید مراد جو مایوس انداز میں سر جھکائے بیٹھا تھا‘ نئے سرے سے جی اٹھا اور تیزی سے اٹھا۔

”میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“ سراج دین بھی ہمراہ ہو لیے۔

”یا اللہ! تیرا شکر ہے‘ بچی خیریت سے مل گئی۔“ شوکت جہاں نے ہاتھ بلند کیے۔ پروین بھی سر بہ سجود ہو گئی۔

”یا اللہ! شکر ہے۔۔۔ بڑھے ویلے میں اپنا چونڈا منڈوانے سے بچ گئی۔ ورنہ ساری دنیا کی جوتیاں ہوتیں اور میرا سر۔۔۔ سب کو یہ نظر آتا ہے کہ میں اس پہ نظر نہیں رکھتی۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ میری عمر کیا ہے؟ اب میری ہڈیاں اس قابل رہ گئی ہیں کہ میں بچوں کے پیچھے بھاگتی پھروں۔“

جب تک نوید وشمہ کو لے کر آ نہیں گیا وہ ایسے ہی اپنی بھڑاس نکالتی رہی۔

”بس بھی کرو اماں! شکر کرو کہ بچی صحیح سلامت آگئی ہے ورنہ عمر بھر کا روگ لگ جاتا۔“

ہمیشہ خاموش رہنے والے نوید مراد سے بھی ماں کی بے وقت کی راگنی برداشت نہیں ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں صحیح سلامت آگئی ہے‘ اس لیے ماں کو چپ کرا رہا ہے‘ نہ آئی ہوتی تو دیکھتی۔۔۔ تجھے کون چپ کراتا۔ تب تو تو نے بھی اوروں کے ساتھ مل کے ماں کو چھتر لگانے تھے۔ وہ آج زیادہ سگی ہو گئی ہے ماں سے سب پتہ ہے مجھے تو بھی یہی سمجھتا ہے کہ میں اس کا خیال نہیں رکھتی۔“

چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق وہ خود ہی بولے جا رہی تھی۔

کسی نے اسے خاموش کرانے کی زحمت نہ کی کیونکہ سب جانتے تھے ایسی کوئی بھی کوشش ناکام ہوگی۔

شوکت جہاں نے سراج دین سے کہہ کر پروین کو وہاں رات رکنے کی اجازت دلوا دی۔

”بھائی جان اب تو سنجیدگی سے سوچ لیں کہ آپ کی دوسری شادی کتنی ضروری ہے۔ آپ اس لیے خوفزدہ تھے کہ وشمہ کے لیے نئی آنے والی ماں نجانے کیسی ثابت ہو‘ مجھے بھی یہ خطرہ تھا مگر اب سوچتی ہوں کہ اس سے برا کیا ہو گا۔

ایسا نہیں ہے کہ انہیں وشمہ سے محبت نہیں مگر اب ان کی عمر بھی تو دیکھیں۔۔۔ نانیاں دادیاں لاڈ پیار تو کر سکتی ہیں مگر نگہداشت نہیں‘ اسے سنبھالنے کے لیے کسی ذمہ دار عورت کی ضرورت ہے۔“

”پروین! میں تھک گیا ہوں۔ میں اپنی ہار تسلیم کرتا ہوں مجھ سے اکیلے یہ بچی نہیں پالی جائے گی۔ تم وہ کرو جو تم بہتر سمجھتی ہو مگر ایک بات کا خیال رکھنا۔“

”وہ کیا بھائی جان؟“

پروین نے اس کے راضی ہونے کی خوشی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”نہ تو اپنے لیے بھابی پسند کرنا نہ میرے لیے ایسی شریک حیات جو میرا ساتھ دے سکے نہ اماں کے لیے ایسی جو ان کو آرام دے سکے صرف اور صرف وشمہ کے لیے ماں تلاش کرنا۔“

”ایسا ہی ہو گا بھائی جان! انشاءاللہ۔“ پروین نے یقین دلایا اور جاتے جاتے ماں کو بھی یہ خوشخبری سنا دی۔

”میں اپنے سسرال میں نظر دوڑاتی ہوں‘ آپ بھی تلاش جاری رکھیے۔“

”رہنے دو بی بی! تم اپنی سسرال تو رہنے دو‘ ساری تمہاری ساس جیسی بقراطن ہوں گی‘ میں شہری سیدھی عورت‘ میرا نہیں گزارا ہونے والا کسی چالاکو کے ساتھ۔“

”برابر والی خالہ بتا رہی تھیں ان کی جاننے والی شاہدرہ کے پاس کہیں رہتی ہے‘ عرصے سے رشتے کرا رہی ہے اور اس کی شہرت بہت اچھی ہے۔ آپ ان سے کہیں وہ آپ کو لے جائے۔“

”ہاں دیکھوں گی۔۔۔ اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا۔ یہ تو وارے نہیں کھاتی۔۔۔ ذرا سی کڑی آفت کی پڑیا۔“

ابھی چار ہی دن گزرے تھے کہ پروین کے پاس ماں کا فون آگیا۔

”میں نے لڑکی دیکھ لی ہے‘ تو آجا پسند کر لے۔“

”دیکھ لی؟ کہاں ہے؟ میرا مطلب کہاں رہتی ہے؟ کون ہے؟“

”وہ جو آپا نہیں رکھی تھی مسٹنڈی۔۔۔ وشمہ کے واسطے۔“

”ہاں ہاں اس نے بتائی ہے لڑکی؟“

”بتائی کیا ہے؟ اس کی بہن ہے۔“

”بہن؟۔۔۔ آپا کی بہن۔۔۔“

پروین کی نظروں کے سامنے اس گنوار اطوار والی عورت کا حلیہ آگیا جسے اس کی ماں نے پوتی کی نگہداشت کے لیے منتخب کیا تھا اور جو اسے کبھی بھی پسند نہ آئی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہو اماں! کسی اچھے گھرانے میں دیکھتیں۔“

”ساجدہ بھی تو غریب گھر سے ہی لائی تھی میں‘ دیکھا نہیں تو نے کیسا اچھا ہیرا چھانٹا تھا میں نے۔۔۔ غریب گھر کی لڑکی کیسے دب کے رہتی آتے ہیں۔“

”وہ غریب گھر کی تھی مگر شریف سلجھے ہوئے خاندانی لوگ تھے۔ ساجدہ بھی واجبی سا ہی سہی‘ مگر پڑھی لکھی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ سسرال میں نباہ کے وقت غریب گھر کا ہونا کام نہیں آتا‘ صرف مزاج کا سلجھا ہونا اور صابر ہونا ہی کام آتا ہے۔“

”رہنے دے۔۔۔ رہنے دے یہ لڑکی صرف اٹھارہ سال کی ہے اور ہے بھی خوب تگڑی۔“

”اٹھارہ سال؟ خدا کا خوف کرو اماں! بھائی جان چالیس پینتالیس کے درمیان ہیں۔ اٹھارہ سال کی بچی سے کیا نباہ کریں گے۔“

”تو نہ کرے نباہ ہم کون سا اس کے نباہ کے لیے لا رہے ہیں۔ وشمہ کے لیے لا رہے ہیں۔ کچی عمر کی لڑکی ٹھیک ہے۔ وہ پال لے گی ہاں شکل کی ذرا ماٹھی ہے بے چاری۔“

”وہ تو مجھے اندازہ ہے۔ ظاہر ہے آپا سے ملتی جلتی ہو گی اس کی بہن۔“ پروین کو موٹے بھدے نقوش والی فربہ آپا یاد آئی۔

”مگر صحت اچھی ہے‘ اس ساجدہ جیسی سوکھی سڑی نہیں — جو ایک بچہ تک آرام سے جن نہ سکی اور چلی گئی۔“

”اماں! مرے ہوؤں کو تو بخش دو۔“ وہ ناگواری سے بڑبڑائی۔

”اللہ بخشے۔۔۔ میں نے کیا بخشنا ہے۔ مگر مجھے تو اس لڑکی کا تگڑا ہونا اچھا لگا ہے۔ یہ میرے نوید کے دس بیٹے آرام سے پیدا کر لے گی۔“

”اماں۔“ پروین نے بے بسی سے سر تھام لیا۔

”دس بیٹے۔۔۔ اللہ بھائی جان کو زندگی دے اور ہمیں ایسی خوشی دیکھنے کا موقع بھی مگر فی الحال ہمیں اس ایک بیٹی کو دیکھنا ہے۔ میرے خیال میں وہ اٹھارہ سالہ ان پڑھ لڑکی کسی بھی طرح وشمہ کی ایک ذمہ دار ماں بننے کے لائق نہیں ہے۔ آپ برابر والی خالہ کو کہہ دیں۔ وہ اپنی جاننے والی عورت کو لے آئے جو رشتہ کراتی ہے۔“

”اچھا۔۔۔ کہہ دوں گی۔“

☼ ☼ ☼

”مجھے آپ سے منزہ کے رشتے کے سلسلے میں بات کرنا ہے۔“ کلثوم نے جمیل سے کہا۔

”پہلے منزہ سے اس سلسلے میں بات کرنا ہو گی پھر کوئی قدم آگے بڑھانا چاہیے۔“

”میں بات کر چکی ہوں ثنا نے بھی سمجھایا ہے میرا خیال ہے اب وہ رضامند ہے اور اسے اعتراض ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اپنے بھائی بھابیوں پہ اسے اتنا اعتماد تو ہونا چاہیے کہ وہ اس کے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔“

”ہونہہ تم تو اعتماد کی بات مت کرو کلثوم! اگر منزہ جان لے کہ تم اس کے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہو تو کتنا دکھ ہو گا اسے۔“

"کیوں ہو گا؟..... میں نے کیا برا کیا ہے اس کے ساتھ؟" وہ بلبلا اٹھی..... جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"کیا میں اندھا ہوں؟ دیکھ نہیں رہا کہ پچھلے ایک دو ہفتوں میں تمہارا سلوک اس کے ساتھ کیسا بدلا ہے۔"

"اس کے ذمہ دار آپ ہیں نہ آپ وہ فضول خیال ظاہر کرتے نہ میرا دل میلا ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کے لیے دل وسیع نہیں کر سکی۔ آپ کی بہن ہونے کے ناتے وہ مجھے عزیز ہے اور میں یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ ایک بے مثال نند ہے۔ کسی کے لیے تکلیف کا باعث نہیں بن سکتی مگر جو آپ چاہتے ہیں وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ پوری نیک نیتی سے چاہتی ہوں کہ اس کا گھر بس جائے۔"

"تم عرفان کی بہن بن کے بھی سوچو تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ دیکھو تمہیں عرفان کی شادی کہیں نہ کہیں تو کرنی ہے یا وہ خود کبھی نہ کبھی کر لے گا۔ پتہ نہیں اس کی بیوی کیسی ہو؟ کس مزاج کی ہو؟ ہم سے میل جول رکھنا پسند کرے یا نہیں۔

پھر وہ ہمارے سارے پلان..... وہ اکبر کی تعلیم..... وہ میرے بزنس میں فنانس کا ارادہ..... سب دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ منزہ سے رشتہ ہونے کی صورت میں عرفان ہمارے اور قریب آ جائے گا۔ منزہ بھی تمہاری مشکور ہو جائے گی..... سب کچھ۔"

"بس کریں جمیل.....!" کلثوم نے کراہیت سے جھرجھری لی۔

"بس کریں..... مجھے گھن آ رہی ہے آپ کی باتوں سے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ خجل سا ہو کر بولا۔

"میرے دل میں ندامت کا ایک ہلکا سا احساس تھا کہ شاید میں نے منزہ کے ساتھ ٹھیک نہیں کیا آج وہ بھی دھل گیا۔ میں نے جو کہا..... جو کیا چاہے بدگمانی میں گھر کے یا چاہے کسی خطرے کے تحت..... مگر وہ خالص تو تھا۔ آپ کی طرح غرض میں ڈوبا ہوا نہیں تھا۔

عرفان سے میں جو لینا چاہتی تھی یا کروانا چاہتی تھی صرف اس لیے کہ وہ صاحب حیثیت ہے اور بہن ہونے کے ناتے میرا حق ہے کہ میں ضرورت پڑنے پہ اس کی مدد لے سکوں مگر آپ..... آپ تو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ بھی اپنی بہن کو چارہ بنا کے..... اب تو میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ کیونکہ غرض کے تحت باندھے جانے والے رشتے کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔

اور میں اسے یہاں بیٹھا بھی نہیں رہنے دوں گی ورنہ آپ بھی نہ کبھی کسی نہ کسی صورت میں دوبارہ اسے استعمال کرنا چاہیں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو وہ میری بہن ہے۔" جمیل نے کمزور انداز میں اپنا دفاع کرنا چاہا، جسے کلثوم خاطر میں نہ لائی۔

"جمشید اور ثنا کو فون کر دیتی ہوں کہ منزہ راضی ہے۔ اب ہمیں حتمی فیصلہ لینا ہے۔ ایک اچھا رشتہ ہے میری نظر میں۔"

"کس کا؟"

"حمیدی بوا نے کل ہی بتایا ہے۔ راوی روڈ کے رہائشی ہیں اچھے کھاتے پیتے خوشحال لوگ ہیں۔ مختصر خاندان ہے۔ لڑکے کی بہن شادی شدہ ہے، صرف ایک ماں ہے اور ایک بچی۔"

"بچی؟"

"ہاں، تین سال پہلے اس کی بیوی ڈلیوری کے دوران وفات پا گئی تھی۔"

● ● ● ●

"آج پھر، نہیں اماں اتنی جلدی میں دوبارہ نہیں آ سکتی۔" پروین نے شمشاد بیگم کا بلاوا سن کر فون پہ جواب دیا۔

"ابھی اس دن تو رات رہ کے گئی تھی۔ اتنی جلدی میاں صاحب نہیں مانیں گے۔"

"تیرے میاں صاحب کی تو....." شمشاد نے باقی کا فقرہ دانت پیستے ہوئے دل ہی دل میں ادا کیا کہ بیٹی شوہر کی بے ادبی کو کہیں دل پہ ہی نہ لے لے۔ انہیں اس کی یہی عادتیں تو زہر لگا کرتی تھیں۔ شوہر تو شمشاد بیگم کا بھی کبھی ہوا کرتا تھا مگر کیا مزے سے اماں اور بہنوں کے ساتھ مل کے اس پہ پھبتیاں کسی جاتی تھیں۔ ٹھٹھے لگائے جاتے تھے اور ایک یہ ہے، خود تو شوہر کے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی ہے میرے سامنے بھی داماد کو ہوا بنا کے رکھ دیا ہے۔" وہ کلس کر رہ گئی۔

"اب دیکھ نا نوید! اتنی مشکل سے مانا ہے۔ پٹھی مت کا ہے دماغ گھومتے دیر نہیں لگتی۔ کیا پتہ کل پرسوں پھر مکر جائے۔ وہ حمیدی کہہ رہی تھی آج آنے کا۔ کوئی اچھا رشتہ ہے اس کے پاس تو آ جائے گی تو بات کرے گی۔ ساتھ بھی چلی جائے گی۔"

"اماں! بات تو ٹھیک ہے مگر....." پروین تذبذب میں پڑ گئی۔

"اور پھر اس مرحلے پہ میرا جانا ایسا ضروری نہیں۔ ایسا کریں اماں! آج حمیدی بوا کے ساتھ آپ خود ہی ہو آئیں..... اگر لڑکی اچھی ہے تو پھر بات آگے بڑھانے کے لیے میں اگلے چکر میں ساتھ چلی چلوں گی۔ ہمیں زیادہ لمبی بات چلانی ہی نہیں..... لڑکی پسند آئی تو ساتھ ہی ہاتھ پہ شگن کے پیسے رکھ دیں گے اور نکاح کی تاریخ لے لیں گے۔ مگر ابھی آپ تو ہو کے آئیں..... میں پھر سہی۔"

"لے..... ایویں، تجھے پتہ تو ہے کہ تیری اس حمیدی کی ہٹر ہٹر اردو مجھے ککھ سمجھ نہیں آتی۔ ہورے کی بولی چلی جاتی ہے۔ یہ نہ ہو وہ کچھ کہے میں کچھ سمجھوں..... بات کچھ کی کچھ ہو جائے۔ بس تجھے آنا ہو گا۔"

"اماں.....!" وہ زچ ہو گئی۔ "ضروری تو نہیں کہ جو لڑکی ہم آج دیکھنے جائیں گے وہی ہماری مطلوبہ لڑکی ہو۔ نجانے کتنے گھر دیکھنا پڑیں، کتنے دن لگ جائیں۔ میں روز روز گھر بار اور بچے چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔ لڑکیاں دیکھنے تو آپ ہی جائیں۔ کوئی پسند آ جائے تو پھر بتا دینا میں آ جاؤں گی۔"

"کیوں نوید بیٹا کس کی لٹیا ڈبو رہی ہو؟"

سراج دین جو باتھ روم سے آنے کے بعد لباس تبدیل کرنے کے دوران اور اب بال بناتے ہوئے پروین کی یکطرفہ گفتگو سن رہے تھے اچانک کہہ اٹھے۔

پروین نے بوکھلا کے ماؤتھ پیس پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"جی؟ کیا مطلب؟"

"تمہیں اپنی ماں کی پسند پہ اعتبار ہے؟ جو سارا معاملہ ان کی پسند پہ ڈال رہی ہو۔ ساجدہ کی بار تکا لگا، ضروری نہیں کہ ہر بار لگ جائے۔"

"تو پھر کیا کروں؟ مجبوری ہے۔"

دبے دبے الفاظ میں پروین نے اپنا عذر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خواہش بھی بغیر الفاظ کا جامہ پہنائے بیان کر دی۔

"ٹھیک ہے چلی جاؤ..... مگر شام سے پہلے پہلے آ جانا..... اور روز روز یہ نہیں چلے گا..... کوشش کرو یہ معاملہ جلد انجام کو پہنچ جائے۔"

"میں ابھی اماں کو....." وہ بے یقین بھی تھی اور پرجوش بھی۔ فوراً شمشاد بیگم کو بتانے لگی۔

"ہیلو..... ہاں اماں..... وہ میں۔"

"لے..... میں چونگا کان سے لگائے بیٹھی ہوں، تو کیا مرد کے پیر دبانے چلی گئی تھی؟"

شمشاد بیگم نے طنزیہ ہنکارا بھر کے کہا۔

"اماں! میاں صاحب مجھے چھوڑنے آ رہے ہیں۔ بس حمیدی بوا کے آتے ہی نکل چلیں گے۔ مجھے گھر جلدی

واپس پہنچنا ہے۔"

"ایک تو تجھے ہر وقت جلدی پڑی رہتی ہے۔ سوچا تھا واپسی پہ انار کلی کا چکر لگائیں گے۔"

"پھر سہی اماں۔۔۔ وقت پہ تیار رہنا۔۔۔ اللہ حافظ۔"

فون رکھ کے وہ گھڑی باندھتے سراج دین کو مشکور انداز میں تکنے لگی۔

"بہت بہت شکریہ۔۔۔ میں بس پانچ منٹ میں تیار ہوتی ہوں۔" وہ اٹھی۔

"شکریہ تمہیں نہیں، نوید کو ادا کرنا چاہیے کیونکہ یہ مہربانی میں نے تم پہ نہیں کی۔ بس نوید بے چارے کا خیال آگیا تھا اور ہاں۔۔۔ پانچ منٹ، پانچ منٹ ہی ہونے چاہیں۔"

✵ ✵ ✵

"تیرا بیڑہ تر جائے حمیدیئے۔"
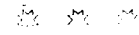
شمشاد بیگم نے حمیدی کی زبانی رشتے کا احوال جاننے کے بعد بے ساختہ دل جلے انداز میں دہائی دی۔ غنیمت تھا کہ ساتھ دو ہتڑ نہیں دے مارے۔

"میرے نویدے کے لیے رانڈ ہی رہ گئی تھی، چتے چھاٹے والی؟"

"آئے ہائے، کیسا چتا چھاٹا بہن۔۔۔ مشکل سے پچیس سال کی ہوگی بچی۔۔۔" حمیدی بوا نے تین چار سال کے ہیر پھیر کو جائز سمجھتے ہوئے کہا۔

"اور تمہارا لونڈا کون سا سچ مچ کا لونڈا ہے؟ چالیس سے اوپر ہے اور رنڈوا۔" وہ بھی کم صاف گو نہ تھیں۔

"مرد تو ساٹھا بھی پاٹھا ہوتا ہے حمیدی! اور میرا نویدا تو ہر مہینے ہزاروں کماتا ہے۔ یہ پندرہ مرلے کا دو منزلہ مکان۔۔۔ گڈی، کاروبار۔"

"اور بچی۔۔۔" حمیدی بوا نے اضافہ کیا۔

"تو جو لڑکی تو بتا رہی ہے وہ کون سی چھڑی چھانٹ ہے۔ اک چھپکلی تو اس سے بھی چمٹی ہے۔"

"اوہو اماں۔۔۔ آپ دونوں کس بحث میں پڑ گئیں۔" قریب تھا کہ وہ دونوں آستینیں پلٹنا شروع کر دیتیں پروین نے دخل دیا۔

"حمیدی بوا! کچھ اور بتائیں لڑکی کے بارے میں۔"

"اور کیا سننا ہے تو نے۔۔۔ بتا تو رہی ہے کہ پانچ چھ سال کی بچی ہے۔ تین سال بعد خصم مر گیا تھا اور اب کیا باقی ہے سننے کو۔ دفع دور۔۔۔ میں نہیں دیکھتی ایسی زنانی۔۔۔ منحوس منہ متھے والی۔"

"آئے ہائے شمشاد بہن۔۔۔! بیٹی پوتی والی ہو، یوں منہ بھر کے مت کوسو کسی کو۔ ہاں پروین بیٹی تو میں کہہ رہی تھی کہ لڑکی بہت خوب صورت ہے، کم عمری میں شادی ہوئی، کم عمری میں ہی بیوہ ہو گئی، مگر تم دیکھو تو دوشیزگی والی معصومیت اور سادگی اب تک چہرے پہ ہے۔ اور ہاں بی اے پاس بھی ہے۔"

"لو گل ای مک گئی۔" شمشاد نے ہاتھ جھاڑے۔

"بی اے پاس۔ تو شادی کم عمری میں کیسے ہوئی۔ بڈھی ہو کے شادی کی اب کدھر سے پچیس سال کی ہوئی وہ۔۔۔ توبہ حمیدی! تھوڑے جھوٹ بول۔"

"اماں! انیس سال کی لڑکی بی اے کر لیتی ہے۔ وہ کون سا بڑی بات رہی ہے۔"

"مگر اپنا نوید ا تو ایف اے پاس ہے ناں۔"

"وہ بعد کی باتیں ہیں اور ویسے بھی اس پہ اعتراض لڑکی والوں کو ہونا چاہیے ہمیں نہیں۔ اگر انہیں نہیں ہوگا تو ہم یہ اعتراض کیوں اٹھائیں۔ مجھے تو یہ بات دل کو لگ رہی ہے کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ روشن دل اور روشن خیالات کی ہوگی۔"

"پراں۔۔۔ روشن دل۔۔۔ روشن خیالات۔" شمشاد نے بیزاری سے ہاتھ ہلایا۔

"بالکل صحیح اندازہ لگایا۔" حمیدی بوا باغ باغ ہو گئیں۔

"بڑے اچھے طور طریقے ہیں اس کے ماں باپ رہے نہیں۔ دونوں بھائیوں کی لاڈلی ہے۔ بھابیاں تک اس کے گن گاتی ہیں۔"

"تو دھکا کیوں دے رہی ہیں بھابیاں۔۔۔ چوم چاٹ کے رکھ لیں اسے اور اس کی بچی کو۔"

"یہ تو ان بھلی بیبیوں کی نیک نیتی ہے جو انہوں نے نند کے لیے ایسا سوچا، ورنہ گھر کی چاکری کے لیے بھی رکھ سکتی تھیں۔ ویسے بھی بیوہ کے نکاح کا تو شرع میں بھی حکم ہے۔ ابھی اس کی عمر کیا ہے، جو وہ موت تک بیوگی کی چادر اوڑھے رکھے۔ ہاں تو پروین بیٹی میں تو کہوں۔۔۔ تم ایک بار میرے ساتھ چل کے دیکھ لو۔"

"ہاں بوا۔۔۔! اب آئی ہوں تو دیکھ لیتی ہوں۔"

✵ ✵ ✵

حمیدی بوا کے حسب توقع پروین کو منزہ خود۔۔۔ اس کا گھر بار اور بھائی بھابی سب پسند آئے تھے۔ شمشاد بیگم منہ بنا کے بیٹھی ناقدانہ نظروں سے سب کو دیکھتی رہی۔ منزہ جو خود بھی جیسے دل ہار کے وہاں سب کے درمیان بیٹھی تھی، اسے تو شمشاد بیگم نے خاص تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ سوچ کے آئی تھی کہ اس کے بیوگی پن اور بڑھتی عمر کے بارے میں ضرور کوئی نکتہ نکال کے حمیدی کو عین موقع پہ شرمندہ کرے گی مگر وہ اس میں ناکام رہی۔ منزہ کے چہرے پہ پھیلا عجیب سا سوز اور حزن اسے بے حد حسین بنا رہا تھا۔ عمر واقعی اس کی اٹھائیس کی تھی مگر دیکھنے میں وہ چوبیس پچیس کی ہی نظر آتی تھی۔

"میرا بھائی نوید مراد لاکھوں میں ایک ہے۔ شریف، محنتی اپنے کام سے کام رکھنے والا۔۔۔ مجھے بہن نہیں، بیٹی سمجھ کے پالا ہے۔ ماشاء اللہ بہت ذمہ دار ہیں بھائی جان۔ اپنی بیوی ساجدہ کو بھی انہوں نے بہت پیار سے رکھا تھا۔ اللہ نے اس کی عمر ہی اتنی رکھی تھی۔۔۔ ورنہ بہت خوش خوش گئی تھی وہ دنیا سے۔"

"ہاں۔۔۔ بڑا زیور لتا دے رکھا تھا اسے۔۔۔ حالانکہ وہ آئی چھوٹے گھر سے تھی۔" یہ شمشاد کا اضافہ تھا۔

"وہ تو دوسری شادی پہ مان ہی نہیں رہے تھے ورنہ اور مرد ہوتا تو ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری خوشی خوشی لے آتا۔ اب بھی صرف اپنی بیٹی کے لیے مانے ہیں۔ ہمیں بھی ایسی بھابی چاہیے جو بن ماں کی بچی کو سچی ممتا دے سکے۔"

"کیا عمر ہے بچی کی؟" کلثوم نے سوال کیا۔

"پونے تین سال۔"

منزہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

سوہا بھی تقریباً اسی عمر کی تھی جب مظہر کے سائے سے محروم ہوئی تھی۔

"مگر جب ماں کی ممتا سے محروم ہوئی تھی تب صرف تین گھنٹے کی تھی بے چاری۔" پروین نے اداسی سے کہا۔

"یہ کچھ عرصہ ہم نے جیسے تیسے اسے پال لیا مگر بچے ماں کے بغیر نہیں پلتے۔ اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اب۔"

"اور پرائی اولاد پالنے کا جگرا بھی کسی کسی عورت میں ہی ہوتا ہے۔" شمشاد بیگم نے مزید کہا۔

"ویسے جی۔۔۔ اللہ نے ایویں ہی ماں کے قدموں کے نیچے جنت نہیں رکھ دی۔ ماں بننا بڑا اوکھا کام ہے اور سوتیلی ماں کے لیے تو اور بھی اوکھا اور جو عورت اس اوکھے کام کو کر گزرتی ہے اس کے لیے بڑا اجر ہے، بڑا ہی ثواب ہے۔"

وہ بڑے رقت بھرے لہجے میں یہ ثواب گنوا رہی تھی۔ جب سوہا کمرے میں داخل ہوئی۔

"ماما۔۔۔! مجھے اسٹار ملا۔"

ہاتھ میں کاپی پکڑے وہ جوش سے بھاگتی ہوئی منزہ کے پاس آئی اور پھر ٹھٹھک کر سامنے بیٹھی تین اجنبی خواتین کو دیکھا۔ کچھ جھجکتے ہوئے اس نے توتلے لہجے میں انہیں سلام کیا۔

حمیدی بوا سرزنش کرتی نگاہوں سے کلثوم کو دیکھ رہی تھیں جبکہ شمشاد بیگم کی نظروں میں واضح بے زاری تھی۔

"شاباش میرا بچہ۔" منزہ نے کالی دیکھ کے اس کے ماتھے پہ پیار کیا۔

"اب آپ جاؤ...... میں ابھی آ کے ہوم ورک کراتی ہوں۔"

"او کے ماما......" وہ اسی طرح اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔

ڈرائنگ روم میں ایک عجیب طرح کا سکوت چھا گیا۔

کچھ دیر تک اس تکلیف دہ اور معنی خیز خاموشی کو محسوس کرنے کے بعد منزہ اٹھی اور ٹیبل سے چائے کے برتن اور لوازمات اکٹھے کرنے کے بعد ٹرالی میں رکھے اور وہاں سے چلی آئی۔

"چلیں پھر......؟" حمیدی بوا نے شمشاد کے تاثرات اور پروین کی خاموشی سے مایوس ہو کے کہا۔

شمشاد بیگم تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

پروین نے چلتے چلتے بے حد رسمی اور روایتی الفاظ میں کلثوم سے کہا تھا۔

"ہم بھائی جان سے بات کرنے کے بعد فون پہ بتا دیں گے آپ کو۔"

کلثوم نے بھی بجھے دل کے ساتھ مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے سرہلا دیا۔

✲ ✲ ✲
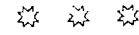
حمیدی بوا کو یہاں سے نہ ہی مثبت جواب کی امید تھی نہ کچھ معاوضہ ملنے کی' اس لیے کلثوم کے ہاں سے نکلنے کے بعد انہوں نے ان دونوں کے ساتھ جانا ضروری نہ سمجھا اور اپنے گھر جانے والی بس پکڑلی۔ منزہ کے بارے میں انہیں یہ خوش امیدی ضرور تھی کہ وہ ان لوگوں کو پسند آجائے گی مگر ساتھ ہی انہوں نے کلثوم کو یہ بھی سختی سے کہہ دیا تھا کہ۔

"ان ابتدائی مراحل میں بچی کو مہمانوں سے ذرا دور دور ہی رکھنا۔ نہ ہی یہ جتانے کی ضرورت ہے کہ بچی بعد میں اپنی ماں کے پاس رہے گی۔ منزہ کو رخصت تو ہونے دو...... ایسی پیاری صورت ہے اور ایسے اچھے گن ہیں...... جلد ہی اپنی جگہ بنا لے گی' جب اس کی جگہ بن جائے گی تو بچی کی جگہ خود بخود ہو جائے گی۔ مگر جب تک اس کے اپنے پیر جم نہیں جاتے سسرال میں تب تک بچی کو ان لوگوں کے سر پر مسلط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" کلثوم نے اس بات پہ آمادگی ظاہر کی تھی۔ ویسے بھی وہ منزہ سے خائف تھی اور وہ بھی کسی ایک وجہ سے...... ننھی سی سوہا سے بھلا کیا کہتی تھی۔ وہ راضی خوشی اسے چند ایک سال سنبھالنے پہ تیار تھی مگر برا ہو وقت کا...... عین اس لمحے جب سب صحیح سمت جا رہا تھا' سوہا کی اچانک آمد نے ماحول ہی بدل ڈالا۔ اگرچہ وہ لوگ سوہا کے متعلق سب جانتے تھے مگر شاید اس لڑکی کو ایک پانچ چھ سالہ بچے کی ماں کے روپ میں دیکھنا انہیں ہضم نہیں ہوا جسے وہ نئی دلہن بنانے کی غرض سے آئے تھے۔

"دیکھا...... کیسی شوٹ لگائی اس مکار حمیدی نے...... اسے پتا تھا کہ میرے ہاتھ آئی تو میں نے اس کی گت کا ایک بال نہیں چھوڑنا تھا۔ اچھا ہوا وہیں سے بھاگ گئی۔"

"ایسا بھی کیا کر ڈالا حمیدی بوا نے۔ بے چاری کو سو دو سو دے ہی دیتیں۔ اس عمر میں کتنی دور تک ہمیں لے بھی گئیں اور پھر بس پہ دھکے کھاتی واپس بھی گئیں۔"

"بس کے دھکے کیا دھکے ہیں...... میرے قابو آتی تو دھکے تو میں نے دینے تھے۔ میرے نوید کے لیے وہی رہ گئی ہے...... بے بے۔"

"بھائی جان اب نو عمر لڑکے نہیں ہیں۔ ویسے بھی انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میرے لیے بیوی نہیں' وشمہ کے لیے ماں ڈھونڈنا اور مجھے لگتا ہے جیسے منزہ سر سے پیر تک ماں ہے۔"

"ہاں ماں تو وہ ہے مگر اپنی لڑکی کی...... اس پٹاخے کی...... دیکھا تو نے...... کیسے آ کے چمٹ گئی ماں کو۔ وہ جان چھوڑے گی اپنی ماں کی تو ہماری وشمہ کے حصے میں ماں آئے گی۔"

ماں کی یہ بات پروین کو کچھ سوچنے پہ مجبور کر گئی۔

"اور کیا پتا...... وہ اپنی چھوکری بھی ہمارے سر لا کے بٹھا دے۔ میں ایک سے نکوں نک (عاجز) ہوں یہ دو دو ہو جائیں۔"

"یہ معاملہ تو طے کرنا پڑے گا ان لوگوں سے۔" وہ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

"مگر سچی بات یہ ہے کہ لڑکی میرے دل کو بھائی ہے۔ سلجھی ہوئی پڑھی لکھی۔ نرم زبان شائستہ بھائی جان کو بھی سنبھال لے گی اور وشمہ کو بھی۔"

"مگر اپنی چھوکری سنبھالنے سے فرصت ملے تب نا۔" شمشاد نے پھر سوہا کا وجود یاد دلایا۔

"ہاں یہ مسئلہ حل طلب ہے۔ بصورت دیگر منزہ ایک لاجواب لڑکی ہے' گھرانہ بھی اچھا ہے۔ میں بھائی جان سے بات کرتی ہوں۔"

نوید نے پروین کی آمادگی دیکھ کر نیم رضامندی کا اظہار کیا۔

"اگر تمہیں پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ مجھے تم پہ اعتبار ہے پروین۔ تم وشمہ کے لیے غلط انتخاب نہیں کر سکتیں۔"

"آپ کہیں تو میں انہیں ہاں کہلوانے سے پہلے تصویر منگوا دوں منزہ کی؟"

"میں تصویر دیکھ کے کیا کروں گا پروین۔"

ایسا کہتے ہوئے نوید کی آنکھوں کے سامنے ساجدہ کی ہنستی مسکراتی تصویر گھوم گئی۔ جو اس کی زندگی میں صرف گیارہ ماہ کے لیے شامل ہوئی تھی اور اس مختصر عرصے میں اس کے بے رنگ شب و روز میں رنگینی اور لطافت بھر گئی تھی۔

"اچھے گھر کی ہے' شریف اور محبت کرنے والی ہے تو بس ٹھیک ہے...... شکل و صورت کس کام آتی ہے پروین۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں فون کر دیتی ہوں پھر...... اور ان سے یہ بھی معاملہ صاف کر لوں گی کہ بچی وہ لوگ رکھیں گے۔"

"بچی؟"

"ہاں...... منزہ کی بچی...... جو پہلے شوہر سے ہے۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا تھا' میں نے بتایا تو تھا کہ۔"

"ہاں' میں نے سنا تھا مگر وہ لوگ کون...... وہ کیوں رکھیں گے اسے؟"

"منزہ کے اپنے میکے والے...... بچی کے ماموں ممانی...... ددھیال والوں نے رکھنی ہوتی تو جانے کیوں دیتے۔"

"مگر جب وہ بیاہ کے یہاں آ رہی ہے پروین تو بچی وہاں کیوں؟"

"یہ ضروری ہے بھائی جان! اگر اپنی بچی کی محبت اس پہ حاوی رہی تو وشمہ کے قریب نہیں ہو سکے گی' اس سے اٹیچ نہیں ہو سکے گی۔"

"اور اگر اپنی بچی کی جدائی کے خیال سے وہ یہاں کسی کے بھی قریب نہ ہو سکی تو پھر؟"

"ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے وہ اپنی بیٹی کی کمی وشمہ سے پوری کرنا چاہے۔"

"ہو سکتا ہے......؟" نوید نے ایک گہرا سانس لیا۔ "یہ ہو سکتا ہے والی باتیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں میری بہن۔ ایسی مشروط محبتیں...... اسے اگر وشمہ کو پیار دینا ہے تو وہ دے گی...... اپنی بیٹی کی کمی پوری کرنے کے لیے نہیں...... نہیں پروین! ایسا مت کرنا...... مجھے اپنی بیٹی کے لیے ماں اس شرط پہ نہیں چاہیے کہ ایک اور بچی اپنی ماں سے محروم ہو جائے...... ایسی بچی جو پہلے ہی باپ کو کھو چکی ہے۔"

نوید مراد کم بولتا تھا مگر اس کی یہ بات پروین کے دل پہ اثر کر گئی۔ اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

منزہ کب سے گم صم بیٹھی سوئی ہوئی سوہا کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ کلثوم ہلکی سی دستک کے بعد اندر

داخل ہوئی تب بھی اس کی حالت میں خاص فرق نہ آیا۔

"منی.....!" عرصے بعد اسے اس نام سے پکارنے کے بعد وہ بیڈ کے دوسرے سرے پہ بیٹھ گئی۔ لہجے کی یہ نر... اور تخاطب کا یہ انداز بھی اسے نہ چونکا سکا۔

"مجھے اچھا لگا کہ آج تم نے حمیدی بوا کے ساتھ آئی خواتین کے سامنے اپنا رویہ نارمل رکھا ورنہ مجھے تو یہ ا... بھی نہیں تھی کہ تم ان کے سامنے آؤ گی بھی یا نہیں۔ اچھا ہے کہ تم نے اس حقیقت کو قبول کرلیا۔ کچھ اور باتیں بھی ہیں جن کو تم جتنا جلد قبول کرلو اتنا اچھا ہے۔"

"اب میرے لیے اچھا ہے، ہی کیا بھابی؟" اس نے بجھے ہوئے انداز میں بغیر نظر اٹھائے کہا۔

"ایسا مت کہو۔ ہم سب تمہارے اچھے مستقبل کے لیے دعا گو ہیں۔ آنے والا کل تمہارے لیے بہت سی خوشیاں لائے گا ان شاء اللہ۔"

"اچھا مستقبل؟" وہ زہریلے انداز میں صرف سوچ کے رہ گئی۔

"اچھے مستقبل کے لیے دعا گو تو سب ہیں اچھے حال کے لیے کوئی ساتھ دینے پہ تیار نہیں۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں اب میرے سوچنے کے لیے رہا کیا ہے۔"

"اچھی سوچیں رکھا کرو۔"

اتنا کہہ کے شاید کلثوم کو خود اپنے مشورے کے کھوکھلے پن کا احساس ہوگیا۔ وہ سر جھکا کے چادر کی شکنیں دور کرنے لگی۔

"بھابی! آپ وہ کہیے جو کہنے کے لیے آئی ہیں..... اتنی لمبی تمہید کس لیے باندھ رہی ہیں؟"

وہ خشک لہجے میں بولی۔ کلثوم خجل سی ہوگئی۔

"نہیں..... میں تو بس یونہی۔"

"کہیے بھابی..... جو بھی کہنا ہے کہہ ڈالیے..... میں اس وقت ہر کسی کی، ہر قسم کی بات سن لینے کی پوزیشن میں ہوں۔"

"دیکھو منزہ! تم خوامخواہ خود پہ مظلومیت اور بے چارگی طاری کر رہی ہو۔"

اس کی مسلسل اس طرح کی باتوں نے کلثوم کو جھنجھلا کے رکھ دیا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوا جو زمانے سے الگ ہے۔ مظہر کو گئے تین سال سے اوپر ہوگئے ہیں۔ اتنے عرصے میں بڑے سے بڑا زخم مندمل ہو جاتا ہے۔ تمہیں سنبھلنے کے لیے خاصا وقت مل گیا ہے۔ اب آگے کے بارے میں سوچو۔ ہم سب نے تمہارے لیے جو فیصلہ کیا ہے وہ بہتر ہے۔ اسے یوں مجبور اور بے بس بن کے نہیں بلکہ پوری خوشی سے قبول کرو۔"

"جی اچھا۔"

خلاف توقع کچھ اور کہنے کی بجائے اس نے تابعداری سے کہا۔ یہ الگ بات کہ الفاظ کے برعکس لہجہ خاصا جھلستا ہوا تھا۔

"اس کے لیے تمہیں تھوڑا اور تعاون کرنا پڑے گا۔"

"مثلاً" "کیا؟" پھر سے وہی چبھتا ہوا لہجہ..... جسے کلثوم نے دانستہ نظرانداز کیا۔

"تمہیں اب سوہا کو..... میرا مطلب ہے اسے عادی کرنا ہوگا کہ وہ تمہارے بغیر رہنا سیکھے۔"

یکدم جیسے کسی نے منزہ کی ساری سانسیں کھینچ لی تھیں۔ وہ پوری آنکھیں پھاڑے کلثوم کو تک رہی تھی جیسے خود کو یہ یقین دلانا چاہتی ہو کہ اس کی اس بات کا جو مطلب وہ سمجھی ہے۔ کیا یہ وہی مطلب ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہار ماننے پہ دل کو تیار کیا تھا..... کچھ ثنا کے سمجھانے پہ..... کچھ کلثوم بھابی کا رویہ دیکھتے ہوئے..... کچھ سوہا کے مستقبل کو معاشی تحفظ دینے کی خاطر اور کچھ مزید مجبوریوں کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہوئے..... اپنے دل کو کچلتی ہوئی یہ چند قدم کا فاصلہ طے کرکے ڈرائنگ روم میں ان عورتوں کے سامنے آئی تھی مگر اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اس ...ہوا فیصلے کے بعد ایک اور کڑا مرحلہ اس کا منتظر ہوگا۔

"بھابی..... سو....."

...تی سانسوں کے ساتھ اس نے کہنا چاہا۔

اس کی سفید رنگت دیکھ کے کلثوم کے بھی ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ فوراً اسے پانی پلانے کی کوشش کرنے لگی۔

"آپ..... آپ..... سوہا۔"

پانی کا گلاس ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔

"میرا مطلب وہ نہیں تھا منزہ....."

کلثوم اس کی حالت دیکھ کر پچھتا رہی تھی کہ ایسی بات کی ہی کیوں۔ ایک ماں بن کے سوچا تو اسے اپنا یہ مطالبہ واقعی سفاکانہ محسوس ہوا۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے....."

"نہیں چاہیے مجھے کوئی نئی زندگی..... میں اپنی اس زندگی میں ہی خوش ہوں۔ میں اور میری سوہا۔ بس..... بس..... بھابی اور کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ نہ کوئی نئی زندگی۔ نہ نئی خوشیاں۔"

وہ کلثوم کے کاندھے پہ سر رکھ کے رونے لگی۔ اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اس کی آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔

"تم میری بات نہیں سمجھیں۔ میں تمہیں اس سے الگ نہیں کر رہی بلکہ کوئی بھی نہیں کر رہا۔ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ میرا یقین کرو، میں صرف اتنا کہہ رہی تھی کہ جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی ہے ویسے ویسے تم اسے اپنے اوپر انحصار کرنا کم کرواتی جاؤ۔ اسے دوسروں کا عادی بھی ہونے دو۔ جیسے اتنے دن ہوگئے اسے ہمارے ساتھ رہتے ہوئے مگر وہ ہمارے بجائے تمہارے ساتھ کمرے میں ہی گھسی رہتی ہے، کبھی تو سونیا اور سویرا کے ساتھ ان کے کمرے میں سو جایا کرے۔ مگر وہ بچیوں کے ساتھ کھیلتی ضرور ہے۔ لیکن ادھر تم نظروں سے اوجھل ہوتی ہو وہ گھبرا جاتی ہے اور تمہیں ڈھونڈنے لگتی ہے۔ میں تو تمہیں صرف اس کی یہ عادتیں ختم کرانے کے بارے میں کہہ رہی تھی۔ اب دیکھو ناں..... آج دن کو کیا ہوا۔ اسے اسکول سے آئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی جب وہ مہمان آئے میں نے سویرا وغیرہ کو کتنا کہا کہ وہ ذرا دیر سوہا کو اپنے پاس کمرے میں رکھیں، مگر اسے دس منٹ بھی تمہارے بغیر قرار نہیں، اندر بھاگتی چلی آئی اور مہمان۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"وہ سوہا کے بارے میں جانتے تو تھے پھر انہیں اتنی تکلیف کیوں ہوئی؟"

"وہ موقع ہی ایسا تھا منزہ..... صورتحال کی نزاکت کو بھی تو سمجھنا چاہیے۔"

"کیسا موقع بھابی؟ کیسی صورت حال؟ میں بھی تو وہاں تھی۔ میرے سامنے بھی تو دونوں ماں بیٹیاں اپنے رنڈوے بیٹے کی ویران زندگی، اس کی مرحومہ بیوی کی اچھائیاں، اور اس کی بن ماں کی بیٹی کی محرومیوں کی داستانیں سنا رہی تھیں۔ میں کیوں وہاں جم کے بیٹھی رہی۔ مجھے بھی صورت حال کا اندازہ کرکے وہاں سے احتجاجاً اٹھ جانا چاہیے تھا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ اگر وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں تو کیا میں ان کے سامنے مظہر کی تعریفیں نہیں کر سکتی؟ اس کے جانے کے بعد اپنی حالت اور اپنے دکھ بیان نہیں کر سکتی؟ میں ایسا کرتی تو ان کا ردِعمل کیا ہوتا؟ بتائیں بھابھی؟"

"ایسا نہیں ہوتا منزہ۔" کلثوم بے چارگی سے سر تھام کے رہ گئی۔

"تم کس دنیا میں رہتی ہو؟ بچی نہیں ہو ایک بچی کی ماں ہو۔ عمر میں مجھ سے چھوٹی ہو لیکن میں کہتی ہوں کہ

زندگی نے تمہیں مجھ سے زیادہ سبق پڑھائے ہیں۔ پھر ایسی احمقانہ اور بچکانہ باتیں؟ میری باتوں پہ ٹھنڈے دل سے غور کرو۔"

"ٹھنڈے دماغ سے سوچو..... ٹھنڈے دل سے فیصلہ کرو۔ آپ سب مل کے میرے دل و دماغ کو ایسے ٹھنڈا کرویں گے۔ بھابھی! اب تو سب کچھ شل ہونے لگا ہے۔"

"بہرحال..... میں صرف اتنا کہنے آئی تھی۔" کلثوم کھڑی ہوگئی۔ "کہ ہم جہاں بھی تمہاری شادی کریں گے دیکھ بھال کے، سوچ سمجھ کے پوری نیک نیتی سے کریں گے اور ظاہر ہے کہ یہ تو نہیں چھپائیں گے کہ تم شادی شدہ رہ چکی ہو اور ایک بچی کی ماں ہو۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے منزہ! کہ ہر آنے والے کو تم ایک ماں بن کے ہی ملو۔ والے اپنے لیے بہو پسند کرنے آتے ہیں۔ اپنے بھائی یا بیٹے کے لیے دلہن ڈھونڈنے۔ انہیں صرف سوہا کو لے کے مت ملو۔ آئندہ کوشش کرنا کہ مہمانوں کے سامنے سوہا یوں نہ آئے۔"

اس نے وہ بات کہہ ہی ڈالی جو وہ کہنے آئی تھی اور کہہ کے فوراً چلی بھی گئی۔ مگر دیر تک منزہ کے آنسو سوئی سوہا کے بال بھگوتے رہے۔

✵ ✵ ✵

"بیگم صاحبہ، کوئی مس جی آپ سے ملنے آئی ہیں۔" مدیحہ ڈرائیر سے اپنے بال خشک کر رہی تھی جب نصیبو نے اسے کسی کی آمد کی اطلاع دی۔

"مس جی! کون سی مس؟"

وہ حیران ہوئی۔ یہاں آئے اسے مہینہ ہو رہا تھا۔ مگر اب تک کسی سے اتنی راہ و رسم نہیں ہوئی تھی کہ کوئی بلا تکلف بھری دوپہر میں ملنے چلا آئے۔ یہ اسلام آباد کا سب سے پوش علاقہ تھا اور کئی کئی کنال پہ پھیلے بنگلوں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے اتنے ہی انجان اور بے گانے تھے جتنے کہ کسی ایک شہر کے رہنے والے دوسرے شہر کے باسیوں سے ہوسکتے ہیں۔

"پتہ نہیں بیگم صاحبہ! نام بتایا تھا پر..... ذرا مشکل سا تھا۔ صرف مس یاد رہا ہے۔"

"دیکھنے میں کیسی ہے؟ کار میں آئی ہے؟" کچھ سوچتے ہوئے مدیحہ نے سوال کیا۔

"نہیں، تھی تو پیدل..... کوئی ٹیکسی وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اور دیکھنے میں اچھی ہے۔ بیگم صاحبہ! فیشن ایبل، بال کٹے ہوئے، عمر کوئی بیس بائیس سال۔ ہاتھ میں کوئی کاپی کتاب بھی ہے۔"

"اوہو..... کوئی سیلز گرل ہوگی۔ جاؤ چلتا کرو اسے۔ فضول میں دماغ کھائے گی بک بک کر کے۔ بے کار کریموں اور شیمپو کے لیے۔"

بال خشک کرنے کے بعد اب وہ انہیں ہیئر برش سے سلجھا رہی تھی۔

"لیکن بیگم صاحبہ! وہ آپ کا نام لے رہی تھی۔"

نصیبو نے اس کے لانبے، گھنے، ریشمی بالوں کو رشک و حسد کی ملی جلی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام؟" وہ پھر چونکی تھی۔

"ہاں جی کہہ رہی تھی۔ مسز محمود سے ملنا ہے۔ ضروری کام ہے۔"

"احمق..... میرا نام کب لیا اس نے؟ باہر گیٹ پہ نیم پلیٹ پر تمہارے صاحب کا اتنا بڑا بڑا نام لکھا ہے، اسے پڑھ کے مسز محمود کہہ رہی ہوگی۔ تمہیں بھی ذرا عقل نہیں ہے۔ ذرا سختی سے کہہ کر فارغ کرو اسے۔"

نصیبو کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر بڑبڑاتے ہوئے ہاتھوں اور بازوؤں پہ ہنی لوشن ملتی رہی۔

"ایسی کند ذہن ہے یہ نصیبو بھی....." حالانکہ نصیبو سراسر اس کا اپنا انتخاب تھی۔ اماں جی تو انہیں اسلام آباد بھیجتے ہوئے وہاں کے آدھ درجن ملازم ساتھ روانہ کرنے کو تیار تھیں لیکن جعفر کو ان تیل چپڑی عورتوں کا ان کے جاہلانہ لب و لہجے سے چڑ تھی۔ اس نے صاف انکار کردیا۔

"اس ماحول سے ہی تو دور لے جانا چاہتا ہوں اپنی بچیوں کو۔ مجھے اپنے گھر میں کوئی جاہل پینڈو نہیں چاہیے

چاہے وہ ملازم یا گیٹ کیپر ہی کیوں نہ ہو۔"

اس کا پرسنل ڈرائیور، گیٹ کیپر اور مالی تین مرد ملازم اس نے خود رکھے تھے۔ مگر نصیبو اور دوسری دو جز وقتی ملازمائیں مدیحہ کی پسند تھیں۔ جعفر نے اپنے ایک دوست سے کہہ کر دو تین میڈ بلوائی تھیں گھر پہ، مگر مدیحہ انہیں دیکھتے ہی بدک گئی۔ پچیس چھبیس سال کی وہ طرحدار، خوش لباس لڑکیاں کہیں سے بھی ملازمائیں نہیں لگ رہی تھیں۔

"یہاں سرونٹ رکھنے کا بھی ایک اسٹینڈرڈ ہوتا ہے۔ یہ ہاؤس کیپر ہیں۔ تمام کام اپنی نگرانی میں احسن طریقے سے کروائیں گی۔ بہت ٹرینڈ ہیں۔"

"وہ تو لگ ہی رہا ہے۔" اس نے تنقیدی نظروں سے ان کے فٹنگ والے لباس، کھلے بالوں اور میک اپ کو دیکھ کر کہا۔

"مجھے ان میں سے کوئی نہیں چاہیے۔ آپ اخبار میں اشتہار دے دیں۔ میں خود انٹرویو کر کے پسند کرلوں گی۔"

اور پھر اٹھارہ عورتوں میں سے اس نے نصیبو کو بطور فل ٹائم میڈ کے پسند کیا تھا۔ چالیس بیالیس سالہ نصیبو کے چہرے پہ چیچک کے پرانے داغ تھے۔ ایک آنکھ میں ہلکا سا نقص تھا۔ جسم بھدا اور بے ڈول تھا مگر تھی بے حد چست اور چاق و چوبند۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی تھی۔ بات کرنے کا سلیقہ تھا۔ مدیحہ کو اس کا بن سنور کے رہنا اور صاف ستھرا جدید انداز کا سلا لباس پہننا بھی برا نہیں لگتا تھا کیونکہ ان سب کوششوں سے اس بے چاری کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"بیگم صاحبہ! وہ مس کہہ رہی ہے کہ اسے صاحب جی نے بلوایا ہے۔" نصیبو پھر آن موجود ہوئی۔

"کیا؟"

مدیحہ اس بری طرح چونکی کہ اس کا لپ اسٹک لگاتا ہاتھ کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔

"بلاؤ ذرا..... دیکھوں تو....." لہجے میں بے حد تپش تھی۔

نصیبو اپنی مسکراہٹ چھپاتی پلٹی۔ ان چند دنوں میں ہی اسے اپنی بیگم صاحبہ کے اندر چھپے شکوک و شبہات کا بڑی اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا۔ اس کی وجہ سے تو وہ لاعلم تھی۔ مگر اتنا ضرور جان لیا تھا کہ بیگم صاحبہ شکی مزاج ہے اور نزدیک سے گزرتی ہوا سے بھی گھبرا کر اپنے میاں پہ آڑ کردیتی ہے۔

مدیحہ سٹنگ روم میں آئی تو صوفے پہ ایک خوش شکل اور خوش لباس لڑکی کو اپنا منتظر پایا۔

"جعفر سے کس لیے ملنے آئی ہے یہ؟ اور جعفر کی ہمت دیکھو۔ گھر پہ بلوالیا۔ نہیں، وہ کچا چور ہے اتنا دیدہ دلیر نہیں ہوسکتا کہ میری موجودگی میں گھر بلوالے۔ یہ ویسا ہی چکر لگ رہا ہے جیسا وہ لاہور والے گھر میں کھیلا گیا تھا۔"

یہ سوچتے ہوئے اسے لاہور والے گھر کے کچن میں ریتا سے ہوئی اتفاقیہ ملاقات یاد آگئی۔

"یہ بھی شاید اسے بلیک میل کرنے کی نیت سے یہاں چلی آئی ہے..... اف جعفر محمود..... تم کب تک میرے صبر کا امتحان لوگے۔ شرم کرو..... بچیاں پالوں یا بچیوں کے باپ کی آوارگیاں سنبھالوں۔"

ماتھے پہ ان گنت شکنیں لیے وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ لڑکی کے چہرے پہ پھیلی رسمی سی مسکراہٹ پھیکی پڑنے لگی۔

"کون ہو تم؟..... کیوں آئی ہو؟"

پھیکی ہوتی مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی۔ شاید آنے والی کو اتنے روکھے اور سخت رویے کی امید نہیں تھی۔ مدیحہ کی لاتعداد شکنوں کے مقابلے میں اس کی پیشانی پہ بھی ایک آدھ شکن نمودار ہوگئی۔

"میں خود نہیں آئی، مجھے کہا گیا تھا آنے کے لیے۔" اس نے جتایا کہ وہ بن بلائے منہ اٹھا کے یہاں نہیں آئی۔

"کس نے؟"

"مسٹر جعفر محمود نے..... ایکچوئیلی میں مسٹر رحمان۔"

سٹنگ روم میں رکھے فون کی بیل نے اسے بات ادھوری چھوڑنے پہ مجبور کیا۔ مدیحہ اسی خطرناک تیور کے ساتھ اب مسلسل بجتے فون کو گھور رہی تھی۔

"ہیلو۔۔۔" پھر پھاڑ کھانے والے انداز میں اس نے کہا تھا۔

"جعفر بات کر رہا ہوں۔"

مدیحہ نے ناگوار نظروں سے پہلے ریسیور کو' پھر صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو اس سے مایوس اب بیزار نظر آ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟۔۔۔ خاموش کیوں ہو؟ بزی ہو کیا؟؟"

"ہاں بہت بزی ہوں۔ آپ کی گھر بلائی مصیبتوں سے نمٹ رہی ہوں۔ بچیوں کے اسکول سے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ ان کے آنے سے پہلے پہلے مجھے یہ معاملہ صاف کرنا ہے۔ اس لیے آپ تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کے لیے کچھ دیر بعد فون کریں۔"

"کیا کہہ۔۔۔" مگر مدیحہ نے اس کی بات پوری سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

"ہاں تو بی بی۔۔۔"

"مس سنتھیا رابنسن۔" اس نے اپنا تعارف خود کرایا۔ خاصے کڑے تیوروں کے ساتھ۔

"اوہ۔۔۔ اب یہاں تک پہنچ ہو گئی ہے۔"

"جی؟" اس کی بڑبڑاہٹ سنتھیا کے پلے نہ پڑی۔

"میڈم آپ پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے تو جعفر صاحب نے کہا تھا کہ میں یہاں آؤں اور آپ سے مل لوں۔ بچیوں سے بات کر لوں۔ اسی لیے میں اسکول سے سیدھی یہیں چلی آئی۔ مگر آپ ہیں کہ مسلسل بولے چلے جا رہی ہیں۔ سوری مگر میں ایسے روڈلی بی ہیو کرنے والے لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔"

اس نے اپنا شولڈر بیگ کاندھے پہ لٹکایا اور ٹیبل پہ رکھی فائل اٹھالی۔

"نائس ٹو میٹ یو مسز محمود۔" چبا چبا کے کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

"اوہو۔۔۔ اتنا طنطنہ۔" مدیحہ کھول کے رہ گئی۔

اتنے میں فون کی بیل پھر بجی۔

"فون کیوں رکھ دیا تھا تم نے؟" جعفر نے پوچھا۔

"ایک مہمان سے بات کر رہی تھی۔"

"کون مہمان اور کون سا معاملہ نمٹا رہی تھی تم؟ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتی ہو؟؟"

"آپ نے کسی سنتھیا رابنسن کو یہاں بلوایا تھا؟؟"

"ارے ہاں۔۔۔ آئی تھیں مس سنتھیا؟"

"ہاں' آئی تھی آپ سے ملنے۔"

"مجھ سے؟ او خدایا۔۔۔ احمق عورت۔۔۔ وہ مجھ سے ملنے آئی ہوتی تو آفس آتی میں اسے گھر نہ بلواتا۔"

"ہاں۔۔۔ میں سوچ رہی تھی' اتنی عقل تو ہے آپ میں۔ آپ آفس میں ہی نمٹاتے ہوں گے ایسی ملاقاتیں۔"

"مدیحہ تم۔۔۔" جعفر بل کھا کے رہ گیا۔

"وہ سنتھیا رابنسن تھی۔"

"اتنا تو جانتی ہوں میں۔ آگے بتائیے۔" وہ جعفر محمود کا صبر آزما رہی تھی۔

"رحمان کے بچوں کی ٹیوٹر ہے وہ۔"

"آپ کسی قسم کی ٹیوشن لینا چاہتے ہیں اس سے؟"

"اسٹاپ اٹ مدیحہ! اب میں کسی قسم کی بکواس نہیں سنوں گا۔ میں اسے جانتا تک نہیں۔ ایک بار بھی نہیں دیکھا اور تم ہو کہ فضول اندازے لگا رہی ہو۔ میری غلطی صرف یہ ہے کہ میں نے ایک باپ کی حیثیت سے اپنی بیٹیوں کے لیے کوئی فیصلہ کرنا چاہا تھا۔ رحمان کے بچے بھی اسی اسکول میں پڑھتے ہیں اور پوزیشن ہولڈر ہیں۔ میں نے اپنی بیٹیوں کو اسی کے کہنے پہ اس اسکول میں داخل کرایا تھا اور اب اسی کے کہنے پہ مس سنتھیا کو بلوایا تھا کیونکہ ایسے اسکولز میں ایک ٹرینڈ اور کوالی فائیڈ ٹیوٹر کی مدد کے بغیر ایوریج قسم کے بچوں کا چلنا ناممکن ہے اور ماشاء اللہ سے تینوں بچیاں عقل کے معاملے میں تم پہ ہی گئی ہیں۔" فون کھٹاک سے بند ہو چکا تھا۔

مدیحہ نے کچھ شرمندگی محسوس کی۔

"مجھے فوراً" اس نتیجے پہ نہیں پہنچنا چاہیے تھا۔ اب کئی دن تک جعفر کا موڈ خراب رہے گا۔"

پھر اس شرمندگی پہ جعفر کی پچھلی بے وفائیوں کی تلخ یادیں غالب آ گئیں۔

"اچھا کیا میں نے۔ پہلے غافل رہتی تھی اسی لیے مار کھاتی رہی۔ جعفر میری اس بے خبری کا فائدہ اٹھا کے کھل کھیلتا رہا۔ یہاں میں اکیلی ہوں۔۔۔ نہ سسرال والے۔۔۔ نہ میکے والے۔۔۔ مجھے اپنے گھر اور شوہر کی حفاظت خود کرنی ہے' اسی طرح آنکھیں کھلی رکھنی ہیں ورنہ۔۔۔ اور یہ ٹیوٹر وغیرہ کا تو صرف بہانہ ہے۔ اتنا خیال ہے بچیوں کی تعلیم کا تو کوئی مرد ٹیوٹر بھی تو رکھا جا سکتا ہے مگر یہ تیز چھری۔۔۔ اسے تو میں کبھی گھر میں گھسنے نہ دوں۔ جعفر نے مجھے کیا ایسا ہی بدھو سمجھ رکھا ہے۔" وہ سوچ رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

کلثوم ٹیبل پہ کھانا لگا رہی تھی۔

سویرا کو دوبارہ منزہ کو بلانے کے لیے بھیجا تھا مگر وہ سر درد کا کہہ کے کھانے کے لیے نہیں آئی۔

"کوئی بات تو نہیں ہوئی تم دونوں کے درمیان؟" جمیل نے ٹوہ لینے کی کوشش کی جس پہ کلثوم چڑ گئی۔

"مجھے اور کوئی کام نہیں ہے کیا؟ سارا دن گھر کے کاموں سے سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی ہے اوپر سے آج ماں کی طبیعت پوچھنے بھی جانا پڑا ایسے میں میرا اتنا دماغ کہاں جو میں ضدی قسم کے لوگوں سے کھپتی رہوں۔"

"یعنی کچھ ہوا تو ہے۔" جمیل نے سر ہلایا۔

"وہ جو کل کچھ لوگ آئے تھے رشتے کے لیے۔۔۔ کیا ان کی وجہ سے؟"

"ہو سکتا ہے۔" کلثوم نے کندھے اچکائے اور پلیٹ میں سالن نکالنے لگی۔

"سویرا! یہ ٹرے اندر اپنی پھوپھو کو دے آؤ اور چائے کا پوچھ لینا۔ اگر سر میں زیادہ درد ہے تو کہنا ٹیبلٹ لے لے مگر خالی پیٹ نہیں۔ تھوڑا بہت کچھ کھا لے۔"

"مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی کلثوم! ایک طرف تو تمہیں اس کی اتنی فکر رہتی ہے' دوسری طرف اس کو گھر سے نکالنے کی بھی جلدی ہے۔" جمیل کے کہنے پہ کلثوم نے اسے جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"سویرا کو اٹھارہ انیس کا ہو لینے دیں۔۔۔ پھر اسے گھر سے رخصت کرنے کی جلدی صرف مجھے ہی نہیں آپ کو بھی ہو گی۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہمیں اس سے پیار نہیں ہے یا ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے منزہ کی فکر ہے۔۔۔ اور آپ سے زیادہ ہی ہے۔ اسی لیے اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں اور چلیں۔۔۔ ٹھیک ہے آپ کو میرا اعتبار نہیں' آپ کو میں منزہ کی خیر خواہ نہیں لگتی' آپ کا خیال ہے صرف اور صرف اپنے بھائی کی وجہ سے میں اس کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتی ہوں۔ تو پھر جمشید اور ثنا بھی کیوں اس کی شادی کروانا چاہتے ہیں؟ انہیں سات سمندر پار بیٹھے بیٹھے منزہ بھاری کیوں لگ رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ انہوں نے بھی منزہ کی بہتری کے لیے ہی یہ سوچا ہے۔"

"بات تو یہ ہے کہ منزہ کیا سوچ رہی ہے؟ ہمارے گھرانے میں بیٹیوں کی مرضی اتنا اہم نہیں ہوتی۔ ماں باپ بھائی خود آرام سے اس کے مستقبل کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔۔۔ میں بھی منزہ کے بارے میں فیصلہ کر لیتا اگر وہ صرف میری بہن ہوتی۔ وہ تو ماں ہے۔۔۔ اس کا ہر فیصلہ سویرا کو سامنے رکھ کے ہو گا۔"

"یہ باتیں اس کے سامنے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے یہ بھلانا چاہتی ہوں کہ وہ ماں ہے اور آپ ... رہے ہیں۔"

"... بھلا جائے گی؟"

کلثوم اس سوال پہ سوچ میں پڑ گئی۔ اتنے میں سویرا نے کسی کے فون کے بارے میں بتایا۔ کلثوم یہ سب ... جھٹکتی ہوئی فون سننے کے لیے اٹھی...... واپس آئی تو چہرہ تمتما رہا تھا۔

"کیا ہوا...... عرفان کا فون تھا؟ بہت خوش لگ رہی ہو۔" جمیل کھانا کھا چکا تھا' ہاتھ دھو کر تولیے سے ... ہوئے بولا۔

"نہیں' وہ کل جو رشتہ آیا تھا منزہ کے لیے...... وہاں سے فون تھا۔ لڑکے کی بہن کا...... انہیں منزہ پسند ... اور رشتہ قبول ہے۔ یعنی ان کی طرف سے تو ہاں ہے۔ اب ہمیں کل شام چائے پہ مدعو کیا ہے۔ اللہ کرے ... ہو...... اور معاملہ جلد طے ہو جائے۔" وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جمیل' نوید مراد سے مل کر خاصا مطمئن ہوا تھا۔ منزہ کو زندگی کے اس نئے دور کا آغاز کرنے کے لیے ایک ... اور سمجھدار شخص کی ضرورت تھی۔ معاشی آسودگی بھی تھی۔

کلثوم کو شمشاد کے اطوار سے کچھ کھٹک پیدا ہوئی تھی۔ مگر دوسری طرف پروین کے سلجھے ہوئے مزاج ... اسے اطمینان بھی دلایا تھا۔ یوں بھی وہ جانتی تھی کہ منزہ اتنے سال تک مظہر کی...... تیز ماں اور بہن کو جھیل ... ہے' تپ کے کندن بن چکی ہے۔

اب تو پہلے کے مقابلے میں اتنی ناتجربہ کار اور معصوم بھی نہیں رہی۔ خود ہی حالات کے مطابق ڈھل جا... یا حالات کو اپنے مطابق کر لے گی۔ اس لیے اس نے جمیل کے آمادگی ظاہر کرتے ہی جمشید اور ثنا کو فون کر دیا۔

"آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟" جمشید نے ان سے دریافت کرنا چاہا۔

"سچی بات ہے کہ ہمیں تو وہ لڑکا پسند آیا ہے۔" نوید مراد کو لڑکا کہتے ہوئے ایک بار کلثوم کی زبان بھی لڑکھڑائی ... اس نے خود کو بہلا لیا۔

"اب ایک بچی کے ساتھ اسے اپنا ہم عمر تو ملنے سے رہا۔"

"ہم لوگ اتنی دور بیٹھے کیا مشورہ دے سکتے ہیں اور کیا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر منزہ کو کوئی اعتراض نہیں ... ٹھیک ہے' ہماری جانب سے بھی منظوری ہے۔"

"اس کا ہی تو مسئلہ ہے ثنا! کبھی وہ مان جاتی ہے اور کبھی ہتھے سے اکھڑ جاتی ہے۔ کبھی سوہا کو لے کر جذباتی ... جاتی ہے۔"

"ہاں سوہا اس کے بارے میں کیا طے کیا ہے؟"

"ابھی سے یہ بات کرنا مناسب نہیں لگتا ثناء! ظاہر سی بات ہے اولاد ماں سے کتنا دور رہ سکتی ہے۔ مگر ماں کے ساتھ اولاد رخصت ہوتی اچھی نہیں لگتی۔ یہاں ہو یا کہیں اور شادی ہو' یہ بات تو طے ہے کہ سوہا کو کچھ عرصہ ... سے الگ ہمارے پاس رہنا ہوگا۔ جب منزہ ایک بیوی اور ایک بہو کے طور پہ اپنے قدم جما لے گی تب وہ سوہا کو ... ساتھ رکھنے کی پوزیشن میں ہوگی مگر ایک ماں کی حیثیت سے اگر وہ نئے سسرال میں داخل ہوگی تو اپنی جگہ ... سکے گی۔"

"بات تو ٹھیک ہے بھابی!"

"مگر یہ بات منزہ سمجھے تب ناں...... اسے سمجھاؤ تو خواہ مخواہ میں بیچارگی اور مظلومیت طاری کر لیتی ہے ... کے ساتھ ہم لوگ کوئی ظلم کر رہے ہوں۔ مجھ میں تو اب بات کرنے کا یارا نہیں۔ تم ہی سمجھا سکو تو سمجھا لو۔"

"آپ بلائیں اسے ہم دونوں سمجھاتے ہیں۔"

ثنا نے بڑے یقین سے کہا مگر جب منزہ چھکوں پھکوں رونے لگی تب اسے اندازہ ہوا کہ یہ کام ایسا آسان بھی نہیں۔

"منزہ...... میری جان! میری بات کا غلط مطلب مت لو۔"

"نہیں بھابی! مجھے آپ کی نیت پہ شک نہیں۔ نہ آپ کی نہ ہی کلثوم بھابی اور جمیل بھائی جان کی...... مگر۔" وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

"مگر ضروری تو نہیں کہ آپ جو چیز میرے لیے بہتر سمجھ رہے ہیں' وہ بہتر ہو۔ کیا میں ایسے نہیں جی سکتی؟"

"نہیں...... بالکل نہیں جی سکتی۔ یہ میرا دعوا ہے۔ دیکھو' میں تمہاری بات دہراؤں گی...... کہ جو چیز تم اپنے لیے اچھی نہیں سمجھ رہی ہو' ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو۔ کچھ فیصلے وقت پہ چھوڑ دو۔"

"وقت نے پہلے میرے ساتھ کیا اچھا کیا ہے۔ جو اب کرے گا۔"

"ایسا نہیں کہتے میری جان! اللہ پہ بھروسا رکھو۔ وہ شخص خود ایک بچی کا باپ ہے۔ اسی تکلیف دہ دور سے گزر رہا ہے۔ جس سے تم گزر رہی ہو۔ اس کی بیٹی بھی اسی دکھ سے دوچار ہے۔ جس سے سوہا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کی محرومیوں کا مداوا کرتے ہوئے ایک اچھی زندگی گزار سکتے ہو۔ اس بن ماں کی بچی کو تمہارے روپ میں ماں مل جائے گی اور سوہا کو باپ کی شفقت۔"

"مگر بھابی تو کہہ رہی تھیں کہ سوہا......"

"صرف کچھ دن...... یہ ضروری ہے۔"

"مگر کیوں؟" وہ کراہی۔

"جانو...... سمجھا کرو۔ ہمارے معاشرے کے کچھ طور طریقے ہیں' کچھ رواج ہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے انجان ہو گے...... تمہیں کچھ عرصہ لگے گا ایک دوسرے کو جاننے میں...... اس دوران اگر تمہاری توجہ سوہا پہ رہے گی تو یہ ممکن نہ ہوگا۔"

"وہ اپنی بیٹی کو کہاں بھیجنے والا ہے؟"

"اف منزہ......" ثنا نے سر تھام لیا۔

"یہ مقابلہ بازی چھوڑ دو ... یہ باتیں تمہیں سوائے تکلیف کے اور کچھ نہیں دیں گی۔ عورت کو لینے سے پہلے دینا پڑتا ہے۔ تم اگر پہلے ہی اس کی بیٹی سے اپنی بیٹی کا مقابلہ شروع کر دو گی تو بات نبھنے کی نہیں' بگڑے گی۔ یاد رکھو تم وہاں جا رہی ہو' وہ یہاں نہیں آ رہا۔"

اس کے علاوہ بھی اس نے دیر تک اسے کافی باتیں سمجھائیں۔ جمشید نے بھی چند ایک نصیحتیں کیں۔ منزہ وہ باتیں سمجھی یا نہیں...... مگر اتنا ضرور سمجھ گئی کہ اب وہی ہوگا جو اس کے بھائی بھابیاں چاہتے ہیں۔ اس نے اسی رات کلثوم کو ہاں کہہ دی۔

☐ ☐ ☐ ☐

"مظہر...... میں تم سے جدا ہو رہی ہوں۔

تمہیں مجھ سے جدا اللہ نے کیا تھا...... اور اللہ کا کوئی بھی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ بے رحم بھی نہیں ہے۔ اس نے تمہیں مجھ سے الگ کیا مگر تمہاری یادوں کو نہیں۔ وہ میرے پاس رہنے دیں...... لیکن مجھے تم سے جدا یہ لوگ کر رہے ہیں۔ لوگ جو بے رحم ہوتے ہیں۔ یہ تمہاری یادیں بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ اب میں تم سے حقیقتاً الگ ہو رہی ہوں۔

بالکل الگ......

ایک دم جدا......

ثنا بھابی کہہ رہی تھیں کہ اب میں کسی اور کی ہو جاؤں گی۔ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔ مظہر...... کیا میں تمہارے علاوہ اور کسی کی ہو سکتی ہوں؟

بھابی یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ اب مجھے تمہارے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ میرا تمہارا رشتہ ختم ہو گیا ہے۔

کیا واقعی ایسا ہے مظہر؟

کیا اب ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں؟

رشتہ تو تب ختم ہوتا ہے جب دونوں میں سے ایک یا وہ دونوں اس رشتے کو ختم کرنا چاہیں۔ نہ تم کبھی اسے توڑنا چاہتے تھے نہ میں..... پھر کیسے؟ کیسے مظہر؟

میں کیسے نہ سوچوں تمہیں؟.....

میں کیسے یاد نہ کروں وہ دن..... وہ راتیں۔

تمہاری باتیں..... تمہاری محبتیں.....

کیوں چھینا جا رہا ہے مجھ سے یہ حق؟

بھابی کیوں یہ کہہ رہی ہیں کہ ایسا کرنا اب بددیانتی ہوگا کیونکہ میں کسی اور کے نکاح میں جا رہی ہوں۔

مظہر کوئی نہیں جانتا میرا دل تمہارے نکاح میں ہے۔" وہ مظہر کی تصویر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچتی رہی۔

اس نے مظہر سے وابستہ تمام چیزیں..... اپنی شادی کی البم..... ہنی مون کی تصاویر' اپنی ورسری اور برتھ ڈے کے گفٹس' شادی کا جوڑا..... شادی کا کارڈ..... مظہر کی فیورٹ ٹائی' اس کا فیورٹ کلون اور پرسنل ڈائری۔ دوسری بہت سی چیزیں ایک سوٹ کیس میں بند کیں اور کلثوم کے حوالے کرنے چلی آئی۔

"بھابی! یہ میری امانت جان کے رکھ لیں۔"

"یہ کیا ہے منزہ؟"

"وہ چیزیں جو اب میرے لیے شجر ممنوعہ ہیں۔" وہ پھیکے پن سے مسکرائی۔

"میں انہیں ساتھ نہیں لے جا سکتی..... مگر اتنا حوصلہ بھی نہیں کہ انہیں کہیں پھینک آؤں۔ میرا ان پہ حق نہیں رہا مگر سوہا کا تو ہے۔ اس کا مظہر سے رشتہ کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ جب وہ بڑی ہوگی تو میری یہ امانت اسے دے دیجیے گا۔"

وہ چپ چاپ واپس پلٹ گئی اور کلثوم نے سچے دل سے اس کے لیے دعا کی تھی۔

"یا اللہ' اس لڑکی کی زندگی کو مزید آزمائشوں سے دور رکھنا..... اسے سچی خوشیوں اور دائمی محبتوں سے نواز۔"

☼ ☼ ☼

وہ پہلی بار دلہن نہیں بن رہی تھی..... مگر آج اسے سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔

نیا بھی..... اور اجنبی بھی.....

موت کا سا' یہ احساس نیا تھا.....

لاش کی طرح سرد کر دینے والا یہ لمس نیا تھا.....

یہ زیور وہ پہلی بار اپنے جسم پہ نہیں سجا رہی تھی مگر آج یہ اسے کسی بچھو کی طرح ڈنک مار رہے تھے۔

مہندی کا رنگ پہلے بھی کئی بار اس کی ہتھیلیوں پہ کھلا تھا مگر اسے کبھی اس سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔

"ماما....." سوہا نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔

"ماما..... آپ دلہن بنی ہیں؟"

"نہیں بیٹا..... آپ کی ماما..... وہ ان کی فرینڈ ہے ناں..... اس کی شادی ہے' اس پہ جانے کے لیے تیار ہوئی ہیں۔" کلثوم نے اسے بہلایا..... اس کا ارادہ تھا کہ سوہا گھر پر ہی رہے گی۔

"مگر ماما بالکل دلہن لگ رہی ہیں۔"

منزہ کا دل کٹ کے رہ گیا۔ شرم سے بھی اور تاسف سے بھی۔

"آپ آؤ..... اکبر بھائی اور عرفان انکل سب بچوں کو لے کر پلے لینڈ جا رہے ہیں۔" وہ اسے لے کر باہر نکل گئی۔

پھر اسے اور دوسرے بچوں کو پلے لینڈ بھیج دیا گیا۔

"اٹھو منزہ.....!" کلثوم نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

"بارات آنے میں کچھ ہی دیر ہے' ہمیں میرج ہال پہنچنا ہے۔"

منزہ کے قدموں نے اس کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام مناظر ایک ایک کر کے آنے لگے جن میں مظہر اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے زور سے آنکھیں میچ کر ذہن سے یہ تمام مناظر جھٹکنے کی کوشش کی۔

"چلو ناں منی....."

منزہ نے ایک قدم آگے بڑھایا..... اور خوف سے لرز کے فوراً ہی پیچھے کر لیا۔

اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کے قدموں کے نیچے مظہر کی کفن میں لپٹی لاش پڑی ہے۔

☼ ☼ ☼

اس کا دماغ ایسا ماؤف ہوا تھا کہ باقی کا وقت کیسے کٹا' اسے پتا ہی نہ چلا..... کب نکاح نامے پہ دستخط ہوئے' کب وہ رخصت ہوئی..... کب نوید کے گھر میں اس نے پہلا قدم رکھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔

پروین اسے سجے سجائے کمرے میں بٹھا کے اس کا دوپٹہ درست کرنے لگی۔

"میرے بھائی جان بہت اچھے ہیں۔ تم عمر میں مجھ سے چھوٹی ہو اور رشتے میں بڑی جو چاہو رشتہ بنا لو میں مایوس نہیں کروں گی۔ نہ میں' نہ میرے بھائی جان۔"

وہ پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

دروازے پہ آہٹ ہوتے ہی وہ پیچھے ہٹی۔

"لگتا ہے بھائی جان آ گئے۔"

نوید مراد اندر داخل ہوا..... اور منزہ کے برف جیسے وجود میں گویا دراڑیں پڑنے لگیں.....

"لیجیے بھائی جان!..... سنبھالیں اپنی امانت۔"

"سنو پروین!"

نوید نے گلے میں پڑا سرخ گلابوں کا واحد ہار اتارتے ہوئے اسے سنجیدگی سے پکارا تو وہ دروازے کے قریب رکی۔

"جی؟ کچھ چاہیے؟"

"ہاں..... ذرا وشمہ کو لانا۔"

"مگر..... وشمہ....." وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

"وشمہ تو..... وہ شاید اماں کے پاس سو رہی ہے۔"

"نہیں' وہ جاگ رہی ہے۔ اس کی آواز آ رہی تھی ابھی۔ اسے یہاں بھیج دو۔"

"اسے اماں کے پاس ہی....."

"اسے لے آؤ پروین!"

"جی....." وہ باہر نکل گئی۔

نوید نے ہاتھ میں پکڑا ہار لے کر ادھر ادھر دیکھا' جیسے اسے رکھنے کی جگہ ڈھونڈ رہا ہو..... پھر ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر رکھ دیا۔ جوتے اور موزے اتارتے ہوئے وہ بیڈ پہ بیٹھی منزہ سے لاتعلق نظر آ رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی منزہ

کو مظہر کے ساتھ اپنی سہاگ رات کی اولین ساعتیں یاد آ گئیں۔ وہ اس کی وارفتگی...... وہ بے قراری سی دیوانگی......

منزہ نے گھبرا کے جھرجھری لی۔

ثنا نے جب اسے مظہر کے بارے میں سوچنے سے منع کیا تھا تب اسے کتنی تکلیف ہوئی تھی مگر اب خود غیر ارادی طور پہ مظہر کو یاد کرنے پہ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی ناجائز حرکت کر رہی ہو۔

"مظہر...... الوداع۔" اس کے دل نے ہچکی لی......

تب ہی دروازے پہ دستک ہوئی۔

"بھائی جان! یہ وشمہ......" پروین' وشمہ کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوئی۔

"صبح سے اتنی مصروفیت رہی ۔..... آپ مل نہیں سکے۔ لیجیے اچھی طرح مل لیں...... پھر میں اسے لے جاؤں۔ آج یہ میرے ساتھ سوئے گی۔"

"نہیں پروین! یہ یہیں سوئے گی۔ میرے...... ہمارے ساتھ۔" نوید نے قطعیت سے کہا۔

پروین کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے بھائی کی یہ بات پسند نہیں آئی مگر بجائے بحث کرنے کے وہ واپس مڑ گئی۔

"یہ وشمہ ہے' میری بیٹی۔"

نوید نے اس کا ہاتھ تھام کے منزہ کے آگے کیا۔ منزہ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کے اس بچی کو دیکھا۔

سوہا کی یاد اس کے دل کو اتھل پتھل کر گئی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ پچھلے تین چار گھنٹوں سے اس سے الگ تھی...... اور نجانے کب تک اسے الگ رہنا تھا۔

پہلی بار وہ اس کے بغیر رات گزارنے والی تھی۔

"اور وشمہ...... یہ آپ کی امی ہیں۔"

"پھوپھو کہہ رہی تھیں یہ ماما ہیں۔" وشمہ صاف زبان میں بولی۔

"ہاں وہی...... ماما!" نوید ہلکے سے ہنسا۔

"منزہ بی بی...... یہ بچی بڑی بدنصیب ہے۔ پیدا ہوتے ہی ماں کی گود سے محروم ہو گئی۔ اسے آپ کی ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے ماں کا پیار دیں گی۔" (میری سوہا کو میری ضرورت ہے' مجھے جانے دو اس کے پاس۔)

"میں نے یہ شادی وشمہ کی خاطر ہی کی ہے...... اسے ماں دینے کے لیے۔" (اور میں نے یہ شادی سوہا سے ماں چھیننے کے لیے کی ہے)

"ساجدہ...... اس کی ماں بہت اچھی عورت تھی۔ اس کی میری زندگی میں ایک خاص جگہ تھی' ہے اور رہے گی۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو بھی آپ کا جائز حق اور مقام دے سکوں۔"

"مظہر...... اس کا بھی میری زندگی میں ایک خاص مقام تھا۔ جواب کہیں نہیں ہے' نہ کبھی ہو گا...... میں تمہیں......"

اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ وشمہ اچھل کے اس کی گود میں بیٹھ چکی تھی۔

"ماما...... ماما......"

اس کے سامنے وشمہ کھڑی تھی مگر اسے سوہا کی پکار سنائی دے رہی تھی۔

اس نے تیزی سے پلکیں جھپک کے بے تحاشا امڈ آنے والے آنسوؤں کو زبردستی پیچھے کی جانب دھکیلا۔ اس نے تو رخصتی کے وقت بھی ایک آنسو تک نہ بہایا تھا۔ نہ ماں باپ کی آخری نشانی اس گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے جہاں بچپن اور لڑکپن کی ڈھیروں یادیں بستی تھیں' نہ اپنے ماں جائے کے سینے سے لگ کر وداع ہوتے ہوئے۔ اس کا اس "دیس نکالے" کے خلاف ایک خاموش احتجاج تھا۔

"ہاں...... یہی ہے تمہاری ماما۔"

نوید مراد کے ایک بار پھر کہنے پہ وہ چونکی۔

"ماما...... ماما...... ماما......"

سوہا کی پکار پس منظر میں اب بھی گونج رہی تھی۔

"پتا نہیں پلے لینڈ سے آنے کے بعد اس نے گھر پہ مجھے نہ پا کے کیا کیا ہو گا۔" اسے ایک اور خیال آیا۔

سوہا اب تک اس سے لپٹ کر سونے کی عادی تھی۔ اس نے تو اسے نہ پا کر طوفان کھڑا کر دیا ہو گا۔ اس متوقع طوفان کا تصور کرنے سے ہی اس کے اندر وحشتیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں۔

"یہ ماما ہیں؟ سچ مچ کی ماما؟"

وشمہ نے ننھا سا ٹھنڈا ٹھنڈا ہاتھ اس کے گھٹنوں پہ دھرے ہاتھوں پہ رکھا تو جذبات کی یورش ذرا تھم سی گئی۔ وحشتیں خود بخود ماند پڑنے لگیں۔ اس نے اسے مسکرا کر دیکھنا چاہا۔ آنکھوں کے آگے جیسے دھند کی چادر تن گئی اور اس دھند کے پار وہ کون تھی...... وشمہ...... یا سوہا...... اسے کچھ اندازہ نہ ہو رہا تھا۔

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں اگر وشمہ آج رات ہمارے ساتھ سو جائے؟" نوید مراد نے اس نئے رشتے میں بندھنے کے بعد پہلی بار اسے مخاطب کیا۔

اس نے بوجھل پلکیں اٹھا کے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھنا چاہا۔ سالوں کا سفر جس کے پژمردہ چہرے پہ رقم تھا' وہ چاہتے ہوئے بھی یہ نہ جتا سکی کہ وہ وشمہ کو رات یہاں سلانے کا فیصلہ کر چکا ہے اور اس پہ بہن کے دبے دبے اعتراض کے باوجود عمل درآمد بھی...... پھر یہ سوال تو بے معنی ہوا اور بے معنی سوال کا وہ کیا جواب دے۔ کیا یہ جواب دے کہ......

"مجھے تو اس پہ بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اگر وشمہ کے ساتھ سوہا بھی ہمارے ساتھ ساتھ سو جائے۔"

مگر ظاہر ہے کہ اس کے لب یہ جواب ادا نہیں کر سکتے تھے۔

فقط اس کی گردن خفیف سی حرکت کے ذریعے اقرار کا اظہار کر سکتی تھی اور اس نے یہی کیا۔

"مجھے آپ سے یہی امید تھی۔"

اس ذرا سی گردن کے "ہاں" میں ملنے سے نوید مراد کو وہی خوشی اور سرشاری حاصل ہوئی جو کسی بھی مرد کو کسی بھی عورت کی "ہاں" سے ملتی ہے۔

"دراصل میں چاہتا تھا' آپ دونوں میں اس ابتدائی مرحلے میں ہی وہ رشتہ قائم ہو جائے جو ہمارے رشتے کی وجہ ہے۔"

بے حد محتاط الفاظ میں اس نے منزہ پہ یہ بھی جتا دیا کہ اس شادی کی اصل وجہ کیا ہے۔

"اور جو رشتہ میں چھوڑ آئی ہوں......"

اس کے دل سے ہوک نکلی...... مگر اپنی بیٹی کی کلائی میں لشکتی ہری لال چوڑیاں دیکھ کر خوش ہوتے نوید مراد تک یہ ہوک کیسے پہنچتی۔ اس نے بڑی حسرت سے وشمہ کو باپ سے لاڈ اٹھواتے دیکھا۔

"کبھی سوہا بھی مظہر کو ایسی ہی پیاری تھی' وہ بھی اسے گود میں لے کر سارے دن کی تھکن بھول جایا کرتا تھا...... کبھی مظہر بھی......"

سوچتے سوچتے اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ایک بار پھر بددیانتی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ مظہر کا خیال بھی اب اس کے لیے شجر ممنوعہ ہے مگر وہ سوہا کا خیال دل سے کیسے نکالے گی اور جب جب سوہا یاد آئے گی' تب تب مظہر تو یاد آئے گا ہی۔

اس نے زور سے آنکھیں میچ کر جیسے اپنے ذہن کے تمام در بھی بند کرنے چاہے۔

☼ ☼ ☼

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی' اصغر! تم جلدی گھر آؤ۔"

رینا نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا تو وہ فون رکھتے ہی گھر کی جانب بھاگا۔

رینا کا ساتواں مہینہ تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے سات طویل سال گزر چکے ہوں۔ ایک ایک دن اسے بھاری لگ رہا تھا کیونکہ رینا کے ساتھ شروع سے ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ رہا۔ مکمل بیڈ ریسٹ کے باوجود آئے دن کوئی نہ کوئی تکلیف پیدا ہو جاتی۔ ڈاکٹر نے اسے خاصا پیچیدہ کیس قرار دیا تھا اور مکمل احتیاط کی ہدایت کی تھی۔ اس کے بیان کردہ اندیشوں کی وجہ سے ہی اصغر کا دل کانپ رہا تھا۔

گاڑی کو جہاز کی طرح اڑاتا وہ گھر پہنچا تو رینا تکلیف کی شدت سے بے حال تھی۔ اس کی زرد رنگت دیکھ کر اصغر کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ملازمہ اس کے پیر سہلا رہی تھی اور خود بھی حواس باختہ نظر آ رہی تھی جبکہ شمیم ایک جانب بے تاثر چہرہ لیے ساکت کھڑی تھی۔

اصغر نے خونخوار نظروں سے شمیم کو دیکھا۔

"تو کھڑی کیا دیکھ رہی ہے... اسے گاڑی تک لے جانے میں میری مدد کر۔"

شمیم کے پتھریلے چہرے پہ ایک بدہیئت دراڑ پیدا ہوئی۔ یہ اس کی مسکراہٹ تھی جس نے اصغر کو اور بھی تلملا کے رکھ دیا۔

"اصغر... مجھے... مجھے ہا... ہاسپٹل..."

رینا کی اٹکتی سانسوں نے ایک بار پھر اس کا دھیان شمیم سے ہٹا کر اس کی جانب دلایا۔

"ہاں... ہاں میری جان..." وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کے باہر کی جانب گیا۔ رینا کی منہ چڑھی ذاتی ملازمہ بتول پیچھے پیچھے تھی۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز اور پھر گیٹ بند ہونے کی آواز تک شمیم کے چٹان چہرے پہ وہ مسکراہٹ یونہی ایک بدصورت دراڑ کی طرح سجی رہی۔

چند سیکنڈ تک محسوس کیے جانے والے بے معنی سکوت کے بعد اس میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی اور وہ داخلی دروازے کی جانب بڑھی۔ نیم وا لکڑی کا منقش دروازہ اس نے پورا وا کر دیا۔

"بی بی جی... کیا کر رہی ہیں... ٹھنڈی ہوا آئے گی۔"

نصیبن جو برتن دھوتے دھوتے افراتفری میں اٹھ کر یہاں تک آئی تھی' ہیٹر کے آگے ہاتھ سینکتے ہوئے بولی مگر شمیم نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔

"بی بی جی... گھر پہ کوئی نہیں ہے... دروازہ بند رکھو... صاحب غصے ہوگا۔"

یہ صدیقہ تھی' چوکیدار کی بیوی جسے کبھی کبھی کسی ملازمہ کی چھٹی کر لینے کی صورت میں یا پارٹی اور فنکشن ہونے پہ کام کی زیادتی کی وجہ سے گھر کے کام کے لیے بلا لیا جاتا تھا کیونکہ وہ یہیں سرونٹ کوارٹر میں رہتی تھی۔ اب بھی رینا کی طبیعت خراب ہونے کا واویلا سن کر بھاگی آئی تھی۔

نصیبن نے صدیقہ کی معلومات میں اضافہ کیا۔ وہ آدھے سے زیادہ دن یہاں گزارتی تھی اور اس نے اول تو شمیم کو کم ہی اپنے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ کھانا تک اس کے کمرے میں ہی پہنچایا جاتا اور کبھی وہ باہر نکلتی کہا تو اس کی بہکی بہکی باتیں اور الجھا الجھا رویہ اسے ایک نارمل انسان ظاہر نہیں کرتا تھا۔

"نہیں نصیبن! وچاری دکھاں دی ماری لگدی اے۔" (بے چاری دکھوں کی ماری لگتی ہے)۔

"دکھوں کی نہیں' عقل کی ماری۔ یہ دیکھ ذرا... ہا ہائے... یہ کیا کر رہی ہے۔"

اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے صدیقہ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی' جہاں شمیم بھاری فرنیچر گھسیٹنے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں زیرو پاور کا ہلکا سبز بلب سفید لیمپ کی آڑ میں روشن تھا۔ فضا میں باسی گلابوں کی مہک سانس بوجھل کر رہی تھی۔ بڑے سے آبنوسی بیڈ پہ ایک جانب نوید مراد لیٹا تھا' دوسری جانب منزہ اور درمیان میں وشمہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پہ لیٹے نوید مراد کے وجود سے الجھن محسوس ہو رہی تھی تو دوسری جانب بالکل نزدیک موجود وشمہ کے ہلکے ہلکے تنفس سے ایک عجیب سی بے قراری کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے بے ترتیب سانسوں کی آواز اور ہلکے ہلکے خراٹے اسے سوہا کی یاد دلا رہے تھے۔

شاید آج کی رات وہ سوہا کی یاد سے خود کو آزاد رکھنے میں کامیاب ہو ہی جاتی اگر وشمہ پاس نہ ہوتی۔ وشمہ کا وجود اسے سوہا کو بھلانے نہیں دے رہا تھا۔

اس نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ اس کی پلکیں سوتے میں ہلکی سی لرز رہی تھیں۔ بالکل جیسے سوہا کی لرزتی تھیں۔

اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں جیسے کوئی میٹھا خواب دبوچے ہوئے ہوں۔

بالکل جیسے سوہا کی...

اس کے گلابی لب تھوڑے سے وا تھے۔

بالکل جیسے سوہا کے سوتے وقت۔

"مگر کیا سوہا اس وقت سو رہی ہوگی۔؟؟"

اس خیال نے اسے ایکدم اٹھ کر بیٹھنے پہ مجبور کر دیا۔

نوید مراد نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ سویا وہ بھی نہیں تھا اور اب منزہ کو پریشانی کے عالم میں بیٹھے دیکھ کر اپنے طور پہ اندازے لگا رہا تھا۔ وہ وشمہ کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے گر رہے تھے۔

"کیا اسے وشمہ کا وجود کھل رہا ہے؟" ایک زہریلی سوچ نوید مراد کو بے چین کر گئی۔

"کیا یہ آج کی رات اس معصوم اور بے ضرر بچی کی موجودگی کو برداشت نہیں کر رہی؟؟"

وہ یہ سوال خود سے کر رہا تھا اور ان کا جواب بھی اسے خود ہی مل گیا' جب اس نے منزہ کے مہندی لگے ہاتھوں کو ہلکی سی کپکپاہٹ کے ساتھ وشمہ کی جانب بڑھتے دیکھا۔

نوید مراد کا دل سکڑ سا گیا۔

"کیا کرنے لگی ہے یہ... میری بچی کے ساتھ۔"

اور پھر اس کی نیم وا آنکھوں نے اس ہاتھ کو وشمہ کے ماتھے پہ ٹھہرتے دیکھا۔ اب وہ ہولے ہولے اس کے بال سہلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو رواں تھے پھر اس کے لرزتے ہونٹوں سے بڑا مدھم سا لفظ ادا ہوا۔

"سوہا!"

نوید کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

"کتنا خود غرض ہوں میں... اپنی بن ماں کی بچی کو ایک ہی رات میں یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ اب اس کی زندگی مکمل ہو گئی ہے' اس کے پاس باپ کے ساتھ ساتھ ماں بھی ہے مگر ایسا کرتے ہوئے میں نے ایک بن باپ کی بچی کی ادھوری زندگی کو بالکل ہی خالی کر دیا۔ اس سے اس کی ماں بھی چھین لی۔"

اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ رات کے ساڑھے تین بجے ننگے پیر بھاگتا جائے اور منزہ کی بیٹی کو گود میں بھر کے اٹھا لائے اور... اور وشمہ کے برابر لٹا دے۔

اب رات کے اس آخری پہر کو گزارنا اسے اور بھی کٹھن لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کدھر؟"

شمشاد بیگم کے سر میں بڑے زوروں کا درد تھا۔ رات کے دو ڈھائی بجے جا کر تو بستر پہ لیٹنا نصیب ہوا تھا۔ اس پر بھی ہزاروں فکریں اور پریشانیاں۔ وہ دیر تک اپنے دل کے وسوسے اور اندیشے پروین کے سامنے بیان کرتی رہیں یہاں تک کہ وہ بے چاری بیٹھے بیٹھے ——— خود کتنی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد اب وہ چائے بنانے اٹھی تھی۔ گرم چائے کا کپ لے کر کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی' جب نوید مراد کو اپنے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ وہ وہیں دروازے پہ رک گئی مگر وہ ماں پہ کوئی توجہ دیے بغیر برآمدے میں ٹنگی چابیاں اتار کر باہر کی جانب بڑھنے لگا۔

"کدھر؟"

"آتا ہوں اماں!"

"پر سویرے سویرے۔۔۔ اور وہ بھی شادی کی اگلی سویرے۔۔۔ گھر پروہنوں (مہمانوں) سے بھرا ہوا ہے۔"

"اوہو اماں۔۔۔!" وہ جھنجلا گیا۔ "مہمان بارہ بجے سے پہلے ہوش میں آنے والے نہیں اور میں آدھے پون گھنٹے تک واپس آجاؤں گا۔ ویسے بھی میں کوئی ایسا کام تو نہیں کرنے جا رہا جسے دوسروں سے چھپانا ضروری ہو پھر آپ کو مہمانوں کی فکر کیوں لگ گئی ہے؟"

"لے۔۔۔ کیوں نہ فکر کروں۔ سارے پوچھیں گے کہ لاڑھا (دولہا) سویرے سویرے گھر سے کیوں نکلا۔ اسے تو بے سدھ پڑا سوتا ہونا چاہیے۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر اپنے تئیں بیٹے سے شریر سا مذاق کرنا چاہا مگر نوید کے چہرے کے زاویے کچھ اور بگڑ گئے۔

"کی ہویا۔۔۔؟ ووہٹی نے کوئی آڑا لگایا ہے؟" شمشاد کا ماتھا ٹھنکا۔ "سچ سچ بتا ماں کو۔۔۔ اگر واقعی ایسی بات ہے تو میں نہ پروہنوں کا لحاظ کروں گی' نہ اس کے ایک دن کی ووہٹی ہونے کا۔ گت پٹ کے پیکے چھوڑ آؤں گی۔"

"اماں۔۔۔" وہ ماں کے جارحانہ عزائم کے سامنے بے بس سا نظر آیا۔

"مجھے تو پہلے ہی اس پکی عمر اور پکے بوتھے والی کے ارادے ٹھیک نہیں لگے تھے۔ پروین ہی رت بجھ گئی' ورنہ میں تو لاتی کوئی ملوک سی کڑی۔ ہولی (ہلکی) سی عمر والی۔۔۔ معصوم بی بی اور ذرا ماٹھے خاندان کی۔۔۔ ساجدہ کے خاندان کی طرح۔۔۔ ایسی لڑکیاں مرد اور سوہروں (سسرال) کے آگے سر نہیں اٹھاتیں مگر جس کا پیچھا اس کے پیچھے کی طرح تگڑا ہو' وہ آسانی سے نہیں دبتیں۔ خیر تو فکر نہ کر۔۔۔ اندر چل۔۔۔ میں دماغ درست کرتی ہوں اس کا۔۔۔ عقل ٹھکانے آجائے گی۔"

"اماں! خدا کے واسطے چپ کر جاؤ اور اپنے کمرے میں جا کر آرام سے چائے پیو۔ ایسا کچھ نہیں ہوا جو آپ کو لگ رہا ہے۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں آجاتا ہوں۔"

"اوہو۔۔۔ تو میں بھی تو یہی پوچھ رہی ہوں کہ کدھر جا رہا ہے؟"

نوید مراد نے ایک گہری سانس بھری۔ اسے لگا کہ اصل جواب سنے بغیر اس کی ماں ٹلنے والی نہیں۔

"میں اپنے۔۔۔" لفظ سسرال اس عمر میں ادا کرتے ہوئے اس کی زبان اٹک گئی۔

"منزہ کے بھائی کے گھر جا رہا ہوں۔"

"ناشتہ دینے؟"

"کیا مطلب؟" اس عجیب و غریب سوال پہ وہ حیران ہوا۔

"شادی کی اگلی سویر' لڑکی کے پیکے ناشتہ لے کر آتے ہیں' تو ادھر جا رہا ہے' اس لیے میں سمجھی کہ شاید رواج بدل گیا ہو۔ اب لڑکی والوں کی بجائے لاڑھا (دولہا) آپ یہ ڈیوٹی دیتا ہو۔" شمشاد نے بھولپن کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "میں منزہ کی بیٹی کو لینے جا رہا ہوں۔"

یہ کہنے کے بعد وہ ایک پل بھی نہ رکا۔ مبادا ماں کے اگلے سوال کا جواب دینے کا مرحلہ اس سے بھی طویل نہ ہو جائے۔

شمشاد بیگم اس جواب سے اتنی حیران ہوئی کہ فوری طور پر کوئی رد عمل بھی ظاہر نہ کر سکی۔ نوید کے گھر سے نکل جانے کے بعد جیسے اسے ہوش آیا۔

"بیٹی کو لینے۔۔۔؟ اس چھپکلی کو۔۔۔؟ اندھیر ہے اندھیر۔۔۔ ابھی خود کو سسرال میں لیے ایک رات ڈھنگ سے نہیں گزری اور چلی ہے اپنا ٹبر بسانے۔ اپنے قدم جمے نہیں اور اپنی اولاد کے جمانے لگی ہے۔ نی پروین۔ اٹھ۔۔۔ ہوش کر۔ دیکھ تیری من مانی نے کیا چن چاڑھا ہے۔ مرد کو آگے لگانے والی گھس آئی ہے میرے گھر میں۔ کیسے سویرے سویرے ڈنگر (مویشی) کی طرح ہانک کے اسے گھر سے نکالا ہے۔"

شمشاد بیگم کا واویلا سن کر پروین تو آنکھیں ملتی باہر نکلی ہی' اندر لیٹی منزہ کے دل میں بھی کھٹک ہوئی۔ اگرچہ اسے شمشاد کی صرف آواز آرہی تھی' الفاظ پوری طرح اس تک نہیں پہنچ رہے تھے پھر بھی اس کا دل سکڑنے لگا۔ اسے لگا جیسے وہی اس ہنگامے کی وجہ ہے۔

"کہیں نوید صاحب نے تو میرے بارے میں ایسا کچھ نہیں کہا جس سے ان کی والدہ اتنی غضب ناک ہو رہی ہیں۔"

اسے وسوسہ لاحق ہوا اور وہ اپنے رات کے رویے کے بارے میں سوچنے لگی۔

بے شک اس کا رویہ نوید سے خاصا لیا دیا اور پر تکلف تھا مگر ایک رات کی دلہن کا یہ گریز قطعی غیر معمولی نہیں کہلایا جا سکتا۔ جبکہ اس کے برعکس نوید کا خشک رویہ ضرور غور طلب تھا۔

وہ جو اس بات سے خوف زدہ تھی کہ اپنے شوہر کی محبت اور وارفتگیوں کا جواب کس طرح دے گی۔۔۔ اب اس بات پہ ملول تھی کہ نئی دلہن کی پذیرائی اس طرح نہیں ہو سکی جیسے ہونا چاہیے تھی۔ اسے مظہر کی دیوانگیاں یاد آنے لگیں' ایک بار پھر۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔

اور وہ غیر ارادی طور پر مظہر کا موازنہ نوید مراد کی سرد مہری سے کرنے لگی اور جب اس بات کا احساس ہوا تو خود اپنے بدلتے احساسات پہ دنگ رہ گئی۔

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے منزہ! کہ تمہیں ایسا شوہر ملا ہے جو تمہاری طرح خود بھی کسی کی یادوں میں گرفتار ہے جیسے تم مظہر کے بجائے کسی اور کا خود سے وابستہ ہونا ذہنی طور پہ قبول نہیں کر پا رہیں' ایسے ہی شاید وہ بھی اپنی پہلی بیوی کے بجائے تمہیں دیکھ کر ناخوش ہے پھر یہ۔۔۔ یہ بھاری بوجھ کیوں؟"

"یہ تو۔۔۔ یہ تو سوہا۔۔۔" اس کے دل نے بھرپور مزاحمت کے ساتھ اس الزام کو جھٹلایا۔

"یہ ناانصافی نہیں تو کیا ہے۔ اپنی بیٹی سے ایک رات کی جدائی بھی گوارا نہیں اور میری بیٹی۔۔۔ اسے مجھ سے الگ کر دیا۔ اس پہ بھی یہ طنطنہ کہ اگر میں نے پہلی ہی رات اس کی بیٹی سے وہ لاڈ پیار نہیں کیا جس کی اسے خواہش تھی تو اس بات کا ڈھنڈورا گھر بھر میں پیٹ ڈالا۔ میں نے ایک بن ماں کی بچی کو ممتا دینے سے کب انکار کیا ہے۔ اتنی کٹھور کیسے ہو سکتی ہے ایک ماں۔۔۔ مگر نوید صاحب کو مجھے کچھ وقت تو دینا چاہیے تھا۔ یہ کیا کہ صبح صبح ناراضی دکھاتے کمرے سے بھی نکل گئے اور ماں سے بھی شکایت کر دی۔"

اس کے دل میں دوسرا گلہ توانا ہوا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہو گیا ہے اماں؟" پروین نے کمرے سے نکل کر ناگواری ظاہر کی۔ "کیوں صبح صبح شور مچا رہی ہیں۔ گھر میں نئی دلہن ہے' اس کا تو لحاظ کریں۔"

"تیری اس نئی دلہن نے تو جوتی برابر لحاظ نہیں کیا۔ نہ خصم کا' نہ ساس کا اور دن چڑھتے ہی اپنی اوقات دکھا دی۔"

"کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے؟ آڑا لگا کے بیٹھ گئی ہوگی کہ پہلے میری ضد مان پھر تیری مانوں گی اور مرد تو اس معاملے میں ایسا اندھا

ہوتا ہے کہ جورو کنویں میں چھلانگ مارنے کی شرط رکھے تو بھی مان لے۔ وہ بھی دم ہلاتا سیدھا باہر بھاگا ہے۔"

"اصل بات تو بتاؤ نا اماں! کیوں بھائی جان کو کوس رہی ہیں؟"

"رات کو بڑے نشے سے وشمہ کو اندر لے کر گیا تھا کہ آج نئی ماں کے ساتھ سوئے گی۔ میں نے بہترا کہا کہ نہ اس معصوم بچی کو کسی کی ہائے لگا... ایسا نہ ہو کہ وہ دل ہی دل میں بددعائیں دینے بیٹھ جائے کہ یہاں سے آگئی میری سیج خراب کرنے مگر وہ تو ایسی رزیل نکلی کہ موقع دیکھ کر مقابلے پہ اتر آئی۔ نوید کو اپنے چیلنج ہے اس نے... کہ جا' جا کر میری بیٹی کو بھی لا۔ اسے بھی وشمہ کے برابر سلاؤں گی پھر میرے کلیجے ٹھنڈ پڑے گی۔"

"واقعی۔" اسے حیرت ہوئی۔

"لے... تو میں کیا کہانی سنا رہی ہوں؟ میرے سامنے نوید نکلا ہے... بکتا جھکتا... کرے بھی کیا دو چار ٹکے والے پڑھی لکھی رن (بیوی) مل گئی ہے۔ اب بھگتے گا۔"

"یہ عجیب حرکت کی بھابھی نے۔ حالانکہ بھائی جان پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ ان کی بیٹی یہیں ... کے ساتھ پرورش پائے گی اور وہ اس کی تمام تر ذمہ داریاں اور فرائض پورے کریں گے اور یہ بات میں نے بھابھی کو بتا دی تھی۔ خود ان کے میکے والوں نے ہی یہ پیشکش کی تھی کہ وہ ایک ہفتہ بچی کو اپنے پاس رکھیں گے پھر انہوں نے اتنی بے اعتباری کا مظاہرہ کیوں کیا؟"

"آتے ہی اپنا رعب جمانا چاہتی ہے اور کیا؟"

"مجھے تو وہ بہت سمجھ دار اور سلجھی ہوئی لگتی ہیں پھر انہوں نے ایسی حرکت کیوں کی؟ نوید بھائی جان پہ ان کا تاثر کتنا برا پڑا ہو گا۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ میرے متعلق کہ بہن نے کیا بیوی پسند کی ہے۔" پروین کو اپنی فکر لگ گئی۔

ادھر شمشاد بیگم کے سینے میں جیسے ٹھنڈک اترتی گئی۔

پروین کم ہی اس کی باتوں میں آتی تھی۔ نہ ساجدہ کی بار آئی... نہ اپنے شوہر اور سسرال والوں کے متعلق ماں کے شر انگیز بیانات کا کبھی کوئی اثر لیا اور اس نئی بھابھی کے متعلق تو اس کی رائے پہلے سے بہت اچھی تھی۔ اس رشتے کو طے کرنے کے لیے وہی سب سے زیادہ فعال تھی اور آج پہلے ہی دن اس کے دل میں بھابھی کے خلاف میل آتا دیکھ کر شمشاد کو سکون سا مل رہا تھا۔

"تیرا تو خیال ہے' ماں جاہل ہے... بک بک کرتی ہے' جھلی ہے... اپنے آپ کو بڑی لائق فائق سمجھتی ہے نا تو... کر کے دیکھ لی من مانی...؟ اب بتا میں نہ کہتی تھی' پکی عمر کی' بال بچے والی عورت نہ لا گھر میں۔ اسے پتہ ہے کہ کیسے خصم قابو کرنا ہے۔ ماں کے کہنے پہ ہلکی عمر کی کڑی لاتی... جو ماڑے (کمزور) گھر کی ہوتی' پڑھی لکھی بھی نہ ہوتی پھر دیکھتی کیسے اب تک گھونگھٹ نکال کر بیٹھی ہوتی۔ اس نے تو آتے ہی مرد کی دوڑ لگا دی۔" پروین سخت کبیدہ دل لیے سست قدموں کے ساتھ اندر گئی۔

بھائی کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر اس کے اندر غصے کی ہلکی سی لہر اٹھی۔ وہ کچھ سوچ کے اندر آگئی۔

منزہ اپنے دھیان میں بیٹھی تھی۔ پروین کو اندر آتے دیکھ کر اس نے خیر مقدمی طور پہ مسکرانے کی ہلکی سی کوشش کی۔

مگر جواب میں پروین کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

منزہ کی مسکراہٹ خود بخود بے جان ہو گئی۔

پروین نے سوئی ہوئی وشمہ کو گود میں بھرا... تب بھی منزہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

پروین وشمہ کو اٹھا کر باہر نکلتے نکلتے دروازے کے قریب رکی اور بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"ایک بات کہوں بھابھی...! اگرچہ یہ بات کہنے کے لیے میرا رشتہ آپ سے چھوٹا ہے مگر عمر میں اور شادی شدہ زندگی کے تجربے میں' میں آپ سے بڑی ہوں' اس لیے ضرور کہوں گی کہ مرد سے ضد لگانا اور وہ بھی اس ابتدائی مرحلے میں... بڑا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

منزہ کی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا۔

"پہلی بات یہ اس گمان میں مت رہیے گا کہ ہمیشہ یہ مقابلے کی فضا آپ کے حق میں رہے گی۔ مرد مقابلے پہ اتری عورت کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرتا اور دوسری بات یہ کہ وعدے پہ اعتبار کرنا سیکھیں اور وعدے کے پورا ہونے کا انتظار صبر کے ساتھ کرنا سیکھیں۔"

وہ منزہ کو ہکا بکا چھوڑ کے کمرے سے نکلی تو شمشاد اسی جانب آ رہی تھی۔

"ہٹ پیچھے... میں خبر لیتی ہوں اس کی۔"

"رہنے دیں اماں! معاملہ اور بگڑ جائے گا۔ ابھی ایک دن بھی نہیں ہوا شادی کو اور گھر میں مہمان بھی ہیں۔"

"پھر بھی اس چالاک کو ماسی کو پتا تو لگنا چاہیے کہ وہ کسی ایسے ویسے گھر میں متھا نہیں لگا رہی۔ یہاں واسطہ شمشاد بیگم سے پڑا ہے اس کا۔"

وہ آستینوں کے کف پلٹتے ہوئے اندر جا کر منزہ پہ پل پڑنے کے موڈ میں لگ رہی تھی۔

"اس کی ضرورت نہیں' میں نے سنا دیا ہے کافی کچھ۔"

"تو نے؟" اسے ذرا اعتبار نہ آیا۔ "مجھے تو نہیں لگتا کہ تو کسی کو کچھ سنا سکتی ہے۔"

"مجھے بھی سنانے کا کوئی شوق تو نہیں مگر بھائی جان کی گرہستی دوبارہ بسانے میں بڑا ہاتھ میرا ہے' بڑے ارمانوں سے میں ان کے لیے نئی بیوی اور وشمہ کے لیے نئی ماں لائی تھی۔ اب اس گرہستی کو برقرار رکھنے کی بھی میں پوری کوشش کروں گی تاکہ بھائی جان اپنی زندگی میں تلخی گھلنے کا الزام مجھے نہ دیں۔"

☼ ☼ ☼

دو گھنٹے بعد اصغر رینا کو لے کر ہاسپٹل سے گھر لوٹا۔ اب اس کی طبیعت کچھ سنبھل ضرور گئی تھی مگر ڈاکٹر کے مطابق خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ ایک تو لاکھ دعاؤں کے بعد یہ خوشی ملنے والی تھی۔ اس پہ بھی خوف اور اندیشوں کی گھر میں لپٹی ہوئی۔

اس سے پہلے دوبار یہ امید پیدا ہوئی مگر ابھی اصغر اور رینا ڈھنگ سے خوش بھی نہ ہو پائے تھے کہ امید کی یہ کرن اندھیروں میں ڈوب گئی۔

اس بار وہ حد سے زیادہ محتاط تھی۔ شہر کی سب سے مہنگی اور قابل گائناکالوجسٹ سے مسلسل رابطہ تھا۔ اصغر نے بھی دیکھ بھال اور علاج میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی۔ ایک ملازمہ صرف اور صرف اس کی خاطرداری کے لیے رکھ دی تھی تاکہ اسے کسی کام کے لیے پیر بھی زمین پہ نہ رکھنا پڑے۔ اسی وجہ سے سات مہینے گزر ہی گئے۔ چاہے اس دوران کتنی بار ایسا لگا جیسے پہلے دو تجربوں کی طرح یہ بھی... مگر خیریت رہی۔

آج بھی وہ خطرہ ٹال کے گھر پہنچے تھے۔

"آرام سے... دھیرے سے..." اصغر نے سہارا دے کر اسے گاڑی سے نکلنے میں مدد دی۔

"میں سوچ رہا ہوں' تمہیں وہیل چیئر لا دوں۔"

"ہاں تاکہ میں بالکل ہی محتاج ہو کے رہ جاؤں۔" اس نے جل کر کہا۔

نقاہت کے مارے آواز مشکل سے نکل رہی تھی مگر الفاظ بھرپور زہریلے تھے۔

"دیکھو نا... اب یہ چار سیڑھیاں چڑھ کے اوپر برآمدے تک جانا ہے۔ تمہیں ایک ایک قدم احتیاط سے اٹھانا ہے میری رانی!" اس کے لہجے کا برا مانے بغیر اصغر نے نثار ہو جانے والے انداز میں کہا۔

شاہدہ نے رشک و حسد کے ملے جلے تاثرات لیے اپنی عام سی شکل و صورت والی اور بڑے خاص طور طریقوں والی تنک مزاج مالکہ کو دیکھا۔

"اور کتنی احتیاط کروں... اب تو سانس لیتے بھی ڈر لگتا ہے۔" اس کے لہجے کی تندی' بے بسی اور لاچاری میں ڈھل گئی۔

اصغر کا بس نہ چل رہا تھا' اس کی ساری تکلیفیں خود مول لے لے۔

"میری جان... اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ بس تھوڑا سا انتظار... ایک بار میرا شہزادہ آجائے پھر دوبارہ تمہیں اس تکلیف سے گزرنے نہیں دوں گا۔"

اصغر اور شاہدہ بہت آہستگی اور احتیاط سے اسے کسی کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھالے آگے بڑھ رہے تھے۔

"اور اگر شہزادی آگئی تو...؟" رینا کے کوفت زدہ چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اصغر اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"تو پھر کیا... شہزادہ ہو یا شہزادی... ایک ہی وارث اور ایک ہی جانشین کافی ہے۔ بس یہ طے ہے۔" اس نے وعدہ کیا یا بات بنائی کیونکہ یہ بات ڈاکٹر نے صرف اسے ہی بتا رکھی تھی کہ رینا کے پاس یہ آخری موقع ہے۔

شاہدہ نے ہینڈل پہ ہاتھ رکھ کے گھمایا۔

"بس میڈم! تھوڑا سا حوصلہ اور..."

رینا کی کراہ کے جواب میں اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا مگر اندر وسیع و عریض ہال پہ نظر پڑتے ہی اس کا فقرہ منہ میں ہی رہ گیا۔

یہی حال اصغر کا تھا' وہ حیرانی سے اپنے سجے سجائے ہال کا یہ حشر دیکھ رہا تھا۔ بھاری صوفے اور دیوان گھسیٹ کے دیواروں کے ساتھ لگا دیے گئے۔ سینٹر اور سائیڈ ٹیبلز بھی ہٹا کے ایک کونے میں اوپر تلے رکھی تھیں۔ ہال کے فرش پہ سفید چادریں بچھی تھیں۔ اگربتیاں جل رہی تھیں۔

اصغر کے دل پہ ایک عجیب سی ہیبت اور دہشت طاری ہو گئی۔ رینا بھی گنگ بنی کبھی سامنے تو کبھی اصغر کو دیکھتی ماحول کی اس تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"صاحب جی... یہ... یہ سب...؟" بالآخر شاہدہ نے اس سکوت کو توڑنے میں پہل کی اور اس کے ساتھ ہی اصغر بھی اس منجمد حیرت کے اثر سے باہر نکل آیا۔

"صدیقہ... نصیبن۔" اس کی دھاڑ کے جواب میں وہ دونوں الگ الگ کونوں سے برآمد ضرور ہوئیں مگر آگے آنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ فق چہروں کے ساتھ دونوں ہی دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔

"یہ سب کیا ہے **نصیبن**! کس نے یہ واہیات حرکت کی ہے؟" وہ پھر گرجا مگر اس سے پہلے کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہمت کر کے اس سوال کا جواب دیتی۔ کچن سے شمیم ٹرے اٹھائے نکلی۔

نصیبن اور صدیقہ دونوں نے گردن موڑ کے اسے آتے دیکھا اور بہت کچھ کہتی نظروں سے اصغر کو سارا جواب دے دیے۔

"شمیم..." اصغر نے بے یقینی سے اس کا نام دہرایا تھا' پکارا نہیں تھا۔ پکار بھی لیتا تو شاید وہ اس وقت سننے کی حالت میں نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو۔ سفید چادر کے وسط میں اس نے ٹرے الٹی تو کھجور کی گٹھلیاں اور چنے بکھر گئے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے انہیں سمیٹ کر ڈھیری بنانے لگی۔

"اصغر...! یہ کیا کر رہی ہے؟" رینا چلائی۔

شمیم اب ہل ہل کے رقت آمیز لہجے میں قل شریف پڑھنے لگی تھی۔

اس بار اصغر سے رہا نہیں گیا۔ وہ رینا کو شاہدہ کے اوپر تقریباً" پھینکتا ہوا شمیم کی جانب لپکا تھا۔ اگلے ہی پل شمیم کی چٹیا اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ بے تحاشا اسے لاتیں رسید کر رہا تھا۔

اپنے ہوش میں یہ دوسری بار تھا' جب وہ اپنی بڑی بہن کو یوں پیٹ رہا تھا۔ ایک بار تب جب نشے کی حالت میں اس نے شمیم کو آدھی رات کے وقت ٹیرس پہ اکیلے بیٹھا دیکھا تھا اور رینا کی اشتعال انگیز باتوں کی وجہ سے خود پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور دوسری بار... جب وہ نشے میں دھت نہیں تھا لیکن مکمل ہوش و حواس میں بھی نہیں تھا۔

اور غصے کی زیادتی نے اس کے ہوش و حواس سلب کر لیے تھے۔

پہلی بار کے بعد... جب وہ ذرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تھا تو اسے اپنے اس بے رحمانہ فعل پہ ندامت ہوئی تھی۔ وہ کئی دن تک شمیم کا سامنا نہیں کر سکا تھا۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اب کبھی اس پہ ہاتھ نہیں اٹھائے گا اور اس کا خیال رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ اگرچہ رینا کی مداخلت اسے ایک بھائی کی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھانے سے روکتی تھیں مگر اب اس نے کم از کم یہ کیا تھا کہ شمیم کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔

اور آج یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی ذہنی حالت مسلسل ابتری کی جانب گامزن ہے' وہ وحشیانہ طریقے سے اسے پیٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ملازماؤں تک کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کی چیخ و پکار سے رینا کو ہوش آیا۔ وہ اب تک بے حسی سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھی مگر اب اس نے بڑی دل سوزی سے واویلا کرنا شروع کر دیا۔

"ارے... کوئی روکو اسے... کوئی روکو... یہ ہوش میں نہیں ہے۔ بہن کو مار ڈالے گا... شاہدہ... نصیبن... اس بے چاری کو بچاؤ... اصغر بس کرو... تمہیں خدا کا واسطہ... تمہیں میری قسم... اپنے بچے کی قسم..." اصغر کے ہاتھ رک گئے۔

زمین پہ اوندھی گری شمیم نے آہستہ آہستہ اپنا بکھرے بالوں والا سر اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا اور چہرہ سوجا ہوا تھا۔ یہ صرف چہرہ تھا جو نظر آرہا تھا' ورنہ اس کی پیٹھ پہ نجانے ایسے کتنے اور نشان بن چکے تھے۔

رینا تک کا دل کانپ گیا۔

نصیبن اور صدیقہ' اصغر کے ایک جانب ہٹتے ہی لپک کے آئیں اور شمیم کو سنبھالنے لگیں۔ **نصیبن** تھر تھر کانپ رہی تھی۔ صدیقہ کے تو آنسو بھی بہہ رہے تھے۔

"اصغر...!" شمیم کے منہ سے ایک کراہ کی صورت اس کے بھائی کا نام ادا ہوا۔ اصغر نے چونک کے سر اٹھایا۔ اسے اچانک محسوس ہوا تھا جیسے اسے شمیم نے نہیں' نصرت نے... اس کی ماں نے پکارا ہو اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ہر گزرتا دن نصرت سے شمیم کی مشابہت کو اور بھی نمایاں کرتا جا رہا تھا۔ شمیم کی شکل پہلے بھی ماں سے ملتی تھی مگر اب آواز اور چال ڈھال تک وہی ہونے لگی تھی۔

خود سے صرف ساڑھے چار سال بڑی بہن کو ماں کی شکل و صورت میں دیکھ کے کبھی کبھی اصغر عجیب سے رعب میں آجایا کرتا تھا۔

اس وقت بھی اس کے دل کی یہی حالت ہوئی۔

"کیوں کرتی ہے تو ایسا؟" وہ رو پڑا۔

"اصغر... میں نے کیا کیا...؟ جب مظہر اسپتال سے آیا تھا' تب بھی چادریں بچھی تھیں۔ ابا... پھر امی... جو بھی اسپتال سے آتا ہے... سفید چادریں بچھتی ہیں... سوگ ہوتا ہے۔ تو بھی رانی کو اسپتال سے لا رہا تھا... اس لیے میں نے..." درد کی شدت سے اس سے مزید کچھ نہ کہا گیا اور وہ صدیقہ کی گود میں سر ڈال کے گر سی گئی۔

"منحوس... کالی زبان والی..."

رینا کا دل سہم کے رہ گیا سوگ والی بات پہ... وہ بے تحاشا اسے کوسنے لگی۔

"نہ کریں میڈم! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور خراب ہو جائے گی۔" شاہدہ نے اسے روکنا چاہا۔

"رہنے دو رینا... اسے کیا کچھ کہنا... یہ تو... یہ تو بے چاری..." اصغر اپنے آنسو آستینوں کے کف سے صاف کرتا رینا کے پاس آیا۔

"تم چلو کمرے میں... آرام کرو۔"

"مگر تم نے سنا' یہ کیا کہہ رہی ہے۔ یہ ہمارے بچے کو..."

"اس کا دماغ کام ہی کب کرتا ہے رینا... اسے خود نہیں پتا یہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کی بات پہ دھیان مت دیا

کرو۔ خوامخواہ میں بھی آپے سے باہر ہو گیا تھا..... تم چلو۔"

وہ شاہدہ کے ساتھ اسے سہارا دے کر کمرے میں لے جانے لگا۔ شمیم وہیں صدیقہ کی گود میں نیم بے ہوش تھی۔

"بیٹھو تم..... میں ذرا....." وہ اسے لٹا کر باہر جانے لگا۔

"دیکھو اصغر.....! آج تو میں نے برداشت کر لیا' روز روز یہ پاگل پن میں برداشت نہیں کروں گی۔ اگر یہ پاگل ہے تو اسے باندھ کے رکھو' کسی پاگل خانے میں چھوڑ آؤ' ورنہ یہ اپنی دل جلانے والی باتوں اور حرکتوں سے ..... کر دے گی۔"

"وہ پاگل نہیں ہے، ریتا..... بس ذرا سی..... میں کیسے اسے پاگل خانے چھوڑ آؤں..... میری ایک یہ بہن ہے..... اب اور رہا کون ہے۔"

"کیوں' میں کون ہوں۔ یہ بچہ کس کا ہے؟"

"تم دونوں تو میری زندگی ہو مگر سمجھا کرو' ایک انسان سمجھ کے ہی کچھ احساس کر لو۔"

"ٹھیک ہے پھر اس سے کہو' اوپر اپنے کمرے تک رہا کرے۔ مجھے اپنی شکل نہ دکھایا کرے۔ میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر نے سختی سے کہا ہے کہ مجھے کوئی ٹینشن نہیں لینی۔"

"ہاں ہاں' تم بے فکر رہو۔ ایسا ہی ہو گا۔ میں صدیقہ سے کہتا ہوں' وہ اسے اوپر تک رکھا کرے گی۔ کبھی نیچے نہیں آنے دے گی۔" وہ اسے تسلی دیتا کمرے سے نکلا۔

صدیقہ اور نصیبن اسے اٹھانے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھیں۔

"ہٹو پیچھے۔" اس نے شمیم کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اس کے بستر پہ لٹا کے صدیقہ کو ہدایت دی لگا۔

"اس کا خیال رکھا کرو..... بلاوجہ نیچے نہ آنے دیا کرو..... بلکہ آنے ہی نہ دیا کرو..... نظر رکھو اس پہ..... ویسے طبیعت خراب ہے۔ اسے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔"

صدیقہ کا دل جل کے رہ گیا۔ بے ہوش اور زخمی پڑی بہن سے بھی زیادہ اس وقت اسے بیوی کی فکر تھی۔

"صاحب..... طبیعت تو اس کی بھی ٹھیک نہیں۔" ہمت کر کے اس نے سنا دیا۔ حالانکہ نصیبن نے اس کا بازو بھی تنبیہاً دبایا تھا۔

"ہاں' میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔ وہ آ کے دیکھ جاتا ہے اور..... اور ہاں..... کہنا..... سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔" چرا تا ہدایات کر کے وہ مڑنے کو تھا کہ صدیقہ نے ایک اور جرات کی۔

"صاحب! اسے دماغ کے ڈاکٹر کی ضرورت زیادہ ہے۔ بی بی جی کا دماغ صحیح کام نہیں کرتا۔ ایسے تو یہ پاگل ہو جائے گی۔"

وہ رکا اور سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا۔

"ہاں' تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ کل لے کر جاؤں گا اسے۔" اس نے کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا اور چلا گیا۔

"تجھے کیا ضرورت تھی اتنا کہنے کی۔" اصغر کے جانے کے بعد نصیبن نے صدیقہ کو گھر کا۔ "ایویں برا مان جاتا..... ہتھ چھٹ ہے اور شرابی بھی..... شرابی کو کسی کا لحاظ دید نہیں ہوتا۔"

"ہاں' وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ اللہ کا بھی ڈر نہیں ہے' بندوں کا لحاظ کیا ہو گا۔"

"بس بس رہنے دے۔ اتنی ہمدردی ٹھیک نہیں۔ کھاتے تو ہم ان کا ہیں۔"

"اللہ کا کھاتے ہیں نصیبن! اور اگر ہم غریب بھی اللہ سے نہ ڈریں گے تو کون ڈرے گا۔ ہم نے تو اللہ کو ہی جان دینی ہے۔ اسی نے شاید بیوی کو دینی ہو گی۔ قبر میں اس کا حساب لینے بھی بیوی نے ہی آنا ہو گا۔" صدیقہ نے ..... ہوئے انداز میں کہا۔

"ہر کسی کا کیا اس کے آگے آتا ہے' تو اور میں ہمدردی کر کے کیا کر لیں گے۔ اللہ بے انصاف کرنے والا اور ..... نہیں ..... مجھے تو یہاں آئے سال بھی نہیں ہوا ہے۔ میں سالوں سے بیٹھی ہوں' تب جب صاحب کے ماں باپ بھی زندہ تھے۔ یہ شمیم بی بی بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ اس نے اپنی بھرجائی کے ساتھ..... اس کے اعمال اس کے آگے آ رہے ہوں گے۔ بیگم صاحبہ کے اس کے آگے آئیں گے..... مگر ہم جس ..... ہوئے ہیں ..... اتنا تو کریں۔" صدیقہ نے اس کی بات کاٹی اور شمیم کو ٹٹولنے لگی۔

"میں سینک دیتی ہوں اسے..... تو دودھ گرم کر کے لا..... ڈاکٹر پتہ نہیں آتا ہے یا نہیں۔"

"صاحب نے کہا تو ہے۔"

"وہ تو یہاں کہا ہے..... نیچے جا کے شاید بیوی کانوں میں کچھ اور پھونک دے۔ توبہ اس عورت کو اس حالت میں بھی کوئی خوف نہیں۔ روز کوئی نہ کوئی تکلیف ہوتی ہے اسے۔ نئے سے نیا مسئلہ..... روتے ہوئے سات مہینے گزرے ہیں پھر بھی اس کا دل موم نہیں ہوتا۔ اپنے پیٹ کے بچے کا سر صدقہ جان کے ہی نند کو بخش دے۔ اس کا کوئی علاج وغیرہ کرا دے۔"

وہ دیر تک اس کی گرم کپڑے سے ٹکور کرتے ہوئے بڑبڑاتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ پروین کے رویہ اور اس کی باتوں سے صرف الجھی ہوئی نہیں تھی بلکہ کسی حد تک خوف زدہ بھی ہو گئی تھی۔

"کیا وہی کہانی پھر سے شروع ہونے والی ہے۔ وہی ساس..... وہی نند....." اسے اندیشوں نے آن گھیرا۔

"پروین تو مجھے بہت متحمل مزاج اور پیار کرنے والی محسوس ہوئی تھی۔ بہت دوستانہ فطرت والی پھر وہ مجھے ایسی چبھنے والی باتیں کس لیے کر گئی۔ کیوں اتنا کچھ سنا گئی۔"

وہ اسی سوچ میں گم تھی کہ سوہا کی آواز پہ چونک گئی۔

"ماما....."

اس نے بے یقینی سے دیکھا' سوہا جسے اس کے خیال کے مطابق اس وقت بھائی جان کے گھر پہ ہونا چاہیے تھا اس نئے اور اجنبی گھر میں اس کے سامنے موجود تھی۔ وہ اپنے مکی ماؤس والے نائٹ پاجامہ سوٹ میں ملبوس تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سوتے میں اٹھ کے آئی ہو۔

"سوہا..... میری جان....." اس کے بازو پھیلے اور وہ ان میں یوں سما گئی جیسے سالوں بعد مل رہی ہو۔

منزہ نے چٹاچٹ اس کے ماتھے' ہاتھوں اور گالوں کے بوسے لینے شروع کر دیے۔

"ماما! آپ رات کو کہاں تھیں؟"

"آپ گھر کیوں نہیں آئیں؟"

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"کیا اب آپ یہیں رہیں گی ماما؟"

اسے اس دوران سوہا کے سارے سوال سنائی دے رہے تھے مگر جواب دینے کی فرصت کسے تھی۔ وہ تو اپنی صدیوں کی اداسی مٹا رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے نوید مراد نے یہ منظر دیکھا اور بوجھل آواز میں جواب دیا۔

"ہاں' اب یہی آپ کی ماما کا گھر ہے۔ وہ یہیں رہیں گی اور آپ بھی۔" منزہ نے گردن اٹھا کے نوید کو دیکھا اور بے ساختہ سوہا سے ذرا پرے ہٹ گئی۔

"ماما! یہ انکل مجھے ماموں کے گھر سے لائے ہیں۔"

سوہا کی اطلاع پہ وہ چونکی۔ اس کا خیال تھا کہ رات بھر سوہا نے اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ طوفان کھڑا کیا ہو گا کہ بھائی جان اسے یہاں لانے پہ مجبور ہو گئے ہوں گے مگر نوید..... نوید اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ یہ امر باعث ..... تھا۔

وہ اتنی حیران ہوئی کہ اس مہربانی کی وجہ دریافت کرنا تو در کنار، شکریہ تک ادا کرنا بھول گئی۔

"بابا! یہ انکل کون ہیں؟"

وہ چپ رہی، سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ سوہا کے اس سوال کا کیا جواب دے۔

بظاہر الماری سے اپنے کپڑے نکالتا نوید مکمل طور پر منزہ کی جانب سے اپنی بچی کے اس سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ "ممانی کہہ رہی تھیں کہ یہ تمہارے پاپا ہیں۔ ماما! کیا یہ میرے پاپا ہیں؟"

وہ اب بھی چپ رہی۔

نوید مراد کے دل کو دھکا سا پہنچا۔

اس نے منزہ کے اس گھر میں قدم رکھتے ہی اپنی بیٹی سے اس کا تعارف ایک ماں کے طور پہ کرایا تھا۔ اس کے سوال پہ منزہ کی معنی خیز خاموشی اسے کھل رہی تھی۔ اس نے جھنجلا کے زور سے الماری کے پٹ بند کیے۔

"بتائیں نا ماما! یہ پاپا ہیں؟"

"پاپا.....!" یہ وشمہ کی آواز تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی باپ کو پکارتی اس کی جانب لپک رہی تھی مگر منزہ پہ نظر پڑتے ہی ٹھٹک سی گئی۔ اس کی سیاہ چمکتی آنکھوں میں اشتیاق بھری مسکراہٹ چھلک رہی تھی۔

"یہ ماما ہیں۔" اس نے رات کو باپ کا پڑھایا ہوا سبق دہرا کر خود کو یاد دلایا۔

اب وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

منزہ نے اسے دیکھ کر مسکرانا چاہا۔

"یہ میری ماما ہیں۔" اس کے قریب آتے ہی سوہا کو جیسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے وشمہ سے چلا کے کہا۔ وہ سہم کے وہیں رک گئی۔

"پاپا....." روہانسی آواز میں اس نے باپ کو پکارا۔

"بری بات سوہا..... چھوٹی سی بہن ہے۔" منزہ نے سرزنش کی۔

نوید نے آگے بڑھ کے وشمہ کو گود میں اٹھالیا اور اسے پیار کرنے لگا۔ منزہ کے اندر خالی پن اور پھیل گیا۔

"یہ منظر کتنا جانا پہچانا لگ رہا ہے۔ سوہا بھی تو اسی عمر کی تھی، جب اس نے باپ کو کھویا تھا۔ مظہر اس کا ایک بھی آنسو نکلنے پہ یونہی بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ اسے ایسے ہی گود میں بھر کے سینے سے لگالیا کرتا۔ اور..... اور کتنے سال ہوگئے ہیں میری سوہا کو باپ کے سینے سے لگے۔ وہ تو بھول بھی چکی ہوگی، باپ کے لمس کی حرارت کیسی ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں..... اس کی گود میں جو تحفظ کا احساس ہوتا ہے، وہ کیسا ہوتا ہے۔"

اس نے سوہا کو دیکھا جو نوید کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ منزہ کو اس کی آنکھوں میں محرومی اور تشنگی نظر آئی۔ اس نے بے ساختہ اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا۔

"یہ عورت کیسی ماں ہے۔" نوید نے اسے بیٹی سے لاڈ کرتے دیکھ کر سوچا۔ "کیا ماؤں کے دل اتنے تنگ ہیں..... کیا ماں صرف اپنی اولاد کی ماں ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ساتھ اس معصوم کو بھی بازوؤں میں لے تو کیا اس کی ممتا میں کوئی کمی ہو جائے گی۔ مگر شاید اس نے دل سے نہ مجھے قبول کیا ہے، نہ میری بیٹی کو۔ اپنی بیٹی کا رشتہ مجھ سے قائم کرنے میں اتنا نہ ہچکچاتی۔ کیا ہو سکتی ہے اس کی وجہ؟ کیا یہ کہ وہ اب تک اپنے شوہر کو نہیں بھلا پائی؟ ہاں یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ ساجدہ نہیں ہے، جس کے کورے دل پہ صرف میرا راج تھا۔ اس کے دل پہ جو شبیہ ہے، اسے شاید میں عمر بھر دھندلا نہ کرپاؤں۔"

وہ دونوں ایک ہی کمرے میں موجود..... اپنے اپنے پرانے رشتے کو سینے سے لگائے اس نئے رشتے کو اپنے اپنے ڈھنگ سے سوچ رہے تھے۔

* * * *

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا مسٹر اصغر کہ آپ کی وائف کا کیس بہت کومپلیکیٹڈ ہے۔ ان کا بی پی تھرو آؤٹ دی ٹائم کنٹرول میں نہیں رہا۔ اس کے علاوہ بھی انہیں بہت سے پرابلمز تھے۔ اسی وجہ سے پہلے بھی دوبار مس کیرج ہو چکا ہے۔ اب ہم لاسٹ ہوپ کے طور پہ ان کا آپریشن کر رہے ہیں۔ آپ دعا کیجیے کہ ہم ماں اور بچہ دونوں کو بچا سکیں۔"

ٹھیک دو دن بعد وہ اسی حالت میں ایک بار پھر رینا کو لے کر ہاسپٹل گیا اور ڈاکٹر نے اس کی حالت کے پیش نظر فوری آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا۔

"مگر ڈاکٹر صاحبہ! ابھی تو تقریباً ڈیڑھ دو مہینے باقی ہیں۔ اتنی جلدی آپریشن..... یہ خطرناک تو نہیں ہوگا؟"

"میں آپ کو جھوٹی تسلی نہیں دوں گی۔ ہے تو سہی مگر زیادہ انتظار کرنا اور خطرناک ہوگا۔ ڈیڑھ دو مہینے بہت دور کی بات ہے۔ ابھی ہم کم از کم ماں کی جان تو بچا سکتے ہیں۔"

"مگر ڈاکٹر صاحبہ....." اصغر کی آواز لڑکھڑا گئی۔ "آپ..... آپ نے بتایا تھا کہ رینا کے دوبارہ ماں بننے کا چانس بہت کم ہے۔"

"کم ہے، ناممکن نہیں۔ دراصل اسے کچھ پیچیدگیوں کا سامنا ہے مگر سائنس میں کوئی بھی بات حرف آخر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے مکمل علاج کے بعد آئندہ کچھ سالوں میں وہ پھر سے ماں بن جائیں مگر فی الحال ان کی جان بچانا زیادہ ضروری ہے۔"

آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند ہوتے ہی اصغر اکیلا ہو گیا۔

آج اسے شدت سے اپنوں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک خاندان کی کمی.....

رینا کی محبت میں کھو کر وہ ہمیشہ خود کو یہ حسین دھوکا دیتا رہا کہ اس کی زندگی مکمل ہے۔ اب اسے کسی اور کی ضرورت نہیں مگر آج اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ کتنا اکیلا..... کتنا تنہا اور کتنا بے بس ہے۔ آج اس کی ماں ہوتی تو یہاں مصلہ بچھائے بہو کے لیے نہ سہی، اپنے ہونے والے پوتے اور پوتی کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوتی۔

باپ ہوتا تو کچھ صدقہ خیرات کرتا۔

بھائی ہوتا تو آج اسپتال میں دوڑ دھوپ کر رہا ہوتا۔

بھابھی ہوتی تو رینا کو سنبھال رہی ہوتی۔

یہاں جتنی عورتیں زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھیں، سب کے ارد گرد یہی رشتے تھے۔ اس وقت ایک رینا تھی جو اکیلی تھی۔ نہ سسرال میں کوئی باقی رہا، نہ میکے سے وہ کوئی رشتہ لے کر آئی تھی۔

اصغر اکیلا ہی ایک سانس میں سو سو دعائیں مانگنے لگا۔ اس کی دعائیں شاید مکمل قبولیت کے درجے تک نہ پہنچ سکیں۔ دو گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد رینا کی زندگی تو بچالی گئی مگر اس کا سات ماہ کا بچہ نہ بچایا جاسکا تھا۔

☆ ☆ ☆
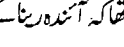
ایک ہفتے کے بعد وہ اسے اسپتال سے گھر لے کر جا رہا تھا۔ دل بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ اپنے بچے سے جدائی کے احساس کے ساتھ ساتھ اس راز کا بھی وزن تھا کہ آئندہ رینا کے ماں بننے کے امکانات بہت کم ہیں۔

رینا کے آنسو سارے راستے خشک نہ ہوئے۔

"بس کریں میڈم! طبیعت خراب ہو جائے گی۔" شاہدہ کسی رٹو طوطے کی طرح بار بار ایک جملہ دہرائے جا رہی تھی۔

"تم تو چپ کرو..... خدا کے لیے۔" اصغر نے جھڑک کے اسے ڈپٹا۔ کسی نہ کسی طرح بھڑاس تو نکالنا ہی تھا۔ "اسے چپ کراؤ..... اس کالی زبان والی چڑیل کو چپ نہ کراتا۔ اسی نے نحوست پھیلائی تھی۔ یاد نہیں کیسے اس

دن سفید چادریں بچھا کے سوگ منانے بیٹھی تھی' جادوگرنی۔۔۔ ڈائن۔ پتہ نہیں رات بھر جاگ جاگ کے منتر پھونکتی رہتی ہے۔ اصغر۔۔۔ گاڑی روکو' مجھے وہاں نہیں جانا۔ میں کہہ رہی ہوں گاڑی روکو۔" وہ چلائی۔

"کیسی باتیں کررہی ہو ریتا! وہ تمہارا گھر ہے' وہاں نہیں جاؤ گی تو کہاں جاؤ گی۔"

"کسی اندھے کنویں میں چھلانگ ماردوں گی مگر وہاں نہیں جاؤں گی' جہاں تمہاری بھتنی بہن کا سایہ ہے۔ وہ گھر نہیں ہے' تمہارے ماں باپ کی روحوں کا آسیب زدہ کھنڈر ہے۔ مجھے وہاں نہیں جانا۔ ایک ایک کرکے مرتے جارہے ہیں' سب ختم ہوتے جارہے ہیں۔ میرا بچہ بھی۔۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایک دن میں بھی مرجاؤں گی' مجھے نہیں مرنا اصغر! مجھے وہاں لے کر مت جاؤ۔"

اصغر گاڑی سڑک کے ایک جانب روک کر سر تھام کے بیٹھ گیا۔

⚫ ⚫ ⚫

"منزہ! میرے کپڑے نکال دو۔"

"کھانا ابھی مت لانا' بھوک نہیں ہے۔"

"وشمہ کہاں ہے؟"

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"اماں کا خیال رکھا کرو' انہیں شوگر ہے۔ میٹھا مت کھانے دیا کرو۔"

یہ تھے وہ چند مخصوص جملے جو ان ڈیڑھ دو ماہ میں نوید مراد نے اس سے وقتاً فوقتاً دہرائے تھے۔ محض چند سوالات۔۔۔ چند ہدایات۔

اور ان کے جواب بھی وہ جس حد تک مختصر الفاظ میں دے سکتی تھی' اس نے دیے تھے۔

"جی۔۔۔"

"نہیں۔۔۔"

"اچھا جی۔۔۔"

سوہا کے یہاں آنے کے بعد کم از کم وہ اس غیر یقینی کیفیت سے تو باہر نکل آئی تھی کہ آیا وہ کبھی سوہا سے اس طرح مل پائے گی یا نہیں جیسے ایک ماں پورے حق سے اپنی اولاد سے ملا کرتی ہے۔ اسے اس خیال سے ہی وحشت ہونے لگتی تھی کہ اب میکے جانے پہ وہ ایک مہمان کی حیثیت سے اس سے ملا کرے گی۔۔۔ اور وہ بھی کبھار۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ ایسے تو کچھ ہی عرصے میں سوہا کے دل سے ماں کی وہ کشش ختم ہوجائے گی جو ایک بچے کے دل میں ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے بغیر رہنا سیکھ جائے گی۔۔۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ مظہر کے بغیر رہنا سیکھ گئی تھی۔

"تو کیا سوہا اب باپ کے بعد ماں کو بھی کھونے والی ہے؟"

یہ خیال اسے لرزا دیتا تھا مگر جب سے نوید نے سوہا کو ایک بن مانگے تحفے کی طرح لا کر اس کی گود میں سجایا تھا وہ ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ اس کے دل میں اس شخص کے لیے ایک خاص طرح کے جذبات پیدا ہوگئے تھے جو ایک مجبوری کا بندھن لیے اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔

مگر یہ جذبات محبت یا انسیت کے نہیں تھے' احسان مندی کے تھے اور اسی احسان مندی کے جذبے سے مغلوب ہوکے وہ شعوری اور غیر شعوری طریقے سے وشمہ کو وہ توجہ دینے لگی تھی جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ علاوہ سوہا کے کسی اور کو نہیں دے سکتی۔

وشمہ بھی شاید محبت اور پیار کو ترسی ہوئی تھی' چند ہی دنوں میں اس سے مانوس ہوگئی۔ وہ عمر کے اس دور میں تھی جب بچے کو سگے سوتیلے' اپنے پرائے کی پہچان نہیں ہوتی' اس نے ماں کا سایہ تک محسوس نہ کیا تھا' اسے بتایا گیا کہ یہ تمہاری ماما ہیں اور اس نے دل و جان سے مان لیا۔ وہ منزہ سے اتنی چپکی رہتی کہ کبھی کبھی منزہ کو گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ البتہ نوید اس صورت حال سے بے حد مطمئن تھا۔ اور اپنی بیٹی کو نئی ماں کے گرد منڈلاتے اور زبردستی لاڈ اٹھواتے دیکھ کر تسکین حاصل کرتا رہتا۔

"ماما سے کھانا کھاؤں گی۔"

"ماما سلائیں گی۔"

"ماما پونی بنائیں گی۔"

"وہ ماما کے نام کی تسبیح پڑھتی رہتی۔ اور وہ نہال ہوتا رہتا۔ دل میں جو ہلکا سا خدشہ تھا' وہ نکل چکا تھا۔

خود اس کا رویہ سوہا کے ساتھ نارمل تھا۔ نہ بہت حد خشک اور نہ نثار ہوجانے والا۔ شاید اس کی بڑی وجہ سوہا ہی تھی۔ وہ خود بھی اس سے الگ الگ' دور دور ہی رہتی۔ یہ اس کے مزاج میں بھی شامل تھا۔

منزہ نے سسرال میں ——— بیوگی کے سال بہت پھونک پھونک کر گزارے تھے۔ باوجود نصرت کی حوصلہ افزائی کے اس نے صرف ریتا کے خوف سے سوہا کو سمیٹ سمیٹ کر رکھا کہ کہیں اس کا بے ضرر وجود اسے نہ کھٹکے۔ اگرچہ اصغر بھتیجی کو بے حد چاہتا تھا مگر اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ سوہا اس محبت کی عادی نہ ہوجائے اور ریتا چچا بھتیجی کی اس محبت کو برداشت نہ کرسکے۔ اگرچہ اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود ریتا وہ کرکے رہی جس کا اندیشہ منزہ کو تھا۔ مگر ان سب کا اثر سوہا پہ یہ ہوا کہ وہ سوائے ماں کے کسی اور کے قریب نہ ہوسکی۔

ماموں کے گھر آنے کے بعد بھی نہیں اور نوید مراد کو وہ ویسے بھی سہمی نظروں سے دیکھتی رہتی تھی۔ اسے یہ شخص اچھا نہیں لگتا تھا جو اس کی ماما کو اپنے گھر لے آیا تھا۔۔۔ اور وہ بھی اس سے چوری چوری' چھپا کے' اور پھر اسی وجہ سے اسے بھی یہاں آنا پڑا۔

حالانکہ یہ گھر اسے ذرا پسند نہ تھا۔ جہاں اس کی ماما صرف اس کے ساتھ ایک الگ کمرے میں نہیں رہتی تھیں۔ اس کی ماما اس انکل کے ساتھ رہتی تھیں اور اسے ان بوڑھی غصیلی سی آنٹی کے ساتھ کمرے میں رہنا پڑتا تھا جو اسے سخت برا لگتا تھا۔

گندا سا کمرہ' اور گندی سی بوڑھی آنٹی۔ جس کے بارے میں ماما نے کہا تھا کہ انہیں دادو کہنا ہے۔ مگر جب پہلی بار اس نے انہیں دادو کہا تھا تو وہ تیز لہجے میں برس پڑیں۔

"پراں مر۔۔۔ آئی وڈی دادو کہنے والی۔ تیری دادی کو کب کے کیڑے پڑ چکے ہیں۔ میں کہاں سے تیری دادی ہوگئی۔ لو جی۔۔۔ نویں نویں رشتے۔۔۔ میں تو اک نوں ویاہ کے لائی تھی۔ ادھر پوری جنج نے رشتے داری باندھ لی۔"

وہ سہم کے دیوار سے لگ گئی۔ اس کمرے میں وہ بچی بھی رہتی تھی۔ وشمہ' بڑی پیاری۔ بالکل گڑیا سی۔ اسے دور سے دیکھنے پہ اچھی لگتی تھی مگر پھر اسے جلد ہی اس سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ سارا دن اس کی ماما سے چپکی رہتی تھی۔ ان پہ حق جتاتی تھی' کبھی کبھی اسے سخت غصہ آتا۔

"ماما۔۔۔! اسے اتاریں گود سے۔۔۔ پرے پھینکیں۔"

اس کی ماما گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگتیں۔ اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کے چپ رہنے کا اشارہ کرتیں۔

"مجھے بھی پیار کریں ناں۔" وہ فرمائش کرتی۔

ماما جھک کے فوراً اس کے ماتھے پہ پیار کرتیں۔ اس کی تسلی پھر بھی نہ ہوتی۔

"اسے اتار کے۔"

اسے ذرا اچھا نہ لگتا کہ ماما پیار تو اسے کررہی ہیں۔ مگر سینے سے اس بچی کو لگا رکھا ہے۔

سوہا کا یہ حکم سن کر وشمہ مارے ضد کے منزہ سے اور بھی زور سے لپٹ جاتی۔

"ماما۔۔۔ اسے اتاریں گود سے۔۔۔ مجھے لیں۔۔۔"

"تم بڑی ہوگئی ہو سوہا۔" نئی اطلاع ملتی۔

"کوئی نہیں' میں نے گودی آنا ہے۔ نہیں تو اسے بھی اتاریں۔ یہ بھی بڑی ہے۔"

مگر ماما اس کی باتوں پہ گھبرا جاتیں۔ ڈر کے ادھر ادھر دیکھتیں کہ کسی نے سن تو نہیں لیا۔ ایک تو وہ بوڑھی [illegible] ہر وقت ماما کو گھورتی رہتی تھی۔ اسے لگتا ماما وشمہ کو گود سے اتارنا تو چاہتی ہیں مگر ڈرتی ہیں۔ شاید بوڑھی [illegible] سے۔

تب اس کا دل چاہتا' جا کے اس گندے کمرے والی گندی آنٹی کو زور زور سے مارے۔

"ایسا وہ کر نہیں سکتی تھی۔۔۔ مگر ایک دن اس نے اپنی طرف سے اس کا توڑ نکال ہی لیا۔

□ □ □

"آپ آملیٹ لیں گے یا فرائی انڈہ؟"

اس نے ناشتے کے لیے بیٹھتے نوید مراد سے پوچھا۔

اس سے پہلے شمشاد بیگم بول اٹھی۔

"اب جب وہ کرسی پہ بیٹھ گیا ہے تو پوچھ رہی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کالجوں میں پڑھی لڑکیاں بڑی سیانی ہوتی ہیں۔ پر تجھے اتنی عقل نہیں کہ کیا کھانا ہے کیا پینا ہے۔ یہ پہلے پوچھنے والی باتیں ہوتی ہیں۔ اب تو بنانے تک بیٹھا انتظار کرتا رہے گا۔"

"اماں! ایک انڈہ فرائی ہونے میں کتنی دیر لگے گی بھلا۔۔۔"

نوید نے ماں کا اعتراض ختم کرنا چاہا۔ مگر اسے نہیں پتہ تھا کہ وہ بحث کا آغاز کر رہا ہے۔

"ہاں اب بیوی کا خیال کر کے کہہ دیا۔۔۔ چاہے دل آملیٹ' پراٹھا کھانے کو کر رہا ہو مگر اسے سکھ دینے کے لیے انڈہ ڈبل روٹی کھائے گا۔"

"اگر آپ نے آملیٹ کھانا ہے تو بتا دیں۔۔۔ دیر نہیں لگے گی۔ میں نے پیاز وغیرہ کاٹ کے رکھی ہے۔ صرف انڈے ڈال کے پھینٹنا ہے۔" منزہ نے شمشاد کو نظرانداز کرتے ہوئے براہ راست نوید سے کہا۔ یہ بات شمشاد بیگم اور [illegible] گئی۔

"بڑا کام کیا ہے۔۔۔ اگر اس نے آملیٹ نہ کھایا تو پیاز تو ضائع ہو گئی ناں۔۔۔ اتنی مہنگی پیاز ہے۔"

"وہ دوپہر کا کھانا بنانے کے کام آجائے گی۔"

منزہ کے ترنت دیے جواب پہ۔۔۔ اور خاص طور پہ جواب دیتے ہی کچن کی طرف مڑ جانے نے تو اسے گویا آگ ہی لگا دی۔

"دیکھی ہے اس کی زبان۔۔۔ مرجانی۔۔۔ کمینی۔۔۔ ذلیل۔۔۔"

سوہا نے تڑپ کے اسے دیکھا۔

گندے کمرے والی گندی بوڑھی آنٹی کی عادتیں بھی گندی تھیں اور باتیں بھی۔

"بس بھی کرو اماں! کیا صبح صبح۔۔۔" نوید بدمزگی سے بڑبڑایا۔

منزہ نے خاموشی سے ناشتہ لا کر اس کے سامنے رکھا۔

"ابلا انڈا کس کے لیے ہے؟" شمشاد بیگم کی تیز نظروں نے ناشتے کا جائزہ لیا۔

"وہ۔۔۔ سوہا کے لیے۔۔۔" منزہ نے چور لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"یہ چار انڈوں کا آملیٹ بنا تو ہے۔۔۔ ابالنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیا ہو گیا ہے اماں آپ کو۔۔۔ ایک انڈہ ہی تو ہے۔"

نوید کے ماتھے پہ واضح شکنیں نمودار ہوئیں۔ یہی بات منزہ کو سہارا دیتی تھی کہ کم از کم اس کا دل سوہا کے لیے تنگ نہیں ہے مگر شمشاد بیگم کی باتیں برداشت کرنا بھی کبھی کبھی حد سے باہر لگنے لگتا تھا۔

"بات ایک انڈے کی نہیں ہے نویدے! انصاف کی ہے۔ اللہ رکھے ہمارے گھر میں رزق کی کمی نہیں۔ چھوڑ دس یتیموں کو بٹھا کر کھلا سکتے ہیں۔"

اس کی یہ بات منزہ کے دل میں تیر کی طرح لگی۔ مگر نوید نے اس پہ بھی ایسا ہی ردّعمل ظاہر کیا جیسا ماں کے

[illegible] کر دیا تھا۔ یعنی چند ناگوار شکنیں اور بس۔۔۔

"ہاں۔۔۔ یہ مظہر تو نہیں جو مجھے پہنچنے والے دکھ پہ پاگل ہو جائے اور دکھ پہنچانے والے پہ پل پڑے۔۔۔ میرے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کے کھڑا ہو جائے۔ نصرت اور شمیم کے زہریلے سے زہریلے فقرے بھی مجھ تک پہنچتے پہنچتے ردّی سے ہلکے ہو جاتے تھے۔ کیونکہ ان سے نمٹنے کے لیے مظہر جو تھا۔"

ایک بار پھر مظہر کے نہ ہونے کے احساس نے اس پہ حاوی ہونا چاہا۔ اس بار وہ اس خیال کو کسی ممنوعہ چیز کی طرح جھٹک نہ سکی۔

"لیکن جدھر انصاف نہ ہو' ادھر تو شمشاد بولے گی۔ چھپر پھاڑ کر بولے گی۔ اگر اس نے اپنی بیٹی' کے لیے انڈہ [illegible] کے لیے بھی ابالتی' اس کا زیادہ حق بنتا ہے۔"

نوید بےزاری سے آخری لقمہ کھاتے ہی اٹھ گیا۔

"یا اللہ۔۔۔ اتنی چھوٹی سوچ؟"

اس نے بےبسی سے سوچا اور وضاحت پیش کی۔

"وشمہ ابلا ہوا انڈہ نہیں کھاتی۔"

"تجھے زیادہ پتہ ہے؟ کھاتی ہے وہ۔۔۔ میں خود کھلاتی رہی ہوں۔" شمشاد سے اپنی بات رد کیے جانا برداشت نہ ہوا۔

"مگر میں نے کئی بار دیا' اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔"

"پیار سے دیتی ناں' مگر تو کیوں پیار سے دے گی؟ پیار تو سارا سگی کے لیے بچا رکھا ہے۔ سوتیلی کے پلّے کیا ہے؟"

نوید اب اپنی چابیاں اور والٹ اٹھا چکا تھا۔

"پیار سے کھلائے ماں۔۔۔ تو بچے سوکھی روٹی بھی کھا لیتے ہیں۔ تیرے ہاتھوں سے نہیں کھایا ہو گا اس نے۔۔۔ میں دیتی تو کھا لیتی۔"

اب نوید بغیر کسی کو سلام کیے گھر سے نکل رہا تھا۔

منزہ کو یہ کمزور سہارا بھی دور جاتے دیکھ کے اپنا آپ اکیلا پڑتا محسوس ہوا۔ پھر اس نے اکیلے ہی مزاحمت کا سوچا۔

"وہ میرے ہی ہاتھوں کا آملیٹ کھا لیتی ہے۔۔۔ اور بڑے شوق سے کھا لیتی ہے۔"

"جادوگرنی۔۔۔" شمشاد کو فوری طور پر کوئی جواب نہ سوجھا تو صرف یہ خطاب دے سکی۔

سوہا نے غصے سے گھور کر دیکھا تو کچن میں جاتی منزہ کی پشت کو کینہ توز نظروں سے گھورتی شمشاد کی شکل اسے عجیب سی لگی۔

وہ کہانیوں کی کتابوں میں چھپی چڑیل کی تصویر جیسی لگ رہی تھی۔ سوہا کو یہ سوچ کر ہی ہنسی آگئی۔

"ماما کو چڑیل کہہ رہی ہے اور خود ہنسل اور گریٹل کو پکڑ کر قید کرنے والی چڑیل جیسی ہے۔"

وہ یہ سوچ کر مزے لے رہی تھی اور شمشاد بڑبڑا رہی تھی۔

"زمانہ بھگت کے آئی ہے۔ چالاک کیوں نہ ہو گی۔۔۔ جوان جہان خصم کھا کے بیٹھی ہے۔ تگڑی تو ہو گی۔ خیر شمشاد نے بھی کم زمانہ نہیں بھگتا' تیرے جیسوں کو آگے لگانا بڑی اچھی طرح آتا ہے سارے کس بل نکال دوں گی۔"

پھر اس نے بیٹھے بیٹھے ہنستی سوہا کو گھورا۔

"تیرے کس بل نکالوں گی اور تیری چھوکری کے دانت۔۔۔"

سوہا نے سہم کر سر جھکا لیا۔

"چل ٹھونس یہ انڈا۔۔۔ بیٹھی کیوں ہے؟ باپ کا مال ہے اڑا۔"

شمشاد نے اس پہ بھڑاس نکالی۔

سوہا نے ڈرتے ڈرتے انڈا کھانا چاہا مگر وہ اس کے حلق میں پھنس کے رہ گیا۔ وہ ہمیشہ زیادہ دودھ والی چائے کے ساتھ ابلا انڈہ ناشتے میں لیتی تھی۔ سو اب چائے کے بغیر انڈا حلق سے نیچے اتر ہی نہیں رہا تھا اور چائے ابھی تک آئی نہیں تھی۔

"ماما۔۔۔" منہ میں رکھے انڈے کے ساتھ بے حد کمزور سی آواز کی ساتھ اس نے ماں کو پکارنا چاہا مگر یہ آواز اس کے اپنے کانوں تک بمشکل پہنچی۔

"ماما!" اس بار اس نے ذرا بلند آواز میں پکارا۔ وہ منزہ کو بلا رہی تھی۔ مگر اس کی خوفزدہ نگاہیں سامنے بیٹھی شمشاد پہ ٹکی تھیں۔

"ماما۔۔۔ماما۔۔۔"

اس بار ابھرنے والی یہ آواز بے حد واضح اور بلند تھی، مگر یہ آواز سوہا کی نہیں۔ وشمہ کی تھی۔

وہ جاگتے ہی منزہ کو پکارتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی۔

"دادی صدقے ادھر آسو ہنیے۔"

شمشاد نے اسے ساتھ لپٹانا چاہا مگر وہ مچل کے اس کی گرفت سے نکلی۔

"ماما پاس جانا ہے۔"

"جا مر پھر۔۔۔" شمشاد نے خفت سے دوچار ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا تو سوہا کو بے حد لطف آیا۔ وشمہ گرتے گرتے بچی تھی۔

اسی اثنا میں منزہ، سوہا کے لیے چائے لے کر کچن سے نکلی تو وشمہ کو بسورتے دیکھا۔

"ارے کیا ہوا وشمہ؟"

"تیری جان کو رو رہی ہے کب سے۔۔۔ آواز نہیں آئی تجھے؟ ہاں، آتی کیسے؟ سگی اولاد تھوڑا ہی ہے۔"

منزہ ساس کی بات نظرانداز کرتی وشمہ کو چپ کرانے لگی۔

"دادو نے گرایا ہے۔" اس نے روتے ہوئے بتایا تو منزہ نے حیرت سے دیکھا۔

شمشاد بیگم گڑبڑا گئی۔

"ہائے ہائے۔۔۔ میں کیوں گرانے لگی۔ توبہ ذرا سی چھوکری اور سگی دادی پہ الزام دھرتی ہے۔"

لفظ "سگی" تو جیسے اس کی زبان پہ دھرا رہتا تھا۔

"سب اس نئی آنے والی کی تربیت ہے۔ اس کی تربیت اور اس کی لڑکی کی صحبت۔۔۔ ورنہ چھوٹی سی بچی یہ چالاکیاں کیا جانے، ہائے نوید! تیری ہی اولاد تیری ماں کے خلاف کر دی اس عورت نے۔" وہ واویلا مچاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پروین کو بتاتی ہوں، اس کی ضد نے کیا رنگ دکھایا ہے۔ بڑا شوق تھا اسے نئی بھرجائی لانے کا۔ خود نمٹے اب آکر۔"

وہ پروین کو فون کرنے اٹھی اور منزہ کا دل گھبرانے لگا۔ پروین کے ساتھ گزشتہ دو چار ملاقاتیں خاص خوشگوار نہ تھیں۔ اب بھی اگر وہ ماں کے بلانے پہ آ جاتی تو۔۔۔

بجھے دل کے ساتھ وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

سوہا نے ناشتہ ختم کیا اور شمشاد کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ فون کان سے لگائے اونچی آواز میں پروین سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس نے گردن موڑ کے منزہ کو دیکھا جسے وشمہ نے مسلسل باتوں میں لگا رکھا تھا اور وہیں چھوٹی ٹیبل پہ پراٹھا سامنے رکھے بیٹھی تھی اور ضد کر رہی تھی کہ منزہ ہی ہر نوالہ اس کے منہ میں ڈالے۔ منزہ کام کے دوران اس کی یہ ضد بھی پوری کر رہی تھی۔

سوہا کو پتا تھا کہ عادت کے مطابق شمشاد جیسے ہی فون سے فارغ ہوگی پھر اس کی ماما کے سر پہ سوار ہو جائے گی اور ایسی ایسی باتیں کرے گی جن کو سن کر ماما کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے۔

وہ چپکے سے اٹھی اور شمشاد کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کو آہستگی سے پورا بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ اونچی آواز میں باتیں کرنے یا دوسرے الفاظ میں منزہ نامہ بیان کرنے میں مگن شمشاد کو قطعی پتہ نہ چلا۔

سوہا چپکے سے اپنی جگہ پہ آ کے بیٹھ گئی۔

"سوہا! بیٹا، وشمہ کا خیال رکھنا، میں دھلے کپڑے اوپر چھت پہ پھیلانے جا رہی ہوں۔"

چاول دم پہ لگا کے وہ دھلے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے اوپر چلی گئی۔ جو صبح ناشتے سے بھی پہلے دھو کر رکھے تھے۔ مگر چونکہ انہیں پھیلانے کے لیے تیسری منزل پہ جانا پڑتا تھا اس لیے وہ کچن کے کاموں سے فراغت کا انتظار کر رہی تھی۔

ٹھنڈی چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہی سوہا نے شمشاد کے کمرے کے دروازے کو ایک جھٹکا لگتے دیکھا۔ اور پھر زوردار طریقے سے ایک اور جھٹکا۔۔۔۔

"آؤ۔۔۔ کمرے میں چل کے کھیلیں۔"

سوہا نے وشمہ کی انگلی پکڑ کے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

اب دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا اور وشمہ اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے خود سے تین سال بڑی سوہا کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے ساتھ کھیلنے کو اس کا دل تو بہت چاہتا تھا مگر اس سے ڈر بھی بہت لگتا تھا۔ کیونکہ وہ نہ تو اسے پیار کرتی تھی نہ اس کے بلانے پہ اس کے کسی کھیل میں حصہ لیتی تھی۔

"دروازہ کھولو۔۔۔ کس مرجانے نے کنڈی لگائی ہے۔ کھولو دروازہ۔" اب اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وشمہ نے کمرے میں جاتے جاتے مڑ کے دیکھا۔

"دادو۔۔۔" اس نے کہنا چاہا مگر سوہا نے اسے اندر کھینچ کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

"لعنتیو۔۔۔ مر گئے ہو سارے کے سارے، مجھے اندر بند کر کے کون سا یار گھسا لیا ہے تو نے۔۔۔ او لوگو۔۔۔ دیکھو۔۔۔ نکالو مجھے یہاں سے۔"

وہ دہائیاں دیتی رہی، تیسری منزل کی چھت پہ موجود منزہ کو اس کی ہلکی ہلکی آواز تو آ رہی تھی مگر اس نے خاص توجہ اس لیے نہیں دی کہ شمشاد عام طور پہ اتنی ہی اونچی آواز میں باتیں کرتی تھی۔ اس نے سوچا، بچیاں مل کے کھیل رہی ہیں۔ ان کے شور سے تنگ آ کر بول رہی ہوگی۔ مگر جب اس کے ساتھ ساتھ دروازہ پیٹنے اور چیزیں گرنے کی آوازیں آنا بھی شروع ہو گئیں تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

"اللہ خیر۔۔۔ کہیں غصے سے پاگل تو نہیں ہو گئی۔"

اس نے یہ سوچا اور باقی کے کپڑے وہیں چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔

"کہیں سوہا کو تو نہیں پیٹنا شروع کر دیا۔"

ایک اور خیال نے اس کی رفتار مزید تیز کی مگر اس کے نیچے پہنچنے تک شمشاد کمرے کی چیزیں اٹھا اٹھا کے دروازے پہ مارنے کے ساتھ پروین اور نوید دونوں کو فون کر چکی تھی اور اپنے کمرے میں بند کیے جانے کا سانحہ رو رو کر سنا چکی تھی۔

منزہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ شمشاد کے کمرے کی جانب بڑھی اور دروازے پہ نظر پڑتے ہی جیسے پتھر کی مانند ساکت ہو گئی۔ اس نے ایک نظر سامنے والے کمرے پہ ڈالی جس کا دروازہ بھی بند تھا۔ اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے کنڈی کھولنے لگی۔ یہ جانتے ہوئے کہ دروازہ کھلتے ہی سیلاب کا رخ اس کی جانب ہو جائے گا اور کوئی عجب نہیں کہ دروازے پہ ماری جانے والی چیزوں کا ہدف اب وہ ہو۔

اس بار شاید کوئی بھاری چیز شمشاد نے اٹھا کر دروازے پہ ماری تھی۔ کوئی کرسی یا چھوٹی میز وغیرہ اور اگلے ہی لمحے منزہ نے دروازہ کھول دیا۔

بکھرے بالوں کے ساتھ ہانپتی کانپتی شمشاد بیگم اپنی لال آنکھوں سمیت اس کے سامنے تھی۔

"تیری یہ ہمت۔"

☼ ☼ ☼

"دیکھو اصغر! کتنے پیارے کپڑے ہیں۔ نرم و ملائم....."

وہ ننھی ننھی فراکوں اور پاجامہ سوٹس پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"رکھ دو انہیں ریناٰ! کیوں بار بار دکھی ہوتی ہو اور مجھے بھی کرتی ہو۔"

اصغر کو واقعی بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔

"سارے کہتے تھے کہ الٹراساؤنڈ کرالو..... پتہ چل جائے۔ لڑکا ہے یا لڑکی، پھر کپڑے وغیرہ خریدنا..... ایسے ہی پیسے ضائع کرو مگر میں نے بھی کہا..... بچے پہ پیسے خرچ ہوتے ہیں، ضائع نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس ہے پیسہ تو کیوں نہ لیں چیزیں۔ اور میں نہیں کرواتی الٹراساؤنڈ، کتنا مزہ آئے گا جب ڈاکٹر بتائے گا کہ مبارک ہو مسز بھٹی۔ آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ یا مبارک ہو، پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ ہے ناں اصغر..... سسپنس میں بھی کتنا مزہ ہے۔ ویسے اصغر! تمہیں بیٹا چاہیے کہ بیٹی؟"

جواب میں اصغر نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ پلکیں جھپک کے اپنے آنسو پینے لگی۔ پھر اگلے ہی لمحے خود پہ قابو پاتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں تو بھول ہی گئی..... وہ بیٹا تھا ہمارا..... ہاں..... پتہ چل تو گیا تھا..... مگر تب جب وہ نہ رہا..... مجھے ڈاکٹر نے بتایا تو یہ نہیں کہا کہ مبارک ہو آپ کو بیٹا ہوا ہے، بلکہ..... بلکہ یہ کہا کہ آپ کا بیٹا....."

اس کی آواز پھر کپکپا گئی۔

اصغر نے پہلی بار اسے اتنا ٹوٹا ہوا دیکھا تھا۔ اور اس سے دیکھا نہ جا رہا تھا۔ بہرحال اس نے رینا کو دل و جان سے چاہا تھا۔

"اچھا چھوڑو..... یہ بتاؤ....." اس نے پلکوں پہ آئے آنسو پھر پیچھے دھکیلے۔

"اب تمہیں بیٹا چاہیے یا بیٹی؟"

"اب.....؟" اصغر نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"ہاں اب..... دوبارہ..... اگلی بار....." وہ مسکرائی۔

"بتاؤ ناں، اس بار تمہیں بیٹا چاہیے یا بیٹی؟"

"چھوڑو یہ باتیں رینا۔ میرے لیے تم کافی ہو۔"

اصغر نے اس کے ہاتھ لبوں سے لگا لیے۔

"چل جھوٹے، کیا میں نہیں جانتی تمہیں بچے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ اپنے بھائی کی بیٹی سے کتنا پیار کرتے تھے۔ کیسے گود میں اٹھا کے چومتے چاٹتے رہتے تھے۔ اب بھی اکثر اسے یاد کرتے ہو۔"

"وہ تو..... بس بھائی کی اولاد جو ہوئی۔ اپنا خون....."

"تو پھر اپنی اولاد سے کتنا کرو گے..... میرا تو دل چاہتا ہے میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوں، ہر ایک کو بھائی بھی ملے اور بہن بھی۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئے تو ہماری تو بیٹے اور بیٹی دونوں کی خواہش پوری ہو جائے گی۔ مگر ہمارے اکلوتے بیٹے اور اکلوتی بیٹی کو....."

"رینا! کوئی اور بات کرتے ہیں۔ چلو گھومنے چلیں۔ یا پھر کافی دن سے تم نے مارکیٹ کا چکر نہیں لگایا۔ تمہیں شاپنگ کرالاتا ہوں، تمہیں۔"

"نہیں، بہت کر لی شاپنگ..... پچھلے تین چار مہینے تک میں نے پاگلوں کی طرح شاپنگ کرنے کے علاوہ اور کیا کیا ہے۔ بچے کے لیے سیٹ کرنے والا کمرہ میں نے اوپر تک بھر کے رکھ دیا۔ بے بی فرنیچر، کپڑے، کھلونے..... اصغر..... اصغر وہ سامان کب تک ایسا پڑا رہے گا؟"

آخر میں اس کے لہجے میں منت اتر آئی۔

"بس کچھ دیر اور..... ابھی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم بہت کمزور ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں اصغر....."

"ڈاکٹر کو زیادہ پتہ ہے یا تمہیں؟"

"پتہ ہے کیا اصغر! مجھے بچوں کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ نہ مجھے اچھے لگتے تھے۔ ان کو پیدا کرنے اور پالنے کے خیال سے ہی مجھے الجھن لگتے تھے۔ مگر اس ننھی جان نے میرے اندر چند مہینے رہ کے میری ممتا بھڑکا دی ہے۔ اب مجھ سے اور انتظار نہیں ہوتا۔ مجھے اس گود میں کوئی چاہیے۔" وہ رونے لگی۔

اصغر عجیب بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ان کپڑوں کو پہننے والا کب آئے گا۔ اس جھولے میں سونے والا کب آئے گا اصغر؟"

اس نے رینا کے سوال کے جواب میں کوئی جھوٹی تسلی دینے کی بھی ہمت نہ کی۔ بس اس کے ہاتھ سہلاتا رہا۔

"یہ دیکھو..... پنک فراک..... اور یہ بلیو سوٹ..... بیٹے کے لیے بھی سب کچھ تیار ہے اور بیٹی کے لیے بھی۔ میری طرف سے تیاری مکمل ہے۔ بس جو بھی آ جائے۔"

وہ پھر گود میں پڑے کپڑے سینے سے بھینچ کر خواب بننے لگی۔

اصغر نے نگاہیں چھت پہ جما دیں۔

اس بڑے سے گھر میں اس وقت وہ دونوں اکیلے تھے اور ساتھ والا کمرہ جو رینا نے بڑے ارمانوں سے اپنے آنے والے بچے کے لیے سجایا تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ اکیلا تھا۔ اپنے اندر بھرے قیمتی اور امپورٹڈ سامان کی بھرمار کے باوجود۔

رینا نے یہ گھر اپنی اولاد کے لیے ہی خالی کرایا تھا۔ اور آج..... آج وہ اس کی اولاد سے ہی خالی تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ ہے ہی فتنی..... اس کی شکل دیکھ ذرا..... نرا فساد لکھا ہے اس کے دیدوں میں۔"

شمشاد بیگم کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ سوہا پہ پل پڑے۔ اگر نوید سامنے نہ ہوتا تو اب تک وہ اس کے چیتھڑے اڑا چکی ہوتی۔ اس کے آنے سے پہلے وہ ایک آدھ کرارا ہاتھ جڑ بھی چکی تھی۔ مگر پھر منزہ نے اسے اسٹور میں بند کر دیا اور اکیلی ہی ساس کا سامنا کرتی رہی۔

سوہا کے گال پہ اب تک شمشاد کے بھاری ہاتھ کا نشان تھا۔ وہ منزہ کے پیچھے چھپی تھی۔ مارے دہشت کے اس کے منہ سے ایک سسکی تک نہ نکلی تھی۔

"اماں..... بچی ہی تو ہے..... شرارت میں آ کر....."

نوید نے دسویں بار ایک ہی بات کہنا چاہی اور شمشاد نے اس بار بھی پوری بات سننے سے انکار کر دیا۔

"بکواس نہ کر..... کیسی بچی..... شیطان کی بچی ہے یہ..... اس کی شکل پہ ہی لعنت برس رہی ہے۔ جوتیاں لگانے کو دل چاہتا ہے اس کے بوتھے پہ....."

منزہ کا دل چاہ رہا تھا وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے..... یا کم از کم سوہا کی سماعت ہی کچھ دیر کے لیے معطل ہو جائے۔

اس نے پچھلے چھ سالوں میں ایک بار بھی ایسے تلخ الفاظ اس تک نہ پہنچنے دیے تھے۔ اور اب ایک غیر عورت پتا نہیں کس حق سے مسلسل اس پہ پتھر برسا رہی تھی۔

منزہ نے کسی آس پہ نوید مراد کے چہرے کی جانب دیکھا جو خود بھی اس صورت حال سے ناخوش اور آزردہ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے واضح ناگواری جھلک رہی تھی۔ مگر دکھ کا ہلکا سا بھی شائبہ نہ تھا۔ ایسے دکھ کا خود سے وابستہ کسی عزیز ہستی کے بارے میں اتنا سب کچھ سننے اور دیکھنے کے بعد ہوتا ہے۔

اس نے خود میدان میں اترنے کا سوچا۔ شمشاد بیگم جیسی عورت کے منہ لگنا نہ اس کی فطرت تھا نہ اس میں اتنی ہمت تھی مگر اپنی اولاد کی خاطر اسے یہ کرنا ہی تھا۔ سوہا کے یخ بستہ ہاتھوں کی ڈری سہمی گرفت جو اسے پشت پہ محسوس ہو رہی تھی اُس جسارت پہ مجبور کرنے لگی۔

"اماں جی! وہ ابھی نا سمجھ ہے۔ بچی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر یا آپ کو تنگ کرنے کے لیے ایسا نہیں کیا۔"

"نہیں۔ اس نے تو مجھے مزے دینے کے لیے ایسا کیا ہے۔ میری جوتی پہ۔۔۔ اس کی تو۔۔۔"

وہ ناشائستہ کلمات پہ اتر آئی۔

"اس کی طرف سے میں معافی مانگ رہی ہوں آپ سے۔"

"تو کیا۔۔۔ یہ خود بھی ناک رگڑے تو میں معاف کرنے والی نہیں۔ شمشاد بیگم نے کبھی کسی کو معاف نہیں کیا۔ سانپ کی فطرت ہے میری۔"

بڑے فخر سے گویا اپنی "خوبی" کا اعلان کر رہی تھی۔

"بات ختم کرو اماں! مانگ تو لی ہے اس نے معافی۔۔۔ ایک چھوٹی سی بچی کی شرارت کو سر پہ سوار کر لیا ہے۔"

نوید بھی اس بار ذرا زیادہ بلند آواز میں بولا۔

"تو چپ کر۔۔۔ زن مرید۔۔۔ چھوٹی بچی، چھوٹی بچی لگا رکھا ہے۔ اپنی وشمہ بھی تو بچی ہے۔ اس فتنی سے بھی چھوٹی۔ اس نے تو کبھی نہیں ایسی پاگلوں والی شرارت کی۔ یہ بوہتی (بہت) لاڈلی بن رہی ہے۔ ساری ماں کی ہلا شیری ہے۔ یہ میسنی سکھاتی ہے اسے۔ صرف مجھے تنگ کرنے کے لیے کہ اچھا ہے بڈھی کلپ کلپ کے مرجائے۔"

وہ غصے سے بے حال ہو رہی تھی۔ زیادہ غصہ اس بات پہ تھا کہ نوید بجائے ماں کی دلداری کرنے کے بیوی کی شکل دیکھ رہا تھا۔

سوہا جو منزہ کے پیچھے چھپی کھڑی تھی اور جھانک جھانک کے اسے چلاتے دیکھ رہی تھی، اچانک اس کا ڈر کم ہونے لگا۔ اسے اب شمشاد کی حالت دیکھ کر مزہ آ رہا تھا۔

کتنا اچھا لگ رہا تھا، اس کی ماما کو ستانے والی، انہیں رلانے والی، اب خود رو رہی تھی۔ اسے خود پہ فخر سا محسوس ہوا۔

"دیکھا ماما۔۔۔ کیسا مزہ چکھایا اس بوڑھی جادوگرنی جیسی آنٹی کو۔ ذرا اب ڈانٹے آپ کو۔"

اس نے چپکے سے سوچا اور بے ساختہ مسکرا دی۔

شومئی قسمت کہ اس کی یہ مسکراہٹ شمشاد بیگم کی نظروں میں آ گئی۔ وہ اور بھی بھڑک اٹھی۔

"دیکھا۔۔۔ دیکھا اسے؟ کیسے دندیاں (دانت) نکال رہی ہے۔ میں نہ کہتی تھی یہ ہے ہی شیطان کی اولاد۔ فساد بھرا ہے اس کے اندر۔ میرے گھر سیاپا ڈال کے چسکے لے رہی ہے۔"

نوید نے مڑ کے دیکھا، تب تک سوہا کی مسکراہٹ سہم کر ختم ہو چکی تھی

"منزہ! اسے اندر لے جاؤ۔"

نوید کو اس سے بہتر حل کوئی نظر نہ آیا ماں کو چپ کرانے کا۔

"ہاں ہاں لے جاؤ اندر۔۔۔ ورنہ میں چیر پھاڑ کے کھا جاؤں گی۔ میں کہتی ہوں اسے اندر لے جا رہی ہو تو باہر مت لانا۔۔۔ میرے سامنے مت لانا اسے۔ مجھے شکل نظر نہ آئے اس کمینی کی۔"

وہ دیر تک چلاتی رہی اور کمرے کے اندر سوہا کو سینے سے بھینچے منزہ روتی رہی۔

"ماما۔۔۔!" وشمہ نے اپنے ننھے ہاتھ اس کے گالوں پہ رکھے۔

"ماما تُوں (کیوں) رو رہی ہو؟"

اور پھر کوئی جواب نہ ملنے پہ خود ہی کہا۔

"دادو نے مارا ہے؟"

"ہاں، تمہاری دادو نے۔۔۔ تم بھی گندی، تمہاری دادو بھی گندی۔" ماں کی گود میں چھپی بیٹھی سوہا نے دونوں ہاتھوں سے اسے زور کا دھکا دے کر کہا۔

وہ پیچھے کی جانب گر گئی۔ اس کا سر ڈریسنگ ٹیبل سے جا لگا۔

"سوہا!" منزہ نے اسے غصے سے گود سے اتار پھینکا اور اونچی آواز میں روتی وشمہ کو لپک کے اٹھا لیا اور پیار کرتے ہوئے چپ کرانے لگی۔

"ابھی تو ایک مسئلہ ختم نہیں ہوا اور یہ۔۔۔ سوہا۔۔۔ کیوں کرنے لگی ہو تم ایسا؟ میری جان تم۔۔۔"

"کیا ہوا وشمہ کو؟"

نوید مراد کی آواز پہ منزہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ماں کو بند کرنے والی حرکت تو وہ پی گیا تھا مگر اپنی بیٹی کو گرائے جانا شاید برداشت نہ کر سکے۔

"وشمہ۔۔۔ میرا پیارا بیٹا! ماں کی جان، پاپا کو یہ نہیں بتانا کہ آپا نے گرایا ہے۔ ماما، وشمہ کو چاکلیٹ دیں گی۔"

اسے امید تو نہیں تھی کہ ایک ساڑھے تین سال کی بچی اس التجا پہ کان بھی دھرے گی۔ مگر اس نے نجانے کس آس پہ منت کی تھی۔

"کیوں رو رہی ہے وشمہ؟"

نوید بے تابی سے اندر آیا۔

سوہا غیر ارادی طور پہ ٹانگیں سمیٹ کر بیڈ کے کونے سے جا لگی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ منزہ نے اس کا رنگ خوف سے اڑتے دیکھا تو اس کا دل چاہا اس گھر پہ لعنت بھیج کر اسے لے کر یہاں سے نکل جائے۔

"گر گئی تھی؟"

وہ بیٹی کو پیار کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور منزہ کو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ اگر ہاں میں جواب دیتی اور وشمہ سچ اگل دیتی تو کیا عزت رہ جاتی اس کی شوہر کے سامنے۔۔۔ فوراً "جھوٹی" ثابت ہو جاتی۔ اور اگر سچ بتا دیتی تو۔۔۔"

"بتاتی کیوں نہیں ہو؟ کیا لگا ہے اس کے سر میں؟"

وہ جھلا گیا۔ وشمہ سر پہ ہاتھ رکھ کے رو رہی تھی۔ اس لیے اب وہ اس کے سر کی پشت کو سہلاتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"ڈریسنگ ٹیبل کا کونا۔۔۔"

اس سوال کا جواب اس نے محتاط الفاظ میں دے دیا۔

"اوہو دیکھنا تھا کہ خون وغیرہ نہ نکل آیا ہو۔"

وہ بیٹھ گیا اور گود میں اسے الٹا لٹا کر بال ہٹا کے چیک کرنے لگا۔ منزہ آگے بڑھی اور اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہا۔

"نہیں۔۔۔ شکر ہے زیادہ چوٹ نہیں لگی۔"

"بیٹا! آرام سے کھیلا کرو۔ زیادہ بھاگتے نہیں ہیں میری جان۔" وہ اس کا گال چومتے ہوئے محبت سے کہہ رہا تھا اور منزہ کا دل حلق میں آ رہا تھا کہ وشمہ نجانے اب کیا کہہ دے۔

مگر وہ اپنے آنسو ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے معصومیت سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "او کے پاپا۔"

منزہ نے ایک سکون بھرا سانس لیا اور وشمہ کو نوید کی گود سے لے کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ چٹاچٹ اس کے دونوں گال چومتے ہوئے آج شاید سچے دل سے اس سے محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ اس محبت کا جو ایک ماں کو اپنی

اولاد سے ہو سکتی ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ سوہا کو دیکھنا بھول گئی جس کا رنگ پہلے سے زیادہ سفید ہو چکا تھا۔

"سنیے۔" رات سر پہ آن پہنچی تو اسے ایک نئی فکر نے گھیرا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج..." وہ کہتے کہتے جھجک گئی۔

"کچھ چاہیے؟" نوید نے سوال کیا۔

"نہیں، وہ میں کہہ رہی تھی کہ بچیاں روز اماں کے پاس سوتی ہیں۔ مگر آج اماں... میرا مطلب ہے اماں کی آج ٹھیک نہیں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم آج... صرف آج رات سوہا کو وہاں نہ سلائیں؟"

نوید چند سیکنڈ تک سوچتا رہا۔

"ٹھیک ہے، مگر کیا وہ اکیلی سو لے گی؟"

اس سوال نے منزہ کو اور کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ کرنے دی۔ وہ اپنی ڈبڈبائی آنکھیں جھکا کر اٹھ گئی اور الماری کھول کے نوید کے صبح کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔

وہ کچھ دیر تک سوچتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"منزہ! میں جانتا ہوں۔ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اس نے تڑپ کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

یہ نظریں صرف سوال نہیں کر رہی تھیں، کچھ جتا بھی رہی تھیں... اس کا پہلی ہی رات وشمہ کو اپنے اور نوید کے درمیان سلانا۔

اور اس کے علاوہ بھی ان ڈیڑھ ماہ میں وشمہ ضد کر کے اور کبھی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کئی بار ان کے کمرے میں سو چکی تھی۔

"مجھے سوہا کو یہاں سلانے پہ اعتراض نہیں مگر اماں کو ایک اور وجہ مل جائے گی جھگڑے کی۔ ایسا کر کے ہم ان کا غصہ ہی بڑھا سکتے ہیں۔ کیا فائدہ؟" اس نے وضاحت دی۔

"مگر... مگر میں اسے آج ان کے کمرے میں چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ انہیں سوہا پہ بہت غصہ ہے۔ کہیں وہ..."

پھر وہ چپ ہو گئی۔ کیسے اسے کہتی کہ مجھے تمہاری ماں پہ ذرا بھی اعتبار نہیں اور شاید وہ اپنی ماں کو اس سے زیادہ جانتا تھا اس لیے کچھ نہ بولا۔

"پلیز... بس ایک رات..."

اس کی خاموشی نے منزہ کو منت کرنے پہ مجبور کیا۔

"بات ایک رات کی نہیں ہے۔" وہ زچ ہو گیا۔

"پھر وشمہ بھی ضد کرے گی۔"

"تو وہ بھی سو جائے پہلے بھی تو اکثر سوتی رہی ہے۔"

"یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ تم ایسا کرو آج سوہا کو اسٹور روم میں سلا دو۔"

"اسٹور روم میں؟" اسے دھچکا لگا۔

"اس گھر میں اور بھی کئی کمرے ہیں، مگر فی الحال ان میں اکیلی بچی کے سونے کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ پروین کے لیے مخصوص کمرہ یہاں سے تھوڑا دور ہے ورنہ وہاں ہر سہولت موجود ہے، وہ وہاں سو جاتی۔ اسٹور روم ہمارے کمرے کے بالکل ساتھ ہے۔ تمہیں تسلی رہے گی۔"

"مگر سوہا کبھی اکیلی نہیں سوئی۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"عادت ڈالو۔" نوید نے نظریں چرا لیں اور تکیہ درست کر کے سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"مگر سوہا...؟" وہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہی مگر وہ کروٹ بدل کے لیٹ چکا تھا۔

"بچیوں کو چھوڑ کے آنے کے بعد لائٹ جلدی آف کر دینا، میرے سر میں درد ہے۔"

اس نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے یہ باور کرا دیا کہ اب وہ کچھ اور کہنے سننے کے موڈ میں نہیں۔

سوہا اور وشمہ ذرا فاصلے پہ کارپٹ پر بیٹھی کھیل رہی تھیں۔ بلکہ کھیل تو صرف وشمہ رہی تھی۔ سوہا اپنی اداس نظروں سے ماں کو تک رہی تھی۔ اس نے ان دونوں کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ وہ آہستگی سے اٹھ کے ماں کے پاس آئی۔

"ماما...! میں اکیلی سو سکتی ہوں۔"

"سوہا...!" وہ اسے دیکھ کے رہ گئی۔ آج وہ اسے یکدم بڑی بڑی سی لگنے لگی تھی۔

"مگر میں اس کمرے میں نہیں سوؤں گی۔ مجھے اکیلے میں ڈر نہیں لگے گا۔ وہاں لگے گا۔ آنٹی بہت زور سے مارتی ہیں۔"

"میری بچی!" منزہ نے بھیگے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ماتھے پہ لب رکھ دیے۔

"ماما! مجھے بھی..." وشمہ نے سوہا پہ جو پیار امڈتے دیکھا تو اپنا حصہ وصولنے آ گئی۔

"کیوں نہیں، یہ تو میری پیاری سی گڑیا ہے۔" اس نے وشمہ کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگی۔

"آؤ! آپا کو سلا کر آتے ہیں۔ پھر دادو کے کمرے میں چلیں گے۔"

"آپا دادو کے پاس نہیں سوئیں گی؟" کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے سوال کیا۔

ان کے جانے کے بعد نوید مراد نے آہستہ سے کروٹ بدلی اور چھت پہ نظریں جما کے کچھ سوچنے لگا۔

اگلے ہی دن اس نے سامنے والا کمرہ جو فالتو سامان سے بھرا ہوا تھا اور جس میں اکثر شمشاد بیگم کے گاؤں سے آنے والے غریب رشتے دار ٹھہرا کرتے تھے، صاف کروا دیا۔ اور ایک ہی ہفتے میں وہ کھلا سا ہوا دار کمرہ دونوں بچیوں کے لیے سیٹ ہو گیا۔

٭ ٭ ٭

شوکت جہاں بہوؤں کے ساتھ مل کے اچار کا مسالا لیموں اور ہری مرچوں پہ لگا رہی تھیں۔

"رخشندہ! تمہاری چھوٹی بہنوں کے رشتے کی کہیں بات چلی؟" انہوں نے بڑی بہو سے پوچھا۔

"رشتے تو بہت آتے ہیں اماں جان۔" رخشندہ کے لہجے میں فخر سمٹ آیا۔ "ایک دن میں دو دو آ جاتے ہیں... نجانے کہاں سے لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ اس گھر میں تین تین خوبصورت لڑکیاں ہیں۔"

"تو کسی ایک کی ذمہ داری سے سبکدوش کیوں نہیں ہو جاتے تمہارے بھلے والدین۔" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

رخشندہ کی شادی کو دس گیارہ سال ہو رہے تھے۔ اس سے چھوٹے پانچ بہن بھائی تھے۔ دو بھائی اور پھر لائن سے تین بہنیں۔ بھائی تو ان گیارہ سالوں میں گھر بار والے ہو چکے تھے مگر بہنیں اب تک بیٹھی تھیں۔ سب سے بڑی والی کی عمر ہو گی کوئی ستائیس اٹھائیس سال، اور پھر ایک چوبیس پچیس سال کی اور سب سے چھوٹی تقریباً بائیس برس کی۔ اس میں تو مبالغہ والی کوئی بات نہ تھی کہ حسن و خوبصورتی میں تینوں ایک سے بڑھ کے ایک تھیں اور ذہین اور اعلا تعلیم یافتہ۔

بڑی والی کسی کالج میں لیکچرر تھی۔ چھوٹی میڈیکل ریپ اور سب سے چھوٹی ایم بی اے کر رہی تھی۔

"رشتے بھی تو ڈھنگ کے آئیں۔"

"تو کیا دن میں دو دو آنے والے رشتے، سارے کے سارے ہی بے ڈھنگے ہوتے ہیں؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"یونہی سمجھ لیں۔ کسی میں ایک بات اچھی تو تین باتیں بری۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً تہمینہ کے لیے ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا... پروفیشن دونوں کا ملتا جلتا ہے۔ لڑکا شکل و صورت کا بھی اچھا تھا۔ عمر کا فرق بھی زیادہ نہیں تھا مگر فیملی بیک گراؤنڈ اچھا نہیں تھا۔

"ذات کے کتر تھے؟"

"نہیں خیر تھے تو راجپوت... مگر دیہاتی بیک گراؤنڈ تھا۔ بہت پینڈو سے لوگ تھے۔ صرف لڑکا ہی پڑھا لکھا تھا باقی سب انگوٹھا چھاپ، رہن سہن بھی گیا گزرا تھا۔ اسی طرح ایک بار اچھی فیملی کا رشتہ آیا۔ پڑھے لکھے ویسٹرن لوگ تھے۔ مگر لڑکا... توبہ کچھ تو دیکھنے لائق صورت شکل ہو۔ ٹھیک ہے کہ مرد کی شکل نہیں، ہنر دیکھا جاتا ہے پر ایسا بھی نہ ہو کہ دیو لگے۔"

"اور کہیں خاندان بڑا ہوتا ہوگا... نندیں چھ اور دیور چار..." پروین نے ہنس کے طنز کیا۔

"خیر... جو بھی ہے... بیٹیاں ماں باپ سوچ سمجھ کے ہی پرائے ہاتھوں میں دیتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی زیادہ چھان پھٹک بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ میری مانو... تو ہر لحاظ سے بہترین کا انتظار کرنے کے بجائے مناسب پہ گزارا کرلو۔"

"اماں جی! جب میری بہنیں ہر لحاظ سے بہترین ہیں تو رشتہ صرف مناسب اور گزارے والا کیوں ہو؟" رخشندہ نے تنک کر کہا تو پروین نے ہاتھ روک کر ایک نظر ساس کو دیکھا۔

"ان کا جوڑ بھی ہم بہتر سے بہترین ہی ڈھونڈیں گے۔"

"ان شاء اللہ... میری تو دعا ہے سب بچیاں اچھے وقت میں اپنے گھر کی ہو جائیں۔" انہوں نے صدق دل سے کہا اور پھر پروین کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"تم کہو، کیسی رہی تمہاری نئی بھابھی؟ اچھی تو نبھ رہی ہے میاں بیوی میں؟"

"اللہ جانے اماں جی! مہینے بھر بعد جانا ہوتا ہے اور وہ بھی گھڑی دو گھڑی کے لیے۔ شادی کو تین چار ماہ ہوئے ہیں اور شاید اتنی ہی بار میرا وہاں جانا ہوا ہے۔"

"چلو... بچی کی جانب سے تو بے فکری ہوئی تمہیں۔"

"ہاں... کچھ کچھ..."

"کیوں؟ قبول نہیں کیا اس نے تمہاری بھتیجی کو؟" رخشندہ بولی۔

"کیا پتہ... دراصل وہ عجیب خشک مزاج عورت ہے۔ میں نے اسے کبھی بھائی جان سے بھی کھل کے ہنستے بولتے نہیں دیکھا۔ اماں سے تو برائے نام ہی مخاطب ہوتی ہے۔ مجھ سے بھی بس تکلفاً کلام کرتی ہے۔ میں نے سوچا تھا بھائی جان کا گھر دوبارہ بس جائے گا تو رونق ہو جائے گی میرے میکے میں۔ مگر وہ عجیب لاش نما عورت ہے۔ نہ ہنسنا نہ بولنا... نہ سجنا... نہ سنورنا..." وہ اداسی سے بتا رہی تھی۔

"تمہاری پہلی بھابھی ساجدہ تو بہت ہنس مکھ تھی۔ ہے ناں... اب تک یاد ہے مجھے۔ مسکراہٹ ہر وقت اس کے ہونٹوں پہ ہوتی تھی۔"

"ہاں... بھائی جان کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ میں نے بس تب تک ہی دیکھی تھی۔ یہ تو..." اس نے سر جھٹکا۔

"عورت کو دوسری بار گھر بسانے میں ذرا وقت لگتا ہے پروین! دل مارنا پڑتا ہے۔ اسے ذرا وقت دو۔" شوکت جہاں نے نصیحت کی۔

"اتنا وقت شاید نہ لگتا اسے پچھلا بھلانے میں، مگر وہ پچھلا ساتھ جو اٹھا لائی ہے۔ اس کی بیٹی اسے نئی زندگی شروع کرنے نہیں دے رہی۔"

"تو کیا کرتی غریب... کہاں چھوڑتی یتیم بچی کو۔ ماں جو ہوئی۔"

"ماں ہے... میں مانتی ہوں، ہم لوگوں نے بھی کبھی نہیں چاہا تھا کہ اسے اس کی اولاد سے دور کریں۔ خاص طور پر نوید بھائی جان نے تو پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ یہ ظلم نہیں کریں گے مگر میری خود اس کے میکے والوں سے یہ بات ہوئی تھی کہ صرف دو مہینے وہ بچی کو رکھ لیں تاکہ میاں بیوی کو اکیلے کچھ وقت مل سکے، ایک دوسرے کو سمجھنے کا۔ مگر انہوں نے ہمارا ذرا اعتبار نہ کیا۔ دوسرے ہی دن لڑکی ہمارے سر منڈھ دی۔ شاید ڈر گئے تھے کہ دو مہینے لیے ہی نہ ہو جائیں۔ ساری عمر ہی نہ سنبھالنا پڑ جائے۔ حالانکہ ہم نے زبان دی تھی مگر... اور اماں جان! خود سوچیں جس بچی کو اس کے ماموں، مامی دو دن نہ رکھ سکے، وہ کتنی آفت ہوگی۔ ناک میں دم کرکے رکھ دیا ہے اس نے میری ماں کا۔ جب جاتی ہوں وہ اس کا نئے سے نیا کارنامہ سناتی ہیں۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔" شوکت جہاں کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا مگر انہوں نے فقط اتنا کہنے پہ اکتفا کیا۔

☼ ☼ ☼

مدیحہ تقدیس کے بالوں میں تیل لگانے کے بعد اب کس کے دو چوٹیاں بنا رہی تھی۔

"یہ تم کیا بنا دیتی ہو بچیوں کو؟" جعفر محمود نے ناگواری جتائی۔

"کیوں؟ کیا کیا ہے میں نے؟"

"اب وہ تیل سے چپچپاتی انگلیاں اپنے بالوں پہ پھیر کر صاف کر رہی تھی۔

"اتنے بڑے اسکول میں جاتی ہیں۔ تم تیل میں ڈبو کے انہیں کارٹون بنا دیتی ہو۔ سب مذاق اڑاتے ہوں گے وہاں۔"

"تیل لگانے میں مذاق اڑانے والی بات کون سی ہے۔ اگر اتنے بڑے اسکول کی لڑکیاں اتنی ہی بدتمیز ہیں تو کیا ضرورت ہے وہاں انہیں پڑھانے کی۔"

"ماما! ٹیچر نے بھی منع کیا ہے کہ تیل کے ساتھ اسکول نہ آیا کریں۔" تقدیس موقع پا کر جلدی سے بولی۔

"کیوں؟ اس پہ بھی فیس لگتی ہے کیا؟" مدیحہ نے تنک کر کہا۔

"ہر چیز کی فیس بٹورتے ہیں یہ اسکول والے... پڑھانے کی فیس، کھیل کی فیس، امتحان کی فیس، لائبریری کی فیس، پکنک کی فیس... ان سے کہو تیل کی فیس بھی لے لیا کریں، مگر نئی پابندیاں نہ لگایا کریں۔"

"کیا جاہلوں والی باتیں کر رہی ہو۔" جعفر کا مارے کوفت کے جی برا ہو گیا۔

"وہ پرانا اسکول کتنا اچھا تھا۔ نہ ایسی فضول روک ٹوک نہ ہی یہ بے کار کے چونچلے۔"

"مدیحہ... نکل آؤ باہر... نکل آؤ اب اس حویلی سے اور اس گاؤں کی آب ہوا سے۔ اسلام آباد جیسے شہر میں رہتی ہو تم... جس طرح مہنگے درزیوں اور اونچے بیوٹی پارلرز کے چکر لگا لگا کر تم نے خود کو ایک ہی سال میں پالش کیا ہے ناں ایسے ہی اپنی سوچ کے رنگ بھی اتار لو، خود کو صرف باہر سے ہی نہیں بلکہ اندر سے بدلو۔"

"میں گرگٹ نہیں ہوں جو رنگ بدلوں۔" مدیحہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جعفر جز بز ہوتا کمرے سے نکل گیا۔

"یہ مرد ہی ہوتے ہیں جن کو بدلنے کی بیماری ہوتی ہے۔ کبھی ان کے خیالات بدلتے ہیں، کبھی معیار۔ کبھی پسند تو کبھی بیٹھے بٹھائے ان کے اصول بدل جاتے ہیں۔"

وہ بڑبڑاتی رہی اور تقدیس ان الفاظ کے مطالب سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

اسٹور روم میں گزاری وہ رات اس کی زندگی کی پہلی رات تھی جو اس نے اکیلے گزاری۔ پہلی تنہا رات۔

ڈیڈی کی شادی والی رات بھی اس پہ بہت مشکل گزری تھی۔ مگر وہ رات تنہا نہیں تھی۔ اس رات بھی وہ روز ہی تھی۔ چلا رہی تھی۔ مگر اس کے آس پاس ایک ہجوم تھا۔ بہت سے آشنا اور مہربان چہروں کا۔

آج وہ بالکل اکیلی تھی۔ وہ رو ضرور رہی تھی مگر چلا نہیں رہی تھی۔

اسٹور روم میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو اس کی طرح بے کار اور فالتو تھیں۔ زائد بستر۔ ایک پرانی کچھ ناقابل استعمال بھاری برتن' پرانے صندوق اور جستی پیٹیاں' ایک جانب ایک تخت پڑا تھا جس پہ گدا بچھا کے اس کے سونے کی جگہ بنائی تھی۔

وہ کتنی ہی دیر تک اس کے پاس بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ اسے پیار سے تھپکتی رہی۔ تک کہ سوہا کی پلکیں بوجھل ہو کر بند نہ ہو گئیں۔ اسے سوتا جان کے منزہ نے اس کے ماتھے سے بال ہٹاتے ایک محبت بھرا بوسہ دیا جو آنسوؤں کی آمیزش سے نمکین ہو رہا تھا۔ پھر آہستگی سے اٹھ کر اسٹور روم سے باہر آئی۔

اس کے نکلتے ہی سوہا نے اپنی آنکھیں فوراً کھول دیں۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔

"ماما! مت جاؤ... ماما مجھے یہاں مت چھوڑو... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

مگر کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز گلے میں ہی گھٹ کے رہ گئی۔ اس نے ماں سے یہ کہہ تو دیا تھا کہ وہ بڑی ہے اور اسے اکیلے میں سوتے ڈر نہیں لگتا۔ مگر اب اس پہ عمل کر کے دکھانا مشکل لگ رہا تھا۔

اسٹور روم میں پھیلی سیلی' سیلی سی بو اسے کھل کر سانس نہ لینے دے رہی تھی۔ یہاں سردی بھی بہت تھی۔ ٹیوب لائٹ کے بجائے ایک پیلے سے بلب کی روشنی تھی جو ماحول کو اور خوفناک اور پراسرار بنا رہی تھی۔ سوہا کا حلق خشک ہونے لگا۔ منزہ اس کے نزدیک پانی کا جگ اور گلاس رکھ گئی تھی مگر کمبل سے ہاتھ نکال کر تک بڑھانے میں اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایسا کرے گی تو کہیں سے دو ہیبت ناک ہوئے بازو آئیں گے اور ان کے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھ اسے دبوچ لیں گے۔

اس نے کمبل منہ تک تان لیا۔

"نہیں... کوئی نہیں ہے یہاں... ماما کہتی ہیں جن بھوت نہیں ہوتے۔ وہ صرف کہانیوں میں اور ڈراموں میں ہوتے ہیں۔ اصل میں نہیں ہوتے۔ یہاں بھی نہیں ہوں گے۔ مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔ میں یہیں سوؤں گی۔ یہاں نہیں سوؤں گی تو گندی آنٹی کے پاس جانا پڑے گا۔ وہ جن سے زیادہ گندی ہے۔ وہ ضرور مجھے کھا جائے گی۔ اس کے دانت بھی چڑیلوں والے ہیں اور پیٹ بھی بھوت جیسا بڑا سا ہے۔ وہ مجھے پورا کا پورا کھا لے گی۔ میں اس کے کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ ماما کے کمرے میں بھی نہیں سو سکتی۔ ماما بے چاری کے پاس کوئی کمرہ ہے ہی نہیں۔ وہ تو اس انکل کے کمرے میں رہتی ہیں اور انکل مجھے نہیں سلائیں گے اپنے پاس۔ وہ صرف ماما کو اپنے ساتھ سلاتے ہیں' یا اس وشمہ کی بچی کو۔ اس سے اچھا ہے میں یہیں سو جاؤں۔ یہاں کوئی ڈانٹنے والا نہیں۔ کوئی غصے سے دیکھنے والا نہیں۔ میں یہیں سوؤں گی۔ مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔"

وہ اپنے خوف پہ قابو پانے کی کوشش کرتی رہی مگر دہشت اس پہ غلبہ پاتی رہی۔ اس کی تمام تر مزاحمت کے باوجود۔

صبح منزہ اس کے پاس آئی تو وہ تیز بخار میں جھلستی بے سدھ پڑی تھی۔

□ □ □ □

"مرد کی ذات ہوتی ہی بڑی... ہے۔"

مہتاب نے اپنا خود ساختہ اور پسندیدہ ترین قول ایک بار پھر دہرایا اور مدیحہ نے خائف ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ مہتاب آپا بھی نا... ہر طرح کی زبان ہر ایک کے سامنے استعمال کر لیتی ہیں۔ نہ چھوٹا دیکھتی ہیں نہ بڑا۔" اس نے کڑھ کے سوچا۔

"چھوڑیں آپا! جانے بھی دیں یہ باتیں۔"

اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی جو ظاہر ہے' ناکام رہی۔ مہتاب اپنے دل پسند موضوع سے ایک انچ ہٹنے کی روادار نہیں تھی۔

"کس لیے چھوڑوں؟ میرے تو کلیجے میں آگ لگی ہے آگ۔"

"اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ جانے دیں... کیا فائدہ اپنا دل جلانے کا۔"

"دل تو کب کا جل چکا مدیحہ... راکھ ہو چکا۔" وہ دوپٹہ آنکھوں پہ رکھ کے سسکنے لگی۔

"میرا درد تم کیا جانو... اور اللہ کرے کبھی بھی نہ جانو۔ جو مجھ پہ گزرتی ہے وہ تو بس میں ہی..." سسکیاں زور پکڑ گئیں اور مدیحہ کی کوفت سوا ہو گئی۔ بچیاں کبھی ٹی وی اور کھلونوں سے دھیان ہٹا کے اسے دیکھنے لگیں۔

"ہر مرد جعفر جیسا ستھرے کردار کا نہیں ہوتا۔" مہتاب کے بیان نے جیسے مدیحہ کی دم پہ پیر رکھ دیا۔ وہ بلبلا اٹھی۔

"رہنے دیں آپا! مرد سارے ایک سے ہوتے ہیں۔"

"ایک سے ہوتے تو سب عورتوں کی قسمت بھی ایک سی ہوتی۔ سب میری طرح اجڑ کے نہ بیٹھی ہوتیں۔"

"ضروری نہیں آپا... جو نظر آئے وہی درست ہو۔ کتنی ہی ایسی عورتیں ہیں جو اولاد اور گھر کے لیے... تو کبھی میکے کا مان یا اپنا بھرم رکھنے کے لیے' اندر سے اجڑ جانے کے باوجود بظاہر سے سہاگنوں والی لیپا پوتی کر کے رکھتی ہیں۔"

"میں کون سا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی؟ کیا میرے بچے نہیں ہیں؟ میرا میکہ نہیں ہے؟ مجھے اپنی گھرہستی عزیز نہیں ہے؟ میرا کوئی بھرم یا عزت نہیں ہے؟ میں بھی ان سب کے لیے سمجھوتہ کرنے پہ تیار تھی مگر وہ موقع تو دیتا۔ اسے تو بس اپنا گھر' اپنا دل اور اپنی زندگی سب کچھ میرے وجود سے خالی چاہیے تھا۔ بچے بھی رکھ لیے اور نکال باہر کیا مجھے... صرف اس... کے لیے اپنا خصم ڈکار کے دوسروں کے ہضم کرنے بیٹھی ہے... بغیر مرد کے عورت بڑی... شے بن کے رہ جاتی ہے... حریص اور کمینی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپا!" ایک تو ان کی گالیوں اور کوسنوں سے مرصع زبان... اور اس پہ یہ زریں خیالات...

اب اسے خود اپنے اس فیصلے پہ افسوس ہو رہا تھا جب اس نے بے جی کی زبانی مہتاب کے اجڑ کے میکے آ بیٹھنے کی خبر سننے کے بعد کیا تھا۔

"جعفر میں چاہتی ہوں کہ مہتاب آپا کچھ دن ہمارے ہاں آ کر رہ لیں... بے چاری کا دل بہل جائے گا۔"

"مہتاب آپا۔" وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

قریبی رشتے داری ہونے کے باوجود وہ اتنا قریب سے کسی بھی رشتے دار کو نہیں جانتا تھا مگر یہ اندازہ بہرحال تھا کہ اس قسم کی آپائیں چاہے ان کے خاندان سے ہوں یا مدیحہ کے میکے سے... کیسی ناقابل برداشت حد تک جاہل ہیں۔

"اس کا دل تو بہل جائے گا' مگر خوامخواہ گھر کا ماحول خراب ہو گا۔"

"ماحول خراب ہو گا؟" مدیحہ کو واقعی یہ بات بری طرح چبھی۔

"وہ صرف میری چچازاد بہن نہیں ہیں۔ آپ کی بھی کچھ لگتی ہیں۔ اپنے ہی خاندان کی کسی عورت کے بارے میں ایسی بات کرنا کیا درست ہے؟"

"تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو گی اپنی چچازاد اور میری ماموں زاد بہنوں کو... اگر انہیں یہاں لا کر موضع دھناں میں بسانا تھا تو مجھے اسلام آباد سیٹل ہونے کی کیا ضرورت تھی... بے کار کی چخ چخ اور رونا پیٹنا ڈال دے گی یہاں آ کر اور پھر اس کے پیچھے پیچھے اس کے "لواحقین" ہر دوسرے دن ادھر پہنچے ہوں گے۔"

"چچ چچ جعفر...!" مدیحہ نے تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"اللہ پاک نے اتنا کھلا رزق دے رکھا ہے پھر بھی دل کتنا تنگ ہے۔ چار دن کسی کو روٹی کھلانے سے ہمیں کون سی کمی ہو گی... الٹا برکت ہی ہو گی۔ جب سے یہاں آئے ہیں۔ مہمان کوئی پھٹکتا ہی نہیں ہے۔ عجیب بے برکتا شہر ہے۔"

انداز سراسر شرم دلانے والا تھا۔ شرم تو جعفر محمود کو کیا آتی، طیش ضرور آ گیا۔

"تم سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے چودھرائن مدیحہ! سکنہ موضوع دھناں ضلع قصور..... تم اس سے بات کر ہی نہیں سکتیں۔ بات صرف چار دن کی روٹی کی نہیں ہے، ذہنی سکون اور یکسوئی کی ہے..... میں چھوڑ چار سال تک ان کو گھر بٹھا کے کھلا سکتا ہوں۔ مگر اپنے نہیں، ان کے اپنے گھر بٹھا کے۔ ہمدردیوں میں اپنی روٹین اور سیٹ اپ خراب نہیں کر سکتا۔"

"آپ گھر پہ وقت ہی کتنا گزارتے ہیں۔ وہ بے چاری اس وقت غمگین ہے، دکھی ہے، شوہر نے دوسری کے لیے اسے میکے بٹھا دیا ہے۔ بھابیاں میکے میں جینے نہیں دے رہی تھیں طعنے مار مار کے۔ اس لیے دن کے لیے اپنے گھر لے آئیں، وہاں بھی کمیوں کی عورتیں کہاں چین لینے دیتی ہوں گی سارا دن سوال نئی نئی باتیں۔ یہاں رہے گی تو ذہن بدلے گا..... دل پہ جو غصہ اور دکھ کا اثر ہے وہ کم ہو گا تو شاید مصالحت بارے میں بھی سوچ لے۔"

"رکھو بھئی..... جسے دل چاہے رکھو۔"

وہ چڑ کے کھلی چھٹی دیتا باہر نکل گیا اور تب مدیحہ اس فتح پہ کھل کر مسکراتے ہوئے خود کو مبارک باد دیے اس بات سے بے خبر کہ اس کے نتائج اسے ہی بھگتنا ہوں گے۔

اس نے مہتاب کو یہاں لانے کی بات بس سرسری سی سوچی ہی تھی اور جعفر سے کہہ بھی ڈالی مگر پھر اپنے فیصلے کو پختہ تب کیا جب اس کی جانب سے مخالفت ظاہر ہوئی۔ تب اس نے ضد میں آ کر اسے یہاں لانے کے بڑھ چڑھ کر دلائل دیے اور اپنی منوا کے رہی۔

اس وقت وہ اپنے اس فیصلے پہ کڑھتے ہوئے بے زار نظروں سے مہتاب آپا کو دیکھ رہی تھی جو پھٹی ایڑیوں والے میلے پیر آف وائٹ صوفے پہ پسارے نیچے کارپٹ پہ مونگ پھلی کے چھلکوں کے ڈھیر لگا رہی تھی۔ جس رفتار سے مونگ پھلیاں اندر جا رہی تھیں، اسی رفتار سے اندر کی بھڑاس گالیوں کی صورت باہر نکل رہی تھی۔

"تحریم! پنسل یہاں کیوں شارپ کر رہی ہو، ڈسٹ بن میں کرو۔ تمہارے پاپا نے دیکھ لیا تو ڈانٹیں گے۔ پتہ ہے ناں کہ انہیں گھر میں گندگی پسند نہیں ہے۔"

تحریم نے ابھی بیگ سے پنسل اور شارپنر نکالا ہی تھا کہ مدیحہ نے ڈپٹتے ہوئے کہا۔ مقصد صرف مہتاب کو باور کرانا تھا مگر وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بے فکری سے کہنے لگی۔

"میں نے دیکھا ہے مدیحہ! تم بچیوں پہ کچھ زیادہ ہی روک ٹوک کرتی ہو اور جعفر کے نام پہ تو ان کا خون خشک رکھتی ہو۔ ذرا تو کھل کے سانس لینے دو بے چاریوں کو..... دیکھو ذرا..... ان کی بڑھوتی بھی رکی ہوئی ہے۔ میری آٹھ سال کی تھی تو میرے کاندھے تک آتی تھی یہ تحریم تو نظر ہی نہیں آتی تمہارے ساتھ کھڑی۔ سب ضرورت سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ کا نتیجہ ہے۔"

"بچوں پہ رعب رکھنا چاہیے آپا!"

"مگر باپ کے نام کا اتنا ہوا کیوں بنا رکھا ہے تم نے۔ مرد کو اتنی اہمیت دے کر سر چڑھانا ٹھیک نہیں۔ صفائی پسند ہے تو ہوا کرے۔ تم کیوں جان ہلکان کرتی ہو اور کیوں بچیوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑی رہتی ہو۔"

"باپ ہے وہ ان کا..... ان پہ فرض ہے کہ اس کی مرضی، پسند....." اس نے کمزور لہجے میں کہنا چاہا۔

جعفر کے دفاع میں کچھ کہنا اب کتنا مشکل لگتا تھا۔ جب دل اور دماغ دونوں زبان کا ساتھ دینے سے انکاری ہوں تو زبان ایسے ہی رک رک جاتی ہے۔

"باپ کا کام کما کر کھلانا ہے۔ ضرورتیں پوری کرنا ہے، چاہے وہ بیوی کی ہوں چاہے بچوں کی۔ زیادہ اہمیت دو تو ان کے نئے نئے نخرے شروع ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہی غلطی کی تھی۔ مختار خود کو بڑی توپ چیز سمجھتا تھا میں اس کے ماتا کے مارے (چیچک زدہ) بوتھے پان اور سگریٹ سے ناس ہوئے دانتوں..... لشکتی

کو نظر انداز کر کے اسے اپنا سرتاج..... اور پتہ نہیں کیا کیا کہتی رہی اس کے بو کے مارے گاں (بھینس) کے باڑوں سے بھی بڑے پیر دباتی رہی۔ وہ سمجھنے لگا میں پتا نہیں کہاں کا ساھوکار ہوں..... یہ زنانی میرے آگے پیچھے پھرتی ہے، ضرور میرے اندر کوئی بات ہو گی۔ بس وہ یہی بات آزمانے گھر سے باہر نکل گیا۔ مرد کو اس کی اوقات میں رکھنا ہی صحیح ہوتا ہے۔ میں نے بے جی کی بات ذرا بھی دھیان سے نہیں سنی تھی۔ وہ ٹھیک کہتی تھیں کہ مرد کو محبت اور توجہ بھی ایسے دو جیسے بھیک دے رہے ہو۔ اس کی خدمت کرو..... کہ یہ اللہ سوہنے کا حکم ہے مگر خدمت بھی احسان جتا کر کرو تاکہ وہ آپے سے باہر نہ ہو۔"

مدیحہ کا دل ان باتوں پہ ناگواری محسوس کرنے کے باوجود اتھل پتھل سا ہو رہا تھا۔ ناگواری شاید صرف بچیوں کی موجودگی میں اس طرح کی گفتگو کے کرنے پہ ہو رہی تھی..... ورنہ ایک ایک بات دل پہ اثر کر رہی تھی۔

"میں ذرا کھانے کا انتظام دیکھوں۔" اس نے اٹھنے کا بہانہ تراشا۔

"وہ مسٹنڈیاں کس لیے ہیں؟" مہتاب کا اشارہ ملازماؤں کی طرف تھا۔

"جعفر کو کھانا میرے ہاتھ کا پکا پسند ہے۔" وہ منہ سے یہ بات نکال کر پچھتائی۔

مہتاب نے عجیب طنزیہ اور جتاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پسند وسند کوئی نہیں..... تم کون سا آسمان سے اترا پکاتی ہو۔ وہی گوشت، وہی سبزی، وہی مسالے..... وہی گھی۔ نوکرانی کو پکانا آتا ہے تو اسے کام پہ رکھا ہوا ہے نا..... نہیں آتا تو نکالو باہر اور کوئی خانساماں رکھو۔"

"جعفر کو پسند نہیں گھر میں مرد ملازم رکھنا۔" ایک بار پھر غلط بات منہ سے نکل گئی۔

"اچھا..... اور وہ جو چوکیدار، مالی اور..... وہ۔"

"وہ گھر کے باہر ہیں آپا! میں گھر کے اندر کے ملازموں کی بات کر رہی ہوں۔ میں بھی سارا دن اکیلی ہوتی ہوں گھر پہ..... اور بچیاں بھی بڑی ہو رہی ہیں اس لیے وہ پسند نہیں کرتے کوئی غیر مرد اندر دندناتا پھرے۔"

"میں کہہ رہی ہوں کوئی پسند وسند کی بات نہیں، صرف تمہیں آگے لگائے رکھنے کا بہانہ ہے۔ سینہ چوڑا ہو جاتا ہو گا اس کا جب تم باورچی خانے سے پسینہ پسینہ ہو کر اس کے من پسند کھانے لے کر نکلتی ہو گی اور اس کے آگے رکھتی ہو گی۔"

"چھوڑیں آپا..... اگر ایسا ہے بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ سارا دن ایک کھانا پکانے کے سوا مجھے کام ہی کیا ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی نہ کروں تو زنگ لگ جائے گا ہڈیوں میں۔"

"کہیں آیا جایا کرو۔ ملا ملایا کرو۔"

"برادری تو پیچھے چھوٹ گئی..... ادھر نہ میکہ..... نہ سسرال..... کس سے ملنا ملانا رکھوں۔ دل گھر پہ ہی لگانا پڑتا ہے۔"

"ہاں یہ بھی تو ظلم ہوا ہے تم پہ۔" مہتاب نے آہ بھری۔

"سارے اپنے چھڑوا کے کالے پانی کی سزا دے رکھی ہے۔ صرف اپنے شوق کی خاطر زمینیں چھوڑ کے دھندہ کرنے کا شوق۔ مگر اتنا بڑا شہر ہے..... کہیں تو تعلقات بناؤ..... کوئی سہیلی بناؤ آیا جایا کرو۔ اپنے آپ کو چولہے کے آگے نہ جلاؤ۔"

"صبح ناشتہ بناتی ہوں..... پھر رات کا کھانا..... وہ بھی دو نوکرانیوں کی مدد سے..... کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ کھانا پکانا ویسے بھی مجھے پسند ہے۔ اپنی بچیوں کے لیے پکا کر دل خوش ہوتا ہے۔"

اس بار اس نے دانستہ جعفر کا نام نہیں لیا۔

"اور پھر آپا..... نوکرانیوں کا کیا بھروسا..... کیا گند بلا پکا کے آگے رکھ دیں..... اپنے ہاتھ سے پکانے میں صفائی سے بچے بھی صحت مند رہتے ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ کوئی کام کر دیتی ہوں۔ کیا پک رہا ہے آج؟"

اللہ اللہ کر کے نارمل گفتگو کی طرف آئی۔

"مرغی بھون لیتی ہوں۔۔۔ گوشت کا تو ناغہ ہے۔ ہاں فریزر میں قیمہ پڑا ہے تو تھوڑا سا' اس میں مٹر ڈال لیتی ہوں ساتھ میں دال چاول۔"

"چلو میں مٹر چھیل دیتی ہوں تمہیں۔۔۔ پیاز' لہسن وغیرہ بھی بنا دیتی ہوں۔"

"یہ کام نوکرانی کر لے گی آپا۔۔۔ آپ رہنے دیں۔ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔"

"تکلیف کیسی؟ ہاں تم ضرور تکلف کر رہی ہو۔ مہمان سمجھ رہی ہو مجھے۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"نہیں آپا! ایسی بات نہیں۔"

"یہی بات ہے۔ چھ دن ہو گئے مجھے آئے ہوئے۔ مہمان کی طرح بٹھا رکھا ہے۔ بستر پہ ٹرے لگا کے دے دیتی ہو۔"

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ جعفر کو ڈائننگ ٹیبل پہ اس کی موجودگی گراں گزرتی تھی اس لیے مدیحہ کی کوشش ہوتی کہ جعفر کے آنے سے پہلے پہلے وہ اسے اس کے کمرے میں ہی کھلا کے فارغ کر دے۔

"اچھا آپا! بنا دیں سبزی۔۔۔ جیسے آپ کی خوشی۔ کریمن! ویکیوم کلینر لاؤ۔۔۔ کارپٹ صاف کر دو۔"

"رہنے دو ابھی۔۔۔ ایک ہی دفعہ سبزی بنا لوں' پھر اکٹھا ہی گند اٹھا لے گی کریمن۔" وہ صوفے پہ پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔

"لاؤ۔۔۔ دے دو مٹر۔"

"آپ یہاں بیٹھ کے سبزی بنائیں گی؟"

"عادت تو مجھے بڑے والے رنگلے منجی (رنگین پلنگ) پہ بیٹھ کے سبزی بنانے کی ہے مگر اب اپنے گھر کا سکھ کہاں اور اپنا گھر کہاں' ہائے میرا ملتانی رنگلا منجا۔ دو سوتی کی کڑھی چدریں (چادریں)' میرے دھسے اور کھیس۔۔۔ ان پہ وہ آ کر پسرے گی۔"

وہ ٹسوے بہانے لگی۔

مدیحہ نے ایک نظر تصور میں کارپٹ پہ پھیلے مونگ پھلی کے چھلکوں کے ساتھ ساتھ مٹر اور پیاز کے چھلکوں پہ ڈالی۔ لاؤنج کی فضا میں پھیلی لہسن کی بو کو محسوس کیا اور اسے تسلی دے کر چپ کرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کم از کم رونے' شوہر اور اس کی معشوقہ کو کوسنے اور گھر یاد کرنے کے شغل میں وہ سبزی بنانے کا شوق تو بھولے رہے گی۔ چپکے سے کریمن کو صفائی کرنے کا اشارہ کرتی کچن میں گھس گئی۔

✲ ✲ ✲

منزہ کا ایک پاؤں کچن میں تھا' دوسرا نئے تیار ہونے والے کمرے میں۔۔۔ تیسرا کوئی پاؤں ہوتا تو یقیناً "مستقل" طور پہ اسٹور میں رکھے رہتی جہاں سوہا بخار کے بعد اپنے تمام تر چڑچڑے پن اور ضدوں کے ساتھ موجود تھی۔ فی الحال تو وہ انہی دو پیروں میں سے باری باری کوئی پیر کچن یا نئے کمرے سے نکال کر سوہا کے پاس ہو آتی۔

سوہا کے نخرے عروج پہ تھے۔ بخار اس کی طبیعت میں ایسے ہی تلخی بھر دیا کرتا تھا۔ نہ کچھ کھاتی نہ پیتی صرف ضد کیے جاتی۔ جب تک منزہ کے بس میں تھا' وہ خوشی خوشی یہ ضدیں پوری کیا کرتی۔ سارے نخرے جی جان سے اٹھایا کرتی مگر اب اس کا اپنا آپ تک اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح سوہا کی بیماری کے دوران سارا گھر بھول بھال کے اس کا سر گود میں لے کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ وہ جس گھر سے آئی تھی۔ وہ گھر اس کے بغیر چل سکتا تھا کیونکہ وہ اس کے بھائی کا گھر تھا۔ یہ گھر اس کے شوہر کا تھا' جو اس کے بیٹی کی پٹی سے لگ کر بیٹھنے کی صورت میں درہم برہم ہو سکتا تھا۔

"ماما! مجھے نہیں پینا یہ سوپ۔۔۔ اس میں سے اسمیل آ رہی ہے۔" اس نے یخنی کا پیالہ بدتمیزی سے پرے سرکایا' سوپ چھلک کے ٹرے کے ساتھ رضائی پہ بھی گرا۔

"اوفوہ سوہا! کیا کر رہی ہو؟" اس نے دوپٹے کا کونا رضائی پر رگڑا۔ یہ اس کے جہیز کی نہیں تھی' اس پہ لگا ہلکا سا دھبہ بھی شمشاد بیگم کا پارہ ہائی کر سکتا تھا۔

"یہ کیا سوپ ہے پتلا۔۔۔ گندا۔"

وہ چائنیز چکن کارن سوپ پی لیتی تھی۔ مگر یخنی اس کے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی۔ منزہ نے یخنی کے لیے مرغی چڑھانے کے بعد سارا کچن چھان مارا تھا مگر کارن فلور' اجینو موتو۔۔۔ مکئی کے دانے وغیرہ کہیں سے نہ نکلے۔ ظاہر ہے وہ گھر میں کبھی استعمال نہ ہوتے ہوں گے اس لیے نہیں منگوائے جاتے ہوں گے۔ نوید تب تک گھر سے جا چکا تھا اور شمشاد کے سامنے کسی ملازمہ یا آس پڑوس کے کسی بچے سے منگوانے کا مطلب تھا' ایک نئے فساد کا آغاز۔ اس نے سادہ یخنی کا پیالہ ہی اسے لا دیا جو وہ ایک چمچہ بھی لینے کی روادار نہیں تھی۔

"کچھ میٹھا بنا دوں؟ کسٹرڈ' ساگودانہ؟"

"زہر لگتا ہے مجھے ساگودانہ۔۔۔" وہ چلائی۔

"کسٹرڈ؟"

"اوں۔۔۔ اچھا۔" ناک چڑھا کے وہ رضامند ہوئی۔۔۔ ساتھ ہی شرط بھی سنا دی۔

"مگر بنانا فلیور۔"

"اوفوہ۔۔۔ اب بنانا فلیور۔" وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

"سوہا' میری جان ماما کو تنگ نہ کرو۔ دیکھو آپ اسٹرابیری اور مینگو فلیور بھی تو شوق سے کھا لیتی ہو۔"

"مگر آج میں نے بنانا کسٹرڈ ہی کھانا ہے۔"

"رات کو پاپا آئیں گے تو منگوا دوں گی۔ اس وقت اسٹرابیری یا مینگو والا لے لو۔ گھر پہ یہی ہے۔"

"وشمہ گندی کو پسند ہوں گے نا یہ فلیورز۔۔۔ اسی لیے منگوائے ہوں گے آپ نے۔" وہ بسورنے لگی۔

"آپ بھی کھا لیتی ہو۔"

"مگر آج نہیں۔ آج صرف اور صرف بنانا۔" وہ زور دے کر بولی۔

"رات کو۔۔۔ پرامس۔ اس وقت نہیں بن سکتا۔"

"منزہ۔۔۔ نی منزہ! کدھر جا کے مر گئی ہے یہ۔ آیا ہے تیرا کوئی ہوتا سوتا۔"

شمشاد کی کراری آواز اور واہیات پکار سن کر وہ اسے منانے کی کوشش ادھوری چھوڑ کے باہر لپکی۔

"اندر ہی جم کے بیٹھ گئی ہے سویرے سے اور باہر جو یہ سیاپا ڈلوایا ہے' اسے کون دیکھے گا؟"

"میں وہ ذرا سوہا کو۔۔۔"

"توبہ۔۔۔ ڈرامے ہی ختم نہیں ہو رہے دو فٹ کی چھوکری کے۔ ایک ذرا سا بخار چڑھا۔۔۔ چڑھ کے اتر بھی گیا۔ پٹی سے ماں کو ایسے باندھ رکھا ہے جیسے مرنے والی ہو۔"

"اماں۔۔۔" منزہ کے دل پہ برچھیاں چل گئیں۔

"ڈیلے نیچے کر۔۔۔ میں نے کبھی کسی کی گھوری برداشت نہیں کی۔"

ان کے للکارنے پہ منزہ نے اپنی گھائل نظریں تو جھکا لیں مگر ان ظالم لفظوں کی مار نہ سہہ پا رہی تھی۔

"جا دیکھ۔۔۔ اب کیا بھیجا ہے نوید نے تیری مانگیں پوری کرنے کے لیے۔"

وہ مرے مرے قدموں کے ساتھ باہر گئی۔ نوید نے بچیوں کے کمرے کے لیے فرنیچر خرید کے بھیجا تھا۔ اس کا ایک دفتری ملازم وین پہ وہی لدوا کے لایا تھا۔

صبح صبح کارپٹ والا کارپٹ بچھا گیا تھا۔ دو دن میں ضروری مرمت اور پینٹ بھی ہو چکے تھے۔ آج صبح سے لکڑی کا کام ہو رہا تھا' اضافی الماری اور کیبنٹ وغیرہ بن رہے تھے۔

"شادا۔۔۔ چنگا پیسہ لگا رہا ہے بے ہداہتا۔"

”آپ۔۔۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔“ اس کے قریب بیٹھ کر جھجکتے ہوئے منزہ نے کہا۔
وہ چونکا۔۔۔ پھر بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کس بات کا شکریہ؟“
”آپ نے سوہا کے لیے اتنا سوچا۔۔۔ اس لیے۔“
”پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اب میری ذمہ داری ہے۔“
منزہ نے ایک گہری سانس خارج کی۔ شاید اس کی حسیات کوئی اور فقرہ سننے کی تمنائی تھیں۔
شاید یہ کہ۔۔۔
”وہ اب میری بیٹی ہے۔“
گویا وہ اسے صرف ذمہ داری ہونے کا اعتراف کر رہا تھا۔
”دوسری بات یہ کہ میں نے اس کے اور روشمہ دونوں کے لیے ہی کیا ہے یہ۔“ وہ اعلا ظرفی سے کہہ رہا تھا اور منزہ نے دل سے اس کی اعلا ظرفی تسلیم کی۔
”یہ آپ کا بڑا پن ہے ورنہ میں جانتی ہوں‘ روشمہ ابھی چھوٹی ہے اور اسے اماں کے ساتھ سونے میں کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ یہ آپ نے صرف سوہا کے لیے۔۔۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“
نوید کو حقیقی معنوں میں تکلیف ہوئی۔
اس نے نہ احسان کیا تھا۔۔۔ نہ وہ اسے ممنون و مشکور دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس نے ایسا صرف سوہا کے لیے کیا تھا۔ اس سے کوئی بیر یا پرخاش نہیں تھی۔۔۔ نہ سوتیلے پن کی خار۔۔۔ مگر ایسا کوئی خاص پیار بھی نہیں امنڈ رہا تھا جو وہ اتنا بڑا قدم اٹھاتا۔ سچ تو یہ تھا کہ ایسا اس نے اپنے اور منزہ کے مابین فاصلے کو پاٹنے کے لیے کیا تھا جو اب بھی جوں کا توں نظر آ رہا تھا۔ ”یہ احسان نہیں ہے منزہ!“
”تو پھر؟“
”میں۔۔۔ میں گھر میں سکون چاہتا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ سوہا کو لے کر کوئی مسئلہ ہو۔ تمہارے اور اماں کے درمیان کوئی تلخی ہو۔ گھر کا ماحول خراب ہو اور۔۔۔“
منزہ جس نے بڑی آس سے یہ سوال کیا تھا۔ بجھ کے رہ گئی اور پژمردہ چہرے کو جھکا کے انگلی سے تکیے پہ آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگی۔
اچانک نوید کا بھاری ہاتھ اس متحرک انگلیوں پہ ٹھہر گیا۔
”اور تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔“
منزہ کے ہونٹوں پہ ایک دبی دبی سی مسکراہٹ جھلک دکھانے لگی۔

✲ ✲ ✲

”دیکھ رہی ہے پروین۔۔۔ ! کیسے تین مہینوں میں گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔“
کافی دنوں بعد پروین کا آنا ہوا اور وہ بھی ایسے دن۔۔۔ جب شمشاد بیگم ناک تک بھری بیٹھی تھی‘ کسی کے سامنے بھڑاس نکالنے کو بے چین۔
”وہی دیکھ رہی ہوں۔ بھابی نے خاصی محنت کی ہے گھر پہ۔“ پروین کی نظروں میں ستائش تھی۔
شمشاد کا دل کباب ہو گیا۔
”کھے تے سواہ محنت۔۔۔ نوید کی محنت کی کمائی برباد کی ہے۔“
”نہیں اماں! برباد ہونا تو نہیں کہتے اسے۔ سنوار کے رکھ دیا ہے سارا کچھ۔ اسے تو گھر بنانا کہتے ہیں۔ بھائی جان نے تو مکان بنایا تھا۔ گھر تو یہ اب لگ رہا ہے۔“

مزدوروں کو نئے سنگل بیڈز‘ رائٹنگ ٹیبل وغیرہ اندر لاتے دیکھ کر اس نے کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے [illegible] انداز میں کہا۔
منزہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کچن میں داخل ہونے لگی۔
”اچھی پٹی پڑھائی ہے چار دن میں۔۔۔ شاوا۔۔۔ تیرے جیسی ہی ہوتی ہیں زنانیاں۔۔۔ جو بندے کو سال [illegible] اجاڑ کے پھوک کر دیتی ہیں۔ بس پیسہ نکلوا کے چین پڑتا ہے پسلی میں۔“
”اماں! میں نے ان سے کوئی فرمائش نہیں کی۔“ جانتی تھی شمشاد بیگم یقین کرنے والوں میں سے نہیں [illegible] بھی اس نے صفائی دینا ضروری جانا۔
”چل چل۔۔۔ وڈی آئی۔۔۔ سارا پتہ ہے مجھے۔ اپنی لڑکی کے سکھ آرام کے لیے کر رہی ہے۔ چار دن [illegible] جو سونا پڑ گیا ہے اسے نہ۔۔۔ میں ڈائن ہوں؟ کھا جاتی تیری لڑکی کو؟ میرے پاس نہیں سو سکتی وہ؟ آخر روشمہ بھی سوتی ہے۔“
”اماں۔۔۔ ! یہ نوید صاحب کی خواہش ہے۔ میری نہیں۔ وہی چاہتے تھے کہ بچیوں کا الگ کمرہ ہو۔ اس [illegible] دونوں میں پیار بھی بڑھے گا جب ساتھ ساتھ رہیں گی۔“
”پیار بڑھا کے کیا کرنا ہے؟ رہنا تو سوتیلے ہی ہے۔۔۔ پیار بڑھا کے کون سا سوتیلا سگا بن جاتا ہے۔ پر یہ بات [illegible] نوید نہیں سمجھتا۔“
وہ چپ چاپ کچن میں چلی آئی اور کسٹرڈ بنانے لگی۔

✲ ✲ ✲

”تم نے بچیوں کا کمرہ دیکھا؟ تیار ہو کے کتنا اچھا لگ رہا ہے؟“ نوید مراد نے اشتیاق سے پوچھا۔
وہ خاموش ہی رہی۔ کیا بتاتی کہ جس کی وجہ سے وہ دن رات طعنے سن رہی ہے‘ اسے دیکھنے کا یا سراہنے کا [illegible] حوصلہ نہیں رہا۔ جب نوید نے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ سامنے والا بڑا کمرہ بچیوں کے لیے سیٹ کر رہا ہے تو وہ کتنا [illegible] ہوئی تھی۔ اس رات پہلی بار اس نے سوہا کو اکیلے سلایا تھا اور ساری رات وہ کروٹیں بدلتی اور سسکیاں [illegible] تھی۔ صبح اس نے سوہا کو بخار میں پھنکتے پایا تو اس کے اپنے اندر آگ بھر گئی تھی مگر اب جیسے سارا ملال ڈھل گیا۔
سامنے والا کمرہ۔۔۔ نظروں کے بالکل سامنے۔۔۔ اور دونوں بچیاں ایک ساتھ اکٹھی رہتیں۔۔۔ سوہا اور روشمہ دونوں کو دو تین دن میں ہی آسانی سے اکیلے رہنے کی عادت ہو جاتی۔
پھر نوید کا خصوصی دلچسپی لیتے ہوئے دو دن کے اندر اندر سارا کاٹھ کباڑ اس کمرے سے نکالتے ہوئے [illegible] کروانا۔۔۔ بے بی پنک کلر کا پینٹ دیواروں پہ اور سلور گرے دروازوں پہ کرانا۔۔۔ نئے اسٹائل کا فرنیچر‘ [illegible] کارپٹ۔۔۔ کارٹونز والے پردے اور بیڈ کورز۔۔۔ فلور کشنز۔۔۔ مگر ان سب کے ساتھ ساتھ شمشاد بیگم کے [illegible] چھلنی کر دینے والے تبصرے۔۔۔ اس کی ساری خوشی مرتی چلی گئی۔
”اور پیسے لے لینا۔۔۔ کل مارکیٹ ہو آنا۔۔۔ جو اچھا لگے لے لینا۔“ نوید کی آواز پہ وہ خیالوں سے باہر آئی۔
نجانے کب سے وہ ٹکٹکی باندھ کے اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھ رہا تھا۔
”کیا ضرورت ہے؟“ وہ آہستہ سے بولی۔
”کمرے کی ڈیکوریشن کے لیے کئی چیزیں چاہیے ہوں گی۔ تمہیں تو اندازہ ہو گا بچیوں کی پسند کا۔ جو ان کو پسند ہو وہ لے لینا۔۔۔ لیمپ‘ وال کلاک‘ فوٹو فریم‘ کھلونے وغیرہ۔“
”جو آپ لے آئے‘ وہ کافی ہے۔ میرا خیال ہے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“
اس نے مرے مرے لہجے میں کہا تو نوید کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔
”پتا نہیں یہ عورت کبھی خوش بھی ہو گی یا نہیں۔“ اس نے مایوسی سے سوچا اور سگریٹ سلگا لی۔

"پہلے کیا چڑیا گھر تھا۔" وہ تپ ہی تو گئی۔ بیٹی کو دیکھ کر کیسے چاؤ سے بہو کے بخئے ادھیڑنے بیٹھی تھی مگر ایک زمانے بھر کی نکمی..... سارے جہاں سے نرالی..... نندوں اور بیاہی بیٹیوں والا ایک بھی گن نہیں تھا۔ وہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

"بھائی جان ماشاءاللہ لاکھوں سے اچھا کماتے' اچھا کھاتے ہیں۔ اللہ نے زرق اور کاروبار میں اتنی برکت رکھی ہے مگر آپ لوگوں کا رہن سہن..... آپ نے کبھی بھائی جان کی آمدنی کو ڈھنگ سے استعمال کرنے کا سوچا نہیں۔ بھائی جان بھی دنیا داری سے کوسوں دور..... سادہ مزاج ملنگ ٹائپ بندے..... اپنا ذاتی گھر بنایا تو لاکھوں ڈالے مگر اسی پرانے محلے میں..... کسی اچھے علاقے میں اتنا پیسہ لگایا ہوتا تو بات بھی تھی..... خیر اسی کو سنوار رکھتے تب بھی ٹھیک تھا۔ ساجدہ' بھائی جان سے زیادہ سادہ طبیعت۔ کچھ تھی بھی الہڑ اور کم عمر دوسرا کم حیثیت گھرانے سے تھی۔ پیسے کے صحیح استعمال کا طریقہ نہ جانتی تھی۔ شاید زندگی مہلت دیتی تو سیکھ ہی جاتی مگر اس کے دم سے پھر بھی غنیمت تھا۔ اس کے جانے کے بعد یہ گھر واقعی چڑیا گھر سے کم نہیں تھا۔ گنوار قسم کی نوکرانیوں کی بادشاہی تھی..... ڈرائنگ روم کسی کو بٹھانے کے لائق نہیں تھا اور کچن میں کیڑے چلتے تھے' دیواروں پہ لگی تھینٹے' چھت پہ جالے' چولہے پہ چکنائی در چکنائی جمی ہوئی..... فرش پہ گرے ہوئے سالن کے دھبے' کالی ٹیڑھی میڑھی دیگچیاں اور یہ لاؤنج جہاں بستر پھیلے رہتے..... پیٹی اور الماری بھی یہیں تھی اور ڈائننگ ٹیبل پہ صندوق اور اٹیچی کیس دھرے رہتے۔ اب دیکھو ذرا کیسی کایا پلٹ ہوئی ہے۔"

وہ توصیفی نظروں سے اٹھ کر پورے گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔

نوید نے بچیوں کا کمرہ سیٹ کراتے ہوئے فالتو کباڑ باہر کیا پھینکا۔ منزہ کو گویا موقع مل گیا' گھر سے غیر ضروری سامان نکالنے کا۔ ضروری اور کبھی کبھار استعمال میں آنے والی اشیاء اس نے اسٹور روم میں منتقل کیں۔ سارے اٹیچی کیس' پیٹیاں اور لوہے کی الماریاں ایک الگ کمرے میں رکھوائیں۔ کچن سے متصل چھوٹا سا ایک اور اسٹور روم تھا جس کی دیوار نکلوا کے کچن بڑا کروایا۔ لاؤنج میں سے فریج اور فریزر لا کر یہاں رکھوایا۔ پلاسٹک کی رنگین کرسیاں اور گول میز ناشتے کے لیے ایک طرف رکھوائی۔ صحن کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی جالیاں خوب رگڑ کر دھلوانے کے بعد منی پلانٹ کی بیل اس پہ لٹکائی۔ کچن میں ٹائلز لگوائے تاکہ صفائی میں آسانی رہے۔

لاؤنج کی حالت بھی بدل گئی تھی۔ صوفے وہی تھے مگر اب قرینے سے رکھے تھے' نئے کشنز..... پینٹنگ..... وال ہینگنگ' پردے..... ڈیکوریشن پیسز ڈرائنگ روم اس کے جہیز کے بھاری فرنیچر سے سج گیا تھا۔ جہیز کا بیڈ روم سیٹ پہلے ہی اس کے کمرے میں سیٹ ہو چکا تھا جبکہ نوید کا زیر استعمال فرنیچر جو تقریباً "نیا ہی تھا اور شمشاد نے اسٹور میں اٹھوا دیا تھا اور تلے پڑا برباد ہو رہا تھا۔ منزہ نے وہ پروین کے لیے مخصوص کمرے میں رکھوا دیا تھا۔ وہاں بھی نئے پردے..... نیا قالین..... ڈرائنگ روم کا پرانا صوفہ پالش کروا کے وہاں رکھوا دیا تھا۔ اس کمرے کا سامان قدرے مرمت اور جھاڑ پونچھ کے بعد ایک اور کمرے میں سیٹ کر کے اضافی گیسٹ روم شمشاد بیگم کے گاؤں والے رشتے داروں کے لیے مخصوص کر دیا جو اکثر آئے رہتے اور لاؤنج میں فرشی بستر کر کے یا صوفوں پہ سو کے شب بسری کرتے۔

"چل بس کر اب....."

شمشاد نے جل کے کہا۔ وہ سارے گھر کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن سی ہو کر بیٹھ گئی۔

"یقین ہی نہیں آتا کہ یہ گھر وہی ہے۔ ایک بات ماننا پڑے گی نئی بھابی ہے سلیقے اور عقل والی۔"

پروین منصفانہ مزاج کی تھی' تعریف ادھار نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے فوراً" کہہ دیا۔

"بڑی....." شمشاد نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

"اس کے دل سے پوچھ جس کی جیب خالی ہوئی ہے۔"

"اماں! مرد کو اپنا پیسہ گھر اور اولاد پہ خرچ ہوتے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ویسے بھی جتنا پیسہ خرچ ہوا ہے' وہ نظر رہا ہے کہ بھیا کنویں میں پھینکا گیا ہے۔ کم از کم اب گھر اس قابل تو لگنے لگا ہے کہ کس کو بلایا' بٹھایا جا سکے۔"

"ہاں ہاں تجھے اپنی ساس کو بلاتے شرم آتی تھی نا..... اب بلا لا....."

"لاؤں گی کسی دن۔"

اسے ماں کی بات سن کر لطف آیا۔ پتہ نہیں وہ اس کی ساس سے اتنا خار کیوں کھاتی تھیں۔ اصولاً" تو اسے بہو ہونے کے ناتے یہ فریضہ انجام دینا چاہیے تھا۔

"وہ بھی بہت کہہ رہی تھیں کہ ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"کیوں؟..... میرے سے ملنے کو کیوں دل چاہ رہا ہے پھاپھے کٹنی کا؟ میں کون سی اس کی "ہانن" (بچپن کی سہیلی) ہوں۔"

"وہ نوید کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔ شادی پہ سرسری سا ملی تھیں۔"

"بس بس رہنے دے۔ زیادہ میل ملاقات والے نہ لالا کے دکھا اسے اور چوڑی ہو جائے گی کہ میں پتہ نہیں کیا چیز ہوں جو زمانہ آ آ کے مل رہا ہے۔"

"اوہو اماں..... !خود کو ٹھنڈا رکھا کریں۔"

"بیڑہ ترے..... اتنی ککر ٹھنڈ میں ماں کو "نگا" (گرم) ہونے کی بجائے ٹھنڈا ہونے کا کہہ رہی ہے۔ نمونیہ لگوانا ہے مجھے؟"

"میں دماغ ٹھنڈا رکھنے کے بارے میں کہہ رہی ہوں اماں!"

"وہ میرے ہاتھ میں تو ہے نہیں..... سارے گھر میں لگی پھرتی ہے یہ' میرے اندر بھانبھڑ جلانے کے لیے..... تیلی (دیا سلائی)۔"

اس نے دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی سوہا کی جانب اشارہ کیا۔

"ذرا دیکھ..... جب آئی تھی تو پیلا پھٹک رنگ تھا..... دیدوں کے نیچے کالے سیاہ حلقے' پسلیاں باہر آ رہی تھیں اب پھٹی پڑ رہی ہے..... مفت کی کھا کھا کر۔"

"چھوڑیں اماں..... !یہ بھی کوئی ...؟" اس نے کوفت سے سر جھٹکا۔ ماں کی اسی قسم کی ذہنیت سے اسے گھبراہٹ ہوئی تھی۔

"دیکھ تو سہی..... گال کیسے لٹک کے نیچے آ رہے ہیں..... ایک ہماری وشمہ ہے..... اور سوکھتی جا رہی ہے۔ نہ کھایا لگتا ہے نہ پیا۔"

"میں نے تو دیکھا ہے بھابی' وشمہ کا بڑا خیال رکھتی ہے..... پہلے اسے کھلاتی ہے..... بعد میں خود کھاتی ہے۔ گڑیا سا سجا بنا کے رکھا ہوتا ہے۔"

"ڈرامے۔"

"نہیں اماں! میں نے اس کی آنکھوں میں وشمہ کے لیے بڑا خاص احساس دیکھا ہے۔ میں خود ماں ہوں اچھی طرح پہچان سکتی ہوں کہ کسی بچے کے لیے اس احساس کا مطلب ڈرامہ ہے یا اصل ممتا۔"

"ہاں تو ماں ہے..... اور میں تو پھوپھی ہوں تیری۔"

ماں کے دل جلے تبصرے پہ پروین کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ماں کے موڈ کے پیش نظر اس نے فوراً" منہ پھیرا کے اور کھانسی کے ذریعے اس ہنسی کو چھپانے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔

"ہاں ہاں نکال وندیاں..... ماں کو کلپانے والی کی ہمدرد۔" شمشاد بیگم کو حسب توقع تپ چڑھ گئی۔

"نہیں اماں! میں تو۔"

"رہن دے..... سارا پتہ ہے مجھے۔ مجھ بدنصیب کا آج تک کون سگا بنا ہے۔ جو تو بنتی۔ ماں پیو نے ہولی عمر میں سر سے بوجھ کی طرح پھینک دیا' پٹواریوں کی کڑی لا کے بھی تیرے ماشکی واد کے میری قدر نہ کر سکے۔ خصم بھی ناشکرا

.....ویلا..... جب تک ساہ لیتا رہا' میرے ساہ (سانس) پیتا رہا مرا تو قرضے اور غریبی چھوڑ کر۔ اولاد ہے تو وہ میری نہیں پتر کو اس عمر پڑھی لکھی زنانی کیا مل گئی 'اڈی (ایڑھی) ہی دھرتی پہ نہیں تک رہی اس کی..... بیٹی ماؤں کی سگی ہوتی ہے' پر تو نے تو یہ بات بھی غلط ثابت کر دی۔"

وہ سوں سوں کر کے ناک رگڑتے ہوئے اپنی کرخت آواز میں کہہ رہی تھی۔ بین ڈالنے کے سے انداز نے اس کی آواز کو اور بھدا بنا دیا تھا۔

کچن میں کام ختم کرنے کے بعد چولہے بند کرتی منزہ چونکی۔

"یا اللہ خیر..... یہ کون ہے؟ اماں تو باہر پروین کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ کیا مسئلہ ہو گیا؟"

ان عجیب و غریب آوازوں پہ وہ گھبرا کے مختلف وسوسے دل میں لیے باہر نکلی۔

شمشاد بیگم واویلا مچا رہی تھی اور پروین بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ منزہ کی ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کے اصل بات پوچھنے کی کوشش کرے۔ کیا پتہ شمشاد بیگم اسے ماں بیٹی کے ذاتی معاملے میں مداخلت جانتے ہوئے بپھر جاتی۔ منزہ تو عام حالات میں اسے مخاطب کرنے سے بھی گریزاں رہتی کہ کب کیا سننے کو مل جائے' کسے پتہ اور اس وقت تو وہ جس موڈ میں لگ رہی تھی' ایسے میں اسے چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ کچن کے دروازے پہ جمی ان دونوں کی پشت پہ کھڑی معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگانے لگی۔

"اماں! میں تو..... میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں! میں بیٹی ہوں آپ کی۔ مجھ سے زیادہ کون پیار کر سکتا ہے"

وہ ماں کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے جیسے اسے کسی بچے کی طرح بہلانے کی سعی کر رہی تھی۔

"بس بس..... رہن دے اپنا پیار..... پیار کرتی ہے تو اپنی پھابھے کٹنی سس (ساس) سے۔ میں تیری کیا لگتی ہوں تیری بلا سے میرے ساتھ جو بھی ہوتا رہے۔ کوئی بھی میرا دل جلاتا رہے۔ مجھے اپنے ہی گھر میں ستاتا رہے۔ تجھے اس سے کیا؟ تو نے تو میری بات پہ یقین ہی نہیں کرنا۔ تیری نظر میں تیری ماں جھوٹی ہے' باقی سارا زمانہ سچا۔"

وہ ہل ہل کے رو رہی تھی۔

منزہ کا دل جیسے کوئی پیچھے کی جانب دھکیلتا جا رہا تھا۔ وہ بھانپ گئی تھی کہ شمشاد کسی اور کا نہیں' اس کا ذکر کر رہی ہے۔ اکیلی ساس کے سامنے ہی وہ خود کو بے دست و پا تصور کرتی تھی..... اس کی کٹیلی زبان' جاہلانہ کوسنے اور گھناؤنے الزامات سن کر بے بسی اور ذلت سے کٹتی رہتی تھی اور آج تو نند بھی ساتھ تھی۔

اسے نصرت اور شمیم کی جوڑی یاد آنے لگی۔

اس بار مقابلے پہ پھر ایک جوڑی تھی..... وہی ساس اور نند کی۔

اور وہ بھی وہی تھی..... ہمیشہ کی بے زبان..... بزدل کم ہمت۔

اور اس بار تو اس کا جوڑی دار بھی نہ تھا۔

پہلے تو مظہر تھا جو اس کے سامنے۔

"اف....." اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

"یہ کس کا نام پھر سے لے لیا۔" اس نے زبان کو کچل کے گویا سزا دی۔

خون کا نمکین سا ذائقہ آنسوؤں کے نمکین گولے کے ساتھ حلق کے اندر اترا..... اور اسے کڑوا کر گیا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے اماں! مجھے بھلا اپنی ماں سے زیادہ پیارا کون ہو سکتا ہے۔"

پروین نے آنسوؤں کے اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔

"میں تیری کون ہوتی ہوں..... میرے دشمن تیرے سگے ہوتے ہیں۔" وہ پروین کو اس وقت کوئی بگڑی ہوئی ناراض بچی لگ رہی تھی جسے سارا زمانہ اپنا دشمن لگ رہا تھا۔ اس نے اس ساٹھ باسٹھ سال کی بچی کو لالی پاپ تھمایا۔

"دشمن جائیں بھاڑ میں..... میں اپنی اماں کے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اکیلی کافی ہوں..... سچ' آخر بیٹی کس کی ہوں؟ شمشاد بیگم کی۔"

شمشاد بیگم نے لالی پاپ تھام لیا۔

"بس تو شیر ہو جا..... لگ پتہ جائے گا اس کل کی آئی کو..... اور اس کی چھوکری..... اسے تو بھگانے کا کوئی طریقہ

.....

بیٹی کے بہلاوے کا لالی پاپ چوستے ہوئے واقعی بہل گئی۔

"ہاں ہاں اماں! اکڑ لیں گے۔ بھگا دیں گے اسے بھی۔"

منزہ کے پچن کی دہلیز پہ جمے پیر زمین کے اندر تک دھنس گئے۔

"کب؟ جب سارا کچھ چر جائے گی؟"

"اماں..... ! یہ بھی تو دیکھیں..... اس گھر کو ایک عورت کی اور وشمہ کو ماں کی کتنی ضرورت ہے۔ ابھی ایسا پنگا لینا ٹھیک نہیں۔"

"یعنی میں اس گھر کی فرد نہیں..... ضرورت ہوں۔" منزہ نے یاسیت سے سوچا۔

دوسری جانب پروین شمشاد بیگم کی جارحیت کم کرنے کے لیے مصلحتاً کہتی جا رہی تھی۔

"ایسا نہ ہو بیٹی کے پیچھے پیچھے وہ بھی چلی جائے۔"

"دفع دور..... کل کی جاتی آج مر مک جائے..... میرے نویدے کو ہور بہتیریاں۔"

"نہیں اماں.....! بھائی جان کا دل آپ کی جانب سے برا ہو گا اور یہ کوئی ایک وجہ نہیں ہے اسے برداشت کرنے کی' اور بھی وجہ ہیں۔ محلے اور خاندان کے لوگوں میں بھی آپ اور بھائی جان برے بنیں گے کہ بیاہ کر لائے اور سال بھی بسا نہ سکے۔ سب سے بڑی وجہ کہ وشمہ بہت مانوس ہو گئی ہے بھابی سے۔"

"یہی تو چالاکی کی ہے اس ڈرامے باز نے۔" شمشاد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"اب جو بھی ہے۔ چالاکی ہے یا ڈرامہ..... مگر وشمہ کو سنبھالنا مشکل ہو گا بھابی کے بغیر۔"

"خیر اسے سنبھالنا تو پہلے کون سا سوکھا (آسان) تھا۔"

"تو خود سوچیں..... آپ کی عمر ہے کیا اب وشمہ کے پیچھے بھاگنے کی..... یہ گھر داری سنبھالنے کی۔ ذرا ہوشیاری سے کام لیں اماں..... اپنا مطلب نکالنے کے لیے انسان کو بڑا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ بھی تھوڑا سا صبر..... اور تھوڑی سی چالاکی دکھا دیں۔"

"چالاکی اور ہوشیاری ہی تو ساری عمر کرنی نہیں آئی تیری ماں کو۔" اس نے حسب توفیق بھولا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو اب کر لیں۔" دل ہی دل میں توبہ توبہ کرتی پروین نے ماں کو اپنے ہی انداز میں لائن پہ لاتے ہوئے کہا۔

"رہنے دیں اس ذرا سی لڑکی کو۔ یہیں پڑی رہے کسی کونے میں آپ کا کیا لیتی ہے؟ اس کی وجہ سے اس کی ماں بھی ٹکی رہے گی اور آپ کی اور وشمہ کی خدمت کرتی رہے گی۔"

منزہ نے بے یقینی سے پروین کو دیکھا کہ بظاہر اتنی سلجھی ہوئی اور معقول نظر آنے والی عورت اندر سے ایسی سازشی اور سطحی ذہنیت والی بھی ہو سکتی ہے۔

"مگر پروین.....! وہ کونے میں ہی تو نہیں پڑی رہتی۔ تو پوچھتی ہے وہ میرا لیتی کیا ہے؟ وشمہ کے برابر خرچہ ہو رہا ہے اس پہ..... جو حق اس کا ہے' یہ برابر وصول رہی ہے..... میری پوتری کی برابری؟ اب تو اسکول بھی داخل کرایا ہے نویدے نے اتنی فیس..... اوپر سے کتابوں' پنسلوں کا خرچہ..... وین بھی لگوا کے دی ہے۔"

"ثواب کما رہے ہیں بھائی جان.....! کمانے دیں..... یتیم بچی ہے۔" منزہ کے دل میں ایک اور سوئی چبھی۔

وشمہ بھی بن ماں کی تھی۔ مگر اس نے وشمہ کی ماں بنتے ہوئے صرف ثواب کمانے کی نیت نہیں کی تھی۔

"وشمہ کے سر کا صدقہ سمجھ کر بھول جائیں۔"

اب کی بار سوئی نہیں..... پورے کا پورا خنجر اتر گیا۔

"صدقہ؟..... خیرات؟ میری بچی، میری سوہا مظہر کی لاڈلی، اس کی شہزادی، صدقے کے قابل....."
من من بھاری ہوتے قدم اس نے بمشکل اپنے کمرے کی جانب موڑے۔ مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی
"میں اسے ایسے راج نہیں کرنے دوں گی۔" شمشاد بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ ذرہ برابر پیچھے نہ ہٹ رہی
"توبہ اماں! آپ کو سمجھانا کتنا مشکل ہے۔"
وہ بھی تنگ آ گئی۔ بلاوجہ ماں کی ہاں میں ہاں ملانے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔
"سمجھنے کی ضرورت تجھے ہے اور تیرے بھائی کو..... میں کیوں کل کی آئی کے پیچھے لگوں مجھے نہیں آتا
میسنا بن کے مطلب نکالنا، میں تو سینہ ٹھونک کے مقابلہ کرنے والی عورت ہوں۔"
"تو کریں پھر مقابلہ..... آپ کی مقابلے بازی میں دوسری بار گھر اجڑ جائے گا بھائی جان کا۔" وہ زچ ہوا
"پہلی بار بھی میں نے اجاڑا تھا؟ ساجدہ کو سیڑھیوں سے دھکا میں نے دیا تھا؟" وہ بھڑک اٹھی۔
"یہ تو سوچیں، آپ مقابلہ کس سے کر رہی ہیں؟ سامنے ہے ہی کون؟ وہ تو آپ سے لڑنے پہ تیار نہیں۔"
پروین کا اشارہ منزہ کی جانب تھا۔
"وہ گھنی ہے، میری طرح سینہ ٹھونک کے میدان میں اترنے والی جی دار نہیں وہ..... جڑیں کاٹ رہی ہے
گھر کی۔"
"یا اللہ....." پروین نے سر تھام لیا۔ جب سے آئی تھی، ماں کی ایسی ہی بے سروپا باتیں سنے جا رہی تھی۔
اس کے برعکس اس نے منزہ کو بہت دھیمے مزاج کا، صلح جو اور صابر پایا تھا۔
"وشمہ کو مٹھی میں لینے کے پیچھے بھی اس کا ایک مقصد ہے۔" اس نے مزید زہر افشانی کی جسے پروین خاطر
نہ لائی۔
"ہوتا رہے..... کم از کم وشمہ کو محبت اور توجہ تو مل رہی ہے نا۔" اس نے اکتا کر کہا۔
"اس سوتیلی کی محبت؟ تیری عقل کدھر ہے پروین تو بڑی ماں بنتی ہے نہ..... تو ماں بن کے سوچ..... سوت کی
کو اپنے جنے بچے کے برابر لائے گی؟"
"اماں....." وہ بری طرح بدک گئی۔
"بس.....؟" شمشاد نے فاتحانہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔
"نکل گیا دم؟..... اپنی بار کیسی کلیجے میں جا کے لگی ہے بات۔"
پروین گلہ آمیز نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی جس نے بیاہی بیٹی کے سامنے اس کی خود ساختہ سوتن بھی لا کے
دی تھی۔
"اماں! آپ کو ایسی بات منہ سے نکالنے سے پہلے سوچنا تو چاہیے۔ کوئی وقت قبولیت کا ہوتا ہے۔"
ناراضی سے اس نے جتایا۔ شمشاد پھر بھی بات کی نزاکت کو نہ سمجھی۔
"میں تو یہ بتا رہی ہوں کہ اس جادوگرنی کا وشمہ کے لیے پیار نرا ڈھکوسلہ ہے۔ صرف نویدے کی آنکھوں پہ پٹی
باندھنے کے لیے ہے۔ اس پہ احسان جتا کے اسے بس میں کر رہی ہے۔ وشمہ..... ذرا سی بچی ہے، اسے قابو کرنا کیا
مشکل ہے۔ اسے اپنے ہاتھوں پہ ڈال کے وہ نویدے اور بچی کو اپنے جوگا کر لے گی۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ سیانی بی بی کہ وہ وشمہ کو میرے سے دور رکھ رہی ہے۔ تیرے پاس نہیں آنے دے رہی۔
کیوں؟ کیونکہ ہم دونوں ہیں اس کی سگی۔ میں دادی تو پھوپھی، ہم سے اس کا برا نہیں دیکھا جاتا۔ وہ وشمہ کو
سیدھی پٹی پڑھا کے ہمارے سے دور اور اپنے سے پاس کر رہی ہے تاکہ اس کے ساتھ جو اچھا برا کرے ہم
ہی نہ چل سکے۔ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہی نہ رہے۔ آئی بات عقل میں؟"
جو نکتہ وہ پروین کے دماغ میں ڈالنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس کی سمجھ میں آ تو گیا۔ مگر اس پہ یقین کرنے میں وہ ابھی

...ہاں تھی۔
"بھابی ایسی لگتی تو نہیں۔"

☼ ☼ ☼

"مرد اور عورت گاڑی کے دو پہیے ہیں۔" تحریم نے اردو کی کاپی میں تحریر کرتے ہوئے زیر لب دہرایا۔
"ہوں..... اور سنو پہیے۔" مہتاب جو نزدیک رہی سر پہ مہندی تھوپے بیٹھی تھی۔ منہ پہ دوپٹے کا گولہ سا بنا کے ہنس
دی۔
"مجھے نہیں پتہ تھا مدیحہ۔ اِ شہر آ کے اچھے بھلے بندے اور بندیاں گڈی کے پہیے بن جاتی ہیں۔"
"آپی! یہ تو مثال ہے۔" تحریم جو سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے اور کچھ فطرتاً بھی سمجھ دار اور سنجیدہ مزاج
تھی، سمجھانے لگی۔
"اس کا مطلب ہے کہ دونوں برابر ہیں..... ایک جیسے۔"
"کوئی ایک جیسے نہیں۔" مہتاب نے ہاتھ بھر کے مزید مہندی اپنے سر پہ لگاتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔
مہندی کے چھینٹے فلور کشن کے ساتھ ساتھ وائٹ پینٹ والی دیوار تک بھی گئے۔ مدیحہ جزبز ہو کے رہ گئی۔
"اب وہ زمانہ نہیں آپا! اب عورت اور مرد کی حیثیت ایک جیسی ہی ہے۔"
"اگر ایک جیسی ہوتی تو میں مختار کو گھر سے نکالتی..... وہ مجھے نہ نکالتا۔"
مدیحہ نے تحریم کو گھور کے دیکھا، وہ فوراً کاپی پہ سر جھکا کے دوبارہ لکھنے لگی۔ تقدیس البتہ ڈرائنگ کرتے ہوئے
نہ صرف چور نظروں سے اپنی اس دلچسپ باتیں کرنے والی آنٹی کو دیکھتی رہی بلکہ کان بھی پوری طرح اس جانب لگا
رکھے تھے۔
"اور میں کسی اور وجہ سے بھی کہہ رہی تھی کہ مرد اور عورت کبھی ایک برابر ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لیے نہیں کہ
مرد کوئی بڑی اونچی چیز ہے اور عورت کبھی اس جیسی بن ہی نہیں سکتی بلکہ اس لیے کہ مرد کی کیا حیثیت کیا اوقات کہ
وہ عورت کے مقابلے پہ آئے۔ نہ شکل کا مقابلہ..... نہ عقل کا۔ عورت وفا کرتی ہے اس کے دل میں حیا اور لحاظ
ہوتا ہے اور مرد..... اس کا تو دل ہی نہیں ہوتا۔"
"دل نہیں ہوتا؟" تحریم نے چونک کر کاپی سے سر اٹھایا۔
"مگر دل تو سارے ہیومن بینگز کا ہوتا ہے۔ ماما! کیا مرد ہیومن بینگز نہیں ہوتے؟ man کو ہی مرد کہتے ہیں نا؟
وہ تو ہیومن....."
"تحریم! اپنی بکس اٹھاؤ اور اپنے کمرے میں جا کے پڑھو۔" مدیحہ نے اس کی فر فر چلتی زبان کے آگے بریک
لگائی۔
"آپ بھی اندر آئیں..... ہمیں تو آپ نے ہی پڑھانا ہے۔"
تینوں بچیاں کتابیں سمیٹنے لگیں۔
"یہ کون سے 'ہیومن بیگ' کا ذکر کر رہی ہے؟"
"آپا.....!" اٹھتے اٹھتے مدیحہ نے ایک گہری سانس لی۔ دس دن میں وہ ناک تک بھر چکی تھی آپا کی میزبانی سے۔
"انسان کو کہتے ہیں انگریزی میں۔"
"انگریزی میں کہو چاہے ملتانی میں۔ فارسی میں کہو چاہے سندھی میں..... مرد ہوتا ہی..... ہے۔"
ایک اور گالی.....
وہ بچیوں کو تقریباً ہانکتے ہوئے ان کے کمرے میں لے گئی۔ انہیں پڑھنے کے لیے بٹھا کے اس نے گھر کا نمبر
ملایا۔ "خیریت کیسی ہے جی؟" بے جی کے استفسار پہ وہ پھٹ پڑی۔

"ربا خیر..... ستاں خیر ہووے میری دھی رانے تے اودے سردے سائیں دی..... بچے تو ٹھیک ہیں؟"
گئیں۔

"جی بے جی..... ! شکر ہے اللہ کا، بچیاں بھی ٹھیک ہیں اور بچیوں کے پاپا بھی۔" اس نے پہلے ان کی تسلی کرائی
اپنا مسئلہ بیان کیا۔ "مصیبت تو وہ ہے جس کو میں نے دعوت دے کر بلایا ہے۔"

"اچھا..... دعوت دے رہی ہے؟ ہاں ہاں ضرور آئیں گے۔ سارے آئیں گے۔"

"بے جی..... میں آپا مہتاب کی بات کر رہی ہوں۔ جسے ہمدردی میں میں نے یہاں آنے کی دعوت تو دی
تھی مگر اب پچھتا رہی ہوں۔ وہ تو جیسے لیس ہی ہو گئی ہے یہاں۔ واپس جانے کا نام نہیں لے رہی۔"

"اچھا اچھا....." بے جی نے یوں سرسری سا کہا جیسے مدیحہ انہیں کوئی اخباری خبر سنا رہی ہو..... غیر اہم سی۔

"کیا اچھا بے جی..... ! انہیں واپس بلوایئے کسی طرح۔"

"تاں پتر..... ! ایسے دل تھوڑا نہیں کرتے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ ان کو واپس نہیں موڑتے۔"

"وہ مہمان نہیں بلائے جان ثابت ہو رہی ہیں۔"

"بوھتا (زیادہ) کھاتی ہے؟" انہوں نے کمال سادگی سے پوچھا۔

کوئی اور یہ کہتا تو شاید وہ اسے اس کا طنز سمجھتی..... مگر یہ بے جی تھیں۔ وہ جانتی تھی یہ سوال انہوں نے سنجیدگی
سے پوچھا ہے۔

"ہاں..... بہت۔" اس نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میرا دماغ کھاتی رہتی ہے۔" وہ کلس کے بول رہی تھی۔

"اچھا میں کہتی ہوں کسی سے..... اسے لینے آجائے۔"

"اسے اب اس کے گھر بھیجنے کی کریں۔"

"گھر کہاں رہا بد نصیب کا۔"

"ماں باپ کا تو ہے۔"

"بھرجائیاں کدھر برداشت کرتی ہیں۔"

پچھلی بار یہی بات بے جی نے بتائی تھی تو اس کا دل مہتاب کی ہمدردی سے لبالب بھر کے چھلکنے لگا تھا۔ اس نے
بھابیوں کی شان میں اس نے خاصے گستاخ کلمات بھی بے جی کے سامنے دُہرائے تھے۔ مگر اب حالات کچھ
دوسرے تھے۔

آج اسے مہتاب کے بجائے اس کی بھابیوں سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ جن کو اسے نجانے کب تک
برداشت کرنا تھا۔

"اپنے شوہر سے صلح صفائی کیوں نہیں کر لیتی؟"

"بتیرا سمجھایا ہے ساری برادری نے..... مت دی ہے کہ اپنے بچوں کے لیے سر نیچا کر لے۔ مرد سے معافی
مانگنے میں شرم کیسی مگر یہ ضد پہ ہے کہ مختار نہ صرف سوت باہر نکالے بلکہ اس سے معافی بھی مانگے اور ہرجانے
کے طور پر اکیس مربعے لکھ کر دے۔ بھلا ایسا ہوا ہے کبھی؟"

"یہ تو صاف نہ بسنے والی بات ہے۔" مدیحہ چونکی۔

"یعنی نہ مختار بھائی صاحب یہ مانیں گے..... نہ صلح کی نوبت آئے گی۔ توبہ..... کتنی نفرت بھری ہے اس عورت
کے اندر گھر بچانے کے لیے کیا نہیں کرنا پڑتا۔ ایسی منہ زوری تو یہاں شہر کی عورتیں نہیں دکھاتیں بے جی!"

"پتہ نہیں کی ہو گیا اے زمانے نوں۔" انہوں نے لمبا سا ہوکا بھرا۔

"مختار تو اک چھوڑ چار زنانیاں حویلی میں رکھ لے..... حویلی میں کوئی جگہ کم تھوڑی ہے۔ پتہ نہیں اس مہتاب
کو کیا پیڑ..... خیر تو فکر نہ کر۔ میں بات کرتی ہوں تیرے بھرا سے۔ شہر کوئی پھیرا لگے تو اسے لیتا آئے۔"

"یاد سے کہنا بے جی!"

"ہاں ہاں ابھی کہتی ہوں۔ خیر سے گھر پہ ہی ہے آج۔"

"سسرال حاضری دے آئے؟ اجازت مل گئی گھر آنے کی؟" مدیحہ نے طنز کیا۔

"کی کرے فیرو چارہ..... تیرے سوہرے کی ذمہ داری بھی اس نے ہی نبھانی ہے۔ جوائی جو ہوا اس کا اور سگا بھتیجا
بھی۔ اپنا پتر تو اس کا شہر جا کے بس گیا ہے۔ یہ تو میرا پتر ہے جو دوہری ذمہ داریاں نبھا رہا ہے۔ اپنے گھر کی بھی اور
سسرال کی بھی۔ کدھر ملتا ہے ایسا جوائی ایک ہمارا جوائی ہے..... تیرا بندہ اللہ سلامت رکھے ہنستا کھیلتا رہے
بس تیرا گلہ ہوتا ہے کہ کبھی سلام دعا کا بھی فون نہیں کرتا۔ ورے کے ورے دن (تہوار) پہ بھی نہیں۔"

"اچھا بے جی..... ! میرا سلام کہنا بھائی جان سے۔"

شوہر سے خود کتنے بھی گلے ہوں کسی اور سے اس کی برائی وہ سن نہیں پاتی تھی۔ یہ اس کی محبت ہی تھی جو
شوہر پہ بے اعتباری ہونے کے باوجود وہ یہاں خاندان سے الگ رہنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ اس کی جھکی
نظریں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب سے اس کی چوری سسر اور سالے کے سامنے پکڑی گئی تھی وہ کچے چوروں کی
طرح ان سے جھینپا جھینپا رہتا تھا۔

"یہ کیا آپا؟" لاؤنج میں آتے ہی وہ دھک سے رہ گئی۔

وہ بالوں کے بعد اب پیروں پہ مہندی تھوپے ہوئے تھیں اور اس لیپا پوتی کے بعد صوفے پہ ہی سو گئی تھی.....
سر کے نیچے کشن ضرور رکھا تھا اور پیروں کے نیچے اپنا جارجٹ کا دوپٹہ بھی گول مول کر کے رکھ لیا تھا لیکن اس کے
باوجود مہندی کے کئی داغ صوفے پہ لگ چکے تھے۔

"آپا..... !" وہ اس کے سر پہ آ کے چلائی۔

جعفر کی ناراضی کے خوف سے اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی اور اس کا اپنا دل بھی برا ہو رہا تھا اتنے قیمتی صوفے
کی یہ درگت بنتے دیکھ کر۔

"آئے..... ہائے کیا ہوا؟" وہ ہڑبڑا کے اٹھی اور حواس باختہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟ بچے کدھر ہیں؟"

"وہ تو اپنے کمرے میں ہیں مگر..... یہ آپ نے..... مہندی پیروں پہ لگا کر آپ صوفے پہ ہی سو گئیں۔"

"ہاں....." وہ لمبی سی جمائی لینے لگی۔ جمائی ابھی تمام نہ ہوئی تھی کہ انگڑائی لینے کے لیے بازو اٹھا دیے۔
وہ صبر کے گھونٹ بھرتی اس انگڑائی کے ٹوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"ہاں..... وہ آلسی (سستی) سی ہو رہی تھی..... ادھر ہی پڑ گئی۔"

"مگر آپا..... ! یہ دیکھیں مہندی کے داغ....." وہ روہانسی ہو چکی تھی۔

"ہا ہائے..... ستیاناس جائے اس نیند کا۔"

وہ خود کو کوستی اس طرح ہڑبڑا کے اٹھی کہ مہندی سے بھرے پیر سیدھے قالین پہ رکھ دیے۔

"یا اللہ..... ! کس عذاب میں پھنس گئی ہوں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی جلدی سے میز سے اخبار کھینچ کر ہی قالین صاف کرنے لگی پھر ملازمہ کو بھی آواز دے ڈالی۔

"عذاب تو تُو نے خود اپنے جی کو ڈالا ہوا ہے۔ ہر طرف مصیبتیں، کہیں قالین..... کہیں گملے..... کہیں گھڑیال
کھڑے ہیں تو کہیں چھ چھ فٹ لمبے لیمپ..... پٹیوں والے پردے الگ سیاپا ڈال رہے ہوتے ہیں۔ کل میرا دوپٹہ
پھنس گیا تھا کنڈے میں۔ صوفے ہیں تو وہ چٹے دودھ۔ بھلا اٹھنے بیٹھنے کے لیے کوئی میل خورے رنگ کے صوفے
لینے تھے۔ میرا تو دس دن میں ساہ اوکھا ہو گیا ہے، کیسے رہ لیتی ہے تُو....."

اس کا موڈ اتنا خراب تھا کہ بغیر کوئی جواب دیے ملازمہ کو قالین صاف کرتے دیکھتی رہی۔
مہتاب کو برا لگا۔

"میں کون سا شوق سے رہ رہی ہوں یہاں..... گھر سے نکالی عورت کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے..... بھرجائیوں کے طعنے

سن کر دل گھبرایا تو تاؤ جی کے پاس آ گئی..... وہاں سے تو نے بلا بھیجا' آ گئی منہ اٹھا کے 'اب جاؤں تو کیسے جاؤں' سا
نہیں دل لگ رہا تیرے اس شیش محل میں۔ اپنے پنڈ میں ہی بھلی میں..... مگر کبھی اکیلی گھر سے نکلی نہیں' جاؤں

"بھائی جان نے کسی کام سے شہر آنا ہے کل..... یہاں تو آئیں گے ہی..... آپ کو جانا ہے تو ان کے ساتھ
جایئے گا۔"

مدیحہ نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے واپسی کے ارادے پہ رضامندی کی مہر لگا دی۔

"اچھا..... کب آ رہا ہے۔" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"خیریت سے تشریف آوری ہوئی ہے تمہارے بھائی کی؟" جعفر نے کمرے میں آتے ہی بریف کیس ایک
جانب پھینکا اور اس سے کڑے تیوروں کے ساتھ سوال کیا۔

اسے ڈر سا تھا کہ کہیں..... بھائی صاحب کی اسلام آباد آمد مدیحہ کی کسی شکایت کی وجہ سے نہ ہو۔ اسے
جعفر کے ہر عمل پہ شک رہتا تھا۔ بار بار آفس میں بھی فون کر کے چیک کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھوں
تھا ہی..... ان کی آمد سے اور بھی خائف ہو گیا۔

"اپنے کسی کام سے آئے ہوں گے۔" اسے بھی جعفر کو گھبرایا گھبرایا دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔

"مگر رات رکنے کا پروگرام کیسے بنا لیا؟"

"ان کی بہن کا گھر ہے' رہ سکتے ہیں۔"

"پورے قصور کا گھر ہے یہ..... سارا قصور آ کے رہ سکتا ہے۔" وہ ٹائی گلے سے نوچتا ہوا بڑبڑایا۔

"جب سے یہاں آئے ہیں' پہلی بار میرے میکے سے کوئی رہنے آیا ہے حالانکہ میرے میکے کا تو صرف نام
..... مہتاب آپا کا آپ سے بھی وہی رشتہ ہے جو مجھ سے ہے اور بھائی جان بھی آپ کے کچھ لگتے ہیں۔ بڑے
ہیں آپ کے..... میرے بھائی ہونے کے ناتے نہ سہی 'اپنی بڑی بہن کے شوہر ہونے کے ناتے ہی احترام کر لیں۔"

"میں کون سا گئے..... رہا ہوں..... احترام ہی کر رہا ہوں اتنے سالوں سے۔"

"وہ..... آپا کو لے جانے آئے ہیں' میں نے ہی کہا تھا۔"

"بس؟..... دل بھر گیا میزبانی سے؟"

"آپ کو بلاوجہ تکلیف ہو رہی تھی' اس لیے مجھے خود کہنا پڑا' ورنہ کتنا برا لگتا ہے گھر آئے مہمان کو منہ سے
کہہ کر بھیجنا۔"

"اگر وہ اسے لے جانے آئے ہیں تو ٹھیک ہیں۔ پھر شاید ان کی ایک رات کی میزبانی برداشت ہو سکتی ہے۔"

"جعفر! وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔" مدیحہ کو سخت برا لگا۔ اس نے فوراً "جتا بھی دیا۔

"میں تمہارے بھائی کے بارے میں نہیں 'اپنے بہنوئی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"

جعفر نے دل جلانے والی مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی۔

☼ ☼ ☼

"ماما! دیکھیں میں کتنی اچھی لگ رہی ہوں۔"

وشمہ اس کا ستاروں والا دوپٹہ سر پہ لے کر معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

منزہ نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اپنی وشمہ کے سر کا صدقہ ہی سمجھ لیں۔"

پروین کے الفاظ کی بازگشت اسے ایک پل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

"میں نے یہ شادی کر کے ٹھیک کیا یا غلط..... ابھی تک فیصلہ نہیں کر پا رہی..... مجھے تحفظ مل گیا..... چھت مل
گئی..... مگر میری بیٹی اسے کیا ملا؟ صدقہ۔"

اس نے اپنے آنسو اندر ہی اتار لیے۔

"میرے اس قدم نے میری لاڈوں پلی کو کتنا ہلکا کر دیا ہے۔ کیا کیا سوچا تھا میں نے اس کے بارے میں اور 'اور کیا
ہو رہا ہے اس کے ساتھ۔"

"ماما! دیکھیں ناں یہ دوپٹہ 'ماما! مجھے اور آپی کو بھی ایسا دوپٹہ لے کر دو۔"

وشمہ کی آواز پہ وہ پھر خیالوں سے باہر آئی۔

بابا کا وشمہ سے رویہ بہت لیے دیے تھا۔ مگر وشمہ شاید نبی ہی محبتیں گوندھ کر تھی کہ منزہ تو منزہ وہ خود سے
بیزار رہنے والی سوہا کے بھی آگے پیچھے گھوما کرتی۔ اپنے نام سے پہلے اس کا نام لیتی۔ جیسے ابھی ابھی اس دوپٹے کی
فرمائش اس نے صرف اپنے لیے نہیں 'اس کے لیے بھی کی تھی۔ اس بات سے منزہ کی سوچ نے ایک مثبت رخ
اختیار کیا۔

"تنویر کا رویہ تو سوہا کے ساتھ ٹھیک ہے۔ مانا کہ سگے باپ والا والہانہ انداز نہیں مگر اب سب کچھ تو ملنے سے
رہا۔ یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے سوتیلا باپ بن کے کبھی نہیں سوچا۔ کبھی وشمہ کے ساتھ اسے میری گود میں دیکھ کر
ناگواری نہیں جتائی۔ اس کی کسی ضرورت سے منہ نہیں موڑا..... اسے بہترین اسکول میں داخل کرایا ہے۔ میں
نے ان کی آنکھوں میں اب تک اس کے لیے بے زاری نہیں دیکھی۔ وشمہ بھی اس کی دیوانی ہے۔ وقت گزرنے
کے ساتھ ساتھ یہ محبت اور پروان چڑھے گی۔ مجھے پروین جیسی عورتوں کی بے سروپا باتوں پہ اپنا دل میلا نہیں کرنا
چاہیے۔"

اس نے خود کو مزید یاسیت کا شکار نہ ہونے دیا۔ ایک تاسف کی لہر بھی رہ رہ کے اٹھ رہی تھی مگر وہ اب ملول
نہیں تھی۔

"میری گڑیا کو ابھی سے دوپٹہ لینے کے ارمان ہیں۔" وشمہ کو گود میں بھر کے اس کے پھولے پھولے گالوں پہ چٹا
چٹ پیار کرتے ہوئے وہ اپنا دھیان بٹا رہی تھی۔

اسی وقت پروین دروازے پہ آ رکی۔

جب سے آئی تھی' فرصت سے اس کے پاس بیٹھ کے کوئی ڈھنگ کی بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ماں کے
دکھڑے ہی ختم نہ ہو رہے تھے۔ وشمہ سے اس کے لاڈ دیکھتے ہوئے وہ وہیں کھڑی مسکرانے لگی۔

منزہ' وشمہ کو گود میں لیے دروازے کی جانب پشت کیے ہوئے تھی وہ اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ پا رہی تھی مگر اس کے
لہجے سے ٹپکتی حلاوت اور وشمہ کے گرد لپٹا اس کا محبت سے بھرپور لمس اسے احساس دلا رہا تھا کہ شمشاد بیگم کے
خدشے کتنے بے بنیاد ہیں۔

"میں اپنی گڑیا کے لیے اس سے بھی اچھا دوپٹہ لوں گی' بالکل پری لگے گی۔" منزہ نے اس کی پیشانی چومی۔

"پری کیا ہوتی ہے ماما؟"

"پری..... " وہ سوچنے لگی۔

"ہوتی ہے کچھ..... پیاری سی..... اچھی سی۔"

"مجھ سے بھی زیادہ؟"

"نہیں' وشمہ سے نہیں۔ وشمہ ساری پریوں سے پیاری ہے۔"

"سب سے زیادہ۔" وہ خوش ہو گئی۔ "آپی سے بھی زیادہ؟"

اس سوال پہ دروازے پہ کھڑی پروین کا رواں رواں جواب کا منتظر تھا۔

"ہاں..... آپی سے بھی زیادہ۔" پروین ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی۔

"بھلا یہاں کوئی ہے جسے سنانے کے لیے وہ اچھی بنتے ہوئے اس سوتیلی کے مقابلے میں اپنی بیٹی کو ...
گی..... یقیناً" وشمہ کو سگی ماں سے بڑھ کر چاہنے والی سوتیلی ماں ملی ہے۔" وہ مسکرا کے پلٹنے لگی۔
ماں بیٹی کے درمیان آنا اسے اس حسین منظر میں خلل ڈالنے جیسا لگ رہا تھا۔

"پھوپھو سے بھی زیادہ؟" اپنا ذکر سن کر غیر ارادی طور پہ وہ رکی۔

"پھوپھو؟" منزہ جو وشمہ سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے اپنا دھیان پروین سے ہٹانا چاہ رہی تھی' پھر ...
ہو گئی۔ وہ ساری دل جلانے والی تکلیف دہ باتیں یاد آنے لگیں۔

"بتائیں ناں ماما! پھوپھو سے بھی اچھی؟"

"تمہاری پھوپھو اچھی کب ہیں؟"

منزہ تنفر سے بڑبڑائی۔ اپنی بیٹی کے بارے میں جس کے منہ سے ایسی باتیں سنی ہوں' اس کے لیے دل میں ...
ہی غبار بھرا تھا۔

"پھوپھو بری ہیں؟" وشمہ نے حیرت سے سرگوشی کی۔

"ہاں..... بہت۔" منزہ کو دل کا بوجھ بانٹنے کے لیے اس چار سالہ بچی کا دم غنیمت لگا' جس نے کچھ دیر بعد
بھول بھال جانا تھا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ بات وہ بھی سن رہی ہے جو زندگی بھر اسے بھلانے والی نہیں۔

● ● ●

مکرم باجوہ کے آنے کے بعد مدیحہ نے سکون کا سانس لیا۔ اب مہتاب آپا کے یہاں سے ٹلنے کے آثار
آ رہے تھے۔

"میری توبہ جو اب کبھی جعفر کی ضد میں وہاں کے کسی فرد کو گھر پہ ٹھہرایا تو۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔
مہتاب کی چند دنوں کی میزبانی نے اسے توبہ توبہ کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اپنی اس حرکت پر وہ خود چونکی بھی
ہوئی۔

"جعفر کو شہر آ کر بدل جانے کے طعنے دینے والی مدیحہ کیا خود بھی اسی کے رنگ میں رنگتی جا رہی ہے؟" اس نے
خود سے سوال کیا۔

جواب اثبات میں ملا' وہ جھینپ گئی۔

یہ سچ ہے کہ اب اسلام آباد کے اس پُرسکون' پُرفضا علاقے کی اس پُرآسائش کوٹھی میں رہنے کے چند دن
بعد ہی اس پہ سے چوہدرائن مدیحہ کا خول اتر گیا تھا۔ حالانکہ اس کا کہیں آنا جانا' جعفر کے سرکل کے لوگوں سے
جلنا نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے باوجود اس نے تیزی سے خود کو بدلا تھا۔ جعفر کو ابتدا میں خدشہ تھا کہ نجانے
طرزِ زندگی کو سنبھال بھی پاتی ہے یا نہیں مگر کم از کم اس نے اس ایک معاملے میں تو اسے بے فکر کر رکھا تھا۔ نیم
جیسی قابلِ بھروسہ اور تجربہ کار ہاؤس کیپر' جس نے مدیحہ جیسی پینڈو مالکن کو ہفتوں میں سچ مچ کی میڈم بنا ڈالا تھا۔
اب باقاعدگی سے پارلر جاتی' بال ڈائی کروا لیے تھے۔ لباس بھی عمدہ سلا ہوتا۔ گھر کی ڈیکوریشن دیکھنے والی
تھی۔ بچیاں بھی اچھے اسکول جانے کی وجہ سے جدید طور طریقے سیکھ گئی تھیں' ورنہ گاؤں سے نکلتی ہی نہ
ایسے مستقل بسیرے تھے جوؤں کے' اور تحریم' تطہیر بات بات پہ گتھم گتھا ہو جایا کرتیں۔ جعفر ان حرکتوں کو
دیکھ کر کڑھا کرتا۔

اب سب ٹھیک تھا' بالکل ویسے ہی جیسے وہ چاہتا تھا۔
ایک نک سک سے درست بیوی۔
سجا سنورا پرسکون گھر۔
باتمیز' ذہین' صاف ستھری اولاد.....
مگر کہیں ایک کمی تھی۔

کمی اس کے اور مدیحہ کے رشتے میں تھی۔
اور یہ ... جس کا ازالہ چاہ کے بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔
ہر بار مدیحہ کچھ نہ کچھ ایسا کر دیتی جس سے وہ چڑ جاتا اور چڑ کے مزید دور ہو جاتا۔
اس کا چڑنا مدیحہ کو بتا دیتا۔ وہ اور بھی اپنے میں سمٹ جاتی۔ ایسے میں فاصلے تو جوں کے توں رہنے ہی تھے۔
مہتاب آپا کی آمد بھی ایسی ہی ایک چڑ کا نتیجہ تھی مگر اب مدیحہ یہ جان چکی تھی کہ نامحسوس طریقے سے وہ رفتہ
رفتہ جعفر کے رنگ میں ہی رنگ چکی ہے اور اب صرف اس کی مخالفت میں کچھ کرنے کا مطلب اپنے آپ کو
عذاب میں ڈالنا ہے۔

مہتاب آپا نے ان چند دنوں میں اسے ناک تک بھر دیا تھا۔ وہ ایک ایک منٹ گن رہی تھی کہ کب وہ اپنا بیگ
اٹھاتی ہیں اور یہاں سے سدھارتی ہیں۔

مکرم باجوہ کے آنے پہ جتنی ہلکی پھلکی وہ ہوئی تھی' اتنی ہی سرشار مہتاب آپا بھی نظر آ رہی تھیں جس سے صاف
ظاہر تھا کہ ان کا بھی یہاں رہنے کا تجربہ خاص خوشگوار نہ تھا۔

"جعفر کس وقت تک آتا ہے؟" مکرم باجوہ کا انداز ٹوہ لینے والا تھا۔

"آجاتے ہیں چھ سوا چھ بجے تک۔"

اس نے محتاط جواب دیا' ورنہ جعفر کے آنے کا کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا۔

"اور جاتا کتنے بجے ہے۔"

"دس ساڑھے دس تک۔"

"ہونہہ..... جانے کا بھی ٹائم مقرر..... آنے کا بھی..... یہ ہے وہ آزادی جس کے لیے روتا تھا؟" مکرم نے طنزیہ
ہنکارا بھر کے کہا۔

"تیرے بندے کی ہڈیوں میں نوکر بن کے رہنا رچ گیا ہے۔ جب سرکار کا نوکر تھا' تب تک تو آنے جانے کے
وقت میں سرکاری نوکری کی وجہ سے پابندی سمجھ میں آتی ہے۔ اب اپنا کاروبار ہے پھر بھی وقت کی غلامی؟"

"خود وقت کی پابندی کریں گے تو ملازم بھی کریں گے نا بھائی جی۔"

"بڑی باتیں آ گئی ہیں تجھے مدیحہ....." مکرم مسکرایا۔

"اپنے مجازی خدا کی وکالت کرنے میں تمہاری بہن بڑی تیز ہے مکرم۔" مہتاب آپا نے اپنے سابقہ تجربات کی
بنا پہ بیان دیا۔

"اچھی بات ہے۔" مکرم نے مسکرا کے سر ہلایا۔ "بندہ چاہے جیسا بھی ہو' گھر والی کو اس کا پردہ رکھنے کا گُر آنا
چاہیے۔ یہی خاندانی اور اصل عورتوں کی پہچان ہے' اسی لیے تو بندے باہر جتنا بھی منہ مار لیں' نکاح کے بول
خاندانی عورت سے ہی پڑھواتے ہیں۔ پتہ ہوتا ہے نہ کہ چورا ہے پہ ان کے کرتوتوں کا تماشا نہیں لگائے گی۔ کسی
امانت کی طرح سنبھال سنبھال کے رکھے گی۔ اس کی بے ایمانیوں کو بھی۔"

"مجھے جتا رہے ہو مکرم؟" مہتاب نے تیکھے چتون کر کے پوچھا۔
مدیحہ تو مدیحہ..... مکرم جیسا دبنگ مرد بھی گڑبڑا گیا۔
اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی بات کو وہ اس رنگ میں بھی لے گی۔

"لے..... جھلی نہ ہووے تے....." وہ خفت سے مسکرانے لگا۔
"بھائی جی نے تو یونہی ایک بات کی تھی آپا؟"
مدیحہ نے بھی جلدی سے وضاحت پیش کی۔ اسے ڈر تھا کہ آپا مکرم سے بگڑ گئیں تو اس کے ساتھ جانے سے
انکار نہ کر دیں۔

"یونہی کی باتیں بھی بعض اوقات سیدھی کلیجے میں جا لگتی ہیں مکرم..... دھیان رکھا کر۔"

وہ دوپٹے کے کونے سے آنکھیں رگڑنے لگیں اور مدیحہ جی جان سے سلگ اٹھی۔

"ایک تو کلیجہ ہاتھوں میں لیے پھرتی ہیں مہتاب آپا! جلنے کو بھی ہر وقت تیار... ٹھیس لگنے کو بھی تیار۔" اس نے جل کے سوچا۔

"مختار جیسا مرد جو ہو کسی کے کالے نصیبوں میں پھر میں دیکھتی ہوں کہ وہ کتنے پردے رکھتی۔ سارا ایک جھٹکے میں نکل جاتا' وہ ہے ہی اس قابل کہ اس کا تماشا چوک میں لگوایا جائے۔"

"چل چھوڑ مہتاب! جانے دے۔"

مدیحہ کو حیرت ہوئی۔ مکرم یہ بات کہہ کیسے رہا ہے اور کس دل سے۔ وہ تو عورتوں کی اس سوچ کا مخالف... وہ تو ان مردوں میں سے تھا جن کا اس بات پہ پختہ ایمان تھا کہ عورت صرف سہنے اور برداشت کرنے کے لیے بنائی گئی ہے اور اسے دنیا میں اپنے صرف اسی ایک ہنر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

"چھوڑ دیا ہے... جانے دیا... کب کا..."

اگلے ہی پل مہتاب قہقہہ لگا کے ہنس پڑیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے پروین! بہت چپ چپ سی ہو۔ جب سے اپنی ماں کے ہاں سے آئی ہو۔ کوئی بات ہوئی ہے؟"

"نہیں اماں جان! بات کیا ہونی ہے۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک تو ہیں شمشاد بہن؟"

"شکر ہے اللہ کا۔"

"نوید بیٹا؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ آج کل مصروف زیادہ ہیں۔ بتایا تھا نا آپ کو کہ گھر پہ کچھ کام شروع کروایا تھا انہوں۔ کاروباری مصروفیات بھی خاصی بڑھی ہیں۔"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ لگتا ہے نئی دلہن کے قدم مبارک ثابت ہوئے ہیں۔ دل لگ گیا ہے تمہارے... کا؟"

"ان کے دل کا حال میں کیا جانوں اماں جان!"

وہ پھیکا سا مسکرائی۔

اور شوکت جہاں نے جیسے اس کی اداسی کا سرا پکڑ لیا۔

"وشمہ تو بہل گئی ہوگی نئی ماں کے آنے سے اور اس کی بیٹی کی صورت میں اسے ساتھی بھی مل گئی۔"

"ہاں اماں جان! بچی ہی تو ہے۔ وہ بھی پیار اور توجہ کو ترسی ہوئی۔ ایسے پروانوں کی طرح نثار ہوتی رہتی ماں پہ..."

"اور ماں؟"

"وہ..." پروین سوچ میں پڑ گئی۔ پھر وہ جواب دیا جو سچا تھا۔ چاہے اس کی سچائی دل کو بھی لگے یا نہ لگے۔

"وہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ پیار اور توجہ دے رہی ہے' جب ہی تو وشمہ اتنی دیوانی ہو رہی ہے اس کے لیے"

"ماشاء اللہ... ماشاء اللہ۔" انہوں نے ایک بار پھر وہی کلمات دہرائے۔

"شکر ہے اللہ کا کہ اس نے نوید کا گھر اور بچی سنبھالنے کے لیے صحیح عورت بھیجی' ورنہ دوسری شادی... جوا ہوتا ہے۔ اب تمہاری اماں بھی مطمئن ہوں گی۔"

"نہیں' وہ ابھی مطمئن نہیں ہیں۔ دراصل بھابھی کا رویہ بھائی جان اور وشمہ کے ساتھ تو ٹھیک ہے مگر... اور اماں سے وہ لیے دیے ہی رہتی ہے۔"

"وہ کیوں بھلا؟" شوکت جہاں کو تعجب ہوا۔

"تمہاری اماں سے تو اس کا رویہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کا مزاج ذرا... اور پھر دن رات کا ساتھ۔ ہو جاتی ہے کوئی اونچ نیچ مگر تمہارا تو کبھی کبھار کا گھڑی دو گھڑی کا جانا ہے اور جہاں تک میں تمہارا مزاج جانتی ہوں تم ایسی عورتوں میں سے ہو بھی نہیں' جو نند بن کے گند پھیلائیں پھر تم سے کیوں کٹ کے رہتی ہے؟"

"یہی تو سمجھ نہیں آتا کہ مجھ سے کدورت رکھنے کی کیا وجہ ہے؟"

"تم نے ذرا پیار سے' دوستانہ انداز سے پوچھا ہوتا۔"

"رہنے دیں اماں جان!" وہ اکتا گئی۔

"نہیں پوچھنا ہوتا... سے کوئی تعلق۔ بعض عورتیں ہوتی ہیں ایسی کہ ہم بھلے... ہمارا میاں بھلا... سسرال جائے بھاڑ میں۔ بس ڈر لگتا ہے تو اس بات سے کہ کہیں وہ آہستہ آہستہ بھائی جان کو بھی مجھ سے اور ماں سے بیزار نہ کردے۔"

"ایسا نہیں ہوگا' بے فکر رہو۔"

"ہو بھی تو سکتا ہے اماں جان! وہ خود ہمیں برداشت نہ کر سکتی ہو' وہ اپنے شوہر کا میل جول اور پیار ہم سے بڑھتا دیکھ کر کیسے برداشت کرے گی۔"

"جو عورت سوکن کی اولاد کھلے دل سے برداشت کر سکتی ہے پروین! پھر وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔"

وہ رسانیت سے مسکرائیں۔

"نہیں اماں جان! مجھے اس کی جانب سے ایک دھڑکا سا لگ گیا ہے۔ اس نے وشمہ کو بھی پوری طرح سے اپنے بس میں کر لیا ہے۔ دادی کون ہے... پھوپھی کون ہے... وہ یہ جانتی ہی نہیں۔ بس اسی کی ہو کے رہ گئی ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"اچھی بات یہ ہے کہ اس نے نئی ماں کو قبول کر لیا ہے مگر یہ تو اچھی بات نہیں کہ وہ اپنے سگے رشتوں کو بھول ہی جائے۔ وہ بچی ہے' گلہ اس سے نہیں ہے۔ یہ منزہ بھابھی ہی کچھ اس کے ذہن میں ایسا بھر رہی ہیں اور جیسے جیسے وشمہ بڑی ہوتی جائے گی' دیکھنا اس کی یہ بیزاری بھی نفرت میں بدلتی جائے گی۔"

"اچھا... مگر..." وہ یقین کرنے میں متامل تھیں مگر یہ بھی جانتی تھیں کہ پروین سنی سنائی پہ ایمان نہیں لاتی۔ ضرور اس نے کچھ ایسا مشاہدہ کیا ہوگا جس کی وجہ سے یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئی۔

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کرے گی کیوں؟"

"مجھے اور اماں کو نوید بھائی جان اور وشمہ کی زندگی سے نکال پھینکنے کے لیے پھر وہ جو سیاہ کرے' سفید کرے' کوئی نہ دیکھنے والا ہو' نہ باز پرس کرنے والا۔"

اس نے وہی رٹا رٹایا جواب دیا جو شمشاد بیگم سے سنا تھا۔

شوکت جہاں لحظہ بھر کو چپ کر گئیں۔

پھر کہا تو فقط اتنا...

"کسی بھی نتیجے پہ اتنی جلدی نہیں پہنچنا چاہیے۔ شادی کے بعد ان گنتی کے مہینوں میں تم گنتی کے برابر ہی ملی ہو اس سے۔ پہلے جان لو... پرکھ لو پھر فیصلہ کرو پھر رائے قائم کرو۔"

"اور کیا جاننا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"تمہاری پھوپھو اچھی کب ہیں؟"

منزہ کی تنفر میں ڈوبی سرگوشی سنائی دی۔

"پھوپھو بری ہیں؟"

وشمہ کا تجسس سے بھرپور سوال۔

"ہاں بہت۔"

اور منزہ کا وہ جواب یاد آیا اور پروین کی اس کے بارے میں رائے اور توانا ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"حسان بھائی۔۔۔ آپ کے پاس سیل ہیں؟" ردا نے سیڑھیاں اترتے اترتے پوچھا۔

"کیوں کیا کرنے ہیں؟"

وہ بیٹ گھماتا پارک جا رہا تھا' رک کر پوچھنے لگا۔

"چاہئیں نا' میرے ویک ہو گئے ہیں۔"

وہ آخری دو سیڑھیاں جست لگا کے اتری۔

"اوہو' ویک ہو گئے ہیں۔ تمہارے سیل ویک ہو گئے ہوتے تو ایک طرف ٹھس کر کے پڑی ہوتیں۔ چھلانگیں نہ مار رہی ہوتیں۔"

احسن نے ٹھٹھا لگانے کے انداز میں کہا۔

وہ ابھی سے فقرے چست کرنے میں بڑا ماہر تھا۔

"میرے نہیں' میری ڈول کے۔"

اس نے ٹھنک کر جواب دیا۔

"اچھا اچھا۔۔۔ وہی والی ڈول جسے کمر ہلا ہلا کے مٹکنے کے اور کوئی کام نہیں ہے اور گانا کون سا گاتی ہے؟ چھیاں چھیاں چھیاں چھیاں۔"

وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کے گھومتے ہوئے گانے لگا۔

وصی نے تالیاں پیٹ پیٹ کر ہنسنا شروع کر دیا۔

حسان نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔ اگر وہ بھی ہنس دیتا تو شاید ردا رو ہی دیتی۔

"حسان بھائی دیکھیں نا ان دونوں کو۔ بدتمیزی کر رہے ہیں۔"

"بدتمیز تمہاری ڈول ہے۔ ہر وقت ناچتی اور گاتی رہتی ہے۔ شور مچاتی رہتی ہے۔ اچھا ہوا اس کے سیل ویک ہو گئے ہیں۔ ایک جگہ آرام سے پڑی رہے گی۔"

"میرے پاس نئے سیل تو کوئی نہیں ہیں۔ کن سے نکال دوں؟" حسان نے اسے منہ بسورتے دیکھ کر پوچھا۔

"ابھی پرسوں ہی ڈالے تھے۔"

"ٹھیک ہے' دے دیں۔"

"ہاں ہاں' دے دیں حسان بھائی! اس کی ڈول بے چاری تھک گئی ہو گی آرام کرتے کرتے۔ یہ بھی بور ہو گئی ہو گی' کتنے دنوں سے سنا نہیں ہو گا۔ چل چھیاں چھیاں چھیاں چھیاں۔۔۔"

احسن پھر سے ناچنے لگا۔ وصی بھی دوبارہ تالیاں بجانے لگا۔

"چپ کرو احسن!" حسان نے ڈانٹا۔

"یہ وصی کو بھی بدتمیزی سکھا رہا ہے۔"

ردا نے جھٹ شکایت جڑی۔ حسان اندر سے سیل لانے چلا گیا۔

"تو تم تمیز سکھا دو۔" احسن نے منہ چڑایا اور مزید کہا۔

"ہمارا بھائی ہے' ہم جو مرضی سکھائیں۔"

"اوہووو۔۔۔" ردا نے جوابی منہ چڑایا۔

"بڑا آیا بھائی۔۔۔ تمہارا بھائی کہاں سے ہے یہ؟"

"اچھا تو کیا تمہارا ہے؟"

احسن لڑنے پہ مل گیا۔

وصی کو اپنا آپ اچانک اہم سا لگنے لگا' اس کی وجہ سے وہ دونوں جھگڑ رہے تھے۔ اسے اس لڑائی کو دیکھنے میں مزا آنے لگا۔

"میرا کیوں ہونے لگا؟ نہ یہ میرا بھائی ہے نہ تمہارا بھائی۔ یہ کسی کا بھی بھائی نہیں ہے' اس کا کوئی بھائی یا بہن جو نہیں۔"

ردا نے عجیب ہی نکتہ نکالا۔

زبان دراز اور حاضر جواب احسن بھی ایک لمحہ کے لیے چپ کر گیا۔ البتہ وصی معاملہ سمجھا نہیں اور بول اٹھا۔

"احسن میرا بھائی ہے۔۔۔ حسان بھائی میرے بھائی ہیں۔۔۔ ندا آپا میری بہن ہیں۔ تم گندی ہو' تم میری بہن نہیں ہو۔"

"ندا آپا بھی تمہاری بہن نہیں ہیں۔ اچھا جی۔۔۔" اس نے گردن لٹکائی۔

"اور نہ احسن اور حسان بھائی تمہارے بھائی ہیں۔ ہم صرف تمہارے کزنز ہیں' سمجھے۔ بڑے آئے۔۔۔"

"ردا! کیا بدتمیزی کر رہی ہو۔" حسان نے باہر آتے آتے اس کے الفاظ سنے تو ڈانٹا۔

"تھینک یو حسان بھائی!" وہ سیل جھپٹ کے دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

حسان نے پلٹ کے وصی کو دیکھا۔ وہ گم صم کھڑا تھا۔

معصوم آنکھوں میں ایک تحیر بھرا سوال ہلکورے لے رہا تھا۔

بھولے بھالے چہرے پہ ایک سہم و ہراس پھیلا ہوا تھا۔

اور نیم وا لب جیسے بہت کچھ پوچھنے کو مچل رہے تھے۔

حسان نے اس کے بال سہلائے۔

"کرکٹ کھیلنے چلو گے' میرے ساتھ؟"

سارے سوال۔۔۔ ساری حیرت۔۔۔ سارا ہراس جیسے پر لگا کے اڑن چھو ہو گیا۔۔۔ وہ خوشی خوشی سر ہلانے لگا۔

"شوز پہن کے آؤں؟"

اس نے چپل اتارتے ہوئے بے تابی اور اشتیاق کے ملے جلے جذبے کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں اور منہ بھی دھو کے' بالوں میں کنگھا کر کے آؤ۔ حسان بھائی کے دوست کیا کہیں گے' ان کا بھائی اتنا گندا بچہ ہے۔"

احسن نے اس کا دھیان بٹ جانے پہ مسکرا کے کہا۔

"کپڑے بدلوں حسان بھائی! یا یہ ٹام اینڈ جیری والی شرٹ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک نہیں' ٹھاک ہے۔"

وہ تیزی سے اندر کی جانب بھاگا۔

"کتنی گندی ہے اور بدتمیز بھی۔"

احسن نے دبے الفاظ میں رائے دی۔

"ہوں۔۔۔" حسان نے تائید کی۔

☼ ☼ ☼

"ادھر کہاں بھاگی جا رہی ہے؟"

شمشاد بیگم نے منزہ کے کمرے تک جاتی وشمہ کا ننھا سا بازو دبوچ لیا۔

"دادی۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ ماما پاس۔۔۔"

اس سے پہلے کہ اس کی آواز اونچی ہوتی' لمبی تڑنگی شمشاد نے اسے بغل میں کسی چابی والے کھلونے کی طرح دبایا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وشمہ نے بہتیری ٹانگیں چلائیں۔

"چپ۔۔۔" شمشاد نے لا کے اسے بستر پہ پٹخا۔ "بند کر آواز۔"

"ماما پاس جانا ہے۔" وہ بسورنے لگی۔ ڈر کے مارے آواز اب کے ہلکی ہی تھی۔

"کیوں' ماما تیری کیا بتاشے بانٹ رہی ہے۔"

"ماما میرے اور آپی کے لیے نیا فراک لائی ہیں۔"

وہ جوش سے بتانے لگی۔ دادی کی ڈانٹ کے غم پہ نئے فراک کی ہیجان آمیز خوشی غالب آ گئی تھی۔

"تیری آپی کا آیا ہے نیا فراک۔۔۔ تیرا تو پرانا ہے۔"

"نہیں دادی! میرا نیا فراک ہے۔۔۔ وائٹ کلر کا۔۔۔ اس پہ۔۔۔"

"ہاں ہاں پتہ ہے' لال تتلیاں بنی ہیں۔"

"سچی دادی! آپ کو بھی دکھایا ہے ماما نے؟"

"تیری وہ آپی ہے نا۔۔۔ سوہا۔۔۔ اس کو پہنے دیکھا تھا۔"

"کوئی نہیں جی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپی کے وائٹ فراک پہ پنک بٹر فلائز ہیں۔"

"وہ تو اب لیا ہے نا۔۔۔ نیا والا۔۔۔ پرانا والا تجھے دے دیا ہے۔"

شمشاد بیگم نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر دو ٹافیاں نکالیں مگر وشمہ کی آنکھوں میں ٹافیاں دیکھ کے بھی چمک نہ پیدا ہوئی۔ اس کا ننھا سا ذہن اس پہیلی کو سمجھنے میں مصروف تھا کہ آپی کا پرانا فراک اسے نیا بتا کر کیوں دیا گیا۔

"آپی کو چھوٹا ہو گیا ہو گا۔"

ننھے سے ذہن نے ایک تسلی بخش جواب ڈھونڈ ہی لیا۔ "پچھلے ہفتے ہی تو ماما نے اس کی الماری میں سے ڈھیر سارے فراک اور شرٹیں اور کئی سینڈلیں نکال کر آپا جی کو دی تھیں اور بتایا تھا کہ اب یہ مجھے چھوٹی ہو گئی ہیں۔ آپا جی کے بچوں کے کام آ جائیں گی کیونکہ وہ بے چارے نئے نہیں لے سکتے۔

اس جواب نے ایک اور نیا سوال جگا دیا۔

"کیا میں بھی نیا نہیں لے سکتی۔۔۔ میں بے چاری۔۔۔ اسی لیے آپی کا چھوٹا فراک پہنوں گی اور اگر میرے فراک بڑے ہو جائیں تو کیا آپی بھی پہنیں گی؟ آپی بے چاری۔۔۔"

"کیا سوچ رہی ہے۔۔۔ لے ٹافی۔۔۔"

"دونوں؟" اس نے ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے پوچھا۔ دادی ایسی فیاضی دکھاتی ہی کب تھی۔

"ہاں دونوں۔ تیری پھوپھی تیرے ہی لیے لائی تھی۔ کہتی تھی روز وشمہ کو دو دو ٹافیاں دینا۔"

"ماما کہتی ہیں' زیادہ ٹافیاں کھانے سے دانت خراب ہو جاتے ہیں۔" اس نے ریپر اتارتے ہوئے کہا۔ شمشاد جی کلس کے رہ گیا۔

جتنا وہ چاہ رہی تھی کہ اس کے سر سے منزہ کا بھوت اتر جائے' اتنا ہی وہ اسے بار بار یاد کر رہی تھی اور یاد دلا رہی تھی۔

"بکواس کرتی ہے۔۔۔"

"دادی۔۔۔ بری بات۔۔۔" وشمہ نے تنبیہی نظر سے دیکھا۔

یہ بھی منزہ کا ہی رٹایا سبق تھا کہ نہ بری بات کرو۔۔۔ نہ سنو۔۔۔

"میں تیرے پاپا اور تیری پھوپھی کو روز چار چار ٹافیاں دیتی تھی۔"

"روز۔۔۔ چار۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ دیکھ لے۔۔۔ ان کے دانت تو کوئی نہیں خراب۔"

"۔۔۔ احسن بھائی۔۔۔؟ حسان بھائی۔۔۔؟ وصی بھائی۔۔۔؟"

"ہاں وہ بھی دبا کے ٹافیاں کھاتے ہیں۔۔۔ کوئی نہیں خراب ہوتے دانت۔۔۔ یہ تو بس جو گندی والی ماما ہوتی ہے' وہ ٹافیاں نہ دینے کے لیے جھوٹ بولتی ہے کہ دینا نہ پڑے۔ تیری پھوپھی کتنی اچھی ہے' تیرے لیے اتنی ساری ٹافیاں رکھ کے گئی ہے۔ اسے پتا ہے نا کہ تیری ماما تو تجھے دے گی نہیں۔ دیکھا کتنا پیار کرتی ہے پھوپھی تیرے سے۔ تو بھی پیار کیا کر۔ جب وہ آتی ہے اس کے ساتھ سویا کر' ٹھیک؟"

"۔۔۔" ایک ٹافی اندر اتارتے اور دوسری کا ریپر کھولتے ہوئے اس نے فوراً" تابعداری سے سر ہلایا۔

دوسری ٹافی منہ میں ڈالتے ہی ایک بار پھر منزہ کا کوئی سبق یاد آ گیا۔

"ایک اور ٹافی دو دادی۔۔۔"

"۔۔۔" وہ خوشی سے نہال ہو کے الماری کھولنے لگی۔

"میں آپی کو دوں گی۔" الماری دھڑ سے بند کر دی گئی۔

"تیری پھوپھی تیرے لیے لائی ہے۔"

"پروین پھوپھو تو آپی کی بھی پھوپھو ہیں۔"

"وہ صرف تیری پھوپھو ہے' اس کی پھوپھو کوئی اور ہے۔"

"کون؟" تجسس جاگا۔

"ہے کوئی۔"

"وہ لاتی ہیں آپی کے لیے ٹافیاں؟"

"بڑی۔۔۔ تھیلے بھر بھر کے۔ تجھے دیتی ہے وہ؟"

وشمہ نے انکار میں سر ہلایا۔

"پھر تو کیوں دینے جا رہی ہے؟ بس جب کھانا ہوں میرے کمرے میں آ جایا کر اور ماما کو نہ بتانا' وہ مجھے ڈانٹے گی۔"

شمشاد نے مسکین سی شکل بنائی اور رونے والی آواز میں کہنے لگی۔ مقصد شاید صرف ننھی سی بچی کی ہمدردی حاصل کرنا تھا مگر اس کوشش میں وہ اس قدر مضحکہ خیز نظر آئی کہ وشمہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"آپ کو ڈانٹیں گی۔۔۔ دادی۔۔۔ آپ تو بڑی ہیں۔۔۔ اتنی بڑی۔۔۔" وہ دونوں بازو پھیلا کر اس کی لمبائی چوڑائی بیان کرنے کی اپنی سی کوشش کرنے لگی۔

"آپ کو ماما کیسے ڈانٹ سکتی ہیں؟"

"وہ مجھے بڑا ڈانٹتی ہے۔" شمشاد نے ہونٹ لٹکائے۔

"بڑی غصے والی ہے' اسی لیے کہہ رہی ہوں اسے نہ بتانا۔ کوئی شرارت کر دیا کوئی کام غلط ہو جائے تو بھاگ کے میرے کمرے میں آ کے چھپ جانا' ورنہ وہ بڑا مارے گی۔"

"ماریں گی؟"

"ہاں۔۔۔ جب غصہ آئے بڑا مارتی ہے۔۔۔ زور زور سے' اسی لیے تو میں نے تجھے وہاں جانے نہیں دیا۔ اس وقت بڑے غصے میں ہے۔"

وشمہ نے دونوں ٹانگیں اوپر کر لیں۔

اب اس کا کافی دیر تک باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

شمشاد بیگم طمانیت سے مسکرائی۔

"لے۔۔۔ کر لو گل۔۔۔ میں تو اسے بڑا اوکھا سمجھ رہی تھی۔۔۔ یہ تو کام ہی کوئی نہیں۔ ایویں ہی کہتے ہیں لوگ کہ پیار سے بڑی طاقت کوئی نہیں۔ دو میٹھے پیار کے بول بندے کا اندر بدل دیتے ہیں۔ شمشاد کہتی ہے کہ ڈر سے بڑی

طاقت کوئی نہیں۔ بندے کا ڈر اس کا اندر باہر بدل دیتا ہے اور یہ تو ذرا سی کاکی ہے' اسے ڈرانا کون سا بڑا
ہے۔"

☼ ☼ ☼

دو ہفتے بعد پروین کا دوبارہ چکر لگا تو شمشاد نے فخریہ اپنی کارکردگی جتائی۔ پروین چپ رہ گئی۔
وہ ذاتی طور پر ایسے اوچھے ہتھکنڈے پسند نہیں کرتی تھی مگر کوئی چیز تھی جو اسے ماں کی کھل کے مخالفت
سے روک رہی تھی۔
"جانے بھی دیں اماں!"
اس نے کہا تو بس دبے لفظوں میں اتنا ہی۔
"لے... ایسے ہی جانے دوں۔ میری پوتری کے ذہن میں زہر بھرتی رہے۔ اسے دادی پھوپھی سے متنفر
بھڑکاتی رہے اور میں چپ چاپ تماشا دیکھتی رہوں۔"
پروین سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ پچھلی بار وہ جاتے جاتے منزہ کی وہ بات من و عن ماں کے سامنے دوہرا گئی تھی
سنی تھی۔
"جیسے کو تیسا۔ فٹے منہ کو لکھ کروڑ فٹے منہ... میں تو وشمہ کو اس کے آلے دوالے نہیں بھٹکنے دے رہی
کام کے لیے آئی ہے' بس وہ کرے۔ میں تیری بات سمجھ گئی تھی کہ اس وقت اس گھر سے اس کا جانا ہمیں وارا
نہیں کھاتا تو ٹھیک ہے' میں اس سے نہیں بگاڑتی مگر وہ یہاں رہے گی تو میری' میرے پتر اور میری پوتری کی چاکر
کے رہے گی' چوہدرائن بن کے نہیں۔ وہ وشمہ کی دیکھ بھال کرے' اس کی خدمت کرے' پر ماں بننے کی کوشش
لگائے۔"
پروین نے سر ہلا دیا۔
اور حالات ہوتے تو شاید وہ ماں کے مقابل ڈٹ کے کھڑی ہو جاتی مگر منزہ کی جو چھاپ اس کے دل و دماغ پر
ہو چکی تھی' اس کے بعد اسے ماں کی حکمت عملی قبول نہ سہی گوارا تو تھی۔
"ایسوں کے ساتھ ایسے ہی نمٹنا چاہیے۔"
اس نے سوچا اور نزدیک کھیلتی وشمہ کو اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔
"پھپھو... ٹافی..."
دادی کی بتائی باتوں کی وجہ سے اس کے کچے ذہن میں پھوپھی کا تصور ہر وقت ٹافیاں برسانے والی پری کا سا بن
گیا تھا۔
"دیکھا... بے چاری ذرا سی چیز کے لیے کیسے ترسی رہتی ہے۔" شمشاد نے فٹ اسے گود میں بھر کے رقت
بھرے انداز میں کہا۔
"سارا کچھ تو وہ چر جاتی ہے... شکل دیکھی ہے اس کی... پھٹنے والا ہو رہا ہے منہ..."
"آپ سے اپنے پاس بٹھا کے کھلایا پلایا کریں۔"

☼ ☼ ☼

"اصغر! وہ کالے بنگلے والی شیخانی بتا رہی تھی کہ اس کی چھوٹی بہو کو گیارہ سال بچہ نہیں ہوا پھر ایک ڈاکٹر کے علاج
سے وہ اب تین تین بچوں کی ماں ہے۔"
"ساری اگلی پچھلی کسریں ہی نکال دیں اس نے تو۔"
اصغر نے مذاق میں بات ٹالی۔
اندر سے وہ کچھ بے چینی محسوس کرنے لگا تھا' بہت عرصے بعد ریتا نے پھر سے یہ ذکر چھیڑا تھا' ورنہ مہینے ہو گئے
وہ اپنے آپ میں مست و مگن ہو چکی تھی۔
وہی سیر سپاٹے۔

تفریح... شاپنگ... موج... مزا...
اصغر نے بھی شکر ادا کیا کہ اس کا دھیان تو اس جانب سے ہٹا۔ یہ الگ بات کہ اندر ہی اندر وہ خود یہ کسک... یہ
محسوس کیا کرتا تھا۔
"میں نے اس ڈاکٹر کا ایڈریس لیا ہے۔ اسلام آباد کا ہے۔"
"اچھا..." وہ مختصر جواب دے کر ٹی وی دیکھنے لگا۔
"چلیں پھر کسی دن؟"
"اچھا..."
"کیا اچھا؟" وہ چڑ گئی۔
... نے چینل بدلا۔
"پچھلی قسط ہم نے نہیں دیکھی تھی' کہیں گئے تھے کیا؟"
اس نے بات بدلنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔
ریتا نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ جھپٹ کر پرے پھینک دیا۔
"یہ منحوس ڈرامہ ہم نے کبھی بھی نہیں دیکھا۔ تم میری بات کیوں نہیں سن رہے؟"
"سن تو رہا ہوں سوہنے۔"
ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے ہائپر نہیں ہونے دینا' اس لیے اصغر اسے ذرا سا غصہ آتے دیکھ کر ہی پریشان ہو جاتا تھا
اور اسے ٹھنڈا کرنے کی فکر میں لگ جاتا۔
"اس اتوار کو چلیں اسلام آباد؟"
"اس اتوار...؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔
"بس کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ پہلے ہی بڑی دیر ہو گئی ہے۔"
"کوئی دیر نہیں ہوئی' زندگی پڑی ہے ابھی۔ تم خود ہی تو بتا رہی تھیں کہ کالے بنگلے والی شیخانی کی بہو کو شادی کے
گیارہ سال بعد..."
"گھر بیٹھے بیٹھے ہی گیارہ سال بعد مراد نہیں پوری ہوئی۔" ریتا نے تیزی سے بات کاٹی۔ "علاج ہوا ہے تو نتیجہ
نکلا ہے۔ ہم بھی ہاتھ پاؤں ماریں گے تو ہی کوئی امید نظر آئے گی۔"
"میری جان... کس چیز کا علاج... تم میں یا مجھ میں کوئی نقص ہوتا تو تم پہلے امید سے کیوں ہوتیں؟ آخر پہلے
بھی بغیر کسی علاج کے اللہ نے خوش خبری سنائی تھی۔ اب بھی انتظار کرو' اللہ پھر سے کوئی امید دکھائے گا۔" اس
نے تسلی دی۔
"نہیں اصغر! کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔"
اصغر نے نظریں چرا لیں اور دوبارہ سے ٹی وی دیکھنے لگا۔
"کچھ نہ کچھ تو ہے۔ امید تو پیدا ہوتی ہے مگر... مگر بچہ... بچہ پیدا نہیں ہوتا۔" وہ سسکنے لگی۔
"میرا بچہ پتہ نہیں کیوں میرے پاس آنے سے پہلے ہی مجھ سے روٹھ کے چلا جاتا ہے۔ اصغر! مجھے میرا بچہ
چاہیے۔"
"فکر نہ کر ریتا! اللہ تیری ضرور سنے گا۔"
"اصغر..." اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"تم مجھے تسلی دیتے ہو تو مجھے تسلی نہیں ہوتی۔ تم مجھے حوصلہ دلاتے ہو تو میرا حوصلہ بلند نہیں ہوتا۔ تم مجھے امید
دلاتے ہو تو مجھے امید نظر نہیں آتی۔ ایسا کیوں ہے اصغر؟"
"پاگل ہے تو۔" وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "تجھے کچھ پتہ ہے نا..." وہ بھی اٹھ کے اس کے مقابل کھڑی
ہو گئی۔

"کیا۔۔۔ کیا پتہ ہے؟"
کچے چور کی طرح وہ ڈگمگا گیا۔
"کچھ ایسا جو تمہیں میرے دل کو تسلی دینے نہیں دیتا جو تمہارے لفظوں میں وہ تاثیر پیدا نہیں ہونے دیتا جس سے میں امید کا سہارا لوں۔"
"دماغ خراب نہ کر رینا! نہ اپنا' نہ میرا۔"
اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی' اس کے سوالوں کا سامنا کرنے سے کہیں بہتر تھا' وہ سڑکوں پہ ادر لور پھرتا۔
"میں دماغ خراب کر رہی ہوں؟" وہ بپھر گئی۔
"تمہیں پتہ ہے' دماغ خراب ہو جائے تو کیا ہوتا ہے۔"
اس نے بیڈ شیٹ نوچ کر پرے اتار پھینکی۔
"میں دکھاؤں تمہیں کیا ہوتا ہے؟"
اس نے وحشیانہ انداز میں تکیوں میں سے مٹھیاں بھر بھر کے روئی نکالنا شروع کی۔
"کیا کر رہی ہے رینا۔"
اصغر نے اس کے دونوں ہاتھ قابو میں کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود کو ایک جھٹکے سے چھڑا کے اب ڈریسنگ ٹیبل کی جانب لپکی۔
"وہی کر رہی ہوں جو دماغ خراب ہو جانے پہ لوگ کرتے ہیں۔" اس نے ایک ایک چیز اٹھا کے نیچے پھینکنا شروع کی۔
"یا اللہ خیر۔"
شمیم کے الجھے گندے بالوں میں تیل لگا کر کنگھا کرتی صدیقہ نے دہل کر کہا۔
شمیم البتہ اسی طرح ٹس سے مس بیٹھی رہی۔ اٹھا پٹخ کی ان آوازوں کا اس پہ کوئی اثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔
"اس گھر میں ایک ایک کر کے سارے ہی جنے پاگل ہوتے جا رہے ہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کی چٹیا گوندھنے لگیں۔ چیزیں گرنے اور رینا کے چلانے کی آوازیں اب تک آ رہی تھیں۔
"رینا بس کرو' اب کیا بچا ہے اس کمرے میں توڑنے کو۔"
اصغر نے اس کے آگے ہار مانتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔
"نہیں۔۔۔ میں بچی ہوں نا' اب میں اپنا سر توڑوں گی۔"
اس نے پتھر کا بھاری لیمپ اٹھا کے تان لیا۔
اصغر کے ہاتھ پیر پھول گئے۔
"رینا۔۔۔ رینا۔۔۔ چھوڑو اسے۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں' چھوڑو۔۔۔ پاگل نہ بنو۔"
"دماغ خراب ہو جائے تو پاگل ہی بنتے ہیں اور کیا بنتے ہیں۔"
وہ خود کو چھڑوانے کے لیے زور لگانے لگی۔
"رینا! تم پاگل نہیں ہو' مجھے پاگل کر رہی ہو۔ بس کرو اپنا جی جلانا۔"
"جلاؤں گی' ضرور جلاؤں گی۔ جب تک میرا بچہ میری گود میں نہیں آئے گا' میں اسی طرح اپنا جی بھی جلاؤں گی اور تمہارا بھی اور اس کے بعد اگر اور کچھ نہ بچا جلانے کو تو یہ گھر جلا دوں گی۔"
"کیا ہو گا اس گھر کو جلانے سے؟" وہ چلایا۔
صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔
"گھر جلانے اور اس طرح چیزیں توڑنے' گلا پھاڑ کے چلانے سے کیا ہو گا؟ بچہ مل جائے گا تمہیں؟ کبھی بھی نہیں رینا! کبھی بھی نہیں۔ تم جو مرضی کر لو' چاہے گھر جلاؤ' چاہے ساری دنیا۔ ہمیں اب بچہ نہیں ہو سکتا۔"

رینا کے ہاتھ بے جان ہو کر لٹک گئے اور وہ جو کب سے اس کے بکھرے ہوئے وجود کو قابو کرنے میں ہلکان ہو رہا تھا بھولی ہوئی سانسیں قابو میں کرنے لگا۔
"رینا تم نے؟ کبھی بھی نہیں۔ ڈاکٹر کہہ چکے ہیں دنیا کے کسی کونے میں بھی چلی جاؤ' اب تمہارا علاج نہیں ہو سکتا۔ تم کبھی ماں نہیں بن۔۔۔"
اس کی بات پوری سننے سے قبل ہی وہ لہرا کے نیچے آ گری۔
"رینا۔۔۔" اصغر نے جلدی سے آگے بڑھ کے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔
اب اسے احساس ہوا کہ شاید رینا کو حقیقت سے آگاہ کر کے اس نے زیادہ بڑی مصیبت مول لی ہے۔

✡ ✡ ✡

جعفر نے گھر میں پہلا قدم رکھتے ہی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور وہیں کھڑے ہو کر ایک لمبی گہری سانس لی اور اس خوشگوار تبدیلی کو اپنے اندر اتارنے کی طمانیت محسوس کرنے لگا۔
"آج آپ بہت جلدی آ گئے؟"
بریزے کے نئے ہلکے جوگیا رنگ کے سوٹ میں ملبوس نکھری نکھری سی مدیحہ سامنے آئی تو اسے عرصے بعد اچھی لگی۔
اس کے ابھی ابھی شیمپو کیے بال ہلکے گیلے تھے اور ان کی مہک جعفر کو یہاں تک آ رہی تھی' وہ مسحور ہو کر مسکرایا۔
"آج جلدی نہیں آیا' اپنے ٹائم پہ آیا ہوں۔ ہاں تمہاری اس آپا کی وجہ سے کچھ دن جان بوجھ کے لیٹ ضرور آ تا رہا۔"
اس نے کوٹ اتار کے اسے پکڑایا۔
"شکر ہے وہ اپنے گھر تو گئی۔"
"اپنے گھر کہاں؟ وہاں جانے کا تو نام نہیں لے رہیں۔ ابھی تو بھائی صاحب اپنے ساتھ ہی گاؤں لے کر گئے ہیں۔"
"جہاں بھی گئیں' یہاں سے تو ٹلیں۔ بچیاں کہاں ہیں؟"
"کمرے میں۔"
وہ اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھ گئی' ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے۔
جعفر نے سلور نازک سینڈل میں پھنسے اس کے گورے گورے پاؤں بغور دیکھے۔ آج پہلی بار اسے مدیحہ کے ہاتھ پیر کی خوبصورتی کا اندازہ ہوا۔ اس سے پہلے اسے مدیحہ میں صرف ایک چیز ایسی لگتی تھی جو حسن کے مروجہ معیار پہ پوری اترتی تھی۔
اور وہ تھا اس کا صاف اور گورا رنگ۔
مگر اس گوری رنگت کے باوجود جعفر کو اس میں کبھی کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی تھی۔
عام سے نقوش۔۔۔
ہر وقت ایک ہی انداز میں بندھے رہنے والے بال۔۔۔
ڈھیلے ڈھالے سلے ہوئے بھدے کپڑے۔۔۔
کبھی کسی تقریب میں جانا ہوتا تو سجایا سنوارا جاتا خود کو مگر جعفر کو وہ تب پہلے سے کہیں زیادہ بری لگتی۔ بھڑکیلے' بھاری کام سے لشکارے مارتے کپڑے۔ بری اور جہیز کا سارے کا سارا زیور خود پہ لادنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی اور بے ڈھنگے اور اناڑی پن سے کیے میک اپ کے ساتھ وہ انتہائی مضحکہ خیز لگا کرتی۔
وہی مدیحہ اسلام آباد آ کے پالش ہو گئی تھی۔

اگرچہ اس کی سادگی کو خاص فرق نہ پڑا تھا لیکن اس سادگی میں بھی ایک نفاست اور کشش پیدا ہو چکی تھی۔ نہ اس نے بال کٹوائے تھے، نہ بھنویں ترشوائیں مگر پارلر کا کبھی کبھار کا چکر اس کی صاف رنگت کو چمک عطا کر جاتا تھا۔ میک اپ کا سلیقہ اسے آ گیا تھا۔

لباس اس کا اب بھی سادگی کا مظہر ہوتا، نہ آستینیں کٹ کر کہنیوں سے اوپر آئی تھیں، نہ چاک اتنے اونچے ہوئے تھے کہ جسم کے سارے نشیب و فراز دیکھنے والوں پہ کھل جاتے مگر چبھتے ہوئے رنگ مدھم ہو گئے تھے، پھیکے رنگ کچھ شوخ ہو کر کھل گئے تھے۔ اسے موسم اور تقریب کی مناسبت سے رنگوں کا استعمال آ گیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

جعفر کی نظروں سے وہ بجائے محجوب ہونے کے نروس سی ہو گئی اور خواہ مخواہ ہی قمیص کا دامن درست کرنے لگی۔

ایک گھٹنے پہ رکھی ٹانگ بھی سرک کے نیچے آ گئی۔

جعفر ہلکا سا مسکرایا۔

"دیکھ رہا ہوں یہ رنگ تم پہ اچھا لگ رہا ہے۔"

مدیحہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ کیا یہ واقعی سچ مچ کی تعریف تھی یا تنقید کا کوئی نیا انداز۔

"یا پھر... تم اس رنگ میں اچھی لگ رہی ہو۔"

اب کے تعریف کے الفاظ بے حد واضح تھے۔ وہ خوش کم ہوئی، حیران زیادہ۔ شادی کے اتنے سالوں میں جعفر نے کتنی بار اس کی تعریف کی تھی۔

وہ حیرت پہ قابو پاتے ہوئے سوچنے لگی۔

"بچیاں اندر کیا کر رہی ہیں؟ ٹیوٹر آئی ہے؟"

"نہیں... آج اس نے چھٹی کی ہے۔ کل بچیوں کے ایگزامز ختم ہوئے ہیں۔ ابھی نیا سمسٹر شاید اس ہفتے شروع ہوگا، تب تک اس نے بچیوں کو ذرا پڑھائی وغیرہ سے فراغت دینے کا سوچا ہے۔ ویسے کل آئے گی وہ کہہ رہی تھی، ان تین دنوں میں کوئی آرٹ وغیرہ کا کام کرائے گی۔"

جعفر کی بہت کچھ کہتی نظروں سے خائف ہوتی، گھبراتی، لجاتی، وہ اٹک اٹک کے بتا رہی تھی۔

"تو وہ اندر کیا کر رہی ہیں۔ بلاؤ انہیں، کہیں گھما پھرا کے لاتے ہیں۔"

جعفر نے جھٹ آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیا۔

"ابھی بلاتی ہوں۔" وہ اٹھی۔

"پلے لینڈ لے کر جاتے ہیں اور ڈنر بھی کہیں باہر کریں گے۔"

"مگر..." وہ جاتے جاتے رکی۔

"میں نے تو کھانا بنا لیا ہے۔"

"کل کے لیے رکھ دینا۔"

"آپ ایک دن کا پکا اگلے دن کھاتے کب ہیں۔"

اس نے دبے الفاظ میں جتایا، وہ خفیف سے مسکرا دیا۔

"ویسے بھی آج میں نے آپ کی پسند کا کھانا تیار کیا تھا۔"

"تم پہلے کب ایسا کھانا پکاتی تھیں جو مجھے پسند نہیں ہوتا۔ آج ایسا کیا خاص ہوگا۔"

مدیحہ غور کرنے لگی۔ کیا ان الفاظ میں بھی کہیں تعریف چھپی ہوئی تھی یا پھر...

اور یہ سچ تھا، اس نے کھانا بناتے ہوئے ہمیشہ جعفر کی پسند ناپسند کا دھیان رکھا تھا۔ ایک اتفاق یہ بھی تھا کہ بچیوں کی پسند کم از کم کھانے کے معاملے میں بالکل باپ پہ گئی تھی اور وہ خود تو سب ہی کچھ کھا لیا کرتی تھی اس لیے

جعفر کو بھی کھانے پہ کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کو تسلیم وہ آج کر رہا تھا۔ اتنے سالوں میں پہلی بار۔

"چلو یہ بتاؤ کہ پکایا کیا ہے، شاید اس کے لالچ میں، میں باہر کھانے کا ارادہ گول کر دوں۔"

"مٹن پلاؤ، پالک کوفتے اور شکر قندی کی کھیر۔"

"سارے ہی اتنی محنت والے کھانے، خیر تو ہے؟"

"بس ایسے ہی... دل چاہا۔"

"تو ٹھیک ہے جناب۔ آپ کا دل چاہا اور آپ نے اتنی گرمی میں اتنی محنت سے بنایا بھی... تو ہم آج یہی کھا لیتے ہیں، کل چلیں گے سہی مگر باہر جانا ضرور ہے۔ تم بچیوں کو تیار کرو، میں شاور لے کر آتا ہوں۔"

وہ اس کے پاس آتے ہوئے کہنے لگا اور جاتے جاتے اس کے بالوں کی لٹ کو ہلکے سے چھو کر اس کے رخسار پہ چھوڑ گیا تھا۔

وہ سن ہوئی دیر تک وہیں کھڑی رہی۔

خواب تھا یا حقیقت؟

کتنے عرصے بعد ایسا ہوا تھا کہ وہ دونوں مقابل تھے۔ اکیلے تھے مگر ایک دوسرے پہ لفظوں کے تیر برسائے اور طعنوں کا تبادلہ کیے بغیر پندرہ بیس منٹ گزار دیے۔

اور کتنے عرصے بعد... نہیں بلکہ اس عرصے میں شاید پہلی بار اس نے مدیحہ سے اتنی ملائمت اور لگاوٹ سے بات کی تھی۔

"کیا یہ مہتاب آپا کے جانے کا اثر ہے؟"

اس نے سوچا اور خود ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں... اگر ان کے جانے کا کچھ اثر ہوا بھی ہے تو مجھ پہ ہوا ہے۔ سارا دن جلی کٹی باتیں سنتے رہنے کا عذاب۔ ان کی بے تکی حرکتوں پہ جعفر کی ناراضی کا خوف۔ ان سب سے نجات ملنے کا احساس ہوا ہے اور شاید اسی نجات نے، اسی ہلکے پھلکے ہو جانے کی طمانیت نے آج مجھے اتنا مسرور کیا کہ میں یوں دل لگا کے تیار ہوئی۔ جعفر کا من پسند کھانا تیار کیا اور انہیں خوش دلی سے ویلکم بھی کیا اور وہ... اس کا مطلب ہے جعفر کو تسخیر کرنے اور اسے اپنے اور صرف اپنے تک محدود رکھنے کے میرے وہ سب حربے بے کار تھے۔ کارگر رہی تو ایک ذرا سی مسکراہٹ اور ان کی پسند میں ڈھل جانے کی ادا۔"

وہ لپ اسٹک کا شیڈ تھوڑا اور ڈارک کرتے ہوئے مسکرا کے سوچنے لگی۔

بال اس نے صرف اس لیے کھلے رکھے تھے کہ وہ ابھی ٹھیک طرح سے خشک نہیں ہوئے تھے لیکن اب خشک ہو جانے کے بعد بھی اس کا انہیں باندھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کلپ لگا کر وہ کمرے سے باہر نکلی۔ بچیاں پوری طرح سے تیار، پلے لینڈ جانے کی خوشی سے سرشار چہک رہی تھیں اور جعفر فون کان سے لگائے کسی سے ہنس ہنس کے بات کر رہا تھا۔

"نہیں یار! تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں... او کم آن..." مدیحہ کے قدم لڑکھڑائے۔

عادت سے مجبور اس کا ذہن شک کے تانے بانے بننے میں مصروف ہوا۔

"کون ہو سکتی ہے...؟ وہ لاہور والی...؟ یا وہ جو... نہیں نہیں...؟ نئی سیکریٹری سے بات کر رہے ہوں گے یا پھر..."

اس کا ذہن اندازے لگانے میں مصروف تھا کہ جعفر نے بات کرتے کرتے ایک ستائشی نظر اس پہ ڈالی۔

شک کے مارے دھاگے ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے۔

"ہاں کل بناتے ہیں پروگرام کوئی مل بیٹھنے کا۔"

وہ اسی نثار ہو جانے والے بے تکلفانہ لہجے میں بات کر رہا تھا مگر اب مدیحہ دور کھڑی اس کے الفاظ کو اپنی مرضی کا مطلب پہنانے کے بجائے پُراعتماد قدم اٹھاتی چلی آئی۔

"چلو بچو۔۔۔" اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ اس وقت فیملی کے ساتھ جا رہا ہوں' اوکے۔ اللہ حافظ۔"

اس نے فون رکھ دیا اور تقدیس کی انگلی تھام لی۔

"چلیں بیٹا۔۔۔"

"چلیں۔۔۔" تینوں نعرہ لگانے کے انداز میں چلائیں۔

✵ ✵ ✵

"ارے وشمہ! آپ کہاں جا رہے ہو بیٹا؟"

وہ رات کو حسب معمول دونوں بچیوں کو دودھ کا گلاس دینے آئی۔ سوہا تو عادت کے مطابق بڑے بڑے منہ بنا کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی مگر وشمہ ایک ہی سانس میں سارا گلاس خالی کر گئی جیسے اسے کہیں جانے یا کسی کام کے کرنے کی جلدی ہو۔

پھر وہ ہتھیلی کی پشت سے اپنا منہ صاف کرتی جلدی جلدی چپل پہننے لگی۔

"میں دادی کے کمرے میں جا رہی ہوں۔"

"وہ تو جلدی سو جاتی ہیں۔ سو بھی گئی ہوں گی اب تک۔"

منزہ کو حیرت بھی ہوئی کہ وشمہ اور سوہا دونوں ہی نے اس الگ کمرے میں رہنے کی روٹین کو بڑے دل سے قبول کیا تھا پھر وہ آج سونے کے لیے دادی کے کمرے میں کیوں جا رہی ہے۔

"تو پھر میں پھپھو کے کمرے میں چلی جاؤں گی۔"

پروین بھی رات یہیں رکی تھی' صبح چھٹی کا دن تھا۔

"مگر یہاں کیوں نہیں۔ دیکھو نا پھر آپی اکیلی سوئے گی۔"

"تو میں آپی کو بھی لے جاتی ہوں۔ آؤ آپی! بڑا مزا آئے گا پھپھو کے پاس۔ وہ بڑی اچھی کہانیاں سناتی ہیں' حسان بھائی اور احسن بھائی کو بہت سی گیمز بھی آتی ہیں۔"

منزہ نے سوہا کو دیکھا' وہ نیم رضامند نظر آ رہی تھی۔ اسے گھبراہٹ نے آن گھیرا۔ پروین کے پاس اپنی بیٹی کو رات تک بھیجنے کا تصور ہی اسے پریشان کرنے لگا۔

"نہیں بیٹا! آپی کو رہنے دو' آپ جاؤ۔"

"کیوں ماما؟"

اس کیوں کا جواب منزہ کے پاس نہ تھا۔

یا شاید تھا مگر وہ جواب وشمہ سمجھ نہ سکتی تھی۔

"جاؤں ماما؟" سوہا نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

منزہ نے الجھ کے اسے دیکھا۔ سوہا کی آنکھوں میں وہاں جانے کی خواہش سے زیادہ اس سوال کے جواب کی کھوج زیادہ جھلک رہی تھی جو سوال وشمہ نے کیا تھا۔

پروین سے اس کی وابستگی اس نوعیت کی نہیں تھی کہ وہ اس کے پاس جا کے سونے کے لیے مچل جاتی مگر ماں کے تذبذب نے اس کے اندر تجسس جگا دیا تھا' وہ تھی ہی ایسی۔ ہر اس بات پہ اڑ جاتی جس کے لیے منع کیا جاتا۔

"نہیں بیٹا! آپ اپنے کمرے میں ہی سوؤ۔" وہ اس کا تکیہ درست کر کے رکھنے لگی۔

"مجھے اکیلے میں نیند نہیں آئے گی۔"

"میں ہوں نہ تمہارے پاس' جب تک تم سوتی نہیں' میں یہیں رہوں گی۔"

"اور جب میں سو جاؤں گی تب تو آپ چلی جائیں گی' مجھے اکیلے میں ڈر لگے گا ماما!"

اپنا تکیہ اور چادر اٹھا کے باہر نکلتی وشمہ دروازے کے پاس تھم گئی۔

"ماما! آپی کو میرے ساتھ آنے دیں نا' پھپھو کے ساتھ سونے میں مزا آتا ہے۔ سچی۔"

"نہیں' وشمہ! آپ جاؤ۔"

منزہ کے سختی سے کہنے پہ وہ چپ چاپ باہر جانے لگی۔

"وشمہ جا سکتی ہے تو میں کیوں نہیں؟" سوہا احتجاجاً چلائی۔

"تم اتنی چھوٹی نہیں رہیں سوہا کہ یہ جان نہ سکو' وہ وشمہ کی پھپھو ہیں' صرف وشمہ کی پھپھو۔ تمہاری نہیں۔"

منزہ کو یہ الفاظ بے بسی کی آخری حد تک جاتے ہوئے کہنے پڑے۔ دروازے کے قریب جھک کر نیچے سے اپنا گرا ہوا تکیہ اٹھاتے ہوئے وشمہ یہ بات سن اور حیران رہ گئی۔

"صرف میری پھپھو؟"

"پتا ہے مجھے ماما! مجھے سب پتہ ہے۔" سوہا اچانک ہی منزہ کو بہت بڑی بڑی محسوس ہوئی۔

اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سمجھ داری سے سرہلاتے ہوئے وہ دس برس کی بچی نہیں' اٹھارہ انیس برس کی باشعور لڑکی لگ رہی تھی۔

"مجھے سب پتا ہے' وہ صرف وشمہ کی پھپھو ہیں' میری نہیں جیسے آپ میری ماما ہیں' صرف میری۔۔۔ وشمہ کی نہیں۔"

"سوہا۔۔۔" منزہ نے دہل کے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا اور گھبرا کے دائیں بائیں دیکھا۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹا!"

وہ ڈر رہی تھی کہ کوئی سوہا کے یہ خیالات نہ جان لے۔ خصوصاً "نوید مراد۔۔۔ تین سال ہونے کو آئے منزہ کو اس گھر میں مگر وہ اب تک سوہا اور نوید کے درمیان وہ رشتہ قائم کرنے میں ناکام رہی تھی جو اس کے اور وشمہ کے درمیان اول روز سے بن چکا تھا پھر بھی وہ اس وقت کی منتظر تھی جب سوہا نوید کو ایک باپ کی حیثیت سے دل سے قبول کر لیتی۔ نوید نے اپنے دل کا راستہ کھلا رکھا تھا' یہ بات اس کے ہر عمل سے ظاہر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ منزہ اب تک مایوس نہ تھی۔ بس کبھی کبھی سوہا کی حرکتیں اسے خوف زدہ کر دیتیں کہ کہیں ان کی وجہ سے نوید کے دل میں میل نہ آ جائے۔

"جس بات سے وہ ڈرتی رہتی تھی' وہ تو نہ ہوئی مگر یہ بات سنی تو وشمہ نے جو شاید اسے پوری طرح سمجھ بھی نہیں پائی تھی اور یہ آدھی ادھوری سمجھ ہی زیادہ خطرناک تھی۔

"تم جو چاہے مرضی کر لو۔ چاہے گھر جلاؤ' چاہے ساری دنیا' ہمیں اب بچہ نہیں ہو سکتا۔"

"تم دنیا کے کسی کونے میں بھی چلی جاؤ' اب تمہارا علاج نہیں ہو سکتا۔ تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔"

وہ ایک ایک سیڑھی چڑھتی جا رہی تھی۔

اور اس کا دل مایوسی کی دلدل میں ایک ایک انچ اندر دھنستا جا رہا تھا۔

"کبھی بھی نہیں؟ کیا واقعی کبھی نہیں؟"

اس نے بے یقینی سے دہرایا۔

اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح بھی ناکام ہو سکتی ہے۔

جعفر نے اس کے عورت پن کو جگایا تھا اور پھر اسی نے اس کی نسوانیت کو مجروح بھی کیا تھا اور اس ہاری ہوئی عورت نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ کبھی نہیں ہارے گی۔

نہ تقدیر سے

نہ کسی مرد سے

تب سے لے کر اب تک اس نے اپنے سارے پتے بہت ہوشیاری سے کھیلے تھے۔
اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں کی طرح اس کی بھی کچھ خواہشات تھیں، کچھ خواب تھے۔ ایک گھر کے... والے شوہر کے... بچوں کے...
کچھ لڑکیاں بند کواڑوں کے پیچھے آنکھوں میں یہ خواب سجائے تعبیر کے رنگ اترنے کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ کچھ تو ان خوابوں پہ پلکوں کی جھالر گرائے انہیں اپنے آپ سے بھی چھپائے رکھتی ہیں۔
مگر رانی... عرف ریتا بنت شمع... ان عام سی... بند کواڑوں کے پیچھے رہنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی... ہوا جو اس کے خواب ان لڑکیوں کے خوابوں جیسے تھے۔
وہ تھی تو چوباروں پہ بسنے والی لڑکی۔
جس کے خواب عام بھی ہوں تو تعبیر پالینے کا ڈھنگ عام لڑکیوں سے جدا ہوتا ہے۔ اس نے اپنے خوابوں میں رنگ بھر لینے کی خود ٹھانی اور اصغر کی جانب قدم بڑھایا۔
شوہر ملا، صرف اور صرف اس کا ہو کر رہنے والا۔
گھر ملا... کسی دوسرے کی شراکت اور مداخلت سے سو فیصد محفوظ مگر یہاں تک آ کے وہ ہار ہی بیٹھی۔
وہ ماں نہیں بن سکتی تھی، اپنا تیسرا خواب پورا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔
"ماں... ایسا کیوں ہوا میرے ساتھ؟"
مہینوں بعد کبھی شمع خود اس سے ملنے آجاتی ہو تو آجاتی ہو مگر شادی کے چھ سات سال گزر جانے کے بعد ریتا نے خود پہلی بار شمع کے گھر کی سیڑھیاں چڑھی تھیں۔
"چل بس کر اب، رو رو کے آنکھیں گلابی ہیں۔"
شمع تھی تو بہر حال ماں... اس کی بکھری بکھری حالت دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔
دو دن پہلے ہی اصغر نے اسے اس روح فرسا حقیقت سے آگاہ کیا تھا اور تب سے لے کر اب تک نہ اس کے آنسو تھمے تھے، نہ پلک لگی تھی۔ آنکھیں من من بھر کی ہو کے لال بوٹی ہو رہی تھیں۔ رنگت پیلی پھٹک۔
"کیا حال بنا رکھا ہے اپنا، سودائن لگ رہی ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ شمع کی بیٹی اور اتنی..."
"میری کوئی بیٹی نہیں ہوگی۔" اس نے ماں کی بات پوری سنے بغیر یاسیت سے کہا۔
"تو تجھے کیا فکر... تجھے کون سا اسی نے کما کر دینا ہے تو تو نے کھانا ہے۔" شمع نے بے فکری سے کہا۔
"تو نے صحیح عمر میں صحیح فیصلہ کرلیا اور اب عیش کر رہی ہے۔ مجھے تو تیرا افتنا باپ ملا بھی تو تب جب اور کچھ کی امید ہی نہ رہی تھی۔" شمع نے ہلکا سا قہقہہ لگا کے خود اپنا مذاق اڑایا۔
"چالیس سے اوپر کی ہو گئی تھی میں اور تو میری بڑھاپے کی اولاد اور میرے بڑھاپے کا آسرا، اسی لیے تو میں ہر سال تیرے باپ کی برسی پہ ختم دلا دیتی ہوں کہ اور کچھ دے کر مرا ہو یا نہ مرا ہو چلو باقی کے دن کٹانے کو ایک بیٹی تو دے دی۔"
"میری کوئی بیٹی..."
خلا میں مرکوز آنکھیں اس کی غائب الدماغی کو ظاہر کر رہی تھیں اور سرگوشی کی صورت ایک ہی بات کی تکرار اس کی ذہنی کیفیت کی نشاندہی کر رہی تھی۔
اب کے شمع نے ذرا تشویش سے اسے دیکھا۔
"ہو جاتا ہے رانی... کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ بہتیری عورتوں کے گھر اولاد نہیں ہوتی مگر وہ سب اس طرح جی کا جنجال نہیں بنا لیتیں۔ اچھا یہ بتا، اصغر کچھ کہتا ہے؟"
"اصغر..." اس کی آنکھوں میں کچھ کچھ ہوش کی رمق نظر آئی۔
"ہاں اصغر! وہ کیا کہتا ہے؟"

"...کہتا ہے... اب اسے کبھی بچہ نہیں ہوگا۔ چاہے میں کہیں سے بھی علاج کرالوں۔ میں کبھی ماں نہیں بن..."
"ہائے ہائے، میرا مطلب ہے کہ کیا وہ بچے کے لیے باتیں سناتا ہے؟ طعنے دیتا ہے؟ رونے روتا ہے اس بات کے؟"
"نہیں اسے بچہ نہیں، صرف ریتا چاہیے۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔
"بس پھر مسئلہ کیا ہے؟"
"مسئلہ یہ ہے کہ ریتا کو بچہ چاہیے۔ اسے صرف اصغر نہیں چاہیے۔" وہ دھاڑی۔
"تو اپنے کرتوتوں کے پیچھے خود کو برباد کرے گی رانی!" شمع نے جھڑکا۔
"میری لاڈو، بچہ آنے کے قابل تو رہی نہیں، سات سال گھر کے اندر بیٹھ کے تو نے خود کو گھن لگا لیا ہے۔ اب تو بیگم صاحبہ بن سکتی ہے، باجی جی بن سکتی ہے، میم صاحب بن سکتی ہے مگر وہ نہیں بن سکتی جو تو تھی اور تیری ماں ہے۔" اس لیے تیرے لیے یہی غنیمت ہے کہ اصغر کی جان کو چمٹی رہے۔ چاہے تجھے وہ چاہیے یا نہیں چاہیے لیکن تیری حرکتیں بتا رہی ہیں کہ تو اس آخری اور اکلوتے سہارے کو بھی ہاتھ سے گنوائے گی۔ شکر نہیں کر رہی کہ اسے اولاد کی نہیں، تیری پروا ہے۔ الٹا ٹسوے بہا بہا کے اس کے دل میں بھی اولاد کی چاہ پیدا کر رہی ہے۔ کچھ اندازہ بھی ہے کہ یہ چاہ اس کے دل میں تو تو پیدا کردے گی پھر اس چاہ کو پورا کرنے کے لیے بچہ کیسے پیدا کرے گی؟"
"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں، میں بچہ کیسے...؟"
وہ ماں کے ہاتھ تھام کے اس لجاجت سے بولی کہ شمع کا اس کو مزید پھٹکارنے کا سارا ارادہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔
"اپنا دل کہیں اور لگانے کی کوشش کر۔"
وہ نرمی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے بولی۔
"میرا دل بچے میں اٹکا ہے۔ اس کے نرم نرم گالوں میں، سنہری بالوں میں، ننھی ننھی گلابی انگلیوں میں، ملائم ہونٹوں میں، چھوٹی چھوٹی قلقاریوں میں۔ مجھے راتوں کو اس کے رونے کی آوازیں آتی ہیں، دل ہولتا ہے۔ مجھے اس کے ننھے منے پیروں کے نشان زمین پہ نظر آتے ہیں۔ بس ایک وہ نظر نہیں آتا۔"
وہ ماں کی گود میں منہ چھپا کے رو پڑی۔
"بس، اب اور نہیں رونا۔ ساری شکل خراب کرلی ہے رو رو کے۔ آج اصغر کو بچہ نہیں چاہیے کیونکہ وہ تیری شکل دیکھ دیکھ کے ہی راضی ہے لیکن اگر یہ شکل ہی بدشکل ہو گئی پھر کیا ہوگا؟ اور کیا ہے تیرے پلے؟"
اس کے اندر کی طوائف ماں پہ غالب آ گئی جسے رنگ و روپ کی فکر زیادہ کھائے جا رہی تھی۔
"ہاں کیا ہے میرے پلے... کچھ بھی تو نہیں۔"
وہ یاسیت سے اپنی خالی گود کو تکنے لگی پھر اچانک اسے کچھ یاد آیا۔
"تم بتاتی تھیں کہ مجھے تم نے بڑی منتوں مرادوں سے لیا تھا۔"
"ہاں... عمر بھی تو اتنی ہو گئی تھی مگر ڈاکٹر کہتے تھے، ویسے مجھ میں کوئی نقص نہیں تھا۔ اگر اللہ کی مرضی ہوئی تو میری گود ہری ہو سکتی ہے اور میں جانتی تھی میرے پاس وقت کم ہے۔ میں نے کوئی درگاہ نہیں چھوڑی۔ ہر جگہ چوکھٹ پکڑ پکڑ کے اللہ میاں جی تک فریاد پہنچائی۔"
"میرے لیے بھی دعا کرو نا۔" اس نے منت کی۔
"ہاں کروں گی مگر تو وعدہ کر کہ خود کو سنبھالے گی۔ ایسے بین نہیں ڈالتی پھرے گی۔ میں کروں گی دعا، رنگ لاتی ہے۔"
"ہاں، دعائیں ضرور رنگ لاتی ہیں۔"
وہ مطمئن ہوئی پھر اگلے ہی لمحے چونک گئی۔

"اور بددعائیں۔۔۔؟ کیا بددعائیں بھی رنگ لاتی ہیں؟"

☆ ☆ ☆

"چائے۔" مدیحہ نے جعفر کے سامنے بھاپ اڑاتا کپ رکھا۔

"تم بھی پیو گی؟"

دوسرا کپ اس کے ہاتھ میں دیکھ کے جعفر نے حیرت سے پوچھا۔ وہ رات کو چائے پینے کی عادی نہیں تھی۔

"ہوں۔" وہ مسکرا کے اس کے برابر بیٹھ گئی۔

سارا دن گرمی رہی مگر مغرب کے بعد جو ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہوئیں تو رات کے اس پہر تک آتے آتے موسم خاصا خوشگوار ہو چکا تھا اور ٹیرس پہ بیٹھ کر باتیں کرنا اس سے بھی خوشگوار۔

"مگر تم تو۔۔۔"

"آہستہ آہستہ عادت ڈال رہی ہوں آپ کی عادتوں سے ہم آہنگ ہونے کی۔"

"خود پہ جبر کرنے کی ضرورت نہیں ہے مدیحہ! اگر تمہیں زیادہ چائے پینا اچھا نہیں لگتا تو۔۔۔"

"نہیں جعفر! میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے آپ کے ساتھ بیٹھ کے چائے پینا اچھا لگ رہا ہے۔"

اس نے سچے دل سے کہا۔ جب سے اس نے شک کی عینک اتاری تھی، جعفر اسے ویسا ہی لگنے لگا تھا جیسے شادی کے شروع کے دنوں میں لگتا تھا۔ اپنا اپنا سا، مہربان سا۔

مدیحہ نے جب سے اس نے اپنے رویے میں تبدیلی کی تھی، جعفر کو بھی اس سے کم ہی شکایت رہا کرتی تھی۔

"اب ایسا نہ ہو کہ تم اتوار کو اپنے ساتھ ناشتہ کراتے ہوئے مجھے بھی پراٹھا کھانے پہ مجبور کرو۔ بلیومی یہ میں نہیں کر سکوں گا۔"

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

مدیحہ بھی ہنس پڑی۔

"نہیں نہیں میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔ آپ کہیں تو میں بھی ناشتے میں پراٹھا لینا چھوڑ دوں۔"

"بس بس۔۔۔ اتنی بھی تابعدار اور پرفیکٹ قسم کی بیوی نہ بنو کہ میرے دل میں تمہارے جیسی دو تین بیویاں اور پانے کی خواہش جاگ اٹھے۔"

جعفر نے قہقہہ لگایا اور یکدم چپ ہو کے اسے دیکھنے لگا۔ پہلے اس کی مذاق میں بھی کہی ایسی کسی بات پہ مدیحہ کا ردّعمل شدید ہوتا تھا مگر اب وہ کھل کے ہنس رہی تھی جیسے اس کے مذاق کا لطف لے رہی ہو۔

وہ بھی ہلکا پھلکا ہو کے مسکرا دیا۔ سینے سے جیسے کوئی بھاری سل سرک گئی تھی۔

اندر سے آتی فون کی گھنٹیوں نے مدیحہ کو قہقہے روکنے پہ مجبور کیا۔

"میں دیکھ کے آتی ہوں۔"

وہ کپ رکھ کے اٹھی اور جعفر نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر ستاروں بھرے آسمان کو تکا۔

"چلو دیر سے ہی سہی، اس گھر کو سکون تو ملا۔ اگر میں پہلے والی ڈگر پہ ہی ہوتا تو شاید مدیحہ کا وہ طرزِ عمل مجھے اتنا کھلتا لیکن جب میں سب چھوڑ چھاڑ چکا تھا، بڑی ہوتی بچیوں نے مجھے سنبھلنے پہ مجبور کر دیا پھر میں زندگی کا ہر پل سوئی کے ناکے میں سے گزرتے ہوئے کیوں بتاتا، اسی لیے بھڑک جاتا تھا۔ اس کی کسی بھی بات پہ۔ اچھا ہوا اسے میری ذات پہ اعتبار تو آیا۔"

اس نے گہری سانس لے کر ٹیرس میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ مدیحہ ریسیور اٹھا رہی تھی۔ کان سے لگاتے ہی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جعفر بھانپ گیا، فون اس کے میکے سے ہوگا پھر اس نے اگلے ہی پل یہ مسکراہٹ غائب ہوتے دیکھی۔ مدیحہ پریشانی کے عالم میں کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ اٹھا اور تیزی سے اندر لپکا۔

"کیا ہوا مدیحہ! کس کا فون ہے؟"

وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی اور ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔

"جعفر! وہ مکرم بھائی جان۔۔۔"

"کیا ہوا انہیں، ٹھیک تو ہیں وہ؟"

جعفر کا دل ڈوب گیا۔ مکرم سے لاکھ اختلافات سہی مگر وہ اس کی بہن کا شوہر تھا۔

اس کا دل بے معنی اندیشوں میں گھر گیا۔

"مدیحہ۔۔۔ بتاتی کیوں نہیں ہو، گھر پہ سب خیریت ہے نا؟"

مدیحہ نے لب دباتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

جعفر کا دل ڈوب گیا۔

"مکرم بھائی صاحب۔۔۔"

اس نے پوچھنا چاہا مگر چند کپکپاتے الفاظ کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔

"جعفر۔۔۔ بھائی جان نے۔۔۔ انہوں نے۔۔۔"

اچانک وہ جعفر کے سینے سے لگ کے پھپک کے رو دی۔

"انہوں نے ایسا کیوں کیا جعفر۔۔۔ کیوں؟ انہوں نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس سے ہمارے پورے خاندان پہ کیا اثر ہوگا۔ اچھی بھلی سوجھ بوجھ ہونے کے باوجود انہوں نے یہ حماقت کی کیسے؟"

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور کچھ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود جعفر اپنے دل سے ایک بھاری بوجھ ہٹتے محسوس کر رہا تھا۔

کسی انہونی کے خدشے نے اس کے دل و دماغ کو آزاد کیا۔ اس نے ایک گہری اطمینان بھری سانس لی۔

"کیا ہو گیا ہے مدیحہ! کیوں روتی چلی جا رہی ہو۔ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟ کیا کیا ہے مکرم بھائی جان نے؟"

"انہوں نے مہتاب آپا سے نکاح کر لیا ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" جعفر نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے سینے سے الگ کیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟"

وہ اسے بے یقینی سے گھور رہا تھا اور اس کی زبان اس سے ان الفاظ میں مخاطب تھی جن سے بات کرنے کا وہ عادی نہ تھا۔

"وہ اس عورت سے نکاح کیسے کر سکتے ہیں۔ میری آپا۔۔۔" وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے دروازے کی جانب لپکا۔

مدیحہ کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔

"یہ حرکت کرنے کی جرأت کیسے ہوئی اس شخص کو۔" جعفر کا اندازِ تخاطب بھی بدل گیا۔ "پہلے تو میں جا کے اباجی سے پوچھتا ہوں۔ یہ ہے ان کا وہ اندھا اعتماد جو بیٹے کے بجائے بھتیجے اور داماد پہ کرتے رہے۔ اس کے بعد جا کے تمہارے بھائی کا گریبان پکڑتا ہوں۔ مجھے تو گلے میں پٹہ ڈال کے ہانکتا ہوا لے گیا تھا کہ میری بہن کے ہوتے ہوئے تم نے ادھر ادھر نظر ڈالنے کی ہمت کیسے کی۔ اب میں ڈالتا ہوں پٹہ۔ اتنا آسان نہیں ہے جعفر محمود باجوہ کی بہن پہ سوتن لے آنا اور خاص طور پر یہ جانتے ہوئے کہ جعفر کے گھر میں اس کی اپنی سگی بہن بھی ہے۔"

اس نے جاتے جاتے دھماکے سے دروازہ بند کیا۔ مدیحہ بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ ایک جانب گر گئی۔

اسے گزرے چند دن کسی خواب کی مانند لگ رہے تھے۔ کسی ایسے ڈراؤنے خواب کی مانند جو آغاز میں بے حد سہانا تھا مگر جس کا انجام اتنا ہی بھیانک۔

●●●●

"مہتاب آپا سے بات کروائیے۔"

اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا مگر مہتاب کے فون پہ آتے ہی اس کے لہجے کی یہ سفاک سی ٹھنڈک بھاپ بن کر اڑ گئی۔

"مہتاب آپا! آپ کو شرم نہیں آئی ایسا کرتے ہوئے؟"
دوسری جانب سے اس کی کھنکتی ہوئی ہیلو سن کے وہ پھٹ ہی تو پڑی۔
"ارے..... مدیحہ..... کیسی ہے تو؟"
وہ اتنے نارمل انداز میں خیریت دریافت کر رہی تھیں کہ مدیحہ کی جان جل گئی۔
"مہتاب آپا! آپ نے جو یہ....."
"کیا آپا آپا لگا رکھی ہے۔" مہتاب نے بات کاٹ کر ٹوکا۔
"کہاں کی آپا... اور کیسی آپا... بھاوج ہوں اب تمہاری۔" انداز سراسر جی جلانے والا تھا۔
"ہر راہ چلنے والی کو میرا بھائی گھر بٹھا لے تو آدھے شہر کی رنڈیاں میری بھابھی نہیں بن جائیں گی۔"
وہ بھی چوہدرائن تھی' اپنے اندر کی کھولن اس نے لفظوں میں گھول کے مہتاب پہ انڈیلی تو وہ بوکھلا اٹھی۔
"زبان سنبھال کے مدیحہ! نہ میں کوئی راہ چلتی ہوں کہ تیرے بھائی نے دل بہلانے کے لیے مجھے گھر لا رکھا ہے۔ نکاح کیا ہے اس نے میرے ساتھ۔"
"اور بھائی ایسے ہی تو نکاح پہ مانا نہیں ہوگا۔ نہ تمہاری شکل نئی ہے اس کے لیے نہ کرتوت۔ ایسا ہی شروع سے تمہارے عشق میں پاگل ہوتا تو کب کی شادی کر چکا ہوتا تمہارے ساتھ۔ یہ تو مختار بھائی جان سے طلاق کے بعد تم نے جو ہاتھ پیر مارے ہیں دوبارہ گھر بسانے کے لیے' اسی کا نتیجہ ہے یہ۔"
"ہاں تو کیا ہوا۔" مہتاب کا لہجہ ایسی کڑوی کسیلی سننے کے بعد بھی نارمل ہی تھا۔
"بیوہ یا طلاق یافتہ کو کیا دوسری شادی کا حق نہیں ہے؟"
"واہ آپا! جب تمہارے میاں نے ایک بیوہ سے شادی کی تو تم نے زمانہ نچا ڈالا۔ تین لفظ سن کے ہی جان چھوڑی اس غریب کی۔ کیا اسے حق نہیں تھا دوسری شادی کا؟ اپنے حق تو بڑے یاد ہیں تمہیں۔ غضب خدا کا... طلاق لیے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ عدت بھی پوری کی یا نہیں؟"
"اپنے بھائی سے پوچھ جا کے۔ اسے سارا حساب یاد ہے۔" مہتاب نے پھر سے دل جلانے والے انداز میں کہا۔
"دن گن گن کے گزارے ہیں اس نے میری عدت کے۔" وہ مدیحہ کے طیش سے جیسے حظ اٹھا رہی تھی۔
"شرم تو نہیں آتی ایسے اپنے کرتوتوں پہ اتراتے ہوئے۔ عدت میں بیٹھ کے ایک بال بچے دار آدمی کو انگلیوں پہ نچاتی رہی ہو۔"
"اچھا اب بس کر' بہت کہہ سن لیا تُو نے۔"
اچانک مہتاب نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔
"میں نے اب تک برا نہیں مانا کہ چلو غصہ آ ہی جاتا ہے۔ ساری برادری کو کوڑ (غصہ) چڑھی ہوئی ہے۔ تیرے پاس تو پھر بھی وجہ ہے لیکن اب بس اور کچھ نہیں سنوں گی میں۔ چھوٹی ہے' چھوٹی بن کے رہ۔ اپنے اور میرے رشتے کا لحاظ کر۔"
"لحاظ..... تم نے کیا تھا کسی رشتے کا لحاظ؟"
"میں نے کیا کیا ہے؟"
اس کے بھول پن سے کیے گئے سوال پہ مدیحہ کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا منہ نوچ لے۔
"دیکھ مدیحہ! نہ بات بڑھانے سے کوئی فائدہ ہے نہ مجھ سے بگاڑنے کا۔ میں اب تیرے بھائی کی بیوی ہوں' بیوی بھی وہ جس سے اس کا ڈھلتی عمر کا عشق۔" وہ ذرا سا ہنسیں۔ "ڈھلتی عمر کے عشق کا مطلب جانتی ہو۔ اس عمر میں ہوا عشق اتھرے سے اتھرے مرد کی مت مار کے رکھ دیتا ہے۔ سمجھو مکرم کی بھی مت ماری گئی ہے۔ اب اس عورت سے بگاڑنا کتنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے جو تمہارے بھائی کے سر چڑھی ہے۔ یہ تم خود سوچ لو۔"

"دھمکا رہی ہو مجھے؟ یاد رکھو مہتاب آپا! چور راستوں سے اندر آنے سے کوئی مالک نہیں بن جاتا۔ تم خود کو میری بھابھی سمجھنے کی غلطی مت کرنا بلکہ اس خوش فہمی سے بھی نکل آؤ کہ تم بھائی جان کی منہ چڑھی بیوی ہو۔ بیوی صرف وہی ہے جو سارے خاندان کی رضامندی سے ان کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ تم لاڈلی ضرور ہو سکتی ہو' پسندیدہ بھی لگتی ہو مگر بیوی نہیں۔ ہم میں سے کوئی تمہیں وہ عزت نہیں دے گا جس کی تم خواہش کر رہی ہو۔ ایسی ہی بے وقعت رہو گی۔ زیادہ سے زیادہ بھائی جان کے ڈھلتی عمر کے عشق کا سہارا ہو گا تمہیں۔ دیکھیں گے ڈھلتی عمر کے اس مت مار دینے والے اندھے عشق کا سہارا کب تک رہے گا۔"
"بڑا زہر اگل رہی ہو۔ تکلیف کیا ہے تمہیں؟" مہتاب نے چبھتے لہجے میں کہا۔ "تمہارے بھائی سے ہی تو شادی کی ہے۔ تڑپ تو ایسے رہی ہو جیسے تمہارا [illegible] کر لیا ہے۔"
"مہتاب آپا!" وہ چلائی۔
"میرے بھائی بھلے درجن زنانیاں اور بیاہ کے لے آئیں۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں بھی نہیں پڑنا چاہیے مگر تم تو ایسے دہائیاں دے رہی ہو جیسے تمہاری بھاوج پہ نہیں' خود تم پہ سوتن آ گئی ہو۔"
مدیحہ کی غیظ و غضب سے بری حالت تھی۔
"اچھا... ہاں..... اب یاد آیا... وہ کوئی بھاوج ہی نہیں ہے۔ تیری..... نند بھی تو ہے..... ہاں اب سمجھ آیا تیرا کلسنا اور تڑپنا۔"
مہتاب نے ایسے نکتہ ڈھونڈ نکالا جیسے اس سے پہلے تو وہ اس بات سے واقف ہی نہ تھی۔
"تیرا مرد تو ویسے بھی کب کا رسیاں تڑا رہا ہے۔ بہنوئی کے نکاح پہ نکاح سے اسے چھوٹ بھی ملے گی اور دوسری شادی کا بہانہ بھی۔ چہ چہ..... یہ تو واقعی برا ہوا۔ سچی مدیحہ! مجھے اس کا تو خیال ہی نہ آیا۔"
"آ تا تو تم نہ کرتیں یہ شادی؟" مدیحہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
"کیا پتا نہ بھی کرتی۔ مجھے کوئی تجھ سے بیر تو نہیں مگر سچی بات ہے۔ میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ بس دعا کر تیرے مرد کا دھیان ہی نہ جائے۔ ویسے وہ ایسا لگتا تو نہیں جو پہلے ہی یہاں وہاں منہ مارنے کا عادی ہو۔ اس سے ایسی امید کیا رکھنی۔ ابھی بھی تو غصہ دکھا رہی ہے مجھے مگر وہ اندر سے میرا احسان مند ہو رہا ہوگا۔ اوپر اوپر سے بہن سے ہمدردی دکھائے گا۔ اندر اندر اپنا الو سیدھا کرے گا۔ بہنوئی کو مزہ چکھانے کے لیے اس کی بہن پہ سوتن لائے گا۔"
"بس کرو مہتاب آپا! جعفر ایسے نہیں ہیں۔"
"مکرم ایسا تھا؟" مہتاب کا سوال اسے سن کر گیا۔
"مختار بھی ایسا نہیں تھا۔" مہتاب کا نوکیلا لہجہ ذرا مدھم ہوا۔ "کوئی بھی ایسا ہوتا نہیں ہے مدیحہ! مگر ہو جاتا ہے۔ میں نے تجھے کہا تھا ناکہ یہ مرد کی ذات ہوتی ہی بڑی..... ہے۔"
اس کی زبان سے ایک گالی نکلی اور مدیحہ نے ڈھیلے بے جان ہاتھوں سے ریسیور رکھ دیا۔
"مکرم ایسا تھا؟"
مہتاب کا سوال اس کے اردگرد باز گشت کی طرح گونج رہا تھا۔
اس کی نظروں کے سامنے اپنے بھائی کے شب و روز گھومنے لگے۔ ایک سیدھی سادی سپاٹ زندگی گزارنے والا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔
بس زمین... فصل... جائیداد.....
زندگی کی ہر رعنائی..... خصوصاً صنف نازک سے کوسوں دور۔
شادی شدہ زندگی کے سولہ سترہ سال ایسے ہی گزار دینے والا اس کا خشک مزاج اور خاندانی آن بان پہ جان دینے

والا بھائی اگر ہر مصلحت سے بے نیاز ہو کے ایسا قدم اٹھا سکتا تھا تو جعفر۔۔۔۔ جعفر تو وہ شوہر تھا جس سے شادی کے ان گزرے تمام سالوں میں وہ ہمیشہ خائف ہی رہی۔

ہر وقت اس کے راستہ بدل جانے کا خوف دل و دماغ پہ طاری رہتا تھا۔

اس کی رنگین مزاجی۔۔۔ اس کی حسن پرستی۔۔۔۔ اس کا دل دہلاتی رہتی۔

اب اگر اس کو اپنا گھر طوفان کی زد میں آتا نظر آرہا تھا تو کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

اور مہتاب نے جو کہا' وہ بھی غلط نہ تھا۔

جعفر محمود کی مکرم باجوہ سے مخالفت اور کدورت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ صرف بہن کے حوالے سے ایک محترم رشتے کا لحاظ تھا جو اسے حد میں رکھتا تھا اور جب وہ رشتہ خود مکرم نے ہی بے اعتبار کر دیا تو کون تھا جو جعفر محمود کو لحاظ اور مروّت یا جیسے لفظ یاد رکھنے پہ مجبور کرتا۔

"کیا میری شادی شدہ زندگی میں سکون' اطمینان' بھروسے اور محبت کی عمر بس اتنی ہی تھی۔ گنتی کے یہ چار دن۔" مدیحہ کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔

❖ ❖ ❖ ❖

مکرم باجوہ کی مہتاب سے شادی اس خاندان کے لیے ایک بہت بڑا دھماکا ثابت ہوئی۔

بہت سے لوگوں کی زندگی اس شادی سے زلزلوں کی زد میں آگئی جن میں سر فہرست خود مکرم باجوہ کی زندگی تھی۔ پتہ نہیں جذبات کی کس رو میں آکے اس نے یہ فیصلہ کر تو لیا تھا مگر اس کے ایسے نتائج بھگتنا ہوں گے' اس کا اسے اندازہ نہ تھا۔

زیادہ سے زیادہ اسے بہن کی ازدواجی زندگی متاثر ہونے کا ڈر تھا مگر مہتاب کے عشق کا خمار کچھ ایسا سر چڑھ کے بول رہا تھا کہ اس نے اس ڈر کو خاطر میں لانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ جعفر کو جیسے وہ ہمیشہ سے بڑا بہنوئی اور بڑا بھائی ہونے کے ناتے رعب میں رکھتا آیا تھا۔ سوچا اب بھی ایسا ہی ہو گا لیکن جعفر کے مکرم کا لحاظ کرنے یا اس سے دبنے کی سب سے بڑی وجہ اس کی اپنی کمزوری تھی۔ سومیہ سے اس کے اسکینڈل نے جس طرح اسے خاندان بھر میں رسوا کیا تھا' اس کے بعد سے وہ نہ اپنے باپ کے سامنے سر اٹھا پا رہا تھا' نہ مکرم کے۔ پرانا پاپی تو تھا نہیں' کچا چور تھا۔ پکڑے جانے کی خجالت نے اسے مکرم سے گریز کرنے پہ مجبور کر دیا تھا جسے مکرم رعب میں آنا سمجھ رہا تھا اور پھر اس کے تایا محمود باجوہ۔۔۔ یعنی جعفر کے ابا کا اس پہ اندھا اعتماد۔ یہ سب جعفر کو دبنے پہ مجبور کرتا تھا۔

اب جب محمود باجوہ کا ہی اپنے داماد اور چہیتے بھتیجے پہ اعتماد ڈانواں ڈول ہو چکا تھا تو کون سی چیز جعفر کو اس کا احترام کرتے رہنے پہ مجبور کر سکتی تھی۔ وہ کھل کے مکرم کے مقابل آگیا۔

یہ صورت حال مکرم کے لیے غیر متوقع تھی۔

بیوی کے واویلے اور گریہ وزاری کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔

خاندان کے دیگر سرکردہ افراد کی جانب سے بھی ہلکی پھلکی لعن طعن کی توقع تھی مگر اس محاذ آرائی کا تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

اس کے اپنے والدین' بہن بھائی سب نے اس سے منہ موڑ لیا تھا۔ جعفر اپنی بہن اور بچوں کو اس کے گھر سے لے گیا تھا۔ اپنی چاچی کی منت و سماجت کے باوجود۔

"مکرو۔۔۔۔ وے مکرم۔۔۔ روک لے جعفر کو۔۔۔ وہ بہن کو لے کر جا رہا ہے۔"

"لے جانے دو بے جی۔۔۔ بڑا شوق ہے اسے بہن کا گھر اجاڑنے کا۔۔۔ کر لینے دو شوق پورا۔"

"گھر وہ اجاڑ رہا ہے یا تو اپنا اجاڑ رہا ہے' بے ہدایتا۔"

"میں نے دوسری شادی کی ہے' پہلی کو نکالا نہیں ہے۔ ایک نکاح اور کر لینے سے مردوں کے پہلے نکاح ختم نہیں ہو جایا کرتے بے جی! اتنی بات تو پتہ ہو گی آپ کو' میں ابھی دو اور لا کے بٹھا سکتا ہوں۔ بتا دو اپنی لاڈلی بہو اور اس کے میکے والوں کو۔"

"اس کے میکے والے۔۔۔؟" بے جی کو جلال آیا۔

"کل تک تو تیرے اپنے ماں پیو سے سگے تھے تیرے سوہرے۔ آج اس کے میکے والے ہو گئے اور یہ نہ بھول کہ وہ تیری سگی تایا زاد ہے۔ کرتے ہوں گے مرد چار چار شادیاں' لے آتے ہوں گے بیوی پہ بیوی مگر اس بیوی پہ بیوی لانا بڑا بھاری پڑتا ہے مکرم! جس کے وٹے میں اپنی بہن بیاہی ہو۔"

مکرم کو ہلکا سا خوف محسوس ہوا۔

"جا۔۔۔ جا کے روک لے جعفر کو۔ آج وہ اپنی بہن لے گیا تو کل تیری بہن کو اس گھر تک چھوڑنے میں دیر نہیں لگے گا۔"

یہ بات مکرم کے دل کو لگی لیکن جعفر کے پیچھے جانا' اسے روکنا' یہ سب اس کے وقار کے منافی تھا۔ اسے یہ [illegible] ہتک محسوس ہوئی۔

وہ نہ گیا۔۔۔۔ نہ جعفر کو روکنے۔۔۔۔ نہ اس کی بہن سے معافی مانگنے مگر اندر ہی اندر ڈر ضرور گیا۔ لاشعوری طور پر اس نے اسی وقت سے مدیحہ کی واپسی کا انتظار شروع کر دیا۔

"میں نے کہا کس سوچ میں گم ہو؟"

مہتاب نے گہرے سبز سوٹ پہ جھلمل کرتی مقیش کے لشکارے اس پہ ڈالتے ہوئے بڑے ناز سے پوچھا۔

"جعفر اسے لے گیا ہے۔"

"کسے؟" اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں مکرم نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔

میک اپ سے چھپے اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑا یا نہیں' یہ تو پتہ نہ چل سکا۔ البتہ آنکھوں کی چمک ضرور کم ہوئی تھی۔ شاید یہ گمان ٹوٹنے کا دکھ تھا کہ اس کا ہونا' کسی کے نہ ہونے کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

"تو لے جانے دو' بہن ہے اس کی۔ رہنے دو' دو چار دن میکے میں۔"

"تم بھی تو میکے آگئی تھیں جب مختار نے۔۔۔۔"

مکرم نے بات ادھوری چھوڑی پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"تم تو دو چار دن بعد واپس نہ گئیں۔"

"میری بات اور تھی۔" وہ گڑبڑا گئی پھر مسکرا کے بات سنبھالی۔

"بلکہ میری کیا۔۔۔ تمہاری بات اور ہے' وہ مختار تھا' یہ تم ہو۔ تمہیں چھوڑنے والی عورت ناشکری ہو گی۔"

"وہ بچے بھی ساتھ لے گئی ہے۔"

"آجائیں گے' اولاد ہے تمہاری۔"

وہ اس کے کلف لگے کھدر کے کرتے پہ لگے سونے کے بٹن سے کھیلنے لگی۔

"پرے ہٹ۔" مکرم نے اکتا کر اس کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

مہتاب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"تو نہ کرتے مجھ سے شادی۔ اگر اتنی فکر تھی بیوی بچوں کی۔ پتہ نہیں تھا کہ یہ سب ہو گا۔"

"نہیں پتا تھا۔"

"پتا ہوتا تو نہ کرتے شادی؟"

"ہاں' نہ کرتا۔" مکرم کے لہجے میں پچھتاوے ہوک رہے تھے۔

مہتاب بستر پہ اوندھی گر کے رونے لگی۔

"میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ ایک نے مجھے چھوڑ کر دوسری سے شادی کی۔ دوسرے نے پہلی چھوڑ کے میرے ساتھ شادی کی مگر نہ وہ میرا بنا نہ یہ میرا بنا۔ اسے دوسری پیاری تھی' اسے پہلی پیاری ہے۔ نہ میں گھر ہستن

بن کے سکھ پاسکی ' نہ سوتن بن کے۔ ہائے میرے نصیب۔"

مکرم کو کوفت ہونے لگی۔ "بس کرو مہتاب...... کیا نحوست پھیلا رہی ہے۔"

اسے ایسا لگا جیسے مکرم نہیں ' مختار اس سے مخاطب ہو۔ اب اسے سچ مچ اپنے نصیب کھوٹے ہونے کا یقین ہونے لگا۔ جب مختار نے اس کے اوپر سوکن لا بٹھائی تو اس کا رواں رواں توہین سے سلگ اٹھا تھا۔

وہ اس کے سامنے اس کے منہ میں نوالے بنا بنا کے ڈالتا' اس کے آگے پیچھے پھرتا۔

اس کے ایک ایک سنگھار پہ واری صدقے جاتا۔

اس کے ماتھے کے ایک بل پہ وہ ہر کسی سے لڑنے مرنے پہ تیار ہو جاتا۔

اور مہتاب حیرت سے سوچتی رہ جاتی۔

"یہ وہی مختار ہے۔ جس نے پندرہ سال کی دلہن کو بھی اتنی میٹھی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ جوانی میں نکھار تو تب بھی بڑھا تھا۔ یہ چونتیس سال کی گٹھے جسم والی میرے آگے کیا چیز تھی مگر میں نے تب بھی کبھی مختار کی نظروں میں اپنے لیے وہ تڑپ اور طلب نہیں دیکھی تھی۔ میری کچی عمر...... گدرایا جسم...... کنوارے جذبے...... میری شرم و حیا سب اس کے لیے بے کشش تھے۔ چند دن کی نئی نویلی دلہن پہ ساس اور نندیں پل پڑتیں تو وہ بے گانہ بنا دور بیٹھا دیکھتا رہتا اور اب وہی اپنی من چاہی بیوی کے آگے ڈھال بنا رہتا تھا۔ کیوں؟ کیا کمی ہے مجھ میں اور ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اس نئی والی میں؟ بات صرف اس کے نئے اور میرے پرانے ہونے میں ہے۔"

وہ کسی نتیجے پہ پہنچتی اور خود ہی اسے رد کردیتی۔

"میں سدا سے پرانی کب تھی۔ نئی تھی ' تب کون سا قدر کرلی اس نے۔ فرق نئے پرانے کا نہیں ' من چاہے اور بن مانگے ملنے کا ہے۔ میں بن مانگے ملی ہوں اسے ' بغیر کسی طلب کے اور اسے مختار نے ضد کر کے لیا ہے۔ زمانے سے ٹکر لے کر حاصل کیا ہے۔ وہ تو سر پہ چڑھ کے ناچے گی ہی مگر میں اس کا ناچنا دیکھنے یہاں کیوں بیٹھی رہوں۔ کیوں مختار اور اس کی معشوقہ کے لیے روٹیاں پکاتی رہوں۔ ان کے عاشقانے دیکھ دیکھ کے کیوں دل جلاتی رہوں۔ مجھے بھی من چاہا بننا ہے۔"

اس نے یہ سوچا اور کبھی نہ آنے کا طے کر کے اس کے گھر سے نکل گئی۔ سارے خاندان نے زور لگا لیا۔ کئی مثالیں پیش کیں جن میں سوتنوں کو ہنسی خوشی قبول کر کے اپنا گھر بچا لیا گیا تھا مگر وہ ضد پہ اڑی رہی۔

"مختار نے اتنے سال میں ایک بار بھی مجھ سے میٹھے بول نہ بولے۔ پیار کی نظر نہ ڈالی ' نہ ڈالتا۔ باقی کی عمر بھی نہ ڈالتا۔ میں جی لیتی مگر میرے سامنے وہ کل کی آئی کم ذات پہ نثار ہوتا پھرے ' یہ میں نہیں دیکھ سکتی۔ بس طلاق اور صرف طلاق۔"

وہ طلاق لے کر مانی۔

اس وقت اس کے دل میں کیا تھا ' کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر عدت کے فوراً" بعد ہی مکرم باجوہ سے اس کے نکاح نے جہاں لوگوں کو نت نئی باتیں سوچنے پہ مجبور کردیا ' وہیں مختار کو بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا بہانہ مل گیا۔

"لو مل گیا ثبوت۔ پتہ چل گیا ساری برادری کو۔ ایسے ہی نہیں پھدک پھدک کر طلاقیں مانگ رہی تھی۔ پیچھے سے شہ ملی ہوئی تھی ' ورنہ یہ کوئی انوکھی تو نہیں تھی جس پہ سوتن آئی تھی۔ تکلیف اسے میری دوسری شادی کی نہیں تھی ' اپنی دوسری شادی کرنے کی تھی۔"

اس نے یہ الزام بھی سہہ لیا۔ کون سا سارے کا سارا جھوٹ تھا۔ کچھ تو سچ تھا ہی۔

مگر اس سے حاصل کیا ہوا۔

مکرم نے اسے زمانے کے ' خاندان کے خلاف جا کے اپنایا۔ جیسا کہ وہ چاہتی تھی مگر اب اسی زمانے اور اسی خاندان کا خوف اسے کمزور کر رہا تھا۔

مکرم نے اسے کسی اور پہ فوقیت دی تھی ' کسی اور کو رد کر کے اسے بڑائی دی تھی ' جیسا کہ وہ چاہتی تھی۔ اپنی کچلی ہوئی نسوانیت کی تسکین چاہتی تھی اور ہوا کیا؟ وہی رد کی ہوئی عورت آج مکرم کے گھر سے وہ اس کی سوچ سے نہ نکل پائی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ مکرم کے دل میں نہ رہتی ہو مگر زندگی سے نکلنے کا نام نہ لے رہی تھی۔

یہ مہتاب کی شکست تھی۔

اس کی خواہشوں کی۔

اس کے ارادوں کی۔

اس کے خوابوں کی شکست۔

اور یہ شکست مکرم باجوہ کی بھی تھی۔

وہ مکرم باجوہ جس نے زندگی بھر کسی کے آگے سر نہ جھکایا تھا۔ اپنے اس ایک غلط فیصلے کی وجہ سے اسے بہت سوں کے آگے سر نیچا کرنا پڑ رہا تھا۔

وہ اپنے فیصلے پہ بری طرح پچھتا رہا تھا۔

صرف ایک عورت کو پانے کے لیے اتنا سب کھونا اسے وارا نہیں کھا رہا تھا۔

وہ حسابی کتابی بندہ تھا۔ عورت اور عشق کے جھمیلوں سے ہمیشہ دور رہنے والا۔ عورت کی غلامی کرنا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ اس کے برعکس حکمرانی اس کی ہڈیوں میں رچی بسی تھی۔ ایک کمزور لمحے کی زد میں آ کے وہ یہ قدم تو اٹھا بیٹھا مگر اس کے نتیجے میں حکمرانی اس سے روٹھ گئی تھی...... اور یہ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح وہ یہ فیصلہ بدل ڈالے اور وہ سب دوبارہ حاصل کرلے۔ جن کی عادت اب نشہ بن گئی تھی۔ دوسروں کو اپنے آگے سر جھکائے کھڑا دیکھنے کی عادت۔

اپنی منوانے کی۔

خود کو سب سے مقدم ' سب سے آگے دیکھنے کی۔

اور پھر اسے موقع مل گیا۔

محمود باجوہ کی طرف سے پیغام آیا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کو منا کے واپس لے جاسکتا ہے۔ کسی معافی تلافی کی بھی ضرورت نہیں۔ فقط مہتاب کو فارغ کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر وہ مدیحہ کو واپس لے جائے۔

مکرم نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا اور فیصلہ کرلیا جس بیوی کو بے ضرر اور بے وقعت جانتے ہوئے اتنی آسانی سے مہتاب کو اس پہ سوکن بنا لایا تھا ' اسی کو اتنی اہمیت دینا...... منانا...... گھر واپس لانا...... اپنی ضد توڑنا...... یہ سب مشکل ضرور تھا مگر اس سب سے کہیں زیادہ آسان اور قابل قبول جو یہ نہ کرنے کی صورت میں دیکھنا پڑتا۔

خاندان بھر کی ناراضی۔

بہن کا گھر اجاڑنے کا ذمہ دار۔

ابھی تو وہ سر جھکا کے سرخرو ہو سکتا تھا۔ وہی خاندان والے جو ابھی منہ پھلائے پھر رہے تھے ' کل کو واہ واہ کرتے کہ بھائی ہو تو ایسا۔ بہن کا گھر بچانے کے لیے اپنی ضد توڑ دی۔ چاؤ سے لائی عورت نکال باہر کی۔

اور اس نے یہی کیا۔

جعفر کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مکرم باجوہ جیسا ہٹ دھرم اور خود پسند شخص ایسا کر سکتا ہے۔

وہ دم بخود رہ گیا۔

ابھی تو وہ اس معاملے کو طول دینا چاہتا تھا۔

"بابا جی! میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ اس معاملے کو مجھے اپنے طور پہ ہینڈل کرنے دیں۔" وہ تلملاتے ہوئے محمود باجوہ سے کہہ رہا تھا۔

انہوں نے ایک بھرپور جتانے والی نظر اس پہ ڈالی۔ اس کی تلملاہٹ ' ہاتھ سے کچھ گنوا دینے والوں جیسی تھی۔

"اپنے طور پہ کیا کرنا چاہتے تھے تم؟ وہی جو مکرم نے کیا......؟ ایک غلطی کو دہرانا چاہتے تھے؟"

"نہیں، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں....."
"بکواس مت کرو۔" وہ گرجے۔
"باپ ہوں تمہارا۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ بہن کی زندگی اجڑنے سے بچانے کے بجائے الو سیدھا کرنے کی فکر میں تھے۔ تمہاری بلا سے وہ بسے یا اجڑے۔ اس پہ چاہے چار سوتنیں اور جائیں اس سے کیا مگر تم موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔"
"ہاں، چاہتا تھا میں ایسا۔ ساری عمر وہ میرے سر پہ مسلط رہے، خون خشک کرتے رہے میرا۔ رشتہ ہمارا برابر کا تھا۔ وہ بہنوئی تھے تو میرا بھی رشتہ بہنوئی کا تھا۔ میں سالا تھا تو وہ بھی میرے سالے تھے مگر آپ نے انہیں میرے لیے ایک طرح سے میرا خدا بنا دیا تھا۔ جب جب موقع ملتا وہ مجھے ذلیل کرنے سے نہ چوکتے۔ اب اگر مجھے موقع مل رہا تھا تو میں کیوں نہ فائدہ اٹھاتا مگر آپ نے سارا کھیل ہی خراب کر دیا۔"
"کھیل..... ذلیل انسان..... تو اسے کھیل سمجھ رہا ہے۔" ان کا فشار خون بلند ہونے لگا۔
"اسے کچھ نہ کہیے گا آپ۔ سارا زور مجھ پہ آزمالیں۔" آج وہ بھی سارے لحاظ بالائے طاق رکھ بیٹھا تھا۔ "کھیل تو اس نے سمجھا ہوا ہے۔ جب چاہا بیوی لے آیا، جب چاہا نکال کے پہلی والی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ میں یہ غلطی معاف نہیں کروں گا۔"
"کیوں؟ اس نے معاف نہیں کی تھی؟ تو بھی تو اس کی بہن کے ہوتے ہوئے حرام کاریاں کرتا رہا ہے۔ اس نے معاف کیا تھا تو تجھے کیا تکلیف ہے۔ وہ تو پھر بھی گھٹنے ٹیک رہا ہے، اپنی غلطی مان بھی رہا ہے، تو نے تو نہ غلطی مانا تھا، نہ ہی شرم کھائی تھی۔ الٹا اکڑ دکھا رہا تھا۔"
"ابھی بھی آپ کی نظر میں وہ اچھے ہیں۔" جعفر کو صحیح معنوں میں دکھ ہوا۔
"مجھے اپنی اولاد سے آگے کوئی نہیں جعفر پتر!" محمود باجوہ کا لہجہ اور تیور دونوں دھیمے پڑے۔ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے وہ نرمی سے کہنے لگے۔
"پتر..... ایسے معاملے گرمی دکھانے سے نہیں، عقل استعمال کرنے سے سلجھتے ہیں۔ خون کا رشتہ بھی ہے ہمارا، کوئی صرف "ساگے داری" نہیں ہے۔ نسلوں تک کڑواہٹ چلتی ہے ایسے غلط فیصلوں کی۔ میں نے مدیحہ کی صرف دھمکی دی تھی، ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اور میں جانتا تھا کہ مکرم اگر میرے بھائی کی حق حلال کی اولاد ہے تو اس دھمکی سے ڈر جائے گا۔ اتنا دید لحاظ تو ہوگا اس کے دل میں بہن کے لیے۔"
"ابا جی! میں نے بھی صرف دھمکی دی تھی۔ خدا گواہ ہے کہ میری مدیحہ کو استعمال کرنے کی نیت نہیں تھی۔ میں صرف مکرم بھائی صاحب کو کچھ اور..... "وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔
"ستانا چاہتا تھا۔" محمود باجوہ نے مسکرا کے بات مکمل کی۔
"مردذات ہے وہ..... کیا پتہ اس پہ اثر ہوتا یا نہیں۔ البتہ مدیحہ پہ اثر ہوتا۔ کتنا دکھ ہوتا اسے یہ جان کر کہ تو نے داؤ پہ لگا رہا ہے۔ ابھی تو جو کیا ہے میں نے اپنے نام سے کیا ہے۔ میں ہی برا بنا ہوں بہو کی نظر میں۔ اگر تم کرتے، برے بنتے بیوی کی نظر میں بھی، بچیوں کی نظر میں بھی۔"
بات سمجھ میں آ گئی، اس لیے وہ چپ ہو رہا۔
مگر یہ بات مدیحہ کی سمجھ میں نہ آ سکی۔
اس کے دل میں بدگمانی اور عدم تحفظ کا احساس اور توانا ہو گیا۔
پہلے تو صرف جعفر سے بدگمانی تھی، اب اپنے ہی بھائی کے اٹھائے قدم نے اس کے دل میں مردذات کے لیے شک اور عداوت کا بیج بو دیا۔
وہ جو کچھ دن قبل ہی اپنے اندر سے شکوک و شبہات کے سارے دھبے دھو دینے کے بعد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے جعفر کی رفاقت کے مزے لے رہی تھی پھر سے اپنے خول میں سمٹ گئی۔

مکرم بھائی جان بہک سکتے ہیں تو ہر کوئی بہک سکتا ہے اور جعفر جیسا مرد تو کبھی بھی۔ اب مجھے اس سے نہ کوئی گمان رکھنا چاہیے، نہ توقع، نہ امید، نہ ہی محتاط رہنے کا کوئی فائدہ ہے۔ میں کتنے بھی بند باندھ لوں۔ محبت، وفا کے پہرے کے..... احتیاط کے..... چاہے قید بھی کر کے رکھ لوں، یہ طے ہے کہ مرد کی ذات کبھی کسی کی ہو کے نہیں رہتی پھر کیا فائدہ تمہیں کیا فائدہ ساری عمر اسے سنبھال سنبھال کے رکھنے کی فکر میں ہلکان ہونے کا۔ جعفر محمود! آزاد ہو تم جو چاہے کرو، مجھے اب تمہیں کھونے کا خوف نہیں کیونکہ میں نے تمہیں پانے کی طلب ختم کر دی ہے۔"
اس نے اپنی بچیوں کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔ بڑھتی عمر کی بچیاں، ایک اور مدیحہ..... ایک اور مہتاب..... ایک اور..... کے لیے تیار ہوتی بچیاں۔

■ ■ ■ ■

"منزہ..... نی منزہ....."
شمشاد کی پاٹ دار آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔
اس نے جلدی سے سوہا کی چٹیا میں آخری بل ڈال کے ربربینڈ چڑھایا اور باہر لپکی۔
"جی اماں جی....."
"وشمہ کا ناشتہ تیار ہے؟"
"جی....."
اس نے آہستہ سے جواب دیا اور کچن کی جانب مڑ گئی۔ ان گزرے پانچ سالوں میں شمشاد نے گھر پہ اور سوہا، وشمہ کے لیے ایک نگران کی سی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ بظاہر منزہ پہ سارے گھر کی ذمہ داری تھی۔ وہ ہر وقت سرگرم نظر آتی تھی مگر در حقیقت اس کی حیثیت ایک پتے سے بھی ہلکی تھی۔
اس نے وشمہ کی ماں بننے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہی تھی۔ ماں کی محبت کو ترسی، سادا سے دل والی وشمہ اس کے کتنے قریب آ گئی تھی۔ نوید کا دل بھی اس نے ایسے ہی جیت لیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اس نئی زندگی اور نئے ہم سفر کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے لگی تھی۔ کچھ وقت جاتا تھا جب سوہا بھی اس کو دل سے قبول کر لیتی۔ وشمہ کے حوالے سے اس میں کئی خوش آئند تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں۔
مگر اچانک پتا نہیں کیا ہوا۔ شاید شمشاد جیسی بدفطرت عورت سے محبت کی یہ فضا برداشت نہ ہوئی تھی۔ اس نے وشمہ کو اپنے پروں میں سمیٹ لیا تھا۔ منزہ کو ماں کے بجائے سوتیلی ماں کے روپ میں اس بچی کے سامنے پیش کیا، وشمہ، منزہ سے دور کیا ہوئی، اسے ایک مکمل گھر پانے کی خواہش کوسوں دور جاتی محسوس ہوئی۔
اب گھر کی فضا وہی تھی۔ شادی کے اولین دنوں جیسی کھنچی کھنچی سی۔ تناؤ سے بھری۔
وشمہ زیادہ تر دادی کے کمرے میں گھسی رہتی۔
منزہ کے ساتھ اس کی بے تکلفی اور لاڈ پیار گزرے کل کی بات تھی۔
سوہا کے ساتھ اس کی بڑھتی انسیت اور اپنائیت خواب لگنے لگی تھی۔ دونوں میں ایک تکلف مانع رہتا تھا جو نو کی حد تک تو پھر بھی تکلف ہی تھا مگر بارہ سالہ سوہا کے طرز عمل سے کدورت بن کے جھلکتا تھا۔
نوید پھر سے اپنے خول میں سمٹ گیا تھا۔
منزہ کو وشمہ سے ایک گہرے بندھن میں بندھتے دیکھ کے وہ خود بخود اپنا جھکاؤ منزہ اور سوہا کی جانب محسوس کرنے لگا تھا مگر اب میکانکی انداز میں اسے اپنی بیٹی کے فرائض ادا کرتے دیکھ کے وہ بھی سوہا سے غافل ہو گیا۔ بس جانے سوتیلی ذمہ داریاں بغیر کہے پوری کر رہا تھا۔
شاید یہ سوچتا ہو.....
منزہ کے خیال میں ایک ماں ہونے کے ناتے اس کی ذمہ داری اتنی ہی ہے کہ میری بیٹی کو وقت پہ دھلے کپڑے، تازہ کھانا مل جائے اور ایسا کر کے وہ سمجھتی ہے ماں ہونے کا فرض ادا ہو گیا تو ٹھیک ہے، سوہا کے لیے

میرا فرض بھی اتنا ہی ہے کہ میں اس کی فیس وقت پہ ادا کردوں اور اسے جیب خرچ دے دیا کروں۔"

شمشاد نے اس ہوشیاری سے پتے کھیلے تھے کہ نامحسوس انداز میں سب کو دلی لحاظ سے ایک دور کرکے صرف اور صرف ضرورت اور مجبوری کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔

"وشمہ..... بیٹا ناشتہ کرلو۔"

ٹیبل پہ ناشتہ لگانے کے بعد اس نے آواز دی جس میں ابھی تک اس کے لیے مٹھاس تھی اور اس ہمیشہ کی طرح وشمہ کو اس کی جانب کھینچا۔

"اپنی چوہی کے لیے لیسے ٹرے سجا کے اندر دے کر آئی ہے' باہر میز تک آتے جیسے ٹانگیں گھستی ہیں' تجھے آواز دے رہی ہے کہ باہر پھینکا ہے ناشتہ۔ آکے کر مرلے۔"

شمشاد کی تنفر میں ڈوبی آواز نے وشمہ کے قدم روک دیے۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔

منزہ کو سوہا کے لیے ناشتہ اندر کمرے میں لے جاتے اس نے بھی دیکھا تھا اور اس کا کچا ذہن یہ جانے تھا کہ سوہا کو شمشاد کے سامنے کچھ بھی کھاتے پیتے ہوئے بے حد گھبراہٹ ہوتی ہے اور اس کی کڑی نظر کڑے فقروں کی مار سے بوکھلا کے وہ اکثر بھوکی ہی ٹیبل سے اٹھ جاتی ہے۔ منزہ کو اس کا خالی پیٹ اسکول نہیں تھا' اس لیے اب وہ اس کو ناشتہ کمرے میں ہی دینے لگی تھی۔

"ٹھہر... رک جا..." شمشاد کی آواز پہ اس کے باہر کی طرف بڑھتے قدم تھم گئے۔

"وہ کہیں کی نواب زادی ہے جو اندر پلنگ پہ بیٹھ کے پراٹھے ٹھونسے۔ سارا چنگا چوکھا تو وہ ہڑپ کر چھپ چھپ کے اور تو کیا گئی گزری ہے جو چل کے باہر تک جائے گی۔ ادھر آ میری رانی! میں اپنی لاڈو کے خود نوالے ڈالوں گی۔ کیا ہوا جو تیری ماں نہیں ہے۔ دادی تو ہے نا۔ میں منگواتی ہوں تیرے لیے ناشتہ۔ میرا کیا کسی سے کم ہے۔"

اس کے چمکارنے پہ وشمہ کی آنکھیں بلاوجہ آنسوؤں سے چمکنے لگیں۔ گلا رندھ سا گیا۔

نجانے منزہ کی بے توجہی کے دکھ سے یا دادی کی بے پناہ محبت کے دکھاوے سے۔

"لے... اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ بتا کیا کھانا ہے' میں ابھی بنواتی ہوں اور یہاں منگوا کے۔ نہ... میں نہیں... تو خود جا... اور جا کے کہہ' میرا ناشتہ دادی کے کمرے میں لے کر آ... جا شاباش جا کے کہہ۔"

"دادی..." وہ منمنائی۔

"جاناں..."

"رہنے دو دادی... میں کرلیتی ہوں۔"

اس کے لاکھ اکسانے پہ بھی وہ کبھی منزہ کے دوبدو آنے یا اس کے ساتھ بدتمیزی کرنے پہ آمادہ نہیں ہوتی اس بات کا بھی شمشاد کو بڑا قلق تھا۔

"آئے ہائے۔ نہ میری اولاد میرے پہ گئی' نہ اولاد کی اولاد... ساری کی ساری تیری عادتیں اپنی پھوپھی کی ہیں۔ اسی کی طرح اگلے کے سامنے مِن مِن کرتی رہنا' اپنا حق نہ لینا۔ پاگلے! اس گھر پہ اور اس گھر کی حق پہلے ہے۔ اگر وہ چوہی دانے ماری (دانوں سے بھری) اندر بیٹھ کے حکم چلا سکتی ہے تو تو کیوں شاباش... جا کے کہہ اور ذرا رعب سے کہنا' میں اندر بیٹھی سن رہی ہوں۔ اچھا۔"

"دادی..." وہ کسمسائی۔ "اچھا نہیں لگتا دادی!"

"تو جاتی ہے یا..." شمشاد نے آنکھیں دکھائیں پھر لہجہ نرم کرلیا۔

"تیرے بھلے کو کہتی ہوں۔ چاہوں تو میں ایک آواز دے کر تیرا ناشتہ اندر منگوادوں۔ مجال ہے اس کی آگے چوں بھی کرے مگر میں تجھے سکھانا چاہتی ہوں کہ دوسروں کے ساتھ کیسے رہا جاتا ہے۔ ابھی ہوں۔" اس نے آواز پہ رقت طاری کی۔ "تجھے سوتیلی ماں سے بچانے کے لیے' یہ میں ہوں' جس کی

نہیں رہی۔ مجبور ہو کے ہی سہی مگر شرافت سے رہ رہی ہے۔ اسے اس کی سچ مچ کی شرافت نہ سمجھ۔ میری یہ تجھے نچا ڈالے گی۔ ابھی سے رعب میں رکھ۔"

وشمہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے حیرت سے سوچتی رہ گئی کہ اتنی چپ چاپ سی رہنے والی' اتنا نرم نرم بولنے والی آنکھوں والی نئی ماما پہ وہ کیسے رعب ڈال سکتی ہے جبکہ وہ اتنی چھوٹی ہے' وہ اتنی بڑی۔ رعب تو بڑے ہو کے بھی اس سے کتنا ڈر ڈر کے بات کرتی ہیں۔ آپ... آپ کہہ کے۔ کبھی کبھی سوہا آپی کو گرا دے نہیں۔ اس کی غلطی پہ بھی چپ ہو جاتی ہیں۔ اس سے کچھ ٹوٹ جائے' کچھ گم ہو جائے' کچھ بھی نہیں کہتیں۔

"... ناراض ہو جاؤں گی۔"

شمشاد نے آخری حربہ آزمایا۔

اب وشمہ بری پھنسی۔

دادی کی ناراضی اسے گوارا نہیں تھی۔ وہ ناراض ہو جاتی تو پورے گھر میں کون ہوتا جس سے وشمہ بات کرتی۔ سوہا اس سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ پانچ سال گزر چکے تھے۔ اب تو وشمہ کو یاد بھی نہیں تھا کہ کبھی وہ اس کے ... آپی کہتی پھرا کرتی تھی۔ شمشاد نے اسے سوہا سے ڈرا ڈرا کے دونوں میں کبھی نہ مٹنے والے فاصلے پیدا کیے تھے۔

وشمہ کو البتہ منزہ کے حوالے سے کچھ ہلکی پھلکی یادیں اب بھی بے چین کرتی تھیں۔ اسے یاد آتا کیسے وہ گھنٹوں اس کی گود میں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ ضد کرکے اس کے ہاتھ سے نوالے لیا کرتی تھی۔ اس سے کہانی اور پوئم سن کر ... کرتی تھی۔

مگر اب... اب تو صرف ایک دادی تھیں جو اسے پاس بٹھایا کرتیں' کبھی کبھی بور بھی کرتیں مگر باتیں تو کرتی تھیں۔ اسے مزے مزے کی چیزیں اور کھلونے دلاتیں' وہ ناراض ہو جاتیں تو کتنی مصیبت ہو جاتی۔

مرے مرے قدموں کے ساتھ وہ باہر گئی۔ دروازے کے قریب رک کر اس نے دیکھا۔ سوہا لمبے بالوں کی چوٹی ڈالے گود میں ٹرے رکھے بیٹھی تھی اور برے برے منہ بنا رہی تھی۔ منزہ اسے پیار بھری دھمکیوں کے ساتھ ... کرنے پہ مجبور کر رہی تھی۔

وشمہ نے حسرت سے دیکھا۔

اس کے لمبے' سیاہ ریشمی بالوں کی چٹیا کو بھی۔

اور اس کے منہ تک جاتے منزہ کے ہاتھ میں دبے نوالے کو بھی۔

سوہا کے بال قدرتی طور پر بے حد خوبصورت تھے۔ کچھ منزہ ان پہ محنت بھی کرتی تھی۔ ہر دوسرے دن تیل کی ... خود بال دھونا' خود سلجھانا۔ دن میں دو بار کس کے چٹیا کرنا۔ پہلے پہل اس نے وشمہ کے سنہری بالوں کی بھی ... کے پونیاں بنانی شروع کیں۔ سنہری ریشمی گچھے اس کے گالوں پہ لٹکتے کتنے بھلے لگتے تھے پھر شمشاد ... میں جانے کے بعد جیسے ہی وہ اس کی دسترس سے دور ہوئی' ان سنہری گچھوں میں جوؤں نے بسیرا کرلیا۔ تب ... منزہ واضح طور پر یہ بھانپ نہیں سکی تھی کہ شمشاد کو وشمہ سے اس کی قربت کھل رہی ہے۔ اس نے کسی ... فکرمند ہوتے ہوئے ان جوؤں کے خاتمے کا بیڑا اٹھایا اور جت گئی۔ شمشاد نے اس پہ بھی فضیحتا کھڑا ...

... کے رکھ دیا ہے ذرا سی بچی کا سر۔ چھوڑ اسے۔ آج تیسرا دن ہے۔ دوپہر کو سونے ہی نہیں دیتی۔ گھٹنوں ... کے بیٹھ جاتی ہے اس کے بال نوچنے۔"

... ایک جھٹکے سے وشمہ کو منزہ کی گود سے نکالا تھا جو پہلے ہی اس افتاد سے اکتائی ہوئی تھی۔ جوئیں نکلوانے ... بات سخت گراں گزر رہا تھا۔

"... اس کے سر میں جوئیں..."

"ہاں تو کون سی انوکھی بات ہے۔ بن ماں کی بچیوں کے سر میں جوئیں پڑتی ہی ہیں۔ تیری لڑکی کے نہیں؟"

"میں دو دن سے صاف کر رہی ہوں' بس ایک آدھ بار اور....."

شمشاد نے اسے پھر بات مکمل کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

"رہنے دے' اپنے پاس رکھ اپنی ہمدردیاں۔ اتنا خیال پہلے رکھتی تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ جاؤ اپنے چونچلے دیکھ' اس کے لیے اس کی دادی کافی ہے۔"

اور دادی کو جوؤں سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا۔

اس نے وشمہ کا سر منڈوا دیا پھر بال نکلے پھر جوئیں بسیرا جمانے آئیں پھر منڈوا دیا۔ یہ شغل تب تک جب تک وہ سات سال کی نہیں ہوگئی اور پروین نے ہاتھ جوڑ کے ماں سے التجا کی۔

"کیسی پیاری شکل ہے اور آپ دولے شاہ کی چوہی بنا کے رکھ دیتی ہیں۔ اسکول جاتی ہے وہ' بڑی ہو رہی ہے لوگ مذاق اڑاتے ہوں گے۔ خدا کے لیے اب اس کا سر منڈوانا بند کریں۔"

یوں یہ سلسلہ بند ہو گیا مگر دو سالوں میں بال اتنے بڑھنے بھی نہ دیے تھے شمشاد نے کہ وہ پونیاں بنا کے ارمان پورے کر سکتی۔ رنگ برنگ کلپ اور ربن لگانے کے شوق پورے کر سکتی۔

زیادہ سے زیادہ بس سوہا کے لمبے بال دیکھ کے اپنے سر پہ ہاتھ پھیر کے رہ جاتی۔

جیسے اس وقت کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹا! کچھ چاہیے؟"

منزہ نے نرمی سے پوچھا۔ اس کے لہجے کی نرمی دادی کے پڑھائے سبق بھلانے لگی۔

"وہ....."

"ناشتہ نہیں کیا ابھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پسند نہیں آیا' کچھ اور کھانا ہے؟"

"نہیں..... وہ..... وہ ٹھیک ہے....."

"تو بیٹا جاؤ ناشتہ کرو' اسکول سے دیر ہو جائے گی۔ ابھی آپ نے یونیفارم بھی نہیں پہنا۔"

"میں..... میں وہاں بیٹھ کے ناشتہ نہیں کروں گی۔" بہت مشکل سے اس کے منہ سے نکلا۔

"کیوں' کیا ہوا؟"

"کمرے میں۔" اس نے کہنا چاہا مگر الفاظ کھو گئے۔

منزہ کو جیسے ترس آگیا' وہ اٹھی اور اس کا سر سہلاتے ہوئے بولی۔

"چلو آپ میں ناشتہ اندر لگا دیتی ہوں۔"

وشمہ نے معذرت خواہانہ نظروں سے اسے دیکھا جیسے اس بے جا مطالبے پہ شرمندہ ہو اور اپنی بے بسی کا اظہار کرنا چاہ رہی ہو۔

"کیوں' باہر کیا تکلیف ہے اسے؟" سوہا نے زہر خند لہجے میں کہا۔

وشمہ خائف ہو کے منزہ کے ذرا سا پیچھے ہو گئی۔

"نوکر سمجھ رکھا ہے میری ماما کو' یہاں ناشتہ لگاؤ' وہاں ناشتہ لگاؤ۔ یہ کرو' وہ کرو۔"

"سوہا!" منزہ نے اسے سختی سے گھورا۔

وہ پاؤں پٹخ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ناشتہ کرو خاموشی سے۔"

"مجھے نہیں کرنا۔"

منزہ اس وقت اس کی منت سماجت کر کے ناشتہ کرانے پہ تیار نہیں تھی' اسے وشمہ کا ناشتہ اندر پہنچانا تھا' اس لیے عجلت میں باہر چلی گئی۔

"جلدی تم بھی دفع ہو جاؤ۔"

وشمہ کی خاموشی سے سوہا کو خوب شہ ملتی تھی۔ اکیلے میں وہ ایسے ہی اسے دھمکا کے' اس کی فق رنگت کا مزہ لیا کرتی تھی۔

وشمہ سٹپٹا کے الٹے قدموں پلٹی۔

"اب مہارانی ناشتہ کریں گی پھر یونیفارم پہنا جائے گا۔ اس کی وجہ سے روز مجھے بھی دیر ہو جاتی ہے۔ اسے چھوٹا سمجھ کے کچھ بھی نہیں کہنے دیتے ہیں اور پنشمنٹ مجھے ملتی ہے۔"

اسے باہر نکلتے نکلتے سوہا کی بڑبڑاہٹ سنائی دی اور کم عمری کے باوجود اس نے انصاف پسندی سے سوچا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ دیر مجھے ہوتی ہے' سزا آپی کو ملتی ہے۔ کیا کروں' جلدی جلدی تیار ہوا نہیں جاتا۔ اب بھی ناشتہ اتنی دیر....."

ساتھ ہی اسے پھر سے خیال آیا کہ اس نے دادی کی وجہ سے ابھی ابھی نئی ماما کے ساتھ کیا حرکت کی ہے۔

"کتنی بری بات ہے' وہ کیا سوچیں گی۔ یہ دادی بھی نا بس....."

اس نے بے دلی سے ناشتے کے نام پہ چند نوالے لیے۔ شمشاد بیگم فتح مندی کے احساس سے مغلوب مسکراتی رہیں' اسے احساس تک نہ ہوا کہ وشمہ خالی پیٹ' اٹھ گئی ہے۔

☼ ☼ ☼

"اصغر! مجھے پچیس ہزار روپے چاہئیں۔"

"شاپنگ کا موڈ ہے؟"

اصغر نے مسکراتے ہوئے دراز کھولی۔

پرانی جون میں رہتی رینا اسے وارے کھاتی تھی۔ چاہے ہفتے میں لاکھوں بے کار کی شاپنگ میں اڑا دے۔

چاہے ساری ساری دوپہر جم خانہ میں کارڈز کھیلتے گزار دے۔

چاہے ساری شام سہیلیوں کے ساتھ پارٹی میں بتا دے۔

چاہے شمیم پہ چیختی چلاتی رہے۔

کم از کم اس طرح وہ نارمل تو رہتی تھی اور وہ خوش تھا کہ رینا پچھلے کچھ عرصے سے نارمل تھی۔ بچے کے لیے دیوانگی کا دورہ اسے کافی مہینوں سے نہیں پڑا تھا۔

"اور چاہئیں تو بتا دو۔" پچیس ہزار اسے تھماتے ہوئے اصغر نے فیاضی سے پوچھا۔

"نہیں' میرا خیال ہے کام بن جائے گا۔"

"اوہ ہوئے' میری رانی کے کام اب صرف پچیس ہزار میں بننے لگے۔" وہ ہنسا۔

"تمہاری رانی ابھی اتنی بے مول نہیں ہوئی۔" وہ ناز سے مسکرائی۔

"یہ پچیس ہزار دراصل بیگم نیاز کے لیے ہیں۔"

"کون بیگم نیاز؟"

"ہے ایک سوشل ورکر۔ بے سہارا بچوں کے لیے دارالامان بھی بنایا ہے اس نے۔"

"اوئے' یہ شوق کب سے پڑا ہے تجھے۔ چلو اچھا ہے' اگلے سال علاقے کے کونسلر کے لیے الیکشن میں کھڑا ہو جانا' پھر اس کے بعد ناظم..... پھر....."

وہ پلاننگ کرنے لگا۔ رینا نے اکتا کر اسے ٹوک دیا۔

"مجھے نہ سیاست میں آنے کا شوق ہے نہ فضول لوگوں کو ڈونیشن دینے کا۔ مجھے تو صرف ایک بچہ چاہیے۔"

اصغر کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

"بچہ۔۔۔؟ یتیم خانے سے؟"

"ہاں اور کیا وائٹ ہاؤس سے لاؤں گی۔" وہ جل کے بولی۔

"پچھلا تجربہ یاد نہیں ہے کیا؟" اس نے یاد دلانا چاہا۔

"یاد ہے۔" ریتا نے سر جھٹکا۔

"پھر بھی؟"

"ہاں پھر بھی۔"

اس نے فیصلہ کن انداز میں اصغر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"دیکھو ریتا! یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ پہلے بھی تم یتیم خانے سے بچہ لائی تھیں۔ کتنا وقت اور پیسہ برباد ہوا وقت اور پیسے پہ مٹی ڈالو مگر تمہاری حالت کتنی خراب ہوئی تھی۔ کتنا عرصہ لگ گیا تھا علاج میں اور پھر جب بچہ دوبارہ یتیم خانے واپس کرنے گئے تو ان لوگوں کی باتیں سنیں' سو الگ۔"

"وہ تھا ہی کوئی۔۔۔" ریتا نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

"شاید میری کسی دشمن کی اولاد تھی۔ صدیقہ وغیرہ کے پاس ٹھیک رہتا تھا' تم گود میں لیتے تب بھی کوئی نہیں ہوتی تھی اسے 'چڑیل کے پاس بھی مزے سے لیٹا رہتا جس کی شکل دیکھ کے ہی بچے ڈر جائیں۔ پتہ میرے ہاتھ لگاتے ہی کون سے کانٹے چبھتے تھے اسے۔" ریتا نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

اب ڈیڑھ دو سال گزرنے کے بعد اسے یہ بات بس اتنی ہی چبھ رہی تھی کہ وہ سر جھٹک کے رہ گئی مگر ان دنوں سر سے پیر تک سلگ جایا کرتی تھی۔ چند ماہ کے بچے کی اس حرکت پہ۔

پتہ نہیں اسے ریتا سے کیا چڑ تھی' اس کی شکل دیکھتے ہی وہ چیخ مارتا اور جو روتا تو چپ ہونے کا نام نہ لیتا' تاوقتیکہ ریتا سامنے سے ہٹ نہ جاتی۔

وہ سوتے میں بھی اسے پیار سے گود میں لیتی تو بری طرح احتجاج کرتا چلا اٹھتا۔

بہتیرے ٹوٹکے آزمائے۔ ڈاکٹروں' نفسیات دانوں کو دکھایا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ بچہ چند دنوں میں سوکھ کے کانٹا ہو گیا۔

ریتا کو بھی ضد سی ہو گئی تھی اس سے۔

اصغر نے کافی سمجھایا کہ وہ وقت کا انتظار کرے۔ فی الحال بچے سے دور رہے۔ رفتہ رفتہ وہ مانوس ہو جائے گا مگر ریتا کی مامتا بچے کے اس عجیب و غریب طرز عمل سے کچھ اور بھڑک اٹھی تھی۔ اس سے یہ بات برداشت نہیں ہو رہی تھی کہ جس بچے کو وہ اصغر کی مخالفت کے باوجود ضد کر کے صرف اور صرف اپنے لیے اس گھر میں لائی تھی وہ بالشت بھر کا بچہ صرف اور صرف اسی سے بے زاری دکھائے' اسی سے دور رہے' چاہے گھر کی نوکرانیوں کے پاس رہے۔

ریتا پہ پھر سے دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔

جس بچہ پہ مامتا کے خزانے لٹانے کے اس نے ارادے باندھ رکھے تھے' اس کے لیے ہی اس کے دل میں مغلظات کا طوفان بہتا رہتا۔ ایک وقت تو وہ آیا کہ ادھر بچہ ریتا کو دیکھ کے رونا شروع کرتا' ادھر ریتا اس پہ لپکتی۔ صدیقہ بے چاری ذرا سے بلونگڑے کو لپیٹ کر چھپاتی پورے گھر میں دوڑتی پھرتی۔

اس ساری صورت حال سے گھبرا کر اصغر نے یہی مناسب سمجھا کہ بچہ جہاں سے آیا ہے' وہیں بھجوا دیا جائے۔ اگرچہ اس پہ بھی ریتا نے کافی ہنگامہ کھڑا کیا۔ بچے کے جانے کے بعد بھی اسے دورے پڑتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی ذہنی حالت ٹھیک ہوئی تو اصغر نے یہ دیکھ کر شکر ادا کیا کہ وہ بچے کی خواہش کو جیسے بھول ہی گئی۔

اصغر نے یہی سمجھا کہ اس تجربے بلکہ تلخ تجربے کے بعد اس نے توبہ کر لی ہو گی کسی پرائے بچے کو لا کر پالنے سے۔ مگر اب وہ سامنے بیٹھی ایک بار پھر اسی غلطی کو دہرانے کرنے کا اظہار کر رہی تھی۔

"نہیں ریتا اس بار نہیں' بہت ہو گیا۔ پہلے ہی کم طوفان نہیں کھڑا ہوا تھا۔"

بہت کم اس کے سامنے کھل کے مخالفت کرتا تھا مگر اب کر رہا تھا کہ یہی وقت کی ضرورت تھی۔

"وہ تو تھا ہی کوئی گندا خون' خبیث کی اولاد۔ ضروری تو نہیں سارے کے سارے ویسے ہوں۔" وہ مچل کے بولی۔

"سمجھا کرو ریتا! پرائی اولاد پالنا مشکل ہے۔ تم نے دیکھا تو تھا۔ ذرا سا بچہ۔۔۔ مگر اپنی ماں کی گود اور غیر کی گود پہچانتا تھا۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے کہا نا کہ وہ تھا ہی الٹے دماغ کا' ورنہ کیا وہاں یتیم خانے میں وہ ماں کی گود میں پل رہا تھا اور پھر کتنے ہی بچے اپنے ماں باپ کے بجائے دوسروں کے پاس پلتے ہیں۔ پل ہی جاتے ہیں۔ پیار لیتے بھی ہیں اور پیار دیتے بھی ہیں۔"

"میں ہوں نہ تمہیں پیار دینے کے لیے اور تمہارا پیار لینے کے لیے۔"

اصغر نے پیار سے رام کرنا چاہا۔

"میں رہوں گی تب پیار کرو گے ناں۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔

"ختم کر لوں گی میں خود کو' ماں بنے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔ بچے کے بغیر جی کے میں نے کرنا کیا ہے۔"

اس پہ ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔

"ریتا۔۔۔ ریتا تم سمجھتی کیوں نہیں۔"

اسے دونوں بازوؤں سے تھام کے بٹھاتے ہوئے وہ بے بسی کی آخری حد پہ تھا۔

"اصغر! یقین کرو اب ایسا نہیں ہو گا۔ میں دیکھ بھال کے بچہ لاؤں گی۔"

"کیا دیکھو گی؟ ذرا سے بچے کی عادتیں؟ وہ کیسا ہے؟ کیسا نکلے گا؟ یہ سب پتا چل جائے گا تمہیں؟"

"میں اس بار ذرا سمجھ دار بچہ لاؤں گی۔ تھوڑا سا بڑا' چیں چیں کر کے رونے والا نہیں ہو گا۔ کم از کم اتنی عمر کا تو ہو گا جسے پہلے دن سے یہ پتہ ہو گا کہ وہ کون تھا اور اس گھر میں آنے کے بعد کیا حیثیت ہے اس کی۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

وہ قطعاً "کچھ نہ سمجھا۔

"بہت فرق پڑے گا۔ یتیمی کے احساس کے بعد اسے صحیح معنوں میں قدر ہو گی ہماری' اس گھر کی۔ جو بچہ آنکھ کھولتے ہی عیش و آرام میں کھولے' اس کی نسبت وہ بچہ محبت کا زیادہ قدردان ہوتا ہے جو ترس ترس کے دن گزارنے کے بعد کچھ پاتا ہے۔ میں اسے وہ سب دوں گی جو اسے نہیں ملا اور وہ مجھے وہ سب دے گا جو مجھے اب تک نہیں ملا۔"

"کچھ لو اور کچھ دو۔" وہ پھیکے پن سے مسکرایا۔ "اولاد کے لیے کیا سودے بازی۔۔۔"

"سودے بازی کیسی اصغر! پیار کا لین دین ہی تو کر رہی ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ' تمہیں لڑکا چاہیے یا لڑکی؟" اصغر نے اچانک سوال کیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یہ تو تم نے بالکل وہی سوال کیا اصغر! جو میں نے ایک بار تم سے کیا تھا۔ جب میں پہلی بار ماں بننے والی تھی اور یہ بھی بالکل اسی اسٹائل میں ہے۔"

"ہنسی میں مت ٹالو' بتاؤ لڑکا لاؤ گی یا لڑکی؟"

وہ قدرے سنجیدہ ہوئی اور سوچنے لگی۔

"شاید۔۔۔ دونوں۔"

"نہیں... ایک... صرف اور صرف ایک۔"

"اچھا۔" وہ اور مشکل میں پڑی۔

"میں... لڑکا... نہیں... لڑکی... دراصل اصغر... جو میرے دل کو بھایا' میں نے ابھی یہ طے نہیں... بھی ہمیں کون سا کھانے کے لالے پڑے ہیں جو لڑکی لاتے ہوئے سوچ میں پڑوں۔ اگر کوئی بچی دل کو... وہی لے آؤں گی۔"

"بچی..."

اصغر نے آہستگی سے دہرایا اور خشک لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اپنی ساری ہمت مجتمع کرنے کے بعد...

"ربنا... بچی تو ہے..."

* * *

"ماما... میں اس اسکول میں نہیں پڑھوں گی۔"

ضدی تو وہ تھی ہی' ایک سے ایک نئی ضد آئے دن پکڑتی رہتی مگر اس دن اس نے عجیب ہی مطالبہ پیش کر...

"کیا برائی ہے اس اسکول میں؟" منزہ نے تحمل سے دریافت کیا۔

"اچھا بھلا تو اسکول ہے بلکہ شہر کے بہترین اسکولوں میں سے ایک۔ لوگ ترستے ہیں یہاں اپنے بچوں کو... کرانے کے لیے۔"

"ترستے رہیں' بس مجھے نہیں جانا اسکول میں۔ وہ جائیں جو ترس رہے ہیں۔"

اس کے بدتمیزی سے کہنے پہ منزہ کو غصہ آگیا اور وہ درشتی سے اسے ٹوک کے رہ گئی۔

"بری بات سوہا! کیسے بات کر رہی ہو تم؟ کیا ہوا ہے اسکول میں؟ کسی ٹیچر سے ڈانٹ پڑی ہے یا کسی دوست سے جھگڑا ہوا ہے؟"

"نہ ٹیچر نے کچھ کہا ہے نہ دوست نے۔ یہ جو ہے نہ... یہ مصیبت... جو میرے ساتھ وہاں ہوتی ہے۔"

سوہا مٹھیاں بھینچ بھینچ کے غصے سے کہتی اسے مظہر کی یاد دلا رہی تھی۔

"کس کی... کس کی بات کر رہی ہو؟"

اس میں جھلکتے مظہر کے عکس نے منزہ کو بے ساختہ نظریں چرانے پہ مجبور کر دیا۔

"اسی وشمہ کی... جب تک وہ اس اسکول میں ہے' میں کبھی بھی وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"تمہارا مسئلہ کیا ہے سوہا؟" وہ زچ ہو اٹھی۔

"کیوں اس بیچاری سے خوامخواہ کا بیر باندھ رکھا ہے۔ وہ تمہیں کہتی کیا ہے' اب یہ کوئی بات ہے۔ نہ وہ تمہاری کلاس میں ہے' نہ تمہارے ساتھ ہوتی ہے پھر اس کی وجہ سے اسکول چھوڑنے کی بات کیوں کر رہی ہو؟"

"کلاس میں نہیں مگر اسکول میں تو ہے۔ پتہ ہے آج اس نے کیا کیا؟ اس "بے چاری" نے..."

سوہا نے "بے چاری" چبا چبا کے کہا۔

"کیا کیا ہے؟"

منزہ نے نارمل انداز میں پوچھا۔ اس کا خیال تھا۔ ہو گا کوئی بچکانہ سا جھگڑا۔ گاڑی میں پہلے بیٹھنے کا... سے لیٹ ہو جانے کا۔

"میری فرینڈ شیبا کی چھوٹی بہن لیلیٰ اس کی کلاس فیلو ہے۔ اس نے وشمہ سے پوچھا کہ تم دونوں سسٹرز... تمہارے نام الگ الگ کیوں ہیں' تم وشمہ نوید ہو اور تمہاری آپی سوہا مظہر۔ تو پتہ ہے اس نے اپنی ساری... میں بیٹھ کے بتا دیا کہ میں... میں پاپا کی... یعنی اس کے پاپا کی بیٹی نہیں ہوں۔ میرے اپنے پاپا کی ڈیتھ..." بتاتے وہ رونے لگی۔

منزہ کے دل کو گھونسا لگا۔

خالی خالی نظروں سے اسے آنسو بہاتے دیکھتی رہی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے مظہر کی موت پہ سب نے اپنے اپنے حصے کا دکھ رو لیا تھا۔ بین ڈال لیا تھا۔ ماتم بھی کر لیا تھا۔ ایک وہی ڈھائی تین سال کی بچی تھی جو یتیمی کے احساس سے یکسر انجان لالی پاپ چوستی گھر میں ایک دم سے امڈ آنے والے بے شمار لوگوں کو حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔

وہی تین سالہ بچی... آج ٹھیک نو سال بعد اپنے حصے کے آنسو رو رہی تھی۔

منزہ نے اسے اپنے باپ کا سوگ دل کھول کے منانے دیا۔ یہ آنسو مظہر کا حق تھے جو اس کی اولاد ادا کر رہی تھی۔

"اس نے یہ بھی بتایا کہ میری ماما اس کی نئی ماما ہیں اور یہ بھی کہ میں اپنی ماما کے ساتھ ان کے گھر میں..."

بہت سارا رو چکنے کے بعد پھر سے کچھ بتانے پہ آمادہ ہوئی تھی مگر اتنا ہی بتا چکنے کے بعد دوبارہ رونے لگی۔

"اس میں غلط کیا ہے بیٹا!"

منزہ نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے تحمل سے کہا۔

"غلط نہیں ہے ماما؟"

سوہا نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کے حیرت سے پوچھا۔

"کیا یہ غلط ہے کہ تمہارے پاپا اللہ میاں کے پاس ہیں؟ کیا یہ غلط ہے کہ میں وشمہ کی اصلی والی ماما نہیں ہوں؟ یہ تو سچ ہے بیٹا! اب تم اتنی بڑی تو ہو گئی ہو کہ ان باتوں کو سمجھ سکو۔"

"اور وہ جو ساری لڑکیاں مجھ سے الٹے سیدھے سوال کر رہی تھیں۔ کوئی کہہ رہی تھی' سوہا! تمہارے سوتیلے پاپا تمہیں مارتے تو نہیں؟ کوئی کہہ رہی تھی' تمہاری ماما تمہیں پیار کرتی ہیں یا وشمہ کو؟ کوئی کہہ رہی تھی تم اپنے... ماما! کیوں سب ایسی باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے نہیں سننا یہ سب' مجھے نہیں جانا اس اسکول میں۔"

"میں وشمہ کو سمجھاتی ہوں۔"

"ہونہہ... آپ سمجھائیں گی۔ ڈرتی ہیں آپ اس سے۔"

اتنے میں منزہ کو دروازے کے باہر سے وشمہ گزرتی دکھائی دی۔ شاید چھت پہ کھیلنے کے لیے جا رہی تھی۔

"وشمہ..." اس کی آواز پہ وہ اندر آئی۔

"جی ماما!" اس نے یہ کہتے ہوئے چور نظروں سے سوہا کے روئے روئے چہرے کو دیکھا۔

وہ سارا معاملہ بھانپ گئی۔

سوہا راستے بھر بھی تو روتی آئی تھی' بنا اس سے کچھ کہے اور وشمہ سارے راستے شرمندہ بیٹھی رہی۔ سوہا اس سے لڑ لیتی' برا بھلا کہہ لیتی تو شاید اور بات تھی مگر اس کا روتے چلے جانا وشمہ کو احساس دلا رہا تھا کہ اس سے کوئی بہت سنگین غلطی ہو چکی ہے۔

اس نے اپنی آنکھوں سے سوہا کے گرد اس کی کلاس فیلوز کا جمگھٹا لگتے' انہیں تابڑ توڑ فضول سے فضول سوال کرتے اور پھر سوہا کو گھبرا کے روتے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔

"مجھے لیلیٰ سے گھر کی یہ سب باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔" اس نے تب ہی پشیمانی سے سوچا تھا۔

"بیٹا! کیا آپ نے اسکول میں اپنی فرینڈز سے کوئی ایسی بات کی تھی جس سے سوہا آپی کو دکھ ہوا؟"

وشمہ نے چپکے سے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"کتنی بری بات ہے بیٹا! ذرا سی بے احتیاطی سے دیکھو کیا ہو گیا۔ ہمیشہ سوچ سمجھ کے منہ سے بات نکالنی چاہیے۔"

"سوری ماما!" اگرچہ منزہ نے پہلی بار اس سے کسی معاملے میں باز پرس کی تھی لیکن پھر بھی وشمہ کو برا نہیں لگا تھا۔ اس کے برعکس اس کی ہلکی سی ڈانٹ اور پھر اپنے سوری کہنے کے بعد دل سے بھاری بوجھ ہٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

"سوری مجھے نہیں' اپنی آپی کو کہو۔ وہ ہرٹ ہوئی ہے۔"

"آپی... سو..."

"معافی مانگتی ہے وشمہ کی جوتی۔"

شمشاد آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی۔

"کمرہ بند کر کے میری پوتری سے معافیاں منگوا رہی ہے۔ اپنی لاڈلی کے آگے ناک رگڑوا رہی ہے۔ شرم نہیں آتی بن ماں کی بچی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے۔"

منزہ ہڑبڑا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اماں... اماں جی... یہ تو بس بچیوں کی آپس کی بات... بس یونہی ذرا سی بات..."

اس نے کہنا چاہا۔

"بچیوں کی بات...؟ اب بچیوں کی نہیں 'بڑوں کی بات ہے۔"

منزہ نے سہمی نظروں سے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا۔

شام کے پانچ بجے تھے۔ عموماً نوید مراد سات بجے تک آتا تھا لیکن آج وہ جلدی آنے کا کہہ کے گیا تھا' وشمہ سے وعدہ جو کر لیا تھا' جوائے لینڈ لے جانے کا۔

"آپ بلاوجہ بات کو بڑھا رہی ہیں اماں!"

اس نے تحمل سے کہا مگر شمشاد بیگم یہ سن کر اور بپھر گئی۔

"ہاں... میں بات کو بڑھانے والی اور تو بات دبانے والی میسنی۔"

"میں وشمہ کو صرف سمجھا رہی تھی کہ..."

"اچھا... صرف سمجھا رہی تھی۔ تیرے صرف سمجھانے سے ہی نمانی کے اتھرو (آنسو) نکل آئے۔ ہورے کس طرح کی دھمکیاں دی ہیں ننھی سی کڑی کو۔ بیچاری کا رنگ پیلا پھٹک ہو کے رہ گیا ہے۔"

اس نے اپنے پاس کھڑی بے آواز آنسو بہاتی وشمہ کو بھینچ کر سینے سے لگایا۔

اور دادی کے بھری سانسوں والے سینے سے لگی وشمہ پورے احتجاج کے ساتھ بتانا چاہتی تھی کہ یہ آنسو ماما کے سمجھانے سے نہیں بلکہ دادی کے ان کے ساتھ اونچا بولنے اور ڈانٹنے کی وجہ سے نکلے ہیں۔

وہ شمشاد کی گرفت میں ذرا سا مچلی مگر اس نے اور بھی زور سے اسے بھینچ لیا۔

"اگر صرف سمجھانے کا اتنا رعب ہے تو جھڑکیاں دے کر تو تو اس کی جان ہی نکال لے گی۔ میں نہ آتی اس پاسے تو تو شروع تو ہونے ہی والی تھی۔ معافیاں منگوا رہی تھی۔ پھر ہاتھ جڑواتی۔"

وشمہ ایک بار پھر زور سے مچلی۔ دادی کے پسینے کی کھٹی باس اس کی سانسوں کو وحشی بنا رہی تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے سوہا کو بھی..."

"نام نہ لے اپنی... کا میرے سامنے۔" اس نے بے دھڑک سوہا کو گالی دی۔

منزہ کڑوا گھونٹ پی کے رہ گئی' البتہ سوہا نے بڑی کٹیلی نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھ دیکھ اس کے قاتلوں والے... میری پوتری کو سمجھانے کے بجائے تو اپنی لڑکی پہ دھیان دے۔ اس کے چھن ٹھیک نہیں ہیں۔ ٹانگ برابر ہوئی نہیں ہے اور منہ کو آتی ہے ہر کسی کے۔ اسے سمجھا کہ جن کے پیو مر کھپ گئے ہوں اور دوسروں کے روٹی ٹکڑے پہ پل رہے ہوں ان کو اتنی اکڑ اور اتنا نخرا اچھا نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھا دوں گی۔"

منزہ نے ایک بار پھر گھڑی کی جانب دیکھا اور جلدی سے کہا۔

نوید کا سر سر جان چھڑانے والا تھا' وہ چاہتی تھی شمشاد بیگم جلد از جلد اس معاملے کو سمیٹے اور اپنے کمرے میں جائے' لیکن اس کے دل کی بھڑاس شاید ابھی پوری طرح نکلی نہیں تھی۔

سوہا نے ماں کو گلہ آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ منزہ نظر چرا کے رہ گئی۔

"اور یہ بھی بتا کہ دوسروں کے گھر رہنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ جن کا کھاتے ہیں' اس کے سامنے نظر نہیں اٹھاتے۔ اتنی تیزی رکھنا سکھا رہی ہے۔"

منزہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سوہا اس سے پہلے پھٹ پڑی۔

"میں کسی کا دیا نہیں کھاتی۔ جو میری ماں دیتی ہیں صرف وہ کھاتی ہوں۔"

منزہ تو اس کے اچانک بولنے پہ گھبرائی ہی۔ چند لمحوں کے لیے شمشاد بیگم بھی سٹپٹا گئی۔ اگرچہ یہ بھلا ہٹ اسے سوہا کی باغی باتوں سے کبھی اکثر ہوتی تھی لیکن یہ امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی یہ بالشت بھر کی لڑکی اس کے مقابلے آ جائے گی۔

دوبارہ اسا سنبھلی اور پہلے سے زیادہ بپھرے انداز میں غرائی۔

"ہاں' ہاں تو جیسے پچھلوں سے مانگ کے لاتی ہے یا پھر اپنے... کے عاشقانے گانٹھ کے... ہے ناں... بے غیرتے' ماں سے لے کر کھائے یا قبر میں پڑے باپ سے... آتا تو میرے بیٹے کی کمائی سے ہے سب کچھ۔ تیرے پینے پرانے کپڑے... اور پیٹ کے اندر ڈلا راشن۔ اندر باہر سب میرے بیٹے کی خیرات ہے۔ اور اکڑ دیکھو۔ جیسے باپ تو مین کے نیچے قیمہ بننے سے پہلے جائیدادیں لکھ گیا تھا۔"

"بس کریں اماں!"

منزہ کے دل کو مظہر کے اس تکلیف دہ انداز میں ذکر نے جیسے چیر کے رکھ دیا۔

سوہا بھی جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"آپ... آپ..." شدت غصہ سے اس کے الفاظ کہیں کھو سے گئے۔

"بڑی تکلیف ہو رہی ہے پچھلے خصم کی بات سے۔ اتنی عاشقی زور مار رہی ہے دل میں تو چلی کیوں نہیں جاتی اس کے پاس جا۔ چھوڑ میرے نویدے کا پیچھا۔ اس بیچارے کے حصے کیا آیا ہے۔ کسی اور کی اولاد۔ جسے پال پوس کر کھلا پلا کے بڑا کرے گا مگر وہ اس کی بنے گی نہیں۔ اور کسی اور کی جورو۔ جس کے پیچھے سارا کچھ لٹا دے گا پھر بھی وہ پرانے والے کی محبت اور پرانے والے کی اولاد کو ہی سارا کچھ سمجھے گی۔"

"آپ بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہی ہیں۔"

بے بسی اور توہین کے احساس سے مغلوب ہو کے وہ جیسے فرش پہ ذرہ ذرہ بکھر گئی تھی۔

سوہا نے آگے بڑھ کے ماں سے لپٹ کر شاید اس کے درد کی شدت کو کم کرنا چاہا۔ اس کے بالوں میں جذب ہوتے منزہ کے آنسو اسے بھی رونے پہ مجبور کر گئے۔

"ماں بیٹیاں۔ منحوس۔ جس دن سے گھر آئی ہیں۔ رو رو کے نحوست پھیلائی ہوئی ہے۔ جس کا ماتم کرنا ہے جا کے اپنے ماں پیو کے گھر کر۔ اگر وہ گھسنے دیں تو۔"

آخری فقرہ اس نے کمرے سے نکلتے نکلتے بڑے طنز بھرے لہجے میں کہا تھا۔ سوہا نے گریہ اور ضبط سے سرخ ہوتی آنکھیں اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ شمشاد بیگم اپنے پہلو سے وشمہ کو چپکائے باہر نکل رہی تھی۔ وشمہ نے جاتے جاتے گردن موڑ کر منزہ کو دیکھنا چاہا۔ اس کی معصوم نظروں میں بے حد واضح معذرت خواہانہ ترحم تھا۔ جو سوہا کی خونی نظروں سے ٹکرا کے ساکت ہو گئیں۔ وشمہ نے جلدی سے سہم کر گردن موڑ لی اور دادی سے الگ ہو کر تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

سوہا اب تک کھا جانے والی نظروں سے اسی جانب تکے جا رہی تھی۔ جہاں اب کوئی نہیں تھا۔ ادھ کھلا دروازہ تھا اور راہداری سے آتی روشنی کی ہلکی سی لکیر تھی۔

"جس کا ماتم کرنا ہے' جا کے اپنے ماں پیو کے گھر کر۔ اگر وہ گھسنے دیں تو۔"

شمشاد بیگم کا یہ طعنہ رہ رہ کر منزہ کو کچوکے لگا رہا تھا۔

"میں نے میکے سے کٹ کر اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی ماری۔ بس اماں مجھے لاوارث سمجھ کے انتہا پہ اتر آئی ہیں۔ غلطی میری ہے۔" اس نے سچائی سے اپنا محاسبہ کیا۔

بلبل' کلثوم' جمشید اور ثنا کے دباؤ پہ اس نے نوید مراد سے شادی کر تو لی تھی مگر اپنے بھائیوں' بھابیوں کے

خلاف اس کی دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی تھی پھر اس نئی زندگی کے آغاز میں ہی درپیش آنے والی تکالیف نے کو اور بھی بڑھا دیا۔ وہ یہی سوچتی کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر بھائی اپنے دل بڑے کر لیتے۔ بھابیاں اپنے ظرف میں اتنی گنجائش پیدا کر لیتیں کہ وہ سوہا کے ساتھ باقی عمر عزت اور سکون سے انہی کے گھر کے کسی کونے میں گزار دیتی۔

"ماما.... آپ ابھی تک رو رہی ہیں؟" سوہا کی ملائم ہتھیلیاں اس کے گیلے رخساروں پر ٹھہر گئیں۔

اس نے اپنے خیالوں سے چونک کر اسے دیکھا۔

بچپن اور لڑکپن کے سنگم پہ کھڑی سوہا کی نظروں میں اسے ایک سنگلاخ بڑھاپا نظر آیا۔

وہ لرز کے رہ گئی۔

"نہیں.... میں رو تو نہیں رہی.... میں تو....

ایک سفید جھوٹ بولتے ہوئے وہ اپنی ہی بیٹی سے نظریں چرا گئی جو آج اسے خود سے بڑی یا شاید بوڑھی نظر آ رہی تھی۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں۔ میں کوئی رو رہی ہوں کیا؟ ان کی باتوں پہ کیا رونا ماما! ان کی تو عادت ہے۔ اگر ہم ہر بات پہ رونے لگے تو رونا ہماری عادت بن جائے گی۔"

اب منزہ کو لگا جیسے وہ اس سے عمر رسیدہ ہی نہیں۔ کہیں زیادہ دنیا شناس اور تجربہ کار بھی ہو گئی ہو۔ دل ہی دل میں وہ اپنی بیٹی سے مرعوب ہو گئی۔

"میں اس لیے نہیں رو رہی بیٹا! میں تو.... دراصل مجھے تمہارے ماموں کی یاد آ رہی تھی۔"

سوہا کی آنکھوں میں بے یقینی نظر آئی مگر اس نے اختلاف ظاہر نہ کیا۔

"بہت دن بھی تو ہو گئے ہیں ان سے ملے ہوئے۔" "لیکن ہم تو زیادہ تر عید وغیرہ پہ ہی ان سے ملا کرتے ہیں۔ اس میں نئی بات کون سی ہے جو آپ اداس ہو رہی ہیں۔"

سوہا کے لیے ماموؤں اور ان کے اہل خانہ سے یہ سرسری سے روابط معمول کی بات تھی کیونکہ اس نے اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد یہی روش دیکھی تھی لیکن منزہ کا دل کٹ رہا تھا پرانے دن یاد کر کے جب وہ بھائیوں کے گھر کی رونق تھی۔ بھابیوں کی سہیلی تھی۔ کتنی محبتیں سمیٹی تھیں اس نے اس گھر میں اور اب ذرا سی بات۔ گو وہ بات اتنی ذرا سی بھی نہ تھی مگر ان بے شمار محبتوں اور خلوص بھری یادوں کے سامنے اب وہ ہیچ نظر آ رہی تھی۔ اس بات کو خلش بنا کے دل میں میکے کے خلاف کدورت پال لینے کا اپنا فیصلہ اسے سراسر حماقت لگ رہا تھا۔

اپنی کم ظرفی محسوس ہو رہا تھا۔

"چلیں ماموں کے ہاں؟"

ماں کے اس خیال پہ وہ حیران ہوئی۔ "ماموں کے ہاں؟"

"ہاں کچھ دن رہ آتے ہیں۔" اس نے بیٹی کے تحیر سے نظریں چرائیں۔ "ویسے بھی لانگ ویک اینڈ ہے اسکول تو تین دن بند رہے گا۔"

"مگر تین دن ہم وہاں؟ پہلے تو آپ کبھی نہیں رہنے جاتی تھیں۔"

"جاتی تھی۔ تمہیں یاد نہیں ہے۔ تب تم چھوٹی بہت تھیں۔"

اس نے تب کا ذکر کیا جب واقعی مظہر کی بے پناہ محبتوں کے باوجود وہ میکے کی جانب کھنچ کھنچ کے جایا کرتی تھی۔ پلڑا دونوں طرف کی محبتوں کا ایک ہی جیسا تھا اور مظہر اس کے بھاگ بھاگ کے میکے جانے سے چڑ جایا کرتا تھا۔

"کیا مصیبت ہے۔ تمہیں یہاں چین نہیں ہے؟" وہ استحقاق بھری گرفت میں لیے اسے جھنجھوڑ کر کہتا۔

سخت لہجے میں ایک گدگدانے والا احساس چھپا ہوتا تھا۔

"اور آپ کو پتا نہیں کیا مصیبت ہے۔ بھاگے چلے آتے ہیں میرے پیچھے۔ کبھی دو دن ٹک کے میکے نہیں رہنے دیا۔" وہ بھی پیار بھری خفگی جتاتی۔

... نہیں رہا جاتا۔ کیا کروں۔"

"... نہیں رہا جاتا؟" وہ شوخی سے پوچھتی۔ محبت کے بھرپور اظہار کی چاہ لہجے سے ٹپک رہی ہوتی۔

"... کے بغیر نہیں رہا جاتا۔" وہ چند ماہ کی سوہا کو گود میں بھر لیتا۔ "اور تم کیا سمجھ رہی ہو۔ تمہارے بغیر۔"

"... سوہا کے بغیر۔" وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے اطمینان ...

"... اچھا جی۔ ٹھیک ہے پھر لے جائیں اپنی بیٹی کو میں تو ابھی نہیں آنے والی۔"

... جاتی ...

مظہر کی ... قابل دید ہوتی۔

"آئندہ جب بھی آؤں گی۔ سوہا کو آپ کے پاس چھوڑ کر آؤں گی۔ ٹھیک؟"

"... نکلنے دیتا ہوں میں تمہیں اکیلے۔" وہ دانت پیستا اس کی جانب بڑھتا اور وہ قل قل کرتی ہنسی کے ساتھ اپنے ...

... لیے ... ہو جاتی۔

"کہاں کھو جاتی ہیں ماما؟"

سوہا کی بات پہ وہ ایک جھٹکے سے حال میں واپس آئی۔

وہی مجرمانہ سا احساس دل کو گھیرنے لگا جو مظہر کی بے ساختہ یاد کے بعد اسے ستانے لگتا تھا۔

نوید مراد سے غفلت کا احساس۔

بے ایمانی کا احساس۔

کچھ غلط کر لینے کا ندامت بھرا احساس۔

"کچھ نہیں۔ تم کیا کیا لے کر جاؤ گی۔ کون سے کپڑے رکھوں تمہارے؟" وہ ہر خیال کو جھٹک کر پوچھنے لگی۔

"ہم واقعی جا رہے ہیں؟" سوہا کی آنکھیں پھیل گئیں، اب اسے ماں کی سنجیدگی کا یقین آ رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھی اور الماری کھول کر بیگ نکال لیا۔

"وہ... وہ جانے دیں گے؟"

نجانے کب بے حد نامحسوس طریقے سے وہ نوید مراد کو پاپا کہنا ترک کر چکی تھی جسے منزہ نے نوٹ تو کیا مگر جتا نہ سکی۔

"کیوں روکیں گے۔ ان کی بہن نہیں آتی رہنے کے لیے۔"

پروین کے ذکر پہ منزہ کے لہجے میں تلخی گھلی۔

"ہم وہاں جا کے کریں گے کیا؟"

"جو بھی کریں گے، کم از کم وہ نہیں کریں گے جو یہاں کرتے ہیں۔"

پیکنگ کرتے کرتے اس نے بے حد مصروف انداز میں کہا۔ اور پھر اچانک ہاتھ روک کر کہنے لگی۔

"ہم وہاں روئیں گے نہیں۔"

مگر یہ کہتے ہوئے وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے ایسا کرنا ہو گا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔

٭ ٭ ٭

لگن خرید کے لائی نی میں
لگن خرید کے لائی
دنیاداری، قسمت ماری
شکلیں بدلے روز
دل کی ایک نہ چلنے دے
اور
عقلیں بدلے روز

عشق کے کاروبار میں پڑ کے
اچھا نفع کمایا
گھڑی گھڑی، پل پل کو
اپنے دل کا ماس کھلایا
تن، من، دھن
سب بیچ دیا اور
بھاگ خرید کے لائی نی میں
بھاگ خرید کے لائی
کوئل لینے گھر سے نکلی
کاگ خرید کے لائی نی میں
کاگ خرید کے لائی

وہ کب سے آنکھیں موندے لیٹے ہوئے اسی گیت کو سنے جا رہی تھی۔ ایک ایک بول جیسے سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔

جعفر نے کمرے میں قدم رکھتے ہی ناگواری سے اسے دیکھا۔

مسلے ہوئے، سلوٹوں سے پُر یہ ہلکے پیلے کپڑے اس نے دو روز سے تبدیل نہیں کیے تھے اور کمرے کی تاریکی میں اس کا وجود اس میلے پیلے لباس میں اور بھی پژمردہ لگ رہا تھا بکھرے ہوئے بال، مرجھایا ہوا بے زار چہرہ۔

جعفر نے آگے بڑھ کے سی ڈی پلیئر آف کر دیا۔

مدیحہ نے آنکھیں کھول کے اس دخل اندازی کرنے والے کو دیکھنا چاہا اور پھر بے اعتنائی سے دوبارہ آنکھیں موند لیں جیسے جعفر کے آنے جانے، ہونے نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

جعفر نظرانداز کیے جانے والے اس مسلسل عمل سے تلملا کر رہ گیا۔

کتنے دن سے وہ یہی تماشا دیکھ رہا تھا اور اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ مدیحہ نے اس سے بغیر کسی وجہ کے مکمل بے اعتنائی اختیار کر رکھی تھی۔ کم از کم اس کے نزدیک تو مدیحہ کا یہ طرز عمل بغیر وجہ کے ہی تھا۔

"یہ کیا لگا رکھا ہے، نری نحوست، عجیب سا شوق سوار ہو گیا ہے تمہیں، ایسے ماتمی گانے سننے کا۔"

"اب آپ کو اس پہ بھی اعتراض ہے؟" مدیحہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہ ہو، کئی ہفتوں سے تمہارے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہوں۔ مجھ سے، بچوں سے، گھر سے، ہر چیز سے لاتعلق ہو چکی ہو تم۔ بس تم ہو، تمہارا یہ کمرہ اور ایسے واہیات گیت...... یہ عمر ہے ان سب خرافات کے پالنے کی۔"

"کیوں کیا ہوا ہے میری عمر کو؟" وہ تنک کے پوچھتے ہوئے اس کے مقابل آئی۔

"مجھ سے سات آٹھ برس تو بڑے ہوں گے آپ، جب آپ اس عمر میں ایسے شوق پال سکتے ہیں تو۔"

"کیسے شوق؟"

جعفر کا ماتھا ٹھنکا مگر وہ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سوال کر رہا تھا کیونکہ فی الوقت اس کا دامن صاف تھا۔

"میرا منہ نہ کھلوایئے۔"

"تم منہ کھول ہی لو تو اچھا ہے۔ آج پتہ چل جائے کہ تمہارے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔"

"کھچڑی میرے نہیں، آپ کے دماغ میں پک رہی تھی۔ جب آپا گھر آ کے بیٹھی تھیں۔ آپ تو وہ مطلبی خود غرض انسان ہیں کہ بہن کی گھر ہستی اجڑنے پہ بھی اپنا فائدہ دیکھ رہے تھے کہ اس موقع سے فائدہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے، کیسے اپنی من مانی کی جا سکتی ہے۔"

"تم اس بات کو رگڑنا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔" وہ زچ ہوا تھا۔

تنازعہ اٹھا اور دب بھی گیا۔ اب تو اس کی اپنی بہن بھی اپنے اس شوہر کے ساتھ راضی بہ رضا تھی جس نے دوسری عورت کے چکر میں پھنس کے سارے خاندان میں ہلچل مچا دی تھی لیکن مدیحہ تھی کہ نہ خود اس بات کو بھول رہی تھی نہ اسے بھلانے دے رہی تھی۔ اس کا گھر اس حادثے کے بعد اب تک زلزلے کی زد میں تھا۔

"تم ایک انتہائی بے وقوف عورت ہو بلکہ میں تو کہوں گا پاگل عورت ہو۔ کوئی ہوش و حواس رکھنے والی عورت اس طرز عمل کا مظاہرہ نہیں کرتی جو تم کر رہی ہو۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس کو بنیاد بنا کے تم گھر کا ماحول خراب کرنے پہ تلی ہوئی ہو۔"

"اچھا...... کچھ نہیں کیا آپ نے؟ بہت ملال ہے کچھ نہ کرنے کا؟ تو اب کر لیں۔ نکال لیں دل کی حسرت۔"

"مجھے تو لگتا ہے اپنا گھر اجاڑنے کی حسرت تمہارے اپنے دل میں ہے۔ عورتیں ازدواجی زندگی بچ جانے پہ اللہ کے حضور شکرانے کے نفل ادا کرتی ہیں۔ خطرہ ٹل جانے پہ سکون کا سانس لیتی ہیں مگر تم اندر ہی اندر تلملا رہی ہو کہ وہ کچھ ہوا کیوں نہیں جو ہونے والا تھا۔ حالانکہ ایسا کرنے کا میرا ارادہ تھا نہ نیت۔ وہ صرف تمہارے بھائی کے عمل کا ردعمل تھا اور کچھ نہیں۔"

اس کے کہنے پہ مدیحہ نے نخوت سے سر جھٹکا جیسے اس کی کسی بات پہ بالکل یقین نہ ہو۔ اس کی یہ حرکت جعفر محمود کو اور تپا گئی۔

"بھوسہ بھرا ہے دماغ میں۔ کچھ بیٹھتا ہی نہیں تمہاری عقل میں۔" مدیحہ کا رویہ اسے اس اسٹیج پہ لے آیا تھا جہاں اس جیسا اعلا تعلیم یافتہ، مہذب اور نفیس شخص جو اعلا سرکاری عہدے دار رہ چکا ہو۔ آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"میرا ہی دماغ خراب ہے جو روز تمہارے آگے صفائیاں پیش کرتا ہوں۔ تمہیں تو ساری تکلیف اس بات کی ہے کہ یہ رشتہ ٹوٹتے ٹوٹتے پھر بچ کیسے گیا۔ اسی کے نوحے اور ماتم کر رہی ہو اتنے ہفتوں سے۔"

"ہاں...... ہاں...... اسی کا غم ہے مجھے۔" وہ بھی چلائی۔ "جب سر پہ ہر وقت خطرے کی تلوار لٹک رہی ہو تو اس خوف کے ساتھ جینا کہ تلوار کب آپ کے آر پار ہو جائے۔ مرنے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ لگتا ہے۔"

"میں سارا دن سر کھپا کے اس لیے گھر لوٹتا ہوں کہ آگے تم مرنے جینے کے کھاتے کھول کے بیٹھ جاؤ۔ سنبھل جاؤ مدیحہ! اس گھر کو اپنے اور میرے لیے جہنم نہ بناؤ، ورنہ......"

اس کی تنبیہہ کے انداز میں کھڑی انگلی دیکھ کے مدیحہ نے ایک استہزائیہ ہنکارا بھرا۔

"ورنہ...... ورنہ کیا...... اوہ...... تو اب آپ اپنے اگلے کسی بھی اقدام کے لیے مجھے موردالزام ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ بہت خوش قسمت ہیں آپ...... ہمیشہ اپنے دفاع کے لیے آپ کو کوئی نہ کوئی بہانہ مل جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی جواز گھر بیٹھے ہی نکل آتا ہے جیسے اس بار "میں......" اس بار آپ مجھے الزام دے دیں گے کہ میری روتی شکل دیکھ کے، میری کڑوی باتیں سن کر آپ باہر کی رنگینیوں میں پناہ لینے پہ مجبور ہوئے۔ بہت خوب۔"

"تو ہیل ود یور کمپلیکسز...... پتہ نہیں کون سی رنگینیوں کے اندیشے پال رکھے ہیں تم نے۔"

وہ بھنا گیا اور زور سے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس رکھے اسٹول کو ٹھوکر ماری۔ ماربل کے فرش سے اسٹیل راڈ کے اسٹول کے ٹکرانے کی زوردار آواز نے اپنے کمرے میں بیٹھی ٹی وی دیکھتی بچیوں کو چونک جانے پہ مجبور کیا۔

تقدیس نے ٹی وی کا والیم کم کیا۔

جعفر محمود کی اونچی آوازیں، مدیحہ کے کبھی سسکنے کی تو کبھی تڑپ کے چلانے کی آوازیں...... دروازوں اور دیواروں کی حدیں پار کر کے پورے گھر میں پھیل رہی تھیں۔ اس کے چہرے پہ سراسیمگی پھیل گئی۔

"آواز اونچی کرو تقدیس! اتنا مزے کا ٹاک شو ہے۔"

اس سے ڈیڑھ سال بڑی تحریم نے پروگرام میں رخنہ پڑتے دیکھ کے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ ماما...... پاپا......"

"تو کیا کریں' یہ تو روز کی بات ہے۔"

کچھ وہ طبعاً "لاابالی" تھی۔ کچھ تقدیس ضرورت سے زیادہ حساس' اس لیے بڑی بہن کی اس بات پہ چھوٹی سی اٹھی۔ ریموٹ اس کے پاس پھینک کر خود کمرے سے نکل گئی۔

"آپ ایک انتہائی عیاش اور رنگین مزاج انسان ہیں۔ کب تک اس سچائی پہ پردہ ڈالیں گے۔ سارا گھر خاندان..... سارا شہر جانتا ہے اور آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔"

"تم یقین کیوں نہیں کرتیں میری بات کا۔"

جعفر محمود کا لہجہ تھکنے لگا تھا۔ وہ مدیحہ کی ضد کے آگے ہار رہا تھا جیسے.....

"تمہارے شک نے میری زندگی اجیرن کردی ہے۔"

"اور آپ کے کرتوتوں نے میری۔" وہ انتہائی تنفر سے بولی اور ٹھنڈی سیڑھیوں پہ بیٹھی تقدیس خود بھی برف جیسی ٹھنڈی ہوگئی۔

اسے یقین نہیں آیا کہ یہ اس کی ماما کی آواز تھی۔

ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک اپنے ماما پاپا کے درمیان بہت اچھے اور دوستانہ تعلقات تو اس نے کبھی نہیں دیکھے۔ ہمیشہ ایک تلخ سا پردہ دونوں کے درمیان حائل رہا۔ کبھی یہ دھند چھٹتی بھی تو بس چند دنوں کے لیے لیکن اس کھنچاؤ کے باوجود ایک لحاظ مانع رہتا اور اب جیسے اس کی ماما نے سارے لحاظ بالائے طاق رکھ دیے تھے۔ اس کے پاپا سے ایسی ایسی باتیں کر جاتیں کہ تقدیس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے لیکن اس کے باوجود اسے کبھی پاپا پہ غصہ نہیں آتا تھا۔ ان سے گلے ضرور تھے' شکایتیں ضرور تھیں مگر غصہ ان پہ نہیں آتا تھا۔ آتا تھا تو پاپا پہ..... جن کی وجہ سے ماما اتنی بدل گئی تھیں۔ اب وہ اس عمر کو پہنچ گئی تھی کہ یہ جان سکے' اس کی ماما کو پاپا سے کون سی شکایتیں ہیں۔ پاپا کی وہ کون سی عادتیں ہیں جن کی وجہ سے ماما اتنی تلخ ہو جانے پہ مجبور ہوئیں۔ وہ صرف جان سکتی تھی پر یہ نہیں سکتی تھی کہ کون صحیح ہے' کون غلط۔

"میرا خیال ہے میں اس گھر میں' اس کمرے میں آنا ہی چھوڑ دوں تو ٹھیک رہے گا۔ شاید یہی چاہتی ہو تم۔"

"میں یا آپ؟"

"خدایا..... کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔"

وہ دونوں مٹھیوں میں بال جکڑے بیڈ پہ گر گیا۔ اس کے اعصاب ٹوٹ رہے تھے۔ آفس سے آنے کے بعد اس نے نہ لباس تبدیل کیا تھا' نہ جوتے اتارے تھے۔ اسی حلیے میں بکھرا بکھرا وہ بیڈ پہ آڑا ترچھا پڑا مدیحہ کو تسکین پہنچا رہا تھا۔

"میں تمہیں اس قابل نہیں چھوڑوں گی جعفر محمود کہ تم کسی اور جانب نظر اٹھا سکو۔ میں اس طرح تمہارے حواسوں پہ سوار رہوں گی کہ تم کسی دوسری کے بارے میں سوچنے کے لیے فرصت ہی نہ نکال سکو گے۔"

اس نے اپنی حکمت عملی پہ خود کو جی بھر کے داد دی۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور خود بھی بیڈ کے دوسرے سرے پہ ٹک گئی۔

دن کو آدھا آدھا کر لینے میں
کوئی حرج نہیں ہے
رات کی بات الگ ہے ساجن
رات کی بات الگ

✡ ✡ ✡

"بہت اچھا کیا تم نے منزہ جو رہنے آگئیں۔"

کلثوم نے خوش دلی سے کہا۔ پہلے تو وہ یہ یقین کرنے پہ ہی تیار نہ تھی کہ منزہ بیٹی کے ساتھ تین دن یہاں رہنے

پہلے پہلے دوسرے میکے والوں کی طرح وہ اور جمیل بھی اس سے میکے آنے اور آ کے رہنے کے لیے اصرار کرتے رہے مگر مسلسل صاف انکار سننے کے بعد اس کی سردمہری اور گریز بھانپ کے خود ہی پیچھے ہٹ گئے' اس لیے کلثوم کو یہ بات اس کا نفیس سا مذاق ہی لگی۔

یہاں تک کہ بھابھی کو یقین دلاتے دلاتے خود منزہ ہی شرمندہ ہوگئی۔ تب جا کے انہیں یقین آیا۔

"پھوپھو..... آپ واقعی ہمارے ہاں رہیں گی؟"

بچوں کے لیے بھی یہ ایک حیرت انگیز اور خلاف معمول بات تھی۔

"رات بھی رہیں گی؟"

"کل لینے تو نہیں آئیں گے؟" وہ ہر طرح سے تسلی کر رہے تھے۔

"اماں نے پیچھا چھوڑا تو بچوں نے پکڑ لیا۔" منزہ نے ہنس کر کہا۔

"سوہا بہت چپ چاپ ہے۔"

سونیا نے اپنے سے چند سال چھوٹی سوہا کا ہاتھ دوستانہ انداز میں تھامتے ہوئے کہا۔

"چھوٹی تھی تو چابی کی گڑیا کی طرح بولے چلی جاتی تھی اور تم سے تو خاصی مانوس تھی۔ گود سے ہی نہیں اترتی تھی۔"

کلثوم کے ہنس کے کہنے پہ سونیا نے مسکرا کے سوہا کو دیکھا۔ ایک ہلکی سی زبردستی کی مسکراہٹ سوہا کے لبوں پہ بھی آن رکی۔

"ملنا ملانا رہا بھی تو نہیں کہ یہ اپنائیت وقت اور عمر کے ساتھ بڑھ سکتی۔"

کلثوم سنجیدہ ہوگئی۔

منزہ چپ چاپ اپنی ہتھیلیوں کو مسلنے لگی۔

سونیا سوہا کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا انداز دوستانہ تھا مگر سوہا کے رویے میں ابھی جھجک تھی۔

"ایک شہر میں رہتے ہیں۔ ایک بہن بھائی کی اولادیں ہیں مگر فاصلے ایسے جیسے دور کے رشتے دار ہوں۔" کلثوم نے آزردگی سے کہتے ہوئے جتایا۔

"یہی فاصلے مٹانے تو آئی ہوں بھابھی!"

"جمشید اور شاہ سات سمندر پار رہتے ہیں۔ سال بعد آتے ہیں مگر ان کے بچوں اور میرے بچوں میں ایسی دوستی ہے جیسے ایک ساتھ پل کے بڑے ہوئے ہوں۔ ذرا اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا انہیں یہاں آ کے' اس لیے کہ ان کے ماں باپ نے دور رہنے کے باوجود انہیں ہمارے لیے اور ہمیں ان کے لیے اجنبی رہنے نہیں دیا جبکہ سوہا..... خیر اب تم آتی جاتی رہو گی تو بچوں میں انسیت اور لگاؤ بھی پیدا ہو ہی جائے گا۔"

"انشاءاللہ..... دراصل سوہا کچھ ہے بھی الگ تھلگ رہنے والی۔ میں خود چاہتی ہوں کہ اس کی عادتیں بدلیں۔ وہ کسی کے ساتھ مل جل کے رہنا سیکھے۔"

"دیر آید درست آید۔ تمہیں یہ خیال تو آیا کہ اکیلے رہنا کتنی مشکل اور ناقابل عمل بات ہے۔ تم نے تو اتنے سالوں تک پتہ نہیں کس بات کی سزا دی تھی ہمیں جبکہ خدا گواہ ہے ہم نے تمہارا بھلا ہی کرنا چاہا تھا۔"

"پتہ نہیں' یہ سزا میں نے آپ کو دی تھی یا خود کو یا شاید سوہا کو..... خیر چھوڑیں یہ پرانی باتیں۔ کوئی نئی بات سنائیں۔"

"نئی بات تو یہ ہے کہ سونیا کے لیے میرے دبئی والے بھائی بھابھی نے بات چھیڑی ہے۔"

"سونیا کے لیے؟" منزہ کو حیرت ہوئی۔

"وہ تو بہت چھوٹی ہے۔ میری سوہا سے چار ساڑھے چار سال بڑی ہوگی۔"

"ہاں تو تمہاری سوہا بھی خیر سے بارہویں سال میں ہے۔ لڑکیوں کو بڑا ہوتے کون سا دیر لگتی ہے۔"

کلثوم بھابھی کی بات پہ منزہ نے گردن موڑ کر دور بیٹھی سوہا کو دیکھا۔ سونیا سے اس کا قد ایک آدھ انچ ہی کم ہوگا۔

بس دبلے پتلے وجود کی وجہ سے عمر چغلی کھا رہی تھی۔

"واقعی۔۔۔ وقت کتنی جلدی گزر گیا۔" اس نے سوچا۔

اس گھر میں اس طرح نظر بھر کے سوہا کو دیکھنے کی فرصت ہی کب ملتی تھی۔ اس پہ بھی سگی اولاد کو نظر لگنے کا فتویٰ صادر ہونے کا ڈر لاحق رہتا تھا۔

"میں سوہا کی شادی کروں گی مگر اسے رخصت نہیں کروں گا۔ کسی کو گھر داماد بننا ہے تو سو بسم اللہ۔ میری بیٹی نہیں جائے گی۔"

مظہر کی بھولی بسری سرگوشی ہوا کے دوش پہ برسوں کا فاصلہ طے کرتی اس تک پہنچی۔

"اور بھائی، بھابھی نے کون سا کل پرسوں تک شادی کرنے کو کہا ہے۔ ابھی تو سونیا بھی پڑھ رہی ہے اور فواد بھی۔ چار پانچ سال تک دیکھیں گے شاید۔"

یعنی آپ کی مرضی ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے حاضر رہنے کی کوشش کی۔

"ہاں۔۔۔ مرضی تو ہے۔۔۔ آگے جو اللہ کو منظور۔"

❖ ❖ ❖ ❖

"سب تیری شہ ہے نوید۔۔۔"

عرصے بعد شمشاد بیگم پہ سارے گھر کی ذمہ داری آن پڑی تو وہ بوکھلا کے رہ گئی۔ آج ابھی دوسرا دن تھا۔ ماں بچوں سمیت میکے گئے ہوئے اور اس کے ہاتھ پیر پھول کے رہ گئے تھے۔

حالانکہ جاتے جاتے وہ دوپہر اور رات کا کھانا بھی پکا گئی تھی۔ دوپہر کے لیے روٹیاں پکا کے ہاٹ پاٹ میں رکھ گئی تھی۔ رات کو شمشاد کو روٹیاں نہیں پکانی پڑیں، اس کے لیے وہ طاہری کے چاولوں کا بگھار بھی لگا گئی تھی کہ یہ ساس کو ویسے تو گھر کے، خصوصاً" کچن کے سب ہی کاموں سے چڑ تھی مگر روٹی پکانے سے اس کی جان جاتی تھی۔ جب کبھی موڈ میں ہوتی اپنی نئی شادی شدہ زندگی کے قصے اور ساس نندوں سے اپنے معرکے خوب لے لے کر اور فخر سے سنایا کرتی جن میں سے اکثر تاریخی معرکے روٹی پکانے کے تنازعے پہ ہوتے تھے۔ اسی لیے اس نے یہ اہتمام کیا تھا۔ نوید مراد کے دو تین دن کے کپڑے بھی استری کر کے الماری میں لٹکا دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ روٹیاں تو وہ دو تین دن کی پکا کے ہاٹ پاٹ میں نہیں رکھ سکتی تھی۔

سو پہلا دن تو ذرا کم بڑبڑ کرتے ہوئے گزرا۔ اگرچہ ہاٹ پاٹ کی روٹیوں کو کھانے پہ بھی خاصی لے دے ہوئی لیکن اگلا دن شمشاد نے تڑپ کے گزارا۔ دو تین تھپڑ تو وشمہ کو دے مارے۔ صفائی والی ماسی سے سنگین تلخ کلامی اور گالم گلوچ ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ روتے دھوتے آئندہ اس گھر میں کبھی قدم نہ رکھنے کی قسم کھا کے رخصت ہوئے گئی، جہاں چند سو روپے کی تنخواہ کے بدلے اس حد تک ذلت سہنا پڑتی ہے۔ وشمہ نے نہانے کی بات پہ شرط یہ مانی کہ وہ نہا کر اپنا گلابی چکن کا نیا جوڑا پہنے گی جو منزہ اس کے لیے لائی تھی اور شمشاد نے اس گلابی چکن کے جوڑے کو ڈھونڈنے کے لیے ساری الماری اوندھی کردی مگر وہ نہ ملنا تھا، نہ مل کے دیا۔ کمرے اور الماری کا حال ہوا سو الگ۔

"میری ساری الماری خراب کردی۔ دادو۔۔۔ آپ سے تو کوئی کام صحیح نہیں ہوتا۔"

پوتی کے ٹھنک کے بولے گئے کڑوے سچ پہ اس کی تواضع ایک کرارے تھپڑ سے کی گئی۔ اتنے میں کچن میں چڑھایا گوشت ککر کے اندر ہی کباب ہو گیا۔ اس حرکت کی پاداش میں پریشر ککر کی ماں بہن ایک کی گئی۔

جس وقت صفائی والی ملازمہ شمشاد کے ہتھے چڑھی تھی، تب وہ گیراج دھونے لگی تھی، اسی لیے پانی کی ٹنکی کے نل سے پائپ بھی لگا رکھا تھا۔ یہ کام تو شمشاد کی گالیوں کی نذر ہوا اور وہ سب ادھورا چھوڑ کے چلی گئی۔ شمشاد نے اس کے جاتے ہی بند کردی مگر نل کھلا ہی رہا۔ سارا پانی بہہ چکا تھا اور پانی کی ٹنکی خالی ہو چکی تھی۔

"دادو۔۔۔ پانی نہیں آرہا۔۔۔ کیسے نہاؤں؟"

جس وقت شمشاد جلے ہوئے گوشت کو دیکھ کے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی، تب وشمہ نے کچن میں

خوش خبری سنائی اور دوسرا تھپڑ بھی وصول کیا۔

"بدبخت۔۔۔ جان کے نلکا کھلا چھوڑا ہو گا تاکہ نہانا نہ پڑے۔ ذلیل۔۔۔ اب پانی کہاں سے لاؤں۔ دوپہر کا ایک بج رہا ہے۔ شام پانچ بجے سے پہلے پانی کسی طرح نہیں آنے والا۔ چاہے چار چار موٹریں چلا لو، نیا سیاپا۔"

ہاتھ دھونا بھول کے وہ اب سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ دوپہر کے ڈھائی بجے جب بھوک نے زیادہ ہی زور مارا تو نوید کو فون کھڑکایا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کا ملازم بریانی اور مرغ چنے کے ساتھ نان پکڑا گیا۔

"چل آ۔۔۔ روٹی کھا لے۔"

اسے احساس تھا کہ اپنی جھلاہٹ میں وہ صبح سے اب تک وشمہ بے چاری کو دو چار تھپڑ رسید کر چکی ہے، اس لیے منانے کی خاطر کھانا اٹھا کر اس کے کمرے میں ہی لے آئی۔ وہ اوندھی گری تکیے میں منہ دیے سسک رہی تھی۔

"اب بس بھی کر، دادی سے کیا غصہ۔۔۔ وہ جو ماں ہے نا تیری۔۔۔ نئی والی۔۔۔ پھاپھے کٹنی۔۔۔ اسی کی وجہ سے ہوا ہے سارا کچھ۔ نہ وہ سارا کچھ میرے سر پہ ڈال کے بھائی کے گھر بیٹھتی نہ میرا دماغ گھومتا۔ آ میری رانی۔۔۔ تو تو میری بڑی پیاری دُلاری رانی ہے۔"

اس کے پاس بیٹھ کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے شمشاد چونک اٹھی۔

"ہائے۔۔۔ میں مرگئی۔" "اتنا ڈاڈا تپ (تیز بخار) سارا پنڈا بھا بھڑ بنا ہوا ہے۔"

ویسے چینی سے اس کے ماتھے اور کاندھوں پہ ہاتھ پھیر پھیر کے بخار کی حدت کا اندازہ کرنے لگی۔

فوراً" نوید کا نمبر دوبارہ ملایا گیا۔

"وشمہ بڑی بیمار ہے۔ تیز تپ چڑھا ہوا ہے۔"

"کب سے؟"

"کب۔۔۔؟" اس سوال پہ وہ چکرا گئی۔

"ابھی۔۔۔ ابھی تو۔۔۔" وہ بتانے لگی۔

"ایک دو منٹ میں اتنا تیز بخار۔ تھوڑی دیر پہلے تو آپ نے کھانا منگوانے کے لیے فون کیا تھا، تب تو نہیں بتایا؟"

"تب مجھے کیا پتا تھا۔"

"یعنی بخار تب بھی تھا، صرف آپ کو پتہ نہیں تھا۔ کمال ہے آپ نے بچی کی خبر تک نہیں لی صبح سے۔"

"لے دیکھ۔۔۔ جرح کرتا جا رہا ہے ماں سے۔" شمشاد کو اب کے تاؤ ہی تو آ گیا۔

"میں نے بیمار کیا ہے؟ اب کیا سارا گھر بار چھوڑ کے اس کی پٹی سے لگ کے بیٹھ جاتی، یہ دیکھنے کے لیے کہ کب تپ چڑھتا ہے۔ بچوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ابھی کھیلتی پھر رہی تھی، ابھی منجی پہ پڑی ہے۔ گھر آ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جا۔ میرا دماغ نہ کھا۔"

ماں کی پھٹکار سن کر نوید ذرا دھیما ہوا۔

"میں نکل رہا ہوں، آپ اسے پانی کی پٹیاں کریں تب تک۔" اور وہ پیالے میں پانی لے کر پٹیاں کرنے بیٹھ گئی۔ سامنے ٹرے میں بریانی سے بھری پلیٹ، مرغ چنے کا پیالہ، روغنی نان پڑے بھاپ اڑا رہے تھے۔ شمشاد کی نظریں بار بار پوتی کے چہرے سے بھٹک کے کھانے تک جاتیں اور پیٹ میں ایک زبردست لہر اٹھنے لگتی۔

دس بارہ منٹ تک پٹیاں کرنے کے بعد اسے لگا جیسے وشمہ کا بخار کم ہو رہا ہے۔

"وشمہ۔۔۔"

"ہوں۔۔۔" دادی کی پکار کے جواب میں اونگھتی ہوئی کراہ اس کے لبوں سے نکلی۔

"دادی صدقے۔۔۔ تپ ہولا ہوا ہے؟"

اس سوال کا جواب وہ کیا دیتی۔ دوبارہ کراہ کے رہ گئی۔ شمشاد نے اس کے ماتھے کو چھو کے دیکھا۔ بخار واقعی کم تھا۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کیے اور ٹرے اپنے آگے کھسکالی۔ بریانی کے بڑے بڑے نوالے

نگلتی وہ بے تابی سے بھوک مٹا رہی تھی جب نوید مراد اندر داخل ہوا۔

اس نے ٹھٹک کے رکتے ہوئے ایک نظر بخار سے نیم بے ہوش بیٹی کو دیکھا اور پھر مرغی کی ٹانگ بھنبھوڑتی ماں کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں ایک واضح اور جتانے والی ناگواری تھی۔

"میں نے پٹیاں کی تھیں۔"

اس نے گڑبڑا کے کارکردگی جتائی مگر نوید وشمہ کو بازوؤں پہ اٹھا کے مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ شمشاد نے ناپسندیدگی سے اسے گھورتے ہوئے سر جھٹکا اور دوبارہ کھانے میں مگن ہو گئی۔ پیٹ بھر گیا تو نئے سرے سے اس کی فکر جاگ اٹھی۔

"ہورے کس ڈاکٹر کے پاس لے گیا ہے۔ مجھے جھوٹے منہ بھی نہیں کہا ساتھ جانے کو۔ ہائے! بخار تو نہیں ہو گیا۔"

وہ ادھر سے ادھر چکر کاٹتی رہی۔ کھانا بھی ہضم ہو گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں نوید وشمہ کو لے کر آ گیا۔

"گلا خراب ہونے کی وجہ سے بخار ہوا ہے۔ دوا انجکشن لگے ہیں۔ دوا بھی دے دی ہے ڈاکٹر نے۔ کہا ہے رات کو کسی بھی وقت دوبارہ تیز ہو سکتا ہے مگر ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ دوا کی خوراک اور دینے سے اور پٹیاں کرنے سے بخار اتر جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے دوبارہ تیز ہی نہ ہو۔ البتہ پرہیز عرصہ کرنا ہوگا۔"

اس نے تفصیل بتا کے ماں کی تسلی تشفی کرانا چاہی جو چٹا چٹ وشمہ کو چومے جا رہی تھی۔

"میری شہزادی..... میری رانی..... میری جند....."

"اسے کچھ کھانے کو دیں اماں!"

"بریانی....." وشمہ نے ٹرے میں بریانی کی باقیات دیکھ کے فرمائشی صدا بلند کی۔

"وادی صدقے۔" شمشاد نے پلیٹ میں سے بریانی ہاتھ کے نوالے میں بھری اور وشمہ کے منہ میں ڈالنے لگی۔

"کیا کر رہی ہیں اماں! میں نے ابھی بتایا ہے کہ ڈاکٹر نے اسے پرہیزی کھانا دینے کو کہا ہے۔ یہ برتن تو اٹھا لیتے کم از کم تاکہ اس کا دل نہ للچاتا اور اس کے لیے سوجی یا ساگودانہ وغیرہ بنا دیں۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے ٹرے اٹھا کے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اکلوتی اور لاڈلی پوتی سے محبت اپنی جگہ مگر کام کرنے سے اس کی جان جاتی تھی۔

رات تک طوعاً" و کرہاً" اس نے ہر وہ کام کسی نہ کسی طرح کر ہی لیا جو ضروری تھا مگر صبح اٹھتے ہی نوید نے اس کا پھولا ہوا منہ دیکھا۔

"جا..... لے کر آ اپنی زنانی کو..... مجھ سے نہیں سنبھالا جاتا سارا گھر۔"

"اماں! وہ تین دن کا کہہ کے گئی ہے۔ آ جائے گی کل صبح تک۔" نوید نے ماں کا موڈ بھانپ کر خود ہی چائے چڑھایا۔

"ناں تیری زبان گھستی ہے کہتے ہوئے۔ لڑکی بخار سے ادھ موئی پڑی ہے اور وہ میکے جا کے بیٹھی ہے بے غیرت۔"

"کچھ نہیں ہوا وشمہ کو۔ معمولی سا گلا خراب تھا۔ اب ٹھیک ہے، شام تک اور بہتر ہو جائے گی۔"

"بلے..... زنانی کی بات آئی تو معمولی گلا خراب..... شام تک ٹھیک ہو جائے گی اور کل ماں کو اٹھا دیا تھا کہ میری بچی کا خیال نہیں رکھا۔ واہ جی واہ۔" وہ ہاتھ نچا نچا کے کہتی رہی اور نوید پیشانی پہ بل لیے چائے کا ڈبہ ڈھونڈتا رہا۔

"میں کہہ رہی ہوں مجھ سے نہیں ہوتے اتنے کام۔"

"یہ بھی آپ کا فیصلہ تھا۔ اچھی بھلی کام والی تھی۔ سارا دن رہتی تھی۔ سارے کام آسانی سے ہو جاتے۔ آپ نے ہی ہٹایا تھا اور اب کل کام والی ماسی ہے پتہ نہیں کون سا پھڈا کیا ہے جو آج وہ آئی نہیں۔"

"دیکھ کر اس کالے بوتھے والی کو۔ بچی چورنی تھی۔ میں نے کل اسے جواب دے دیا ہے۔"

"بس بس پھر۔" نوید نے تلخی سے کہتے ہوئے فریج کا دروازہ زور سے بند کیا۔

"میری بڈھی ہڈیاں اس جوگی کہاں کہ سارا کام کر سکیں۔ کام والیاں ہٹائی ہیں تو تیرے فائدے کے لیے ہی ہٹائی ہیں۔ تیری کمائی سوکھی نہیں ہے جو کام والیوں مسٹنڈیوں پہ اڑا دوں۔ زنانی کس لیے ہے تیری..... کھا پی کے ڈکار مارنے کے لیے۔"

"یہ چائے پی لیں، وشمہ اٹھے تو گرم دودھ کے ساتھ رسک یا ابلا انڈا کھلا دیں اسے۔" اس نے ماں کے سامنے کپ لا کے رکھا۔

"تو ابھی میرے سامنے فون کرا اسے، وشمہ کے بخار کا بتا۔ ابھی پتہ چل جائے گا کتنا درد ہے اس کے دل میں تیری اولاد کے لیے۔ دیکھتی ہوں آتی ہے یا نہیں۔"

نوید نے چاہا دوسری بہت سی باتوں کی طرح وہ ماں کی یہ بات بھی ان سنی کر کے چپکے سے نکل جائے مگر بندہ بشر تھا۔ دل میں کھٹک سی پیدا ہوئی۔

"آزمانے میں کیا حرج ہے۔ ذرا دیکھوں تو سہی۔"

اور شمشاد کے محض ایک بار اور کہنے پہ وہ بظاہر جز بز ہوتا جمیل کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

☆ ☆ ☆

صرف ایک دن لگا تھا سوہا کو اپنے خول سے باہر آنے میں۔ کزنز کے ساتھ وہ ایسے گھل مل گئی جیسے سالوں سے ان کے ساتھ ہی رہتی آئی ہو۔

جمیل نے بھی عرصے بعد میکے آئی بہن کی خوشنودی کا خیال رکھتے ہوئے خوب پروگرام بنائے۔ رات کو بھی وہ سب بچوں کو سندباد اور جوائے لینڈ لے کر گئے۔ واپسی پہ بچوں کی ہی مرضی سے مکڈونلڈ میں کھانا کھایا گیا۔ اگرچہ سوہا کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔ نوید مراد کبھی بھی وشمہ کو اکیلے کہیں نہیں لے کر گیا تھا۔ وہ اور منزہ بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ اس شہر کے سب ہی قابل دید مقامات وہ دیکھ چکی تھی، ہر مشہور ریسٹورنٹ جا چکی تھی۔ آؤٹنگ کے دوران جتنی شاپنگ وشمہ کی ہوتی، اس کے لیے بھی اتنی ہی اور ویسی ہی شاپنگ کی جاتی مگر ایک واضح فرق تھا جو وہ اپنے اور وشمہ کے درمیان محسوس کرتی تھی۔

وہ ہر اس پروگرام میں شامل ہوتی تھی جو وشمہ کے لیے اس کا باپ بناتا تھا۔

کبھی اس کے لیے یا اس کی پسند اور فرمائش سے بنے کسی پروگرام میں وشمہ کو شامل نہیں کیا جاتا تھا۔

ہمیشہ اس کے لیے ویسی چیز برابر خریدی جاتی جیسی وشمہ کے لیے لی جاتی مگر وشمہ کے لینے کے بعد۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کی شاپنگ کے ساتھ ویسی ہی شاپنگ وشمہ کی بھی کی جاتی کہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔

وہ ہر اچھے ریسٹورنٹ میں نوید، منزہ اور وشمہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی مگر ہر اس ریسٹورنٹ میں جہاں جانے کا فیصلہ نوید مراد کرتا اور وہ یہ فیصلہ عموماً" وشمہ کی فرمائش پہ کرتا۔

کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وشمہ نے کے ایف سی جانے کی ضد کی ہو اور سوہا اچانک پزاہٹ جانے کی فرمائش کر دے اور نوید مراد مسکراتے ہوئے اپنی گاڑی کا رخ پزاہٹ کی جانب موڑ دے۔

اسے ہر چیز وشمہ کے "صدقے" میں ملتی تھی۔

اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اس کا احساس پہلے سے بڑھ کے ہونے لگا تھا۔

جبکہ یہاں ایسا نہیں تھا۔ بھانجی عرصے بعد رہنے آئی تھی۔ باپ کی شفقت سے محروم تھی۔ سوتیلے رشتوں کے سہارے میں رہتی تھی۔ اس کا دل خوش کرنے کے لیے ماموں اور ممانی بساط سے بڑھ کے کوششیں کر رہے تھے۔ ان کے بچے بھی سوہا سے عمر میں بڑے تھے اور سمجھ دار تھے۔ اس کوشش میں وہ ماں باپ کا برابر ساتھ دے رہے

تھے۔

"کہاں جائے گی ہماری بیٹی؟"

"کیا کھائے گی ہماری گڑیا؟"

"سوہا سے پوچھو۔"

"سوہا جیسا کہے۔"

"جو سوہا کی مرضی۔"

ایسی باتیں سننا اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ جی بھر کے اس تجربے سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور منزہ بیٹی کے چہرے پہ اتنی طمانیت' اتنی سرشاری اور اتنی تسکین پہلی بار دیکھی تھی۔

وہ تو اس کے چہرے پر اضمحلال' پژمردگی اور تلخی دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔

تیمی کا احساس جیسے اس کے ہر نقش میں بول رہا ہوتا۔

حسرتیں جیسے اس کی آنکھوں میں چسپاں ہوئے رہ گئی تھیں۔

وہ یہ سارے پرانے رنگ اترتے اور نئے رنگ آتے دیکھ کے خوش ہو رہی تھی۔

"شاید میرا یہاں آنے کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ ہر ماہ نہیں تو ہر دوسرے ماہ کم سے کم دو تین دن کے لیے یہاں آنا چاہیے۔ رشتوں اور محبت کی آکسیجن ملتی رہے گی میری بچی کو۔"

"ماما... ممانی نے کہا ہے سینڈوچز تیار رہیں؟"

سوہا نے اندر جھانک کے پوچھا۔

منزہ جو اپنے سوٹ پہ استری کر رہی تھی' بات کا جواب دیتے دیتے رک کر اسے دیکھنے لگی۔

بلیک جینز پہ گھٹنوں تک آتے سفید کرتے' سفید ڈاٹس والے بلیک اسکارف کو گلے میں ڈالے' کاندھوں سے نیچے آتے بالوں کی اونچی سی پونی کے ساتھ وہ کتنی پیاری' کتنی اجلی لگ رہی تھی اور کتنی معصوم بھی۔

"نہیں بنائے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بنا لیے ہیں۔ کولر بھی بھر لیا ہے اور فروٹ باسکٹ بھی تیار ہے۔" منزہ نے مسکرا کے جواب دیا۔

"مگر آپ تیار نہیں ہیں۔ جلدی کریں۔"

"بس میں شاور لینے جا ہی رہی تھی۔ یہ دوپٹہ تو پریس کرنا ذرا۔" پھر باتھ روم جاتے جاتے مڑی۔

"کر لو گی؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"آف کورس۔"

وہ اناڑی پن سے دوپٹے پہ استری پھیر رہی تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔

کچھ دیر بعد سونیا کی آواز آئی۔

"پھوپھو..."

"ماما نہا رہی ہیں۔"

سوہا کی ساری توجہ دوپٹے پہ تھی۔ اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"اوہ... اچھا... تم بات کر لو۔ تمہارے پاپا کا فون ہے۔"

وہ چونک کے مڑی۔

سونیا کارڈلیس فون سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کے جا چکی تھی۔

□□□□

"آئی کیوں نہیں فون پہ؟"

شمشاد نے نوید کو دو ہی منٹ میں فون نمٹا کے واپس رکھتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہا رہی ہے۔"

"دس منٹ بعد دوبارہ کر..."

"میں نے پیغام دے دیا ہے' سوہا تھی فون پہ۔"

"وہ شتو نگڑی... اسی کا تو فساد ہے سارا۔ نہ وہ آگ لگاتی' نہ بات بڑھتی اور نہ اسے میکے جانے کا چاؤ چڑھتا۔ اتنے سالوں سے تو گئی نہیں' اب اچھا بہانہ ملا ہے۔"

وشمہ اور سوہا سے شروع ہونے والے ساس بہو کے تنازعے سے اب تک نوید بے خبر تھا مگر شمشاد کی بے دھیانی میں کہی گئی بات نے اسے چونکا کے رکھ دیا۔

"کون سی آگ... کون سی بات بڑھی تھی۔ کیا ہوا تھا؟"

شمشاد منہ سے بات نکال کر پچھتائی۔

"کچھ نہیں' ایویں ہی لڑکیاں لڑ پڑی تھیں۔"

"بچیوں میں اول تو لڑائی ہوتی نہیں اور بالفرض ہو بھی تو منزہ ایسی نا سمجھ نہیں کہ اس لڑائی کو بنیاد بنا کے میکے جا بیٹھے۔"

"ہاں' نا سمجھ تو میں ہوں۔"

ہر بار بیٹے کے منہ سے ارادتاً یا غیر ارادتاً بیوی کی تعریف سن کر شمشاد کو یہی لگتا جیسے یہ اس کی برائی ہے۔

"اور کیا کچھ نہیں ہوتا گھروں میں۔ میسنی عورتیں اپنے بندوں سے باتیں چھپا لیتی ہیں جیسے تیری زنانی کرتی ہے' ورنہ اس کی لڑکی تو ہر وقت لڑنے پہ تیار رہتی ہے۔ اس نے نہ کبھی تجھے باپ سمجھا ہے نہ وشمہ کو بہن۔"

اس بات سے اختلاف کرنے کی نوید ہمت نہ کر سکا۔ اگرچہ سوہا نے کبھی اس سے بدتمیزی نہیں کی تھی۔ ہمیشہ اس کے سامنے خاموش اور باادب ہی رہتی تھی لیکن اس کے اطوار کبھی کبھی نوید کو کھٹک جاتے تھے' وہ اسے اس اپنائیت سے پاپا کہہ کر نہیں پکارتی تھی جس اپنائیت سے وشمہ' منزہ کو ماما کہتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں اس گھر اور اس گھر کے مکینوں کے لیے ایک اجنبیت بھرا احساس رہتا تھا۔

"بہرحال... اگر ایسی بات ہوتی منزہ مجھے جتاتی ضرور۔ اس کے کسی انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ناراض ہو کر جا رہی ہے۔"

"اسی لیے تو میں اسے میسنی کہتی ہوں۔ ہوا نہیں لگنے دیتی اپنے ارادوں کی اور میں بتاتی ہوں تجھے ہوا کیا تھا پرسوں۔"

اس نے سارا واقعہ نمک مرچ لگا کے نوید مراد کو سنایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ منزہ اکیلے میں وشمہ کو ڈراتی اور دھمکاتی ہے۔ کیا خبر مارتی بھی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے وشمہ کا بخار گلے کی خرابی سے نہیں بلکہ منزہ کی دہشت سے ہوا ہو۔ یہ نکتہ بھی شمشاد بیگم کو بیٹھے بٹھائے سوجھا تھا اور اس نے اچانک نکل آنے والی دلیل پہ خود کو داد بھی دی تھی۔

"دیکھ لے... دس منٹ کیا... آدھا گھنٹہ ہو گیا' آیا ہے اس کا فون؟ تو نے بتایا بھی تھا وشمہ کی بیماری کا۔ اپنی اولاد ہوتی تو تڑپ جاتی مگر ہاں... میری یتیم مسکین وشمہ... اپنی ماں ہوتی تو رونا کس بات کا تھا۔"

"ان کے گھر کے سب لوگ تو پکنک پہ گئے ہیں۔ شام تک آئیں گے۔"

"مجھے گھر کے لوگوں سے نہیں مہمان سے بات کرنی ہے۔ منزہ بی بی سے۔"

"وہ بھی گئی ہیں۔ ان ہی کے لیے تو پکنک رکھی گئی ہے۔"

"کب نکلے ہیں؟"

نوید نے شاک سے نکلتے ہوئے دریافت کیا۔

"ابھی... دس بارہ منٹ پہلے۔"

نوید نے ریسیور رکھتے ہوئے وال کلاک کی جانب دیکھا۔

سوہا کو وشمہ کی بیماری کی اطلاع اس نے تیس منٹ قبل دی تھی، تب منزہ بقول اس کے نہا رہی تھی۔ کے بعد... جانے سے قبل بھی اس نے فون کرکے وشمہ کی خیریت تک دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

اور کیا جانا اتنا ہی ضروری تھا؟

متحمل مزاج اور کم گو سا نوید مراد اس وقت ابلنے کو تیار بیٹھا تھا اور آنچ تیز کرنے والی شمشاد بیگم بھی

✡ ✡ ✡

پکنک کی خوشی ابھی اس کے چہرے سے ماند نہیں پڑی تھی کہ ماں کے ہاتھ میں ریسیور اور چہرے کے دیکھ کے اس کا چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

وہ حیران کم، پریشان زیادہ لگ رہی تھی۔

"نہیں... مجھے تو... مگر... دیکھیں... میں..."

باربار کچھ کہنے کی کوشش کرتی منزہ کو دیکھ کے سوہا کو ایک دم رونا سا آ گیا۔

"ماما..." وہ سست قدموں سے اس کے برابر جا کھڑی ہوئی۔ وہ سمجھی شاید وہ کچھ پوچھنے آئی ہے۔ ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ مسلسل صفائیاں پیش کرتی رہی۔

"نہیں، آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے، آپ صحیح کہہ رہے ہوں گے... ضرور کہا ہوگا آپ نے وہ سوہا نہیں ہوگی... کوئی رانگ نمبر مل گیا ہوگا... کسی بچے نے شرارت..."

"ماما..." اس بار سوہا نے ماں کا وہ ہاتھ زور سے پکڑ کے کھینچا جو ریسیور تھامے ہوئے تھا۔

"ماما... وہ میں ہی تھی۔" وہ چلائی۔

منزہ نے بے دھیانی میں ایک بار پھر اسے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں چپ ہونے کا اشارہ کیا۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ سوہا..."

اور پھر چونک کے سوہا کو دیکھا۔ آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

سوہا نے لب کاٹتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ایک مجرمانہ اعتراف کے طور پہ اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی پلکوں پہ ٹنگے آنسو اس خفیف سی حرکت کے ساتھ گالوں پہ پھسل آئے۔

منزہ نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ریسیور کریڈل پہ رکھ دیا۔

✡ ✡ ✡

"کیسی ہے وشمہ؟"

رکشے سے اترتے ہی وہ اندر بھاگی تھی اور بے تابی سے سوال کیا۔ نوید نے سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے اب۔"

وہ وشمہ کے پاس بیٹھ کے اس کا ماتھا چومنے لگی۔

"اتنی فکر تھی تو تب آجاتی..." شمشاد بھی پیچھے پیچھے اندر آئی۔ "اب اتنے ڈرامے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ذرا دھیان سے جائزہ لیا اور تازہ دم ہو کر نئے جوش سے حملہ کیا۔

"خالی ہاتھ... اکیلی آئی ہے... یعنی اب بھی میکے سے واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ایویں ہی احسان کرنے گھڑی دو گھڑی کے لیے آئی ہے، نہ آتی۔ وشمہ کوئی لاوارث نہیں بیٹھی۔"

نوید کو بھی اس کا بغیر سامان کے اور بغیر سوہا کے آنا کھلا۔

"سامان بکھرا پڑا تھا۔ میرا کل صبح آنے کا پکا پروگرام تھا۔ سوچا تھا رات کو پیکنگ کرلوں گی اس لیے۔ اب وشمہ کی بیماری کا سنا تو رہا نہیں گیا۔ سوچا سامان پیک کرنے لگی تو بہت دیر ہو جائے گی۔ بس رکشہ پکڑا اور آ گئی۔ بھابھی پیک وغیرہ کرکے کل بھائی جان کے ہاتھ سامان بھیج دیں گی اور..."

جلدی جلدی صفائی پیش کرتے ہوئے وہ ذرا دھیمی پڑی اور شرمندگی سے نظریں جھکا کے کہا۔

"اور سوہا کو بھی... ابھی وہ... ابھی میں خود ہی اسے نہیں لائی۔ بہت ڈری ہوئی تھی اور شرمندہ بھی۔ غلطی ہوگئی اس سے۔"

"وہ... تو تمہیں یقین آ ہی گیا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تمہاری بیٹی نے فون سنا تھا مگر تمہیں بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔"

"ناسمجھ تھی... پلیز آپ کوئی غلط مطلب نہ لیں اس بات کا۔"

"کیا بچپنا، میری بچی کی بیماری کوئی معنی نہیں رکھتی اس کے لیے۔ میں کچھ نہیں لگتا تمہاری بیٹی کا جو اس نے میری بات کو اہمیت نہیں دی۔"

"میری بچی" اور "تمہاری بیٹی" کی تکرار نوید مراد کے منہ سے سننا کہیں زیادہ تکلیف دہ لگ رہا تھا، بہ نسبت اس اعتراف کے جو اس نے سوہا کے منہ سے سنا۔

"بچی ہے نا سمجھ ہے، بات کی گہرائی میں نہیں گئی۔ صرف یہ سوچا کہ میں پیغام سنتے ہی گھر واپس جانے کا فیصلہ کروں گی اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی، ابھی رکنا چاہتی تھی اس لیے..." گڑگڑاتے گڑگڑاتے وہ چپ ہو گئی۔

نوید کے چہرے کے تاثرات سنگلاخ تھے۔

"اور وہ ایسا کیوں نہیں چاہتی تھی؟" اس نے بہت ٹھہرے انداز میں پوچھا۔

منزہ اس سوال کے تسلی بخش جواب کے لیے الفاظ ڈھونڈ ہی رہی تھی جب شمشاد نے بھی طنزیہ کہا۔

"اب بول... کیا دیا ہوا ہے اس کا وہاں؟"

"وہ... بس... وہ خوش تھی وہاں... اس لیے... مگر وہ بھی اب وشمہ کے لیے بہت پریشان ہے اور..."

"نہیں..." نوید نے ہاتھ روک کر اسے سوہا کی مزید وکالت کرنے سے روک دیا۔

"اسے کہو، پریشان مت ہو۔ پریشان ہونے کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔ بس وہ خوش رہے۔"

✡ ✡ ✡

"ارے منزہ... تم آ گئیں؟"

کلثوم نے مٹر چھیلتے چھیلتے اسے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے تو وہ اتنی پریشانی کے عالم میں گھر سے نکلی تھی۔

"جی بھابھی... میں نے سوچا... سامان وغیرہ بھی پیک کرلوں... ایک ہی بار صبح چلی جاؤں گی۔"

"اچھا... اچھا..." کلثوم نے سکون کی سانس خارج کی۔

"سامان کا کیا ہے، صبح آجاتا منی..." جمیل نے بھی ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور... نوید بھائی صاحب کا موڈ کیسا تھا؟" انھوں نے اس بار محتاط لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہوگا... جب ہی تو..." کلثوم نے شوہر کی تسلی کرانا چاہی۔

"ویسے سچی بات ہے، ایک بار تو میں منی کو آتے دیکھ کے گھبرا ہی گئی۔ مجھے لگا شاید سوہا کی غلطی کو انہوں نے معاف نہیں کیا، بات بڑھ گئی ہے اور منزہ جھگڑ کے آ گئی ہے۔"

"آپ گھبرا گئیں کہ ابھی تو گئی ہے پھر شوہر سے لڑ کے آ گئی۔" منزہ نے پھیکی سی، مردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ مٹر کھوجتے ہوئے کہا۔

"کیسی بات کر رہی ہو، سو دفعہ آؤ مگر ہنسی خوشی، ہنستے بستے، اپنے شوہر کی مرضی سے۔ اللہ نہ کرے جو کسی بیٹی کو میکے بیٹھنا پڑے۔ ہم تو یہی دعا کرتے ہیں کہ تم اپنے گھر خوش باش رہو۔"

منزہ نے ایک گہری سانس لی۔

"یعنی میں آپ کو اس گھر میں "کبھی کبھار" قبول ہوں مگر مسز نوید مراد کے رول میں۔" اس نے سوچا۔

فیصلہ کرنا اب اور آسان لگ رہا تھا۔

"چلو آ گئی ہو تو اچھا ہے۔ سوہا کو بھی دیکھ لو۔ اب تک سہمی ہوئی ہے۔ تم نے بھی حد کر دی ڈانٹنے ڈپٹنے کی۔"

"آنا تو تھا ہی، میری بچی جو تھی یہاں۔" ایک فیصلہ کن چمک اس کے چہرے پہ تھی۔

"اور اب آنا جانا بھی لگا ہی رہے گا اس سے ملنے کے لیے۔"

اخبار کھولتے جمیل کے اور مٹر چھیلتے کلثوم کے ہاتھ یکدم ساکت ہوئے تھے۔ نظریں منزہ کے چہرے کی طرف سوالیہ انداز میں اٹھیں۔

"اگر آپ کی دلی خواہش یہی ہے کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی رہوں تو... تو آپ کو سوہا کو اپنے ساتھ رکھنا ہو گا۔"

کتنی ہی دیر تک کلثوم کچھ کہہ نہ سکی۔

ایسا مذاق کرنا منزہ کی عادت تھی نہ فطرت... اس کے باوجود کلثوم نے بڑے دھیان سے اسے دیکھا۔ شاید مذاق کی ہلکی سی رمق نظر آئے مگر وہاں ایک جامد سناٹا تھا۔

جمیل بھی دم بخود بیٹھا منزہ کو تک رہا تھا جو یہ دھماکا کرنے کے بعد سر جھکائے اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی انگوٹھی کو بائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے گھمائے چلے جا رہی تھی...

"مگر..." جمیل نے کھنکارتے ہوئے تفصیل جاننا چاہی۔ "اس اچانک فیصلے کی..."

لیکن اس سے آگے اس کے الفاظ کھو گئے۔ وہ مدد طلب نظروں سے کلثوم کو دیکھنے لگا جو دوبارہ مٹر چھیل رہی تھی۔ مگر اب اس کے انداز میں ایک واضح بے دلی اور غائب دماغی کی کیفیت جھلک رہی تھی۔

جمیل کی زبان سے ادا ہوئے ان چار الفاظ کے بعد دوبارہ ایک جان لیوا سکوت تینوں نفوس کے درمیان حائل ہو گیا۔ پلاسٹک کے باؤل میں گرنے والے مٹر کے دانوں کی ہلکی سی آواز کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔

"ماما... آپ؟" سوہا اندر سے نکلی، ماں کو دیکھ کے ٹھٹھک کر رکی اور پھر خوشی سے بھاگتے ہوئے اس کے گلے آ لگی۔

"ماموں نے بتایا ہی نہیں کہ آپ آنے والی ہیں۔ میں تو سمجھی کہ اب صبح میں ماموں کے ساتھ ہی..."

کہتے کہتے وہ رکی... ماں کے ستے ہوئے چہرے پہ ایک نظر ڈال کے اس کا اپنا منہ بھی اتر سا گیا۔ اتنی بچی تو وہ اب نہ رہی تھی کہ معاملے اور ماحول کی گمبھیرتا محسوس نہ کر سکے اور حالات نے ویسے بھی اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ حساسیت عطا کر دی تھی۔

"کیا ہوا ماما؟" اس بار آواز میں وہ کھنک نہ تھی... ایک موہوم سا اندیشہ جھانک رہا تھا۔ "انہوں نے ڈانٹا۔"

منزہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں... ڈانٹا تو ہو گا... بہت غصے میں ہوں گے۔"

وہ ماننے پہ تیار نہ تھی۔ اپنے "جرم" کی سنگینی کا احساس رہ رہ کے ہو رہا تھا۔

"تھے... اب نہیں ہیں۔"

"یعنی مجھے... مجھے ڈانٹ نہیں پڑے گی؟"

منزہ نے نظریں چراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر بھی ماما... میں ان سے سوری کر لوں گی۔"

منزہ نے ذرا سا رخ موڑا اور کلثوم کے آگے سے باؤل نامحسوس طریقے سے اپنے آگے کھسکایا اور مٹر کے دانے نکالنے لگی۔ شاید سوہا کے سوالات سے بچنے کا اس سے کمزور سہارا اور نہ ملا تھا اسے۔

"آپ نہیں کہتیں تو میں ابھی آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

اس بار منزہ کوشش کے باوجود گھبراہٹ کو خود پہ حاوی ہونے سے روک نہ سکی۔

"امی نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ غلطی کرنے کے بعد چھپنے کے بجائے اس پہ شرمندہ ہو کر معافی مانگ لی جائے تو..."

کلثوم نے اپنے اس "قبل از وقت" دیے لیکچر پہ خود کو کوستے ہوئے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

"بیٹا پاپا کو سوری تو تم فون پہ بھی کر سکتی ہو سوہا! اتنی جلدی واپس جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس بات پہ جہاں منزہ نے اپنی مشکل آسان ہو جانے پہ ایک مشکور و ممنون نظر اس پہ ڈالی تھی، وہیں جمیل نے کلثوم کو تنہا اتنا بڑا فیصلہ کر لینے پہ ایک تیز اور ناراض نظر سے نوازا تھا۔

"منزہ کی تو مجبوری ہے۔ جیسے تم اس کی بیٹی ہو ویسے ہی وشمہ بھی تو اب اس کی ہی ذمہ داری ہے اور بیمار بچے کو تو یوں بھی ماں کی مکمل توجہ چاہیے ہوتی ہے۔ یہ وہاں وشمہ میں مصروف رہے گی۔ تم کیا کرو گی وہاں... بور ہی ہو گی اس سے تو اچھا ہے کہ ابھی ہفتہ دس دن یہیں رک جاؤ۔"

"مگر امی... چھٹیاں تو صرف تین تھیں۔ اب ایک ہی رہ گئی ہے۔"

"میں ایپلیکیشن بھیج دوں گی۔" منزہ نے پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔

سوہا نے آنکھوں میں حیرت بھر کے کھڑی ہوئی ماں کو دیکھا جو بلا وجہ چھٹیاں کرانے کے حق میں کبھی بھی نہ رہی تھی۔

"لیکن ماما... چھٹیاں کیوں... ایگزامز نزدیک ہیں اور..."

اس کی ادھوری بات میں ان گنت سوال چھپے تھے۔

"میں... میں بیگ بھجوا دوں گی۔ یہیں سے چلی جایا کرنا۔ ماموں کے آفس کے راستے میں پڑتا ہے تمہارا اسکول۔"

وہ جانے کے لیے مڑی... کسی ادھورے پن کا... عجیب سے خالی پن کا احساس ہوا۔ پلٹ کے دیکھا تو سوہا اب تک وہیں الجھی ہوئی سی کھڑی تھی۔ بے اختیار اس کا جی چاہا، اسے بانہوں میں بھر کے اس کے ماتھے پہ... بالوں پہ... رخساروں پہ... گلابی نازک ہتھیلیوں پہ... ڈھیر سارے بوسے دے ڈالے مگر جانتی تھی محبت کا یہ والہانہ اظہار اسے اور الجھائے گا۔ اس نے دل پہ ضبط کرتے ہوئے اپنے لب بھینچے اور تیزی سے مڑ کے وہاں سے نکل گئی۔

جمیل نے ایک تیکھی سی نظر کلثوم پہ ڈالی جو خود بھی اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد سے بوکھلائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس نے بروقت کسی نہ کسی طرح خود پہ قابو پاتے ہوئے اس صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی مگر جو فیصلہ جلدی میں کر لیا تھا اس کے متوقع نتائج بھی اسے ہولا رہے تھے۔

منزہ جا چکی تھی... ادھ کھلے دروازے پر اب تک سوہا کی بے یقین نظریں ٹکی تھیں۔ پھر اس نے گردن گھما کے دیکھا۔ جمیل کب کا اپنے کمرے میں جا چکا تھا... کلثوم سبزی لے کر کچن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بجھے دل کے ساتھ برآمدے کی سیڑھی پہ بیٹھ گئی اور انگلی کی نوک سے گرد آلود فرش پہ لکیریں بنانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کسی کی اولاد کی ذمہ داری لینا اتنا آسان کام نہیں ہے جو تم نے وہیں کھڑے کھڑے پلک جھپکتے میں فیصلہ کر لیا کلثوم!"

اندر بند کمرے میں جمیل اس پہ اپنی ناگواری جتا رہا تھا کلثوم جو خود بھی اس فیصلے پہ مطمئن نہیں تھی، ایک کمزور سا احتجاج کر کے رہ گئی۔

"وہ کسی کی اولاد نہیں ہے۔ آپ کی اپنی بہن کی بیٹی ہے۔"

"پتا ہے مجھے... اپنے رشتے مجھے تم سے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ چڑ کے بولا۔ پھر ذرا تحمل سے وضاحت کرنے لگا۔

"سوہا مجھے اپنی بیٹی کی طرح ہی عزیز ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کلثوم! کہ وہ منزہ کی بیٹی ہے۔ اسے اپنے باپ کے گھر میں ہی رہنا چاہیے۔"

"باپ" تو ہے نہیں اس کا... یہ کیوں بھول جاتے ہیں آپ اور جب باپ نہیں ہے تو باپ کا گھر کیسا؟"

"تو بڑا اچھا انسان ہے، سلجھا ہوا اور خوف خدا رکھنے والا۔ منزہ اگر اسے طریقے سے ہینڈل کرتی تو یہ نوبت نہ آتی۔ اب دیکھ لو۔ اس لڑکی نے کیا کیا؟ مزید وہ فضول حرکت کرتی نہ اس بات کی نوبت آتی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر نوید نے سوہا کی حرکت پہ غصے میں آ کے ایسا کچھ کہہ ہی دیا ہے تو منزہ کو بجائے اس بات کو دل پہ لینے کے یا ضد میں آ کر سوہا کو ہمارے گھر چھوڑنے کے، سمجھ داری سے حل نکالنا چاہیے۔ معافی مانگ لے وہ نوید سے۔ اور سوہا کو پیار سے، سختی سے بے شک مار پیٹ کر کسی بھی طرح سمجھا دے۔ بات ختم۔"

وہ حد سے زیادہ جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"بات اتنی آسانی سے ختم ہونے والی ہوتی تو منزہ ختم کر چکی ہوتی۔ وہ کوئی اٹھارہ انیس سال کی ناتجربہ کار لڑکی نہیں ہے اور آپ نوید کو ہینڈل کرنے کی کیا بات کرتے ہیں۔ اب کیا وہ اسے الو کا گوشت کھلا کے اپنے قابو میں کرتی؟ آپ بھی تو بیٹی کے باپ ہیں۔ ٹھیک ہے کہ سوہا نے نادانی کی۔ لیکن دل پہ ہاتھ رکھ کے بتائیں کہ آپ کی بیٹی سے یہ غلطی یا اس سے بھی بڑی کوئی غلطی ہو جاتی تو کیا آپ اسے گھر میں رکھنے سے اور اس کی کفالت کرنے سے انکار کر دیتے؟"

جمیل سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"چاہے وقتی اشتعال کے تحت ہی سہی... نہیں ناں؟... آپ کیا کوئی بھی باپ ایسا نہیں کر سکتا۔ اور نوید مراد نے کیا۔ اس لیے کہ وہ سوہا کا اصلی باپ نہیں ہے نہ کبھی ثابت ہو سکتا ہے پھر کیا سوچ کے منزہ اس کے آگے ناک رگڑ کے معافیاں مانگتی رہے۔ آج مان گیا تو کل پھر کسی بات پہ بگڑے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن... لیکن اس میں ہمارا... میں پھر کہتا ہوں کلثوم! منزہ سے بات کر لو۔ یہ پریشانی مت مول لو۔"

"کبھی کبھار بڑی پریشانی سے بچنے کے لیے چھوٹی پریشانیاں مول لینا پڑتی ہیں۔"

"بڑی پریشانی؟"

"آپ نے سنا نہیں۔ سوہا کی وجہ سے منزہ کی شادی شدہ زندگی خطرے میں ہے۔ شادی شدہ بہن اجڑ کے گھر آ جائے اس سے تو بہتر ہے کہ آپ اس کی بیٹی کو ہی پال لیں۔"

"آتی ہے تو آئے۔" جمیل رکھائی سے بولا۔

باوجود بھاوج ہونے کے۔ کلثوم کا دل کانپ گیا۔ "کیسے انسان ہیں آپ... بہن کے بارے میں ایسی بات۔"

"انسان ہوں۔ یہ تو مانتی ہو تم۔ پھر یہ توقع کیوں کر رہی ہو کہ میں فرشتہ ثابت کروں خود کو۔"

"انسان ہی ثابت کر دیجیے۔ انسانیت دکھا کے۔" کلثوم نے جتلاتے انداز میں کہا۔

"کلثوم... کلثوم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر آج ہی تم نے منزہ کو فون کر کے سوہا کو لے جانے کو نہ کہا تو یہ بوجھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے گلے پڑ جائے گا۔"

"کیسا بوجھ؟ ایک دس گیارہ سال کی بچی ہی تو ہے۔ اپنا رزق خود ساتھ لائے گی۔ آپ کی ہماری بساط ہی کیا جو کسی کو دو وقت کی روٹی کھلا سکیں۔"

"بات صرف دو وقت کی روٹی کی نہیں ہے اس کا اسکول کا خرچہ... اور... اور مستقل ذمہ داری لے رہی ہو تو یہ

چند سال گزریں گے تو اسے دے دلا کر رخصت کرنے کا فرض بھی ہم کو ہی نبھانا ہو گا۔

"بھی دیکھو کہ وہ لڑکی ہے... اپنی بھی دو بیٹیاں ہیں۔"

کلثوم کی آواز بھرا گئی۔

"لیے منزہ کو مایوس نہ لوٹا سکی۔ وہ بھی اس گھر کی بیٹی ہے۔ میں... ڈر گئی تھی جمیل... کہ اس کے ساتھ کی گئی ہی ہماری بیٹیوں کے آگے نہ آ جائے۔"

"یہ ناانصافی ہم نے نہیں کی... بس قسمت کا ہیر پھیر ہے۔" بیٹی کا ذکر آیا تو وہ بھی دھیما پڑ گیا۔

"تو ٹھیک ہے... قسمت کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ آپ ہی اسے قسمت کا لکھا جان کے تسلیم کر لیں۔ ہماری دو نہیں تین بیٹیاں ہیں۔"

"میں یہ کہتا آسان لگ رہا ہے۔ ذرا وقت گزرنے دو۔ پھر خود پچھتاؤ گی اس جذباتی فیصلے پر۔"

"تو کیا کریں ہم؟" کلثوم بھی پھٹ پڑی۔ "ہاں میں مانتی ہوں۔ کسی کی اولاد کو اپنی اولاد کے برابر لاکھڑا کرنا بہت مشکل ہے۔ معاشی تنگی دلوں کی کشادگی پہ حاوی ہونے لگتی ہے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ اس کے یہاں آنے کے بعد رفتہ رفتہ میرا دل بھی شاید... لیکن کیا کروں۔ منزہ کی جانب سے آنکھیں بند کر کے بھی نہیں رہ سکتے۔ اس کا گھر اپنی نظروں کے سامنے اجڑتا بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ہم ہمیشہ کے لیے نہ صرف اس کی نظروں میں بلکہ شاید خدا کی نظر میں بھی اس کے قصوروار رہوں گے۔"

"ہم؟"

"ہاں ہم۔ اس لیے کہ یہ شادی ہم نے... بہت زور دے کر کروائی ہے۔ وہ کب راضی تھی۔ ایک بار اس کا گھر اجڑا تو اسے ہم نے مشیت ایزدی کہہ کے صبر کر لیا۔ دوسری بار اجڑا تو ہم اپنے آپ سے بھی نظر نہیں ملا سکیں گے جمیل! ہماری بھی بیٹیاں ہیں۔ کہیں اس کی آہ نہ لگ جائے انہیں۔"

"عجیب وہمی عورت ہو..." وہ بڑبڑانے لگا۔

"تمہارا تو وہ خون ہے۔ نوید جیسے پتھر دل نہ بنو۔"

"اب وہ پتھر دل ہو گیا۔ جب یہ رشتہ آیا تھا تب تو تمہیں اس میں سرخاب کے پر لگے نظر آ رہے تھے۔ تب یہ بات سوچنا تھی کہ پہلے سے ایک بیٹی کے ہوتے ہوئے وہ سوتیلی بیٹی کو کیا اہمیت دے گا۔ تب تو تم تلی بیٹھی تھیں کہ راتوں رات منزہ کو رخصت کرا کے دم لینا ہے۔"

"دوسری شادی تو ہونا ہی تھا ہے۔" کلثوم اس کا اشارہ بھانپ کر دھیرے سے بولی۔ "اس کی بھی کوئی گارنٹی نہیں کہ ہم نے اس کی شادی عرفان یا کسی اور کنوارے سے کی ہوتی تو وہ سوہا کو اپنی بیٹی مان کے رہتا۔"

"اگر کسی بھی بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی تو اتنا بڑھ چڑھ کے اس کی دوسری شادی کرانے کا شور کیوں مچایا تھا۔ بیٹھی رہتی وہ یہیں... وہاں کون سے سکھ کے جھولے لے رہی ہے۔"

"ہم اس کے دکھ کم نہیں کر سکتے تو بانٹ تو سکتے ہیں۔"

کلثوم نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کے لجاجت سے کہا تو وہ آہستگی سے سر ہلا کے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"تو تھا دیکھو ذرا۔ ڈھائی من کا بنا رکھا ہے۔"

اسے چپ چاپ اپنے کاموں میں مصروف دیکھ کے شمشاد بیگم بڑبڑائی۔ اس سے منزہ کی خاموشی برداشت نہ ہو رہی تھی۔

نوید مراد کو بھڑکا کے اپنا من چاہا نتیجہ پانے کے بعد اسے یہ توقع تھی کہ منزہ خاصا رونا دھونا مچائے گی۔ واویلا کرے گی۔ شاید بیٹی کو واپس لانے کے لیے اس کے پیر تک پکڑ کے گڑگڑائے گی تب مزہ آتا۔ وہ کئی ایک شرطیں منوا لیتی اس کی روتی تڑپتی زخمی ممتا کو پیروں تلے مسلتے ہوئے۔

مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔
وہ بڑی کٹھلی سی خاموشی کے ساتھ واپس آئی تھی۔
نہ کوئی گلہ۔۔۔ نہ شکوہ۔۔۔
نہ آنسو۔۔۔ نہ سسکیاں۔۔۔
نہ نوید کے کمرے سے رات بھر کسی اٹھا پٹخ یا چیخ و پکار کی آواز آئی۔۔۔ وہ ساری رات دروازے سے کان لگا کھڑی رہی۔
صبح اس نے معمول کے مطابق اس کے اور نوید کے آگے ناشتہ رکھا۔ ماسی کے نہ آنے پہ کوئی سوال نہ پوچھا خود ہی کام میں جت گئی۔ دوپہر میں ایسے اس کے کمرے میں آئی جیسے درمیان میں کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔
"آج کیا پکے گا اماں!" وہ نارمل انداز میں پوچھ رہی تھی۔۔۔
"بچیوں سے پوچھ لو۔ جو انہیں پسند ہو۔"
اس نے جان بوجھ کر لفظ "بچیوں" استعمال کیا اور بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جہاں ایک زرد دھوپ سی ٹھہر گئی تھی۔
"ہائے ہائے۔۔۔ بڑھاپا۔۔۔ یاد ہی نہیں رہتا کچھ۔۔۔" اس نے ماتھے پہ ہاتھ مار کے دہائی دی۔ "سوہا تو چلی گئی اب" اس مصنوعی یاسیت کے ساتھ اس طرح کہا کہ منزہ کو اپنا سارا ضبط ہاتھ سے جاتا دکھائی دیا۔
"چلی نہیں گئی۔۔۔ نکالی گئی ہے' ماں کے جگر سے کاٹ کر پھینکی گئی ہے۔"
اس نے کہا نہیں مگر اس کے دل سے یہ گلہ آمیز صدا ضرور بلند ہوئی تھی۔
"میں۔۔۔ میں وشمہ سے پوچھ لوں گی مگر۔۔۔"
خود پہ قابو پاتے ہوئے اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
"مگر وہ تو ابھی پرہیزی کھانا ہی کھائے گی۔۔۔ آپ بتا دیں آپ کے لیے کیا پکاؤں؟"
"نوید سے پوچھنا تھا ناں۔ کھانا مرد کی مرضی سے پکانا چاہیے۔۔۔ آخر وہ رزق لانے والا وسیلہ ہوتا ہے اسے خوش رکھنا' راضی رکھنا اس کی مرضی پہ چلنا ہی عورت کو فیدہ دیتا ہے۔"
اس کی ایک ایک بات منزہ کو کچوکے لگانے والی تھی اور وہ خود اذیتی کی انتہا پہ جاتے ہوئے پتھرنی ہر وار سہ رہی تھی۔
"جی۔۔۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ مگر وہ آپ کی مرضی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔۔۔ بلکہ آپ کی مرضی ہی دراصل ان کی بھی رائے ہوتی ہے۔"
"کیا مطلب ہے تیرا۔؟"
وہ اسے بھڑکانے کی ٹھانے بیٹھی تھی' الٹا خود بھڑک اٹھی۔
"میرا مطلب ہے میں نے ان سے پوچھا تھا' وہ یہی کہہ رہے تھے کہ جو اماں کو پسند ہو' وہ بنا دینا۔"
اس نے بظاہر سادگی سے کہا۔
شمشاد کچھ دیر اس کے چہرے کو کھوجتی رہی پھر کسی قسم کے طنز کا شائبہ تک نظر نہ آنے پہ منہ میں منمنا کے جواب دیا۔
"گوشت میں گوبھی ڈال دے۔۔۔ ساتھ میں ماش کی دال اور دھیان سے۔۔۔ دال کھڑی کھڑی رہے۔"
"لیکن اماں!" وہ کہتے کہتے رک گئی کہ گوبھی اور دال اسے بے حد مرغوب سہی مگر دونوں چیزیں ہمیشہ اس کی گیس کی تکلیف کو بڑھا دیتی ہیں۔ کوئی دل کے دورے کی تکلیف سے بھی اتنا نہ تڑپتا ہوگا جتنا وہ اس تکلیف کی وجہ سے ذبح ہوئی بھینس کی طرح ڈکراتی ایڑیاں رگڑتی تھی۔
"میری طرف سے جو مرضی کھائے۔" اس نے سفاکی سے سوچا اور خوب دل لگا کے گوبھی گوشت بھونا' کھڑی

کھڑی الگ الگ دانے والی ماش کی دال پکائی۔ نتیجتاً عادت کے مطابق شمشاد بیگم نے پلیٹیں بھر بھر سالن ڈالا۔ رات نوید کے آنے تک وہ پیٹ پکڑے بستر پہ دوہری ہو رہی تھی۔
"کیا کھایا تھا دوپہر میں؟"
نوید جو تھکا ہوا آیا تھا' آتے ہی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے خیال سے جھنجھلا اٹھا اور گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔
"ذرا سی دال ہی تھی ماش کی۔۔۔ اور تھوڑا سا گوبھی گوشت۔"
اس نے منزہ کے کہنے سے پہلے ہی کراہتے ہوئے جواب دیا۔
"جب پتہ ہے کہ ستر بیماریاں جان کو چمٹی ہوئی ہیں تو تھوڑا پرہیز کر لیا کریں۔ اور منزہ! تم تو پڑھی لکھی ہو۔ تمہیں تو پتہ ہونا چاہیے کہ انہیں کیا دینا چاہیے کیا نہیں۔"
"مجھے تو اماں نے جو کہا۔ وہ میں نے بنا لیا۔" منزہ نے معصومیت سے کہا۔
"اماں بھی ناں۔ انہیں کوئی کیسے سمجھائے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اماں کو لے کر آگے بڑھ گیا۔
منزہ کو درد سے دوہری ہوتی شمشاد اور جھلاہٹ سے سر جھٹکتے نوید کو دیکھ کے ایک نوکیلی سی راحت محسوس ہوئی۔

☆ ☆ ☆

"چائے۔" اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کے اپنی چٹیا کے بل کھولنے لگی۔
نوید نے ایک نظر بھاپ اڑاتے کپ کو دیکھا اور دوسری نظر بے گانگی سے کھڑی بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتی منزہ پہ ڈالی۔
اپنی ماں کی طرح اسے بھی منزہ کے خلاف توقع رویے پہ الجھن بھری حیرت ہو رہی تھی۔
وہ بھی یہ چاہ رہا تھا کہ منزہ کچھ کہے۔۔۔ چاہے گلہ ہی سہی۔۔۔ چاہے اس سے لڑے جھگڑے۔
مگر اس کی اس خواہش کے پیچھے شمشاد والا جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ اسے منزہ کو روتے سسکتے دیکھ کے خود کو کوئی تسکین نہیں پہنچانی تھی۔ وہ تو اپنے اندر توانا ہوتے احساس گناہ کو مٹانے کے لیے ایسا چاہتا تھا۔ وقتی اشتعال کے تحت۔ اور کچھ ماں کی باتوں کے زیر اثر اس نے سوہا کو اپنے گھر میں مزید رکھنے سے صاف انکار تو کر دیا تھا مگر رہ رہ کے اپنے اس چھوٹے پن اور کمینگی کا مظاہرہ کرنے پہ تاؤ آ رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ منزہ کے دو آنسو گرتے ہی' ایک لفظ شکوے کا ادا ہوتے ہی وہ مسکرا اٹھے۔ اور کہے۔
"اتنی سی بات دل پہ لے لی۔۔۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ بھلا سوہا کے لیے میں ایسا کہہ سکتا ہوں۔"
اس کی مردانہ انا پچھتاوے کا اظہار کرنے سے روک رہی تھی اسے۔ اس کا زعم اپنی ندامت کو سامنے لانے سے ہچکچا رہا تھا۔ اسے اس مجرمانہ احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے بھی ایک سہارا چاہیے تھا۔ منزہ کا سہارا۔ جس کی مدد سے وہ اس پچھتاوے سے نجات بھی پا لے' اس کی مردانگی کا بھرم بھی رہ جائے اور وہ بیوی کی نظروں میں سرخرو بھی ہو جائے۔ جبکہ منزہ تھی کہ کل سے ایسا کوئی سہارا دینے پہ آمادہ ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔
نوید مراد کی خجالت بڑھتے بڑھتے اب جھنجھلاہٹ میں بدل رہی تھی۔
"منزہ"
"جی۔" اس نے پلٹے بغیر فوراً کہا۔۔۔ اتنا ترنت کہ بے ارادہ اسے پکار بیٹھنے والے کو فوری طور پر کہنے کے لیے کوئی بات تک نہ ملی۔
"تم۔۔۔ تم چائے نہیں پیو گی؟"
"میں رات کو چائے نہیں پیتی۔"
وہ جوڑے کے گرد پنیں لگاتے ہوئے بیڈ کے دوسرے سرے تک آئی۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟"

"جی۔ اب ٹھیک ہے۔ میں ابھی ابھی دیکھ کے آئی ہوں۔ دوا دے کر، دودھ پلا کے سلا دیا ہے۔" میں سنے تکیہ درست کر کے رکھنے کے بعد وہ کمبل کی تہہ کھول رہی تھی۔

"کون... میں..."

وہ ہڑبڑا کے وضاحت کرنے لگا کہ اس نے اصل میں کس کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا ہے مگر اس کا بھی موقع نہ دیا۔

"وشمہ... اور کون؟" اس نے الٹا سوال کر کے نوید کو لاجواب کر دیا۔

وہ سر جھکا کے چائے پینے لگا... اس سے پہلے بھی عموماً دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو وشمہ کے متعلق کرتی تھی اس لیے منزہ کا جواب... یا سوال برملا تھا۔

"بخار تو اب اتر گیا ہے مگر کمزوری باقی ہے۔ ابھی کچھ دن اسکول نہیں جائے گی وہ۔"

اسکول کا ذکر سنتے ہی نوید کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

"اسکول... اسکول کیسے جائے گی سوہا؟"

"جیسے پہلے جاتی تھی..."

"پہلے تو میرے ساتھ جاتی تھی۔"

"اب اپنے ماموں کے ساتھ چلی جایا کرے گی۔"

"منزہ! ایسا ضرورت ہے اتنی مشکل میں پڑنے کی۔ بچیاں... بچیاں اپنے گھر پہ ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"اور اگر کوئی گھر نہ ہو تو... پھر اچھی ہی نہیں لگتیں... کہیں پہ بھی نہیں۔"

آہستہ آواز میں کہتے ہوئے اس نے کروٹ بدل لی۔

"ایسا کب تک چلے گا؟" وہ جھلا گیا... "آخر یہ سمجھتی کیوں نہیں کہ میں شرمندہ ہوں اور اپنی غلطی کا ازالہ چاہتا ہوں۔" دوسرا جملہ محض سوچ کر رہ گیا۔

"جب تک چل سکا۔"

اس نے دوسری جانب رخ کیے ہوئے ہی جواب دیا۔ چہرے کے تاثرات کیسے تھے۔ یہ تو وہ جان نہ سکا مگر آواز بے حد ٹھنڈی۔ لہجہ بے حد میکانکی اور بے تاثر تھا۔

"اگر جمیل بھائی جان کو دقت ہوئی تو وین لگوا دیں گے یا پھر تین مہینے بعد اسکول بدل دیں گے... فائنل ایگزام کے بعد۔"

نوید نے چائے کا آدھا خالی کیا کپ ٹیبل پہ پٹخ دیا اور بستر پر لیٹ کر چھت پہ نگاہیں گاڑ دیں۔ شرمندگی جو جھلاہٹ میں بدلی تھی اب ڈھٹائی پہ تل گئی۔

"حد ہے اکڑ دکھانے کی۔ ایک بار کہہ دے گی تو کیا شان میں فرق پڑ جائے گا۔ اب میں پیر پکڑ کے معافی مانگنے سے تو رہا۔"

اس نے بھی کروٹ لے لی۔

☼ ☼ ☼

"تم میری بات مان کیوں نہیں لیتیں۔" اصغر نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"اور تم کیوں نہیں میری بات مان لیتے؟" ربینا نے زچ کرنا ہی سیکھا تھا۔

"ایک بار مانی تو تھی... نتیجہ تم نے دیکھ لیا۔ اب میری بات آزما کے دیکھ لو۔"

"کوئی زبردستی ہے کیا؟" وہ چڑ کے بولی۔

"نہیں... بالکل بھی نہیں۔ میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کوئی ضد ہے میری کہ سوہا اس گھر میں آ کے رہے گی۔ یہ تو میں نے تمہاری ضد کا آسان سا حل نکالا تھا جو میرا دل خوشی سے قبول کر لے۔

اور اب چھوٹے بچے کو لانے والے ناکام تجربے کے بعد تم کسی بڑے بچے کو لانا چاہتی ہو جسے پالنے کے لیے تمہیں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ یعنی پلا پلایا بچہ... تو اس لیے میں نے سوہا کا نام لیا کوئی نہیں کی تمہارے ساتھ۔ تمہیں منظور نہیں تو نہ سہی لیکن کوئی دوسرا بچہ بھی نہیں آئے گا۔"

"زبردستی نہیں تو اور کیا ہے بھلا؟"

... کے رہ گئی... آج تک اصغر کو سر ہلا ہلا کے صرف بات مانتے ہی دیکھا تھا۔ اس کا شرطیں سامنے رکھنا ... نہیں ہو رہا تھا۔

"زبردستی نہیں ہے میری جان۔"

... نے ربینا کا مزاج بگڑتے دیکھ کر پیار سے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔

... جائیداد... دیکھو... سب میں نے کتنی محنت سے بنایا ہے۔ کوئی غیر... کوئی دوسرا آ کے اس کا مالک بن ... مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔"

"جب اس غیر کو ہم اپنی اولاد مان لیں گے دل سے بھی اور کاغذوں میں بھی۔ تو وہ کوئی دوسرا نہیں رہے گا ... ہمارا اپنا بھی نہیں ہو گا۔"

"سوہا بھی ہماری اپنی نہیں ہے۔ اسے بھی اپنا صرف ماننا ہو گا... تو پھر کسی دوسرے کو کیوں نہیں۔"

"سوہا اپنی نہ سہی۔ مگر غیر بھی نہیں ہے۔ اسے دل سے اپنانے میں کم وقت لگے گا اور پھر وہ میرے بھائی کا خون ہے۔ اس میں وہی تاثیر ہو گی جو مظہر کے خون میں تھی اور بھرجائی... تم نے بھی تھوڑا بہت وقت بھرجائی کے ساتھ گزارا ہے۔ تمہاری اس کی آپس میں بنی نہیں، وہ الگ بات... مگر یہ بات تو تم بھی مانتی ہو گی کہ وہ اچھی عورت ہے۔ صابر، شریف... بھلے دل کی۔"

ربینا کچھ نہیں بولی... ماتھے کے بل ذرا کم ہوئے... یعنی اسے اصغر کی اس بات سے بہرحال اختلاف نہیں تھا۔

"جو بچہ ہم یتیم خانے سے لائیں گے پتہ نہیں کس کی اولاد ہو گا۔ حرام کی اولاد ہو گا... یا حلال کی... شاید کسی نے اپنا گناہ وہاں پھینکا ہو گا... شاید کسی ڈاکو... کسی فراڈیے... کسی سڑک چھاپ بھکاری کی اولاد ہو... خون کی بڑی تاثیر ہوتی ہے ربینا... میں اس بات کو بہت مانتا ہوں اور ڈر لگتا ہے مجھے... کہ کہیں کوئی گندے خون والا بچہ اپنے بد ذات لے کر اس گھر میں آ گیا تو ہمیں اپنی محبت کے بدلے میں صرف نقصان ہی ملے گا۔ مجھے ساری عمر کی محنت ... کھاتے دیکھ کے اپنا بڑھاپا خوار نہیں کرنا۔"

ربینا اب واضح طور پر متفق ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ماتھے کے گنے چنے بل بھی معدوم ہو رہے تھے۔

"اور کوئی الٹی سیدھی بیماریاں بھی لا سکتے ہیں اپنے ساتھ۔ بعض بچوں میں خاندان کی بیماریاں بھی منتقل ہوتی ہیں۔ سوہا کو ہم پورے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ گھر لا سکتے ہیں۔ بھرجائی نے اس کی اچھی تربیت کی ہو گی۔ وہ تمہارے لیے کبھی مسئلہ نہیں بنے گی۔"

"بھرجائی مان جائے گی کیا؟"

یہ سوال اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ قائل ہو چکی تھی۔ اصغر کی پچھلے کئی مہینوں سے جاری کوشش رنگ لا رہی تھی۔

"مان جائے گی کیسے نہیں؟" اس نے اپنی خوشی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو نہیں لگتا۔ آخر سوہا اس کی اکلوتی اولاد ہے۔"

"اس کے بھائیوں سے ایک سال بھی اس کا بوجھ نہیں اٹھایا گیا تھا اور کب کا بیاہ چکے ہیں وہ اسے ... میرے شوہر سے اب تک دو بچے اور ہو چکے ہوں۔ نہ بھی ہوں تو اس کی دوسری شادی کر لینے سے ہمارا کیس بھی مضبوط ہوا ہے۔ ویسے تو مجھے یقین ہے وہ مان جائے گی۔"

"مگر مجھے نہیں ہے۔"

ربنا کو منزہ کے ساتھ اپنا "حسن سلوک" یاد تھا۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ منزہ کے دل میں بھی وہ "خوشگوار" تازہ ہوں گی۔ اس لیے وہ اس بارے میں نہ پرامید تھی نہ ہی خوش فہم۔

"نہ مانے گی تو عدالتیں کس لیے ہیں۔ دیکھنا پہلی پیشی میں بچی ہمارے حوالے ہو جائے گی۔"

اس نے سینہ ٹھونک کر دعوا کیا۔

❤ ❤ ❤ ❤

آج ساتواں دن گزر گیا تھا۔

وہ روز شام تک دروازے پہ نظریں جمائے بیٹھی رہتی۔ ہر روز اسے امید ہوتی کہ آج منزہ اسے لینے آ... مگر نہ وہ آئی... نہ اس کا فون۔

اس کی خاموش نظریں کبھی ماموں۔ کبھی ممانی کے چہرے کی جانب اٹھتیں اور ان کے نظر چرا لینے پر لوٹ آتیں۔

پہلے دو تین دن جس ہلچل اور گہما گہمی کے ساتھ گزرے تھے ان سات دنوں میں ان کا کوئی ذکر ہی نہ... پکنک کے پروگرام' وہ اس سے پوچھ پوچھ کر اس کے پسندیدہ مقامات پہ آؤٹنگ کے لیے جانا۔ وہ اس کے من... کھانے بننا۔ اب تو ایک گہرا جمود طاری تھا۔ ایک ایک دن کاٹنا اس سے مشکل ہو گیا تھا۔

اس کا اسکول بیگ' کتابیں اور یونیفارم بھی اگلے ہی دن پہنچ گئے تھے۔ کسی کے بنا بتائے ہی وہ بہت کچھ... تھی اور جان لینے کے باوجود مان نہیں پا رہی تھی۔ خود کو یقین نہیں دلا پا رہی تھی کہ اتنی چھوٹی سی غلطی پہ... سمجھے کی جانے والی غلطی کی اسے اتنی بڑی سزا بھی مل سکتی ہے اور سب سے ناقابل تسلیم بات تو یہ تھی... لیے کہ اس کی ماما نے اسے ملنے والی اس سزا کو خوشی خوشی تسلیم کیسے کر لیا؟

"وہ مجھے لینے نہیں آئیں۔ بلکہ یہ بتانے کے لیے آئیں کہ میں اب وہاں نہیں آ سکتی... یعنی انہیں میرا... منظور ہے۔ اتنے دنوں سے انہوں نے کوئی فون نہیں کیا۔ یعنی انہیں میری کوئی فکر ہے نہ پروا... ضرورت... دور کی بات ہے۔"

اس سوچ نے اسے اندر تک مرجھا کے رکھ دیا تھا۔

"ماما۔"

دل ہی دل میں شکوے کرتے رہنے کے بعد اس نے سسکی لیتے ہوئے پکارا... خالی اندھیرے کمرے میں... سسکی کی گونج اسی کو ڈرا گئی۔ اس نے ٹانگیں سمیٹ کے پیٹ سے لگا لیں اور چہرہ گود میں چھپا لیا۔ تنہائی سے فرار بھی اس کا خوف کم کرنے میں مددگار ثابت نہ ہو سکا۔ بلکہ اپنی ہی گود میں آنکھیں میچے' سر چھپائے اسے... محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی گھات لگائے آہستہ آہستہ اسے دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہو۔ اس نے لینے... ہوتے ہوئے ڈرتے ڈرتے گردن اٹھائی۔ اب آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو رہی تھیں مگر جو کچھ دی... تھیں وہ اسے مزید خوفزدہ کر رہا تھا۔

فرنیچر اس چھپتے ہوئے اندھیرے میں دیو قامت سائے دیواروں پہ پیدا کر رہا تھا۔ ان گنت ہیولے اسے... ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ باہر سے آتی ملی جلی آوازیں بھی اس کا خوف کم کرنے اور... بندھانے میں ناکام تھیں۔ اس نے تھوک نگل کر ہمت مجتمع کرتے ہوئے کسی کو آواز دینا چاہی۔ مگر کو... باوجود آواز نہ نکال سکی۔ لائٹ گئے پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور آنے میں تقریباً" اتنا ہی وقت اور تھا۔ با... لیمپ آن کیے۔ سب اکٹھے بیٹھے خوش گپیوں میں مگن تھے اور ایسے میں شاید کسی کو اس کا خیال بھی چھو کر... تھا کہ اندر کسی کمرے میں اندھیرے سے اپنی جنگ آپ لڑتی وہ بچی نڈھال ہو رہی ہے۔

دن چڑھتا ہے مائی
ڈر لگتا ہے مائی

رات آئے تو رات سے ڈرتی ہوں
اری مائی ری۔ اری مائی ری
مکڑی کے جالے سا آتا ہے
ناخن دکھا کے ڈراتا ہے
ڈرتی ہوئی' چھپتی ہوئی
جاؤں کہاں بچتی ہوئی
پھر جب رات آتی ہے
پنجرے والی رات سے ڈرتی ہوں
رات آئے تو رات سے ڈرتی ہوں
کیڑا سا گردن پہ چلتا ہے
رات انگلی سے ملتا ہے
مائی میرا پیچھا چھڑا
سر پہ چڑھی کالی بلا
کل نہ جانے کیا ہو
آنے والی شام سے ڈرتی ہوں
رات آئے تو رات سے ڈرتی ہوں

"ماما!" سناٹے میں مدھم سی آواز گونجی اور منزہ اپنے دھیان سے چونک اٹھی۔

"سوہا!" اس کے خشک لب پھڑپھڑائے۔

"ماما... میں..." اس نے تڑپ کے دروازے کی جانب دیکھا اور بے ساختہ اپنا پیر نیچے اتارا۔

دروازے سے جھانکتی سہمی ہوئی وہ سوہا نہیں وشمہ تھی۔

منزہ کا پیر دوبارہ اوپر چلا گیا۔ چہرے کے تاثرات غیر ارادی طور پر سرد ہو گئے۔

"کیا بات ہے؟"

لہجہ بھی اتنا ٹھنڈا ٹھار تھا کہ وشمہ کی ساری ہمتیں جواب دے گئیں۔ اس کے چہرے سے یکایک اتنی سراسیمگی ٹپکنے لگی کہ منزہ کا دل پسیج گیا۔

"کچھ کہنا ہے؟"

لہجے میں خنکی کم ہوئی تو وشمہ نے بھی ایک قدم اندر بڑھانے کی ہمت کی۔

"ماما... آپ ناراض ہیں مجھ سے؟"

"ہاں... بہت زیادہ..." دل چاہا' صاف کہہ دے... وہی تو تھی جس کی وجہ سے سوہا کو اتنے امتحانوں سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ بے شک وہ براہ راست ذمہ دار نہیں تھی اس سارے معاملے کی... لیکن ہمیشہ ہر بار اس کی کسی نہ کسی بات پہ بہانا بنا کہ شمشاد اور نوید سوہا کو نشانے پہ رکھ لیتے تھے۔ مگر یہ ناراضی اس پہ جتانے کا فائدہ... جب کہ وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"میں تم سے کیوں ناراض ہوں گی بھلا؟"

آواز کی لرزش پہ قابو پاتے ہوئے اس نے بمشکل ہونٹوں پہ مسکراہٹ سجائی جس سے حوصلہ پا کے وشمہ آگے بڑھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے ایک بڑی محتاط سی نظر برآمدے پہ ڈالی تھی۔ اس کی یہ بے ساختہ احتیاط منزہ کو ایک طنزیہ ہنسی ہنسنے پہ مجبور کر گئی۔

"یوں دیکھ رہی ہو... آ جاؤ۔ تمہاری دادو اس وقت گہری نیند سو رہی ہیں۔ انہیں پتہ نہیں چلے گا کہ تم میرے پاس

اس کے جتا دینے پہ وشمہ خفیف سی ہو گئی۔ ایک شرمندہ سا تاثر اس کے پورے سراپے سے جھلکنے لگا۔

"ماما... آپی کب آئیں گی؟"

"کبھی نہیں۔" بڑی مشکل سے دھکیلی گئی پتھریلی ٹھنڈک پھر سے ڈھٹائی کے ساتھ اس کے لہجے میں اتر آئی۔

"ماما... آپ... انہیں لے آئیں۔" وشمہ کی آواز اور پلکیں دونوں نمکین ابلتے پانی سے بھیگ رہی تھیں۔ "میں کبھی جھگڑا نہیں کروں گی ان سے۔"

منزہ نے ایک سرد آہ بھری اور اس کی نچلی پلکوں پہ ٹنگا ایک شفاف ہیرا سا آنسو اپنی انگلی کی پور پہ لیے پوری سچائی سے کہا۔

"تم پہلے بھی کب جھگڑا کرتی تھیں جان! وہی لڑا کرتی تھی تم سے۔"

سوہا کے لیے لفظ "تھی" کا استعمال اس کے کلیجے میں ٹیسیں چبھونے لگا۔ ایسا لگا جیسے وشمہ کی پلکوں سے ایک ہیرا اس کی پلکوں پہ ہیروں کی باڑ اگا گیا ہو۔

"پھر میں ان کی شکایت نہیں کیا کروں گی کسی سے۔ وہ کچھ بھی کہہ لیں۔ سیڑھیوں سے دھکا دے کر گرا دیں۔ اسکول میں کاپی سے ہوم ورک والا پیج پھاڑ دیں۔ یونیفارم پہ کیچپ گرا دیں۔ باتھ روم میں بند کر کے لاک کر دیں۔ کچھ بھی کر دیں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی اور منزہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ تو تم نے پہلے بھی کسی کو نہیں بتایا بیٹا!"

وشمہ کا کچھ اور کہنے کے لیے کھلتا منہ وہیں کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چہرے پہ ایک رنگ سا آ کے گزر گیا جیسے ابھی ابھی اپنی کہی بات کا احساس ہوا ہو۔

"کیا واقعی، سوہا یہ سب کیا کرتی تھی تمہارے ساتھ؟" اس نے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں، وہ تو نہیں۔ میں بس... ایسے ہی..."

اس کی گھبراہٹ میں منزہ کو اپنے سارے جواب مل گئے۔

"پھر بھی تم چاہتی ہو کہ وہ یہاں دوبارہ آ جائے؟"

وشمہ کا سر مجرمانہ سے اقرار کے ساتھ جھک گیا جیسے وہ خود اپنی اس بے معنی خواہش پہ شرمندہ ہو۔

"مگر کیوں؟ کیوں چاہتی ہو تم ایسا؟ کیوں تمہیں اتنا پیار ہے اس سے؟" اس بار حیرت کے ساتھ جھلاہٹ بھی تھی۔

"کیونکہ... کیونکہ وہ نہیں ہیں تو آپ... بہت اداس رہتی ہیں ماما!"

اس نے بھیگی آواز میں چند قدم آگے سرکتے ہوئے کہا پھر اس کے ننھے گدرائے ہوئے ہاتھوں کی حدت منزہ نے اپنی گود میں دھری سختی سے بند مٹھیوں پہ محسوس کی۔

"اور میں آپ کو اداس نہیں دیکھ سکتی۔ میں آپی سے نہیں، آپ سے پیار کرتی ہوں۔"

منزہ کی حیران اور وشمہ کی پشیمان آنکھوں سے ایک ساتھ آنسو گرے تھے اور ان دونوں کے بندھے ہاتھوں پہ آن ٹپکے تھے۔ پتہ نہیں کس کا آنسو کس کی ہتھیلی پہ ٹھہرا تھا۔

"آئی لو یو ماما!"

وشمہ نے منزہ کے گلے میں بانہیں ڈالیں تو وہ رہ نہ سکی اور اسے اپنے سینے سے بھینچ کر سسک اٹھی۔

☆ ☆ ☆

پرائی اولاد سے محبت کرنا مشکل نہیں ہے۔ مشکل ہے پرائی اولاد کو سگی اولاد کی جگہ دینا۔

منزہ نے وشمہ کو کبھی سوکن کی اولاد کی نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ ایک تو سوکن کا وجود نہ تھا اور شاید اس لیے بھی کہ اسے اس انجانی، ان دیکھی سوکن سے کبھی رقابت کا احساس ہوا بھی نہیں تھا۔ رقابت کے لیے محبت کا ہونا ضروری ہے اور غالباً اس کے اور نوید مراد کے رشتے میں ابھی وہ موڑ نہیں آیا تھا کہ اسے نوید کے حوالے سے ایسے کسی جذبے کا احساس ہوتا۔

اسے پہلی نظر میں ہی وشمہ ایک سہمی ہوئی چڑیا سی لگی تھی جسے دونوں ہاتھوں کی اوٹ دے کر تحفظ کا احساس دینے کا بے ساختہ دل چاہا تھا اور پھر اس بچی کی والہانہ محبتیں، اپنائیت جگاتا گدگداتا لمس... وہ اس سے کبھی بے رخی اور رکھائی برت ہی نہ سکی۔ سوہا کی دبی دبی ناپسندیدگی اور ناگواری کے باوجود۔

اس نے کبھی بھی یہ سوچ کر وشمہ کو توجہ اور محبت دینے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس سے متاثر ہو کر بدلے میں نوید سوہا پہ اپنی شفقت و عنایت کرے۔ اس نے کسی غرض سے بے نیاز ہو کے وشمہ پہ ممتا نچھاور کی تھی۔

لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ اس کی بیٹی کو تو "دیس نکالا" ملے اور وہ ایسا سنگ دلانہ حکم سنانے والے کی بیٹی کو اپنے سینے سے چمٹا لے۔ فطری سی بات تھی کہ اس کے دل میں بھی ملال آیا۔ وشمہ کے لیے۔ وقتی ہی سہی مگر ایک بیزاری بھی پیدا ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ پچھلے کئی روز سے اس کا رویہ اس کے ساتھ لیا دیا اور خشک سا تھا۔ اسی کے ساتھ نہیں بلکہ نوید مراد کے ساتھ بھی اور شمشاد بیگم کے ساتھ تو خاصا جارحانہ ہو چکا تھا جو اس کے مزاج اور فطرت کے خلاف تھا۔

"کسی پناہ گزین کی طرح اس گھر میں ہر شرط مان کر رہنے پہ مجبور ہوں مگر میرے دل پہ کوئی جبر نہیں۔ جس پیار کی حق دار ہو کر بھی میری بیٹی اپنے حق سے محروم کر دی گئی ہے، اس پیار کو میں کسی اور پہ کیوں لٹاؤں۔ میری بچی کو تنہائیوں کے حوالے کر کے یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی بچی کی محرومیاں دور کروں۔ کس لیے؟ کیوں؟ میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔"

یہ اس کا ارادہ تھا جو وشمہ کے معصوم اور بے ریا پیار کے سامنے ریت کی بھربھری دیوار ثابت ہوا۔

اسی لیے کہتے ہیں کہ

پرائی اولاد سے محبت کرنا مشکل نہیں ہے۔ مشکل ہے پرائی اولاد کو سگی اولاد کی جگہ دینا۔

اور منزہ نے یہ مشکل کام آخر کار کر ہی ڈالا تھا۔ اس نے اپنی لٹی پٹی زخم خوردہ محبت پہ وشمہ کا پھاہا رکھ لیا تھا اور سوہا... کیا اس کے نصیب میں بھی کوئی مرہم تھا؟

⌑ ⌑ ⌑

"تم...؟" جمیل نے خلاف توقع اصغر کو سامنے دیکھ کر بے ساختہ کہا تھا۔

اس کے سوال میں موجود حیرت، تنفر اور بیزاری اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ جتنی اس کی آنکھوں میں اس کے لیے نظر آ رہی تھی۔ اسے سالوں پہلے کی اپنی اور اصغر کی وہ آخری ملاقات یاد آ گئی جس کی تذلیل وہ بھلائے نہیں بھول پا رہا تھا۔

"یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"بڑا صحیح پہچانا ہے۔"

اصغر نے ڈھیٹ سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے یوں خوش دلی سے کہا جیسے عرصے سے دونوں میں بڑے دوستانہ مراسم چلے آ رہے ہوں۔

"واقعی آیا تو کچھ لینے ہی ہوں۔"

"دیکھو، میرا موڈ اس وقت پہلے ہی خراب ہے۔ اب دماغ مت خراب کرو تم۔ اور جہاں سے آئے ہو، وہیں منہ اٹھا کے چلے جاؤ۔"

جمیل نے گیٹ بند کرنا چاہا، اس کا خیال تھا کہ یہاں اس علاقے میں وہ کسی سے ملنے یا کسی اور کام سے آیا ہو گا اور راستے میں اس کا گھر دیکھ کر اس کی شیطانیت پھڑک گئی ہو گی۔

"میں تو خاص طور پر آپ سے ملنے آیا ہوں"، اس نے آگے بڑھ کے گیٹ بند ہونے سے روکنا چاہا۔ پھر ابرو اچکا کے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"آپ سے اور بھرجائی سے۔"

"کیسی بھرجائی؟ کون سی بھرجائی؟" جمیل بھڑک اٹھا۔

"یہاں تمہاری کوئی بھرجائی نہیں رہتی۔ تم شاید بلی کے آئے ہو۔ یہ شریفوں کا گھر ہے اصغر بھٹی! جاؤ سسرالی کوٹھے پہ اپنے گن دکھاؤ۔ وہاں یہ سب چلتا ہوگا۔" جمیل نے طنز کیا تھا۔

اصغر کی باچھوں سے پھوٹتی مکروہ اور تپا دینے والی مسکراہٹ، ایسے بھڑ بھڑ کرتی راکھ ہو گئی جیسے کسی نے تیزاب ڈال دیا ہو۔

"میں منزہ بھابھی کی بات کر رہا ہوں۔"

موقع کی نزاکت ایسی تھی، ورنہ جس طرح جمیل نے رینا کے حوالے سے اس کی دم پہ پیر رکھا تھا، وہ تلملاتے کتے کی طرح اس کو بھنبھوڑ کے رکھ دیتا۔ فی الحال بڑے روکھے لہجے میں فقط اتنا کہنے پہ اکتفا کیا۔

"وہ تمہاری بھابھی اب نہیں رہی اور تمہاری معلومات کے لیے اتنا بتا دوں کہ میری بہن کی شادی ہو چکی ہے اب وہ کسی کی بیوی ہے۔ تمہارے جیسے ایرے غیرے سے بلاوجہ نہیں مل سکتی۔"

"میری معلومات اتنی کمزور نہیں ہیں کہ بھرجائی کی شادی کے اتنے سال بعد تک بھی میں بے خبر رہتا۔"

"تم یہی ساری بکواس کرنے آئے ہو میرے دروازے پہ؟"

"نہیں۔ بتایا تو ہے کہ کچھ لینے آیا ہوں۔"

"اب یہاں کیا ہے تمہارا؟" وہ الجھا۔

"میری بھتیجی، میرے بھائی کی آخری نشانی، سوہا۔"

جمیل کتنی دیر تک کچھ بول نہ سکا۔

☙ ☙ ☙

جمیل کے ڈرائنگ روم میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھے وہ بڑی بے چینی سے اپنے پیر ہلا رہا تھا۔ اس کی مضطرب نگاہیں کسی ایک منظر پہ ٹک ہی نہ رہی تھیں۔ ایک چیز سے دوسری چیز پہ پھسلتی نجانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔

"شکر ہے میں رینا کو ساتھ نہیں لایا۔"

اس نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے سوچا۔

اور یہ شاید اس کی زندگی کے ان چند گنے چنے فیصلوں میں سے ایک فیصلہ تھا جس پہ وہ شکر ادا کر رہا تھا۔ رینا ساتھ آنے کے لیے بضد تھی مگر وہ حالات خراب ہونے کے خدشے کے پیش نظر اسے ساتھ لانے پہ تیار نہیں ہوا تھا۔

اگرچہ جمیل اسے سامنے پا کے بھی کم نہیں بھڑکا تھا لیکن وہ اصغر بھٹی تھا، اپنا مطلب نکالنے کے لیے کچھ بھی سہہ لینے کا حوصلہ رکھنے والا اور وہ رینا تھی۔ پل میں شعلہ جوالا بن جانے والی۔ ہر مصلحت سے عاری، موقع شناسی کے فن سے نا آشنا۔ اس کو ساتھ لایا ہوتا تو اس وقت جمیل کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا سوہا کا انتظار کر رہا ہوتا۔

"سلام کرو بیٹا! تمہارے چچا ہیں یہ۔"

جمیل کی آواز پہ وہ چونکا۔

اس کے ساتھ کھڑی وہ دس گیارہ سال کی لمبے قد کی دبلی پتلی مگر مضبوط کاٹھی کی لڑکی، اپنی صحت مند باڈی کے برعکس بڑا معصوم سا چہرہ رکھتی تھی اور جو حیران آنکھوں میں اجنبیت بھرے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

اصغر کے اندر ایک لہر سی انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔ وہ بہت سالوں کے بعد اس کے سامنے تھی۔ درمیان کے اتنے سال یکایک غائب ہو گئے تھے، اسے اپنے ہاتھوں میں نرم روئی کے گالے جیسی چند ماہ کی بچی کا مہکتا لمس محسوس ہوا جسے وہ بڑے شوق سے مگر ڈرتے ڈرتے گود میں لیا کرتا تھا۔ پھر دو سال کی گول مٹول گڑیا جسے وہ موٹر سائیکل کی ٹنکی پہ بٹھا کے گھر کے پورچ میں گول گول چکر لگایا کرتا تھا۔ پھر چھوٹا سا لال فراک ہوا سے پھڑپھڑاتا اور اس کی کلکاریاں سارے میں الگ گونج رہی ہوتیں۔ وہ سہمی ہوئی بچی جو باپ کی میت کے پاس روتی پیٹتی عورتوں کو دیکھ کے خوف کے مارے اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اس کی ننھی منی مٹھیوں کی گرفت سے آزاد کرانے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ اسے اپنے بھائی کو اس کے آخری سفر پہ لے جانے کے لیے اپنا کاندھا پیش کرنا تھا۔

اور وہ سوہا۔۔۔ جو ماں کی انگلی تھامے اس کے گھر سے جا رہی تھی بلکہ اس کی نظروں کے سامنے نکالی جا رہی تھی اور جاتے جاتے اس نے جس طرح مڑ کے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"چاچو۔۔۔"

وہ صدا اب بھی کبھی کبھی زمانوں کا سفر کرتی اس تک آتی اور وہ اندر تک سرد پڑ جاتا۔ ایسے لگتا جیسے مرا ہوا بھائی اس سے کچھ سوال کرتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہو۔

"چاچو۔۔۔"

اس نے دھندلی ہوتی آنکھیں رگڑ کے دیکھا۔ اس بار یہ صدا زمانوں کا نہیں، صرف چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس تک آئی تھی اور وہ بھی آنکھوں میں پہچان لیے جانے کی چمک لے کر۔

اصغر نے بازو وا کیے اور مظہر کی خوشبو کو سینے سے لگا کر محسوس کرنے لگا۔

"میری سوہا۔۔۔ میری بچی۔۔۔ چاچو کی جان۔۔۔"

وہ اسے والہانہ پیار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس ایک مختصر سے وجود نے اس کے اندر کتنے بچھڑے رشتوں کی خوشبو جگا دی تھی۔ بھائی کی۔۔۔ ماں کی۔۔۔ باپ کی۔۔۔ اور اس بہن کی جو ابھی مری نہیں تھی۔۔۔ زندہ تھی مگر وہ اسے کب کا اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں دفنا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا ضرورت تھی اسے گھر میں گھسانے کی؟"

کلثوم کو جمیل کی یہ حرکت ذرا پسند نہیں آئی۔

"لینے کیا آیا ہے اب وہ۔ بھائی کی بیوہ کو تو پلٹ کے پوچھا تک نہیں اتنا عرصہ۔۔۔ اور جب وہ اپنے گھر بار والی ہے تو آیا ہے منہ اٹھا کے۔۔۔ منزہ بے چاری پہلے ہی تلوار کی دھار پہ چل رہی ہے۔ پچھلے رشتوں کی ایسی دخل اندازی اسے ڈسٹرب کر سکتی ہے۔ آپ اسے منع کر دیں۔ اب نہ آئے یہاں۔"

"منزہ اپنے گھر میں بیٹھی ہے۔ وہ یہاں آیا ہے۔ منزہ کو بھلا کیا کہہ رہا ہے وہ۔ ویسے بھی اصغر کو منزہ یا اس کے شوہر سے کیا لینا دینا۔ کیا واسطہ؟"

"اس کا ہم سے کیا لینا دینا۔ اور کیا واسطہ؟"

"ہم سے نہ سہی سوہا سے تو ہے۔"

"سوہا سے؟"

"ہاں سوہا اس کے بھائی کی اولاد ہے، وہ۔۔۔ سگی بھتیجی۔ اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ میں کیسے روک سکتا تھا۔"

"سگی بھتیجی یاد آ گئی اور کہاں کی بھتیجی؟" کلثوم نے چمک کر کہا۔ "اب یاد آیا ہے اسے کہ اس کے مرحوم بھائی کی کوئی

"اب یاد آیا ہو کہ تب یاد آیا ہو..... بہرحال میں منع کرنے والا کون ہوں۔ دونوں کا خون کا رشتہ ہے اور
حق بات تو یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ حق سوہا پہ اس کے چچا کا ہی ہے۔"
"واہ۔ بڑا آیا حق جتانے والا۔ اب آیا تو وہ خبرلوں گی اس کی کہ....."
"بس کرو کلثوم۔" جمیل نے ناگواری سے ٹوکا۔ "خبردار جو تم نے معاملہ بگاڑنا چاہا تو۔"
"معاملہ؟" وہ کھٹکی۔ "کن چکروں میں ہیں آپ؟"
"لاحول ولا۔ میں کسی چکر میں ہوں گا۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں نہیں گیا تھا اس کے پاس، وہ خود آیا ہے۔ خون کی
کشش اسے کھینچ کر لائی ہے؟"
"دفع کریں اس کے خون کی کشش کو۔ مجھے اصل بات بتائیں۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"
کلثوم کی چھٹی حس بار بار اسے کوئی اشارہ دے رہی تھی۔
"میں نے کچھ نہیں کہنا۔" جمیل نے بے اعتنائی سے کہا۔ "وہ کہہ کے گیا ہے کہ... سوہا کو اپنے ساتھ لے
جانا چاہتا ہے۔"
"کیا؟ اس کی ہمت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی۔ پہلے یتیم بھتیجی کو خود نکالا۔ اب خود لینے آگیا ہے۔ وہ بے
شرمی اور ڈھٹائی کی۔ اس نے یہ سوچا بھی کیسے کہ ایک یتیم بچی کو ماں کی ممتا سے محروم....."
"سوہا کو اس کی ماں اپنی ممتا سے محروم کر چکی ہے کلثوم۔" جمیل کے سرد لہجے پہ کلثوم کو چپ لگ گئی۔
"وہ..... وہ اور بات ہے۔"
کافی دیر بعد اس نے اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا مگر اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن خود اس پہ عیاں ہو رہا تھا۔
"ایک ہی بات ہے۔ منزہ اسے ساتھ رکھنا نہیں چاہتی۔"
"چاہتی ہے، صرف رکھ نہیں پا رہی۔ مجبور ہے۔"
کلثوم نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے منزہ کی جانب سے صفائی پیش کی۔
"چلو یونہی سہی۔" جمیل نے بدمزگی سے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔
"بات تو وہی ہے کہ بیٹی کی وجہ سے اس کا گھر نہیں بس پا رہا تو اگر اللہ کی جانب سے سبب بن رہا ہے تو منزہ نے
کیا ہے۔"
"منزہ کبھی نہیں مانے گی۔"
"اس کے ماننے نہ ماننے کا کیا سوال۔ اس نے لڑکی پہلے ہی ہمیں سونپ دی ہے۔"
"عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ۔ امانت جان کے ہمیں سونپی ہے، اس لیے نہیں کہ ہم اسے ادھر ادھر بھیجتے
پھریں۔ اس سے تو اچھا ہے۔ سوہا کو دوبارہ منزہ کے پاس پہنچا دیں۔ اگر اتنا ہی دوبھر لگ رہا ہے بھانجی کو پالنا۔"
"بات کی نزاکت کو نہ سمجھنا تم، بس مجھ پہ طنز کے تیر چلاتی رہنا۔" وہ بھڑک اٹھا۔
"میں نے جو فیصلہ کیا ہے، منزہ اور سوہا کی بھلائی کے لیے کیا ہے۔ حق دار کو اس کی امانت پہنچا رہا ہوں۔ مظہر کے
بعد اس کی اولاد کی کفالت اصغر کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ ٹھیک ہے، وہ ایک عرصہ اس فرض کی ادائیگی سے
غافل رہا لیکن اگر اب اللہ نے اس کے دل میں اپنے خون کے لیے محبت جگا ہی دی ہے تو ہمیں بلاوجہ
دکھانے کے بجائے مصلحت سے کام لینا چاہیے۔ اگر منزہ کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو بات دوسری تھی۔ اصغر
کا باپ بھی اس سے سوہا کو لینے کی بات نہیں کر سکتا تھا اور یقیناً میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ منزہ کی گود سونی کر دوں
فی الوقت حالات دوسرے ہیں۔ منزہ اب کسی اور کی بیوی ہے۔ اس کی بیٹی کی ماں ہے۔ ہو سکتا ہے آنے
وقت میں اللہ اس کے نصیب میں اور اولاد بھی لکھ دے مگر سوہا کی حالت وہی رہے گی جو اب ہے۔ وہاں اسے
مل رہی ہے نہ یہاں وہ حق سے رہ پا رہی ہے۔ وہاں کم از کم اسے یہ احساس تو ہو گا کہ وہ اپنے باپ کے
اور میں بھی کچا کام نہیں کروں گا۔ میں نے اصغر سے ساری بات طے کر لی ہے۔ باقاعدہ قانونی کارروائی
سارے ضابطے قاعدے پورے کرتے ہوئے نہ صرف سوہا کو قانونی طور پر ایڈاپٹ کرے گا اور اپنی ساری

وارث بنائے گا بلکہ مظہر کا حصہ جو اس وقت اس نے ہڑپ کر لیا تھا، وہ بھی سوہا کے نام لگائے گا۔ سوچو، اس صورت
میں اس کا مستقبل کتنا محفوظ ہو جائے گا۔"
جمیل کے تفصیلی اور وضاحتی بیان پہ کلثوم چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔
اس کی باتیں دل کو لگ بھی رہی تھیں اور نہیں بھی۔
کبھی اس کی دلیلوں پہ دل متفق ہو جاتا، کبھی ان سے مطلب پرستی اور منافقت کی بو آنے لگتی۔ یہ خدشہ ستانے
لگا کہ جمیل بغیر کسی غرض کے کسی کے لیے اتنا کچھ اچھا سوچنے والا تو نہیں۔ کہیں سوہا کا مستقبل محفوظ کرنے کے
چکر میں اس نے اپنا بھی کوئی فائدہ تو نہیں رکھا۔
یہی بات اس نے جمیل کو جھٹلاتے ہوئے کہتا۔
"بھلا اصغر کو ایسی بھی کیا مجبوری ہے جو وہ جمیل کی ہر جائز ناجائز شرط مان کے سوہا کو لے جائے۔ چلو، سوہا کے لیے
وہ کچھ کرے، بات سمجھ میں آتی ہے مگر جمیل کا فائدہ وہ کیوں سوچے گا؟"
"سوچ کیا رہی ہو؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"
اس کے سوال پہ وہ چونکی اور ایک گہرا سانس لیا۔
"نہیں، کچھ ایسا غلط بھی نہیں مگر ہمارے صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ منزہ کا
فیصلہ کیا ہوتا ہے۔"
"اس کے فیصلے کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی اب۔"
"وہ ماں ہے سوہا کی۔"
"ہاں مگر اس کے شادی کر لینے کے بعد قانون کی نظر میں اس کا سوہا پہ وہ حق نہیں رہتا جو پہلے تھا۔ اگر وہ اصغر کا
مطالبہ رد کرتی بھی ہے تو وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹا کے بڑی آسانی سے سوہا کو حاصل کر سکتا ہے۔"
کلثوم نے ایک اور گہری سانس بھری۔
پہلی سانس میں کشمکش اور بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا اور دوسری میں ہار مان لینے، ہتھیار ڈال دینے والی رضامندی
جھلک رہی تھی۔
"پھر اب.....؟"
آگے کے بارے میں اس کا ارادہ جاننے کا اظہار کرتی وہ کچھ کچھ قائل نظر آ رہی تھی۔
"اب یہ کہ..... منزہ سے بات کی جائے۔"
"اور یہ بات کرے گا کون؟"
"تم..... ظاہر ہے اور کون؟"
"میں؟"
اس کے اطمینان سے کہہ ڈالنے پر وہ بدک ہی تو گئی۔
"میں کیسے.....؟ نہیں نہیں..... مجھ سے نہیں ہو گا یہ۔ آپ خود بات کریں۔"
"میں کیا کہوں گا۔" پہلی بار وہ گھبراہٹ کا شکار نظر آیا۔
"وہ سب..... جو ابھی مجھ سے کہا۔"
"تم سے اس لیے کہا کیونکہ تم سن رہی تھیں۔ وہ پوری بات سنے گی ہی نہیں اور بے کار کا رونا دھونا مچا دے گی۔
تم بات کرو تو شاید مان جائے، تم سے دوستی بھی ہے اس کی اور میری بجائے وہ تمہیں اپنا زیادہ ہمدرد سمجھتی ہے۔"
"ہاں اب تک تو سمجھتی ہے۔ آگے کا پتہ نہیں۔" کلثوم تلخی سے مسکرائی۔
"میں کوشش کروں گی لیکن مجھے پتہ نہیں کہ وہ اس بات کا کیا مطلب لیتی ہے۔"
اس نے ابھی سے اپنی ہمتیں مجتمع کرنا شروع کر دیں۔ منزہ سے یہ بات کرنے کے لیے۔
وہ سوچنے لگی کہ کس بہانے اسے فون کرے اور پھر بات سے بات نکالتے ہوئے یہ بھی کہہ ڈالے۔

"نہیں' فون پہ نہیں۔ آمنے سامنے بات ہو تو زیادہ بہتر ہے۔"
اس نے خود ہی فون والے آئیڈیا کو رد کرتے ہوئے وہاں جانے کا سوچا مگر پھر یہ بھی مسترد کر دیا۔
"نہیں... وہاں نہیں... وہاں تو اس کی ساس سر پہ سوار رہے گی... منزہ کا موڈ خراب ہو گا تو ڈھنگ سے بات نہ کر سکے گی نہ سمجھ پائے گی۔ یہاں بلوا لیتی ہوں۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔"
لیکن ابھی اس نے منزہ کو بلانے کے لیے کوئی بہانہ بھی نہ سوچا تھا کہ منزہ خود وہاں آ گئی۔

☆ ☆ ☆

"بات نہ کر مجھ سے۔"
شمشاد بیگم نے ساتھ جڑ کے بیٹھنے کی کوشش کرتی وشمہ کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔
"گھسی رہتی ہے اس ڈائن کے پاس۔ آج وہ دفع ہوئی ہے تو آ گئی ہے۔ چھاپے کتنیاں دکھاتی۔ جا سے جا کر انتظار کرا اپنی اس سگی ماں کا۔ میں کوئی مری نہیں جا رہی تیرے بغیر۔"
اس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر وشمہ کو سنا ڈالا۔
"کیا کرتی ہیں اماں!"
پروین نے وشمہ کی اتری ہوئی صورت پہ پھیلا ہراس دیکھ کر ماں کو ٹوکا۔
اس کا کافی دنوں بعد آنا ہوا تھا اور آتے ہی یہ دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو گیا کہ منزہ تیار ہو کے بھائی کے گھر جانے کے لیے نکل رہی تھی۔
پہلے والی منزہ ہوتی تو نند کی خاطر داری میں جُت جانے کے لیے اسی وقت اپنا پروگرام کینسل کر دیتی لیکن اب اتنی زیادہ پروا نہ رہی تھی کسی کی۔ اس نے پروین کی آمد کو سرسری سا لیا۔ معمول کی چند ایک باتیں کی اور نوید کو اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔
"آپ چلیں گے مجھے چھوڑنے یا پھر میں ٹیکسی منگوا لوں۔"
نوید نے ایک نظر پروین کے رنگ بدلتے چہرے کی جانب دیکھا۔ ماں کی چبھتی نظروں سے نظر چرائی اور منزہ کے سپاٹ انداز کو ٹٹولا۔
"میں... بس... چلنے ہی والا تھا۔ وہ پروین آ گئی تو..."
"جی میں اسی لیے کہہ رہی تھی کہ اگر آپ کچھ دیر رک کر آفس جانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں چلی جاتی ہوں خود ہی۔"
وہ پروین یا شمشاد کی جانب ذرا سا بھی دیکھے بغیر روانی سے کہہ رہی تھی اور یہ سوچ سوچ کر ہی اس کے دل کو مزے آ رہے تھے کہ ان دونوں کا کیا حال ہو رہا ہو گا بے بسی کے مارے۔ شمشاد بیگم کا تو بس نہ چل رہا ہو گا گرا کے اس پہ بیٹھ جائے۔ بس نوید مراد کے سامنے ہونے سے وہ چپ رہنے پہ مجبور تھی۔
اور نوید... وہ چپ رہنے پہ مجبور تھا۔ اپنے اس ندامت اور پچھتاوے کے احساس کی وجہ سے۔ سویا کو گھر بھیج دینے کے بعد بھی منزہ اس کے سامنے جس نارمل انداز میں اور بغیر کسی شکوے یا ناراضی کے رہ رہی تھی نوید کو اندر ہی اندر ایک مجرمانہ احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ اب منزہ کے سامنے اس کے الفاظ یونہی ساتھ چھوڑ جایا کرتے تھے۔
لیکن ماں اور بہن نے اسے اس کی زن مریدی پر محمول کیا۔ پروین نے تو ان دونوں کے نکلتے ہی جھٹ سے کہہ دیا۔ "آپ تو کہہ رہی ہیں آپ نے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے' یہ ہے وہ کارنامہ؟ بھائی جان کو دیکھ کے تو لگتا جیسے بھابھی نے ان کی گردن دبا رکھی ہے۔"
"گردن تو میں مروڑوں گی اس کی اور ایسی مروڑوں گی کہ اُف نہ کر سکے گی۔ آج لڑکی بھجوائی ہے۔ کل اسے

بھجوا دوں گی۔"
"کیا فائدہ اماں! یہ سب کرنے کا اماں! بھائی جان ہی پریشان ہوں گے۔ ساری زندگی انہوں نے دیکھا ہی کیا ہے۔ بھوں کی ذمہ داریاں... فرائض... نہ تعلیم مکمل کر سکے... نہ کم عمری کی بے فکر زندگی جی سکے... کام کام بس بھی ساجدہ کے آنے سے جو ذرا ان کی زندگی میں خوشی کی لہر آئی بھی تو بس جیسے کوئی وہم سا گزرا ہو۔ اب جو بھی ہے' جیسی بھی ہے ہمارے ساتھ چاہے اچھی ہو یا نہ ہو مگر ان کے ساتھ ٹھیک رہے' وہی کافی ہے۔"
"اس کے ساتھ کدھر اچھی ہے؟ دیکھا نہیں' کیسے لک (کمر) پہ ہاتھ رکھ کے کھڑی دیدے نکال رہی تھی اور بے رعب میں آ کے نوید ادبک کے پیچھے پیچھے اس کے چلا گیا۔ اتنا نہیں کہہ سکا کہ میری بہن پہلے آئی ہے۔ نیز اور جو تو گھر سے نکل۔ آرام نال بہہ جا مگر نال جی۔ وہ تو ایسا جھلا ہو گیا ہے کہ..."
"کیا ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بھابھی اتنی آسانی سے مان کیسے گئیں' کیسے دل چاہا ان کا اپنی بیٹی کو خود سے جدا کرنے کا؟"
"ایسی زنانیوں کو اپنی بوہتی فکر ہوتی ہے' کیسا خصم اور کیسی اولاد۔ تیرے میرے جیسی نہیں ہوتیں کہ بچوں کے لیے کلیجہ مار کے رہیں۔ دو دو خصم کرنے والیوں کے دیدے میں ویسے ہی شرم نہیں رہتی۔ اس نے سوچا۔ جاتی ہے' جائے۔ میں نیا بندہ کہاں سے ڈھونڈوں گی' ورنہ میرے کرنے سے کیا ہونا تھا۔ اگر یہ اڑ جاتی تو میں زبردستی تو اس کی کڑی کو نہیں بھیج سکتی تھی۔ اسے خود ہی پروا نہیں۔"
"ہاں۔ لگتا تو ایسا ہی ہے' ورنہ جب آپ نے بتایا تھا تو سچی بات ہے' بھابھی سے گلے شکوے اپنی جگہ مگر ایک منٹ کے لیے میرا تو دل ہل کے رہ گیا۔ خود ماں ہوں اس لیے یہ بات ہضم کرنی بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ اب یہاں آ کے دیکھ رہی ہوں تو اتنی بڑی بات کا کوئی اثر ہی نہیں نظر آ رہا۔"
"دادو بھوک لگی ہے۔"
وشمہ کی شامت آئی تھی جو عین اسی وقت وہ دادی سے لاڈ جتاتی اس کے ساتھ جڑ کے بیٹھ گئی اور شمشاد نے ساری بھڑاس اس پہ نکال دی۔
"او ہو اماں! وشمہ بے چاری کا کیا قصور۔"
"سارا قصور اسی بدذات کا ہے۔ اس نے بوہتا سر چڑھایا ہے اسے۔ ذرا اکڑ کے رہتی تو کیا مجال تھی اس کی جو وہ نوید کو نیچے لگاتی مگر یہ... یہ تو ایسے ہڑکتی ہے اس کے لیے جیسے اس کے بغیر دو جا ساہ نہیں آئے گا۔ یہی دیکھ دیکھ کے نوید اجھلا ہوا ہے۔"
"بن ماں کی بچی پیار کی بھوکی ہوتی ہے' شاید اسی لیے۔" پروین نے وشمہ کا سر سہلایا۔ ہمیشہ کی طرح وشمہ کا گلا آنسوؤں کے ریلے سے بوجھل اور کڑوا نمکین ہو گیا مگر وہ رو نہیں سکی۔
"کبھی پیار کی پہچان بھی تو ہونی چاہیے۔ اتنی کا کی بھی نہ رہی یہ کہ ذرا اس نے پُچ پُچ کی تو یہ دم ہلاتی اس کے پیر چاٹنے لگی۔"
"رہنے دیں اماں!" پروین نے وشمہ کو مرجھائے انداز میں اپنے کمرے میں جاتا دیکھ کے اور اس کی اتری صورت دیکھ کے پروین کے دل کو کچھ ہونے لگا۔
وشمہ اپنے کمرے میں آ کے بیڈ پہ ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گئی گردن اٹھا کے سامنے والی دیوار پہ تکنے لگی۔
وہاں اس کی تین تصویریں لگی تھیں۔ ایک چھ ماہ کی عمر کی جس میں وہ سرخ رنگ کی گوٹا لگی فراک میں عجیب سی لگ رہی تھی۔ اسی رنگ کے کپڑے کی ٹوپی گنجے سر پہ منڈھی ہوئی تھی جس کے کناروں پہ لگا الاسٹک اسے ستائے ہوئے تھا۔ اس ٹوپی پہ بھی جا بجا گوٹے کی کلیاں لگی تھیں۔ یہ فراک اور ٹوپی اس کی دادو نے خود سی تھی اس کے لیے اور اس تصویر میں بھی وہی اسے گود میں اٹھائے ہوئے تھیں۔ اگرچہ تصویر میں نظر نہیں آ رہی تھیں مگر یہ تصویر بھی ان ہی کی فرمائش پہ بڑی کروا کے لگائی تھی اور وشمہ کو اپنی یہ تصویر زہر لگتی تھی۔

گہرے سرخ رنگ کے سلک کے چمکیلے فراک میں اس کا اچھا بھلا رنگ سانولا لگ رہا تھا۔ یہ سنولاہٹ شاید سر سے بہتے سرسوں کے تیل اور ڈیلوں سے باہر ابل ابل جاتے دودھاری سرمے کی وجہ سے بھی تھی۔

دوسری تصویر ڈھائی سال کی عمر کی تھی۔

نوید مراد اور منزہ کی شادی کے موقع پر کھینچی گئی تصویر جس میں وہ پیلے رنگ کے ستارے ٹنکے چمکیلے غرارے میں چنا ہوا سبز دوپٹہ گلے میں پٹائے مسکرا کے کیمرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

تیسری تصویر آٹھویں سالگرہ کی تھی اور چند مہینے قبل کی تھی۔ اس میں وہ منزہ کا لایا ہوا سفید فراک پہنے ہیر بینڈ بالوں میں لگائے بڑی خوبصورت اور سنجیدہ سنجیدہ سی نظر آرہی تھی۔

کچھ دن پہلے تک یہاں تین نہیں 'پانچ تصویریں تھیں۔ ایک سوہا کی دسویں سالگرہ کے موقع پہ کھینچی تصویر جو پچھلے سال ہی منائی گئی تھی اور دوسری بھی سوہا کی ہی جس میں وہ وشمہ کے ساتھ کھڑی نظر آرہی تھی۔

یہ دونوں تصویریں سوہا کے چلے جانے کے تیسرے چوتھے دن ہی شمشاد بیگم نے یہاں سے اتار لی تھیں۔ منزہ کے احتجاج کے باوجود۔

اور جب اگلی صبح منزہ اسے اسکول کے لیے جگانے آئی تو وشمہ کا دل چاہا وہ دیوار سے جا کے چپک جائے تاکہ منزہ کے علم میں یہ تبدیلی نہ آسکی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ سوہا کی تصویریں نہ پا کے وہ نجانے کیسا محسوس کرے۔ اس کا ردِ عمل کیسا ہو مگر منزہ نے دیوار کی جانب دیکھا بھی۔ پانچ میں سے دو تصویریں غائب دیکھ کے ٹھٹکی بھی مگر جو خدشہ وشمہ کو تھا' ویسا کچھ نہ ہوا۔ اگلے ہی لمحے سر جھٹک کے وہ وشمہ کا یونیفارم ہینگر سے اتار رہی تھی۔

وہ سارے آنسو جو منزہ کی آنکھوں میں آنے چاہیے تھے۔ وہ وشمہ نے چپکے سے اپنے اندر اتار لیے تھے اور جب کوئی کسی کے آنسو اپنے اندر اتار لیتا ہے تو ساتھ ساتھ وہ اس کی ساری کڑواہٹ بھی اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ منزہ کے آنسو وشمہ کے اندر وہ ساری نفرتیں بو گئے تھے جو اس کے دل میں شمشاد بیگم اور پروین کے خلاف تھیں۔

اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی وہ ان دونوں کے قہقہے اور خوشگوار چہلیں سن رہی تھی اور اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔

بالکل منزہ کی طرح۔

□ □ □

"سوہا کہاں ہے؟"

منزہ کو اندر آتے دیکھ کے سب سے پہلا خیال بلکہ سب سے پہلی دعا جو کلثوم نے مانگی وہ یہ تھی۔

"کاش... اسے یہ یاد ہی نہ آئے کہ اس کی سوہا نام کی کوئی بیٹی بھی ہے یا... یا وہ یہ بھول جائے کہ وہ اسے یہاں چھوڑ کے گئی تھی۔"

مگر اس کی دوسری بہت سی دعاؤں کی طرح یہ دعا بھی نجانے کس مصلحت کے تحت واپس لوٹا دی گئی۔

"سوہا... وہ..."

دل چاہا کوئی بہانا بنا دے 'بچوں کے ساتھ کہیں گئی ہے' سو رہی ہے یا... یا پھر... لیکن نہیں... یہی موقع تھا اس سے وہ بات کرنے کا۔

"سوہا تو اپنے چچا کے ساتھ گئی ہے۔"

"چچا... مگر..."

وہ اچنبھے سے بولی۔ یہ اچنبھا بڑا نارمل سا تھا۔ اس میں چونکا دینے والی 'جھٹکا لگا دینے والی بات کوئی نہیں تھی۔ ایسے جیسے وہاں وہ اکثر جاتی رہتی ہو۔ اس کے برعکس کلثوم کے چہرے پہ وہ ساری حیرت در آئی۔

اسی حیرت نے منزہ کو کسی غیر معمولی پن کا احساس دلایا۔ اس نے ذہن میں اس کے کہے الفاظ دہرائے اور یہ حقیقی معنوں میں تھرا اٹھی۔

"چچا... اصغر؟"

☆ ☆ ☆

"تمہاری چاچی تمہیں بڑا یاد کرتی ہے۔"

اصغر نے سارے راستے میں کوئی تیسری بار اس سے یہ بات کہی۔

"لیکن وہ کب ملی ہیں مجھ سے جو یاد کر رہی ہیں۔"

منہ پھٹ سوہا تیسری بار خود کو یہ کہنے سے روک نہ سکی۔

"ملی کیوں نہیں؟ تب تم اتنی سی تھی۔ ذرا سی..." اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"اور سارا وقت چاچی کی گودی چڑھی رہا کرتی تھیں۔"

یہاں اس نے گپ ہانکی۔

"امی ماں کے پاس تو جاتی ہی نہیں تھیں۔"

"پہلے... [illegible] سی ہوئی۔

"پھر میں کیوں گئی؟"

اس سوال نے مسلسل چہکتے اصغر بھٹی کی بولتی بند کر دی۔ وہ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کیے گیا۔

"بتائیں نا چاچو...!"

"بس لے گئیں تمہاری ماما... ہم نے تو بڑا روکا تھا۔"

اس نے سوچا' ایک اور جھوٹ سہی۔

"یہاں پہ اور کون کون رہتا ہے؟"

"پہلے تو سارے رہتے تھے۔ میں' تمہاری چاچی' تم... تمہاری ماما... تمہارے پاپا... دادی' دادا اور پھوپھی بھی ہے تمہاری ایک۔"

"میرے پاپا..." سوہا کے دماغ میں ایک یہی لفظ اٹک گیا۔

"وہ بھی رہتے تھے یہاں۔"

"ہاں اور کیا۔"

اصغر نے ٹٹولتی نظروں سے اس کے چہرے پہ پھیلتے اشتیاق کے رنگ دیکھے اور قدرے مطمئن ہوا۔

آج وہ اسے اپنے گھر لے جا رہا تھا ریتا سے ملوانے کے لیے۔ پچھلے تین دن سے وہ روزانہ شام کو اسے چند گھنٹوں کے لیے لے جاتا تھا۔ اس کی خصوصی اجازت اسے جمیل نے دی تھی۔ ریتا نے تو پہلے ہی دن اسے ساتھ لانے کی فرمائش کی تھی' بلکہ اصغر کے ساتھ جانے کی ضد بھی کی تھی لیکن وہ سوہا کو اپنے طریقے سے ہینڈل کرنا چاہتا تھا۔

پہلے دن وہ اسے پلے لینڈ لے کر گیا' اس کے فیورٹ ریسٹورنٹ میں شاندار کھانا کھلایا۔ ٹوائے ٹاپ سے ڈھیر ساری باربی ڈولز' ڈول ہاؤس اور اسٹینڈ ٹوائز لے کر دیے۔

دوسرے دن بھی شاپنگ ہوئی۔ اس بار ڈھیر سارے برانڈڈ ریڈی میڈ سوٹس' امپورٹڈ مہنگے والے جوگرز اور سینڈلز' ہیلتھی ڈیٹ بکس اور کامکس اور اب تیسرے دن وہ اسے گھر لے جا رہا تھا۔

"یہ ہیں تمہاری چاچی..."

سوہا نے بڑی حیرت سے سامنے کھڑی عورت کو دیکھا۔

"چاچی" کی تکرار سے اس نے اپنے ذہن میں جو خاکہ کھینچ رہا تھا' وہ شمشاد اور پروین کے قبیل کی ایک ڈھیلی ڈھالی گھریلو اور سادہ سی عورت کا تھا۔ بڑے بڑے پھولوں والی تیز رنگوں کے کپڑے پہنے سیدھی مانگ نکال کر جوڑا بنائے بالوں پہ بڑا سا کلپ لگائے' میرون لپ اسٹک اور سونے کے موٹے موٹے کنگن پُرگوشت کلائیوں میں پھنسائے ہوئے۔ ویسے بھی اصغر سے مل کے اس کی بات چیت اور طور اطوار کو بھانپ کے یہی اندازہ لگایا تھا کہ جیسا چاچا' چاچی بھی ویسی نکلتی مگر یہ عورت جو اس کے سامنے تھی' اسے متاثر کرنے کے لیے کافی تھی

کہ اس عمر میں "ظاہر" ہی دل کو لبھاتا ہے۔ وہ بھی "ظاہر" دیکھ کے بہل گئی۔

بے حد اسٹائلش انداز میں سلے نفیس سی شیفون کے سوٹ میں ملبوس وہ عورت یقیناً" باقاعدگی
چمکانے کی عادی تھی کیونکہ اس کی گندمی جلد چمک رہی تھی۔ نقوش عام سے تھے مگر پلک پلک تک سنو
تھی۔ سیاہ اور کاہی رنگ کے امتزاج سے بنا سوٹ اس کی گندمی رنگت کو دلکش بنا رہا تھا۔ کاندھوں سے
سرخی مائل بھورے بال بے حد چمکیلے اور ملائم لگ رہے تھے۔ اتنے زیادہ کہ بے اختیار انہیں چھونے
چاہے۔

خوشبوؤں کی لپیٹیں بلاوجہ ہی پلکوں کو بھاری اور مخمور سا کر رہی تھیں۔ ہلکے زیورات اور نفاست سے
میک اپ نے اسے بارعب بنا رکھا تھا۔

"چاچی...! اور یہ...؟"

ریناکے ہونٹوں پہ سجی مسکراہٹ پل بھر کے لیے غائب ہوئی۔

"اتنی پیاری... چاچیاں ایسی تھوڑا ہی ہوتی ہیں۔ میں انہیں آنٹی کہوں گی۔"

مسکراہٹ دوبارہ آئی۔ پہلے سے کہیں بھرپور اور جان دار۔

"آنٹی نہیں، ماما کہو مجھے۔"

رینا کا یہ مطالبہ ذرا قبل از وقت تھا، اس لیے سوہا نے بے حد الجھ کے اصغر کو دیکھا۔

"وہ دراصل بہت پیار کرتی ہے نا یہ تمہیں، اس لیے۔" اس نے گڑبڑا کے وضاحت دیتے ہوئے آنکھوں
آنکھوں میں رینا کو جلد بازی سے کام لینے سے منع کیا۔

"آؤ، میں تمہیں گھر دکھاؤں۔"

رینا نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"یہ لاؤنج ہے، ہمارا لیونگ روم... یہ دیکھو... یہاں سے سارا لان نظر آتا ہے اور اس طرف ڈائننگ روم۔"

سوہا نے بڑے اشتیاق سے سامنے رکھے بڑے سے ٹی وی سیٹ کو دیکھا اور پھر گردن گھما کے گلاس وال
دوسری جانب نظر آتے بڑے سے لش گرین لان کو جس کے وسط میں بنے فوارے کے ساتھ ماربل کے
نظر آرہے تھے۔

"اور یہ ساتھ ڈرائنگ روم ہے... وہ گیسٹ روم ہے... سامنے کچن... میرا خیال ہے انہیں دیکھنے کا تمہیں
خاص شوق نہیں ہوگا۔ آؤ تمہیں اوپر لے کر جاتی ہوں۔ وہاں تمہارے پاپا کا کمرہ تھا... اب وہاں ہمارا اسٹڈی
ہے۔"

اسٹڈی کرنے سے اصغر اور رینا دونوں کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا مگر شہر کے ٹاپ کے انٹیریر ڈیکوریٹر
سے گھر سنوارتے، سجاتے ہوئے انہوں نے دوسری بہت سی آرائشی اضافوں کے ساتھ اسٹڈی کا شوق بھی
لیا۔ یہ الگ بات کہ وہاں جانے کا اتفاق دونوں کو ہی نہ ہوتا تھا۔

"اور یہ دیکھو سوہا! تمہارے پاپا۔"

اصغر نے اسے کاندھوں سے تھام کے ایک تصویر کے سامنے کھڑا کیا۔

وہ گنگ ہو کے رہ گئی۔

"میرے پاپا..."

اس کے لبوں نے ایک نامحسوس سی حرکت کی اور آنکھیں... وہ یہ موہوم سی حرکت تک کرنے سے
تھیں۔ وہ مظہر کی تصویر کے ایک ایک نقش کو اپنے اندر اتارنے میں مصروف تھیں۔

"تمہیں یاد ہیں اپنے پاپا؟"

رینا کا سوال اسے سماعتوں پہ دستک کرتا محسوس ہوا مگر جواب دینے کی ہمت تھی، نہ فرصت۔

تھے۔ سیاہ بال دلکش انداز میں کشادہ پیشانی پہ بکھرے ہوئے تھے۔ سیاہ چمکدار آنکھوں سے ذہانت جھلک رہی
تھی۔ گرے سوٹ، وائٹ شرٹ اور گرے ریڈ ٹائی میں اس کے پاپا مردانہ وجاہت کا ایک شاہکار نظر آرہے تھے۔
اس نے منزہ سے سن رکھا تھا کہ وہ بے حد تعلیم یافتہ اور قابل بھی تھے۔

"پاپا یاد آتے ہیں؟"

رینا کے سوال مسلسل جاری تھے۔ سوال تھے یا شاید گرم لوہے پہ لگتی ضربیں۔ اس نے بھیگی پلکیں تیز تیز
جھپکتے ہوئے سر ہلایا۔

"تمہارے پاس پاپا کی کوئی تصویر نہیں ہے؟"

اصغر نے اسے یک ٹک تصویر کی جانب تکتے پا کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کہ سے چھپنے کی کوشش کرتی، وہ اپنے آنسو باہر چھلکا گئی۔ رینا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"ہونی بھی کیسے؟ کسی اور کو پاپا کہتے ہوئے اس کے گھر میں رہتے ہوئے وہ اپنے اصلی پاپا کی تصویر رکھ بھی کیسے
سکتی تھی۔"

سوہا اس کے سینے سے اٹھتی دلفریب مہک سے مسحور ہوتے ہوئے منمنا کے بولی۔

"نہیں، میں انہیں پاپا نہیں کہتی۔ کبھی بھی نہیں کہا۔"

"ہیں...؟" رینا نے حیرت سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا، جہاں دبا دبا فخر
جھلک رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے کسی کارنامے پہ داد طلب کر رہی ہو اور یہ داد اصغر اور رینا نے جی بھر کے دی اپنے بھرپور
قہقہوں کی مدد سے۔

"یہ ہوئی نا بات۔" رینا کو اس کی جی داری جی جان سے بھائی۔ اصغر کے سینے میں بھی ٹھنڈ پڑتی محسوس ہوئی۔

"بہت اچھا کرتی ہو۔ پاپا تو وہی ہوتا ہے جو اصل ہوتا ہے۔ کسی اور کو پاپا کہو گی تو اوپر اللہ میاں کے پاس تمہارے
اپنے پاپا کو کتنا دکھ ہوگا۔"

یہ دونوں وہ تھے جنہوں نے اس کی اس حرکت کی حوصلہ افزائی کی تھی، ورنہ ماں سے لے کر ماموں اور ممانی
تک، سب نوید سے اس کے گریز پہ ٹوکتے ہی آرہے تھے۔

پھر دیر تک وہ ان کے سامنے بیٹھی اپنے کارنامے سناتی رہی۔

شمشاد کو چڑانے کی کوششوں سے لے کر وشمہ کو زچ کرنے تک کے۔

اور پھر نوید سے فون پہ بولے جھوٹ تک بھی۔

☼ ☼ ☼

"بس یونہی... تھوڑی سی دیر کے لیے لے کر گیا تھا۔"

کلثوم جو ساری بات من و عن اسے بتانے کا تہیہ کیے ہوئی تھی، ہکلا کے وضاحتیں دینے اور بہانے گھڑنے لگی۔
منزہ کی فق ہوتی رنگت اور ٹھنڈے پڑتے ہاتھ اسے بوکھلانے پہ مجبور کر گئے۔

"مگر تھوڑی سی دیر کے لیے بھی کیوں؟"

اس کیوں کا جواب کلثوم کے پاس تھا مگر وہ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ جواب اسے دے یا نہ دے۔

"اور آپ نے لے جانے کیسے دیا؟"

"ہم کیسے منع کر سکتے تھے۔ وہ بہرحال چچا ہے سوہا کا، اس کا حق بنتا ہے۔"

آخر کار اس نے جمیل کے پڑھائے سبق ایک ایک کر کے دہرانے شروع کیے۔

"حق... کیسا حق... یہ حق اسے اتنے سالوں بعد یاد آیا۔"

"جب بھی آیا ہو، آیا تو ہے اور یہ اچھی بات ہے۔ سوہا کی شخصیت ویسے ہی باپ کی محرومی کے باعث ادھوری
رہ گئی۔ اب کم از کم اس ایک رشتے سے اسے..."

"کوئی رشتہ نہیں اس کا میری بیٹی سے۔"

اس نے چلا کے بات کاٹی۔

"ایسا کیوں نہیں کہتے کہ آپ سے میری بیٹی کی ذمہ داری اٹھائی نہیں جاتی۔ ایک ہفتہ بھی آپ اسے سکھ سے اپنے گھر میں نہ رکھ سکے اور پھینک آئے وہاں' جہاں سے اسے نکالا گیا تھا۔"

اس کی بدتمیزی کے جواب میں کلثوم کی خجالت اور کھسیاہٹ نے بھی غصے کا روپ دھار لیا۔ وہ اس قصے کی قصوروار ٹھہرائی جا رہی تھی' جس میں وہ غیر جانب دار اور مخلص تھی۔ سو اس کا طیش میں آنا تو لازمی تھا۔

"آرام سے بات کرو منزہ! کوئی سوال کرنا ہے تو جا کے اپنے بھائی سے کرو۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ اصغر سوہا کا چچا ہے سگا چچا۔ وہ اس پہ حق جتاتے ہوئے اس سے ملنے کی اجازت لینے آیا اور ہم نے انکار نہیں کیا کیونکہ اس کے حق کو نہ ہم جھٹلا سکتے ہیں' نہ تم' نہ کوئی اور۔۔۔ ہم اسے وہاں پھینک کے نہیں آئے' وہ خود بڑی چاہ سے لے کر گیا ہے اور تیسری بات یہ کہ تمہیں یا سوہا کو وہاں سے نکالا نہیں گیا تھا۔ یاد کرو' آدھی رات کو تم نے خود فون کر کے ہمیں وہاں بلایا تھا' وہاں سے لے جانے کے لیے۔"

"اس وقت حالات کیا تھے' وہ آپ بھی جانتی ہیں بھابھی!"

"اور اس وقت حالات کیا ہیں' وہ تم بھی جانتی ہو۔ تمہارا شوہر سوہا کو رکھنے پہ تیار نہیں۔ بالفرض مان بھی جائے تو احسان دھر کے۔ عمر بھر تم اس کے زیر بار رہو گی اور پھر بھی سوہا خوش نہیں رہے گی۔ ان چاہے ہونے کا احساس اسے کھل کے پورے حق سے جینے نہیں دے گا۔ وشمہ کا وجود اس کی کم حیثیتی کو اور اجاگر کرے گا۔ تمہاری ساس کے طعنے اور جاہلانہ باتیں اسے مسخ کر دیں گی اور تمہاری گھریلو زندگی جو ڈسٹرب رہے گی' سو رہے گی جبکہ اصغر اور اس کی بیوی سچے دل سے اسے لے جانا چاہتے ہیں۔ پورے دل سے' گڑگڑا کے اسے مانگ رہے ہیں۔ سوچو' کتنی قدر کریں گے وہ اس کی۔"

"مانگ رہے ہیں؟ مگر آپ نے تو۔۔۔" وہ ہکلا کے رہ گئی۔

"ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ اصغر اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔" کلثوم نے نظر چراتے ہوئے کہا۔

"تم نے شادی کر لی ہے اس لیے اس کا خیال ہے کہ وہ گھر سوہا کے لیے اجنبی ہے' اسے اپنے باپ کے گھر میں' اپنے ددھیال میں رہنا چاہیے۔ دوسرا اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے' اس لیے بھی۔"

"نہیں' میں سوہا کو نہیں جانے دوں گی۔" وہ بری طرح سہم گئی۔

کلثوم کو اچانک اس پہ ٹوٹ کے ترس آیا۔

اس نے دل سوزی سے اس کے شانے کے گرد بازو پھیلایا۔

"ٹھنڈے دل سے سوچو منزہ! سوہا وہاں خوش رہے گی۔"

"نہیں رہے گی' میں رہ چکی ہوں وہاں۔ میں جانتی ہوں' وہاں رہنا کیسا ہے؟ سوہا نہیں رہ پائے گی۔"

"مگر اب وہ اصغر نہیں رہا۔ میں خود اسے دیکھ کے حیران رہ گئی۔ سوہا کے لیے اس کی محبت میں کوئی بناوٹ نہیں ہے۔ ریتا کو بھی اولاد نہ ہونے کا غم توڑ چکا ہے اور سوچو منزہ! وہ کوئی دھوکا دہی کیوں کرے گا۔ سوہا کو لے جانے میں اس کا کیا مفاد ہو سکتا ہے۔ سوائے اپنی زندگی کی محرومی دور کرنے کے علاوہ۔ وہ کوئی کنگلا ہوتا اور ہوتیں سوہا کے نام جائیدادیں تو پھر شک ہوتا کہ وہ کچھ ہتھیانے کے چکر میں ہے' مگر یہاں تو الٹا حساب ہے۔ وہ سب کچھ سوہا کے نام کرنے کو تیار ہے۔ اپنی بیٹی کا فائدہ سوچو۔ نوید کے گھر میں رلنے سے اصغر کے ہاں قدر کے ساتھ پلنا زیادہ بہتر ہے یا نہیں۔"

"وہ۔۔۔ آپ کے ہاں بھی تو۔۔" منزہ نے بڑی آس سے اسے دیکھتے ہوئے کہنا چاہا۔

"ہم سو دفعہ اسے رکھنے پہ تیار ہیں منی!" جمیل نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

کلثوم مشکل آسان ہو جانے پر سکون کا سانس لیتی منزہ کے پاس سے اٹھی۔ گویا اگلے مراحل جمیل کو طے کرنے کا عندیہ دیا۔

"ہمیں خوشی ہوگی اگر بہن کے کسی کام آسکیں مگر اس صورت میں کہ سوہا یہاں خوش ہو اور وہ ہمارے پاس خوش نہیں ہے۔"

"میں اسے سمجھا دوں گی۔" منزہ نے جلدی سے کہا۔

اس سے پہلے کہ جز بز ہوتا جمیل کوئی اور عذر پیش کرتا' اصغر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ پھرتی سے اٹھا اور سوہا کو لینے باہر کی جانب لپکا۔ مبادا وہ اسے اندر تک چھوڑنے نہ آجائے اور پہلے سے بھری بیٹھی منزہ کے ساتھ کوئی تلخی ہو جائے۔

گزشتہ دو دنوں کی طرح آج بھی وہ تحفے تحائف سے لدی پھندی چہکتی سرشار سی اندر داخل ہوئی۔

"ماما!" اور اندر آتے ہی ماں کو دیکھنے کے بعد اس کی خوشیاں دوچند ہو گئیں۔ دل میں کتنے دنوں سے سینت سینت کے رکھے گلے شکوے اور ناراضیاں سب غائب ہو گئے اور بھاگ کے وہ منزہ کے گلے لگ گئی۔

"آپ کب آئیں ماما؟"

"تم کہاں گئی تھیں؟"

"میں۔۔۔ میں پاپا کے گھر۔" منزہ ششدر رہ گئی۔

اس کا خیال تھا' سوہا جواب دے گی۔ چاچو کے ساتھ اور وہ کڑے انداز میں خبر لے گی کہ کون سا چاچو' کیسا چاچو۔ مگر خلاف توقع یہ جواب اسے گنگ کر گیا۔

"جہاں پہلے آپ اور پاپا رہتے تھے۔ میں نے وہاں پاپا کا کمرہ بھی دیکھا' ان کی الماری' ان کے کپڑے' ان کی ڈھیر ساری تصویریں۔"

وہ ایکسائٹڈ ہو کے بتا رہی تھی اور منزہ کی مزاحمت دم توڑ رہی تھی۔

"ماما! آپ مجھے لینے آئی ہیں۔" اچانک اس نے ایک اور غیر متوقع سوال کیا۔

"نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ دراصل۔۔۔" منزہ کے حلق میں گولے پھنسنے لگے۔

"پلیز بتائیں نا' میں کب آپ کے ساتھ جاؤں گی؟"

"سوہا! میں نے آپ کو اس دن بھی سمجھایا تھا کہ ابھی آپ کی ماما آپ کو ساتھ نہیں لے جا سکتیں۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔" کلثوم نے دخل دیا۔

"میں صرف جاننا چاہتی ہوں کہ آپ لے جائیں گی یا نہیں کیونکہ چاچو نے کہا ہے میں ان کے پاس آ کے رہوں پاپا کے گھر' چاچو اور آنٹی کے ساتھ۔"

"پھر۔۔۔ تم نے کیا کہا؟" منزہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"میں نے۔۔۔ میں نے منع کر دیا۔"

سوہا کے جواب پہ منزہ نے اطمینان کی لہریں اپنے اندر اتارتے ہوئے بھیگی آنکھوں میں فخر بھر کے جمیل اور کلثوم کو دیکھا۔

"میں نے کہہ دیا چاچو سے کہ سوری' میں تو اپنی ماما کے ساتھ رہوں گی۔ مجھے ان کے ساتھ رہنا سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے اور ماما بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتیں لیکن وہ کہتے ہیں تمہاری ماما اب تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے کر جائیں گی' کبھی بھی نہیں۔ کیا یہ سچ ہے ماما؟"

منزہ بت بنی بیٹھی تھی' اس سوال سے نظر تک نہ چرا سکی۔

دل چاہا ابھی اسی وقت اسے ہاتھ پکڑ کے ساتھ لے جائے' کیا کر لیتی شمشاد اور نوید تو ویسے بھی دل سے شرمندہ تھے' شکر کرتا سوہا کے آنے پہ کہ اب اسے منزہ کے آگے نظر جھکا کے نہیں رہنا پڑے گا مگر وہ سارے خدشے' وہ ساری باتیں جو کلثوم نے ابھی ابھی اس کے سامنے دہرائی تھیں' وہ حرف بہ حرف سچ تھیں اور پہلے سے منزہ کے دل

میں پیر پسارے پڑی تھیں۔

"تمہارا شوہر سوہا کو رکھنے پہ تیار ہوا بھی تو تمہاری ذات پہ سو احسان دھر کے۔ عمر بھر تم اس کے اس ایک [illegible] کی وجہ سے زیر بار رہو گی اور پھر بھی سوہا خوش نہیں رہے گی۔ ان چاہا ہونے کا احساس' وشمہ کا وجود [illegible] حیثیتی' شمشاد بیگم کے طعنے۔"

ایک ایک کر کے ساری باتیں گونج رہی تھیں۔

"بتائیے ماما! آپ کب مجھے ساتھ لے کر جا رہی ہیں؟" سوہا نے اسے جھنجوڑا۔

"سوہا۔۔۔ میری جان۔۔۔! آپ میرے ساتھ نہیں جا سکتیں۔" اس کے بازوؤں پہ سوہا کی ہتھیلیوں کی [illegible] کمزور ہوئی۔

"آپ کو یہیں اپنے ماموں کے پاس رہنا ہوگا۔"

سوہا نے ہاتھ اٹھا کے اپنے بازوؤں میں دبا لیے۔ اس کے چہرے پہ ایک سپاٹ تاثر تھا۔

"کیونکہ۔۔۔" منزہ نے خشک ہوتے حلق کو تر کرتے ہوئے اسے بہلانے کے لیے کوئی عذر تراشنا چاہا مگر سوہا نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔

"پھر آپ مجھے چاچو کے ساتھ جانے دیں۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ اگر نہیں تو یہاں بھی نہیں [illegible] میں چاچو کے پاس رہوں گی۔"

"یہ تمہارے ماموں کا گھر ہے سوہا!"

"وہ میرے پاپا کا گھر ہے۔"

"تمہارے پاپا اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"مگر وہاں ان کی تصویر تو ہے۔۔۔ مجھے وہاں محسوس ہوتے ہیں۔ سب ان کو یاد کرتے ہیں' ان کی باتیں کرتے ہیں۔ چاچو۔۔۔ پھوپھو۔۔۔ سب۔۔۔ اور یہاں۔۔۔ نہیں نہ یہاں۔۔۔ نہ ہی آپ کے گھر۔۔۔ کہیں بھی میں پاپا کو محسوس نہیں کر سکتی۔ ان کی تصویر اپنے کمرے میں نہیں لگا سکتی۔ یہاں میرا کوئی کمرہ ہی نہیں ہے' میں آپی کے کمرے میں سوتی ہوں۔۔۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں میرے پاپا کی تصویر نہیں لگانے دیں گی اور آپ کے گھر میں بھی کوئی مجھے [illegible] نہیں کرنے دے گا۔"

وہ آج واضح طور پر "آپ کا گھر" کہتے ہوئے اپنے اور اس کے درمیان پیدا ہوتے فاصلے کی نشاندہی کر رہی تھی۔

"میں وہیں رہوں گی۔"

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو منزہ کو غصہ آگیا۔

"کوئی نہیں ہے وہ تمہارا چاچو! ایک دھوکے باز اور برا انسان ہے وہ۔ تمہارے پاپا بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے اور تم وہاں جانے کے لیے مری جا رہی ہو۔"

"پلیز ماما! وہ پیار کرتے ہیں مجھ سے اور مجھے کوئی شوق نہیں ہے وہاں جانے کا۔ میں تو کہہ رہی ہوں' میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں مگر اس گھر میں نہیں۔ آپ اور میں اکیلے رہیں گے' کسی اور گھر میں۔"

"بے وقوف مت بنو سوہا! ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اس سے پہلے کہ منزہ کچھ کہتی' جمیل نے گھر کا۔ اسے ڈر سا لگا کہ منزہ کمزور نہ پڑ جائے اور بیٹی کی اس معصوم بچکانہ ضد پہ ہتھیار نہ ڈال دے۔

"منزہ! یہ تو بچی ہے مگر کہیں تم اس کے کہے میں آ کے مشکل سے بستا گھر اجاڑ نہ دینا۔ تم نے چند سال بیوگی کے گزارے ہیں' تم اس تجربے سے گزر چکی ہو کہ مرد کے بغیر جوان عورت کا تنہا رہنا کتنا دشوار ہے اور باپ یا کسی اور سرپرست کے بغیر بیٹی کی پرورش کرنا اس سے بھی بڑھ کے مشکل۔"

کلثوم نے بھی اسے سمجھانا چاہا۔

منزہ خاموشی سے سوہا کو دیکھے گئی جو سینے پہ بازو باندھے کھڑی بڑی الگ' بڑی غیر غیر سی لگ رہی تھی۔

"تو ٹھیک ہے۔۔۔ تمہارے بعد۔۔۔ تمہاری یہ نشانی بھی کھو دی میں نے۔"

منزہ نے ہار مان لی۔ مقدر سے ہار۔۔۔ اولاد سے ہار۔۔۔ شوہر سے ہار۔۔۔ حالات سے ہار۔۔۔

☼ ☼ ☼

"خیر تو ہے۔۔۔" شمشاد بیگم نے اس کے چہرے پہ رقم درد کو دیکھ کے سوال کیا۔

اس استفسار میں ہمدردی کا نام و نشان نہ تھا۔ تشویش دور دور تک نہ تھی۔ ایک تضحیک اور تحقیر بھرا احساس فتح مندی جھلک رہا تھا۔

"۔۔۔ آئی ہے' اتھرو نہیں رک رہے تیرے۔۔۔ کوئی مرگ ہو گئی ہے؟"

حالانکہ نوید مراد سے وہ ساری صورت حال جان چکی تھی پھر بھی کچوکے لگانے کا جو الگ ہی سواد ہوتا ہے' اس سے بھی وہ محروم تو نہیں رہ سکتی تھی آخر۔

"کس کی فوتگی ہوئی ہے؟"

منزہ کی خاموشی اسے اور بھی اکسائے دے رہی تھی۔

"میری بیٹی کی۔" بڑے ہی ٹھنڈے لہجے میں' بنا اک آنسو ٹپکائے منزہ نے سفاکی سے کہا۔

شمشاد جیسی پتھر دل عورت بھی ایک ثانیے کو اس فقرے میں چھپی موت کی سی خنکی محسوس کر کے جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"اگر موت کا مطلب کسی کو کھو دینا ہی ہے تو آج میری ممتا کی موت ہوئی ہے۔ گود اجڑی ہے میری۔"

اس نے بین ڈالنے کے انداز میں دہائی دی۔ شمشاد کی نوکیلی باتوں نے جیسے رات بھر کے باندھے بند میں دراڑیں ڈال دی تھیں اور وہ بھربھری ریت کی طرح بہہ گیا تھا۔

"دفع دور۔۔۔ نیستی۔۔۔ منحوس۔۔۔"

خود پہ قابو پاتے ہوئے شمشاد نے بے حد ناگواری سے اس کا رونا دھونا نحوست قرار دے دیا اور جانے کے لیے مڑی۔

"میرے گھر پہ پھٹکار ڈال کے رکھ دی ہے نیستی صورت نے۔ جب دیکھو بین ڈال رہی ہوتی ہے کچھلوں کے۔" کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے اندر گھستی وشمہ کو گھورا۔

"کی اے نی۔۔۔؟ اندر کی اے۔۔۔؟ چل۔"

بے حد غصے سے اس کا بازو پکڑ کے اس نے وشمہ کو اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہا۔

وشمہ نے ایک نظر اندر ڈالی' جہاں ہچکیاں لے لے کر روتی منزہ بے حال ہوئے جا رہی تھی اور پھر جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

"کمینی۔۔۔" شمشاد نے بلبلا کے اسے کوسا مگر اگلے ہی پل وہ اندر تھی۔

"ماما۔۔۔!" وشمہ نے منزہ کے ہونٹوں سے پانی کا گلاس لگانا چاہا۔

بھرتی پلکوں کی اوٹ سے دیکھنے پہ منزہ کو وہ سوہا کا ہیولا لگی۔

"سوہا۔۔۔ میری بچی۔۔۔؟"

اس نے اسے زور سے سینے سے بھینچ لیا۔

"میں سوہا کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔ میں سوہا کو۔۔۔ سوہا میرے ساتھ رہے گی۔۔۔ سوہا۔۔۔!"

وہ بلک بلک کے روئے جا رہی تھی اور وشمہ کا ماتھا' اس کے گال' اس کے بال' اس کے ہاتھ چومے جا رہی تھی۔ وہ جہاں جہاں سے اسے آنسوؤں میں بھیگے بوسے دے رہی تھی' وہاں وہاں سے وشمہ اس کے لیے سوہا بنتی جا رہی تھی۔

"ماما... ماما... پلیز بس کریں۔"

وشمہ بھی رو دی، بلاوجہ، بس یونہی۔

"پلیز نہ روئیں۔"

وہ سچ مچ اس کے آنسو دیکھ کے ڈر گئی تھی۔ اس نے اپنی آٹھ ساڑھے آٹھ سالہ زندگی میں کبھی کسی کو [illegible] روتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ اپنی ننھی منی ہتھیلیوں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔

پلکوں سے دھند چھٹی، منظر واضح ہوئے تو منیزہ نے دیکھا، وہ سوہا نہیں وشمہ تھی، وشمہ۔

سوہا کو تو وہ کہیں پیچھے کسی اور موڑ پہ کھو آئی تھی۔

جمیل کے ہاں اس نے خود اسے چھوڑا تھا، دل تب بھی بے تحاشا دکھا تھا۔ کئی راتیں تکیے بھگوتے [illegible] گزاری تھیں۔ کتنے ہی پہر ایک نوالہ تک کھائے بغیر ٹیبل سے تب بھی اٹھتی رہی تھی، کروٹیں تب بھی [illegible] ساری بدلی تھیں مگر دل کے لٹنے، تہی داماں ہونے کا یہ جان لیوا احساس نہیں ہوا تھا۔

دل کو ایک امید تھی، وہ جب چاہے سوہا کو واپس لا سکتی ہے۔ کبھی بھی حالات اس کے حق میں ہو سکتے ہیں [illegible] خود غرضی اور سفاکی سے کام لیتے ہوئے اس نے یہ تک سوچا تھا۔

"اماں سارے فساد کی جڑ ہے، نوید دل کے برے نہیں۔ لاپروا اور کانوں کے کچے ضرور ہیں۔ اگر اماں نہ [illegible] تو... تو پھر میری سوہا کو یہاں کیا تکلیف ہوگی بھلا۔ باپ کی شفقت نہ ملے، نہ سہی۔ انسان ہر چیز تو نصیب میں [illegible] لکھوا کے لاتا مگر وہ میری نظروں کے سامنے تو ہوگی۔ نوید برا بھلا خیال رکھ ہی لیں گے اس کا۔ بس یہ اماں [illegible] نکل جائے۔ اس کے ہوتے تو میں کبھی نہ لاؤں سوہا کو۔ ایسے حالات میں اسے رکھنے کا مطلب ہے اس کی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ بھلا زیادہ سے زیادہ کتنا جی لے گی، دھرتی کا بوجھ۔ اللہ کو مجھ پہ ترس آیا تو میرے [illegible] پھریں گے۔ وہ جلد اسے اٹھا لے گا اور میں..."

مگر اصغر کے پاس جانے سے اس نے گویا یہ فرض کر لیا کہ وہ سوہا کو ہار چکی ہے۔ اب اس کا دل ہر امید، ہر [illegible] خواب سے خالی تھا اور اس خالی دل میں آنسوؤں کا تالاب بھرتا جا رہا تھا۔

"پانی پئیں ماما!"

کسی نہ کسی طرح وشمہ اسے دو گھونٹ پانی پلانے میں کامیاب ہو گئی۔

"میں بابا سے کہوں گی، وہ آپی کو لے آئیں گے۔ آپ مت روئیں پلیز۔"

وشمہ نے اس کے ماتھے پہ پیار کرتے ہوئے بڑے سیانے پن سے دلاسا دیا۔

ٹھنڈے پانی کے دو گھونٹ اور تپتی بلتی پیشانی پہ میٹھے لبوں کا بوسہ۔ اسے شانت کرنے لگا۔

اس نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا اور اس کی ہتھیلیاں لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا! کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔ ناراض ہو گئی ہے مجھ سے۔"

"آپ سے مگر آپ تو کچھ نہیں کہتیں۔ ڈانٹتی بھی نہیں۔"

"تم تو ناراض نہیں ہو گی مجھ سے۔"

"نہیں ماما! کبھی بھی نہیں۔" وہ ایک بار پھر اس سے لپٹ گئی۔

"میں آپ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتی۔"

"چاہے کوئی کچھ بھی کہے، دادی... پھوپھو؟"

وہ پتہ نہیں کیا سننا چاہ رہی تھی، شاید سوہا کی جانب سے ملی نااعتباری پہ وہ وشمہ کے اعتبار کا پھاہا رکھنا چاہ رہی تھی۔

"ہاں، کچھ بھی... میں آپ کو سب سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔"

✲ ✲ ✲

"تمہیں اپنا روم پسند آیا؟"

ریتا نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

وہ مبہوت سی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"اور کچھ چاہیے تو بتا دینا۔ فوراً آ جائے گا۔"

"اور کچھ؟"

اس نے اِدھر سے اُدھر، یہاں سے وہاں، اتنے بڑے سارے کمرے میں نظر دوڑاتے ہوئے سوچا۔

وائٹ اور پنک کے کھلے کھلے شیڈز سارے کمرے میں پھیلے تھے۔ آنکھیں جیسے گلابی خمار سے بوجھل ہوئے [illegible] نیٹ اور ویلوٹ کے بھاری بندھے ہوئے تھے اور نیٹ سے باہر کی روشنیاں چھن چھن [illegible] آتی تھیں۔ سفید ماربل کے جھاگ سے فرش پہ راؤنڈ شیپ کا بے بی پنک دبیز قالین بچھا تھا۔ اطراف میں چار مختلف اور منفرد ڈیزائنوں والی جدید چیئرز۔ ایک جانب رائٹنگ ٹیبل اور بک شیلف جس پہ خوبصورت ٹیبل لیمپ، کمپیوٹر اور کرسٹل کا پنسل اسٹینڈ رکھا تھا۔ رائٹنگ ٹیبل کے اوپر ہی ایک بڑا خوبصورت فوٹو فریم تھا جس کے ایک جانب مظہر کی اور دوسری جانب سوہا کی تصویر تھی۔

سوہا کی ہی ایک اور خوبصورت تصویر انلارج کرا کے بیڈ کے اوپر آویزاں کی گئی تھی۔ بیڈ کے ساتھ بنی شیشے کے سلائیڈنگ والی الماری بے شمار ڈولز اور اسٹفڈ ٹوائز سے بھری ہوئی تھی۔

بائیں جانب کی دیوار کے ساتھ ٹی وی رکھا تھا، اسی کے ساتھ بنا دروازہ ڈریسنگ روم اور واش روم کی جانب کھلتا تھا، ان میں بھی آسائش اور آرائش دونوں عروج پہ تھے۔

اتنی بے شمار چیزوں کی بھرمار ہونے کے باوجود کمرہ تنگ تنگ اور بھرا بھرا نہیں لگتا تھا کیونکہ ایک تو کمرہ وسیع بہت تھا، دوسرے بڑے طریقے سے تمام چیزیں سیٹ کی گئی تھیں۔

اس کی نظروں میں ستائش دیکھ کے ریتا کے اندر سکون اترا۔

"کل اصغر تمہارے ساتھ جا کے شہر کے سب سے بڑے اور اونچے اسکول میں تمہارا ایڈمیشن کرا دے گا۔"

"نہیں، میں اسکول چینج نہیں کروں گی۔"

"یہ کوئی خاص اسکول نہیں ہے۔ میں تمہیں جس اسکول میں بھیجوں گی، وہ..."

"نہیں آنٹی! یہاں میری فرینڈز ہیں۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ میں کوئی کام تمہاری مرضی کے خلاف نہیں کرنا چاہتی۔"

ریتا نے اس کے گال تھپتھپائے۔

"تمہارے لیے ٹیوٹر بھی رکھوا دوں گی۔ ایک ڈرائیور الگ سے رکھ دیا ہے جو صرف تمہیں اسکول سے لانے لے جانے کے لیے مخصوص ہوگا۔ ایک گاڑی بھی صرف اور صرف تمہارے لیے ہر وقت گھر پہ کھڑی رہا کرے گی اور کے۔"

"صرف کھڑی رہا کرے گی۔"

اس کے جواب میں ریتا نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"نہیں، میری جان! جہاں تم کہو گی وہاں چل بھی پڑا کرے گی۔ مگر صرف اور صرف تمہارے کہنے پہ۔"

"اگر میں اس گاڑی کو کہوں کہ وہ میری ماما کے گھر لے چلے مجھے، تو وہ جائے گی۔"

سوہا نے بڑا گھما کے سوال کیا تھا اور اتنا اچانک کہ پل بھر کے لیے ریتا کے چمک دار لبوں پہ کھلتی مسکراہٹ غائب سی ہو گئی۔

"بڑی تیز چیز ہے، اصغر نے میرے لیے اولاد بھی میری ٹکر کی ڈھونڈی ہے۔ مزا آئے گا۔"

وہ خود ہی اپنی سوچ سے محظوظ ہوتے ہوئے دوبارہ مسکرانے لگی۔

”گاڑی بے چاری تو چلی جائے گی۔ وہ تو آپ کے حکم کی غلام ہے۔ نہ اس پہ کوئی پابندی ہے نہ تم پہ سوائے تمہاری ماما کی جانب سے پابندی ہے۔“

”میرے وہاں آنے پہ؟“

اس کے سوال میں اتنی بے یقینی تھی کہ ربنا کو لگا اگر اس نے ہاں میں جواب دے بھی دیا تو وہ یقین نہیں کرے گی‘ اس لیے یہ رسک لینے سے اس نے گریز کیا۔

”نہیں تمہارے آنے پہ تو نہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ ہمیں پسند نہیں کرتیں۔ نہ ہم سے کوئی رابطہ رکھنا چاہتی ہیں۔ کہیں انہیں ایسا نہ لگے تمہارے بہانے ہم اپنی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے انہیں ڈر ہو کہ تمہارے آتے آتے کسی دن ہم خود نہ آجائیں اور اس طرح ان کے شوہر ضرور کوئی پابندی لگا سکتے ہیں یا انہوں نے کبھی لگائی تو اعتراض ضرور کریں گے اور بھئی ہم سے تو برداشت نہیں ہوگا‘ کوئی ہماری بیٹی کو دیکھ کے ناک بھوں چڑھائے۔“

”کوئی بھی۔“

”ہاں کوئی بھی‘ چاہے وہ میری اپنی ماں ہی کیوں نہ ہو۔“ یہ اصغر کی خاص ہدایت تھی اسے کہ کسی بھی طرح کچھ بھی کر کے سوہا کو یہ یقین دلانا ہے کہ ہم دونوں سے بڑھ کے اس کا کوئی خیر خواہ نہیں۔ اس کی ہر ضد مانی جائے اس کی ہر بات کو اہمیت دینا ہے۔

اور وہ یہی کچھ کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
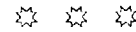
”یہ تو اچھا نہیں ہوا۔“

شوکت جہاں نے پروین سے سارا قصہ سننے کے بعد تبصرہ کیا۔

”نوید ماشاءاللہ بہت سمجھ دار بچہ ہے‘ اس سے ایسی امید نہیں تھی۔“

”بھائی جان بھی کیا کرتے‘ ذرا سی لڑکی نے سارے گھر کا سکون درہم برہم کر رکھا تھا۔ اماں سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا‘ ناک میں دم کیے رکھتی تھی‘ وہ پہلے ہی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں‘ اس کے آنے کے بعد سے تو طبیعت سنبھلتی ہی نہیں تھی‘ اپنی اولاد ہو..... نواسی‘ پوتی..... تو انسان ڈانٹ ڈپٹ بھی کر لے مگر وہ تو بہو کی اولاد تھی۔ کچھ کہہ کر برا ہی بننا تھا انہوں نے۔ وشمہ کو بھی بہت ستاتی تھی۔ حالانکہ وشمہ سے تین چار سال بڑی تھی عمر میں مگر اس کے مقابلے میں ہماری وشمہ لاکھ گنا سمجھ دار بچی ہے۔ یہ تو بس.....“

پروین نے وہی کچھ بتایا‘ جو شمشاد بیگم ہمیشہ اسے بتاتی تھیں۔

”پھر بھی اس مسئلے کا حل کسی اور طریقے سے بھی نکالا جا سکتا تھا۔ نوید ذرا مصلحت پسندی سے کام لیتا تو شاید.....“

”انہوں نے بہت کوشش کی تھی بلکہ وہ تو بعد میں بھی منتیں کرتے رہے کہ میں نے جو کہا‘ وقتی غصے میں آ کے کہا۔ تم بے شک بچی کو واپس لے آؤ۔ میں سب بھول کے دوبارہ اس کی ذمہ داری لینے پہ تیار ہوں لیکن وہ تو شاید خود ناک تک بھری بیٹھی تھیں یا پھر اس مسئلے کو سنگین بنانا چاہتی تھیں جو اسے ددھیال پہنچا دیا۔“

”ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ٹھیک بھی ہے۔ ماموں ہو‘ چاہے سوتیلا باپ‘ ان کی نسبت تو اس کا ددھیال میں رہنا ہی بہتر ہے۔ ان کا خون ہے وہ..... ان سے زیادہ کون سگا ہو سکتا ہے۔“

ساس کے اس بیان پہ پروین کے لب تو سلے رہے‘ البتہ بولتی نظروں نے ان کے ساتھ جڑ کے بیٹھے پہلی کا پہ سے کھیلتے وصی پہ بھرپور تبصرہ کیا۔

”پھر اپنے نواسے کو اس کے ددھیال بھیجنے کے بجائے ہمارے سروں پہ کیوں لا دیا۔“

وہ سوچ کے رہ گئی۔

”چلو اب بس بھی کرو۔ جب دیکھو کھیل ہی کھیل‘ کبھی ٹک کے پڑھائی بھی کر لیا کرو۔“

شوکت جہاں نے اس کے ہاتھوں سے پہلی کا پیڑ لیتے ہوئے اٹھایا۔

”جاؤ‘ جا کے بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کے پڑھو۔“

”ان کے سر بہت ڈانٹتے ہیں۔“

”تو بیٹا! آپ انہیں تنگ نہ کیا کرو نا‘ وہ بہت سخت ٹیچر ہیں۔ آپ جا کے شرارتیں کرتے ہیں‘ اس لیے وہ ڈانٹتے ہیں۔“

پروین نے رسان سے سمجھایا۔

”چلیں آئیں‘ میں آپ کو ہوم ورک کراتی ہوں۔“

”پروین! اسے بھی اس ٹیوٹر کے پاس بٹھا دو۔“

شوکت جہاں نے نئی فرمائش کی۔

”میں دیکھ رہی ہوں تمہارے قابو کم آتا ہے یہ۔ پڑھائی میں دلچسپی بھی نہیں لیتا۔“

”مگر اماں جان! ابھی یہ کلاس فورتھ میں ہی تو ہے۔ میں بہت اچھی طرح پڑھا سکتی ہوں اسے۔“

”پھر اس کا رزلٹ اچھا کیوں نہیں آیا۔“

”اب یہ تو ظاہر ہے اماں! بچے کا اپنا ذہن بھی تو ہوتا ہے۔“

”ذہن تو ماشاءاللہ تیز ہے اس کا۔ بس توجہ کی ضرورت ہے۔ جب تک پریپ اور پہلی دوسری میں تھا‘ تم ٹھیک ٹھاک پڑھاتی رہی ہو لیکن اب ظاہر ہے کہ گھرداری کے ساتھ ساتھ اس کی پڑھائی پہ آخر کتنی توجہ دے سکتی ہو‘ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اس کی ٹیوشن بھی رکھوا دو۔“

”جی..... بہت اچھا۔“

اس نے مرے مرے انداز میں کہا۔

ابھی کل رات ہی تو سراج دین سے اس کی ٹھیک ٹھاک قسم کی بحث ہوئی تھی اس مسئلے پر۔

تینوں بچوں کی فیس کل ملا کے چھ ساڑھے چھ ہزار روپے ماہانہ تھی پھر چوبیس سو روپے وین کے۔ ایسے میں سراج دین کو ٹیوشن کا خرچا اضافہ لگتا تھا جبکہ پروین کا خیال تھا کہ فی زمانہ ٹیوشن کے بغیر اچھی پوزیشن لانا محال ہے اور وہ بھی اس مرحلے پہ جب بڑا والا او لیول کر رہا ہو۔ پروین کو اس کا نصاب کیا خاک سمجھ آتا اور سراج کو فرصت کہاں تھی۔ ہوتی بھی تو وہ بھی او لیول کی کتابیں بیٹے کو پڑھانے سے قاصر ہوتا۔

سراج دین نے اس کے لیے دو دو ہزار ماہوار پہ ٹیوٹر لگوانے پہ اعتراض پھر بھی نہیں کیا تھا مگر وہ چھوٹے والے کے لیے اب بھی یہی چاہتا تھا کہ پروین اسے خود پڑھائے۔

اور پروین ہی جانتی تھی کہ اسے پڑھانا کتنا مشکل کام ہے۔ وہ پڑھائی سے ہر بہانے جان چراتا تھا۔ صرف ٹیوٹر کے قابو آجاتا تھا۔

مگر سراج یہ عذر ماننے پہ تیار نہ تھا۔ ایسے میں اماں جان کا یہ نیا مطالبہ۔

وہ جانتی تھی سراج انہیں منع نہیں کر سکے گا۔ بڑبڑاتے‘ کڑکڑ کرتے وہ اسے بھی ٹیوٹر کے پاس بٹھا ہی دے گا اس کے بھی دو ہزار مہینے کے مگر سارا نزلہ گرے گا پروین کے سر کہ اس نے چھیڑ ڈالی ہے۔ نہ وہ حسن اور حسان کے لیے ٹیوشن کا ٹنٹا پالتی‘ نہ اماں کو وصی کے لیے ہڑک جاگتی۔

”کیا مصیبت ہے‘ اپنی ہی اولاد کے لیے کچھ کرتے ہوئے بھی سو سو طرح کا دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں وہ بھی نہ مطالبہ کر دے۔ کہیں اس کے دل میں بھی خواہش نہ پیدا ہو۔ کتنی بار میں نے خود اپنا بھی دل مارا اور بچوں کو بھی سمجھایا کہ تین تین میں لے نہیں سکتی اور ایک لے کر دوں گی تو وصی کا دل برا ہوگا۔ اس کا دل برا ہونے سے بچانے کے لیے اپنے بچوں کا دل چاہے برا ہوتا رہے۔“

"یہ تمہارا تحفہ۔"
صبح سے کبھی بھائیوں، کبھی بھابھیوں کے فون آ رہے تھے اور ہر بار مبارک باد وصول کرتے ہوئے منزہ کو عجیب سا احساس ہوتا۔
"کس چیز کی مبارک باد؟"
"ایسا کیا خاص ہوا تھا آج کے دن؟"
"اور اگر ہوا بھی تھا تو یہ دن ہر سال آتا ہے۔ ہر سال اسے نئے سرے سے یاد کرنے اور مبارک باد دینے کا کیا تک ہے بھلا۔"
مگر اب شام ڈھلے اس کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھے سامنے کھڑے اس شخص نے جب اس کی کلائی میں طلائی بریسلٹ پہناتے ہوئے یہ تین لفظی فقرہ کہا تو اسے احساس ہوا کہ کوئی خاص بات ہے آج کے دن میں۔
"میرے لیے؟" اس نے اس بے یقینی سے پوچھا کہ تحفہ دینے والا بھی شرمندہ ہو گیا اور اس کی شرمندگی منزہ کو شرمندہ کر گئی۔
"میرا مطلب تھا کہ...." اس نے وضاحت پیش کرنا چاہی مگر نوید نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔
"ٹھیک ہو تم بھی.... واقعی یہ دن پچھلے پندرہ سالوں سے آ رہا ہے مگر تحفہ دینے کا خیال مجھے پہلی بار آیا ہے۔ تمہاری حیرت بجا ہے۔"
نوید کے کہنے پہ اس نے سر جھکا لیا اور کلائی میں جھولتے دلکش ڈیزائن والے بریسلٹ کو تکنے لگی۔
"سچ پوچھو تو اس کا خیال اب بھی مجھے نہیں آیا۔"
اس کے جھجکتے ہوئے اعتراف پہ منزہ نے سر اٹھایا اور پورے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر وثوق بھرے انداز میں کہا۔
"جانتی ہوں، میری بیٹی نے یہ خیال دلایا ہو گا۔"
وہ ہر بار اتنے حق سے دشمہ کو "میری بیٹی" کہا کرتی تھی کہ کئی بار نوید مراد کا اپنا استحقاق ڈگمگا سا جاتا تھا۔
"ہاں۔" وہ کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
"اور یہ پسند بھی اسی کی ہو گی۔"
"وہ تمہاری پسند ناپسند زیادہ اچھی طرح جانتی ہے۔"
"آپ بھی جان سکتے تھے نوید! اگر کوشش کرتے۔" برسوں سے دل میں دبا گلہ اب بھی دل میں ہی چٹکی لے کر رہ گیا۔
"حالانکہ مجھے یہ بریسلٹ بھی تحفے میں دینے کے لیے جچ نہ رہا تھا۔"
اس بار منزہ نے صرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے پہ اکتفا کیا۔
"پندرہ سال کی رفاقت کا صلہ نہ تو چند تولے کے زیور سے چکایا جا سکتا ہے، نہ ہی چکانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بار تاعمر اپنے کاندھوں پہ اٹھائے رکھنا چاہتا ہوں منزہ!" اس کی آواز بوجھل ہو گئی اور منزہ کی سانسیں سبک۔
عرصے بعد نوید نے اس کی قربانیوں کا نہ صرف اعتراف کیا تھا بلکہ سراہا بھی تھا۔ اسے اپنا وجود ہلکا پھلکا سا محسوس ہونے لگا۔
"تم نے میرے لیے.... میری بیٹی کے لیے اور اس گھر کے لیے، جو کچھ کیا ہے وہ...."
"پلیز نوید۔" منزہ نے روک دیا۔
"آپ کچھ بھی کہیے مگر دشمہ کو میرے سامنے "میری بیٹی" کہہ کر نہ پکارا کریں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"
وہ ہولے سے ہنس دیا۔
"اچھا بھئی "تمہاری بیٹی" اب خوش؟" اس نے منزہ کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔

میری بیٹی.... تمہاری بیٹی.... کاش ہمارے درمیان کوئی ایسا ہوتا جسے ہم "ہمارا" یا "ہماری" کہہ پاتے۔
سالوں میں پہلی بار یہ خواہش اس کے دل میں جاگی اور ایسے اچانک کہ وہ خود حیران رہ گئی۔
بھلا اب یہ خواہش کرنے کا کون سا موقع ہے۔ پندرہ سالوں بعد.... جوان ہوتی بیٹیوں کے ہوتے ہوئے....
اس نے محجوب ہوتے ہوئے خود کو لتاڑا۔
اور نوید مراد دلچسپی سے منزہ کے چہرے پہ اترتے رنگ دیکھتا رہا۔
یہ عورت جو پندرہ سال پہلے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔
ایک بڑے ہی مضبوط اور اٹوٹ بندھن میں بندھ کر۔
مگر اس رشتے میں نہ چاہ تھی نہ طلب۔
ایک ضرورت کا رشتہ تھا.... ضرورت.... جو دونوں جانب ایک سی تھی۔ کچھ لو اور کچھ دو کے اس رشتے میں اس نے مرد ہونے کے ناتے بس لیا ہی لیا تھا۔ منزہ جس ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس رشتے میں بندھی تھی، وہ ضرورت عرصہ پہلے دم توڑ چکی تھی۔
اور اس عورت نے خالی ہاتھ، خالی گود ہونے کے باوجود جس اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی سے اس کی ضرورتیں پوری کی تھیں، وہ تمام ضرورتیں جو اسے یہاں تک کھینچ لائی تھیں، وہ ان گزرے سالوں میں اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔
لیکن محبت کے بجائے وہ ایک عجیب سا ممنونیت بھرا احساس تھا جو اس کے دل پہ غالب رہا۔ وہ اسے ہمیشہ بہت اور بہت اونچی لگی اور محبت تو ان سے کی جاتی ہے جو دل کے قریب ہوں۔ اتنی اونچی مسند پہ بٹھا دینے کے بعد تو صرف کسی کی تعظیم کی جا سکتی ہے اور اس نے منزہ کے لیے ہمیشہ اسی جذبے کو محسوس کیا۔ یہ محبت کی ہری کونپل تو نئی پھوٹی تھی دل میں۔ عمر کے پچپن ویں برس میں۔ شادی کے پندرہ سال بعد اسے اپنی چھیالیس سالہ بیوی سے یکایک بڑی طوفانی سی محبت ہو چلی تھی۔
بڑی نوخیز.... بڑی بھرپور.... بڑی بے کل محبت۔
اور نو عمری کی محبت کی طرح وہ اب تک اس کا اظہار کرنے کی ہمت نہ پا رہا تھا خود میں۔
"کیا دیکھ رہے ہیں؟"
"تمہیں۔" اس کے سوال پہ نوید نے برجستہ کہا۔ "اور کیا ہے یہاں دیکھنے کے قابل۔"
وہ نظریں چرا کے رہ گئی۔ عادی نہیں تھی اس کی جانب سے ایسے فقرے سننے کی مگر لگتا تھا اب عادی ہونا پڑے گا۔ پچھلے کئی روز سے وہ ایسی ہی شوخیوں پہ آمادہ نظر آ رہا تھا۔
"اتنے سال گزر گئے تم ذرا بھی نہیں بدلیں۔"
"نجانے یہ تعریف تھی یا کچھ اور...." وہ سوچنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"یہ اوپر والے کو کیا ہوا؟"
وصی گھر میں داخل ہوتے ہی منہ اونچا کر کے حیرت سے چلایا۔
"بچے.... اوپر والے کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ شاید تمہیں پتہ نہیں، اس لیے اچانک رسید ہونے پر ہڑبڑا اٹھے ہو۔"
حسن نے کمپیوٹر سے ذرا کی ذرا توجہ ہٹا کے کہا۔
"میں اوپر والے کی نہیں حسن بھائی! ان اوپر والوں کی بات کر رہا ہوں۔"
اس نے نظریں اور انگلی دونوں اوپر کی جانب اشارہ کر کے جواب دیا۔
"میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ یہ اوپر والوں کو کیا ہوا ہے۔ بریانی کی خوشبو، وہ بھی اوپر والے کچن سے۔"
وہ واقعی حیرت کی شدت سے بے ہوش ہی ہونے والا تھا۔

"السلام علیکم۔ امی کیا پکا ہے؟"

حسان نے اندر داخل ہوتے ہی اپنا روزانہ کا سوال کیا۔

"امی گھر پہ نہیں ہیں۔ بھنڈی گوشت اور آلو کی بیسن والی ٹکیاں ہیں۔ تل دوں؟"

پروین کی غیر موجودگی میں شروع سے ہی حسن نہ صرف بڑے بیٹے اور بڑے بھیا کی ذمہ داریاں نبھاتا آیا تھا بلکہ کبھی کبھی بوقت ضرورت بیٹی اور بہن کی کمی بھی بغیر کسی شرم یا جھجک کے پوری کردیا کرتا تھا۔

"ندا۔۔۔ آپی۔۔۔" وصی نے گردن اونچی کرکے ندا کو آواز لگائی۔ "بریانی پک رہی ہے کیا؟"

"ہاں۔۔۔ بس دم پہ ہے۔"

اس کی جوابی چیخ سنائی دی۔

"حسن بھائی! میں آج کھانا اوپر کھاؤں گا۔ بریانی پکی ہے۔" وہ ایسے بولا جیسے کسی ناقابل یقین کرشمے کا ذکر ہو۔

"کبھی بریانی کھائی نہیں کیا؟" حسن کو اس کا ندیدا پن کھٹکا۔

"ہفتے میں دو بار تو پک ہی جاتی ہے' ابھی پرسوں دو ٹائم ٹھونسی ہے۔"

"ہاں مگر اس بریانی کی بات ہی اور ہے۔ یہ اوپر والوں کی بریانی ہے۔ روز روز کھانے کو نہیں ملتی اور نہ ہر کسی کو کھانے کو ملتی ہے۔"

وہ تیزی سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چڑھا۔

"تمہارے لیے لاؤں کھانا یا تمہیں بھی اوپر سے امید بندھی ہے۔" اب کے اس نے اکتائے ہوئے انداز میں حسان سے پوچھا جو مگرمچھ کی طرح صوفے پہ الٹا ڈھیر تھا۔

"کون اوپر چڑھے۔" وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

"نیچے ایک آدھ پلیٹ بھیج دی تو الگ بات۔"

"ہاں' بھیجتے ہیں اچھی طرح۔ وہ جو دادی جان کے لیے ایک پلیٹ آجاتی ہے نیچے' آج وہ بھی وصی کے وہاں جاکے تناول فرمانے پہ نہیں آنے والی۔"

اس نے "تناول فرمانے" پہ خاصا زور دیا اور بڑی مہارت کے ساتھ کڑاہی میں گرم ہوتے تیل میں بیسن کا چھینٹ ڈال کر اندازہ کررہا تھا کہ آلو کی ٹکیاں ڈالے یا نہیں۔ پروین جاتے ہوئے روٹیاں پکا کے ہاٹ پاٹ میں رکھ گئی تھیں۔

"امی گئی کہاں ہیں؟"

"دادی جان کے ساتھ کسی جاننے والے کے ہاں' شاید میلاد شریف ہے۔"

اب وہ سلیقے سے ٹرے میں چٹنی اور اچار کی پیالیاں سیٹ کررہا تھا۔

"جلدی سے کھاؤ اور اکیڈمی سدھارو۔ یہیں کھا پی کے لڑھک مت جانا۔ پیٹ بھرنے کے بعد بڑی نیند آتی ہے تم پہ۔"

"آپ کے ہوتے کوئی مر نہیں سکتا' سوئے گا خاک۔"

وہ بھوک سے بے چین کچن میں چلا آیا اور دیگچی میں چمچہ ہلا کے بھنڈیوں پہ ستم ڈھانے لگا۔

"تیرا بیڑہ غرق موٹے۔۔۔" حسن نے اسے دھکا دے کر پرے کیا۔

"اتنی محنت سے امی کھڑی کھڑی بھنڈیاں پکا کے گئی تھیں اور تو لگا ہے ملیدا کرنے۔ تمہیں پتہ تو ہے ابو اس معاملے میں کتنے سخت ہیں۔ انہوں نے سبزی کا یہ حشر دیکھ لیا تو۔۔۔"

"اف۔۔۔" وہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کچن سے بھاگا۔

اوپر وصی بے چینی سے بریانی کے دم کھلنے کا انتظار کررہا تھا۔

ارے۔۔۔ کہیں میرا دم نہ نکل جائے۔۔۔ لے بھی آؤ۔۔۔ صبح ناشتے میں بھی بس ڈیڑھ پراٹھا کھایا تھا اور وہ بھی انڈے کے ساتھ۔ قسم سے ممانی! ایک عدد انڈا سامنے دیکھ کے مجھے یہی لگا جیسے میں آپ کے گھر ناشتہ کرنے آیا ہوں۔ میں تو ایک پراٹھا دو انڈوں کے ساتھ بمشکل ختم کرتا ہوں۔ دو پراٹھوں کے ساتھ کم از کم تین چار انڈے' ایک پیالہ دہی اور ایک پلیٹ سالن تو ہو مگر میری قسمت۔ رات کو چھوٹی ممانی سالن فریج میں رکھنا بھول گئیں' صبح تک خراب ہوگیا اور تو اور ماموں جو ناشتے کا سامان لائے وہ بھی باہر ڈائننگ ٹیبل پہ پڑا رہ گیا۔ گرمی میں آدھے انڈے بھی خراب نکل آئے۔ آپ کے ہونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ممانی! بندہ ضرورت کے وقت آس پڑوس سے ہی مانگ لیتا ہے مگر مجھے پتہ ہے کہ آپ رات کو بھی سالن ناپ کے بناتی ہیں۔ آخری نوالہ تک ماپ کے اور انڈے بھی گن کے آتے ہیں۔" اس کی زبان فراٹے بھر رہی تھی اور رخشندہ صبر کے گھونٹ بھر رہی تھیں۔

"ہمارے ہاں انڈے نہیں آتے۔" انہوں نے روکھے لہجے میں کہا۔ "وہی' دودھ' لسی وغیرہ کے ساتھ ہم کھالیتے ہیں یا پھر جیم بریڈ وغیرہ۔ میرے بچوں سے گرم چیزیں برداشت نہیں ہوتیں۔"

"اور مجھ سے بھوک۔" وہ چلایا۔

"ظل الٰہی' بریانی۔" وہ کچن تک چلا آیا۔

"کتنی بار کہا ہے میرا نام ٹھیک طرح سے پکارا کرو۔" ظل ہما نے دیگچی کا ڈھکن ہٹاتے ہوئے ٹوکا۔

"لاؤ' میں مکس کرتا ہوں۔" وہ بڑا سا کفگیر اٹھا کے آگے بڑھا۔

"یہ چائے میں چینی یا پانی میں شربت مکس کرنے والا کام نہیں' سارے چاول ٹوٹ جائیں گے۔"

"نہیں ٹوٹتے بھئی۔ میں تو دیگ کی بریانی بھی مکس کرلیتا ہوں۔"

"پروین نے سارے لڑکیوں والے گر سکھا دیے ہیں انہیں۔"

رخشندہ نے طنزیہ انداز میں کہا جسے وصی نے سراسر نظرانداز کرتے ہوئے بریانی ملانے کی کوشش جاری رکھی۔

"میں اس صفائی اور مہارت سے چاول۔۔۔ مسالوں اور بوٹیوں کو۔۔۔ ایں۔۔۔ یہ کیسی بوٹی ہے' اس قدر ڈھیلی ڈھالی سی۔۔۔ جیسے کوئی چھیچھڑا۔ مگر وہ بھی کالا نہیں ہوتا نہ ہی اس کے چھلکے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ کیا لگی ہوئی ہے بھئی یہ؟ کس چیز کا گوشت ہے؟"

وہ چمچے کے سرے سے لٹکتی مسالے میں لتھڑی چیز کا بغور معائنہ کررہا تھا۔

"یہ گوشت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو۔۔۔ یہ تو بینگن ہے۔"

ظل ہما نے کچھ اس انداز میں سرگوشی کی جیسے بینگن کوئی نازیبا یا معیوب قسم کا لفظ ہو اور اسے ادا کرنے میں اسے حیا مانع آرہی ہو۔

"بینگن۔" وہ صدمے سے چلا اٹھا۔ "یعنی کہ بینگن۔۔۔ جس کا رنگ شرمناک حد تک جامنی' ذائقہ افسوسناک حد تک پھسپھسا اور سرے پہ ایک انتہائی بھدی سی ڈنڈی ہوتی ہے' وہ والا بینگن؟"

اس نے مکمل تشریح بیان کی اور ہما کے مجرمانہ انداز میں اعترافی سر ہلانے پہ وہ ہاتھ میں پکڑا چمچہ پٹخ کے رہ گیا۔

"یہ بینگن کی بریانی کب سے بننے لگی۔ بھرتہ تو سنا تھا۔ اب بھرتہ کیا مرغی کا بنا کرے گا۔ اوبی بی۔۔۔ بریانی بنانے کا حوصلہ کرہی لیا تھا تو چکن بریانی بنائیں۔"

"زیادہ گوشت صحت کے لیے کتنا نقصان دہ ہے' اس کا اندازہ بھی ہے تمہیں۔"

رخشندہ نے ناگواری سے ٹوکا۔ انہیں وصی کے طنز جتنے برے لگ رہے تھے' اتنی ہی ظل ہما کی شرمندگی کھل رہی تھی۔

"سبزیاں کھانے سے بیماریاں دور رہتی ہیں۔"

"چلیں زیادہ گوشت نقصان دہ ہے مگر کم گوشت تو۔۔۔" وہ بڑبڑا کے رہ گیا۔ یہ اس کی پروین ممانی نہیں تھیں جن کے سامنے وہ بے تکان کچھ بھی بولتا چلا جاتا۔ رخشندہ ممانی کے ماتھے کی چتون اسے ایسے ہی بریک لگا دیا کرتی تھی۔

"تم کھا کے تو دیکھو' مسالے وہی ہیں اور ذائقہ بھی۔" ظل ہما نے جلدی جلدی ڈش میں چاول نکالتے ہوئے کہا۔

اب اوپر تک آ ہی گیا تھا تو مجبوراً" ٹیبل تک بھی جانا پڑا۔ پلیٹ میں تھوڑے سے چاول بھی ڈالے مگر انگلی سے چمچ کے اوپر پڑا بینگن کا خوفناک سا ٹکڑا اٹھا کے الگ کر دیا۔ آلو' مٹر' شملہ مرچ البتہ آنے دیے واقعی اچھا تھا۔ مگر وہ ٹھہرا شدید قسم کا گوشت خور۔ اس لیے ٹیبل پر رائتہ' سلاد' اچار اور سبزی کی بریانی سب رنگ و خوش ذائقہ ہونے کے باوجود اسے کوئی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

"ارے میرا تو بہت ضروری فون آنا تھا۔" بالآخر وہ چونکنے کی بھرپور ایکٹنگ کرتا پلیٹ سمیت اٹھا۔ بغیر کے اس لیے نہیں کہ ممانی کی کفایت شعاری بلکہ کنجوسی سے بے انتہا چڑ رکھنے کے باوجود وہ ان کی ناراضی نہیں لینا چاہتا تھا۔

"میری روٹی؟....."

حسان نیند سے جھومتا جھامتا ٹیبل سے اٹھ ہی رہا تھا جب وہ کچن میں رکھی اس چار کرسیوں والی میز اور خالی دسترخوان میں ہاتھ مارنے لگا۔

"خود ہی تو منع کیا تھا کہ بریانی کھاؤں گا۔ اس لیے میں تمہاری بھی کھا گیا....." پھر اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ دیکھ کر نیند سے مندی آنکھیں ذرا کی ذرا کھولیں۔

"یہ کیا ہے؟ میرا حصہ۔؟"

"تمہارا حصہ؟..... تمہارا حصہ تو کل جہاں کے رزق کا تین چوتھائی حصہ ہے موٹے....." پر وہ بے چینی سے ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھا کے دیکھنے لگا۔

"میرے لیے روٹی اب کون بنائے گا۔؟"

"کم از کم میں تو نہیں۔" حسان نے کورا جواب دیا۔

"تم سے کہہ کون رہا ہے۔ تم روٹی بنانے کی نہیں' کھانے کی مشین ہو۔ یا اللہ... کس بری گھڑی مجھے اس کچوم بریانی کی خوشبو آئی تھی اور میں نے گھر کی مرغی کو دال سمجھتے ہوئے اوپر کھانا کھانے کا اعلان کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی بھوکا مارنے کا شوق ہے۔"

"ہما کو آواز دے لو... وہ پکا دے گی آ کر۔ ویسے بھی اسے تمہارے لیے روٹیاں پکانے کا بڑا شوق ہے۔" حسان نے معنی خیز نظروں سے اسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

مگر ایسی باتیں وصی کے سر سے عموماً" گزر ہی جایا کرتی تھیں' اب بھی "شاں" کر کے گزر گئی۔

"نہیں یار... جو بھی ہے۔ یہ اچھا تو نہیں لگتا کہ میں اسے جتاؤں کہ اوپر سے اس لیے نیچے چلا آیا کہ مجھے ان کی بریانی نہیں کھانی تھی۔"

"لا... دکھا... کچھ بچایا ہے یا نہیں۔"

وہ ڈونگوں میں جھانکنے لگا۔

"سارا کھیت اگا دیا ہے اس بریانی کی پلیٹ میں ممانی نے۔ بس بھنڈیوں کی کمی تھی۔"

وہ اس پر بھنڈی گوشت انڈیل کے ایک نئی قسم کی رنگا رنگ ڈش انجوائے کرنے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو... میرے لیے دو چار ٹکیاں تل دو....."

"مجھے اکیڈمی ..... کے لیے دیر ہو رہی ہے اور میں کوئی تمہاری بیوی نہیں ہوں جو تمہارے لیے پکوان تلوں۔"

"مجھے ایسی بارہ من کی دھوبن کو بیوی بنانا بھی نہیں ہے کہ ولیمہ میں چار دیگیں ایکسٹرا بنانی پڑیں۔ صرف دلہن کے لیے۔"

"دعی... !یہ لو... تازہ چپاتیاں۔"

وہ منہ بنا بنا کے چمچے لے رہا تھا جب ظل ہما نے کپڑے میں لپٹی گرما گرم روٹیاں اس کے سامنے رکھیں۔

"اوہ... تھینکس یار..." اس کی جان میں جان آئی۔

"ٹکیاں بھی تل دینا..." وہ نئے سرے سے کھانے میں جت گیا' اس کے چہرے پہ اطمینان بھری مسکراہٹ دیکھ کے ظل ہما کی آنکھوں میں جو رنگ اترے وہ نہ دیکھ سکا۔

☼ ☼ ☼

"انجر پنجر ہل گیا ہے میرا تو..."

بیگم شوکت جہاں' پروین کا ہاتھ تھامے ہانپتی کانپتی گھر میں داخل ہوئی تھیں۔

"بھلا بتاؤ کون سے علاقے میں گھر بنایا ہے آمنہ نے۔ لگتا تھا مریخ پہ آ گئے ہیں۔ دو دو ڈھائی ڈھائی کنال کے عالیشان بنگلے اور سڑکیں ٹوٹی ہوئی۔ گڑھے ہی گڑھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گاڑی میں نہیں' بیل گاڑی میں بیٹھے ہیں۔" وہ چپل اتار کے سوجے ہوئے پیر سہلانے لگیں۔

"اور میلاد کا انتظام بھی ناقص تھا۔ عمر گزر گئی آمنہ کی..... تقریبات کا سلیقہ نہ آیا۔ اب جب کوئی ہنر خود کو نہ آیا تو بہو بیٹیوں کو کیا سکھلاتی..... قرآن خوانی اور محفل نعت کے ختم ہونے کے بعد بھی پون گھنٹہ بٹھائے رکھا کھانے کے انتظار میں..... بیٹھ بیٹھ کے میرے تو پاؤں سوج گئے۔ کئی بار تو دل میں آیا... ایسا بھی کیا کھانے کا لالچ... اشارہ کروں تمہیں... اور نکل چلتے ہیں مگر پھر لحاظ آ گیا کہ ایسی مبارک محفل میں سے یوں نکلنا اچھا نہیں..... اور سب سے پہلے جانے پہ دوسروں کے سوالوں کے جواب بھی دینا پڑے گا۔ نہ بھئی..... ہم سے تو نہیں ہوتی کی سبکی... مگر آمنہ کو خود خیال کرنا چاہیے تھا... ایک تو گھر اتنا دور بنایا ہے..... شہر کے دوسرے کونے میں... زیادہ تر عورتیں میلاد کے تقدس کی وجہ سے بچے گھر چھوڑ کے آئی تھیں... ان کو زیادہ دیر رکنے کی وجہ سے کتنی پریشانی ہو رہی ہوگی۔"

بیگم شوکت جہاں طویل بات کرنے کی پہلے بھی عادی تھیں اور عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس صلاحیت میں اور اضافہ ہوا تھا۔

دوسری جانب پروین جو پہلے بھی خاموشی اور تحمل سے ان کے طویل طویل بیان سننے کی وجہ سے ان کی من پسند بہو تھیں ان کی یہ صلاحیت بھی اب قابل قدر حد تک بڑھی تھی۔ اب بھی وہ بڑے سکون سے ساری بات سننے کے بعد رسان سے بولیں۔

"مجھے تو پہلے ہی اندازہ تھا۔ اسی لیے آپ سے کہا تھا کہ آپ رہنے دیں۔ میں خود ہو آتی ہوں..."

"اے لو... کون سا میں نہیں جانتی تھی..... آمنہ میرے سامنے بیاہی گئی... اولاد والی..... اور پھر پوتوں نواسوں والی ہوئی..... مجھے بھی پتہ تھا کہ اس کے ہاں ہونے والی تقریبات ایسی ہی بدنظمی اور افراتفری والی ہوتی ہیں... شادی بیاہ' مایوں... مہندی' عقیقہ سالگرہ ہوتی... تو میں رہنے بھی دیتی... مگر ایک تو اس نے عمر گزارنے کے بعد اب گھر بنایا ہے' اس کی مبارکباد دینا بھی ضروری تھی... اور پھر میلاد شریف... محفل نعت... قرآن خوانی... اس میں جانے کی سعادت میں کیسے جانے دیتی... پروین! وہ نیلی کنارے والے دوپٹے میں جو خاتون تھیں... ماشاءاللہ کیسی خوش الحان تھیں..... اور گلے میں کیا تقدس تھا..... قرآت بھی اچھی کرتی تھیں اور نعت کے الفاظ بھی جیسے گلے سے ڈھل کر نکلتے تھے۔ اپنے ہاں کے میلاد میں اسے بلائیں گے..... آمنہ سے ان کا نمبر لے لینا فون کر کے..... اور پوچھ لینا کہ ہدیہ وغیرہ کیا لیتی ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں اماں؟....." پروین حیران ہوئی۔

"آمنہ خالہ نے تعارف کرایا تو تھا آپ کا... ان کی سمدھن ہیں وہ... ان کی ہونے والی بہو کی امی..... فیصل کی ساس۔"

”اے لو۔۔۔“ وہ سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئیں۔ ”ایک تو کوئی بات یاد نہیں رہتی۔۔۔ بھلا ہوا کہ میں نے خود ہی پوچھ لیا۔۔۔ اٹھا نہیں جا رہا تھا اپنی جگہ سے۔۔۔ ورنہ دل میں کئی بار آئی کہ جا کے ان خاتون سے اس بارے میں بات کروں۔۔۔“

”یہ بھی شکر ہے کہ آپ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔“

وہ ذرا سا ہنسیں پھر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”بڑی خاموشی ہے۔۔۔ حسن تو کھانے کے فوراً بعد فیکٹری چلا جاتا ہے۔۔۔ مگر حسان اور وصی کے ہوتے ہوئے خاموشی؟؟“

”دونوں میں سے ایک ضرور سویا ہوگا‘ ورنہ خاموشی ہو تو نہیں سکتی۔“

”نانو۔۔۔ وصی کمرے سے برآمد ہوا اور دوڑ کے ان کے گلے لگ گیا۔ بچپن کی عادت تھی۔۔۔ چاہتے ہوئے بھی جاتی تھی۔

”حسان کہاں ہے؟؟“ پروین نے پوچھا۔

”اکیڈمی۔۔۔“

”ارے ہاں۔۔۔ حسن نے بتایا تو تھا کہ اسے کسی اکیڈمی میں داخل کروایا ہے۔ اللہ کرے اس سال پاس ہو جائے۔۔۔“

”آمین۔۔۔“ شوکت جہاں کے کہنے پہ پروین نے دزدیدہ نظروں سے ان کی گود میں منہ چھپائے لیٹے وصی کو دیکھا جو حسان سے چند ماہ ہی چھوٹا تھا مگر امتیازی نمبروں سے بی اے کرنے کے بعد اب مختلف یونیورسٹیوں سے رابطے میں تھا۔ کبھی ایم بی اے کرنے کا ارادہ باندھتا۔۔۔ کبھی سی ایس ایس کی تیاری کرنے کا مشورہ ملتا اور سب جانتے تھے کہ وہ کچھ بھی کرے۔۔۔ کسی بھی میدان میں جائے۔۔۔ جھنڈے ہی گاڑے گا۔ اور حسان۔۔۔ شروع سے پڑھائی کی جانب اس کا رجحان کم تھا۔ سادہ سا بی اے بھی اس سے پچھلے دو سالوں سے ہو ہی نہیں پا رہا تھا۔

حسن کے ذہن میں ابتدا سے ہی یہ خیال پختہ تھا کہ بڑا بیٹا ہونے کے ناتے اس نے سراج الدین کا بزنس سنبھالنا ہے اس لیے ڈاکٹر‘ انجینئر‘ وکیل یا پائلٹ بننے کا کوئی خواب بچپن سے ہی اس نے نہیں دیکھا۔ بی ایس سی کے بعد ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کے چند کورسز کیے‘ ڈپلومے لیے اور باپ کی فیکٹری سنبھال لی مگر اس کا جتنا بھی تعلیمی ریکارڈ رہا بہترین رہا۔ ایسے میں حسان کی جانب سے پروین کو ہمیشہ مایوسی ہی ہوتی اور یہ مایوسی اس وقت شرمندگی اور دبے دبے غصے میں بدل جاتی جب حسان کا مقابلہ دانستہ نادانستہ وصی سے کیا جاتا۔

☼ ☼ ☼

”آج ذرا جلدی گھر آجائیے گا۔“

عرصۂ دراز کے بعد اس کی جانب سے ایسا کوئی مطالبہ ہوا تھا۔ اگرچہ لہجے میں وہ بشاشت اور گرم جوشی سرے سے مفقود تھی جو یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے بیویوں کے لہجے میں در آتی ہے پھر بھی جعفر محمود نے بڑے تعجب سے اسے دیکھا۔

اپنی کہی بات کے برعکس اس کا چہرہ بے حد سپاٹ تھا۔۔۔

اس کے کسی انداز سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اسے جعفر کے جلدی گھر آنے یا نہ آنے سے کوئی دلچسپی ہو۔ ہمیشہ کی طرح وہ مدیحہ کے یہ مستقل بے زار اور لاتعلق سے تاثرات دیکھ کر وہ چڑ گیا۔

”کیوں؟۔۔۔ کیا رکھا ہے یہاں۔۔۔ جو کوئی جلدی آئے۔“

یہ چڑ اسے ایسے ہی دل جلے فقرے ادا کرنے پہ مجبور کرتی تھی۔ ”شام کو مجھے خاصی مصروفیت ہے۔۔۔ جلدی نہیں آسکتا۔“ ”آنا تو پڑے گا۔۔۔ جس سے ملنے کا وعدہ کیا ہے‘ وہ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی‘ کل پرسوں کا وقت دے لیجیے

مدیحہ کی بے حد سکون سے کی بات اسے بھسم کر گئی۔

”مدیحہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ اب ظاہر ہے آپ کو یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہوگی کہ آپ ایک نہیں‘ تین جوان ہوتی بیٹیوں کے باپ ہیں‘ جن میں سے ایک کے رشتے کی بات آج چلنے والی ہے۔ اس لیے کوئی اور بہانہ۔۔۔“

”مدیحہ۔۔۔ اب تو بس کردو۔ خدا کے واسطے۔“ جعفر نجانے کیسے ٹوٹے ہوئے انداز میں اس کے سامنے گڑگڑا اٹھا۔

[illegible] طرح ابل جانے والا

”میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم ایک نہیں تین تین۔۔۔ جوان ہوتی بیٹیوں کی ماں ہو جن میں سے ایک کی بات آج ہونے جا رہی ہے۔ میری عمر کا نہیں‘ اس بات کا ہی لحاظ کرلو۔۔۔“

”ہاں! آپ کی عمر کو؟؟“

مدیحہ نے رشک و حسد سے بھرپور نظر سامنے کھڑے اس ترپن سالہ مرد پہ ڈالی جو اس کا شوہر تھا۔۔۔ اور جس پہ عمر کے اثرات اس تیزی اور بے رحمی سے واضح نہیں ہوئے تھے جیسے خود اس پہ ہوئے تھے۔۔۔ اسے دیکھ کر تو ایسا لگتا جیسے عمر کا ہر گزرتا سال اسے بری طرح روند رہا تھا حالانکہ عمر میں وہ جعفر سے چند برس چھوٹی ہی تھی۔۔۔ مگر شک۔۔۔ بے اطمینانی اور اندر ہی اندر کڑھنے کی عادت اسے کھا گئی تھی۔

”اور نہ آپ کچھ ہونے دیں گے اپنی عمر کو۔۔۔ آپ کیوں نہیں لحاظ کرتے اپنی عمر کا۔۔۔ چھوڑیں بال ڈائی کرنا۔۔۔ کسی دن ٹائی میچ کیے بغیر ہی لگا کے چلے جائیں۔۔۔ کبھی پرفیوم کا اسپرے کرنا ہی بھول جائیں۔ مگر نہیں۔۔۔ آپ سب بھول سکتے ہیں۔۔۔ بیوی بھی۔۔۔ بیٹیاں بھی۔۔۔ مگر خود پہ توجہ دینا نہیں بھول سکتے۔۔۔ خود پہ توجہ دیں گے تو دوسرے آپ پہ توجہ دیں گے ناں۔“

”تم کبھی نہیں بدل سکتیں۔۔۔ مدیحہ۔۔۔ کبھی نہیں۔“

وہ افسوس سے کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”ماما۔۔۔“ دوسرے دروازے سے چپکی کھڑی تقدیس نے اندر جھانکا وہ کوئی بات کرنے آئی تھی مگر ماں باپ کی اس بحث سے گھبرا کے وہیں رک گئی تھی۔

”ہوں۔۔۔ کیا ہے۔۔۔؟؟“

مدیحہ کا سارا دھیان اب نیچے کی جانب تھا۔۔۔ وہ کھڑکی سے نیچے ڈرائیو وے میں جھانک رہی تھیں جہاں جعفر محمود سخت غصے کے عالم میں چلتا ہوا نظر آرہا تھا‘ ڈرائیور کے دروازہ کھولنے۔۔۔ جعفر کے آف موڈ کے ساتھ اس میں بیٹھنے اور گاڑی کے گیٹ سے نکلنے تک وہ مسلسل پردہ ہاتھ میں تھامے وہیں کھڑی رہیں۔

”آپی پوچھ رہی ہیں‘ چائے کے ساتھ کیا کیا تیار کرنا ہے‘ بتا دیں۔“

”ہوں۔۔۔“ گاڑی کے نظروں سے اوجھل ہونے پہ وہ مکمل توجہ دینے کے قابل ہوئیں۔

”بیکری سے کچھ سامان آجائے گا۔۔۔ پیسٹری‘ پیٹز‘ نمکو اور ڈونٹس وغیرہ۔۔۔ شامی کباب کا مسالا میں نے رکھ دیا ہے‘ وہ میں خود تیار کرلوں گی‘ چاٹ اور ٹرائفل تم تیار کرلو۔ اور تحریم سے کہو اسے زیادہ سر کھپائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں بس چکن ونگز وہ خود تیار کرلے۔۔۔ اچھے بناتی ہے۔ اس سے زیادہ ضرورت نہیں کچن کے کام کرنے کی۔ ابھی کل فیشل کروایا ہے اس کا۔۔۔ ذرا دھیان سے اس کا کوئی ڈھنگ کا جوڑا نکال دینا اور بال وغیرہ بنوا دینا۔۔۔“

وہ اب بیوی سے ایک مکمل ماں لگ رہی تھیں۔۔۔ اپنی عام سی شکل و صورت کی چوبیس سالہ بیٹی کے لیے فکر مند۔۔۔

اور تقدیس کو ماں کا یہی روپ پسند تھا۔

بیوی کے روپ میں مدیحہ اسے بے حد اجنبی لگا کرتیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ والا پنک سوٹ ٹھیک رہے گا۔"

اس نے ہینگر سے میرون پھولوں والا بے بی پنک سوٹ اتارنا چاہا۔

"نہیں تقدیس۔ یہ نہیں۔ وہ۔ ہاں وہ اسکن کلر والا۔"

"یہ۔؟" تقدیس نے ناک چڑھائی۔

"ہاں' ویسے اس کا ٹائی اینڈ ڈائی دوپٹہ خاصا کلر فل ہے۔ اور بھی زبردست لگتا اگر آپ صرف بجائے اس کے دامن پہ بھی کڑھائی کروا لیتیں۔ نہیں میں نہیں نکال رہی یہ۔ ماما نے کہا ہے آپ لگنا چاہیے۔"

"یہ نہ تمہارے بس میں ہے نہ میرے بس میں۔"

تقدیس کی عام سے انداز میں کہی بات اسے بری طرح چبھی تھی اسی لیے وہ آزردگی سے کہہ اٹھی۔

"کیا ہے آپی؟۔ کیوں اتنے عجیب و غریب اور بے بنیاد کمپلیکس پال رکھے ہیں آپ نے؟ موٹی ناک والی' سیاہ رنگت والی۔ سب کی سب پوری زندہ دلی سے ہر قسم کا فیشن کرتی ہیں اور کیوں نہ کریں ہر لمحے سے خوشی کشید کرنا ان کا بھی حق ہے اور آپ۔ آپ میں ایسی کون سی کمی ہے جو آپ اپنے آپ کر رہی ہیں۔ اچھی بھلی تو ہیں۔ اور بھی اچھی لگیں گی اگر یہ خود ساختہ خول توڑ کے اعتماد سے جینا سمجھیں۔"

اس سے پورے چار سال چھوٹی ہونے کے باوجود وہ اکثر اس کے لیے ناصح کا کردار بھی ادا کیا کرتی۔ جو کا کوئی اثر تحریم پہ پڑتا نظر آئے یا نہ آئے۔

"توبہ۔ تم تو شروع ہی ہو جاتی ہو۔ بس موقع ملنا چاہیے بس۔"

وہ جھنجلا گئی۔ "میں نے صرف اتنا ہی تو کہا ہے کہ میں پنک سوٹ نہیں پہنوں گی۔"

"کیوں نہیں پہنیں گی۔" اس نے جرح کی۔

"مجھ پہ یہ کلر سوٹ نہیں کرتا۔"

"کسی نے یہ کہا آپ سے؟ نہیں ناں۔ اپنی طرف سے فرض کر کے بیٹھ گئی ہیں۔ اتنا اٹھتا ہے یہ رنگ گندمی رنگت پہ۔"

"نہیں' پنک کلر صرف سفید رنگ پہ جچتا ہے۔"

"اُفوہ۔ آپ کو سمجھانا مشکل ترین کام ہے۔ لیں بھئی' ٹھیک ہے۔ پہن لیں یہ اپنا سکن کلر کا سوٹ آپ کو تیار میں خود کروں گی۔"

اس نے تحریم کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس کے لمبے سلکی بالوں کی اونچی سی پونی کر کے کھلے چھوڑ دیے میں ملٹی کلر نگینوں والے چاندی کے آویزے پہنائے۔ ایک کلائی میں سادہ کانچ کی تین چار رنگوں کی تحریم کے لانبی انگلیوں والے گندمی ہاتھ اسے بے حد پسند تھے۔ فدا تھی وہ ان پہ۔ مگر دل سے بھی تعریف تحریم کو لگتا وہ اسے بنا رہی ہے۔ ان ہاتھوں کے سادگی سے ترشے ناخنوں پہ ڈیپ میرون نیل پالش لگا کے گویا انہیں مکمل طور پہ سجا دیا۔ ہلکا سا میک اپ۔ جو پاؤڈر' نیچرل کلر لپ اسٹک اور بلیک آئی لائنر نے تحریم کو نیا روپ دے گیا۔

"یہ دیکھیں۔ ذرا سا خود پہ توجہ دیں لیں آپ تو کیا سے کیا بن جاتی ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہے جو الٹے جوڑے لپیٹے رکھتی ہیں یا کس کے چٹیا۔ منہ بھی دھلا نہ دھلا ایک برابر۔ کتنا کہتی ہیں ماما کہ اور کچھ نہیں کاجل ہی لگا لیا کریں۔"

"تقدیس۔ مجھے بے حد گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

اس میں آئینے کے عکس نے بھی اعتماد پیدا نہ کیا تھا۔

"اس میں گھبرانے والی کون سی بات ہے۔ پہلے بھی تو دو بار یہ پریڈ کر چکی ہیں آپ۔"

"لیکن تقو۔ اگر اس بار بھی ریجیکٹ کر دی گئی تو؟"

"پہلے تو یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ آپ ریجیکٹ کر دی گئی تھیں۔ پہلے والے رشتے میں پاپا کو یہ اعتراض تھا لڑکا بہت معمولی تعلیم یافتہ تھا اور دوسرے میں ماما کو یہ برائی نظر آئی تھی کہ فیملی بہت بڑی تھی۔ اور بہت تیز قسم کی عورتیں تھیں۔ بقول ماما کے' تحریم کو بھون کے کھا جاتیں اس کی نندیں اور جٹھانیاں۔"

"وہ دونوں رکھنے کے لیے ماما پاپا نے کہا ہوگا۔ ورنہ اصل میں تو۔"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"چلو چھٹی۔ آپ نے بھی یقین کیا ہے کسی بات کا۔" تقدیس کو بھی غصہ آ گیا۔ "اور یہ والے جو لوگ آ رہے ہیں۔ ماما کے جاننے والے ہیں۔ مسز خورشید کے گھر پارٹی پہ ملے تھے مجھے۔"

"کون۔؟" تقدیس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہمارے ہونے والے جیجا جی؟"

"نہیں بھئی۔ ان کی بہنیں وغیرہ۔"

"اوہ۔" وہ مایوس ہوئی۔

"اور وہ بہت خوبصورت ہیں۔ بڑی بڑی براؤن آنکھیں' سرخ و سفید رنگت' بھرے بھرے جسم۔ لانبے قد بھائی بھی پھر ان جیسا ہوگا۔"

"ضروری تو نہیں۔ اور ہو بھی تو۔ اچھا ہی ہے۔ آج کل پتہ نہیں کیا رواج سا چل نکلا ہے۔ اتنی پیاری پیاری دلہنوں کے برابر میں پتا نہیں کیسے دلہا بٹھا دیتے ہیں۔ میں نے اپنی کزنز' کلاس فیلوز جس کے پاس بھی اس کی انگیجمنٹ یا اس کے بہن بھائیوں کی شادی کی تصویریں دیکھی ہیں۔ سب میں ایک چیز کامن دیکھی۔ اور وہ ہے انتہائی سا دولہا۔ چلو اچھا ہے۔ ٹرینڈ تھوڑا سا بدلے گا۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ اگر وہ اتنا ہی اچھا ہوا تو مجھے کیوں پسند کرے گا بھلا۔"

"توبہ آپی۔ آپ تو۔" مارے جھنجلاہٹ کے اس سے کچھ کہا نہ گیا اور وہ برش میبل پہ پٹخ کے کھڑی ہو گئی۔

"میں کچن میں جا رہی ہوں۔ آپ کا تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ جا کے ٹرائفل کی تو خبر لوں۔"

اس کے نکلنے کے بعد تحریم نے تھوڑا آگے ہو کر غور سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔

صاف کھلتی ہوئی گندمی رنگت۔ مگر عام سے نقوش جن میں کم از کم اسے تو کوئی جاذبیت نظر نہیں آتی تھی۔ آنکھیں' پتلے پتلے ہونٹ۔ قدرے پھیلا ہوا دہانہ۔ ناک متوازن تھی مگر چہرے کی ساخت لمبی ہونے کی وجہ سے اسے اکثر اپنی ناک ضرورت سے زیادہ تیکھی لگا کرتی۔ اس میں مدیحہ کی خاصی مشابہت نظر آتی تھی۔ بس اتنا تھا کہ مدیحہ کا جسم شروع سے بھرا بھرا تھا اور اب عمر کے ساتھ ساتھ وزن میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ اس کے باوجود دیکھنے والوں کو یہ مشابہت صاف محسوس ہوتی تھی۔ مدیحہ کے چچا' خالائیں وغیرہ تو جب تحریم کو دیکھتے اسے مدیحہ کی جوانی قرار دیتے۔ اور تحریم بجائے اس بات پہ مسرور اور نازاں ہونے کے بجھ سی جاتی۔ اس نے ہمیشہ ماں کو اپنی کم صورتی کے دکھڑے روتے سنا تھا۔ کم عمری میں ہی یہ بات اس کے دل و دماغ میں گھر کر گئی تھی۔ ماں کے مقابلے میں باپ کا کہیں زیادہ وجیہہ ہونا' بلکہ تعلیم اور ذہانت کے لحاظ سے برتری رکھنا بھی واضح طور پہ محسوس ہوتا تھا۔ اور اس کے خیال میں ان دونوں کے درمیان ذہنی مطابقت نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھا۔ اس نے از خود فرض کر لیا تھا کہ چونکہ اس کے پاپا کو اپنے معیار اور مقابلے کی شریک حیات نہیں ملی اس لیے وہ اس کی ماما کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ پائے۔ اور ماما۔ ان کا احساس کمتری انہیں پاپا کے مقابل نہیں دیتا۔ وہ اپنے ساتھ ایسی کوئی بات دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا چیخ چیخ کر اعلان کرے مت کرو میرے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش۔ مت جھونکو مجھے اس بھٹی میں جس میں میری ماں پچیس

سالوں سے جل رہی ہے مجھے پیوند بن کے زندگی نہیں گزارنی......

مگر اس کی فطرت میں چیخنا ہی تو نہیں تھا......

سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے وہ شروع سے ہی ماں کے بہت نزدیک تھی۔ اس کے ہر درد سے آشنا، ماں کے ہر دکھ سے آگاہ۔ اس کے تمام موسموں کی ساتھی......

مدیحہ پچھلے دس بارہ سالوں میں کبعفریہ جتنا چلائی تھی...... اتنا ہی تحریم کی آواز اندر ہی اندر گھٹتی چلی گئی تھی۔

مدیحہ نے جتنے آنسو بہائے تھے...... اتنا ہی تحریم کو اپنے آنسو اندر اتارنے کی عادت ہو گئی تھی۔

جتنے اس نے تقدیر سے گلے کیے تھے...... اتنا ہی تحریم کو سارے شکوے دل میں دبانے کا فن آ گیا تھا۔

وہ چاہ کے بھی دل کی بات زبان پہ لانے کا حوصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس نے بیڈ پہ رکھا اپنا موبائل اٹھایا، ڈائل میں Save واحد نمبر ملایا۔

"ہیلو!" وحید کی سوئی سوئی سی آواز آئی۔

"وحید...... آپ سو رہے ہیں؟" تحریم نے بھیگی آواز میں گلہ کیا۔ اس کی جان پہ بنی تھی اور وہ......

"ارے نہیں یار...... اب کیا سونا...... تم کہو۔" وہ لہجے میں بشاشت پیدا کرتے بول رہا تھا۔

"وہ...... آج پھر گھر پہ کچھ لوگ آ رہے ہیں۔"

"اوہ نو...... پھر؟"

"پھر کیا؟...... میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"تم منع کر دو۔ ظاہر ہے تمہارے گھر والے تم سے پوچھیں گے تو سہی۔"

"اور اگر انہوں نے وجہ پوچھی!"

"وجہ؟...... تم...... تم کہہ دینا...... کہ تم مزید پڑھنا چاہتی ہو۔"

"مگر مجھے آگے نہیں پڑھنا۔"

"جاب کرنے کا بہانہ بنا دینا...... کہہ دینا تمہارا دل چاہتا ہے کچھ عرصہ انڈی پینڈنٹ رہنے کا۔"

"وہ نہیں مانیں گے۔"

"کیوں بھئی...... لگتا تو نہیں کہ تمہارے گھر والے اتنے سخت اور پرانے خیالات کے ہوں گے جو تمہیں جاب نہ کرنے دیں۔"

"ہم رہتے ایف ٹین میں ہیں وحید...... مگر ہمارے گھر میں اب تک موضع کلاں کے اصول اور روایتیں ہیں...... میرے پاپا گھر سے باہر کچھ بھی ہوں مگر گھر کے اندر وہ چودھری ہی ہوتے ہیں۔ پکے پینڈو ہیں ہم لوگ اور اس کے علاوہ بھی...... میرے جاب کرنے کی مخالفت تو سب اس لیے بھی کریں گے کہ سب کے خیال میں میں کچھ زیادہ سادہ...... بلکہ بے وقوف ہوں۔ مجھے نہ زمانے کی چال کا پتہ ہے نہ لوگوں کی پہچان ہے۔"

"ہاں...... وہ تو ہے۔" وحید بڑبڑایا...... پھر سنبھل گیا......

"تو اور کیا راستہ ہو سکتا ہے ان ان چاہے مہمانوں سے نمٹنے کا۔"

"یہ سوچنا تو آپ کا کام ہے۔" وہ دبے دبے انداز میں کچھ جتا گئی۔

"ہاں...... کرتا ہوں کچھ...... بس تم اس بار کسی طرح ٹال دو ان کو...... آگے کے لیے میں وعدہ کرتا ہوں۔ تمہیں......"

"اچھا......" تحریم نے ایک گہری سانس لی۔

"اب تو یہی امید کر سکتی ہوں کہ یہ لوگ خود ہی مجھے ناپسند کر جائیں...... مجھ سے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"تمہیں کون ناپسند کر سکتا ہے۔ کوئی اندھا ہی ہو گا۔"

وحید کے بجائے کوئی اور یہ بات کہتا تو تحریم سر جھٹک کے اسے جھٹلا دیتی...... مگر وہ وحید تھا...... جس کی آمنا و صدقنا کہہ یہ اٹھتی تھی...... اب بھی شرما کے مسکرا دی۔

"سب کے پاس آپ کی نظر نہیں ہوتی وحید۔"

"ہوں...... ابھی نہیں چاہیے...... کیونکہ تم صرف میرے لیے بنی ہو۔"

"آپی...... مہمان آ گئے۔"

مخمور سی ہو کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ تطہیر نے اندر جھانک کر اطلاع دی۔

وہ بڑبڑا سی گئی......

دھنک رنگ بکھر بکھر سے گئے......

"آپی...... آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔"

تحریم کو وہ روپ عطا کیا تھا کہ وہ چونک کر سراہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

"ہاں...... وہ میں...... بعد میں فون کرتی ہوں...... کچھ مہمان آئے ہیں......"

"سنا ہے تم اچھی لگ رہی ہو۔"

وحید نے جلے ہوئے انداز میں کچھ اس طرح کہا کہ اسے ہنسی آ گئی۔

"تمہیں کوئی حق نہیں سوائے میرے، کسی اور کو اچھا لگنے کا...... سمجھیں؟"

"آپی...... چھوڑیں ناں فون...... آئیں تو......"

"میں پھر فون کرتی ہوں۔"

اس نے جلدی سے موبائل دوبارہ بیڈ پہ پھینکا۔

"تم چلو...... میں آتی ہوں...... تطہیر کو کمرے سے چلتا کرنے کے بعد وہ دوبارہ آئینے کے سامنے آئی......

ہونٹوں پہ لگی لپ اسٹک کو ٹشو سے رگڑ کے صاف کیا۔ کانوں کے آویزے اتار کے رکھے...... لمبے بال جو پونی کی صورت اونچے باندھنے کے باوجود کمر سے نیچے تک آ رہے تھے، ان کو لپیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھا۔ اور آئینے پہ ایک تنقیدی نظر ڈالتی کمرے سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ دوپہر کے سوا تین بجے گیٹ پہ کھڑا تھا۔

جھنجھلاہٹ اور بے چینی اس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔

دو تین بار تو اس نے سوچا کہ بائیک نکالے اور کالج تک ہو آئے......

"نہیں...... کچھ دیر دیکھتا ہوں...... شاید آنے والی ہوں۔"

گرمیوں کی دوپہر...... سنسان علاقہ...... اور اس کی پیاری ندا آپی ابھی تک گھر تک نہیں لوٹی تھیں...... ان کے بجائے کھل ہما یا مدیحہ باہر ہوتی تو وہ اتنا فکرمند نہ ہوتا۔ مگر ندا جو کہنے کو سب سے بڑی تھی...... ایک میچور تعلیم یافتہ تھی اور پچھلے ڈیڑھ سال سے ایک پرائیویٹ گرلز کالج میں لیکچرار تھی یعنی عملی میدان میں بھی قدم رکھ چکی تھی، اس کے باوجود اس کی سادہ لوحی خطرناک حد تک برقرار تھی۔ یہی وجہ تھی گھر والوں نے اس کے بھرپور احتجاج کے باوجود اس کے پک اینڈ ڈراپ کے لیے وین کا بندوبست کیا تھا۔

"یہ کیا؟ اب کیا میں ساری عمر کالج گرلز کی طرح وین میں آتی جاتی رہوں گی...... میں اب لیکچرر ہوں...... اسی وین میں اپنی اسٹوڈنٹس کے ساتھ بیٹھ کر آنا جانا کیا اچھا لگے گا؟"

"اچھا تو یار میں آپ کو پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"تم کون ہوتے ہو اجازت دینے والے؟ چھوٹے ہو مجھ سے۔"

"پاپا......"

"پاپا سے بات کر رہی ہوں۔" وہ معراج الدین کی جانب متوجہ ہوئی۔

"یہ فیصلہ میرا ہی ہے بیٹا! تم پبلک ٹرانسپورٹ سے آنے جانے کی عادی نہیں ہو۔ ہمیشہ سے میں ہی تم لوگوں کو

اسکول و کالج چھوڑتا آیا ہوں اور واپسی کے لیے وین لگوا کے دی ہوئی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں لیزنگ پہ گاڑی لے لیتی ہوں۔"

"ضرور لیجیے۔" اسے وصی کی جانب سے اس پہ بھی مخالفت اور تنقید کا اندیشہ تھا مگر اس کا مثبت ردِعمل پا کر ریلیکس ہو گئی۔

"اب مجھے تو کچھ پتہ نہیں اس بارے میں۔ تم ہی تھوڑی ہیلپ کرو۔ قسط اتنی ہو کہ میری پے میں سے آرام سے کٹ سکے۔"

"ہاں یہ تو دیکھنا ہی ہوگا۔ یہ نہ ہو کہ۔ قسط ادا کرنے اور ڈرائیور کی تنخواہ دینے کے بعد کچھ بچے ہی نا۔"

"ڈرائیور؟" ندا کے کان کھڑے ہوئے۔

"جی ہاں۔۔۔ ڈرائیور۔ اس کے بغیر تو میں آپ کو گاڑی رکھنے نہ دوں گا۔"

"تم ہوتے کون۔۔۔" وہی پرانا گھسا پٹا اور بے کار فقرہ دہراتے دہراتے وہ لب بھینچ کر چپ ہو گئی۔

"میں ان چھٹیوں میں ڈرائیونگ سیکھ لوں گی۔"

"ضرور سیکھیے۔۔۔ ہر کام آنا چاہیے۔۔۔ آڑے وقت میں کام آتا ہے۔۔۔ کبھی کبھی ڈرائیور چھٹی پہ ہوتا ہے
ایمرجنسی کی صورت میں آپ قریبی مارکیٹ تک تو ڈرائیو کر ہی لیں گی۔"

"کہاں سے بھروں گی اس کی تنخواہ۔۔۔؟" وہ پھٹ پڑی۔

"ایک پرائیویٹ کالج میں نئی نئی لیکچرار ہوں۔۔۔ کوئی انکم ٹیکس میں تگڑا سا عہدہ نہیں مل گیا۔ گاڑی کی قسط اور ڈرائیور کی تنخواہ چکانے کے بعد میرے پاس بچے گا کیا؟"

"آپ کا وہ جیب خرچ جو برسرِ روزگار ہونے کے باوجود آپ بڑے دھڑلے سے ماموں سے وصولتی ہیں۔"

"وہ میری بیٹی کا حق ہے اور جاب کرنا اس کا شوق۔" معراج الدین نے بیٹی کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ "مگر وصی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم کبھی اکیلی رکشے یا ٹیکسی میں سفر تو کر نہیں سکتیں۔ لاہور کی ٹریفک کا مقابلہ کیسے کرو گی
صرف ڈرائیونگ آنا کافی نہیں ہوتا۔ تم بہت جلد نروس ہو جاتی ہو۔ انڈر پریشر آ جاتی ہو۔ کالج بھی تمہارا
ہے۔ اتنی خوفناک ٹریفک میں ڈرائیونگ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے نہ لینے دینا مجھے گاڑی۔"

حسب عادت ایک منٹ لگا تھا ندا کی آنکھوں میں آنسو آنے میں۔

"ہونے دو خوار ویگن کی گرمی میں۔۔۔ کالج میں لڑکیاں مجھے کتنا ایڈمائر کرتی ہیں۔۔۔ ڈیسنٹ اور گریس فل
کتنی شرم آتی ہے بھیڑ بکریوں کی طرح پک اپ سوزوکی میں ٹھنستے ہوئے۔ اور کبھی جو وہ اپنی ٹیچر کی درگت
ہیں۔۔۔ لیں جو گھر پہ اس کی اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے ہاتھوں ہوتی ہے تو۔۔۔"

"بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں۔۔۔" وصی نے افسوس سے سر ہلایا۔

ندا کا مزاج دھیما اور قدرے دبتا ہوا تھا۔ محبت اور مروت کے ہاتھوں بھی ماری ہوئی تھی۔۔۔ اس لیے ان کا
گلہ بھی صحیح تھا کہ سب سے بڑی ہونے کے باوجود سارے چھوٹے آسانی سے اس کے سر پہ چڑھ کے
تھے۔ بچپن میں اس نے وصی کے خوب آنسو پونچھے تھے۔۔۔ اس کو ڈرتے دیکھ کے گود میں لے کر سلایا تھا
ہاتھ پکڑ پکڑ کے لکھنا۔۔۔ سکھایا تھا۔۔۔ بالوں میں کنگھا کرنا۔۔۔ ناخن کاٹنا سکھایا تھا۔۔۔ اور پھر جب سے وصی نے
سنبھالنے کے بعد اسے بات بے بات روتے دیکھا۔۔۔ اور ہر بار ان آنسوؤں کی وجہ ایک ہی پائی۔۔۔ یعنی کسی پہ
اندھا اعتماد۔۔۔ تو اس نے نہ صرف ان آنسوؤں کو پونچھنے کا ذمہ لے لیا بلکہ ان آنکھوں کو نم نہ ہونے دینے کی کوشش بھی کرتا رہتا۔۔۔

مگر ندا کی سادہ لوحی ایسے مواقع فراہم کرتی رہتی۔

کبھی کوئی عزیز سہیلی اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیتی۔

کے خلوص کا غلط مطلب نکال کر فائدے سمیٹ کر چلتی بنی اور ندا بے چاری منہ تکتی رہ گئی۔۔۔
نے ادھار لے کر کبھی نہ واپس کرنے والی لمبی رقمیں ادھار لے لیں۔
ایک دم سادہ کی طرح اس کے آنسو پونچھتا رہا۔۔۔ ایک ناصح کی طرح سمجھاتا رہا۔

کہ وہ خود تنگ آ گیا۔
عقل آ سکتی ہے مگر آپ کو نہیں۔ آپ کا اب اور طرح کا علاج کرنا ہوگا۔ ایسے تو آپ خود کو تباہ
ایک عمر میں انسان کو اپنا خیال خود رکھنا آ ہی جاتا ہے مگر آپ تو اس امید پہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ خاص آپ
اضافی پروردگار فرشتے مقرر کر دے جو آپ کو ہر آنے والے خطرے اور دکھ سے بچاتے رہیں۔ اب
کو نہیں معلوم نہیں کہ کون سے اضافی فرشتے ہیں۔ ہیں بھی یا نہیں مگر اپنے بارے میں پکا پتہ ہے کہ مجھے
آپ ہی کے لیے بھیجا ہے۔"

نے چھوٹا بھیا بن کے رہنے کے بجائے بڑا بھائی جان بن کے رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہیں سے دونوں کے
نے نیا موڑ لیا۔ ندا کا پیارا لاڈلا منا بھیا اب اس کے نزدیک ایک روک ٹوک کرنے والا نکتہ چیں قسم کا
بن چکا تھا۔

ہر بات اس سے لاڈ کرنے والی بہن اب اس سے نالاں اور شاکی رہنے لگی مگر وصی کو یہ بھی منظور تھا۔ وہ اس
ناراضی خفگی، ہر کڑوی کسیلی ہنس کے سہ جاتا۔ جانتا تھا اس سب کے پیچھے اب بھی وہی سالوں پرانا پیار ہے۔

"ین خراب نہ ہو گئی ہو اور باقی سب کی طرح آپی بھی اگر پبلک وین یا بس میں بیٹھ گئیں تو انہیں تو روٹ وغیرہ
تم نہیں۔ پتہ نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جائیں۔"

گیٹ پہ کھڑے کھڑے گھبراہٹ سی ہوئی۔

"اور اگر کسی راہ گیر سے شادمان کی طرف آنے والا روٹ پوچھ لیا تو پتہ نہیں وہ شخص کس قماش کا ہو۔ کہیں
لاعلمی سے فائدہ نہ اٹھا لے۔ بارہ ہزار کا تو موبائل پکڑا ہوتا ہے ہاتھ میں۔ قیمتی گھڑی، ڈائمنڈ کے ٹاپس۔
کے دل میں لالچ پیدا ہو سکتا ہے اور وہ خود۔۔۔ وہ کیا کم قیمتی ہیں ہمارے لیے۔"

نے بالآخر بائیک لے کر نکلنے کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا۔ ابھی بائیک کو اسٹارٹ کرنے کے لیے پہلی کک ہی
کہ روڈ کے اس جانب سے اپنا مخصوص ہارن بجاتی وین آتی نظر آئی۔

"اس ڈرائیور کی تو ابھی خبر لیتا ہوں۔"

بڑے تیور لیے آگے بڑھا مگر ڈرائیور کا خراب موڈ دیکھ کر رک گیا۔

"س جی! آئندہ پلیز وقت پہ گیٹ سے نکل آیا کریں۔ اگر دیر سے چھٹی ہونی ہے تو صبح بتا دیا کریں تاکہ میں
راؤنڈ میں آپ کو لے جاؤں۔ آج آپ کی وجہ سے ساری بچیوں کو دیر ہوئی ہے۔"

تھی میں لائبریری میں۔ یہی سوچ رہے ہوگے تم۔" وصی کی استفسار سے پہلے ہی وہ چڑ کر بولی۔
میں میٹنگ بلائی تھی میڈم نے۔ اب کیا میں پہلے اس ڈرائیور کو انفارم کرنے نکلتی۔ سارے شہر
اور پھر بتاتی کہ آج آدھا گھنٹہ لیٹ آؤں گی۔"

"دو گھنٹے ہو رہے ہیں اور فون پہ تو بتا سکتی تھیں آپ، ہمیں بھی اور ڈرائیور کو بھی۔"
نہیں تھا۔"

کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔

تو آپ نے مجھ سے کارڈ منگوایا تھا وہ بھی ہزار کا۔"

میری ایک کولیگ نے کل جو کال کی تھی اپنے ہسبنڈ کو اور آج۔۔۔"

نے پھوپھی سے دکھ سکھ کہنا ہوگا اسی میں آپ کا کارڈ ختم۔ پھر اس کھلونے کو ہاتھ میں رکھنے کا

فائدہ۔"

"توبہ۔۔۔ بس کرو وصی۔۔۔ اور خبردار میرے پیچھے نہ آنا۔" تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لمحہ بھر کو رک کر پیچھے مڑتے ہوئے اسے وارننگ دی۔

وصی نے بے ساختہ اپنا قہقہہ روکا۔

مگر تب وہ اپنی ہنسی روک نہ سکا۔ جب ٹھیک بارہ منٹ بعد وہ اوپر سے لٹکی اسے آوازیں دے رہی تھی۔

"وصی۔۔۔ ذرا آنا تو۔۔۔ بڑے مزے کی بات ہے۔"

وصی صرف اس کا بھیا ہی تو نہیں تھا' سب سے اچھی سہیلی بھی تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے ہاتھ میکانکی انداز میں شمشاد بیگم کی بے جان ٹانگ پہ متحرک تھے اور بے تاثر نگاہیں سامنے اسکرین پہ جمی تھیں۔ جیسے اس وقت اس سے اچھا منظر دیکھنے کے لائق ہی نہ ہو جبکہ اس کی ٹی وی سے ... سب پہ واضح تھی۔

شمشاد خاموش ہونٹوں مگر بولتی آنکھوں کے ساتھ مسلسل اسے تک رہی تھی۔ اس کی گدلی آنکھوں پہ ایک تحریر نہیں تھی۔

مگر منزہ ان میں سے کسی ایک تحریر کو بھی پڑھنے پہ آمادہ نہ تھی۔

وہ کسی معمول کی طرح دن میں کئی بار اس کمرے میں آتی۔ کبھی اس کو دلیہ کھلانے' کبھی چائے پلانے' پلانے' کبھی کپڑے تبدیل کروانے۔ کنگھا کر کے چوٹی بھی بنا دیتی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار نہلا بھی دیتی مگر یہ معاملات جیسے وہ کسی روبوٹ کی مانند ادا کرتی۔ اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریز کرتے ہوئے۔

اور شمشاد بیگم جس کی آواز کی گونج سے محلہ تھرا اٹھتا تھا اور جو پچھلے تین ساڑھے تین سالوں سے... ایک لفظ تک بولنے سے بلکہ اپنے جسم کے دائیں حصے کو حرکت دینے سے ہی معذور تھی۔ وہ ایک بار... ایک بار پوری شدت سے بولنا چاہتی تھی۔ منزہ کو اتنا کہنے کے لیے کہ وہ اسے دیکھ تو لے' اس کی آنکھوں... جھانک لے۔ مگر منزہ سب کچھ کرنے پہ تیار تھی' صرف اسی ایک بات کے لیے نہیں۔

"میں کبھی معاف نہیں کر سکتی' کچھ بھی نہیں۔ میری بیٹی مجھ سے دور ہی نہیں ہوئی' پرائی بھی ہوئی... نے پلٹ کر اتنے سالوں میں ایک بار مجھے نہیں پوچھا۔ شاید۔۔۔ شاید نفرت کرتی ہے مجھ سے اور ان سب کی... جو ہے' اس کو معاف کرنا۔۔۔ کتنا مشکل کام ہے یہ۔۔۔ یہ میں نہیں کر سکتی۔ خوف خدا سے لرز کے یا نوید... اپنے تعلق کا لحاظ کرتے ہوئے میں اس کی ماں کی خدمت تو کر سکتی ہوں مگر معاف نہیں۔"

واش بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی' جب اسے دشمہ کی آواز سنائی دی۔

"ماما۔۔۔ ماما۔۔۔ کہاں ہیں آپ؟"

شاید وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے دادی کے کمرے تک آئی تھی۔

منزہ نے دزدیدہ نظروں سے شمشاد بیگم کو دیکھا جو بڑی ترسی ہوئی نظروں سے پوتی کو دیکھ رہی تھی جو اس... کھڑی تو اس کے سامنے تھی' اسی کے کمرے میں مگر اس نے ایک بار بھی دادی پہ توجہ نہیں دی تھی... آنے کے بعد وہ سارے دن کی روداد جب تک منزہ کو سنا نہ ڈالتی تھی' اسے گویا چین نہ پڑتا تھا۔

شمشاد بیگم کی پیاس دیکھ کر منزہ کے دل میں جیسے سکون سا اترا۔

اس نے ایک بار بھی دشمہ کو ٹوک کر دادی کا حال چال پوچھنے کا خیال نہ دلایا اور کیوں دلاتی۔ یہی تو... تھی۔ یہی تو اس کا حاصل تھا۔

پندرہ سال کا حاصل۔ "آج تمہاری پسند کا کھانا بنا ہے۔"

"آپ میری پسند کا نہیں بنتا۔" وہ ناز سے مسکرائی اور بازو اس کے گلے میں ڈال دیے۔

"کل میں نے اپنی کچھ فرینڈز کو گھر بلایا ہے۔ صرف اور صرف آپ سے ملوانے کے لیے۔"

"اچھا۔۔۔ بتاؤ پھر چائے کے ساتھ کیا۔۔۔"

دونوں باتیں کرتی ایک ساتھ کمرے سے باہر نکل گئیں اور شمشاد بیگم نے ادھ کھلے دروازے سے نظر آتی ان دونوں کی جھلک کو دیکھنے کے بعد ایک سرد آہ بھری اور خالی خالی نظریں دوبارہ چھت پہ لگے پنکھے پر جما دیں۔

◻ ◻ ◻

اس نے ایک ایک کر کے اپنی انگلیوں سے بیش قیمت انگوٹھیاں اتاریں۔ اور ان پہ آئل آف اولے کا مساج کیا۔

پھر اس نے اپنا چہرہ ذرا سا اونچا کرتے ہوئے اپنی لانبی گردن کا آئینے میں جائزہ لیا۔۔۔ کہیں کوئی دھبہ نظر نہ آیا۔

وہ مسکرائی اور پھر روز واٹر میں بھیگی ہوئی کاٹن سے آنکھیں تھپتھپانے لگی۔

"رینا۔۔۔" اصغر نے جمائی کے لیے بھاڑ سا منہ کھولتے ہوئے اسے بھی پکارا۔

"چل اب بس کر۔"

اسے رینا کا زیادہ دیر آئینے کے سامنے بیٹھنا برداشت نہ ہوا۔ ایک وقت وہ تھا' جب وہ گھنٹوں اس کے سامنے کسی داس کی طرح گھٹنے موڑے بیٹھا رہتا۔۔۔ اس کی اداؤں اور حسن پہ قربان ہوتا۔ دل اب بھی اس کا اسیر تھا۔ اب بھی اس کی محض ایک جنبش ابرو پہ وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا۔ لیکن وہ روپ وہ حسن وہ جوانی جس پہ وہ فدا ہوا تھا۔ وہی سب اب کھٹکنے لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ برسوں پہلے دماغ کے سب دروازے اور آنکھیں بند کر کے صرف اور صرف دل کی مانتے ہوئے وہ جس عورت کو اپنے گھر اور زندگی میں لایا تھا۔۔۔ وہ اب بھی ویسی کی ویسی تھی۔۔۔ ویسی ہی حسین' ویسی ہی بھرپور۔۔۔ امنڈنے کو بے تاب۔ چھلک جانے کو بے قرار' جسم کا لوچ۔۔۔ آنکھوں کا سرور۔۔۔ زلف و رخسار کا سحر بھی' وہی ادائیں۔ عمر نے جیسے اس کے ایک بال تک پہ کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اور خود وہ پیسے بنانے کی مشین میں ڈھل چکا تھا' ایک ایسی مشین جو کثرت استعمال کی وجہ سے اب گھرر گھرر کر کے چل رہی تھی۔ جس کے پرزے پرزے گھس چکے تھے۔

ایسے میں اسے اس عورت کا سنگھار' اس کا جوبن کیا راحت دلاتا جو اب اس کے برابر کھڑی اسے صرف اور صرف احساس کمتری میں مبتلا کر رہی تھی۔

"اور کتنا وقت لگاؤ گی؟"

"کیا مسئلہ ہے اصغر۔۔۔ سو کیوں نہیں جاتے تم۔" اب وہ ناخنوں سے کیوٹکس اتار رہی تھی۔

"رات کے وقت میک اپ کرنا ضروری ہے؟"

"میں میک اپ نہیں کر رہی' اتار رہی ہوں۔" وہ بڑبڑائی۔

"تو نہ تھوپا کر اتنا۔۔۔ لگانے میں بھی دو گھنٹے۔ اتارنے میں بھی دو گھنٹے۔"

"حد ہے جہالت کی۔" وہ تلملا کے کھڑی ہوئی۔

اور اس وقت قطعی طور پہ بھول گئی کہ وہ خود لاہور کے شاہی محلے کے اس پار بنے اسٹیشن کے پاس والے پیلی دیواروں والے اسکول سے بمشکل میٹرک کر پائی تھی۔

اتنا ہی غالباً" اصغر نے بھی پڑھا تھا۔ مگر دونوں میں فرق یہ تھا کہ وہ اتنا پڑھنے کے بعد کمانے میں جت گیا۔ اس نے خوب کمایا' ایک درمیانے درجے کے جنرل اسٹور کو۔ جو اس کا باپ بھی مشکل سے بنا پایا تھا' اس نے چند ہی برسوں میں ایک نامور ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں تبدیل کر دیا۔ باپ کی اور مظہر کی زندگی میں ہی وہ اس کی دوسری برانچ بھی کھول چکا تھا اور اب ملک بھر میں یہ ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کی سب سے بڑی چین تھی۔ اس کے علاوہ پلازے پہ... پٹرول پمپس' کاروں کا شوروم غرض جس کام میں ہاتھ ڈالا۔ وہ سونے کا ہو گیا مگر خود اصغر بھٹی سونا

بن سکا نہ کندن..... وہ اب بھی کچے لوہے کا ٹھن ٹھن کرتا ڈب کھڑیا ڈول تھا۔ نہ بولنے کا سلیقہ' نہ پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ..... خیر پہناوا تو کسی حد تک رینا نے بدل ہی ڈالا تھا مگر سلیقہ وہ چیز تھی جسے وہ گھول کے اصغر کے اندر انڈیل سکتی تھی۔ وہ اسے برانڈڈ سوٹس تو دلوا سکتی تھی مگر انہیں پہن کے باوقار انداز میں چلنا کیسے ہے یہ سکھانے کا نہ اس کے پاس وقت تھا نہ برداشت۔ کیونکہ اصغر ان معاملات میں اتنا ہی نالائق پھسڈی شاگرد تھا جتنی تیز وہ تھی۔

وہ بھی کسی بہت اچھے بیک گراؤنڈ سے نہیں آئی تھی بلکہ اصغر کی نسبت اس نے تو فاقوں' تنگ دستی اور معاشی و اخلاقی پستی کا بھی سامنا کیا تھا۔ اصغر گلیوں میں پلا تھا۔ معمولی تعلیم یافتہ باپ اور اجڈ ماں کا بیٹا تھا مگر آنکھ کھولتے ہی خوشحالی ضرور دیکھی تھی..... جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی..... تعلیم حاصل کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع بھی باپ نے مقدور بھر فراہم کر رکھے تھے۔ جن سے مظہر نے فائدہ اٹھایا اور نہ صرف کالج یونیورسٹی تک کے اعلا تعلیم اور اچھی جاب حاصل کی بلکہ اپنی شخصیت کو بھی سنوار لیا۔ مگر وہ شروع ہی سے تعلیم کے میدان میں آگے نہ آسکا اس لیے زمانے کے رنگ ڈھنگ اپنانے اور نئے دور کے ساتھ چلنے کی صلاحیت خود میں پیدا نہ کر سکا اور یہی صلاحیت رینا میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

اس نے گندی' تاریک اور بدنام گلیوں میں پرورش پائی تھی..... باپ کے نام پہ اس نے تیرہ برس کی عمر تک تین زمانے بھر کے نکمے مرد دیکھے تھے اور ماں کے نام پہ ایک ایسی عورت جو ہمیشہ اس کی سانولی رنگت' رقص سے نابلد ہونے کی خامی اور اکلوتے پن کا ماتم کرتی رہی۔ ان کے خاندان میں جس کی جتنی زیادہ اور جتنی خوب صورت بیٹیاں ہوتیں وہی بھاگوان کہلاتا اور اس لحاظ سے اس کی ماں خود کو خاصا بدنصیب سمجھا کرتی تھی۔ جو دوسری لڑکیوں کی طرح ماسٹر جی کے توڑوں اور طبلے والے کی تال پہ ٹھمکنے کے سبق لینے کے بجائے چار آنے کرائے پہ کہانیاں لا لا کے چاٹتی رہتی تھی..... اور یہی کہانیاں رینا کے دل و دماغ پہ حاوی ہو گئیں۔ وہ کسی اچھے ماحول سے ہوتی تو یہ اثر یقیناً "مثبت ہوتا مگر وقت آتے ہی وہ جان گئی کہ وہ کیا ہے' کس کی بیٹی ہے۔

اس نے حقیقت پسندی سے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ کچھ بھی کر لے کسی کہانی کی شہزادی کی طرح کوئی شہزادہ اس کے گلے میں مالا ڈالنے نہیں آئے گا..... مگر وہ ان گندی گلیوں کا تعفن بھی نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے اس نے جس حد تک ہو سکا خود کو پالش کیا۔ بازار کی رونق وہ بھی بنی..... رقص و سرور کی محفلیں اس نے بھی سجائیں۔ عشاق کی جیبیں اس نے بھی خالی کروائیں.....

مگر اپنے اسی افسانوی انداز میں..... وہ کام وہی کرتی تھی جو اس کی ماں نانی کرتی آئی تھیں مگر ان کا رنگ ڈھنگ' زبان' پہناوا وہ نہ اپنا سکی..... اسی انفرادیت کا پہلے جعفر اسیر ہوا اور پھر وہ خود جعفر کی اور اس اسیری و رہائی کے کھیل میں جب سارا خسارہ اس کے دامن میں آیا تب اسے پتہ چلا کہ وہ خود پہ کتنے بھی نفیس اور معطر پردے ڈال لے رہے گی وہی..... ناچنے والی۔

تب اس نے اپنی حیثیت کو کیش کرایا اور اصغر جیسے مال دار مگر شریف اور خاندانی شخص کی زندگی میں آ گئی جس میں اضافی قابلیت یہ تھی کہ وہ حد سے زیادہ بے وقوف تھا۔ اور رینا کے عشق میں اندھا بھی۔

رینا نے اس کی بیوی بننے کے بعد وہ سب کیا جو کوئی بھی عام خاندانی شریف زادی کر سکتی تھی۔ ساس نندوں نے کانٹا سمجھا..... تو وہ عام گھرانوں کی عورتیں بھی سمجھتی ہی ہیں۔ جٹھانی کو نکلوایا۔ وہ بھی طوائف ہونے کے ناتے نہیں' ایک حریص اور حاسد عورت ہونے کے ناتے۔ وہ جو بیوہ ہونے کے باوجود اسے خود سے زیادہ باحیثیت اور بااختیار لگا کرتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ تعلیم یافتہ تھی' اس سے زیادہ اچھے خاندان سے تھی' جس کی اس کے سسرال والے بھی عزت و تکریم کرنے پہ مجبور تھے حالانکہ اس کے سر پہ تو شوہر کا سایہ بھی نہ تھا اور وہ شوہر کے ہوتے ہوئے' اس کے بل بوتے' زور زبردستی سے بھی اپنی عزت کروانے میں ناکام رہی تھی' برداشت کرتی اسے..... سو نکال دیا اسے اور اس کی یتیم بچی کو۔

شادی کے بعد اس نے طوائف کا رنگ خود پر سے اتارنے کی بھرپور کوشش کی تھی..... اصغر سے وفادار رہی۔ محبت اس سے کر سکی یا نہیں اسے دل سے عزت دے سکی یا نہیں' یہ الگ مسئلہ ہے۔ مگر کم از کم اپنی شادی شدہ زندگی میں دوبارہ کسی اور مرد پہ نظر نہ ڈالی۔ ہاں وہ جو عرصے سے دل کے اندر تھا جعفر محمود اسے نکال کر باہر بھی نہ پھینک سکی وہ اس کے دل میں موجود تھا مگر محبت بھری ایک یاد بن کے نہیں ایک پھانس' ایک کسک بن کے۔

اس نے اصغر کے بچے پیدا کرنا چاہے بالکل کسی گھریلو وفاشعار بیوی کی طرح اور یہ کوشش کرتے کرتے وہ خود بھی دل میں یہ حسرت پال بیٹھی..... ماں بننے کی۔

ایک اور شریف زادیوں والی خواہش..... یعنی ماں بننا..... طوائفیں بھی بھلا ماں بنتی ہیں وہ صرف بچے پیدا کرتی ہیں اور اس کی ماں نے بھی اسے پیدا کیا تھا مگر ماں بن کے پالا ہوتا تو زندگی کے ابتدائی اکیس سال اس نے ٹھوکروں میں نہ گزارے ہوتے۔ شمع اور اس جیسی کتنی ہی عورتیں تھیں..... بدنصیب عورتیں جو مائیں ہوتے ہوئے بھی باجیاں یا آپائیں کہلاتی تھیں اور رینا تو سچ کی ماں بننا چاہتی تھی۔

پھر اس نے کسی اچھی بیوی کی طرح اصغر کی اس بات پہ بھی خاموشی سے سمجھوتہ کر لیا کہ وہ باہر کا کوئی بچہ گود لینے کی بجائے مظہر کی بیٹی سوہا کو اپنا لے۔

اس نے سوہا کو کھلے دل سے اپنایا۔ کسی ماں کی طرح ہی پالا..... اس کی کسی فرمائش' کسی ضد سے یہ سوچ کر ہاتھ نہیں کھینچا کہ وہ کون سا اس کی سگی اولاد ہے۔ اب تو جیسے وہ خود بھی بھولنے لگی تھی کہ سوہا اس عورت کی بیٹی ہے جس سے کبھی رینا نے نفرت کی تھی۔

اور کتنا بدلتی وہ خود کو۔ اصغر کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ اب ماضی کی رینا عرف رانی نہیں ہے۔ جو آٹھ سو روپیہ فی ڈانس کے حساب سے نائٹ فنکشن کیا کرتی تھی۔ کیا یہ ضروری تھا کہ وہ برتن مانجھ مانجھ کے ہاتھوں کی لکیروں میں کوئلے کی سیاہی اور ناخنوں میں ریت بھر لیتی۔ ایڑیاں پھٹ جاتیں۔ کمر کے گرد سائیکل کی ٹیوب کے برابر چربی لٹکنے لگتی' گردن سے گوشت ڈھلک کے چہرے کو بدنما کر دیتا' ماتھے سے بال اڑ جاتے' آنکھوں کے نیچے حلقے اور ہونٹوں کے گرد دائرے بن جاتے تب جا کے اسے یقین آتا کہ ہاں رینا نے حق ادا کر دیا بیوی ہونے کا۔

وہ خود سے غافل نہیں رہتی تھی..... بس ایک یہی گلہ تھا اصغر کو..... حالانکہ نوے فیصد شوہروں کو گلہ غافل ہونے کا ہوتا ہے کہ بیوی گھرداری میں مگن ہو کے خود کو بھول گئی ہے۔ وہ شاید خود کو ضرورت سے زیادہ یاد رکھے ہوئے تھی جو اصغر کو کھلتا تھا۔ اب تو اسے رینا کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے بھی عجیب سا لگتا۔ لوگ اسے رینا کا ڈرائیور سمجھتے تھے' چاہے وہ کتنے ہی مہنگے لباس میں ہوتا۔ قیمتی سگریٹ بھی اس کے مٹھی میں دبا کے سوٹا لگانے کی وجہ سے بیڑی کا ٹوٹا لگنے لگتا۔

"اب تو مجھے صحیح طرح یاد بھی نہیں کہ تیرے بالوں کا اصل رنگ کیا تھا۔"

اصغر نے اسے شہد رنگ کاندھوں تک آتے لہریے بالوں کو ٹائٹ بینڈ میں لپیٹتے دیکھا تو رشک و حسد سے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"اور اصل رنگ کوئی تھا بھی یا نہیں۔" وہ یونہی ہنسا۔

"اور مجھے کون سا یاد ہے کہ تمہارے سر پہ کبھی بال تھے۔" رینا نے کون سا ادھار رکھنا سیکھا تھا۔

"تھے بھی کبھی..... یا نہیں۔"

اصغر اپنے مکمل گنجے سر پہ ہاتھ پھیر کے رہ گیا۔

"کتنی بار کہا ہے کہ ہیئر ٹرانسپلانٹ کروا لو کتنا عام ہو چکا ہے اب۔"

"میں نے نہیں لگوانے گھوڑے کی دم کے بال۔" وہ بدکا۔

"پھر وہی جہالت کی باتیں۔ پتہ نہیں کس نے تمہارے دماغ میں یہ غلط اطلاع بھر دی ہے۔ ٹھیک ہے نہ لگواؤ... مگر خدا کا واسطہ ہے وہ بھیانک وگ بھی نہ لگایا کرو۔ نری شرمندگی۔"

"تمہیں تو اب میرے ساتھ جانے میں ہی شرمندگی ہوتی ہے۔ چاہے وگ کے ساتھ' چاہے وگ کے بغیر۔"

اصغر کے دل کا ملال گویا ہوا۔

"یہ تمہارا اپنا احساس کمتری ہے۔" ریتا نے تنفر سے کہا۔ "جس سے تم مر کے بھی نکل نہیں سکتے۔"

اصغر کے دل کو دھچکا سا لگا۔

کتنی آسانی سے... اور کتنی سفاکی سے وہ اس کے لیے لفظ "مر" استعمال کر گئی تھی۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں عورتوں کو... شوہر کے لیے ایسے الفاظ شاید کسی سے سننے کی بھی سکت نہ ہو کجا کہ خود کہنا۔

"زندگی ختم ہوگئی ہے تمہارے ساتھ مغز ماری کرتے ہوئے۔ اتنے سال تو انسان کسی جانور کو سدھائے تو وہ انسان کی طرح دو پیروں پہ چلنا سیکھ لے مگر..."

اس نے سر جھٹکا اور زور زور سے گردن پہ مونسچرائزر کا مساج کرنے لگی۔

اصغر دکھ سے اسے تکتا رہ گیا۔ یہ وہی تھی جس نے اسے اصغر جی اصغر جی کہہ کے سر آنکھوں پہ بٹھایا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سگریٹ سلگانے لگا۔

"ٹیرس پہ جا کے سگریٹ پیو... یہ بھی تمہیں روز بتانا ہوگا؟"

"میرا گھر ہے، جہاں میرا دل چاہے گا پیوں گا... تمہیں کیا تکلیف ہے۔" وہ بھی بالآخر بھڑک اٹھا۔

"ٹھیک ہے۔" خلاف توقع وہ آرام سے اٹھی۔

"ٹھیک ہی تو ہے، تمہارا گھر ہے۔" وہ اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔

"تو سنبھالو اپنے اس گھر کو۔ بس اس میں سے وہ سب نکال کر مجھے واپس دے دو جو میرا ہے۔"

"تمہارا؟"

"ہاں میرا... یہ زندگی جو ان دیواروں میں نظر آرہی ہے، میری دی ہوئی ہے، ورنہ کیا تھا یہاں... سوائے تمہاری ماں کے کوسنے اور بد دعاؤں کے، تمہاری پاگل بہن کی چیخ و پکار کے اور تمہاری بیوہ بھابی کے ماتم کے۔ یہ رنگ جو بکھرے ہوئے ہیں میرے ہیں۔ ورنہ کتنے لوٹتے تھے تمہارے اس بنگلے کے بھائیں بھائیں کرتے خالی کمروں میں۔ ہونہہ۔ جن عورتوں کو بالوں میں ڈھنگ سے مانگ تک نہ نکالنی آتی ہو وہ کیا سنواریں گی گھر۔ اگر یہ تمہارا گھر ہے اصغر... ! تو اسے ویسا ہی بنا لو... جیسا یہ میرے آنے سے پہلے تھا۔ اجڑا ہوا، بے رنگ و بے کشش۔ اور تمہیں پتہ ہے... ایسا کرنے کے بعد تم خود بھی ایک دن یہاں نہیں رہ سکو گے کیونکہ تم بھی اسی لائف اسٹائل کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہو، بے شک اس لائف اسٹائل کو برتنے کے نہ تم عادی ہوئے ہو نہ تمہاری کبھی یہ اوقات ہو سکتی ہے مگر دیکھنے کے عادی تو ہو ہی گئے ہو۔ تمہارے دن رات کی روٹین اسی سسٹم کی محتاج ہو چکی ہے جو سسٹم میں نے اس گھر میں رائج کیا ہے ورنہ کیا تھا یہاں۔ ڈائننگ ٹیبل پہ گرد جمی رہتی اور روٹی پہ سالن ڈال کے کھایا جاتا... ڈرائنگ روم میں ہزاروں لاکھوں کا فرنیچر پڑا سڑ رہا ہوتا اور سارا خاندان آلتی پالتی مارے دھوپ سینک رہا ہوتا۔"

اس نے کمبل ایک جھٹکا دیا اور لیٹ کر کروٹ بدل لی۔ اصغر کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"چائے دس پندرہ منٹ بعد لانا۔"

ریتا نے گریپ فروٹ جوس کے سپ لیتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔

"لیکن میرا ناشتہ ابھی اور اسی وقت۔" سوہا ساتھ والی چیئر پہ دھپ سے آ کے بیٹھی تھی۔

"تم گھر پہ ہو؟" ریتا نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"کالج نہیں گئیں آج پھر۔" خفگی جتلاتے لہجے میں کہا۔

"آنکھ ہی نہیں کھلی..." لاپروائی سے کہتے ہوئے اس نے ماں کے سامنے رکھا اخبار اٹھایا اور کسی ہولناک سی ہیڈلائن پہ ایک نظر ڈالتے ہی برا سا منہ بناتے ہوئے پرے کھسکا دی۔

"رات کو دیر سے سونے کی عادت کب چھوڑو گی تم؟"

"کیا کروں ماما... نیند ہی نہیں آتی... ناشتہ۔" بات کے اختتام پہ اس نے ایک بار صدا دی۔

"جوس منگواؤں تمہارے لیے؟"

"نہیں ماما... پلیز۔" سوہا نے ناک چڑھائی۔

"مجھے تو آملیٹ پراٹھا ہی چاہیے... بچپن کی عادت ہے، اس کے بغیر ناشتہ، ناشتہ نہ لگتا ہی نہیں۔"

... کے احساسات کی پروا کیے بغیر اپنی دھن میں کہہ رہی تھی اور ریتا کے چہرے پہ ایک رنگ سا آ کے گزر گیا۔ وہ کتنا ہی چاہتی، سوہا کے ماضی سے اس کے بچپن کو کھرچ کر نہیں پھینک سکتی تھی... ماں کی گھٹی میں ڈالی ... نہیں بدل سکتی تھی۔

... کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے سر ہلایا۔

"... بات ہے ... بھی ایک ناشتہ ہی تو ڈھنگ کا کرتی ہو۔ اس کے علاوہ سارا دن کچھ کھانے پینے کا ہوش نہیں ہوتا تمہیں۔"

ناشتہ آ گیا تھا اور وہ رغبت سے پراٹھے اور آملیٹ سے انصاف کرنے لگی، پھر اچانک اسے خیال آیا۔

"چاچو چلے گئے؟"

ریتا چاچی ہو کے بھی اب ماما تھی... وجہ اس کا عدم تحفظ کا وہ احساس تھا جو اسے حصار میں لیے رہتا تھا اور اصغر باپ کی جگہ پہ ہونے کے باوجود چاچو ہی رہا، کیونکہ اسے کوئی عدم تحفظ کا احساس نہیں تھا۔ سوہا اس کا خون تھی اور یہ بات اسے ثابت کرنے کے لیے اسے کسی اور رشتے کا نام استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"آپ کہیں جا رہی ہیں؟"

"ہوں..." ریتا نے کسی خیال میں گم مختصر جواب دیا۔

"میں بھی۔" اس نے باقی کا پراٹھا آملیٹ لپیٹ کر رول بنا لیا۔

"کہاں؟ اور ناشتہ تو سکون سے کرلو۔" ریتا نے ٹوکا۔

"راستے میں کرلوں گی۔"

"سنو تو سوہا... ! کہاں تک جانا ہے... دور جانا ہے تو ڈرائیور کو لے لو... اکیلے مت جانا۔"

وہ یہ نہ کہہ سکی کہ خود ڈرائیو نہ کرنا۔ کیونکہ سوہا جب بھی کار لے کر نکلتی ضرور ہی کہیں نہ کہیں مار کے آتی تھی اس کے باوجود وہ بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی ڈرائیونگ کو برا کہا جائے۔

"پلیز ماما...!" وہ کسی ہدایت کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔ ریتا نے سر جھٹکا اور جوس پینے لگی۔

سوہا کی ایسی خودسری اور من مانیوں کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ اور سوہا کو ان کا عادی اس نے خود ہی تو بنایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عاطف کا کنسرٹ ہو رہا ہے پی سی بھوربن میں۔"

"اللہ... لاہور میں کب ہوگا۔ پچھلے سال جب ہوا تھا اسی دن میری سسٹر کی شادی تھی مس ہوگیا۔"

چیونگم کی جگالی کرتی اس پونی ٹیل والی دبلی پتلی سی لڑکی نے مایوسی اور دل گرفتگی سے کہا۔

"مجھے ابھی تک اتنا افسوس ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ حالانکہ چوائس میری اپنی تھی کہ کنسرٹ پہ نہیں جانا اور وہ اسٹوپڈ سا ولیمہ اٹینڈ کرنا ہے۔ اگر میری سسٹر کی میرڈ لائف ایک سال بھی چل جاتی تو شاید یہ کنسرٹ مس ہونے کا اتنا افسوس نہ ہوتا مجھے۔"

اس بات پہ ان تینوں لڑکیوں نے کھل کے قہقہہ لگایا۔

"اس سے تو اچھا تھا میں عاطف کا لائیو کنسرٹ ہی دیکھ لیتی تم لوگوں کے ساتھ۔"

"اور کیا مل کے ہلا گلا کرنے، لائف انجوائے کرنے کے مواقع تو کم ملتے ہیں۔"

ذرا سے ہلکی فیگر والی بے تحاشہ گوری رنگت کی شیبا نے کٹیلا سا اضافہ کیا۔
"اسپیشلی تمہاری فیملی میں۔"
پھر سے قل قل کرتی ہنسی بکھر گئی۔
چیونگم چباتی پونی ٹیل والی سبیکا کے منہ میں چیونگم کی گردش ذرا کی ذرا تھمی۔۔۔۔ پھر وہ کھسیانے سے انداز میں ہنس پڑی۔ اس کی فیملی میں شادیوں کا ریکارڈ واقعی قابلِ رشک تھا۔ دو سے کم کسی کی نہیں تھیں۔۔۔۔ بعض تین اور چار تک چلے گئے تھے۔
"ہالی ووڈ اسٹارز کو مات دے دی تم لوگوں نے۔"
سانولی سلونی قیامت سے سراپے والی دیا نے لقمہ دیا۔ ہنستے ہوئے اس کی چھوٹی سی خوش نما ناک کے عین درمیان پھنسی چاندی کی ننھی لشکارے مار رہی تھی۔
"سوہا نہیں آئی ابھی تک۔" سبیکا نے موضوع بدلنا چاہا۔
"سو رہی ہوگی۔" دیا نے قیاس کیا۔
"یار! میں عاطف کے کنسرٹ کی بات کر رہی تھی۔" شیبا نے ٹھنکتے ہوئے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔
"میری کزن ہے اسلام آباد میں۔۔۔۔ اس نے بتایا ہے وہ تو اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ اسی ویک اینڈ پہ نکل رہی ہے بھوربن کے لیے۔"
"اسلام آباد والوں کے عیش ہیں یار۔ ! گھنٹے گھنٹے کی ڈرائیو پہ کیسے زبردست ڈیٹنگ پوائنٹس ہیں۔۔۔۔ یہاں آجا کے وہی ہوٹلز اور ریسٹورنٹ۔"
"گیسٹ ہاؤس ٹرائی کیا کبھی؟" دیا نے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔
اسے نت نئے تجربے کرنے کا شوق تھا۔
"اوہ نو۔۔۔۔ اٹس سو لو اسٹینڈرڈ۔" سبیکا نے ناک بھوں چڑھائی۔
"ویسے بھی وہاں پر ایسے ویسے لوگ جاتے ہیں۔"
"اور پولیس ریڈ بھی ہوتے رہتے ہیں۔" شیبا نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔
"تمہیں خاصا شوق ہے ایسے ایڈونچرز کرنے کا بٹ بی کیئر فل۔ ایسے کسی ریڈ میں پکڑی گئی تو۔۔۔۔"
اس نے ہاتھ سے اوپر اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔
"کم آن یار۔ ! ایک تو اس کنٹری میں انسان اپنی مرضی سے لائف بھی انجوائے نہیں کر سکتا۔ میں تو کبھی بھی یہاں نہ رہوں اگر میرے پاس چوائس ہو۔"
"لو سوہا بھی آگئی۔"
شیبا نے اسے گاڑی پارک کرنے کے بعد ہاتھ ہلاتے ہوئے یہیں آتے دیکھا تو جواباً ہاتھ ہلایا۔
"ہائے۔۔۔۔" وہ نزدیک آتے ہی ان تینوں کے گال سے گال مس کرتے ہوئے ملنے لگی۔
"اتنی لیٹ؟"
"اتنی نہیں صرف ایک گھنٹہ یار۔۔۔۔ ہم تھنگ فریش؟" اس نے دیا کا شولڈر بیگ اٹھا کے اپنی گود میں رکھا اور ہاتھ مار کے اس کی تلاشی لینے لگی۔
"ہاں عاطف کا کنسرٹ۔"
"ڈیم اٹ۔۔۔۔ اس میں فریش کیا ہے۔" آخر اس نے اپنی مطلوبہ چیز دیا کے بیگ سے برآمد کر ہی لی۔ سگریٹ کیس اور لائٹر۔
"کم آن شیبا۔۔۔۔! اب یہ ٹین ایجرز والی ایکسائٹمنٹ چھوڑ دو ان پاپ اسٹارز کے لیے۔"
"اور کیا انسان بریڈ پٹ کے پیچھے مرے تو بات بھی ہے۔" بدیسی چیزوں کے پیچھے جان چھڑکنے والی دیا نے کہا۔

"فار یور کائنڈ انفارمیشن۔۔۔۔ آئم اسٹل ان مائی ٹین ایج۔۔۔۔ اسی لیے میں ٹین ایجرز کی طرح ہی بی ہیو کروں گی۔"
شیبا نے تیز لہجے میں کہا۔
"پھنسی رہو تم اسی ٹین ایج میں۔۔۔۔ میں تو دن گن گن کر گزار رہی ہوں کہ کب اس سلی پیریڈ سے نکلوں گی۔"
سوہا نے سگریٹ کا کش لگا کے دھواں اپنے اندر اتارا۔
"کیوں ڈرنک پرمٹ بنوانا ہے؟"
سبیکا نے آنکھ میچتے ہوئے قہقہہ لگایا۔
"شٹ اپ۔" سوہا نے اس کی کمر میں دھموکا جڑا۔
"ہاؤ ناں یار۔ ! چل رہی ہو پھر میرے ساتھ بھوربن؟" شیبا اب تک وہیں اٹکی تھی۔
"بھوربن؟ سو بورنگ یار۔ نیولی میریڈ کپل ہیں کیا ہم؟" سوہا نے دھواں اگلا۔
"یار وہاں عاطف۔۔۔۔"
اس کے آگے وہ ایک لفظ نہ کہہ سکی کیونکہ سبیکا نے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پہ زور سے جما دیا تھا اور دیا اسے گھور رہی تھی۔
"اب دوبارہ اس ڈھیلی ٹائی والے کا نام لیا تو اس سے برا ہوگا تمہارے ساتھ۔"
سوہا نے ہنستے ہوئے وارننگ دی۔

☆ ☆ ☆

"لوگ تو اچھے ہیں۔ لڑکا بھی خوش شکل اور تعلیم یافتہ ہے۔" مدیحہ نے صبح ناشتے کی ٹیبل پہ بغیر کسی کو مخاطب کیے کہا۔۔۔۔ مگر جسے سنایا تھا اس تک پہنچ گیا۔
"ہوں۔۔۔۔" جعفر نے ایک نظر تحریم کے جھکے ہوئے سر پہ ڈالی جس کے تاثرات وہ بھانپ نہ پایا۔
"مگر ایک آدھ ملاقات میں کیا پتہ چلتا ہے کسی کا۔" تحریم نے فوراً سر اٹھا کے باپ کو دیکھا۔۔۔۔ اس کی نظروں سے تائید جھلک رہی تھی۔
"خیر۔۔۔۔ پتہ تو بعض اوقات ساری عمر ساتھ گزار کے بھی نہیں چلتا۔"
مدیحہ کے لہجے میں تپش تھی۔ جعفر نے بے حد ناگواری سے اس کے چہرے کو دیکھا۔۔۔۔ جو حسین و دلکش تو کبھی بھی نہیں رہا تھا، مگر اب شک، حسد اور طنز کے مستقل اثرات نے جیسے اس کے سارے نقوش مسخ کر کے رکھ دیے تھے۔
"اتنی اچھی فیملی ہے ہماری تحریم خوش رہے گی وہاں۔"
"ایک بار تحریم سے بھی پوچھ لو۔"
پتہ نہیں کیسے جعفر نے اس کے جھکے ہوئے چہرے پہ ناگواری کے تاثرات جانچ لیے اور کہا۔
"اس سے کیا پوچھنا۔۔۔۔" مدیحہ نے لاپروائی سے کہا۔
"یہ اس کا حق ہے۔"
"اور یہ حق استعمال کرنا تب اچھا لگتا ہے جب سامنے دو تین آپشنز ہوں۔ اگر ہوتے کوئی دو چار رشتے تب میں اس کے سامنے رکھتی اور پوچھتی کہ بتاؤ ان میں سے کون سا تمہیں بہتر لگتا ہے لیکن اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں دوسرا تو رشتہ آیا ہے۔ اس میں وہ کیا نقص نکالے گی۔۔۔۔ اور آپ بھی زیادہ مین میخ نہ نکالیے گا۔۔۔۔ آج کل اچھی بھلی لڑکیوں کی شادی بھی۔۔۔۔"
تحریم کو ایک جھٹکے سے اٹھتا دیکھ کے مدیحہ چپ ہوگئی۔۔۔۔ وہ ناشتہ جوں کا توں چھوڑ کے چلی گئی تھی۔۔۔۔ مدیحہ کو ملال سا ہوا۔
"تم کبھی نہ بدلنا مدیحہ!" جعفر بھی غصے سے کھڑا ہوگیا۔ "آپ کو تو موقع چاہیے میرے خلاف کچھ کہنے کا۔"

"میرے ساتھ ساتھ تم میری بیٹیوں کو بھی اپنی کم عقلی کی لپیٹ میں لے رہی ہو۔ دل دکھایا ہے تم نے ان کا۔"

"اپنی بیٹی کا دل دکھا ہے تو چوٹ لگی ہے ناں جعفر محمود صاحب کو۔"

مدیحہ نے اس پہ ایک تیکھی سی نظر ڈالی۔

"ایسے ہی آپ نے بھی کتنے ہی دل دکھائے ہوں گے۔ وہ بھی کسی کی بیٹیاں...."

"جسٹ شٹ اپ۔" وہ دہاڑا تھا۔

□ □ □ □

"ماما... پلیز آپ' آپ منع کردیں ان لوگوں کو۔"

جعفر سے جھڑپ ہونے کے بعد مدیحہ نے کیا وہی.... جس کا جعفر نے اسے مشورہ دیا تھا اور جسے عادت کے مطابق اس نے جھٹلایا بھی تھا۔

مگر اسے شدید دھچکا لگا جب تحریم نے جھجکتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

"مگر کیوں؟ کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تحریم کسی اور کو پسند کر سکتی ہے۔

"وجہ...." تحریم نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر پھر لب دبا لیے۔ ماں نے وجہ پوچھی تھی.... اس کی پسند ناپسند نہیں.... ہاں اگر سوال کچھ اور ہوتا تو شاید وحید کا نام لینے میں آسانی ہوتی۔

"دیکھو تحریم بیٹا! اپنے پاپا کے فرمودات پہ کان نہ دھرو۔ انہیں ایسے ہی دوسروں میں کیڑے نکالنے کا شوق ہے۔ وہ کوئی اجنبی لوگ نہیں ہیں۔ مسز خورشید کے پرانے جاننے والے ہیں اور مسز خورشید میری دوست ہیں وہ دیکھ بھال کے چھان پھٹک کے ہی کوئی رشتہ میری بیٹی کے لیے بھیجے گی۔ تم بالکل فکر نہ کرو اور مطمئن ہو کر ہاں کہہ دو۔"

"نہیں ماما.... میں.... میرا دل نہیں مانتا۔" وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں مسل رہی تھی۔

"کیوں' بات کیا ہے تحریم! کسی نے کچھ کہا.... مہمانوں میں سے کسی نے؟"

ابھی جن لوگوں کی جانب سے وہ بیٹی کو تسلیاں دے رہی تھی' ان ہی کی جانب سے مشکوک ہو گئی۔ اسے یونہی شک سا گزرا کہ کہیں آنے والے مہمانوں نے تحریم کو کوئی ایسے ریمارکس تو نہیں دیے جو اس کی دل آزاری کا سبب بن گئے ہوں۔

"مجھے بتاؤ.... میں ابھی فون کر کے پوچھتی ہوں مسز خورشید سے۔" مدیحہ نے تحریم کو نئی راہ سمجھائی۔

"وہ دراصل وہ جو خاتون تھیں۔ بڑے عجیب عجیب سے سوال کر رہی تھیں۔"

"کبھی پوچھ رہی تھیں میٹرک کس سن میں کیا' کبھی کچھ' کبھی کچھ۔"

"اچھا.... دیکھنے میں تو بڑی سلجھی ہوئی لگ رہی تھیں اور کیسے کرید کرید کے عمر پوچھ رہی تھیں۔ جیسے اپنا بیٹا تو ابھی بائیسویں سال میں لگا ہو۔ اچھا خاصا تیس چونتیس سال کا مرد ہے۔"

کچھ دیر پہلے تک اسے دھڑلے سے لڑکا کہنے کے بعد اب وہ تنفر سے اسے چونتیس سال کا مرد بتلا رہی تھی۔

"ان کی بڑی والی بیٹی بھی بڑی گھما پھرا کے بات کر رہی تھی.... ماما! مجھے بہت انسلٹ فیل ہوئی۔ وہ ایسے پوز کر رہی تھی جیسے یہاں آ کے مجھ پہ کوئی احسان کیا ہو جیسے میں...."

"بس کرو.... میں ابھی بات کرتی ہوں۔ میری بیٹی کو کمی نہیں ہے ایسے رشتوں کی' یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ...." وہ غصے سے کہتی باہر نکل گئی اور تحریم نے ایک سکون بھرا سانس لے کر سینے پہ ہاتھ رکھا جہاں دل پسلیاں توڑ کے باہر نکل آنے کو بے تاب تھا۔

"اوہ.... کتنے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں وحید تمہارے لیے۔"

وہ بیڈ سے اٹھی اور موبائل پہ وحید کا نمبر ملاتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔

★ ★ ★ ★

"آپی...! وصی کا برتھ ڈے آ رہا ہے۔"

"مجھے بتا رہی ہو۔" ندا نے ہنسی اڑائی۔ "وصی کے برتھ ڈے کا مجھے نہیں پتہ ہو گا کیا؟"

"سوچ رہی تھی اسے کیا گفٹ دوں؟" ظلِ ہما نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تم ہر سال سوچتی ہو۔"

اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"اس برتھ ڈے پہ وصی کو پتہ ہے کیا گفٹ دے رہی ہوں۔" ندا نے اپنے اگلے دن پہننے والے سوٹ کو پریس کرتے ہوئے خوشی سے بتایا۔

"ہوں!" اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"اس کی کار میں اسٹریو سسٹم لگوا رہی ہوں.... بالکل لیٹسٹ ماڈل کا۔"

ندا نے بلاک پرنٹ والے دوپٹے کو خود پہ پھیلاتے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور ہما نے چپکے سے دراز کھول کے اس میں اپنا کل اثاثہ... پاکٹ منی ملتی تھی اس میں سے صرف اٹھارہ سو بچے تھے۔

"ایک تو وصی کے بچے کا برتھ ڈے بھی ہمیشہ مہینے کے آخر میں آتا ہے۔"

ٹھنڈی سانس نکالتے ہوئے وہ اپنی غلطی بھول گئی کہ کیسے وہ ہمیشہ اس کی برتھ ڈے بھول جایا کرتی تھی اور سارے کی ساری پاکٹ منی اڑا دینے کے بعد اس سوچ میں ہلکان رہا کرتی تھی کہ اب اتنے سے پیسوں میں اسے کیا گفٹ دے.... ہمیشہ وہ یہ عہد کرتی کہ اس بار دسمبر میں ساری کی ساری پاکٹ منی سنبھال کے رکھنی ہے مگر کبھی یاد نہیں رہتا تھا.... یاد آتا تو تب' جب برتھ ڈے سر پر آن موجود ہوتا اور وہ دل مسوس کے رہ جاتی۔ نتیجہ یہی نکلتا کہ برتھ ڈے پہ موجود ہوتی.... مگر ہاتھ خالی اور منہ سوجا ہوا۔

ہاتھ اس لیے خالی ہوتے کہ وصی کے لائق کوئی تحفہ ہی نہ نظروں میں جچتا جو چند سو میں آ جائے۔ جو دل کے قریب ہوں' زندگی کے لیے اتنے انمول ہوں ان کے لیے تحفہ بھی سب سے نرالا.... سب سے بیش قیمت دینے کو جی چاہتا ہے۔

اور منہ اس لیے سوجا ہوتا کہ رخشندہ ہمیشہ اس کے پیسے مانگنے پہ صاف انکار کر دیتیں۔ انھیں یہ چونچلے سرے سے پسند ہی نہ تھے۔

"لینے ہیں تو اپنے لیے لو.... دوسروں پہ اجاڑنے کا فائدہ۔ صرف ایک کیک کھانے کے لیے۔"

وہ دوٹوک انکار کر دیتیں اور ہما بل کھا کے رہ جاتی۔ رخشندہ نے گھر کا ماحول کچھ ایسا بنا رکھا تھا کہ خوشحالی کے باوجود تمام اخراجات اس کے کنٹرول میں تھے۔ بچوں کو لگا بندھا خرچہ ملتا اور ان کے علاوہ پورے مہینے ایک پائی تک دینے کو تیار نہ تھیں.... ہاں ان کی تمام ضروریات پوری کرنے میں مستعد تھیں۔ ابھی تک بچیوں کی شاپنگ وہ خود کرتی تھیں۔ اچھا پہننا اوڑھنا رکھا تھا.... سلیقہ گھر کے کونے کونے سے ٹپکتا تھا۔ مگر بے جا اسراف اور شوشا سے احتراز کرتی تھیں اور بیٹیوں کو بھی یہی سبق پڑھانے کی کوشش کی تھی۔

اور شاید بچے پوری طرح اس رنگ میں رنگے جاتے اگر نیچے پروین اور ان کا بنایا کھلا ڈلا ماحول دل نہ لبھاتا۔ وہاں تفریح کھلی نہ سونے کا خاص وقت مقرر' نہ جاگنے کے اوقات۔ دل چاہتا تو پکا پکایا کھانا ملازمہ کو دے کے گاڑی میں بیٹھ کے ہوٹلنگ کرنے چلے جاتے۔

"اسٹریو سسٹم کتنے کا لگ رہا ہے؟"

ندا نے لائٹ آف کر کے نائٹ لیمپ آن کیا جب اسے اپنے بیڈ پہ لیٹی ظلِ ہما کی آواز سنائی دی۔

"مختلف طرح کے تھے۔ چائنا کا تو سب سے سستا تھا مگر کسی کام کا نہیں تھا اور تمہیں تو پتہ ہے وصی کتنا کوالٹی کانشس ہے اس لیے میں بارہ ہزار والا لگوا رہی ہوں۔"

"با..... بارہ ہزار....." ظلِ ہما کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ یہ ندا کی سیلری کا تقریباً ساٹھ فیصد تھا۔ "اتنا مہنگا؟"

"میرے بھائی سے زیادہ تو نہیں۔" وہ بڑے مان سے مسکرائی۔

"ماما کو بتایا تم نے؟"

"نہیں، اور خبردار جو تم نے بتایا۔" ندا نے اس کی جانب سے کروٹ لیتے ہوئے تنبیہہ کی۔

"میں تو نہیں بتانے والی مگر کسی کو پتہ چل گیا تو؟"

"نہیں چلے گا..... میں کون سا پیک کر کے اسے کیک کاٹتے وقت ہاتھ میں پکڑاؤں گی۔ اس کی کار میں رکھ رہی ہوں۔ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد میں۔" اس نے جمائی لینے کے لیے بات روکی۔ "اوں..... بڑی نیند ہے۔" وہ تکیہ ٹھیک کرتے کرتے چونکی۔ "سوچا تم نے؟ کیا دو گی؟"

"ٹھینگا۔" وہ جل گئی۔

"ماما ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ کیا ضرورت ہے گفٹ دینے کی اور وہ بھی ایسے مہنگے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"تمہیں بھی ماما کی طرح کنجوسی صرف دوسروں کو کچھ دیتے ہوئے یاد آتی ہے۔"

ندا نے اس کی آواز کا بھیگا پن محسوس نہ کیا۔ ظلِ ہما دوسری جانب کروٹ لے کر چپ چاپ تکیہ بھگونے لگی۔

"کاش میں بھی ندا آپی کی طرح کوئی جاب کرتی ہوتی..... میرے ہاتھ میں بھی میری تنخواہ کے پیسے ہوتے۔ خرچ کرتے ہوئے میں کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہوتی۔"

یک دم اسے ایک اچھوتا خیال آیا۔

✡ ✡ ✡

"کیا؟ جاب؟ مگر کس لیے؟ اور تمہیں جاب دے گا کون؟ بی ایس سی کا رزلٹ تک تو نکلا نہیں تمہارا۔"

رخشندہ نے اس کی بات تعجب سے سننے کے بعد تابڑتوڑ سوال کر دیے اور اس سے پہلے کہ وہ ان میں سے ایک کا بھی تسلی بخش جواب دیتی..... چند اور سوالوں کا اضافہ ہو گیا۔

"اور تمہیں جاب کی ضرورت کیا ہے؟ ایسا کون سا فارغ وقت ہے جو کاٹے نہیں کٹتا..... سو کام ہیں گھر کے اور کون سی ضرورت ہے جو ہم پوری نہیں کر رہے۔"

"ندا آپی کی بھی تو سب ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں۔ انہوں نے کی ناں جاب؟ جاب صرف ضرورتیں پوری کرنے کے لیے نہیں کی جاتی، کیریئر بنانے کے لیے بھی کی جاتی ہے۔"

"ندا ایم ایس سی گولڈ میڈلسٹ ہے۔ تم سیکنڈ ڈویژن میں بھی بی ایس سی کلیئر کر لو تو بڑی بات ہو گی۔"

رخشندہ ایسی ہی سفاکانہ صاف گوئی کی عادی تھیں چاہے مقابل ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

"اور اس کے بعد کرنا چاہو تو کسی عام سے پرائیویٹ سکول میں پرائمری ٹیچر کی جاب مل جائے گی، چار ہزار والی..... کیا اسے کیریئر بنانا کہتے ہیں؟"

"لیکن ماما.....!"

"بس..... چپ۔" رخشندہ نے اپنا تکیہ کلام دہرایا۔

"اس معاملے میں مزید بحث نہیں ہو گی۔ میں جاب کے خلاف نہیں ہوں مگر پہلے تعلیم پھر کچھ اور۔ بوریت سے بچنے کے لیے یا ٹائم پاس کے لیے جاب کا سہارا تلاش کر رہی ہو تو کوئی اور ایکٹیویٹی تلاش کرو۔ ... نے بیوٹیشن کا کورس کیا ہے، اس سے کچھ سیکھ لو۔ کام آئے گا۔" رخشندہ نے اپنے بھائی کی بیٹی کا نام لیا۔

"اس سے کیوں سیکھوں، وہ جس انسٹیٹیوٹ سے سیکھ کر نکلی ہے، وہاں سے کیوں نہیں۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ اس فضول کام کے لیے بھابی جیسی بے وقوف عورتیں بیٹی کو چالیس ہزار دے سکتی ہیں، میں نہیں۔"

... چالیس ہزار دینے ہیں تو فضول کام ہے، مفت میں سیکھنے کو ملے تو کام آئے گا۔"

... کھل کے بولنے کی ہمت نہ تھی۔

... ممانی..... وہ کتنی باتیں سنائیں گی کہ میری نیلی نے یہ کورس مفت میں سکھانے کے لیے..... "

... وہاں پتہ ہے....." رخشندہ کو بھی خیال آ گیا۔

... ہے، رہنے دو۔"

... میری دوست کی اکیڈمی ہے وہاں پہ....." اس نے دوبارہ منت سماجت والی شکل بنا کے کہنا چاہا۔ مگر رخشندہ ...

... دوست کی اکیڈمی؟"

... میرا مطلب ہے اس کے پاپا کی اکیڈمی..... نائنتھ، ٹینتھ اور ایف اے، ایف ایس سی کے بچوں کی ٹیوشن کے ... میری دو ... ٹین اور فرینڈز بھی وہاں پہ آج کل پڑھا رہی ہیں۔ صرف رزلٹ نکلنے تک..... اپنا ہی فائدہ ہے۔ ... ٹائم پاس ہو جاتی ہے اور انکل مناسب پے کے ساتھ پک اینڈ ڈراپ بھی دیتے ہیں۔"

"اچھا....." وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"اگر صرف رزلٹ نکلنے تک کے لیے ہے تو ٹھیک ہے، کر لو..... مگر رزلٹ آتے ہی تم نے یہ ٹیچنگ وغیرہ ... ہے۔ یا تو آگے ایڈمیشن لینا ہے یا پھر....."

"یا پھر.....؟" ظلِ ہما کو شہنائیاں سی گونجتی سنائی دیں۔ زرتار آنچل لہراتے نظر آئے اور اس نے بڑی آس سے ...

"... میں ناں ماما..... یا پھر؟"

"یا پھر اگر فیل ہو گئی تو دوبارہ پیپرز دینے ہوں گے۔"

فوراً ... ڈھیلی پڑ گئی۔

♣ ♣ ♣ ♣

"... آپ برسرِ روزگار ہو گئے ہیں۔"

اگلی صبح وہ اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی اور جیسا کہ اس موقع پہ پہلی پہلی بار جو سب کے ساتھ ہوتا ... اس کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

... بے حد نروس تھی۔ اس پہ مستزاد یہ کہ وصی وارد ہو گیا۔

"مبارکاں..... بھئی مبارکاں۔"

"... میری فرینڈ ہے ناں اس کے پاپا۔ ان کی اکیڈمی میں انہیں ضرورت تھی۔ ریکونسٹ کی تو میں....."

... اٹک اٹک کے بتانے لگی۔

"ریکونسٹ کی؟" وصی نے قہقہہ روکا۔

"... ریکونسٹ کی کہ آؤ اور اپنی کارکردگی سے میری اکیڈمی کی ساکھ کو بٹہ لگاؤ۔ میرے اسٹوڈنٹس کی لٹیا ڈبوؤ۔"

... قہقہے لگانے لگا اور ظلِ ہما آنسو پیتی اندر بھاگی۔

"... سمجھتا کیا ہے اسے، ایک میرا ہی نہیں ہے۔ سب کے لیے اچھا ہے بس میرے لیے....."

... باتھ روم کے بند دروازے سے لگی رو رہی تھی۔

"... وین آ گئی ہے تمہاری۔" رخشندہ نے دروازے پہ دستک کی۔

... وہ چونکی اور جلدی سے واش بیسن پہ لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ آنسوؤں نے شکل کو بد شکل بنا دیا تھا ... کاجل آنسوؤں سے بہہ گیا تھا اور ناک پکوڑا سی سرخ ہو رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی منہ پہ پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

"... جی..... نکل آیئے۔ آپ کی وین نے ہارن بجا بجا کے کان "بولے" (بہرے) کر دیے ہیں۔"

... تھا..... جس کی آواز سنتے ہی وہ نئے سرے سے جل گئی۔

"آ رہی ہوں....." جتنی شدت سے اپنا غصہ وہ اس دھاڑ میں بھر سکتی تھی اس نے بھرا..... اور کر...
دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا وصی مسکرا اٹھا۔

"ابھی تو کھانا بھی نہیں کھایا اس لڑکی نے دوپہر کا۔"
رخشندہ نے ٹرے کی جانب دیکھتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔
وصی نے ٹرے پہ ایک نظر ڈالی۔
مولی پالک کی بھجیا' آلو مٹر کا شوربہ اور بس۔
"اچھا ہی ہے جو نہیں کھایا۔" وہ بڑبڑایا سبزیوں سے اسے ویسے ہی چڑ تھی اور خاص طور پہ جب ...
ساتھ ایک اور سبزی ہو۔
"دو نوالے تو لے لو۔" اس کے نکلتے ہی سیڑھیوں کی جانب لپکنے پہ رخشندہ جلدی سے بولی۔
"کینٹین سے کچھ لے لوں گی..... وہاں ہے۔" تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہما نے جواب دیا۔
"لو..... یہ نیا خرچہ..... پانچ ہزار میں سے آدھے تو یہ لڑکی کینٹین میں اڑا دے گی۔ اسی لیے میں جاب کے ...
تھی۔ ہاتھ میں جتنے پیسے آئیں لڑکیوں کے' اتنے ہی زیادہ خرچ کرنے کی عادت پڑتی ہے۔"
ہما کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اترتے وصی نے ... ممانی کے خیالات سنے۔
وہ نیچے بیگم شوکت جہاں کے سامنے جھکی دعا لے رہی تھی۔
"زکام ہے تمہیں؟" انہوں نے اس کی روئی روئی آنکھیں دیکھ کر پوچھا۔
"جی..... " اور کیا کہتی۔
"تو گھر بیٹھو..... ضرور جانا ہے زکام میں۔" انہوں نے فوراً" مشورہ دیا اور اس مشورے کی تائید فوراً" ...
جانب سے آئی۔
"اور کیا..... وہاں معصوم طالب علموں میں بھی جراثیم پھیلاؤ گی۔ بے چاروں کے امتحان سر پہ ہیں۔"
"تم سے بات نہیں کر رہی میں۔" وہ تپ کے کہتی باہر نکلی۔
"لعنت ہے مجھ پہ جو میں اس کی خاطر یہ چخ چخ والی جاب کر رہی ہوں۔ صرف اس کو گفٹ دینے کے ...
کبھی بھی نہیں' میں تو اسے ٹھینگا بھی نہیں دوں گی۔"
وین میں بیٹھی وہ کڑھ کڑھ کے سوچتی رہی اور کینٹین میں برگر کھاتے ہوئے اسمارہ سے کہہ رہی تھی۔
"اسمارہ..... یار اپنے پاپا سے کہہ کے مجھے ایڈوانس سیلری دلوا دو۔"
یہ پلان وہ پہلے سے سوچے ہوئے تھی..... ظاہر ہے چھ دن بعد ہونے والی برتھ ڈے پہ گفٹ دینے کے ...
پورے مہینے تو تنخواہ کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔
"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں وہ میرے پاپا نہیں' سر ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ کسی بھی صورت ایڈوانس نہ...
گے نہ تمہیں نہ مجھے۔"
"اچھا....." اسے قدرے مایوسی ہوئی۔
"کیا فائدہ ہوا پھر....." اس نے منہ لٹکا لیا۔ وہ تو دوپہر کے کھانے کے بعد لمبی تان کے سونے کی عادی ...
سونے سے پہلے..... یا جاگنے کے بعد ڈائجسٹ پڑھنے کا چسکہ بھی تھا اور یہ دونوں شوق بستر میں ...
کیے جاتے تھے۔ اپنے پیارے بیڈ سے جدائی اس لیے تو نہیں برداشت کی تھی کہ.....
"اچھا' تم تھوڑے پیسے دے دو۔" اس نے جھٹ اپنی اور اسمارا کی دوستی پہ ادھار کی قینچی چلانا چاہی۔
"کتنے؟" برگر کا نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے اس نے پوچھا۔
"تین دے دو..... تین ہزار۔"
اسے فوراً" بیگ میں ہاتھ مار کے سو سو کے نوٹ نکالتے دیکھ کے ہما نے اضافہ کیا۔

"... کرنے ہیں؟"
"... کیا؟..... دینے ہیں تو دے دو۔"
... میں پانچ ہزار رکھنے کے بعد اس نے بڑی مشکل سے نائنتھ اور ٹین کی لڑکیوں کو فزکس پڑھائی کہ
... کے سامنے مختلف چیزیں گھوم رہی تھیں۔
... شرٹ' کبھی ٹائی' کبھی کف لنکس' کبھی کوئی اچھی کتاب۔
... تک کلاسز لینے کے بعد اس نے سیدھا شادمان مارکیٹ کا راستہ پکڑا۔

☼ ☼ ☼

"وحید! آپ اپنے گھر میں بات کیوں نہیں کرتے؟"
دونوں جناح سپر کے ایک خوب صورت ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے جب تحریم نے وحید سے کہا۔
"... کروں گا۔" وحید نے مینیو کارڈ سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔
"مجھے تو لگتا ہے جیسے آپ نے بات کی ہے مگر وہ مانے نہیں اور آپ مجھے اس لیے ٹال رہے ہیں کہ مجھے برا نہ ...
... دل کا خدشہ زبان تک لے آئی۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے تحریم! میں صرف مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔"
"یا مناسب وقت؟ آپ اسٹیبلش ہیں..... اچھی جاب پہ ہیں کوئی خاص ذمہ داری بھی آپ پہ نہیں' پھر اتنا ...
... کیوں؟"
اس کے جرح کرنے پہ وحید کو اچھا خاصا غصہ آ گیا۔
"دیکھو تحریم..... ! میں کوئی تمہارے ساتھ فلرٹ نہیں کر رہا۔ سیریس ہوں اور شادی بھی ایک نہ ایک دن
... ساتھ کروں گا۔ لیکن تمہارے انداز سے لگ رہا ہے جیسے تمہیں مجھ پہ شک ہے۔ ٹھیک ہے اگر تمہیں
... رشتے پہ اعتبار ہی نہیں تو کیا فائدہ اتنی دور تک آنے کا۔"
... خفا ہو گیا اور تحریم کی جان پہ بن آئی۔
"میرا یہ مطلب نہیں تھا وحید..... ! میں تو..... پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔"
اس کی منت اور آنسو بھری آنکھوں کے آگے وحید کی خفگی ہار مان گئی۔
"اوکے..... لیکن تم وعدہ کرو کہ بار بار یہ ذکر کر کے مجھے اری ٹیٹ (مشتعل) نہیں کرو گی۔"
"اری ٹیٹ؟" وہ دکھ سے لب کچل کے رہ گئی۔
"میری ایسی کوئی نیت نہیں..... میں تو صرف..... دراصل جب کوئی پرپوزل آتا ہے اور گھر والے مجھ پہ پریشر
... ہیں تو....."
"تو تم وہ سارا پریشر مجھ پہ ڈال دیتی ہو۔" وحید نے اس کی بات مکمل کی۔ "فار گاڈ سیک تحریم..... ! اس رشتے کی
... اور نزاکت کو ان باتوں سے تباہ مت کرو۔ اگر میں کسی بھی لڑکی کو شادی کے نام پہ صرف اور صرف
... اور سمجھوتوں سے جکڑ کے گھر میں قید کرنے والا ہوتا تو کب کا شادی کر چکا ہوتا۔ جب تم میری زندگی
... اس سے بھی پہلے.....!"
تحریم نے خاموشی سے گردن جھکا لی..... واقعی ایسا ہو بھی سکتا تھا کیونکہ وحید کی عمر اس وقت لگ بھگ
... تھی۔
"... نے ایسا نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نہ تو یہ چاہتا تھا کہ میری بیوی گھر کی ذمہ داریاں نبھانے
... ساتھ معاشی تگ و دو میں بھی میرا ہاتھ بٹائے اور نہ یہ کہ گھر بیٹھی میری محدود آمدنی کا بجٹ بنا بنا کے ہلکان
... میں عورت کے کام کرنے کے خلاف نہیں ہوں لیکن یہ کام وہ صرف اپنی ذات اور شوق کی تسکین
... وقت گزارنے کے لیے یا پھر اپنی اعلا تعلیم کو بروئے کار لانے کے لیے تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ مجھے

گوارا نہیں کہ میری نا اہلی کا اعلان کرتی..... مجھ سے مایوس ہوتی وہ گھر سے باہر نکلے۔ اپنی ضرورتیں پوری
کرنے کے لیے۔"

وہ بول رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح تحریم سحرزدہ سی سن رہی تھی۔ اس کے یہی اچھوتے خیالات تو پسند تھے اسے

"تم خود سوچو..... کسی دوسری عورت کے لیے میرے یہ جذبات ہیں تو تم..... تم سے تو میں پیار کرتا ہوں تحریم
ہے مجھے تم سے۔"

تحریم کی پلکیں لرزتی ہوئی جھک گئیں۔

"میں نے تمہارے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے..... بہت کچھ۔ ایک اچھا مستقبل دینا چاہتا ہوں میں تمہیں
ہر آسائش، ہر سہولت، دنیا جہاں کی تمام نعمتیں میں تمہارے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ..... آپ ہی میرے لیے کافی ہیں وحید۔ یقین کیجیے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"پھر وہی بات..... تمہیں کچھ چاہیے ہو یا نہ ہو..... بس اسے میری خواہش سمجھ لو..... میں ابھی خود کو تمہارے
قابل نہیں پاتا تحریم!"

"مگر....." اس نے کچھ اور کہنا چاہا مگر وحید نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

"میرے لیے اتنا سا بھی انتظار نہیں کر سکتی..... ہوں۔"

"ساری عمر کر سکتی ہوں..... مگر ماما بار بار....."

"میری خاطر یہ معاملہ کچھ دیر اور سنبھال نہیں سکتیں؟" اس نے ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے پھر سے بات کی۔

تحریم اسے دیکھ کے رہ گئی اور خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"چلو..... اب آرڈر دو۔"

"ایک شرط پہ....."

"وہ کیا؟"

"اس بار بل میں پے کروں گی۔"

"وہ کس خوشی میں؟" وحید نے ابرو چڑھائے۔

"آپ ہر بار اتنے مہنگے ریسٹورنٹس میں لے آتے ہیں اور؟"

"شش۔" وحید نے اس کے لبوں پہ انگلی رکھی۔

اس کا رواں رواں لرز کے رہ گیا۔ وہ اب تو کیا..... دیر تک کچھ بولنے کے قابل نہ رہی تھی۔

"دوبارہ ایسا مت کہنا۔ ابھی میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں کہ تم سے ملنے کے لیے یہ اہتمام بھی نہ کر سکوں۔ ویسے
میں نے تمہارے لیے لیا ہے۔"

اس نے جیب سے ایک ڈبیا نکال کر کھولی۔ اس میں نازک سی سونے کی انگوٹھی تھی۔

✲ ✲ ✲

"آپی..... آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟"

مدیحہ کو تو اس نے ٹال دیا تھا مگر وہ تقدیس تھی..... اس کی چھوٹی بہن، اس کی دوست، اس کی سب سے
اور اس کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والی۔

"میں سارا وقت آپ کے پاس، بالکل ساتھ بیٹھی تھی، پھر کیوں کہا ماما سے آپ نے..... کہ ان لوگوں نے
فلاں باتیں کی ہیں۔"

تحریم سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو جھنجھلا کے زور زور سے بالوں میں کنگھا پھیرنے لگی۔

"میں کچھ پوچھ رہی ہوں آپی؟"

"تمہیں پتہ چل ہی گیا ہے کہ میں نے جھوٹ بولا تھا تو یہ بھی جان لو کہ جھوٹ کس لیے بولا جاتا ہے۔
کیونکہ میں وہاں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"کہاں کرنا چاہتی ہیں؟"

اس کے واضح سوال پہ وہ تھم گئی۔

جواب اس کے پاس تھا۔ وہ دے بھی سکتی تھی لیکن اس کے بعد جو سوال ہوتے ان کے جواب دینے کی
وہ اس لیے نہیں تھی کہ وحید سے کیے وعدے کی پابند تھی..... یعنی انتظار کرنے کی۔
انکار کر سکتی تھی..... مگر اس کے گھر والے نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ جس دن مدیحہ کو وحید کے بارے میں پتہ
چلے گھر بلوانے کے لیے زور دینے پہ تل جائیں گی۔

"کہیں سے بھی نہیں۔"

اس نے آہستہ سے کہتے ہوئے بالوں میں بل دینا شروع کیے۔ مگر اپنے سوال پہ تقدیس نے تحریم کا ٹھٹکنا
محسوس کر لیا تھا۔ وہ اس جواب پہ مطمئن نہیں ہوئی۔

"آپی..... کوئی ہے ناں؟"

"نہیں بھی....." وہ گھبرا کے اسے سامنے سے ہٹاتے ہوئے آگے نکلنے لگی کہ بیڈ پہ رکھے موبائل کی بیل پہ رکی۔
اس نے ایک نظر فون کو دیکھا اور پھر تقدیس کو..... پھر آہستہ سے اٹھا کے کانوں سے لگا لیا۔

"ہوں..... اچھا، نہیں کل، اوکے۔"

اور بار وہیں رکھ کر کن اکھیوں سے تقدیس کو دیکھتی باہر نکل گئی۔

تقدیس بری طرح الجھ رہی تھی۔

کوئی چیز تھی جو اسے آگے بڑھ کے کچھ کرنے پہ اکسا رہی تھی۔ بالآخر وہ رہ نہ سکی اور فون اٹھا کے اس کا کال
ریکارڈ چیک کیا۔ ڈیڑھ منٹ پہلے آنے والی کال جس نمبر سے آئی تھی وہ نمبر "اسپیشل" کے نام سے Save تھا۔

✲ ✲ ✲

"کہاں گھوم رہی ہو؟" وصی کی آواز سن کر وہ کرنٹ کھا کے اچھلی تھی۔

اسے اپنے بالکل سامنے پا کے وہ حواس باختہ ہو گئی۔

"بتاؤ تم نے جاب اکیڈمی میں کی ہے یا اس گارمنٹس اسٹور میں سیلز گرل کی۔"

تمہیں نکالے اسے گھور رہا تھا۔

"ارے واہ..... میں کیوں بننے لگی سیلز گرل۔"

"تو پھر کیا لگا رکھا ہے سامنے؟"

اس نے کاؤنٹر پہ پھیلے سامان پہ نظر ڈالی..... مردانہ پرفیوم، آفٹر شیو..... ٹائی اور کف لنکس..... جیکٹ اور
... سیلز مین اس کا مطلوبہ گفٹ ریپر لینے گیا تھا۔

"ظاہر ہے یہ سب تمہارے کام کا تو ہے نہیں۔"

"اور ظاہر ہے کہ اگر میں سیلز گرل ہوتی تو کاؤنٹر کے اس طرف نہیں، اس طرف ہوتی اور رہا یہ سامان تو..... یہ تو
... یہاں رکھا ہے۔"

"اور تم اس تاک میں ہو کہ موقع ملتے ہی ایک آدھ چیز پار کر لو۔ ویسے اس وقت تو تمہیں اکیڈمی ہونا چاہیے۔"

"... سے آرہی ہوں۔ یہ سامنے تو ہے۔ روڈ کے اس پار پوسٹ آفس کے بالکل ساتھ۔ مجھے کچھ لینا تھا اس
لیے یہاں آ گئی۔"

"ہوں۔" وہ اطمینان سے کھڑا تھا۔ "تمہیں کیا لینا ہے؟" وہ جز بز ہوئی۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"اکیڈمی کی پک اینڈ ڈراپ ہے۔" اس نے یاد دلایا۔

"مگر ممانی کہہ رہی تھیں کہ تم دو گھنٹے میں فارغ ہو جایا کرو گی اور وین تمہیں ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کروائے گی اس لیے میں تمہیں لے آؤں۔۔۔ چلو آؤ۔"

اس نے بھی بہتری اس میں جانی کہ چپ چاپ اس کے پیچھے چلی آئے ورنہ سیلز مین آجاتا تو سارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

دکان سے نکلتے نکلتے اچانک اسے یاد آیا کہ پے منٹ تو وہ کر چکی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔

اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کے دیکھا اور پھر ساتھ کھڑے وصی کو۔۔۔ چار ہزار روپے کے ضائع جانے سے بہتر کہ وہ اسے سچ بتا ہی دے۔۔۔ بھاڑ میں جائے سرپرائز گفٹ۔

"تم تو کہہ رہی تھی کہ کچھ لینا ہے؟" اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی وصی بول اٹھا۔ "لینا بھی تھا یا صرف گھومنے پھرنے کا شوق پورا کرنے کے لیے بہانہ بنایا تھا۔ میں بھی سوچ رہا تھا ظلِ الٰہی نے بیٹھ کر روٹیاں توڑنے کے علاوہ کام کرنے کا کیسے سوچ لیا۔ اب پتہ چلا کہ مارکیٹ یہاں سے قریب ہے۔"

"لیکن میں۔۔۔" وہ رکی اور پیچھے مڑ کے دیکھا 'اسٹور کے گلاس ڈور سے سیلز مین کاؤنٹر پہ چیزوں کے ساتھ کچھ حیران پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

"اب میری برتھ ڈے کا بہانہ مت بنا دینا کہ تمہارا گفٹ لینا تھا۔۔۔ کیونکہ اس کی تو تمہیں کبھی توفیق ہوئی نہیں۔" ہما نے چپ چاپ قدم آگے کی جانب بڑھا دیے۔

"اور یہ ہے میرا گفٹ۔۔۔"

ردا نے جوکر والی بڑی سی رنگین کاغذی ٹوپی اس کے سر پہ پہناتے ہوئے کہا۔ وہ ایک نمبر کی پڑھاکو تھی کتابی کیڑا۔ اسی وقت اپنے کمرے سے نکلا کرتی جب ایسی کوئی گیدرنگ ہوتی۔ ورنہ وہ تھی اور اس کی کتابیں۔

"شرم کرو۔۔۔ اس نے کم از کم کچھ تو دیا ہے۔"

وصی نے سر کو دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے ٹوپی کے پھندنے کو گھمایا اور اپنے اوپر ہنستے ہوئے حاضرینِ محفل کو غیرت دلائی۔

"تم تو سب بس کیک ٹھونسنے کو تیار آ گئے ہو۔ خالی ہاتھ تالیاں بجاتے۔"

"ہاتھ خالی ہوں گے تو تالیاں بجیں گی۔" حسان نے خالی ہاتھ آنے کا جواز پیش کیا۔

"کتنا برا لگے گا تم موم بتی پہ پھونکیں مار رہے ہو گے یا کیک پہ چھری چلا رہے ہو گے اور بیک گراؤنڈ میں تالیوں کی گونج نہ ہو۔"

"ویسے بھی ہم کب تک لاتے رہیں تحفے۔۔۔ تم تو کیک کاٹتے کاٹتے تھکتے نہیں ہو۔۔۔ ہم تحفے لا لا کے تھک گئے ہیں بھائی۔"

ندا نے ہاتھ جوڑے۔۔۔ اپنا تحفہ وہ فی الحال سب کے سامنے دے کر رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ رخشندہ کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر نہ صرف منہ بنا لیتیں بلکہ شاید دو چار کڑوی کسیلی سنا بھی دیتیں۔ وہ وصی کی برتھ ڈے کا مزا کرکرا نہ کرنا چاہتی تھی اس لیے ابھی تک اپنا تحفہ خفیہ رکھا ہوا تھا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔

"دیکھ لیا نانو! آپ کی ضد کی وجہ سے مجھے ہر سال شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔"

اس نے مڑ کے شوکت جہاں سے گلہ کیا جن کی فرمائش پہ ہر بار اس کی سالگرہ اہتمام سے منائی جاتی تھی۔

"ہر سال! یعنی سال میں صرف ایک بار؟۔۔۔ کیوں کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہو یار!" حسن نے غبارے باندھتے ہوئے کہا اور اسٹول سے نیچے اتر آیا۔

"چلو بھئی کیک کاٹو۔ کسی کا انتظار ہے؟" حسان نے صدا بلند کی اور یہ صدا وہ پچھلے پون گھنٹے میں سات بار بلند کر چکا تھا۔

"بس آ جائیں اب۔۔۔" حسان ڈھونڈ ڈھانڈ کے سب کو اکٹھا کرنے لگا تاکہ کیک کٹے اور وہ اپنا فرض بخوبی ادا کر کے پلیٹ پہ پلیٹ خالی کرنے کا۔

"ہما نیچے اترو۔" منہ اونچا کر کے اسے بھی آواز دی۔

"وہ شاید گفٹ پیک کر رہی ہے۔" وصی نے ایسے آس بھرے لہجے میں کہا کہ سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ہما کی کنجوسی سے وہ سارے ہی واقف تھے۔ رخشندہ نے البتہ ناگواری سے پہلو بدلا کچھ کچھ سن گن تھی انھیں بھی کہ جب بھی ہما کی کنجوسی اور کفایت شعاری کا ذکر ہوتا ہے 'فلابے' ان ہی کی ذات سے ملائے جاتے ہیں۔

منہ پھلائے ہما بھی نیچے اتر آئی اور حسبِ سابق خالی ہاتھ اسے آخری سیڑھی اترتے دیکھ کے سب سے پہلا نعرہ وصی کا چھوٹا تھا اور پھر کسی وبا کی طرح سارے میں ہی پھیل گیا۔ بیگم شوکت جہاں اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے انہیں ہلکی پھلکی سرزنش کر رہی تھیں۔ کبھی رخشندہ کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتیں تو یہ مسکراہٹ فوراً ہی غائب ہو جاتی اور وہ بوکھلا کے پروین کو اشارے کرنے لگتیں کہ وہ سب کو روکے۔

"بس۔۔۔" پروین نے اونچی آواز میں کہا۔

"اب مزید کوئی بدتمیزی ہوئی تو کھانا نہیں ملے گا۔۔۔ بھوکے رہنا پارٹی میں۔"

"ہاں۔۔۔ میری لمبی عمر کے لیے نفلی روزہ مان کر۔" وصی نے لقمہ دیا اور پل بھر کو تھمی ہنسی کی قل قل پھر سے رواں ہو گئی۔ اس بار بھی ہما نے اس ہنسی کا ساتھ نہ دیا۔ اسے رہ رہ کے اپنے چار ہزار کا دکھ ستا رہا تھا۔۔۔ اور اس پہ بھی بڑھ کے یہ غم کہ ہر بار وہ رقم نہ ہونے پہ تحفہ نہ دینے کی سبکی سہتی تھی اور اس بار پورے چار ہزار گنوا دینے کے بعد بھی وہی حال۔۔۔

"وصی! بھیا کا فون ہے تمہارے لیے۔" ردا نے کارڈلیس اس کی جانب بڑھایا۔

"ہیلو۔۔۔ تھینک یو یار۔ انہیں ایمان سے اتنی خوشی ہو رہی ہے تمہارے فون کی کہ بتا نہیں سکتا۔۔۔ کم از کم یہ تو کہہ سکتا ہوں اب کہ میرے برتھ ڈے پہ کسی نے چار پیسے تو خرچ کیے۔۔۔ چاہے فون کال پہ ہی۔"

حالانکہ وہ جانتا تھا ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیک کٹتے ہی سب کے چھپا چھپا کے رکھے گفٹس اچانک نکل آتے۔ پیار بھرے چھوٹے چھوٹے تحفے۔۔۔ جن کی قیمت ان کے دینے والوں کا خلوص تھا۔

"ہیلو ہاں اب کلیئر آ رہی ہے آواز؟" وہ ذرا دور چلا گیا۔ رخشندہ کے چہرے پہ بے تابی سی تھی۔۔۔ پردیس بیٹھے بیٹے سے بات کرنے کی بھی۔۔۔ اور کال لمبی نہ ہو جائے اس فکر کے رنگ بھی نمایاں تھے۔

"امی۔۔۔ آپ نے وشمہ کو بلایا؟"

پروین بیگم شوکت جہاں کو ان کے رات کے کھانے سے قبل کھائی جانے والی دوا دے رہی تھی جب حسن نے کیمرے میں ریل ڈالتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا۔

"نہیں بھئی۔۔۔ دھیان ہی نہیں رہا۔"

"کمال ہے ایک فون کرنا تھا بس۔" وہ جھنجھلایا۔ سارا سرسری پن یکدم سے غائب ہو گیا۔ شوکت جہاں نے دوائیاں پھانکتے ہوئے پل بھر کو اس پہ نظر ڈالی اور چونک سی گئیں۔

"اصل بات تو یہ ہے کہ بھابی اس کا یہاں زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔"

"اس کی پھوپھی کا گھر ہے۔۔۔ وہ کیوں اعتراض کرے گی بھلا؟"

"سوری اماں جان! جب سے ماں کسی بے جان وجود کی طرح بستر پہ پڑی ہے اور بھائی نے اپنے آپ کے ساتھ گھر کے کل اختیارات اسے سونپ دیے ہیں' تب سے میں نے تو ایسے سوالوں کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ بھائی کے ساتھ ساتھ بھتیجی بھی اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جہاں کا حکم دے گی' وہاں جائے گی۔ جہاں سے روکے گی وہاں نہیں جائے گی۔"

"آجاتی توذرا دل بہل جاتا۔" حسن بڑبڑایا۔

"میں لے کر آؤں؟"

"نہیں..... رہنے دو۔ میں نے بلاوے کا فون کیا ہوتا اور بعد میں تم لینے جاتے تو بات بھی تھی..... اب اعتراض ہو گا کہ وقت کے وقت لینے آگئے۔"

"تو ہم کون سا کوئی باقاعدہ تقریب منعقد کیے بیٹھے ہیں۔ بچوں کے مل بیٹھنے کا بہانہ ہے بس۔ گھر کے لوگ ہیں اور وشمہ کون سا غیر ہے۔ جاؤ حسن بیٹے لے آؤ وشمہ کو..... کیک گھنٹہ بعد کٹ جائے گا۔"

شوکت جہاں نے گویا اس کے دل کی بات کہی اور پھر اپنی بات کا ردِ عمل اس کے چہرے سے کھوجنے لگیں۔ یکا یک روشنیاں سی پھوٹنے لگیں تھیں۔ کیمرہ رکھ وہ تیر کی طرح باہر لپکا تھا۔ اپنے اندازے کی درستی پہ وہ مسکرا اٹھیں۔ اور قدرے ملول سی بیٹھی پروین کی جانب دیکھا۔

"اماں جان! آپ نے ایسے ہی بھیج دیا حسن کو۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے بھابی کے موجودہ رویے کا..... وہ اب پرانی منزہ نہیں ہے۔ مجھے تو بڑا خوف محسوس ہوتا ہے اس سے۔ پتہ نہیں کیوں بس ایسا لگتا ہے جیسے کسی کے ہاتھ اچانک بہت زیادہ طاقت، بہت سے اختیارات آجائیں اور اسے موقع نہ مل رہا ہو ان کے استعمال کا۔"

"سارے خدشے جھٹک دو پروین..... اور مطمئن ہو جاؤ۔ وشمہ تمہارا خون ہے۔ ٹھیک ہے منزہ سے وابستگی اور لگاؤ کی وجہ سے وہ تم سے اتنی نزدیک نہیں ہے جتنی بچیاں عموماً پھوپھیوں سے ہوا کرتی ہیں مگر اس کی وجہ منزہ کا عدم تحفظ بھی ہو سکتا ہے۔ سوتیلی ہونے کے باوجود اس نے وشمہ کو ہتھیلی کا چھالا بنا کے پالا..... اس کا اعتراف تم بھی کرتی ہو۔ کہیں کوئی دوسرا رشتہ اس پہ غالب نہ آجائے اس لیے اس نے وشمہ کو باقی سب سے دور رکھنا چاہا ہو گا۔ لیکن جو بھی ہو' ایک ماں چاہے سگی ہو..... چاہے سوتیلی بیٹی کو کب تک پردوں میں چھپا کے رکھ سکتی ہے۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے ادھوری سی بات کی اور پروین کچھ چونک کر اس ادھوری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ایسے ہی اچانک؟" وشمہ حسن کی بات پہ حیران رہ گئی۔

"تو کیا ہوا؟ گھر کی ہی تو بات ہے۔"

پورے ڈیڑھ ماہ بعد دیکھ رہا تھا وہ اسے..... پھر بھی احتیاط لازم تھی کہ کہیں دل کی بے تابی نگاہوں کی وارفتگی سے ظاہر نہ ہو جائے۔

"پھر بھی..... کیا تھا جو پھوپھو مجھے ایک فون ہی کر دیتیں۔"

"میں خود جو آگیا ہوں لینے فون کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ تو ٹھیک ہے حسن بھائی! لیکن پھوپھو..... خیر ان سے کیا گلہ..... انہیں میں یاد تھوڑا ہی رہتی ہوں۔"

اسے اپنی اکلوتی پھوپھی سے وہی گلے تھے جو پھوپھی کو اس سے تھے اور ہر دو جانب ان شکووں کے ہونے کی وجہ منزہ ہی تھی۔

"وشمہ..... امی تمہیں اتنا یاد کرتی ہیں کہ ایک وقت وہ تھا جب مجھے تم سے حسد ہونے لگا تھا۔"

"اب نہیں ہوتا؟" وہ یونہی ہنس پڑی۔

"اب..... اب میں خود تمہیں اس سے بڑھ کے یاد کرتا ہوں۔"

اس کا دل یہ کہہ دینے کو بے اختیار ہوا مگر اس نے فوراً "ڈپٹ کر اسے قابو میں کیا اور بولا تو فقط یہ۔

"وہ بچپن کی بات تھی..... رہا امی کے فون نہ کرنے کا سوال تو صاف گوئی سے کہوں گا کہ انہیں خدشہ تھا کہ ممانی انکار کر دیں گی تمہیں اکیلے بھیجنے سے اور ممانی کو ہم نے اس لیے نہیں بلایا کہ خاندان کے اور کسی بڑے کو نہیں بلایا بس گھر کے لوگ مل کے ہلا گلا کر رہے تھے ان کو بلانے سے پھر اور لوگوں کو اعتراض اور شکایت کا موقع ملتا بس یہ تھی ساری بات۔"

"تو آپ کیوں آئے؟ آپ کو ڈر نہیں تھا اس بات کا کہ ماما انکار کر دیں گی؟"

"ہاں..... امید تو مجھے بھی نہیں تھی..... پھر بھی میں نے سوچا ہو آؤں شاید' شاید وہ مان جائیں..... اور اگر نہ بھی مانتیں تو کم از کم میں تم سے مل ہی آؤں' تمہیں دیکھ ہی لوں۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے اس کی آواز بوجھل سی ہو گئی تو اس نے فوراً "خود کو نارمل کیا۔

"کافی عرصہ ہو گیا ہے ناں ہمیں ملے ہوئے۔"

"ہاں..... یہ تو ہے..... اچھا میں پوچھتی ہوں ماما سے۔ آپ چائے..."

"نہیں نہیں اس کا ٹائم نہیں ہے۔ وہاں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"کون کس کا انتظار کر رہا ہے بھئی؟"

منزہ سلام پھیرتے ہی جائے نماز سے اٹھ آئی تھی..... جیسے ہی ماسی سے پتہ چلا کہ پروین کے گھر سے کوئی آیا ہے اور وشمہ ڈرائنگ روم میں اس کے ساتھ ہے تب سے نماز کے دوران بھی سارا دھیان اسی جانب تھا۔

"ماما! وہ حسن بھائی مجھے لینے کے لیے آئے تھے۔ وصی کا برتھ ڈے ہے آج۔"

"وصی؟..... اچھا اچھا۔ وہ تم لوگوں کا کزن۔ اس کا برتھ ڈے ہے تو وشمہ..... ! میرا مطلب ہے تمہارا ایا حسان کا ہوتا تو اور بات تھی۔"

اس بات پہ حسن نے بڑی گلہ آمیز نظروں سے وشمہ کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"میں نہ کہتا تھا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ برتھ ڈے چاہے تمہارے کزن کا ہو گھر تو وشمہ کی پھوپھو کا ہے۔ وہ جب چاہے وہاں جا سکتی ہے خاص طور پہ تم لینے آئے ہو تو میں انکار تو نہیں کر سکتی۔ جاؤ وشمہ..... ! تیار ہو جاؤ۔"

اب جتاتی نظروں سے حسن کو دیکھنے کی باری وشمہ کی تھی۔ پھر اس نے بڑے مان اور فخر بھرے انداز میں منزہ کے گلے میں بازو ڈالے۔

"اوکے ماما..... ! آپ بور تو نہیں ہوں گی اکیلی..... آج پاپا بھی دیر سے آئیں گے۔"

"نہیں ہوتی..... تم ہو آؤ..... پھر دیر تک باتیں کریں گے' صبح تمہاری کالج سے چھٹی ہے ناں..... اور حسن! اسے ٹائم پہ چھوڑنے آجانا..... یا میں اس کے پاپا کو فون کر دوں؟ وہ لینے آجائیں۔"

"نہیں میں آجاؤں گا۔" وہ ابھی تک وشمہ کے سامنے اپنے خیال کے اظہار پہ شرمسار تھا۔

"اور پروین سے کہنا' مجھے بہت اچھا لگا۔ اس نے بھتیجی کو یاد رکھا..... دیکھو کیسے کھل سی گئی ہے وشمہ..... ! ایسے ہی کبھی کبھی اپنے گھر بار کی مصروفیت سے وقت نکال کے ملنے آجایا کرے اس سے۔ رشتے باندھے رکھنے کے لیے ملنا جلنا بھی ضروری ہوتا ہے۔"

وہ مسکرا کے کہتی وہاں سے جانے لگی۔ حسن مجرم سا بنا کھڑا تھا..... جیسے ماں کے ہفتوں یہاں فون نہ کرنے اور مہینوں ادھر کا رخ نہ کرنے کا سبب وہی ہو۔

"دیکھا..... کوئی منع کیا میری ماما نے؟" وہ اترا کے پوچھ رہی تھی۔ اور منزہ منع کر بھی کیسے سکتی تھی۔ اس نے حسن کو یہاں سے ملنے کے لیے آتے ہوئے اس کا اپنے بارے میں قائم کیا اندازہ سن جو لیا تھا..... نہ سنا ہوتا تو شاید وہ وہی کرتی۔ یعنی وشمہ کو وہاں بھیجنے سے سختی سے انکار اور دو چار طنزیہ پیغام پروین کے لیے۔ مگر وہ اس منفی خیال کو پختہ نہیں کرنا چاہتی تھی جو حسن دانستہ یا نادانستہ اس کے ذہن میں بھر رہا تھا..... اس نے زندگی میں سب کچھ ہارا تھا۔

محبت۔

خون کے رشتے۔

اولاد۔

جیتا تھا تو بس ایک وشمہ کا دل اور اس جیت کو وہ کسی بھی طرح قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ذرا سی لغزش کے ہاتھوں وہ اپنا مفتوحہ چیز کیسے ہاتھ سے جانے دیتی۔

□ □ □

"آپ یہ پڑھتے ہیں؟"

اس نے بڑی حیرت سے ڈیش بورڈ میں رکھی "طلوعِ اشک" اور "شاید" کو نکالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اکثر۔" وہ ڈرائیونگ کے دوران مسلسل اس کے صبیح اور معصوم چہرے کے خدوخال حفظ کر رہا تھا۔

"گاڑی میں؟ ڈرائیونگ کرتے ہوئے؟"

اس کے کمال سادگی سے کیے سوال پہ وہ جی بھر کے ہنسا۔

"نہیں بھئی۔ اپنے کمرے میں رات کے وقت۔ یہ گاڑی میں اس لیے ہیں کہ کل خریدی تھیں اور گھر لے جانا بھول گیا۔ یہیں پڑی رہ گئیں۔ تمہیں ہے کوئی شوق پڑھنے کا؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے ناک چڑھائی۔

"کورس کی بکس سے ہی ٹائم نہیں ملتا۔۔۔ ویسے بھی میری سمجھ میں شاعری تو آتی ہی نہیں۔۔۔ ایسی مشکل مشکل باتیں ہوتی ہیں۔"

"آسان سی چیز سناؤں تمہیں!"

پتا نہیں کیوں آج دل اتنا ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا ورنہ اس کی وشمہ سے چاہت بڑی قدیم تھی۔ کوئی نیا نویلا جذبہ نہ تھا جو اپنا آپ دکھانے کو بے چین ہوتا۔ کتنے عرصے سے سینت سینت کر رکھتا آرہا تھا اپنے جذبوں کو پھر شاید آج اس کے اتنا قریب ہونے کا اثر تھا جو وہ کھلنے پر آمادہ نظر آرہا تھا۔

"خوشبو ہے' دھنک ہے چاندنی ہے
وہ اچھے دنوں کی شاعری ہے
بھیگے ہوئے پھول' حرف اس کے
رم جھم کی زباں میں بولتی ہے
باتوں میں تھکن ہے شام جیسی
لہجے میں سحر کی تازگی ہے
یہ اس کی صدا کا بھولپن ہے
یا شمع سخن پگھل رہی ہے
چہرے پہ حیا کا روپ' جیسے
دریا میں شفق سی گھل گئی ہے
آنکھوں میں گلاب کھل رہے ہیں
کیا جانے وہ کب سے جاگتی ہے
برسا ہے خمار چاندنی کا
یا اس کی جبیں دمک اٹھی ہے
کیا جانے وہ کیسے مسکرائی
ہیرے سے کرن سی چھن پڑی ہے
چہرے پہ بکھر کے زلف اس کی
سورج سے خراج مانگتی ہے
پل بھر کو سرک گیا جو آنچل
کلیوں کی طرح سمٹ گئی ہے
پروا ہی نہیں اسے کسی کی
اپنے سے وہ کتنی اجنبی ہے
آئینہ ہی دیکھتا ہو گا اس کو
آئینہ کہاں وہ دیکھتی ہے

حسن آنکھوں کی پتلیوں میں اس کا پیکر سموئے ایک جذب کے سے عالم میں پڑھتا جا رہا تھا۔ کیمپس کی سنسان خالی سڑک پہ گاڑی سبک خرامی سے رواں تھی۔۔۔ وہ کسی معمول کی طرح سامنے تکتا ڈرائیونگ کر رہا تھا ورنہ نگاہ تو وہی طرح طرح کے رنگ بدل کے آرہی تھی۔ کسی اسپیڈ بریکر سے گزرتے ہوئے ہلکا سا جھٹکا کھایا تو اس سحر کے عالم سے نکلا اور خود کو دل ہی دل میں سرزنش کرتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی وشمہ کو گردن موڑ کے دیکھنا چاہا۔ اس کا خیال تھا جو یقیناً "اس طویل غزل پہ وہ برے برے منہ بنا رہی ہو گی۔۔۔ مگر وہ تو سیٹ سے سر ٹکائے بے سدھ سو رہی تھی۔ حسن بے ساختہ مسکرا اٹھا۔۔۔

وشمہ کے چہرے کو چھوتی بھورے بالوں کی ریشمی لٹ کو ہٹانے کے لیے اس کا ہاتھ آگے بڑھا۔۔۔ پھر رک گیا ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ سے دھیان ڈرائیونگ کی جانب لگانا چاہا۔

"میری جان۔۔۔!" پروین نے جس والہانہ انداز میں اسے ساتھ لپٹا کے ماتھے پہ پیار کیا۔۔۔ وہ پھر سے ڈانوا ڈول ہونے لگی۔ منزہ کے پڑھائے سبق ذہن سے محو ہونے لگے۔

"ماشاءاللہ بڑی پیاری صورت نکلی ہے۔"

شوکت جہاں نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے تبصرہ کیا تو وہ کچھ اور بھی گلابی سی ہو گئی۔

"شروع سے ہی ایسی ہے۔ ذرا کسی نے تعریف کی' ادھر یہ بیر بوٹی بن گئی۔" پروین نے ہنستے ہوئے کہا اور رخشندہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اپنی بیٹیوں کو دیکھنے لگیں۔۔۔ جو تینوں وشمہ کے آنے سے ماند پڑتی نظر آرہی تھیں۔۔۔ ندا پہ بڑھتی عمر کے اثرات اب واضح ہونے لگے تھے۔ ردا کا رنگ تو سانولا تھا ہی اوپر سے پڑھ پڑھ کے موٹا سا چشمہ بھی لگا لیا تھا' ظلِ ہما شکل و صورت کی اچھی تھی' قد کاٹھ بھی مناسب تھا مگر اس وقت ایسا برا منہ بنا کے بیٹھی تھی کہ ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنے کو دل نہ کرے۔ انھیں خوامخواہ ہما پہ غصہ آنے لگا' دل چاہا اٹھ کے جائے اور سب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اسے رکھ کے دو طمانچے لگائے۔

"وصی کیا مایوس ہو کر سو گیا ہے؟"

حسن نے اسے غیر حاضر پا کے پوچھا۔ وصی کو نیند بہت آتی تھی اور رات کو جلدی سونے کی عادت بھی تھی۔

"تحفے لیے بغیر میں سوؤں گا نہیں۔" وہ کمرے سے جمائیاں لیتا برآمد ہوا پھر وشمہ کو دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ شاید باقی سب کی طرح اسے بھی اس کے آجانے کی امید نہیں تھی بلکہ وہ تو بڑبڑا تا بھی رہا تھا کہ حسن نے بے کار کے آنے جانے میں اس کی برتھ ڈے کا کیک لٹکا دیا۔

"سوری۔۔۔ میں تحفہ نہیں لا سکی۔" وشمہ نے اسے اپنی جانب دیکھ کر یہ بات کہتے پایا تو شرمندہ سی کہنے لگی۔

"حسن بھائی بس کھڑے کھڑے لینے آئے مجھے تو تیار ہونے کی بھی مہلت نہیں دی۔"

"لو۔۔۔ ابھی اس نے تیار ہونا تھا۔ تیار ہو کے نجانے کون سی قیامت ڈھاتی۔" رخشندہ نے جلبلا کے سوچا۔ انھیں تو سرے سے وصی کے یہ چونچلے ہی پسند نہ تھے۔ جو ان کی ساس بڑے چاؤ سے اٹھاتی تھیں اور پروین احمق انہی کے کہنے پہ سارا اہتمام بھی کر ڈالتی۔۔۔ اتنے لاڈوں سے تو اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو نہ پالا تھا جس طرح وصی عیش کر رہا تھا۔

"چلو' کوئی بات نہیں تمہارا آنا ہی میرا تحفہ ہے۔"

لاپروا' لاابالی سے وصی نے رواداری سے کہتے ہوئے کیک کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اس سادگی سے کہے گئے فقرے نے جیسے وشمہ کے نوخیز جذبوں کو اتھل پتھل کر ڈالا۔

وصی نے پھونک مار کے موم بتی بجھا دی تھی۔ مگر وشمہ کا چہرہ اب تک لو دے رہا تھا۔۔۔ حسن نے تالیاں بجاتے ہوئے اسے دلچسپی سے دیکھا جہاں پہلے سے کہیں بڑھ کے دھنک پھیلی نظر آرہی تھی۔

"ہیلو....."

دوسری جانب سے آتی گمبھیر مردانہ آواز سن کر تقدیس گڑبڑا گئی۔ اگرچہ اس نے اپنے اسی اندازے کی تصدیق کے لیے یہ کال ملائی تھی مگر اس اندازے کی درستی کا اتنا یقین نہیں تھا اس لیے حیرت کے مارے کتنی دیر کچھ بول نہ سکی۔

"تحریم.... ہیلو۔" اب بار آواز میں تحیر زیادہ تھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا گئے۔ اب تو کچھ بولنا بالکل ہی محال تھا۔ یہ تو اس کے دھیان میں ہی نہیں تھا کہ وہ اس خاص نمبر پہ تحریم کے فون سے کال کرے گی تو ظاہر ہے دوسری جانب جو بھی ہے وہ اسے تحریم ہی سمجھے گا۔ اس نے بوکھلا کے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔

"کون ہو سکتا ہے یہ؟" کتنی ہی دیر وہ سوچتی رہی۔ تحریم سے پوچھنا فضول تھا۔ اسے بتانا ہوتا تو تب ہی بتا دیتی جب تقدیس نے بڑے دوستانہ انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

"آپی! کوئی ہے ناں؟"

اور اس کا صاف مکر جانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ چھوٹی بہن کو اپنے راز میں شریک کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔

"پھر کیسے پتا لگایا جائے..... یہ آپی بھی ناں دل کی بات کسی کو بتانے والی نہیں۔ ایسے تو کچھ بھی نہیں ہو گا نہ ماما پاپا کو پتہ چلے گا نہ وہ کوئی عملی قدم اٹھائیں گے اور یہ اسپیشل موصوف جو بھی ہیں، شاید زور ڈالتے ہوں گے آپی پہ..... اپنے گھر والوں کو بھیجنے کے لیے مگر مجھے پکا یقین ہے آپی ہی گھبرا کے منع کر دیتی ہوں گی..... وہی ان کی پرانی بزدلی اور کومپلیکس مگر جاننا پڑے گا کون ہے یہ طرم خان..... جس نے آپی جیسے دبو سی لڑکی کو محبت کی سرحد پہ لا کھڑا کیا جہاں بڑے بڑوں کے کلیجے پانی ہو جاتے ہیں۔" وہ خود بخود مسکرا دی۔

تطہیر نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

"یہ اکیلے میں مسکرانے کی عادت تمہیں کب سے ہوئی؟"

"جب سے دل ہی دل میں باتیں کرنا شروع کی ہیں۔"

"دل ہی دل میں باتیں..... یعنی خود کلامی اور سوچتے سوچتے مسکرا دینا..... یہ تو خاصی خطرناک علامات ہیں۔" تطہیر فکر مند نظر آئی۔

"فکر تو کرنی چاہیے مگر میری نہیں کسی اور کی۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں..... پاگلوں کو ایک اپنے علاوہ ساری دنیا ہی پاگل لگتی ہے۔"

وہ کتاب اٹھا کے باہر نکل گئی اور تقدیس نے ایک بار پھر اس نمبر کو دل ہی دل میں دہرایا۔ اب وہ اپنے سیل فون پہ یہ نمبر ملانے لگی مگر تین ہندسے ہی دبا کے اس نے فون رکھ دیا۔

"میں اپنا تعارف تو چھوٹتے ہی نہیں کرا سکتی..... وہ آپی کو بتائے گا اور آپی..... توبہ اپنی اور میری جان ایک کر دیں گی رونا دھونا مچا کے۔ پھر؟ نہیں اپنے نمبر سے نہیں کرنا..... کہیں اس نے اس نمبر پہ دوبارہ کال کر لی..... یہ جاننے کے لیے کہ میں کون ہوں تو؟"

اور یہ خطرہ گھر کے نمبر سے کال کرنے میں بھی تھا۔ اس لیے اس نے سوچا شام کو مارکیٹ جائے گی تو پی سی او سے فون کرے گی۔

☼ ☼ ☼

"خیریت؟ آپ نے اس وقت فون کیا؟"

سراج دین کے فون کرنے پہ پروین کو اتنی حیرت نہیں تھی، جتنا ان کا انداز کھٹک رہا تھا..... بڑی گمبھیر سی "ہیلو" کے بعد وہ چپ سے ہو گئے تھے۔

"ہاں..... وہ بتانا تھا کہ....."

ان کے تمہید باندھنے پہ پروین کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"میرا دوست ہے خورشید راٹھور، اس کا فون آیا تھا میرے پاس۔ وصی آج کہیں انٹرویو کے لیے گیا تھا؟"

"مجھے بتاتے بتاتے جس طرح بات بدل کے یہ سوال کیا گیا اس پہ پروین جھنجھلا اٹھیں۔

"مجھے کیا پتا..... جوان بچے ہیں۔ اب ہر بار کہیں آتے جاتے بتاتے تھوڑا ہی ہیں۔"

"ملٹی نیشنل فرم میں انٹرویو کے لیے گیا تھا، وہیں خورشید بھی ہیڈ آف ایچ آر ڈیپارٹمنٹ ہے۔ انٹرویو جس میں وہ بھی تھا۔"

"تو پھر آپ اس سے کہیں ناں..... وصی کے لیے سفارش کرے۔"

پروین نے بڑی سادگی سے کہا تھا۔ مگر نجانے کیوں سراج دین بھڑک اٹھے تھے۔

"مجھے کیا ضرورت ہے اس کی سفارش کرنے کی؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ بھانجا ہے وہ آپ کا..... بیٹوں جیسا۔" پروین کی سمجھ میں ان کا رویہ نہ آ رہا تھا۔ حال تو وصی کے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا اور کہاں یہ عالم کہ اس کی ذرا سی سفارش کرانے کے مخلصانہ مشورے پہ ردعمل۔

"بیٹوں جیسا۔" سراج دین نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

"یہ سفارش کرانے والی ذلالت میں اپنے اصل بیٹے کے لیے کیوں نہ سنبھال کے رکھوں جسے اس بیساکھی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے..... بلکہ شاید وہ تو اس کے ساتھ بھی دو قدم نہ چل سکے۔ وصی کو وہاں کسی بھی قسم کی سفارش کے بغیر جو جاب ملی ہے، وہ ایک بی اے بمشکل پاس کرنے والے گدھے کو کبھی بھی نہیں مل سکتی چاہے وہ منسٹر کی سفارش ہی کیوں نہ لے آئے۔"

"وصی کو جاب مل گئی؟" پروین کو قطعاً ملال نہ تھا اس کا..... نہ کوئی حسد۔ عام حالات میں، عام سے انداز میں یہ خبر دی جاتی تو ان کے لیے خوش خبری ہی ہوتی اور وہ کھل کے اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتیں مگر جس طرح سراج نے حسان کی نااہلی کے طعنے دیتے ہوئے یہ بات بتائی تھی وہ چاہ کے بھی خوشی ظاہر نہ کر پا رہی تھیں۔

"ظاہر ہے خورشید نے یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا مجھے اتنی تعریف کر رہا تھا وہ وصی کی ذہانت اور قابلیت کی جب اس نے یہ کہا کہ میں نے اپنی مرحومہ بہن کی اولاد کی ایسی تربیت کی ہے تو اپنے بیٹوں کو کس انداز میں پڑھایا ہو گا..... پانی پانی ہو رہا تھا میں یہ سوچ کر کہ کہیں وہ ان کی قابلیت اور تعلیم کے بارے میں کوئی سوال نہ کر دے۔"

"حسن کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ آپ کی صحت ٹھیک نہ رہنے کی وجہ سے کاروبار پہ کتنا فرق پڑ رہا تھا۔ آپ کی خاطر ہی اس نے تعلیم ادھوری چھوڑ کے....."

"اور حسان..... اس نے کس کی خاطر یہ عظیم قربانی دی؟" وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

"اب تو سانپ سونگھنا ہی ہے تمہیں اور تمہیں کیا فرق پڑتا ہے، بچے پڑھیں یا نہ پڑھیں تمہارے پورے خاندان میں کسی نے کالج کی شکل نہیں دیکھی..... مگر مجھے تو ہر جانب سبکی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ معراج بھائی صاحب کی آمدنی مجھ سے کہیں کم ہے..... مگر بیٹا لائق فائق ہے، اس لیے پیٹ کاٹ کاٹ کر بھی اسے آسٹریلیا میں پڑھا رہے ہیں پتہ جو ہے کہ اس کا پھل اچھا ملے گا۔ ندا گولڈ میڈل کے ساتھ ایم ایس سی کرتے ہی شہر کے سب سے بڑے کالج میں لیکچرر لگ گئی..... ردا بھی....."

"وہ بھی اپنے ہی بچے ہیں..... اس پہ کڑھنے کا کیا فائدہ۔"

"اونہہ..... میں کڑھ رہا ہوں؟" وہ دھاڑے۔

"بیوقوف مغز عورت..... ! میں اپنے ہی بھانجے اور بھتیجے بھتیجیوں کی ترقی اور لیاقت پہ کڑھ رہا ہوں؟ میں اپنا پھل کڑوا نکل آنے پہ کڑھ رہا ہوں۔"

انہوں نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔ پروین بڑے پژمردہ سے انداز میں پلٹیں۔ اسی وقت شوکت جہاں کی خوشی سے کھنکتی آواز سنائی دی۔

"پروین! مٹھائی لاؤ..... منہ میٹھا کرنے کے لیے۔ گھر پہ نہیں ہے تو فون کر کے منگاؤ بلکہ جب تک چینی ہی لے آؤ ایسی اچھی خبر سننے کے بعد پھیکے منہ نہیں بیٹھنا چاہیے۔ رخشندہ! رخشندہ۔"
اب وہ بڑی بہو کو آواز دینے لگیں۔

پروین جان گئی تھیں کہ وصی کی جاب والی خوشخبری ان کو مل گئی ہو گی اسی لیے..... وہ کچن کی جانب بڑھ گئی البتہ رخشندہ چونکہ بے خبر تھیں اس لیے اوپر ریلنگ سے لٹکی بڑے تعجب سے وجہ پوچھ رہی تھیں۔

"وصی کو نوکری ملی ہے..... پینتیس ہزار سے آغاز ہے اور ساتھ میں گاڑی بھی....." انہوں نے فخر سے مزید تفصیلات جان کر شوگر پاٹ اٹھاتی پروین کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ آگئی۔ جو بھی تھا وصی حسن اور حسان ساتھ ساتھ ان ہی کی گود میں پل کے جوان ہوا تھا..... اگر سراج دین وقتاً فوقتاً احساس نہ دلاتے رہتے تو وہ بھول جایا کرتی تھیں کہ ان کے دو بیٹے ہیں یا تین۔"

"مبارک ہو اماں جان!" رخشندہ نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

"خیر مبارک..... خیر مبارک۔ میرے تو خوشی کے مارے پیر نہیں ٹک رہے زمین پہ..... میرا وصی میرا بیٹا آج اس قابل ہو گیا۔"

"وصی..... زہرہ کا بیٹا!" اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود پروین کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ انہوں نے شوگر پاٹ دوبارہ کیبنٹ میں پٹخ دینے والے انداز میں رکھ دیا۔

٭ ٭ ٭

"ہیلو کون؟" بہت محتاط انداز میں پوچھا تھا اس نے۔

"بی بی! فون آپ نے کیا ہے آپ کو پتہ ہو گا کہ کسے کیا ہے؟" دوسری جانب سے بڑے مہذب اور شستہ لہجے میں کہا گیا۔ تقدیس ذرا متاثر سی ہو گئی۔

"وہ مجھے..... مجھے نائلہ سے بات کرنی ہے۔"

"سوری..... رانگ نمبر۔"

قریب تھا کہ وہ فون رکھ دیتا تقدیس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا بھلا دو باتوں کے تبادلے سے وہ کیسے اس کے بارے میں کچھ جان سکتی تھی۔

"نائلہ نے مجھے یہی نمبر دیا تھا۔" وہ جلدی سے بولی۔

"غلط بتایا ہو گا یا آپ سے نوٹ کرنے میں غلطی ہو گئی ہو گی۔ یہ میرا نمبر ہے پرسنل نمبر۔"

"اوہ سوری معاف کیجیے گا مسٹر؟"

دانستہ اس نے فقرہ سوالیہ انداز میں ادھورا چھوڑ دیا۔

"اوہ..... تو یوں کہو۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔

"تعارف چاہیے؟ بور ہو رہی ہو؟ ٹائم پاس کرنا ہے؟" وہ جیسے چٹخارے لے لے کر کہہ رہا تھا۔ مارے سبکی کے احساس کے تقدیس کے کانوں کی لویں تک دہکنے لگیں۔

"مگر لی سی ادے؟..... یہ نیا انداز ہے بھئی....." شاید اس نے نمبر سے بھانپ لیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے کمزور انداز میں تردید کی۔ "آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں..... میں تو"

"ریلیکس..... گھبرا کیوں رہی ہو۔ بات کرنی ہے ناں؟ کرو..... میں ایسی خدمت خلق کے لیے ہر وقت تیار ہوتا ہوں۔"

"یہی کام کرتے ہیں آپ یا کوئی دوسرا شغل بھی ہے؟" تقدیس نے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اجی آپ جیسی حسینائیں کچھ اور کرنے کے قابل رہنے دیں تب ہی کریں گے۔" خالص لوفرانہ انداز پر وہ سر سے پیر تک سلگ اٹھی۔ دل تو چاہا اس پہ لعنت بھیج کر فون بند کر دے لیکن دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ اور

...کے بعد اصل میں کیا نکلتا ہے۔ اتنا تو اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ تحریم نے غلط بندے کو "اسپیشل" مان لیا

...کہتے ہیں مجھے..... عمر چوبیس سال۔ قد چھ فٹ دو انچ "آنکھیں لائٹ براؤن اور بال ڈارک براؤن.....

"...آپ کی شکل و صورت میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
...میں ہے۔ اوہ آئی سی۔ اپنے انڈسٹریلسٹ ڈیڈی کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے منہ میں سونے ...کر پیدا ہوا ہوں۔"
...اس چمچہ کو منہ سے نکال دیں تو بہتر ہو گا آپ کے لیے۔" وہ جل گئی "کہیں سانس نہ رک جائے۔"
...فون بند کر کے غصے سے لال بھبھوکا چہرہ لیے پی سی او کے کیبن سے نکلی۔
"...پیسے۔"
...دار نے پکارا تو وہ رکی اور بڑبڑاتے ہوئے ہینڈ بیگ میں سے پیسے نکالنے لگی۔
"...دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔ کس واہیات بندے سے پالا پڑا ہے۔ نہ بات کرنے کی تمیز ہے نہ....."
"...میں نے آپ کو کیا کہا ہے میں آپ نے کال کی ہے 'میں نے پیسے مانگے ہیں۔"
...دار کے کانوں میں جو چند ایک لفظ پڑے 'ان سے اپنی مرضی کے مطلب اخذ کر کے وہ ماتھے پہ شکنیں لیے ...رہا تھا۔
...تقدیس کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پلٹی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔
"...آپ کے بقایا پیسے۔"

٭ ٭ ٭

"...روز روز ملنا بہت مشکل ہے وحید۔"
...تحریم نے بے بسی سے کہا..... ساتھ ساتھ وہ چور نظروں سے واش روم کے بند دروازے کو بھی دیکھ رہی تھی ...تقدیس ابھی ابھی گئی تھی۔
"...روز روز؟ مہینے میں ایک بار ملنا بھی تمہیں روز لگتا ہے؟" وہ ہلکا سا چلایا۔
"...آپ ناراض تو نہ ہوں۔" وہ منمنائی اس کی ناراضی کا خوف ایسے ہی سہما دیتا تھا۔
"...میں ناراض نہیں ہو رہا۔" وہ دھیما ہوا..... پھر لہجے میں محبت سموتے ہوئے کہنے لگا۔
"...حیران ہو رہا تھا کہ اگر تمہارے دل میں بھی میرے لیے وہی محبت ہے جو میرے دل میں تمہارے لیے ہے تو ...یہ ایک مہینہ ایک صدی کی طرح کیوں نہیں لگتا؟ مجھے تو تمہارے بغیر ایک ایک پل سال کے برابر لگتا ہے۔"
...کچھ بول نہ سکی..... جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔
"...مل رہی ہو کل؟" اب انکار کی گنجائش کہاں تھی۔
"...مگر سوچنا پڑے گا کیسے؟"
...تقدیس بھی واش روم سے نکل آئی۔ تولیے سے چہرہ تھپتھپاتے ہوئے وہ بظاہر آئینے کی طرف متوجہ ...دھیان اسی کی جانب تھا۔
"...ٹھیک ہے 'پھر ملتے ہیں تو بات کرتے ہیں۔" تحریم ذرا محتاط ہو کے بات کرنے لگی تھی۔
"...کہاں جا رہی ہیں آپی؟..... نگین آپی سے ملنے؟" تقدیس نے کولڈ کریم لگاتے ہوئے اس کی واحد دوست کا نام
"...نہیں 'نگین تو ہاں..... " وہ اچانک اس کے مخاطب کرنے پہ گڑبڑا اٹھی۔
"...مجھے بھی کیا جانا ہیں۔ ان کے گھر کے پاس ہی میری ایک کلاس فیلو رہتی ہے 'ذرا اس سے اپنے نوٹس واپس

"مگر میں نگین سے نہیں...." وہ جھنجلا اٹھی۔

"ہیلو...." وحید نے ہلکا سا گنگنا کے اسے متوجہ کیا اس کی گھبراہٹ سوا ہو گئی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وحید اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا اور وہ تقدیس کے بالکل سامنے اس کے سوالوں کے جواب دے رہی ہو۔

"میں پھر بات کروں گی آپ سے۔" اس نے جلدی سے کہہ کر فون رکھ دیا۔

"اوہ.... آپ سے؟" تقدیس معنی خیز انداز میں مسکراتی اس کے پاس آئی۔

"یہ آپ' جناب کوئی دوست تو ہو نہیں سکتی۔"

"دوست ہی ہے.... مگر زیادہ نہیں میرا مطلب ہے بس یونہی سی جان پہچان ہے اور تمہیں تو پتہ ہے کہ میں اتنی جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی۔"

"یہی تو حیرت ہے مجھے۔" اس نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا' کب تک یہ آنکھ مچولی کھیلی جاتی۔

"کہ آپ جو کالج میں چار سالوں میں ایک بس نگین آپی کو دوست بنا پائیں جو آپ ہی کی طرح گم صم سی رہتی ہیں' اچانک اتنی دوست دار کب سے ہو گئیں کہ ایسی دوستوں سے ملنے بھی جانے لگیں جن سے بس یونہی سی جان پہچان ہو اور جن سے تعارف آپ' جناب سے آگے نہ بڑھا ہو۔"

"تم زیادہ کرید میں مت پڑا کرو۔" وہ چڑ گئی' بہت بری عادت ہے تمہاری۔"

"کیا کروں.... آپ کو بھی تو اچھی عادتیں نہیں آتیں۔" وہ اس کے گلے میں بازو ڈال کے اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"مثلاً" بہنوں سے اپنی سیکریٹس شیئر کرنا.... دل کی بات دل میں نہ رکھنا.... وغیرہ۔"

"کیا مطلب؟" تحریم نے گھورا۔

"مطلب یہ کہ آپی جان! یہ جو آپ' جناب' ہیں ہاں' اتنا اونچا بولتے ہیں کہ ان کی آواز صرف آپ کے کانوں تک ہی نہیں میرے کانوں تک بھی با آسانی پہنچ رہی تھی۔"

تحریم کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔ وہ بے تاثر نظروں سے تقدیس کے چہرے کو دیکھتی رہی جو بالکل سنجیدہ نظر آ رہا تھا.... کسی ہلکے سے مذاق کی رمق بھی ظاہر نہ ہو رہی تھی۔

اور یہ بات تقدیس نے بہت سوچ سمجھ کے کی تھی.... اگر وہ اسے بتا دیتی کہ اس نے تحریم کے فون سے نمبر نوٹ کرنے کے بعد اس "اسپیشل" سے بات تک کر لی ہے تو ایک تو وہ ہتھے سے اکھڑ جاتی اور اس شاندار کارکردگی پہ اس سے ٹھیک ٹھاک ناراض ہو جاتی.... دوسرا اپنا اعتبار کھونے کے بعد تقدیس تحریم کی ہمراز بننے سے بھی رہ جاتی۔

"اب کہیے۔" تقدیس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں نچائیں۔

"ایک نمبر کی خبیث ہو تم۔" تحریم نے اپنے اوپر جھکتی تقدیس کو زور سے دھکا دے کر پرے کیا اور خفت سے لال ہوتا چہرہ لیے اٹھ گئی۔

"سنیں تو آپی.... بتائیں تو سہی ہے کون؟" وہ اس کی آواز پہ ٹھٹک کے رکی۔

"تمہیں کیوں بتاؤں؟" اس کے ہونٹوں پہ ٹھہری شرمگیں مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ اسے راز میں شریک کرنے پہ آمادہ تھی۔

✲ ✲ ✲

"کس واہیات مارکیٹ میں لے آئی ہو؟"

سوہا کو پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد بھی پارکنگ میں جگہ نہ مل پائی تو اس نے کوفت سے اسٹیرنگ پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں یار.... میرے سائز کے سوٹ اسی بوتیک میں ملتے ہیں۔" شیبا نے بھی پارکنگ کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"سائز نہ کم کرنا تم اپنا۔" سوہا نے اس کے فربھی مائل ———— بدن کو گھورا۔ جواباً" وہ ڈھٹائی سے

...رہ گئی ...گھر کے ہیں بھئی۔" سبیکہ نے لقمہ دیا۔

...کھاتے پیتے اور کھلاتے پلاتے گھر کے۔" اس کے اضافہ کرنے پہ شیبا کا ایک اور قہقہہ گونجا۔

...فادر کا ہوٹلنگ کا بزنس تھا۔

...وائٹ کرولا نکل رہی ہے۔" سبیکہ نے توجہ دلائی اور پھر ہلکی سی چیخ مارتے ہوئے بولی۔

...گاڑی از آ ڈارلنگ۔"

...اس کی نظر وائٹ کرولا کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے کسی ہینڈسم لڑکے پہ پڑی۔ تینوں اس طرف متوجہ ہو ...

...کتنی کلنگ ہے یار...." شیبا تو فوراً" ریشہ خطمی ہو گئی۔

...مسکراتے ہوئے مرد احمق لگتے ہیں۔" یہ سوہا کی منطق تھی۔

...." سبیکہ نے کچھ زیادہ غور سے دیکھ کر کہا۔

...کم ہے یار....

...تمہیں ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے ہوئے کی ہائٹ کا اندازہ بھی ہو گیا؟" شیبا کو یہ تنقید ذرا پسند نہ آئی۔ شاید زیادہ ...گیا تھا۔

...ایکسپیرنس میری جان ایکسپیرنس۔" سوہا نے آنکھ میچی اور پھر یک دم اس کی مسکراہٹ جھنجلاہٹ میں ...

...گاڑی.... تم لوگ ہائٹ اور اسٹائل پہ بحث کرتے رہے اور کسی اور نے کار لگا دی یہاں۔"

...ہم کر رہے تھے' ڈرائیونگ تو تم کر رہی تھیں غلطی تمہاری ہے کیسے تم نے کسی اور کو پارک کرنے دی۔"

سبیکہ بھی لڑنے پہ اتر آئی۔

...تم دونوں کے ساتھ کہیں جانا نری ذلالت ہے۔ جاؤ دفع ہو جاؤ جا کے ڈھونڈو اپنے سائز کی بوریاں ...نہیں لگتا پارکنگ ملنے والی ہے۔ میں تب تک کافی پی کے آتی ہوں۔"

...کس کے ساتھ؟" شیبا نے گاڑی سے اترتے اترتے چونک کر پوچھا۔

...ہائٹ کرولا والے کے ساتھ۔" سوہا نے چبا چبا کے کہا۔

...اب جلدی کرو پیچھے والی اکارڈ ہارن پہ ہارن دے رہی ہے۔"

...پہلے یہ بتاؤ تمہاری ڈیٹ پہلے سے پلان تھی کیا؟"

...میں اکیلے کافی پینے جا رہی ہوں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ مجھے تمہارے ساتھ ان چیپ تھرڈ کلاس ...میں خوار نہیں ہونا۔"

...برا وقت آ گیا ہے یار.... ایک خوب صورت ینگ لڑکی کو اکیلے کافی پینے جانا پڑ رہا ہے۔ چہ چہ.... ویری ...کوئی ایسا اللہ کا بندہ نہیں ہے جو...."

...اترو.... یا میں کار اسٹارٹ کروں۔"

...مسلسل بجتے ہارن پہ تنگ آ کے اس نے دھمکی دی۔ اس بار دونوں واقعی جلدی سے اتر گئیں۔ جانتی ...سوہا سے کچھ بعید نہیں۔

...منٹ تھی۔" سوہا نے پیچھے مڑ کے ہنڈا اکارڈ کے ڈرائیور سے کہنا چاہا اور وہیں جم کے رہ گئی۔ اس بلیک ...سیٹ پہ منزہ بیٹھی تھی وشمہ کے ساتھ اور اس نے یقیناً" ابھی تک سوہا کو نہیں دیکھا تھا۔ وشمہ کے ...لٹ الجھ گئی تھی جسے منزہ بڑے پیار اور بڑی ملائمت سے چھڑا رہی تھی۔ وشمہ کے چہرے پہ ہلکی سی ...جسے منزہ مسکرا کے کچھ کہتے ہوئے کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

...تھوک نگل کر اپنے خشک ہوتے حلق کو تر کرنے کی کوشش کی مگر جیسے اور بھی کانٹے اگ آئے ہوں۔

منزہ کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے نوجوان مگر اجڈ اور غصیلے سے نظر آتے پٹھان ڈرائیور نے [illegible]
باندھ کے ادھر دیکھتے مگر ٹس سے مس نہ ہوتے پایا تو غصے سے بڑبڑاتے ہوئے جما کے ہارن پہ ہاتھ رکھ دیا [illegible]
سی آواز ایک ناگوار تواتر کے ساتھ گونجنے لگی۔ سوہا نے رخ پھیر لیا اور سامنے دیکھنے لگی۔

"ماڑا..... پتہ نہیں کون پاغل کا بچی اے..... خوبسرا ہے شاید۔" اب ڈرائیور قدرے بلند آواز میں [illegible]
منزہ نے اس سے اس طرح ہارن بجانے کی وجہ دریافت کی تھی۔

سوہا نے بیک ویو مرر سیٹ کر کے دیکھا..... منزہ ڈرائیور سے کچھ کہہ رہی تھی..... سوہا کی آنکھوں [illegible]
دھند چھانے لگی۔ پورے گیارہ ماہ بعد دیکھ رہی تھی وہ اپنی ماں کو..... گیارہ ماہ پہلے اس کے برتھ ڈے پہ [illegible]
..... اس کے لیے گفٹ لے کر..... جسے اس نے کھولنے کی زحمت کیے بغیر واپس کر دیا تھا۔

"دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جو میری ماما نے مجھے لے کر نہ دی ہو۔"
اس نے رینا کی طرف مسکرا کے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ تب رینا کا چہرہ فخر سے جگمگا اٹھا تھا اور منزہ کا [illegible]
گیا تھا۔

پتہ نہیں کیوں جب بھی منزہ اس سے ملنے آتی تھی..... وہ ایسا ہی سلوک کرتی۔ ایسی ہی بے رخی سے [illegible]
تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا منزہ کے ساتھ کچھ ایسا کرے جو اسے جھنجوڑ کے رکھ دے وہ اس طرح [illegible]
رخسار پہ دو طمانچے لگائے اور اس کا ہاتھ پکڑ کے زبردستی گھسیٹتی ہوئی اپنے ساتھ لے جائے یہ کہتے ہوئے
"بہت بگڑ گئی ہو تم میری نظروں سے دور ہو کے..... ڈانٹ نہیں پڑتی ناں، چلو میرے ساتھ۔ [illegible]
کر کے رکھ دیا تو میں بھی تمہاری ماں نہیں۔"
مگر اس کا گمان، گمان ہی رہتا..... منزہ اپنے آنسو پیتی خاموشی سے واپس پلٹ جاتی۔ اگلے کئی ماہ تک [illegible]
کے لیے۔

"اوئی بی کان بند کر کے بیٹھا اے سارا ٹریفک بند کر کے رکھ دیا ہے ماڑا۔"
پہلے ڈرائیور کی آواز آئی..... پھر اس کی گاڑی کا دروازہ زور سے بند ہونے کی۔
سوہا نے ڈیش بورڈ میں رکھا سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔ تب تک پٹھان ڈرائیور اس کے سر پہ تھا۔
"او تم ادر بیٹھ کے شوق پورا کرتی اور ام لوگ خوار ہو رہی ہے۔"
"صرف خوار ہونے سے دل نہیں بھرا جواب ذلیل ہونے آ گئے ہو۔" وہ ایک لمبا سا کش لینے کے بعد [illegible]
"کیا بکواس کرتی اے..... باپ کا موٹر میں بیٹھی اے تو ام کو اکڑ دکھاتی اے۔" حسب توقع وہ گرم ہوا۔
"خان..... بدتمیزی مت کرو۔" منزہ کی آواز سنائی دی۔ "کسی لڑکی سے بات کرنے کا یہ کیا طریقہ ہے؟"
"بی بی! یہ لڑکی ام کو تڑی لگاتا اے۔"
"صرف تڑی؟ میں تو تمہیں پھینٹی بھی لگا سکتی ہوں۔"
سوہا اپنی جانب کا دروازہ کھول کے نکلی اور اس کا گریبان مٹھی میں جکڑ لیا..... دو بے چارہ اس افتاد پہ [illegible]
گیا۔ کسی لڑکی سے اس حسن سلوک کی اسے قطعاً توقع نہ تھی اس لیے چند سیکنڈ [illegible]
"کیا بکواس کر رہے تھے الو کے پٹھے، بول اب بولتی کیوں بند ہو گئی ہے۔"
سوہا نے اس کی وقتی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے زور سے دو تین جھٹکے دیے۔ وہ جیسے ہوش میں [illegible]
ساتھ ہی اس کا غصہ بھی بھرپور انداز میں پلٹ آیا۔
"اوہ خنزیر کا بچی..... مرد پہ ہاتھ اٹھاتی ہے۔"
وہ کف اڑاتا اس کی کلائی مروڑ رہا تھا..... آس پاس کھڑے لوگ رک کر دلچسپی سے یہ اپنی نوعیت [illegible]
واقعہ دیکھ رہے تھے..... ایک پچیس چھبیس سالہ گنوار شخص اور ایک بیس اکیس سالہ خوب صورت [illegible]
اور ماڈرن امیرزادی ایک ہی سطح کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گتھم گتھا تھے۔

[illegible] سکتے کے عالم میں تھی۔
[illegible] نظروں کے سامنے اس کی جوان بیٹی ایک ہاتھ میں سگریٹ پکڑے، دوسرا ہاتھ ایک غیر مرد کے گریبان پہ
[illegible] گالیاں کو بکتے ہوئے سارے بازار کے لیے تماشا بنی ہوئی تھی۔ چست جینز جو ٹخنوں سے کافی اونچی
[illegible] کافی نیچے تھی۔ کھلے گلے والی شرٹ جو جینز تک پہنچنے میں ناکام تھی اور اسی وجہ سے اس کی کمر، پشت اور
[illegible] اچھا خاصا حصہ عریاں ہو کے دعوت نظارہ دے رہا تھا۔
[illegible] نہیں جانتی تھی کہ وہ اتنا بپھر کیوں رہی تھی..... شاید منزہ کے ابھی تک گاڑی میں بیٹھے رہنے پہ۔
[illegible] راہگیروں کی طرح وہ بھی اس کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ یہ احساس اسے اور مشتعل کرتا جا رہا تھا۔ اس
[illegible] چل رہا تھا کہ اپنے اندر کی ساری کھولن اس دو ٹکے کے ڈرائیور پہ نکال دے اور وہ یہی کر رہی تھی۔ گالیوں
[illegible] نکلی تو اس نے دو تین زوردار تھپڑ اسے دے مارے۔
[illegible] نشے میں ہے۔"
[illegible] نے سر اٹھا کے تبصرہ کرنے والے کی جانب دیکھا جو اس کی گاڑی کے پاس ہی کھڑا تھا اور ہوس بھری غلیظ
[illegible] سوہا کو تک رہا تھا..... منزہ کا سکتہ ایک پل میں ٹوٹ گیا۔ اس کے اندر باہر شعلے بھڑ کنے لگے ——
[illegible] نظر آتے اس منظر کی ساری جزئیات ایک بار پھر واضح ہو گئیں۔ وہ ننگی گالیاں پھر سے کانوں میں زہر گھولنے
[illegible] کو محض سن کے ہی وشمہ خفت سے سرخ ہوتی ہوئی چہرہ جھکائے بیٹھی تھی اور اس کا ہاتھ منزہ کے گھٹنے پہ
[illegible] ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ ڈرائیور نے تھپڑ کھانے کے بعد سوہا سے باقاعدہ ہاتھا پائی شروع کر دی تھی۔ گالیوں کا
[illegible] دونوں جانب سے زور و شور سے جاری تھا۔
[illegible] ہوش میں آتے ہوئے گاڑی سے اتری۔ سوہا نے اسے اس جانب آتے دیکھا تو روانی سے مغلظات اگلتی
[illegible] زبان لمحہ بھر کو تھمی ڈرائیور کے دھکا دینے پہ وہ ہلکا سا لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی۔
[illegible] بھی جی دار ہے..... جان بوجھ کے لڑائی کے بہانے مزے لوٹ رہا ہے۔" اسی تبصرہ کرنے والے کی
[illegible] پھر سے منزہ کے قدم روکے۔
[illegible] بھری جوانی سامنے ہو اور وہ بھی بے قابو ہوتی ہوئی تو کس کا دل نہ چاہے گا اس بارود کے ڈھیر سے ٹکرانے
[illegible] آہستگی سے واپس پلٹ گئی۔
[illegible] اسے پلٹتے دیکھا تو اس کے اندر کی آگ کو جیسے کسی نے ایک ہی پھونک میں بجھا کر رکھ دیا۔
[illegible] لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی کار کی جانب بڑھی اور ایک جھٹکے کے ساتھ اسٹارٹ کرتی ہوئی وہاں سے تیزی
[illegible] ساتھ نکل گئی۔
[illegible] خراب کر کے رکھ دیا اے..... کیا بدتمیز اور بے حیا لڑکی اے۔"
[illegible] آ کے بیٹھتے پٹھان ڈرائیور نے کہا تو وشمہ چور نظروں سے منزہ کو دیکھ کے رہ گئی جہاں ضبط کے مراحل
[illegible] تمام تر تکلیف رقم تھی۔
[illegible] پیسہ نظر آتا ہے بی بی صیب! لیکن ام کہتا ہے پیسہ امارا صیب کے پاس بھی تو اللہ کے فضل سے کم
[illegible] جو حرام کا کمائی ہوتا اے ناں بی بی صیب وہ ایسا ہی اولاد پیدا کرتا اے۔"
[illegible] چلتے دیکھ کے وشمہ کا دل چاہا وہ ڈپٹ کر ڈرائیور کو چپ کرا دے جس کی زبان مسلسل اس کی ماما کو
[illegible] لگا رہی تھی۔
[illegible] تربیت کی قصور اے بی بی صیب..... سب ماں آپ کے جیسا نئیں ہوتا..... یہ تو ماڑا کسی بہت ہی بے
[illegible] غیرت) اور پنچ ماں کا۔"
[illegible] " منزہ چلائی تو وہ سہم کے چپ ہو گیا۔ پھر ذرا بے یقین سی نظروں سے بیک ویو مرر سے اپنی بی بی
[illegible] چلاتا جس کی فطرت میں ہی نہ تھا۔

"تم نے کیا کم گھٹیا پن دکھایا ہے" ایک لڑکی کے ساتھ بھرے مجمع میں دست درازی کرتے ہوئے غیرت اور حیا کہاں سوئی ہوئی تھی؟ کیا اسی کو مردانگی کہتے ہو تم۔"

بھرائی آواز کے ساتھ وہ کہہ رہی تھی تو ڈرائیور نے بڑی مشکل سے خود کو باز رکھا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا لڑکی کے بارے میں ایسی ایسی بات کہے کہ بی بی صیب کانوں کو ہاتھ لگا کر اس کی مزید حمایت سے خود کو باز رکھیں بمشکل ضبط کر پایا۔

"معاف کرنا بی بی صیب۔"

منزہ نے لب سختی سے بھینچتے ہوئے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا لیا۔ اس کی پلکوں کے سرے پہ دو ستارے ٹنگے تھے۔ اور ان آنسوؤں سے وشمہ کا بڑا عجیب رشتہ تھا اس کے گلے میں نمکین سے پھندے اٹکنے لگے۔

"گاڑی واپس موڑ لو۔"

اس نے ڈرائیور سے کہا تو تب بھی منزہ نے کچھ نہ کہا۔

گھر کے راستے پہ واپس مڑتے ہوئے وشمہ نے ایک بار اور اسی دل گرفتگی سے اسے دیکھا۔

"پتہ نہیں کتنے دن لگیں گے ماما کو اس ملال سے نکلنے میں۔"

☆ ☆ ☆

"سوہا۔۔۔! بڑی جلدی آ۔۔۔"

ریناکی بات منہ میں ہی رہ گئی سوہا تیزی سے اس کے پاس سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

ریناہکا بکا اسے دیکھتی رہی۔۔۔ اور پھر اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند ہونے پہ چونکی۔

"منزہ باز نہیں آئے گی اس کے پاس آنے سے۔" وہ بڑبڑائی۔

اتنے سال سوہا کو گھر میں نہیں۔۔۔ پلکوں میں رکھ کے پالا تھا اس نے۔ کیسے نہ جان پاتی اس کے مزاج بگڑنے کا سبب۔

"سوہا۔۔۔ بیٹا دروازہ کھولو۔"

اس نے دستک دیتے ہوئے میٹھے لہجے میں اسے پکارا۔ حالانکہ جانتی تھی وہ جواب نہیں دے گی۔

"سوہا۔۔۔ میری جان کچھ کھالو اچھا جوس ہی لے لو۔" دس بارہ منٹ تک وہ یونہی وقفے وقفے سے دروازہ بجاتے ہوئے دہراتی رہی تو نگہت سے برداشت نہ ہوا۔

"بیگم صاحبہ۔۔۔ وہ جواب نہیں دے رہیں تو آپ ہی ہٹ جائیں دروازے سے ماں بیٹی کی ایک جیسی عادت ہے۔"

پچھلے آٹھ سالوں سے ملازم تھی وہ اس گھر کی اور تین چار بار تو دیکھ ہی چکی تھی یہ تماشا۔

"وہ کون سا دروازہ کھولنے والی ہیں چاہے آپ رات تک کھڑی پوچھتی رہیں۔"

"میں جانتی ہوں نگہت۔۔۔ جانتی ہوں وہ دروازہ نہیں کھولے گی، نہ جواب دے گی لیکن اسے یہ تسلی تو رہے کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ کسی کو اس کی فکر ہے۔۔۔ کوئی پوچھ رہا ہے اسے۔"

تکیے پہ سر رکھے بے تاثر نگاہیں چھت کے جامد و ساکت پنکھے پہ جمائے وہ کسی بت کی طرح پڑی تھی کہ سماعتوں سے رینا کے یہ الفاظ ٹکرائے۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں حرکت ہوئی۔۔۔ اور وہ بکھر گئیں۔ اس نے مرتعش آواز کے ساتھ کہا۔

"ماما۔۔۔ آپ جائیں آرام کیجئے۔۔۔ بھوک لگی تو میں منگوالوں گی کچھ۔"

"لیکن۔۔۔" رینا نے اس کی بات پہ حوصلہ پا کر کچھ کہنا چاہا مگر اس بار وہ ہلکا سا چیخ پڑی تھی۔

"پلیز ماما۔"

اور پھر دروازے کے اس پار گہری خاموشی چھا گئی۔۔۔ کچھ دیر تک رینا کی ہیل کی ٹک ٹک سنائی دیتی رہی پھر وہ بھی چلی گئی۔ مکمل خاموشی چھانے کو تھی کہ اس کے سینے پہ دھرا سیل فون بج اٹھا۔۔۔ سوہا نے کوفت سے دیکھا۔ مبشر بیگ کا نمبر اسکرین پہ جگمگا رہا تھا۔ یقیناً" اسے یہی پوچھنا تھا کہ کافی پینے کے بعد وہ ان دونوں کو پک کرنے کیوں نہیں آئی۔

سوہا نے فون آف کرنا چاہا پھر جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اٹھا کے فون سامنے والی دیوار پہ دے مارا۔

☆ ☆ ☆

"وحید بہت اچھے ہیں۔"

"اللہ کرے۔"

تحریم کے شرما کے، جھجکتے ہوئے کہنے پہ تقدیس نے ایک مایوسی بھری گہری سانس کے ساتھ بے ساختہ کہا تو وہ اسے گھورنے لگی۔

"میرا مطلب تھا۔۔۔ یقیناً" ظاہر ہے آپ کی پسند کوئی ایسی ویسی تو نہیں ہوگی۔" وہ گڑبڑا کے وضاحت کرنے لگی۔ بڑی مشکلوں سے تو وہ کھلنے پہ آمادہ ہوئی تھی۔ اگر دوبارہ اپنے خول میں سمٹ جاتی تو وہ کیا کر لیتی بھلا اس کا۔

"مگر۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یعنی بھئی۔۔۔ دیکھیں نا انسان کو جانچنے پرکھنے کے لیے وقت چاہیے ہوتا ہے۔ آپ کو ان سے ملے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔"

"مگر بہت کم عرصے میں وہ مجھے اتنی اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ مجھے لگتا ہے اب تک کسی نے مجھے اس طرح سمجھا ہی نہیں۔ وہ تو جیسے میرے اندر تک اتر کے ساری باتیں جان لیتے ہیں۔"

"پولیس مین ہیں کیا؟"

"نہیں بھئی۔۔۔ بزنس ہے ان کا۔۔۔ الیکٹرونکس کا۔"

"اچھا مجھے لگا کسی انڈسٹریلسٹ کی اولاد ہوں گے موصوف۔" تقدیس نے وحید کی کہی بات کا حوالہ دیا۔

"ویسے آپ کی جان پہچان کیسے ہوئی؟"

"میری ایک کلاس فیلو کے کزن ہیں۔۔۔ بلکہ کلاس فیلو بھی کہاں پچھلے سال جو ہینڈی کرافٹ کے شارٹ کورس میں ایڈمیشن لیا تھا میں نے وہاں پہ ہلکی سی جان پہچان ہوئی تھی۔ ایک بار غلطی سے میں اس دن چلی گئی جب میری کلاس نہیں تھی۔ ڈرائیور واپس چلا گیا تھا تو اسی لڑکی نے لفٹ دی تھی۔"

"اور وہ یقیناً" اس وقت اپنے کزن کے ہمراہ ہوگی۔"

"ہوں۔۔۔" تحریم نے مسکرا کے سر جھکایا۔

"پتہ نہیں وحید کو مجھ میں کیا اچھا لگا انہوں نے میرا فون نمبر بھی لے لیا اپنی کزن سے۔ پھر فون کرنے لگے مجھے بہت۔۔۔ پہلے پہل تو مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا تقدیس کہ کوئی مجھ میں۔۔۔ مجھ جیسی عام سی لڑکی میں بھی دلچسپی لے سکتا ہے۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں یہ سب مذاق نہ ہو۔۔۔ مگر بالآخر مجھے وحید کی محبت کے آگے سر جھکانا پڑا۔"

"محبت سر جھکانا تو نہیں سکھاتی آپی!"

تقدیس نے اس کی ہتھیلی سہلاتے ہوئے ملائمت سے کہا تو تحریم الجھ کے اسے دیکھنے لگی۔

"اچھا۔۔۔ یہ بتائیں بات یہاں تک ہی رکی رہے گی کیا؟ آگے بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہمشیرہ کہ کب تک آپ اپنے لیے آئے رشتوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے واپس لوٹاتی رہیں گی۔ صاف صاف بات کریں ماما سے۔ انہیں اپنی پسند کے بارے میں بتائیں اور وہ جو وحید صاحب ہیں انہیں کہیں کہ اپنے گھر والوں کو لے کر آئیں۔"

"نہیں تقدیس۔۔۔ ابھی نہیں۔"

"کیوں؟ کیا مسئلہ ہے انہیں؟"

"انہیں کوئی مسئلہ نہیں وہ تو تیار ہیں..... کتنی بار زور دیتے رہے ہیں..... اپنے گھر میں میرا ذکر بھی کر
"وہ جس طرح تیز تیز کہتی وحید کی صفائی دے رہی تھی۔ تقدیس سمجھ گئی کہ رکاوٹ اسی جانب تھی
محض پردے ڈال رہی ہے۔

"تو پھر۔" اس نے کھوجتی ہوئی نظروں سے تحریم کا چہرہ دیکھا۔ اور وہ ان کریدتی نظروں کی تاب نہ لا
کھڑی ہوئی۔

"پھر یہ کہ..... بس ڈر لگتا ہے مجھے۔"

بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس نے فوری بہانہ تراشا۔

"کس سے؟ وحید سے؟ ماما سے یا پاپا سے؟"

"نن..... نہیں مجھے' ہاں وہ وحید کے گھر والوں سے۔"

وہ پریشانی سے انگلیاں مسلنے لگی۔ تقدیس کو ترس سا آنے لگا اس کی حالت پہ..... مگر یہ وقت نرم پڑنے کا
تھا۔

"لیکن وحید صاحب تو اپنے گھر والوں سے آپ کا ذکر کر چکے ہیں..... پھر ڈر کیسا؟"

"اوہو..... کیا ہے تقدیس! اتنے سوال۔" وہ زچ ہو گئی۔

"دیکھو..... ذکر وحید نے کیا ہے اور وحید وہ مجھے اس نظر سے نہیں دیکھتے جس سے ان کے گھر والے دیکھیں
وحید کو میری شکل وصورت سے نہیں میری روح سے' میرے دل سے محبت ہے۔"

"کیوں؟" تقدیس نے اس کی روانی سے جاری بات کو کاٹا۔

"صرف دل اور روح سے کیوں ہے؟ شکل سے کیوں نہیں ہے؟ اتنی پیاری تو صورت ہے آپ کی۔"

"بس..... یہی تو بات ہے ساری۔ تمہیں میں اچھی لگتی ہوں کیونکہ بہن ہوں تمہاری۔ تمہیں مجھ سے پیار
ہے۔ وحید کو بھی اسی محبت کی وجہ سے پسند ہوں۔ ہر حال میں' مگر پتہ نہیں ان کے گھر والوں کے معیار پہ پورا
اتروں یا نہیں۔ بس اسی لیے ڈر سا لگتا ہے مجھے..... میں ہی روک دیتی ہوں انہیں کہ وہ اپنی فیملی کو یہاں نہ

اس بار تقدیس کو کچھ کچھ یقین آ ہی گیا اس کی بات پہ۔

"چلو..... مان لیا..... مگر یہاں سے تو کوئی پابندی نہیں ہے ناں ان سے ملنے پہ؟"

"کیا؟"

"ہاں..... میرا مطلب ہے انہیں تو یہ ڈر نہیں ہو گا کہ وہ میرے معیار پہ پورے اترتے ہیں یا نہیں۔"

"تمہارے معیار پہ؟"

"بالکل' میں نے بھی اپنے ہونے والے بہنوئی کے متعلق ایک معیار بنا رکھا ہے۔ اب دیکھتے ہیں آپ کے
وحید صاحب اس معیار کے مطابق ہیں یا نہیں..... میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ' ان سے ملنے کے لیے۔"

"ہیں.....؟" تحریم بری طرح پچھتا رہی تھی' اسے اپنے راز میں شریک کر کے۔

وہ بیچ سڑک پر کھڑی تھی۔

نہ گلے میں دوپٹہ..... نہ پیر میں جوتی۔

کپڑے بوسیدہ جیسے چیتھڑے لٹک رہے ہوں اور وہ دونوں بازو آپس میں لپیٹ کے سینے سے لگائے
بغلوں میں دبائے شاید اس برہنگی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی یا پھر تیز برفیلی ہواؤں سے خود کو بچانے کی ناکام کوشش
کر رہی تھی۔

آس پاس سے گزرتے لوگ انگلی اٹھا اٹھا کے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دوسروں کو بھی متوجہ کرتے
ٹھٹھا لگا کے گزر جاتے۔ وہ اور بھی اپنے آپ میں سمٹ جاتی۔ مگر قدم آگے پھر بھی نہ بڑھا پائی۔ تلوے جیسے برف
کی سل جیسی سڑک سے چپک گئے تھے۔

پھر سامنے سے آتی اس عورت کو دیکھ کے اس کی ہراساں اور وحشت بھری آنکھوں میں آس کی جھلک نظر
کے پپڑی جیسے ہونٹ کچھ کہنے کی کوشش میں پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ منہ سے آواز نہ نکل سکی مگر نظریں پکار
طلب کر رہی تھیں..... مگر وہ عورت..... وہ نہ جانے کس دھیان میں تھی' ہاں.....
وہ اس گڑیا میں مگن تھی' وہ گڑیا جو اس کی گود میں تھی۔ ممتا بھری نظریں اس سنہری بالوں والی ننھی سی
جائے وہ مدھر سروں میں کوئی لوری گنگناتے ہوئے چلی آ رہی تھی۔

ماں....." اس کا دل چلا رہا تھا۔ مگر حلق سے آواز نہ نکل پا رہی تھی۔ ہونٹ کھل کے پھر بند ہو جاتے
بے بسی کے اس کی آنکھیں لبالب بھر آئیں اور پھر ان دھندلی نظروں سے اس نے دیکھا کہ وہ عورت
دیکھ رہی تھی۔ اس کے نیم برہنہ..... سردی سے ٹھٹھرتے وجود کی طرف..... اس کی گویا مراد بر آئی۔
ہوتی رگوں میں ایک گرم سیال نے جوش مارا..... ہتھیلیاں تڑتڑ کرتی زندہ ہونے لگیں۔

"اں" اس بار ہلکی سی کراہ بھی اس کے لبوں سے نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ وہ امید بھرے انداز میں اپنی
اور قدم قدم بڑھاتی اس عورت کو دیکھ رہی تھی۔

نے ایک چیلنج بھری نظر ارد گرد کھڑے ہجوم پہ ڈالی۔

بت ستا رہے ہو نا مجھے۔ تماشا بنا رہے ہو میرا۔ ابھی پتا چل جائے گا جب میری ماں....."

حیرت کی شدت نے اس کے اگلے الفاظ کا گلا ہی گھونٹ دیا۔

عورت انگلی اس کی جانب کیے کھلکھلا کے ہنس رہی تھی۔ اس نے گود میں لی گڑیا کو ذرا سا اونچا کر کے اسے
دلچسپ تماشا دکھانا چاہا۔

"ماں....." اس کی آواز ایک بار پھر حلق کے اندر گھٹ کے رہ گئی۔

ن میں قہقہوں کی آوازیں چھید ڈالے دے رہی تھیں۔

کے آگے پھر سے دبیز دھند چھاتی جا رہی تھی۔

کے تلوؤں کے ذریعے برفیلی ٹھنڈک ہڈیوں کے اندر اترتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ان بھی یہاں بن کے سوچو۔"

یہ آج کل بھوت سوار تھا' ریتا کو اس کی عمر کا احساس دلانے کا۔ وہ سارا دن مشقت میں جتے رہنے والے
کی طرح عمر کی شام ڈھلے تھان پہ بندھا مریل سے انداز میں ہنہناتا رہتا تھا اور مشکی گھوڑی کی طرح
بھرتی ریتا کی رفتار کا ساتھ دینے کے اب قابل نہیں رہا تھا۔ چاہتا تھا وہ بھی اس کی طرح تھان سے آ کر
لگے۔

کے لیے کیا سوچنا ہے کیا نہیں' یہ مجھے تم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

آنکھیں آئینے میں نیزے کی طرح گاڑے' چہرا اپنے عکس کے قریب تر لائے ان جھریوں کو تلاش کرنے کی
کر رہی تھی' جو شاید راستہ بھول گئی تھیں اور وقت گزرنے کے بعد بھی نمودار نہ ہو رہی تھیں۔
تھکے ہارے وجود' ڈھلکے ہوئے بدن اور لٹکی ڈھیلی کھال والے چہرے کو دیکھ کر اسے خوف سا محسوس
میں خسرے اور ٹی بی کی طرح اس بڑھاپے کے جراثیم بھی نہ لگ جائیں اسے۔ اپنی بڑھتی عمر کا احساس
کو دیکھ کے ہی ہوتا تھا' اسی لیے اب وہ اس کے سائے سے بھی بدکنے لگی تھی۔ بس نہ چلتا تھا کہ اس کا
ساتھ کروا دے۔

نور کا بڑا دل ہے اپنے بیٹے کے لیے۔"

منمنا کے کہا۔ ڈارک براؤن کمبل کے اندر سکڑا وہ خود بھی گہرا نسواری ہی لگ رہا تھا۔

نور؟" ریتا نے نخوت سے بھنویں اچکائیں۔

"تم بہار کیٹ کا صدر......"

"اونہہ...... بات تو ایسے کر رہے ہو جیسے امریکہ کا صدر ہو۔ دیکھ رکھے ہیں میں نے اس کے بیٹے۔ کوئی میٹرک سے بھاگا ہوا تو کوئی انٹر سے۔ شکل و صورت کے بھی ایک سے ایک بڑھ کے واہیات۔ کسی قصائی کی اولاد لگتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا کوئی جوڑ ہے بھلا ہماری سوہا کے ساتھ۔"

"تمہیں پتا بھی ہے تنویر کا کتنا ٹھکا ہے کاروباری حلقوں میں۔"

"جیسے تم ویسے تمہارے واقف کار۔ تمہیں بڑا سکون ملتا ہے نا ان ٹھیکے والوں کے ساتھ تو گئے … سالوں میں تو میں تمہاری کمپنی بدل نہ سکی اب کیا بدلوں گی۔ کتنی کوشش کی تھی کہ ذرا اچھے لوگوں میں اٹھو بیٹھو سیکھ لو مگر......"

"کون سے اچھے لوگ...! بیویوں کی ننگی کمروں میں بازو ڈال کے سگریٹ کے سوٹے لگاتے بیٹیوں کا تعارف … سے غیر مردوں کے ساتھ کراتے اچھے لوگ......" اصغر نے زہر اگلا۔

"بس بس رہنے دو ہاتھ نہ پہنچے۔ تھو کوڑی والا حساب ہے تمہارا۔ اپنے احساس کمتری سے ابھر کر کبھی … سوسائٹی میں خود کو موو کرنے کی ہمت ہی نہیں کر پائے۔ تمہارا تو کچھ ہو نہیں سکتا اب مگر مجھے اور میری بچی کو … دو۔ پلیز اس کے بارے میں ایسے اوٹ پٹانگ مشورے دوبارہ نہ دینا ورنہ میں لحاظ نہیں کروں گی۔"

ربینا نے اس انداز میں وارننگ دی جیسے اس سے پہلے وہ لحاظ کرنے کی بڑی عادی رہی ہو۔

"میری بھی کچھ لگتی ہے وہ۔ کیا مجھے فکر نہیں ہے اس کی؟"

"فکر ہوتی تو میری بات مان لیتے۔" ربینا ڈریسنگ سے اٹھ کر تیز تیز جارحانہ قدم اٹھاتی ان کی جانب بڑھی۔

وہ کمبل کے اندر کچھ اور سمٹ گیا۔

"کتنا کہا تھا میں نے کہ اپنی اس منحوس بھاوج پہ پابندی لگا دو کہ کبھی ہماری سوہا سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ مانی تم نے میری یہ بات؟"

"کیسے منع کرتا، ماں ہے وہ اس کی۔"

"ماں...... تو میں کیا ہوں؟" وہ حلق پھاڑ کے چلائی۔

"کہاں سے ماں بنی پھرتی ہے وہ...... آوارہ...... مطلبی...... سنگ دل...... پریوں جیسی بچی کو کلیجے سے نوچ کر پھینک دیا، صرف ایک مرد کے لیے۔ رہے اسی کے ساتھ وہ...... کیوں ڈسٹرب کرتی ہے میری بچی کو۔"

"بھابھی آئی تھیں؟" اس کا ہسٹریائی انداز دیکھ کے ہمیشہ کی طرح اصغر نرم پڑ گیا۔ اس پل پل رنگ بدلتی، ساعت ساعت کینچلی کی طرح ایک نئی پرت اتارتی عورت کا اور کوئی بھید وہ جان پایا ہو یا نہ ہو مگر اس بات پہ ایمان تھا کہ وہ سوہا کو سگی ماں سے بڑھ کے چاہتی ہے۔ منزہ نے چاہے دل پہ پتھر رکھ کے سہی، چاہے مجبوری اور بے بسی کی آخری انتہا پہ جاتے ہوئے کوئی اور راستہ نہ پا کے ہی سوہا کو خود سے جدا کیا تھا مگر کیا تو تھا اور وہ قسم کھا کے کہہ سکتا تھا کہ اس کی جگہ ربینا ہوتی تو مرتی مرجاتی۔ چاہے چوک میں بیٹھ کے اپنی نیلامی لگوا لیتی مگر سوہا کو خود سے الگ نہ ہونے دیتی۔

"گھر آئی تھی یا کالج میں جا کے ملی تھی؟"

"مجھے کیا پتا مگر وہ جتنی ٹینس نظر آرہی ہے، اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ عورت...... منزہ......"

ربینا کے لہجے میں نفرت پھنکاریں مار رہی تھی۔

"میرا بس چلے تو سوہا کو لے کر کسی ایسی جگہ......"

اچانک سوہا کی دلدوز چیخوں کی آوازوں نے اسے ہڑبڑا کے رکھ دیا۔

کسی انجانے خدشے کے تحت اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"سوہا کو کیا ہوا ہے سوہا......!"

اگلے ہی پل اصغر کمبل سے جست لگا کے باہر تھا اور سوہا کو متوحش انداز میں پکارتا باہر نکل رہا تھا۔

اور سوہا کی وحشیانہ چیخیں ربینا کے حواسوں پہ چھائی جا رہی تھیں۔ دھڑکتے وجود کے ساتھ اس نے بمشکل شل ہوتے قدم باہر گھسیٹے اور اس کے کمرے کا رخ کیا۔

"چاچو...... چاچو...! وہ...... وہ......"

اندر بیڈ پہ گھٹنوں کے بل بیٹھی سوہا نے سہمے انداز میں اصغر کے ہاتھ تھام رکھے تھے اور اس کا پورا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ ربینا نے ایک نظر اس کے اوپر ڈالی اور دوسری کمرے کی حالت پہ۔ تیسری نظر باہر لان میں کھلنے والی کھڑکیوں پہ اور پھر اطمینان بھری سانس لی۔ سب کچھ معمول کے مطابق نظر آرہا تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں، بھاری پردے گرے ہوئے تھے، کمرے کی ہر چیز ٹھکانے پہ تھی۔ یعنی جن اندیشوں نے کچھ دیر پہلے تاک لگا کے وار کیا تھا، وہ بے بنیاد نکلے۔

"لگتا ہے خواب میں ڈر گئی ہے۔" اصغر نے امکان ظاہر کیا اور وہ آگے بڑھ کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔

"لو...... میری جان...... میری سوہا...! ماما ہیں نا تمہارے پاس۔ ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں جان...!"

اسے دلار سے بہلاتے ہوئے وہ گلاس اس کے لبوں سے لگا کر گھونٹ گھونٹ پلانے لگی۔

"کیا دیکھا تھا میری سوہا نے خواب میں؟"

ذرا اس کی حالت سنبھلی تو اصغر نے پوچھا۔ جواب میں اس کے لب کپکپا کے رہ گئے۔ ربینا نے ایک تیز نظر اصغر پہ ڈالی۔

"اس شقی القلب عورت کو دیکھا ہوگا، جس نے اپنی زندگی سے تو سوہا کو نکال دیا مگر خود اس کی زندگی سے نہیں نکل رہی۔"

سوہا ربینا کے سینے سے لگی ہچکیاں لے رہی تھی۔ ربینا نے اس کے بکھرے بالوں میں اپنی ملائم انگلیاں پھیرنا شروع کیں۔ اسے لگا جیسے وہ بھی ایک ننھی سی گڑیا ہو اور اس عورت کی طرح ربینا نے بھی اسے آغوش میں بھر کے سب کچھ بھلا رکھا ہو۔

وہ دھیرے دھیرے شانت ہونے لگی۔

دور کہیں سے اصغر اور ربینا کی آوازیں سرگوشیوں کی صورت ابھر رہی تھیں۔

"میں تو کہتی ہوں، اسے باہر بھجوا دیتے ہیں۔ امریکا یا لندن۔"

ربینا کے مشورے پہ اصغر پہلے تو بھونچکا رہ گیا پھر اس پہ الٹ گیا۔

"دماغ خراب ہے، جوان بیٹی کو باہر بھجوا دوں؟"

"ساری دنیا پڑھنے کے لیے بھیجتی ہے، تم اپنے ان بینڈو دوستوں کے حلقے سے نکل کر دیکھو تو پتا چلے۔ ان میں تو لڑکی سترہ اٹھارہ کی ہوئی نہیں اور ڈھائی من سونا لاد کے کوٹھی، کار اور پلاٹ ہاتھ میں جہیز کے نام پہ پکڑا کے گھر بھیج دیتے ہیں لیکن میں اپنی سوہا کو......"

"جو بھی ہے، جتنا پڑھنا ہے اسے، یہیں پڑھاؤں گا۔ نظروں سے دور نہیں کروں گا۔ زمانے سے لڑ کے اسے اپنے گھر نہیں لایا تھا۔"

"میرا دل کب چاہتا ہے کہ اسے خود سے دور کروں مگر......" ربینا کی آواز بوجھل ہو گئی۔

"میں اسے اپنی نظروں سے نہیں، منزہ کی نظروں سے اوجھل کرنا چاہتی ہوں۔ میں ساتھ جاؤں گی اس کے۔"

اس بات پہ تو اصغر بالکل ہی آؤٹ ہو گیا۔

"ہونہہ...... تو یوں کہو...... خود کا دل مچل رہا ہے میم بننے کے لیے۔ جو کسر رہتی ہے، وہ ولایت جا کے پوری کرنی

"آہستہ بولو۔" ریتا نے ناگواری سے اسے ڈپٹا۔
"چلو اپنے کمرے میں۔ اسے آرام کرنے دو۔" وہ اپنا نائٹ گاؤن سوہا کی بند مٹھی میں سے آہستگی سے چھڑاتے ہوئے اٹھی۔
"وہاں جا کے کر لینا اپنی جہالت کے مظاہرے۔"

٭ ٭ ٭

"یہاں بلانے کی خاص وجہ؟"
تقدیس نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے جناح سپر میں واقع اس ریسٹورنٹ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ہم ہمیشہ یہیں ملتے ہیں۔" تحریم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ اسے چھوٹی بہن سے بے حد شرمندگی محسوس ہو رہی تھی مگر ایک تو وہ خود ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ وحید سے مل کے رہے گی۔ دوسرا جب تحریم نے وحید سے سرسری ساذکر کیا اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد کا تو وہ بھی بضد ہو گیا کہ اپنی بہن کو ضرور لے کر آئے۔
"اگر تم اسے مجھ سے ملانے میں ٹال مٹول سے کام لوگی تو وہ کیا امپریشن لے گی میرا۔ یہی سمجھے گی کہ بہن کو کوئی فلرٹ لڑکا بے وقوف بنا رہا ہے اور پکڑے جانے کے خوف سے ملنا نہیں چاہ رہا۔ تم لے کر آؤ اسے تاکہ اسے بھی پتہ چلے کہ اس کا ہونے والا بہنوئی کوئی ایسا ویسا بندہ نہیں ہے۔"
اس بات پہ تحریم کا دل کھل سا گیا۔ کبھی کبھی ہی تو وحید ایسی کوئی حوصلہ افزا بات کیا کرتا تھا۔
"دراصل وحید کا اسٹور اسی مارکیٹ کے قریب کہیں ہے' نہیں لنچ پہ یہاں آنا قریب پڑتا ہے' اس لیے۔"
"لنچ۔۔۔" تقدیس نے ریسٹورنٹ کے گلاس ڈور کو دھکیل کر اندر جاتے ہوئے زیرِ لب دہرایا۔ یہاں کا لنچ ہونے شاید ہزار یا بارہ سو پر ہیڈ تھا۔ "مزے آ گئے بھئی تمہارے وحید صاحب۔۔۔"
اس نے فوراً یہ اندازہ قائم کر لیا کہ وحید جو اس سے کسی انڈسٹریلسٹ باپ کا اکلوتا وارث ہونے کا اور تحریم سے بزنس مین ہونے کا دعوا کرتا ہے' اصل میں ہو گا کوئی ٹٹ پونجیا۔ جو اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی سادہ لوح لڑکی کو احمق بنا کے اس کے طفیل اچھے ہوٹلوں میں عیش کیا کرتا ہے۔ نجانے گفٹ وغیرہ بھی بٹورا کرتا ہے۔
"آپ کی ساری پاکٹ منی تو مہینے میں یہاں تین چار بار وحید صاحب کو لنچ کرانے میں ہی اڑ جاتی ہو گی۔ مارکیٹ بھی نزدیک ہے' بعد میں کوئی شاپنگ وانپگ' گفٹ شفٹ۔"
بظاہر مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے دوستانہ انداز میں اس نے ٹٹولنا چاہا۔
"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" تحریم کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔
"وحید بالکل پسند نہیں کرتے کہ میں ان کی ذات پہ ایک آنہ بھی خرچوں۔ ان کی مردانہ انا پہ کاری ضرب لگتی ہے۔ حتیٰ کہ پچھلے دنوں ان کی برتھ ڈے پہ میں نے گفٹ دینا چاہا' تب بھی بہت بحث کے بعد صرف بوکے لینے پہ رضامند ہوئے۔ لنچ اور شاپنگ تو تم رہنے ہی دو۔ وہ آج کل کے چھچھورے لڑکوں جیسے نہیں۔"
وہ اتنے یقین سے کہہ رہی تھی کہ تقدیس کو اعتبار کرنا ہی پڑا۔
"پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ بندہ فون پہ بات کے دوران ہی مجھے بری طرح کھٹک رہا ہے۔" وہ سوچنے لگی۔
"آ گئے وحید۔"
تحریم کی دبی دبی جوش میں ڈوبی آواز پہ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ دونوں گلاس ونڈو کے ساتھ والی ٹیبل پہ بیٹھی تھیں اور پارکنگ ایریا صاف نظر آ رہا تھا۔ چمکتی نئی کرولا کا دروازہ کھل رہا تھا۔ تقدیس کا اس کی حیثیت کے بارے میں قائم پہلا اندازہ ذرا ڈانوا ڈول سا ہو گیا۔ اس نے قصداً نگاہیں پھیر لیں۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی اس شخص پہ اپنی دلچسپی اور تجسس۔
"آئی ایم سو سوری۔ آپ کو ویٹ کرنا پڑا۔"
بے حد شائستہ لب و لہجے اور گمبھیر آواز میں تقدیس نے سر اٹھا کے سامنے کھڑے خوش لباس شخص کو دیکھا جو

قیمتی سن گلاسز اتارتے ہوئے مسکرا کے کہہ رہا تھا۔
تقدیس کو حیرت کا شدید دھچکا لگا۔
"نہیں' آپ کیوں معذرت کر رہے ہیں۔ ہم ہی شاید کچھ زیادہ جلدی آ گئے۔"
تحریم کی خود اعتمادی ویسے بھی کہیں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہتی تھی مگر اس وقت اس کی شخصیت کچھ زیادہ ہی دبی سی لگ رہی تھی۔ تقدیس کو اس کا معذرت خواہانہ لہجہ بڑا ہی کھلا۔
"کچھ خاص جلدی بھی نہیں' صرف ساڑھے تین منٹ پہلے آئے تھے' مقررہ وقت سے اور یہاں بیٹھے بیٹھے بارہ منٹ ہو چکے ہیں۔ اتنی معذرت کرنا تو فرض ہے ان پہ۔"
اس نے جتاتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔
"مجھے پتا ہوتا یہ گڑیا حساب کتاب کی اتنی ماہر ہے تو میں خود اٹھارہ منٹ پہلے آ جاتا۔"
وہ بہلانے والی مسکراہٹ ہونٹوں پہ پھیلا کے اسے دیکھ رہا تھا اور تقدیس کو اس بناوٹی لہجے' زبردستی کی مسکراہٹ اور اوپر سے الفاظ سے سخت وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکا کے لیمن سوڈا پینے لگی۔ کوئی بھی جواب دیے بغیر۔
"آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو' کوئی خاص وجہ؟"
یوں تو وہ مسکرا کے تحریم کی تعریف کر رہا تھا مگر اسے لگا جیسے تعریف کے پردے میں طنز کر رہا ہو۔
"صرف آج؟" اس نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا تو تحریم جو وحید کی بات پہ انکساری سے مسکرا رہی تھی' الجھی نگاہوں سے دیکھ کے رہ گئی۔
"میرا مطلب ہے۔۔۔" وہ سنبھل سنبھل کے کہنے لگا۔ "آج پہلے سے۔۔۔ یعنی معمول سے کہیں زیادہ اچھی لگ رہی ہے تحریم۔"
اس کے بعد اس نے تقدیس کو مخاطب کرنے کی حماقت نہیں کی اور وہ اور تحریم دھیمی آواز میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ تقدیس بظاہر انجان بنی لیمن سوڈا کے ڈرنک لے رہی تھی اور نگاہیں یہاں وہاں۔۔۔ تقریباً خالی پڑی ٹیبلز پہ بھٹک رہی تھیں مگر دھیان سارا کا سارا وحید کی جانب تھا۔
پانچ فٹ تین انچ کے قریب قد۔۔۔ مناسب اور درمیانی جسامت۔
رنگ سانولا' چہرے پہ وہ مہاسے' پکے نشان اور گڑھے چھوڑ گئے تھے جو کبھی نوعمری میں نکلے ہوں گے۔
تیز عیار قسم کی گول گول آنکھیں جن کے دیدے بے حد متحرک اور بے چین تھے۔ پان یا شاید سگریٹ سے نمایاں ہوتے بدنما اور بے ڈھب دانت۔۔۔ عمر بھی ہو گی کوئی پینتیس اڑتیس کے آس پاس۔
وہ ایک اچٹتی سی نظریں ڈالنے کے بعد ہی اس کا جی مکدر ہو گیا پھر اچانک ایک خیال کوندا۔ اتنی عمر ہونے کے باوجود یہ شخص نوعمر چھوکروں کی طرح ہوٹلوں میں بیٹھا ڈیٹ کیوں مار رہا ہے؟
"آپ کے گھر میں کون کون ہے؟"
اس نے اتنا اچانک سوال کیا کہ وحید واضح طور پر بوکھلا گیا۔ شاید اسے کافی دیر سے لاتعلق بیٹھی اس لڑکی کے اس سوال کی توقع نہ تھی۔
"میری ممی۔۔۔ سب ہی ہیں۔۔۔" گلا کھنکھارنے کے بعد اس نے قدرے توقف سے کہا۔
"تین بہنیں۔۔۔ ایک دادی۔۔۔"
"سب خواتین ہی ہیں؟"
"بس میں اکلوتا سہارا ہوں اپنے گھرانے کا۔" وہ اچانک بڑا مدبر' بڑا سنجیدہ نظر آنے لگا۔
"والد کی وفات کے بعد کاروبار اور فیملی کی ساری ذمہ داری میرے ہی ناتواں کاندھوں پہ ہے۔"
"میرے خیال میں تو آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ اچھے بھلے "میچیور" شخص ہیں آپ۔۔۔ ناتواں کاندھے کیسے ہو سکتے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے "بیچلر" پہ خاصا زور دے کر کہا تو وہ جزبز ہو کے رہ گیا۔
"میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب میرے والد گزرے تھے تب میری عمر صرف اکیس سال تھی۔"
"اوہ....." اس نے متانت سے سر ہلایا۔ ایسی متانت اور بردباری جو وحید کو حیران کر رہی تھی کیونکہ وہ اس عمر کی لڑکیوں کا خاصا نہیں ہوتی۔ وہ تو سمجھا بیٹھا تھا جیسی عقل سے پیدل "تحریم خود ہے" ویسی اس سے کئی برس چھوٹی بہن ہو گی یا شاید اس سے بڑھ کے ہو اپنی کم عمری کی وجہ سے۔
"آپ کی بہنوں کو تو بہت شوق ہو گا آپ کے سر پہ سہرا سجانے کا؟" وہ اس کے اب تک کنوارے رہنے کے معمے کو حل کرنا چاہ رہی تھی۔
"بے شک..... یہ تو فطری سی بات ہے۔ میری والدہ کو بھی بڑا ارمان ہے میرا گھر جلد سے جلد بس جائے۔"
"تو....؟" تقدیس نے ادھورا سا سوال کر کے چھوڑ دیا۔
"تو یہ گڑیا..... اپنی والدہ اور بہنوں کی خواہش سے کہیں بڑھ کے میری یہ خواہش ہے کہ میں اپنی چاروں بہنوں کو جلد از جلد ان کے گھر کا کر دوں۔ چاروں چھوٹی ہیں مجھ سے۔ ایک ابھی تعلیم سے فارغ ہوئی ہے دو پڑھ رہی ہیں سب سے بڑی اسکول ٹیچر ہے اور اس کی منگنی ہی بڑی مشکل سے کی ہے میں نے۔ اسے رخصت کرنے کے بعد کم از کم ایک اور بہن کی شادی اور دوسری کی منگنی کرنے کے بعد اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ چلو سب سے چھوٹی کی شادی میں تو ابھی پانچ چھ برس ہیں۔ دراصل لڑکیوں کے رشتے دو وجہ سے جلد ہوتے ہیں یا تو ان کا غیر معمولی حسن ہو یا پھر بے شمار دولت۔ میری بہنیں قبول صورت ہیں اور مالی حالات..... ظاہر ہے میں اکلوتا ہوں خاندان کا ٹھیک ٹھاک گزارا ہو رہا ہے مگر ہر بہن کو جہیز میں کروڑوں کی مالیت کی جائیداد تو نہیں دے سکتا پھر بھی بساط بھر کوشش کر رہا ہوں کہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ جتنا بھی ہو سکے جمع کر لوں تا کہ ان کی معمولی شکل صورت کو نظر انداز کر کے کوئی....."
اس نے بات ادھوری چھوڑ کے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے تحریم کی جانب دیکھا جو افسردہ سے تاثرات لیے اپنے ناخن سے ٹیبل کی سطح کھرچ رہی تھی۔ تقدیس نے لفظ "معمولی شکل و صورت" پہ اس کا رنگ پھیکا پڑتے بھی دیکھا تھا۔ وہ الجھ کے وحید کا جائزہ لینے لگی۔
اس کی ظاہری شکل و صورت، بناوٹی مسکراہٹ اور عیار و مکار سی آنکھیں مسلسل اسے کھٹک رہی تھیں کسی گڑبڑ کی نشاندہی کر رہی تھیں۔
دوسری جانب اس کی لچھے دار گفتگو میں ایسا کوئی سقم نہ تھا جس سے وہ گرفت میں آتا۔
اس نے اس معاملے کو کسی اور طریقے سے حل کرنے کا سوچا۔ "آپی..... میں بھی ساتھ چلوں گی۔"
ندا کو شولڈر بیگ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر ظلِ ہما نے جلدی جلدی بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کہا۔
"لیکن تمہارا ٹائم تو....."
"ہاں..... وہ سر نے آج میٹنگ کے لیے جلدی بلایا ہے۔"
"چلو پھر..... ورنہ وصی کے ہارن پہ ہارن بجنا شروع ہو جائیں گے۔"
ندا کے کالج آنے جانے کا مسئلہ جوں کا توں تھا۔ وین یا بس پہ وہ جانے کو تیار نہ تھی اور اپنی کنونس یعنی کہ گاڑی لینے کی اس کی خواہش کے آڑے وصی آ رہا تھا۔ سو یہ فریضہ بھی اس کے سر ہی سونپا گیا۔ اب وہی اسے پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ ندا کے کالج اور اس کے آفس جانے کی ٹائمنگ ایک تھی۔ وہ روز وہیں میں آ جاتا، ظلِ ہما روز بالکونی سے دیکھ دیکھ کر کلسا کرتی۔ کاش وہ بھی وصی کے ساتھ..... اس کے کوچنگ جانے کا وقت بھی تو نرالا تھا۔
"آہا..... آج تو بڑے بڑے لوگ باہر تک سی آف کرنے آئے ہیں۔"
وصی نے اسے آتا دیکھ کے جملہ کسا۔ وہ کچھ کہے بغیر پچھلی جانب کا دروازہ کھولنے لگی۔

...کالج کی اور میرے آفس کی ٹائمنگ بھی ایک ہی ہے اور روٹ بھی۔ انہیں ڈراپ کرنے کے بعد شہر کے دوسرے کونے پہ پھینکنے جاؤں گا تو آفس سے لیٹ نہیں ہو جاؤں گا۔"
...ڈراپ کرو، ٹائم بھی بچے گا اور میرا دماغ بھی۔" آخری الفاظ اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے کہے۔
"نہیں میری کلاس مس ہو جائے گی۔ پہلے مجھے۔" ندا نے مداخلت کی۔ جلا بھنا وصی مسلسل بڑبڑاتے ڈرائیونگ کرتا رہا اور ظلِ ہما دل ہی دل میں خود کو کوستی رہی۔
...مرے اس کی قربت کے۔ بڑا ترس رہی تھی نا۔ اس کی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے، جیسے تمہیں ساتھ ...گاڑی سیدھا چاند پہ لے جائے گا یا نہر کنارے روک کر ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے گانا ہی تو گانے لگ جائے گا۔ ...مجھ پہ جو ہر بار کے تلخ تجربے کے بعد بھی باز نہیں آتی۔"
...وصی..... تھینکس....!"
...خیالوں سے تب چونکی جب ندا آپی نے اترتے ہوئے ٹھک سے دروازہ بند کیا۔
"...بھی یہیں اتر جاتی ہوں۔" اس نے وصی کے چہرے پہ کوفت اور دیر ہو جانے کی جھنجلاہٹ دیکھ کر کہا۔
"...یہاں کیا تماشے بٹ رہے ہیں؟" وہ چڑچڑے پن سے پھاڑ کھانے کو دوڑا۔
"...آفس نزدیک ہے، تم جاؤ۔ میں رکشہ لے لیتی ہوں۔"
..."حسب توقع اس نے خاصی پس و پیش نہ کی۔ وہ بجھے دل کے ساتھ گاڑی سے اتری اور ڈھیلے قدم ...ہوئے گردن گھما کے دیکھا۔ وہ زن سے گاڑی آگے بڑھا کر جا چکا تھا۔
...کے کوڑھ مغز اور دو دو تین تین سپلیاں لینے والے میٹرک کے اسٹوڈنٹس کو حالی کی نظم کی تشریح ...ہوئے اس کا بارہا دل چاہا یہاں سے بھاگ جانے کو۔ ادھار..... تنخواہ ملنے پہ چکانے کا وعدہ نہ کر چکی ہوتی ...کر بھی گزرتی مگر...

○ ○ ○

"...مصیبت ہے؟"
...زور سے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مار کے بڑبڑا کے رہ گیا۔
"...بدل جائے گی مگر یہ خاتون نہیں سدھر سکتیں۔ پتہ نہیں قوم کی معصوم بچیوں کو کیا پڑھاتی ہوں گی یہ۔"
...ندا کی مظلوم اسٹوڈنٹس پہ ترس آنے لگا اور سخت خراب موڈ کے ساتھ اس نے یوٹرن لے کر گاڑی ...ندا کے کالج والے روڈ پہ ڈالی۔ ندا اپنی لاپروا طبیعت کی مہربانی سے خالی ہاتھ ہلاتی کالج چلی گئی تھی۔ اس کی دو ...سیٹ پہ دھری کی دھری رہ گئی تھیں، جو یقیناً ضروری ہوں گی۔ جب ہی تو وہ ساتھ لائی تھی۔ پہلے تو دل چاہا ...بھاڑ میں جائیں فائلیں لیکن جانتا تھا جیسے ہی اسے فائلیں یاد آئیں گی، فون پہ فون آنا ...ہو جائیں گے اور آفس ایک بار جانے کے بعد دوبارہ نکلنا خاصا مشکل تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ فائلوں کی ...ہی مکر جائے لیکن اس صورت میں زیادہ خواری ہو سکتی تھی۔ پہلے تو فون پہ رو رو کے سیلاب لائے ...پھر منت سماجت کر کے گھر جانے کو کہا جائے گا۔
"...اچھا ہے کہ میں انہیں من مانی کرنے دوں، لے لیں اپنی کار اور دوڑاتی پھریں ہر جگہ۔" اس نے ...سوچا جو ظاہر ہے صرف سوچا ہی جا سکتا تھا، جو خاتون اپنی ضروری فائل کار میں، کمرے کی چابی کمرہ لاک ...کے بعد کمرے ہی کے اندر، اور پانی نکالتے ہوئے والٹ فریج میں رکھ کے بھول سکتی ہے، کیا بعید کہ پارکنگ ...کھڑی کرنے کے بعد نکالنا بھول جائے اور رکشے میں گھر آ جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پارکنگ سے ...جائے اور اپنی ہی گاڑی کا نمبر بھول جائے۔
...سیکنڈ تک کالج کے گیٹ کے سامنے جھنجلا کر سوچتے رہنے کے بعد اس نے موبائل فون نکالا اور ندا کا نمبر ...دوسری جانب نمبر آف مل رہا تھا۔ کلاس میں جاتے ہی وہ فون آف کر دیا کرتی تھی۔
"...جاتے ہی لیکچر دینا شروع کر دیا اور فائلز کا ہوش نہیں۔" وہ اور جل گیا۔

فائلز اٹھائے وہ گاڑی سے نکلا اور گیٹ تک آیا تاکہ گیٹ کیپر کے ہاتھ اندر بھجوا سکے مگر اس وقت وہ بھی غائب تھا۔ عین اسی وقت ایک لمبی سی سیاہ مرسڈیز گیٹ کے سامنے رکی اور باوردی ڈرائیور نے نکل کر پچھلا دروازہ کھولا۔ وصی وہاں متوجہ ہو گیا۔

"شاید کوئی ٹیچر یا اسٹوڈنٹ ہے' اس کے ہاتھ اندر بھجوا دیتا ہوں۔"

اس نے ایک ہی قدم آگے بڑھایا تھا کہ کار سے برآمد ہوتی اس لڑکی کی ایک جھلک نے اسے ٹھٹک جانے پہ مجبور کر دیا۔

❖ ❖ ❖ ❖

"کیا ہوا تھا اماں کو؟"

تین گھنٹے تک ڈاکٹروں کے ساتھ مغزماری اور اس لیب سے اس لیب تک چکر کاٹنے کے بعد نوید مراد نڈھال سا لگ رہے تھے۔

"وہی بدپرہیزی۔" منزہ نے دبے لہجے میں کہا۔

"مگر کیسے....؟ جبکہ تم ان کے لیے خاص پرہیزی کھانا تیار کرتی ہو' باقاعدہ چارٹ بنا رکھا ہے تم نے اور خود وہ ایک قدم تک اٹھانے کے قابل نہیں پھر کیسے ہوئی یہ بدپرہیزی۔"

"میرے پرہیز کرانے کا کیا فائدہ؟ میں تو ان کے بھلے کے لیے پرہیزی کھانا پکاتی ہوں۔ ایک ایک قطرہ آئل کا گن کے ڈالتی ہوں مگر سب کو تو یہ نظر نہیں آتا۔ کچھ کا تو یہی خیال ہے کہ میں نے ان پہ دنیا کی نعمتیں جان بوجھ کے بند کر رکھی ہیں۔ ان کی حالت پہ رونا رویا جاتا ہے' وہ بھی ان کے سرہانے بیٹھ کے۔ ایسے میں مریض کی حالت کیا سنبھلے۔ وہ خود بھی اپنے آپ پہ ترس ہی کھانے لگے گا۔ دل مچلے گا الٹا سیدھا وہ سب کچھ کھانے کو جس سے میں نے محروم کر رکھا ہے۔"

وہ بھی جیسے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے پروین؟"

"اور کون....؟ اماں خود چل کے کچن جا نہیں سکتیں۔ میں یا وشمہ ایسی بے وقوفی کر نہیں سکتیں کہ شوگر' بلڈ پریشر اور انجائنا کی اس پیشنٹ کو گاجر کا حلوہ کھلا دیں جو پچھلے کئی سالوں سے فالج کا بھی شکار ہیں۔"

"پروین ایسی حماقت کیسے کر سکتی ہے؟"

"میں تو اتنی عادی ہو گئی ہوں اس کے رویے کی کہ اب توجہ دینا ہی چھوڑ دی تھی لیکن مجھ سے بالکل نہیں دیکھی جا رہی تھی اماں کی یہ حالت۔ میرے اتنے سالوں کے کیے کرائے پہ پانی پھیر دیا پروین نے۔ گاجر کا حلوہ دیسی گھی سے بنا بادام' کھویا۔ اف.... اماں کی تباہی کا پورا سامان...."

وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑ رہی تھی' جب نوید نے ہسپتال کے کاریڈور کے آخری سرے سے افتاں و خیزاں نمودار ہوتی پروین کو دیکھا۔

"میں اماں کے پاس جاتی ہوں۔"

منزہ نے پروین کو دیکھا مگر نہ دیکھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے آئی سی یو کی جانب بڑھ گئی۔

"کیا ہو گیا اماں کو بھائی جان! ان میں اب کہاں سکت رہی تھی کسی اور بیماری کو جھیلنے کی۔"

وہ سسکتی ہوئی نوید کے سینے سے لگیں مگر ان کا ہاتھ دلاسہ دینے کے لیے بہن کے سر کی جانب نہ بڑھا۔ پروین کو کسی خالی پن کا احساس تو ہوا مگر بھائی کے عجیب و غریب رویے کو اس کی پریشانی پہ محمول کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"ابھی کل تک تو اماں بھلی چنگی تھیں' میں خود دیکھ کے آئی تھی' بات بات پہ مسکرا رہی تھیں۔ پہلے تو گھڑی گھڑی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے جیسے کسی معمول کی طرح رہتی تھیں۔ بٹھا دیا' بیٹھ گئیں۔ گلاس ہونٹوں سے لگا دیا' گھونٹ بھر لیا۔ جو منہ میں ڈالا' بے دلی سے نگل لیا مگر کل خود ہاتھ سے پرے کر رہی تھیں' دلیے کا پیالہ

مشکل سے مجھے سمجھایا انہوں نے کہ میٹھا کھانے کو جی کر رہا ہے۔"

"تم نے کھلا دیا؟" نوید نے خشک لہجے میں پوچھا۔

وہ ٹھٹک گئی۔ غور سے بھائی کی آنکھوں میں جھانکا اور کسی گہرے احساس نے ان کے ہاتھ پیر سن کر دیے۔

"صرف.... صرف ایک چمچ....." انہوں نے مجرمانہ انداز میں سر جھکایا۔ اب جا کے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔

"بھائی جان! دراصل.... وہ اماں.... پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔"

وہ شرمساری اور التجا کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔

"کسی بیمار کا کسی چیز کے لیے خواہش ظاہر کرنا بھی تو اچھی علامت ہے۔ مجھے لگا اماں کے اندر میٹھے کی خواہش امید جاگی ہے زندگی کی بس اسی لیے.... مگر بھائی جان صرف ایک چمچے سے تو ان کا یہ حال نہیں ہو سکتا۔"

"ان کو ہارٹ اٹیک ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے ہوا ہے اور ہائی بلڈ پریشر یا تو کسی ٹینشن یا ذہنی دباؤ سے ہو سکتا ہے یا بدپرہیزی کی وجہ سے۔ تم نے خود دیکھا کہ کل تک تو انہیں کوئی فکر یا پریشانی نہیں تھی پھر ظاہر ہے کہ بدپرہیزی کی وجہ سے ہی وہ اس حالت کو پہنچی ہیں۔ مجھے تم سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی پروین!"

پروین اپنی صفائی میں جو کہنا چاہتی تھیں اور جو کچھ بھی کہنے کے قابل تھیں' وہ سب تو کہہ چکی تھیں۔ اب اور باقی رہا تھا جو کہتیں۔ چپ چاپ آئی سی یو میں زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ماں کو دیکھتی اور آنسو بہاتی رہیں۔

"میری ضد میں وہ اس سے بھی زیادہ حماقت کا ثبوت دے سکتی ہے۔"

خلاف عادت منزہ خاصا بول رہی تھی' جو نوید کے لیے بھی باعث حیرت تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کچھ غلط نہیں کہا میں نے۔ میں کچھ بتاتی نہیں آپ کو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ خود سے کچھ پتا نہ ہو۔ میں ہمیشہ سب کچھ نظرانداز کرتی رہی مگر حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے پروین نے بیمار ماں تک کو...."

اس کا گلا رندھ گیا اور نوید مراد پریشر ککر کی طرح اندر ہی اندر پھنکارنے لگے۔

شمشاد بیگم کا کمزور وجود اس اٹیک کو سہار نہ پایا اور رات کے آخری پہر وہ اپنا اعمال نامہ سنبھالتی لرزتی کانپتی خدا کے حضور پیش ہو گئی۔

✲ ✲ ✲

"مجھے ٹوسٹر دکھائیے۔"

سیلزمین سے کہتے ہوئے تقدیس متلاشی نظروں سے اسٹور کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔

خاصا بڑا اسٹور تھا' ہر طرح کے الیکٹرانکس پہ ورائٹی کی وسیع رینج موجود تھی..... مائیکروویو اوون سے لے کر واشنگ مشین اور اے سی تک۔ سات آٹھ افراد پہ مشتمل عملہ اسے سرگرم نظر آ رہا تھا مگر وحید کا نام و نشان نہ تھا۔

"یہ لیٹسٹ ماڈل ہے کمپنی کا۔ اس میں بیک وقت آٹھ سلائس ٹوسٹ ہو سکتے ہیں۔"

سیلزمین کے کہنے پہ اس نے بے دلی سے ایک نظر سامنے رکھے دو تین کمپنیوں کے ٹوسٹرز پہ ڈالی۔

"میڈم! اسینڈوچ میکر کی نئی رینج آئی ہے۔ وہ چیک کریں گی آپ؟"

سیلزمین نے اس کی بے توجہی بھانپ کر کہا۔

"نہیں' کچھ دن پہلے' اس دن میں آئی تھی تو میں نے کوئی اور ٹوسٹر پسند کیا تھا' تب میں لے نہیں سکی' وہ اب نظر نہیں آ رہا۔"

"کس کمپنی کا ہے؟"

"نہیں' مجھے یاد نہیں۔"

"سوری میڈم! اس وقت جتنے برانڈز مارکیٹ ہیں' میں نے آپ کو دکھا دیے ہیں۔ کیا اسی اسٹور پہ پسند کیا تھا

"جی..... مجھے اچھی طرح یاد ہے اور یہ بھی کہ اس دن مجھے کسی سیلزمین نے نہیں، خود اس اسٹور کے اونر نے ڈیل کیا تھا۔"

"وحید صاحب نے؟" وہ اچنبھے سے بولا اور تقدیس کا کچھ دیر پہلے لگایا اندازہ بھی زمیں بوس ہو گیا۔ اسے لگا تھا کہ وحید کا اس اسٹور سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ یونہی گپ چھوڑ رہا ہے۔

"کمال ہے..... وہ کسٹمرز کو یوں ڈیل کرتے تو نہیں۔"

زیرلب بڑبڑاتے ہوئے وہ ٹوسٹرز اٹھانے لگا۔ اس سے ذرا فاصلے پہ کھڑے دوسرے سیلزمین نے دبی آواز میں کہا۔

"کسٹمر لیڈیز ہوں تو کر بھی لیتے ہیں۔"

اگرچہ آواز بے حد ہلکی اور مسکراہٹ مبہم تھی مگر تقدیس نے بخوبی سن بھی لی اور دیکھ بھی لی۔ خاموشی سے وہ اسٹور سے نکل آئی۔

اس نے ایک ٹٹولتی ہوئی نظر اسٹور کے باہر کھڑے سیکورٹی گارڈ کو دیکھا جو گن سنبھالے بیٹھا تھا۔ ذہن میں آتے خیال کو جھٹک کر اس نے قدم آگے بڑھائے۔

اور اگلی نظر اسٹور کے سامنے بنے پارکنگ ایریا کے ایک کونے میں ڈالی جہاں زمین پہ چادر بچھائے فال والا طوطا لیے ایک شخص بیٹھا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے سامنے بچھی چادر پہ پچاس کا نوٹ رکھ رہی تھی۔

"چل میرے بادشاہ۔ بی بی کو فال نکال کے دے۔"

"مجھے طوطے سے نہیں، آپ سے کچھ جاننا ہے۔"

"بی بی ہمارا علم تو یہی ہے، جدی پشتی۔ وہ سامنے والے پلازہ کی بغل میں پروفیسر حمیدی بیٹھتا ہے، وہ ہاتھ دیکھ کے بتاتا ہے لیکن بی بی! میں کہتا ہوں جو علم اس بے زبان کے پاس ہے، وہ اس پروفیسر کے پاس نہیں۔ وہ کسی لالچ میں، کسی مجبوری میں جھوٹ بھی بول سکتا ہے اور سچ بھی چھپا سکتا ہے مگر یہ معصوم وہی کرتا ہے اور وہی بتاتا ہے، جس کا اسے اشارہ ہوتا ہے۔"

"اور آپ مجھے وہ بتائیں جو آپ جانتے ہیں، اس اسٹور کے اور اس کے مالک کے بارے میں۔"

اب کے وہ ٹھٹکا، غور سے سامنے بیٹھی لڑکی کی جانب دیکھا جس نے بڑی سی سرمئی چادر اس ڈھنگ سے اوڑھ رکھی تھی کہ نہ جسم کے خطوط واضح ہو رہے تھے، نہ چہرے کے خدوخال کا صحیح طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ آدھے سے زیادہ چہرہ چادر تلے پوشیدہ تھا لیکن اتنا تو وہ بھانپ سکتا تھا کہ یہ کوئی نوجوان لڑکی ہے اور لب و لہجے سے اس کے کسی اچھے خاندان سے ہونے کا اندازہ بھی ہو رہا تھا۔

"یہ دس روپے لے کر فال نکالنے والا طوطا ضرور پچاس کا نوٹ دیکھ کے اوقات سے باہر ہو سکتا ہے بی بی! لیکن میرا منہ کھلنے کے لیے یہ پیسہ کم ہے۔"

تقدیس نے چپ چاپ سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر سامنے رکھ دیے۔

"وحید نام ہے اس دکان کے مالک کا۔"

"اتنا تو مجھے پتا ہے۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"سیٹلائٹ ٹاؤن میں کوٹھی ہے۔ ایسی دو دکانیں شہر میں اور بھی ہیں۔ ایک گل ریز میں، دوسری صدر میں۔ صدر والی میں اس کا باپ بیٹھتا ہے اور گلریز والی میں بڑا بھائی۔"

"باپ..... بڑا بھائی.....؟" اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"اور..... جلدی بتاؤ۔" مگر وہ اس کے بے تابانہ سوالات نظرانداز کرتا انگلی کان میں گھماتے ہوئے آسمان کی جانب تکنے لگا۔ تقدیس نے چڑ کے پانچ سو کا نوٹ اس کے آگے پھینکا۔

"چار بہنیں ہیں اس کی؟" تقدیس نے وحید کے بیان کی تصدیق چاہی۔

"نہیں ہیں، دو بیاہی، ایک کنواری۔"

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" اچانک تقدیس کو شبہ سا گزرا کہ کہیں یہ شخص صرف رقم کی لالچ میں اپنی طرف سے گھڑ کے تو جواب نہیں دے رہا۔ بھلا اسٹور کے باہر بیٹھنے والے اس مفلوک الحال شخص کو اسٹور کے مالک کے گھریلو اور ذاتی حالات کا کیا علم۔ اس کی کتنی بہنیں شادی شدہ ہیں اور کتنی غیر شادی شدہ، یہ اتنے وثوق سے کیسے بتا سکتا ہے۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بی بی! یہ تو کھلا سچ ہے۔ میں جھوٹ بکوں گا تو کسی دوسرے کو پکڑ کے پوچھ لینا، سارے جانتے ہیں۔ وحید صاحب کا ایک بہنوئی تو ادھر پرلی طرف پراپرٹی کا دفتر کھول کے بیٹھا ہے اور وہ جو دوسرا والا ہے، جو وحید صاحب کا بہنوئی بھی ہے اور سالا بھی، وہ ڈاکٹر ہے۔ آتا جاتا رہتا ہے ادھر۔"

"سالا بھی، کیا مطلب؟" آسانی سے سمجھ آنے والی بات تھی مگر انکشافات ہی اتنے تابڑتوڑ تھے کہ دماغ سن ہو کر رہ گیا تھا۔

"وٹے سٹے میں بیاہے گئے تھے دونوں۔ شریکے (رشتہ دار) بھی لگتے ہیں ایک دوجے کے۔"

"کب..... کب ہوئی تھی شادی؟"

"پتا نہیں جی۔" وہ کان کھجانے لگا۔

"مجھے تو تین چار سال ہی ہوئے ہیں اس علاقے میں مگر وحید صاحب کا بڑا لڑکا ہو گا کوئی بارہ تیرہ سال کا۔ اسی سے اندازہ لگا لو۔"

وہ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بی بی! ایک بات اور....." وہ رکی، ہاتھ پرس کی جانب گیا۔

"نہ..... یہ بات پیسے لے کر نہیں بتاؤں گا۔ خدا خوفی کے خیال سے بتا رہا ہوں۔ میری بھی دو بچیاں ہیں، ان کا لحاظ کر کے کہہ رہا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ وحید صاحب نے..... دراصل وہ بندہ عورتوں کے معاملے میں ایسا ہی ہے۔ اس کا بہنوئی اور سالا..... وہ خود بھی ایسا ہے۔ دونوں اپنی اپنی گھر والیوں کے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں اور بے غیرتی دیکھو، ایک دوسرے کے کالے کرتوتوں کو جانتے بھی ہیں لیکن کوئی بہن کے خیال سے دوسرے کا گریبان نہیں پکڑتا کہ اگلا ہاتھ اس کے اپنے گریبان تک آئے گا۔"

تقدیس کے پاس کچھ کہنے کی ذرا سی سکت نہ تھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کے وہاں سے چل دی۔

☼ ☼ ☼

"کیسے بتاؤں آپی کو، انہیں شاک لگے گا۔ بکھر جائیں گی وہ۔ پہلی بار انہوں نے کسی پہ اعتبار کیا، پہلی بار اپنے خول سے نکل کر ایک عام اور نارمل لڑکی کی طرح کوئی خواب بنا اور اس پہلی جسارت کی ہی اتنی بڑی سزا۔"

بہن کو نہ بتاتی تو چپ چاپ اس کی بربادی کا تماشا کیسے دیکھتی اور اگر بتاتی تو اسے کیسے سنبھال پاتی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" تطہیر نے الماری سیٹ کرتے ہوئے اس کی جانب دھیان دیا، جو کب سے ایک ہی رخ پہ بیٹھی اضطراری حالت میں پیر ہلائے جا رہی تھی۔

"اور یہ پیر ہلانا تو بند کرو، نری نحوست۔"

"آپی کہاں ہیں؟"

"ماما کے ساتھ مارکیٹ گئی ہیں۔"

تطہیر کی اطلاع پہ وہ چونکی۔

"لگا نا جھٹکا۔" تطہیر ایک ہینگر سے ڈریس اتارتے ہوئے مسکرا کے پوچھنے لگی۔

"ہو مشکل سے کہیں نکلنے پہ تیار ہوتی تھیں، آج ماما کو مارکیٹ جاتے دیکھ کر خود ساتھ جانے کا کہنے لگیں۔ شاپنگ کا ارادہ تھا ان کا۔ رئیلی مجھے تو بڑا اچھا لگا آپی کا یہ چینج۔"

وہ خالی خالی نظروں سے اس کے مطمئن اور آسودہ چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔

"کاش میں بھی بے خبر ہوتی تو اتنی ہی مطمئن نظر آتی۔ میں بھی لاعلم ہوتی تو آپی کی اس تبدیلی پہ خوشی کا اظہار کر رہی ہوتی لیکن میں بے خبر ہوتی ہی کیوں یا "باخبری" یہ "آگہی" تو ہمیشہ سے میرے مقدر میں لکھی ہے میری فطرت میں شامل ہے۔ جب ماما اور پاپا کے درمیان جھگڑا شروع ہونے پہ آپی سہم کے کمبل کے اندر گھس جاتی تھیں اور تطہیر لاپروائی سے کارٹونز کا والیم اور تیز کرلیا کرتی تھی تو یہ میں ہی تھی جو دروازے سے چپکی کھڑی ان دونوں جانب سے ایک دوسرے پہ برسائے جانے والے زہر میں بجھے تیروں کی کڑواہٹ اپنے اندر اتارتی تھی اور پاپا کے گھر سے نکل جانے کے بعد روتی اور کلستی ماما کے آنسو پونچھتے ہوئے ان کی خود کلامیوں سے اگلے کڑوے گھونٹ پیتی تھی۔ مجھے تو ابتدا ہی سے چسکا ہے باخبر رہنے کا۔ چاہے یہ باخبر رہنا مجھے کتنے ہی کچوکے کیوں نہ لگاتا ہو۔"

وحید کے بارے میں ملی اطلاعات اسے اور بہت کچھ یاد دلا رہی تھیں۔ ماضی کی وہ ساری کہانی جسے مدیحہ بعض سے ہونے والے ہر جھگڑے کے بعد نئے سرے سے دہرایا کرتی تھیں۔

وہی وٹے سٹے کی شادی۔

وہی گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے ادھر ادھر کی منہ ماری۔

وہی باہر کے معاشقوں میں اپنا شادی شدہ اسٹیٹس چھپانا۔

"کیا ماما سچ کہتی ہیں۔ سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔"

یہ خیال اسے اچانک آیا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے مزید پختہ کرتی یا اسے جھٹلاتی، تحریم اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کسی مشہور بوتیک کے شاپنگ بیگز تھے۔

وہ خاموشی سے اس کے کھلے کھلے چہرے کو تکنے لگی۔

"آج میں نے شاپنگ کے سارے ریکارڈ توڑ کے ماما کو بھی حیران کر دیا۔"

"کیا مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں حقیقت بتلا کے اس چہرے سے مسکراہٹ نوچ لوں جس سے مسکراہٹ کی شناسائی بس ابھی ابھی ہوئی ہے۔ اس آواز سے بشاشت کو چھین لوں، جس میں کھنک پیدا ہوتے چند ہی دن ہوئے ہیں۔ کتنا مشکل مگر کتنا ضروری ہے یہ کام۔"

"کیا دیکھ رہی ہو؟ تمہارے لیے بھی ایک زبردست سی چیز لائی ہوں۔ یہ دیکھو، تمہارے فیورٹ کلر کا کارڈیگن۔"

وہ پھولے پھولے بیگز میں ہاتھ ڈال کے نکالنے لگی۔

"تطہیر کے لیے بالکل نئے ڈیزائن کا ہینڈ بیگ۔ تمہیں تو پتہ ہے بیگز کے معاملے میں کتنی ندیدی ہے وہ جی نہیں بھرتا اس کا، چاہے جتنے مرضی رُل رہے ہوں کمرے کی الماریوں میں اور پتہ ہے...." اچانک اس کی آواز سرگوشیانہ ہوگئی اور رخساروں پہ حیا کے رنگ بکھرنے لگے۔

"وحید کے لیے بھی ایک تحفہ لیا ہے۔ ویسے تو انہیں مجھ سے تحفے لینا پسند نہیں ہے لیکن...."

"آپ کو ان کی ساری پسند ناپسند کا علم ہے؟"

اچانک اس کشمکش و پیچ سے نکلنے کا اس نے حتمی فیصلہ کرلیا۔ آر یا پار۔ دونوں صورتوں میں تحریم کو شاک تو لگنا ہی تھا۔ کیوں نہ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے کم نقصان گوارا کرلیا جائے۔

"ہاں۔" تحریم فخریہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"سب...." تقدیس نے دہرایا تو تحریم کو اس کی آواز و انداز میں کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا، وہ کھٹک گئی۔

"کیا مطلب؟"

"کیا آپ ان کے بارے میں یہ بھی جانتی ہیں کہ ان کی شادی کو کم از کم پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ ان کی بیوی

پڑھی لکھی، خاندانی اور خوش شکل عورت ہے۔ ان کے چار بچے ہیں اور...."

تحریم کا فق ہوتا چہرہ اسے نظر آ رہا تھا مگر اس نے رُکے بغیر سچ ہی اگلے۔

"اور ان پہ کوئی چار بن بیاہی بہنوں کا بوجھ نہیں ہے، ان کے والد زندہ سلامت...."

مگر تحریم اس کے آگے مزید کچھ سننے سے قبل ہی ہوش سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"چلیں امی...!" حسن نے کھڑے ہو کر پینٹ کی جیب میں ہاتھ پھنساتے ہوئے بوجھل پن سے کہا۔

"ہاں... بس... چلتی ہوں۔"

پروین کی آواز میں اس سے کہیں بڑھ کے بوجھل پن تھا۔ آج شمشاد بیگم کو گزرے تیسرا دن تھا۔ صبح ہی وہ قل سے فارغ ہوئے تھے۔ گاؤں سے اور دور پرے کے شہروں سے آنے والے رشتہ دار قل کے فوراً بعد واپسی کے لیے روانہ ہو چکے تھے مگر پروین کا فی الحال کوئی ارادہ نہ تھا۔ گھر پہ وہ بیگم شوکت جہاں سے اجازت لے کر آئی تھی دنوں کے ختم تک رکنے کی۔ اگرچہ اس پہ بھی سراج دین خاصا جزبز ہوا تھا لیکن انہوں نے سمجھا دیا۔

"زمانے کے تقاضوں کو بھی سمجھا کرو سراج! اب خود اپنے بچے بیاہنے کی عمر میں آگئے ہو۔ اس کی ماں کی وفات ہوئی ہے۔ کون سا بہت سے بہن بھائی ہیں۔ ایک پروین، دوسرا نوید۔ دونوں کو اس وقت ایک دوسرے کی ضرورت ہے اور پھر تعزیت کے لیے لوگ آتے رہیں گے۔ کتنا برا لگے گا اگر تب پروین وہاں نہیں ہوگی۔"

مگر پروین نے ماں کی تدفین کے فوراً بعد بھانپ لیا کہ میکے کے حالات اب اس کے لیے سازگار نہیں رہے۔ ویسے اچھے تعلقات تو کبھی بھی نہیں رہے تھے مگر آنکھیں ماتھے پہ رکھ لینے کی نوبت بھی کبھی نہیں آئی تھی۔ بڑی بھاوجوں کی طرح نہ تو اس نے بھی پروین سے تو تو میں میں کی تھی، نہ طنز میں بھگو بھگو کے وار کیے تھے اور مثالی نندوں کی طرح دوستانہ ماحول بھی قائم نہ ہونے دیا تھا۔ کبھی دونوں نے سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے دل کی باتیں نہیں کی تھیں۔ اس کے باوجود پروین کو قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ جب وہ ماں کے آنسو رونے کے لیے اس کے گلے لگنے آگے بڑھیں گی تو منزہ لوگوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر کنی کترا جائے گی۔ اس وقت وہ صدمے کے زیر اثر اس الجھن پہ زیادہ توجہ نہ دے سکیں۔ نہ اندر باہر کی مصروفیت میں مگن بھائی کے بدلے بدلے تیور بھانپ سکیں مگر کب تک۔

شمشاد بیگم کی تدفین کے بعد جب آنسو ذرا تھمے تو دھند صاف ہوئی، انہیں سب صاف نظر آنے لگا۔

نوید مراد کا اکھڑا اکھڑا انداز اور بے رخی۔

منزہ کی واضح اجنبیت۔

انہیں ایک منٹ بھی یہاں مزید گزارنا مشکل لگنے لگا مگر دور پرے کے تمام رشتہ دار، آس پڑوس کے جاننے والے سب موجود تھے۔ کیسے اٹھ کے چلی جاتیں، شوکت جہاں نے تو خیر یہ بدلا ہوا ماحول اس ماتمی حالات میں بھی بھانپ لیا تھا مگر غم سے چور پروین کو جتلانا مناسب نہیں سمجھا بعد میں حسن کو بھیجا۔

"جاکے ماں کی خیر خبر لے آؤ۔"

"میکے میں ہے، مزے سے ہوگی۔" جواب سراج دین کی جانب سے آیا۔

"خدا کا نام لو سراج!" وہ دہل گئیں بیٹے کی اس سفاکی کے مظاہرے پہ۔

"موت والا گھر ہے، وہ وہاں کون سے مزے لے رہی ہوگی۔ ماں تھی وہ اس کی، تم کیا میرے مرنے کے اگلے دن بھی...."

"ارے ہو اماں جان...!" سراج نے انہیں بات مکمل نہ کرنے دی۔ "میرا مطلب صرف یہ تھا کہ ابھی رات کو ہی تو وہاں سے آئے ہیں۔ چند گھنٹوں میں ایسا کیا ہو گیا ہوگا کہ آپ صبح سویرے حسن کو وہاں دوڑا رہی ہیں۔ آجائے گی۔"

"اس کی بھی نانی تھی' اللہ بخشے مرنے والی..." ان کی تیوریاں ابھی تک ناگواری ظاہر کر رہی تھیں۔
"ماموں بے چارہ نڈھال ہو گا۔ اس کا فرض بنتا ہے کہ وہاں جائے اور اسے دلاسا دے' ہاتھ بٹائے۔ اس کی کوئی بیٹا نہیں تو اس صورت میں بھانجوں پہ زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔"
"چلو بھیجنا ضرور وہاں' کبھی ماں کی خیر خبر لانے کے بہانے تو کبھی ماموں کا ہاتھ بٹانے۔"
وہ چڑ کے ناشتے کی ٹیبل سے اٹھ گئے۔
"دنیا بدل گئی۔ عمر کیا سے کیا ہو گئی۔ بچے جوان ہو گئے مگر سراج کی سسرال سے خار نہ گئی۔ نجانے اس کی مردانگی اور شوہرانہ انا کی کون سی تسکین ہوتی ہے۔ سسرال والوں کو نیچا دکھا کے اور ان سے لاتعلقی جتا کر۔"
وہ کڑھنے لگیں تو حسن اپنا چائے کا مگ اٹھا کے ان کے قریب آ گیا۔
"کیوں پریشان ہو رہی ہیں دادو! میں اور حسان ابھی چلے جاتے ہیں۔"
"حسان کو تو تم رہنے ہی دو' فوتگی والے گھر میں بھی چائے ناشتے ہی بنواتا رہے گا۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"
وصی نے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی مگر حسان نے فوراً" اس کے گلے لگتے ہوئے اسے پھر سے کرسی پہ گرا دیا۔
"شکریہ میرے عظیم دوست..... بھائی...! میں تمہارا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔ آج تم میری نانی کی وفات پہ میرے کام آ رہے ہو' ان شاء اللہ کل میں بھی تمہاری نانی..."
"اوئے...." اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے وصی چلایا۔
"دیکھو ذرا اس لڑکے کو' باؤلا۔ یہ بھی نہیں یاد کہ وصی کی نانی اس کی بھی تو دادی لگتی ہے۔"
بیگم شوکت جہاں نے ماتھے پہ ہاتھ مار کے کہا تھا اور حسان بے چارہ خجل ہو کر ایک اور پراٹھا پلیٹ میں رکھ کے سر جھکا کر نوالے توڑنے لگا۔
اور اس دن بے شک دادی کی ہدایت پہ حسن' پروین کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا مگر اس وقت اور پھر اگلے دن قل کے ختم کے موقع پر اس نے جو کچھ محسوس کیا' اس کے بعد شام کو وہ کسی کے کہے بغیر ماں کو لینے کے لیے پھر سے موجود تھا۔
"ابھی تو گئے تھے تم سب کے ساتھ۔"
وہ بھی اسے غیر متوقع طور پر دیکھ کے حیران تھیں۔
"اس وقت بہت لوگ تھے' ان کے سامنے آپ کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں لگا۔ اب لینے آیا ہوں۔"
"مگر بیٹا!" وہ متذبذب ہو گئیں۔ اگر یہ کڑے دو دن درمیان میں نہ آئے ہوتے تو یہ تذبذب دور تک نہ ہوتا' وہ ڈانٹ کر رکھ دیتیں حسن کو اس نامعقول مطالبے پہ۔
"کوئی اگر مگر نہیں' سب دیکھ رہا ہوں میں۔ اب بھی آپ کو یہاں مزید رہنے کی خواہش ہے؟"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر لوگ کیا کہیں گے۔" وہ دبی زبان میں کہہ رہی تھیں۔
"رشتہ دار باتیں بنائیں گے کہ ایسی عزیز تھی بیٹی کو اپنی گھر گرہستی' دس دن ماں کا سوگ نہ منا سکی۔"
"کیسا سوگ امی! جانے والے کو صرف دعائے مغفرت کی حاجت ہوتی ہے' وہ آپ اپنے گھر بیٹھ کے بھی کر سکتی تھیں۔ اتنا ہی کوئی پوچھے تو بتا دیں اصل وجہ....."
"چائے پئیں گے حسن بھائی!" اس بھیگی بھیگی بوجھل سی آواز پہ حسن نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے کے درمیان وہ دھلے دھلے شفاف چہرے کے ساتھ موجود تھی۔
"نہیں۔" اس کی تلخی خود بخود کم ہوئی۔ لہجہ نرم پڑ گیا۔ ہلکے سبز رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کرتا پاجامہ میں وہ بہت مضمحل نظر آ رہی تھی۔
"تم ٹھیک ہو؟"

"جی... چائے نہیں تو کھانا کھا لیں۔ ٹائم تو ہو گیا ہے۔"
"نہیں' شکریہ۔ میں بس امی کو لینے آیا ہوں۔"
"پھپھو! آپ جا رہی ہیں؟"
"ہاں بیٹا...!" پروین نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
"دل نہیں لگا ہمارے ہاں؟"
"کیسی بات کرتی ہو بیٹا! یہ کوئی موقع ہے دل لگانے کا۔ بس گھر پہ بچے کچھ پریشان ہیں میرے نہ ہونے سے۔"
"وشمہ بیٹا! کیوں پریشان کر رہی ہو اپنی پھپھو کو۔" منزہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے بڑے عام سے لہجے میں
"تم نے ہوش سنبھالنے کے بعد بھلا کتنی بار انہیں یہاں آ کے رہتے دیکھا ہے؟ دو بار یا تین بار....؟ اور وہ بھی صرف اماں کے پاس.... اب ماں نہیں رہی تو کون سی کشش انہیں میکے سے باندھے گی۔"
"بھابھی!" پروین نے پہلی بار منزہ کو اتنی طویل بات کرتے سنا تو مارے حیرت کے کچھ کہہ نہ سکیں۔
"سچ ہی تو کہہ رہی ہوں۔ ہمارے گھر میں وہ آسائشیں' وہ آرام کہاں' اسی لیے تو حسن' حسان بھی بس کھڑے کھڑے آتے ہیں' ورنہ بچے اپنے ننھیال سے جانے کو تیار نہیں ہوتے۔ خیر.... دل کے رشتے زور زبردستی سے تو باندھے نہیں جا رہے لیکن تم خود ہی رشتوں میں پائیداری نہیں چاہتیں۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔"
یہ حملہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ پروین جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔
"اب تو چلیں امی!" حسن نے جھنجلا کر کہا۔ پروین شکستہ قدموں کے ساتھ باہر کی جانب بڑھنے لگیں۔
"وشمہ بیٹا! اپنے پاپا کو بتا دینا۔ پھپھو جا رہی ہیں۔ آ کر مل لیں۔ اچھا سنو' رہنے دو۔ ان کے سر میں درد ہے' سختی سے منع کر کے سوئے تھے کہ معمولی باتوں کی وجہ سے پریشان نہ کرنا۔"
وشمہ' ماں کا لہجہ اور طور پہچانے بنا سر ہلاتی اندر کی طرف مڑ گئی۔ حسن نے بڑے بھاری دل کے ساتھ اسے جاتے دیکھا۔
"آتی جاتی رہیے گا۔"
پروین نے اپنی پشت پہ اس کی آواز سنی اور بڑی دیر سے رکے آنسو رخساروں پہ بہہ نکلے۔

☼ ☼ ☼

وہ جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں پھر رہی تھی۔
"یہ میرا گھر ہے..... میرا...."
ایک ایک چیز کو ہاتھ سے چھوتی' ایک ایک کونے کو نظروں سے کھنگالتی وہ خود کو یقین دلا رہی تھی۔
"عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ پہلے باپ کے گھر پھر شوہر کے گھر پناہ گزین ہوتی ہے۔ پہلے میکہ پھر سسرال ٹھکانہ ہوتا ہے۔ گھر کوئی نہیں ہوتا مگر میرا ہے اور یہ گھر مجھے ایسے نہیں مل گیا' بہت بڑی قیمت دے کر حاصل کیا ہے میں نے۔ اپنے جگر کا ٹکڑا نوچ کے پھینکا ہے۔ اپنے ضمیر کو تھپکی دے کر سلایا ہے۔ وہ سب کیا ہے' جو میرے ظرف اور میری فطرت کے خلاف تھا' اس سب کے بدلے مجھے اتنا صلہ تو ملنا چاہیے۔ یہ گھر...."
منزہ نے رات کے اندھیرے میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک چکر کاٹتے ہوئے سوچا۔
"اور سوہا کو اپنی ماں کے گھر رہنے سے کون روک سکتا ہے بھلا؟ میری بچی.... میری سوہا... تمہاری ماں صرف تمہارے لیے اس سطح تک گری ہے' اب اسے نظروں سے نہ گرانا یہاں آنے سے انکار کر کے۔"

● ● ●

وہ تو کوئی بھی تھی.... عام سی نہیں تھی....
عام لگ ہی نہیں سکتی تھی.... لیکن وصی کا چونکنا... اس کا ٹھٹکنا اس کے بے حد خاص نظر آنے کی وجہ

سے نہیں تھا۔ وہ اسے بہت شناسا محسوس ہو رہی تھی۔
اسے کہیں دیکھا تھا۔۔۔ بلکہ دیکھتا رہا تھا مگر کب اور کہاں؟ یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔
سوہا نے گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے راستے میں تن کر کھڑے اس لڑکے پہ بڑی تیز نظر ڈالی جو مسلسل [illegible] باندھے اسے گھور رہا تھا۔ وہ ناگواری لیے پاس سے گزری تو وصی کی محویت ٹوٹی۔
"ایکسکیوزمی مس!"
وہ مڑی مگر کچھ کہے بغیر ماتھے پہ شکن لیے اسے دیکھنے لگی۔ انداز سراسر ایسا تھا جیسے سننے کے لیے کھڑی ہو کر بھی کوئی احسان کر رہی ہو۔
"آپ یہاں پڑھتی ہیں یا پڑھاتی ہیں؟"
"تم نے مجھ سے پڑھنا ہے یا مجھے پڑھانا ہے؟"
بے حد ترش انداز میں سوہا نے اس کا سوال معمولی ردوبدل کے ساتھ اسے لوٹایا۔
وصی کے لبوں پہ محظوظ ہونے والی مسکراہٹ پھیلی جس نے پہلے سے جلی بھنی سوہا کو اور تپا دیا۔
"ایکچوئلی مجھے اندر کچھ بھجوانا تھا۔۔۔ کائنڈلی آپ۔۔۔"
اس نے سوہا کے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوتے دیکھ کر سنبھل کر اپنی مسکراہٹ سنجیدگی کے پردے میں چھپائی اور مدعا بیان کرنا چاہا مگر سوہا اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پھٹ پڑی۔
"تمہیں میں "رقعے" پہنچانے والی نظر آتی ہوں؟"
"جی؟" چند لمحے تو وہ اس جواب کی تہہ میں اترنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر مطلب واضح ہونے پہ خجل سا ہو گیا۔
"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔۔۔ بات رقعے کی نہیں، پوری فائل کی ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل لہرا کے اسے دکھائی۔
"اگر آپ اسٹوڈنٹ ہیں تو آپ کی ایک ٹیچر اور اگر خود ٹیچر ہیں تو آپ کی ایک کولیگ مس ندا معراج میری سسٹر ہیں۔ ان تک یہ فائل پہنچانی ہے۔ اتنی سی ہیلپ کر سکتی ہیں آپ؟"
"مس ندا معراج؟" سوہا نے تذبذب کے عالم میں زیر لب یہ نام دہرایا۔ پھر ہاتھ آگے بڑھا کے فائل تھام لی۔
"میں اس نام کی کسی ٹیچر کو جانتی تو نہیں۔ اینی وے۔۔۔ یہ فائل اسٹاف روم تک پہنچا دوں گی۔"
وہ چلی گئی مگر وصی وہیں کھڑا ادھ کھلے گیٹ سے اسے دور تک اندر جاتے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔
"یار۔۔۔! اسے دیکھا کہاں ہے؟"

☼ ☼ ☼
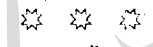
"تقدیس! میں جانتی ہوں، تمہیں سب پتہ ہے کہ تحریم کی ایسی حالت کیوں ہوئی ہے۔۔۔ تم مجھے کچھ بتاتی کیوں نہیں!"
ہسپتال سے آنے کے بعد مدیحہ نے کڑے تیوروں کے ساتھ تقدیس سے پوچھا۔۔۔ وہ سر جھکا کے رہ گئی۔۔۔ ایک تو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے ویسے ہی اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی تحریم کے بارے میں سوچ سوچ کر۔ ان ہی سوالوں سے بچنے کے لیے تو وہ ماما کے ساتھ ہسپتال تک نہیں گئی تھی۔
"کیسی ہیں اب آپی؟"
"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟"
"ماما۔۔۔! وہ آپی کی طبیعت صبح سے ہی۔۔۔" اس نے عذر تراشنا چاہا۔
"ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے رہ گیا ہے اس کا۔" ممّا کی آواز ہلکی سی کپکپائی۔

"[illegible] کچھ نہیں ہوگا ماما۔ ان کا بی پی کچھ لو ہو رہا تھا۔ شاید اسی لیے یا پھر وہ آج کل ڈائٹنگ بھی کر رہی تھیں [illegible] ویک نیس کی وجہ سے انہیں۔"
"[illegible] کمزوری کی وجہ سے کوئی دو گھنٹے کے لیے بے ہوشی کی حالت میں نہیں چلا جاتا تقدیس! مجھے بہلانے کی کوشش [illegible] اور وہ بات بتاؤ جس پہ پردے ڈالنے کے لیے تم مسلسل جھوٹ پہ جھوٹ بول رہی ہو۔ میں ماں ہوں [illegible] ان بودے بہانوں پہ مطمئن نہیں ہو سکتی۔ مجھے تمہارے باپ کو بھی جواب دینا ہے۔ شکر کرو کہ وہ ان [illegible] یہاں نہیں ہیں۔ پرسوں آئیں گے۔۔۔ اور مجھے پرسوں سے پہلے پہلے یہ معمہ بھی حل کرنا ہے اور یہ مسئلہ [illegible]"
"[illegible] یقین کریں۔۔۔ مسئلہ کوئی ہے ہی نہیں۔۔۔"
"[illegible] تو رنگ کیوں اڑا ہوا ہے تمہارا؟"
[illegible] مدیحہ کی اندر تک اترتی، ٹٹولتی نظروں کے آگے وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکی اور ان کے گلے لگ کے [illegible]
"[illegible] ماما! میں نے تو آپی کے بھلے کے لیے سوچا تھا۔۔۔ میں نے بالکل یہ نہیں چاہا تھا کہ ان کی ایسی حالت۔۔۔ ماما۔۔۔ یہ [illegible] ضروری تھا۔۔۔ بہت ضروری۔۔۔ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے۔"
"کیسا بڑا نقصان؟" اپنے کاندھے پہ رکھے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے پھیرتے مدیحہ لمحہ بھر کو ساکت ہوئیں۔
[illegible] اس سکتے میں بے انتہا اندیشے متحرک تھے۔
"بولو۔۔۔ کیسا نقصان؟" انھوں نے تقدیس کو جھنجھوڑا۔
"ماما۔۔۔ آپی نے۔۔۔" وہ مناسب قطع و برید کے ساتھ سارا واقعہ بتانے لگی۔

❦ ❦ ❦

چند لمحوں کی نقدی دے کر
عمروں کا سودا ملتا ہے
اس سودے میں غم کی گٹھڑی
اس سودے میں دکھ کے بنڈل
اشکوں کی پروئی لڑیاں
دو خریدو تو چار مفت میں ملتی ہیں
کون کہتا ہے اس سودے میں
ہاتھ کچھ نہیں آتا ہے
جھولی بھر کے پچھتاوے ملتے ہیں
[illegible] ہی تو ہے جو جاتا ہے

[illegible] کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔۔۔ پھر بھی یقین تھا کہ آ ہی نہیں رہا تھا۔۔۔ ہر طرف جھوٹ منہ پھاڑے ہنستا [illegible] تھا۔ اپنے ارد گرد موجود سب ہی چہرے اسے تہہ در تہہ نقاب میں چھپے نظر آ رہے تھے۔ اسی لیے وہ کسی کا [illegible] نہیں چاہتی تھی۔۔۔ کسی کی آواز۔۔۔ سننا نہیں چاہتی تھی۔
[illegible] گھر آئے چار گھنٹے ہو چکے تھے مگر ان چار گھنٹوں میں اس نے کسی سے مخاطب ہونا تو در کنار۔۔۔ کسی کی بات [illegible] کا رد عمل تک نہ ظاہر کیا تھا۔۔۔ جیسے وہ گونگی۔۔۔ بہری اندھی ہو چکی ہو۔
[illegible] دوپہر کے وقت بے ہوشی کے عالم میں اسے ہسپتال لے جایا گیا تھا اور ساری رات کے بعد آج صبح دس [illegible] کے قریب وہ گھر آئی تھی؟ ڈاکٹر کی اس ہدایت کے ساتھ کہ اسے کسی قسم کے شاک اور ذہنی دباؤ سے دور رکھا [illegible] سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مگر ذہنی دباؤ تھا کہ ساتھ نہیں چھوڑ رہا تھا۔

"بیٹا! اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ کل تمہارے پاپا آنے والے ہیں۔ کیا بتائیں گے ہم انھیں تمہارے بارے میں۔"

مدیحہ نے لہجے کی درشتی کو چھپانے کی بہت کوشش کی مگر وہ چھلک ہی پڑی۔ تحریم نے شکوہ کناں نظروں سے ان کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

گرم سیال ایک لکیر کی صورت اس کے زرد چہرے سے ہوتا تکیے میں جذب ہونے لگا۔ دیوار کے ساتھ کھڑی تقدیس کا دل اس کی حالت دیکھ کے کٹ رہا تھا مگر اپنی جلد بازی پہ پشیمان وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ بہن کے سامنے آ کے کچھ کہہ پاتی۔ پہلے وحید کا بھانڈا پھوڑنے میں جلد بازی کا مظاہرہ۔ اس کے بعد ماں کے سامنے سب کچھ اگل دینے کا اتاؤلا پن۔

اس نے تو اس وجہ سے سب کچھ کہہ ڈالا تھا کہ اتنا بوجھ وہ اکیلے سہار نہیں پا رہی تھی۔ اور تحریم کا ردعمل اس کی توقع سے زیادہ شدید اور خطرناک تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ ایسے میں مدیحہ کی تفتیش۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے اور اس نے یہی بہتر جانا کہ ماں سے زیادہ بہتر ہمراز اور دمساز کوئی ہو سکتا ہے؟ وہ اس معاملے کو زیادہ بہتر طریقے سے ہینڈل کر لیں گی مگر اب ان کا رویہ دیکھ کر پچھتا رہی تھی۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے پیش نظر مدیحہ مجبور تھیں کہ تحریم سے نارمل انداز میں بات کریں۔ مگر اندر ہی اندر وہ بری طرح مشتعل تھیں۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ تحریم کو آڑے ہاتھوں لیں مگر وہ جلے پیر کی بلی کی طرح اندر اس کے کمرے میں جاتیں۔ اس کی نیم غشی کی کیفیت۔ پیپڑی جمے سفید لبوں۔ زردی کھنڈے گالوں کو دیکھتیں اور اندر ہی اندر خود سے لڑتی باہر نکل آئیں۔ اور پھر چیزیں پٹخ پٹخ کے بڑبڑاتے ہوئے دل کی بھڑاس نکالتیں۔

"میری ساری عمر کی ریاضت کو پل بھر میں خاک میں ملا کے رکھ دیا ہے اس لڑکی نے۔ لوگ اسی لیے تو بیٹی کی پیدائش پہ کانوں کو ہاتھ نہیں لگاتے ـــــ بیٹی کو پالنا مسئلہ نہیں ہے۔ بیٹی کو سنبھالنا مسئلہ ہے۔"

"ایسا تو نہ کہیں ماما۔ آپی نے ایسا کچھ نہیں کیا جو۔۔۔"

تقدیس سے رہا نہ جاتا اور بول اٹھتی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" مدیحہ ساری کھولن اس پہ نکال دیتیں۔

"اور کیا باقی رہ گیا تھا کرنے کو؟ ماں کے سر میں خاک ڈال کے، باپ دادا کی عزت پاؤں میں رول کے بھاگ نکلتی فراڈیے کے ساتھ، تب کا انتظار تھا تمہیں؟"

"ماما۔۔۔!" تقدیس ہکا بکا رہ گئی۔ یہ تحریم ہی تھی جو مدیحہ کے نزدیک تینوں بیٹیوں میں سب سے زیادہ سیدھی سادی سب سے زیادہ فرماں بردار تھی۔ اور ایک معمولی سی لغزش کی وجہ سے اس قدر بدگمانی؟

"ماما! پلیز آہستہ بولیں۔ آپی سن لیں گی۔ انہیں صدمہ ہو گا۔"

وہ جانتی تھی کہ اس وقت تحریم کی طرف داری کرنا مدیحہ کو اس سے بھی برگشتہ کر سکتا ہے اس لیے اس نے اتنا کہنے پہ اکتفا کیا۔

"اوہونہہ، صدمہ اور ہمیں جو صدمہ پہنچانے چلی تھیں محترمہ اس کا خیال نہیں تمہیں۔۔۔ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ دھچکا نہ لگتا اسے تو۔ تو سوچو کیا ہو سکتا تھا۔ اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں پورے خاندان کے منہ پہ کالک مل سکتی تھی وہ۔"

"آپی سادہ ہیں۔ ناسمجھ ہیں مگر بے وقوف نہیں ہیں۔ خاندان کی عزت کا خیال انہیں بھی ہے۔ اور انہوں نے ایسا نہ تو کچھ کیا ہے۔ نہ کرنے کا کوئی ارادہ تھا جس سے ہمیں کوئی دکھ ملتا۔ ایسی باتیں کرنے کے بجائے ہمیں انہیں حوصلہ دینا چاہیے۔ انہیں احساس دلانا چاہیے کہ ہم سب ان کے ساتھ ہیں۔ ان کے پاس۔۔۔"

"ہاں اب یہی کام تو رہ گیا ہے کہ جوان بیٹیوں کے ناکام عشق کے آنسو پونچھتی پھروں۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے ہٹ جاتیں اور تقدیس اور تطہیر ایک دوسرے سے نظریں چراتی رہ جاتیں۔

ان کے سامنے تحریم کی اس حرکت پہ بے بھاؤ کی سنانے والی مدیحہ بیٹی کے کمرے میں جاتے ہی ایک بے بس سی چپ کے حصار میں آ جاتیں۔

ان کی ممتا پھڑپھڑانے لگتی اور اندر کا غصہ تھا جو اس پھڑپھڑاتے جذبے کو کھل کے حاوی نہ ہونے دیتا تھا۔ عجیب کشمکش میں گھری وہ اسے دیکھتی رہ جاتیں۔ یا پھر بے معنی سی باتیں کر کے اسے معمول کے انداز میں واپس لانے کی کوشش کرنے لگتیں۔ اور یہ کوشش بار آور اس لیے نہ ہو پاتی تھی کہ ان میں وہ گرمجوشی، وہ ہمدردی، وہ اپنائیت سی دل سوزی مفقود تھی جو ایک ماں ہونے کے ناتے اس کی ذات سے تحریم کو محسوس ہونی چاہیے تھی اسی لیے تحریم گم صم کسی بے جان بت کی طرح انھیں تکے جاتی۔

"میں کچھ کہہ رہی ہوں تم سے اس پہ غور کرو اور رحم کھاؤ میرے حال پہ۔"

بالآخر وہ اس چپ کے آگے ہار مان کے پھٹ پڑیں اور دونوں ہاتھ بیٹی کے سامنے جوڑ دیے۔ تقدیس دیوار سے ہٹ کر جلدی سے معاملہ سنبھالنے آگے بڑھی۔

"آپی! ماما بہت پریشان ہیں آپ کی وجہ سے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کی حالت دیکھ کے۔"

اس نے ملتجی نظروں سے مدیحہ کو دیکھتے ہوئے تحریم سے کہا تھا۔ مدیحہ نے جز بز ہوتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

"اسی لیے وہ چاہتی ہیں کہ آپ جتنا جلدی ہو سکے خود کو سنبھال لیں۔ اور پھر ایسے شخص کے لیے خود کو مزید کیا تکلیف دینا جو اس قابل ہی نہ ہو۔ آپ کو اس کے بارے میں اب اپنی زندگی کا ایک منٹ، ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کرنا۔ ہمارے بارے میں سوچیں۔ ماما کے بارے میں۔ پاپا کے بارے میں۔ میرے اور تطہیر کے بارے میں۔ ہم سب آپ کو چاہتے ہیں، ہمیں آپ کی ضرورت ہے، ہمارے لیے زندگی کی جانب لوٹیں۔ توڑ دیں یہ خود ساختہ ماتمی حصار۔ پلیز آپی! بھول جائیں اس حادثے کو پلیز۔"

اس نے تحریم کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیے۔۔۔ وہ تحریم سے چھوٹی تھی۔ مگر اس کی ہتھیلیوں سے ممتا کی حرارت اسے اپنے اندر جذب ہوتی محسوس ہوئی۔۔۔ اسے دل کو چھو جانے والی شاید اسی آنچ کی ضرورت تھی۔ وہ پگھلنے کے لیے شاید اسی گنگنے لمس کا انتظار کر رہی تھی۔

مدیحہ نے اسے تقدیس کی انگلیاں لبوں کے ساتھ لگا کے روتے دیکھا اور غیر محسوس انداز میں ان کے پاس سے ہٹ گئیں۔

"ہاں یار۔ نہیں آج نہیں۔ کل آؤں گی۔"

لاؤنج میں تھکی تھکی سی تطہیر کو فون پہ کہتے سنا تو ان کی تمام حسیات متحرک ہو گئیں۔

وہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

"آج گھر میں کچھ مصروفیت تھی۔ نہیں کچھ خاص نہیں۔۔۔ بس وہ۔۔۔"

مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ مدیحہ اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین چکی تھیں۔۔۔ تطہیر کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

"بہت ہو گیا۔۔۔ بڑی چھوٹ دے دی میں نے تم لوگوں کو۔۔۔ اب یہ سب نہیں ہو گا۔" انھوں نے ریسیور پٹختے ہوئے کہا۔

"مگر ماما۔ ہوا کیا ہے؟"

"ہونے کو اور رہ ہی کیا گیا ہے۔ جس سے میں مر کے بھی ایسی امید نہیں کر سکتی تھی اس نے یہ کارنامہ کر دکھایا ہے تو تم پہ کیسے بھروسہ کر لوں۔ جو دن کے چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے باہر گزارتی ہے۔"

"پلیز ماما! سوچ سمجھ کے بات کریں۔"

تطہیر سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ ویسے بھی وہ کسی کی بات مشکل سے ہی برداشت کرتی تھی۔ خاص طور پہ ناجائز بات۔

"سوچ سمجھ کر ہی کہہ رہی ہوں۔ پہلے جو بغیر سوچے سمجھے تم لوگوں پہ اندھا اعتماد کیا ہے اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ تمہارا باپ پہلے ہی مجھے کچھ نہیں سمجھتا۔ بیوی کی حیثیت سے میں کبھی اس کی نظروں میں جچی ہی نہیں۔ اب یہ اولاد مجھے اور رسوا کروائے گی۔ اسے موقع دے گی کہ وہ مجھے ایک بری ماں بھی ثابت کر سکے۔"

سالوں بعد ان پہ وہی ہیجان طاری تھا جو جعفر محمود کو اس سے مزید متنفر اور تینوں بچیوں کو دہشت زدہ کر دیا کرتا تھا۔

"ماما! آپ کو ہو کیا گیا ہے' کس طرح بی ہیو کر رہی ہیں آپ؟"

قریب تھا کہ تطہیر کا یہ دبا دبا احتجاج گستاخی کی حد کو چھونے لگتا۔ تقدیس انہیں تنبیہا گھورتے ہوئے آگے بڑھی۔

"ریلیکس ماما۔ اتنی ٹینشن نہ لیں آپ! آپی اب..."

"تم اپنے لیکچر اسے سناؤ۔" مدیحہ نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی تیز لہجے میں کہا۔

"بجائے اسے یہ احساس دلانے کے کہ وہ کیا کرنے چلی تھی' الٹا اور ہلا شیری دی جا رہی ہے۔ دلاسے دے دے کر۔"

"تو کیا کروں میں... ان کی حالت تو دیکھیں آپ... انہیں اس وقت محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔"

"اور میں... مجھے ضرورت نہیں ہے ہمدردی کی؟ سب سے زیادہ ہمدردی کی مستحق میں ہوں... میں تمہاری ماں جو ہمیشہ تم تینوں کو دیکھ کر اپنے ساری محرومیاں بھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس حویلی سے نکال کر تم تینوں کو یہاں لائی۔ کس لیے! تمہارے اچھے مستقبل کے لیے۔ اعلا تعلیم کے لیے۔ ورنہ وہاں رہ کے اپنی ماں اور پھوپھیوں' خالاؤں کی طرح میٹرک' ایف اے کرتے ہی خاندان کے کسی بھی بے جوڑ مرد کے سر پہ ان چاہے بوجھ کی طرح دھر دی جاتیں۔ میں نے وہاں سے نکلتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ میں تہی ہو رہی ہوں۔ اپنا میکہ' اپنا سسرال... اپنی مچن چھوڑی تھی میں نے۔ اس شخص کے ساتھ رہنے آ رہی تھی' جس کے لیے میرا ہونا' نہ ہونا کوئی۔ معنی نہیں رکھتا تھا۔ کم از کم وہاں میں کوئی حیثیت تو رکھتی تھی۔ کسی کی بیٹی' کسی کی بہن۔ کسی کی بڑی اور قابل احترام بہو۔ ڈھیر سارے رشتے چھوڑ کر تمہارے باپ کے لیے تختہ مشق بننا گوارا کیا میں نے صرف اور صرف تم تینوں کے مستقبل کے لیے اور... اور یہ مستقبل سنوارا ہے تم نے؟... عشق و عاشقی کے چکروں میں پڑ کے بیڑا غرق کرنے لگی ہوا اپنا!"

"پلیز ماما! آپ آپی کی غلطی کا غصہ ہم دونوں پہ تو نہ نکالیں۔"

ہمیشہ کی گرم مزاج تطہیر تنک کر بولی۔

"اس کی غلطی تو سامنے آ گئی۔ تم دونوں نجانے کیا کیا گل کھلا رہی ہو گی۔ وہ ایک نمبر کی بے وقوف۔ گھر گھسنی۔ جب وہ ایسا چاند چڑھا سکتی ہے تو تم تو ساتویں آسمان پہ تھگلی لگا کے آ جاؤ' تم سے کیا بعید ہے۔"

"حد ہو گئی ہے اب تو..." تطہیر نے بھرائی آواز میں کہا اور پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اس کی بے وقوفی نے اس کا راز کھول دیا۔ تم دونوں جو ایک دوسرے سے بڑھ کے ہو کان کترنے میں' نجانے کیا کیا چھپا کے رکھا ہو گا مجھ سے۔"

"ماما! آپ اپنی بیٹیوں کے بارے میں ایسی سوچ رکھتی ہیں؟" تقدیس نے بڑے دکھ کے ساتھ پوچھا تھا۔

"نہیں اپنی بیٹیوں کے بارے میں نہیں' جعفر محمود کے خون کے بارے میں۔"

مدیحہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تمہیں ورثے میں ملا ہے مجھے دھوکا دینا۔ مجھے کچوکے لگانا۔ تمہارے خون میں شامل ہے اعتبار توڑنا۔"

تقدیس کو اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کرچیاں بہت دور دور جا کے گری تھیں۔

☆ ☆ ☆

"یار۔ اہمال کی آرٹسٹک چیز بن گئی ہے۔"

ندا نے ہاتھ میں پکڑے پیپر کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب کیا کر ڈالا ہے آپ نے؟" ظل ہما چہرے پہ سنگترے کے چھلکوں کا ابٹن ملتے ہوئے پلٹ کر پوچھنے لگی۔

"تمہیں کیسے پتا ہے کہ انہوں نے ہی کچھ کیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے کسی اسٹوڈنٹ کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔" روا نے کتاب سے سر اٹھا کے اسے ٹوکا۔

"نہیں ہوں۔ وہ بات نہیں کر رہیں۔ تعریف کر رہی ہیں۔ اور تعریف وہ صرف اپنی کیا کرتی ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں آپی؟" ہما نے مسکراتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ابٹن ملے چہرے پہ پھیلتی مسکراہٹ اس لیپا پوتی کے باوجود چھپا چھپا کے اپنے اندر چھپے طنز کا اعلان کر رہی تھی۔

"تم تھوڑا بد اخلاق..." ندا مائنڈ کر گئی "میرا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور پھر روا کی جانب کھسکی۔

"یہ دیکھو۔ زبردست بنا ہے ناں؟"

"مگر یہ ہے کیا؟" اس نے چشمہ اوپر نیچے کرتے ہوئے ہونق پن سے پوچھا۔

"کارٹون اور کیا؟ ندا نے قدرے غصے سے کہا۔

"توبہ آپی۔! اتنی بڑی ہو گئی ہیں آپ۔ اور لیکچرار بھی کہلا رہی ہیں خیر سے۔ مگر کارٹون بنانے کا شوق نہیں جا رہا۔"

"تو تمہارا خیال ہے' یہ جو اتنے بڑے اور نامور کارٹونسٹ حضرات ہیں یہ سارے دودھ پیتے بچے ہیں؟ بڑے ہو جانے کے بعد کارٹون بنانے پہ پابندی لگ جاتی ہے کیا...؟ اس "بابے" کو بھول گئیں' جس نے ڈزنی لینڈ بنایا تھا تو بچپن میں بنایا تھا کیا؟ جناب یہ بھی آرٹ ہے... اسے تم جیسے سطحی سوچ اور ایوریج سی ذہنیت رکھنے والے لوگ سیریسلی نہیں لیتے ورنہ دنیا بھر میں کارٹونسٹ کی بڑی قدر و قیمت ہے۔"

"مگر یہ بغیر ڈنڈی کا حلوہ کدو بنانا کون سا آرٹ ہے؟" ہما نے رخسار رگڑتے ہوئے غور سے اس کا بنایا شاہکار دیکھا۔

"کدو...؟ یہ تمہیں کدو نظر آ رہا ہے؟" صدمے کے مارے ندا کی آواز پھٹ گئی۔

"نہیں... حلوہ کدو۔" اس نے تصحیح کی۔

"اسٹوپڈ... یہ بلقیس آنٹی کا کارٹون بنایا ہے میں نے۔"

"بل... قیس... آن...ٹی..." روا اور ہما ایک دوسرے پہ گرتے ہوئے ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔

ندا نے اسے بھی اپنے فن پہ داد دینے کا ایک انداز جانا اور فخر سے گردن انچ بھر اور باہر نکال لی۔

"دیکھا... کتنا فنی کارٹون ہے۔ تم لوگوں کی ہنسی نہیں رک رہی۔"

"اور بلقیس آنٹی کا ہاتھ نہیں رکے گا اگر انہوں نے یہ کارٹون دیکھ لیا۔"

"تو انہیں دکھا کون رہا ہے۔ یہ تو میں نے کالج میگزین کے لیے بنایا ہے۔"

"لو۔" ہما نے روا کو اشارہ کیا اور وہ تاسف سے سر ہلا کے رہ گئی۔

"جواب نہیں آپی آپ کا... یہ بلقیس آنٹی کا کارٹون ہے' یہ ہمیں بھی آپ کے بتانے کے بعد پتا چلا تو آپ کے کالج والوں کو کیا پتا یہ کس کا کارٹون ہے' کس سے متاثر ہو کے بنایا گیا ہے' بنایا تھا تو کسی ٹیچر وغیرہ کا بناتیں تاکہ وہ بھی دیکھ کے حظ تو اٹھاتیں۔"

"مشورے کا شکریہ... میں نے ایسا بھی کیا ہے... ایک آدھ نہیں' پورے اسٹاف کے کارٹون بنائے ہیں اور تو اور پرنسپل کا بھی۔"

"تو وہ چھپ بھی جائیں گے؟"

"نہیں..... خیر..... اتنی بے وقوف نہیں ہوں میں۔ وہ تو ویسے ہی موڈ میں تھی میں اس وقت اور کارٹون بن بھی رہے تھے مزے کے۔ اس لیے بناتی چلی گئی۔ لیکن کم از کم پرنسپل کا یا ان دو چار ٹیچرز کا تو نہیں دوں گی جو پہلے ہی مجھ سے خار کھاتی ہیں۔"

"اوہ..... رئیلی..... یعنی آپ سے خار کھانے والے وہاں بھی موجود ہیں؟"
وصی نے حسب عادت انٹری دیتے ہی گفتگو کا آخری سرا پکڑا۔

"جینئس لوگوں سے ہمیشہ خار ہی کھایا جاتا ہے۔ حسد کرنے والوں کی کمی تو نہیں ہے۔"
ندا نے اسے بُری طرح گھورا۔ ایک تو ویسے ہی بڑی ہونے کے باوجود اس کا بڑا پن اب تک مشکوک تھا اوپر سے وصی کے بے لاگ تبصرے اسے اور بھی نکو سا کر دیتے۔

"تھوڑے ہی عرصے میں میں اپنی اسٹوڈنٹس کی ہر دلعزیز ٹیچر بن گئی ہوں اور پرنسپل کی گڈ بکس میں بھی آگئی ہوں۔ اس وجہ سے اسٹاف کی پرانی مگراب تک ناپسندیدہ ٹیچرز بدکتی ہیں مجھ سے۔ ایسے میں اگر میں ان کے کارٹونز منظر عام پر لے آئی تو بس....."

"پھر کبھی دکھائیں تو سہی۔" ہما کے اندر اشتیاق سا جاگا۔

"پتا نہیں یار..... کہاں رکھ دیے..... مل ہی نہیں رہے۔"

"یہ تو حال ہے جینئس لوگوں کا....." وصی کو موقع ملا۔

"ان خاتون کو اپنا آپ یاد رہ جائے وہی بڑی بات ہے۔"

"تمیز سے بات کرو تم۔" ندا بھڑک اٹھی۔ "ادب کیا ہوتا ہے بالکل ہی بھول گئے ہو۔"

"مجھے پتا ہے ادب کیا ہوتا ہے۔ لٹریچر کو کہتے ہیں۔" وصی نے چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اور میں اس سے کام ضرور لوں گا مگر آپ بھی ذرا عقل شریف سے کام لیں۔ اپنے ضروری پیپرز ادھر ادھر رکھ دیتی ہیں۔ فرض کریں کبھی امتحانی پرچے یہاں وہاں بھول گئیں اور آپ کی اس غلطی کی وجہ سے پرچہ آؤٹ ہو گیا تو پھر؟ آپ کی تو یہ نوکری گئی جس پہ آپ پھولے نہیں سماتیں اور لیکچرر بن کے قوم کی معصوم بچیوں کو دھوکا دے رہی ہیں۔"

"کون سے ضروری پیپرز؟"
ندا نے تحمل سے اس کا تفصیلی بیان سننے کے بعد پوچھا۔

"تھی کوئی فائل..... جسے آپ میری گاڑی میں بھول گئی تھیں۔"

"اوہ وہ..... وہ میں بھولی نہیں تھی..... بلکہ بھول کے ساتھ لے جانے لگی تھی۔ اچھا ہوا وقت پہ یاد آگیا اور میں نے گاڑی میں ہی چھوڑ دی۔ ہاں صرف تم سے کہنا بھول گئی تھی کہ اسے واپس گھر لے جانا اور میرے روم میں پہنچا دینا۔ کہاں ہے اب؟ گاڑی میں پڑی ہوگی ابھی تک..... اتنی توفیق تو تم سے ہوئی نہیں کہ ساتھ لیتے آتے۔"

"نہیں..... وہ تو میں نے اسی وقت....."
اس نے کہنا چاہا مگر اس سے پہلے ہما کہہ اٹھی۔

"کون سی فائل؟"

"اس میں میں نے سارے اسٹاف اور پرنسپل کے کارٹونز بنائے تھے۔" ندا ہنستے ہوئے بتانے لگی۔

"سوچا تھا اپنی فرینڈ کو دکھاؤں گی۔ پھر خیال آیا کسی جل ککڑی، چغل خور کولیگ کی نظر پڑ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس لیے وہاں لے جانے کی حماقت نہیں کی۔ اپنے فن کی داد تم لوگوں سے ہی وصول کرلوں گی۔ کیا وصی!" وہ وصی سے مخاطب ہوئی تو وہ گڑبڑا کے رہ گیا۔

"کیا.....؟"

"وہی فائل..... قسم سے پرنسپل کی ناک تو ایسی کلاسک قسم کی بنی ہے اور آنکھیں..... چشمے کی اوٹ سے..."

...ہوئی جیسے دو نالی بندوق۔" وہ قل قل کرتی ہنسی کے ساتھ بتانے لگی۔

...جو میرے ڈیپارٹمنٹ کی سینئر ہیڈ ہیں ناں..... میڈم ذاکرہ..... جنہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے میری اور زنیرہ ...اسٹوڈنٹس میں مقبولیت دیکھ کے اور بقول جن کے ہمارے جیسی ٹیچرز نے اسٹوڈنٹس کو سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ ان ...چھائیوں کو میں نے ایسا کمال کا ابھارا ہے جیسے کسی نے سیاہ رنگ کی پچکاریاں پھینکی ہوں ان پہ..... لاؤ ...

"...وہ تو میں....."
...اپنی سویٹ سی ندا آپی کی متوقع درگت کا سوچ کر دل بیٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

...بس ایک بار پتا چل جائے وہ الو کا پٹھا تھا کون؟" سوہا تلملاتے ہوئے چکر کاٹ رہی تھی۔

"...کوئی تمہارا زخم خوردہ تو نہیں تھا؟" سبیکا نے ٹٹولا۔

"ہو سکتا ہے کسی پرانی چوٹ کا بدلہ لینے کے لیے یہ گھٹیا چال چلی ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ کیا میری یادداشت اتنی کمزور ہے کہ میں پہچان نہ پاتی۔" وہ بپھر کے بولی۔

"کول ڈاؤن یار..... یادداشت بیچاری کیا کرے۔ کوئی دو چار ہوں تو یاد بھی رہ جائیں۔ اتنے بوتھے کون یاد رکھے۔"

شیبا نے خباثت سے منہ پکا کرتے ہوئے کہا تو باوجود شدید غصے کے اسے ہنسی آگئی۔

"شٹ اپ....." اس نے شیبا کی پر گوشت کمر پہ دھپ ماری۔

"یہ فاریہ لوگوں کی شرارت ہو سکتی ہے۔"
...اس نے کالج میں اپنے مخالف گروپ پہ شبہ ظاہر کیا۔

"...انہیں بڑی تکلیف ہو رہی ہے آج کل۔"

"کیوں نہ ہو وہ لم ڈھینگ فاریہ..... رو رو کے تو اسے کوئی ڈھنگ کا بوائے فرینڈ ملا تھا اور سبیکا ایسی مین ہے..... اسے بھی کھینچ لیا۔"

"تو سبیکا جانے اور فاریہ..... مجھے اس معاملے میں گھسیٹ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔"
تب پہلی بار شیبا کو سوہا کے تاثرات سے ذرا خوف محسوس ہوا۔ چھوٹے موٹے تنازعے تو ان کے اور فاریہ کے گروپ میں ہوتے ہی تھے لیکن اگر سوہا اس میں براہ راست ملوث ہو رہی تھی تو اس کا مطلب تھا یہ تنازعہ معمولی نوعیت کا نہیں رہنے والا۔

"کم آن یار..... جسٹ لیو اٹ۔" اس نے سوہا کے اشتعال کو کم کرنا چاہا۔ "یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے..... کول ...

"...ہو گا..... مگر میرے ساتھ نہیں..... اگر تو فاریہ نے یہ پنگا لیا ہے تو She should pay for ...۔"
...اس نے اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر پش کرنے لگی۔ سبیکا اور شیبا نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے ...

"سوہا..... آئی تھنک..... یہ صحیح نہیں ہے۔ this is not a right ... ہمیں اس سے بات کر کے اس معاملے کو ..... حل کرنا چاہیے۔"
...سبیکا نے ٹوکنے کی ہمت کی۔

"...کیا مطلب ہے آپ؟" وہ غرائی۔

"...ناٹ ایٹ آل..... میرا مطلب تھا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سب کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو۔ ہم فاریہ

گروپ کی حرکت سمجھ رہے ہوں اور اصل میں یہ......"

"Now its too late ......" اس نے درشتی سے کہا اور فون کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"ہائے رونی...... Whatsup یار؟ تھنگ اسپیشل...... اوہ یس...... اچھا سنو ایک کام تھا۔ اوہ نو...... قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔ "وہ کام تم رہنے دو...... سوہا دل ہاتھوں میں لے کر نہیں بیٹھی جو کوئی آئے اور اڑا کے لے جائے۔ فی الحال تو تم سے بڑا معمولی سا کام تھا...... ایک لڑکی ہے...... فاریہ......"

"سوہا...... سنو تو......" سبیکا نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ذرا سا رخ موڑ کے ترچھی ہو گئی اور مزید انہماک سے بات کرنے لگی۔ سبیکا بے بسی سے شیبا کو دیکھ کے رہ گئی۔

وہ بے چارگی سے کاندھے اچکا کے سوہا کو دیکھنے لگی۔

"نہیں بھئی اتنا زیادہ نہیں its too much تم تو موقع کے انتظار میں رہتے ہو۔" اور پھر ایک اور بے تکلفانہ قہقہہ لگانے کے بعد اس نے قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ذرا سا ڈرا دینا بس بچی کو...... سمجھ جائے گی اگر عقل مند ہوئی تو...... دیٹس گریٹ۔" چند لمحوں بعد فون بند کر کے فاتحانہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"کالج میں تو یہ سب چلتا رہتا ہے سوہا! تمہیں نہیں لگتا کہ تم اوور ری ایکٹ کر رہی ہو؟"

شیبا نے ملامتی انداز میں کہا۔

"اس نے مذاق کیا...... مانا کہ بڑا چیپ مذاق ہے۔ تمہارا غصہ سمجھ میں آتا ہے لیکن اس میں رونی جیسے انسان کو انوالو کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تو اس سے تمہاری فرینڈ شپ بھی پسند نہیں۔ وہ بڑا کرمنل مائنڈ پرسن ہے۔"

سبیکا نے بھی ناپسندیدگی ظاہر کی تو وہ اس کے ناراض ناراض چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔

"سویٹ ہارٹ...... پاور جہاں سے ملے اکٹھی کرنی چاہیے کہ یہاں جینے کا ایک ہی ڈھنگ اب تک کامیاب رہا ہے...... پاور...... رونی سے میری کوئی فرینڈ شپ نہیں ہے۔ ان فیکٹ وہ ایسا انسان ہی نہیں ہے جس سے کوئی بھی دوستی کر سکے۔ ہاں وہ ایسا انسان ضرور ہے جس سے دوستی کے نام پہ اس کی طاقت اور اختیارات کو استعمال ضرور کیا جا سکتا ہے اور میں یہی کر رہی ہوں۔"

"فاریہ بھی کسی معمولی فیملی سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ بات بہت دور تک جائے گی سوہا! ابھی بھی روک لو رونی کو۔"

"جانے دو دور تک...... ویسے بھی مجھے جلدی ختم ہو جانے والی نہ باتیں اچھی لگتی ہیں نہ عادتیں۔" وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

"میرا بیلنس ختم ہو گیا ہے۔ لوڈ کروا کے آتی ہوں۔ جسٹ کمنگ۔"

اور اس کے جانے کے بعد سبیکا نے پریشانی سے کہا تھا۔

"سوہا دن بدن......" اسے شاید کوئی مناسب لفظ نہ مل رہا تھا...... یا کہنے سے ہچکچا رہی تھی۔

"دن بدن لوفر ہوتی جا رہی ہے۔" شیبا نے اس کی مشکل آسان کی اور اسے اس ٹینشن میں بھی ہنسی آ گئی۔ بڑا دلچسپ لفظ لگا اسے...... لوفر......

"Dont say یار......"

"ریئلی...... Imustsay یہ وہ سوہا لگتی ہی نہیں جو چار سال پہلے تھی۔"

"چار سال پہلے وہ ایک اسکول گرل تھی۔ ہم دونوں بھی تو چار سالوں میں اتنے چینج ہوئے ہیں۔"

"یہ چینج نیچرل ہے۔ ہر ایج کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جس طرح ہم تیرہ سال کی عمر میں ری ایکٹ کرتے تھے ویسا سولہ سال کی عمر میں نہیں کرتے تھے اور جو تھنکنگ ہماری سولہ سال کی عمر میں تھی وہ اب نہیں ہے مگر اس کے اندر جو چینج آ رہا ہے بلکہ آ چکا ہے وہ صرف چینج نہیں ہے disaster (تباہی) ہے اور تم دیکھنا اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی کسی دن برے پھنسیں گے۔"

"شروع سے ایسی ہے یار...... بولڈ...... من موجی اور رسکی۔"

"ہونہہ نہیں اور چیز ہے یار......" تھرل کے پسند نہیں اس ایج میں...... لیکن لائف میں تھرل پیدا کرنے کے لیے خود کو مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کرتا اور رونی جیسے لڑکے کے ساتھ اتنی دوستی رکھنا نری مصیبت ہے۔ مجھے تو اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اس میں اس کی عمر سے زیادہ عقل اور سمجھ بوجھ ہو۔ اپنا آپ ...... مجھے اس کے سامنے بالکل بچہ لگتا ہے اور کبھی ایسی چائلڈش حرکتیں...... فاریہ نے ایک شرارت کی...... بلکہ کنفرم نہیں ہو سکا کہ یہ شرارت اس کے گروپ کی تھی یا کسی اور کی شامت آئی ہے۔ جو اس نے سوہا کو ...... کے آفس تک لے جانے کی حرکت کر ڈالی اور اس بات پہ وہ فاریہ کا کیس رونی تک کو دے بیٹھی ہے۔ یار ...... کر لیتی...... بدلے میں کوئی ایسی ہی شرارت...... چلو کوئی لڑائی جھگڑا ہی سہی۔ تھوڑا بہت ہم بھی ساتھ دیتے ...... بات مجھے ذرا اچھی نہیں لگی۔"

"تم نے سنا نہیں اس نے کیا کہا...... وہ پاور کا استعمال کر رہی ہے۔ رونی کی صورت اسے ایسی بیک ملی ہے کہ ...... پاور کا کھیل جی بھر کے انجوائے کرنا چاہتی ہے۔"

"تو ہیل ود رونی......" وہ اکتا کے کھڑی ہو گئی۔

"میں تو سخت بور ہو گئی ہوں ان بے کار لڑکوں سے۔"

"Exactly ...... اب تک کے چھ تجربے یہ بتاتے ہیں کہ بوائے فرینڈز سوائے ٹینشن اور خواری کے کچھ نہیں دیتے۔"

"تو پھر......؟" اس نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"توبہ کر لو گی؟"

"اب میں بوائے فرینڈ پالو رپہ Depend نہیں کروں گی۔ کوئی فیانسی ہونا چاہیے یار......"

دونوں ساتھ ساتھ چلتے گیٹ کی طرف بڑھنے لگیں۔

"تو کر لو یار کوئی منگنی شنگنی۔"

"ہاں...... پہلے تم......"

"کیوں؟"

"کیوں کہ میں نہیں چاہتی کہ میری کوئی بھی فرینڈ میرے فیانسی پہ بری نظر رکھے۔ ہاں اگر وہ پہلے سے انگیج ہو ...... تو ڈیل ہو سکتا ہے۔"

اور جب سوہا بیلنس لوڈ کروا کے واپس اپنی مخصوص جگہ تک آئی تو گراؤنڈ میں اس کا بیگ اور فولڈر رکھا تھا۔ سبیکا اور شیبا دور...... بہت دور جاتی نظر آ رہی تھیں۔

❤ ❤ ❤

بلیک جینز کیپری...... اور...... سلیولیس پرنٹڈ ٹاپ میں وہ سو فیصد وہی تھی۔

اگرچہ اصغر نے اس کی ایک ہی جھلک دیکھی تھی مگر وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ وہی ہے اور یقین ہونے کے باوجود بے یقینی کی کیفیت اس لیے تھی کہ اس کے ساتھ جو بھی تھا اور جس انداز میں تھا وہ اس قابل نہ تھا کہ اصغر اس کے "وہی ہونے" کا اعتراف کر لیتا۔

"ایک منٹ روکنا ذرا۔"

اس نے ڈرائیور سے کہا۔ مگر پھر اسے فوراً ہی اندیشہ ہوا کہ جو منظر اس نے دیکھا ہے وہ اگر اس ڈرائیور نے بھی دیکھ لیا تو عزت رہ جائے گی اس کی دو کوڑی کے ملازم کے سامنے۔

"چلو......" اس نے گھبرا کے فوراً ہی اسے گاڑی آگے بڑھانے کو کہا مگر گردن موڑ کے پیچھے دیکھا ضرور...... اگرچہ اس کی پشت اصغر کی جانب تھی مگر ایک ہاتھ سے سگریٹ کے کش لگاتی دوسرا ہاتھ ساتھ چلتے ہوئے اس

اوباش سے نظر آنے والے نوجوان کے کاندھے پہ بے تکلفی سے مارتی اس ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہوئی
بالکل وہی نظر آرہی تھی۔ اور یہ شہر کے پوش ایریا کی مصروف ترین روڈ پہ بنا مہنگا ترین اور ڈیٹنگ کے حوالے سے
بدنام زمانہ یا مشہور زمانہ ریسٹورنٹ تھا۔

"روکو۔" اس نے بے تابی سے پھر کہا۔

"جی صاحب۔۔۔ خیریت؟" اب کی بار ڈرائیور بھی چونکا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ وہ سگریٹ۔۔۔ سامنے اسٹور سے سگریٹ لانا۔"

"یہ تو میڈیکل اسٹور ہے صاحب۔۔۔ یہاں سے سگریٹ کیسے ملیں گے۔ وہ ذرا آگے جو اسٹور ہے وہاں۔"

"نہیں۔۔۔" اصغر یہاں سے ہلنا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں سے وہ ریسٹورنٹ چند قدم کے فاصلے پر تھا اور اس کے
ہونے کی تصدیق کے بعد وہ۔۔۔

"تم جوس لے کر آؤ۔"

ڈرائیور پیسے تھام کر اترنے لگا۔

"اور سنو۔۔۔ اپنے بچوں کے لیے جوس کا کارٹن اور ٹافیوں کے پیکٹ بھی لے لینا۔"

یہ اہتمام اسے اسٹور میں کچھ دیر اور روکنے کے لیے تھا۔

"ہیلو۔۔۔" اس کے کار سے نکلتے ہی اصغر نے گھر کا نمبر ملایا۔

"ہوں۔۔۔ کیا ہے؟" رینا کی سوئی سوئی سی آواز سنائی دی۔

"یہ کون سا وقت ہے سونے کا۔" وہ جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"تم نے وقت پوچھنے کے لیے فون کیا ہے؟"

وہ اس سے بڑھ کے جھنجلائی ہوئی آواز میں بولی۔

"سوہا کہاں ہے؟"

"کالج میں ہوگی اور کہاں؟"

"تمہیں پکا پتا ہے وہ کالج میں ہے؟"

اس کے تیکھے لہجے اور گھبرائے انداز پہ رینا چونکی۔ ساری نیند بھک سے اڑ گئی۔

"کیا مطلب؟"

"نمبر کون سا ہے آج کل اس کا؟" سوہا کو چونکہ آئے دن اپنا سیل نمبر چینج کرتے رہنے کی عادت تھی اس لیے
اصغر نے پوچھا۔

"میں نے اسے ابھی ابھی ایک ہوٹل میں جاتے دیکھا ہے۔"

"اوہو۔۔۔ تو اس میں تمہیں کیا مصیبت ہے۔۔۔ گئی ہوگی دوستوں کے ساتھ۔"

"پہلی بات تو یہ کہ یہ کالج کا وقت ہے۔ پڑھنے کے بجائے وہ ہوٹلوں میں کیوں پھر رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ
میں نے اسے ایک لڑکے کے ساتھ اندر جاتے دیکھا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہوٹل [illegible]
ہے۔ لفنگوں والا۔"

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" رینا نے سنبھل کر کہنا چاہا مگر وہ بپھرا ہوا تھا۔

ساری تبدیلیاں ایک طرف مگر اس کے اندر کا روایتی مڈل کلاس مرد ابھی تک وہی تھا۔

"میں اپنی بیٹی کو نہیں پہچانوں گا؟"

"آج کل سب ہی لڑکیاں ایک جیسی لگتی ہیں۔ اچھا بتاؤ اس نے پہنا کیا تھا؟" رینا اس سے بڑے ریلیکس انداز
میں پوچھ رہی تھی مگر اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"تم نے اسے ڈھنگ کے کپڑے پہننے سکھائے ہی کب ہیں۔" اب کار کا ہوا دل میں دبا ہوا یہ شکوہ بھی
ملنے پہ باہر آگیا۔

[illegible] ہوئی پینٹ۔۔۔ کالے رنگ کی۔۔۔ اور شرٹ پھولوں والی تھی۔ بڑے بڑے لال پیلے پھول۔ تم نمبر دو
[illegible] ابھی۔۔۔"

"[illegible] دیتی ہوں۔۔۔ لکھو۔۔۔"

[illegible] اس کا موجودہ سیل نمبر لکھوایا پھر بھرپور چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

[illegible] ایک منٹ۔۔۔ مجھے یاد آیا۔۔۔ ابھی نیند میں میں نے اس کی آواز سنی تھی۔۔۔ وہ ملازمہ کو ناشتے کا
[illegible] تھی اور شاید اپنے سر درد کا بتا رہی تھی۔ یعنی وہ تو کالج گئی ہی نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے گھر پہ ہی ہے، تم ذرا
[illegible] میں دیکھ کے آتی ہوں۔"

ریسیور ایک جانب رکھ کے اپنے کمرے میں گئی اور سوہا کا نمبر اپنے سیل فون سے ملایا۔

"ہائے۔۔۔" دوسری جانب سے اس کی بشاشت سے بھرپور آواز سنائی دی۔

"[illegible] بلیک ٹراؤزر اور فلورل شرٹ میں ہو؟"

"[illegible] تھنگ سیریس ماما؟"

"[illegible] ہاں میں جواب دو۔۔۔ جلدی۔"

"[illegible] کسی ریسٹورنٹ میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ہو؟"

[illegible] بھر کے لیے چپ ہوئی پھر صاف گوئی سے بتانے لگی۔ notexactly بٹ یس، آئی مین وہ بوائے
[illegible] اور فرینڈ بھی۔۔۔ مگر ان معنوں میں بوائے فرینڈ نہیں ہے جن میں آپ سمجھ رہی ہیں۔"

"[illegible] مطلب اپنی مام کو نہیں، اپنے چاچو کو سمجھانا سویٹی۔"

"[illegible]۔۔۔؟ چاچو۔۔۔؟" وہ ہلکا سا چلائی۔

"[illegible] سب سے پہلے میرا فون بند ہوتے ہی اپنا سیل آف کرو۔۔۔ اور جتنی جلدی ہو سکے گھر پہنچو، مگر ایم ایم عالم روڈ
[illegible] کسی دوسرے راستے سے ہری اپ۔۔۔"

[illegible] بند کر کے وہ اصغر کے فون کی جانب آئی۔

"[illegible] کرتے ہو تم اصغر۔۔۔ پریشان کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔ وہ بے چاری تو سر درد لے کر بیٹھی ہے اندر کمرے
[illegible] ملازمہ اس کا سر دبا رہی ہے۔ بتا رہی ہے کہ ابھی ابھی ٹیبلٹ لی ہے اور سر دبواتے دبواتے آنکھ لگ گئی

"[illegible] مگر میں نے تو۔۔۔ وہ بالکل ویسی ہی۔۔۔"

"[illegible] کرو۔" اب رینا اسے لتاڑنے کا پورا حق رکھتی تھی۔

"[illegible] سوچ ہے تمہاری۔۔۔ بیٹی پہ شک کر رہے ہو؟ اسے پتا چلا تو کتنا دکھ ہوگا بے چاری کو۔۔۔ خدا کا واسطہ ہے
[illegible] میں تو ہار مان چکی ہوں میرے لیے نہ سہی اپنی بیٹی کے لیے ہی بدل لو خود کو۔"

"[illegible] زیادہ باتیں سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ شرمندہ تو تھا مگر ابھی تک الجھا ہوا بھی تھا۔

"[illegible] دھیان رکھنا ہی پڑتا ہے۔ زیادہ لاپروائی اچھی نہیں ہوتی ہے۔ تم مجھے پٹیاں پڑھانے کے بجائے خود
[illegible] کام لو۔"

[illegible] فون رکھ دیا مگر اتنی دیر میں سوہا وہاں سے نکل چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"[illegible] کام؟"

[illegible] میں سر رکھ کے لیٹی سوہا کے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”وہی جس کے ساتھ دیکھا تھا اصغر نے تمہیں؟“
”کس کے ساتھ دیکھا تھا؟“
”تنگ مت کرو سوہا! مجھ سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ماں ہوں میں تمہاری۔ بتاؤ کون ہے وہ جس کے ساتھ آج تم تھیں؟“
”میں کس کے ساتھ تھی؟“ وہ ذرا سا بستر سے اٹھی اور حیرت سے ربنا کو دیکھنے لگی۔
”کیا ہو گیا ہے ماما آپ کو...... میں تو آج سارا دن گھر سے نکلی ہی نہیں۔ اتنا تو سر میں درد تھا۔“
اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا مگر شرارت اس کی لشکارے مارتی آنکھوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔
”چھپا...... ہماری بلی ہمی کو میاؤں۔“ ربنا نے پیار سے اس کے ایک دھپ لگائی۔
”سیدھی طرح بتاؤ...... کون ہے وہ...... کیا کرتا ہے؟“
”روفی ہے اور کیا کرتا ہے کیا نہیں کرتا۔ یہ جان کر آپ کو کیا ملے گا۔ اس سے پہلے میرے کسی دوست کے بارے میں اتنی انکوائری تو کی نہیں آپ نے۔“
وہ دوبارہ سے لیٹ کر چیونگم چبانے لگی۔
”مجھے یہ دوست ذرا اسپیشل قسم کا لگ رہا ہے۔ پسند کرتی ہو اسے؟“
”کچھ خاص نہیں۔“
”کیا مطلب...... ؟ پھر دوستی کیسے ہوئی؟“
”دوستی کے لیے ضروری نہیں کہ ہنڈرڈ پرسنٹ پسندیدگی بھی ہو، مجھے شیبا اور سبیکا کی بھی بہت سی باتیں بری لگتی ہیں۔“
”دیکھو سوہا! مجھے بناؤ مت۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ تمہارا ایسا دوست نہیں جیسی سبیکا اور شیبا ہیں۔“
”کیوں ماما...... آپ لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ اگر لڑکا اور لڑکی ملتے ہیں تو ضرور ان میں کوئی افیئر ہی ہوگا۔“
”اس لیے کہ تمہاری باقی فرینڈز یہاں ہمارے گھر پہ بھی بلا روک ٹوک تم سے ملتی ہیں اور تم بھی جاتی ہو لیکن آج تک وہ گھر آیا ہے نہ تم نے ملوایا ہے اور ہمیشہ وہی چیز چھپائی جاتی ہے جو چھپانے والی ہو۔ اگر وہ صرف دوست ہوتا تو یہ دوستی ہوٹلوں میں چھپ کر ملنے تک کیسے پہنچی۔“
”میں چھپ کر نہیں ملتی روفی سے...... ہاں یہ نہیں چاہتی تھی کہ چاچو اس سے ملیں۔ آپ کو پتا تو ہے چاچو کا اوپر سے روفی بھی ذرا روڈ اور بدلحاظ سا ہے۔ بے کار میں کوئی تلخی ہو جاتی۔“
”تم کچھ چھپا تو نہیں رہیں؟“ ربنا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
”ٹرسٹ می ماما...... میں آپ سے کچھ کیسے چھپا سکتی ہوں۔“
”چھپانا بھی مت......“ ربنا نے سختی سے کہا۔ ”یہ یاد رکھنا۔ مجھ سے زیادہ کوئی تمہارا خیرخواہ نہیں۔ کوئی تمہیں مجھ سے زیادہ چاہ سکتا ہے۔“
نہ جانے کون سا احساس تھا جو اسے یہ یاددہانیاں کراتے رہنے پر مجبور کرتا تھا۔
”پتا ہے مجھے۔“ اس نے ربنا کے ہاتھ کی پشت پہ ایک بوسہ دیا۔
”اور ایک بات اور کہوں گی۔ مرد چاہے دوست بنے چاہے کچھ اور، عورت سے قریب ہوتا ہے تو صرف مطلب کے لیے اور دور ہوتا ہے تب بھی صرف اپنے مطلب کے لیے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس پاس آنے اور پھر دور جانے کے کھیل میں عورت کتنی کرچیوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ اس لیے...“
”اوہ پلیز ماما۔“ وہ اس بے وقت کے لیکچر سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگی۔
”اور خاص طور پہ اس مرد سے تو بہت ہی محتاط رہو جو تمہیں بہت عزت دیتا ہو۔“

...لاپروائی کا مظاہرہ کرتی وہ اچانک اس بات پہ چونک اٹھی۔
”کیونکہ یہ سب سے مہلک اور کاری وار ہوتا ہے۔“ ربنا کی تھکی ماندی آنکھوں میں ایک شعلہ لمحہ بھر ...معدوم ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

...سپتال میں تھی اور تم نے مجھے انفارم تک کرنا مناسب نہیں سمجھا؟“ جعفر محمود مدیحہ پہ چلّا رہا تھا۔
...کر دیتی تو آپ کیا کر لیتے؟“
...میں؟ کیا کر لیتا؟ میری بیٹی ہاسپٹلائزڈ ہو اور میں بے خبر رہوں۔ ظاہر ہے میں فوراً آ جاتا۔“
...میں کہہ رہی ہوں کہ آ جاتے تو آ کے بھی کیا کر لیتے۔ کون سا کوئی بہت سیریس بات تھی۔ رات بھر جو ...انڈر آبزرویشن رکھا تو صرف میرے کہنے پہ میری تسلی کے لیے ورنہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔“
...تھا...... ؟ میں بات کروں گا...... ذرا Detail سے پتا کرتا ہوں کہ اسے ہوا کیا تھا؟“
...جھوٹ بول رہی ہوں؟“
...لگیں...... نہیں چاہتی تھیں کہ جعفر کو ڈاکٹر سے یہ پتا چلے کہ تحریم کسی ذہنی دباؤ کا شکار تھی ورنہ بات ...کتنی ہی چلی جاتی اور جعفر محمود جو ابھی ایک فکرمند باپ کی طرح بی ہیو کر رہا ہے پھر ایک کم ظرف شوہر کی ...کی تربیت کو الزام دے رہا ہوتا۔
...آپ کو میری بات سے تسلی نہیں ہو رہی تو جا کے دیکھ لیں اسے۔ ٹھیک ٹھاک ہے وہ۔ آج کل کی لڑکیوں کو ...کے نام پہ فاقے کرنے کا جنون ہے۔ ایسا ہی کوئی چکر تھا۔ کمزوری ہو گئی اور بی پی بھی لو ہو گیا اس لیے ایسا ...آرام کرے گی، کھائے پیئے گی، دوا باقاعدگی سے لے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔“
...ایک خیال اور بھی آ رہا ہے۔“

...اس کی اس حالت کی وجہ کسی قسم کا ڈپریشن تو نہیں؟“ جعفر کے اندازے پہ وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔
...اندازہ اتنا غیر متوقع تھا ان کے لیے کہ وہ فوری طور پر تردید بھی نہ کر سکیں۔
...ڈپریشن...... ؟“ ذرا سنبھل کے وہ ٹالنے لگیں۔ ”اسے بھلا کیا پریشانی ہو گی؟“
...ان واہیات عورتوں کا آنا...... اور پھر ریجیکٹ کر کے چلے جانا۔“
...جھجکتے ہوئے دل کی بات کہی۔
...مشکل لگتا ہے اپنی اولاد کے لیے یہ اعترافی بیان کہ کوئی اسے مسترد بھی کر سکتا ہے۔
...میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ شادی ہی لڑکیوں کی زندگی کا واحد مقصد نہیں ہوتی...... ٹھیک ہے ہونی چاہیے ...ضرور ہونی چاہیے لیکن اگر وہ وقت کسی وجہ سے آ نہ رہا ہو تو اسے سر پہ سوار نہیں کرنا چاہیے۔ مسئلہ ...بنانا چاہیے۔ نہ اپنے لیے نہ بیٹی کے لیے لیکن اب سوچتا ہوں کہ تحریم جیسی لڑکیوں کی جتنی جلدی ...جائے اتنا اچھا ہوتا ہے۔“
...جیسی لڑکیوں سے کیا مراد ہے آپ کی؟“
...ی سے پوچھا......
...کی طرح وہ بھی یہ بخوبی آگاہ تھیں کہ تحریم ہو بہو ان کا دوسرا روپ ہے۔
...لڑکیاں جن کی دلچسپی کا مرکز صرف اور صرف گھر ہو۔ ورنہ چاہتی تو اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکتی ...جاب کر سکتی تھی، خود کو مصروف رکھنے کے لیے اور کچھ نہیں تو وقت گزاری کے لیے لڑکیاں کئی شوق ...مختلف قسم کے کورسز وغیرہ مگر اس طرح سارا دن گھر پہ بے مقصد رہنا ڈپریشن کو دعوت دینے والی

"ہاں شاید۔۔۔" وہ جعفر کا دھیان دوسری جانب لگانے میں کامیاب ہو کر ریلیکس سی ہو گئیں۔
"ہم سارے خاندان سے کٹ کر بھی تو بیٹھے ہیں۔ ورنہ ایسے معاملوں میں رشتے داریاں بہت کام آتی ہیں۔ جانا ہو تو رشتے کی بات بھی کہیں نہ کہیں چل نکلتی ہے۔"

عرصے بعد وہ مدیحہ کے ساتھ اس طرح کوئی بات کر رہا تھا ورنہ ایک چھت کے نیچے رہنے والے وہ اجنبی دونوں۔۔۔ ایسے اجنبی جو نامعلوم وجوہ کی بنا پہ ایک دوسرے کو خاموش مگر ناگواری سے گھورتے ہوئے [illegible] ڈھونڈتے رہیں۔

"اور ساری برادری سے کٹ کر رہنے کا فیصلہ کس کا تھا؟" مدیحہ کو شاید اس کا نارمل انداز میں بات کرنا [illegible] آیا اس لیے سلگتے لہجے میں پوچھا۔

"میرا۔۔۔" جعفر نے خلاف عادت تحمل سے کہا۔ "میں مانتا ہوں وہ فیصلہ میرا تھا۔ تب بھی وہ فیصلہ میں نے [illegible] کی بہتری کے لیے کیا تھا اور اب بھی۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" مدیحہ نے اس کی بات کاٹی۔ "آپ نے وہ فیصلہ اولاد کے لیے نہیں اپنے لیے اپنی آزادی کے [illegible] کیا تھا۔"

"مدیحہ۔۔۔ تم۔۔۔" وہ تلملا اٹھا۔۔۔

"بات پوری کرنے دیں مجھے۔ بچیوں کی تعلیم کے لیے ہم یہاں شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ مطالبہ میں نے [illegible] کے سامنے پیش کیا تھا اور وہ بھی صرف آپ کے بھرم کے لیے اور آپ کو میرا احسان مند ہونا چاہیے [illegible] تک سارا خاندان حتیٰ کہ ہماری بچیاں بھی یہی سمجھتی ہیں کہ یہ اقدام میری خواہش کے نتیجے میں عمل [illegible] تھا۔"

"بس تم احسان جتاتی رہنا اپنا۔۔۔ کبھی ماں بن کے مت سوچنا۔ مدیحہ! خدا کا واسطہ ہے میرے ماضی کو [illegible] اور بچیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچو۔"

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس کے تلخ اور بپھرے ہوئے تیور مدیحہ کی مستقل مزاج بدگمانی کے سامنے تھم [illegible] روہانسے سے ہو جاتے تھے۔

"آپ کا ماضی۔۔۔ بچیوں کا مستقبل۔ اور میرا حال؟ وہ کہاں ہے جعفر! میں نے اپنا حال تو کبھی جیا ہی نہیں [illegible]"

"اوہ خدایا۔۔۔ یہ عورت کبھی نہیں بدل سکتی۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گیا۔

"اپنا حال، ماضی اور مستقبل تم نے خود برباد کیا ہے مدیحہ! میں جب بھی تمہاری جانب بڑھا۔ تم [illegible] کھاتے کھول کر مجھے پیش قدمی سے روک دیا۔ تم اب بھی یہی کر رہی ہو حالانکہ اس بار میں نے تم سے [illegible] کڑوا گھونٹ اپنی بیٹیوں کی وجہ سے بھرا تھا۔ میں لاہور میں سیٹل ہونا چاہتا ہوں۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ حیران رہ گئیں اس اچانک فیصلے پہ۔۔۔

"مگر کیوں؟ بار بار نئی جگہ پہ سیٹل ہونا آپ کو کھیل لگتا ہے؟"

"بار بار؟ آج سے دس بارہ سال پہلے ہم اپنے گاؤں سے اسلام آباد سیٹل ہوئے تھے اب میں [illegible] ہوں کیونکہ گاؤں میں کوئی رہا ہی نہیں۔ نہ تمہارا۔۔۔ نہ میرا۔۔۔ سب قریبی رشتے دار لاہور میں سیٹ [illegible] بزنس اس نوعیت کا ہے کہ مجھے خاص فرق نہیں پڑتا یہاں سے اسے لاہور میں منتقل کرنے میں۔ [illegible] کرو؟" اور مدیحہ سوچ میں پڑ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"مجھے لگتا ہے جو ہو رہا ہے، بہتر ہے۔" تقدیس نے اس کا بی پی چیک کرتے ہوئے کہا۔

"گڈ۔۔۔ یہ ہوئی ناں بات۔۔۔ بی پی بالکل نارمل ہے۔ ایسے ہی ریلیکس رہا کریں۔ الٹی سیدھی سوچوں کو [illegible] جھٹکنے دیں۔ پھر دیکھیں دو تین دن کی بات ہے، بالکل ٹھیک ہوں گی آپ۔"

"پاپا نے لاہور جانے کا فیصلہ کیوں کیا تقدیس؟" تحریم نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پریشانی سے [illegible]

"نہیں پاپا نے انہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ان کا سامنا کیسے کروں گی؟"

"پاپا کچھ نہیں ہوا آپی! ماما نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔"

"نہیں۔ تم یا تو مجھ سے چھپا رہی ہو یا تمہیں خود بھی علم نہیں ہوگا۔ ہو نہ ہو ایسی ہی بات ہے۔ اسی لیے پاپا ہم کو یہاں سے لے جا رہے ہیں میری غلطی کی سزا تم سب کو۔۔۔"

وہ رونے لگی تو تقدیس زچ ہو گئی۔ ابھی وہ اس کا بی پی نارمل ہونے پہ شکر ادا کر رہی تھی اور ابھی وہ پھر سے ایک [illegible] نیا پال بیٹھی تھی۔

"کیسی سزا۔۔۔؟ لاہور جا رہے ہیں ہم۔۔۔ کوئی کالا پانی تو نہیں بھیجا جا رہا اور اسلام آباد بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے [illegible] چلیں میں آپ کے پسندیدہ شہر کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرتی لیکن یہ تو آپ کو بھی پتا ہوگا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جما۔۔۔ یعنی پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہم نے لاہور دیکھا تو ہے، مطلب پیدا تو ہوئے ہیں مگر ہوش نہیں سنبھالا۔ اب ہوش سنبھالنے وہاں جا رہے ہیں۔"

تطہیر نے آ کر بات سنبھالی۔۔۔

"اور مجھے تو اتنا شوق تھا کنیئرڈ کالج میں جانے کا چلو اسی بہانے یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور سنڈے کے سنڈے چڑیا گھر کا بھی چکر لگ جایا کرے گا۔ لبرٹی کے گول گپے، انار کلی کی فروٹ چاٹ۔۔۔ مزے ہی مزے۔"

"اور ایک بات اور بھی ہے آپی!"

تطہیر کے ڈھیر سارے پلس پوائنٹ گنوا دینے کے بعد تقدیس نے بھی ایک پوائنٹ اٹھایا۔

"وہاں ماما اور پاپا کے بہت سے رشتے دار ہیں۔ ماموں کا گھر بھی وہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے وہاں جانے کے بعد ماما [illegible] ملنے ملانے میں بزی رہا کریں گی تو ان کا دھیان بٹے گا۔ ان کے اور پاپا کے درمیان ہر وقت جاری ٹینشن میں کمی ہوگی۔"

"ہم ایک تو لوگ خواب بہت دیکھتے ہیں۔"

تطہیر نے بظاہر ہنس کے طنز کیا۔۔۔ مگر اس طنز میں کتنا کرب پوشیدہ تھا، یہ وہ دونوں اچھی طرح محسوس کر سکتی تھیں۔

"اور خواب بھی وہ جو دیکھے جانے کی پاداش میں آنکھوں میں خار ہی خار بچھا جاتے ہیں۔"

تحریم ہولے سے بڑبڑائی۔

"آپی۔۔۔ پلیز۔۔۔" تقدیس نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"آپ بھول کیوں نہیں جاتیں یہ سب اور ویسے بھی وہ شخص یاد رکھے جانے کے قابل بھی نہیں تھا۔"

"مجھے وہ شخص نہیں اپنی غلطیاں نہیں بھولتیں۔ اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کیسے۔ کس طرح میں اس گڑھے میں گرتی چلی گئی۔ جھوٹ در جھوٹ مجھے اس جال میں پھنستی چلی گئی۔ میرا شعور کہاں سو گیا تھا۔ میں اتنی بے وقوف، اتنی عاقبت نا اندیش تو نہ تھی تقدیس۔۔۔ قصور اس کا نہیں میرا تھا۔ اگر میری شخصیت مضبوط ہوتی۔ مجھے اپنی عزت کا پاس ہوتا، اپنا اور اپنے خاندان کا وقار عزیز ہوتا تو میں کبھی اسے اس کے ارادوں میں کامیاب نہ ہونے دیتی۔"

"برباد کبھی چاہ کے نہیں مانگی جاتی آپی! چاہے وہ خوابوں کی ہو، چاہے توقعات کی ہو۔ آپ خدا کے لیے خود کو کوسنا چھوڑ دیں۔ کسی کو پسند کرنا بری بات نہیں ہے اور آپ کی غلطی صرف یہیں تک محدود ہے، اس کے بعد جو کچھ بھی غلط ہوا، وہ دوسری جانب سے ہوا۔"

"نہیں تقدیس یہ میری غلطی ہے۔ ماما ٹھیک کہتی تھیں۔ مرد کبھی بھروسے کے لائق نہیں ہوتا اور میں نے ایک گدھے پہ بھروسہ کرنے کی غلطی کی۔"

"فار گاڈ سیک آپی..... ہمارے پاپا بھی تو مرد ہیں۔ کیا آپ اور میں ان پہ بھروسہ نہیں کرتے؟"
"کرتے ہیں مگر ہم اپنے پاپا پہ بھروسا کرتے ہیں۔ کسی مرد پہ نہیں' ہمارے لیے وہ مرد نہیں ہیں تقدیس! بابا ہیں
کے لیے ہیں اور ماما نے ان پہ بھروسا کیا تھا۔ بتاؤ کیا ملا انہیں اس بھروسے کے بدلے؟"
اس سوال پہ اسے گہری چپ نے گھیر لیا۔
تحریم اس کی خاموشی کو اس کا لاجواب ہونا سمجھتے ہوئے ایک گہری سانس بھر کے رہ گئی۔
"پتا ہے تقدیس! میں نے ماما کو کہتے سنا تھا کہ....." وہ ذرا سا ہچکچائی۔ پھر جی کڑا کر کے کہہ دیا۔
"وہ کہہ رہی تھیں کہ پاپا کا کیا ان کی بیٹیوں کے آگے آرہا ہے۔"
اس بات پہ اس نے تڑپ کے تحریم کو دیکھا۔
"ماما کا کہنا ہے کہ پاپا نے بھی ایسے کتنے ہی دل توڑے ہیں۔ اپنی شادی شدہ زندگی اور بیٹیوں کے وجود کو چھپا کے
ایسے کتنے ہی دھوکے دیے ہیں اور اب وہ بددعائیں پیچھا کرتے کرتے ہماری زندگی میں شامل ہو چکی ہیں۔"
"ماما تو....." وہ سر جھٹک کے رہ گئی۔
اسے حقیقتاً اس بات سے بے حد تکلیف ہوئی تھی۔ وہ آج تک ماں باپ کی اس جنگ سے یہ نتیجہ اخذ نہ کر
پائی تھی کہ کون سچا ہے کون جھوٹا ہے۔ کبھی اسے ماں کے آنسو سچے لگتے اور دل باپ کے خلاف گلے شکووں سے
بھر جاتا اور کبھی ایسا لگتا جیسے ماں نے بلاوجہ کی بدگمانیوں کا ایک گھنا جنگل اپنے اردگرد بن رکھا ہے۔
"مجھے بہت ڈر لگنے لگا ہے تقدیس..... میرے ساتھ جو ہوا' وہ تو ہو گیا۔ مجھے تمہارے اور تطہیر کے لیے بہت ڈر
لگنے لگا ہے۔"
"فضول باتیں نہ سوچیں آپی..... ماما کی تو عادت ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ وہم نہ کریں اور چپ چاپ دوا
لے کر لیٹ جائیں..... شاباش۔"
اس نے تحریم کو تو بہلا دیا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل ان گنت اندیشوں سے بھرتا جا رہا تھا۔

✱ ✱ ✱

"سنیے۔"
"الفتح۔" میں باڈی اسپرے کی رینج دیکھتے ہوئے اس نے اپنی پشت پہ بے حد مہذب آواز سنی اور پلٹ کے
دیکھا۔
"آپ وہی ہیں ناں..... اس دن والی!"
بلیک ٹراؤزر اور گرے اور وائٹ لائننگ والی شرٹ میں ملبوس وہ بے حد صاف رنگت اور بے حد چمکیلی سیاہ
آنکھوں والا لڑکا.....
سوہا اپنی یادداشت کو کھنگالنے لگی۔
"وہ جو کالج گیٹ پہ ملی تھیں اور میں نے آپ کو ایک فائل....." یکدم جیسے کوئی پردہ ہٹ گیا۔
وہ پہچان کر زور سے چلائی تھی۔
"تم.....؟"
سوچا تھا کہیں وہ نظر آگیا تو ادھیڑ کے رکھ دے گی..... ایسی ایسی سنائے گی کہ کانوں پر ہاتھ بھی رکھ لے تو
سماعتیں مفلوج ہو کر رہیں گی..... سرعام چھینٹی تک لگوا کے رہے گی۔
لیکن اب وہ سامنے کھڑا تھا۔ فٹ بھر کے فاصلے پہ اور وہ مٹھیاں بھینچے بس دیکھے چلے جا رہی تھی۔
"تم.....؟" شدید غصے کے عالم میں فقط اتنا ہی کہہ سکی۔ باقی کے الفاظ اور ارادے کہیں آپس میں ہی گتھم گتھا
ہو کے بہت پیچھے رہ گئے۔
"وہ فائل..... وہ ایکچوئیلی....."
الفاظ تو شاید وصی کو بھی نہیں مل رہے تھے۔ اگلے ہی دن ندا کی زبانی اسے پتہ چلا تھا کہ کسی لڑکی نے
وہ فائل پہنچائی تھی اور پھر اس کا جو حشر ہوا..... توبہ..... توبہ.....
"لیکن آپی! اس نے فائل آپ تک کیوں نہیں پہنچائی۔ آپ کا نام بھی نہیں لیا؟" وصی حیران ہوا۔
"وہ میرے ڈپارٹمنٹ کی نہیں تھی..... نہیں جانتی ہوگی مجھے اور یوں بھی مجھے اپائنٹ ہوئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے
خوش قسمتی بوکھلاہٹ کے مارے وہ میرا نام تک بھول گئی اور میں بھی نا....." وہ خود ہی مزے لے کر
[illegible]
کارٹون کے نیچے جلی حروف میں نام لکھ رکھے تھے۔ میں نے..... پرنسپل کا..... وائس پرنسپل کا..... ہیڈ آف دی
ڈیپارٹمنٹ کا..... بس نہیں لکھا تو اپنا نام نہیں لکھا۔ ظاہر ہے اس بے چاری کی شامت تو آنا ہی تھی۔
"اور آپ چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں؟" وصی نے افسوس سے سرہلایا۔
"وہاں ہوتی تو دیکھتی نا..... مجھے تو اگلے دن پتہ چلا۔ جب یہ تماشا ہوا میں تو سیکنڈ ایئر کی کلاس لے رہی تھی۔" ندا
کے انداز میں تاسف تھا جیسے کچھ زبردست چیز مس ہو گئی ہو۔ اسی شام کو تو میں تم سے اپنے فولڈر کے بارے میں
پوچھ رہی تھی۔"
"بے چاری..... " وصی افسوس اور ہمدردی جتانا چاہ رہا تھا مگر کچھ سوچ سوچ کر ہنسی بھی آتی جا رہی تھی۔ وہ ندا کو
اپنی عیز سے داری کا احساس دلانا چاہتا تھا۔
"سب آپ کی لاپروائی کی وجہ سے ہے۔" وہ اتنا کہتا اور پھر سے ہنسنے لگ جاتا..... مشکل سے دانت اندر کر کے
بار سنجیدگی کا خول چڑھاتا۔
"اعلا ظرفی کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ اس سے ملتیں' معذرت کرتیں بلکہ مجھے بھی معذرت کرنی چاہیے' آخر
میری وجہ سے بے چاری کو اتنی.....؟"
خول ایک بار پھر چٹک جاتا اور ہنسی بے قابو ہو کے بکھر جاتی۔
اس وقت بھی یہی ہوا۔ وہ معذرت کے لیے بڑے مناسب اور موزوں الفاظ چن کر..... صورت پہ مقدور بھر
سنجیدگی اور متانت کی آمیزش کر کے گویا ہوا تھا مگر مزا لینے والی چٹخارے دار مسکراہٹ تھی کہ اس لڑکی کے پیچ
و تاب کھاتے چہرے کو دیکھ کے ہونٹوں کے گوشوں سے ابلی جا رہی تھی اور یہ بات سوہا کو مزید تاؤ دلا رہی تھی۔
"میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت اٹھانا پڑی اس دن..... لیکن بلیو می..... ساری غلطی میری نہیں ہے..... وہ
دراصل میری سسٹر..... میری کزن ہیں نا..... وہ..... آپ کے کالج میں....."
"میں جانتی ہوں تم نے یہ حرکت کس کے کہنے پر کی ہوگی۔"
بہت مشکل سے خود پہ قابو پا کے سوہا نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا۔
"لیکن تم نہیں جانتے کہ تم اور تمہاری کزن فاریہ کس مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔"
"فاریہ.....؟" وہ بھرپور طریقے سے چونکا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔
"سوہا مظہر بھٹی بھڑوں کا چھتہ ہے مسٹر..... چھیڑو گے تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔"
[illegible] پھر چونکا۔ اسے پہلی بار دیکھ کے ہی جو ہلکا سا شناسائی کا احساس جاگا تھا' وہ اس نام کو سن کر اور توانا
[illegible]
"سوہا..... مظہر..... بھٹی....."
بہت سنا ہوا نام تھا' بہت جانا پہچانا حوالہ تھا..... مگر..... کب..... کیسے..... کس طرح۔ وہ اس گتھی کو سلجھا ہی رہا تھا اور
مسلسل غرا رہی تھی۔
"فاریہ کو تو میں دیکھ ہی لوں گی مگر تم یہ نہ سمجھنا کہ صرف سوری کر لینے سے تم سستے میں چھوٹ جاؤ گے۔ ڈیڑھ
سو لوگوں کے سامنے میری جو انسلٹ ہوئی..... جو جو کچھ مجھے سننا پڑا..... جس جس طرح سے وضاحت پیش کرنا
پڑا ان سب کے تم بھی برابر کے ذمہ دار ہو۔ صرف اپنی کزن پہ سارا الزام سر ڈالنے سے تم بری نہیں ہو سکتے۔"
[illegible] "ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

"آپ حسن بھائی اور حسان کی کزن ہیں؟"
دانت کچکچا کے اسے دھمکاتی سوہا پہ جیسے کسی نے اچانک برفیلے پانی کی بالٹی گرا دی۔ وہ شرابور ہو گئی۔

"پروین مامی کی بھانجی یا پھر شاید بھتیجی۔ وہ دراصل مجھے رشتوں کی اتنی ورائٹی سمجھ میں نہیں آتی۔"
"تم...؟" وہ الجھی۔
"میں وصی..." وہ چہکا۔ "یاد آیا...؟ مامی کے ساتھ اکثر آتا تھا تمہارے گھر؟"
"وہ میرا گھر نہیں تھا۔" وہ سینے پہ بازو لپیٹ کر منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی۔
"اور نہ تمہاری مامی کی بھانجی یا بھتیجی ہوں میں۔ وہ وشمہ تھی۔ اور تمہارے اس حسن... حسین... what ever کی کزن بھی وہی تھی... گیٹ آؤٹ۔"
سخت قسم کا تنفر اس کے انداز سے جھلک رہا تھا جسے محسوس کر کے وصی کا جوش کم ہوا۔ اسے بھی رفتہ رفتہ ساری تفصیل یاد آ گئی۔
"اوہ... یہ تو مامی کی بھابی کی وہ بیٹی ہے جو..."
"آپ اسی شہر میں ہوتی ہیں... مامی نے کبھی بتایا نہیں۔"
"تمہاری مامی میرا اتا پتا تمہیں کیوں بتانے لگیں مسٹر؟"
پہلی بار وصی کو اس کا لہجہ ذرا برا لگا۔ اس سے پہلے وہ اس کے تند ردیے کے لیے اسے حق بہ جانب سمجھ رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سے بے چاری کی اتنی خواری ہوئی تھی۔
"اور فاریہ... وہ بھی تمہاری؟" وہ مزید تفصیل جاننے کے لیے پوچھنے لگی۔
"سوری... اس بار غلط فہمی آپ کو ہوئی ہے۔" اب کے وصی کا لہجہ بھی اکھڑا ہوا تھا۔ وہ مسلسل آپ جناب کر کے بات کر رہا تھا اور وہ پتھر مارنے کے سے انداز میں تو تکار کر رہی تھی، جو اسے سخت گراں گزر رہا تھا۔
"میں کسی فاریہ کو نہیں جانتا... مجھ سے جو غلطی ہوئی اس کی وجہ وہی تھی جو میں نے آپ کو بتائی... میری کزن آپ کے کالج میں حال ہی میں اپائنٹ ہوئی ہیں بطور لیکچرر... سائنس ڈپارٹمنٹ میں... میں نے واقعی وہ فائل تک پہنچانے کے لیے آپ سے ریکویسٹ کی تھی۔ یہ آپ کی قسمت کہ آپ ان کا نام بھول گئیں۔"
سوہا چند سیکنڈ جانچنے والی نظروں سے اسے تکتی رہی۔ اب وہ کافی سنجیدہ لگ رہا تھا اور کچھ کچھ خفا بھی۔
"ایکسکیوزمی مس... آپ کون سا شیمپو یوز کرتی ہیں؟" کسی کمپنی کی جانب سے آئی... سیلز گرل... شائستگی سے سوہا کو مخاطب کیا۔ وہ اس دخل اندازی پر بدمزگی سے اسے گھورنے لگی۔
"آپ ہمارا یہ اینٹی ڈینڈرف..."
"اوشٹ اپ..." وہ دھاڑی۔

○ ○ ○

"ہماری وشمہ اب بڑی ہو گئی ہے۔"
نوید مراد نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے پرسوچ انداز میں کہا۔
منزہ ان کے صبح کے لیے پہننے والا سوٹ ہینگر سے اتارتے اتارتے ٹھٹک کر انہیں دیکھنے لگی۔
"پتا ہی نہیں چلا کیسے اتنا وقت گزر گیا۔"
وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی ان کی بات پہ۔
"کوئی میرے دل سے پوچھے کیسے گزرا ہے یہ وقت۔"
"بیٹے جوان ہوں تو بڑھاپے میں بھی انسان کے اندر توانائی بھر جاتی ہے، ڈھلکے شانے چوڑے ہو جاتے ہیں اور بیٹیاں جوان ہو جائیں تو بڑھاپے کا احساس زیادہ شدت سے ستانے لگتا ہے۔"

"کو اب جا کے افسوس ہو رہا ہے بیٹے کے نہ ہونے کا؟" منزہ نے حیرت سے پوچھا... کیوں کہ اس کمی کا ...بھی نوید کی جانب سے نہیں ہوا تھا۔
"نہیں۔ ہرگز نہیں... افسوس بالکل نہیں ہے۔"
...دھا ہو کے بیٹھے اور سختی سے جھٹلانے لگے۔
"...بس یونہی ایک خیال سا آیا تھا... کہ لوگ کیوں بیٹوں کے لیے اتنا جذباتی ہوتے ہیں۔ ایک ہی بات سمجھ میں ...ہے کہ وہ چیز دل کے زیادہ قریب ہوتی ہے جس کے اپنے ہونے کا احساس توانا ہو۔ یہ ڈر نہ ہو کہ کوئی اسے ہم ...کر دے گا یا ہمیں اسے کسی کے ساتھ بانٹنا ہوگا، جب کہ بیٹیاں جتنا مرضی سینے سے لگا کے پالو... اتنا پیار ...اور پھر کسی غیر کو سونپ دو۔"
"...تو ریت ہے زمانے کی۔" منزہ کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ وہ خوامخواہ ہی پلکیں ...نے لگی۔
"...پھر بھی... کتنا مشکل ہے۔"
نہ جانے کیوں نوید مراد کو آج یہ احساس رہ رہ کے ہو رہا تھا۔ منزہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔
"...مشکل، اور وہ آسان تھا نوید مراد جو میں نے کیا؟ میں نے بھی تو اپنے جگر کے گوشے کو خود سے الگ کیا تھا... تم تو ...کر دیے۔ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے... اور میں نے سارے فرائض بھی بھلا دیے تھے ماں ہونے کے... ہر ...داری سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے..."
"ارے تم رو رہی ہو؟" نوید اس کے آنسو دیکھ کر چونکے۔
"بس یونہی۔" وہ ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑنے لگی۔
"ابھی تو صرف بات کی ہے میں نے... اور تم نے دریا بہا دیے ہیں... جب اسے واقعی رخصت کرنے کا وقت ...گا تب کیا کرو گی؟"
"تب...؟" اس نے سرخ ہوتی آنکھیں نوید کی جانب اٹھائیں۔
"آپ فکر مت کریں... گزر جاؤں گی اس مرحلے سے اور بڑی آسانی کے ساتھ... بڑے حوصلے سے ...برداشت کر لوں گی۔ کیونکہ یہ مرحلہ میری زندگی میں پہلی بار نہیں آئے گا... میں پہلے بھی ایک بار اپنے حوصلے کا ...امتحان لے چکی ہوں اور اس میں سرخرو بھی ہو گئی ہوں۔"
نوید ساکت بیٹھے رہ گئے۔
منزہ اطمینان سے ان کا استری شدہ سوٹ صوفے پر پھیلانے کے بعد خالی ہینگر الماری میں لٹکا رہی تھی۔
"منزہ..." وہ دھیرے سے پکارے۔
"ہوں..." اس نے جواب ضرور دیا... مگر پلٹی نہیں۔ وہیں الماری کے اندر سر گھسائے کچھ تلاش کر رہی تھی۔
"...میں نے تم سے کئی بار کہا تھا کہ اسے لے آؤ۔"
...انہوں نے کمزور لہجے میں اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔
"...اور میں نے کئی بار بتایا ہے آپ کو کہ جانے کے سو دروازے ہوتے ہیں، واپسی کا کوئی نہیں۔"
"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تم نے ابھی تک میرا وہ ایک قصور معاف نہیں کیا... اور نہ کبھی کرنا چاہتی ہو۔"
...انہوں نے شکوہ کیا۔
"کیا آپ کو ایسا لگتا ہے؟"
...وہ مڑ کے ان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور پورے اعتماد کے ساتھ پوچھنے لگی۔ کچھ دیر پہلے کی کیفیت سے وہ گزر ...چکی تھی۔ اب اس کے چہرے پہ مکمل سکون اور اطمینان کے تاثرات تھے۔ نوید مراد کو ڈھونڈے سے بھی ...کی کوئی سچائی نہ نظر آئی۔ وہ سر جھکا کے رہ گئے۔

"اگر میری اتنی ریاضتوں کے بعد بھی آپ کو یہ لگتا ہے کہ میں آپ کے لیے دل میں ایسے جذبات سپاسے بیٹھی ہوں تو مجھ سے زیادہ ناکام عورت کوئی نہیں ہوگی۔ ہر عورت کے اندر موجود ماں.... باقی تمام رشتوں پہ حاوی ہوتی ہے' مگر میں نے ایک بیوی' ایک بہو کو توانا رہنے دیا اور ماں کو سر جھکا کے پسپا ہونے پہ مجبور کر دیا اور میں پھر بھی خالی ہاتھ نہیں رہی۔ اللہ نے مجھے سوہا کے بدلے وشمہ دے دی۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔"

اور نوید نے ہمیشہ کی طرح یقین کر لیا اور اس کا ہاتھ مشکور انداز میں تھپتھپانے لگا۔

"اب تمہیں کیا بتاؤں.... کہ جس بیٹی کو وقت کی مصلحتوں کے پیش نظر خود سے الگ کیا تھا' اس نے مجھے ہی ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تم لاکھ وسیع القلبی کا مظاہرہ کرو لاکھ سخی بنو.... لیکن میں اسے نہیں لا سکتی بہت دور چلی گئی ہے.... بہت دور.... اب تمہاری معافی اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ تمہارا جھکا ہوا سر میرا قرار مجھے نہیں لوٹا سکتا۔ اب تو اس دل کو سکون صرف اس صورت مل سکتا ہے کہ....."

"دراصل وشمہ کے لیے میرے ایک جاننے والے صاحب نے بات کی تھی۔ اپنے بیٹے کے لیے۔"

نوید کی بات پہ وہ اپنے خیالوں سے باہر ابھری۔

"وشمہ کے لیے؟" وہ حیران ہوئی۔ یہ وقت آ بھی گیا۔

"ہاں.... اسی لیے مجھے رہ رہ کے ایسے خیال آ رہے تھے۔"

"ابھی اس بارے میں سوچنے کی قطعی ضرورت نہیں۔" اس کا لہجہ خود بخود روکھا سا ہو گیا۔

"بہت اچھے لوگ ہیں.... خاندانی.... کھاتے پیتے.... لڑکا بھی پڑھا لکھا ہے' خوبرو ہے اور پھر اکلوتا۔"

"لیکن وشمہ ابھی چھوٹی ہے۔" وہ جز بز ہوئی۔

"ماں باپ کی نظر میں بیٹیاں بچیاں ہی ہوتی ہیں لیکن جب بیری پہ پتھر آنے لگیں' تب اس حقیقت کو قبول کرنا پڑتا ہے۔"

"ابھی وہ پڑھ رہی ہے' نا تجربہ کار اور معصوم ہے۔ میں اسے اس جھنجٹ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ آپ منع کر دیں۔"

"وہ کون سا فوراً" ہی.... میرا مطلب ہے بات آگے تو بڑھنے دو.... منگنی کر لیتے ہیں شادی دو سال.... یا چلو تین سال بعد کر لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ کتنا پڑھ لے گی؟"

"اوہ.... تو منگنی کے دورانیے تک طے ہو گئے۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تو صرف خانہ پری کے لیے مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی.... میں اس کی لگتی کیا ہوں.... جب تمام فیصلے آپ کو خود کرنے ہیں تو جائیں کریں۔ میرا کیا حق ہے آپ کی بیٹی پہ....."

وہ اٹھنے لگی تو نوید مراد نے گھبرا کے اس کی کلائی تھام لی۔ ان کے حقیقتاً" ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"کیا کہہ رہی ہو منزہ.... تمہارا حق نہیں ہے؟ مجھ سے زیادہ حق ہے تمہارا جو تم کہو گی وہی ہو گا۔ وشمہ کی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا اختیار صرف تمہیں ہے۔"

وہ دوپٹے کے پلو سے پلکیں خشک کرتے ہوئے مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

"آر یو شیور.... کہ اس سارے قصے سے فاریہ کا کوئی لنک نہیں ہے؟"

اس نے بلا مبالغہ کوئی پچیسویں بار پوچھا تو وصی کا دل چاہا' ہاتھ میں پکڑی کون اس کے منہ پر مل دے۔

"ویسے کیا فائدہ.... اس آئس کریم سے زیادہ ٹھنڈے اس کے اپنے تاثرات ہیں' اسے کیا فرق پڑتا ہے۔"

وہ سوچ کے ہنس پڑا اور ساتھ ساتھ وضاحت کی۔

"کتنی بار بتاؤں.... میں کسی فاریہ کو نہیں جانتا۔"

"یہ جو تمہاری ہنسی ہے نا.... یہ مجھے مشکوک کر دیتی ہے۔"

"تم میری ہنسی پر نہ جاؤ.... یہ میری عادت ہے۔"

آئس کریم کھانے کے بعد اب کون چبا رہا تھا۔ دونوں اس وقت میکڈونلڈ میں بیٹھے تھے۔

"پہلی بار ایسا شخص دیکھا ہے' ہنسنا جس کی عادت ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"تم نے بتایا نہیں کہاں ہوتی ہو آج کل؟"

"دارالامان۔"

"واقعی.... ؟ نہیں یار.... اتنی بھی نہ پھینکو۔"

"تو تم بتاؤ.... کہاں ہوتی ہوں؟" وہ جاننا چاہتی تھی کہ منزہ نے اس کے بارے میں دوسروں کو کیا بتا رکھا ہے۔

"شاید اپنے انکل کے ہاں.... انہوں نے تمہیں اڈاپٹ کیا تھا ناں۔" اسے کچھ کچھ یاد تھا۔ چند سال پہلے خاصا گرما گرم موضوع تھا یہ ان کے گھر کا۔

"انہوں نے نہیں' میں نے انہیں اڈاپٹ کیا ہے۔ میری مرضی کے بغیر مجھے کوئی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ میری اپنی ماما بھی نہیں۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ لاپروا سا وصی کھوجنے کے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"وشمہ تم سے بہت مختلف ہے۔ بہت الگ۔" پتہ نہیں کیوں اس نے یہ کہا تھا اور سوہا زور سے ہنس پڑی۔

"مختلف اور ان جان لوگ ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہی ہیں.... اس کے اور میرے ایک جیسے ہونے کی کوئی تک بھی تو نہیں بنتی۔ نہ ہمیں پیدا کرنے والے ماں باپ ایک ہیں' نہ پالنے والے۔"

"تم ہر وقت ایسی ہی جلی کٹی باتیں کرتی رہتی ہو یا یہ اس دن وہ کارٹونز والے فولڈر کے نتیجے میں پڑنے والی ڈانٹ کا منطقی نتیجہ ہے۔"

وہ ہنسنے کھیلنے والا.... زندگی کے ہر رخ کو رنگوں سے بھرپور دیکھنے والا محبت بھرا شخص تھا۔ چند منٹ بعد ہی اس کی وحشت زدہ آنکھوں' جھلستی باتوں اور طنزیہ مسکراہٹ سے خائف ہو گیا.... شدت سے یہاں سے بھاگ جانے کو من چاہا۔

"میں ایسی ہی ہوں۔" سوہا نے شانے اچکائے۔

"اور وہ تمہاری وشمہ.... وہ کیسی ہے؟" اس نے بڑی کوشش کی اپنا لہجہ عام سا سرسری رکھنے کی.... مگر ایک حاسدانہ سا تجسس جھلک رہا تھا۔

"ویسی ہی جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں.... ندا آپی جیسی.... ردا اور ہما جیسی۔"

"یعنی میں لڑکیوں جیسی نہیں ہوں؟" اس نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ وصی گڑبڑا اٹھا۔

"نہیں' میرا مطلب ہے نارمل لڑکیوں جیسی ہے۔" اس نے روانی سے بات سنبھالنا چاہی مگر وہ بالکل ہی ہاتھ سے نکل گئی اور اوندھے منہ جا گری۔

"تمہارا مطلب ہے میں ابنارمل ہوں؟"

"توبہ ہے یار....!" وہ بدک کے کھڑا ہو گیا۔

"ایک پینتیس روپے کی کون کے پیچھے میں اتنا سر نہیں کھپا سکتا۔" اور والٹ میں سے پیسے نکالنے لگا۔

"بے شک یہاں آنے کی دعوت تم نے دی تھی لیکن میرا خیال ہے میں نے تمہارے سوالوں کے تسلی بخش جواب نہیں دیے اس لیے اس دعوت پہ میرا کوئی حق نہیں بنتا۔ یہ لو.... یہ میری طرف سے ایک کون تم کھا لینا اور حساب برابر کر لینا۔"

سوہا تلملاتی ہوئی اسے باہر نکلتے دیکھتی رہی پھر ٹیبل سے پچاس کا نوٹ ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔

"ابھی بھی دنیا میں اس قسم کے نمونے باقی ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"وہ اتنی عجیب کیوں ہے؟"

سارے راستے وہ رہ رہ کے یہی سوچتا رہا۔

"ہوتی رہے۔۔۔ مجھے کیا۔" اس نے سر جھٹک کے اس خیال سے نکلنا چاہا لیکن دو وحشت زدہ خالی خالی نظریں بے تابی سے گرد و پیش میں کچھ کھوجتی نظر آتیں اور وہ پھر سے الجھ جاتا۔

"اتنی بے چینی اس قدر اضطراب کیوں نظر آتا ہے اس کی ذات میں۔"

"بھئی ہو گا۔۔۔ تم نے جان کے کیا کرنا ہے؟"

وہ دوبارہ خود کو لتاڑنے لگا لیکن۔۔۔

"مجھے اس کے ساتھ اتنی بے رخی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ صرف چند بے ضرر سے سوال ہی تو کر رہی تھی۔ میں نے ہی جواب کچھ الٹے دیے تھے۔ شاید میں اس کے تفتیشی انداز سے چڑ گیا تھا لیکن مجھے سمجھنا چاہیے تھا۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ میں اپنے پاپا کے بارے میں جانوں۔ وہ کیسے ہیں۔۔۔ مجھے یاد کرتے ہیں یا نہیں۔۔۔ اتنا تو پتہ ہے کہ دوسری شادی کے بعد وہ اپنے بچوں کے ساتھ ایک مکمل زندگی جی رہے ہیں لیکن اس کے باوجود کیا کبھی انہیں کسی کمی کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ اگر میں یہاں نانو کے گھر میں اتنی محبتوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کے بارے میں جاننے کے لیے کبھی کبھی بے چین ہو جاتا ہوں تو وہ کیوں نہیں؟ شاید وہ بھی اس مقصد سے وشمہ کے بارے میں۔۔۔ اور میں خوامخواہ گرم ہو گیا۔"

اس نے یوٹرن لے کر گاڑی دوبارہ اس راستے پر موڑ لی۔

✲ ✲ ✲

لاہور آنے کے بعد پورا ہفتہ بھرپور مصروف گزرا۔

مکرم باجوہ سالوں سے یہاں سیٹل تھا۔ بہن کے بھی یہاں منتقل ہو جانے کی خوشی میں اس نے شاندار تقریب منعقد کی اور اسی میں مدیحہ کو اپنے ان دور نزدیک کے رشتے داروں سے ملنے کا موقع ملا جن کو وہ "تقریباً" بھول چکی تھی۔

"پاپا اتنے بہت سے انکل۔۔۔؟ یہ کہاں تھے اب تک؟" تینوں میں سے تطہیر، جعفر سے کچھ قریب بھی تھی اور نسبتاً "بے تکلف بھی" اس نے باپ کو درجن بھر رشتے کے بھائیوں میں گھرے گپیں مارتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"سب میری طرح اپنا اپنا الگ محور بنائے بس ایک معمول کی طرح گھوم رہے تھے۔۔۔ تھک گئے تو اصل کی جانب لوٹ آئے۔"

جعفر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"نوجوانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز، ہر وہ بات بری لگتی ہے جو زندگی میں پہلے سے موجود ہے۔ دل خود discover کی دنیا کے لیے ہمکتا ہے۔ روایتیں۔۔۔ رواج۔۔۔ رسمیں۔۔۔ وضع داری۔ لحاظ۔۔۔ سب بیڑیاں سی لگتی ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے سے روکتی ہوئی۔ تب ہر گرم خون جوش کھاتے ان پابندیوں سے دور بھاگتا ہے۔۔۔ اور یہی خون جب ٹھنڈا پڑنے لگتا ہے تو پتہ نہیں کیسے مگر قدرتی طور پر اس میں وہی تاثیر پیدا ہونے لگتی ہے جو اس کے اصل میں تھی۔"

یہ سب، جو یہاں موجود تھے ان میں اکثریت جعفر محمود جیسے لوگوں کی ہی تھی۔

بیرسٹر کمال ساجد۔۔۔ جعفر کی پھوپھی زاد بہن کے شوہر، جو دور پرے کے رشتے دار بھی تھے۔۔۔ اٹھائیس سال انگلینڈ میں رہنے کے بعد دونوں میاں بیوی پچھلے برس ہی وطن لوٹے تھے۔ دونوں بیٹے وہیں سیٹل تھے جن کی شادی بھی کر دی تھی۔۔۔ تینوں نے ماں باپ کے جذباتی فیصلے کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا ٹھیک اسی طرح جیسے کمال ساجد نے کیا تھا اور بڑے کروفر سے فیملی کو لے کر انگلینڈ شفٹ ہو گیا تھا یہ کہتے ہوئے

"اس ملک میں کیا رکھا ہے؟"

اب اسی کچھ رکھے ہوئے کی تلاش میں لوٹا تھا۔ اس کے بیٹوں نے اگرچہ صاف کہہ دیا تھا کہ ان کا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ان کا جینا مرنا اب اسی ملک میں ہے، جہاں انہوں نے ہوش سنبھالا لیکن کمال ساجد بیٹوں کے نام سے حال ہی میں ایک کاٹن مل قائم کی تھی۔ شاید وہ جانتا تھا کہ آج نہ سہی کل، کچھ سالوں کے بعد جو خون آج گرم ہے ذرا ٹھنڈا پڑتے ہی مٹی کی آغوش میں حدت تلاشنے ضرور آئے گا۔

جعفر بھی ساری عمر جس حوالے سے جان چھڑاتا اور گھبراتا رہا۔ اب بڑے فخر سے اپنے نئے سرکل میں اس کا تعارف کرا رہا تھا۔

جس سالے، بہنوئی اور چچا زاد مکرم سے اسے ہمیشہ خدا واسطے کا بیر رہا۔ اسی کے ساتھ پارٹنر شپ کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔ کوئی اور جانے نہ جانے مگر مدیحہ جانتی تھی کہ جعفر کی اس تبدیلی کی وجہ کیا تھی۔

اس کی تین بیٹیاں۔۔۔

وہ بظاہر چاہے جتنا بھی لبرل ظاہر کرتا وہ خود کو۔۔۔ لیکن اندر سے ایک روایتی باپ تھا۔ انجان بے گانے لوگوں کے ہاتھ میں بیٹیاں سونپتے ہوئے اسے ہزار دھڑکے تھے۔۔۔ جس خاندان سے کٹ کر جینے کے دعوے کیے تھے اسی خاندان میں اب بیٹیوں کے لیے سہارے تلاش کرنے کی نیت سے ان کے قریب ہوا تھا۔

پہلی ہی بار مدیحہ کو بیٹیوں کی ماں ہونے پر فخر ہوا۔

اس سے پہلے وہ ہمیشہ دل ہی دل میں خدا سے شاکی رہی کہ جعفر محمود کے بیٹے کی ماں بن کے اس پہ حاوی نہ ہو سکی لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ بیٹے کا باپ بن کر تو خود جعفر نے حاوی ہو جانا تھا۔۔۔ اب تو وہ زیر ہوا تھا۔ یہ تین تین بیٹیاں ہی ہیں جو اسے ہاتھ پکڑ کے واپس لائی ہیں۔

اسے جعفر محمود کا جھکا سر اور اپنے بھائی کے سامنے اس کی انکساری دیکھ دیکھ کے ایک کمینی سی راحت ملتی تھی۔ اب تحریم کی وجہ سے لگا گھاؤ بھی بھولنے لگا تھا۔ واپسی پہ وہ خلاف معمول بڑی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

"پاپا بالکل بے جی جیسی لگنے لگی ہیں۔"

جعفر نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔

"اور بھائی صاحب بالکل تاؤ جی جیسے۔۔۔"

مدیحہ نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا پھر کچھ توقف کے بعد دہرایا۔

"پتہ نہیں کیوں ہم جانے والوں کی شبیہ رہ جانے والوں میں تلاشتے ہیں، اگر آپا، آپا جیسی لگیں اور بھائی صاحب بھائی صاحب جیسے ہی۔۔۔ تو کیا ہمارے لیے کم محترم ہوں گے؟ کیا ضروری ہے کہ ان سے قریب ہونے کے لیے ہم ان پر ان رشتوں کے خول چڑھائیں۔ کیا ان کے موجودہ رشتے کافی نہیں ہیں ہمیں ان سے قریب رکھنے کے لیے؟"

جعفر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اتنی گہری بات کی توقع اسے مدیحہ کی جانب سے نہیں تھی۔۔۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے خاموشی سے ساری توجہ سامنے پر ہجوم سڑک پہ مرکوز کر دی۔

✲ ✲ ✲

"تم تو اچھی خاصی سمجھدار لڑکی ہو یار۔۔۔ میں تمہیں ایسے ہی کند ذہن اور غبی سمجھ رہا تھا۔"

بات کے لہجے پہ سوہا نے گھور کے اسے دیکھا۔

"لگتا ہے جو تم ابھی تک تھرڈ ایئر میں پھنسی ہوئی ہو تو۔۔۔" وہ وضاحت دینے لگا مگر سوہا نے بات کاٹ دی۔

"مجھے پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، نہ ہی تعلیمی میدان میں جھنڈے گاڑنے کا شوق ہے۔"

"لیکن تم میں۔۔۔" وصی نے اپنے اندازے کے درست ہونے کی داد چاہی لیکن سوہا نے دوبارہ اس کی بات کاٹ

"لیکن اس کے باوجود۔۔۔" وہ پُرزور اور بلند آواز میں بولی۔

"میرے تھرڈ ایئر میں ہونے کی وجہ میرا فیل ہونا نہیں ہے بلکہ اسکولنگ کے دوران کچھ عرصے کے لیے میری ایجوکیشن کا سلسلہ رک گیا تھا۔"

"تب ہی۔۔۔ ورنہ وشمہ تو تم سے کئی سال چھوٹی ہونے کے باوجود۔۔۔" اس بار سوہا نے اس کی بات نہیں کاٹی تھی۔ وہ خود ہی پُنھ محسوس کر کے چپ ہو گیا تھا۔

"لگتا ہے تمہارا زیادہ تر وقت خواتین میں گزرتا ہے' خاصے گھریلو قسم کے لڑکے ہو۔" سوہا نے اندازہ لگایا۔

"کیوں؟" اس نے ابرو چڑھائے۔

"تمہاری باتیں بڑی زنانہ قسم کی ہوتی ہیں۔۔۔ وہ جیسے نانیاں' دادیاں کرتی ہیں نا۔۔۔ فلاں یہ۔۔۔ فلاں وہ۔۔۔" وہ ہنستے ہوئے اس کی ذات کا تجزیہ کر رہی تھی۔۔۔ اتنے دن کی دوستی کے بعد یہ حق تو رکھتی تھی وہ۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟۔۔۔" وصی کے مردانہ زعم کو اچھی خاصی ٹھیس پہنچی۔ "اس طرح تو تمہاری گفتگو میں بھی اچھا خاصا مردانہ ٹچ ملتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنا زیادہ وقت مردوں میں۔۔۔"

وہ کچھ نامناسب سی بات کرتے کرتے رک گیا۔ جھینپ مٹانے کے لیے کان کی لو مسلنے لگا۔

سوہا نے اس کے شانے پہ دھپ لگاتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"لڑکیوں کی طرح ہی بلش بھی کرتے ہو۔"

"شٹ اپ۔" وصی نے جھنجلا کے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

پارکنگ سے کار نکالتے حسن نے بڑے تعجب سے یہ منظر دیکھا۔

وصی۔ اور کسی لڑکی کے ساتھ؟

وصی کی عمر تھی۔۔۔ اور زمانہ جس رخ پہ جا رہا تھا اس کے پیش نظر یہ ایسی انہونی بھی نہیں تھی۔۔۔ وہ لڑکی کوئی بھی ہو سکتی تھی۔۔۔ اس کی کولیگ۔ کوئی کالج کے زمانے کی فرینڈ۔۔۔ مگر حسن کے اچنبھے کی وجہ وصی کا کسی لڑکی کے ساتھ ہونا نہیں تھا بلکہ اس طرح کی لڑکی کے ساتھ ہونا تھا۔

کھلے سے گریبان والی سلیولیس اسکن ٹائٹ شرٹ کے ساتھ اسکن ٹائٹ جینز۔۔۔ جو گھٹنوں سے ذرا ہی نیچے تھی۔۔۔ بے تکلفی کے ساتھ ایک پبلک پلیس پہ وصی کے ساتھ دھول دھپہ کرتی۔۔۔ بلند قہقہے لگاتی پہلی نظر میں ہی حسن کو سخت ناپسندیدہ لگی۔

○ ○ ○

"اک گرم چائے کی پیالی ہو۔"

حسان لاؤنج میں صوفے پر اوندھا گرا' بڑے دردناک سُروں میں گا رہا تھا۔

"اک گرم چائے کی پیالی ہو۔"

"کوئی اس کو پلانے والی ہو۔"

چاہے گوری ہو یا کالی ہو؟"

"تو مرو۔۔۔" وصی نے چائے کا گرم گرم مگ اس کی کمر سے چھوا۔۔۔ وہ تڑپ کے اٹھا۔

کپ چھلکتے چھلکتے رہ گیا تھا۔

"اوئے آرام سے۔۔۔ ابھی وہ تمہاری گوری یا کالی نہیں آئی چائے بنانے کے لیے۔ یہ گر جاتی ناں تو تم دوبارہ بنا کے نہیں دینے والا تھا۔"

"کمر جلا کے رکھ دی ہے۔" وہ کمر سہلاتے ہوئے مگ پکڑ رہا تھا۔

"کمر۔۔۔؟ خدا کا واسطہ ہے اتنی انکساری سے کام نہ لیا کرو۔ کیوں اس سلطنت خداداد کو اتنا مختصر سا بنا رہے ہو۔ اچھا بھلا کمرستان ہے۔"

ایک "کپ" چائے کے بدلے دس باتیں نہ سناؤ۔ عنقریب میں چائے اور کھانے کے معاملے میں خود کفیل ہونے والا ہوں۔" حسان نے فخریہ اعلان کیا۔

"کیا لنگر کے باہر ڈیوٹی لگ گئی ہے' دیگوں کے ڈھکن اٹھانے اور رکھنے کی؟"

"تمہاری بھابی لانے کا سوچ رہا ہوں۔" حسان نے شرماتے ہوئے کہا۔

"پہلے اے کا رزلٹ تو لے آؤ۔ پھر لاتے رہنا بھابیاں۔"

"کون لا رہا ہے بھئی بھابیاں؟"

حسن نے اندر داخل ہوتے ہوئے بہ ظاہر سرسری انداز میں کہا مگر نظریں وصی کو ٹٹول رہی تھیں۔

"یہ حضرت' جو خود تو ہیں ہی کام کے نہ کاج کے' ڈھائی من اناج کے۔۔۔ اب ایک اور ذمہ داری آپ کے کندھوں پر لادنا چاہ رہے ہیں۔ تیار ہو جائیں۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ عنقریب آپ اس کے بیوی بچوں کی بھی ذمہ داری اٹھانے والے ہیں۔"

"ارے نہیں۔۔۔" حسن کو سامنے پا کے حسان فوراً اپنے کہے الفاظ سے منحرف ہو گیا۔

"میں نے بیوی کی بات کب کی۔۔۔ میں تو بھابی کی بات کر رہا تھا۔"

"میری بھابی کی۔" وصی نے تصحیح کی۔

"ہاں تو جو میری بھابی ہو گی وہ تمہاری بھابی بھی تو ہو گی۔ ہم دونوں کی بھابی۔۔۔ بھابی پیاری بھابی۔۔۔ ممتا اور محبت سے بھرپور۔۔۔ مجھے تین ٹائم پراٹھے پکا کے کھلانے والی۔۔۔ ہر بیس منٹ بعد چائے کا کپ بمعہ حلوے اور پکوڑوں کے دینے والی۔"

"تمہیں یہ خواب دن کے وقت کہاں سے آ گیا؟"

"بھئی ظاہر ہے حسن بھائی جیسے خود ہیں' ویسی ان کی بیگم ہوں گی۔۔۔ ان ہی طرح۔۔۔ ہو بہو۔"

"ہو بہو ایک جیسے جڑواں بہن بھائی ہوتے ہیں' میاں بیوی نہیں۔" وصی نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"یہ تم دونوں میری ہونے والی بے چاری بیگم کو کیوں موضوع گفتگو بنا بیٹھے ہو۔ اپنی بات کرو۔"

"اوہو۔۔۔ یعنی وہ جو ابھی آئی بھی نہیں۔۔۔ اس سے اتنی ہمدردی کہ زبانی کلامی بھی محترمہ کو تکلیف دینا گوارا نہیں۔ سن لو حسان! تم ادھر پراٹھوں اور پکوڑوں کی آس لگائے بیٹھے ہو اور یہاں ہمیں اپنا اپنا بندوبست خود کرنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔"

وصی نے حسان کو بھڑکانا چاہا تھا لیکن حسن نے اس پر براہ راست حملہ کیا۔

"اور تم تو شاید بندوبست کر بیٹھے ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ حسن کی سنجیدگی پہ ٹھٹکا۔

اب تک تو بات ہلکے پھلکے انداز میں ہو رہی تھی۔

"کل پانکرو کلب میں تم کیا کر رہے تھے؟"

"بیڈمنٹن کے لیے اکثر جاتا ہوں وہاں۔"

"اکیلے۔" حسن نے ذرا توقف کیا۔

"یا کسی لڑکی کے ساتھ؟"

وصی ذرا چونکا۔۔۔ پھر سنبھل کے بیٹھ گیا۔

"سوہا۔۔۔ وہ پہلی بار آئی تھی وہاں۔۔۔ آئی نہیں میرے ساتھ پہلی بار آئی تھی۔۔۔ ہو سکتا ہے پہلے بھی آتی رہی ہو۔"

"دوست ہے تمہاری؟" حسن کو اس کے پُراعتماد اور بے فکر انداز کی وجہ سے مناسب الفاظ نہ مل رہے تھے اپنی ناگواری کے اظہار کے لیے۔

وصی کا ذکر پہ ذرا سا بھی گھبرایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔

"ظاہر ہے... دشمن کے ساتھ میں گیم کے لیے تو جانے سے رہا۔"
"کس قسم کی دوست؟"
"کیا دوستوں کی بھی کیٹیگریز ہوا کرتی ہیں؟"
اس نے الٹا سوال کیا۔
اس پوچھ گچھ کا کچھ کچھ مقصد سمجھ میں آرہا تھا۔
"ہاں اگر دوستوں میں لڑکیاں بھی شامل ہونے لگیں۔"
"وہ میری ایک عام سی دوست ہے... بس۔"
"مگر وہ لڑکی عام سی نہیں لگ رہی تھی وصی... وہ ہمارے گھر کی لڑکیوں جیسی نہیں تھی۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"
"بالکل سمجھ رہا ہوں۔ وہ واقعی ہمارے گھر کی یا ہماری فیملی کی لڑکیوں جیسی نہیں ہے لیکن ڈونٹ وری... میرا اسے اس فیملی کی لڑکیوں میں شامل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"
اس نے مسکراتے ہوئے تسلی کرانا چاہی۔ مگر وہاں ردِ عمل کچھ اور گمبھیر نظر آیا۔
"یہ تو اور بھی غلط بات ہے۔"
"کیا مطلب...؟" وہ اچھلا۔
"یعنی آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اسے اس فیملی میں شامل کروں؟"
یہ سوال اس نے سراسر حسن کو چھیڑنے کی نیت سے کیا تھا ورنہ اتنے سالوں کے ساتھ کے بعد یہ تو جانتا تھا کہ اس کی کہی باتوں کا کیا مطلب ہے اور اَن کہی باتوں کا کیا مطلب ہے۔
"میں نے یہ نہیں کہا... تمہیں اچھی طرح پتہ ہے کہ..."
حسن کو غصہ آنے لگا مگر پھر دبا کے آہستگی سے کہا۔
"تم جانتے ہو ہمارے گھر کا ماحول... بعض باتوں میں ہم لوگ ابھی تک دادا پردادا کے زمانے کی روایتوں پہ کاربند ہیں۔ آزادی کی بھی ایک حد مقرر ہے ایسے میں صاف ظاہر ہے کہ تمہاری اس دوست جیسی لڑکی کی ہمارے گھر میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی لیکن میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ تم صرف دل لگی یا وقت گزاری کے لیے کسی لڑکی کو استعمال کرو۔"
"لیکن حسن بھائی... وہ..." اس نے کہنا چاہا مگر حسن کچھ سننے کے بجائے سنانے کے موڈ میں زیادہ لگ رہا تھا۔
حسان کسی ہونق الو کی طرح دیدے پھاڑے کبھی وصی کو تو کبھی بڑے بھائی کو دیکھ رہا تھا، جو لیکچر کے فل موڈ میں لگ رہا تھا۔
"وہ چاہے کتنی بھی آزاد خیال اور ماڈرن کیوں نہ ہو، تمہیں تو اپنی حدود کا خیال رکھنا چاہیے۔ کسی کو پسند کرنا برا نہیں ہے لیکن اس میں بھی دو باتوں کا دھیان رکھنا چاہیے۔ ایک تو معیار کا... دوسرا اس پسندیدگی کی سنجیدگی کا۔"
"چلیں... پسند کرتے وقت تو ان دو چیزوں کا دھیان رکھا جا سکتا ہے لیکن اگر محبت ہو جائے... اور وہ بھی طوفانی قسم کی، تب کیا کیا جائے۔ محبت میں تو سنا ہے دھیان، ہوش، حواس سب ضبط ہو جاتے ہیں۔"
حسن کی سنجیدگی وصی کو شرارت پہ اکسا رہی تھی۔
"محبت...؟ ابھی تو تم کہہ رہے تھے ایسی کوئی بات نہیں؟"
حسن کو ایک بار پھر لڑکی کا حلیہ اور کھلا ڈلا انداز یاد آنے لگا اور انگلیوں میں دبا سگریٹ بھی۔ واقعتاً اس کے ہوش اڑ گئے۔
"وہ تو میں اب بھی کہہ رہا ہوں... بس یونہی... احتیاطاً" پوچھ رہا تھا۔ ممکنہ صورتحال کے لیے۔"

باتوں میں مت اڑاؤ بات کو... میں جو کہہ رہا ہوں اسے سیریسلی لو۔ یہ فلرٹ بازیاں ختم کرو۔ جاب تمہاری لگی ہے ایم بی اے ابھی چل رہا ہے... تمہارے پاس وقت ہی کہاں ہے اس قسم کے یارانوں کا۔"
"کمال کرتے ہیں حسن بھائی۔" اب کے وہ سچ مچ زچ ہوا تھا۔
"کیا دورانِ تعلیم آپ نے ساری دوستیاں چھوڑ دی تھیں... یا کام کی مصروفیت کی وجہ سے اب آپ صہیب بھائی، کامل بھائی وغیرہ سے نہیں ملا کرتے۔"
اس نے حسن کے جگری دوستوں کے نام گنوائے۔
"میں گرل فرینڈز کی بات کر رہا ہوں۔"
حسن کے صاف صاف کہنے پر وصی کا تو قہقہہ بلند ہوا ہی۔ حسان بھی کھل کھل کر تا ہنسنے لگا۔
"یہ تو خود گرل فرینڈ ہے... وہ بھی ندا آپی کی۔"
اس نے ہنستے ہوئے بے تکا سا تبصرہ کیا۔
"بکو مت۔" حسن نے ڈانٹا۔
"بکواس نہیں کر رہا... ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سوہا سے میری دوستی اتنی ہی بے ضرر ہے جتنی آپ کی صہیب بھائی سے۔"
"لیکن معاشرہ ایسی دوستیوں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ وہ جو تمہاری سو کالڈ دوست ہے، میں اس کے بارے میں بھی یہی کہوں گا کہ ایسی لڑکیوں کو بھی لوگ اچھی نظر..."
"وہ بری لڑکی نہیں ہے حسن بھائی۔"
وصی نے بات ضرور کاٹی مگر بڑی نرمی سے کہا۔
"اس کی ڈریسنگ... اس کا لائف اسٹائل، اس کے ماحول کی وجہ سے ہے، ورنہ اندر سے وہ ایک عام سی لڑکی ہے۔ عام سے محسوسات اور عام سے جذبات رکھنے والی۔"
وصی کو یہ بتاتے ہوئے سوہا کی خالی خالی نظروں کا وہ تاثر یاد آ گیا جو ماں کے ذکر پہ نمایاں ہو جاتا تھا۔
"تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔"
حسن نے شانے اچکاتے ہوئے کہا مگر انداز نہ ماننے والوں جیسا تھا۔ جب بھی اس لڑکی کی جھلک تصور میں آتی، ناپسندیدگی کی ایک زوردار لہر اٹھتی۔
"ویسے ایک چیز کا اندازہ ہو رہا ہے مجھے۔" وصی نے سر ہلا کر کہا۔
"جب آپ کی شادی کی باری آئے گی تب آپ نے امی جی کو دقت ڈال دینا ہے۔ بھئی بڑے سخت معیار لگ رہے ہیں۔"
"تمہیں سخت لگیں یا نرم... بہرحال میری شرط صرف ایک ہی ہوگی... میری شریکِ حیات حسن و جمال میں چاہے یکتا نہ ہو مگر کردار کے حوالے سے بے داغ ہونی چاہیے۔ میں ظاہری شخصیت کی کوئی کمی برداشت کر سکتا ہوں مگر کردار کی کمی ہرگز نہیں۔"
"ڈال دیا نا امتحان میں پورے گھر کی خواتین کو۔ اب بتائیے وہ کیسے پتہ لگائیں گی آپ کی مطلوبہ خصوصیات کا۔ گورے رنگ یا لمبے بالوں کی بات کرتے تو وہ تو دور سے نظر آ جاتے ہیں۔"
"اندر کا نکھرا پن بھی دور سے نظر آ جاتا ہے میرے بھائی۔" حسن کی نظروں کے سامنے وشمہ کی شبیہہ لہرائی۔
چہرے پہ انوکھی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ٹھہر گئی۔
"کچھ چہرے ایسے ہی ہوتے ہیں... جن کو پہلی نظر دیکھتے ہی نگاہیں گواہی دینے لگتی ہیں۔ ان کی معصومیت اور ان کی پاکیزگی کی۔"
"اللہ... وہ..."

وصی اور حسان نے اپنی مشترکہ ”اوہو“ سے حسن کو خجل ہو جانے پہ مجبور کر دیا۔
وہ مسکراہٹ چھپاتا وہاں سے اٹھ گیا۔
وہ کسل مندی سے پتھر کے بنچ پہ نیم دراز تھی۔
دھوپ اب چبھنے لگی تھی۔ مگر اسے خاص اثر نہ ہو رہا تھا۔ جہاں جہاں چھاؤں تھی۔ وہاں وہاں لڑکیوں کے جمگھٹے بھی تھے اور وہ ان سب چہلیں کرتی لڑکیوں سے بے زار تھی۔
حتیٰ کہ **سبیکا** اور شیبا سے بھی۔
جب سے **سبیکا** کے رشتے کی بات ممتاز صنعت کار اور زمین دار گھرانے کے چشم و چراغ شہاب پگڑی والا سے چلنا شروع ہوئی تھی۔ وہ ان تمام سرگرمیوں کے نام سے ہی بدکنے لگی تھی‘ جو ان تینوں کے گروپ کا خاصہ تھیں۔
”اوہ۔ فیوڈل سسٹم کا حصہ بننے کی تیاری ہے؟“
سوہا نے طنزیہ تبصرہ کیا۔
”یعنی خول پہ خول چڑھا کے رکھنا... ابھی سے بہروپ بھرنے کی پریکٹس کر رہی ہو تاکہ پگڑی والا فیملی کی بہو بننے کے بعد کام آئے۔“
”اس میں بہروپ بھرنے والی کون سی بات ہے؟“
سبیکا تپ ہی تو گئی۔
”زندگی کے ہر فیز کے الگ تقاضے ہوتے ہیں۔ ہم اپنی ٹین ایج سے نکل چکے ہیں... اور اس ایج کی حماقتیں اسی پیریڈ کے ساتھ ختم ہو چکی ہیں۔ تمہیں بھی یہ لاابالی پن چھوڑ کے **مچیوریٹی** کی طرف آنا چاہیے۔“
مثلاً ”کس قسم کی **مچیوریٹی**؟ تم آج کل سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگا رہی... اگر اسموکنگ سے پرہیز کا مطلب ہی **مچیوریٹی** ہے تو تمہارے ہونے والے فیانسی کی پھوپھو محترمہ... جو ہمارے کالج کے بورڈ ممبرز میں سے ایک ہیں... دن دیہاڑے سوٹے لگاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری ہونے والی ساس بھی...“
”مگر بہوئیں منتخب کرنے کے ایسی فیملیز کے الگ ہی معیار ہوا کرتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ وہ فیملی میڈیا میں کتنی اِن ہے۔ ایسے میں ہر ایرے غیرے سے ملنا افورڈ نہیں کر سکتی۔ اس دن بھی جیم خانہ میں تم نے ہم سے بتائے بغیر روفی کو انوائٹ کر لیا تھا۔ روفی کا بڑا بھائی **موسٹ وانٹیڈ کریمنل** ہے‘ اس کے فادر کروڑوں کے غبن کے الزام میں نیب کی زیر حراست ہارٹ اٹیک سے گزرے تھے اور خود روفی... اس کی شہرت کون سی بہت اچھی ہے۔ اسی لیے میں نے وہاں سے واک آؤٹ کیا تھا‘ میرے اِن لاز میں سے کسی کو پتہ چل جاتا کہ میری کمپنی میں ایسے تھرڈ کلاس اور بدنام لوگ شامل ہیں تو کیا عزت رہ جاتی میری۔“
”تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے یہ رشتہ نہ آتا تو تم کنواری مرنے والی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں اتنی پچی ہو رہی ہو اس شہاب پگڑی والے کے لیے... لٹھے کی ڈھائی تین گز گھیر والی شلوار پہننے والا... بڑی بڑی مونچھیں... اور سر پہ خاندانی علامت... من بھر کی پگڑی سر پہ رکھی ہوئی۔ شادی کے بعد ساہیوال کی کسی حویلی کے اندر بند کر دے گا تمہیں۔“
”ایک بار شادی ہو جانے دو۔ ایسی حویلیوں کے خفیہ دروازے بھی ہوتے ہیں۔ شہاب اپنے ماں باپ کا اکلوتا ہے۔ بھائی تو بھائی... کوئی بہن تک نہیں ہے... اور شہاب کے پیرنٹس بھی سب بہن بھائیوں میں بڑے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے پیرنٹس کی پراپرٹی کا اکلوتا وارث ہوگا‘ بلکہ پگڑی والا خاندان کا بھی سب سے بڑا پوتا۔“
سوہا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے **سبیکا** کو کون سا فائدہ ہونے والا ہے۔ وہ مزید کچھ کہنے سے باز رہی لیکن ایک استہزائیہ مسکراہٹ ضرور اس کے چہرے پہ سج کے ان دونوں کو تاؤ دلانے لگی۔
”اور ایک نمونہ اور آج کل تمہارے بڑا کلوز ہے... وہ پرانی سی آلٹو میں جو آتا ہے... مڈل کلاس کا چلتا پھرتا اشتہار۔“

”وصی ہے۔“ سوہا سنجیدہ ہو گئی۔
”اور میرا بہت اچھا دوست ہے۔“
”نہیں سوئٹ نہیں کرتی ایسے ٹٹ پونجیوں کی دوستی۔“ شیبا نے ناک چڑھائی۔
”Exactly“ **سبیکا** نے تائید کی۔
”پتا نہیں تمہارے ٹیسٹ کو کیا ہو گیا ہے۔ ذرا بھی سینس نہیں رہی کہ کن لوگوں سے فرینڈشپ کرنی ہے۔“
”یو آر ڈیم رائٹ۔“ سوہا ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔
”مجھے واقعی سینس نہیں ہے اس بات کی۔ ہوتی تو کبھی تم دونوں سے بھی دوستی نہیں کرتی۔“
وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ان سے دور ہو گئی۔
”ونو ہیل۔“ **سبیکا** بڑبڑائی۔
”مجھے تو لگتا ہے اس کا اپنا بیک گراؤنڈ بھی ایسا ہی ہوگا‘ اسی لیے اس قسم کے لوگوں کی جانب اٹریکٹ ہوتی ہے۔“
”ہے ہاں... اس کے انکل کو دیکھا ہے نا تم نے۔“ اور دونوں اصغر کا حلیہ اور بولنے کا ڈھنگ یاد کر کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسنے لگیں۔
تب سے سوہا کا کالج آنا برائے نام تھا۔
روفی سے بھی فاریہ کے معاملے میں پھڈا اچل رہا تھا۔ وصی کے ذریعے ساری حقیقت جان لینے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ روفی کو فون کر کے فاریہ سے دور رہنے کا کہا... لیکن روفی جیسے لڑکوں کو تو موقع چاہیے ایسے کارناموں کا... وہ ہاتھ آیا شکار چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔
”کم آن یار۔! مانا تمہارا اس سے اب کوئی لینا دینا نہیں رہا لیکن مجھے تو کھاتہ کھولنے دو۔ ابھی تو فون کیے ہیں کہ بوکھلائی ہوئی رونے لگ گئی... ذرا سا دھمکانے کی دیر ہے جہاں بلاؤں گا وہاں آ جائے گی۔“
”تم یہ سب میرے کہنے پہ کر رہے تھے... اب میں ہی کہہ رہی ہوں کہ رہنے دو۔“
”سوری... میں کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔ اتنی محنت سے اس کی اور اس کے بوائے فرینڈ کی تصویریں اتاری ہیں۔ اب جب تک ان کے بدلے کچھ مل نہ جائے... ایسے تو بات ختم نہیں کروں گا۔“
وہ فاریہ کو بلیک میل کر رہا تھا کیوں کہ اس کی پہلے ہی اپنے فرسٹ کزن سے منگنی ہو چکی تھی۔
اور سوہا نے غصے میں آ کے اسے کھری کھری سنا دیں یوں یہ نیا فرینڈز سرکل تو خود بخود ختم ہو گیا... **سبیکا** اور شیبا بھی انہی وجوہات کی بنا پر دور سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ خالی پن کی اس کیفیت میں وہ یادیں... وہ ماضی اس پہ زیادہ شدت سے حملہ آور ہونے لگا جس سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے خود کو ان بے کار مشغلوں میں الجھا رکھا تھا۔
ایسے میں وصی سے اس کا بار بار ٹکراؤ بے شک اتفاق تھا لیکن دو مخالف فطرت رکھنے والے مگر قریب قریب ایک سی فیملی اسٹرکچر رکھنے والے ایک دوسرے کے نزدیک آتے ہی گئے۔
کبھی کبھی تنہائی میں سوچنے پہ سوہا کو بھی اس تعلق کے بارے میں حیرت ہوتی۔ وہ اس کی زندگی کا پہلا مرد دوست نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی اس کے سرکل میں کئی لڑکے آ جا چکے تھے... اور یہ بھی ٹھیک تھا کہ نہ ان سے اس کی کسی رومانوی نوعیت کی تھی نہ وصی کے لیے کوئی احساس جاگا تھا لیکن وہ سب کسی نہ کسی طرح سوہا کی بے چین طبیعت سے میل کھاتے تھے اور وصی... وہ کسی ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند تھا۔ پُرسکون... مگر گہرا۔
سوہا کی ساری تلخ باتیں اس کے اندر ایسے گم ہو جاتیں جیسے گہرے کنویں میں کنکر... وہ گھنٹوں اس کا کہا سنتا رہتا... اور ذرا بھی نہ تھکتا۔
وہ کالج چلی بھی جاتی تو ایک آدھ کلاس لے کر اس طرح کسی نہ کسی کونے میں پڑی رہتی جیسی اس وقت تھی۔
”ہیلو سیکسو زمی...“

شائستہ اور ملائم سی آواز پہ اس نے سیل فون پہ گیم کھیلتے کھیلتے سر اٹھا کے دیکھا۔
وائٹ کروشیے کی بیل سے سجا اسکارف۔
اور اس سوتی اسکارف کے ہالے میں وہ قدرے نروس سا نظر آتا سادا سا چہرہ۔
"لیس۔۔۔" وہ اپنے ازلی اکھڑپن کے ساتھ گویا ہوئی۔
"پولیٹکل سائنس کی فورتھ ایئر کی کلاس کہاں ہو رہی ہے؟"
"آئی ڈونٹ نو۔۔۔ میں تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"
رکھائی کے ساتھ کہہ کے وہ پھر سے اپنے مشغلے میں مگن ہو گئی۔
"پلیز آپ مجھے کسی فورتھ ایئر کی لڑکی سے ملوا دیں۔۔۔ میں اس سے گائیڈنس لے لوں۔ ایکچوئلی میرا فرسٹ ڈے ہے اس کالج میں۔ اسلام آباد سے مائیگریٹ ہو کر آئی ہوں۔ تقدیس جعفر۔" اس نے اپنا سفید نرم ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

♥ ♥ ♥

"پروین ابھی تک آئی نہیں بازار سے؟"
رخشندہ نے ساس کے پاس بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔
گزرے ماہ و سال نے اس کی طبیعت اور مزاج پہ بہت سے اثرات مرتب کیے تھے۔ پروین کے مقابلے میں ایک احساس برتری جو ہمیشہ ان کے انداز سے جھلکتا تھا، اب قدرے دب گیا تھا۔ یہ احساس برتری انہیں دیورانی کے مقابلے میں اپنے بہتر فیملی بیک گراؤنڈ اور تعلیمی قابلیت کی وجہ سے تھا۔
وہ پورے سسرال میں اپنے آگے کسی کو گردانتی ہی نہیں تھیں لیکن پھر عام عورتوں کی طرح ان کے بھی فخر کرنے اور اترانے کے معیار بدلتے گئے۔ پروین کے دو دو بیٹے اور پھر وصی کا تیسرے بیٹے کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہنا۔ انہیں اپنی حیثیت کم لگنے لگی۔۔۔ یہ خیال انہیں بہت دیر سے آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنی تینوں بیٹیوں کے معاملے میں بالکل بھی روایتی سوچ نہیں رکھتی تھیں، نہ کبھی ایک ہی بیٹا ہونے کی وجہ سے کسی کمی کا احساس جاگا تھا۔
ندا کا تعلیمی ریکارڈ شروع سے ہی قابل رشک رہا تھا۔ پھر ردا بھی اسی کے نقش قدم پہ چل پڑی۔۔۔ ہما آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تو کبھی نہیں رہی تھی مگر بہرحال اس کا حال حسان جیسا بھی نہیں تھا۔ رخشندہ کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے تھے، جب انہوں نے بیٹیوں کی ماں ہونے پہ فخر محسوس کیا تھا۔۔۔ اور اب اسی حوالے سے ان کے پاس سوائے فکر و اندیشے کے اور کچھ نہیں تھا۔ ندا عمر کے ستائیسویں سال میں آگئی تھی۔ اوپر سے اس کی لیکچررشپ۔۔۔ گھر بیٹھی بیٹی کو بڑے آرام سے کئی سال تک بائیس تیئس کا بتلایا جا سکتا ہے مگر جاب کرنے والی کی عمر کا اندازہ لوگ اس کے تعلیمی سال کے ختم ہونے اور ملازمت کے شروع ہونے سے لگا لیا کرتے تھے۔
"اچھا۔۔۔ کالج میں پڑھاتی ہے؟"
رشتے کے لیے آنے والے لوگ بڑے اچنبھے سے دہراتے اور ان کا سارا اشتیاق وہیں ختم ہوتا محسوس ہوتا۔ جیسے کالج میں پڑھانے والی ضرور پینتیس سال سے اوپر اور چشمے والی، ڈائی شدہ بالوں والی خاتون ہوگی۔ ان کا دم خم باقی رہتا تو کیسے؟ اپنی شخصیت کی ساری کشش اور وقار۔۔۔ تعلیم۔۔۔ خاندانی پس منظر، اپنی ذاتی قابلیت۔۔۔ اپنی سمجھ بوجھ اور متانت۔۔۔ سب رخشندہ کو بے کار کی چیزیں لگنے لگا تھا۔۔۔ وہ اپنے مقابلے میں بھی ایسی اجڈ اور گنوار قسم کی عورت کو بھی رشک کی نظر سے دیکھنے لگتیں۔۔۔ جو اسے اپنی بیٹی کا رشتہ کہیں اچھی جگہ ہونے کی خوشخبری سنا رہی ہوتی۔
وہ رخشندہ جو رکھ رکھاؤ کے معاملے میں پورے خاندان کو مات کرتی تھیں۔ عرصہ ہوا انہوں نے کچھ کفایت شعاری کے نام پہ اپنے گھر کے طور طریقوں کو دوسروں کے لیے باعث مذاق بنا کے رکھ دیا تھا۔۔۔ یہ خیال آگیا تھا دل میں کہ شاید زیادہ جہیز کی وجہ سے ہی لوگ لالچ میں آجائیں۔ سو اسٹور میں رکھے بھاری

بیاں بھرتی گئیں، بینک میں تینوں کے نام سے کھولے اکاؤنٹ پھلتے پھولتے رہے جبکہ گھر کا بجٹ سکڑ کے ختم ہوتا چلا گیا۔
رخشندہ جو پروین اور شوکت جہاں تک کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر ان سے گفتگو کرنا وقت کے ضیاع کے سمجھا کرتی تھیں اور جن کے نزدیک ان سب کے اور ان کے ذہنی معیار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔۔۔ اب میں اور دور پرے تک کے رشتے داروں سے مراسم بڑھانے لگی تھیں۔ صرف بیٹیوں کے لیے رشتوں ہموار کرنے کے لیے، اگرچہ اس نئے نئے اختیار کیے چلن میں ایک اوپرا پن سا صاف نظر آتا تھا۔ لگاوٹ بات کرتے کرتے وہ اچانک چپ ہو جاتیں جیسے جی اکتا گیا ہو۔ یا الفاظ ذہن سے محو ہو گئے ہوں۔
خیریت سے گئی ہے بازار؟"
منٹ یونہی بیٹھے بیٹھے گزر گئے تو انہوں نے اگلا سوال کیا۔ بے تکا سا۔
"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" شوکت جہاں نے اون کے الجھے ہوئے ڈھیر میں سے گولے بناتے بناتے رک کر تعجب سے دیکھا۔
"بازار کوئی خیریت سے ہی جاتا ہے۔۔۔ خدانخواستہ خیریت نہ ہو تو بازار کیا خاک پھانکنے جائے گا۔"
"نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔" وہ خجل سی ہو گئیں۔
"یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔۔۔ بے کار کی مشقت۔"
انہوں نے بات پلٹی۔
"بے کار کاہے کی؟۔۔۔ جس کام سے دھیان ہٹ جائے۔ وقت کٹ جائے، وہ اچھا ہی ہے۔"
"لیکن اس کا کریں گی کیا؟ ہاتھ کا بنا سویٹر تو اب ہمارے بچے پہنتے ہی نہیں۔"
"تب ہی تو۔۔۔ یہ سارے پرانے سویٹر اسی لیے ادھیڑے ہیں۔ ویسے تو میں نے کبھی گھر پہ بے کار اور بے مصرف چیزیں نہیں رہنے دی ہمیشہ کسی نہ کسی ضرورت مند کو دے دی۔ لوگوں کا وتیرہ ہے۔ ایک بچے کے کپڑے، جوتے چھوٹے ہوئے تو سالوں تک سنبھال کے رکھ لیے کہ دوسرا اس جتنا ہو تو اس کو پہنا دیں اگر تو حالات اجازت نہ دیں اور اس عمل سے سہولت ملتی ہو تو تب تو جائز ہے لیکن بلاوجہ کی ذخیرہ اندوزی اللہ کو پسند نہیں۔"
"اس میں ذخیرہ اندوزی کی کیا بات اماں جان! میں خود ندا کے کپڑے ہما اور ردا کو پہناتی رہی ہوں۔"
"یہ تو ماشاء اللہ اوپر تلے کی ہیں۔۔۔ ایک کا اترا فوراً ہی دوسری کو آجاتا تھا۔۔۔ اس میں کوئی غلط بات نہیں۔ تم نے تو بیٹے کے کپڑے دس بارہ سال تک پیٹی میں سینت سینت کر رکھے کہ دوسری بار بیٹا ہوا تو اس کے کام آجائے گے۔ میں نے ہی کچھ سال پہلے واویلا مچا کے نصیبن کے پوتے کے لیے نکلوائے تھے۔ بعض عورتیں پھیل جاتی ہیں۔ اعلا جوڑے تنگ پڑ جاتے ہیں۔ انہیں کھول کر ناپ کے مطابق کرنے کے یا خود دبلی ہو کر ان کے ناپ کی ہو جانے کے بجائے موی کاغذوں میں لپیٹ کر الماریوں میں بند کر دیتی ہیں۔ بھئی ان دونوں کاموں میں محنت جو ہے سلے ہوئے جوڑے کو ادھیڑ کر دوبارہ سینا ایک مصیبت، ہمہ وقت چرتے ہوئے، جگالی کرتے ہوئے منہ کو قابو کرنا مصیبت۔۔۔ اس کے بجائے وہ کسی دن سکڑ جائے یا کپڑے پڑے پڑے بڑے ہو جائیں۔۔۔ اتنا کہ وہ کپڑے کسی اور کو دے دیے جائیں کئی بے چاریاں اچھا پہننے کی آس میں عمر گزار دیتی ہیں۔"
رخشندہ کو اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ یوں تو شروع سے ہی شوکت جہاں کو لمبی لمبی تمہیدیں باندھنے اور تفصیل بتانے کا شوق تھا لیکن عمر کے ساتھ ساتھ یہ عادت اور بھی پختہ ہو چکی تھی۔
"ہاں یہ تو ہے۔" انہوں نے بات سمیٹنا چاہی مگر وہ اور پھیل گئی۔۔۔ اب شوکت جہاں اصل موضوع کی جانب آئیں۔
"اسی لیے میرے گھر سے کبھی فالتو ساز و سامان نہ نکلا، نہ ہی بے کار کپڑے۔۔۔ ضرورت کی ہر چیز ہوا کرتی تھی آج کل کے زمانے میں جو سر گرائنڈر۔۔۔ ویسے ہی میں نے اناج تولنے کے لیے بڑا والا ترازو تک گودام

میں رکھا ہوا تھا۔ برتن اتنے تھے کہ سالگرہ اور عقیقہ یا میلاد، ختم شریف جیسے محدود پیمانے پہ ہونے والی تقریبات
کے لیے بھی برتن کرائے پہ نہ منگوائے گئے۔ آج کل جیسی شادیاں تھوڑا ہوا کرتی تھیں تب کہ کارڈ پہ شادی کی
تاریخ چھپوا کے مسٹر اینڈ مسز کے نام بھیج دی اور مہمان بھی ہاتھ ہلاتے شادی ہال یا ہوٹل میں وقت کے وقت پہنچ
گئے۔

ہفتوں پہلے برادری کے لوگ آنا شروع ہو جاتے تھے۔ گھر بھر جاتا تھا۔ آنگن میں بڑی بوڑھیاں بیٹھ کر گپیں لگایا
کرتیں۔ کوئی ٹولی بیٹھی جوڑے ٹانک رہی ہے کوئی دوپٹوں پہ کرن لگا رہی ہے۔ چند بیٹھی شادی پہ پکنے والے پلاؤ
کے لیے منوں چاول چُن رہی ہیں۔ لڑکیاں بالیاں ڈھولک بجا رہی ہیں۔۔۔ اتنے لوگوں کے لیے ہر وقت ڈھیر
سارے بستروں کا انتظام موجود رکھنا پڑتا تھا۔

شادیاں بھی تو سردیوں میں آتی تھیں۔ بڑی بڑی پیٹیاں اوپر سے نیچے تک لحافوں اور ریشمی غلاف والی
رضائیوں سے بھری رہتی تھیں، کئی کئی درجن تکیے۔ چادریں۔۔۔ اور سردیوں کے آنے سے پہلے ہر سال انہیں
دھوپ لگوانا، لحافوں، رضائیوں میں ڈورے ڈلوانا۔ یہ سارے کام۔۔۔ مگر کرنا پڑتا تھا۔ ہمیں تو اپنی ناک کٹتی محسوس
ہوتی تھی۔ ہمسائیوں کے گھر جا کے بستر اور برتن مانگتے ہوئے۔ مگر ان دو چیزوں کے علاوہ میں نے کسی چیز کا ذخیرہ گھر
میں نہیں ہونے دیا۔

دوپہر کا کھانا کبھی رات کے لیے نہیں رکھا۔ ہمیشہ ملازمہ کو ساتھ باندھ کے دے دیا۔ اللہ رکھے اتنا کچھ ہے گھر
میں۔۔۔ جب نئے سے نیا خرچا برداشت کیا جا سکتا ہے تو ایک بچے کی چیز دوسرے کے لیے کیوں رکھی جائے اور پھر
کوئی پتا تھوڑا ہی تھا کہ اس بار بھی بیٹا ہی ہوگا۔ اس لیے سراج دین کے سارے کُرتے شلواریں، سوئٹر۔ میں نے
ذرا سے تنگ ہوتے ہی کسی نہ کسی کو دے دیے۔ نئے نکور مہنگے والے کپڑے، کسی غریب ماں کو کیسی ٹھنڈ پڑتی ہوگی
اپنے بچے کو ایسے اچھے کپڑوں میں دیکھ کے۔۔۔ وہی دعائیں لگتی ہیں تو اللہ رزق اور کھول کے دیتا ہے۔ مسز ان
ان سے، اچھی چیزیں مل گئیں، یہ اس کا نصیب۔۔۔"

رخشندہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"پروین کھانا وغیرہ پکا کے گئی ہے؟ نہیں تو میں بھیج دوں؟" اس نے دوبارہ موضوع بدلنا چاہا۔

"پکا گئی ہے۔ پتہ تو ہے تمہیں کہ سراج دین کھانا ہمیشہ ساتھ لے کر جاتا ہے۔ پہلے تو صرف وہی کھاتا تھا
پرہیزی پھیکے کھانے۔ اب مجھے بھی کھانے پڑتے ہیں۔ بے چاری روز صبح جاگ کے چار چار کھانے پکاتی ہے۔"

"کوئی ملازمہ رکھ لیں اور کاموں کے لیے بھی تو ہیں۔"

رخشندہ نے دبے دبے اعتراض والے انداز میں کہا۔ انہیں پروین پر کبھی رشک آتا، کبھی حسد محسوس ہوتا۔ وہ تو تین
تین بیٹیوں کی ماں ہونے کی رعایت لے کر تقریباً "سارا کام ہی ملازماؤں سے کرواتی تھیں۔ کپڑے دھونے اور
استری کرکے الماریوں میں رکھنے کے لیے الگ ملازمہ، برتن دھونے اور کچن کے دوسرے چھوٹے بڑے کاموں
جیسے آٹا گوندھنا، سبزی کاٹنا وغیرہ کے لیے ایک ملازمہ اور صفائی کے لیے الگ جس سے رخشندہ بھی اپنے پورشن
کی صفائی کرواتی تھیں۔ البتہ باقی سب کام وہ خود یا بیٹیوں کی مدد سے کرتی تھیں۔ اگرچہ ان کی مرضی پہ
شاید ان کی کفایت شعار طبیعت بھی کسی دوسری ملازمہ کا خرچا برداشت نہ کرتی۔ لیکن چونکہ ساس کی جانب سے
یہ آرڈر پہلے صادر ہو چکا تھا کہ تین تین بیٹیاں گھر پہ ہونے کے بعد اتنی ملازمائیں رکھو گی تو لوگ بیٹیوں کو پھوہڑ اور
نکمی سمجھیں گے۔ اس لیے دل میں گلہ سا تھا ان کے لیے۔

"کھانا تو سراج اسی کے ہاتھ کا بنا کھاتا ہے۔" وہ مسکرائیں۔۔۔ اون کے گچھے پھر سے الجھ گئے تھے۔

"اوہو۔۔۔ باتوں میں دھیان ہی نہیں رہا۔" وہ جھنجلا کے سرا ڈھونڈنے لگیں۔ "ذرا دیکھنا تو۔۔۔ اس گولے کا
سرا کہاں الجھا ہے؟"

اور رخشندہ کو دھیان ہی نہ رہا۔۔۔ سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے پھر سے ایسا سوال پوچھ لیا کہ وہ جو اللہ اللہ

کرکے اس موضوع سے ہٹی تھیں۔ پھر سے وہیں آ گئیں۔

"آپ نے بھی کیا جھنجٹ پال لیا ہے۔ کرنا کیا ہے اس کا؟"

"وہی تو بتا رہی تھی۔" انہوں نے تمہید باندھنے کے انداز میں سانس بھری۔۔۔ اور رخشندہ کا اوپر کا سانس اوپر،
نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔

"بچے تو یہ سوئٹر پہنتے نہیں ہیں۔۔۔ نہ اپنے نہ ملازموں کے، نجانے پروین نے کب رکھے تھے یہ اسٹور میں۔ میں
کل پیٹی سے جانے اتروا رہی تھی تو کالے والے صندوق سے نکلے۔ بڑا کہا اسے کہ تو لے لے۔۔۔ مگر اس کے
بچوں کے بھی اپنے نخرے ہیں۔ لنڈے کے پہنیں گے مگر ہوں مشین والے۔ میں نے سوچا ان کو ادھیڑ کے اون دری
بنانے والے کو دے دوں۔ ایسی ایسی رنگین دریاں بنتا ہے وہ ہاتھ کی۔ فرش پہ بچھی ہوں تو فرش کی شان بڑھ جاتی
ہے۔"

"اچھا۔۔۔ چند ایک سوئٹرز اور شالیں میرے پاس بھی رکھی ہیں۔ وہ بھی لے لیجیے گا۔ میں خود ادھیڑ دوں گی۔
مجھے بھی دو تین دریاں بنوا دیں۔"

"مگر تم تو قالین اور دری وغیرہ نہیں بچھواتیں دمے کی تکلیف ہے نا تمہیں۔"

"بچیوں کے جہیز میں رکھ دوں گی۔ ماں کا دمہ وہ اگلے گھر ساتھ تو نہیں لے کر جائیں گی۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ پہلے وقتوں میں لوگ جہیز میں سوئی تک رکھتے تھے۔ میرے جہیز میں مجھے آٹا پیسنے کی چکی
بھی ملی تھی۔ سونے کے کیل گڑے تھے اس میں۔"

"سونے کے کیل۔۔۔؟"

"ہاں ہاتھ سے جھلنے والے پنکھوں سے لے کر چاندی کے چمچوں تک، مسہری اور چھپر کھٹ سے لے کر دوائن
کی ہی چارپائیوں تک، بھاری صوفوں سے لے کر لکڑی کی چوکیوں تک، فرانس سے منگوائے چینی کے ڈنر سیٹ
سے لے کر اٹک سے لائے پتھر کے سل بٹے تک۔ ہر چیز موجود تھی۔"

"میری ندا کے لیے بھی خیر سے ہر چیز موجود ہے۔"

رخشندہ تفاخر سے مسکرائیں۔ پھر ساتھ ہی ان کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"اور پتہ نہیں میں کب تک سنبھالتی رہوں گی۔"

شوکت جہاں کے متحرک ہاتھ تھم گئے۔

"ایسا کیوں سوچتی ہو۔۔۔ دیکھنا ندا کے لیے اللہ کیسا در کھولے گا اور ہماری بیٹی میں کسی چیز کی کمی ہے۔ ماشاءاللہ
حسن و سیرت دونوں میں لاجواب ہے اور پھر تعلیم۔۔۔"

"اور عمر بھی۔۔۔" رخشندہ نے دبے لفظوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا جس سے وہ نظر چراتی رہتی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ اگر میں اپنے وقتوں کے لحاظ سے دیکھوں تو عمر کچھ بڑھ گئی ہے مگر آج کے زمانے کے لحاظ سے دیکھا
جائے تو یہ عمر کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں اتنی تعلیم اٹھارھویں سال میں تو حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ہر دوسرے گھر میں
پچیس سے لے کر پینتیس سال تک کی کنواری بچیاں موجود ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا عام ہو چکا ہے کہ اتنی انہونی نہیں
لگتی۔"

"مجھے تو سوچ سوچ کے ہول اٹھتے ہیں۔ حالانکہ ندا ابھی ستائیسویں سال سے دو... ہے اور اللہ کرے عمر کے تیس
سال پورے کرنے سے پہلے پہلے وہ اپنے گھر کی ہو جائے۔"

"بیٹا۔ دعا مانگنے کے بھی سلیقے قرینے ہوا کرتے ہیں۔ یہ کہنے کے بجائے یہ دعا مانگو کہ جو ندا کے حق میں بہتر ہو
جب بھی بہتر ہو اللہ تب اس کے نصیب کھولے۔"

پھر ذرا توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"مگر بڑی بھی تو ہے اپنے حسن سے، ورنہ پروین کبھی بھی پیچھے نہ رہتی۔"

رخشندہ ذرا سا کسمسائیں۔۔۔ دل کی بات لبوں پہ آتے آتے رہ گئی۔ وہ اکثر یہ بات سن کر سوچ کر رہ جاتی تھیں کہ ندا تو حسن سے بڑی ہے مگر ردا اور ہما۔۔۔ ان ہی کے بارے میں پروین سوچ لے تو وہ آئندہ کی فکروں سے آزاد ہو جائیں۔

"ابھی بھی میں کہوں تو شاید نہ وہ بات ٹالے نہ میرا بیٹا۔۔۔ مگر عمر کا ذرا سا فرق بھی رشتے کا توازن خراب کر دیتا ہے۔ لڑکا عمر میں بھلے پندرہ سال بڑا ہو گزارا ہو جاتا ہے مگر لڑکی کا دو تین سال بڑا ہونا بھی بہت نمایاں ہوتا ہے خصوصاً" ان دونوں کے اپنے دل میں یہ خیال تقویت پکڑ لیتا ہے۔ بہت سی قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں دونوں کے رشتے میں۔"

"جی۔۔۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔"

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ دل تک آئی بات بے دھڑک ہو کر کہہ نہ سکیں۔ بیٹی کی ماں جو ٹھہریں۔ ان کے لیے لاکھ فکر مند سہی مگر اتنی بھاری تو نہ تھیں ہیرا سی بیٹیاں کہ ان کو خود ہلکا کرتیں۔

"تمہارے بھائیوں میں سے بھی کسی نے خیال ظاہر نہیں کیا؟"

یہ سوال شوکت جہاں پہلے بھی ایک آدھ بار کر چکی تھیں۔ بار بار یہ ذکر کر کے رخشندہ کو میکے کے حوالے سے شرمندہ کرنا مقصود نہ تھا بلکہ عمر نے ان کی یادداشت پہ عجیب و غریب اثرات مرتب کیے تھے۔ برسوں بلکہ نصف صدی پہلے کے واقعات ازبر تھے' جبکہ کل پرسوں کی بات بھول جاتی تھیں۔ ابھی بھی یہ سوال انہوں نے یہی سوچ کر کیا تھا کہ جیسے پہلی بار پوچھ رہی ہوں۔

"نہیں۔۔۔" وہ چور سی بن گئیں۔

"حیرت ہے۔ تمہارے دونوں بھائیوں کے بیٹے ندا سے بڑے تھے۔ دو بیاہ دیے ہیں نا انہوں نے؟ بھانجی کا حق پہلے تھا۔ مگر اب یہ سب کون سوچتا ہے؟"

"صرف عمر کا جوڑ برابر ہونے سے کیا ہوتا ہے اماں جان اور بہت کچھ دیکھا جاتا ہے۔ بڑے بھائی جان کے بچے تو بڑے ہی نالائق نکلے۔ کسی نے گریجویشن کر کے نہ دیا۔ بھابی ہی ہماری ماشاء اللہ اتنے گنوں والی تھیں' خاک تربیت کرتیں یا پڑھاتیں۔۔۔ رشتہ آ بھی جاتا تو میں کہاں دینے والی تھی اپنی اتنی قابل بیٹی۔۔۔ وہ بھی جانتے تھے اس لیے چپ رہے۔"

رخشندہ نے ظاہر ہے کہ بات بنائی۔ کچھ بھرم اپنا رہنے دیا' کچھ بھائی کا۔

"اور وہ دوسرے بھائی کے بیٹے' ایک ڈاکٹر ہے اور دوسرا باہر ہوتا ہے۔"

"ڈاکٹر تو ڈاکٹر سے ہی شادی کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے بھائی نے ابھی پچھلے دنوں ان کی منگنی کسی لیڈی ڈاکٹر سے کی ہے اور باہر کے لیے میں خود ہی تیار نہیں۔ بھائی نے تو ہلکا سا ذکر کیا تھا مگر میرے حوصلہ افزا جواب نہ دینے پہ چپ سادھ لی۔ بچیاں پال پوس کے انہیں رخصت کرنے کا حوصلہ تو کر لیتے ہیں ماں باپ۔۔۔ میں نے بھی کر لیا ہے مگر سات سمندر پار تو کبھی نہ بھیجوں۔"

انہوں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ ورنہ بیٹی کو دلہن بنا دیکھنے کی خواہش ایسی شدید تھی کہ سات تو کیا دس بارہ سمندر پار بھی بھیجنے کو تیار تھیں۔

"پھر تو بس چکا لڑکی کا گھر۔۔۔" شوکت جہاں نے گھر کا۔ "دیکھو رخشندہ۔۔۔ میں کرتی ہوں سچی بات اور سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔ تمہیں بھی کڑوی لگے گی لیکن تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں نے کبھی کسی کے معاملے میں غیر ضروری دخل بھی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ تمہارے یعنی بیٹے اور بہوؤں کے معاملے میں بھی نہیں۔ یاد کرو اپنی بہن کے بارے میں بھی تمہارے اور تمہاری اماں مرحومہ کے یہی خیالات ہوا کرتے تھے۔ میں سن لیا کرتی تھی اور چپ رہا کرتی تھی کیونکہ یہ تمہارے میکے کا معاملہ تھا۔ مگر ہوا کیا' بیٹھی ہے نا اب تک تمہاری بہن بھائی کے گھر۔ جوانی برباد ہونے کو آئی۔۔۔ اب معاملہ پوتی کا ہے اس لیے بول رہی ہوں ورنہ مقصد تمہیں غلطی کا احساس دلانا نہیں

اس وقت سے ڈرو رخشندہ! بیٹیاں امانت ہوتی ہیں۔ بڑا قرض ہوتا ہے ماں باپ کے سر پہ کہ اچھے وقت پہ ادا کر دیا جائے۔ تم نے اعلا تعلیم دلائی' اچھی تربیت دی۔ اب اصل فرض سے نظریں نہ چراؤ اور ایسے بے جا کھسیڑے مت نکالو' سات سمندر پار بھیجنے سے کون سا آسمان گر پڑے گا' خدانخواستہ غیر ہوں تو بے شمار بیٹیوں میں کیڑے پڑے ہوتے ہیں۔ اپنا لڑکا کیا سات سمندر پار لے جا کر قید کر دے گا؟"

رخشندہ چپ چاپ بیٹھی ساس کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہیں۔ ناگواری کا ہلکا سا احساس بھی کہیں دور دور تک نہیں تھا۔ اس کے برعکس طمانیت محسوس ہو رہی تھی یہ سوچ سوچ کر کے ندا کا رشتہ اب تک نہیں ہو پا رہا اس کا الزام ان کی کوتاہ بینی پہ آ رہا ہے۔ کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کم از کم۔۔۔ کہ ندا میں ہی کوئی کمی ہے' جو اب تک اس کے رشتے کی بات نہیں بڑھ سکی۔

☆ ☆ ☆

تقدیس اور سوہا میں کچھ بھی تو ایک جیسا نہیں تھا مگر پھر بھی دونوں میں ان کی دوستی سالوں کا فاصلہ طے کرنے لگی۔

محبت کے لیے تو یہ کلیہ مستند جانا جاتا ہے کہ دو مخالف مزاج رکھنے والے لوگ ایک دوسرے میں کشش محسوس کرتے ہیں لیکن دوستی تو ہمیشہ ہی مزاج کی موافقت پہ جڑ پکڑتی ہے اور یہاں۔۔۔

"سب سے بڑی تحریم آپی ہیں۔۔۔ مجھ سے بالکل الگ۔۔۔ کچھ کچھ ماما جیسی البتہ ماما اس بات کو نہیں مانتیں۔ ان کا خیال ہم تینوں میں سے کوئی بھی ان پہ نہیں گیا اور پتہ ہے پاپا کو بھی یہی شکایت ہے کہ تینوں میں سے ایک بیٹی نے بھی ان کی کوئی عادت نہیں لی جبکہ مجھے خود میں' تطہیر میں اور تحریم آپی میں ماما پاپا دونوں کی تھوڑی جھلک محسوس ہوتی ہے۔"

وہ مزے سے بتاتی جا رہی تھی۔ سوہا کے پوچھے بغیر اور آہستہ آہستہ خود ہی دلچسپی لینے پہ مجبور ہو گئی۔

"مثلاً"۔۔۔؟"

"مثلاً" تحریم آپی دیکھنے میں ماما جیسی ہیں سو ایسی ہی گداز' ویسی ہی سادہ۔۔۔ اور طبیعت کا "خفیہ پن" پاپا سے لیا ہے انہوں نے۔"

"خفیہ پن؟" وہ کھل کے ہنسی۔ "یار عجیب عجیب سے لفظ نکالتی ہو تم۔"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے کبھی پاپا کو دل کی بات کسی سے کرتے نہیں دیکھا۔ ماما سے۔۔۔ اپنی ماما یعنی دادی جان سے۔ کسی بہن بھائی یا کسی دوست تک سے نہیں' بالکل یہی عادت تحریم آپی میں ہے اور تطہیر وہ پاپا کی طرح ہے۔ یعنی ان ہی کی طرح کتابی کیڑا۔۔۔ وہ بھی کتابیں پڑھنے کے شائق ہیں اور تطہیر بھی یعنی کہ دونوں کی کھانے پینے کی عادتیں بھی ایک جیسی ہیں' بے تحاشا چائے پینے کے عادی۔۔۔ میٹھے سے دور بھاگتے ہیں۔ وقت پہ کھانا چاہیے ورنہ بھوک ہڑتال۔۔۔ اور ماما کی طرح وہ کچھ بے دھڑک مزاج کی ہے۔ ماما کے بھی جو دل میں آتا ہے فوراً" کہہ دیتی ہیں' چاہے سامنے والے کو برا ہی کیوں نہ لگے۔ یہی بد لحاظی تطہیر میں بھی ہے بلکہ ماما سے کچھ بڑھ کے۔"

"اور تم۔۔۔؟"

"میں۔۔۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "مجھے کبھی کبھی لگتا ہے میں بالکل پاپا جیسی ہوں۔ کبھی کبھی لگتا ہے نہیں ماما کا پر تو ہوں اور کبھی۔۔۔ کبھی لگتا ہے جیسے ان دونوں سے میں نے کچھ نہیں لیا۔"

پھر وہ سوہا کی جانب متوجہ ہوئی۔

"تم نے کبھی اپنے گھر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کتنے بہن بھائی ہو؟"

"اکیلی ہوں۔"

"اکیلی نہیں۔۔۔ اکلوتی کہتے ہیں۔" تقدیس نے تصحیح کی۔ "تبھی اتنی نخریلی اور اکھڑی سی ہو اور موڈی بھی۔۔۔" چند ہفتوں کی دوستی میں وہ اس کے مزاج کے سارے رنگ جان گئی تھی۔

"تم تو بہت خوب لاڈلی ہو گی اپنے پیرنٹس کی؟"

"میرے پاپا کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

سوہا نے بے تاثر چہرے کے ساتھ سامنے تکتے ہوئے کہا اور مٹھی بھر کے گھاس زمین سے نوچ ڈالی۔

"اوہ... سوری..." تقدیس کو حقیقتاً افسوس ہوا۔

"اپنے نانا نانی کے ہاں رہتی ہو ماما کے ساتھ؟"

اس نے وہی اندازہ لگایا۔ جو عموماً ایسے کیسز میں ہوا کرتا ہے۔

"نہیں' وہ میرے پیدا ہونے سے پہلے گزر چکے تھے۔"

"اوہ... پھر دادا' دادی...؟"

"وہ میرے پیدا ہونے کے بعد گئے۔" پھیکی سی ہنسی کے ساتھ اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

ہمیشہ کی نرم دل' ہمدرد طبیعت تقدیس ایک سرد آہ بھر کی رہ گئی... اس کے سامنے جیسے سوہا کا سارا بچپن پھر گیا۔ نہ ددھیال... نہ ننھیال... ایک جوان بیوہ عورت... ایک چھوٹی تنہا بچی... اگرچہ سوہا کو دیکھ کے اس کے مالی طور پر بے حد مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ کا پتا چلتا تھا' اس کے باوجود وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس کی مدر کو اس تمام عرصے میں کیا کیا مشکلات پیش آئی ہوں گی اور وہ جو پچھلے ایک ہفتے کے دوران سوہا کی چند عادتیں... چند باتیں اسے کھٹکی تھیں' ان کا سہرا بھی اس نے اسی ایک وجہ پہ باندھ دیا۔

"شخصیت میں توڑ پھوڑ تو ہونا ہی تھی... آخر بچپن میں یہ سب سہنا پڑا۔"

اس نے از خود فرض کر لیا اور بڑی ہمدردی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی۔

"میں سمجھ سکتی ہوں لیکن تمہیں اداس نہیں ہونا چاہیے۔ فخر کرنا چاہیے کہ تمہارے پاس ایسی ماں ہیں' جو تن تنہا تمہاری پرورش کرنے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔"

سوہا نے چبھتی نظروں سے تقدیس کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر زہر کی اوس میں بھیگی مسکراہٹ آگئی۔

کڑوی کڑوی... کسیلی کسیلی سی مسکراہٹ۔

"بے شک انہیں کوئی فنانشل کرائسس سے نہ گزرنا پڑا ہو گا لیکن پھر بھی ایک عورت کے لیے کسی کی مدد کے بغیر خود سروائیو کرنا کسی کارنامے سے کم نہیں۔"

"کارنامہ...؟" کڑوی کسیلی مسکراہٹ زہر اگلتے قہقہے میں بدل گئی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔" تقدیس متعجب ہو گئی۔

"آج تمہیں یہ بات معمولی لگ رہی ہے لیکن سوچو تو غیر معمولی ہے۔ تم نے کتنی آسانی سے کہہ دیا ناکہ تم نہ نانا' نانی کے پاس رہتی ہو اور نہ دادا' دادی کے پاس... لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ بتاتے ہوئے تمہارا دل احسان مندی کے بوجھ تلے دبا ہوتا۔ تمہاری ماما نے تمہیں اس بوجھ سے بچایا ہے۔"

"میرے پاپا کی ڈیتھ کے فوراً بعد دوسری شادی کر کے؟"

اس نے اتنا اچانک یہ کہا کہ تقدیس چپ کی چپ رہ گئی۔ اس بار اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ دوپٹہ دیکھیں کیسا خوب صورت بارڈر ہے۔" پروین نے شوکت جہاں کی آنکھوں کے سامنے دوپٹہ پھیلایا۔

"ہوں... اچھا ہے۔"

"اور کپڑا تو ہاتھ میں پکڑ کے دیکھیں کیسا نفیس ہے۔ ویسے تو میں آپ کے لیے ہمیشہ ہی بڑھیا سے بڑھیا کپڑا لیتی ہوں کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ آپ کو زیادہ جوڑے سلوانے کی نہ عادت ہے نہ شوق... کم سلواتی ہیں مگر اچھے سلواتی ہیں۔ رنگ آپ کی پسند کا ہے نا؟"

"ہاں... اچھا ہے۔"

ذرا اٹھکیں۔

خلل ہوں' ہاں میں جواب دے رہی تھیں حالانکہ ہمیشہ ہی ان کی خریداری میں بے حد دلچسپی لیا کرتی کسی زمانے میں ساس بہو یہ کام اکھٹے کیا کرتی تھیں۔ باہمی مشورے کے ساتھ اور اس سے بھی پہلے یہ کام نے کے لیے شوکت جہاں پروین کو ساتھ لیے پھرتی تھیں تاکہ انہیں گھر کے ہر فرد کے مزاج' عمر اور ضرورت مطابق شاپنگ کا سلیقہ سکھا دیں۔ چند ہی برسوں میں پروین شاپنگ کے فن میں طاق ہو گئیں اور شوکت جہاں کے لیے ان ہی پہ انحصار کرنے لگیں۔ اب عمر کے اثرات نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ خود تو جانہ پاتی تھیں کے ساتھ مگر اس کی شاپنگ ذوق و شوق سے دیکھا کرتیں۔

"کیا بات ہے اماں جان' طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"الحمدللہ..." انہوں نے بشاشت دکھانا چاہی۔

"اور یہ شیفون کے سوٹ اپنے لیے لائی ہو؟"

"ہاں جی... دونوں خود لیے ہیں اور یہ..."

فیروزی مرد رنگ کا کچھ کچھ فینسی سوٹ دکھاتے ہوئے وہ اس عمر میں بھی نو بیاہتاؤں کی طرح تھوڑی سی لجا گئیں۔ "اگلے جمعہ کو ہماری شادی کی سالگرہ آرہی ہے تو انہوں نے کچھ پیسے الگ سے دیے تھے کہ اپنے لیے کوئی اچھا سا لے لینا۔ میری طرف سے۔"

"اچھا..." شوکت جہاں کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ چلو دیر سے ہی سہی۔ پتھر کو جونک تو لگی... وہ مسکرا اٹھیں۔ بے ساختہ ان کا ہاتھ پروین کے سر کی جانب چلا گیا' جو بڑی مطمئن سی مسکراہٹ لیے سوٹ تہہ کرتے ہوئے واپس شاپنگ میں رکھ رہی تھیں۔

"اور یہ ایک ایک سوٹ میں نے بچیوں کا لیا ہے۔" شوکت جہاں سمجھ گئیں۔ بچیوں کا لفظ وہ جیٹھ کی تینوں بیٹیوں کے لیے استعمال کیا کرتی تھیں۔

"ویسے تو آج کل کی لڑکیاں زیادہ تر سوتی جوڑے پہننا پسند کرتی ہیں اور وہ بھی بازار کے سلے سلائے۔ بوتیک کے ریڈی میڈ لیکن اس میں شاپنگ کا مجھے خاص تجربہ نہیں ہے۔ نجانے کسی کو پسند آئے یا نہ آئے۔ اسی لیے یہ شیفون کے لے آئی... بریزے سے لیے ہیں۔"

"نہیں خیر۔ رخشندہ نے بچیوں کو سب کچھ سکھایا ہے بوتیکوں کے مہنگے مہنگے کپڑے وہ بھی کہاں پہنتی ہیں۔ ہاں ندا کہیں سیل سے لے آئے تو لے آئے ورنہ تمہیں تو پتہ ہے رخشندہ نے ہمیشہ خود اپنے ہاتھ سے سی کر پہنائے ہیں تینوں کو اور ایسے ایسے خوب صورت کہ لوگ رک رک کر پوچھتے تھے کہاں سے لیا ہے یہ فراک...؟ اب خود نہیں سیتی مگر دیکھ لو... اپنا ہنر ہما تک کیسا منتقل کیا ہے۔ اب اس کے ہاتھ میں کمال کی صفائی ہے۔ میرا پچھلی عید کا جوڑا ایسا کمال کا سیا ہے ورنہ میں تو پچیس سالوں سے سوائے اقبال بیگم کے ہاتھ کی سلائی کے اور کسی سے مطمئن ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے آنکھوں کا آپریشن کرایا اور میرے ہاتھ پیر پھولے کہ اب نئی درزن یا درزی کہاں سے ڈھونڈوں... میرے دل ٹھکتا ہی نہیں کسی پہ... مگر ہما... واہ..."

"ہما ہے ہی بہت سگھڑ... سلائی کے معاملے میں ہی ہاتھ صاف نہیں ہے' ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت ہے... سلیقہ بھی ہے۔"

"لیکن اس کے ماموؤں کو یہ سب نظر نہیں آیا۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"دونوں ہی باہر سے بہوویں لے آئے۔"

"ہاں لیکن ہما..." پروین کچھ متذبذب ہوئیں۔

"ہما سے پہلے تو ندا ہے نا... اور ندا... ہاں ویسے ندا کے لیے تو سوچنا چاہیے تھا انہیں۔"

"اب وہ دور نہیں رہا کہ بڑی کی وجہ سے چھوٹی کو بٹھا کر رکھا جائے۔ خصوصاً دو کے معاملے میں اتنی کڑی

روایت پہ عمل کرنا بے کار ہے۔ ہاں چار پانچ ہوں اور پہلی کو چھوڑ کر چوتھی یا پانچویں بیاہ دی جائے تو ذرا عجیب سا لگتا ہے لیکن ندا ماشاءاللہ ہما اور ردا دونوں سے زیادہ خوب صورت اور تعلیم یافتہ ہے۔ سرکاری ملازم بھی ہے۔ قدرت کی جانب سے کوئی بندش ہے ورنہ کمی تو کوئی نہیں اس میں۔ شاید اللہ کی کوئی مصلحت ہو اس میں لیکن میرا ایمان ہے اس کے لیے جب بھی کوئی رشتہ آیا لاکھوں میں ایک ہوگا۔ بڑی روشن پیشانی ہے اس کی۔"

"ان شاءاللہ۔۔۔" پروین نے صدق دل سے کہا۔

"لیکن اس وقت تک کے لیے ہما کو بٹھائے رکھنا سمجھ میں نہیں آتا۔ یہی میں رخشندہ سے بھی کہہ رہی تھی کہ کوئی اچھا رشتہ آئے تو یہ بات رکاوٹ نہ بننے دینا کیونکہ ہما بھی ماشاءاللہ پیاری شکل و صورت کی ہے لیکن ندا کے مقابلے میں دبتی ہے۔ کچھ کاٹھی اس کی ایسی ہے کہ عمر سے بڑی لگتی ہے۔ بالکل ندا کے برعکس۔۔۔ جیسے کہ وہ عمر کے چھبیسویں، ستائیسویں سال میں۔۔۔ لیکچرر بننے کے بعد بھی اکیس بائیس سے زیادہ کی نہیں لگتی اور ہما ہے ہی بائیس برس کی۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ اگلے پانچ سال بعد وہ بائیس کی بھی لگے گی۔ وہ شاید تیس کی لگنے لگے۔ ندا لاابالی ہے۔ ہنستے کھیلتے مزاج کی اور ہما شروع سے سنجیدہ اور حساس ہے۔ اس لیے ڈر ہے بڑھتی عمر کے اثرات اس پہ جلد نمایاں ہوں گے ہاں اللہ کرے اپنے گھر میں ہنس بس جائے تو بچیوں کی عمر رک جاتی ہے۔ خوشحالی کا نور اور جوبن ہی الگ ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔۔۔" وہ متفق ہوئیں۔

"پھر کیا کہا رخشندہ نے؟"

جواب میں شوکت جہاں بوجھل نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیا کہتی بے چاری۔۔۔ یہی کہ رشتے آتے ہی نہیں تو کیا فیصلہ کیا جائے۔ نہ ندا کا، نہ ہما کا، نہ ردا کا، کسی ایک کا بھی آجائے تو راستہ کھلے۔"

"یہ تو واقعی فکر والی بات ہے اور اماں جان! مجھے تو ایک ڈر اور بھی رہتا ہے۔۔۔ رخشندہ بھابی کی جب شادی ہوئی تو ان کی عمر بھی تب اچھی خاصی تھی اور ان کی چھوٹی بہن اب تک کنواری ہے۔ اب تو خیر بڑھاپے کی دہلیز تک آن پہنچی۔ کہیں یہی اثرات خدانخواستہ بچیوں تک۔۔۔"

"کیسی جاہلانہ باتیں کر رہی ہو پروین۔"

شوکت جہاں نے بلاتوقف ٹوک دیا۔

"ہر کسی کا اپنا نصیب ہے۔ کسی کی قسمت کے اثرات کسی دوسرے پہ کیوں ہونے لگے - یہ تو توہم پرستی اور کمزور عقیدے کی نشانیاں ہیں۔"

"توبہ توبہ۔۔۔ واقعی۔۔۔" وہ فوراً متفق ہوگئیں اور یہی ادا ان کی تھی جو شوکت جہاں کو سب سے زیادہ بھاتی تھی۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں ہچکچاتیں نہ ہی شرمندگی کا اظہار کرنے میں دیر لگاتیں۔

"میں کہوں۔۔۔" اشارے کنائے میں بات بنتی نہ دیکھ کر بالآخر انہوں نے واضح کہنے کی ٹھانی۔

"میں کہوں۔۔۔ کیوں نہ تم ہی پہل کرلو۔"

"کس معاملے میں اماں جان؟" وہ بھول پن سے پوچھنے لگیں تو انہوں نے ایک خفگی بھری نظر ان پہ ڈالی۔

"نہ جانے کون بیبیاں ہیں جو اشارے کنائے اور رمزیں تک بھانپ لیتی ہیں۔" انہوں نے پہلے تو چشم کا پھر ذرا اور پاس سرک کر رازداری سے کہا۔

"ہما کے معاملے میں۔۔۔"

پروین حق دق ساس کا چہرہ تکنے لگیں۔

بات سمجھ میں آگئی تھی۔ مگر حیرت کا جملہ بھرپور تھا۔

"ندا حسن سے بڑی سہی۔۔۔ چاہے سال بھر ہی کا فرق ہے مگر ہے تو سہی۔ خاندان میں ایسی باتیں سب کے علم

میں ہونے کی وجہ سے زیادہ اچھالی جاتی ہیں جس سے میاں بیوی کے مابین تلخی کو ہوا ملتی ہے اس لیے میں ذاتی طور پہ تنہا سال دو سال کے فرق کو اہمیت نہ دینے کے باوجود اس رشتے پہ تیار نہیں۔ جب ہی ہلکا سا اشارتاً بھی نہیں کہا تم سے لیکن ہما تو حسن کے لیے بے حد مناسب رہے گی۔"

"واقعی۔۔۔ اس بارے میں تو کبھی میں نے۔۔۔ بلکہ کسی نے بھی سوچا تک نہیں۔"

پروین نے حیرت کے جھٹکوں سے سنبھلتے ہوئے کہا اور ان کے لہجے کی خوشگواری محسوس کرکے شوکت جہاں نے ہلکے پھلکے ہوتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

"میں نے تو کئی بار سوچا۔۔۔ کئی سالوں سے سوچ رہی تھی۔ ہاں مگر کہا نہیں۔"

"کیوں اماں جان؟"

"بس یہی سوچتی رہی کہ اولاد پہ حق ماں باپ کا ہوتا ہے اور ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار بھی سب سے زیادہ ان ہی کا ہوتا ہے۔"

"یہ کیا بات کی آپ نے۔۔۔؟ ہم سب آپ کی اولاد ہیں۔ ہم بھی ہمارے بچے بھی۔ آپ کا حق اس گھر کے ہر فرد پہ، ہر فرد سے زیادہ ہے۔"

انہوں نے ساس کے ہاتھ تھام کر اپنی نم ناک آنکھوں سے لگاتے ہوئے صدق دل سے کہا۔

شوکت جہاں کا مان کئی گنا بڑھ گیا۔

لیکن وہ ان ماؤں اور ساسوں میں سے نہیں تھیں، جو خود کو ملی عزت، مان اور اختیار کا کھل کے فائدہ اٹھاتی ہوں اس لیے رسانیت سے کہنے لگیں۔

"میرے کہنے پہ تم اور سراج فوراً رشتہ لے کر اوپر چلے جاتے اور یہی میں نہیں چاہتی تھی کہ تم یہ فیصلہ صرف میری خواہش کے احترام میں کرو۔ میں چاہتی تھی کہ تمہارے دلوں میں خود ہما یا ردا کے لیے خواہش پیدا ہو۔۔۔ ابھی بھی اگر میں نے بہت مجبور ہو کر یہ بات کی ہے تو صرف تمہارا دھیان اس جانب دلانے کے لیے میری جانب سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اسے تم صرف ایک رائے سمجھو۔ یا پھر ایک گزارش کہ حسن کے بارے میں سوچتے ہوئے میری پوتیوں کو بھی نظر میں رکھنا۔"

"خدا کے لیے اماں جان!"

پروین آبدیدہ ہوگئیں۔

"ایسے تو نہ کہیں۔۔۔ آپ کی پوتیاں ہماری بھی کچھ لگتی ہیں۔ مجھے تو شرمندگی ہو رہی ہے یہ سوچ کر کہ آپ کو یہ بات اتنے انتظار کے بعد کہنا پڑی۔ یقین کیجیے ہمیں بھائی جان کی بچیوں سے پیارا کوئی نہیں لیکن شاید میں یہ بھول چکی تھی کہ وہ میری بیٹیاں نہیں ہیں بھتیجیاں ہیں اس لیے ہونے والی بہو کے طور پہ کبھی سوچا ہی نہیں۔ ہمیشہ ان کی شادی اور رشتوں کے لیے رخشندہ کے ساتھ مل کر فکر مند ہوتی رہی، یہ خیال کبھی نہ آیا کہ انہیں رخصت کرانے کی فکر کرنے کے بجائے لے کر آنے کا سوچوں میری طرف سے تو کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے بھلا ہما سے اچھی بہو کون ملے گی۔"

"اور سراج۔۔۔ اس سے تو پوچھنا ہوگا۔"

ان کے اندر دبے دبے اندیشے نے سر اٹھایا۔

"آپ کے بیٹے ہیں، اتنا بھی نہیں جانتیں ان کے بارے میں، ایسی باتوں کی طرف میرا دھیان کم کم جاتا ہے اتنے سالوں کی بیاہتا اور گھرہستی ہونے کے باوجود وہ تو پھر مرد ہیں۔ کاروبار کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں۔ دیکھیے گا یہ بات سنتے ہی اچھل جائیں گے۔ خوشی کے مارے۔"

آخری الفاظ انہوں نے ذرا وقفے سے کہے اور خود ہی مزا لیتے ہوئے ہنس دیں۔

شوکت جہاں کو اپنے شانوں سے کوئی بھاری بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا، جو رخشندہ کی پژمردہ حالت دیکھ کر خود بخود ان پہ آن بیٹھا تھا۔

اب وہ پھر سے پرانے ذوق و شوق کے ساتھ اس کی شاپنگ کھنگالنے لگیں۔
”یہ گلاس تو بالکل نئے ڈیزائن کے ہیں۔“
”جی اماں جان... تین سو کا ایک پڑا ہے۔“
”میرے خدا... اتنے مہنگے... اچھا سنو۔ میں پچھلی بار بھی پوچھتے پوچھتے رہ گئی تھی... اب تم ہر بار خریداری میں ایک فرد کو بھول جاتی ہو... ایسا کیوں؟“
”کون...؟ میاں صاحب کے کرتے لائی تو ہوں... اور یہ بنیانیں... اور...“
”میں سراج کی بات نہیں کر رہی۔“
”ارے اماں جان! اڑکے اب کہاں میری پسند کا لایا پہنتے ہیں، اب کی بات تھوڑا ہی ہے... سالوں ہو گئے۔“
”میں وشمہ کی بات کر رہی ہوں۔“
”وشمہ...؟“ پروین جو ڈبے کا ہوا جوڑا کھول کر دوبارہ کتے ہوئے لپیٹ رہی تھیں، چونک گئیں۔
”مجھے یاد ہے جب سے وہ پیدا ہوئی، تم باقاعدگی سے اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتی رہتی تھیں۔ حالانکہ تب سراج کا مزاج ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ خواہ خواہ کا بیر تھا اسے اس معصوم بچی سے... پھر بھی تم اپنی جانب سے پھوپھی ہونے کا فرض ادا کرتی رہیں۔ اس بن ماں کی بچی کی ضرورتوں اور خواہشوں کا دھیان رکھتے ہوئے اور اب جب سراج بھی خاصا بدل گیا ہے۔ مین میخ نکالنے کی عادت کافی حد تک ترک کر چکا ہے۔ تم اپنی یہ روش کم کرتے کرتے تقریباً چھوڑ چکی ہو... کیوں؟“
”اماں جان... اس کا خیال رکھنے کو اس کی ماما ہے نا... ہمیں وہ سمجھتی ہی کیا ہے؟“
وہ اداسی سے کہنے لگیں۔
”ایسا تو مت کہو۔ بڑی باادب اور تمیز والی بچی ہے۔“
”یہ تو ہے... مگر منزہ بھابی سے زیادہ اہمیت کسی کو نہیں دیتی۔“
”تمہارے بچے بھی تو تم سے زیادہ اہمیت کسی کو نہیں دیتے ہوں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔“
”لیکن وہ اس کی ماں تو نہیں ہے۔ ہم زیادہ سگے ہیں۔“ پروین جھنجلا اٹھیں۔
”ہم کون...؟“
”ہم یعنی... میں... پھوپھی اور اماں دادی۔“
”بہن جی تو رہیں نہیں... تم پھوپھی ہو مگر اپنے گھر بار اور بچوں والی... اگر وہ منزہ کو سگی ماں اور منزہ اسے سگی اولاد سمجھتی ہے تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی تو تم زیادہ دکھی ہوتیں۔“
”نہیں اماں جان! مجھے اعتراض ان دونوں کے رشتے کی نوعیت پہ نہیں۔ دراصل ایک عجیب سا احساس ہے جو بس کچھ ہے... اماں جان... جو بری طرح محسوس ہوتا ہے مگر بیان نہیں کیا جا سکتا۔“
پروین کی حسیات اتنی تیز نہ سہی۔ مگر بہرحال تھیں تو سہی۔ اس لیے اس گڑبڑ کو وہ بھانپ رہی تھیں۔ صرف نشاندہی نہ کر پا رہی تھیں۔ اسی لیے دانستہ نادانستہ وہ اپنے آپ کو سمیٹ رہی تھیں۔ وہاں جانا نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا کیونکہ ہمیشہ وہاں جا کے اسی الجھن میں گرفتار ہو جاتی تھیں۔
”جو بھی ہے تمہارا اور اس کا رشتہ تو ہے۔ اس سے پیچھے نہ ہٹو۔ کل یا پرسوں جا کے مل بھی آؤ اور ان میں سے ایک جوڑا اس کے لیے لے جاؤ۔“
”جی اچھا...“

✡ ✡ ✡

”ارے نہیں یار... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“
سوہا نے تقدیس کی بات پہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

میرا دوست ہے... بس...“
سوہا... چاہے تم مجھے بیک ورڈ سمجھو... یا کنزرویٹو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ لڑکا اور لڑکی کبھی بھی دوست نہیں ہو سکتے۔“
نے ”صرف“ پہ خاصا زور دیا تھا۔
مانتی ہوں۔“ خلاف عادت وہ تائید میں سر ہلانے لگی۔
مجھے اس بات کا کیونکہ وصی سے پہلے بھی میری کئی لڑکوں سے دوستی رہی لیکن اس دوستی سے میرے لیے یہی تھی کہ وہ اس دوستی کو ڈیزرو نہیں کرتے تھے۔ انہیں واقعی ”صرف“ دوستی نہیں چاہیے سب سے الگ ہے۔ اس کے ساتھ ہوتے ہوتے مجھے کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ لڑکا میں لڑکی ہوں۔ ان فیکٹ... اتنا زیادہ کمفرٹ ایبل تو میں تمہارے ساتھ بھی محسوس نہیں کرتی۔“
بات کو ٹالنے کی خاطر مسکرا کے بولی۔
مان لیتی ہوں۔ ورنہ مجھے دال میں کچھ کالا کالا لگ رہا تھا۔“
فارگیٹ اٹ یار... وصی بہت نائس بندہ ہے۔ اور مجھے بہت پسند بھی ہے لیکن — وہ میرے ٹائپ کا نہیں میرا مطلب دوستی کے لیے انسان کے اسٹینڈرڈز اور ہوتے ہیں لیکن رومانس کے لیے اور وصی میرا رائٹ نہیں ہے۔“
تمہارا بھی کوئی آئیڈیل ہے؟“
تقدیس نے دلچسپی سے پوچھا۔
آف کورس... یار میں نارمل ہوں۔“
ہمارا تو میں بھی ہوں لیکن میرا کوئی آئیڈیل نہیں ہے۔“
تقدیس نے شانے اچکائے۔
جھوٹ مت بولو یار... امپاسبل...“
کیوں؟“
لائف پارٹنر کے لیے تم نے کوئی خاکہ تو کھینچ رکھا ہو گا ذہن میں... یا مدر ٹریسا بننے کا ارادہ ہے؟“
نالکل...“ وہ سوچنے لگی۔
پتہ نہیں... میں ارینج میرج پہ یقین کرتی ہوں۔“
اچھی رہو... مگر ارینج میرج ہی سہی... کچھ تو سوچا ہو گا کہ کاش میرے پیرنٹس میرے لیے ایسا لائف پارٹنر تلاش کریں۔“
کیا فائدہ ایسا سوچنے کا... جب پیرنٹس کے ہاتھ میں اختیار دے ہی دیا تو الٹی سیدھی توقعات باندھنے سے کیا حاصل؟ اگر زندگی میں آنے والا تصورات کے بالکل برعکس نکلا تو سوائے مایوسی کے اور کیا ہاتھ آئے گا۔ اس لیے خالی ذہن رکھنا بہتر ہے۔“
مجھے تو اس سوچ سے ہی گھٹن ہوتی ہے۔“
سوہا کو گھبراہٹ نے آن گھیرا اور وہ جھرجھری لے کر کہنے لگی۔
کیسے؟ ارینج میرج کے خیال سے؟ یعنی تم لو میرج پہ یقین کرتی ہو؟“
میں صرف اس بات پہ یقین رکھتی ہوں کہ انسان کو اپنی پسند اور معیار پہ کبھی کمپرومائز نہیں کرنا چاہیے، ناشتے میں لینے والے سیریل سے لے کر سر پہ لگانے والے کلپ اور پیر میں پہننے والی چپل تک، اور یہ تو پھر لائف کا سوال ہے۔ ضروری نہیں کہ میں لو میرج ہی کروں... میں تو ایک Possibility کی بات کر رہی ہوں۔ اگر ساری عمر کسی کے لیے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہ جاگا تو کنواری تو مرنے والی نہیں میں۔“
وہ خوامخواہ ہنسنے لگی۔

"لیکن ارینج میرج میں بھی میں کم از کم اپنی پسند اور معیار تو سامنے رکھ ہی سکتی ہوں۔ تم یہ کیوں سمجھتی ہو ارینج میرج کے لیے پیرنٹس کے سامنے سرنڈر کرنا ضروری ہے۔ تم انہیں یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے لائف پارٹنر میں کیا دیکھنا پسند ہے۔ اس میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ دیکھنے میں کیسا لگتا ہو، کس پروفیشن سے ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ... پھر وہ ایسا ہی بندہ ڈھونڈ کے لائیں اور یہ ہو گئی ارینج میرج۔"

تقدیس سن کر ہنسنے لگی۔

"ہماری فیملی میں ایسے نہیں ہوتا۔ ارینج میرج کا ہمارے ہاں دو طرح کا تصور ہے۔ ایک تو یہ کہ پالنے میں ہی نسبت طے کر دی جاتی ہے، جس سے انحراف کی صورت میں خاندانوں میں صدیوں تک جاری رہنے والی رنجش پیدا ہو جاتی ہے اور دوسرے طریقے میں لڑکی بی۔ اے کے پیپرز دے کر جیسے ہی گھر لوٹتی ہے تو اسے بتا دیا جاتا ہے وہ اپنی ماں، چچی خالہ وغیرہ کے ساتھ جا کے شادی کا لہنگا پسند کر آئے کیونکہ فلاں تاریخ کو اس کی شادی ہے۔"

"مائی گاڈ... یعنی لڑکیوں کی پسند کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی جاتی؟"

"بالکل دی جاتی ہے۔ زیورات پسند کراتے وقت دی جاتی ہے کہ ملتانی سیٹ لینا ہے یا گلوبند... کنگن ٹھوس لینے ہیں یا جڑاؤ... جہیز کا دوسرا سامان خریدتے وقت بھی پسند ناپسند پوچھی جاتی ہے۔"

وہ مزے لے لے کر بتا رہی تھی اور سوہا حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کا ننھیال اور ددھیال بھی ماضی قریب میں ایسی ہی روایات رکھتا تھا۔ اگرچہ مظہر اور منزہ کی شادی کو لو میرج ہی کہا جاتا رہا لیکن زیادہ تر بھی لوگ جانتے تھے کہ یہ پسندیدگی یک طرفہ تھی۔ کم از کم اظہار کے معاملے میں تو مظہر ہی آگے رہا۔

منزہ بے شک دل میں اسے پسند کرتی تھی لیکن اگر اس کے ہاں سے آیا رشتہ اس کے بھائی بھابی مسترد کر دیتے تو چپ چاپ کسی اور سے... یعنی ان کی پسند کے کسی بھی انجان بندے سے شادی کر لیتی۔ احتجاج تو بہت دور کی بات ہے وہ شاید کبھی دل کی بات زبان پہ بھی نہ لاتی۔ یہ تو قسمت کی بات کہ اس کی اور مظہر کی جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی اور مظہر کی وارفتگیوں اور دیوانہ وار محبتوں نے یہ چرچا کر دیا کہ دونوں کی محبت کی شادی ہے...

اور ددھیال تو عورتوں کے معاملے میں اور بھی دقیانوسی روایات کا حامل رہا ہے، جہاں انہیں تعلیم جیسے بنیادی حق سے بھی محروم رکھا جاتا تھا تو شادی میں اختیار دینا تو دور کی بات تھی۔

وہ یہ سب نہیں جانتی تھی۔ اسے تو آج کا پتہ تھا۔

اپنے آج کا...

جو رینا کے سائے تلے بیت رہا تھا۔

اور اس کا اٹھنا بیٹھنا جن لوگوں میں تھا وہ سب اپر کلاس سے تو تھے۔ مگر تھے نو دولتیے اور نئی نئی دولت جب آتی ہے تو انسان سب سے پہلے اپنے اصل سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ اپنی خاندانی روایات کا چوغہ اتارنے کی کوشش کرتا ہے، نئی پوشاک پہننے کے لیے ان میں سے کوئی بھی خاندانی لوگ نہیں تھے۔ اس لیے بڑی آسانی سے آزاد خیالی کے نام پہ ٹریپ ہو کر مغرب زدہ زندگی گزار رہے تھے۔ چاہے وہ شیبا کی فیملی ہو۔ چاہے بیگم... چاہے رینا کی کسی دوست کی۔ چاہے اصغر کے کسی یار کی۔ سب مادر پدر آزادی کے خمار میں ڈوبے خود کو اور ایلیٹ کلاس کا نمائندہ سمجھ رہے تھے۔ سوہا کا خیال تھا شاید ایسی باتیں صرف مڈل اور لوئر کلاس تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایسے میں اسے تقدیس جیسی لڑکی کے خیالات اور فیملی کی روایات جان کے حیرت ہی ہونا تھی۔ باوردی شوفر کے ساتھ ٹویوٹا ہائی لکس پہ آتی تھی لیکن سر اسکارف میں لپٹا ہوتا تھا۔ جس کے پیروں میں امپورٹڈ شوز اور کاندھے پہ ڈیزائنر بیگ ہوتا مگر یونیفارم سادہ تراش کا اور پوری آستینوں والا بغیر فٹنگ کے ہوتا اور ایک مشہور صنعتی اور سیاسی پس منظر رکھنے کے باوجود اس کی باتوں سے کبھی اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہ چار لوگوں میں بیٹھ کے اپنے اس ماموں کا ذکر کرتی جو لاہور کی معروف سماجی شخصیت تھا نہ اپنے اس کزن کے بارے میں ڈینگیں مارتی جو موجودہ حکومت میں نوجوان قیادت کے طور پہ نمایاں تھا۔ نہ اپنے اس نانا، دادا، پردادا کے کارنامے بیان کیے، ملک کی صنعتی ترقی میں جن کا بڑا ہاتھ تھا اور جو یہاں کی اولین فیکٹریوں کے مالک تھے۔ اس کی طبیعت کی یہی سادگی اور انکسار آمیز وقار سوہا کو متاثر کرتا تھا۔

"ہمم... تم کر لو گی ایسی شادی؟"

اس نے بے حد حیرت سے پوچھا۔

"شاید..." تقدیس کی آواز اور لہجہ دونوں دھیمے پڑے۔

"اگر تمہیں کسی سے محبت ہو گئی تو؟"

"ڈونٹ بی سلی۔" تقدیس بے حد گھبرا گئی۔

"یار... اگر ہو گئی تو؟"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"

"فرض کرو یار... ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے اور میں کون سا محبت کر لینے پہ زور دے رہی ہوں لیکن ذرا سوچو تم کسی اور سے محبت کرتی ہو تمہارے پیرنٹس تمہاری بات کہیں اور طے کر رہے ہیں۔ تم کیا کرو گی؟"

"تمہارا سر پھاڑوں گی۔"

تقدیس نے جھلا کے اس کے سر پہ فائل ہلکے سے دے ماری۔

"جس کے امکانات صفر ہیں، اس کے بارے میں فرض بھی کیوں کروں۔ تم میرا دماغ مت خراب کرو۔ بات کہاں سے چلی تھی اور تم نے کہاں پہنچا دی۔ میں وصی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔"

"وہ بھی تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

سوہا کے کہنے پہ وہ چونکی اور اس کی پیشانی ناگوار شکنوں سے بھر گئی۔

"میرے بارے میں؟ اس کا مجھ سے کیا تعلق؟"

"مجھ سے تو ہے..." سوہا نے کہا اور فوراً ہی اس میں اضافہ بھی کیا۔

"تمہارا تعلق... اور وہ اسی حوالے سے کہہ رہا تھا کہ تمہاری نئی دوست نے تمہارے اندر کافی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ مثبت تبدیلیاں۔"

"مثلاً...؟"

"مثلاً" میں اسموکنگ سے پرہیز کرنے لگی ہوں اس لیے نہیں کہ تم کوئی ملانی بنی ہر وقت مجھے نصیحتیں کرتی ہو بلکہ اس لیے کہ میں خود ہی بور ہو گئی تھی۔ مگر یہ بات اسے کون سمجھائے۔ وہ اس کا سارا کریڈٹ تمہیں دیتا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ اب میں لڑکی لڑکی نظر آنے لگی ہوں۔ بول چال کے لحاظ سے بھی اور اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے کے لحاظ سے بھی۔ ہاں اس کا تھوڑا بہت کریڈٹ تمہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم دونوں ساتھ ہوں تو ہم میں سے کوئی ایک عجوبہ لگے۔ بالکل ہی زمین آسمان کا فرق تو نہیں ہونا چاہیے دوستوں میں۔"

"بہت نوٹس لیتا ہے وہ تمہارا۔"

تقدیس نے نئے رخ سے معاملہ کھنگالا۔

"دال میں کالا مجھے اب بھی نظر آ رہا ہے مگر اس کی دال میں۔"

"فار گاڈ سیک یار... پلیز وصی بالکل سہیلی ٹائپ بندہ ہے یار۔"

"سہیلی ٹائپ... اور بندہ؟..." وہ ہنسنے لگی۔

"اچھا بہت ہو گیا وصی نامہ... چلو کوئی کلاس ہی لے آئیں۔"

"میری تو آج صرف دو کلاسز تھیں... وہ میں نے لے لیں... باقی فری ہیں... تم لے آؤ..."

"مجھے ایسا خاص شوق نہیں ہے پیشیاں بھگتنے کا' چلو گھر چلتے ہیں۔"
"میرا انزا نیور نو اپنے ٹائم پہ ہی آئے گا۔"
"تمہارے نہیں ۔۔۔ میرے گھر ۔۔۔ آؤ تمہیں اپنی ماما سے ملواتی ہوں۔"
"یعنی تمہاری آنٹی ۔؟"
"نہیں ۔۔۔ وہ میری ماما ہیں ۔۔۔ اگر وہ ماما نہیں ہو سکتیں تو دنیا کی کوئی عورت بھی ماں نہیں ہو سکتی۔"

☼ ☼ ☼

"بھولنا کیسا ۔۔۔ کوئی اپنی بیٹی کو بھول سکتا ہے بھلا ۔۔۔"

پروین نے نوشمہ کے گلے کے جواب میں بڑے دلار سے کہا۔ وہ اس وقت وہاں جانے کے لیے بالکل تیار ۔۔۔ اس سے فون پہ بات کر رہی تھیں۔ فون کرنے کا مشورہ وصی کا تھا ۔۔۔ کہ یہ نہ ہو کہ ہم وہاں جائیں اور وہ لوگ ہی گھر پہ نہ ملیں۔

"بس۔ مصروفیت اتنی رہتی ہے کہ ۔۔۔ بچے چھوٹے تھے تو ان کے اسکول وغیرہ کی وجہ سے نکلنا مشکل ہوتا تھا' سوچتی تھی بڑے ہو جائیں گے تو ذمہ داریاں کم ہوں گی۔ جی بھر کے ملنے ملانے کے آنے جانے کے پروگرام رکھا کروں گی مگر اب اور پھنس گئی ہوں۔ لیکن گھر داری میں گھر کے بھی کوئی اپنوں کو نہیں بھولتا ۔۔۔ تم تو ہر وقت مجھے یاد آتی ہو۔ آخر اکلوتی بھتیجی ہو۔"

وصی جو ان کے کہنے پہ دوست کے ساتھ جانے کا پروگرام کینسل کیے' تیار کھڑا تھا' اتنی لمبی تمہید پہ جز بز ہو رہا تھا۔

"نانو کے ساتھ دن رات کی صحبت اثر دکھا رہی ہے آپ پہ ممانی جان ۔۔۔ پلیز!"
وہ وصی پہ ایک تیز نظر ڈال کے بادل نخواستہ اصل بات کی جانب آئیں۔
"سچ کہہ رہی ہوں ۔۔۔ میں تو آنے کے لیے تیار بیٹھی ہوں سوچا نکلنے سے پہلے تمہیں فون کر لوں' گھر پہ ہی ہو
"ہاں ہاں ۔۔۔ نہیں بھئی زیادہ دیر رکنے کا وعدہ نہیں کر سکتی۔ کھانے پہ؟ ۔۔۔ اچھا دیکھتی ہوں۔"
وہ امید بھری نظروں سے وصی کو دیکھنے لگیں اور وصی دانستہ نظریں چراتا بال سنوارنے لگا۔
"وشمہ ۔۔۔ بچے ۔۔۔ میرا کیا ہے' رات تک رک جاؤں مگر وصی کو کہیں جانا تھا۔ شاید کسی دوست کی شادی پہ ۔ وہ اتنی دیر نہیں رک سکتا۔"
"ہاں وہی لے کر آ رہا ہے۔"
"میں تو لا رہا ہوں مگر کوئی جانے پہ تیار بھی تو ہو۔"
وصی چڑ کے چابی ہلاتے ہوئے اٹھا۔
"غلطی ہوئی جو آپ کو فون کرنے کا مشورہ دے دیا ۔۔۔ میں گاڑی میں ہوں ۔۔۔ جلدی آئیں پلیز۔"
وہ دھمکی دیتا نکل گیا۔
لاؤنج سے نکلتے ہی وہ ظل ہما سے ٹکرا گیا جو تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آ رہی تھی ۔۔۔ اس کا سر وصی کی ٹھوڑی سے بری طرح ٹکرایا تھا۔
"یا الٰہی ۔۔۔ رحم ۔۔۔" وہ ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھ کے بلبلانے لگا۔
ہما شرمندہ سی ہو گئی ۔۔۔ اور خجالت کو خوامخواہ کی خفگی سے مٹانے کی کوشش کرنے لگی۔
"دیکھ کے نہیں چل سکتے؟"
"تمہیں ڈاکٹر نے منع کیا ہے دیکھنے سے؟"
موڈ اس کا پہلے سے خراب ہو رہا تھا۔

"ارے تیار شیار ہو ۔۔۔ کہاں جا رہے ہو؟"
اس نے ایک پسندیدگی سے بھرپور نظر اس کی تیاری پہ ڈالی ۔۔۔ راسلک کا ایش گرے کرتا ۔۔۔ لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار' دل لگا کے بنائی شیو ۔۔۔ جیل سے جمائے بال ۔۔۔ اور تیز پرفیوم کے بے تحاشا لپٹے۔
"ممانی کو لے کر جا رہا ہوں ان کے میکے ۔۔۔"
"تیار ی کے ساتھ؟"
مشکوک ہوئی اور حیران بھی ۔۔۔
"نہیں کیا تکلیف ہے' میرا دل چاہے گا تو اچکن پہن کے جاؤں گا۔"
بلاوجہ چڑ رہا تھا ۔۔۔ شاید اس لیے کہ ممانی کو انکار نہیں کر سکا تھا اور دوست بھی بڑا قریبی تھا جس کی آج مہندی تھی ۔۔۔ حالانکہ ممانی نے کون سا رات بھر رکنا تھا' ایک ڈیڑھ گھنٹے کی بات تھی' اسے بعد میں جانا ہی تھا ۔ مہندی کے فنکشنز تو رات گئے تک چلتے ہیں لیکن اسے اس متوقع بوریت کا سوچ سوچ کے کوفت ہو رہی تھی۔ جو اسے وہاں ایک گھنٹے تک جھیلنا تھی۔
"میری بلا سے تم سہرا باندھ کے چلے جاؤ۔"
غصے میں آ کے ہما نے کہہ تو دیا مگر دل لمحہ بھر کے لیے سکڑ کے رہ گیا۔
وشمہ کا رعنائیوں سے بھرپور سراپا تصور میں آیا ۔۔۔ اور وہ اپنی حماقت کو کوسنے لگی۔
اسے کہتے ہیں اپنے پیر پہ کلہاڑی مارنا ۔۔۔ اس کا چاہے اس جانب کبھی دھیان نہ گیا ہو مگر میں نے سہرا باندھ کے جانے کا مشورہ دے کر رولا دیا ۔
پچھتانے لگی ۔۔۔
اسی وقت حسن تھکا ہارا ۔۔۔ اندر داخل ہوا۔
"خیریت؟" اس نے ٹھٹھک کر دونوں کو دیکھا ۔۔۔
ایک سجا بنا ۔۔۔ مگر ماتھے پہ تیوریاں لیے کھڑا تھا۔
دوسری ایک پیر آخری سیڑھی پہ ۔۔۔ دوسرا نیچے ٹکائے انگلیاں مروڑ رہی تھی ۔۔۔ چہرہ خفت سے سرخ ہو رہا تھا۔
"کوئی نیا پھڈا؟"
"ان سے پوچھیں ۔۔۔" وصی نے ظل ہما کی جانب اشارہ کیا۔
"مجھے سہرا باندھنے کے ارمان ظاہر کیے جا رہے ہیں۔'
"ہونہہ ۔۔۔" وہ بدک اٹھی ۔۔۔
"پتہ نہیں کس بات پہ جلا بیٹھا ہے' سارا غصہ مجھ پہ نکال رہا ہے۔"
"حسن بھائی ۔۔۔ آپ ہی انصاف سے کام لیں۔ اسد کی مہندی ہے آج ۔۔۔ سارے دوستوں نے کتنا ہلا گلا کرنا ہے ۔ ممانی ہیں کہ بیٹھے بٹھائے انہیں بھتیجی کی یاد ستا رہی ہے۔"
وشمہ ۔۔۔ حسن کے آس پاس گھنٹیاں بجیں۔
"جی ۔۔۔ وہی محترمہ ۔۔۔ چلو ۔۔۔ میں لے جاتا ہوں مگر صرف نکلتے نکلتے ہی انہوں نے سات بجا دیے ہیں وہاں پتہ نہیں دس بجائیں گی یا گیارہ ۔۔۔"
"تم جاؤ ۔۔۔ میں لے جاتا ہوں امی کو۔"
"نہیں حسن بھائی ۔۔۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" وہ سنبھلا۔
"آپ دیر سے آئے ہیں گھر ۔۔۔ تھکے ہوں گے ۔۔۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ پلیز انہیں جلدی بھیجیں ۔۔۔ تاکید کے ساتھ کہ وہاں جا کے جم نہ جائیں۔"
"ٹھیک ہے کھانا ۔۔۔ تم جاؤ ۔۔۔ میں لے جاتا ہوں۔"

"نو پرابلم وصی ۔۔۔ میں شاور لے کر چینج کرتا ہوں ۔۔۔ اتنے میں امی دادی کے ساتھ مذاکرات سے فارغ ہو جائیں گی۔"

"ابھی خاصا ٹائم ہے میرے پاس ۔۔۔"

وہ کھل کے ۔۔۔ مسکرایا تو وصی کو اطمینان ہوا۔

"آر یو شیور ۔۔۔؟"

"ہنڈرڈ پرسینٹ۔"

وصی گنگناتا ہوا باہر نکل گیا ۔۔۔ ہما پہ ایک نگاہ غلط بھی ڈالے بغیر۔

ہما نے بھاری ہوتے دل کے ساتھ نگاہیں باہر نکلتے وصی سے ہٹائیں اور حسن سے پوچھنے لگی۔

"کھانا کھائیں گے حسن بھائی؟"

وہ نیچے آئی تھی تو پروین کے کہے بغیر کتنے ہی کام اپنائیت سے اپنے ذمے لے لیتی تھی۔

"نہیں ۔۔۔ لیٹ ہو جاؤں گا ۔۔۔ تم چائے بنا دو ۔۔۔ ساتھ میں کچھ لائٹ سا ۔۔۔ میں امی کو بتا دوں کہ وصی کو میں نے بھیج دیا ہے۔"

وہ اندر گیا اور ہما نے ایک اطمینان بھرا سانس لے کر خود کو تسلی دلادی۔

"ایسے ہی دل پہ چھوٹا کر رہی تھی میں ۔۔۔ وہ تو وہاں جانا ہی نہیں چاہتا ۔۔۔ کجا کہ سرا باندھ کے۔"

اپنے اندیشوں پہ اسے خود ہی ہنسی آنے لگی۔

آج بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا ہے پھوپھو کا؟"

منزہ نے بظاہر سرسری انداز میں لیکن در حقیقت خاصی تشویش سے پوچھا۔

"جی ۔۔۔ نہیں تو ماما ۔۔۔" وہ گھبرا اٹھی ۔۔۔ جیسے چوری پکڑی گئی ہے حالانکہ نہ بھی مکرتی ۔۔۔ تو پھوپی کے انتظار میں کون سی قابل اعتراض بات تھی۔

"کچھ بتایا انہوں نے، کس لیے آ رہی ہیں؟"

وہ بیکری سے منگوایا سامان پیکٹ کھول کے پلیٹوں میں نکالتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"مجھ سے ملنے۔"

"بس؟"

"جی"

"اچھا ۔۔۔" منزہ کی "اچھا" میں بے یقینی سی تھی۔

اسی وقت گاڑی کا ہارن سنائی دیا ۔۔۔ وشمہ بے تابی سے فرائی پان میں چمچہ پھینک کر کچن سے نکلنے لگی۔

"وشمہ ۔۔۔ خان کھول دے گا گیٹ ۔۔۔ کہاں جا رہی ہو؟"

منزہ کو یہ وارفتگی ذرا نہ بھائی۔

"یہ کباب جل رہے ہیں ۔۔۔ انہیں نکالو ۔۔۔ اندر ہی آنا ہے تمہاری پھوپھو نے، میں ذرا تمہارے پاپا کو فون کر دوں ۔۔۔ پھر کہیں گے اطلاع نہیں دی بہن کے آنے کی۔"

وشمہ خاموشی سے کباب پلٹنے لگی مگر سماعتیں باہر کی جانب لگی تھیں ۔۔۔ سینے میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ پھر پھوپھو کی آواز آئی ۔۔۔ اور اس کے ہاتھ کپکپاتے ہوئے پھرتیاں دکھانے لگے۔ ایک جانب سے کباب ابھی سرخ بھی نہ ہوئے تھے کہ اس نے پلیٹ میں نکال لیے ۔۔۔ اور جلدی سے باہر نکلی ۔۔۔ منزہ شاید ابھی فون پہ بات کر رہی تھی۔

"پھوپھو ۔۔۔"

وہ والہانہ انداز میں ان کی جانب لپکی۔ اور ان کے گلے لگتے ہوئے داخلی راستے پہ نظریں دوڑانے لگی۔

اتنی دیر؟ ۔۔۔ کب سے انتظار کر رہی تھی۔"

۔۔۔!" پھوپھو نے اس کا ماتھا چوما اور اسی وقت وشمہ کی مسلسل سامنے بھٹکتی نظروں نے حسن کو اندر

۔۔۔ اس کا ہمک ہمک کر بے چین ہوتا دل جیسے برف کی سل تلے دب گیا۔

تھی مگر حسن کو تیار ہونے میں کچھ وقت لگ گیا ۔۔۔ ابھی آیا تھا کام پر سے۔"

۔۔۔" وہ وصی کا نام لیتے لیتے رک گئی۔

۔۔۔! اور بھابی کہاں ہیں ۔۔۔؟"

کو دیکھتے ہی وہیں ساکت ہو گیا تھا، ماں کی پکار پہ سنبھل کر نظروں کا رخ بدلتا آگے بڑھا۔

کے گلے لگی کھڑی تھی، بے دلی سے الگ ہوئی۔

فون کرنے گئی ہیں۔ آ رہی ہیں۔"

اس کی آواز بھی پژمردہ تھی۔

نظروں سے ایک بار پھر اسے دیکھا ۔۔۔ وہ ہمیشہ کی طرح دل میں اترتی محسوس ہوئی۔ اور پہلی بار اختیار رکھنا مشکل لگنے لگا ۔۔۔ دل چاہا ۔۔۔ دل میں قدم بہ قدم اترتی اس من موہنی ہستی کو وہ گھر میں اتار

بھابی کو دیکھ کے آتی ہوں۔"

کے بعد جب سے منزہ نے بڑے ہی نامحسوس طریقے سے نوید مراد پہ ۔۔۔ اور اس گھر پہ تمام حاصل کر لیے تھے۔ پروین اس سے خاصا دب کے رہتی تھیں اس ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ کسی نہ منزہ انہیں بھائی سے اور اس گھر سے دور نہ کر دے ۔۔۔ شروع سے ہی منزہ سے کوئی ذاتی پرخاش نہ چھوٹے گلے پیدا ابھی ہوئے تو انہوں نے روایتی نندوں کی طرح طعنے تشنے دے کر اسے جتایا نہیں کے باوجود اسے ایک بے ضرر سی عورت سمجھتی رہیں۔ اب صورت حال مختلف تھی۔ اب وہ منزہ سے تھیں۔ انہیں ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ وہ کبھی بھی کوئی بھی ایسا قدم اٹھا سکتی ہے جس سے وہ اپنے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو سکتی ہیں۔

وہ اسی کی خوشنودی کے لیے مہمان ہونے کے باوجود خود اٹھ کر اندر اس سے ملنے جا رہی تھیں۔

دل ہی دل میں جھنجلاتی پیر کے ناخن سے کارپٹ کرید رہی تھی ۔۔۔ اسے رہ رہ کے وصی کے نہ آنے پہ تھا اور مصیبت تو یہ تھی کہ وہ اس کے نہ آنے کا سبب بھی کسی سے نہیں پوچھ سکتی تھی ۔۔۔ وصی اس کا لگتا تھا ۔۔۔ اس لیے اس سے کبھی دوستانہ بے تکلفی نہ پیدا ہو سکی، ورنہ اسی سے پوچھ لیتی ۔۔۔ اسے تو یہ چلی تھی کہ وہ بھی صرف اسی سے ملنے ۔۔۔ اسی کو دیکھنے کی خاطر یہاں آ رہا ہے۔

کر رہی ہو آج کل؟"

نے خاموشی کو توڑنے میں پہل کی۔

رزلٹ کا انتظار ۔۔۔"

مختصر جواب دیا۔

ایک بات کہنا تھی تم سے۔"

کیسے ۔۔۔ حسن نے اتنی ہمت کر لی ۔۔۔ شاید یہ حوصلہ اس تنہائی نے دیا تھا جو قسمت سے آج میسر ہوئی

نے زبردستی خود کو حاضر ظاہر کرنا چاہا۔

ہمت تو آ گئی تھی مگر الفاظ کھو چکے تھے۔

"امی! آج کل میری شادی کے بارے میں سوچ رہی ہیں" اچانک ایک سرا ہاتھ آ ہی گیا۔۔۔ وہ بھی اس طرح پروین نے واقعی آج راستے میں دو تین بار اشارتاً "اسے ذہنی طور پہ شادی کے لیے تیار رہنے کی بات کی تھی" پہلے بھی کبھی کبھار وہ اس کی دلہن لانے اور اپنی ذمہ داریاں اسے سونپنے جیسے ارمان ظاہر کرتی رہی تھیں مگر اب حسن نے اپنی مسکراہٹ کے ذریعے اس خیال پہ اپنی آمادگی ظاہر کر کے گویا پروین کو گرین سگنل دے دیا تھا۔ سوچ رہا تھا یہی اچھا موقع ہے بات کرنے کا۔۔۔ وشمہ سے بھی اور ماں سے بھی۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

وہ رواداری سے مسکرائی۔

"تمہاری فیملی کی۔۔۔ میرا مطلب ہے اس جنریشن کی پہلی شادی ہو گی یہ۔"

"تم۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بتا تو رہی ہوں۔" وہ کچھ حیران ہوئی۔ "بس یہ دھیان رکھیے گا کہ گرمیاں نہ ہوں۔ ذرا مزا نہیں آتا۔"

وہ اس کی معصومیت پہ ہنس دیا۔ یا شاید ایسے اناڑی پن پہ۔۔۔

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس کے الفاظ اب بھی بے حد سادہ اور مبہم تھے اس کے باوجود وشمہ کھٹک گئی۔ اس کے چھپے مفہوم کو بھانپ گئی اور بھانپ جانے کے باوجود جھٹلانے لگی۔

"آپ۔۔۔ میں۔۔۔ یعنی۔۔۔ کیا خیال ہو سکتا ہے۔ آپ۔" وہ بری طرح نروس ہو گئی۔

"اگر امی نے مجھ سے میری پسند پوچھی تو کیا میں تمہارا نام لے لوں؟"

"جی۔۔۔؟" وہ آنکھوں میں وحشت بھر کے اسے دیکھنے لگی۔

"بہت مشکل سوال تو نہیں کیا میں نے؟"

حسن مبہم سا مسکرایا۔ دل ہی دل میں اس کے ردِ عمل کی وجہ سے متردد بھی تھا۔ جو بات اس نے ہمت کر کے کہہ ڈالی تھی۔ وہ بہت انوکھی، بہت ناقابلِ یقین نہ سہی۔۔۔ بہرحال بہت بڑی بات ضرور تھی۔

حسن کے لیے بھی۔

اور وشمہ کے لیے بھی۔

وہ جانتا تھا کہ وشمہ جیسی چھوئی موئی سی لڑکی اس سے یہ سن کر حیرت زدہ بھی ہو گی۔۔۔ کترانا بھی چاہے گی۔ حیا کے رنگ بھی کھل جائیں گے اس کے چہرے پہ۔ وہ سارے ممکنہ ردِ عمل جانتا تھا مگر یہ وحشت۔۔۔ یہ بے چینی اس کی عقل و فہم سے ماورا تھی۔

"صرف اتنا ہی تو پوچھا ہے کہ امی مجھ سے شادی کے لیے میری پسند پوچھ رہی ہیں، تمہارا نام رکھ دوں ان کے سامنے۔"

"میرا؟" اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "میرا کیوں؟"

حسن بے ساختہ ہنس پڑا۔

"یعنی تفصیل بھی بتانی پڑے گی۔ مکمل حالِ دل سننا ہے؟" وہ قدرے شوخ ہوا۔

ادھر وشمہ کی سراسیمگی بڑھی۔۔۔

"میں۔۔۔ میں ماما کو۔۔۔" گھبرا کے وہ اٹھی اور کمرے سے باہر جانے کو لپکی۔

"وشمہ۔۔۔ سنو۔۔۔ رکو تو۔۔۔" مگر وہ جا چکی تھی۔ حسن وہیں ادھیڑبن میں گھرا کھڑا رہا۔

"پتا نہیں میں نے ٹھیک کیا یا غلط۔۔۔"

○ ○ ○

"آج رات میں تمہارے ابّا سے ایک اہم بات کرنے والی ہوں۔" واپسی پہ پروین نے بڑے سرشار سے لہجے میں بتایا۔

"الٰہی خیر۔۔۔ لگتا ہے ان کی جیب پہ خاصا بار پڑنے والا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ بس باپ کی جیب سے ہمدردی جتاتے رہنا۔ ماں سے تو کوئی ہمدردی ہے ہی نہیں۔"

"یہ بات دادی سن لیں نا تو آپ کو گھنٹہ بھر کا لیکچر تو ضرور دیں گی کہ ہمدردی اور تین تین جوان گبھرو بیٹوں کی

ماں۔۔۔ ارے امی! آپ پہ تو رشک کرنا چاہیے۔"

حسن کا اگرچہ اب بھی وشمہ کے عجیب و غریب طرزِ عمل کی وجہ سے الجھا ہوا تھا مگر وہ دانستہ اس ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے ذریعے اپنا دھیان بٹا رہا تھا۔

"تین تین بیٹوں کی ماں سے ہی تو ہمدردی کی جاتی ہے۔ وہ بھی بیٹے اگر ایسے کاہل ہوں تو۔۔۔"

"لیجیے کون سی کاہلی ملاحظہ فرما لی آپ نے میری یا وصی کی۔ حسان کا نام نہیں لے رہا میں۔ وہ تو کاہلی کا چیمپئن ہے۔"

"تم کون سا کم ہو؟ تمہاری عمر میں تمہارے ابا دو بچوں کے باپ تھے اور تم ابھی تک شادی شدہ تو کیا، منگنی شدہ بھی نہیں ہو۔۔۔"

"اس میں قصور میرا نہیں، آپ کی کاہلی کا ہے۔" وہ مزے سے کہنے لگا۔ "میں خود بخود تو نکاح پڑھا کے کسی کو بیاہ لانے سے رہا۔ آپ ہی اپنے فرض سے چشم پوشی کر رہی ہیں اتنے عرصے سے۔"

"واہ۔۔۔ بہت اچھے بیٹا۔۔۔"

اندر ہی اندر پروین کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے کہ صاحبزادے سہرا باندھنے کے لیے تیار ہیں مگر اوپر سے ڈانٹنے لگیں۔

"سارا الزام ماں کے سر۔۔۔ ٹھیک ہے اب میں خود اس الزام کو دھو دوں گی۔۔۔ پھر مجھے نہ کہنا بچو۔۔۔"

"کیا نہ کہنا؟"

"یہی کہ پوچھا کیوں نہیں۔۔۔؟"

"ہاں یہ تو ہے۔۔۔ پوچھنا تو چاہیے۔"

"تم کالج وغیرہ تک تو کسی میں دلچسپی نہیں لیتے تھے، اتنا تو میں جانتی ہوں، آخر ماں ہوں۔"

"تو کالج سے نکلنے کے بعد کیا مجھ پہ کسی میں دلچسپی لینے پہ پابندی عائد ہو گئی ہے۔ یا دلچسپی صرف کالج میں ساتھ پڑھنے والیوں میں لی جا سکتی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ لیکن تم۔۔۔" پروین ٹھٹکیں۔

اور حسن ماں کی پریشان صورت دیکھ کر ہنس پڑا۔

"مذاق کر رہا ہوں امی۔۔۔"

"شکر ہے۔۔۔ تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ دراصل حسن! اب میں سنجیدگی سے کچھ کہنے جا رہی ہوں۔ پلیز۔۔۔ سنجیدگی سے سننا۔"

"جی۔۔۔" وہ سچ مچ حد درجہ سنجیدہ ہو گیا۔

"میرا ارادہ خون کے رشتوں کو مزید مضبوطی سے باندھنے کا ہے۔ میں تمہارے ابو سے آج یہی بات کرنے والی ہوں۔ سوچا پہلے تم سے عندیہ لے لوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"امی۔۔۔ میں۔۔۔ آپ کا مطلب ہے کہ۔۔۔"

اس کے دل خوش فہم نے اپنی ہی غرض کے مطلب تراشنے شروع کر دیے۔

"بیٹا! اگر اپنی ہی بچیوں سے ہم لوگ غافل رہیں گے تو پرایوں سے کیا گلہ۔"

"جی۔۔۔ آپ نے ٹھیک سوچا ہے۔"

دل کی خوشی کو دل کے اندر ہی چھپاتے ہوئے اس نے بظاہر بردباری سے جواب دیا تھا۔

بڑا سا آہنی گیٹ۔۔۔

اس پہ بنا طلوع ہوتے سورج کا منظر پیش کرتا سنہری کنگرہ۔

بڑا سا ڈرائیو وے۔۔۔ جس میں کھڑی ہوئی قیمتی کاروں کے نئے ماڈل۔

گیٹ پہ بیٹھا باوردی اور مسلح سیکورٹی گارڈ۔۔۔

اندر ایک بڑے رقبے پہ پھیلا لان ۔۔۔ جس میں لگے سنگی مجسمے، آبشاریں، فوارے، سنگی چبوترے، قسم قسم کے ملکی اور غیر ملکی پھول، حوض، اس پہ تیرتے آبی پرندے۔

لش گرین گھاس پہ پر پھیلا کے پھرتے دو رنگین اور ایک سفید مور۔

سفید اور نیلے رنگ کی بنی تین منزلہ عمارت۔ جس کے رہائشی افراد کی تعداد صرف تین۔۔۔ مگر رہائشی کمروں کی تعداد تیرہ تھی۔

سب کے سب ہر سہولت، آسائش اور آرائش سے مزین۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم بیش قیمت فرنیچر اور نایاب پینٹنگز سے آراستہ۔

لاؤنج بے حد آرام دہ اور جدید انٹیریئر کا حامل۔۔۔

اور خود سوہا کا بیڈروم۔۔۔ ایک ایک چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اور تقدیس وہی کر رہی تھی۔

یعنی دیکھتی جاتی تھی اور سراہتی جاتی تھی۔

دولت کی اس کے ہاں بھی ریل پیل تھی۔ مگر ایسی صاف جھلکتی نہ تھی۔ جعفر محمود نے باپ دادا کا دیا ہوا بھی سنبھال کے رکھا تھا اور خود بھی جو کمایا تھا، سبھاؤ سے خرچ کیا تھا۔ وہ بے حد نفیس ذوق کا مالک تھا۔ ایک عمر باہر گزارنے کے سبب نمود و نمائش سے دور تھا۔

اور مدیحہ اسے ایسے شوق ہی نہیں تھے۔ یا یوں کہیے کہ جو تھے، وہ ناقدری کے ڈر سے دبا کے رکھ دیے کیونکہ شروع شروع میں اس نے ایک عورت ہونے کے فطری ذوق و شوق کے تحت اپنا گھر اپنی جنت جیسے خواب دیکھتے ہوئے اس کو سجانے سنوارنے کی کوشش بھی کی مگر وہ جعفر کے معیار پہ پوری نہ اتری اور اس نے جن الفاظ میں اور جس تیور کے ساتھ اسے آئندہ ایسی زحمت نہ کرنے کی تنبیہہ کی تھی، اس کے بعد مدیحہ جیسی انا پرست اور ضدی عورت بھول کے بھی ایسی کوئی کوشش کب کر سکتی تھی۔

"تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بہت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ جیسے ایک ایک دیوار، ایک ایک ستون پہ محنت کی گئی ہو۔" اس نے دل کھول کر تعریف کی۔

"ایک ایک اینٹ کہو۔۔۔" سوہا نے خود کو واٹر بیڈ پر گراتے ہوئے کہا۔

"ماما کا شوق ہے یہ۔۔۔ ایک خود کو سنوارتے رہنے کا، دوسرا اس گھر کو۔"

اس نے اندر داخل ہوتی ملازمہ کو ہاتھ سے وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

"تقدیس! تم لے لو خود جو پسند ہے بلکہ مجھے بھی دے دو یار۔" وہ کسل مندی سے لیٹی ٹانگیں جھلاتی کہہ رہی تھی۔

ملازمہ تین منزلہ ٹرالی اوپر سے نیچے لدی، وہیں چھوڑ کے چلی گئی۔ دروازہ آہستگی سے بند ہوا۔ کمرے میں اے سی کی خنکی غنودگی پیدا کر دینے کی حد تک سکون بخش تھی۔

"تم کیا لو گی؟" تقدیس نے ٹرالی اپنی جانب کھینچتے ہوئے جائزہ لیا۔ اوپر ہر طرح کے کولڈ ڈرنکس کے ٹن سجے تھے۔ ملکی بھی اور غیر ملکی بھی۔ کولڈ ڈرنکس بھی۔۔۔ تین چار اقسام کے فروٹ جوسز بھی۔ فلیورڈ ملک۔۔۔ ڈائٹ ڈرنکس۔ انرجی ڈرنکس۔۔۔ نچلے خانے میں ڈرائی فروٹ، فریش فروٹ کاک ٹیل، فرائی نگٹس۔ کباب اور پیسٹری تھے جبکہ سب سے نیچے آئس باکس اور گلاس وغیرہ تھے۔

"اتنا تکلف۔۔؟"

"تکلف کیسا یار۔۔۔ دراصل میرا سب کو پتا ہے کہ اس وقت کچھ منگواؤں اپنے کمرے میں تو رات کا کھانا گول۔ اس لیے ماما کی ہدایت ہوتی ہے انہیں ٹرالی بھر کے بھیجنے کی۔ ماما کو لگتا ہوگا جیسے اتنا سب کچھ دیکھ کر میں کچھ تو کھا ہی لیا کروں گی۔"

"بہت پیار کرتی ہیں تمہاری ماما تم سے۔"

وہ پیچ جوس کے سپ لیتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہوں۔۔۔ بہت۔۔۔" سوہا نے فورک (کانٹا) کی مدد سے نگٹس کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے تائید کی۔

"تمہاری اصل ماما جتنا؟"

تقدیس کے سوال پہ یہ لقمہ اس کے حلق میں پھنس سا گیا، اس نے لیمن بارلے کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے اسے اندر اتارا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔۔۔ ان کے جتنا نہیں۔۔۔ ماما مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔ بہت زیادہ۔۔۔ تم کسی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں ان سے۔"

تقدیس اور بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر کچھ سوچ کے چپ ہو رہی۔

"تم شاید اپنی ماما سے ملوانے لائی تھیں مجھے۔" اس نے یاد دلایا۔

"ہاں۔۔۔ دیکھتی ہوں۔ اٹھیں کہ نہیں۔" اس نے دوبارہ خود کو پیچھے کی جانب دھپ سے گرایا اور بیڈ کے سرہانے لگے انٹر کام پہ بات کرنے لگی۔

"کیا ہے ماما یار۔۔۔ میری فرینڈ اسپیشلی آپ کے لیے آئی ہے اور آپ کی تیاریاں ہی ختم نہیں ہو رہیں۔ اوکے بس فائنل دس منٹ۔"

تقدیس تعجب سے اس کی بے تکلفی ملاحظہ کر رہی تھی۔

"آ رہی ہیں یار! تھوڑی دیر میں۔۔۔ دیر سے اٹھتی ہیں ناں۔۔۔ اوپر سے تیار ہونے میں بھی کمال وقت لگاتی ہیں۔ بابا جی کا حوصلہ ہے۔"

وہ ہنستے ہنستے پلیٹ میں سے ٹونگ رہی تھی۔

"تیار ہو رہی ہیں؟ کیا جاگتے ہی پھر سے کہیں جانا ہے؟"

"نہیں یار!" وہ قہقہہ لگانے لگی۔

"یہ ان کی روٹین کی تیاری ہے۔ ریگولر۔"

"ریگولر؟" وہ مزید حیرت میں مبتلا ہوئی۔

اور یہ ساری حیرت تب دور ہو گئی جب ٹھیک پندرہ منٹ بعد سوہا اسے لے کر لاؤنج میں داخل ہوئی۔۔۔ جہاں شفون کی ہلکے کاسنی رنگ کی نفیس قیمتی ساڑھی میں ملبوس ریناان دونوں کی منتظر تھی۔

پور پور سجی۔۔۔ پلک پلک سنوری۔
ایک بے حد متاثر کن ظاہری شخصیت کی مالک۔۔۔ تقدیس کے اندازے سے بہت کم عمر نظر آنے والی۔
"ماما! یہ تقدیس ہے۔۔۔ میری فرینڈ۔۔۔"
سوہا نے بہت فخریہ اس کا تعارف کرایا کیونکہ عموماً" ریتا اس کی دوستوں شیبا' مبیکا وغیرہ سے نالاں ہی رہتی تھی۔
"سو سویٹ۔۔۔" ریتا نے بڑے اسٹائل سے اس کے گال سے لب مس کیے ایک مسحور کن خوشبو نے تقدیس کو اپنے حصار میں لے لیا۔
"سوہا بہت ذکر کرتی ہے تمہارا۔۔۔ اور ایسا بہت کم ہوا ہے ورنہ فرینڈز تو اس نے پہلے بھی کئی بنائی ہیں لیکن نہ تو ان کے نام کی مالا جپی ہے نہ ان سے اتنی متاثر رہی ہے اور نہ یوں بطور خاص مجھ سے ملوانے لائی ہے۔ تمہیں دیکھ کر لگ رہا ہے کہ تم میں ایسی خاص بات ہے ضرور۔۔۔ کہ تمہیں بطور خاص ملوایا جائے۔"
تقدیس محجوب سی ہو گئی۔ "یہ تو سوہا کی محبت ہے۔"
اس کے سوا اور کیا کہتی وہ۔۔۔ لیکن ریتا یہ جواب سنتے ہی قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔
"محبت۔۔۔ اور سوہا۔۔۔" ایسے جیسے تقدیس نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔
سوہا بھی ریتا کے قہقہوں کا ساتھ دینے لگی تو تقدیس اور شرمندہ ہو گئی۔
"سوہا! تم نے بتایا نہیں کبھی' تمہیں محبت بھی کرنا آتی ہے؟ اور وہ بھی میرے علاوہ کسی اور سے؟"
ریتا ہنستے ہنستے آنکھوں میں آجانے والے آنسو ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی اور تقدیس کو اس لمحے اس کے لہجے۔۔۔ اس کے انداز میں ایک جتاتا ہوا تفاخر محسوس ہوا۔
"اوہ پلیز ماما۔۔۔" سوہا اپنی ہنسی کنٹرول نہ کرپا رہی تھی۔ "اس بے چاری کی شکل دیکھیں ذرا۔"
اس نے ہنستے ہنستے تقدیس کی جانب اشارہ کیا جس کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ رہا تھا۔
"کیا سوچ رہی ہوگی وہ آپ کی ان باتوں سے۔۔۔ یار پلیز۔۔۔" وہ بمشکل ہنسی کنٹرول کرپائی۔
"پلیز۔۔۔ ماما کی باتوں کا مائنڈ نہ کرنا۔ وہ تو۔۔۔" اور ایک بار پھر ہنسی کا دورہ شروع۔
"سوری۔۔۔ سوری تقدیس۔۔۔" ریتا نے نرمی سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔
"دراصل تمہاری بات سے مجھے سوہا کی وہ قسم یاد آ گئی۔ جو یہ اکثر و بیشتر دہراتی رہتی ہے کہ ماما کے علاوہ میں نے نہ کبھی کسی سے محبت کی ہے نہ کبھی کروں گی اور میں ہمیشہ کہتی تھی اسے کہ مت بولو اتنے بڑے بول۔ ورنہ خدانخواستہ تمہارے ہی آگے آئیں گے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ سویٹی! کم از کم اس ایج میں آ کے ایسے دعوے نہیں کرنے چاہئیں۔ میں نے تمہاری ساری ویکسی نیشن کرائی ہے مگر محبت سے بچاؤ کے ٹیکے نہیں لگوائے۔۔۔" ایک اور قہقہہ۔۔۔
تقدیس نے کسی عورت کو ایسے مردانہ وار بلند بانگ قہقہے لگاتے نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ اس کے باوجود یہ قہقہے اس نفیس اور شائستہ خاتون پہ جچ رہے تھے' حیرت کی بات تو یہ تھی۔ البتہ تقدیس کو جو چیز نہیں جچ رہی تھی وہ اس کی گفتگو تھی۔
"دیکھ لینا' ایک نہ ایک دن میرے ہی پاس آؤ گی اپنی محبت کو لے کر اور لو۔۔۔ وہی ہوا لیکن فرق صرف یہ ہے کہ میں کسی لڑکے کو Expect کر رہی تھی۔۔۔ اور نکلیں تم۔۔۔"
وہ ہنستی جا رہی تھی اور تقدیس کی حیرت دوچند ہوتی جا رہی تھی' اس نے ماں بیٹی کے رشتے میں اتنی بے تکلفی اور اس قدر بے باکی اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

"سوری۔۔۔ سوری جانو۔۔۔" ایکا ایکی وہ اپنے قہقہے سمیٹ کر اس کا گال ہولے سے چھو کر معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگی۔
"تم نے اپنی فرینڈ کی کوئی خاطر وغیرہ بھی کی یا صرف ماما سے ملوانے پہ ہی ٹرخا دیا ہے۔" اب وہ مہمان نوازی کے تقاضے نبھانے لگی۔
"تم کہاں رہتی ہو؟"
"ماڈل ٹاؤن۔" تقدیس نے اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔
"کیا کرتے ہیں تمہارے فادر؟"
"فیوڈل فیملی سے ہیں محترمہ۔۔۔"
جواب اس کے بجائے سوہا نے دیا۔
"اوہ۔۔۔ کہاں سے Belong کرتی ہے تمہاری فیملی؟"
"جی۔۔۔ یہیں پنجاب سے اور میری فیملی ضرور فیوڈل سسٹم پہ عمل پیرا رہی ہے مگر میرے فادر بہت روشن خیال اور تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ وہ اس سسٹم کا حصہ نہیں ہیں۔ پہلے گورنمنٹ سروس میں رہے پھر ریٹائرمنٹ کے بعد اب بزنس اسٹارٹ کیا ہے۔"
"دیٹس گریٹ۔۔۔ کس قسم کا بزنس؟"
"ماربل کا۔۔۔"
"اور گورنمنٹ سروس میں؟" اس نے بلاوجہ تفصیل جاننا چاہی۔ مقصد صرف سوہا کو اطمینان دلانا تھا کہ وہ اس کی خاص الخاص دوست کو خاص الخاص اہمیت دے رہی ہے۔
"بیوروکریسی میں تھے' جعفر محمود نام ہے ان کا۔"
اور سرسری انداز میں ایسے سوال کرتی ریتا' جسے سوالوں کے جوابوں سے کوئی خاص دلچسپی ہی نہ تھی۔۔۔ چونک کر رہ گئی۔
"جعفر محمود۔۔۔"
عرصہ بعد اس کے لبوں نے پھر سے وہی سرگوشی کی۔

❦❦❦❦

"اماں جی نے ایک بڑی عجیب سی بات کہی ہے مجھ سے۔" پروین نے سراج دین کا موڈ اچھا دیکھ کے تمہید باندھی۔
"اب؟" انہوں نے اخبار کے پیچھے سے ہی سوال کیا۔
"کیا مطلب؟" وہ الجھیں اس بے تکے سوال سے۔
"میرا مطلب ہے اب کی ہے؟ اتنے سالوں کے بعد؟ جبکہ اب بہو خاصی پرانی بھی ہو گئی ہے۔"
انداز سراسر غیر سنجیدہ اور تضحیک سے بھرپور تھا جس پہ اچھے بھلے خوشگوار موڈ میں بھی پروین جل کے خاک ہو گئیں۔ یہی تو کمال تھا سراج کا۔ اگر سادہ سے سادہ الفاظ بھی استعمال کیے جاتے تب بھی لہجہ ایسا سوئیاں چبھونے والا ہوتا کہ سننے والا دیر تک کسک محسوس کرتا۔
"صاف صاف کہیں کیا کہنا چاہتے ہیں؟"
"بھئی میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسی شکایتیں بیویاں شادی کے ابتدائی سالوں میں کیا کرتی ہیں اپنی ساسوں

کی۔۔۔ تم اب کر رہی ہو۔ اب میں کیسے مان لوں کہ میری ماں نے اتنے سالوں میں تم سے کوئی بات نہیں کی
عجیب۔۔۔ نہ غریب۔۔۔ تو اب کیا کریں گی۔ ویسے بھی تم دونوں دنیا کی سب سے انوکھی ساس بہو ہو ایک دوسرے کا
عکس۔۔۔ اب چوتھائی صدی کا ریکارڈ کیوں خراب کرتی ہو ساس کی جھوٹی شکایتیں لگا کے۔"

"توبہ توبہ۔۔۔" پروین نے کلے پیٹے۔

"میں کیوں لگانے لگی شکایتیں۔ وہ بھی جھوٹی اور وہ بھی اماں جان کی۔ میں تو صرف یہ بتا رہی ہوں کہ انہوں نے میرا دھیان ایک ایسی بات کی جانب دلایا ہے جہاں کبھی ہمارا خود سے دھیان گیا ہی نہیں۔"

"مثلاً"۔۔۔ کس جانب؟" وہ سنجیدہ ہوئے۔

"حسن کی شادی کے بارے میں۔"

"جہاں تک میرا خیال ہے تمہارا دھیان اس مسئلے کی جانب پچھلے ڈیڑھ سالوں سے ہے۔"

"لیکن عملی قدم تو نہیں اٹھایا اب تک۔ جہاں تک ارمانوں کی بات ہے تو وہ تو بیٹے پیدا ہوتے ہی دل میں خود بخود جاگ جاتے ہیں' میں نے بھی کب سے اس گھر میں بہو لانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ شکر ہے کہ کچھ حسن کے دلچسپی نہ دکھانے کی وجہ سے اور کچھ قدرتی طور پر یہ کام ٹلتا رہا۔۔۔ ورنہ میں اگر کسی لڑکی کو منتخب کر بیٹھی ہوتی اور بعد میں اماں جان کی خواہش کا علم ہوتا تو کتنی شرمندگی اور پچھتاوا ہوتا۔"

"کیا انہوں نے کسی لڑکی کے بارے میں خواہش ظاہر کی ہے' حسن کے لیے؟"

"جی۔۔۔ بالکل۔۔۔ اور پتا ہے کس کے لیے؟"

سراج دین نے اخبار سمیٹ کر ایک جانب رکھ دیا اور ذرا سا آگے ہوئے۔

"کون؟"

"ہما۔۔۔ اپنی ظلِ ہما۔" پروین نے خوشی سے کپکپاتی آواز میں بتایا۔

ردعمل کے طور پر سراج کتنی دیر کچھ بول نہ سکے۔

اور جب بولے تو الفاظ حلق میں اٹک رہے تھے۔

"ہما۔۔۔ وہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ والی ہما۔۔۔؟"

"جی۔۔۔" انہوں نے سرہلا کے انہیں یقین دلایا۔

سراج دین نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے اپنا سر تکیے سے ٹیک دیا۔

"یا اللہ۔۔۔ تیرا شکر ہے۔۔۔"

"کس بات کا شکر ادا کر رہے ہیں آپ!"

پروین کے لیے ان کا یہ طرز عمل حیرت انگیز تھا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ یہ بات جاننے کے بعد وہ حیران بھی ہوں گے اور خوش بھی۔۔۔ لیکن وہ حیران اور خوش ہونے کے باوجود اس سے کہیں زیادہ مطمئن اور مسکور نظر آ رہے تھے۔ "اپنی مراد بن کہے پوری کر دینے پہ۔۔۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کبھی میں یہ خواہش زبان پہ نہیں لایا۔۔۔ لیکن دیکھو ماں' ماں ہوتی ہے' کیسے بنا کہے سمجھ گئیں وہ۔۔۔"

"اگر آپ اتنا ہی چاہتے تھے تو کہا کیوں نہیں؟"

"بس عجیب سی جھجک آتی تھی۔۔۔ اور کوئی خاص ہما کے لیے نہیں بلکہ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ میری ایک بچی میری بہو بن کے آجائے پھر چاہے وہ ہما ہو' ندا یا ردا۔۔۔ لیکن کہا اس لیے نہیں کہ یہ گھریلو۔۔۔ اور خالصتاً "زنانہ امور تھے۔۔۔ مجھے ان میں دخل دینا مناسب نہیں لگا۔"

"کیا بات ہوئی بھلا۔ آپ باپ ہیں حسن کے' اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے بارے میں ایسی جھجک۔"
"چلیے۔۔۔ جو ہوا۔۔۔ ہو گیا۔۔۔ اچھا ہی ہوا۔۔۔ اماں جان کا بھی مان بڑھا۔۔۔ بے شک ہماری رضامندی اور خوشی اس میں ہی ہے لیکن انہیں یہ خوشی تو حاصل ہو گی کہ یہ ان کے ایماء پہ ہو رہا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔"

"بھائی صاحب اور بھابی کیا کہتے ہیں؟"

"لیجیے۔۔۔ ان سے کب بات ہوئی ہے ابھی۔۔۔"

"تو کر۔۔۔ دیر کس لیے۔" وہ اتاؤلے ہو رہے تھے۔

"ہاں۔۔۔ بس ایک آدھ دن میں کرتے ہیں۔ بے شک گھر کی بات ہے۔ چار سیڑھیاں چڑھ کے اوپر جانا ہے لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ پورے وضع داری اور طور طریقے نبھاتے ہوئے ہی کرنی پڑے گی۔ اماں جان غیر رسمی طور پر بھابی کے کان میں یہ بات ڈال دیں گی' پھر ہم باضابطہ رشتہ لے کر چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک۔۔۔"

زندگی میں بہت کم ایسے مواقع آئے تھے جب سراج دین نے پروین کی کسی بات کے جواب میں "ٹھیک" کہا

☼ ☼ ☼

"امی مجھ سے شادی کے لیے میری پسند پوچھ رہی ہیں۔۔۔ تمہارا نام رکھ دوں ان کے سامنے؟"

حسن کی کہی بات بار بار اس کے اطراف گونج رہی تھی اور وہ ہر بار نئے سرے سے ہراساں ہو جاتی تھی۔

"یہ کیا کہہ دیا حسن بھائی نے۔۔۔ کیوں کہا۔۔۔؟ انہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔۔۔ ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ آخر میں نے بھی تو کبھی ان کے بارے میں ایسا نہیں سوچا۔۔۔ پھر کیوں وہ میرا نام لینا چاہتے ہیں۔۔۔ کیوں؟"

وہ الجھ رہی تھی۔۔۔ ساتھ ساتھ خود کو ملامت کر رہی تھی کہ کیوں نہ صاف الفاظ میں اسی وقت منع کر دیا۔

"نجانے کیا ہو گیا تھا مجھے۔۔۔ کیوں نہیں کچھ کہہ سکی۔۔۔ اور پتا نہیں انہوں نے میری خاموشی کا مطلب کیا لیا ہو گا؟" پھر ایک نئی فکر لاحق ہوئی۔

"یا اللہ۔۔۔ کہیں وہ جو کہہ رہے تھے' اس پہ عمل نہ کر دیں۔ کہیں عمل کر ہی نہ دیا ہو۔۔۔ یا اللہ میں کیا کروں۔۔۔ کیسے روکوں انہیں۔۔۔؟ کیا فون کروں۔۔۔؟ ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اس کے ہاتھ تیزی سے فون کی جانب بڑھے۔

"نہیں۔۔۔" وہ ست ہو کر پیچھے ہٹی۔

"وہ پوچھیں تو کیا کہوں گی۔۔۔؟ یہ تو مر کے بھی نہیں کہہ سکتی کہ میں آپ کے بجائے وصی سے۔۔۔ نہیں۔" اس نے لب زور سے کچل ڈالے۔ "تو کیا کہوں؟ سچ کہنے لائق نہیں ہے۔۔۔ اور جھوٹ بولنے لائق نہیں تو پھر۔۔۔؟ ہاں۔۔۔ تھوڑا سچ۔۔۔ تھوڑا جھوٹ۔۔۔"

وہ دل ہی دل میں مناسب اور موزوں جواب ترتیب دینے لگی۔

"حسن بھائی' میں نے کبھی آپ کے بارے میں ایسا نہیں سوچا بلکہ ہمیشہ آپ کے روپ میں اپنے بڑے بھائی کو دیکھا ہے۔ آپ نے ایسی بات کر کے انجانے میں مجھے بہت بڑا دکھ دیا ہے۔ اس کی تلافی اسی صورت ہو سکتی ہے کہ آپ میرے متعلق ایسا ہر خیال جھٹک دیں۔ جو آپ چاہتے ہیں وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔۔۔ کیونکہ جسے میں بڑے بھائی کے طور پہ آئیڈیلائز کر چکی ہوں اسے۔۔۔ امید ہے آپ میرا نکتہ نظر سمجھ گئے ہوں گے اور اس سے اتفاق کرتے ہوئے میری بات کا برا بھی نہیں مانیں گے۔"

بڑے ہی نپے تلے الفاظ پہ مشتمل یہ مختصر سی تقریر اس نے فوراً" تیار تو کرلی مگر اسے پیش کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتی۔۔۔

حسن کا نمبر ملا کے ایک بھی بیل کا انتظار کیے بغیر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

"نہیں۔۔۔ میں نہیں کرسکوں گی۔۔۔ ناممکن۔۔۔ کبھی بھی نہیں کہہ سکتی میں یہ سب۔۔۔" وہ بے دم ہو کر بیٹھ گئی۔
"کاش۔۔۔ کاش وصی! تم میرے دل کی آواز سن چکے ہوتے۔ کاش تمہارے دل میں بھی میرے لیے وہی محبت جاگ چکی ہوتی جو میرے دل میں تمہارے لیے عرصے سے ہے۔۔۔ تو۔۔۔ تو یہ مرحلہ کتنی آسانی سے سر ہو جاتا۔ تم مجھے زحمت دیے بغیر خود سارا معاملہ سنبھال لیتے لیکن اب۔۔۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب جب کہ تم میرے دل کے حال سے واقف تک نہیں ہو۔"

وہ تکیے کو بھگوتی اس کے تصور سے چپکے چپکے گلے کررہی تھی۔ اپنی نوعمری کی محبت کے دکھ اکیلے ہی جھیل رہی تھی، جب منزہ نے آہستگی سے اس کے کمرے کا دروازہ دھکیلا۔۔۔ نیم تاریکی کے باعث وہ اسے فوری طور پر نظر تو نہ آسکی مگر اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں ضرور منزہ کے کانوں تک پہنچ گئیں۔

حیران ہوتے ہوئے اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اس سے پہلے کسی ہچکی کی صورت ایک نام وشمہ کے لبوں سے آزاد ہوا۔

"وصی۔۔۔" منزہ کے ذہن نے ایک دم ہی وصی تک رسائی حاصل نہیں کی بلکہ بے حد تعجب کے ساتھ وہ وشمہ کے کسی کلاس فیلو کے بارے میں سوچنے لگی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وشمہ تو کو ایجوکیشن میں پڑھتی ہی نہیں۔۔۔ پھر؟

"شاید کسی فرینڈ کا بھائی یا کزن وغیرہ ہو۔۔۔" اور لفظ "کزن" کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

"کزن۔۔۔ وصی۔۔۔ حسن اور حسان کا کزن۔۔۔ پروین کی نند کا بیٹا۔۔۔" وہ فوراً" نتیجے پہ پہنچ گئی۔۔۔ اور اسی آہستگی سے دروازہ بند کرکے پلٹ گئی۔

اپنی کچی عمر کے کچے خوابوں کے دکھ روتی وشمہ کو نہ اس کے آنے کی خبر ہوسکی نہ جانے کی۔

☼ ☼ ☼

"ایک اچھی خبر ہے اماں جان!"

ابھی شوکت جہاں بیگم رخشندہ کے پاس جانے کا ارادہ ہی باندھ رہی تھیں کہ وہ خود مسرت سے دمکتا چہرہ لیے سامنے تھی۔

"ماشاءاللہ۔۔۔ کیا خبر ہے؟"

"ندا کے لیے رشتہ آیا ہے۔۔۔ بلکہ آیا کیا۔۔۔ آنے والا ہے۔ ابھی تو انہوں نے آنے کا قصد ظاہر کیا ہے۔"

"کون لوگ ہیں؟"

"ان کے جاننے والے ہیں۔۔۔ بہت قریبی دوست تو نہیں مگر شناسا ضرور ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا۔۔۔ وہاں پہ سارے لوگ گئے بھی تھے ان کے ہاں شادی پہ۔۔۔ بلاوا تو سب کا تھا مگر صرف میں اور ندا جاسکے تھے۔"

"ہاں۔۔۔ کچھ یاد تو پڑتا ہے۔"

"ان کے جاننے والوں کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہیں پہ اپنے بیٹے کے لیے ہماری ندا کو پسند کرلیا۔۔۔ اب باضابطہ رشتہ لے کے آنا چاہ رہے ہیں۔"

"بسم اللہ۔۔۔ جلدی بلاؤ۔"

"یہی مشورہ کرنے آئی تھی۔۔۔ اتوار کی شام کو بلالوں؟"

"اتوار میں پانچ روز ہیں، جمعہ کے مبارک دن کیوں نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"لڑکا کیا کرتا ہے، خاندان کیسا ہے؟" انہوں نے مزید تفصیلات جاننا چاہیں۔

"اماں جان۔۔۔ اگر پتا ہوتا کہ ان کا یہ ارادہ ہے تو میں جب گئی تھی تو گہری نظر سے جائزہ لے کر آتی۔۔۔ لیکن میں تو بس رسمی سی شرکت کی وہ بھی صرف ایک فنکشن میں۔۔۔ لڑکے کا بھی تعارف ہوا تھا تب لیکن میں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔"

"حالانکہ بیٹیوں کی ماؤں کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔"

"ویسے خاندان تو اچھا ہے۔ پڑھا لکھا۔۔۔ مناسب اور میانہ روی کی حد تک روشن خیال۔۔۔ ملنسار لوگ۔ لڑکا ہوگا کوئی 33'34 سال کا مگر دیکھنے میں لگتا نہیں ہے۔ اپنی ندا کی طرح عمر پورہ ہے۔" وہ ہنسیں۔ "بہنیں بیاہی ہیں۔ ایک بڑی اور ایک چھوٹی جس کی دو ماہ پہلے شادی تھی۔۔۔ ماں باپ اور بس یہ۔۔۔ الیکٹرونکس بزنس کرتا ہے مال روڈ پہ۔۔۔ باپ بھی اس کاروبار میں ہے بس یہ ہے اماں جان کہ۔۔۔" وہ ذرا سا ہچکچائیں۔۔۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولیں۔

"ذات برادری سے باہر کا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ میں نے نہ پہلے کبھی اسے مسئلہ بنایا ہے نہ آئندہ بننے دوں گی۔ بس لڑکا تعلیم یافتہ، ہنرمند اور شریف ہو۔ گھرانہ سادا اور پرخلوص ہو۔"

"یہ خوبیاں تو ہیں ان میں۔۔۔ میرا مطلب ہے نظر تو آئی ہیں۔"

"ان شاءاللہ ہوں گی بھی۔ اتنی اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔۔۔ لو اب ایک اچھی خبر مجھ سے سنو۔۔۔"

وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بہو کے قریب ہوئیں اور یہ سوچ سوچ کے ہی مزا لینے لگیں کہ خوشیاں حقیقی معنوں میں کیسے ہوتی ہیں، یہ آج وہ رخشندہ کو بتائیں گی۔

○ ○ ○

"لڑکی۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔۔۔" رخشندہ کے ہاتھ پیر پھولے جارہے تھے۔

وہ اس ایسے گم ہوئے تھے کہ کسی کو یہ بتانے تک کا ہوش نہ تھا کہ ندا کو دیکھنے نیازی فیملی تو آہی رہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ظل ہما کے لیے پروین بھی اپنی خواہش ظاہر کرنے والی ہے۔ زیادہ شور نیازی صاحب کے گھرانے کا تھا۔۔۔ کہ دوسری بات تو گھر کی تھی۔ گھر میں ہی نمٹ جاتی۔ معراج دین کو بھی شوکت جہاں نہ بتاتیں تو وہ سارے بے خبر ہی رہتے۔ سن کر جہاں بے پایاں مسرت ہوئی وہیں رخشندہ پہ ہلکا سا غصہ بھی کیا۔

"کمال ہے، اتنی اہم بات اور تم نے مجھ سے ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"ایک گھر کی ہی تو بات ہے، میں نے نہیں بتایا تب بھی پتا تو چل گیا آپ کو۔۔۔ اماں جان نہ بتاتیں تو کوئی اور بتادیتا۔"

اور اس کے علاوہ نہ ندا جانتی تھی نہ ہما۔۔۔

"گاؤ تکیے کے کور تو بدلو۔۔۔" رخشندہ نے پردے دھلائی کے لیے اتارتے ہوئے کہا۔

"دھلائی۔۔۔ پردوں، کشنز کی حد تک تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر گاؤ تکیئے تو اندر آپ کے کمرے میں ہیں۔ وہاں کون دیکھنے آئے گا۔ اور پرسوں ہی تو نئے چڑھائے تھے۔"

"نئے نہیں۔۔۔ دھلے ہوئے۔۔۔ نئے تو یہ ہیں۔۔۔ دیکھو میرے جہیز کے۔ اب تک سنبھالے ہوئے ہیں۔ کام دیکھا ہے ان کا؟"

"توبہ امی۔۔۔ گاؤ تکیے آرام سے ٹیک لگا کے بیٹھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ بھلا ان سے ٹیک لگا کے کون آرام سے رہ سکتا ہے۔ اتنا بھرا ہوا شیشوں کا کام اور کڑھائی۔"

ہما نے ناک چڑھا کے ان کے جہیز کی سوغات میں کیڑے نکالے تو وہ برداشت نہ کر سکیں۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ تمہیں پتا بھی ہے آج اس کام کی کیا قیمت ہے؟ ہونہہ۔۔۔ ادھر دو مجھے۔ بس کام سے بچنے کے بہانے۔۔۔ اور فکر مت کرو۔ تمہارے جہیز میں یہی رکھوں گی میں۔۔۔ جو چبھ رہے ہیں تمہیں۔"

"امی۔۔۔ میں تو۔۔۔" ہما خفیف سی ہو گئی۔

"اور جب لوگ آ آ کے سسرال والوں سے پوچھیں گے کہ یہ غلاف کہاں سے لیے، تب یہی ڈیڑھ انچ کی گردن جو ہلا ہلا کے نقص نکال رہی ہو، تب چھ انچ باہر نکال کے فخر سے کہو گی میرے جہیز کے ہیں۔"

ردا کے کھلکھلانے پہ ہما کی خفت اور سوا ہو گئی۔

"تم تو چپ رہو۔۔۔ کتابوں کے پیچھے دبکی رہتی ہو تاکہ کام کوئی نہ کرنا پڑے۔"

"اور تم کاموں میں جتی رہتی ہو تاکہ پڑھنے سے بچنے کا بہانہ ملا رہے۔" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اب تم دونوں چونچیں لڑانا چھوڑو، جاؤ جا کے کچن کی خبر لو۔"

"مزے میں ہے کچن، عیش کر رہا ہے۔ برسوں بعد بھاگ جاگے ہیں کچن کے۔ ایک طرف مرغیاں اور تلے شہید ہوئی پڑی ہیں۔ ایک جانب بکرا صاحب اپنی ران رکھے کہہ رہے ہیں۔۔۔ جاؤ تمہیں جگر کا۔ سوری ٹانگ کا ٹکڑا سونپا۔۔۔ خیال رکھنا۔۔۔ دھیان سے پلاؤ دم دینا۔ ایک تسلے میں مچھلی حیران حیران پریشان پریشان آنکھیں پھاڑے تک رہی ہے 'یا اللہ میں کہاں آ گئی۔۔۔ چولہا الگ دنگ ہے 'الٰہی۔۔۔ یہ آج مجھ پہ اکھٹا پانچ سیر دودھ ابل رہا ہے؟ اگر میں گیس کا نہ ہوتا، مٹی کے تیل کا ہوتا تو حیرت کے مارے پھٹ جاتا۔"

وصی نے اندر داخل ہوتے ہوئے بے تکان تبصرہ کیا جس پہ ہمیشہ کی طرح رخشندہ جز بز ہو کے رہ گئیں۔ ردا کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ جبکہ ہما اپنی دھڑکنیں سنبھالنے لگی۔

"خیر کی بات منہ سے نکالو۔۔۔ یہ کیا چولہے پھٹنے کی واہی تباہی بولے جا رہے ہو۔"

رخشندہ کو اعتراض تو بیان کے کل حصے پہ تھا، مگر ظاہر آخری حصے پہ کیا۔

"ہاں بھئی، آج تو ہماری باتیں بری لگیں گی۔ آخر سمدھیوں کی یلغار جو ہونے والی ہے؟"

وہ اس اعتراض کو قطعی خاطر میں نہ لاتا، نزدیک رکھے صوفے پہ گر گیا، پاس بیٹھی ہما ذرا سا پرے سرکی۔ اس کے کاٹن کے ایش گرے کرتے سے اٹھتی "لیونڈر" کی خوشبو اندر تک گھس رہی تھی۔

رخشندہ اس کی بات پہ ہلکا سا مسکرا دیں پھر دوبارہ بیٹیوں کو احکامات دینے لگیں۔

"تم دونوں اب تک یہیں بیٹھی ہو۔ ردا تمہارے ذمے تو سب سے آسان کام ہے، ٹرائفل، سلاد اور رائتہ وغیرہ۔۔۔ جلدی شروع ہو جاؤ۔۔۔ یہ چیزیں سب سے پہلے بنا کے فریج میں رکھ دینی چاہئیں۔ عین وقت پہ ایسی غیر اہم چیزیں عموماً بھول جایا کرتی ہیں۔"

"سب سے آسان؟" وہ احتجاجاً چلائی۔

"سب سے زیادہ سبزیاں، پھل اس میں کاٹنے پڑتے ہیں۔"

"ہاں میرے حصے میں تو جیسے بڑے آسان کام آئے ہیں؟" ہما نے منہ بسورا حالانکہ کھانا پکانا اس کا شوق تھا اور وہ پکاتی بھی اچھا تھی۔

"توے والی مچھلی، پلاؤ، کڑاہی گوشت، کوفتے۔۔۔ واہ بڑی دانی۔۔۔ سارے کے سارے آئٹم آج ہی۔۔۔ وہ بھی اکٹھے؟ لگتا ہے سمدھیوں کو چاروں شانے چت کرنا ہے۔"

معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ اس کے علم میں آ چکا تھا کہ حسن کے لیے ہما کا ہاتھ مانگا جانے والا ہے۔

سمجھ لو۔" وہ بھی مبہم سا مسکرائیں۔

اور آپی۔۔۔ ان کے مزے ہیں۔۔۔ آرام سے کالج چلی گئیں۔۔۔ حالانکہ ان کے حصے سب سے زیادہ کام لگانے تھے۔"

فضول مت بولو۔۔۔ جاؤ جا کر کام کرو۔"

وقت انہیں اچانک خیال آیا، ہما کو حقیقت بتانے کا لیکن پاس ہی پھیل کر بیٹھے وصی کو دیکھ کر انہوں نے یہ خیال ترک کر دیا کہ نجانے اس کے سامنے اس بات پہ ہما کیسا محسوس کرے۔

ہیلپ کرتا ہوں تمہاری۔"

کچن میں جاتی ہما نے اپنی پشت پہ وصی کی آواز سنی تو تھم کے رہ گئی۔

اس کے پیچھے پیچھے بے تابی سے لپکا آ رہا تھا۔

ہما کے انگ انگ سے مسکراہٹ چھلکنے لگی۔

☆ ☆ ☆

حسن بیٹا! تم سے ایک بات کرنا تھی۔"

کل آپ باتیں بہت کرنے لگی ہیں امی۔۔۔ کبھی ابو سے۔۔۔ کبھی مجھ سے۔۔۔" وہ الماری میں گھسا کپڑے نکالتا ہوا کہنے لگا۔

بے مقصد باتیں نہیں ہیں بیٹا۔۔۔ مطلب کی ہیں۔" وہ اندر ہی اندر مزا لیتے ہوئے مسکرائیں۔

اوہ آپ بھی مطلبی ہو گئیں والدہ محترمہ۔ زمانے کی ہوا لگ گئی آپ کو۔" اس نے ہینگ کیا ہوا سوٹ نکالا۔۔۔

"تو اب تمہیں لگنے والی ہے بیٹا جی۔۔۔"

سوٹ ہینگر سے اتارتے اتارتے وہ ٹھٹھکا۔

"تمہیں پتا ہے آج کیا ہے؟"

"بالکل۔۔۔ آج جمعہ ہے اور میں نماز کے لیے ہی یہ اہتمام کر رہا ہوں والدہ محترمہ۔"

"اور۔۔۔ اس کے علاوہ؟"

مسکراہٹ تھی کہ پروین کے ہونٹوں سے جدا نہ ہو رہی تھی۔

اس کے علاوہ۔۔۔ اس کے علاوہ بائیس تاریخ ہے۔۔۔ برتھ ڈے تو کسی کا ہے نہیں۔۔۔ ہاں شام کو تایا جان کے دوست کی فیملی آ رہی ہے۔۔۔ ندا کے رشتے کے لیے۔"

یہاں تک تو صحیح پہچانا۔۔۔ اب مزید بوجھو۔ کہ اس کے علاوہ اور کیا خاص بات ہے آج؟"

پہیلیاں بجھوا رہی ہیں امی۔"

ایک اشارہ دیتی ہوں۔۔۔ بات جو بھی ہے تمہارے متعلق ہے۔ تمہاری خوشی ہے اس میں۔"

میری خوشی!"

کی صورت چھم سے ذہن کے پردے پہ جگمگانے لگی۔

ندا کی نہیں، تمہارے رشتے کی بات بھی ہونے والی ہے آج۔" اس سے پہلے کہ اس کے لبوں سے بے اختیار رخشندہ کا نام ادا ہو جاتا، پروین نے اسے چونکنے پہ مجبور کر دیا۔

"کس کے؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"ایسی کوئی نرالی بات بھی نہیں۔۔۔ کتنے دنوں سے تو ذکر کر رہی تھی میں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ اچانک۔۔۔ کیسے؟"

وہ ٹھیک ٹھاک الجھ کے رہ گیا۔۔۔ "کیسے" کے بجائے "کس سے" کا سوال زیادہ چک پھیریاں کھا رہا تھا اور ذہن میں۔

"اچانک ہی سہی۔ مگر ہے بروقت فیصلہ۔۔۔ اور ایسا جس میں ہمارے سارے گھر کی خوشیاں وابستہ ہیں۔"

"اور میری؟" اس کا دل کراہ کے رہ گیا۔

"ہم سب نے تمہارے لیے ہما کا انتخاب کیا ہے۔"

"ظل ہما کا۔۔۔؟" وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

"کیوں۔۔۔ ہے ناں ہمارا انتخاب لاجواب۔۔۔"

پروین اتنے مان سے اس کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھیں کہ وہ فوری طور پہ انکار میں سر ہلانے کی ہمت نہ کر سکا۔

ماں کی آنکھوں میں جھلملاتے آس کے دیے اس کے چہرے کو اتنا حسین بنا رہے تھے کہ وہ منہ پھیرنے پہ مجبور ہو گیا۔

"امی۔۔۔ میں۔۔۔" ایک بار جی میں آئی۔۔ انکار کر دے۔۔۔ صاف انکار۔۔۔ وشمہ کا نام لے لے مگر۔۔۔"

"تمہاری دادی کی برسوں پرانی خواہش تھی۔۔۔ اور تو اور تمہارے ابو بھی یہی چاہتے تھے۔۔۔ دونوں کو اتنا پرسکون اور مطمئن میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کے رہ گیا۔

طبیعت میں نہ اتنی خودسری تھی۔ نہ اپنی بات ضد کر کے منوا لینے کی عادت۔۔۔ ہمیشہ سے ہر معاملے میں سر جھکا کے ہاں کر دینے کی خو گھٹی میں پڑی تھی اب کیسے سینہ ٹھونک کر اس فیصلے سے اختلاف ظاہر کر دیتا جس فیصلے پہ ماں باپ اور دادی اتنے مطمئن نظر آ رہے تھے۔

"لیکن وشمہ۔۔۔ اگر میں نے اس سے اپنے دل کا حال نہ کہا ہوتا تو دوسری بات تھی۔ اب وہ سب جان چکی ہے۔ میرے اظہار کے بعد اس نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ مگر وہ منتظر تو ہو گی میرے اگلے قدم کی اور میں۔۔۔ کیا کرنے جا رہا ہوں۔ فقط اپنی فطری بزدلی کی وجہ سے میں ایک معصوم لڑکی کے جذبات کو چھیڑ کے اسے تشنہ چھوڑ دوں۔ آج میں اس سے اظہار محبت کر کے آ رہا ہوں' کل میری شادی کی۔۔۔ کسی اور سے شادی کی خبر اس تک پہنچے گی۔۔۔ کیا گزرے گی اس گھٹیا مذاق سے اس کے نازک دل پہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

آخر کار دل کڑا کر کے اس نے کہہ دیا۔

"امی! میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنی جلدی۔۔۔ ابھی اس سب کی کیا ضرورت ہے؟"

"جلدی۔۔۔؟ کیوں بھئی سترھویں سال میں لگے ہو کیا؟" وہ چھیڑنے لگیں۔۔۔ حسن مسکرا تک نہ سکا۔

"ابھی ندا کا معاملہ تو طے پانے دیں۔ اچھا نہیں لگتا کہ ایک غیر خاندان باہر سے آ رہا ہے رشتہ لے کر درمیان میں ہم اپنی ٹانگ گھسائیں۔۔۔ تایا' تائی کیا سوچیں گے۔"

"سوچنا کیا ہے' وہ تو بے حد خوش ہیں۔ تم بے کار کے وہم پال رہے ہو۔ ماں باپ کے لیے اس سے بڑی بات کیا ہو گی کہ ان کی بیٹیوں کے اللہ مناسب سبب پیدا کر دے اور ایک ہی دن میں اگر دونوں کا رشتہ طے ہو جاتا ہے تو اس سے زیادہ خوشی کا مقام ان کے لیے کیا ہو گا۔ تمہاری تائی کے تو قدم زمین پہ نہیں ٹک رہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟ وہ۔۔۔ وہ جانتی ہیں؟" وہ بری طرح چونکا۔

آپ لوگ تو آج جانے والے ہیں رشتہ لے کر۔"

ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ پہلے سے اطلاع کرنی ہوتی ہے۔ کوئی اچانک جا کے دھماکہ تھوڑا ہی کرتا ہوتا ہے۔ پہلے اشارتاً" یا کسی اور کے ذریعے کانوں میں بات ڈالی جاتی ہے پھر جایا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ منہ اٹھا کے چل دیے' وہاں جا کے پتا چلے کہ ان کی مرضی کچھ اور ہے اور پھر اپنا سا منہ لے کر واپس آؤ۔ سامنے والے کی رضامندی ملنے کے بعد جایا جاتا ہے۔ بعد میں تو رسمی کارروائی ہوتی ہے۔ یہ جو نیازی فیملی آ رہی ہے' انہوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔"

"آپ نے بھی۔۔۔؟" وہ بے دم ہو کر بیڈ پر گر گیا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ جو طریقہ ہے اس کے مطابق ہی چلنا ہے۔ کیوں؟"

کچھ کہنے یا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بہت سے لوگوں کی امید توڑ دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"جتنی توجہ تم پلاؤ کو دم دینے میں دے رہی ہو' اس کی آدھی توجہ بھی اپنے چہرۂ مبارک پر دے لو تو نتائج اچھے نکل سکتے ہیں؟"

وہی۔۔۔ جو آیا تو ہیلپ کرنے تھا۔۔۔ مگر اب اس کا دماغ اور گاجریں مسلسل کھا رہا تھا۔

ہما جو اس کے اپنے پیچھے کشاں کشاں چلے آنے پہ مسرور و مغرور سی ہو گئی تھی۔۔۔ پل بھر میں کئی خوش خیال بیٹھی تھی۔ اب اس کی بے سروپا گفتگو سن سن کر دل جلا رہی تھی۔

"کیا ہے میرے چہرے کو۔۔۔؟ کیا خرابی ہے؟"

"نہیں خرابی کوئی نہیں ہے۔۔۔" اس نے اطمینان بھری نظر اس کے لال بھبھوکا چہرے پہ ڈالی جو کچھ گرمی سے کچھ غصے سے ایسا ہو رہا تھا۔

"خرابیاں ہیں۔۔۔"

"مت دیکھو۔۔۔" وہ بھنا کے آٹے پہ زور زور سے مکے مارنے لگی۔

"اب تو ساری عمر دیکھنا پڑے گا آپ کو۔۔۔"

اس نے معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اس کے ناراض ناراض سے چہرے پہ شرارت سے بھرپور نظر ڈالی۔

ظل ہما کا اندر جیسے جھنجھنا اٹھا۔

"ظاہر ہے جی۔۔۔ بزرگوں کے فیصلے کے آگے ہم کل کے بچے کیا دم مارنے کی مجال رکھتے ہیں۔"

"یہ کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو؟"

بڑی مبہم سی باتیں' جو مطلب اس پہ کھول رہی تھیں' وہ یقین نہ کر پا رہی تھی۔۔۔ بھلا ایسے کیسے۔۔۔

"کیا سمجھی۔۔۔ فضول باتیں۔۔۔ تو اب یہ باتیں فضول ہیں۔ یعنی میں جا کے کہہ دوں دادی جان سے۔۔۔ آپ جس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کے پروگرام بنا رہی ہیں' اس کے خیال میں ایسے تمام پروگرام فضول ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ اور ہما نے فوراً" آٹے سے سنے ہاتھ آگے کیے۔

"نہیں۔۔۔"

"کیا نہیں۔" وہ مڑا۔۔۔ شرارت آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسا مذاق ہے وصی؟" وہ روہانسی ہو گئی۔۔۔
دل تھا کہ ناچنے کو بے چین ہو رہا تھا اور وصی کی سابقہ شرارتیں اور لاابالی رویہ یاد آتا تو خوفزدہ سی ہو جاتی۔۔۔ کہ کہیں یہ بھی اس کا کوئی مذاق۔۔۔ کوئی شرارت نہ ہو۔۔۔
"مذاق؟ لگتا ہے تمہیں تب یقین آئے گا جب امی تمہارے ہاتھوں میں انگوٹھی پہنائیں گی۔"
ہما کے جسم کا سارا خون چہرے پہ جمع ہو گیا۔
وصی شوشہ چھوڑ کے جا چکا تھا اور وہ تصدیق کے لیے جلے پیر کی بلی کی طرح کبھی ردا تک جاتی۔۔۔ کچھ پوچھے بغیر پلٹتی۔۔۔ پھر امی کے کمرے تک جاتی۔ ایسے ہی اس کا تیسرا پھیرا تھا جب رخشندہ نے نوٹ کیا اور اسے آواز دی۔
"ہما۔۔۔!" وہ سرعت کے ساتھ پلٹی۔
"جی!"
"کیا بات ہے۔۔۔؟ کچھ کہنا ہے؟"
"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ پوچھنا تھا۔"
"کیا۔۔۔؟"
"کیا؟" وہ خود بھی دہرا کے رہ گئی۔۔۔ "ہاں۔۔۔ یہ کہ۔۔۔ کڑاہی میں مسالے تیز رکھنے ہیں یا ہلکے؟"
"ہلکے ہی رکھ لو۔۔۔ وہ لوگ تو نجانے کیسا کھانا پسند کرتے ہیں مگر تمہارے چچا اور دادی دونوں پھیکا کھاتے ہیں۔ ان کو مسئلہ ہو گا۔"
"وہ۔۔۔ وہ بھی ہوں گے۔"
"ہاں۔۔۔ ظاہر ہے۔۔۔"
اب کے رخشندہ کو سنجیدگی سے دھیان آیا ہما کو تفصیل سے آگاہ کرنے کا۔
"بھئی ایک تو ندا پہ جتنا حق ہمارا، ان کا بھی اتنا۔۔۔ دوسرا وہ ندا کے علاوہ بھی کسی خاص مقصد کے لیے آ رہے ہیں۔"
ہما خاموش رہی۔۔۔ مگر اس کی آنکھیں شدت سے سوالیہ انداز میں ماں کے چہرے پہ جمی تھیں۔
"تمہارے لیے۔"
"یعنی۔۔۔ وصی مذاق نہیں کر رہا تھا"
وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔۔۔ پھر رخشندہ کی مسکراہٹ دیکھ کر جھینپ گئی۔
"یعنی وصی نے پہلے ہی سب بتا دیا۔۔۔ چلو۔۔۔ میرا کام آسان کر دیا۔" وہ ہنسیں اور ہما۔۔۔ گلابی پڑتے چہرے کے ساتھ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

✲ ✲ ✲

"تیار نہیں ہوئے تم ابھی تک؟" پروین اندر آئیں تو اسے ابھی تک اسی حالت میں بیٹھا دیکھا۔
"میں کیا کروں گا اب جا کے۔"
وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔۔۔ تھکن آواز سے ظاہر ہو رہی تھی۔
"ندا کے بھائی کی حیثیت سے تو جانا ہی ہو گا۔ یا اپنی خوشی میں یہ بھی بھول گئے؟"
پروین نے چھیڑا۔۔۔ مگر وہ مسکرا تک نہ سکا۔
"جلدی کرو۔۔۔ تیار ہو جاؤ۔۔۔ نیازی فیملی آ چکی ہے۔"
وہ بے دلی سے اٹھا اور بیڈ پہ کب کا نکالا سوٹ اٹھا کے واش روم میں گھس گیا۔ بیس منٹ بعد کمرے سے نکلا تو سارا گھر خالی تھا۔۔۔ اوپر سے باتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ سب وہیں جمع تھے۔ وہ بھی بوجھل قدموں کے ساتھ

ڈرائنگ روم کے دروازے کے پردے تھامے وہ اندر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کچن سے نکلتی ہما کی جھلک دی۔۔۔ حسن نے کبھی اسے ان نظروں سے دیکھا تو نہیں تھا اس کے باوجود اسے شدت سے محسوس ہوا کہ نقوش اور سادہ سی شخصیت والی ظل ہما آج بے انتہا خوب صورت لگ رہی تھی۔ حالانکہ اس کی سادگی ہلکی تھی۔ شاید یہ خوب صورتی اس مسکراہٹ کی تھی جو اس کے لبوں پہ سجی تھی۔۔۔ اس خوشی کی تھی جو انا پور پور سے جھلک رہی تھی۔
"بس کرو۔۔۔ ہما۔۔۔ بیٹھ جاؤ ایک جگہ۔۔۔ کتنے چکر لگاؤ گی اور باہر کے۔" کچن میں موجود ردا نے چھیڑا تھا۔
اور پھر ندا کا جوابی مذاق۔۔۔
"یہ بے قراری ہے کہ کب چچا چچی کا نمبر آئے گا۔۔۔ کب اسے اندر بلایا جائے گا۔۔۔ کیوں ہما؟"
دیا سے سرخ پڑتی ہما کی نظریں اسی وقت حسن سے ٹکرائیں۔ حسن گھبرا کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا
نیازی فیملی سب کا منہ میٹھا کرا رہی تھی۔ ہاں ہو چکی تھی۔
حسن نے غائب دماغی کی کیفیت میں ندا کے متوقع شوہر ارسلان نیازی کا تعارف حاصل کیا۔۔۔ اس کھوئے انداز میں اس نے پروین کو کہتے سنا۔۔۔
"ہم بھی اپنے بیٹے حسن کے لیے ندا سے چھوٹی ہما کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔"
معراج دین نے خوش دلی سے بھائی کو گلے لگا لیا۔
یہ اقرار اور رضامندی کا ثبوت تھا۔
مبارک سلامت کے شور نے کچن میں بیٹھی ہما کے وجود کو پر لگا دیے۔
"ہما چلو جی اندر۔۔۔" ردا ماں کا پیغام لیے اسے بلانے آئی۔
"ماشاء اللہ۔۔۔ کتنی پیاری لگ رہی ہے میری ہما آج۔" پروین نے آگے بڑھ کے اس کا ماتھا چوما۔۔۔ اور اسے برابر بٹھا لیا۔
"لیجیے۔۔۔ آج سے آپ کی ہما اب ہماری۔۔۔"
ہما کے وجود پہ لگے پر۔۔۔ اسے اونچا۔۔۔ بہت اونچا اڑانے لگے۔
"پھر آپ کا بیٹا بھی ہمارا۔۔۔ بھئی اصول تو یہی ہونا چاہیے۔" معراج دین نے مذاقاً کہا۔
"حسن تو ہے ہی آپ کا۔۔۔ کہنے کی کیا بات ہے۔" چچا کی آواز پہ اس کے پھڑپھڑاتے پر ساکت ہوئے۔
"حسن۔۔۔" اس کے اندر یہ لفظ بازگشت بن کے گونجا۔
"ماشاء اللہ جوڑیاں بڑی اچھی جچی ہیں۔" شوکت جہاں نے مطمئن لہجے میں کہا۔
"دونوں کی دونوں۔۔۔ ندا اور ارسلان کی بھی۔۔۔ اور اپنے حسن اور ہما کی بھی۔"
"حسن اور ہما۔۔۔"
"ہما اور حسن۔۔۔"
پر ایک ایک کر کے الگ ہوئے تھے۔ اور وہ دھڑام سے نیچے آن گری۔
پر ایک ایک کر کے الگ ہوئے تھے اور وہ دھڑام سے نیچے آن گری تھی۔ اتنی زور سے کہ ذات کے پرخچے اڑ گئے تھے۔

"ہما اور حسن۔"

"ہما اور حسن..... حسن، حسن، حسن، حسن۔"

اس کی سماعتوں میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ارد گرد بیٹھے نفوس کو دیکھا۔ اس وقت ساری شرم و حیا فراموش کر چکی تھی۔ یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس کو رخشندہ نے خاص طور پر تاکید کی تھی سر اور نظریں جھکا کے رکھنے کی۔

وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی کہ شاید مذاق کی کوئی رمق نظر آجائے۔

سب خوش باش.....

سب راضی اور مگن.....

یہ سب اس کے اپنے تھے۔ مگر اس کے درد سے یکسر انجان۔

سب اس کو چاہنے کا دعوا رکھتے تھے مگر اس کی چاہت سے بے خبر۔

"بھائی جان! اجازت ہو تو میں حسن کے نام کی انگوٹھی ہما کو پہنا دوں؟" پروین نے اجازت طلب کی۔

معراج دین نے ماں کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا وہاں اجازت ہی اجازت تھی۔

اب کے انہوں نے شریک حیات سے نظروں ہی نظروں میں رائے طلب کی۔ وہاں اس سے بھی بڑھ کے رضا مندی اور سرخوشی رقم تھی۔

"بسم اللہ کیجئے۔ آپ کی اپنی بیٹی ہے۔"

ہما کے اندر کوئی چیز بڑے زور سے پھڑپھڑائی تھی۔ جیسے روح نکل بھاگنے کو تیار ہو۔ اس نے ہراساں انداز میں ماں کو دیکھا..... رخشندہ کے چہرے پہ ایک انوکھی چمک تھی۔

پھر اس نے باپ کے چہرے پہ نگاہ ڈالی..... وہ شانے جواب تک نادیدہ بوجھ تلے دبے نظر آتے تھے اٹھے ہوئے تھے۔ دادی کی نظروں میں ایک اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔

"میں..... میں نہیں مطمئن میں نہیں راضی۔" اس کا اندر چلا رہا تھا۔ کرلا رہا تھا مگر کون سنتا۔

"بھئی کب سے آس لگائے دروازے پہ کھڑے ہیں ہم۔"

وصی کی آواز پہ وہ جھٹکا کھا کر مڑی..... وہ پردہ ہٹا کے اندر جھانکتے ہوئے آنکھوں میں شرارت بھرے پتہ نہیں کس سے مخاطب تھا۔

"ہاں ہاں تم سنو گے۔ تم سے دل کا ناتا ہے۔ روح کا ناتا ہے۔ میرے دل کی پکار تمہارا دل سنے گا..... میری روح کی صدا پہ تمہاری روح لبیک کہے گی۔" اسے آس سی بندھی۔

"کب مبارک بادوں کا شور سنائی دیتا ہے اور کب مٹھائیاں ہمیں بھیجی جاتی ہیں۔ ہم ہیں کہ منہ میٹھا کرنے کا موڈ بنائے بیٹھے ہیں اور آپ انگوٹھی ہاتھ میں لے کر اسی سوچ میں گم ہیں کہ پہناؤں یا نہ پہناؤں۔"

ہما کی آس کے دھاگے کچے پڑنے لگے۔

"یہ میرا نواسا ہے..... وصی..... بڑا شریر ہے۔" شوکت جہاں نے مسکراتے ہوئے اس کا تعارف کرایا۔

"مامی جی! نہیں پہنائی جا رہی انگوٹھی۔ تو میں پہنا دوں آکر۔" اس کی بات پہ جہاں اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے وہیں ہما کا دل سکڑ کر پھیلا اور پھر سے سکڑ گیا۔

"پروین سے بڑا پیار ہے اس کا۔" انہوں نے مزید وضاحت کی۔ "اس کے ہاتھ میں پلا ہے۔ اس کے ساتھ مذاق بھی ایسے ہی چلتا رہتا ہے اس کا۔"

"اور یہ مذاق؟" وہ سوچ کر رہ گئی۔ "یہ کیا مذاق کیا ہے میرے ساتھ؟ پتہ نہیں وصی! یہ مذاق تم نے کیا ہے میرے دل نے کیا ہے یا تقدیر نے۔؟ میں کیوں یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ تمہارے دل میں بھی کہیں نہ کہیں وہ محبت کنڈلی مارے بیٹھی ہے جو میرے دل پہ راج کر رہی ہے۔ اس چھیڑ چھاڑ اس نوک جھونک کے پیچھے کچھ نہ کچھ

مگر۔" اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکی۔

یکدم ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کے برف کی سل جیسے ہاتھ پر کسی نے دہکتا انگارہ رکھ دیا ہو۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کا ہاتھ پتا نہیں کب رخشندہ نے تھام کر پروین کے سامنے کیا تھا اور وہ دہکتا انگارہ اور نہیں حسن کے نام کی انگوٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اور جب یہ خبر دشمہ تک پہنچے گی۔ کیا گزرے گی اس پہ۔" حسن نے اپنے تاریک کمرے میں ٹہلتے ہوئے

سارے گھر میں رات کے سوا بارہ بجے بھی زندگی عروج پہ تھی۔

پروین نے نجانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ڈھولک نکال لی تھی اور سب لڑکیوں کو جمع کیے حسن کا سہرا گا رہی تھا۔

تیرے سہرے توں میں واری آں

سہرے والے توں بلہاری آں

جوش اور ممتا کے غرور سے لبریز آواز کھنک رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا ساتھ دینے کو شوکت جہاں کی بوڑھی آواز بھی شامل ہو جاتی اور تالیوں میں شدت کچھ اور بڑھ جاتی۔ ڈھولک کی پہلی تھاپ سنتے ہی آس پڑوس کے چند جاگنے والے مارے تجسس کے جھانکنے آگئے۔ وجہ دریافت ہونے پہ تالی بجانے والے ہاتھوں میں چند کا مزید اضافہ ہو گیا۔

وہ کمرہ بند کیے پریشانی سے ٹہل رہا تھا..... کسی کی دخل اندازی کا خطرہ نہ رہے اس لیے لائٹ تک آف کر رکھی تھی..... تاکہ سب اسے سوتا سمجھ لیں۔ البتہ باہر سے آنے والے گیتوں کی آواز وہ روک نہیں پا رہا تھا۔

"جیوے بنڑا..... عمراں ساریاں۔"

کچھ دیر پہلے اس نے پروین کو فون پر نوید مراد کے گھر پہ اطلاع دیتے ہوئے سنا تھا۔ تب اسے اس کا بجھا ہوا دل رہ رہ کے ٹیسیں دے رہا تھا۔

"کاش میں نے وشمہ سے حال دل کہنے میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا۔" وہ آزردگی سے سوچ رہا تھا۔

تصور کے پردے پہ وہ اسے اپنے کمرے میں، تکیے میں منہ دے کر ہچکیاں لے لے کر روتی نظر آ رہی تھی۔

"تب یہ دکھ صرف میرا دکھ ہوتا۔ کم از کم وہ اس دکھ کی حصہ دار نہ ہوتی۔ میں نے کیوں اس کے معصوم نوخیز دل میں یہ کونپل اگائی۔ وہ انجان تھی۔ انجان رہتی ہمیں چپ چاپ پی جاتا اس زہر کو۔ بزدلی کا مظاہرہ تو میں نے کیا ہی ہے اس کی نظر میں بے وفائی کا مرتکب تو نہ ٹھہرتا۔"

"سونے دیاں لڑیاں دا سہرا جدوں لایا"

پروین کی خوشی سے کھنکتی آواز ایک بار پھر کمرے کی خاموشی کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

"ایک عزیز ہستی کو غم سے بچانے کے لیے میں دوسری اتنی بہت سی محترم اور عزیز ہستیوں کو ملال سے دوچار نہیں کر سکتا تھا وشمہ..... میں نہ بزدل ہوں نہ بے وفا۔ کاش تم کبھی جان سکو۔ مگر تم کیسے جان سکو گی۔ کون بتائے گا تمہیں کہ یہ فیصلہ میں نے کس صورت حال کے پیش نظر مجبوراً کیا ہے۔ کم از کم میں تو نہیں بتا سکتا۔ شاید زندگی بھر تمہارا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا۔" وہ نڈھال ہو کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ ٹھیک سوچ رہا تھا۔ اس غم میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ یہ رشتہ جہاں گھر بھر کو خوشیوں کی وجہ دے گیا تھا وہاں اس کے ساتھ ساتھ کوئی اور بھی تھا جس کا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی بھاری سل تلے دب کر رہ گیا تھا۔

اس کا اندازہ درست تھا۔۔۔۔ کوئی تھی جس کی یہ رات تکیے میں منہ چھپا کے ہچکیاں لیتے ہوئے گزر رہی تھی۔ کوئی تھی جس کے آنسو بستر بھگو رہے تھے۔ مگر وہ وشمہ نہیں ظل ہما تھی۔

"الوداع۔۔۔۔ اے محبت الوداع۔"

ظل ہما نے رات کے آخری پہر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے گویا دل کی سلیٹ پہ لکھے اس نام کو بھی صاف کر دیا اور صبح کے اولین پہر کے استقبال کی تیاری کرنے کے لیے وضو کرنے کھڑی ہو گئی۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ ایک مکمل مشرقی لڑکی۔۔۔۔ دل اس کا بھی ٹوٹا تھا۔ سپنے اس کے بھی مجروح ہوئے تھے۔ آرزوئیں اس کی بھی کرچی کرچی ہو کر بکھری تھیں۔ جبر اس نے بھی سہا تھا۔۔۔۔ اس رشتے پہ وہ بھی بہت سی مجبوریوں اور مصلحتوں کے تحت راضی ہوئی تھی لیکن حسن کی نسبت اس نے سمجھوتہ بہت جلدی کر لیا۔ رات کی سیاہی کو دن کے اجالے میں بھی بدلنے سے پہلے پہلے۔۔۔۔ وہ اس نئی زندگی کے پہلے دن کا آغاز دو حصوں میں بٹے ہوئے کے ساتھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے دل سے پرانی محبتوں اور گزرے خوابوں کی ہر شبیہہ مٹا کر اسے صاف کر دینا چاہتی تھی کہ نئے حوالے اس پہ بددیانتی کے بہتان نہ لگائیں۔

مگر حسن ایک مرد تھا۔۔۔۔ باشعور، میچور اور ایک ستھری سوچ کا مالک ہونے کے باوجود ایک مرد۔

جو سمجھوتا کرنے پہ مشکل سے تیار ہوتا ہے۔

جو کبھی تو اتنا کمزور ہوتا ہے کہ دل کی سب سے بڑی خوشی کو بھی پورا کرنے سے خود کو قاصر پاتا ہے۔

اور کبھی اتنا منہ زور کہ تقدیر کے کیے ہوئے ایک مذاق کو سہنے سے بھی صاف انکار کر دیتا ہے۔

اس نے مصلحت کے تحت اور اپنی فطری تابع داری کے باعث اس فیصلے پہ سر تسلیم خم تو کر دیا تھا مگر وہ ظل ہما کے لیے دل کے دروازے وا کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ آنسوؤں سے وشمہ کی شبیہہ مٹانے پہ تیار نہیں تھا۔ وہ اسے کھونے کی کسک، اسے نہ پانے کی محرومی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہ جانے والے دکھ کے طور پہ پالنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ مٹھائی آئی ہے پروین کے ہاں سے۔" نوید مراد نے منزہ کے سامنے ڈبہ رکھتے ہوئے بتایا۔ اس کے سادہ سے لہجے میں خوشی کی ہلکی سی رمق بھی تھی۔ "ڈرائیور دے کر گیا ہے۔"

"ظاہر ہے، خود کس منہ سے آتیں۔" منزہ کے تبصرے پہ وہ ٹھٹکا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اکلوتے ماموں ہیں آپ۔۔۔۔ منگنی کر ڈالی اور آپ کو فون پہ اطلاع دے کر، ڈرائیور کے ہاتھ کلو مٹھائی بھیج کر کیا میکے کا حق ادا ہو گیا؟"

"انہوں نے کون سا باجے گاجے کے ساتھ منگنی کی ہے جو میں نہ بلائے جانے کا گلہ کروں۔" نوید مراد نے عادتاً ٹالنا چاہا۔ "گھریلو معاملہ تھا ان کا۔۔۔۔ گھر گھر میں نمٹا لیا۔"

"کوئی صلاح مشورہ تو لے سکتی تھیں آپ سے۔"

"چلو چھوڑو۔ جیسے اس کی خوشی تم کیا نیا مسئلہ لے کر بیٹھ گئی ہو۔"

وہ نند بھاوج کا کوئی نیا تنازعہ کھڑا ہونے کے خدشے سے گھبرا اٹھے۔

"میرے لیے یہ اہم نہیں کہ انہوں نے آپ سے مشورہ کیا تھا یا نہیں، نہ ہی اس بات کی تکلیف ہے کہ ہمیں بلایا کیوں نہیں۔ بیٹی کی ماں ہوں۔ اپنی بیٹی کی حق تلفی پہ دل جلے گا یا نہیں؟"

"کیا مطلب؟ وشمہ؟" نوید مراد بری طرح چونکے۔

"ویسے تو حق جتانے کو پھوپھی صاحبہ ہمیشہ آگے آگے ہوتی ہیں میری وشمہ، میری بیٹی، میری جان اور اب بیٹے کا رشتہ طے کرتے ہوئے وہ نظر نہیں آئی۔"

اس بار نوید نہ ٹال سکے نہ جھٹلا سکے۔۔۔۔ پُرسوچ انداز میں منزہ کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھی وشمہ کی تصویر کو تکنے گئے۔

"کیا میری وشمہ کسی سے کم ہے؟ صورت شکل میں؟ تعلیم اور سلیقے میں۔۔۔۔ اب انسان غیروں سے کیا گلہ کرے گا جب اپنے ہی طوطا چشم نکل آئیں تو۔"

وہ اب بھی چپ رہے۔۔۔۔ شاید دل ہی دل میں وہ بھی گلے شکوے کر رہے تھے۔

"میں تو کوئی لگی لپٹی نہیں رکھنے والی۔۔۔۔ صاف جتا دوں گی پروین سے۔"

"خبردار ایسا کچھ نہ کرنا۔" نوید مراد جیسے خواب سے ہڑبڑا کے جاگے تھے۔

"دیکھیے آپ جانتے ہیں دوسری عورتوں کی طرح مجھے عادت نہیں ہے بلاوجہ کی کل کل گھر میں ڈالنے کی۔۔۔۔ میں نے نہ کبھی اماں کے سامنے زبان کھولی نہ کبھی پروین کی کسی زیادتی پہ دوبدو بات کی۔ بتایئے کبھی کیا ایسا؟"

وہ تائید بھری خاموشی کے ساتھ سر جھکا کے رہ گئے۔ واقعی منزہ نے ایسی نوبت کبھی نہیں آنے دی تھی۔ پہلے اس کی طبیعت کا صبر اور برداشت اس سے یہ کرواتا رہا۔

بعد میں جب یہی صبر زہر بنا تو اسے موقع کا انتظار کرنے کی تاکید کرتے خاموش رہنے پہ مجبور کرتا رہا۔

وہ اصل وجہ جانے بغیر منزہ کی خاموش رہ کر سہنے کی صلاحیت کے البتہ دل سے معترف تھے اور جیسے اس نے سوہا سے علیحدگی کے بعد لب سیئے تھے۔ کبھی پلٹ کے نوید کو اس بات کا طعنہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبھی وشمہ کی ذات سے اپنی اس محرومی کا بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بعد تو وہ خود ہی اس کے سامنے شرمسار سے رہتے تھے۔ ازالے کے طور پہ اس کی ہر بات کی تائید کرنا اور اس کے ہر فیصلے کو جوں کا توں تسلیم کرنا انہوں نے اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔

"لیکن اپنی بات اور تھی۔ اپنے ساتھ ناانصافی میں نے چپ چاپ برداشت کر لی۔ بیٹی کے ساتھ برداشت نہیں کروں گی۔ آپ کو بھلا لگے یا برا۔۔۔۔ میں کہہ کے رہوں گی۔"

وہ بھی نوید مراد کی اس کمزوری سے آگاہ ہو چکی تھی اس لیے ببانگ دہل اعلان کر رہی تھی۔

"مگر اس سے فائدہ کیا ہو گا؟" نوید مراد نے کمزور سی مزاحمت کی۔ "کیا فائدہ اپنی بیٹی کی ذات کو ہلکا کرنے کا۔"

"ہلکا کیوں کروں گی۔ حق کی بات کروں گی۔"

اس نے طے کر رکھا تھا۔۔۔۔ مگر کیا۔۔۔۔ یہ وہ ابھی نوید مراد کو بتانے کے موڈ میں نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے ساری بات بتائی تھی بھائی جان کو کہ کیسے صرف گھر کے افراد نے بیٹھ کر آپس میں یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر کوئی تقریب کرتے اور آپ کو نہ بلاتے تب آپ کا گلہ جائز تھا بھابھی۔"

پروین نے منزہ کے اکھڑے رویے سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اس ایمرجنسی میں کی گئی منگنی پہ خفگی جتا رہی ہے۔ رشتے داریوں میں ایسے نخرے، ایسے شکوے معمول کی بات تھی۔

"گلہ تو میں تب بھی کرتی۔" منزہ نے بڑے جھلستے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھی نہیں بھابھی!"

"آپ اتنی ناسمجھ تو ہیں نہیں۔۔۔۔ ماشاء اللہ جوان بچوں کی ماں ہیں، مجھ سے زیادہ بھرے پرے خاندان میں رہتی ہیں۔ آپ کو تو مجھ سے کہیں پہلے اس بات کا خیال آنا چاہیے تھا۔"

"کس بات کا بھابھی! کھل کے کہیے۔"

"بیٹی کی ماں ہوں اور کتنا کھل کے بات کروں۔ مگر کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ میری وشمہ بھی آپ کے سامنے تھی۔ آپ کو اس سے محبت کا دعوا بھی ہے اور یہ تو سب سے اچھا موقع تھا اپنی محبت جتانے کا۔ آپ نے اپنے حسن کے لیے وشمہ کا کیوں نہیں سوچا؟"

بات ایسی تھی کہ کتنی دیر تو پروین کو جواب نہ سوجھ سکا۔ مانو سانپ سونگھ گیا ہو انہیں۔

بات تو غیر متوقع تھی ہی۔۔۔ مگر وہ یہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ منزہ جیسی معاملہ فہم عورت یہ بات اتنے دو ٹوک انداز میں اور بلا جھجک کہہ دے گی۔ وہ بھی اس موقع پہ جب وہ حسن اور ظل ہما کی باقاعدہ منگنی کا دعوت نامہ دینے وہاں آئی تھیں۔

"پہلا حق اپنوں کا ہوتا ہے۔ مانا کہ ظل ہما بھی غیر نہیں' مگر میکے سے بڑھ کے اپنا کون ہوتا ہے۔ اگر آپ کہتیں تو آپ کے سسرال والے بھی انکار نہ کرتے مگر دکھ تو اس بات کا ہے کہ آپ نے ہی ایسا نہ چاہا۔"

"بھابھی! میں تو دراصل۔" وہ ہمت اور الفاظ دونوں مجتمع کرنے لگیں۔

"اب بھی کیا بگڑا ہے۔ اگر آپ۔۔۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" پروین یکدم حواسوں میں آئیں "بات طے ہو چکی ہے اور کیا میکہ کیا سسرال میرے لیے سب بچیاں ایک سی ہیں۔ میں بھائی کی بیٹی کی خاطر جیٹھ کی بیٹی کا تماشا نہیں بنوا سکتی۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اصل میں آپ کا اپنا جی نہیں ہوگا۔"

منزہ نے زندگی میں پہلی بار نند سے اتنی رکھائی سے بات کی تھی۔ "کیونکہ آپ نے وشمہ کو کبھی بھائی کی بیٹی جان کے محبت دی ہی نہیں۔ میری وجہ سے اس سے بیر باندھے رکھا۔"

"حد ہو گئی بھابھی! آپ کے میرے کون سے پرانے جھگڑے تھے بھلا جو میں دشمنیاں نکالتی۔"

"یہ تو آپ کو زیادہ پتہ ہوگا۔۔۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ میرے اور وشمہ کے درمیان پیار کو نہ کبھی اماں نے کھلے دل سے قبول کیا نہ آپ نے پسند کیا۔"

"آپ پتہ نہیں کون سے پرانے کھاتے کھولے بیٹھی ہیں۔ کبھی ایک مسئلہ چھیڑ کبھی دوسرا نکال۔" اب کے پروین واقعی برا مان گئیں۔

"چلیں۔۔۔ پرانی باتیں رہنے دیں۔ انہیں نہیں چھیڑتی میں' لیکن یہ بات تو منوا کے رہوں گی۔ یا تو آپ تسلیم کریں کہ آپ سے وشمہ کے سلسلے میں کوتاہی ہوئی اور اس کا ازالہ کیجئے۔ یا پھر آئندہ اس پر کسی قسم کا کوئی حق نہ جتائیں۔۔۔ کیونکہ خالی خولی پیار سے اس کا کیا بھلا ہونے والا ہے۔"

"بھابھی۔۔۔" پروین دم بخود رہ گئیں۔

یہ تو وہ شروع سے مانتی تھیں۔ اور شمشاد بیگم بھی اسے یہی باور کراتی آئی تھیں کہ منزہ' وشمہ کو باقی سب سے دور رکھ کے صرف اور صرف اپنے جوگا رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن اب ثابت بھی ہو رہا تھا۔ اور وہ بالکل امید نہیں کر رہی تھیں کہ منزہ ایسے نازک وقت میں ایسا وار کرے گی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم ہما کے ہاتھ میں حسن کے نام کی انگوٹھی پہنا آئے ہیں۔ اول تو میں خود ایسا نہیں چاہتی کہ اس طرح بغیر کسی مناسب جواز کے۔۔۔ ظاہر ہے زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور بالفرض میں ایسی کوشش کر بھی لوں تو کون مانے گا میری۔ اس عمر میں شوہر کی نظروں میں بے وقعت ٹھہروں گی اور چلیں ماننے کو یہ بھی مان لیں کہ وہ راضی ہو گئے تب بھی بھائی بھائی کے درمیان دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ یہ ناممکن ہے بھابھی! حسن اور وشمہ۔۔۔"

وہ یکدم جھجک کر چپ ہو گئیں۔

"چلیں۔۔۔ حسن نہ سہی۔۔۔ آپ وشمہ کے لیے دل بڑا تو کریں گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔" منزہ نے بڑے عجیب سے انداز میں کہا۔

"یعنی۔۔۔ یعنی۔۔۔ حسان۔"

پروین نے چونک کر کہا۔

☆ ☆ ☆

"جعفر محمود۔" اس کے لبوں نے عرصے بعد دھیمی سرگوشی کی۔

انداز ایسا تھا کہ تقدیس بھی چونک گئی۔

"آپ جانتی ہیں میرے بابا کو؟"

"ہیں؟" وہ سالوں پیچھے چلی گئی۔

"مجھے آج تک کوئی نہیں جان پایا رینا۔۔۔ سوائے تمہارے' تم شاید میری روح کا وہ گمشدہ حصہ ہو جس کے بغیر میں اب تک ادھورا پھر رہا ہوں۔"

جعفر محمود کی بھولی بسری۔۔۔ مگر ساحر آواز پھر سے سماعتوں میں گونجنے لگی۔

"نہیں' میں نہیں جانتی۔" اس نے تیزی سے پگھلتے ہوئے وجود کو منجمد کر لیا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میں جان بھی کیسے سکتی ہوں۔" اس کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ تقدیس سن نہ سکی۔

"ایکسکیوز می' مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ ساڑھی کا پلو نزاکت سے سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ساڑھی تو جیسے بنی ہی تمہارے لیے ہے۔"

اس کی توصیف کا وہ انداز۔۔۔

اس نے آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"اس لباس میں جتنے باوقار انداز میں تم قدم بڑھاتی ہو وہ بس تمہارا ہی خاصہ ہے۔"

عادت کے مطابق رینا نے اضطراری حالت میں انگلیاں بالوں پہ پھیریں۔

"اور تمہاری یہ ادا۔۔۔ ختم ہے میری جان' ختم ہے۔"

اس کے وہ نثار ہو جانے والے اظہار۔

نجانے کہاں کہاں سے تاک تاک کر یادیں حملہ کر رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ جو نیا ڈرائیور ہے' مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔"

مدیحہ نے توس پہ مکھن لگاتے ہوئے متفکر لہجے میں کہا اور جعفر محمود کی جانب دیکھا۔ جو سن کر بھی ان سنی کرتا چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا اخبار میں مگن تھا۔

مدیحہ نے بڑی مشکل سے اس کی بے توجہی کو ہضم کیا اور دوبارہ گویا ہوئیں۔

"چھان پھٹک تو کی تھی ناں۔۔۔ یا ایسے ہی رکھ لیا؟"

اس بار بھی جواب ندارد۔

اب کے وہ برداشت نہ کر پائیں اور ہاتھ میں پکڑی بٹر نائف زور سے ٹیبل پہ پٹخی۔

"میں دیواروں سے باتیں نہیں کر رہی۔"

جعفر نے آخری گھونٹ لے کر کپ میز پر رکھا اور ایک سرد لاتعلق سی نگاہ اس عورت پہ ڈالی جو اس کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ مگر درمیان میں صدیوں کا فاصلہ تھا۔

"اطلاع کا شکریہ۔" کہہ کر وہ دوبارہ اخبار میں گم ہو گیا۔

"یہ آپ نے نیا کام پکڑ لیا ہے۔" وہ تلملا کے رہ گئیں۔

"پہلے تو مجھ سے اجنبی بنے رہتے تھے اب گھر کے ہر معاملے سے لاتعلقی اختیار کر لی ہے۔"

"میرے پاس اتنا فارغ وقت نہیں ہے مدیحہ' کہ میں گھر کے ڈرائیوروں اور ماسیوں کے دکھڑے سنوں۔"

"گھر کے ڈرائیور ہوں یا ماسی یا جمعدار ہیں تو گھر سے وابستہ معاملات۔ جبکہ یہ جو اخبار چاٹ رہے ہیں آپ گھنٹہ بھر سے۔ یہ کون سے سگوں کی خبریں دے رہے ہیں آپ کو۔"

وہ تند و تیز لہجے میں بولیں تو حسب توقع جعفر محمود کا پارہ ہائی ہو گیا۔ اس نے اخبار گول مول کر کے ایک جانب پھینکا۔۔۔ ایک جھٹکے سے اٹھا۔ پاؤں کی ٹھوکر سے کرسی پرے کی۔

"بس۔۔۔ بہت ہوگیا جہالت کا مظاہرہ۔۔۔ تمہاری زبان اور تمہاری حرکتیں دونوں اب ناقابل برداشت ہوتے جارہے ہیں مدیحہ!"

"اور آپ نے کبھی اپنی حرکتوں پہ غور فرمایا ہے؟" وہ کون سا دبنے والی تھیں۔

"یا بھول گئے ہیں ماضی۔۔۔ میں یاد دلادوں؟"

اب کے گویا انہوں نے جعفر کی دم پہ پاؤں رکھ دیا۔

"یاد۔۔۔ احمق عورت تم نے میرا ماضی 'ماضی' بننے ہی کب دیا ہے۔ زخموں پہ کھرنڈ آنے سے پہلے انہیں کھرچ کر تازہ کرنا تمہاری عادت ہے۔"

اس نے ہاتھ سے ٹیبل پہ رکھے کپ کو ٹھوکر رسید کی۔۔۔ کپ دور تک گلاس ٹاپ پہ لڑھکتا چائے کے چھینٹے اڑاتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

واپسی کے سارے رستے وہ گم صم رہیں۔۔۔ حسان نے ایک دوبار پوچھا بھی۔ اس بار وہ ماں کے ساتھ آیا تھا ماموں کے گھر ورنہ اس سے پہلے حسن یہ ذمے داری جی جان سے نبھایا کرتا تھا۔ مگر آج اس نے صاف انکار کردیا۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے امی۔۔۔ پلیز آپ کسی اور کے ساتھ۔۔۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں جانا اتنا ضروری بھی نہیں۔"

کچھ خیال آنے پر اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا جس پہ پروین الٹا برامان گئی تھیں۔

"میرے میکے میں اور ہے کون۔۔۔ اور تم کہہ رہے ہو جانے کی ضرورت کیا ہے؟ ویسے بھی مجھے لگ رہا ہے تمہارے ماموں اور ممانی کو اچھا نہیں لگا' چپ چاپ تمہاری منگنی کردینا۔"

"صرف انہیں نہیں کسی اور کے دل پہ بھی بڑی بری گزری ہوگی۔"

وشمہ کا خیال کرکے وہ سوچ کر رہ گیا۔ کہہ نہ سکا۔

"تم فارغ نہیں ہو تو میں حسان کو لے جاتی ہوں۔ وصی تو کہہ گیا ہے دیر سے آئے گا' کسی دوست کے ساتھ جانا تھا اسے دفتر سے واپسی پہ۔"

اور یوں وہ حسان کے ساتھ چلی آئیں۔

پروین کا اندازہ درست تھا۔ حسن کی منگنی اور بغیر مشورے اور پیشگی اطلاع کے منگنی کا گلہ بھی تھا انہیں۔ مگر جو مزید ناراضی جتائی گئی وہ ان کے وہم و گمان سے آگے کی چیز تھی۔

"ایسا کیا کہہ دیا ہے مامی جی نے جو آپ گم صم ہوگئی ہیں۔" پروین کے ہوش ایسے اُڑے ہوئے تھے کہ حسان جیسا لاابالی لڑکا بھی نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں کہا تو ہے مگر۔۔۔" وہ حسان کو دیکھ کے رہ گئیں۔

"کیسے بتائیں اسے ساری تفصیل۔۔۔"

"چلیں حسن نہ سہی آپ وشمہ کے لیے دل بڑا تو کریں۔ گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔"

منزہ کے عجیب سے انداز پہ وہ چونک گئی تھیں۔ پھر مطلب واضح ہونے پہ بڑی مطمئن سی سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔

"یعنی' یعنی حسان۔"

یہ مسئلہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے حل ہوجائے گا اس کا تو پروین کو اندازہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو پریشان ہوئے جارہی تھیں کہ یہ کیسا کڑا وقت آن پڑا ہے۔ بھائی سے رشتہ بھی خطرے میں پڑ رہا تھا' دوسری جانب سسرال میں پوزیشن ڈگمگا جاتی۔۔۔ لیکن اب منزہ نے خود گنجائش نکال کر انہیں ہلکا پھلکا کردیا۔

"ہاں۔۔۔ واقعی حسن نہ سہی حسان ہی سہی اگر اس صورت وشمہ میرے نزدیک آتی ہے اور بھائی بھابی کا دل صاف ہوتا ہے تو اس سے اچھی بات کیا ہے۔"

وہ دل سے رضامند ہوگئیں۔۔۔ مگر اگلے ہی پل منزہ کی بات نے انہیں ایک اور جھٹکا دیا۔

پہلے جھٹکے سے شدید جھٹکا۔

"بھابی عجیب سی بات کہہ دی آپ نے حسن کہاں حسان کہاں' بات کرنے سے پہلے سوچتیں تو آپ؟"

پروین کی ممتا کو دھچکا لگا۔

"حسن بھی میرا بیٹا ہے اور حسان بھی۔ میرے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں۔"

ان کے لہجے کی تلخی نے منزہ کو ذرا دھیما پڑنے پر مجبور کیا۔

"اگر آپ کو برا لگا ہو تو معذرت چاہتی ہوں۔ میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ بے شک دونوں بھائی ہیں مگر دونوں میں فرق تو ہے۔ ممتا کی پٹی اتار کے دیکھیں تو آپ کو بھی یہ فرق محسوس ہوگا۔ تعلیم' ذہانت' شکل و صورت' پرسنالٹی' عادات۔۔۔ ہر لحاظ سے یہ فرق موجود ہے۔ معاف کیجیے گا مگر وشمہ کے ساتھ حسان کا جوڑ بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا چاہتی ہیں آپ؟" پروین کا لہجہ خود بخود روکھا سا ہوگیا۔

"وصی۔"

منزہ نے بے دھڑک اس کا نام سامنے رکھ دیا تھا۔

□□□□

"وصی۔۔۔ یار ایک بات تو بتاؤ۔" سوہا نے اس کے ساتھ واک کرتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں وہ بے ہنگم طریقے سے ہنسنے لگا۔

"اب تمہیں کیا ہوا ہے؟ میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟"

سوہا نے چند لمحے اس کی ہنسی رکنے کا انتظار کیا پھر برا مانتے ہوئے بولی۔

"یار۔۔۔ واہ۔" وہ بمشکل ہنسی روک پایا۔

"اگر میری نانی اماں نے۔۔۔ یعنی میری سویٹ نانو نے تمہیں اتنی بے تکلفی کے ساتھ مجھے یار پکارتے سنا تو پتہ ہے میرا کیا حال ہوگا۔"

"تمہاری فیملی کیا بہت بیک ورڈ ہے؟"

"قطعی نہیں۔" وہ اپنی فیملی کے خلاف کبھی ایک لفظ تک نہیں سن پاتا تھا۔ "تمہیں کس نے کہا۔۔۔ ہاں مگر روایتیں انہیں جان سے زیادہ عزیز ہیں اور ہونی بھی چاہئیں۔ نانو کہتی ہیں جڑ کے بغیر کوئی پودا ہرا بھرا نہیں رہتا۔"

"کچھ ایسی ہی تقدیس کی فیملی بھی ہے۔"

"وہ تمہاری نئی فرینڈ؟"

"ہاں' اگرچہ میں اس کی فیملی سے کبھی ملی نہیں مگر وہ جو کچھ بتاتی ہے اس سے ایسا ہی لگتا ہے۔" پھر کچھ سوچ کر روہانسی ہی ہوگئی۔ "اس نے بھی مجھے کہا ہی نہیں اپنی فیملی سے ملوانے کے لیے جیسے تم نے کبھی نہیں کہا۔"

وصی اس کی بات ان سنی کرتے چلتا رہا۔

سوہا کے اس گلے کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"کیا میں اتنی بری ہوں وصی کہ۔۔۔"

"فضول۔" وصی نے مزید اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ "فضول سوچیں ہیں تمہاری۔"

"سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔"

دونوں جم خانہ کے لان میں واک کر رہے تھے۔۔۔ نزدیک ہی سوہا کے کچھ اور دوست گروپ کی شکل میں کھڑے تھے۔۔۔ وصی سوہا کے اصرار پہ آ تو گیا تھا مگر اس کے فرینڈز کے ساتھ اس کی جم نہیں رہی تھی۔ سوہا۔۔۔ اس کی بے آرامی محسوس کرتے ہوئے اسے چپکے سے لے کر نسبتاً الگ گوشے میں آگئی۔

"سچ بہت بولنے لگی ہو آج کل؟"
"صحبت کا اثر ہے۔" وہ مسکرائی۔
"کس کی؟..... میری صحبت کا یا تمہاری نئی فرینڈ کی صحبت کا؟"
"میں نوٹ کر رہی ہوں تم بہانے بہانے سے اس کا ذکر لے بیٹھتے ہو چکر کیا ہے؟"
"پھر سے وہی فضول سوچیں۔"
"اتنی فضول ہوں میں تو دوستی کس لیے کی ہے۔" حسب عادت وہ پل میں بھڑک گئی۔
"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔" اور یہ تو وہ بھی سچ کہہ رہا تھا۔
کسی بھی لڑکی سے دوستی کرنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا اور وہ بھی اتنا عجیب و غریب۔
ان کے ہاں یہ بات خاصی معیوب سمجھی جاتی تھی۔ وہ اور ندا یونیورسٹی میں کو ایجوکیشن میں پڑھتے رہے تھے لیکن کبھی ندا نے کسی لڑکے کو یا اس نے کسی لڑکی کو دوست بنانے کی ہمت نہیں کی۔ اپنے گھر کے ماحول سے واقف جو تھے۔ حتیٰ کہ گھر میں کزنز کے درمیان بھی بے تکلفی ایک حد کے اندر ہی تھی۔
وہ سب سے زیادہ ندا سے قریب تھا۔ لیکن اس کی وجہ ان کے درمیان موجود عمر کا فرق تھا۔ ندا اسے بچپن میں گودوں کھلاتی رہی تھی۔ باقی سب کے ساتھ بات چیت ہنسی مذاق چلتا رہتا مگر ایک دائرے میں رہ کے۔
اور اب اس کی سوہا کے ساتھ دن بدن بڑھتی دوستی..... جو اس کے گھر والوں کے علم میں آتی تو ہنگامہ تو یقینی تھا ..... مزے کی بات یہ کہ وہ اکیلے میں اس کے بارے میں سوچ کر خود بھی حیران رہ جاتا۔
بھلا..... وہ اور سوہا؟"
کوئی ایک بھی قدر مشترک نہ تھی دونوں کے مزاج اور شخصیت میں۔
ایک شعلہ ایک شبنم۔
ایک پارہ ایک سبک خرام ندی.....
اکیلے میں کئی بار اس نے اس دوستی کی وجہ تلاشنی چاہی۔
کیا وہ فطری کشش جو صنف نازک کی جانب کھینچتی ہے؟
"نہیں....." اس نے سختی سے تردید کر دی۔
سوہا کی جانب اس کا جھکاؤ ضرور تھا مگر ان معنوں میں نہیں..... وہ کسک وہ تڑپ جو ایسی کشش میں محسوس ہوتی ہے وہ کبھی محسوس نہ ہوئی تھی اسے۔
"تو کیا ہمدردی؟"
ہاں اس سوال پہ وہ کچھ تذبذب میں پڑ جاتا۔
اس نے پہلی بار اپنے دل کا ایک گوشہ سوہا کے لیے تب نرم پڑتا محسوس کیا تھا جب اس کی آنکھوں کے گوشے نم دیکھے تھے۔ تب اس کے دل سے سوہا کے بارے میں وہ سارا تاثر جیسے دھل سا گیا تھا جو اس سے پہلی بار مل کر قائم ہوا تھا۔
"میں جانتی ہوں تم اور تقدیس مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتے۔"
سوہا مسلسل اس کی مہربانیوں اور التفات کا پوسٹ مارٹم کرنے میں مصروف تھی۔
"نہ مجھے نہ میری عادتوں کو لیکن مجبور ہو۔"
"ہاں..... مجبور ہیں ہم۔ گن پوائنٹ پہ رکھا ہوا ہے کسی نے ہمیں۔" وہ بھنا گیا۔ "کہ اس سرپھری کے دوست بنے رہو اگر خیریت مطلوب ہے۔"
"گن پوائنٹ پہ نہ سہی..... مگر خدا ترسی کے جذبے کے آگے ضرور مجبور ہو۔ ہے ناں کہ بھئی یہ نیم پاگل بے چاری سی لڑکی جس کا دماغ جب پھرتا ہے تو اپنے آپ کو دانت کچکچانے اور جھنجھوڑنے تک سے گریز نہیں کرتی

[ہیں] سال کی عمر تک تین بار خودکشی کی کوشش کر چکی ہے اور جس سے کالج کی ساری لڑکیاں بدکتی ہیں۔ جو [بھی لحاظ] یا مروت سے کام نہیں لیتی اور جسے ایک اچھی لڑکی کہلانے کا رتی بھر شوق نہیں ہے چلو اس سے دوستی کر [کے اس] کو کچھ محبت کچھ نرمی سے ہینڈل کیا جائے۔ کچھ سدھارنے کی تدبیریں اختیار کی جائیں۔"
"[شٹ] اپ سوہا..... بند کرو اپنے ماہرانہ تجزیے۔" وہ سچ مچ ناراض ہو کر پلٹ گیا۔
[سوہا] نے تیز تیز قدموں کے ساتھ خود سے دور ہوتے وصی کو دیکھا اور ایک اذیت پسند سی مسکراہٹ اس کے [لبوں پہ] سج گئی۔ یہی تو مشغل تھا اس کا۔
[سب] آنے والوں کو دور کرنا اور اس دور جانے کے کرب کو محسوس کرنا۔
[اپنائیت] جتانے والوں کو خفا کرنا اور پھر اس خفگی کے دکھ کی ٹیس کو لطف لے لے کر جھیلنا۔

❖ ❖ ❖ ❖

"تمہیں اتنی بڑی بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیے تھی۔" نوید مراد نے ساری تفصیل جان کے ذرا الجھتے [ہوئے] کہا تھا۔
"کیا ضرورت ہے اپنی بیٹی کو خود دوسروں کے سامنے....."
[وہ] سر جھٹک کر اس ناگواری کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔
"[ک]ون دوسرا؟..... بہن ہے وہ آپ کی وشمہ کی سگی پھوپھی..... دوسروں میں کب سے شمار ہونے لگا ان کا۔" اور [بڑا] انا بدلہ لینے کے سے انداز میں جتایا۔
"کل تک تو وہ مجھ سے زیادہ اپنی تھی وشمہ کی۔"
"مگر وصی تو..... دیکھو جہاں تک پروین کے اپنے بیٹوں کی بات تھی پھر بھی قابل قبول تھا میں حق سے نام لے [لیتا] کسی کا بھی لیکن وصی کا نام ہمارے لیے خود سے لینا مناسب نہیں تھا منزہ! وہ پروین کا نہیں اس کی نند کا بیٹا [ہے۔] ایک غیر خاندان کا لڑکا۔"
"شادیاں غیروں میں بھی ہوتی ہیں..... پرائے خاندانوں میں بھی رشتے جڑتے ہیں یا نہیں؟ جیسے آپ کا اور میرا [۔۔۔] پروین کا اور بھائی صاحب کا۔"
"ایسے رشتے خود طلب کیے جاتے ہیں..... چاہ کے ساتھ ..... زبردستی اپنی بیٹیاں اوروں کے سر نہیں تھوپی [جات]یں۔"
"میں نے بھی ایسا بالکل نہیں کیا۔ کیا آپ مجھے اتنا ناسمجھ سمجھتے ہیں افسوس ہے۔" اس کے ناراض ناراض [سے] انداز پہ نوید دھیمے پڑے۔
"خیر وہ تو میں جانتا ہوں تم کتنی معاملہ فہم اور سمجھ دار ہو۔ اسی لیے تو زیادہ جز بز ہو رہا ہوں کہ آخر کیا سوچ کر تم [نے]....."
"میرا ایسا کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو ظاہر ہے میں ایسے بے دھڑک ہو کر کیسے یہ بات کہہ سکتی تھی۔ [جب] پروین نے حسن کے بجائے حسان کا نام لیا تو میں نے سوچا یہ اچھا موقع ہے۔ وہ خود طلب گار ہو رہی ہے [تو] کیوں نہ میں حسان سے بہتر انتخاب کروں اپنی بیٹی کے لیے۔"
"وصی حسان سے بہتر انتخاب کیسے ہو سکتا ہے؟ حسان میرا اپنا خون ہے۔"
[و]شمہ جو اپنے ہاتھ سے بنی کھیر نوید مراد کو بڑے فخر سے چکھانے اور داد وصول کرنے آ رہی تھی اگلی بات سن کر [دروا]زے پر دستک دینے کے لیے اٹھا اس کا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔
"وشمہ کے لیے حسان سے بہتر کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے؟"
دروازے کے اس پار کھڑی وشمہ کا دل جیسے پاتال میں گرتا چلا جا رہا تھا۔
"آپ وصی اور حسان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ ہر لحاظ سے حسان سے بہتر ہے۔"

"وصی۔۔۔" وشمہ نے یہ نام سنا اور پاتال سے ابھرنے کے لیے اس کا دل ہاتھ پیر مارنے لگا۔

"صرف اپنا خون ہونے سے آپ اسے فوقیت نہیں دے سکتے۔ سوال بیٹی کے مستقبل کا ہے اور وصی ہر لحاظ سے وشمہ کے قابل ہے۔"

وشمہ کا دل آہستہ آہستہ گہرائیوں سے اوپر ابھرنے لگا۔

"حسان کے پاس کون سا پلس پوائنٹ ہے' سوائے اس کے کہ وہ پروین کا سگا بیٹا ہے۔ یہ مت بھولیں کہ وشمہ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ نے اس کی خوشی دیکھنی ہے۔ حسان کی نہ ظاہری شخصیت متاثر کن ہے کہ ہماری اتنی پیاری بیٹی کے ساتھ جوڑ بیٹھے۔ نہ ہی تعلیم اور مزاج کے لحاظ سے وصی کے پاسنگ ہے۔ چلو مرد کی جیب دیکھی جاتی ہے' شکل نہیں' اس مقولے پہ عمل کرتے ہوئے اس کے بھاری بھرکم وجود اور رواجبی سی صورت کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو دوسری سب باتیں؟ آپ کو پتہ بھی ہے کہ وہ کتنے سالوں سے بی اے کرنے میں ناکام ہے؟"

"تعلیم تو حسن کی بھی خاص نہیں۔۔۔ اس کے لیے تمہیں اعتراض نہیں تھا۔"

"اس کے تعلیم حاصل نہ کرنے کی وجہ حالات تھے' اس کی ذمہ داریاں تھیں' اس کی نالائقی نہیں تھی۔ جبکہ حسان۔۔۔ وہ ماشاء اللہ سے کتنی عقل والا ہے یہ اس کے بچپن سے ہی سب پہ واضح ہے۔ ذرا سا بھی احساس ذمہ داری نہیں ہے۔ نہ کسی سے بات کرنے کا سلیقہ۔۔۔ جبکہ حسن۔۔۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے کالج کے دوران تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا اور پھر اعلا ڈگریاں نہ سہی' قابلیت تو ہے اس کے پاس جو باپ کا کاروبار بخوبی سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے مقابلے پہ پروین کو حسان کا نام لیتے ہوئے خود سوچنا چاہیے تھا۔۔۔ جو خود کسی قابل نہیں وہ ہماری بیٹی کی ذمہ داری کیا لے گا جبکہ وصی۔۔۔ تعلیم' ذہانت' شخصیت' مزاج' ہر لحاظ سے وشمہ کے ہم پلہ ہے۔"

وشمہ کو منزہ پہ ٹوٹ کے پیار آرہا تھا۔

"یہ ہوتا ہے ماں کا دل۔۔۔ اولاد کی چاہ' اس کی طلب بن بتائے جان لی۔"

وہ چپ چاپ پلٹ گئی۔ اسے نوید مراد کا جواب سننے کی بھی خواہش نہیں رہی تھی۔ کیونکہ منزہ کے تیور ایسے تھے کہ اسے یقین تھا وہ اپنے دلائل سے یہ بات ان سے منوا کے ہی رہے گی۔

✡ ✡ ✡

پروین کے دل کو پنکھے لگے ہوئے تھے۔

بات ایسی تھی کہ کہی ہی نہ جا سکے۔۔۔ اور کہے بغیر بھی وہ رہ نہیں سکتی تھیں۔ ان کے دل میں وشمہ کے لیے جو فطری محبت تھی' اس پہ حرف آرہا تھا۔ میکے کا آخری رشتہ واحد تاتا خطرے میں تھا۔ ویسے تو وشمہ ہر لحاظ سے ایک مثالی لڑکی تھی۔۔۔ شاید کئی معاملوں میں ظلِ ہما پر بھی برتری حاصل تھی اسے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی وہ اس سے کئی گنا بڑھ کے تھی۔

عمر بھی نسبتاً کم تھی۔

اور پھر وہ ان کے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی۔۔۔ بھائی بھی حیثیت میں ہم پلہ تھا جبکہ بھائی صاحب کے گھر کا سارا دارومدار اکلوتے بیٹے کی کمائی پہ رہ گیا تھا۔ اس پہ تین تین بیٹیوں کی ذمہ داری۔

"کاش بھابی نے پہلے منہ سے بھاپ نکالی ہوتی۔ اماں جان کے ہما کے لیے کہنے سے بھی پہلے۔۔۔ اور میں بھی کیسی بے وقوف ہوں۔ جوان بیٹوں کی ماں ہو کر بھی میرا دھیان کیوں نہیں جاتا ان باتوں کی جانب۔ ظلِ ہما کی جانب بھی اماں جان نے توجہ دلائی اور اب وشمہ کے لیے بھابی۔۔۔"

وہ خاصی خود غرض بن کے سوچ رہی تھیں۔

"وصی کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی کیسے کر سکتی ہوں۔ بے شک میں نے پالا پوسا ہے' ماں مانتا ہے وہ مجھے' لیکن میں یہ فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔"

...نے خود کو بے بس سا محسوس کیا اور دوپٹہ منہ پہ ڈال کے لیٹ گئیں۔۔۔ جب کچھ نہ سوجھ رہا ہو تو حالات ... کا یہ واحد حل ہوتا تھا ان کے پاس۔

...بات ہے پروین۔۔۔ اماں جان کی آواز نہیں سنائی دے رہی کیا؟"

...روم سے نکلتے سراج دین نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔ اتنے سالوں بعد بھی وہ ان کی معمولی سی ...نے کو تیار نہ تھے بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے ان کی کمزوریاں اور کوتاہیاں تلاش کیا کرتے تھے۔

...جا رہی ہوں۔"

...ست انداز میں کہتے ہوئے انہوں نے پیر نیچے کیے۔ اتنے میں شوکت جہاں خود اندر آگئیں۔

...ت اماں جان؟"

...اج دین نے ہیر برش واپس رکھا اور لپک کر ماں کا ہاتھ تھام کر انہیں چیئر تک لانے لگے۔

...پروین کو دیکھنے آئی تھی۔"

...ں؟" انہوں نے غور سے پروین کو دیکھا جو معمول سے ہٹ کر خاموش اور بے چین سی تو انہیں پہلے بھی لگی ...انہوں نے دھیان نہیں دیا۔ اب غور کیا تو خاصی مضمحل بھی محسوس ہوئیں۔

...کام تھا اماں جان! تو میں آرہی تھی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی؟"

...ن نے معمول کے لہجے میں کہنے کی پوری کوشش کی تھی مگر لہجے سے تھکن عیاں ہو رہی تھی۔

...سان بتا رہا تھا تمہاری طبیعت خراب ہے؟ اچھی بھلی تو گئی تھیں بھائی کے ہاں؟"

...بس ویسے ہی۔" وہ کوئی مناسب جواب ڈھونڈنے لگیں کہ سراج دین کے استہزائیہ تبصرے نے ان کی ...کی حد ختم کر دی۔

...چھی بھلی تو یہ ہمیشہ ہی وہاں جاتی ہیں' واپس آنے کے بعد البتہ اچھی بھلی نہیں رہتیں۔ اوروں کی بیٹیاں ...ے دکھ سمیٹ کر میکے لے جاتی ہیں' دل ہلکا کر کے ہشاش بشاش دامن میں خوشیاں سمیٹ کر لے آتی ہیں۔ ...نرالا میکہ ہے' خوش باش جانے والی بیٹیاں میکے کے دکھ پوٹلی باندھ کے ساتھ لے آتی ہیں۔"

...ت جہاں کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ مسلسل بولتے رہے۔

...اب تازہ ترین فکر کون سی سمیٹ لائی ہو۔ اماں تو تمہاری رہیں نہیں' جو ہر بار میکے سے واپسی پہ سوغات ...کوئی نہ کوئی فکر کوئی نہ کوئی پریشانی تمہارے ساتھ کر دیتی تھیں۔"

...دعا کریں اور بھی کوئی نہ رہے۔۔۔ تب خوشی ملے گی آپ کو جب میرا میکہ ہوگا ہی نہیں۔" وہ تو پھٹ ہی پڑیں۔

...راج تو سراج۔۔۔ شوکت جہاں بھی دم بخود رہ گئیں۔ اس طرح ضبط کھونا پروین کا شیوہ کبھی نہیں رہا تھا۔

...بکواس کر رہی ہو؟"

...اج دین کی پیشانی شکنوں سے پُر ہو گئی اس جسارت پہ۔

...میں جھوٹ کیا ہے۔ ہمیشہ میرے میکے والے آپ کو اسی طرح چبھتے رہے جیسے آپ مجھے خانہ بدوشوں ...سے بیاہ کر لائے ہوں۔" ان کی آواز مارے طیش کے کپکپا رہی تھی۔

...اماں جان! آپ کی شہ پا کے یہ اتنی زبان دراز ہو رہی ہے۔ اگر مزید ایک لفظ اس نے نکالا منہ سے تو میں ...کروں گا الٹے ہاتھ کا۔۔۔"

...خاموش۔" شوکت جہاں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے سختی سے کہا۔

...بس۔۔۔ بیٹا بیاہنے کی تیاری ہے اور اپنا یہ حال ہے تم دونوں کا کہ نئے نویلے میاں بیوی کی طرح لڑ رہے ...ابھی ایک دوسرے کو جاننے کے عمل سے گزر رہے ہو۔ بہو آئے گی تو کیا اس کے سامنے بھی یہی تماشے ...یا اثر لے گی وہ اس سب سے۔"

...غیر تو ہے نہیں۔ سب جانتی ہے یہی دیکھتی آئی ہے۔" سراج دین نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا جس پہ

شوکت جہاں نے انہیں ملامتی نظروں سے گھورا۔

"کچھ تو عقل سے کام لو سراج دین!"

"اور اس کی زبان دیکھی ہے آپ نے۔ جواب معصوم اور مظلوم بنی ٹسوے بہا رہی ہے۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیچاری کی۔ حسان بتا رہا تھا کہ سارے رستے عجیب حالت رہی ہے اس کی۔ ذرا ساتھ نہیں دیتے کسی معاملے میں اس کا۔ میں تو چلو بڑھاپے کی وجہ سے زیادہ کہیں آنے جانے سے معذور ہوں۔ وہ بیچاری اکیلی کل سے سارے خاندان کو بھگتا رہی ہے۔ کبھی ایک گھر مٹھائی دینے جانا، کبھی دوسرے جانا۔ تھک گئی ہوگی۔ گرمی میں ویسے ہی انسان بستر پہ پڑا ہی نڈھال رہتا ہے یہ بیچاری تو..."

"بس بھی کریں اماں!" سراج چڑ سے گئے۔ چند سیکنڈ کے دوران چار مرتبہ اماں نے اسے "بیچاری" قرار دیا تھا۔ وہ جلتے بھنتے کمرے سے ہی نکل گئے اور وہ پروین کے پاس چلی آئیں جو زار و قطار روئے چلی جا رہی تھی۔

"بات کیا ہے پروین... ! میں جانتی ہوں کہ کوئی بڑی وجہ ضرور ہے ورنہ محض طبیعت کی خرابی کے آگے تم یوں پیر چھوڑ کے بیٹھنے والی نہیں ہو۔"

"کچھ نہیں اماں جان! کچھ خاص نہیں۔" وہ آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ہچکی اب بھی بندھی ہوئی تھی۔

"خاص نہیں؟ یعنی کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔"

وہ پاس ہی بیٹھ گئیں۔ یعنی اب پروین سے اگلوا کے ہی رہیں گی۔

"بھابھی سے کوئی کھٹ پٹ ہوئی کیا؟"

انہوں نے سسکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر؟"

"وہ وشمہ..."

"کیا ہوا اسے؟ خیریت سے تو ہے؟"

"جی... خیریت سے ہے بس آپ تو جانتی ہیں، میں ہمیشہ ہی اس سے ملنے کے بعد بہت دکھی ہو جاتی ہوں۔ ساجدہ بھابی ایک جیتا جاگتا دکھ چھوڑ گئی ہیں ہمارے لیے۔"

"ایسے کیوں کہتی ہو پروین... ! میں نے پہلے بھی کتنی بار ٹوکا ہے تمہیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کرو کہ تمہیں وقت پہ صحیح عورت مل گئی۔ منزہ ایک اچھی بہو اور بھابی کے معیار پہ شاید پوری نہ اترتی ہو مگر ماں بن کے دکھایا اس نے۔ یہ بات کھلے دل سے تسلیم کرو۔ ورنہ ایسی سوتیلی مائیں بھی ہوتی ہیں کہ ان کے مظالم سنو تو کہانی کا موضوع ہو۔"

"میں جانتی ہوں اماں جان! لیکن میری بھی کچھ لگتی ہے وہ۔ میں بھی اس پہ حق جتانا چاہتی ہوں۔ اپنا پیار ... کرنا چاہتی ہوں لیکن افسوس اس کا موقع ہی نہ آ سکا۔"

"پرائی اولاد پہ کیسا حق پروین!"

اماں کی بات ان کے دل میں کھب سی گئی۔

... وشمہ بھی تو پرائی اولاد ہے، وہ کس منہ سے اس پہ حق جتائیں۔ بے بسی کی آخری حد پہ جا کے کوئی ... ہو سکتا ہے؟ اتنی ہی بے حسی کے ساتھ انہوں نے اپنے آنسو رگڑ کے صاف کیے۔

"سچ کہہ رہی ہیں آپ... پرائی اولاد پہ کیسا حق۔ میں ہی پاگل ہوں جو کبھی یہ سمجھا ہی نہیں کہ میرے صرف ... بیٹے ہیں... یہی سمجھتی رہی کہ جیسے حسن اور حسان ہیں ایسے ہی وصی... جیسے وشمہ ہے ایسے ہی ... میں نے خود کو ہمیشہ ان سب کی ماں سمجھا... اور آج اتنی تہی دامنی کا احساس ہو رہا ہے یہ جان کر ... صرف حسن اور حسان کی ماں ہوں۔ پیار بے شک سب پہ ایک جیسا لٹاؤں مگر حق صرف ان دونوں پہ ... وشمہ اور وصی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا میرے اختیار میں کہاں۔"

... انہوں نے وصی اور وشمہ کا نام ساتھ لے ہی لیا۔

"... کیوں نہیں... میں دیتی ہوں تمہیں اختیار۔"

... جہاں کے الفاظ پہ وہ چونکیں۔

"... کے بارے میں سارے اختیارات میں تمہیں سونپتی ہوں۔"

... بے یقینی سے ساس کو تکنے لگیں جو فیاضی سے مسکرا رہی تھیں۔ ان کی شریانوں میں خون جیسے دوگنا ہو ... لگا۔

"... فیصلے تم کرو گی... ماں بن کے... کل ہی پوچھ رہا تھا مجھ سے... خرم نے شاید اسے اپنے پاس آنے کا ... کہہ رہا تھا یہاں زیادہ اچھے مواقع ہیں اس کے لیے۔ میں نے کہہ دیا سوچ کر بتاؤں گی لیکن اب تم اسے ... سوچ کر۔"

"... بغیر سوچے ہی کہہ رہی ہوں۔" انہوں نے سرشاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"... ہرگز باہر نہیں جائے گا۔ میں اسے خود سے دور کرنے پہ بالکل تیار نہیں ہوں۔ وہ تو رونق ہے ... گھر کی۔ جتنی ترقی اس نے کرنی ہے آپ کی دعاؤں سے اور اپنے نصیبوں سے یہیں کر لے گا۔"

"... ہوئی ناں بات... اور جیسے ہی ذرا اس کے قدم جم جائیں، اس کی شادی کے لیے بھی تم نے ہی قدم اٹھانا ..."

... کے پروین کی شریانوں میں خون چار گنا ہو کر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

"... ؟"

"... ہے ابھی تو نئی نئی نوکری ہے، طبیعت میں بچپنا بھی بہت ہے لیکن ایک آدھ سال کے اندر منگنی ضرور ... ارادہ تھا میرا، چلو... اس جھنجھٹ سے بھی آزادی۔ سکون سے اللہ اللہ کر سکوں گی میں۔ تم جانو اور ... ۔"

... باتیں پروین کو آسمان پہ اڑائے جا رہی تھیں۔

"... تم ہی جانا رخشندہ کے آگے دامن پھیلا کے۔ ردا کے لیے۔"

... شریانوں میں بھاگتا خون پل میں منجمد ہو گیا۔

... سوال تک کرنے کے قابل نہ رہیں... پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہیں جو گھٹنوں پہ ہاتھوں کا ... کے اٹھ رہی تھیں۔

"... اماں جان... کیا اختیار سونپا ہے... جواب نہیں آپ کا۔" وہ تلخی سے مسکرا دیں۔

... ہاتھ میں تھما دیں اور ناک کی سیدھ میں چلنے کا حکم بھی سنا دیا۔"

✲ ✲ ✲

... جان بوجھ کر پروین کو فون کرنے کے لیے یہ وقت منتخب کیا تھا جب وشمہ لاؤنج کے ایک کونے میں ... کھولے بیٹھی کچھ نوٹس بنا رہی تھی۔

"... کیا باتیں کر رہی ہیں آپ؟ کیسے نہیں کچھ ہو سکتا؟"

... پروین کی دبی دبی سی معذرت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مقدور بھر اونچی آواز میں پوچھا۔

"... ایسے نہ ہوں... میری بیٹی کی زندگی کا معاملہ ہے۔"

... ان کی آنسوؤں میں ڈوبی جذبات سے بھرپور آواز سن کر وشمہ ماں کی محبت کے آگے مزید جھک گئی۔

... جانب پروین الجھن میں پڑ گئی۔

"... کا معاملہ؟ مگر بھابی آپ تو ایسے بگڑ رہی ہیں جیسے میں نے بچپن سے وشمہ کے لیے کوئی آس دلا رکھی ہو۔

کوئی برسوں پرانا عہد توڑ کے بیٹے کی نسبت کہیں اور کر دی ہو۔ ہماری وشمہ میں ماشاء اللہ کس چیز کی کمی ہے؟ اس سے بھی اچھے رشتے ملیں گے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"مل سکتے ہیں اس سے بھی اچھے رشتے۔ لیکن کیا کروں۔۔۔ لاڈوں سے پالی بیٹی ہے میری پرایوں میں دیتے ڈر لگتا ہے۔ سوچا تھا آپ پھوپھی ہیں' چاہ سے لے کر جائیں گی پیار سے رکھیں گی لیکن۔" اس نے ایک آہ بھری۔

"خون سفید ہو جائے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"خدا کے لیے بھابی! طعنے تو نہ دیں۔ جو بات میرے اختیار میں نہیں ہے میں کیسے کر سکتی ہوں آپ سمجھتی نہیں سسرال کا معاملہ ہے میری ایک نہیں چلتی۔ وشمہ مجھے لاکھ عزیز سہی مگر جیٹھ کی بیٹی رد کر کے بھائی کی بیٹی کا نام لوں گی تو ہر جانب سے انگلیاں ہی اٹھیں گی۔"

اور منزہ کو سالوں سے تپتے سلگتے سینے میں ایک ٹھنڈی لہر اترتی محسوس ہوئی۔

"اب پتا چلا پروین بیگم۔۔۔ سسرال کے آگے دم نہ مارنے کی بے بسی کیسی ہوتی ہے۔ دل کچھ چاہ رہا ہو اور مصلحتیں کچھ اور کرنے پہ مجبور کر رہی ہوں۔۔۔ یہ کیفیت تم پہ اب صادق آئی ہے' میں کب سے اسی کرب سے گزر چکی ہوں۔"

اس نے سفاکی سے سوچا اور کن اکھیوں سے وشمہ کو دیکھا جو بظاہر کتابوں کی جانب متوجہ تھی مگر اس کی ساکت نظریں اور کھویا کھویا انداز اس کی دلی کیفیت کی چغلی کھا رہا تھا۔

"کوشش کرنا چاہیں تو ہو بھی سکتا ہے۔ آپ نے دل سے ایسا چاہا تو ہوتا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے وشمہ کے تاثرات جانچے وہاں ایک شکوہ سا رقم نظر آیا۔ جو بجا طور پہ پروین کے لیے تھا۔

وہ اور بھی مطمئن ہو گئی۔

"میں ایک کوشش اور کروں گی۔۔۔ مگر وعدہ نہیں کر سکتی خدا کے لیے مجھے مجبور نہ کریں بھابی!"

"مجبور تو میں ہوں پروین۔"

وشمہ کو اٹھ کر اندر جاتے دیکھ کر منزہ نے دل گرفتگی سے کہا۔

"میں کہنا تو نہیں چاہتی تھی۔۔۔ بیٹی کا پردہ ماں نہیں رکھے گی تو اور کون۔۔۔ پھر سوچا میں ماں ہوں تو آپ پھوپھی۔ شاید آپ بھی اس مجبوری کو محسوس کر سکیں۔"

"صاف صاف بتائیں بھابی!"

پروین نے ایک سیکنڈ میں سینکڑوں اندیشے پال لیے۔

"اگر میں یہ کہوں کہ آپ پہ وصی کے لیے دباؤ میں وشمہ کے دباؤ میں آ کے ڈال رہی ہوں تو کیا تب بھی آپ خود کو بے اختیار پائیں گی؟"

منزہ کے سوال نے پروین کو گنگ کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"کسی دن تقدیس سے ملنے اس کے گھر بھی جاؤ ناں۔"

حسب معمول وہ کالج سے واپسی پہ لنچ کرتے ہوئے اپنے دن بھر کا معمول اور تازہ ترین واقعات سنا رہی تھی اور پچھلے چند دنوں سے اس معمول کی گفتگو میں تقدیس کا ذکر لازمی ہوتا تھا۔

ربینا کی عادت تھی کہ سوہا چاہے گھنٹوں بولتی رہتی۔ وہ باقی سارے کام پس پشت ڈال کے بڑے تحمل سے سنتی رہتی۔ پوری توجہ کے ساتھ۔۔۔ ایک لطف اندوز ہونے والی مسکراہٹ اس دوران اس کے ہونٹوں پہ رہتی۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ اس نے سوہا کو ٹوک کر درمیان میں کچھ کہا ہو۔ لیکن آج جب غیر متوقع طور پر اس نے اچانک یہ مشورہ دیا تو سوہا لمحہ بھر کو چپ سی ہو گئی۔

"کیوں؟"

بتاتی۔۔۔ تقدیس نے کبھی اس قسم کی دعوت ہی نہیں دی تھی۔ اگرچہ وہ سوہا کو اندر تک جان چکی تھی کہ وہ بری لڑکی نہیں ہے' صرف اس کی ظاہری شخصیت اور کچھ عادتیں ضرور خراب تاثر چھوڑتی ہیں مگر نہ وہ کردار کی بری تھی نہ فطرت کی۔ اب تو وہ رفتہ رفتہ اس کی بہت سی عادتیں نامحسوس طریقے سے چھڑوا بھی چکی تھی۔

ہوٹنگ کی۔۔۔

گالیاں دینے کی۔۔۔

اور اس کی ڈریسنگ بھی بہت حد تک مناسب ہو گئی تھی لیکن اب بھی وہ اخلاقیات کے اس معیار پہ پوری نہیں اترتی تھی' جو اس کے گھرانے میں قائم تھا اور اس لیے وہ اسے اپنے گھر لے جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔۔۔ مدیحہ نے تو اس کی سلیولیس شرٹ' کمر تک ادھڑی چاک دیکھ کے تقدیس کے وہ لتے لیتا تھا کہ بس۔

"ایک دوسرے کے گھر آنے جانے سے۔۔۔ فیملیز سے انٹروڈیوس ہونے سے دوستی اور گہری ہوتی ہے۔"

سوہا کے چہرے پہ تذبذب دیکھ کر ربینا نے وضاحت کی۔

"اتنا ٹائم کس کے پاس ہے ماما؟" اس نے لاپروائی اختیار کرتے ہوئے بات ٹالنا چاہی۔

"تو ٹائم نکالو سویٹ ہارٹ۔"

اس نے الجھن بھری نظروں سے ربینا کو دیکھا۔ وہ ایسی ماؤں میں سے نہیں تھی جو بیٹی کی "پرسنل لائف" میں دلچسپی لیں۔

"کبھی تم اس کے گھر جاؤ۔ کبھی اسے اپنے گھر بلاؤ مجھے اچھی لگی ہے وہ لڑکی۔ پرخلوص سی۔ میرا دل چاہ رہا ہے تم دونوں کی دوستی اور بھی مضبوط ہو۔ تمہیں کسی اچھی دوست کی بہت ضرورت ہے سوہا! بالکل تقدیس جیسی۔ کسی دن انوائٹ کر لیتے ہیں اس کی فیملی کو۔"

ماما کے آئیڈیے پہ وہ فوراً "انکار میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں ابھی نہیں۔ میرا مطلب ہے فیملی کو نہیں۔ ابھی صرف تقدیس سے اپنا رشتہ مضبوط کرو۔"

"ماما آپ کیسی الجھی الجھی باتیں کر رہی ہیں۔"

"باتیں؟ تمہاری ماما کی تو ساری زندگی الجھی ہوئی ہے میری جان۔ اب جا کے ایک سرا ہاتھ آیا تھا۔۔۔ شاید کوئی گتھی میں سلجھا ہی لوں تمہاری مدد سے۔" وہ سوچ گئی۔

☼ ☼ ☼

وشمہ کی آنکھ رات دیر سے لگی تھی۔ لہٰذا صبح کالج بھی نہ جا سکی۔ منزہ نے تکیے پہ پھیلے اس کے ریشمی بال پیار سے سہلاتے ہوئے اسے جگانا چاہا۔

"وشمہ! اٹھو بیٹا دس بج رہے ہیں۔" پہلی آواز پہ وہ ہلکا سا کسمسائی مگر دس بجنے کا سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"دس بج گئے؟ اتنی دیر؟ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔" وہ جلدی جلدی سلیپر پہننے اور بال سمیٹنے لگی۔

"میرے پہلے دونوں پیریڈ مس ہو گئے۔ اب بھی اگر ساڑھے دس تک پہنچ گئی تو شاید تیسرا۔۔۔"

"رہنے دو اب۔" منزہ نے پیار سے اسے منع کر دیا۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آرام کرو۔" اس نے بغور اس کی متورم آنکھوں اور ان میں نظر آتے سرخ ڈوروں کو دیکھ کر کہا۔

وشمہ نظریں چرا گئی۔ "میں ٹھیک ہوں ماما۔" پھر بات بدلی۔ "آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"کیونکہ میں جانتی ہوں تم رات دیر سے سوئی تھیں۔"

منزہ نے وشمہ کو جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"آج۔۔۔ آج ٹیسٹ تھا نا۔۔۔ تو تیاری۔" وہ ماں کی ٹٹولتی نظروں سے خائف ہو رہی تھی۔

"وشمہ! میری بچی ماں سے بہترین دوست کوئی اور نہیں ہوتا اور تم مجھ سے اپنے دل کی بات چھپاتی ہو۔" اس

نے وشمہ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر محبت سے کہا تھا۔
"ماما! میں نے تو کچھ بھی نہیں۔" اس سے کوئی بات مکمل نہ ہو پا رہی تھی۔
ایسا لگ رہا تھا جیسے منزہ نقب لگا کر اس کے اندر کے سارے نوخیز راز چرا کے رہے گی۔
"ماں ہوں تمہاری..... تمہاری ہر خواہش سے آشنا۔ وہ بھی جو تمہارے لبوں پہ ہے اور وہ بھی جو تمہارے دل میں ہے..... جیسے کہ وصی۔"
وشمہ کا چہرہ جھک کر سینے سے جا لگا۔ منزہ کو اس کی اس ادا پہ بے ساختہ پیار آ گیا۔
"پگلی۔" وہ اسے گلے لگا کر ماتھا چومنے لگی۔
"ماں سے کیا پردہ..... اور مجھے تو فخر ہے اپنی بیٹی پہ۔ اس نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا..... جذبات کے ہاتھوں بے لگام ہو کر اپنا وقار نہیں کھویا..... رہا دل کا سوال تو دل تو ہوتا ہی بے اختیار ہے۔ میں جو تمہاری پھوپھی پہ مسلسل دباؤ ڈال رہی ہوں وصی کے لیے تو وہ تمہاری اس تابعداری کا انعام ہے کہ تم نے اپنے دل کی بات کو دل تک رکھا۔ اسے کسی اور کے تو کیا وصی تک کے علم میں نہ آنے دیا اور دیکھنا میں یہ انعام تمہیں دے کر رہوں گی۔"
"ماما!" وہ حیا کے بوجھ سے دہری ہوتی اب اس کے سینے میں چھپی جا رہی تھی۔
"چاہے تمہاری پھوپھو کتنی ہی آناکانی کرے۔"
منزہ کی بات پہ اس کا دل سہم سا گیا۔
"تو کیا پھوپھو راضی نہیں ہیں؟"
اس نے دل ہی دل میں پوچھا..... جبکہ منزہ اس سوال سے آگاہ تھی۔
"نجانے کیوں وہ راضی نہیں ہے' حالانکہ تم سگی بھتیجی ہو اس کی۔ اسے تو میرے کہنے سے پہلے خود یہ احساس کرنا چاہیے تھا۔ خیر وہ چاہے اپنا فرض نبھائے نہ نبھائے میں تو ماں ہوں ناں..... میں نے بھی تمہارے دل کی مانی تو اور کون مانے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا سر سہلا رہی تھی۔

● ● ●

رخشندہ پہ ان دنوں الگ ہی موسم اترا ہوا تھا۔
دو دو بیٹیوں کے رشتے طے ہو جانے کی خوشی۔
اور وہ بھی اتنی اچھی جگہ ہو جانے کی خوشی..... ایسی خوشی' جس میں اطمینان کی چاشنی بھی شامل ہو۔
وہ کھل کے مسکرا رہی تھیں..... کھل کے چاؤ پورے کر رہی تھیں۔
"بس میں نے کہہ دیا ہے' اورنج کلر کا ایک بھی سوٹ نہیں ہو گا۔"
ندا نے صاف اعلان کر دیا۔ اورنج کلر اسے سخت ناپسند تھا۔
"اور اگر بری میں دو تین سوٹ اورنج کلر کے ہو گئے تو؟"
ردا نے تنگ کرنے کی نیت سے شوشہ چھوڑا۔
"میں پہلے سے منع کر دوں گی..... لاؤ دو فون۔"
"ہوش کرو ندا!" رخشندہ جواب تک خاموشی سے مسکرا مسکرا کر سنتے ہوئے بڑے سے اٹیچی کیس میں سے سوٹ نکال رہی تھیں' اچانک بوکھلا گئیں۔
"اب تم ہونے والی سسرال خود فون کرو گی؟"
"خود کب کر رہی ہوں..... ردا ملا کر دے گی نمبر۔"
"ایک ہی بات ہے۔"
"لو..... جب وہ فون کریں تو آپ خاص تاکید کے ساتھ مجھے ریسیور تھماتی ہیں کہ بے شک وہ گھنٹہ بھر دماغ چاٹتی رہیں۔ تم صبر کے ساتھ بیٹھی ان محترماؤں کی بے سروپا گفتگو کانوں میں اتارتی رہو۔ تب کوئی فرق نہیں پڑتا اور میں فون کر لوں تو حرج ہے؟"

"بالکل حرج ہے۔ باتیں سنو ذرا اس لڑکی کی..... ذرا عقل نہیں ہے کہ سسرال والوں سے خصوصاً" ہونے والی سسرال کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں۔ نجانے کالج میں کیا کرتی ہے؟"
"کالج میں ہونے والی سسرال سے نمٹنے کے لیے کوئی کورس نہیں ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔
"ہاں ہے..... میں کیا کبھی کالج نہیں گئی۔" وہ برا مان گئیں۔ اسی بات کا تو زعم رہا تھا ہمیشہ..... کہ جس خاندان کی خواتین بمشکل میٹرک پاس تھیں وہاں وہ پہلی گریجویٹ بہو تھیں۔
"خبردار ردا! کوئی ضرورت نہیں اسے نمبر ملا کے دینے کی۔ کل میں نے کتنا کہا کہ تمہاری ساس کو زکام ہے' فون کر کے خیریت معلوم کر لو۔ مگر یہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آج بری کے لیے۔ اپنی ہی بری کے لیے منہ پھاڑ کے ہدایات دینے فون کر رہی ہے۔ رکھ دو فون۔"
"اوہو..... میں کب آپی کو نمبر ملا کے دے رہی ہوں۔ میں تو اپنی فرینڈ کو فون کر رہی ہوں۔" ردا جھنجلا کے بولی۔
"اور زکام ہی تو ہوا تھا بڑی بی کو..... کون سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا جو میں ..."
"توبہ!" رخشندہ نے دہل کے ندا کی بات کاٹی۔
"کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا ندا!" وہ روہانسی ہو گئیں۔
"تم تو میری تربیت پہ حرف لانے کا پورا پورا انتظام کیے بیٹھی ہو۔" وہ سخت خوف زدہ انداز میں کہہ رہی تھیں اور ندا ہنسے چلے جا رہی تھی۔
"اللہ کیا ہو گیا ہے آپ کو' میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آپ تو سیریس ہی ہو گئیں۔ اچھا یہ بتائیں..... انہیں بڑی بی کہا ہے ناں میں نے..... کون سی غلط بات کی؟..... بچی اتنی تو بزرگ ہیں وہ..... پہلے میں سمجھی تھی کہ میری ہونے والی ساس کی بھی ساس ہیں..... دادو جتنی عمر کی تو ہوں گی۔"
"تمہیں کیا ان کی عمر سے؟" رخشندہ اس کی گفتگو سے جھلائے جا رہی تھی۔
"شادی ہونے جا رہی ہے اور بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں۔ کیسے نبھائے گی یہ رشتے داریاں۔ اتنی لمبی چوڑی سسرال اور یہ نکمی لڑکی..... اوروں کی بھی لڑکیاں کالج یونیورسٹی جاتی ہیں۔ نوکریاں کرتی ہیں مگر سب ہی کی عقل یوں گھاس چرنے نہیں چلی جاتی..... انہیں گھرداری کا بھی سلیقہ ہوتا ہے۔ ملنا ملانا بھی آتا ہے مگر یہ ..."
"ویسے ایک بات کہوں؟" ندا کی آنکھوں میں ابھی تک شرارت ناچ رہی تھی۔
"آپ بالکل دادو جیسی ہوتی جا رہی ہیں۔ ان ہی کی طرح بے تکان بولے چلی جاتی ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ آپ' آپ ہیں۔"
"تمہیں دیکھ کے کون سا لگتا ہے کہ تم' تم ہو..... بچی بنی رہتی ہو۔ ہما تم سے چھوٹی ہے مگر کتنی سمجھ دار۔ شادی کی بات چلتے ہی کتنی بردبار اور سنجیدہ ہو گئی ہے۔ طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا ہے اس کے..... اور ایک تم ہو۔"
اور کچن سے گلاس لے کر نکلتی ظلِ ہما کے قدم سست ہو گئے۔
"طبیعت میں ٹھہراؤ کیا آتا ماں! زندگی ہی ٹھہر سی گئی ہے اور نجانے کب تک اس اجاڑ بیاباں موڑ پہ رکی رہے بس پتا نہیں کب یہ بھاری پتھر سرکے گا..... پتا نہیں کب اس دل پہ جمی کائی چھٹے گی..... پتا نہیں کب؟ نجانے کب؟"

□ □ □ □

"ہیلو؟"
ادھر کی آواز سنتے ہی وشمہ کی ہتھیلیاں پسیج گئیں۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔
اس نے گھبرا کے جلدی سے فون رکھ دیا اور اپنی منتشر دھڑکنوں کو شمار کرنے لگی۔
وصی سے اس کی پہلے بھی کئی بار بات ہوئی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی دھڑکنوں کی ترتیب ہمیشہ ہی تلپٹ ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ حال..... شاید اس کی وجہ منزہ سے ہونے والی وہ گفتگو تھی۔
منزہ کا دلایا وہ اعتماد تھا۔

"ماں ہوں میں تمہاری۔ میں نے بھی تمہارے دل کی نہ جانی تو اور کون جانے گا۔ میں تمہاری شادی وصی سے کروا کے رہوں گی۔ دیکھنا تم۔"

اور روشمہ کے دل کے اندر دبک کے بیٹھی وصی کی نوخیز سی چاہت ایک دم سینہ تان کے تن آور ہو کر پھیل گئی۔ اسے کسی کی ذات سے اعتماد ہی ایسا ملا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا اس احساس میں کسی اور کو بھی شریک کرے اور "یہ کسی اور" سوائے وصی کے اور کون ہو سکتا تھا اس نے بے اختیار ہو کر اس کا نمبر ملا ڈالا۔ مگر اس کی آواز سنتے ہی ساری ہمت ہار بیٹھی۔

کانپتی انگلیوں کے ساتھ دوبارہ نمبر ملایا۔

"ہیلو.....!" پھر سے وہی آواز۔ سماعتوں کے اتنے قریب۔ دھڑکنوں کے اتنے پاس۔

وہ ایک بار پھر بکھر گئی..... ریسیور کریڈل پہ رکھ کے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے دھڑکنوں کو اعتدال پہ لانے لگی۔

اس بار اس شرارت میں الگ ہی مزا محسوس ہوا۔

چھپنے چھپانے کا مزا..... ستانے کا مزا۔

صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں کا مزا۔

اس نے تیسری بار نمبر ملایا اور اس ہشاش بشاش' دل میں اترنے والی آواز کی منتظر ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو..... ہیلو کون ہے بھئی..... کیا مصیبت ہے یار؟"

جھنجلا کے اس نے فون رکھ دیا۔

"کون ہے وصی؟" پروین نے اس کے لیے لسی لے کر آتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ جانے۔" اس نے لسی کے فل سائز گلاس کو دیکھ کر نظروں کو تراوٹ پہنچائی۔

"واؤ..... جھاگ والی لسی..... جئیں امی! اس وقت اس کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی ورنہ ان بلینک کال نے تو دماغ پلپلا کر کے رکھ دیا تھا۔ پتہ نہیں کون ہے..... جو۔"

اس نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا..... ہونٹوں پہ لگا جھاگ زبان سے چاٹا اور پھر اطمینان سے بات مکمل کی۔

"پچھلے دس منٹ سے تنگ کر رہا ہے۔ یا کر رہی ہے۔"

"بس دس منٹ میں تنگ آ گئے؟"

حسان نے ساتھ والے صوفے سے انگڑائی لے کر اپنی بیداری کا اعلان کیا۔

"امی! ایک گلاس لسی مجھے بھی۔" اور ساتھ فرمائش بھی بلند کی۔

"صرف دس منٹ میں میرے بھائی! دس منٹ اور سترہ کالز' یہ دیکھ لو سی ایل آئی میں۔"

اس کی اس بات پر پروین نے ایک سرسری سی نظر فون پہ ڈالی اور سی ایل آئی پہ ایک جانا پہچانا نمبر دیکھ کر چونک گئی۔

اور اس نمبر سے وصی کو کون خاموش پیغامات دے رہا ہے۔ یہ وہ شاید کل تک بالکل بھی نہ سمجھ پاتی۔ لیکن آج سمجھ سکتی تھی..... منزہ کی اس بات کو اس نے سنا ضرور تھا مگر ہضم نہ کر پائی تھی اور اب سی ایل آئی پہ چمکتا یہ نمبر اسے یقین دلا رہا تھا' منزہ نے بالکل سچ کہا تھا کہ وہ وصی کے سلسلے میں اس پہ دباؤ وشمہ کے دباؤ میں آ کے ڈال رہی ہے۔

"امی..... لسی۔"

حسان فریادیں کر رہا تھا۔ مگر پروین کے ہوش اتنے اڑے ہوئے تھے کہ اسے کچھ سوجھ نہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو.....!"

اس بار وصی حد سے زیادہ جھنجلایا ہوا تھا اور اس نے سوچ رکھا تھا کہ اب بھی کوئی نہ بولا تو وہ ساری مروت' لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے دو چار ستھری ستھری تو سنا ہی دے گا۔

"کیا بات ہے..... لڑ کے بیٹھے ہو کسی سے؟" دوسری جانب سوہا تھی۔

"اوہ..... سوہا!" وہ الجھا "کہیں پچھلے آدھے گھنٹے سے تنگ کرنے والی وہی تو ہیں۔"

"کیوں تمہیں کسی اور کے فون کا انتظار تھا؟"

"کیوں تنگ کر رہی ہو یار؟"

"میں تنگ کر رہی ہوں یا تم؟..... پتا ہے کتنے دنوں سے ملنے نہیں آئے تم۔ ذرا سی بات پہ ناراض ہو جاتے ہو لیوں کی طرح۔"

"اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم بار بار مجھے فون کر کے تنگ کرو' یہ کون سا طریقہ ہے بدلہ لینے کا۔"

اس نے ہوا میں تیر چلایا..... جانتا تھا۔ وہ آنا کانی کرنے والوں میں سے نہیں..... اگر یہ شرارت اسی کی تھی تو ہنستے ہنستے مان جائے گی۔ اور بے کار کی جو الجھن سوار ہے۔ وہ ختم ہو جائے گی کہ آخر یہ کون ہستی ہے۔

"واٹ..... میں؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں؟"

وہ حسب عادت پھٹ پڑی۔

"مائنڈ اٹ مسٹر وصی! یہاں کوئی اتنا ترسا نہیں بیٹھا نہ کسی کے پاس فالتو وقت ہے۔"

"یار! پتا نہیں کون تنگ کر رہا ہے فون پہ..... کل سے بار بار فون آتا ہے مگر کوئی بولتا نہیں۔ سوری۔ مجھے ایسے لگا جیسے شاید لیکن نہیں تم ایسا کیوں کرو گی؟"

وہ واضح طور پر ڈسٹرب لگ رہا تھا۔

"کوئی اور بھی ایسا کیوں کرے گا؟" سوہا نے نکتہ اٹھایا۔ "کتنے فون کیے اس حسینہ نے؟"

"تمہیں کیا پتا وہ حسینہ ہے یا پہلوان؟"

وہ جل کے رہ گیا۔ اس کا حشر ہو گیا تھا اس بارے میں سوچ سوچ کر اور اسے مذاق سوجھ رہے تھے۔

"فون سیل پہ آتے ہیں یا لینڈ نمبر پہ؟"

"دونوں پہ۔"

"انٹرسٹنگ۔"

"میں کیا کوئی فلم کی اسٹوری سنا رہا ہوں جو تمہیں انٹرسٹنگ لگ رہی ہے؟"

"پہلی بار تو تم سے کوئی مزے کی بات سنی ہے۔"

وہ ہنسے جا رہی تھی اور وصی تپتا جا رہا تھا۔

"ورنہ تو وہی نانو کے..... مامی کے' آپی کے قصے۔"

"تمہارے لیے تو ہر بات مذاق ہے۔"

"نہیں۔ تم تو نہیں۔" وہ فوراً" کہہ اٹھی۔ یونہی بے ارادہ.....

اور کہہ دینے کے بعد لب بھینچے سوچ رہی تھی کہ بھلا اس بات کا کیا مطلب ہوا۔

لیکن دوسری جانب سننے والا وصی تھا..... جس نے یہ بھی سوچنے کی زحمت نہ کی کہ اس بات کا مطلب کیا ہوا۔

"مجھے تو اب شک سا ہو رہا ہے کہ اگر یہ فون تم نہیں کر رہیں۔ تب بھی کسی سے کروا ضرور رہی ہو۔"

"شٹ اپ وصی!" وہ پیار بھری ڈانٹ کے ساتھ ناک چڑھا کے بولی۔

"تم میرے دوست ہو' صرف میرے۔ تمہیں تنگ کرنے کا حق بھی صرف مجھے ہے۔ میں یہ اختیار کسی اور کو کیوں دوں؟" یہ بات بھی اس نے یونہی کی تھی۔

بے ارادہ
گر کہنے کے بعد پھر سوچ میں پڑ گئی۔
"بھلا اس بات کا کیا مطلب ہوا۔"

کچھ بنا مطلب کی باتیں.....
کچھ بے مقصد سوال.....
کبھی یونہی روٹھ جانا.....
کبھی یونہی چڑ جانا.....
پھر یونہی من جانا.....
یونہی.....
یونہی دیکھنے لگتی ہیں آنکھیں
وہ چہرہ
جو نظروں سے اوجھل ہو کر بھی
منظر سے گم نہیں ہوتا
وہ بنا مطلب کی باتیں
جن کا کوئی سرا نہیں ہوتا
وہ بے مقصد سے سوال
جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا
ان سوالوں میں ان باتوں میں
من الجھنے لگے تو
جان لینا
اک نیا رشتہ شروع ہونے کو ہے
محبت کا اور اک سلسلہ
شروع ہونے کو ہے۔"

سوہا نے زور سے کتاب بند کی۔
"کیا فضول چیزیں پڑھتی ہے یہ تقدیس بھی۔"
وہ سر جھٹک کے اس احساس کو جھٹلانے لگی جو اس نظم کو پڑھنے کے بعد اسے جکڑ رہا تھا۔
"تمہیں کیا ہوا؟" تقدیس نے اس کے چہرے کے زاویے بگڑتے دیکھ کر پوچھا۔
"تمہاری یہ نظم..... یہ ہو گئی ہے مجھے۔"
اس کا چڑنا تقدیس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"کتنی بکواس ہے یہ....."
"تو نہ پڑھو..... ویسے بھی یہ میری پرسنل ڈائری ہے۔ تمہیں کھولنی بھی نہیں چاہیے۔"
"میں تو یہ دیکھ رہی تھی تم کیا لکھتی رہتی ہو۔"
"بس..... جو دل چاہتا ہے اور جو اچھا لگتا ہے۔ لکھتی ہوں۔"
"لیکن اس میں میرے بارے میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔"
اس کی تسلط پسند اور خود پسند شخصیت کو دھچکا سا لگا۔
تقدیس اس کی ناراضی دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"اچھا..... سنو۔" سوہا نے لہجے کو سرسری سا بنانے کی بھرپور کوشش کی لیکن چہرے پہ لکھی الجھن صاف پڑھی جا سکتی تھی۔
"جب کوئی اچھا لگتا ہے..... آئی مین..... یہ جو محبت وحبت ہوتی ہے تو اس کے کیا سمٹم (علامات) ہوتے ہیں؟"
اس سوال پہ پہلے سے ہنستی تقدیس کی کھنکھلاہٹ قابو سے باہر ہو گئی۔
"اس میں فنی کیا ہے؟" وہ برا مان گئی۔
"تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے کسی بیماری کی علامات کے بارے میں جاننا چاہ رہی ہو۔"
"بیماری ہی تو ہے یہ۔"
"نہیں بھئی..... محبت تو بڑا خوب صورت جذبہ ہے۔ بہت نرم..... بہت لطیف..... اگر آلودہ نہ ہو تو..... اگر پراگندہ نہ ہو تو۔"
"پلیز..... فار گاڈ سیک..... ہم اردو کی کلاس میں نہیں بیٹھے تقدیس!" وہ کراہ اٹھی۔
"اتنے بھاری بھرکم الفاظ کے ساتھ تو محبت اور بھی مشکل لگنے لگی ہے۔ پہلے ہی حلق سے نہیں اتر رہی۔"
"یہ کوئی چاکلیٹ نہیں ہے جسے تم حلق سے اتارو گی۔ یہ جذبہ دل میں اتارنے کے لیے ہوتا ہے۔"
"تمہارے دل میں اترا کبھی؟"
سوہا کو جاننے کا اشتیاق ہوا حالانکہ اثبات میں جواب ملنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔
"ہاں۔"
جواب توقع کے بالکل برعکس تھا۔
"ہیں؟..... واقعی ایمان سے؟"
سوہا اچھل پڑی۔
"کس سے؟" یہ اس کا اگلا سوال تھا۔
"ہے کوئی۔" تقدیس نے نظریں چرائیں..... مگر اس لمحے اس کے چہرے پہ دھنک اور تاریک سایوں کا جو امتزاج بکھر اٹھا تھا اسے وہ سوہا کی نگاہوں سے چھپا نہ سکی۔
"اور مزید کوئی سوال نہ کرنا..... میں اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی نہ یہ کہ وہ کون ہے نہ یہ کہ اس وقت کہاں ہو گا اور نہ یہ کہ مجھے دوبارہ کب ملے گا۔ کبھی ملے گا بھی یا نہیں۔"
سوہا کے پاس بہت سے سوال تھے۔ یہ بھی جو تقدیس نے دہرائے اور اس کے علاوہ اور بھی کئی مگر وہ خاموشی سے تقدیس کو دیکھتی چلی گئی۔ جو اس لمحے اسے بڑی الگ الگ، بڑی منفرد سی لگی۔ پہلے سے بالکل مختلف۔
بمشکل اس نے تقدیس کے اداس چہرے سے نظریں ہٹائیں اور دوبارہ اس کی ڈائری کے ورق پلٹنے لگی۔

اجنبی تھا وہ
مگر جانتا تھا میرے دل کے سارے راستے
آشنا تھا.....
لیکن توڑ گیا ملنے کے سارے آسرے.....
مہربان تھا وہ.....
پھر بھی

سوہا نے ڈائری بند کی اور اس کی جانب دیکھا۔
وہ پین کی نوک سے گھاس میں چھپی مٹی کرید رہی تھی۔
اس کا دل اپنی دوست کے اس انجانے دکھ سے بھر گیا۔
"تقدیس!" اس نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے پکارا۔ "میں تمہارا درد محسوس کر سکتی ہوں۔"

"نہیں سوہا۔! یہ درد صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہو جس نے محبت کا ذائقہ چکھا ہو..... جس نے خواب دیکھے ہوں۔ تم یہ درد محسوس کر ہی نہیں سکتیں۔"

"لیکن میں کر رہی ہوں تقدیس!"

اس نے زور دے کر کہا۔

"کیسے؟" اس نے نظریں اٹھا کر تحیر سے دیکھا۔

"تو کیا..... کیا تم بھی...

سوہا متردد نظر آنے لگی۔

"میں..." وہ تانے بانے جوڑنے لگی۔

وصی کو آنے والی فون کالز کے بارے میں سنتے ہی اس کی تمام حسیات کا منتشر ہو جانا۔

کسی متوقع رقابت کے خدشے سے دل کا سہم جانا۔

یہ سب اسے وصی کے حوالے سے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔

یہ تو ایک عام سی بے ضرر سی دوستی کا رشتہ تھا کہ وصی اپنا دوست نہیں، سہیلی محسوس ہوتا تھا۔ کبھی تقدیس نے اسے وصی کے حوالے سے ستانا بھی چاہا تو وہ بجائے چڑنے کے ہنسنے لگتی۔ تقدیس کے اس خیال پہ۔

"بھلا میں اور وصی..... پاگل ہوئی ہو تم۔"

پھر یہ کیا تھا۔

یہ ایک الگ احساس۔ بالکل الگ۔

صرف یہ سوچتے ہی کہ کوئی دوسری لڑکی ہے جو وصی کو فون کر کے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتی ہے۔ صرف یہ سوچنے کی دیر تھی کہ یہ احساس پورے وجود میں پھیل گیا۔

پھر غیر ارادتاً اس کے لبوں سے نکلتے وہ الفاظ.....

"نہیں سب مذاق ہے مگر تم نہیں۔"

کتنی سچی تھی وہ بات۔ واقعی یہ وصی ہی تھا جس کے آنے کے بعد اس نے زندگی کو مذاق سمجھنا ترک کیا تھا.... خود کو سنجیدگی سے لینا شروع کیا تھا۔

"تم میرے دوست ہو۔ صرف میرے۔ تمہیں تنگ کرنے کا اختیار میں کسی اور کو کیوں دوں؟"

اور اس نے وہ بات بھی کہہ دی تھی۔ جو اس کے خیال میں اب تک صرف اس کی ماما رینا تک محدود تھی۔

صرف رینا کی ذات وہ واحد ذات تھی..... جس کے بارے میں وہ حد سے زیادہ تسلط پسند تھی کیونکہ اس کا خیال تھا، پوری دنیا میں صرف ایک وہی ہستی ہے جسے وہ سب سے زیادہ چاہتی ہے۔

"تو کیا وصی کو بھی میں....."

"کیا سوچنے لگی ہو؟" تقدیس نے اسے جھنجھوڑا۔

"آں..... کچھ نہیں۔" وہ چونکی۔

"میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے؟"

"کیا جواب دوں۔ مجھے خود نہیں پتا۔"

"واقعی کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں؟"

تقدیس کے لہجے میں مایوسی بھری تھی۔

"تو میں نے بے کار میں اتنی لمبی چوڑی کہانی سنائی..... سفید جھوٹ بول کر اپنے گناہوں میں اضافہ کیا۔"

"کیا؟ کیا مطلب۔" سوہا چلائی۔

"اور کیا..... صرف تمہارے اندر سے اندر کی بات اگلوانے کے لیے۔" وہ پھر سے ہنسے جا رہی تھی۔ چند منٹ

پہلی والی سنجیدگی اور گمبھیرتا کا شائبہ تک نہ تھا اس کے چہرے پہ۔

"کس قدر جھوٹی ہو تم۔"

سوہا اس کی کمر میں ایک دھموکا جڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور خبیث بھی..... یعنی وہ سب جھوٹ تھا؟"

"سو فیصد۔"

"ایکٹر۔ فراڈ..... مکار۔"

وہ اپنی یادداشت کھنگال کر قدرے مہذبانہ گالیاں ڈھونڈ رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

"آپ نے وصی کے لیے ردا کا نام....."

وہ بڑی ہچکچاہٹ کے عالم میں کہہ رہی تھیں۔

حالانکہ یہ بات اماں جان سے سن لینے کے بعد انہوں نے قسم کھائی تھی، اس بارے میں سوچنا تک نہیں۔ چاہے منزہ کتنا بھی دباؤ ڈالے لیکن آخری بار اس نے جو تڑپ کا پتہ چلایا تھا..... وشمہ کا ذکر کر کے..... اس کے بعد پروین اپنی قسم پہ قائم نہ رہ سکیں۔

"ہاں..... لیکن تم اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو؟"

شوکت جہاں ان کی حالت دیکھ کر ٹھٹھکیں۔

"اماں جان! یہ آپ کی دلی خواہش ہے یا محض رخشندہ بھابی کا بوجھ ہلکا کرنے کی نیت سے آپ۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو پروین! کھل کے کہو۔"

"کہہ تو دوں مگر ڈر ہے، آپ غلط مطلب نہ نکال لیں۔ یا ناراض نہ ہو جائیں۔"

انہوں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"نہیں تم کہو؟"

خلافِ عادت انہوں نے مختصر الفاظ میں معاملہ سمیٹا۔ شاید پروین کے دل کی بات جلد سے جلد جان لینے کی بے تابی تھی۔

"اگر تو یہ آپ کی دیرینہ خواہش ہے اماں جان تو سر آنکھوں پہ..... لیکن اگر صرف وہی وجہ ہے جو میں نے پہلے بیان کی ہے تو ردا کے لیے میں حسان کا رشتہ دینے پہ تیار ہوں۔"

"حسان نے کہا تم سے؟"

شوکت جہاں کے سوال پہ وہ بری طرح چونکیں۔

"ارے..... یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں..... یہ تو بہت آسان حل تھا کہ میں کہہ دیتی، ردا کے لیے میں حسان کا خیال پکا کیے بیٹھی ہوں اور جب وہ وصی کا نام لیتیں میں کہہ دیتی سوچتے ہیں اس کے بارے میں بھی کچھ اور پھر شمسہ کا خیال ظاہر کر دیتی۔ کمال ہے میں بلاوجہ اتنا ڈر ڈر کے بات کر رہی تھی۔"

اب ان کا اعتماد لوٹ آیا اور وہ آرام سے اپنا مدعا بیان کرنے لگیں۔

"حسان اور یہ بات کرے گا؟ آپ کیا جانتی نہیں ہیں اپنے پوتے کو۔" وہ بلاوجہ ہنسنے لگیں۔ شاید اپنی خجالت کم کرنے کے لیے۔

"ہاں۔ میری شروع سے یہ خواہش تھی۔"

"کبھی ذکر نہیں کیا تم نے۔"

شوکت جہاں کو شروع کی خواہش والی بات کچھ ہضم نہ ہوئی اس لیے فوراً جتا دیا۔

"کبھی وقت کہاں آیا تھا۔ وہ تو اس دن آپ نے وصی کے حوالے سے ردا کا نام لیا تو..؟"

"تب کچھ کیوں نہیں کہا تم نے؟"

"مجھے لگا...... میں وصی اور حسان میں فرق کر رہی ہوں مگر بخدا میرا ایسا کوئی مقصد نہیں۔ میرے لیے حسان اور وصی ایک برابر ہیں۔ ردا تو میری ہی بہو بن کے آئے گی دونوں صورتوں میں لیکن بس خواہش تو خواہش ہے میں نے سوچا' آپ سے ذکر تو کروں' آگے جو آپ کی مرضی تاکہ دل میں یہ ملال نہ رہے کہ میں نے کہہ کے تو دیکھا ہوتا۔"

"ہاں..... ٹھیک سوچا تم نے' دل کی بات کہہ دینی چاہیے۔ خصوصاً "اپنوں" سے۔"

"پھر کیا خیال ہے آپ کا اماں جان؟" انہوں نے بڑی آس کے ساتھ پوچھا۔

"حرج تو کوئی نہیں اس میں..... دونوں کی عمر بھی ایک ہی ہے۔ صرف فرق ہے تو یہ کہ وصی تعلیم مکمل کرتے ہی اپنے پیروں پہ کھڑا ہو چکا ہے جبکہ حسان کی ابھی تک تعلیم بھی.."

پروین دل مسوس کر رہ گئیں۔

"اور ردا کا تم جانتی ہو..... ماشاء اللہ سے شروع سے ہی پڑھائی میں کتنی اچھی ہے۔"

یہ دوسرا موقع تھا جب انہیں اپنے بیٹے کی کم اہلی کا طعنہ سننے کو مل رہا تھا اور زندگی میں پہلی بار انہیں حقیقی معنوں میں حسان پہ سخت تاؤ بھی آ رہا تھا۔

"لیکن میں یہ بات رخشندہ سے کہوں گی ضرور۔"

اب شوکت جہاں نے ان کے ڈوبتے دل کو امید کی پتوار تھمائی۔

"اپنوں میں ایسی معمولی باتیں نظرانداز کر دی جاتی ہیں اور پھر حسان تو ہے بھی بڑا سیدھا..... بڑا پیارا۔"

پروین نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔

✡ ✡ ✡

"کیا کر رہے ہیں آپ؟"

منزہ نے یونہی سرسری سی نظر ڈالی تھی نوید مراد کے ہاتھوں کی حرکت پہ..... اور ایک جانا پہچانا نمبر ملاتے دیکھ کر چونک گئی۔

"پروین کو فون کر رہا تھا..... بہت دنوں سے بات نہیں ہوئی۔"

منزہ نے تیزی سے آگے بڑھ کے فون اس کی گود سے اٹھایا۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو اپنی بیٹی کی پروا ہے کہ نہیں۔"

"تم ابھی تک وہی بات لیے بیٹھی ہو؟"

"وہ بات ختم ہوئی کہاں ہے؟"

"منزہ! تم نے کبھی اس طرح کا برتاؤ نہیں کیا۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے تمہارے طرز عمل پر..... اور افسوس بھی۔ تمہیں اتنا تو سوچنا چاہیے کہ پروین کس ذہنی کرب سے گزر رہی ہو گی۔ یقیناً" وہ اس معاملے میں [illegible]

کیا میں اس بات پہ اس سے لاتعلق ہو کر اس کی بے بسی اور مجبوری کا مذاق اڑاؤں؟"

منزہ نے ایک گہری سانس لی اور اپنی نظریں نوید مراد کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

کیا نہیں تھا ان نظروں میں۔

گزرے کل کی ساری حکایتیں.....

ساری بے بسی..... ساری مجبوریاں۔

نوید مراد نے نظریں چرا لیں۔

"انہیں کم از کم اس بات کا احساس تو ہونا چاہیے کہ ہماری بیٹی کی حق تلفی ہوئی ہے۔"

شمہ کے نصیب میں جو ہے' اسے مل کے رہے گا منزہ!"

بارہ بڑے دھیمے اور پست لہجے میں بولا۔

تمہاری فکرمندی سمجھ سکتا ہوں لیکن اس کے لیے۔"

ن کی گھنٹی نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔

پروین"

اسکرین پہ چمکتے نمبر کو دیکھ کر حیرت سے دُہرا کے رہ گیا۔

ے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتا..... پروین کا فون خود ہی آ گیا۔"

ے سرشاری سے کہتے دیکھ کر وہ کلس کے رہ گئی اور احتجاجاً کمرے سے نکل گئی۔

ہیلو پروین!"

دل ہی دل میں منزہ کے بے موقع' بے محل مطالبے پہ نادم سا تھا اور یہی توقع کر رہا تھا کہ دوسری جانب بھی شاید یہی گلہ کرنے کا ارادہ باندھا ہو گا لیکن خلاف توقع ان کا رویہ نارمل تھا۔ وہ روٹین کی باتیں بھائی نے لگیں۔

منزہ پیر پٹختی باہر نکل تو آئی تھی مگر اب دھیان سارے کا سارا اندر ہونے والی گفتگو کی جانب تھا۔ وہ بہانے سے دو تین بار کمرے کے آگے سے گزری اور ادھ کھلے دروازے سے سن گن لینے کی کوشش کی۔ ہر بار آتی نوید مراد کی شگفتہ آواز اور ہلکا پھلکا لہجہ سن کر حیران ہوتی رہی۔

کو مٹی کی بنی ہے یہ پروین...! یا تو اسے واقعی وشمہ کی ذرا برابر پروا نہیں یا پھر جان بوجھ کر مجھے باور کراتا ہے کہ اس پہ ان باتوں کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

اس سے رہا نہ گیا تو اندر آ گئی۔

کیوں نہیں آنا۔ کیوں نہیں ضرور آئیں گے۔ آخر تمہارے گھر کی پہلی خوشی ہے اور ماموں ہونے کے ناتے فرض ہے کہ میں تمہارے گھر آ کے حسن کی منگنی کی مبارک باد تمہیں اور سراج بھائی صاحب کو دوں۔"

کہتے ہوئے اس نے دانستہ منزہ کی جانب سے رخ پھیرا جو بیڈ کی چادر بدلتے ہوئے بڑے جارحانہ انداز میں جھٹکے دے رہی تھی۔

ناراض ہونے کا پورا حق ہے بھائی صاحب کو..... واقعی یہ میری کوتاہی ہے۔ اور میں اس کی معذرت بھی ان کر لوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

ساری عمر معذرتیں ہی پیش کرتے رہیے گا آپ۔"

تکیے کے کور نوچ کر اتارتی ہوئی بڑبڑانے لگی۔

ہی ارادہ بنتا ہے..... فون کر کے اطلاع دے دوں گا..... خیال رکھنا اپنا۔ اللہ حافظ۔"

بند ہوتے ہی منزہ نے ہاتھ میں پکڑی چادر پرے پھینکی اور تیزی سے نوید کی جانب گئی۔

ب میرا نہ سہی بیٹی کا مان تو رکھ لیں۔"

کس کا مان؟"

ہوئے ایک ہی سوال نے اسے چپ سادھ لینے پہ مجبور کر دیا۔

چپ چاپ انہیں کمرے سے نکلتا دیکھتی رہی اور تھکے تھکے انداز میں بیڈ کے کونے پہ بیٹھ گئی۔

جانے کون ہیں جن کی سازشیں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ نجانے کون ہیں وہ جن کی برائیاں بھی مراد پا لیتی ہیں ہم اور صبر بھی رائیگاں گیا اور مکر بھی۔"

✡ ✡ ✡ ✡

ہیلو۔"

اس بار جھنجلاہٹ اور بے زاری نہیں..... آواز میں تھکن لیے پوچھ رہا تھا۔ مگر حسب سابق کوئی آواز

کریں گھروں میں نوکروں کی فوج کیوں نہ ہو لیکن انہیں ہر کام میں طاق ضرور ہونا چاہیے۔
میرا کیا قصور ہے امی۔ ! اسے دیکھیں اس کا اپنا جی مچل رہا ہے سسرال میں حاضری دینے کا۔"
بات سے ہما ایسا تپی کہ پلیٹ دوبارہ پٹخ دی۔
خود ہی۔"
بات کہہ کر پچھتائی۔
ارے سنو تو۔۔۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔"
وہ تیز تیز قدموں سے کچن کی جانب چل دی تھی۔
فضول گوئی کی عادت ترک کر دو ردا۔۔۔! یہ ہمیشہ خجالت ہی دیتی ہے۔"
رخشندہ کو بھی اس کا یہ کہنا اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ اس کے ردِ عمل کے طور پر وہ ہما کے چہرے پہ کچھ عجیب سے
رنگ دیکھ چکی تھیں۔
وہ اس کے چچا کا گھر ہے۔۔۔ یہ سسرال وسسرال بعد کی باتیں ہیں۔ جاؤ ظلِ ہما! تم دے آؤ یہ بریانی نیچے۔
تمہاری دادی ویسے بھی دوپہر کا کھانا جلدی کھاتی ہیں۔"
وہ اب قطعاً "نہیں جانا چاہتی تھی لیکن ماں کو صاف انکار بھی نہیں کر سکتی تھی اس لیے تذبذب کے عالم میں
کھڑی رہی۔
جاؤ بھی۔۔۔ ویسے بھی حسن کون سا اس وقت گھر پہ ہوتا ہے جو تم جھجک رہی ہو۔"
اس کی جھجک کو رخشندہ نے اپنی فہم کے مطابق معنی پہنائے۔ اب ہما مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی
اس لیے پلیٹ اٹھا کے نیچے آ گئی۔
کئی دِنوں بعد وہ اس پورشن میں آئی تھی۔ سب کچھ الگ الگ اور اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔
"ارے ہما۔۔۔" پروین اسے دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ "آؤ بیٹا۔۔۔ شکر ہے تم نے بھی قسم توڑی۔۔۔ میں تو سچ میں
تم سے گِلہ کرنے والی تھی۔ اس نے منع کیا ہو گا ناں۔۔۔ حالانکہ رشتہ تو وہی ہے بیٹا۔۔۔ وہی گھر' تمہارا اپنا
گھر' چچا کا گھر' چچی کا گھر' دادی کا گھر۔۔۔"
"یہ بات نہیں چچی۔۔۔" وہ محجوب سی ہو گئی۔ "انہوں نے منع نہیں کیا بس ٹائم ہی۔۔۔"
"بس بس رہنے دو' نئی نئی مصروفیت ہے تمہاری جو میرے پاس آنے کا ٹائم اب نکالنا پڑے گا۔"
انہوں نے ہما کا ہاتھ تھام کے اپنے پاس بٹھایا۔
کیا پیو گی۔۔۔؟ کوک یا شربت اور یہ کیا لائی ہو؟"
"نہیں کچھ نہیں چچی۔۔۔ ابھی ابھی چائے پی ہے اور یہ بریانی امی نے بھیجی ہے۔"
اس نے بھی دونوں سوالوں کے جواب اکٹھے ہی نمٹائے۔
کس نے بنائی ہے۔۔۔؟"
"
تو مزے کی ہو گی۔۔۔"
اس کے کہنے کا مطلب ہے کہ رخشندہ مامی بڑی فضول بریانی پکاتی ہیں۔"
اس کی گھبراہٹ کم ہوتے ہوتے اب ختم ہی ہونے والی تھی کہ وصی کی آواز سن کر وہ اچھل پڑی۔
چہرے پہ سمٹ آیا۔۔۔
اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں آنے پہ اس سے بھی سامنا ہو سکتا ہے۔۔۔ وہ تو اسی پہ مطمئن ہو گئی تھی کہ
حسن سے مڈبھیڑ نہیں ہو گی۔ اس نے تو اس نئے رشتے کے بعد یہاں آنا کم کر دیا تھا۔ لیکن نامعلوم
شاید وصی کے بھی اوپر کے چکر گھٹتے گھٹتے غائب ہو چکے تھے۔

سنے بغیر کال ڈس کنیکٹ ہونے کی ٹون سنائی دی۔
اس نے الجھن بھرے انداز میں ریسیور رکھا۔۔۔ اور اسکرین پہ نظر آتے اس نمبر کو دیکھنے لگا۔
مسئلہ سامنے تھا مگر حل بھی سامنے تھا۔
چاہتا تو اس نمبر پہ کال کر کے اپنے سارے سوالوں کا جواب پا سکتا تھا۔۔۔ ضروری نہیں تھا کہ کال ریسیو کرنے
والا یا کرنے والی وہی ہوتی جس نے پچھلے کچھ دِنوں سے اسے پریشان کر کے رکھا ہوا تھا۔ لیکن کم از کم یہ تو پتہ چل
جاتا کہ وہ ہے کون؟
جاننے والوں میں سے کسی کی شرارت تھی یا کسی انجانے فرد کی شرانگیزی۔

● ● ●

"بہت ہی سست لڑکی ہو تم۔۔۔ بریانی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی۔۔۔ مگر تم نہیں اٹھیں۔۔۔ اٹھتی ہو کہ میں جاؤں
خود۔۔۔؟"
رخشندہ نے پڑھائی میں غرق ردا کو تیز نظروں سے گھورا۔ اس پہ مطلق اثر نہ ہوتے دیکھ کر پھر سے اضافہ کیا۔
"زیادہ سے زیادہ لوگ یہی کہیں گے کہ تین تین بیٹیوں کی ماں خود ہاتھ میں ڈش پکڑے' دوسرے ہاتھ سے گھٹنا
پکڑے سیڑھیاں اتر رہی ہے۔"
ان کے گھٹنوں میں پچھلے تین چار روز سے تکلیف تھی۔
اور یہ بلیک میلنگ کچھ کچھ کارگر رہی۔ ردا نے زور سے کتاب بند کی۔
"لائیں۔۔۔ دیں۔۔۔ ان دونوں کو تو منگنی ہوتے ہی آپ نے ہتھیلی پہ بٹھا کے رکھ لیا ہے۔ کوئی کام ہی نہیں
کرنے دیتیں۔ میرے ایگزامز ہو رہے ہیں اور پھر بھی سارے گھر کے کام مجھ ہی کو کرنے ہیں۔"
وہ ناراض ناراض سی اٹھ گئی تھی۔
"مثلاً"۔۔۔؟ کون کون سے گھر کے کام۔۔۔!"
اس سفید جھوٹ پہ رخشندہ کو تاؤ تو بڑا آیا۔۔۔ پھر بھی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔
"وہ۔۔۔ جیسے۔۔۔ جیسے کل رات فریج میں پانی کی ساری بوتلیں میں نے بھر کر رکھیں۔۔۔ اور ہاں کل شام کی چائے
میں نے بنائی تھی۔۔۔ وہ بھی۔ سب کے لیے۔۔۔ صبح آملیٹ کے لیے پیاز بھی ہما نے مجھ سے کٹوائی۔۔۔ لاؤنج میں
بکھرے اخبار بھی آپ نے مجھے ہی سمیٹنے کو کہا تھا۔"
"جو پھر بھی تم نے نہیں سمیٹے۔"
ہما اس بحث سے اکتا کے کچن سے نکل آئی۔۔۔
"ہاں تو میں دوسرے کاموں میں بزی تھی۔ تمہارے پاس تو اچھی جگہ ہے چھپنے کی۔۔۔ کچن۔۔۔"
"میں کچن میں چھپ کر کرتی کیا ہوں۔۔۔؟ یہ پتا ہے تمہیں۔۔۔؟"
ہما نے بریانی کی ڈھکی پلیٹ سے خوان اٹھا کے سرسری سی نظر ڈالی اور پلیٹ اٹھا لی۔
اس کا ارادہ بھانپ کر ردا پھر سے بیٹھ گئی اور کتاب کھول لی۔
"پھر سے بیٹھ گئی ہو۔۔۔ میں تمہارا کیا کروں ردا۔۔۔"
رخشندہ کو غصہ تو اس کی کام چوری پہ آتا ہی رہتا تھا۔۔۔ اب مایوس بھی ہونے لگی تھیں۔ ندا اور ہما بھی پڑھائی
میں مصروف رہا کرتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ گھر کے کاموں میں بھی ان کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔ ندا نے
جب سے کالج جوائن کیا تھا۔ وہ چھٹی کے دن وہ شاذ و نادر ہی کچن کو رونق بخشا کرتی۔۔۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی حد
درجہ بڑھتی مصروفیت تھی۔ دوسرے تھکن کے پیش نظر رخشندہ نے خود ہی اس پہ کم ذمہ داریاں عائد کر رکھی
تھیں اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہما نے اپنی گہری دلچسپی کی وجہ سے خود ہی تن تنہا بہت سی ذمہ داریاں لے
رکھی تھیں۔
ردا' ندا اور خود رخشندہ کے لیے بہت کم کام باقی بچتا لیکن رخشندہ کی خواہش بھی فطری تھی کہ بھلے بیٹیاں کچھ

"تم باز نہ آنا اپنی شرانگیزیوں سے۔۔۔"

پروین نے پیار سے اسے جھڑکا۔

"ویسے تم اس وقت؟ حسن بھائی تو دو بجے تک آتے ہیں۔" وصی نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ کر کہا۔

وہ گھبرا کے ہاتھ مسلتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں چچی۔۔۔"

"ارے۔۔۔ بیٹھو تو۔۔۔ یہ وصی تو بس۔۔۔ تم بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہو۔ تمہارا اپنا گھر ہے بیٹا۔ تم جب سے کسی بھی وقت، کبھی بھی آسکتی ہو۔۔۔ سمجھیں۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ کبھی بھی۔۔۔ کسی بھی وقت۔۔۔"

وصی نے اضافہ کیا۔

"بس اتنا کرنا۔۔۔ ہمیں پیشگی اطلاع دے دیا کرنا۔ تاکہ ہم حسن بھائی کو کسی بہانے سے گھر پہ روک لیا کریں۔"

وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا اور پروین بظاہر اس سے خفا۔۔۔ مگر اندر ہی اندر اس کی شرارت پہ محظوظ ہوتی اپنی مسکراہٹ چھپاتی ہوئی اس کے کاندھے پہ دھپ لگا رہی تھیں۔

ظل ہما نے شکوہ کناں نظروں سے وصی کو دیکھا۔ جواب اس کی جانب بالکل بھی متوجہ نہیں تھا۔

حسن کے حوالے سے بہنوں کی چھیڑ چھاڑ۔۔۔ سہیلیوں کی چہلیں اور ماں کی نصیحتیں ہمیشہ اسے بوجھل کر دیتی تھیں۔ اپنے پر کٹنے کی بے بسی کا احساس سوا ہو جاتا تھا لیکن جو ناگوار سا احساس اسے آج وصی کی وجہ سے ہو رہا تھا، وہ ان سب سے بڑھ کے تھا۔ وہ اپنی پیشانی کی شکنیں چھپائے نہیں چھپا پا رہی تھی لیکن کوئی نہ دیکھنے والا تھا نہ سمجھنے والا۔

"بائی دا وے، یہ بریانی اس دن والی بریانی تو نہیں ہے۔ بینگن، آلو اور شملہ مرچ والی۔"

وصی نے مسلسل ہنستے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وصی! تمیز کرو بھابی ہے اب وہ تمہاری لگام دو زبان کو۔۔۔"

پروین نے اس کی سنجیدگی بھانپ کر وصی کو ڈانٹا۔

"سوری مامی۔۔۔ میں تو۔۔۔ ہما۔۔۔ سنو تو۔۔۔"

مگر وہ تیز تیز چلتی لاؤنج سے نکل گئی اور کوریڈور کے آخری سرے پہ اندر داخل ہوتے حسن سے بری طرح ٹکرا گئی۔

دونوں کو ہی اس ٹکراؤ کی توقع نہیں تھی۔

دونوں ہی ایک دوسرے کے وجود سے گریزاں تھے۔

دونوں ہی اپنے مابین رشتے سے خائف تھے۔

اور دونوں ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اس وقت ایک دوسرے کے مقابل ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے۔

دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے اجنبیت تھی۔

دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے سرد مہری تھی۔

لیکن دونوں کے ہاتھوں کی لکیریں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

نوید مراد نے بہت پس و پیش کے بعد منزہ سے کہا تھا۔ کہے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ آخر کو بہن کی سسرال کا معاملہ تھا اور وہ ان سے فون پہ آنے کا وعدہ بھی کر چکے تھے۔ ڈر تھا تو صرف منزہ کی مخالفت یا خفگی کا لیکن خلاف توقع ایک بھی لفظ کہے بغیر "فوراً" جانے پہ تیار ہو گئی۔

"ماما! آپ۔۔۔ آپ پھوپھو کے ہاں۔۔۔"

دشمہ بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔۔۔ مگر پوچھ نہ پا رہی تھی۔

"ہاں میری جان۔۔۔ جانا تو پڑے گا۔۔۔"

منزہ نے بریزے کے نئے سوٹ کے ساتھ میچنگ گولڈ ٹاپس نکالتے ہوئے کہا۔

"حالانکہ میں کبھی بھی وہاں جانا پسند نہیں کرتی اور میں نے یہ بات کبھی بھی تم سے یا تمہارے پاپا سے چھپائی نہیں ہے۔ مجھے منافقت آتی ہے نہ چاپلوسی، اسی لیے تو نہ کبھی پسندیدہ بہو بن سکی نہ بھابی لیکن مجھے کوئی غم نہیں۔ منافقت اور چاپلوسی کے سہارے ملنے والی محبت اور توجہ سے میں ایسے ہی بھلی لیکن تمہاری خاطر تمہاری خاطر۔۔۔ صرف اور صرف اپنی بیٹی کے لیے میں یہ کرنے پہ بھی تیار ہوں۔"

دشمہ نے عقیدت سے اسے دیکھا۔

"اگر تھوڑی سی منافقت۔۔۔ تھوڑی سی خوشامد، تھوڑی سی ملاوٹ سے میری بیٹی کے من کی مراد پوری ہوتی ہے تو مجھے یہ کرنے میں کوئی عار نہیں۔"

دشمہ نے اس بار نظریں جھکا لیں۔

حیا کے بوجھ سے۔۔۔

اپنی ذات کی وجہ سے ملنے والی شرم ساری کے باعث۔۔۔

"ماما آپ۔۔۔ میں کیسے بتاؤں کہ آپ میرے لیے۔۔۔"

وہ اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے بہت مشکل سے کہہ رہی تھی۔ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ اس کی ایک کمزوری کی وجہ سے ماما خود کو اتنی مشکل میں ڈالیں۔ خود پہ غصہ بھی آ رہا تھا کہ ایسی بھی کیا بے قراری۔ جو پورے کا پورے چھلک گئی اور راز، راز نہ رہا۔ اسے اپنا آپ بے حد ہلکا لگ رہا تھا۔

اگرچہ منزہ نے اس سے کوئی باز پرس کی تھی نہ ہی روایتی ماؤں کی طرح ڈھکے چھپے الفاظ میں تنبیہہ کی تھی۔ اس کے باوجود خود کو کسی گہرے بوجھ تلے دبا ہوا پا رہی تھی۔ خوشی کا ہلکا سا احساس بھی وہ خود میں جگانے میں ناکام تھی کہ اسے وہ ملنے جا رہا ہے جس کے اس نے محض خواب دیکھے ہیں۔ منزہ کے اس معاملے میں ملوث ہونے کے باعث اسے اپنے خوابوں میں تعبیر کا رنگ تو بھرتا نظر آ رہا تھا لیکن اپنی ذات سے اعتماد اور مان کے رنگ اڑتے نظر آ رہے تھے۔

"ماما کچھ تو کہتیں، کوئی ڈانٹ، تھوڑی سی نصیحتیں۔۔۔ مگر۔۔۔" اس کا نادان دل یہ گتھی سلجھا نہ پا رہا تھا۔

"تم بالکل ٹینشن نہ لو۔۔۔" منزہ نے اس کے گال تھپکے۔ "تمہاری ساری فکریں اب میری ہیں۔۔۔"

انہوں نے دشمہ کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور تسلی دی۔

"بس تم صرف دعا کرنا کہ میں اپنی بیٹی سے کیا وعدہ نبھانے میں کامیاب رہوں۔"

"منزہ۔۔۔!" نوید کی آواز پہ دشمہ ہڑبڑا کے پیچھے ہٹی۔

"کتنی دیر اور ہے؟"

ہلکی سی دستک کے ساتھ آتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

سفید کلف لگی شلوار قمیص میں پوری طرح تیار تھے۔

"بس آدھا گھنٹہ۔۔۔"

منزہ نے مسکرا کے تسلی دی اور ٹاپس پہننے لگی۔

"اب اور آدھا گھنٹہ کس لیے چاہیے؟" وہ جز بز نظر آ رہے تھے۔ "تیار تو لگ رہی ہو۔"

انہوں نے تنقیدی نظروں سے منزہ کا جائزہ لیا۔ جو عمر کی پانچویں دہائی پہ دستک دیتی ہوئی بھی اپنی عمر کے لحاظ سے تر و تازہ نظر آ رہی تھی۔ خوش لباسی دن بدن نکھرتی جا رہی تھی۔ خوش ذوقی کا گراف خوشحالی کے گراف کے

ساتھ ہمیشہ ہی اوپر کی جانب بڑھتا ہے۔ سو ایسا ہی یہاں بھی ہو رہا تھا۔
بریزے کا بیش قیمت سوٹ موسم کی مناسبت سے بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ ایک کلائی میں دو کنگن ' دوسرے میں
ہیرے لگا نازک سا بریسلیٹ۔ گلے میں پچھلے سال عمرے سے واپسی پہ لایا موتی چین والا لاکٹ۔ ہیرے گی دو
انگوٹھیاں اور روبی سے مزین گولڈ کے بھاری ٹاپس۔ میک اپ کے نام پہ ہلکی سی لپ اسٹک اور پاؤڈر۔

"میری تیاری ہو گئی۔۔۔ آپ کی رہتی ہے۔"
"میری۔۔۔؟ مجھے کون سے ہار پھول پہنانے رہتے ہیں اب۔"
"ڈرائیور کو بھیجا ہے۔ موچی گیٹ۔۔۔ لال کھوہ والی برفی لانے۔۔۔ پروین کو پسند ہے ناں۔۔۔ مٹھائی تو لے کر جانا ہی
تھی۔۔۔ سوچا اس کی پسند کی لے جاؤں اور آپ تو جانتے ہیں اس وقت موچی گیٹ کے پاس ٹریفک کا کوئی حال ہوتا
ہے۔۔۔؟ پھنس کے رہ جاتے اس لیے اسے ویگن پہ جا کے لانے کو کہا ہے۔"
"حد کرتی ہو منزہ۔۔۔ اب پتا نہیں وہ کتنی دیر میں آئے گا۔ اور مٹھائی وہ لینے گیا ہے تو باہر ٹیبل پہ پیکٹوں میں کیا
رکھا ہے۔"
"تحفے۔ اس نے بیٹے کی باقاعدہ منگنی کی ہوتی تو قاعدے کے حساب سے میکے والے ہونے کے ناتے ہمیں
سب کی پہناؤنی کے جوڑے دینا ہوتے۔۔۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا تھا۔ ان لوگوں کا منگنی کی تقریب کرنے کا
کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ایک ہی بار شادی رکھی ہے سال کے آخر میں۔ منگنی نہ سہی ' رشتہ تو طے کیا ہے۔ ہم تو اپنی
طرف کی رسم نبھائیں گے ورنہ لوگ باتیں کریں گے کہ میکے والے اتنا بھی نہ کر سکے۔"
نوید کو بیوی کی باتوں سے تقویت بخش احساس ہوا۔
"وہ تو اچھی بات ہے۔۔۔ تم نے بھلا ہی سوچا لیکن پروین کے سسرال والے اچھے سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ ایسی
باتیں نہیں سوچتے۔"
"معاف کیجیے گا۔۔۔ میں پروین کے سسرال سے اتنا قریبی تعلق تو نہیں رکھتی کہ ان کے بارے میں اندازہ
لگا سکوں کہ کس مزاج کے ہیں لیکن جن سے میرا واسطہ پڑتا رہتا ہے یعنی آپ کے بہنوئی صاحب ' وہ سو فیصد اسی
مزاج کے ہیں اور ایسی باتیں صرف سوچتے ہی نہیں برملا کہہ بھی دیتے ہیں۔"
منزہ کے صاف جتا دینے پہ نوید مراد خفیف سا ہو گیا۔
"ہاں ' وہ بھائی صاحب کی عادت کچھ۔۔۔"

✡ ✡ ✡

"آج شام کو جلدی آ جانا۔۔۔"
ماں کی تاکید پہ اس نے بجھے بجھے انداز میں وجہ دریافت کی۔
"بھائی جان آ رہے ہیں۔۔۔ بیگم کے ساتھ۔ وشمہ بھی ساتھ ہو گی۔"
اس اطلاع پر وہ سلگ اٹھا۔
"یا وحشت۔۔۔ لوگ سنبھلنے بھی نہیں دیتے۔ پھر گلہ کرتے ہیں کہ ہوش کیوں گم ہیں۔ جب بھی
ہوئی صورت حال سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی موڑ پھر سے مجھے اس مقام پہ لا کے کھڑا کر دیتا
ہے۔"
"تمہاری منگنی کی مبارک دینے آ رہے ہیں۔"
"کیا ضرورت تھی اس کی۔" وہ جل کے بولا۔
"اللہ خیر کرے ' ضرورت کیوں نہیں تھی۔ کیسی فضول باتیں کرتے ہو۔" وہ بگڑ گئیں تو حسن ذرا سنبھلا۔
"میرا مطلب تھا فضول کی رسموں میں الجھا رکھا ہے آپ لوگوں نے خود کو۔ فون پہ مبارک باد دی تو تھی ماموں
اور ممانی نے۔"

"تو تمہارا مطلب ہے ' وہ یہاں نہ آیا کریں۔ فون پہ بات کر لینا کافی ہے؟"
ہر عورت کی طرح وہ بھی اپنے میکے پہ بات آتی دیکھ کے برہم ہو گئیں۔
"اوہو۔۔۔ امی۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف۔۔۔"
"دیکھو بیٹا! تم ان رسموں رواجوں کے کتنے بھی خلاف ہو مگر یہ بات ماننی پڑے گی تمہیں کہ ان سب کا کوئی نہ
مقصد ضرور ہے۔ جسے مل بیٹھنے کا بہانہ ہی سمجھ لو۔ اپنی اپنی مصروفیات میں مگن نہ مجھے مہینوں وقت ملتا ہے
جانے کا۔۔۔ نہ انہیں۔۔۔ جبکہ ان کو تو سال سال گزر جاتا ہے۔ یہ مبارک بادیں۔۔۔ یہ عیادت۔۔۔ یہ مزاج
پرسی۔۔۔ چھوٹے موٹے تہوار اور تقریبات جیسے عقیقہ۔۔۔ غسل صحت ' آمین۔۔۔ یہ سب تمہیں فضول کی رسمیں
لگتی ہوں گی مگر حقیقت یہ مل بیٹھنے کا بہانا ہوتی ہیں۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ مل بیٹھنے کا بہانہ ہی سہی میری منگنی۔۔۔" وہ چڑ کے بڑبڑایا۔
"اب میں کام کر لوں؟"
وہ فون بند کرنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔
"ضرور کرو۔۔۔ بلکہ ہو سکے تو کام جلد سمیٹ لو۔ گھر پہ مہمان آ رہے ہوں تو پہلے سے موجود رہ کر ان کا استقبال
اچھا لگتا ہے۔"
وہ وشمہ کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی گھبرا اٹھا۔
"امی۔۔۔! مجھے بہت کام ہے آج۔۔۔ میں تو پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ آپ کو فون کر کے بتا دوں۔ آج معمول سے دیر
سے آؤں گا۔"
"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ میں جلدی آنے کا کہہ رہی ہوں۔ تمہیں دیر سے آنے کی سوجھ رہی ہے۔"
"پلیز امی۔۔۔! میں کسی کی نوکری نہیں کرتا۔۔۔ کہ چھٹی کا وقت ہوتے ہی اٹھ کر آ جاؤں کہ مہینے کے مہینے تنخواہ تو
مل جانی ہے۔ یہ ہمارا اپنا کاروبار ہے۔۔۔ اپنا۔ اپنے کام کے لیے اپنی ترقی کے لیے اڑتالیس گھنٹے مسلسل بھی
کام کرنا پڑے تو کروں گا۔"
"کرتے رہنا مگر پھر کبھی۔۔۔ کوئی ڈیڑھ سال کے بعد میرا بھائی گھر آ رہا ہے اور باپ بیٹے دونوں کو خیال ہی نہیں
دونوں ہی گھر آنے سے انکاری ہیں۔ اب میں کیا کہوں گی بھائی جان سے۔ تمہارے ابو نے تو خیر ساری عمر
میکے کے سامنے شرمندہ کروایا ہے۔ جو رہی سہی کسر ہے وہ اب تم۔۔۔"
"اچھا امی۔۔۔ پلیز۔۔۔ پلیز چپ کریں۔۔۔ میں آ جاؤں گا۔" وہ گھبرا اٹھا۔
انداز بتا رہے تھے کہ پروین کسی بھی وقت رو دیں گی۔
"لیکن پہلے سے آ کر ان کو ویلکم نہیں کر سکتا۔ پلیز اپنی اس فرمائش پہ تھوڑا سا کمپرومائز کر لیں۔ ہاں جلدی
آنے کی کوشش ضرور کروں گا۔"
"صرف کوشش؟"
"پکا وعدہ۔۔۔" وہ ہار گیا۔
پروین نے قدرے مطمئن ہو کر فون رکھا اور ملازم کو سامان کی لسٹ تھمانے لگیں۔
"سب کچھ بازار سے ہی منگواؤ گی کیا؟"
ساس جہاں کب سے ان کا جوش و خروش اور تیاریاں دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔
"نہیں اماں جان! لیکن تھوڑا بہت تو بازار سے منگوانا ہی پڑے گا۔ بھائی جان کون سا روز روز آتے ہیں۔"
"ہاں تو ہے۔ عرصے بعد آ رہے ہیں تمہارے بھائی بھاوج۔"
وہ مسکرائیں۔
معمول کے برعکس ان کی پیشانی کبھی بھی بہوؤں کے میکے سے آنے والے مہمانوں کے ذکر پہ شکن آلود

نہیں ہوتی تھی۔ وہ ان کی خوشی میں خوش رہا کرتیں۔ یہی وجہ تھی کہ سب ان کی خوشی کو مقدم جانتے تھے اور دل سے جانتے تھے ورنہ زبردستی کرائی قدریں کتنی کھوکھلی ہوتی ہیں اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ ارد گرد بے شمار مثالیں بکھری ہیں۔

"آپ تو جانتی ہیں۔ سردیاں ہوتیں تو گھر میں ہر وقت بنا کے رکھے حلووں میں سے کچھ نہ کچھ پیش کر دیتے ہیں مہمانوں کو۔ بادام کا حلوہ... پیٹھے کا... دال کا... گاجر کا حلوہ لیکن حلووں کا موسم تو ہے نہیں اور حلوے کے علاوہ مجھے بس ایک کھیر بنانا آتی ہے میٹھے میں۔ کھیر بنانے کا وقت ہی کہاں ہے اس لیے قلفہ منگایا ہے اور سیخ کباب تازہ گرما گرم لگوانے بھیجوں گی حسان کو۔ مجھے تو وہی روزمرہ کے کھانے پکانے آتے ہیں۔ پلاؤ، کباب، کوفتے، قورمہ... بھائی جان کو مرغی کے بجائے بکرے کا گوشت بھاتا ہے اس لیے پلاؤ بھی گوشت کا بنایا ہے اور ساتھ کچے قیمے کے کباب، مرغی بس نمک اور کالی مرچ کے ساتھ ہرا مسالہ ڈال کے بھون لی ہے۔ آج کل کی بچیاں وہ چائنیز اور نوڈلز اور برگر وغیرہ شوق سے کھاتی ہیں۔ شاید وشمہ کو بھی پسند ہو اس لیے حسان سے کہا ہے کہ آتے ہوئے کسی چائنیز ریسٹورنٹ سے نوڈلز پیک کروا تا لائے۔"

"تو ظل ہما سے کہتیں وہ بنا دیتی تمہیں۔ پچھلی بار سراج کے کوئی ملنے والے قطر سے آئے تھے تو اس نے تم قسم کے کتنے ہی پکوان بنائے تھے۔ ہم تم تو نام سن کر ہی چکرا گئے تھے۔ اس بھلی نے کون سا انکار کرنا تھا۔"

"وہ تو انکار نہ کرتی لیکن اماں جان پہلے کی بات اور تھی اب کی اور... اب وہ میری ہونے والی بہو ہے۔ مجھے اس سے کوئی بھی کام کہتے جھجک سی آتی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ شادی سے پہلے ہی بے گار لینا شروع کر دی۔"

"بے گار کی کیا بات ہے؟ اور کون سے لوگ؟ کیا لوگ نہیں جانتے کہ اس کا اس گھر سے کیا رشتہ ہے؟ وہ اس گھر کی بیٹی پہلے ہے بہو تو ابھی بننا ہے اسے۔"

"اوروں کی کیا بات...." وہ دبے الفاظ میں گلہ کرنے لگیں۔

"میری بھابی ہی کم نہیں۔ اسے تو میری ذات میں، میری ہر بات میں خامی تلاشنے کا کوئی بہانا چاہیے۔ اسی لیے تو ہاتھ پیر پھولے جا رہے ہیں میرے کہ کسی قسم کی کوئی کسر نہ رہ جائے۔ ورنہ اسے شکایت کا موقع ملے گا اور وہ میاں کے سامنے جتا بھی دے گی کہ لو دیکھو، سالوں بعد آئے بہن کے ہاں اور یہاں یہ...."

بات ادھوری چھوڑ کے وہ تلخی سے ہنس دیں۔

"عجیب معاملہ ہے۔ عموماً تو نندیں ایسی صورت حال پیدا کیا کرتی ہیں میکے آ کر اور ہاتھ پیر بھاوجوں کے پھولا کرتے ہیں کہ بہن کے ماتھے پہ بل دیکھ کے میاں آگ بگولا نہ ہو جائے۔"

شوکت جہاں کی ہلکے پھلکے انداز میں کی گئی بات الماری کی دراز میں سے پیسے نکالتی پروین پہ پل بھر میں منوں بوجھ لاد گئی۔

ماضی کے دھندلکوں میں سے عکس پکارنے لگے....

"میں نے تو کہہ دیا نوید سے کہ میری پروین دو ہفتے بعد آئی اور تیری زنانی کا منہ متھا ہی نہیں سیدھا ہوتا سڑے بوتھے والی...."

"کیا ضرورت تھی اماں... رہنے...."

پروین کو بھی اچھا تو نہیں لگا تھا کہ اس کے آنے کے بعد منزہ نے سرسری سا سلام اور خیریت دریافت کرنے کے بعد اسے دوبارہ مخاطب تک نہ کیا تھا۔

"کیوں....؟ ضرورت کیوں نہیں ہے؟ پاگلے... تو کلی کلی (اکیلی) بہن ہے۔ بھائی کو مٹھی میں رکھے گی تو تیرا کلا مضبوط رہے گا۔ بھائی کو یقین دلاتی رہ کہ زنانی نہیں ماں اور بہن اس کی خیر خواہ ہیں۔"

"وقت خود بتا دیتا ہے اماں! کون کس کا خیر خواہ ہے۔ کیا ضرورت ہے بے کار کی کوششیں کرنے کی اور خیر خواہ میں ہوں۔ آپ ہوں یا پھر بھابی کیا فرق پڑتا ہے۔ اچھی بات تو یہ ہے کہ بھائی کے زیادہ سے زیادہ خیر خواہ ہوں۔

"یہی تو گل ہے۔ وہ کب سگی ہے اپنے خصم کی۔ پچھلے کا درد ہی نہیں نکلتا اس کے کلیجے سے... اس کا عشق کم ہو میرے نوید کی خیر خواہ بنے۔"

"سچی اماں....؟"

وہ کتنی بھی صاف نیت رکھنے کی کوشش کرتی... شمشاد کے زہر کے چھینٹے اسے آلودہ کر ہی دیتے تھے۔

"ہور نئیں؟ کتنی واری میں نے آپ دیکھا ہے اسے، راتوں کو ہوکے بھرتے... اور وہ جو چھپکلی ہے اس کی بیٹی، اس کی آنکھیں چوم چوم نہیں تھکتی۔ میں نے سنا ہے، وہ کوڑھ کرلی ہو بہو اپنے پیو کی شکل اور آنکھیں لے کر آئی ہے۔"

"اچھا...." وہ بدگمان سی ہو گئی اور کچھ کچھ متاسف بھی۔ کہ اس کا بھائی اپنی تمام تر نیک نیتی اور خلوص کے باوجود ایک عورت کی مکمل اور خالص توجہ اور محبت سے محروم تھا۔

"اسی لیے تو میں چاہتی تھی کہ وہ منحوس کم از کم اس گھر سے چلی جائے۔ وہ دفع ہو تو شاید اس بدذات کے دل سے پچھلے خصم کا عشق کم ہو اور میرے نوید کا بھاگ کھلے۔ نوید اتو پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے گھوم رہا ہے۔ میرے دل! اس نے الو کا گوشت کھالیا ہے۔ نہ شکل نہ عقل، نرا تعویذوں کا آسرا...."

"تعویذ گنڈے؟" وہ متحیر ہوئی۔ اور کچھ کچھ خوف زدہ بھی۔ اسے ان تعویذوں اور عملیات وغیرہ سے بڑا ڈر لگتا تھا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کچھ ہوش کر۔ بھائی کو نکال اس ڈائن کے چنگل سے.... میں کون سا طلاق کروانے کو کہہ رہی ہوں۔ خوف خدا ہے بڑا... بے چاری۔ اک تے بیوہ۔ دوجی طلاقن... اوپر سے یتیم.... میں نے کوئی ہائے نہیں لینی لیکن اتنا بھی اندھیر نہیں ہے کہ میں اسے من مانی کرنے دوں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ڈوریں کھینچتی رہتی ہوں۔ تو بھی جب آیا کر اپنا رعب ڈال کے رکھا کر۔ نوید سے چھوٹی ہے تو کی ہویا... ہے تو اکلوتی نان (نند) آتا ہے نوید اتو بتاتا اسے کہ نہ میٹھے میں کچھ بنایا نہ بچوں کو شام کو کوئی کباب چپس تل کے دیے اور سراج کو معدے کی تکلیف ہے پھر بھی بریانی میں مرچیں دبا کے ڈال دیں اور کباب بھی بڑے قیمے کے بنا دیے۔"

"لیکن اماں! انہوں نے تو کھانا کھایا ہی نہیں۔ کام تھا بہت ضروری... اس لیے جلدی۔"

"ہاں ہاں... تو کام نہ ہوتا تو رکتا ناں...."

شمشاد چڑ گئی۔

"پھر بھی... کھانا مرچوں والی بریانی اور بڑے گوشت کے کباب۔ تو کہہ دیتا نوید سے کہ سراج نے اس لیے کھانا نہیں کھایا اور خفا ہو کے اٹھ کے چلا گیا۔ نوید سے برداشت نہیں ہوگی یہ بات کہ اس کا بہنوئی اس کی بیوی کی وجہ سے ناراض ہو۔ وہ چنگی خبر لے گا اس میسنی کی۔"

"لیکن اماں...؟"

وہ متذبذب تھی۔ یہ سب اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ منزہ سے اس کے تعلقات قابل رشک نہ سہی۔ بھلے ہی ابتدا سے ایک نہ سمجھ میں آنے والی سردمہری اور گریز کا رشتہ تھا۔ اس کے باوجود ایسی سیاست وہ اس کے لیے کسی کے خلاف بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے ماں کی ہدایت پہ عمل نہیں کیا۔ یہ قابل ستائش بات تھی۔

لیکن قابل مذمت حرکت یہ تھی کہ اس سے مایوس ہونے کے بعد جب شمشاد نے یہی بات اس کے سامنے ہی نوید سے کہی تو وہ کھل کے تردید نہ کر سکی۔ نہ اکیلے میں بھائی کو لے جا کر معذرت کر سکی۔ صرف نظروں ہی نظروں میں ماں سے باز رہنے کی التجا کی جسے شمشاد نے لاپروائی سے مسترد کر دیا تو وہ سانس بھر کے دوسری جانب دھیان لگانے لگی اور اس نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہ کی کہ اس دن کے بعد جب جب وہ میکے آئی تو نوید مراد نے منزہ کو کس طرح زچ کیا اور اس کے ہر ہر عمل کو بے پناہ تنقید اور شک کے گھیرے میں لیا۔

"کیا سوچنے لگیں؟"
شوکت جہاں کی بات پر وہ چونکیں۔
"کچھ نہیں..... بس ویسے ہی۔"
وہ بوجھل دل کے ساتھ پیسے گننے لگیں۔

✡ ✡ ✡

"یہ لڑکی بالکل تم پہ گئی ہے۔"
اصغر نے جھنجلا کے کہا تو ریتا کی گردن تفاخر کے احساس کے ساتھ خم لے کر بلند ہو گئی۔
"تمہارے جیسی ضدی اور ہٹ دھرم....."
"یہ ضد اور ہٹ دھرمی نہیں، مستقل مزاجی اور لگن ہے۔ اپنے مقصد کو پانے کا جنون ہے۔"
اس نے نادیدہ گرد کو اپنی کیپری سے جھاڑتے ہوئے تنفر سے جواب دیا۔ ایک تو ویسے ہی اصغر اس کے سامنے کم مائیگی کے بوجھ تلے دبا نظر آتا تھا۔ اوپر سے وہ جان بوجھ کے اس سے باتیں بھی ایسی بھاری بھرکم کیا کرتی تھی جن سے وہ سٹپٹایا ہوا لگتا۔
"اچھا جنون ہے یعنی اب بھٹی صاحب کی پوتی ہارمونیم بجانا سیکھے گی۔" وہ تپا بیٹھا تھا۔
"کلاسیکل میوزک سیکھنا ہائی کلاس کا Latest ٹرینڈ ہے اصغر! تم نہیں سمجھو گے۔"
"میں صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ ہائی کلاس ہو چاہے پرائمری کلاس..... ہے تو یہ کنجروں میراثیوں کا کام اب ہمارے خاندان کی لڑکی ہارمونیم بجاتی، طبلہ بجاتی اچھی لگے گی۔"
"وہ کوئی پروفیشنلی یہ سب Own نہیں کر رہی اصغر! اپنے شوق کے لیے کر رہی ہے۔"
"ایسی کی تیسی اس کے شوق کی۔ مجھے ایسے سارے شوق ناک کے راستے باہر نکالنے آتے ہیں۔"
وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا اور ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا — اس قسم کے غیرت کے دورے وقتاً فوقتاً پڑتے رہتے تھے، پہلے جب ریتا نے ساڑھی کے بلاؤز کا سائز پہلے کی نسبت مختصر کر دیا۔ جب اس نے تنہائی کے علاوہ سر عام اسموکنگ شروع کی اور تب جب اس نے سوئمنگ کلاسز جوائن کی تھیں اور تب جب کئی سال پہلے اس نے دوستی کے نام پہ سوہا کے میتھس کے ٹیوٹر سے اچھی خاصی بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ وہ کلبلا کلبلا کے اپنی غیرت کے مظاہرے کر رہی دیا کرتا تھا اور بدلے میں ریتا سے خاطر خواہ تواضع بھی کروایا کرتا تھا۔
"رہنا تم سدا کے وہی اندرون لاہور کے باسی....."
ریتا نے چبا چبا کے انتہائی حقارت سے کہا۔
"میں باسی ہوں تو تم کون سی سولہویں سال چڑھی ہو، تین چار سال ہی چھوٹی ہو گی مجھ سے۔"
اس کی سمجھ میں نہ تو ریتا کی وہ انگریزی آتی تھی جس میں خود ریتا بھی طاق نہیں تھی مگر دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے چند سکہ بند جملے اور الفاظ ضرور رٹ رکھے تھے اس نے جن کو وہ اپنی گفتگو میں کچھ اس مہارت اور ذہانت سے ٹانکتی کہ سب اسے کانونٹ کا تعلیم یافتہ سمجھتے۔
اور نہ ہی اس کے پلے ریتا کی وہ اردو آتی تھی۔ جو اس نے رسالوں، ناولوں اور شعری مجموعوں سے سیکھی تھی ورنہ جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہاں زبان اس سے کہیں زیادہ کرخت، تلخ اور شرمناک تھی جس کا چلن اصغر کے ہاں تھا۔
"ویسے ہی کاکی بننے کا شوق چڑھا رہتا ہے۔ اب یہ کوئی تک ہے اس قمیص کے نیچے یہ تنگ موری کا پاجامہ پہنے کی۔ جو ہے بھی گٹوں (ٹخنوں) سے اونچا۔ آدھی پنڈلیاں نظر آ رہی ہیں۔"
"یہ کیپری ہے اسٹوپڈ....."
ریتا خت بدمزہ ہوئی۔

"جو بھی ہے، ہے تو شوخوں والا لباس اور قمیص کون سی ڈھنگ کی ہے۔ پہلے چھوٹی قمیصوں نے آخر ڈالی ہوئی تھی۔ اب لمبی سلانے لگی ہے تو چاک پہلوانوں کی طرح بغلوں تک ادھیڑ رکھے ہوتے ہیں، آدھا پیٹ اور کمر نظر آ رہی ہوتی ہے۔"
"اصغر..... تم میرے ڈریس میں کیڑے نکالنے کے بجائے وہ بات کرو جس کے لیے تڑپتے ہوئے آئے تھے میرے پاس۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"
"کہاں جانا ہے؟ بوتیکوں کو اجاڑنے؟"
ریتا نے گہری سانس لی اور بغور اس کا جائزہ لیا۔ ڈولتا جسم، کھلتی بند ہوتی مخمور آنکھیں، سوجے پپوٹے لڑکھڑاتی آواز، وہ بے تحاشا پیے ہوئے تھا اور اتنی بحث بھی تب ہی کرنے کی ہمت کرتا تھا جب اس حالت میں ہوتا تھا اور وہ جانتی تھی کہ جب تک مدہوش ہو کر گر نہیں جائے گا، ایسے ہی اپنا اور اس کا دماغ خالی کرتا رہے گا۔
"پارلر جا رہی ہوں اصغر..... راستہ دو مجھے۔"
"پارلر ہی جا رہی ہو ناں..... کون سے دفتر جا رہی ہو یا اسکول، جو ٹائم پہ نہ گئیں تو گیٹ بند ہو جائے گا۔ بیٹھو آرام سے۔ ضروری بات کرنی ہے تم سے۔"
"میں نے جس سیلون سے ٹائم لیا ہے، وہاں اپائنٹ منٹ لینے میں ہی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ سوری! میں یہ اپائنٹ منٹ مس نہیں کر سکتی اور وہ بھی تمہاری بے سروپا بکواس سننے کے لیے۔"
آخری فقرہ اس نے زیر لب دہرایا۔ نشے میں چور اصغر سے کوئی بعید نہیں کہ اس حالت میں ایسی اشتعال انگیز بات سننے کے بعد وہ کوئی ہنگامہ برپا کر دیتا۔
"پہلے اس بات کا فیصلہ کرو..... میں نے کہہ دیا ہے کہ سوہا کوئی استاد وغیرہ نہیں رکھے گی اس گھر میں۔ گانا بجانا سکھانے والا۔ شریفوں کا علاقہ ہے یہ بڑی عزت ہے میری۔ لوگ کیا کہیں گے جب یہاں سے طبلے کی، ہارمونیم کی اور ستار کی آوازیں آئیں گی۔"
"لوگ یہی کہیں گے کہ اصغر بھٹی کے گھر کوئی خوش ذوق انسان رہتا ہے۔ پتا نہیں کس دنیا میں رہتے ہو تم..... جسے تم شریفوں کا علاقہ کہہ رہے ہو۔ وہ شریفوں کا نہیں صرف پیسے والوں کا علاقہ ہے۔ وہ زمانہ گیا اصغر..... جب انسان کے درجے اس کے کردار کے لحاظ سے بانٹے جاتے تھے۔ شریف لوگ..... نیک لوگ..... بے ایمان لوگ..... بد دیانت لوگ..... اب صرف دو کیٹیگریز ہیں۔ امیر اور غریب۔ یہاں جتنے لوگ رہتے ہیں اپنے کریکٹر سرٹیفکیٹ کی وجہ سے نہیں، بینک بیلنس کی وجہ سے رہتے ہیں۔ ہماری لین میں دو مشہور ترین خواتین رہتی ہیں۔ ایک ملک کی نامور سنگر ہے۔ جس کے نام سے کنسرٹ کے مہنگے ترین ٹکٹس بھی کھڑے کھڑے بک جاتے ہیں اور وہ کسی بازار سے نہیں، شرفاء ہی کے خاندان سے ہے، کیا ہوا جو اس پیشے سے وابستہ ہونے کے بعد شہرت میں اضافہ کے لیے اس نے حرکتیں بازار والی ہی شروع کر دی ہیں۔ ظاہر ہے بارہ میٹر کی ساڑھی لپیٹ کر مائیک سے لپٹ کر گانا گانے والی سنگر کو کون پیسہ خرچ کر کے دیکھنے آئے گا۔ اسے تو کوئی مفت میں ٹی وی پہ دیکھنے کو تیار نہیں ہوتا۔ فوراً چینل بدل دیا جاتا ہے اور وہ دوسری محترمہ وہ ڈنکے کی چوٹ پہ خود کو بازار کی بتاتی ہے لیکن اب اس کا بازار ذرا نئے طریقے سے سجتا ہے وہ نہ کوٹھا سجاتی ہے نہ اپنے چار کنال کے بنگلے میں مجرے کی محفل سجاتی ہے۔ وہ تھیٹر پہ پیسے خرچ کر کے آنے والوں کو تفریح مہیا کرتی ہے، آرٹ اور فن کے نام پہ اگر ان کے گھروں سے ہر طرح کے آلات موسیقی کی آواز آ سکتی ہے تو اصغر بھٹی کے گھر سے کیوں نہیں۔"
"کیونکہ اصغر بھٹی کسی..... کی اولاد نہیں....."
اصغر کے منہ سے بھاری بھرکم گالی سن کر ریتا کے گال دہکنے لگے۔ اسے لگا جیسے اصغر کے منہ سے بدبودار بھبکوں کے ساتھ تیزاب کے چھینٹے اڑ کے اس تک آئے ہوں۔
"میں ہوں وہ اولاد؟"

وہ پوری طاقت سے چلائی اور اپنے کمرے میں ہینڈ فون چڑھا کے بیٹھی سوہا کو اس کے باوجود اس کی آواز آگئی۔ اس نے جلدی سے ایئر فون اتارا اور بیڈ سے اتر کے دروازے تک آئی۔ دو کتوں کے لڑنے کی آوازوں جیسی غرغراہٹ، خراہٹ اور بھنبھناہٹ باہر سے آرہی تھی۔ اصغر اور رینا کے روم سے۔۔۔۔

وہ ہینڈل پہ ہاتھ رکھ کے سوچنے لگی کہ باہر جائے یا نہ جائے۔

"ہاں، ہوں میں وہ اولاد۔۔۔ نہ کرتے مجھ سے شادی۔ نہ ناک رگڑتے میری ماں کے سامنے۔ کر لیتے اپنے خاندان کی کسی بانو، سلمیٰ یا رشیدہ سے شادی۔ درجن بھر بچے پیدا کرتے اپنے جیسے، نکمے، کم عقل، بد شکل اور بدزبان، کتے لوٹ رہے ہوتے تمہارے اس گھر میں، وہی نقشہ ہوتا جو تمہارے اعلیٰ نسب کے خاندان کے اکثر گھروں کا ہوتا ہے۔ قالینوں سے بدبو کے بھبکے اڑ رہے ہوتے۔ صوفوں پہ سالن اور پان کے داغ لگے ہوتے۔ پردوں سے جھول جھول کر بچوں نے حشر کر دیا ہوگا۔ فریج بچے ہوئے باسی کھانوں سے اٹا پڑا ہوتا اور تمہارے بیڈ پہ چربی کے ڈھیر کی صورت وہ عورت پڑی ہوتی جو اس فگر کے باوجود ہی پہنتی جو میں نے پہن رکھا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو تمہارے شریف خاندان کی عورتیں اب تک کلائیوں تک بند آستینوں والی، بند گلے کی قمیصیں پہنتی ہیں۔ وہ تمہارے کزن ارشاد کی شوگر کی ماری بیوی، کبھی اس کی قمیص کے آگے پیچھے سے پھٹے ہوئے گلے ملاحظہ کرنا اور وہ تمہاری پھوپھو کی آدھ درجن پوتیاں۔۔۔ کینرڈ کالج کی دیواروں تک میں جن کی شرافت کی تاب نہ لا کے دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ ہاں ہوں میں بازاری، تمہارے لیے اتنا کچھ کر کے بھی میں بازاری ہوں؟ تمہارا گھر بنا کے۔۔۔ تمہاری بھتیجی کو کلیجے سے لگا کر پالنے کے بعد، تمہاری پاگل بہن کو جھیلنے کے بعد، تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دینے کے بعد تمہیں اپر کلاس سوسائٹی میں ایک نمایاں حیثیت دینے کے بعد بھی میں بازاری ہوں۔"

نشے میں اصغر تھا۔ جبکہ آپے سے باہر وہ ہو رہی تھی۔ اصغر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور بولتے بولتے جب اس کا حلق خشک ہونے لگا اور دماغ ماؤف۔۔۔ تو وہ لہرا کے نیچے آگری اور سوہا نے ہینڈل پہ رکھے ہاتھ کو خفیف سی حرکت دی۔

✡ ✡ ✡

"بڑی پیاری بچی ہے وشمہ۔۔۔"

شوکت جہاں نے جھینپی جھینپی۔۔۔۔ شرمائی شرمائی سی وشمہ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

اس نے اپنی متلاشی نگاہیں فوراً" جھکا دیں۔ وہ جب بھی یہاں آتی اس کا رواں رواں وصی کی جانب ہی متوجہ ہوتا تھا لیکن پروین کو آج ہی اس کے انداز اور تیور کچھ بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ اس کا شرمانا۔۔۔ اس کی بوکھلاہٹ، اس کی ہڑبڑاہٹ، حواسیاں۔۔۔ اس کا بار بار راہداری کی جانب تکنا۔ بیٹھے بیٹھے مسکرا دینا۔ ان سب کو وہ اپنے مرضی کے معنی پہنا رہی تھیں اور انہیں ایک نامعلوم سی انجانی سی خفت بھی ہو رہی تھی۔ حالانکہ پھوپھی ہونے کے ناتے انہیں وشمہ سے بہت محبت تھی اور جس طرح وہ پیدا ہوتے ہی ماں کی گود سے محروم ہو گئی تھی۔ اس سے پروین تو کیا باقی متعلقین کی بھی اس کے لیے ہمدردی محبت میں ڈھل کے اور توانا ہو گئی تھی۔ وہ صرف اور صرف اپنی نظر سے دیکھتیں تو انہیں وصی اور وشمہ کا جوڑ بڑا بھلا لگتا۔ یہ خیال بھی خوش کن لگتا کہ وشمہ کو ان کے گھر آ کے پلتے ہوئے دیکھ کر اس کی ماں۔۔۔ شمشاد کی روح کو بھی سکون ملے گا کیونکہ ان کی مرتے دم تک یہ خواہش تھی کہ وہ پوتی کو سوتیلی ماں کے بجائے پھوپھی سے زیادہ قریب دیکھے۔ ماں کی خواہش نے پروین کے اندر بھی یہ کسک جگا دی تھی کہ ان کے اور وشمہ کے مابین روایتی پھوپھی اور بھتیجی والی انسیت اور لگاؤ نہیں ہے۔ اب تو انہیں خوش ہونا ہی چاہیے تھا مگر وہ چاہ کے بھی خوش نہیں ہو پا رہی تھیں۔ ان کی خوشی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔۔۔ منزہ۔

وہ جب جب وشمہ کے کھلے کھلے چہرے پہ محبت بھری نگاہ ڈالتیں برابر بیٹھی منزہ کے ہونٹوں پہ پھیلی استہزائیہ مسکراہٹ انہیں نظر جھکانے پہ مجبور کر دیتی۔ ایسا لگتا جیسے منزہ وشمہ کی کم عمری کی جذباتیت کی تشہیر کر کے انہیں شرمندہ کر رہی ہو۔ جو بھی تھا وشمہ کا اور ان ہی کا خون کا رشتہ تھا۔ اس کی کسی بھی کمزوری کا کسی دوسرے کے ہاتھ میں آجانا پروین کے لیے سبکی کا باعث تھا۔

انہیں یاد تھے منزہ کے وہ الفاظ۔۔۔۔

"میں وشمہ کی ضد کے آگے مجبور ہوں۔ ورنہ نادان تو میں تب بھی نہیں تھی جب عمر جذباتی پن پہ اکساتی ہے۔ پروین! تم جانتی ہو کہ مجھے دل مارنا آتا ہے۔ جب میں نے اپنی بیٹی کو خود سے دور جاتے دیکھ کر احتجاج کی آواز بلند نہیں کی۔ کوئی اسٹینڈ نہیں لیا تو صرف اتنی سی بات پہ شوہر اور سسرال کے سامنے کیا ڈٹتی کہ وشمہ کو تمہاری بہو بنانا میری دیرینہ خواہش ہے۔ میں کیا اور میری خواہش کیا۔ میں تو وشمہ۔۔۔ اس نے جھکایا ہے مجھے۔ ماں ہوں اس کی اور مائیں جھک ہی جایا کرتی ہیں اولاد کے ہاتھوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ کسی انتہا پہ نہ چلی جائے۔"

اور ایسا کہتے ہوئے اس کے الفاظ اور لہجے میں بے شک بہت عاجزی اور انکسار تھا۔ ٹوٹ کر بے بسی ٹپک رہی تھی لیکن پروین کو اس کی آنکھوں میں استہزاء کے رنگ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ نظریں جھکانے کے سوا کچھ نہ کر سکی تھیں۔

"بس بیٹیوں کے نصیب اچھے ہونے چاہیں۔"

منزہ پروین کی ساس کے سامنے بہت متانت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ویسے بھی پروین کی باتوں پہ وہ وقتی طور پر چاہے منزہ کے بارے میں بد دل ہو جاتیں مگر مجموعی طور پہ ان کی رائے بہو کی اس بھاوج کے بارے میں ٹھیک ٹھاک تھی۔ انہوں نے ہمیشہ اسے بڑی معقول گفتگو کرتے پایا تھا۔

"بیٹیاں اپنے نصیب لکھوا کے لاتی ہیں۔ کسی کا دیر سے، کسی کا سویرے۔۔۔ مگر نصیب کھلتا ضرور ہے۔ اب میری پوتیوں کا ہی دیکھ لو۔۔۔ ایک کے بعد ایک کے مقدر کھلتے گئے۔ ندا کا رشتہ تو چلو غیروں سے آیا۔ مگر پھر بھی اتنے اچھے قدر کرنے والے لوگ اور ہما تو خیر چچی کے پاس آرہی ہے۔ ویسے ہی دل کو سکون مل گیا۔ اب خیر سے ردا کے لیے بھی اپنے۔۔۔۔"

"میاں صاحب کو کہا بھی تھا کہ جلدی آجائیں۔ حسان کو کہتی ہوں کہ دوبارہ فون کرے۔"

پروین نے کبھی شوکت جہاں کی بات کاٹنے کی جرات نہیں کی تھی۔ آج مصلحتاً" انہوں نے یہ گستاخی کی تو وہ پل بھر کو چپ ہو گئیں۔ غور سے ان کا چہرہ دیکھا اور بھانپ گئیں کہ وہ قبل از وقت یہ اطلاع کسی کو دینا نہیں چاہتیں۔ اس لیے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

"میں تو کہتی ہوں بیٹی ہو یا بیٹا۔۔۔ بس اللہ سے اس کی دعا مانگنی چاہیے۔"

"لیکن خالہ جان۔۔۔ آپ کی پوتیوں کی بات اور ہے۔ ماشاء اللہ سے ان کے چچا، ماموں وغیرہ کو ان کا خیال ہے۔ کم از کم انہوں نے اپنے بھائی کا بوجھ ہلکا کرنے کا سوچا تو ورنہ اس نفسا نفسی کے دور میں کون کس کے بارے میں سوچتا ہے۔ اب تو رشتے ناتے بھی لوگ اپنے مفاد اور سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے طے کرتے ہیں۔"

پروین اپنی جگہ کٹ کے رہ گئیں۔

"اور نوید تو اکیلے ہیں۔۔۔ میرا میکہ ہے مگر بدقسمتی سے وہ وشمہ کا ننھیال نہیں ہے۔ میں نے خود سالوں کی ریاضت کے بعد اس کی ماں کا درجہ پایا ہے اور ابھی شاید کئی سال لگیں گے ان لوگوں کو وشمہ کو اپنے بنانے میں۔ بس یوں سمجھیں، مجھے تو خاندان کا بھی آسرا نہیں اور باہر بیٹی دیتے ہوئے سو سو دھڑکے ہوتے ہیں۔ خاص طور سے اتنے لاڈوں سے پالی بیٹی کے لیے۔"

"سو تو ہے۔۔۔" شوکت جہاں نے غائب دماغی کی کیفیت میں کہا۔ ان کا سارا دھیان منزہ کی اسی بات پہ رکا تھا۔

"نوید تو اکیلے ہیں۔"

"اکیلا کیوں۔۔۔؟ بھائی نہ سہی۔۔۔ بہن تو ہے۔ پھر منزہ نے ایسا کیوں کہا۔۔۔؟ کہیں وہ۔۔۔"

انہوں نے پر سوچ انداز میں اپنی چوڑیوں سے کھیلتی وشمہ کو دیکھا۔ ہزار بار کی دیکھی ہوئی ان کے سامنے پل کر اتنی بڑی ہونے والی وشمہ۔۔۔ ناک نقشہ تو لاکھوں میں ایک تھا ہی۔

کھلتی ہوئی چمپئی رنگ۔۔۔
کمر سے نیچے آتی گھنی چوٹی۔۔۔
نرم اب ولہجہ۔۔۔ شائستہ اطوار۔۔۔

"یہ خیال تو پروین کو۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ جن کے ساتھ دن رات کا ساتھ ہے۔ ان بچیوں کا دھیان بھی میں نے ہی اسے دلایا۔ تو وشمہ کا خیال کیسے آتا۔ یہ پروین بھی ناں جوان بیٹوں کی ماں ہے اور سمجھ بوجھ۔۔۔ کب تک رہوں گی میں اس کی انگلی پکڑنے کے لیے۔۔۔"

وہ مسکرا دیں۔

اور منزہ جو بڑی دیر سے ٹٹولتی نظریں ان پہ جمائے وشمہ میں ان کی دلچسپی کو محسوس کر رہی تھی۔ اس مسکراہٹ سے ایک حوصلہ سا پاتے ہوئے مطمئن ہو گئی۔

"شاید میں ان تک اپنی بات پہنچانے میں کامیاب رہی۔"

"ماما۔۔۔ جوس۔۔۔"

سوہا نے سہارا دے کر ریتا کی کمر تکیے سے ٹکائی اور جوس کا گلاس اس کے لبوں سے لگانا چاہا۔۔۔ جسے ریتا نے ہاتھ سے پرے کر دیا۔

"نہیں۔۔۔ پانی۔۔۔ بہت زیادہ ٹھنڈا۔۔۔"

سوہا نے بیڈ روم کے کارنر میں رکھے Chiller سے گلاس بھرا اور ریتا کے سامنے کیا۔ جسے اس نے ایک گھونٹ بھرنے کے بعد منہ بنا کے پیچھے کر دیا۔

"میں نے کہا ناں بہت زیادہ ٹھنڈا پانی۔۔۔"

نقاہت اس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔

بی۔ پی شوٹ کر جانے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ فوری ٹریٹ منٹ کی وجہ سے اس کی حالت سنبھل گئی۔ ورنہ ڈاکٹرز کے مطابق ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو نتیجہ ہارٹ اٹیک یا فالج کی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا۔

ساڑھے چھ گھنٹے تک ہاسپٹل میں رہنے کے بعد اسی کے ضد کرنے پہ اسے گھر لایا گیا اور اب مسکن انجکشن کی وجہ سے لی گئی ایک لمبی نیند کے بعد بھی وہ خود کو بے حد تھکا ہوا اور نڈھال محسوس کر رہی تھی۔

سوہا نے انٹر کام پہ ملازمہ کو آئس کیوبز لانے کی ہدایت دی۔

"کچھ کھائیں گی آپ۔۔۔؟"

"بہت گرمی لگ رہی ہے۔ آگ برس رہی ہے کمرے میں۔"

وہ وحشت کے عالم میں گاؤن کی دوڑیاں کھینچ کر ڈھیلی کر رہی تھی۔

"اے سی فل کولنگ دے رہا ہے مام۔! ایسا کریں' آپ شاور لے لیں فریش فیل کریں گی۔"

"شاور۔۔۔ لیکن آگ میرے باہر نہیں میرے اندر لگی ہے سوہا۔۔۔"

وہ آنسوؤں کے ساتھ رو رہی تھی۔

سوہا پریشان ہو اٹھی۔ ڈاکٹر نے سخت تاکید کی تھی کہ ریتا کو ٹینس ہونے سے بچانا ہے۔

"شعلے دہک رہے ہیں میرے اندر۔۔۔ ایسے لگتا ہے جیسے ابھی بھسم ہو جاؤں گی۔"

"آئس کریم کھائیں گی آپ؟"

"آئس کریم۔۔۔؟"

وہ زور سے ہنس پڑی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ ہنستے ہنستے اس کی پلکوں پہ آنسو ستاروں کی مانند چمکنے لگے۔

"ہاں۔ آئس کریم۔ اب میری ہی بیٹی مجھے آئس کریم دے کر بہلائے گی۔ کسی بچے کی طرح۔"

"ماما پلیز۔۔۔ ریلیکس۔۔۔ زیادہ ہائپر ہوں آپ کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

"میں نے آج تک کچھ بھی ایسا نہیں کیا سوہا! جو میرے لیے اچھا ہو۔ ہر وہ چیز جو میرے لیے اچھی ہے۔ سمجھو

میرے لیے بنی ہی نہیں۔"

"ماما۔۔۔" وہ اسے زبردستی لٹانے کی کوشش کرنے لگی مگر ریتا اس کے ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔

"تم بتاؤ۔۔۔ کیا ہے میں نے کچھ اچھا۔۔۔؟ یہ۔۔۔ یہ تمہارے چچا سے شادی۔۔۔؟ یہ کر کے میں نے کیا اچھا کیا؟ کیا یہ شخص میرے قابل تھا۔۔۔؟ کیا میں ایسی ساہوکار کو ڈیز رو کرتی تھی۔۔۔؟ بولو۔۔۔"

وہ ہذیانی کیفیت میں بول رہی تھی۔

سوہا نے لاجواب ہو کر سر جھکا لیا۔

یہ سوال تو ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک اس نے بھی کئی بار خود سے کیا تھا۔ بھلا کوئی جوڑ تھا مام اور چاچو کا؟

دیکھنے میں بھی بے ڈھب۔۔۔

اور مزاجاً "بھی شرقاً" "غرباً"۔۔۔

لیکن آج پہلی بار ریتا خود اس کے سامنے یہ تسلیم کر رہی تھی۔

"تو نہ کرتیں آپ ان سے شادی۔"

"ڈوبتا تنکے کا بھی سہارا نہ لے تو کیا کرے۔۔۔"

"جس طرح آپ اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہیں۔ پچھتاتی رہتی ہیں اس سے تو اچھا تھا آپ خود کو ڈوبنے دیتیں۔"

سوہا بھی تلخ ہو گئی۔ پچھلے نو گھنٹے اس نے ریتا کی خرابی طبیعت کی وجہ سے جلے پیر کی بلی کی طرح گزارے تھے اور وہ تھی کہ اپنی حالت مزید خراب کرنے کے درپے تھی۔ اس کی لاکھ تاکید کے باوجود ڈپریشن کے شکنجے میں خود کو دیتی چلی جا رہی تھی۔

"میں گھلتی ہوں۔۔۔ پگھلتی ہوں۔۔۔ مگر پچھتاوے کی آگ میں نہیں۔۔۔ مجھے غم ضرور ہے مگر ڈوبتے ہوئے اس تنکے کا سہارا لے لینے کا نہیں' اس تنکے کا قصور نہیں ہے سوہا! قصور اس کا ہے جو کنارے پہ کھڑا مجھے ڈوبتا دیکھ رہا تھا۔ مجھے گلہ اس سے ہے سوہا۔۔۔ اس سے۔۔۔"

وہ بے تحاشا روتی اس کی گود میں گر گئی اور سوہا کچھ سمجھتے ہوئے' کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"جی مامی جی! لیتا آؤں گا۔ مجھے نانو کی سب دوائیں یاد ہیں۔ آپ کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔"

وصی نے ڈرائیونگ کے دوران کہا۔ ساتھ والی سیٹ پر منزہ بیٹھی تھی' جبکہ وشمہ پیچھے بیٹھی چور نظروں سے بیک ویو مرر میں نظر آتی وصی کی جھلک کو تک رہی تھی۔

کھانے کے دوران ہی نوید مراد کو اس کے کسی دوست کا فون آ گیا تھا۔ کسی ایمرجنسی کی وجہ سے انہیں کھانے کے فوراً بعد جانا پڑا۔ منزہ اور وشمہ بھی ساتھ نکلنے کو تھیں کہ شوکت جہاں نے اصرار کیا۔

"اتنے عرصے بعد آئے اور غیروں کی طرح کھانا کھاتے ہی چلے گئے۔ ابھی تو نند بھاوج نے جی بھر کے باتیں بھی نہیں کیں۔"

ان کی اس بات پہ منزہ اور پروین ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئیں۔ ان کے درمیان بھلا کون سی باتیں تھیں کرنے کو۔

"اور وشمہ کے لیے اس کی پھوپھو نے خاص منگوا کے رکھا ہے اس کی پسند کا قلفہ۔۔۔"

"لیکن خالہ جان۔۔۔ نوید کینٹ جا رہے ہیں' وہاں سے نجانے کب فارغ ہوں۔ پھر یہاں تک آنا' یہاں سے دوبارہ گھر جانا۔۔۔ بہت لمبا چکر پڑے گا ورنہ رک ہی جاتے۔"

منزہ نے نیم رضامندی کے عالم میں توجیہہ بیان کی۔

"کوئی بات نہیں آنٹی! مجھے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد کسی کام سے وہاں جانے کے لیے نکلنا ہے۔ آپ میرے ساتھ

چلی چلیے گا۔"

وصی کی پیشکش پہ جہاں وشمہ کا چہرہ کھل گیا، وہیں پروین نے ایک گہری نظر وصی پہ ڈالی مگر وہاں کسی غیر معمولی پن کا ہلکا سا شائبہ بھی نہ تھا۔

"آنٹی۔۔۔! ایک بات پوچھوں۔۔۔ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟"

وصی نے تھوڑی ہی دیر بعد پوچھا تھا۔

"آپ کی۔۔۔ آپ کی ایک بیٹی بھی تو ہوا کرتی تھی۔"

اس نے تمہید باندھی لیکن اس کے "ہوا کرتی تھی" کہنے پہ منزہ کے دل پہ گھونسا سا لگا۔

اس کی مسکراہٹ پل بھر میں سمٹ گئی۔

"میری بیٹی میرے ساتھ ہی ہے۔"

اس کے ٹھنڈے لہجے میں کہنے پہ وصی ذرا سنبھلا۔

"سوری۔۔۔ شاید میں غلط کہہ گیا۔ میرا مطلب تھا ایک اور بیٹی۔۔۔ سوہا۔"

"تمہیں اس کا نام تک یاد ہے ابھی؟"

اسے وصی کی یادداشت پہ حیرت ہوئی۔

"میں صرف اس کے نام سے نہیں اور بھی بہت باتوں سے واقف ہوں۔۔۔ وہ۔۔۔ میری۔۔۔

دوست۔۔۔" کہتے کہتے اس کی زبان رک گئی۔ وہ جس ماحول کا پروردہ تھا۔ منزہ بھی اسی ماحول سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں گھرانوں میں اس قسم کی دوستی کو معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے یوں کہتے کہتے رک جانے پہ وشمہ نے معنی خیز انداز میں اسے دیکھا تھا۔

"تم ملے ہو اس سے؟"

منزہ کے لبوں سے سرسراہٹ کے انداز میں الفاظ نکلے۔

"جی۔۔۔ اکثر۔۔۔" دل میں کوئی چور نہ ہوتے ہوئے بھی وہ شرمندہ تھا۔ پھر خواہ مخواہ ہی وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

"دراصل وہ۔۔۔ ندا آپی کے کالج میں پڑھتی ہے۔ ایک بار ندا آپی کو ڈراپ کرنے گیا تو۔۔۔ ایکچوئیلی۔۔۔ میں اسے پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔ وہ اب بھی ویسی کی ویسی ہے جیسی بچپن میں تھی۔"

"ہاں۔۔۔ مگر دیکھنے میں۔۔۔"

ایک اداس سی۔۔۔ لٹی پٹی سی مسکراہٹ منزہ کے چہرے کو وحشت ناک بنانے لگی۔

"میرے بارے میں کچھ پوچھا کبھی اس نے؟"

بڑی آس سے پوچھے اس سوال کے جواب میں وصی سچ بتانے کی ہمت نہ کر سکا۔

"جی۔۔۔ اکثر۔۔۔" مختصر الفاظ میں اس نے تسلی دینا چاہی۔

مگر سوال۔۔۔ اور۔۔۔ جواب ان دونوں کے درمیان موجود معنی خیز توقف نے منزہ پہ اصلیت کھول دی تھی۔

اس کی وحشت ناک مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

اسی وقت پروین کا فون آ گیا۔ شوکت جہاں کی کچھ دواؤں کی یاددہانی کرنے کے سلسلے میں۔۔۔

"آنٹی! اگر آپ کو دیر نہیں ہو رہی تو میں اس میڈیکل اسٹور سے میڈیسنز لے لوں۔۔۔ واپسی پہ ہو سکتا ہے مجھے یاد نہ رہے۔ اصل میں میری یادداشت کچھ۔۔۔"

اس کی مسکراہٹ کو وشمہ نے اپنے اندر اترتے محسوس کیا۔ اس کا اندر جیسے چکاچوند ہو کر جگمگانے لگا۔

"کیوں نہیں۔۔۔ میں بھی ذرا سامنے والے اسٹور سے ہو کر آتی ہوں۔ چلو گی وشمہ۔۔۔؟"

اس نے اترتے اترتے پوچھا۔

وشمہ نے انکار میں گردن ہلائی۔

چھ سات منٹ میں ہی فارغ ہو کر آ گیا لیکن منزہ ابھی تک اسٹور سے نہیں نکلی تھی۔ وشمہ اپنے سیل فون پہ آن کیے F.M سن رہی تھی۔

"۔۔۔" وصی نے یک لفظی استفسار کیا۔

"ابھی نہیں آئیں۔"

پہلے میں دونوں کے درمیان یہ پہلی گفتگو تھی شاید۔۔۔

وصی کار کا دروازہ کھولتے کھولتے رہ گیا۔ اسے منزہ کی عدم موجودگی میں وشمہ کے ساتھ بیٹھنا معیوب لگ رہا تھا۔ کار کے ساتھ ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔

اس اثناء میں اس کے سیل فون پہ پروین کی پھر سے کال آ گئی۔

"یا خدا۔۔۔ امی! میری یادداشت کمزور ضرور ہے مگر قریب المرگ ابھی نہیں ہے۔ لے لی ہیں میں نے میڈیسنز۔۔۔ نہیں ابھی تو نہیں۔ فی الحال میرے ساتھ ہی ہیں۔ نہیں بھئی ٹریفک زیادہ نہیں ہے۔ بس میڈیسنز لینے میں کچھ ٹائم لگ گیا اور اب آنٹی بھی کافی ٹائم لگا رہی ہیں۔ پر اسٹور میں۔ نہیں میں تو یہیں ہوں پارکنگ میں۔ وشمہ بھی یہیں ہے۔۔۔ صرف آنٹی۔۔۔"

مگر اس کی بات پوری سننے سے پہلے ہی پروین لائن کاٹ چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"جو بھی تھا اس گھٹیا پن کی امید نہیں تھی بھابی سے۔ حد کر دی انہوں نے۔"

پروین کلستی ہوئی چکر کاٹ رہی تھیں۔

"وصی اور وشمہ اکیلے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔ بھابی نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں یہ موقع فراہم کیا ہے۔ اب یہ خبر نہیں کہ وصی بھی انوالو ہے اس سارے معاملے میں یا؟ نہیں۔۔۔ ایسی بات ہوتی تو وہ یہ نہ چھپاتا۔۔۔ صاف صاف بتا نہ دیتا منزہ بھابی کی غیر موجودگی کے بارے میں اور ہاں۔۔۔"

انہیں ایک بات اور یاد آئی۔

"اسے تو وہاں کے فون نمبر کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔ کتنا الجھ رہا تھا وہ اس دن کی بلینک کالز سے۔ نہیں یہ وشمہ کی یک طرفہ پسندیدگی ہے جسے بھابی جان بوجھ کر ہوا دے رہی ہیں، میری مجبوری بھانپ گئی ہیں ناں۔ ایک میرے اور وشمہ کے درمیان مزید دراڑیں پیدا کرنے کے لیے ایک طرف اس کے کم عمر جذبات بھڑکا رہی ہیں دوسری طرف مجھے دباؤ میں لے رہی ہیں۔ دونوں صورتوں میں تسکین ان کو ملے گی۔ اگر میں وصی کے معاملے میں وشمہ کا نام نہ لے سکی تو کتنے استحقاق سے وہ وشمہ پہ جتا سکیں گی کہ میں نے ہی ایسا نہ چاہا۔ خیر وہ سب الگ مگر یہ جو آگ اور تیل کا کھیل وہ کھیل رہی ہیں۔ اس سے سب سے زیادہ نقصان نوید بھائی جان کی عزت کو ہے۔ وشمہ میرے ہاتھوں کا پلا ہے۔ جانتی ہوں اسے۔ اس کے حوالے سے مجھے کوئی دھڑکا نہیں ہے لیکن اگر بھابی اپنی بیٹی کے وشمہ کے ساتھ یہ کچھ کر سکتی ہیں تو۔۔۔ تو۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ صرف ہم سب کی خام خیالی ہے کہ وہ رشتوں میں کھری ہوں نہ ہوں۔۔۔ وشمہ کے لیے ایک اچھی ماں ضرور ہیں۔ نہیں وشمہ اس عورت کے پاس بالکل بھی محفوظ نہیں ہے۔ وہ ماں بن کے پال رہی ہوتی اسے تو اس کی ڈھال بنتی۔ اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی، اچھا برا سمجھاتی نہ کہ اس طرح۔ نہیں۔۔۔ اب کچھ بھی ہو۔۔۔ مجھے وشمہ کو بچانا ہے اس سے۔ اب تک میں چپ تھی لیکن اب نہیں۔"

انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ وشمہ کو اپنے پاس لانے کا۔

❊ ❊ ❊

بے نام سکون دواؤں کے زیر اثر پھر سے گہری نیند سو رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پہ گہری نیند کی طمانیت کے بجائے ایسی تھکن تھی، جو کسی بہت پیارے، بہت اپنے کو دفنا کے آنے والے کے پاس ہوتی ہے۔ اس نے بھی

آج ایک بہت بڑا راز اپنے سینے سے نکال کر سوہا کے اندر دفن کیا تھا۔

اور سوہا کاؤچ پہ نیم دراز۔۔۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں نظر آتے ریتا کے زرد رو چہرے کی جانب دیکھتی ہوئی اس مدفن امانت کے بوجھ تلے نڈھال نڈھال سی لگتی تھی۔

"وہ مجھے وہ سب کچھ دے سکتا تھا جو میں چاہتی تھی لیکن اس نے مجھے دیا تو کبھی نہ بھرنے والا زخم۔۔۔ ایسی پستی جس سے کبھی ابھر نہ سکی۔ آج مرے تن پہ قیمتی کپڑا ہوتا ہے لیکن مجھے وہ وقت نہیں بھولتا سوہا! جب میں اس کی بیوی کی نظروں سے بچنے کے لیے پردے کو اپنے گرد لپیٹے ہوئے تھی۔۔۔ آج میں نایاب خوشبویات سے مہک بھی رہی ہوتی ہوں تو مجھے اس کی وہ کراہیت آمیز نظریں، وہ ذلت بھرا گریز نہیں بھولتا۔ جیسے میں کوئی گندگی کا ڈھیر تھی۔۔۔ جب تک میرا وجود اس کے لیے ایک سربستہ راز تھا، میں اس کی محبوبہ تھی اور جب اس نے میرا حرف حرف پڑھ لیا تو ایک داشتہ تک ماننے میں اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوتی تھی۔

میں گندی گلیوں کی پیداوار تھی۔۔۔ میں نے ایک جدی پشتی طوائف کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ مجھے بارہ سال کی عمر میں ہی سستے میک اور بھڑکیلی ساڑھی میں لپیٹ کر مجرا کرنے دھکیل دیا گیا تھا لیکن وہ۔۔۔ وہ تو شریف زادہ تھا۔۔۔ اس کی رگوں میں تو ستھرا خون دوڑ رہا تھا۔ پھر وہ ہی اپنے جذبے میں کھرا اور قول کا پکا نکل آتا۔ میں نالیوں کی گندگی۔۔۔ میں کم ذات۔۔۔ میں بدذات۔۔۔ میں نیچ۔ میں تو پھر بھی کم از کم ایک چیز میں تو اس سے اوپر ہی رہی۔۔۔ وہ تعلق توڑنے میں میں نہیں۔۔۔ وہ شریف زادہ قصوروار تھا۔ میں لاکھ گناہ گار سہی مگر قول توڑنے کا گناہ میں نے نہیں کیا تھا۔ اس نے وعدے توڑے، میرا دل توڑا، میرا مان توڑا، سب کچھ توڑ کے بھی وہ معتبر رہا اور میں۔۔۔ میں خالی ہاتھ رہ گئی۔ اس نے مجھے اندر باہر سے زہریلا کر دیا تھا۔ اسی زہر کی کاٹ ڈھونڈنے میں اصغر کے پاس چلی آئی۔ اصغر جس سے مجھے نہ محبت تھی، نہ نفرت۔۔۔ اس کے باوجود میں نے پوری وفا سے اس کے ساتھ اتنے سال گزار دیے۔ تم گواہ ہو سوہا۔ اس سے میرا مزاج ملے نہ ملے، دل ملے نہ ملے، لیکن میں نے اسے دھوکا نہیں دیا۔ صرف یہی ثابت کرنے کے لیے کہ ایک طوائف زادی بھی اچھی بیوی بن سکتی ہے لیکن میں ثابت کس پر کر رہی ہوں؟ کس پہ؟ کہاں ہے وہ۔۔۔؟ اسے آکر دیکھنا چاہیے۔۔۔ کہ میں۔۔۔ میں ایک عزت دار شخص کی بیوی ہوں۔ ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ میں اسے دکھانا چاہتی ہوں کہ میرے کتنے روپ ہیں۔ وہ دیکھتا تو سہی۔۔۔ مجھے دریافت تو کرتا۔۔۔ مگر اس نے۔۔۔"

کہتے کہتے وہ بے دم ہو گئی اور سوہا نے اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے اس سے آنکھوں ہی آنکھوں سے مزید کچھ نہ بولنے کی استدعا کی تھی۔

اور اب وہ ان ہی خاموش نظروں سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔۔۔ اس عورت کو۔۔۔ جس سے اس کا خون کا رشتہ کوئی نہیں تھا لیکن جس کی بانہیں ہمیشہ اس کے لیے کشادہ رہتی تھیں اور جس کا دل ہمیشہ اس کے لیے گداز رہتا تھا پھر کیسے ہو سکتا تھا کہ سوہا کا دل اس کے لیے گداز نہ ہوتا۔

"وہ دیکھتا تو سہی مجھے دریافت تو کرتا۔"

"کاش میں کہیں سے اس شخص کو ڈھونڈ کر لا سکتی اور دکھا سکتی ماما کے وہ روپ۔۔۔ جو اس بدقسمت نے دریافت نہیں کیے۔ کیے ہوتے تو آج اس چہرے پہ اتنا کرب نہ ہوتا۔۔۔"

اس نے دردمندی سے ریتا کے غافل چہرے کی جانب دیکھا۔۔۔ میک اپ سے ہر وقت چھپا رہنے والا چہرہ دھلا دھلا نظروں کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہونٹوں کی رنگت سیاہ و سفید کا امتزاج لگ رہی تھی۔ کنارے سیاہ اور بھرے بھرے خم سفید پڑے تھے۔ پلکیں گہری نیند میں بھی لرز رہی تھیں۔۔۔

"کیوں کرتے ہیں لوگ محبت۔۔۔؟ کیوں کرتے ہیں کسی پہ اتنا اعتبار۔۔۔؟"

اس ایک پل میں اس نے بھی اس انجانے شخص سے اتنی ہی شدید نفرت محسوس کی جتنی ریتا کے دل میں تھی۔

☆ ☆ ☆

میرے دل میں اپنے پاپا کے لیے جتنی عزت، جتنا پیار ہے، وہ میں کبھی ظاہر ہی نہیں کر پائی۔"

...یں کے کہتے پہ تطہیر نے حیرت سے اسے دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے خود ہی جواب دے دیا۔

...ما کی وجہ سے؟"

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔" وہ سر جھکا کے پھر سے لسٹ بنانے لگی۔

...پا کو ہمیشہ یہ عدم تحفظ رہا ہے کہ ہم ان سے زیادہ پاپا کے قریب نہ ہو جائیں۔ ان کے بجائے پاپا کو حق پہ نہ ...لگیں۔"

"اور تمہارے خیال میں کون حق پہ ہے؟" تطہیر نے ٹٹولا۔

"...نہیں۔۔۔ شاید اپنی اپنی جگہ دونوں ٹھیک ہوں یا پھر اپنی اپنی جگہ دونوں غلط۔"

"...سے کہتے ہیں سیاسی جواب۔"

تطہیر نے داد دی۔

"لیکن ایک بات ہے تطہیر۔ جسے تم بھی تسلیم کرو گی کہ ہر جھگڑے کے بعد ماما نے ہمیشہ ہم پہ یہ ثابت کرنا چاہا ...صحیح ہیں اور پاپا غلط۔۔۔ وہ مظلوم ہیں اور پاپا۔۔۔ لیکن پاپا نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے ہمارے ذہنوں میں ...کے خلاف کچھ بھرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"وہ ہمارے ساتھ وقت ہی کتنا گزارتے ہیں۔"

"لیکن پھر بھی۔۔۔"

"اچھا چھوڑو یار! یہ بے کار کی باتیں۔۔۔ کم از کم آپی کے سامنے اتنے بور قسم کے ٹاپک نہ چھیڑنا۔ ایک تو ویسے ...نا پہ قنوطیت چھائی رہتی ہے، اوپر سے گھر کا ماحول۔۔۔ ذرا نہیں لگتا کہ یہ شادی والا گھر ہے۔ اوروں کے ہاں ...سے ہفتہ ہفتہ پہلے ہی فنکشن شروع ہو جاتے ہیں۔ مہینہ مہینہ پہلے رونق لگ جاتی ہے۔"

"اور سال سال بھر پہلے مہمان آ کے ڈیرے جما لیتے ہیں۔ اس سے تو ہم ایسے ہی اچھے۔"

"لیکن یار! تھوڑا ہلا گلا تو ہونا چاہیے۔"

"تو تم بلاؤ نا اپنی دوستوں کو۔۔۔ میرا تو تمہیں پتا ہے کہ اس شہر میں آنے کے بعد کوئی دوست بنی ہی نہیں ...سوہا کے۔"

"بڑی چیز ہے وہ بھی۔۔۔ کبھی ملاؤ ناں اسے ماما سے۔" تطہیر نے شرارت سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"توبہ کرو۔۔۔" وہ فوراً "کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔

"ماما تو یہاں آنے کے بعد اور بھی وہمی ہو گئی ہیں۔۔۔ مجھے اپنی شامت نہیں لانی۔"

"تو ضرورت کیا تھی ایسی لڑکی سے دوستی کرنے کی۔"

"ایسی لڑکی سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مائنڈ نہ کرنا، دوست ہے تمہاری لیکن تمہیں بھی کچھ اندازہ تو ہو گا کہ میں نے یہ بات کیوں کہی۔"

"...کا امپریشن ایسا ضرور پڑتا ہے تطہیر۔۔۔ لیکن وہ ایسی ہے نہیں، بہت اچھی ہے دل کی۔"

"...تم سے بے حد مختلف ہے۔۔۔ بالکل الٹ۔ حیرت ہے تم دونوں کی دوستی ہوئی کیسے؟"

"...ہو گئی۔۔۔ ویسے بھی مخالف قوتیں ایک دوسرے کو کھینچتی ہیں۔"

"شاید اسی لیے ماما نے بھی آپی کے لیے ایسا ہی رشتہ ڈھونڈا ہے، جو ماحول، فیملی بیک گراؤنڈ، عادات ہر لحاظ سے ...سے یکسر مختلف ہیں۔"

...ما بات پہ وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

...خیال تو کب سے اسے بھی پریشان کر رہا تھا اور پھر اس نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔

"...لیکن یہ فرق ماما کو محسوس کیوں نہیں ہوتا۔ پاپا نے تو پہلے دبے الفاظ میں اور بعد میں کھل کے مخالفت ظاہر

کی تھی۔"
"نہیں کرنی چاہیے تھی؟"
"کیا مطلب؟"
"ان کی مخالفت نے ہی تو ماما کو اپنی ضد میں پکا کیا۔ یوں سمجھو کہ انہوں نے پاپا سے چڑ کے۔۔۔ یا ان کو نیچا دکھانے کی خاطر۔"
"نہیں تطہیر۔" اس نے فوراً ٹوک دیا۔ "اتنی بدگمانی اچھی نہیں۔"
"مجھے جو لگا۔۔۔ میں نے کہہ دیا۔"
اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔
"وہ ماں ہیں ہماری۔ پاپا سے ان کا ضد کا رشتہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے لیکن اس ضد اور انا کے کھیل میں اپنی بیٹیوں کو قربان نہیں کر سکتیں۔ رہا آپی کا معاملہ تو ظاہر ہے۔ ہمارا اتنا تجربہ کہاں، جتنا ماما کا ہے۔ نہ ہم اتنے دور اندیش ہیں نہ مردم شناس۔ ماما نے یہ فیصلہ کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کے کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے کوئی ایسی خوش آئند بھانپ لی ہو جس کے بارے میں ہم ابھی اندازہ لگانے کے قابل نہ ہوں۔"
"I hope so ۔۔۔"

☆ ☆ ☆

"بیٹھو پروین۔۔۔ تم سے ایک مشورہ کرنا تھا۔"
وہ آئیں تو اپنی بات کرنے تھیں مگر شوکت جہاں بھی ان سے کوئی مشورہ مانگنے تیار بیٹھی تھیں۔
وہ جو اپنے تئیں بڑے مناسب الفاظ اور موزوں توجیہات تلاش کر کے آئی تھیں، دل مسوس کے رہ گئیں۔
"جی۔۔۔ کہیے اماں جان۔"
"یہ جو منزہ ہے تمہاری بھابی۔"
پروین کا حلق تک کڑوا ہو گیا اس کے ذکر سے۔
"جی۔۔۔!"
ان کے انداز میں تلخی تھی جسے اپنی دھن میں بات کرتی شوکت جہاں نے محسوس نہ کیا۔
"ہے سمجھ دار عورت۔۔۔"

● ● ●

"کہاں گم ہو اتنے دنوں سے؟"
وصی کے سوال نے سوہا کو گم صم کر دیا۔
وہ سارے ان چاہے۔۔۔ ان سوچے جواب پھر سے لبوں تک آ کے بولنے پہ اکسانے لگے۔
"تم میں گم ہوں۔" لیکن پہلے کی طرح اب بھی اس نے ان جوابوں کو جھٹک کر پرے دھکیلا، جو اسے ہی اتنا حیران کر دیتے تھے تو وصی کا نجانے کیا حال ہوتا۔
"یونہی۔۔۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"
"خیریت؟۔۔۔ کیا ہوا؟" الفاظ عام سے۔۔۔ مگر اس کا لہجہ بے حد تشویش لیے ہوئے تھا۔ سوہا کو اس کا یہ اچھا لگا۔
"اتنی فکر ہے تو دیکھنے آ جاؤ۔"
اچانک بے ساختہ ہی اس کا جی وصی کو سامنے دیکھنے کے لیے مچلنے لگا۔۔۔ حالانکہ وہ جانتی تھی وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔
"کیا ہوا؟۔۔۔ تم تو کسی گہری سوچ میں چلے گئے۔۔۔ وہ کیا ہوتا ہے مقابلہ۔۔۔ نہیں ہاں۔۔۔ مراقبہ میں چلی گئی ہو؟"

[illegible] دوسری جانب گہری خاموشی تھی۔
"ہیلو۔۔۔ وصی۔۔۔! ہیلو۔"
[illegible] فون بند ہو چکا تھا۔
[illegible] نے ایک گہری سانس لی اور انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ گئی۔ تقریباً ساری رات ربنا کے کمرے میں اٹھتے بیٹھتے [illegible] تھی۔ اسے کسی اور کے کمرے۔۔۔ خصوصاً ربنا کے ہارڈ بیڈ پہ نیند نہیں آتی تھی۔ صبح جاگنے پہ جب ربنا [illegible] اور کل کے اثرات سے یکسر پاک دیکھا تو مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آئی۔ ابھی لیٹنے کا سوچا ہی تھا [illegible] کا فون آ گیا۔ لیکن اس دو منٹ کی کال نے اسے اور بھی بوجھل کر دیا۔
[illegible] کا فون بند کر دینا۔۔۔ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ نہ تو اسے صاف انکار کرنا چاہتا تھا۔۔۔ شاید اس کی دل آزاری [illegible] اور نہ وہاں آنا چاہتا تھا۔۔۔ غالباً "بلکہ یقیناً" اپنی دل آزاری کے ڈر سے۔
[illegible] قدموں سے چلتی ٹیرس کی جانب کھلتی ونڈو تک گئی۔۔۔ بھاری پردے ہٹانے پہ کمرہ دن کے اجالے سے [illegible] جانب دماغی سے وہ دیر تک نیچے لان میں جھانکتی رہی۔۔۔ ہارن کی آواز پہ وہ چونک کر گیٹ کی جانب دیکھنے [illegible] چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا اور وصی کی کار اندر داخل ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

[illegible] سمجھ دار عورت۔"
[illegible] جہاں کے کہنے پہ پروین نے کوفت محسوس کی۔
[illegible] جو کرنی تھی اگر بھی گئی اور برا بھی نہیں لگا بلکہ رہ رہ کے خیال آ رہا ہے کہ کاش یہ میں نے سوچا ہوتا۔"
[illegible] پروین چونکیں۔
[illegible] کل منزہ کی جانب سے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نجانے کب کس وقت کیا کہہ دے۔
[illegible] کے لیے اشاروں کنایوں میں کہہ رہی تھی ظاہر ہے لڑکی والے کھل کے تو کہہ نہیں سکتے۔۔۔ مجھے تو [illegible] کہ اسے یہ بات کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ تو میرا یا تمہارا فرض بنتا تھا کہ خیال کرتے۔ ہمارے [illegible] تھے، بچے جوان ہوتے تو باہر مارے مارے پھرنے کے بجائے خاندان میں ہی دیکھ بھال کے رشتے ناتے [illegible] ایسا وقت نہیں آتا تھا کہ لڑکی والوں کو خود منہ سے کہنا پڑے۔"
[illegible] کا مطلب ہے کہ۔۔۔" پروین نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔
[illegible] میں یہی سوچ رہی تھی کہ وشمہ دیکھی بھالی بچی ہے شکل بھی اچھی۔۔۔ عادتیں بھی اچھی۔ کیوں نہ [illegible] سوہن جائے۔"
[illegible] جس مرحلے کو مشکل سمجھ رہی تھیں وہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں [illegible] زبانی کی قائل ہو گئیں۔
[illegible] رخشندہ سے۔"
[illegible] سے؟"
[illegible] بھی تو ندا سے فارغ ہونے کے بعد سولانے کی فکر میں ہے نا کہ ہما کے جانے کے بعد گھر بالکل ہی [illegible] چاہے بیاہ کے اس کو پیچھے ہی آنا ہے لیکن پھر بھی اپنے گھر کی رونق تو جاتی ہی ہے بیٹی کے رخصت [illegible] پرائے ہونے کا احساس تو تب بھی اتنا ہی ہوتا ہے اس لیے کل ذکر کر رہی تھی۔ میں نے سوچا اس کا [illegible] جانب۔۔۔"
[illegible] آپ۔" پروین کا بس نہ چل رہا تھا کہ ان کی غلط فہمی پہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔
[illegible] بے بسی پہ چیخ چیخ کر روئیں۔
[illegible] اتنا آگے تک کا نہ سوچیں، ہو سکتا ہے بھابی نے اپنے میکے میں کسی کو پسند کر رکھا ہو۔"

"ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے ذکر کرتی۔"

"پھر بھی..... اماں جان۔! میں یہ مناسب نہیں سمجھتی۔" بہت ہمت کر کے انہوں نے کہہ ہی دیا..... جانتی تھیں اب بھی نہ بولی تو سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہ رہے گا۔

شوکت جہاں کو ان کی جانب سے اس کھلی مخالفت کی امید نہیں تھی۔

"وشمہ تمہارے بھائی کی بیٹی ہے پروین!"

"جانتی ہوں..... میں اس کا برا نہیں چاہتی۔ لیکن آپ میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش بھی کریں۔ میرے رخشندہ بھابی سے دو دو رشتے ہیں جٹھانی کا بھی سمدھن کا بھی..... دونوں رشتے بے حد نازک ہیں۔ اپنی ہی بھتیجی کو ان کی بہو بنانے کا مطلب ہے ایک طرح سے وٹہ سٹہ۔"

یہ جواز انہیں بڑا بروقت سوجھا تھا۔

وہ بھی متفق ہو گئیں۔

"ہاں..... یہ بھی ٹھیک ہے..... کل کلاں کو کوئی بات ہوئی تو اثر دونوں رشتوں پہ پڑے گا..... شادی کے بعد جو معمولی مسائل آسانی سے حل ہو جایا کرتے ہیں' وٹے سٹے کی صورت میں ان ہی مسائل کی وجہ سے گھر کے گھر برباد ہوتے دیکھے ہیں۔ پھر....."

انہوں نے پروین کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"پھر کیا کیا جا سکتا ہے' ورنہ میں نے تو سوچا تھا کہ اچھی لڑکی ہے۔ ہمارے گھر آ جائے گی تو....."

"آ بھی سکتی ہے۔" پروین نے آج سارا معاملہ صاف صاف کرنے کا تہیہ کر لیا' ویسے بھی بات کرنا مشکل نہیں ہوتا' بات کو شروع کرنا مشکل ہوتا ہے اور بات شروع شوکت جہاں نے کی تھی۔

"اگر آپ..... آپ وصی کے لیے رضامندی دے دیں تو....."

"وصی کے لیے؟" شوکت جہاں حیران ہوئیں۔

"ارے ہاں..... کیا بات کی ہے تم نے پروین!"

ان کے پہلے ردِ عمل پہ پروین کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا لیکن پھر خوشی کے بے ساختہ اظہار نے یہ سانس آسان کر دی۔

وہ کھل کے مسکرانے لگیں..... کئی دنوں کے بعد۔

"بس ٹھیک ہے..... یہ طے ہے کہ اب ہم جلد ہی تمہارے بھائی کے گھر جائیں گے..... وصی کے لیے وشمہ کا ہاتھ مانگنے۔"

"یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ میرے بھائی کے گھر کی عزت' عزت سے گھر کی ہو جائے گی اور میرا مان بھی رہ جائے گا۔"

پروین نے اسی وقت شکرانے کے نوافل کی نیت باندھ لی۔ منزہ کو فون کر کے جتانے کی خواہش کو انہوں نے بمشکل ٹالا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے یہ کہا تھا کہ طبیعت خراب ہے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے۔"

وصی کی ناراض ناراض سی شکل دیکھ کے وہ ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ایکچوئیلی..... میری ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں..... اسی وجہ سے چند دن تک سوائے ان کے کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔"

"یہ تم فون پہ صاف صاف بھی تو بتا سکتی تھیں۔ دوڑ لگوائی ہے میری آفس سے۔"

"دوڑ نہیں..... ریس..... پیدل نہیں تھے تم۔" اس نے تصحیح کی۔

ہی بات ہے..... میری نہ سہی..... میری ماما کی عیادت کر لو..... چلو آؤ تمہیں ملوا کے لاتی ہوں اپنی ماما سے۔" وصی کا ہاتھ کھینچتی اندر لے گئی۔

نے ریتا کے بارے میں سرسری سا سن رکھا تھا اور وہ سرسری ساذکر اتنا خوشگوار نہ تھا' جتنی خوشگوار حیرت اسے دیکھ کر ہوئی تھی۔

...ت کا اضمحلال چہرے سے واضح تھا لیکن سوگواری اور کسلمندی نے بھی شخصیت کے پرکشش اسرار پہ ...الا تھا۔ وہ لڑکی بہت مسحور کن حسن کی مالک نہ تھی لیکن اس کی خوش گفتاری' خوش لباسی اور خوش ذوقی جو ساتھ ساتھ نکھرتی ہی جا رہی تھی' سامنے والے پہ بڑا خوش کن اثر ڈالتی تھی۔

"سوہا بہت محبت کرتی ہے آپ سے اس کی دس باتوں میں سے نو' آپ کے بارے میں ہوتی ہیں۔"

"اور آخری ایک....." ریتا نے قہقہہ لگا کے پوچھا۔

سوہا نے اسے اس موڈ سے نکلتے دیکھ کر اطمینان محسوس کیا' جس میں وہ گزشتہ دو دنوں سے محصور تھی۔

"that's not fair ماما آپ بہانے بہانے سے میری سیکرٹس جاننا چاہ رہی تھیں۔"

اٹھتے ہوئے بولی' اسے جاتا دیکھ کر وصی نے کچھ بے چینی محسوس کی..... کسی لڑکی سے ہی دوستی کرنے کا یہ نتیجہ تھا اور پر سے یہ تجربہ..... کہ اس کی ماں کے سامنے بیٹھ کر اس کے سوالوں کے جواب دیے جائیں۔

...کا مشہور زمانہ اعتماد کسی کونے کھدرے میں جا چھپا تھا۔

"میں چینج کر کے آتی ہوں..... پھر چائے پیوں گی تمہارے ساتھ..... سستی سی ہو رہی ہے۔"

"بلکہ جاؤ..... کہیں گھوم پھر آؤ' وصی کے ساتھ دو دن سے میرے ساتھ بندھی ہوئی ہو۔ فریش ہو جاؤ گی۔"

"میں آفس جا رہا تھا..... سوہا کی..... میرا مطلب ہے آپ کی طبیعت کا پتا چلا تو دیکھنے آ گیا..... مجھے یہاں سے ...ں جانا ہے۔"

"اوہ!" ریتا کو وصی سے صاف جواب ملنے کی امید نہیں تھی۔

"ڈونٹ وری ماما۔! سوہا کو فریش ہونے کے لیے کسی دوسرے پہ depend نہیں کرنا پڑتا۔"

اس نے جاتے جاتے وصی کو چڑانے کے انداز میں کہا۔

"اور میری دعا ہے..... اسے واقعی کسی پہ depend نہ کرنا پڑے۔" ریتا نے اس کے نکلتے ہی سنجیدگی سے کہا۔

"نہ خوش رہنے کے لیے..... نہ زندہ رہنے کے لیے۔"

"لیکن وہ آپ پہ تو depend کرتی ہے۔"

"نہیں!..... وہ مجھ پہ depend نہیں کرتی..... صرف مجھ پہ ٹرسٹ کرتی ہے..... یہ اعتماد کرتی ہے کہ میں اس کے لیے جو سوچوں گی اچھا سوچوں گی جو کروں گی بہتر کروں گی..... لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ میرا اس کی زندگی میں ہونا ہی اس کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

"کیا مطلب..... میں سمجھا نہیں۔"

"تم صرف سوہا کے دوست نہیں ہو..... کسی نہ کسی تعلق سے اس کی ماں کے عزیز بھی ہو۔ اس کے باقی دوستوں اور کلاس فیلوز کے برعکس صرف تم ہو جو یہ جانتے ہو کہ میں اس کی اصل ماں نہیں ہوں اور یہ بھی کہ میں....."

کہتے کہتے رکی..... وصی نے دانستہ نظریں جھکا لیں۔

"مجھے اس سے محبت ہے اور رہے گی لیکن اب میں پوری دیانت داری سے یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میری محبت خود غرض تھی اور اپنی خود غرضی میں میں نے سوہا کی زندگی برباد کر دی۔"

"آپ نے اس کی زندگی برباد نہیں کی۔ سنواری ہے۔ اسے ایسے موڑ پہ جذباتی سہارا دیا' جب وہ اپنی شخصیت توڑنے والی تھی۔ اس مقام پہ' جہاں اس کا اعتبار ہر رشتے اور محبت سے اٹھنے والا تھا' آپ نے اسے اپنی محبت کا ...دیا۔"

"ہاں کیونکہ میری اپنی زندگی میں اس اعتماد اور محبت کی کمی تھی ۔۔۔ مجھے سوہا کی ضرورت تھی ۔۔۔ ورنہ میں ختم ہو جاتی ۔۔۔ فنا ہو جاتی۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے ایک معصوم بچی کی محبت کا سہارا لیا۔"

وہ نجانے کیسے پہلی ملاقات میں ہی یہ باتیں وصی سے کہہ گئی ۔۔۔ جو اس نے کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں کی تھیں ۔۔۔ شاید یہ گزشتہ دو روز سے طاری فرسٹریشن کا غبار تھا ۔۔۔ جس کا نکلنا ضروری تھا۔

"دو تنہا لوگ ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہی ہیں۔ اس میں احساسِ جرم والی کون سی بات ہے؟"

"ہے ۔۔۔ کیونکہ جب تک سوہا بچی تھی۔ اسے میری محبت سے اور میرے ساتھ سے فیض پہنچ رہا تھا لیکن اب مجھے لگتا ہے میری بیٹی کہلانے سے اس کے نصیب میں صرف خسارہ آئے گا ۔۔۔ کس کس کو بتاؤں کہ وہ میری بیٹی نہیں ۔۔۔ ایک بڑے ہی عزت دار گھرانے کی عورت نے جنم دیا ہے اسے ۔۔۔ لوگ تو اسے ربتا کی بیٹی سمجھتے ہیں۔ میرا اس کی ماں ہونا ۔۔۔ اس کا سب سے بڑا خسارہ ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

وصی کا دل انجانے بوجھ تلے آن دبا۔

پھر راستے بھر وہ سوہا کے بارے میں سوچتا آیا۔

"ابتدا کتنی ملتی جلتی ہے ہماری کہانی کی ۔۔۔ مگر انتہا؟"

"نہیں ہر کوئی اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا' جتنا میں ہر کسی کو وہ سب نہیں ملتا جو مجھے ملا ۔۔۔ نانو جیسی شفیق ہستی کا سایہ ۔۔۔ چاہنے والے ماموں۔ جنہوں نے بہن کے جانے کے بعد مجھے اپنے بہنوئی کے ذمے داری سمجھتے ہوئے ان کے سر زبردستی منڈھنے کے بجائے خلوصِ دل اور محبت سے اپنایا ۔۔۔ پروین ممانی جیسی وسیع قلب خاتون کی تربیت' جنہوں نے کبھی مجھ میں اور اپنے بیٹوں میں کوئی فرق روا نہ رکھا ۔۔۔ یہ گھر جس نے بازو پھیلا کے مجھے سمیٹا ۔۔۔ ایک ماں کا رشتہ واپس لیا خدا نے ۔۔۔ مگر بدلے میں کتنے رشتے لوٹائے اور سوہا ۔۔۔"

اپنی خوش قسمتی پہ شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ سوہا کے لیے اسے ملال بھی محسوس ہو رہا تھا۔

"کاش! اسے بھی یہ سب ملا ہوتا تو اس کی شخصیت کتنی مکمل ہوتی ۔۔۔ ایسا ہی گھر جیسا میرا ہے' ایسی ہی نانو جیسی میری ہیں' پروین مامی جیسی مامی ۔۔۔ نہ آپی محسن اور حسان جیسے بھائی بہنیں کاش یہ سب اسے ۔۔۔"

اچانک اس کے پاؤں بریک پہ جا لگے۔

کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔

اور ایسا ہی ایک جھٹکا اس کے ذہن کو بھی لگا' اس اچانک وارد ہونے والی سوچ سے۔

"یہ سب اس کا ہو سکتا ہے یہ گھر نانو مامی اور ۔۔۔ اور میں بھی ۔۔۔"

دل سے بوجھ پرے سرکتا ہوا محسوس ہوا' وہ مسکرایا اور کار ریورس کی۔

وہ ایک بار پھر سے سوہا کے گھر کی طرف جانے والی روڈ پہ گامزن تھا۔

وہ ایسا ہی تھا۔ فوری فیصلہ کرنے والا ۔۔۔ آر یا پار ۔۔۔

اور پھر اس فیصلے کو ایک پل کے لیے بھی دل میں نہ رکھنے والا۔

فوری فیصلہ ۔۔۔ فوری اظہار۔

○ ○ ○

"امی ۔۔۔ یہ وصی کی شادی کا کیا ذکر ہو رہا تھا؟"

ندا نے کالج سے آنے کے بعد شوکت جہاں' پروین اور رخشندہ کی گفتگو کا کچھ حصہ سنا تھا مگر تھکن سے برا حال تھا ۔۔۔ اور جانتی تھی ان تین کی ٹولی میں کسی کو گھس کر سن گن لینے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے سو کر اٹھنے کے بعد یاد آتے ہی سب سے پہلے یہ سوال کیا۔

دھلے ہوئے کپڑے تہہ کرتی ہما نے ہاتھ روک کے دیکھا ۔۔۔ پھر سر جھٹک کے دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوتی "ہاں ۔۔۔ سنا ہے پروین اپنی بھتیجی کے بارے میں سنجیدہ ہے۔"

"وہ ۔۔۔ وشمہ ۔۔۔ ویسے ہے تو پیاری اپنے وصی کے ساتھ اچھی لگے گی۔" ندا مسکرائی۔

ظل ہما نے ہاتھ میں رکھی قمیص بغیر تہہ کیے صوفے پہ پھینکی اور بے زاری سے بڑبڑانے لگی۔

"کیا مصیبت ہے۔ ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ کپڑے ختم ہی نہیں ہو رہے۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔"

وہ چڑچڑے پن سے کہتی اندر چلی گئی۔

"اسے کیا ہوا؟" ندا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہوتا ہے ۔۔۔ شادی کے دن نزدیک آئیں تو میکے سے بچھڑنے کا دکھ ۔۔۔ نئی جگہ ایڈجسٹ ہونے کا خوف ۔۔۔ یہ سب لڑکیوں کو ایسا ہی چڑچڑا کر دیتا ہے۔"

رخشندہ نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔ جسے ماننے سے ندا ایک دم انکاری تھی۔

"یوں ایسے ہی ۔۔۔ میری بھی تو تاریخ طے ہو گئی ہے۔ مجھے تو ایسے بے زاری کے دورے نہیں پڑتے۔"

"میں نے لڑکیوں کی بات کی ہے' تمہاری نہیں۔"

رخشندہ نے تپ کے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"اگر مجھے لڑکی نہیں سمجھتی ہیں تو رخصت کیوں کر رہی ہیں ۔۔۔ داماد کو رخصت کرا کے گھر لے آئیں نا!"

"توبہ ہے ندا! بچپنا اور نادانی نہیں جاتی تمہاری۔ کالج میں لیکچرار ہو اور باتیں اسکول گرلز والی۔"

"ویسے امی ۔۔۔! حسان اور وصی دونوں چھوٹے ہیں بھائی سے اور دونوں کی شادی کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ آخر آپ سستی کیوں کر رہی ہیں بہو ڈھونڈنے میں پروین چاچی کی طرح آپ بھی بھائی کی بیٹی لے آئیں نا!"

"رہنے دو تم ۔۔۔ عجیب بے تکے خیال آتے ہیں تمہیں۔"

"کیا برائی ہے امی؟"

"میری تین تین بیٹیوں کے لیے کسی بھائی نے سوچا۔"

"ضروری تو نہیں آپ بھی خود غرضی سے کام لیں۔"

"ہاں ضروری نہیں ۔۔۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ میں بلاوجہ عظمت کے مظاہرے کرتی پھروں ۔۔۔ میں غیر خاندان سے ہی کوئی بہو لاؤں گی۔ بس دو شرطیں ہیں' ایک تو لڑکی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ سلجھی ہوئی اور ذمے دار ہو' کیونکہ وہ اکلوتی بھابھی ہو گی تم سب کی اس گھر کی مکمل ذمے داری اٹھانے کی تمام تر صلاحیت ہونی چاہیے اس میں' تمہاری طرح پڑھ لکھ کے ڈبویا نہ ہو اس نے۔"

"لیں پھر میری کھنچائی۔"

"اور دوسری بات' خاندان اچھا ہو ۔۔۔ سسرال نام والا ہو' رعب دبدبہ والا تو بڑا فرق پڑتا ہے' اس کے برعکس لڑکی جتنی بھی اچھی ہو' اگر خاندان ذرا سا بھی ہوتا ہوا ہو تو ساری عمر چخ چخ میں گزر جاتی ہے۔ مرد بیوی میں ہلکی پھلکی کمی برداشت کر لیتا ہے کہ اس کا سدھارنا پھر بھی بس میں ہوتا ہے مگر سسرال کی کمی گویا ناک کٹنے کے مترادف ہوتی ہے۔"

"رہنے دیں امی ۔۔۔! یہ سب فرضی باتیں ہیں ۔۔۔ بس میاں بیوی کی آپس میں انڈر اسٹینڈنگ ہونی چاہیے۔"

"اپنے چچا کی مثال لے لو۔ کس بات کی کمی ہے تمہاری چچی کی ذات میں ہر لحاظ سے بے مثال عورت ہے بلکہ کئی معاملوں میں مجھ سے بہتر بہو اور بیوی ثابت ہوئی ہے۔"

رخشندہ نے پہلی بار کھل کے پروین کی اچھائی تسلیم کی۔ شاید اس لیے کہ ان کی دو دو بیٹیوں کا بوجھ ہلکا کرنے میں معاون ثابت ہوئی تھیں۔

"لیکن میں نے ہمیشہ سراج بھائی کو ان سے نالاں ہی دیکھا ہے۔ اور وجہ تنازعہ رہا ہے پروین کا میکہ۔ آج پروین کا بھائی ماشاء اللہ ایک کامیاب ٹھیکے دار ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے اس کے پاس اور پھر بیوی بھی پڑھی لکھی سمجھ دار ملی ہے جس نے گھر کا نقشہ بدل کے رکھ دیا ہے لیکن جب پروین کی شادی ہوئی تب بے چارہ اس کا بھائی کاروبار جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کم عمری میں گھرانے کی کفالت کا ذمہ کاندھوں پہ آ جانے کی وجہ سے وہ تعلیم بھی

مکمل نہ کر پایا۔ ویسے خاندانی لوگ تھے۔ پیچھے سے کھاتے پیتے زمین دار لوگ مگر تعلیم کے فقدان اور دیہاتی طور طریقوں کی وجہ سے عجیب سا لگتا تھا ان کے گھر کا ماحول۔۔۔ خاص طور پر پروین کی والدہ جن سے سراج کو خدا واسطے کا بیر تھا۔۔۔ ظاہر ہے مردوں نے باہر بھی ملنا جلنا رکھنا ہوتا ہے۔ آخر سسرال ایسا تو ہو کہ کسی کو فخر سے بتایا جا سکے۔

"مجھے تو آپ کی اس سوچ سے بالکل بھی اتفاق نہیں ہے۔۔۔ پلیز۔۔۔ مائنڈ مت کیجیے گا۔"

"مائنڈ کیا کرنا۔۔۔ تمہیں ویسے بھی میری کسی بات سے اتفاق ہوتا ہی کب ہے؟"

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا؟ کچھ بھول گئے کیا؟"

سوہا بھی اسی وقت گیٹ سے گاڑی باہر نکال رہی تھی۔ جب وصی اس جانب آتا نظر آیا۔۔۔ وہ گرین بیلٹ کے ساتھ گاڑی پارک کر کے اس کے پاس آئی۔

"ہاں۔۔۔ بھول گیا۔"

"Let me guess۔۔۔"

"موبائل۔"

"نہیں۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"keys؟"

"نہیں۔" نظریں سوہا کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ آج پہلی بار اسے اس نظر سے دیکھا تو وہ بہت بدلی بدلی۔۔۔ بہت الگ الگ سی محسوس ہو رہی تھی۔

نظریں کیا بدلیں۔۔۔ جیسے سب کچھ بدل گیا۔

سوچ کیا تبدیل ہوئی۔ زندگی کا منظر نامہ ہی تبدیل ہو گیا۔

"گلاسز بھول گئے ہو گے؟"

"نہیں۔۔۔ میں کچھ کہنا بھول گیا تھا۔"

"what" وہ ہلکا سا چلائی۔

"کہنا بھول گئے تھے؟ مگر کیا؟"

"ایک بہت ضروری بات۔۔۔ کہہ دوں؟"

"ہاں بولو۔" سوہا کو حقیقتاً" تشویش ہونے لگی اس کی سنجیدگی سے۔

"شادی کرو گی مجھ سے؟"

اس بار سوہا کچھ نہ کہہ سکی۔

حیرت کا اظہار تک نہ کر پائی۔

☆ ☆ ☆

"پروین اتنی اتاؤلی نہ بنو۔۔۔ ایسی باتیں فون پہ نہیں ہوتیں۔ تسلی سے جا کے کریں گے۔۔۔ طور طریقے سے۔"

شوکت جہاں کے ٹوکنے پہ وہ جز بز ہو کے رہ گئیں۔ اب انہیں کیا بتاتیں کہ یہ خبر منزہ تک پہنچا دینے کے بعد ہی سکون ملے گا انہیں بھی اور منزہ کو۔۔۔ وہ اس کے سامنے سرخرو ہونا چاہتی ہیں' یہ جتا کے کہ وہ اتنی بھی بے اختیار نہیں جتنا وہ سمجھتی ہے۔

"جائیں گے اماں جان ظاہر ہے۔۔۔ وہ تو جانا ہی ہے میں تو بس فون پہ صرف آنے کی اطلاع دینے کا سوچ رہی تھی۔۔۔ کل کا پروگرام رکھ لیں؟۔۔۔ بتا دوں منزہ کو؟"

"کل؟ وصی سے بات ہو جاتی تو۔۔۔!"

"آپ نے میاں صاحب سے بھی بات کر لی۔۔۔ انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وصی کو کیوں ہو گا۔"

"میں جانتی ہوں وصی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اگر اس کی نظر میں کوئی لڑکی ہوتی تو وہ ہمیں بے خبر نہ رکھتا' اب تک لیکن کم از کم اسے اطلاع تو دینی چاہیے۔ مشورہ تو لینا چاہیے۔ زمانہ بدل گیا ہے پروین! بچوں کو بھی اچھا لگتا ہے اگر انہیں اعتماد میں لے کر فیصلے کیے جائیں۔"

"زمانہ واقعی بدل گیا ہے اماں جان!"

وہ ریسیور ہاتھ میں لیے سوچنے لگیں۔

"اب بچے ہمیں اعتماد میں لے کر فیصلے کرنے کے بجائے خود فیصلہ کر لینے کے بعد اس اعتماد سے ہمیں کٹھ پتلی پاتے ہیں کہ ہم لازماً" ان کے اشاروں پہ ناچنے لگیں گے۔"

"اب کیا ہوا؟ کیا سوچنے لگیں؟"

"کچھ نہیں۔" انہوں نے ریسیور واپس کریڈل پہ رکھ دیا۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔ وصی سے پہلے بات کر لینا مناسب ہو گا۔"

"کیا کر ڈالا وصی نے؟" حسن نے اندر داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"اس جھلے نے کیا کرنا ہے۔۔۔ کرنے والے تو ہم ہیں۔۔۔ اس کا رشتہ۔"

"اوہ خدا۔! یہ آپ لوگوں کو ہو کیا گیا ہے۔۔۔ اوپر نیچے بس ایک ہی موضوع۔۔۔ سارا خاندان جیسے ایک ہی مہم پہ جت گیا ہے۔۔۔ قسم کھالی ہے آپ سب نے کیا؟ کہ اسی مہینے خاندان کے ہر لڑکے اور لڑکی کو ٹھکانے لگانا ہے۔ ایک وہی بچا تھا بس اب اسے بھی قابو کر لیا۔"

وہ شوز اتارتے ہوئے شگفتگی سے کہہ رہا تھا۔

"ایک وصی بچا تھا اور ایک وشمہ۔"

پروین کے مسکرانے ۔۔۔۔ اور وشمہ کے نام پہ وہ ٹھٹکا۔

"یہ وشمہ کا یہاں کیا ذکر؟"

اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"اسی سے تو کرنا چاہتے ہیں ہم وصی کی شادی۔"

موزے اتارتے ہوئے حسن کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے۔

"میں پروین کو مشورہ دے رہی تھی کہ اتنی جلد بازی سے کام مت لو۔۔۔ پہلے وصی سے اس کی رضامندی جان لو۔"

"بہت جلدی خیال آ گیا آپ کو یہ مشورہ دینے کا۔"

اس نے شکوہ کناں نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ہاں جلدی آ گیا ورنہ تو یہ فون کرنے ہی والی تھی۔ اتنی اتاؤلی ہو رہی ہے بھتیجی کو گھر لانے کے لیے۔"

"بھتیجی کو گھر لانے کا شوق بھی کچھ اچانک ہی ہوا ہے امی کو اس سے پہلے تو یہ خیال نہیں آیا۔"

طنز کے ساتھ ساتھ دبا دبا حسد بھی اس کے لہجے سے چھلک رہا تھا' جسے اپنی ہی خوشی میں مگن پروین اور شوکت جہاں نے محسوس نہ کیا۔

○ ○ ○

"وصی! تم۔۔۔!"

اس سے آگے سوہا کے الفاظ گم ہو گئے۔

گالوں پہ قطار در قطار بہتے آنسوؤں نے سامنے کا منظر دھندلا کر دیا۔

وصی نے ہاتھ بڑھا کے اپنی پوروں پہ اس کے آنسو چن لیے۔

"یقین نہیں آ رہا' یا دکھ ہو رہا ہے میرے اتنے عجیب و غریب طریقے سے بتانے پہ۔۔۔ کیا کروں یار۔۔! فرسٹ ٹائم ہے نا۔"

وہ آنسوؤں کے ساتھ کھلکھلا اٹھی۔

"جھوٹ۔۔۔ جھوٹ یہ جھوٹ۔"

"تمہیں لگتا ہے مذاق کر رہا ہوں میں؟"

اور اگرچہ سوہا نے اس کی آنکھوں میں سچائی کے سارے رنگ دیکھ لیے تھے لیکن صرف اس کی زبان سے ایک بار پھر یہ اقرار سننے کے لیے کہہ دیا۔

"ہاں۔"

"کیسے یقین دلاؤں تمہیں۔۔۔ تمہاری ماما سے بات کر کے؟"

"تم کیا بات کرو گے؟"

"آں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں تو نہیں۔۔۔ میرا مطلب تھا میری مامی!"

"مامی؟" اور جیسے اچانک سوہا کسی سہانے خواب سے جاگ گئی۔

بچپن کی وہ سب یادیں تازہ ہو کر سامنے آ گئیں جن کو اس نے بہت کوشش کے بعد بھلایا تھا۔

شمشاد بیگم کی کریہہ آواز اور دل چھلنی کرنے والے طعنے جو اس کے معصوم دل نے سہے تھے۔

نوید مراد کی بے گانگی۔۔۔ جسے سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔

پروین کی خاموش مگر ناگوار چبھتی نظریں۔۔۔ جن کا مفہوم اس کا کم عمر ذہن تلاش نہیں کر سکتا تھا۔

"وہ تمہیں آئیں گی وصی!"

وصی کے اظہار نے اسے ساتویں آسمان پہ ضرور لا بٹھایا تھا لیکن پروین کا خیال اسے ایک بار پھر نیچے لے آیا۔

"میں جانتی ہوں وہ عورت مر جائے گی لیکن مجھے۔"

بے حد تاؤ کے ساتھ کہتے کہتے اسی نے وصی کی جانب نگاہ کی اور اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویے دیکھ کر جلدی سے بات بدلی۔

"نہیں وصی! بہت مشکل ہے تمہاری مامی میری کچھ نہیں لگتیں مجھ سے ذاتی تنازعہ کوئی نہیں ہے ان کا لیکن وہ میری ماما You know very well پھر کیسے تم کوئی امید دلا سکتے ہو مجھے۔"

"مجھے امید دلانی ہی نہیں ہے۔۔۔ مجھے یقین دلانا ہے۔" وصی نے اس کا ہاتھ دبا کے کہا۔

☼ ☼ ☼

"حد ہو گئی۔۔۔ کیا میں انسان نہیں تھا؟ ایک جیتا جاگتا انسان۔۔۔ کیا میری کوئی مرضی۔۔۔ کوئی رائے نہیں تھی؟"

حسن اپنے کمرے میں لیٹا کڑھ رہا تھا۔

لائٹس آف تھیں۔۔۔ دروازہ بند۔۔۔ اور لاؤنج سے آتی شوکت جہاں اور پروین کی گفتگو کی ہلکی ہلکی آوازیں اس کا اور بھی پارہ ہائی کر رہی تھیں۔

"وصی کو رائے دینے کا حق ہے۔ مجھے نہیں؟ اس سے اس کی مرضی جاننا امی پہ فرض ہے 'میری مرضی جاننا ضروری نہیں اور۔۔۔ اور آخر اس کے لیے ہی کیوں سب کو وشمہ کا خیال آیا۔۔۔ کیا آج سے پہلے امی کے دل میں بھتیجی کی محبت نہیں جاگ سکتی تھی؟ آخر وصی ہی کیوں؟ اور کیا وشمہ کو میں دن رات اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہی گھر میں دیکھ سکوں گا؟ میں نے یہ تمنا تو کی تھی۔۔۔ مگر اس طرح نہیں کہ وہ میرے سامنے ہو اور کسی دوسرے کے ساتھ ہو۔ نہیں اس رشتے سے وصی کے حوالے سے اسے ایک ہی چھت کے نیچے برداشت کرنا بہت مشکل ہو گا' میرے لیے۔"

وہ خوف زدہ تھا کہ اگر پروین کی یہ خواہش پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی تو اس کا ردِعمل کیا ہو گا؟ اب تک وہ ہمارے بندھے اپنے تعلق پہ ناپسندیدگی بڑی کامیابی سے چھپاتا آیا ہے 'کیا وشمہ سے اپنی پسندیدگی بھی اس کامیابی سے چھپا پائے گا۔

باہر سے مدھم مدھم آتی آوازیں اچانک تیز ہوئیں اور ان میں تندی ترشی کا تاثر جھلکنے لگا تو وہ چونک گیا۔ دھیان دینے پہ وصی کی آواز صاف سنائی دی۔

"وجہ کیا صرف یہی ہو سکتی ہے کہ وشمہ میں کوئی کمی ہے؟" اس نے بے حد جھنجھلا کر پروین کے کسی سوال کا جواب دیا تھا۔

حسن اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"کیا یہ وجہ کافی نہیں کہ۔۔۔ کہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔"

اس کے جواب نے جہاں پروین اور شوکت جہاں کو گنگ کر کے رکھ دیا۔۔۔ وہیں حسن کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔

"نہیں کولیگ نہیں ہے وہ تو ابھی پڑھتی ہے اسٹوڈنٹ ہے اور ندا آپی کے کالج میں ہوتی ہے۔"

"اچھا تو ندا کے کالج کے پھیرے اسی لیے لگا کرتے تھے۔" شوکت جہاں نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔۔۔ وصی ان کا لاڈلا چہیتا نواسا تھا۔ اس کی مرضی اور خوشی جاننے کے بعد جیسے وہ پل بھر میں فراموش کر گئی تھیں کہ کچھ دیر پہلے پروین کے ساتھ کیا باتیں کی جا رہی تھیں۔۔۔ لیکن پروین۔۔۔

وہ تو سن ہو کر بیٹھی تھیں۔

طمانیت کے احساس نے بس چند لمحوں کے لیے انہیں آغوش میں لیا تھا۔ اور اب وہ پھر اسی کشمکش میں گرفتار تھیں جس کشمکش نے اسے گزشتہ کئی روز سے حصار میں لیا ہوا تھا۔

پہلے اس کشمکش کے ساتھ ایک امید بھی تھی۔

یہ امید کہ کبھی نہ کبھی وہ یہ مسئلہ حل کر ہی لے گی۔

اور اس بار تو آس نے بھی ہاتھ چھڑا کے راستہ بدل لیا تھا۔ اب صرف مایوسی ہمراہ تھی۔۔۔ اور یہ مایوسی کمبخت جس سفر میں ہم سفر بن جائے وہ سفر صدیوں پہ محیط ہو جاتا ہے۔

"ایسی بات نہیں ہے نانو! اور ویسے بھی میں اسے پہلے سے جانتا ہوں میرا مطلب ہے بچپن سے آپ سب بھی واقف ہیں اس سے اور خاص طور پر مامی!"

پروین نے سوالیہ نظروں سے وصی کو دیکھا۔

وہ بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔۔۔ ابھی ابھی سوہا سے دل کی بات کہہ کے آ رہا تھا۔۔۔ ابھی ابھی اس سے ایک نئے رشتے اور نئے احساس سے بندھا تھا اور ابھی ابھی اس رشتے کو سب کو سامنے define بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ مقام اتنی جلدی آ جائے گا۔۔۔ بغیر سنبھلنے یا کچھ سوچنے کا موقع دیے بغیر۔

"وہ۔۔۔ وہ سوہا ہے۔"

اس کے بتا دینے پہ بھی سامنے کھڑی شوکت جہاں اور پروین دونوں ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہیں۔۔۔ شوکت جہاں اس لیے کیونکہ ان کی یادداشت میں سوہا نام محفوظ نہیں تھا اور پروین اس لیے کیونکہ یہ نام سننے کے بعد بھی انہیں یقین نہیں آ رہا تھا یا شاید وہ یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"حسن! تم بلاوجہ اس کی حمایت کر رہے ہو۔ تمہارے ابا کو پتہ چلا تو وہ میری ہی درگت بنائیں گے جیسے سارا قصور میرا ہو۔ میں نے ہی اسے اس آفت لڑکی سے ملوایا ہو۔ حالانکہ میری غلطی اگر تم اسے واقعی غلطی سمجھتے ہو' صرف اتنی ہے کہ اس کی ماں میرے بھائی کی بیوی ہے۔"

"امی! آپ بے کار میں پریشان ہو رہی ہیں۔۔۔ آپ اسے نہ جانتی ہیں نہ اس سے ملی ہیں پھر مخالفت کس لیے؟"

حسن وصی کی حمایت میں مضبوطی سے کھڑا تھا۔

"اچھی طرح جانتی ہوں اس نے بچپن میں کم فساد بپا نہیں کیے تھے۔ اب کون سا سدھر گئی ہو گی۔"

”حد ہو گئی امی۔۔۔! آپ ایک بچی کی حیثیت سے اسے پرکھ رہی ہیں۔ تب کی باتیں یاد کر رہی ہیں۔ جب وہ ایک تو کم عمر تھی‘ دوسرا عجیب و غریب حالات سے گزر رہی تھی۔ وصی کوئی ناسمجھ نہیں ہے۔ اگر اس نے سوہا کو پسند کیا ہے تو ضرور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ہو گی۔“

”اور وشمہ۔۔۔؟“

پروین کے سوال پہ حسن چپ کر گیا اور اس کی یہ چپ دانستہ تھی۔

وہ نہیں چاہتا تھا اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ اصل میں وہ وصی اور سوہا کے حق کے لیے نہیں‘ وصی اور وشمہ کی مخالفت میں کھڑا ہے۔

”آپ نے کون سا ابھی بات کی ہے وہاں۔۔۔ یہ محض آپ کی ذاتی خواہش تھی۔۔۔ وصی کی خواہش اور مرضی زیادہ اہم ہے۔“

”تم نہیں سمجھ رہے حسن! اس سے بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ مجھے اعتراض صرف اس پہ نہیں کہ وہ منزہ بھابی کے پہلے شوہر کی بیٹی ہے۔ اعتراض والی اصل بات یہ ہے کہ اس نے منزہ بھابی کی نہیں اپنی بدقماش چچی کے یہاں تربیت پائی ہے۔“

حسن جزبز ہو کے رہ گیا۔

اس معاملے میں وہ کوئی دلیل نہ دے پا رہا تھا انہیں قائل کرنے کے لیے۔

”اور یہ اعتراض صرف مجھے نہیں بلکہ سب کو ہو گا اماں جان اور میاں صاحب کو بھی۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن ہے تو وہ شریف ماں باپ کی اولاد۔“

”ہاں ان شریف ماں باپ کی اولاد۔۔۔ جن کی پرورش اس کے نصیبوں میں نہیں تھی اور پرورش کا بڑا اثر ہوتا ہے بیٹا!“

”تو اس میں قصور کس کا ہے مامی؟“

وصی نے حسن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس دوران بالکل بھی دخل نہیں دے گا۔ لیکن اس وقت اس سے رہا نہیں گیا۔

”باپ کو تو موت نے چھین لیا اسے تو اللہ کی مرضی قرار دے کر صبر کیا جا سکتا ہے لیکن ماں کی تربیت سے محروم کرنے والے تو آپ لوگ ہی تھے۔“

پروین ششدر رہ گئیں۔

بات سچ تھی۔۔۔ مگر اپنے ہی کسی چھوٹے کے منہ سے یہ سچ سننا بڑا تکلیف دہ امر تھا۔

”اس لڑکی نے تمہیں اتنا بدلحاظ کر دیا کہ اب تم میرے سامنے کھڑے ہو کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے الزام دے رہے ہو۔۔۔ نجانے اور کتنا زہر بھرا ہو گا اس نے۔“

”وہ ایسی نہیں ہے مامی۔۔۔! آپ اس سے ایک بار مل کے تو دیکھیں۔“

وہ منت سماجت پہ اتر آیا۔

شوکت جہاں بھی نیم رضامند لگ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے وشمہ کے لیے سب سے پہلے خواہش میں نے ظاہر کی تھی۔ لیکن جب وصی ہی راضی نہیں ہے تو۔۔۔ آخر زندگی تو اس نے گزارنی ہے۔ رہا وشمہ کا سوال تو اس کے لیے میں تم سے معذرت کرتی ہوں کہ نہ میں یہ بات کرتی نہ تمہارے دل میں ارمان جاگتے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں اماں جان۔۔۔ معذرت کیسی بات اب صرف وشمہ کی نہیں ہے۔ سوال سوہا کا ہے۔ وہ کسی بھی طرح ہمارے گھرانے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ میں اس کے چچا اور چچی دونوں کے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔“

شوکت جہاں بھی شش و پنج میں پڑ گئیں۔

ایک جانب پروین اتنے وثوق سے یہ بات کر رہی تھیں۔

دوسری جانب وصی بضد تھا اور سوہا کی شان میں رطب اللسان بھی۔

”ایک بار وصی کے کہنے پہ ہمیں اس سے ملنا ضرور چاہیے۔“

پروین بے بسی سے انہیں دیکھ کے رہ گئیں۔

وصی کے ساتھ شوکت جہاں تھیں۔۔۔ حسن تھا۔۔۔ ندا تھی‘ رخشندہ کی دبی دبی صلاح بھی یہ تھی کہ لڑکی کو جانچے پرکھے بغیر کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہو گا۔

دوسری جانب وہ تنہا تھیں اور کمزور پڑ رہی تھیں۔

ندا کو بہت زور دینے پہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کے کالج کی وہ کون سے سوہا نام کی اسٹوڈنٹ ہے جس پہ وصی کا دل آیا ہے۔

ہما نے بھی کل سے گھر میں گردش کرتی یہ خبریں سنیں۔۔۔ مگر دل پتھر کر لیا۔ اب اسے کیا فرق پڑتا تھا کہ وصی کی زندگی میں وشمہ شامل ہو یا سوہا۔۔۔ وہ خود پہ بے حسی طاری کرتی کسی اور جانب خود کو مشغول کر لیتی جب بھی یہ چرچا آس پاس ہو رہا ہوتا۔

سراج اور معراج تک یہ سارا معاملہ شوکت جہاں کی ہدایت پہ پہنچنے نہ دیا گیا۔

”پہلے یہ طے ہو لینے دو کہ سوہا یا وشمہ‘ اس کے بعد گھر کے مردوں تک بات پہنچے ورنہ بلاوجہ بدمزگی ہو گی‘ سراج کے مزاج کا تو پتہ ہے تم سب کو۔“

اور ایک لمبی بحث اور کشمکش کے بعد یہ طے پا گیا کہ یہاں سے پروین اور ندا سوہا سے ملنے جائیں گی۔

”صرف اور صرف ملنے۔“

شوکت جہاں نے اپنے الفاظ پہ زور دے کر وصی کو باور کرایا۔

”بھی وہ اس سے یا اس کی چچی سے ایسی کوئی بات نہیں کریں گی۔۔۔ پہلے پروین کو یہ تسلی کر لینے دو کہ سوہا تمہارے لیے مناسب رہے گی یا نہیں۔۔۔ اور یاد رکھو وصی۔۔۔! میں نے سالوں پہلے تمہاری پرورش کا ذمہ پروین کو سونپا تھا۔ آج میں اسے تمہارے بارے میں سارے اختیار بھی سونپ چکی ہوں۔“

شوکت جہاں کی بات پہ وصی نے تابعداری سے سر جھکا دیا۔۔۔ وہیں پروین کا بھی ڈھیروں مان بڑھ گیا۔

”لیکن ندا کا جانا سمجھ میں نہیں آ رہا اماں جان! آپ بڑی ہیں‘ بزرگ ہیں آپ چلی جاتیں۔“

رخشندہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اسے تو ان معاملات کی ذرا بھی سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ نجانے کیا کہہ دے۔“

”ایسے ہی آئے گی سمجھ بوجھ۔۔۔ اگلے مہینے شادی ہونے والی ہے اس کی اب بھی ان معاملات میں دلچسپی نہیں لے گی تو کب لے گی۔ ویسے بھی اسے بھیجنے کی صرف یہ اکلوتی وجہ نہیں ہے۔ ایک تو سوہا اس کے کالج میں پڑھتی ہے ہو سکتا ہے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے جانتی ہو اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ندا وصی سے بہت قریب رہی ہے۔ اس کی پسند ناپسند کو ہم سب سے بہتر جانتی ہے۔“

ندا نے اتراتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

”تم مجھے میرے حال پہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے اصغر؟“

ربتا نے پھوڑے کی طرح دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بڑی التجا بھرے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

”تمہارا کوئی حال بھی تو ہو‘ جس پہ چھوڑوں۔۔۔ یہ حال ہے؟“ اس نے بھری ہوئی ایش ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔

”شکل دیکھ اپنی شیشے میں آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے ہیں‘ رنگ پیلا ہو گیا ہے۔“

”میں خوب صورت نظر آؤں تب بھی تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔ میں بدصورت نظر آؤں تب بھی تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔“

”تو خوب صورت لگو... مگر صرف مجھے۔“

اصغر نے اس کا زرد رو نقاہت کا مارا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

”اور تو ہے کہ جب خوب صورت لگتی ہے تو باہر والوں کے لیے اور جب کچھ دنوں سے باہر جانا چھٹا ہوا ہے تو یہ بیمار شکل میرے لیے لے کر بیٹھ گئی یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

ریتا یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

یہاں تک کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”جھلی... اب رونے کیوں لگی؟ سچ مچ بدصورت تھوڑا ہی کہا ہے میں نے تو بدصورت ہو بھی نہیں سکتی۔ کبھی بھی نہیں دس دن منہ نہ دھوئے تب بھی نہیں۔“

اس کی بات پہ ریتا کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

”تم بہت اچھے ہو اصغر!“

”چل تجھے پتا تو چلا۔“

”پتہ تو مجھے تھا... پہلے سے تھا کہ تم بہت اچھے ہو لیکن کیا ہے اصغر! کہ کبھی کبھی انسان کو کسی بہت اچھی چیز کی بھی خواہش نہیں رہتی۔ کبھی کبھی اچھی چیزیں راس بھی نہیں آتیں۔“

”پھر سے وہی مشکل مشکل باتیں کتنی بار کہا ہے۔ آسان باتیں کیا کر‘ آسان زندگی جیا کر۔“

”اپنے بس میں ہے زندگی کا آسان کرنا؟“

”ہے کیوں نہیں ہے... تین چار سال ہو گئے ہیں ہمیں اکٹھے ملک سے باہر نکلے۔ چل سنگاپور یا ملائیشیا ہو کے آتے ہیں یہ ذرا سستے پڑتے ہیں۔“

نرمی سے اسے دیکھتے دیکھتے ریتا پھر سے ہنسنے لگی۔

”کوئی لطیفہ سنایا ہے میں نے؟“

”محبت میں بھی نفع نقصان پورا سوچ کے رکھتے ہو۔ پکے کاروباری ہو تم اصغر...! میری خوشی کے لیے مجھے باہر بھی لے جا رہے ہو۔ یہ خیال بھی ہے کہ ٹرپ سستا پڑے۔“

وہ پھر سے ہنسنے لگی اور اصغر خجالت مٹانے کے لیے خوامخواہ مسکرانے لگا۔

”اچھا چل سنگاپور یا ملائشیا بعد کی باتیں ہیں۔ سوہا آتی ہے تو کرتے ہیں پروگرام سیٹ ابھی تو چل میرے ساتھ۔ گھومتے پھرتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں شاپنگ کرتے ہیں پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔“

بہت عرصے بعد وہ موڈ میں آیا تھا۔

بہت عرصے بعد ریتا کو اس کا چونچال پن برا نہیں لگ رہا تھا لیکن باہر جانے کے خیال سے پھر سے کسلمندی چھانے لگی۔

”نہیں آج نہیں بہت تھکن ہو رہی ہے۔“

”تھکن... صوفے پہ بیٹھے بیٹھے؟“

”ہاں... پیروں میں اینٹھن سی ہو رہی ہے۔“

”لا... دکھا۔“

ٹو پیس قیمتی سوٹ میں ملبوس... وہ وہیں اس کے ساتھ صوفے پہ بیٹھ گیا اور اس کا پیر اپنی گود میں رکھ لیا۔

”پھر سگریٹ؟“

”بس ایک... پلیز۔“

ریتا نے اس کی جانب مسکراہٹ اچھالی... اور اس مسکراہٹ کے پیچھے ہی تو وہ سالوں سے ہارتا آ رہا تھا اس بار

بھی ہار گیا اور جب وہ سگریٹ کے کش لگاتی اصغر کی گود میں پیر رکھے ہوئے تھی اور اصغر بڑی مہارت سے اس کے تلووں کا مساج کر رہا تھا عین اسی وقت ملازمہ پروین اور ندا کو لے کر اندر داخل ہوئی۔

”بیگم! یہ سوہا بی بی سے ملنے آئی ہیں۔“

پروین نے اس منظر سے بے حد کراہیت محسوس کی اور ندا بھی شرم سے نظریں چرا گئی۔

”سوہا سے؟“

ریتا نے پیر تو اٹھا لیے اصغر کی گود سے مگر دھوئیں کا ایک بھاری کش چھوڑتے ہوئے ان دونوں کے چہرے بغور دیکھے۔

”پروین‘ سوہا کی دوست ہو سکتی تھیں نہ ندا۔“

”نہیں... میں وصی کی ممانی ہوں اور یہ اس کی بہن۔“

پروین نے اس کی آنکھوں میں استفسار دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی آپ اپنا تعارف کرایا۔

”اوہ“ اس نے جلدی سے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھائی اور کھڑی ہو گئی... اصغر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی تقلید کی۔

”تم کھڑی کیا منہ دیکھ رہی ہو... جاؤ سوہا کو لے کر آؤ۔“

”وہ جی انہوں نے منع کیا تھا انہیں کوئی نہ جگائے۔ رات پونے تین بجے تو وہ گھر آئی تھیں۔“

ملازمہ کی اطلاع پہ پروین اور ندا ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”آپ باہر تشریف رکھیں۔“

ریتا بوکھلا کے آداب میزبانی نبھانے لگی۔ اس کے انداز دیکھ کے اصغر کو بھی لگا کہ آنے والے مہمان خاص ہوں گے‘ ورنہ ریتا ہر ایک کو گھاس ڈالنے والوں میں سے نہیں۔

پروین اور ندا بہت تکلف کے ساتھ صوفے پہ ٹک گئیں۔ بارہ پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد سوہا زینوں سے نیچے اترتی نظر آئی... اور ندا اس پہ پہلی نظر ڈالتے ہی حیرت سے کھڑی ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

وصی سر جھکائے سن رہا تھا اور پروین اور ندا دونوں دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

”یہ سوہا ہے... وہ؟“

ندا بے یقینی سے انداز میں اس پہ چلا رہی تھی۔

”... کالج کی سب سے بدنام لڑکی! کیا ہو گیا ہے تمہاری پسند کو وصی؟“

”دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا؟ اور کیا؟“

پروین بڑبڑائیں... ذہن سے وہ منظر ہی محو نہیں ہو رہا تھا۔

”غضب خدا کا... یہ شرفاء کے اطوار ہوتے ہیں کیا؟ سگریٹ کے کش لگاتی مسٹنڈوں کی طرح لیٹی تھی... بغیر دوپٹے کے اور وہ جورو کا غلام ٹائی لگائے‘ کوٹ پہنے گود میں اس کے پیر رکھے مالشیا بنا ہوا تھا۔ یہی حال وہ لڑکی ہمارا کرنا چاہتی ہوگی‘ جس عورت نے اس کی تربیت کی ہے وہ وہاں کی ہے جہاں مردوں کو اسی طرح جوتے کی نوک پہ رکھا جاتا ہے۔“

”ہاں وہ بہت حساس اور دکھی لڑکی ہے‘ اسے ہمارے گھر کا ماحول اور آپ سب کی محبت ملے گی تو وہ سنبھل جائے گی۔“

”بس وصی! یہ گھر کوئی تجربہ گاہ نہیں ہے بس یہ طے ہے کہ اس گھر میں ایسی کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔“

عزت جہاں نے حتمی انداز میں کہا۔

”پروین تم اپنے بھائی کے ہاں فون کرو... انہیں اطلاع دو کہ ہم اس اتوار ان کے ہاں آ رہے ہیں۔“

"جی۔۔۔ اچھا۔" وہ پھرتی سے اٹھیں۔

"اور یہ بھی بتا دینا کہ کس مقصد سے آ رہے ہیں۔" ان کے اضافہ کرنے پہ وصی پہلو بدل کے رہ گیا۔

"تانو۔۔۔! ٹھنڈے دل سے غور کریں تو آپ۔"

"وصی پلیز۔۔۔! غور تم کرو۔" ندا نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہمیشہ تم مجھے اچھا برا' اونچ نیچ سمجھاتے رہے ہو۔ پھر آج تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ لڑکی کسی بھی طرح تمہارے قابل نہیں۔ کل کو تم کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہو گے۔"

"اور ذرا سمجھ داری سے کام لو۔۔۔ ندا کی شادی ہونے والی ہے اور وہ بھی غیروں میں' کتنا اثر پڑے گا اس کے رشتے پہ بھی اس عورت سے تعلق قائم ہونے کا۔"

وصی بے بسی سے گہرا سانس بھر کے رہ گیا اور اٹھ کر بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

○ ○ ○

"اصغر۔۔۔! تم کہیں جانے کی بات کر رہے تھے؟"

ریتا نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن بھئی ہماری بیگم کے شایانِ شان نہیں ہیں ملائیشیا اور سنگاپور۔۔۔ سستے پڑتے ہیں نا اس لیے۔۔۔ تو جناب اب ہم پلاننگ کریں گے لندن کی۔۔۔ یا پھر۔"

"ملائیشیا ٹھیک ہے۔ ٹکٹ جلدی مل جاتا ہے' وہاں کا کل کی سیٹ بک کروا لو۔"

"خیر تو ہے؟" وہ اس سنجیدگی پہ ٹھٹکا۔

"ہاں فی الحال تو خیر ہے ویسے ہی سوچا سوہا کا دل بھی بہل جائے گا۔ کچھ وقت ہمیں بھی ایک ساتھ گزارنے کو مل جائے گا۔" بہت مشکل سے وہ اپنے چہرے پہ مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوئی اور اصغر بہل گیا۔

لیکن سوہا کو بہلانا اتنا آسان نہیں تھا۔

"اتنا اچانک پروگرام۔"

"تم جاؤ گی تو میں جاؤں گی ورنہ۔۔۔ تمہیں تو پتہ ہے تمہارے چاچو سے زیادہ بور کوئی اور نہیں ہے اس دنیا میں۔"

"میں نے منع نہیں کیا لیکن کل ہی؟"

وہ سمجھ رہی تھی کہ اصغر سے گزشتہ دن بلا کی کشیدگی رہنے کے بعد ریتا پہلی بار خود سے پیش قدمی کر رہی ہے اور ان دونوں کا چند دن کسی اچھے مقام پہ رہنا بہت خوشگوار اثرات مرتب کرے گا لیکن دوسری جانب وصی سے دور رہنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔۔۔ دو دن تو گزرے تھے پہلے پہلے پیار کی بارش میں بھیگتے ہوئے۔۔۔ ابھی تو دل کی مٹی پوری طرح نم بھی نہ ہوئی تھی۔۔۔ سیرابی کا ہلکا سا بھی احساس نہ جاگا تھا۔ ایسے میں وہ چند دنوں کے لیے ہی سہی مگر اتنی دور کیسے چلی جاتی۔۔۔ پھر اس کی ممانی کا وہاں آنا۔۔۔ بغیر کچھ کہے سنے' چند منٹ بعد ہی روکھے پھیکے انداز میں چلا جانا۔۔۔ یہ بھی اسے الجھا رہا تھا۔

اس نے وصی کا نمبر ملایا۔

"ہاں سوہا بہت جلدی جاگ گئیں تم؟"

اس وقت وہ اس سے بات کرنے کے لیے ذہنی طور پہ تیار نہ تھا اس لیے گڑبڑا کے اتنا ہی کہہ سکا۔

"طنز کر رہے ہو؟"

"طنز؟"

"ہاں۔۔۔ کل تمہاری ممانی آئیں تو میں دوپہر تک سو رہی تھی اس لیے۔۔۔ شاید وہی غصہ نکال رہے ہو لیکن یار! تم نے بھی تو اطلاع نہیں دی ان کے آنے کی۔۔۔ ورنہ میں کسی نہ کسی طرح جاگ ہی جاتی۔ ایکچوئلی رات کو سوئی دیر سے تھی۔"

"جانتا ہوں۔ ظاہر ہے جب گھر تین بجے آئی تھیں تو سوئی چار بجے ہو گی۔"

[illegible]کے خشک لہجے پہ غور کرتے ہوئے سوہا لمحہ بھر کو چپ ہوئی پھر تلخی سے بولی۔

[illegible]ات کو تین بجے گھر آنا میرا معمول نہیں ہے اور نہ ہی دن کو ڈیڑھ بجے جاگنا۔ ایسا ہوتا تو میں کالج کیسے جاتی۔ [illegible]ات کو میں ایک مہندی کے فنکشن میں تھی اور مہندی کے فنکشنز تو رات تین چار بجے تک چلا ہی [illegible]تے ہیں۔"

[illegible]عادت کے خلاف وضاحتیں پیش کرتے ہوئے سوہا کو بڑا عجیب سا لگا۔

"[illegible]چھا چھوڑو یہ باتیں۔۔۔ میں نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ میں ماما اور چاچو کے ساتھ دو تین دن کے لیے [illegible]چلی جاؤں؟"

"[illegible]س میں مجھ سے پوچھنے والی بات کون سی ہے؟"

[illegible]بجھے بجھے انداز میں زبردستی بشاشت پیدا کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔

"[illegible]سے ہی تو پوچھنا ہے اب سب کچھ۔"

[illegible]س کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

"[illegible]یسے بھی مجھے لگا۔۔۔ کل تمہاری ممانی ہمارے ہاں آ کے کچھ اپ سیٹ ہو گئی تھیں۔۔۔ ہونا بھی چاہیے اتنے [illegible]بعد انہیں سامنے دیکھ کر مجھے بھی بہت عجیب سا فیل ہوا۔ وہ سب کچھ یاد آ گیا جو اچھے بھلے موڈ کو برباد کرنے [illegible]لیے کافی تھا۔ مجھے یقین ہے انہیں بھی مجھے دیکھ کر کچھ خوشگوار احساس نہ ہوا ہو گا۔ میں کچھ دنوں کے لیے [illegible]سے غائب ہو جاؤں گی تو شاید تم بھی اس مہم میں کامیاب ہو جاؤ۔"

"[illegible]مہم؟" وہ غائب دماغی سے پوچھنے لگا۔

"[illegible]انہیں منانے کی مہم یار۔۔۔! اور کیا لگتا ہے تمہاری اچھی خاصی کھنچائی ہوئی ہے گھر میں۔۔۔ تبھی ہوش اڑے [illegible]ئے ہیں۔"

[illegible]س کے انداز اندر ہی اندر سوہا کو بھی ڈرا رہے تھے مگر وہ بات کو مذاق میں اڑا رہی تھی۔

"[illegible]میں نے تو کہا تھا تمہیں کہ میری محبت تمہیں خوار کرائے گی مگر تم خود دل و جان سے راضی تھے خوار ہونے [illegible]لیے۔" وصی پھیکے پن سے مسکرا دیا۔

[illegible]بند ہونے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

[illegible]وہ چاہتا تھا کر نہیں سکا۔

[illegible]ور تو ہونے جا رہا تھا۔۔۔ اسے روکنے پہ وہ قادر نہیں تھا۔

[illegible]ور تو اور اپنی پسپائی کا اظہار وہ اس لڑکی کے سامنے کر بھی نہیں سکتا تھا۔ چند دن پہلے جس کے سامنے بڑے [illegible]دعوے کیے تھے تو بہتر یہی تھا کہ وہ کچھ ہونے دیا جاتا۔ جو قدرت کی طرف سے ہو رہا تھا۔ یعنی سوہا کا منظر سے [illegible]ہونا۔

"[illegible]جب میں یہ جانتا ہوں کہ وہ صرف ملک سے باہر نہیں جا رہی۔۔۔ میری زندگی سے بھی دور جا رہی ہے۔ [illegible]واپس آنے کے بعد سب کچھ بدلا ہو گا۔ میں' میرا دل' میری زندگی' میرے خواب سب کچھ اس کے باوجود [illegible]س کے جانے کے خیال سے میرا دل بوجھل کیوں نہیں ہو رہا' میری آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں ہیں؟ میں [illegible]کیوں نہیں پا رہا میں اسے پانے کی دل سے کوشش کیوں نہیں کر رہا' کیا مجھے اس سے محبت تھی ہی نہیں؟ [illegible]جذبہ جو اچانک میرے دل میں اس کے لیے جاگا تھا۔۔۔ یہ محبت کا نہیں ہمدردی کا جذبہ تھا؟ کیا میں ایک [illegible]حیثیت سے صرف اس کی زندگی میں کچھ آسانیاں کچھ خوشیاں لانا چاہتا تھا۔"

[illegible]اس شخص کی تھی۔۔۔ جس کے لیے سوہا نے اپنے دل میں سب سے بڑھ کے محبت محسوس کی تھی۔

[illegible]وہ لڑکی۔۔۔ جس سے سوہا نے زندگی کی سب سے سچی اور بے لوث دوستی کی تھی۔۔۔ وہ لڑکی بھی

اس کے جانے کی خبر سن کر شانت سی ہو گئی۔

"I will miss you یار!"

"میں بھی۔"

تقدیس دل ہی دل میں اس کی محبت اور خلوص کے سامنے شرمندہ ہو رہی تھی۔

"کیا لاؤں تمہارے لیے؟"

اس کے احساسات سے بے خبر سوہا سے پوچھ رہی تھی۔ تقدیس کو اس کے جانے سے اطمینان کا احساس صرف اس لیے ہو رہا تھا کہ اگلے ہفتے تحریم کی شادی تھی۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ تقدیس کی بہن کی شادی ہو اور اپنی سب سے عزیز اور قریبی دوست کو وہ نہ بلائے۔ دوسری جانب اسے اپنی ماں کی جانب سے شدید خطرہ تھا۔

اگرچہ سوہا نے اپنے رنگ ڈھنگ۔۔۔ اپنا پہناوا۔۔۔ اپنی بول چال عادتیں سب خاصی حد تک بدل لیا تھا لیکن اب بھی وہ مدیحہ کے مرتب معیار سے بہت دور تھی۔۔۔ انہیں تو بلند وبانگ قہقہے تک لگانے والی لڑکی واہیات لگا کرتی تھی۔ ایسے میں جب سوہا نے دو ہفتے کے لیے بیرونِ ملک جانے کی خبر سنائی تو یہ تقدیس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

منزہ نے ریسیور رکھا اور بڑے جوش کے ساتھ پلٹی۔ اندر داخل ہوتے نوید مراد نے تعجب کے ساتھ دیکھا۔ اس کے چہرے پہ یہ چمک اب کم کم نظر آتی تھی۔

"اب تو آپ کو ماننا ہی ہو گا کہ میں ایک بار جو ٹھان لیتی ہوں کر کے رہتی ہوں۔"

"کیا ہوا؟"

"پروین کا فون تھا۔" فتح کی سرشاری اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

"وہ اپنی ساس اور میاں کے ساتھ آ رہی ہے۔ وشمہ کا رشتہ لے کر۔"

"واقعی؟" انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔

وشمہ کے لیے ایسی سسرال اور ایسے لڑکے کے انہوں نے خواب دیکھ رکھے تھے اور وہ جانتے تھے وہ صرف خواب دیکھنے تک محدود رہنے والے شخص ہیں۔ یہ منزہ تھی جس نے ان خوابوں میں تعبیر کا رنگ بھرنے کے لیے تگ ودو کی تھی۔

"تم نے وشمہ کی ماں ہونے کا حق ادا کر دیا۔"

نوید کے اعتراف نے اسے آسمان پہ پہنچا دیا۔

اس آسمان پہ۔۔۔ جہاں اس وقت اس کی بیٹی پرواز کرتی اس ملک سے دور جا رہی تھی۔

وہ بیٹی۔۔۔ جس کی ماں ہونے کا حق وہ ادا نہ کر سکی تھی۔

● ● ●

"اسے بھی ابھی بیمار ہونا تھا۔۔۔ پہلے ہی صورت پہ مردنی چھائی رہتی ہے' اوپر سے یہ بخار اُترنے کا نام نہیں لے رہا۔"

تیسرا دن تھا جب مدیحہ' تحریم کے بخار سے چڑ کے بولیں۔۔۔ بخار دواؤں کے زیرِ اثر ٹوٹ جاتا تھا۔ مگر شام ہوتے ہوتے پھر سے تیز ہو جاتا تھا۔۔۔ وہ بے چاری نچڑ کے رہ گئی تھی۔

"شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔۔۔ اور اسے دیکھو ذرا۔" ان کے لہجے میں کوفت اور بے زاری محسوس کر کے تحریم نے تپش سے سلگتی آنکھیں کرب سے موند لیں۔۔۔ پلکیں جڑتے ہی اندھیرے اندر تک اترتے محسوس ہوئے۔

"اس میں آپی کا کیا قصور ہے بھلا؟" تطہیر کو بھی برا لگا۔

"قصور نہیں ہے۔ لیکن تم نے سنا ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا کہ اس بخار کی وجہ نفسیاتی ہے۔ سارے ٹیسٹ تو کلیئر ہیں۔۔۔ نہ ملیریا' نہ جانڈس نہ ٹائیفائیڈ نہ کسی اور قسم کا انفیکشن۔۔۔ اب اسے خود ہمت کر کے اس بیماری کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ مگر یہ ہے کہ نہ کچھ کھا رہی ہے' نہ پی رہی ہے۔ دن میں تین بار دوا لیتی ہے۔ مگر ایک ہی بار میں اتنا پیار پڑتا ہے کہ دوسری بار ہمت جواب دینے لگتی ہے۔ اتنا تنگ تو اس نے کبھی بچپن میں بھی نہیں کیا۔"

"مسلسل بخار کی وجہ سے چڑچڑی ہو رہی ہیں۔۔۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے۔" تقدیس نے یہ کہتے ہوئے تحریم کی بند پلکوں کی لرزش کو دکھ سے دیکھا۔

(یہاں ہو کر اندازہ کیوں نہیں لگا سکتیں کہ ان بند آنکھوں کے پیچھے کون سا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔)

"میں کس کس کو سمجھاؤں گی کہ کوئی اور وجہ نہیں ہے۔" مدیحہ کا لہجہ اور آواز دونوں تیز ہوئے۔

"گھر میں مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں اور تم اچھی طرح جانتی ہو' اپنے باپ کے رشتے داروں کو۔ سو سو سوال کریں گے وہ اس کی اتری صورت اور فق رنگت دیکھ کر۔"

یہ کہتے ہوئے مدیحہ ہمیشہ کی طرح اب بھی بھول گئیں کہ جعفر محمود کے رشتے دار جتنے جعفر محمود کے سگے ہیں' اتنی ہی سگی قرابت داری ان کی۔۔۔ بھی ہے۔

"کیوں۔۔۔ کیا ان کے گھروں میں کبھی کوئی بیمار نہیں ہوتا۔" تقدیس تو ماں کے انداز پہ ناگواری محسوس کرنے کے باوجود چپ رہی۔۔۔ مگر تطہیر الجھ پڑی۔

"اچھا۔۔۔ بس بھی کرو۔۔۔ آپی کے سر پہ کھڑے ہو کر یہ بحث کرنا کیا بہت ضروری ہے۔۔۔ آرام کرنے دو انہیں۔"

"یہ تو بستر کی ہو کے رہ گئی ہے۔۔۔ اور اب بھی تم اسے مزید آرام کرانے کے درپے ہو۔۔۔ اسے لان میں لے جا کر واک کراؤ۔۔۔ تاکہ کچھ فریش نظر آئے۔۔۔ کہیں گھمانے لے جاؤ۔۔۔ شادی کے دن قریب ہوں تو لڑکیوں کے کام کے چکر ہی ختم نہیں ہوتے۔۔۔ ایک یہ ہے نہ تو شاپنگ میں دلچسپی لی۔۔۔ نہ کسی اور معاملے میں۔۔۔ ایسا کب تک چلے گا۔۔۔ مجھے تو ڈر ہے اس کے سسرال والے اس کی بے دلی محسوس نہ کر لیں۔۔۔ اب تک تو میں نے اس کی بے زاری اور عدم دلچسپی پر اس کی سنجیدہ طبیعت اور شرم وحیا کا بھرم ڈالا ہوا ہے مگر کب تک؟"

مدیحہ کے خدشات بھی بے بنیاد نہ تھے۔۔۔ اپنی جگہ وہ بالکل ٹھیک تھیں۔۔۔ اپنے سسرال والوں کے سامنے تحریم کا بیزار بیزار انداز۔۔۔ اور مسلسل منہ سی کر بیٹھنا انہیں خفت میں مبتلا کر دیتا تھا اور وہ خجالت بھری ہنسی کے ساتھ کہا کرتی تھیں۔

"میری تحریم ایسی ہی ہے۔۔۔ آج کل کی لڑکیوں کے برعکس بے حد پرانی قسم کی روح۔۔۔ شرم کے مارے یہ تو آپ کے سامنے تک آنے سے گھبراتی ہے۔۔۔ آپ ہی کیا۔ پورے خاندان میں شاید ہی کسی نے اس کی اونچی آواز سنی ہو۔"

لیکن انہیں ایسا لگتا جیسے سامنے بیٹھے چہروں پہ ان کی بات سن کر تمسخر پھیل گیا ہے۔

مدیحہ باہر نکلیں تو تقدیس نے تاسف سے تحریم کو دیکھا جو اب تک آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔

"کیا کان بھی بند کر لیتیں آپی۔۔۔!"

اس نے تطہیر کو بڑے خراب موڈ میں مدیحہ کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلتا دیکھا تو کچھ سوچ کر روک لیا۔

"تطہیر! تم آپی کے پاس بیٹھو۔۔۔ ان کا خیال رکھنا۔"

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

تحریم نے نقاہت بھری آواز میں منت سی کی۔

"نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ ماما نے ہر بات غلط نہیں کی آپی! آپ کو اپنی دل بیماری سے کام لینا ہو گا۔ ایسے بیمار پڑے رہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ کی زندگی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہونے جا رہا جو انہونی بات ہو۔۔۔ کیا ہر لڑکی کی شادی نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے۔۔۔ مگر کبھی لاش کی بھی شادی ہوئی ہے؟"

تقدیس اس کی بات سن کر لرز کے رہ گئی۔

"خدا کا خوف کرو آپی۔! کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

تطہیر نے دہل کر کہا جبکہ تقدیس تو سن سی ہو کر رہ گئی تھی۔۔۔ کچھ کہہ نہ سکی۔

"وحید نے میری جان نچوڑ کے رکھ دی تھی۔۔۔ اس بے جان پتلے پہ رنگ و روغن کر کے ماما کیوں کسی کو دھوکا دینا چاہتی ہیں۔ کیا میں اس قابل ہوں کہ کسی کی زندگی میں پورے اعتماد سے شامل ہو سکوں۔"

"کیوں نہیں ہیں اس قابل؟ کیا کمی ہے آپ میں؟ کیا کیا ہے آپ نے؟ صرف ایک چرب زبان اور شاطر شخص کی باتوں میں ہی آ گئی تھیں نا ۔۔۔ ذرا سا قدم لڑکھڑائے تھے، پھسلے تو نہیں تھے۔۔۔ ایسی چھوٹی موٹی لغزشیں تو ہر انسان سے ہوتی ہی رہتی ہیں۔۔۔ ان ہی سے انسان سبق سیکھتا ہے اور پھر آئندہ زندگی میں ایسا کچھ نہ کرنے کا اعادہ کرتے ہوئے اگلے قدم مضبوطی سے دھرتا ہے۔"

"تو۔۔۔ تو کیا جب اسے پتا چلے گا، وہ کھلے دل سے مجھے قبول کر لے گا؟"

تحریم کا سوال کچھ دیر تو تقدیس کی سمجھ میں نہیں آیا اور جب آیا تو وہ چلا اٹھی۔

"کچھ نہیں کہیں گی آپ زاہد بھائی سے۔۔۔ ایسے کوئی اہم بات نہیں تھی یہ۔۔۔ جو ان کو بتانا ضروری ہو۔"

"بددیانتی کی بنیاد پہ قائم رشتے۔۔۔"

"مائی گاڈ۔! کیا فضول کی بحث لے بیٹھی ہیں آپ دونوں۔" تطہیر اس بحث سے تنگ آ گئی۔

"آپی! تقدیس ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ بہت نگیٹو تھنکنگ رکھنے لگی ہیں۔ آپ کو خود کو بدلنا ہو گا۔۔۔ اور تقدیس پلیز۔ ! تم اور ماما۔۔۔"

"Please give her a break انہیں سنبھلنے تو دو۔۔۔ پتا نہیں ماما کو کیا جلدی تھی۔۔۔ کچھ ٹائم ملتا آپی کو تو وہ خود ہی اس احساس سے باہر آ جاتیں۔۔۔ اب یہ فائنل ہے۔۔۔ کہ کوئی یہ بحث دوبارہ نہیں چھیڑے گا۔"

"او کے۔۔۔ تم بیٹھو آپی کے پاس۔۔۔ اور انہیں چیئر اَپ کرنے کی کوشش کرو۔۔۔ میں ماما کو سمجھاتی ہوں۔"

وہ ڈرتی تھی۔۔۔ ہر وقت ڈرتی تھی کہ تطہیر اپنی دو ٹوک، اور بے جھجک زبان کی وجہ سے کسی دن ماما سے زیادہ گستاخی نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے ایسے کسی بھی موقع پہ اس کی کوشش ہوتی کہ ان دونوں کا آمنا سامنا کم سے کم ہو۔

❖ ❖ ❖ ❖

"تو تم نے ہتھیار ڈال دیے۔"

وہ بیڈ پہ آڑا ترچھا لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ جب حسن نے اندر آتے ہوئے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

"میں نے ہتھیار اٹھائے ہی کب تھے۔" وہ پھیکی سی ہنس دیا۔

"یہ تمہاری زندگی کا سوال ہے وصی۔! جس کو چاہتے ہوں اس سے دست برداری پھر بھی کچھ آسان مرحلہ ہوتا ہے۔ مگر کسی اَن چاہے کا زندگی میں زبردستی داخل ہو جانا۔۔۔ اس مرحلے سے گزرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تم کیوں اپنی آئندہ زندگی میں مشکلات پیدا کر رہے ہو۔۔۔ آج تمہیں بڑوں کے خلاف اسٹینڈ لینا مشکل لگ رہا ہے مگر تم اپنے فیصلے کو سراہو گے۔۔۔ یہ ذرا سی ہمت دکھا لینے پہ تم باقی کی ساری زندگی محبت کے ساتھ گزارو گے۔ ورنہ ایک ٹوٹے ہوئے، ہارے ہوئے، زخم خوردہ انسان بن کر جیو گے۔"

حسن پورے جوش کے ساتھ اسے اکسا رہا تھا۔ حالانکہ وہ وشمہ سے شادی کرنے پہ مانے یا نہ مانے۔ حسن کو تو پھر بھی نامراد ہی رہنا تھا۔۔۔ اس کی زندگی میں ظلِ ہما کا نام پکی سیاہی سے لکھ دیا گیا تھا۔۔۔ لیکن وہ شدت سے وصی کی جانب سے اس بغاوت کا متمنی تھا جو بغاوت اس سے نہ ہو سکی۔۔۔ ایسا کرنے اور چاہنے کے لیے اس کے پاس بے شمار وجوہات تھیں۔۔۔

۔۔۔ بڑی وجہ۔۔۔ وہ اب بھی وشمہ کے حوالے سے اپنے دل میں کسک محسوس کرتا تھا۔۔۔ اسے اپنا نہیں ۔۔۔ الگ بات۔۔۔ لیکن اسے کسی اور کا ہوتا دیکھنا۔۔۔ یہ بہت تکلیف دہ ہوتا اس کے لیے۔۔۔ حالانکہ وہ جانتا تھا ۔۔۔ کسی نہ کسی سے وشمہ کی شادی ہونا ہی ہے۔۔۔ مگر وہ کسی نہ کسی اس کا اپنا بھائی ہو، یہ بات ناقابلِ ۔۔۔ تھی۔

۔۔۔ بڑی وجہ اس کا وہ اظہارِ محبت تھا جو اس نے بے اختیار ہو کر وشمہ سے کر دیا تھا۔۔۔ تب وہ نہیں جانتا تھا کہ ۔۔۔ کی رسائی سے باہر ہے۔۔۔ اگر یہ اظہار دل تک رہتا، تب شاید وہ کسی نہ کسی طرح زندگی میں اس کا سامنا ۔۔۔ کرنے کے قابل ہوتا۔ ابھی تو یہ خیال سوہانِ روح تھا کہ اسے وشمہ کے سامنے آنکھیں بھی اٹھانا پڑیں ۔۔۔ یہ ڈر گھیرے میں لیے رہتا کہ وہ معصوم لڑکی اسے ہرجائی اور بھنورا صفت سمجھتی ہو گی جو اس کے ۔۔۔ بت کا اقرار کرنے کے دو دن بعد ہی کس اور کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی پہنا رہا تھا۔۔۔ اور ایسے میں اگر ۔۔۔ کے اس گھر میں آنے کے امکان پیدا ہو رہے ہوں تو اس کا بدکنا لازمی تھا۔۔۔ کہاں تو وہ اس سے سامنا کرنے ۔۔۔ زار ہا تھا۔ اور کہاں اب عمر بھر اس کے سامنے نظریں جھکا کے اور کنی کترا کے رہنا پڑے۔

۔۔۔ تیسری اہم وجہ یہ تھی۔۔۔ کہ اس نے وصی کو ہمیشہ حیان کی طرح اپنا چھوٹا بھائی سمجھا تھا، اپنے چھوٹے بھائی ۔۔۔ کے روپ میں اس لڑکی کو دیکھنا کتنی شرم کی بات تھی؟ جس لڑکی سے کبھی اس نے ٹوٹ کر محبت کی ہو۔۔۔ ۔۔۔ کے نقش کو تصور میں بسا کے گھنٹوں سرور لیا ہو۔۔۔

۔۔۔ لیے وہ تن دہی سے اسے اپنے مؤقف پہ قائم رہنے پر ورغلا رہا تھا۔

"تم خود کو کمزور کیوں سمجھ رہے ہو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ اور یہ کون سا بچپن کی منگنی کا قصہ ہے جو ۔۔۔ مسئلے پیدا ہوں۔ ابھی ابھی تو یہ خیال پیدا ہوا ہے امی اور دادو کے دل میں۔ ان کی خواہش زیادہ اہم ہے یا ۔۔۔ ے جذبات۔۔۔ میں خود تمہارا مقدمہ لڑوں گا۔۔۔ بس تم ڈٹ جاؤ۔۔۔ کہ شادی کرو گے تو سوہا کے ساتھ کیونکہ تم ۔۔۔ اس سے محبت کرتے ہو۔"

"لیکن میں اس کے ساتھ محبت نہیں کرتا۔"

۔۔۔ن کے لمبے چوڑے بیان کے جواب میں وصی کا بڑی بے بسی سے کہا گیا صرف ایک جملہ تھا۔۔۔ جس نے ۔۔۔ چپ کرا دیا۔۔۔ وہ خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا پھر پھٹ پڑا۔

"یہ کیا ڈرامہ لگا رکھا ہے تم نے۔۔۔ صرف سب کی توجہ اپنی جانب کھینچنے کے لیے؟۔۔۔ سب کو ایک ذہنی آزار ۔۔۔ مبتلا کرنے کے لیے؟ تم ایک انتہائی کمزور شخصیت کے مالک ہو وصی۔! تم میں ابھی تک فیصلہ کرنے کی ۔۔۔ ہمت نہیں ہے۔۔۔ ایسے زندگی نہیں گزرتی۔۔۔ سمجھے تم؟"

۔۔۔ بھی سر جھکائے سنتا رہا۔ اسے حسن کا غصہ برا لگ رہا تھا نہ ڈانٹ ڈپٹ۔

"اور اگر واقعی تمہیں سوہا سے محبت نہیں تھی تو تمہارے چہرے سے رونق کیوں ختم ہو گئی ہے۔۔۔ کیوں ۔۔۔ زمانے سے منہ چھپا کے اندر چھپے بیٹھے ہو؟"

حسن نے جاتے جاتے دروازے پہ رک کر ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

۔۔۔ نے فوراً سر اٹھایا۔۔۔ وہ اس سوال کا جواب دینا چاہتا تھا۔ مگر حسن اپنی بات کہہ کر جا چکا تھا۔

"ہاں میں منہ چھپائے بیٹھا ہوں۔۔۔ حالانکہ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ مجھے سوہا سے محبت نہیں تھی۔۔۔ لیکن یہ ۔۔۔ ہے کہ میں نہ سہی۔۔۔ وہ بے وقوف تو مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔۔۔ اور یہ کچھ کھونے کا نہیں، ندامت کا ۔۔۔ ہے جو مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔۔۔ کہ جب میرے دل میں اس کے لیے اتنی اسٹرانگ فیلنگ ۔۔۔ نہیں تو کیا ضرورت تھی اس جذباتی لڑکی کے اندر پہلے سے موجود محبت کی طلب کو اور بھڑکانے کی۔ میں نے ۔۔۔ تم دونوں ایک سے ہیں۔۔۔ ساتھ رہتے رہتے ہو جائے گی محبت بھی۔۔۔ اور میں ایک دوست کی حیثیت سے ۔۔۔ سب دوں گا جس کے لیے وہ عمر بھر ترسی ہے لیکن گھر والوں کا رویہ دیکھ کے لگا۔۔۔ میں ایک دوست ہونے

کے ناتے اس کے ساتھ یہ ظلم نہیں کر سکتا۔۔۔ کہ اسے ایک ایسے گھر میں لے آؤں جہاں کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔۔۔ کوئی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا۔۔۔ نفرتوں کی یہ دھوپ اسے کملا کے رکھ دیتی۔۔۔ مجھے اس سے محبت کرنے میں کچھ وقت لگتا۔۔۔ اور اس دوران وہ محبت کو ترسی لڑکی اتنی ڈھیر ساری نفرتوں کا مقابلہ کیسے کرتی یا تو میری محبت اتنی توانا، اتنی طاقت ور ہوتی۔۔۔ کہ وہ اس میں سرشار رہتی۔۔۔ مگر میرے دل میں اس کے بارے میں جو جذبات ہیں، ان کی حقیقت سے واقف ہونے کے بعد میں کیسے اسے یہ سہارا دے سکتا تھا۔۔۔ محبت کے سہارے ہر جنگ جیتی جا سکتی ہے، ہر وار الٹا جا سکتا ہے۔۔۔ لیکن صرف ہمدردی اور خدا ترسی کی نیت سے کسی کے ساتھ بھلا کرتے کرتے میں اتنے ڈھیر سارے لوگوں سے نہیں لڑ سکتا جن سے میرا قلبی ربط اس چند روزہ دوستی سے کہیں بڑھ کے ہے۔"

وصی نے اداسی سے سوچا۔۔۔ اور ایک گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔

"یہ ہار کا احساس محبت میں شکست کھانے والوں کا نہیں ہے حسن بھائی۔۔۔! یہ ہار میرے اندر کے کمزور انسان کی ہے۔۔۔ ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ میں ایک کمزور شخصیت کا مالک ہوں۔۔۔ ادھار میں ملی محبتوں پہ زندہ رہنے والے کمزور ہی ہوتے ہیں۔ آپ۔۔۔ یا کوئی اور۔۔۔ آپ لوگ اپنی ماں سے، باپ سے، بہن بھائیوں سے بڑے حق سے خفا ہو سکتے ہیں، جانتے ہیں کہ گوشت سے ناخن جدا ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ لیکن میں ایسا کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔۔۔ ڈرتا ہوں کہ احسان فراموشی کا طعنہ نہ مل جائے۔۔۔ میں امی کی محبتیں۔۔۔ نانو کی شفقتیں کیسے نظرانداز کر دوں؟ صرف سوہا کے لیے؟ جسے میں صرف اپنے چند اچھے دوستوں میں سے ایک سمجھتا ہوں اور جس کی زندگی میں صرف ایک اچھا خوشگوار موڑ لانا چاہتا تھا۔ میری یہ شکست محبت کی نہیں، ارادے کی شکست ہے۔"

✡ ✡ ✡

"یہ والے بندے پہن لو اس سوٹ کے ساتھ۔"

منزہ نے وشمہ کے کانوں میں سونے کے ہلکے سے بندے پہنائے جن میں سفید نگ دمک رہے تھے۔۔۔ وہ ہلکے گلابی شفون کے سوٹ میں ملبوس تھی جس پر سفید ریشمی دھاگے کی نفیس کڑھائی تھی۔۔۔ اور سفید اور گلابی ٹائی اینڈ ڈائی دوپٹہ۔۔۔ جس کے چاروں اور روپہلی پٹی لگی تھی۔

"میک اپ بے شک نہ کرنا۔۔۔ بس لائٹ سی لپ اسٹک لگا لینا۔"

منزہ نے اس کے گلابی پڑتے چہرے سے نظر ہٹائی، مبادا اس کی اپنی نظر نہ لگ جائے۔۔۔ وشمہ کا چہرہ سوٹ سے ہم رنگ دکھ رہا تھا۔

"اوور تو نہیں ہو جائے گا؟" وہ بے حد نروس نظر آ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ اوور کیسا؟ لپ اسٹک ہی تو لگانی ہے۔۔۔ پہلے کبھی نہیں لگائی کیا؟"

"وہ۔۔۔ پہلے کی بات اور تھی۔۔۔ اب تو۔۔۔"

وشمہ بات پوری نہ کر سکی۔۔۔ اس کے رخسار لو دے رہے تھے۔ منزہ کو اس پہ ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم کر اسے دل سے دعا دی۔

"اللہ نصیب اچھے کرے۔"

وشمہ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ منزہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹ گئی۔

"ماما۔۔۔! آئی لو یو۔۔۔"

منزہ کے دل کو کوئی اندر سے کاٹنا لگا۔۔۔ اس نے تیزی سے پلکیں جھپکتے ہوئے امنڈ آنے والے آنسو بمشکل پرے دھکیلے اور وشمہ کے گرد اپنی گرفت اور والہانہ انداز میں سخت کرتے ہوئے اسے اپنے اندر سمونے کی کوشش کی۔ "میری بچی۔۔۔!"

وہ اس کی ریشمی چٹیا پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔۔۔ بند آنکھوں کے ساتھ اس کے نرم و نازک وجود کو اپنے اندر سموئے، اس کی دھڑکنوں کو اپنے سینے پہ محسوس کرتے ہوئے۔۔۔ اس کی گرم سانسوں کو اپنی گردن کے پاس مہکتا محسوس کرتے ہوئے وہ کئی سال پیچھے چلی گئی۔

اب اس کے سینے سے لگا وجود وشمہ کا نہیں سوہا کا تھا۔۔۔ منزہ نے اور بھی بے اختیار ہوتے ہوئے اسے زیادہ زور سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"تمہیں کیا پتا۔۔۔ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے تمہیں ننھی سی گڑیا بنا کے سارا وقت اپنی گود لیے رہوں۔۔۔ تمہاری انگلیوں کی پوریں اپنے لبوں سے لگا لگا کر ان کی نرمی محسوس کروں۔۔۔ تمہاری آنکھوں کے چمکتے جگنوؤں کے واری صدقے ہوتی رہوں۔ تمہاری آواز کا رس چوبیس گھنٹے اپنی سماعتوں میں اتارتی رہوں۔۔۔ تمہیں۔۔۔"

"ماما۔۔۔!" وشمہ کی گھٹی گھٹی سی آواز نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

اس کی وحشت نے وشمہ کو ہراساں کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔ منزہ نے چونک کر اپنی گرفت ڈھیلی کی اور ایک جھٹکے سے اسے خود سے الگ کر کے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔۔۔ جس پہ حیرت تو نظر آ رہی تھی، مگر کوئی سوال نہیں تھا۔۔۔ وہ اب تک نہ سمجھ پائی تھی۔۔۔ اتنے سالوں میں یہ اندازہ نہ کر پائی تھی کہ منزہ اس کی ذات سے محبت نہیں کرتی۔۔۔ اس کے وجود کو چاہتی ہے۔۔۔ کیونکہ وہ اپنے تصورات میں اس کے پیکر میں اپنی حقیقی بیٹی کی روح اتار کے اسے محبت دینے کی کوشش کرتی ہے۔

"بس۔۔۔ تمہارے دور جانے کے خیال سے۔۔۔ ذرا۔۔۔"

وہ پھیکے پن سے مسکرا کے وضاحت دینے لگی۔۔۔ مگر یہ کوشش اس کی پلکیں بھگو گئی۔۔۔ کیونکہ وشمہ عقیدت بھرے انداز میں اسے والہانہ تکے جا رہی تھی۔

اس کی یہ عقیدت۔۔۔ اس کی یہ محبت منزہ کو پل پل کچلتی تھی۔۔۔ اندر ہی اندر مارے جاتی تھی۔

"مت اتنی محبت کرو مجھ سے۔۔۔ کیسے رہو گی میرے بغیر۔" آنسوؤں سے بوجھل آواز کے ساتھ کہتے اس نے وشمہ کے گال تھپکے۔۔۔ وہ ایک بار پھر اس کے گلے لگ گئی۔

"ماما۔۔۔! I really love you ۔۔۔ آپ جیسی ماں شاید ہی کسی کی ہو۔۔۔ سب مائیں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہیں۔۔۔ مگر کیا کوئی اور ماں اپنی بیٹی کے دل کے اتنے اندر تک اتر سکتی ہے؟ وہ اس کی خواہش کا مان رکھنے کے لیے اتنا آگے تک سوچ سکتی ہے۔ ماما! مجھے صرف فخر ہی محسوس نہیں ہوتا۔۔۔ بلکہ کبھی کبھی تو میں یہ سوچ کر مغرور ہو جاتی ہوں کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔۔۔ آپ جیسی ماں ملی ہے مجھے۔"

منزہ نے اپنی نظریں چرا لیں اور خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگی۔

"اچھا اب باتیں مت بناؤ۔۔۔ بہت ہو گئی مکھن پالش۔۔۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔۔۔ وہ لوگ آنے ہی والے ہیں۔۔۔ اور ذرا! ایک چکر کچن کا لگا لینا۔۔۔ سب کچھ تیار ہے۔ بس ذرا پلاؤ دم پہ ہے۔ وہ دیکھ لینا اور سلاد بھی چیک کرنا۔۔۔ ٹھیک بنے ہیں؟ اگر فضل آئس کریم لے آیا ہے تو فریزر میں رکھ دینا اور نسرین سے وہ والا ڈنر سیٹ صاف کروا کے ڈائننگ ٹیبل پہ لگوا دینا جو میں نے اسٹور سے نکلوا کے کچن میں رکھوایا ہے۔ اب ذرا میں بھی تیار ہو لوں۔"

پروین، شوکت جہاں اور رخشندہ کے ساتھ آئی تھیں۔۔۔ سراج دین اور معراج دین دونوں بھائی فیکٹری سے سیدھا یہاں پہنچنے والے تھے جبکہ حسن کو پروین نے لاکھ کہا تھا ساتھ چلنے کے لیے۔۔۔ کہ وہ بڑا بھائی ہے لیکن حسن نے سخت چڑ کے صاف منع کر دیا تھا۔۔۔ پروین نے ندا کو بھی بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے ساتھ لے جانا چاہا تھا لیکن شوکت جہاں نے کچھ سوچ کر سہولت سے منع کر دیا۔۔۔ کہ کچھ دن تک وہ مایوں بیٹھنے والی ہے اور اگر یہی وجہ نظر رکھتے ہوئے اسے کالج سے بھی چھٹیاں لینے پر مجبور کیا گیا ہے تو کسی اور جگہ جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ندا نے یہ عذر سن کر اطمینان کا سانس لیا۔

سوہا سے ملنے کے بعد سب سے زیادہ زور و شور سے اس کے اور وصی کے رشتے کی مخالفت ندا نے ہی کی تھی مگر وصی سے بے پناہ لگاؤ ہونے کے باعث اندر سے اس کا دل بھی بجھا ہوا تھا۔ اسے مناسب نہ لگا کہ جس رشتے وصی کا دل نہیں مان رہا اور وہ بحالتِ مجبوری صرف اپنے بڑوں کی خاطر اس پہ سر جھکا رہا ہے' اس رشتے میں وہ اتنا جوش و خروش دکھائے۔

"ارے۔۔۔ بچوں کو ساتھ نہیں لائیں آپ؟ اور نہ بھائی صاحب نظر آ رہے ہیں؟"

منزہ کو ان تین خواتین کو دیکھ کے دھچکا سا لگا اگرچہ ٹیبل پہ رکھا نرالا کی مٹھائی کا بڑا سا رنگین ٹوکرا خاصی تسلیاں دے رہا تھا۔

"وہ دونوں بھائی فیکٹری سے سیدھا یہیں آنے والے ہیں تھوڑی دیر میں۔" شوکت جہاں نے جواب دیا۔

"اگر فیکٹری سے گھر جاتے۔۔۔ ادھر پھر یہاں آتے مل کر۔۔۔ تو بہت وقت لگ جاتا۔"

"اور بچیاں؟" اب منزہ رخشندہ سے مخاطب تھی۔ پروین کا روکھا پھیکا رویہ اس نے محسوس کر لیا تھا۔ لیکن اس رویے کو وہ دل سے لگانے کے موڈ میں نہیں تھی۔۔۔ اسے ذرہ برابر لفٹ نہ کرانے کا سوچتے ہوئے ہی اس نے سراسر پروین کو نظرانداز کرتے ہوئے یہ سوال رخشندہ سے کیا تھا۔

"ردا ابھی ابھی کالج سے تھکی ہوئی آئی ہے۔۔۔ ہما کا تو سب کو پتہ ہے زیادہ تر گھر کے کاموں میں الجھی رہتی ہے۔ ویسے بھی اسے کہیں آنے جانے کا خاص شوق بھی نہیں اور ندا۔۔۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئیں۔ پروین نے گھبرا کے جٹھانی کو دیکھا کہ کہیں روانی میں وہ یہ نہ اگل دیں کہ ندا وصی کا دل رکھنے کی خاطر ساتھ نہیں آئی۔

"وہ تو پرسوں مایوں بیٹھ رہی ہے۔ ایسے میں مناسب نہیں لگتا اسے ساتھ لانا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔۔۔ اب یہ روایتیں ہمارے اور آپ کے جیسے خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔"

پروین نے ٹرالی اندر لاتی وشمہ کو دیکھا تو بے اختیار زیرِ لب ماشاء اللہ کہہ کے رہ گئی۔۔۔ دل میں دبی دبی سی خفگی اپنی جگہ۔۔۔ لیکن اس وقت تو اس کے گلابی چہرے سے نظر نہیں ہٹائی جا رہی تھی۔

وشمہ سب کو جوس سرو کرنے کے بعد منزہ کے برابر جڑ کے بیٹھ گئی۔ پروین کے لبوں پہ اسے دیکھ کے آ جانے والی مدھم مسکراہٹ ایک دم توڑ گئی۔

"چلو بھئی پروین۔ ! بسم اللہ کرو۔۔۔ تمہیں وصی کے سارے حق سونپے ہیں' اس لیے دست سوال بھی تم دراز کرو۔"

شوکت جہاں نے پروین کو عندیہ دیا تو منزہ کے ہونٹوں پہ ایک جی کلسانے والی فخریہ مسکراہٹ آ گئی۔

"سب معاملات تو طے ہی ہیں۔۔۔ میں نے تو ایک رسمی سی کارروائی ادا کرنا ہے۔"

پروین نے بھی بدلہ چکانے کی نیت سے یہ بات کہی جس کے سیاق و سباق سے صرف منزہ واقف تھی' اس لیے دوسری دونوں عورتوں پہ اس کا خاص اثر نہ ہوا۔

جس پہ ہونا تھا۔۔۔ ہو چکا۔۔۔

اب صرف ردِعمل آنا باقی تھا۔

"یہ تو صحیح کہا۔۔۔ غنیمت ہے کہ رسمی کارروائی بھی ہو رہی ہے۔" اس کے جُھنجھلے لہجے میں جو دھمکی تھی۔ اس سے پروین کو تو جو تاؤ آیا۔۔۔ سو آیا۔۔۔ شوکت جہاں بھی چونک گئیں۔

منزہ نے اس بات کو مسکراہٹ اور لہجے کی شیرینی میں لپیٹ کر اس کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

"میرا مطلب ہے۔۔۔ اتنے قریبی رشتے داروں میں یہ ضابطے کی کارروائیاں بس نہ ہونے کے برابر ہونی چاہئیں۔ میری بیٹی پروین کی بھی تو بیٹی ہے۔"

شوکت جہاں طمانیت سے مسکرا دیں۔۔۔ صرف پروین تھیں جو اس کی زہر میں بجھی باتوں کے مطلب سمجھ رہی تھیں۔

"ویسے بھی مثل مشہور ہے پھوپھی' بھتیجی کی ایک ذات۔۔۔ مائیں بے شک پیار کریں۔۔۔ لیکن پھوپھوں کا پرتو ہوتی ہیں بھتیجیاں۔"

کھلم کھلا پروین پہ حملہ تھا۔۔۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں پروین کو نشانہ بنا رہی تھی۔۔۔ یہ باور کرا رہی تھی کہ وشمہ کی تربیت کرنے میں اس سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔۔۔ بلکہ اگر وہ کوئی نادانیاں کر رہی ہے تو یہ اس کے اس خون کا اثر ہے' جو پروین کی رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے۔

وہ منزہ سے کچھ اور بھی کبیدہ نظر آنے لگیں۔۔۔ وشمہ کے لیے بھی وہ التفات دکھانا خاصا مشکل امر لگ رہا تھا' جس کی وہ عادی تھی۔۔۔ یہ بات رخشندہ اور شوکت جہاں نے شاید اتنی محسوس نہ کی البتہ وشمہ کو بری طرح کھلی۔۔۔ ویسے بھی منزہ نے زور دے دے کر کہہ رکھا تھا کہ پروین آخری وقت تک وشمہ کے لیے دل سے راضی نہیں تھیں۔ اور اب انجانے میں وہ اپنے رویے سے یہ ثابت بھی کر رہی تھیں۔

پہلے وشمہ نے اس بات پہ دل برا کیا۔۔۔ بعد میں نوید مراد نے بھی بہن کا لیا دیا انداز دیکھ کے کچھ ناگواری محسوس کی۔۔۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بحالتِ مجبوری یہاں آئی ہوں۔

سراج دین اور معراج دین بھی آ گئے۔۔۔ رسمی باتوں کے دوران باضابطہ طور پر وشمہ کا ہاتھ وصی کے لیے مانگ لیا گیا۔ اور شگن کے طور پہ وشمہ کے ہاتھ پہ شوکت جہاں نے پچاس ہزار کی رقم اور سرخ جوڑا بھی رکھ دیا۔۔۔ لیکن پروین کی سرد مہری نے نوید مراد کے دل پہ بوجھ سا لا دیا تھا۔ وہ اس اہم فرض کی سبکدوشی کے احساس سے ہلکا پھلکا نہ ہو سکے۔

پروین کے اپنے جذبات و احساسات تھے۔۔۔ وشمہ سے فطری محبت اپنی جگہ' لیکن جس طرح اس کی کمزوری کو ہاتھ میں لے کر منزہ نے ان پہ دباؤ ڈالا تھا' اس وجہ سے ان کے دل میں وشمہ کے لیے گلہ سا پیدا ہو گیا تھا۔۔۔ کبھی دل چاہتا اپنا پھوپھی ہونے کا استحقاق استعمال کرتے ہوئے اسے سخت الفاظ میں ڈانٹیں۔۔۔ اسے بتائیں کہ کچی عمر کا تقاضا ہے خواب دیکھنا۔۔۔ مگر ان خوابوں کا رازدار کسی ایسی ہستی کو نہیں بنانا چاہیے جو ان کے اشتہار زمانے بھر میں لگاتا پھرے۔

وہ اسے ایک ماں بن کے بتانا چاہتی تھیں۔۔۔ کہ ممتا وہ نہیں جو بچے کے ایک اشارے پہ اسے ہر چیز لا دینے کا عندیہ کر لے۔۔۔ ممتا سیری کا احساس دلاتی ہے۔۔۔ ممتا آن سے سر اٹھا کے جینا سکھاتی ہے۔ لیکن وہ جانتی تھیں کہ وہ اس وقت پوری طرح منزہ کے زیرِ اثر ہے اور وصی کے معاملے میں منزہ نے ناجائز طور سے اس کا ساتھ دے کر اسے گویا زر خرید کر لیا ہے۔۔۔ اس وقت وہ جس جذباتی کیفیت سے گزر رہی ہے' اس میں پروین کی نصیحتیں اسے مزید برگشتہ کر سکتی ہیں۔۔۔ اس لیے انہوں نے مصلحتاً "لب سیے رکھے۔۔۔ مگر چونکہ کوئی بہت کامیاب اداکارہ نہیں تھیں۔ اس لیے دل کے جذبات پوری طرح چھپانے میں ناکام رہیں۔

✡ ✡ ✡

نوید مراد کے دل میں چھپے ہلکے گلے کو بعد میں منزہ نے خوب ہوا دی۔

"آپ نے نوٹ کیا پروین کا اکھڑا اکھڑا رویہ؟"

نوید سر جھکا کے رہ گئے۔

"خیر۔۔۔ ہمیں کیا۔۔۔ اماں جان نے اتنی محبت اور اپنائیت جتائی ہے۔۔۔ ایسے میں پروین کا رویہ کیا معنی رکھتا ہے۔ ہاں پھر بھی ملال تو ہوتا ہے۔۔۔ کہ سگی پھوپھی ہوتے ہوئے بھی ان کے دل میں وشمہ کے لیے ذرا بھی ہمدردی یا محبت نہیں۔"

"اب تو مجھے لگ رہا ہے شاید میں نے وشمہ کے معاملے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔"

بیٹی کا معاملہ تھا۔۔۔ اس لیے نوید مراد زندگی میں پہلی بار پروین سے مکمل طور پر بے زار ہو کر سوچ رہا تھا ورنہ اس سے

پہلے ہر بار رشتوں کا بھرم رکھتے ہوئے اس نے بہن کو خاص رعایت دی تھی۔

"پروین کے کھنچے کھنچے رویے کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔۔۔ لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے اب اپنی بیٹی کو وہاں بھیجتے ہوئے۔ مجھے وشمہ اتنی بھاری تو نہیں ہے کہ میں کسی کے گلے میں اسے ان چاہے طوق کی مانند ڈال دوں۔"

"کیسا ان چاہا طوق؟ وصی بہت سمجھ دار لڑکا ہے۔ وہ ہماری وشمہ کو پلکوں پہ بٹھائے گا اور اتنی چاہت سے طلب کرنے والی نانی بھی بے قدری نہیں کریں گی۔ آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ پروین وصی کی ماں نہیں ہیں۔ آپ صرف اپنی بیٹی کی خوشی کو مدِ نظر رکھیں۔ اور بس۔۔۔"

حسن کی شادی ہما سے ندا کے ولیمہ کے روز ہونا قرار پائی تھی۔ اور اس کے تین ماہ بعد ہی وصی کی اور وشمہ کی شادی طے کردی گئی تھی تاکہ تب تک وشمہ اپنے امتحانات سے فارغ ہوجائے۔ شادی کی بھرپور تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔

منزہ بے حد جوش و خروش سے کھل کے اس کے لیے شاپنگ کر رہی تھی۔ نوید مراد نے کسی قسم کی کسر نہ رہنے دی تھی خرچ میں اعلا سے اعلا فرنیچر۔ نفیس اور بیش قیمت زیورات' عمدہ ملبوسات' الیکٹرانکس کا جدید سامان۔ وقت کم تھا اور منزہ اپنے گذشتہ کئی سالوں کی محنت اس ایک شادی کے ذریعے ثابت کرنا چاہتی تھی کہ سوتیلی مائیں ضروری نہیں سب کی سب ایک سی ہوں۔ دن بھر بازاروں کی خاک چھاننے' جیولرز کے پاس چکر لگانے بوتیکوں پہ دماغ کھپانے کے بعد جب وہ رات کو نڈھال ہو کر تکیے پہ سر رکھتی تو دماغ گھومنے لگتا اور اس چک پھیریاں لیتے دماغ کے سامنے ایک ہی چہرہ گردش کرنے لگتا۔

سوہا کا۔۔۔

"پتا نہیں کبھی میں اس کا جہیز بھی اکٹھا کرپاؤں گی یا نہیں۔ کبھی اسے رخصت کرنے کی حسرت بھی پوری ہوگی یا نہیں؟ کبھی اس کا گھر بھی بستے دیکھوں گی یا نہیں؟"

اور جب ان سوالوں کے جواب میں صرف ایک سناٹا گونج کے رہ جاتا' تب اس کا دل چاہتا وحشت کے عالم میں وشمہ کے ارمانوں سے خریدے جہیز کی ایک ایک چیز تہس نہس کرکے رکھ دے۔

✡ ✡ ✡

"میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ میرا بھی دل دکھتا ہے ایسی بیٹی سے کوئی سخت بات کہتے ہوئے جو اس گھر میں صرف دو دن کی مہمان ہو لیکن میں کیا کروں تقدیس! مجھے وحشت ہوتی ہے اسے اس حال میں دیکھ کے۔۔۔ پہلے میں نے سوچا نیا نیا حادثہ ہے۔ بھلانے میں وقت لگے گا۔ مگر کتنا وقت؟ وہ تم دونوں سے بڑی ہے' اپنی تعلیم مکمل کرچکی ہے۔ کیا میں اسے پانچ چھ سال دینے کی پوزیشن میں ہوں پانچ چھ سال؟ صرف ایک دھوکے باز شخص کی تکلیف دہ یادیں بھلانے کے لیے؟ یہ بہت زیادہ عرصہ ہوتا ہے تقدیس! ویسے بھی کسی دور سے نکل کر دوسرے دور میں جانے سے اس دور سے وابستہ اچھی بری یادیں خود بخود دماغ سے نکل جاتی ہیں۔ اس کی حالت میں بہتری لانے کا واحد اور فوری حل اس کی شادی ہے مگر وہ یہ بات تسلیم کرنے پہ تیار ہی نہیں۔ خود کو اس سوگ کی کیفیت سے نکال ہی نہیں رہی۔"

مدیحہ نے اکیلے میں تقدیس کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔ وہ سارے وسوسے' وہ سارے اندیشے جو انہیں ڈس رہے تھے' سب بتلا دیے۔

تقدیس کسی ایک بات کو بھی جھٹلا نہ سکی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما! لیکن آپی۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کا رویہ ذرا بلکہ خاصا ترش ہوجاتا ہے جس سے انہیں اپنے آپ سے اور بے زاری ہونے لگتی ہے۔ پہلے تو آپ یہ گمان دل سے نکال دیں کہ وہ اپنی ناکام محبت کا سوگ منا رہی ہیں۔ وہ تو اپنی اس نادانی پہ شرمندہ ہیں' یہ تاسف ان کے دل سے جا نہیں رہا کہ اچھی بھلی سمجھ بوجھ رکھتے ہوئے وہ اس کے چنگل میں کیسے پھنسیں۔ وہ خود کو مجرم محسوس کرتی ہیں۔ آپ کو دکھ پہنچانے کا قصوروار

سمجھتی ہیں اور ایسے میں آپ کی باتیں۔۔۔ یہ انہیں ندامت کے دریا میں اور بھی غرق کردیتی ہیں۔"

"تو اب بتاؤ' اس مسئلے کا کیا حل ہو؟" مدیحہ نے بے چارگی سے کہا۔

"دو دن بعد اس کی شادی ہے۔ ایسے تو مجھے چین نہیں آئے گا۔ تم نہیں جانتیں مرد کی خصلت۔۔۔ تحریم کی حالت پکار پکار کے کہتی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا ہے اور نادانی میں' کم عمری میں بہت سے لوگ اس جذباتی غلطی سے گزرتے ہیں لیکن مرد جب شوہر بن جاتا ہے تو وہ ہر غلطی کو صرف گناہ قرار دیتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان شروع کے دنوں میں جب میاں بیوی کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ اور محبت کو پروان چڑھنا چاہیے' شک کا ناگ اس کے دل میں اندیشے پروان چڑھا دے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا ماما۔ ان شاء اللہ۔"

"اللہ کرے مگر تحریم کو اب خود کو سنبھالنا ہوگا۔ جب خود ہی ہوش میں نہیں تو وہ کیا خاک شوہر کو قابو کرے گی۔" "قابو؟" تقدیس نے تحیر سے دہرایا۔

"ہاں تو اور کیا؟ یہ رشتہ صرف پیار محبت اور انڈر اسٹینڈنگ کے بل بوتے پر نہیں چلتا۔ یہ عناصر بھی ضروری ہیں مگر سب سے اہم چیز ہے قابو پانا اور جس کے ہاتھ میں دوسرے کی کمزوری آجائے وہ دوسرے پہ قابو پالیتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تحریم کی کمزوری اس کے شوہر کے ہاتھ میں نہ آجائے۔"

تقدیس گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ وہ اب تھک کے ہار ماننے کے قریب تھی۔ کتنے دنوں سے کوشش کر رہی تھی کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہی بات کی نزاکت کو سمجھ لے لیکن نہ تحریم اپنی روش سے ہٹنے پہ تیار تھی نہ مدیحہ اپنے وسوسے جھٹک دینے پہ آمادہ نظر آتی تھیں۔

"ماما۔۔۔ یہ کارڈ دیکھا آپ نے؟"

تطہیر ہاتھ میں ایک انویٹیشن کارڈ لیے آئی۔ "کس کا ہے؟"

"پاپا کے کسی دوست کے ہاں سے آیا ہے۔ ان کے بیٹے کی شادی کا۔۔۔ آپی کی مہندی کے روز ہے یہ شادی۔"

"مشکل ہوگا جانا۔ مگر۔۔۔ خیر کسی طرح آدھے گھنٹے کے لیے ہو آئیں گے۔"

"لیکن ماما! اپنے گھر میں فنکشن ہو تو ہم کیسے جاسکتے ہیں' اور کون سا کسی قریبی عزیز کی شادی ہے جو جانا ضروری ہے۔"

"قریبی نہ سہی۔ مگر تمہارے پاپا کے دوست ہیں اور انہوں نے خاصی تاکید کی تھی وہاں جانے کے لیے۔"

"اوہو۔۔۔ آپ نے کب سے پاپا کی تاکیدوں پہ اتنا عمل کرنا شروع کردیا۔"

تطہیر نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔ مگر مدیحہ پہ اس شرارت کا خاص اثر نہ ہوا' وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔

"میں کسی کی تاکید پہ عمل نہیں کر رہی۔ میں بیٹیوں کی ماں ہونے کا فرض نبھا رہی ہوں۔ اب مجھے وہ غلطی نہیں دہرانی جو تحریم کے معاملے میں ہوئی۔ پرانے لوگ ٹھیک کہا کرتے تھے کہ جوان لڑکی گھر پہ رکھا اناج ہوتا ہے۔ زیادہ دن رکھ لو تو گھن لگنے لگتا ہے۔"

"پلیز پاپا!" تطہیر نے برا سا منہ بنا کے احتجاج کیا۔

"اب میں تم دونوں کا بندوبست جلد از جلد کرنا چاہتی ہوں۔ اللہ کے فضل سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو شادی کے وقت تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہیں۔ عرصے سے تیاریاں کر رہی ہوں۔ اچھے رشتے ہوں تو ایک ہی رات میں رخصت کرنے کی پوزیشن میں ہیں ہم' یہ یاد رکھنا۔ بعد میں مت کہنا کہ ذکر نہیں کیا۔ مجھے کسی قسم کی کوئی چیں چپڑ نہیں چاہیے۔ اس فنکشن میں بھی اس لیے جانا چاہ رہی ہوں کہ اچھے لوگ ہیں۔ خاندانی اور کھاتے پیتے۔ ایسے ہی نظروں میں آؤ گی تم دونوں۔"

تطہیر اور تقدیس ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئیں۔

"ماما! پتا نہیں کیا بات ہے۔ دو دن سے وصی کا نمبر آف مل رہا ہے۔"

سوہا نے بے حد پریشانی کے عالم میں رینا سے کہا تو اس کا دل سوہا کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کے کٹ سا گیا۔

"ہو جاتا ہے۔۔۔ یہاں سے پاکستان کال مشکل سے ہی ملتی ہے۔"

"پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"اوہو۔ تم کیا فکریں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں ڈیر۔۔۔"

رینا نے بمشکل اس کا دھیان ہٹایا مگر اندر سے وہ بھی قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ وصی سے رابطہ نہ ہونے کا مطلب تھا اس کے وہ بدترین اندیشے سچ ثابت ہونے جا رہے تھے۔ واپسی پہ اس کی بیٹی کو وہ جھٹکا ملنے والا ہے جو آج سے کئی سال پہلے اس کے مقدر نے اسے دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کتنی پیاری لگ رہی ہیں آپی!"

تطہیر نے اس کا میرون بھاری کام والا گھونگھٹ اٹھا کے گویا مسحور ہوتے ہوئے کہا۔

ہمیشہ سادہ رہنے والی تحریم واقعی اس عروسی بناؤ سنگھار کے ساتھ غضب ڈھا رہی تھی۔ اور اس کے چہرے پہ چھائی سوگواری اس حسن کو عجیب سی پراسراریت بخش رہی تھی۔

"اب میری ساری باتیں یاد رکھنا۔۔۔"

ہر دو منٹ بعد مدیحہ گھبرائے ہوئے انداز میں اندر قدم رکھتیں اور تحریم کوفت بھرے لہجے میں تاکید کرتی۔ وہ بہت نروس نظر آ رہی تھیں۔ تقدیس کو ماں کی اس حالت پہ ترس سا آنے لگا۔

"ہیلو۔" اب وہ جاتے جاتے رک کر فون سن رہی تھیں۔

"جی مسز نیاز۔ بالکل پہچانا۔ اتنی جلدی کیسے بھول سکتے ہیں، ابھی کل تو ملے تھے آپ کے بیٹے کی شادی میں اور آپ آ رہی ہیں ناں ہماری بیٹی کو رخصت کرنے۔"

دوسری جانب جعفر کے اس دوست کی بیوی نے نجانے کیا کہا کہ مدیحہ کے چہرے پہ حیرت کے رنگ پھیل گئے۔

"جی۔۔۔؟"

☆ ☆ ☆
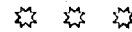
ندا گولڈن شرارے میں اور اس کے برابر ظلِّ ہما سرخ اور رائل بلیو کنٹراسٹ والے لہنگے میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ہما اور حسن کا نکاح ابھی ابھی پڑھایا گیا تھا۔

"مبارک ہو رخشندہ! دو دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو رہی ہو۔"

رشتے کی ایک بھابھی نے انہیں گلے لگا کر مبارک باد دی۔

"بس اللہ کا کرم ہے۔ اس کے ہاں کیا مشکل ہے۔ جو کام مجھے پہاڑ سا بھاری لگا کرتا تھا۔ میرے مولا نے کیسے سبک انداز میں مجھے۔۔۔"

وہ آبدیدہ ہو گئیں اللہ کے حضور شکرانہ پیش کرنے کو الفاظ نہ ملے۔

"تمہارا گھر تو خالی خالی سا ہو جائے گا۔ رونق تو بیٹیوں کے دم سے ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ بیٹی پیدا ہوتے ہی ہم اس وقت کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔ جب اس کو باعزت رخصت کر سکیں اور جب رخصت کرنے کا وقت آتا ہے تو دل اور آنگن دونوں کے خالی ہو جانے کا احساس مارنے لگتا ہے۔"

"مجھ سے پوچھو۔ اس درد کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے؟ اوپر تلے کی پانچ بیٹیوں نے ہوش اڑا رکھے تھے مگر ماشاءاللہ ساری شکل صورت کی پیاری۔ سیرت اور عادتوں میں بے مثال۔ پڑھنے لکھنے میں ہوشیار۔ گھرداری میں طاق۔ ایک کے بعد ایک کا رشتہ آگیا اور ساری کی ساری چڑیوں کی طرح اڑ گئیں۔ چڑیاں ہی تو تھیں۔ سونے

آنگن میں اپنی چہکار کی گونج چھوڑ گئیں بس۔ اور کیسی میری راتوں کی نیند اڑی رہتی تھی ان کی وجہ سے۔ کہتی تھی سب اپنے گھر کی ہوں گی تو چین کی نیند سوؤں گی۔ اب میں ہوں اور اکیلی راتیں۔ ساری ساری رات کروٹ لینے میں گزر جاتی ہے۔ پلک سے پلک نہیں جڑتی۔ بیٹی دم ساز ہوتی ہے ہم راز ہوتی ہے غم گسار ہوتی ہے اور تم تو خوش نصیب ہو رخشندہ! بیٹی کی رحمت کے ساتھ ساتھ تمہارے پاس بیٹے کی نعمت بھی موجود ہے۔ تین بیٹیاں جائیں گی تو ایک بیٹی آئے گی۔"

"صحیح کہا بھابھی آپ نے۔"

"پھر کب کر رہی ہو خرم کی شادی؟"

"ان شاءاللہ جلدی۔ اس سال کے آخر تک اس کا پاکستان آنے کا ارادہ ہے۔"

"تو ڈھونڈ رکھو کوئی لڑکی۔"

"ہاں ایک پہ نظر ٹھہری تو ہے۔ بس ذرا شادی سے فارغ ہو جاؤں تو کرتی ہوں کچھ۔"

☆ ☆ ☆

ظلِّ ہما رخصت ہو کر اوپر سے نیچے آگئی۔

دیکھنے کو بس یہ اتنی سی تبدیلی آئی تھی ان کی زندگی میں۔۔۔ مگر یہ تو صرف وہ اور حسن جانتے تھے کہ تبدیلی کہاں کہاں آچکی ہے۔

دل۔۔۔ ذہن۔۔۔ سوچ۔۔۔ حالات۔۔۔ جذبات سب بدلے ہیں۔ جو نہیں بدلے انہیں بدلنا پڑا چاہے من مار کے۔

حسن نے سوچا تھا، اپنے اندر کی ساری کھولن اس ذات پہ الٹ دے گا جس نے اس کے اور دشمہ کی درمیان آنے کی جرأت کی۔ نہ وہ ہوتی نہ اس کی محبت میں پروین حسن کو پیش کرتی۔ اس نے نجانے کیسے نوکیلے فقرے چن رکھے تھے اس کے پندار کو زخمی کرنے کے لیے۔

"تم میرے کمرے میں آچکی ہو، میری زندگی میں شامل نہیں ہوئیں۔"

"تمہارے نام کے آگے میرا نام لگا ہے مگر میں تم سے اتنا ہی الگ رہوں گا جتنا پہلے تھا۔"

"تم کبھی میرے لیے اہم تھیں نہ ہو نہ کبھی ہو سکو گی۔"

لیکن کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی اس کی زبان گنگ ہو گئی۔

ریشمی جھلملاتے عروسی لباس میں گٹھڑی بنا وہ وجود ایک جیتا جاگتا وجود تھا۔

ایک ایسا وجود جو اس کا من چاہا بے شک نہیں تھا مگر انجان اور بیگانہ بھی نہیں تھا۔ وہ اسے اس کے بچپن سے جانتا تھا۔ اور اس کی معصومیت، پاکیزگی اور صاف دلی کا قائل بھی تھا۔ ایسی لڑکی جو شروع سے ایک بے ضرر سا امیج رکھتی ہو۔ اسے ایسے دل جلے الفاظ کہنے کی حسن کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ یہ سادہ معصوم دل توڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔

اگرچہ وہ خود کو اس سے محبت کرنے پہ مجبور نہیں کر سکتا تھا لیکن خود کو اس سے نفرت کرنے پہ مجبور کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ اس نے سست قدموں سے اس کی جانب آتے آتے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"یعنی مجھے اب ایک ایسا رشتہ جینا ہو گا جس میں نہ محبت سانس لیتی ہے نہ نفرت رگوں میں دوڑتی ہے۔ مصلحت کا آکسیجن ماسک لگا کر زبردستی کا تنفس بحال رکھنا ہے۔"

اس نے بے دلی سے ہما کا گھونگھٹ اٹھایا۔

مگر وہاں الوہی حسن کی دمک اس کی بے دلی کا سدِباب کرنے کو بے چین تھی۔

☆ ☆ ☆

اور اکیلے کمرے میں بیڈ پہ سر جھکا کے گھونگھٹ گرائے بیٹھی ہما نے سوچا تھا۔

"میں وصی کو بھلادوں گی۔ آنکھیں ہوتے ہوئے اندھی اور سماعتیں رکھتے ہوئے بہری بن جاؤں گی۔ وہ سامنے آئے گا بھی تو ان دیکھا کردوں گی۔ کچھ کہے گا تو ان سنا کردوں گی۔ مجھے اب اس رشتے کو نبھانا ہے‘ سچے دل سے نبھانا ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر ناظر جان کے قائم ہوا ہے۔ میں حسن سے محبت نہیں کرتی‘ لیکن کیا ہوا۔ نفرت بھی تو نہیں کرتی اور جس سے نفرت نہ ہو اس سے محبت کرنے کے امکان پیدا ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ محبت صرف ہوتی نہیں ہے۔ کبھی کبھی کی بھی جاتی ہے۔ اور اسے منافقت نہیں کہتے۔ ایک پاک رشتے کی حرمت کہتے ہیں۔ جس اللہ نے میرا حسن سے رشتہ بنایا ہے‘ وہ میرے دل میں حسن کے لیے محبت بھی پیدا کرے گا۔"

☆ ☆ ☆

"امی! میری خالہ ساس بتارہی تھیں‘ آپ شادی والے دن ان سے کسی لڑکی کے بارے میں معلومات لے رہی تھیں؟"

ندا شادی کے بعد پہلی دعوت میں میکے آئی تو رخشندہ سے پوچھا۔ مگر رخشندہ کے جواب دینے سے پہلے ردا بول اٹھی۔

"امی کو اتنا ہوش کہاں؟ انہیں تو صرف ہم تینوں ہی نظر آتے ہیں۔ ایک مہینے کے اندر اندر دو بیاہ دیں۔ تیسری کی منگنی کردی۔ یہ بھول گئی تھیں کہ ایک بیٹے کی ماں بھی ہیں۔"

"اللہ خیر کرے۔ بھولنے کیوں لگی۔" وہ برا مان گئیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ان کے بھی کچھ حقوق ہیں بھئی۔ کیوں آپی!" ردا نے شریر سا اشارہ کیا‘ ندا ہنس دی۔

"میں نے ہی امی کو دکھائی تھی وہ لڑکی۔ بڑی سلجھی ہوئی گریس فل۔ سمجھ دار اور کیوٹ سی بھی۔"

"کون تھی؟" ندا تفصیلات جاننے کے لیے بے چین ہوئی۔

"تمہارے سسرالی عزیزوں میں سے تھی؟"

"نہیں قریبی عزیز کہاں؟ کوئی ملنے جلنے والے تھے۔ تم دیکھنا مووی میں۔ بلیک ڈریس میں تھی۔ ریڈ ایمبرائیڈری والا۔۔۔ کھلے لمبے بال۔۔۔ لائٹ سا میک اپ۔۔۔ لمبا قد گورا رنگ۔۔۔ کھڑے نین نقش۔۔۔"

ردا نے پورا حلیہ بتادیا۔

"اور بھلا سا نام تھا۔ کیا ہاں؟" رخشندہ نے ذہن پہ زور دیا۔

"ہاں یاد آیا تقدیس۔"

☆ ☆ ☆

آج منزہ نے حسن اور ہما کی دعوت رکھی تھی۔ آخر اب دوہری رشتے داری تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے کچھ سوچ کر ندا اور اس کے شوہر کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا۔

وشمہ کو جتنا پُرجوش ہونا چاہیے تھا‘ اتنی وہ نہیں تھی۔ پروین کے رویے نے اسے سہما کر رکھ دیا تھا۔ شادی کے موقع پہ وہ باقاعدہ اس پہ کڑا پہرہ رکھے ہوئے تھیں۔ اس نے جتنے شوق سے ساری تیاریاں کی تھیں۔ اتنی ہی وہ بے مزہ سی ہوگئی‘ جہاں جہاں وصی کی موجودگی کے امکان ہوتے‘ پروین نامحسوس طریقے سے وشمہ کی چوکیداری پہ چوکس ہوجاتیں۔ اول تو دونوں کا سامنا ہونے کا موقع ہی نہ آنے دیا۔ کبھی دور سے بھی اس پہ نظر پڑجاتی تو پروین کے گھورنے پہ خجل ہوکر چور سی بن جاتی۔

مہندی والی رات ہی کتنے خشک لہجے میں پروین نے اس سے کہا تھا۔

"اتنا میک اپ؟ دیکھو ہما اور ندا کتنی جچ رہی ہیں‘ صرف اس لیے کہ ہمیشہ سادگی سے رہیں۔ تم ابھی سے بیاہتا عورتوں کے برابر بناؤ سنگھار کروگی تو شادی پہ کیا روپ آئے گا۔ آئی شیڈو صاف کرو۔ اور دوپٹہ پھیلا کر لو۔ تمہاری قمیص تو ضرورت سے زیادہ فٹنگ والی ہے‘ منزہ کچھ سمجھاتی نہیں تمہیں؟"

تو ابھی سے ساس بن گئیں۔ خیر پھوپھی تو کبھی بنی ہی نہیں تھیں۔"

مسوس کر رہ گئی۔ اور باقی کے فنکشن بے دلی سے اٹینڈ کیے۔ منگنی کے بعد پہلا واسطہ پڑنا تھا وصی سے۔ لیے نجانے کیا کیا سوچ رکھا تھا لیکن۔۔۔۔

وصی کا انداز بھی بہت لیا دیا سا تھا۔

نے اس پہ کوئی پُرشوق نظر نہیں ڈالی۔

بھی شوخ فقرہ نہیں اچھالا۔

انداز سے ثابت نہیں کیا کہ وہ اپنے اور اس کے اس نئے رشتے کے حوالے سے خوش ہے۔ یا پھر ناخوش۔ نارمل رویہ تھا اس کا ویسا۔ جیسے پہلے ہوتا تھا۔ اور وشمہ کو حیرت تو اس پہ تھی کہ اس بار منزہ نے بھی کسی میں دخل نہیں دیا تھا۔ پروین اس کے ساتھ بڑے استحقاق سے درشت لہجے میں پیش آتی رہیں اور منزہ رہی جیسے اسے اس بات سے فرق نہ پڑتا ہو۔ اس بات کا بھی رنج تھا وشمہ کو۔ اور اسے پکا یقین تھا کہ اس میں بھی وصی کو آنے نہیں دیا جائے گا‘ اس لیے اس نے کسی قسم کی سرگرمی نہیں دکھائی۔ نفس سے میں بیٹھی رہی۔

تو بیٹا! تیار ہوجاؤ۔ وہ لوگ آنے والے ہوں گے۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ اسی طرح روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

دل چاہے نہ چاہے۔ تیار تو ہونا ہی پڑے گا۔ وہ اب صرف تمہاری پھوپھو کا گھر نہیں‘ ہونے والا سسرال ہے۔"

صرف ہونے والا سسرال کہیے۔ پھوپھو تو ایک دم بدل گئی ہیں۔" وہ پھٹ پڑی۔

منزہ پُراسرار طریقے سے مسکرائی۔

اچھا۔ مجھے تو نہیں لگتا۔ وہ تو شروع سے ایسی ہی ہیں۔ روکھی پھیکی‘ سرد مزاج‘ پُرتکلف۔"

اور وہ مجھے آپ کے سامنے ڈانٹتی ہیں۔ میری عادتوں‘ میرے لباس تک پہ تنقید کرتی ہیں‘ آپ چپکے سے سنتی ہیں کیوں؟"

"کیونکہ اب مجھ سے زیادہ حق ان کا ہے تم پہ۔"

ایسے ہی۔" وہ ہاتھ ہلا کے بولی "آپ سے زیادہ حق کسی دوسرے کا کیسے ہوسکتا ہے؟"

ہوتا ہے میری جان! بیٹی تو پرائی امانت ہے۔ اس پہ ماں یا باپ کا کیسا حق؟ جب وہ تمہاری پھوپھی تھیں بہال تھی۔ اب وہ ایک نئے رشتے سے سامنے آئی ہیں۔ میں کچھ کہہ کر تمہارے لیے مشکلات نہیں کرنا چاہتی۔ اتنا تو تم نے بھی بھانپ لیا ہوگا کہ وہ دل سے اس رشتے پہ تیار نہیں۔ اس لیے بہانے بہانے سے جتاتی رہی ہیں‘ ایسے میں تمہارا یا میرا کچھ کہنا انہیں یہ رشتہ توڑنے کا بہانہ فراہم کردے گا۔ صبر سے کام لینا اب تمہارا ہے‘ میاں بیوی کے رشتے میں ایسی معمولی باتیں اثر انداز نہیں ہوتیں۔ ہاں منگنی بہت نازک رشتہ ہے۔ تم میرا مطلب سمجھیں؟"

وشمہ نے سر ہلا دیا۔ وہ بخوبی سمجھ گئی تھی کہ منزہ اسے کیا باور کرانا چاہتی ہے۔ یعنی منگنی کا دورانیہ اسے اور منزہ کو اور مصلحت کے ساتھ صبر سے گزارنا ہوگا۔ ہاں شادی کے بعد نہ صرف وہ پروین کو ہینڈل کرسکتی ہے بلکہ معاملے میں اسے منزہ کی بھی بھرپور سپورٹ حاصل ہوگی۔

☆ ☆ ☆

آپ کا رویہ وشمہ کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔"

سے آنے کے بعد حسن مسلسل پروین سے الجھ رہا تھا۔ پہلے تو وہ وہاں جانے پہ تیار نہیں تھا۔ اب جب کوشش کر رہا تھا تو وشمہ سے سامنا اسے دوبارہ اسی مقام پہ لاسکتا تھا لیکن نہ جانے کا کوئی معقول بہانہ بھی

نہیں تھا۔ اس لیے جانا پڑا۔

پروین کے ساتھ وہ پہلے بھی وہاں جاتا رہا تھا اور پروین کا وشمہ کے لیے والہانہ پن ہی دیکھا تھا اس نے۔ لیکن اس بار پروین کو اس سے کھنچا کھنچا محسوس کرکے حیرت لازمی تھی۔ پہلے ہی وہ اپنی جگہ چور سا بنا ہوا تھا وشمہ کی پژمردگی دیکھ کر۔ وہ وصی کے نہ آنے سے اَپ سیٹ اور بجھی بجھی سی تھی۔ لیکن حسن نے یہ محسوس کیا جیسے اس سے اپنی ناراضی جتا رہی ہو۔

"آپ نے خود اپنی مرضی سے کی ہے وصی کی منگنی اس سے۔ اور اب ایسے ظاہر کر رہی ہیں جیسے وصی نے آپ کو مجبور کیا ہو۔ کسی اَن چاہی بہو والا سلوک کر رہی ہیں آپ اس سے۔"

"ہونہہ۔ اپنی مرضی۔" پروین بڑبڑا کے رہ گئیں۔ مجبور تو وہ کی گئی تھیں اس رشتے کے لیے۔ ایسا نہیں تھا کہ وشمہ کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھنے سے انہیں کوئی تکلیف تھی لیکن یہ بات ان کے اختیار سے باہر تھی۔ اور انہیں مجبور اور بے بس دیکھ کر منزہ نے جس طرح وشمہ کی پسندیدگی ان پر جتائی تھی اور یہ بھی خبردار کیا تھا کہ وہ اس پسندیدگی میں بہت آگے تک جا چکی ہے۔ تو اس صورتِ حال میں پروین جس کرب سے گزری تھیں اس سے وہی واقف تھیں۔ لیکن یہ راز وہ کس کو بتاتیں۔

وشمہ سے لاکھ گلے سہی۔ مگر تھی تو اپنی بھتیجی۔ اپنا خون کیسے اس کا بھرم سب کے سامنے کھولتیں۔

"اور تم کیوں اتنا اچھل رہے ہو؟ پتا ہے تمہیں کسی بات کا۔ اور بلاوجہ دوسروں کی حمایت میں ماں کے سامنے سینہ پھلا کر جواب طلب کر رہے ہو۔"

"جب آپ کو کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو ڈانٹنے لگتی ہیں۔"

وہ ناراض ہو کر پیر پٹختا اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ جہاں ہما اپنے گیلے بال سکھا رہی تھی۔

"تمہارے بال بے حد خوبصورت ہیں۔ کوئی کسی کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبتا ہے۔ کوئی کسی کے لبوں کے پیچ و خم میں۔ مجھے لگتا ہے میں کسی دن تمہاری گھنی زلفوں کے جنگل میں بھٹک جاؤں گا۔"

ابھی پرسوں شام ہی وہ اس کی ایک لٹ کو انگلی پہ لپیٹتے ہوئے خواب ناک لہجے میں کہہ رہا تھا لیکن اب اگر اسے یہ بات یاد آتی بھی۔ تو خود کو ملامت کرنے لگ جاتا۔ اتنی جلدی وشمہ سے دست بردار ہو کر کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو جانے کے جرم کی پاداش میں۔ وہ اسے نظر انداز کرتا بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اور جوگرز سمیت لیٹ کر چھت کو تکنے لگا۔

ابھی کل تک ہما ایک مثالی بیوی بنتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی الرٹ ہو کر اس کے لباس، کھانے پینے اور دوسروں باتوں کی فکر میں لگ جایا کرتی تھی۔ لیکن آج اسے یہ احساس تک نہ ہوا کہ وہ اس کے پاس سے گزر کر جا چکا ہے۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ لیٹا ہے۔

وہ وشمہ سے ملنے کے بعد کھو سی گئی تھی۔ پہلے بھی چند ایک بار اس سے ملی تھی۔ مگر اب وصی کی ہونے والی بیوی کی حیثیت سے اس سے ملنا اتنا تکلیف دہ ہو گا۔ اس کا اندازہ اسے نہ تھا۔ ہوتا تو شاید جانے سے انکار کر دیتی۔

دونوں ایک دوسرے سے بندھے۔ ایک دوسرے میں کشش تلاشتے اب دوبارہ سے راستہ بھٹک کر اپنے اپنے حصار میں واپس جا رہے تھے۔

بوجھ کی طرح لادے رشتے۔
اَن چاہے بندھن۔
مجبوری کے سودے۔
مصلحتوں کے فیصلے۔

ان سب کے نیچے دبے لوگ ایسے ہی جیون بتاتے ہیں۔ غیر یقین۔ غیر واضح۔ مبہم اور موہوم۔ کبھی جانے۔ کبھی انجانے۔ کبھی اپنے۔ کبھی بیگانے۔ کبھی آشنا تو کبھی ناآشنا بن کر ایک ساتھ چلتے رہتے

ندی کے دو کناروں کی طرح۔ جو ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی کبھی ایک نہیں ہو پاتے۔ حتّٰی کہ سفر ختم بھی ہو جائے تو ایک کنارہ دوسرے کنارے سے جدا ہی رہتا ہے۔ میلوں کا سفر اکٹھا طے کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں

☆ ☆ ☆

"...یہ۔ مسز نیاز نے کسی خاتون کے بارے میں ذکر کیا تھا؟"

...ریحہ نے جعفر محمود کو مخاطب کیا۔ اگرچہ وہ انہیں کم کم ہی مخاطب کیا کرتی تھیں۔

"کس سلسلے میں؟"

"ظاہر ہے۔ ہماری بیٹی کے سلسلے میں۔ انہوں نے مسز نیاز کے بیٹے کی شادی پہ تقدیس کو پسند کیا تھا۔"

"کون لوگ ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟"

"مسز نیاز کے سمدھی ہیں۔ ان کی بہو کا بھائی۔ باپ کا گارمنٹس کا بزنس ہے۔ لڑکا باہر ہوتا ہے۔"

"منع کر دو؟" جعفر محمد نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ کر حتمی فیصلہ فوراً سنا دیا۔

...ریحہ کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

☆ ☆ ☆

"او موئے۔ ذرا پرے ہٹ۔ صوفے کو سانس لینے دے۔ بے چارا دب کے سسکیاں بھر رہا ہے۔"

...صی نے حسان کو پرے دھکیلنا چاہا۔

لاؤنج میں ٹی وی دیکھنے کے لیے دونوں کا یہی پسندیدہ مقام تھا اور دونوں کی کوشش ہوتی تھی کہ اس صوفے پہ ڈھیر ہو۔

"سسکیاں تو وہ بھر رہی ہے۔ تمہاری منگیتر۔ جسے اتنا ہرجائی قسم کا سجنا ملا ہے۔"

حسان نے شوارما کا بڑا سا لقمہ توڑتے ہوئے کہا تو وصی کی شوخی رخصت ہو گئی۔

"کیوں۔ میں نے کون سے ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے ہیں جن کے شکوے وہ آ کے تم سے کر رہی ہے۔"

اس نے لہجے میں مصنوعی بشاشت بھرنا چاہی۔

"بے چاری آتی کہاں ہے۔ اور ایک ہماری والی ہے۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ردا کا ذکر کیا۔ "اوپر کے پھیرے لگا لگا کے سیڑھیاں گھس دی ہیں۔"

"ظاہر ہے۔ اسے ہی لگانے تھے پیچے کے چکر۔ اگر کہیں تم یہ کام شروع کر دیتے تو ابھی سیڑھیاں صرف ...ذہیں تب تو ٹوٹی ہوتیں۔"

"...بات کو ٹالو مت۔ یار! ہم سے کیا پردہ۔ بتاؤ نا۔ کبھی فون پر ہلکی پھلکی گفتگو بھی نہیں ہوئی؟ کوئی ...بات؟" "نہیں یار۔" وصی کے لہجے میں تھکن اتر آئی۔

"ڈرتے ہو؟"

"...ہیں؟" اس نے سچائی سے تسلیم کیا۔

...تی ڈرتا تھا۔ اپنے آپ سے ڈرتا تھا۔ اس کا دل عمر کے پچیسویں سال میں آ کے بھی کسی کے نقش سے ...تھا۔ پھر بھی وہ ڈرتا تھا۔

...سے سہا سے محبت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اس کا دل دکھانے کا گناہ گار ہوا تھا۔ اس کا سامنا کرنے سے ڈرتا ...اس کی آہ لگ جانے سے ڈرتا تھا۔

...اسے اس معصوم لڑکی وشمہ سے بھی فی الوقت محبت نہیں تھی، جس کے ہاتھ میں اپنے نام کی انگوٹھی اس نے ...ہمانے بقائمی ہوش و حواس پہنائی تھی۔ لیکن وہ اپنے آپ سے اقرار کرنے سے بھی ڈرتا تھا کہ وہ اب اس ...سے کسی رشتے میں بندھ گیا ہے۔

"گھامڑ ہے تو بھی۔۔۔ منگیتر ہے تیری۔۔۔ ڈر کیسا؟۔۔۔ لگتا ہے اس چکر میں تو نے اتنی سینڈلیں اور اتنے چھتر کھائے ہیں کہ اب جہاں ڈرنے والی بات نہیں ہے وہاں بھی ڈر رہا ہے۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔۔۔" ہنسی کا وصی سے بڑا پرانا اور گہرا تعلق تھا مگر اب وہی ہنسی اس کے لبوں پہ روٹھی روٹھی سی نظر آتی تھی۔

"میں تو کہتا ہوں، کسی دن باہر ملنے کے لیے۔۔۔"

ابھی وہ اور بھی کار آمد مشورے دینے والا تھا کہ حسن نے کمرے سے نکل کر اسے خشمگیں انداز میں گھورا۔

"حسان۔۔۔!"

"وہ بھائی میں۔۔۔ میں دراصل وصی کو بتا رہا تھا کہ کامیاب زندگی گزارنے کے گر کیا ہیں۔"

گڑبڑا کے اس نے عجیب بودا سا بہانہ تراشا جس پہ باوجود بھاری دل کے وصی مسکرا اٹھا۔

"پہلے تم خود تو سیکھ لو یہ گُر۔۔۔ اور کامیاب زندگی صوفے پہ ٹانگیں پھیلا کے لیٹنے سے اور ٹی وی پہ دیدے گاڑ کے بیٹھنے سے نہیں گزاری جاتی۔"

وہ نجانے کس بات کا غصہ حسان پہ نکال رہا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے حسان کو ہمیشہ دوسروں کی ڈانٹ سے بچاتا ہی آیا تھا۔۔۔ عین اسی وقت وصی پہ عجیب سا انکشاف ہوا۔۔۔ کہ بھلے حسن 'حسان کو ڈپٹ رہا ہے' اس کے ساتھ درشتی سے پیش آرہا ہے' لیکن مخاطب تو کر رہا ہے' جبکہ کتنا عرصہ ہوا اس نے کبھی دوستانہ انداز میں یا ازراہ شفقت و محبت وصی کو مخاطب نہیں کیا۔۔۔ کبھی بات کرنا بھی پڑی تو جیسے بحالت مجبوری۔۔۔ بہت اکھڑے انداز میں۔۔۔ رسمی طریقے سے۔۔۔ یہ وصی کو اب محسوس ہو رہا تھا۔

"حسن بھائی۔۔۔!" بے اختیار وہ اسے پکار بیٹھا۔۔۔ شاید اس رویے کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

حسن رکا مگر کچھ کہنے کے بجائے سرد نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔۔۔ اس خنکی نے اسے اور بھی خائف کر دیا۔ وہ دل کی بات زبان پہ نہ لا سکا۔

"شام کو ماڈل ٹاؤن چلیں۔۔۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے اکٹھے شاپنگ کیے ہوئے۔"

"چلے جاؤ۔۔۔ کسی نے منع تھوڑی کیا ہے۔۔۔"

عجیب سے انداز میں جواب دے کر وہ رکا نہیں۔۔۔ اور جس انکشاف نے کچھ دیر قبل وصی کو حیرت میں مبتلا کیا تھا اسی نے حسان کو بھی گنگ کر دیا۔

وصی اس احساس کو زائل کرنے کے لیے کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

"انہیں کیا ہوا؟" حسان پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"شادی شدہ ہو گئے ہیں بھئی۔۔۔ رعب دکھا رہے ہیں۔"

"تو اپنی زوجہ محترمہ کو دکھائیں۔۔۔ ہم پہ خار کیوں نکال رہے ہیں۔۔۔ مسئلہ کیا ہے؟ ناراض ہیں مجھ سے۔۔۔ شاید" اپنے خیال کا اظہار کرنے کے بعد اس نے شبے کا عنصر بھی شامل کر دیا۔۔۔ یعنی وہ خود بھی پُریقین نہیں تھا۔

"مگر کیوں؟۔۔۔ تم نے ان کی بھینس کھولی تھی؟"

"وہ چاہتے تھے میں وشمہ سے شادی کے سلسلے میں کسی کے دباؤ میں نہ آؤں۔۔۔ وہ سوہا کے [illegible] سپورٹ کر رہے تھے۔۔۔ میرے لیے ماموں اور ممانی کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔۔۔ کہاں کہاں سے دلیلیں اکٹھی کر رہے تھے اور میں۔۔۔ میں ہی میدان چھوڑ کے بھاگ گیا۔"

وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ وجہ بتانے لگا۔

"اس پہ اب تک ناراضی؟"

"یار۔۔۔! مجھے تو اس کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

وہ زچ ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼
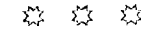
[illegible] نے مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔" جعفر غصے سے پھنکار رہا تھا۔

[illegible] پوچھتی کیا۔۔۔ آپ نے تو ذکر سنتے ہی صاف منع کر دیا تھا۔" مدیحہ نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"اور اس کے باوجود تم باز نہیں آئیں؟"

[illegible] تقدیس کی بات طے نہیں کر رہی۔۔۔ نہ آپ کی مرضی کے خلاف اسے رخصت کر رہی ہوں۔ ایک بار مل [illegible] کیا حرج ہے؟ بعد میں دیکھتے ہیں اقرار کرنا ہے یا نہیں۔۔۔ یہ کیا کہ صرف ذکر سن کر انکار کر دیا۔۔۔ نہ جانا۔۔۔"

[illegible] مجھے کسی کے بارے میں رائے دینے کے لیے اسے جاننا' پرکھنا ضروری نہیں ہے۔ میں اس کلاس میں بیٹی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

[illegible] کھاتے پیتے صاحب حیثیت لوگ ہیں۔"

[illegible] مگر جس بزنس سے تعلق رکھتے ہیں وہاں تعلیم کا رجحان کم پایا جاتا ہے اور یہ باہر جانے والے لڑکے۔۔۔ کیا کرتا [illegible] بھلا باہر؟۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ انجینئر؟ ہرگز نہیں۔۔۔ پتہ نہیں کسی سی گریڈ پروفیشن سے وابستہ ہوگا۔"

مسز نیاز بتا رہی تھیں کہ وہ مستقلاً "پاکستان آنے والا ہے اور لیدر کا بزنس شروع کرنے والا ہے اور رہی بڑی بات تو مسز نیاز کی اپنی بہو۔۔۔ یعنی لڑکے کی بہن لیکچرر ہے۔ سب سے چھوٹی بہن میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے [illegible] زندگی میں پہلی مدیحہ نے جعفر محمود کے انکار کو انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے تحمل سے اسے دلائل دیے۔۔۔ اور زندگی میں پہلی بار ہی جعفر محمود نے مدیحہ کے دلائل سنے بھی۔۔۔ اور ان سے متفق نظر آیا۔

☼ ☼ ☼

جہاز کے لینڈ کرتے ہی سوہا نے اپنا سیل نمبر آن کیا۔ ریتا نے کن اکھیوں سے اس کی یہ حرکت دیکھی اور اس [illegible] نظم بو جھل ہو گئے۔ وصی کا نمبر اب بھی آف مل رہا تھا۔

"یا اللہ خیر۔۔۔! اتنے دن تک کوئی کیسے اپنا نمبر آف رکھ سکتا ہے۔۔۔ کہیں کوئی مس ہیپ نہ ہو گیا ہو۔۔۔ سیل فون [illegible] کی بھی تو اتنی وارداتیں ہوتی ہیں۔۔۔ لیکن میرا نمبر تو ہے اس کے پاس۔۔۔ وہ نئے نمبر سے مجھے کال کر لیتا۔۔۔ آخر [illegible] وجہ ہے جو وہ۔۔۔"

اپنے آپ سے الجھتی وہ گاڑی میں آبیٹھی۔۔۔ "ماما۔۔۔! وہ وصی۔۔۔"

"پلیز سوہا۔۔۔! اتنی پریشان مت ہو۔۔۔ کیوں بلاوجہ ٹینشن لے رہی ہو؟"

سوہا نے ریتا کو چڑتے دیکھ کر مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کیا اور اب تقدیس کا نمبر ملایا۔۔۔

"کوئی نئی تازہ بات کالج کی۔۔۔؟"

چند منٹ گپ شپ لگانے کے بعد وہ تھوڑی نارمل نظر آ رہی تھی۔ ریتا نے اس کا دھیان بٹ جانے پہ شکریہ [illegible]

"[illegible] نہیں تو اتنے دن گئی ہی نہیں کالج۔۔۔"

"خیریت۔۔۔ طبیعت تو خراب نہیں تھی؟"

"ہاں یار۔۔۔! ایکدم پرفیکٹ۔۔۔ ایکچوئلی' آپی کی شادی ہوئی بڑی ایمرجنسی میں۔۔۔ اس لیے۔۔۔"

جواب میں سوہا سے کتنی دیر کچھ بولا نہ گیا۔

"کیسی ایمرجنسی؟" اس نے ذرا سرد لہجے میں پوچھا۔ اور اس سے پہلے کہ تقدیس جواب دیتی وہ دوبارہ بول اٹھی۔ "میں نے جانے سے پہلے تمہیں فون کر کے اپنی روانگی کی خبر دی تھی تب تمہاری آپی کی شادی کی ڈیٹ فکس [illegible] تھی نا؟" اس کے سوال پہ ریتا نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"ایکچوئلی سوہا۔۔۔ میں۔۔۔"

"وضاحتیں دینے کی ضرورت نہیں ہے تقدیس۔ !" سوہا اداسی سے مسکرائی۔
" I can understand "(میں سمجھتی ہوں۔)
اور واقعی تقدیس نے مزید وضاحتیں دینے کی کوشش نہ کی۔۔۔ حالانکہ ذہنی طور پر وہ خود کو کب سے اس مرحلے کے لیے تیار کررہی تھی۔۔۔ جانتی تھی کہ جب بھی سوہا آئی۔۔۔ اس کی ناراضی بھی سہنا پڑے گی۔ اور رودے بہانے پیش کر کے اسے مطمئن بھی کرنا ہوگا۔۔۔ منانے کے سو سو جتن کرنے ہوں گے۔
مگر ان سب کی ضرورت پیش نہ آئی۔
"او کے۔۔۔ خدا حافظ۔"
سوہا نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے لائن ڈس کنیکٹ کردی۔۔۔ تقدیس "ہیلو۔۔۔ ہیلو" کرتی رہ گئی۔۔۔ اور پھر جھنجلا کے سوہا کا نمبر ملانے لگی۔
سوہا نے ریتا کی جانب دیکھا۔۔۔ وہ دانستہ نظریں چرا کے اپنے بیگ میں کچھ تلاشنے لگی تھی۔
"کیا ڈھونڈ رہی ہیں ماما؟"
"وہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ گلاسز۔۔۔ پتا نہیں کہاں رکھ دیے۔" وہ ٹٹولنے میں مگن تھی۔۔۔ سوہا کے ہونٹوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔
"گلاسز آپ نے لگا رکھے ہیں ماما۔ !" ریتا اور نروس ہوگئی۔
"اوہ۔۔۔ ہاں۔" شرمندگی سے وہ گلاسز اتار کے ٹشو سے صاف کرنے لگی۔۔۔ شاید سوہا کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔
ایک عجیب سا مجرمانہ احساس ہو رہا تھا۔۔۔ جیسے اسے ابھی ابھی پہنچنے والی ٹھیس کی ذمے دار وہی ہو۔۔۔ اور وہ دھچکا جو اسے کچھ دیر میں وصی کے حوالے سے لگنے والا ہے' وہ بھی ریتا کی ذات سے ملنے والا تحفہ ہو۔
اور دفعتاً "سوہا کھلکھلا کے ہنس پڑی۔۔۔ ریتا نے چونک کر تعجب سے اسے دیکھا۔
"ماما! آپ بھی نا۔۔۔ مانتی نہیں ہیں۔۔۔ لگتی بھی نہیں ہیں۔۔۔ مگر ہو ضرور گئی ہیں۔۔۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"کیا؟" ریتا نے پوچھا۔
"بوڑھی۔۔۔" اور ریتا بھی اس کی ہنسی کا ساتھ دینے لگی۔
"ماما۔۔۔! میں آپ کو شرمندہ سا نہیں دیکھ سکتی' کبھی نہیں۔۔۔" کھوکھلی ہنسی کے پیچھے اس کا دل محبت سے کہہ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

"کیا ہو گیا ہے امی آپ کو؟" خرم کھل کر ہنس رہا تھا۔
"ذرا سانس تو لیں۔۔۔ کیا ہیٹ ٹرک کرنی ہے شادیوں کی۔۔۔ ابھی تو ہما اور ندا کی شادیوں کی دعوتیں تک ختم نہیں ہوئی ہوں گی۔"
"وہ بیٹیاں تھیں۔۔۔ شادی تھوڑی ہی کی ہے ان کی۔۔۔ فرض سے سبکدوش کیا ہے۔۔۔ شادی تو میں کروں گی تمہاری۔" رخشندہ کے کہنے پہ وہ پھر سے ہنسنے لگا۔
"لیجیے۔۔۔ کھل گیا آپ کے دعووں کا پول۔۔۔ صحیح کہتی ہے ردا۔۔۔ کہ آپ نے ہمیشہ ان کے معاملے میں ڈنڈی ماری ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہی امی محترمہ ! کہ آپ ہمیشہ سے ردا کے اس دعوے کو جھٹلاتی رہیں۔۔۔ اور فخر سے اعلان کیا کہ آپ کی نظر میں بیٹی' بیٹا سب برابر ہیں۔۔۔ لیکن آخر آپ نے ثابت کر ہی دیا کہ اندر سے آپ وہی روایتی ماں ہیں۔۔۔ بیٹے کو فوقیت دینے والی۔"

"ان میں مت ٹالو بات کو۔۔۔ میں تو اب بھی کہوں گی کہ شادی۔۔۔ جس کا مطلب ہی مسرت اور خوشی ہے۔۔۔ وہ بیٹے کی ہوتی ہے۔۔۔ بیٹی کی شادی پہ دل بوجھل ہوتا ہے۔۔۔ اداس ہوتا ہے۔۔۔ اسے رخصت کرنے کے بعد آنگن دیکھ کے ہول اٹھتے ہیں۔۔۔ اور اگر خوشی کا کوئی احساس ہوتا بھی ہے تو وہ صرف ذمے داری کم ہونے کا۔۔۔ سے سبکدوش ہونے کا۔۔۔ لیکن رونق تو تمہاری شادی سے ہوگی۔۔۔ آنگن بھرے گا۔۔۔ دل بھرے گا۔"
"کون سی فلم دیکھی ہے رات میں؟" خرم نے سنجیدگی سے پوچھا۔۔۔ پھر رازدارانہ سرگوشی کی۔
"ایک دن بھو کا۔۔۔؟۔۔۔ یا پھر ساس ہو تو ایسی؟"
"بس۔۔۔ بہت ہوگئی مسخری۔۔۔ سیدھی طرح سے بات سنو میری۔۔۔ میں نے ایک لڑکی پسند کی ہے تمہارے لیے۔"
"واہ۔۔۔ بالا ہی بالا فیصلے بھی ہوگئے۔۔۔ حد ہے آمریت کی۔" خرم کے شکایتی انداز پہ وہ ٹھٹکیں۔۔۔
"نہیں۔۔۔ فیصلہ کوئی نہیں ہوا۔۔۔ صرف پسند کی ہے۔۔۔ اور باقاعدہ رشتہ ڈالنے سے پہلے تم سے بات کر رہی تاکہ تم بلا جھجک اپنی رائے دے سکو۔ یہ مت سوچنا کہ میں ناراض ہوں گی یا تم پہ زبردستی اپنی پسند ٹھونسنے کوشش کروں گی۔"
"دراصل امی۔ ! ابھی میں۔۔۔"
"نہیں۔۔۔" رخشندہ نے اس کی بات کاٹی۔
"یہ مت کہنا کہ ابھی تم شادی نہیں کرنا چاہتے۔ بس اس ایک بات کے علاوہ جو چاہے کہہ دو۔"
"امی۔۔۔ !" وہ بے بسی سے کراہ کے رہ گیا۔
"کوئی لڑکی وہاں ہے نظر میں؟"
"کام سے سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔۔۔ آپ پتا نہیں کیا کیا سوچ رہی ہیں۔"
"خاندان میں کوئی؟"
"امی! سچ پوچھیں تو یہ آپ کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔۔۔ میں ابھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔۔۔ لیکن اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یہ ذمے داری بھی آپ سنبھالیں۔۔۔ خود پسند کریں اپنے لیے بہو۔"
"یہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔" اطمینان بھرا سانس لے کر وہ ہلکی پھلکی ہوگئیں۔
روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے بڑے کھلے دل سے سوچا تھا کہ وہ جس لڑکی کو ان کی بہو بنانا چاہے گا بڑی خوشی قبول کریں گی۔۔۔ لیکن جب اس نے یہ کام ان کے سر ڈالا تو اندازہ ہوا کہ اندر سے وہ بھی پرانی سوچ والی ماں ہیں۔۔۔ ابھی بھی ان کے اندر وہی خواہش ہے۔۔۔ خود بہو پسند کر کے لانے کی۔
"پھر بھی۔۔۔ کچھ تو سوچا ہوگا۔۔۔ لمبا قد۔۔۔ گورا رنگ۔۔۔ تعلیم۔۔۔ عادت وغیرہ؟" انہوں نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔ وہ جھینپ گیا۔
"افوہ۔۔۔ جب اختیار آپ کو دے ہیں تو اعتبار بھی ہے' آپ کی پسند اور ذوق پہ۔۔۔ مجھے کوئی آسمانی حور یا پری کی ضرورت بھی نہیں۔۔۔ سلجھی ہوئی' مناسب حد تک تعلیم یافتہ ہو۔۔۔ زیادہ کم عمر نہ ہو۔۔۔ اس گھر کی اکلوتی بہو میں بچپنا ہونا بھی نہیں چاہیے۔"
"پھر تو تقدیس تمہیں ضرور پسند آئے گی۔۔۔ ایسے ہی نہیں وہ پہلی نظر میں مجھے بھائی تھی۔۔۔ ماشاءاللہ۔۔۔ شکل و صورت کی بھی پیاری ہے۔۔۔ خاندان بھی اعلا اور نام والا ہے۔۔۔ تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی ہے۔۔۔ بہت سنجیدہ بھی نہیں۔۔۔ بہت چنچل۔۔۔ تم ہاں کہہ دو تو میں آگے بات بڑھاؤں؟"
"دیکھ لیں۔۔۔" اس نے جھجکتے ہوئے مبہم سی رضامندی ظاہر کی۔
"ہم اچھا! تو معاملہ جلدی آگے بڑھے۔"
"پھنس گیا تو پھنس جاؤں گا امی۔۔۔ !"

"کیا مطلب؟"

"واپس جانے میں مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

"لڑکی والوں کے بھی کئی تحفظات ہوتے ہیں۔۔۔ انہیں بھی تم سے ملنا، تمہیں پرکھنا ہوگا۔۔۔ محض تصویر دیکھ کے تو کوئی بھی بیٹی نہیں دیتا۔"

"لیکن امی! مسئلہ نہ ہو جائے۔۔۔ آپ کو تو پتا ہے کہ اسٹوڈنٹ ویزا پہ آیا تھا۔۔۔ ڈگری بھی مل گئی۔۔۔ جاب کے ساتھ ساتھ کبھی کوئی۔۔۔ کبھی کوئی پروفیشنل کورس کرتا رہتا ہوں کہ اسٹوڈنٹ ویزے کا جواز بنا رہے۔۔۔ جب تک پیپرز نہیں بن جاتے۔"

"نہ بنیں۔۔۔ فکر نہیں۔۔۔" رخشندہ نے اطمینان سے اس کی بات کاٹی۔

"تمہارے ابو بھی کہہ رہے تھے کہ خرم سے کہنا۔۔۔ یہاں کی لی ڈگری پہ ہی لوگ ساٹھ، ستر ہزار ماہوار والی نوکری آرام سے کر رہے ہیں۔۔۔ خرم کے پاس تو باہر کی ڈگری ہے۔۔۔ کسی بھی اچھے بینک میں آسانی سے جاب مل جائے گی۔۔۔ کیا کرنا ہے پردیس کی زندگی کا۔۔۔ نری خواری۔۔۔ وہاں کون سا پیسے درختوں پہ لگے مل جاتے ہیں۔"

"آپ نے تو بڑا دل کر کے بھیجا تھا مجھے۔۔۔ اب یہ تبدیلی کیسے؟"

"تمہاری بہنوں کی شادی کے وقت تمہارے نہ ہونے نے یہ احساس دلایا۔۔۔ کہ ہماری زندگی کتنی ادھوری۔۔۔ کتنی خالی ہے تمہارے بغیر۔۔۔ تم لوٹ آؤ خرم۔۔۔! تمہارے ابا کے شانے اب جھکنے لگے ہیں۔۔۔ تم اکلوتے سہارے ہو ان کے۔۔۔ اس وقت انہیں۔۔۔ مجھے۔۔۔ اس گھر کو تمہاری ضرورت ہے۔"

"چلیں۔۔۔ یہ آپشن بھی ذہن میں رکھتا ہوں۔۔۔ لیکن آپ اسے حتمی نہ سمجھیں۔۔۔ بس یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے جا نہ سکا۔۔۔ یا یہاں آنے کے بعد ویزا ایکسپائر ہو گیا تو آپ کا سمجھایا ہوا راستہ تو ہے ہی۔۔۔"

"جیتے رہو۔۔۔ بس تم آنے کی تیاری کرو۔۔۔ میں دوسری تیاری رکھتی ہوں۔" انہوں نے فون رکھا۔

✡ ✡ ✡

وہ لاکھ کترا رہا تھا اس کا فون اٹینڈ کرنے سے، مگر کب تک۔۔۔ آخری حل کے طور پہ اس نے اپنا نمبر چینج کر لیا۔۔۔ جانتا تھا۔۔۔ واپس آنے کے بعد اس کے نئے نمبر کا پتا لگانا اس کے لیے خاص مشکل نہ ہوگا۔۔۔ لیکن پھر بھی۔۔۔ کچھ دن۔۔۔ کچھ دن تو وہ اس کا سامنا کرنے سے بچ سکتا تھا۔

اور وہی ہوا۔۔۔ سوہا نے اس کے آفس سے رابطہ کر کے اس کا نیا نمبر اپنے پاکستان لوٹنے کے چوتھے روز ہی حاصل کر لیا۔

موبائل کی اسکرین پہ سوہا کا جانا پہچانا نمبر دیکھ کے وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اب کال ڈس کنیکٹ کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔۔۔ وہ دوسری بار کرتی۔۔۔ تیسری بار کرتی۔۔۔ بار بار کرتی۔۔۔ وہ کب تک اس کی کال کاٹتا۔

کیا تب تک؟۔۔۔ جب تک وہ اس کے گھر۔۔۔ یا آفس آ پہنچتی؟

اس سچویشن سے بچنے کا واحد حل یہی تھا کہ وہ فون پہ ہی اس سے بات کر لیتا۔

"ہیلو۔۔۔"

"وصی۔۔۔! بے ایمان۔۔۔ بدتمیز۔۔۔ نمبر چینج کر لیا تو بتا نہیں سکتے تھے۔۔۔ میرا نمبر تو وہی تھا۔۔۔ یا بھول گئے تھے؟"

چپ رہا۔۔۔

سوہا کھٹک گئی۔

"کیا ہوا وصی؟۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہوں۔۔۔" اس نے چور نظروں سے کیبن کی گلاس وال سے نظر آتے اپنے کولیگز کو دیکھا اور پیشانی سے پسینہ پونچھا۔۔۔ مگر وہ چہرے کی اڑی رنگت کو بحال کرنے پہ فی الحال قادر نہیں تھا۔

"کیا ہوا؟ بخار؟"

"نہیں۔۔۔ بس۔۔۔ وہ۔۔۔"

"ناراض ہو؟" اس کے اتنے مان سے۔۔۔ اتنی معصومیت سے اور اتنی محبت سے پوچھنے پہ وصی کی آنکھیں بھر آئیں۔

"نہیں۔۔۔ میں کیوں ناراض ہوں گا۔۔۔ ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔ تم۔۔۔ تم ہو سکتی ہو۔"

"نہیں۔۔۔ تم سے ناراض؟ ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ تم نے مجھے فون نہیں کیا۔۔۔ اپنا نیا نمبر نہیں دیا۔۔۔ تب بھی نہیں۔۔۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔"

"ہاں۔۔۔ وجہ تو تھی۔۔۔" وصی نے اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس کیا۔

"دفع کرو وجہ کو۔۔۔ بس ہو گئی بات۔۔۔ کافی ہے۔۔۔ آج شام ملیں؟"

"آج۔۔۔ نہیں آج مجھے۔۔۔"

دل چاہا۔۔۔ کہہ دے کہ آج مجھے اپنی منگیتر کو ڈنر پر لے جانا ہے۔۔۔ یا آج شام میرے ہونے والے سسرال والے چائے پہ آ رہے ہیں۔۔۔ یا پھر یہ کہ۔۔۔ آج تو میں ممانی کے ساتھ اپنی شادی کی شاپنگ کرنے جا رہا ہوں۔۔۔ اپنی ہونے والی دلہن کے لیے عروسی لباس خریدنے۔

رونمائی کا تحفہ پسند کرنے۔۔۔

مگر یہ سب کہنے کی خواہش ہوئی۔۔۔ ہمت نہیں۔ صرف خواہش ہو جانے سے سب ممکن تو نہیں ہو جاتا۔ وہ اپنے خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیر کے رہ گیا۔

"ڈنر میرے ساتھ کرنا۔۔۔ میں نے تمہارے لیے کچھ گفٹس بھی لیے ہیں۔۔۔ اور ہاں تمہاری فیملی کے لیے بھی۔۔۔ تمہاری ممانی۔۔۔ اور وہ تمہاری آپی۔۔۔ جو تمہاری بیسٹ فرینڈ بھی ہیں۔۔۔ ان کے لیے بھی۔۔۔ کیسے ہیں سب۔۔۔؟"

وہ اس کی ایک نہ سن رہی تھی۔۔۔ اپنی سنائے جا رہی تھی۔

"ٹھیک ہیں۔۔۔ لیکن سوہا! میں آج نہیں مل سکوں گا۔۔۔ آج مجھے۔۔۔"

"so rude وصی! میں اتنے دنوں بعد لوٹی ہوں۔۔۔ اتنی اداس ہوں اور تم۔۔۔ جاؤ۔۔۔ اب میں واقعی ناراض ہوں۔" وصی کو اپنا آپ کمزور پڑتا محسوس ہوا۔

اسے لگا جیسے ہر طرف سے اسے سنگسار کیا جا رہا ہو۔۔۔ فوراً ہی اس نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

سب کچھ صاف صاف بتانے کا۔ ایک بار۔۔۔ ایک آخری بار اس سے ملنا ضروری تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ ملتے ہیں۔۔۔ مگر میں تمہارے گھر تمہیں لینے نہیں آ سکوں گا۔۔۔ تم آ جانا۔"

"اور وہ گفٹس۔۔۔ اچھا ساتھ لے آتی ہوں۔۔۔ وہیں ملیں گے نا۔۔۔ جہاں پہلی بار ہم نے اکٹھے ڈنر کیا تھا؟"

"ہاں۔۔۔" وصی نے بوجھل لہجے میں کہا۔۔۔ اور ریسیور رکھتے ہوئے سوچا۔

"پہلی بار۔۔۔ اور اب آخری بار۔۔۔" دل کسی نے مٹھی میں لیا۔۔۔ وہ حیران رہ گیا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ مجھے۔۔۔ میں تو اس سے محبت نہیں کرتا۔۔۔ پھر دل کو اتنی تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟ اسے یہ بتاتے ہوئے کہ میں اپنے ہی کیے وعدے سے پھر گیا ہوں۔۔۔ کیا یہ اس کو دینے والی تکلیف سے ہونے والی تکلیف ہے؟ یا پھر یہ شرمندگی ہے جو مجھے کچوکے دے رہی ہے؟"

"میں اس سے محبت نہیں۔۔۔ ہمدردی محسوس کر رہا ہوں۔۔۔ یہ وہ دوستانہ سی اپنائیت ہے جو مجھے اس کے وجود سے ملی ہے۔۔۔ یہ اس کی سچائی کے جواب میں رکھائی دینے کی خجالت ہے۔۔۔ اور کچھ نہیں۔۔۔ کچھ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ اگر مجھے اس سے محبت ہوتی تو میں اتنے سہل طریقے سے اس کی خواہش سے دست بردار کیسے ہو سکتا تھا۔۔۔ کیسے شمہ کو اپنے نام کی انگوٹھی پہنا سکتا تھا۔ کیسے راستہ بدل سکتا تھا؟ محبت کمزور نہیں پڑنے دیتی۔ اور میں کمزور اور شکستہ ہو گیا۔۔۔ مجھے اس سے محبت نہ تھی۔۔۔ نہ ہے۔"

اور خود کو یقین دِلاتے دِلاتے وہ یہ کہنا بھول گیا کہ... "نہ ہو سکتی ہے۔"

☆ ☆ ☆

"اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے... لڑکے کے بیرون ملک ہونے پہ آپ ہچکچا رہے تھے... انہوں نے بتایا ہے کہ وہ واپس آ رہا ہے... اور مجھ سے بھی معلومات لینے میں کچھ غلطی ہو گئی تھی... لیدر فیکٹری لگانے کا ارادہ اس کے ابا کا ہے' جو ابھی تک اپنے بھائی کے ساتھ ہوزری کے بزنس میں شراکت دار تھے... لڑکا تو بینکنگ کی اعلا تعلیم حاصل کر کے لوٹ رہا ہے... ملٹی نیشنل بینک میں ایسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا... " مدیحہ بیگم نے بتایا۔

"ہوں... ٹھیک ہے... تم تفصیلات لے لو... میں اپنے طور پر پتا کرواتا ہوں' خاندان اور لڑکے کے کردار وغیرہ کے بارے میں۔"

جعفر محمود نے بھی دلچسپی لی... اور تمام اطلاعات تسلی بخش ہونے کے بعد انہوں نے مدیحہ کو گرین سگنل دے دیا... مدیحہ نے ان خاتون کی وساطت سے اپنی رضامندی کہلوا دی... جو یہ رشتہ کروانے میں پیش پیش تھیں۔ تقدیس کے احساسات نارمل تھے۔

وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھی... جانتی تھی کہ تحریم کے ساتھ ہونے والے تلخ حادثے کے بعد اس کے ماں' باپ اسے زیادہ موقع نہیں دیں گے' اور جلد از جلد اسے سر سے اتارنے کی کوشش کریں گے۔

یہ اطمینان بہرحال تھا... کہ جلدی جلدی میں کیا فیصلہ اتنا برا بھی نہیں تھا... لڑکا نہ صرف تعلیم یافتہ تھا' بلکہ پوری فیملی سے ملنے کے بعد اسے تمام لوگوں کے سلجھے ہوئے ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا... تینوں نندوں میں اس نے روایتی نندوں والی بات نہ دیکھی تھی... وہ تو ویسے بھی شادی شدہ تھیں... تقریباً" ہم عمر اور ہم مزاج... دیورانی' جٹھانی کا ٹنٹنا نہ تھا... اور ساس بھی معقول خاتون لگ رہی تھیں' اس لیے وہ مطمئن تھی۔

اور زیادہ خوش اس لیے نہیں تھی... کہ عمر سے زیادہ حاصل ہونے والا تجربہ... اور مشاہدہ... اسے زیادہ توقعات باندھنے سے روک رہا تھا... وہ آنے والی زندگی کے بارے میں پُر امید ضرور تھی... مگر خود کو خواب بُننے سے باز رکھ رہی تھی۔

○ ○ ○

کافی دنوں بعد مل رہا تھا اس سے... اس کے نقوش اجنبی اجنبی لگ رہے تھے... یا شاید اس نے اس سے پہلے کبھی اتنے غور سے سوہا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کی گندمی رنگت میں کہیں کہیں سونے کی سی دمک ہے... اس کی پلکوں کے کنارے مڑے ہوئے ہیں۔

اس کی آنکھوں کے نیچے یہ گہری سرمئی لکیر کسی مصنوعی سہارے کی دین نہیں... قدرتی ہے۔

اس کے نچلے لب کا دایاں گوشہ مسکراتے ہوئے اندر کی جانب دب کر کتنا دلکش لگتا ہے۔

کسی بات پر پُرجوش ہو کر ہتھیلیاں مسلتی وہ کتنی چھوٹی سی معصوم سی بچی لگتی ہے۔ آج دیکھ رہا تھا تو احساس ہو رہا تھا۔ "ایسے... کیا گھور رہے ہو؟" وہ اس کی نظروں سے خائف ہوئی۔

"کچھ نہیں... " وہ چونکا۔

"اتنے کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟"

"ابھی تک تو نہیں کھویا... اب کھونے والا ہوں۔"

"مجھ میں؟" وہ لب دبا کے مسکرائی۔

"تم میں نہیں... تم سے کھونے والا ہوں سوہا!"

"پلیز ڈراؤنی باتیں نہ کرو... یہ دیکھو میں سارے گفٹ ساتھ لائی ہوں۔" اس نے بیگ کھولا... اور ایک پرفیوم نکالا۔

"سوہا! پلیز... میری بات سن لو۔"

"نہیں پہلے یہ... "

"سوہا...! پلیز... پھر شاید میں کبھی کہہ نہ پاؤں... یا شاید کہنے کے لیے مل نہ پاؤں۔"

"وصی...!" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟"

"سوہا... تمہیں یاد ہے میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔"

"وہ میں کیسے بھول سکتی ہوں وصی!"

"کسی بھی طرح... مگر بھول جاؤ... اب اسے بھولنا ہی ہو گا۔" سوہا کے اندر سے جیسے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ گیا۔

وصی کو اس کے سفید بے جان پڑتے چہرے کی طرف دیکھتے خوف آیا... اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔

"میں... میں مجبور ہوں۔"

"وہ نہیں مانتے؟" سوہا نے بڑی دقت سے پوچھا۔ "تمہارے گھر والے؟ نہیں مانتے؟"

وصی نے سر جھکا لیا۔

"میں منا لوں گی... تم بھی کوشش کرو... اتنی جلدی ہمت نہ ہارو وصی... ! میں بدل لوں گی خود کو... جیسا وہ چاہیں گے ویسی بن جاؤں گی... کچھ وقت لگے گا... مگر ہو جائے گا... مایوس کیوں ہوتے ہو... وہ مان جائیں گے۔"

وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی... جیسے وصی یہ سب سننے سے پہلے ہی اٹھ کے چلا نہ جائے۔

"وہ ضرور مانیں گے... محبت سب منوا لیتی ہے... محبت اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔"

"ہاں... " وہ اٹھا۔

"محبت... " اس نے سانس لے کر سینے پہ دھرا بوجھ پرے سرکایا۔

"محبت سب منوا لیتی ہے۔" اس نے ٹیبل سے اپنا سیل فون اور کار کی چابیاں اٹھائیں۔

"محبت اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے۔

"لیکن... اگر محبت ہو تو... "

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس کا ہاتھ لگنے سے میز پہ رکھی پرفیوم کی شیشی نیچے گر کر ٹوٹ گئی۔ کرچیاں پھیلنے پہ وصی نے بے ساختہ مڑ کے دیکھا۔ وہ کسی بت کی طرح... کسی بے جان بت کی طرح بیٹھی تھی۔

اس کی بے روح پتلیاں ساکت تھیں۔

اس کے سفید خشک لب نیم وا تھے۔

نجانے وہ سانس بھی لے رہی تھی یا نہیں۔

یہ آخری نظر... جو وہ کبھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا... کبھی بھی نہیں... یہ نادانستہ ڈالی آخری نظر اسے اندر تک جھنجوڑ گئی۔ اس کی رگوں میں تلاطم جگا گئی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ریسٹورنٹ سے نکل گیا... تیز ڈرائیونگ کے دوران اسے خیال آیا تو اس نے ونڈ اسکرین کے وائپرز چلا دیے... اسے احساس تک نہ ہوا کہ باہر بارش نہیں ہو رہی... آسمان صاف تھا۔

ایک بوند تک نہیں برس رہی۔

یہ جھڑی تو اس کی آنکھوں سے لگی تھی... جو اسے سامنے کا منظر دھندلا دھندلا... بھیگا بھیگا نظر آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ماما...!" وہ ریتا کے گلے لگی بلک رہی تھی...

اور ریتا کے پورے وجود پہ جیسے کوڑے برس رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے ایک ایک آنسو' ایک ایک زخم کی ذمے دار وہ ہے۔

”سوہا۔۔۔ بس میری جان!۔۔۔ بس۔۔۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔۔۔ میری وجہ سے ان لوگوں نے تمہیں۔۔۔ میں نہیں بتاؤں گی کہ میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔۔۔ منزہ ہے تمہاری ماں۔۔۔ وہ شریف خاندانی عورت۔۔۔ اس نے جنم دیا ہے تمہیں۔۔۔ اس کا دودھ پیا ہے تم نے۔۔۔ میں تمہاری ماں نہیں ہوں‘ میں تمہاری ماں ہو بھی کیسے سکتی ہوں۔“ اسے چپ کراتے کراتے وہ خود رو پڑی تھی۔

جو اعتراف وہ کبھی مر کے بھی نہ کرتی۔۔۔ وہ جیتے جی کرنا پڑ رہا تھا۔۔۔ جس حقیقت کو وہ ہمیشہ جھٹلاتی رہی۔۔۔ اب خود اس کا اعلان کر رہی تھی۔۔۔ اپنی زبان سے سوہا کی ماں نہ ہونے کا اعتراف کر رہی تھی۔

”میں بتاؤں گی۔۔۔ انہیں یقین دلاؤں گی۔۔۔ کہ تم میری کچھ نہیں لگتی۔۔۔ تم چلی جاؤ۔۔۔ اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ۔۔۔ پھر وہ لوگ تمہیں قبول کر لیں گے۔“

”نہیں ماما۔۔۔! لوگ تو کہیں ہیں ہی نہیں اس سارے قصے میں۔۔۔ بات تو اس کی ہے۔۔۔ اس کی۔۔۔ جس نے کبھی مجھے چاہا ہی نہیں۔“

”کیا؟۔۔۔ وصی۔۔۔ وصی کی بات کر رہی ہو تم؟“

”ہاں۔۔۔ وہ کہتا ہے۔۔۔ اسے مجھ سے محبت نہیں۔۔۔ وہ کہتا ہے میں اسے بھول جاؤں۔“

اور رینا کو لگا۔۔۔ سالوں پہلے کی کہانی پھر سے دُہرائی جا رہی ہو۔۔۔ اسے چپ لگ گئی۔۔۔ گہری چپ۔۔۔

اس نے اپنے سینے سے لگی ہچکیاں لے لے کر روتی سوہا کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔۔۔ اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور کہا۔

”اسے تم سے محبت نہیں ہے۔۔۔ تو تمہیں کیوں ہے؟ محبت‘ محبت مانگتی ہے سوہا؟ اور جہاں بدلے میں نفرت ملے۔۔۔ وہاں نفرت لوٹاؤ۔۔۔“

☼ ☼ ☼

خرم سے مل کر جعفر محمود کو بہت تسلی ہوئی۔

ظاہر ہے کہ ایک مرد ہونے کے ناتے وہ اس معاملے میں خود کو کورا سمجھتے تھے۔ بیوی پہ اعتماد ہو۔۔۔ نہ ہو۔۔۔ اس کی صلاحیتوں اور ذوق کے بارے میں کتنے ہی شکوک ہوں۔۔۔ یہ اختیار تو اسے سونپنا ہی تھا۔ کیونکہ یہ خالصتاً“ عورتوں کا شعبہ تھا۔۔۔ اس کے باوجود وہ بہت سے شبہات کا شکار تھے۔

اور معراج دین کی ساری فیملی سے ملنے کے بعد۔۔۔ خصوصاً“ خرم سے ملنے کے بعد اس کے یہ سارے شبہات دھل گئے۔۔۔ یہ خاندان ویسا ہی تھا۔۔۔ جیسے وہ لوگ خود تھے۔۔۔

نئی سوچ سے ہاتھ آگے بڑھا کے ملنے والے۔۔۔ مگر اپنے قدم اپنی زمین پہ مضبوطی سے جما کے کھڑے ہونے والے۔

دونوں بھائی اپنی اولادوں کے ساتھ اکٹھے بھی رہ رہے تھے‘ اور ایک انفرادی خاندان کے طور پہ بھی زندگی بسر کر رہے تھے۔ خرم اکلوتا تھا۔۔۔ مگر اس کی تینوں بہنیں تعلیم یافتہ اور خوش گفتار تھیں۔۔۔ تقدیس کو وہ اپنی ہونے والی بھابی کے طور پہ نہیں‘ کسی دوست کے طور پر ڈیل کر رہی تھیں۔۔۔

گھر کی واحد بزرگ خاتون‘ شوکت جہاں بیگم بھی بہت زیرک تھیں۔۔۔ بہت شفیق اور معتدل مزاج کی۔

اس نے تقدیس سے رضامندی لینے کے بعد یہ رشتہ طے کر دیا۔۔۔ شادی چھ مہینے بعد قرار پائی۔

☼ ☼ ☼

”یار! پہلے تو تم حسن کے ہوا کرتے تھے۔۔۔ شادی میرے ساتھ کیوں کر رہے ہو؟“

خرم نے وصی کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے کہا۔۔۔ دونوں اس وقت واک کرتے ہوئے مارکیٹ کی طرف نکلے تھے۔

”خدا کا نام لیں خرم بھائی۔۔۔! میں۔۔۔ اور آپ کے ساتھ شادی؟۔۔۔ مجھے کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے؟“ وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

”او مسخرے۔۔۔ میرے ساتھ نہیں۔۔۔ مگر میری شادی والے دن تو کر رہا ہے نا شادی۔۔۔ تجھے کوئی اور دن نہیں ملا۔“

”اکیلے ڈوبنے میں کیا مزا۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔ آپ کو بھی اکیلے ڈوبتے میں اداسی ہو گی۔۔۔ تو ہم بھی ڈوب جاتے ہیں صنم۔۔۔“ اس نے مصرعے میں ردّوبدل کیا۔

”اڑتے اڑتے سنا ہے کہ تیرا کسی سے دھانسو عشق بھی چلا تھا؟“

خرم کے ٹٹولنے پہ وصی کی وہ نمائشی مسکراہٹ ماند پڑ گئی جو پچھلے دو ڈھائی مہینوں سے اس نے کسی نقاب کی طرح اوڑھ رکھی تھی۔

”سنی سنائی پہ یقین نہیں کرتے۔۔۔“ اس نے جھٹلانا چاہا۔

”پھر بھی یار! مجھ سے کیا پردہ۔۔۔“ وہ تفصیل جاننے پہ مصر تھا۔

”بس ایسے ہی۔۔۔ غلط فہمی ہو گئی تھی سب کو۔“

اور اس سوال کے جواب کی تلاش میں تو وہ خود تھا‘ پچھلے کئی روز سے۔۔۔ کہ غلط فہمی اصل میں ہوئی کسے تھی۔۔۔ اسے؟ یا سوہا کو؟

کیا سوہا کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے؟

یا اسے یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ سوہا سے محبت کرتا ہے؟۔۔۔ اور پتا نہیں۔۔۔ محبت کرتا ہے؟ یہ غلط فہمی تھی؟ یا۔۔۔ محبت نہیں کرتا۔۔۔ یہ غلط فہمی ہے؟

اور ہر بار اس سوال کے جواب میں اسے ایک سناٹا ملتا تھا۔۔۔ ایک ہولناک سناٹا۔۔۔ اور تب اپنے اندر کے اس سناٹے اور اس تاریکی سے گھبرا کے وہ بلند و بانگ قہقہے لگانے لگتا۔۔۔ اونچی آواز میں باتیں کرنے لگتا۔۔۔ کار کے ڈیک کا والیوم فل کر دیتا۔

اس پہ بس نہ چلتا تو بلاوجہ ہارن پہ ہارن دیے جاتا۔۔۔ مگر یہ خالی پن تھا کہ بھر نہ پا رہا تھا۔

”نام کیا تھا محترمہ کا؟“ خرم کے سوال پہ وہ چونکا۔۔۔ پھر شرارت سے مسکرایا۔

”تقدیس۔۔۔ حیرت ہے۔۔۔ شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے۔ اور آپ اپنی ہونے والی دلہن کا نام تک بھول گئے۔“

”بنا و مت۔۔۔ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“

”یار! آپ کیا یہ۔۔۔“ بات کرتے کرتے اس کی نظر فاسٹ فوڈ اسپاٹ کے پاس کار پارک کرتی سوہا پہ پڑی۔۔۔ وہ وہیں جم گیا۔۔۔

”سوہا۔۔۔!“ ایسا لگا جیسے مہینوں نہیں۔۔۔ بلکہ مدتوں بعد اس نے یہ نام لیا ہو۔

”اوہو۔۔۔ تو سوہا نام تھا محترمہ کا۔۔۔ مزید عہد اربعہ کیا تھا۔۔۔ کولیگ تھی؟۔۔۔ کلاس فیلو؟۔۔۔ یا کسی دوست کی ہمشیرہ؟ عموماً“ ایسی قلبی وارداتیں انہی جگہ پہ ہوتی ہیں‘ یا پھر پڑوس میں۔۔۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ سوہا نام کی کوئی پڑوسن ہماری ہوتی اور میں اس سے ناواقف ہوتا۔۔۔ بھئی آخر اس محلے میں بچپن اور لڑکپن گزرا ہے۔“

وہ شوخی سے کہتا ایک دکان کے باہر رک کر شوکیس میں لگے کھلونے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ جو اس کی کمزوری تھے۔ بچپن چلا گیا مگر کھلونوں سے اس کا لگاؤ ختم نہ ہوا تھا۔ لیکن وصی کا دھیان اس کی گفتگو کی جانب نہیں تھا۔۔۔ وہ مکمل طور پہ سوہا میں گم تھا۔۔۔ جواب کار سے باہر نکل رہی تھی۔۔۔ وصی کو دھچکا لگا۔

وصی ٹنگ ٹخنوں سے خاصی اونچی جینز۔۔۔ وہی فٹنگ والا سلیولیس اور کھلے گریبان کا ٹاپ۔۔۔ وہی انگلیوں میں دبا سگریٹ۔۔۔ وہی چہرے پہ پچھلی معصومیت کی جگہ ناچتی ہوئی وحشت اور چنگھاڑتی ہوئی کرختگی۔

سگریٹ ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے وہ چٹکی بجا کے ویٹر کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

”یار۔۔۔ اکتنے عجیب عجیب کھلونے بننے لگے ہیں اب۔۔۔ کھلونے کم اور جنگی آلات زیادہ لگتے ہیں۔۔۔ ٹینک۔۔۔ آبدوز۔۔۔ ریوالور۔۔۔ مجھے تو لگ رہا ہے کھلونے کی دکان کے آگے نہیں۔۔۔ اسلحے کے ڈپو کے آگے کھڑا ہوں۔۔۔ دیکھنا

ذرا۔۔۔" یہ کہتے ہوئے خرم نے وصی کی جانب دیکھا تو چونک گیا۔۔۔ وصی کے چہرے پہ دراڑیں ہی دراڑیں تھیں۔
"وصی!" گھبرا کر کے خرم نے اسے کاندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ ہڑبڑا کے خرم کو دیکھنے لگا۔۔۔ خالی خالی نظریں۔۔۔ دماغ ماؤف۔۔۔
"کیا ہوا ہے؟" جواب نہ ملنے پہ خرم نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔۔۔ کوئی فاسٹ فوڈ ٹیک اوے تھا۔۔۔ جہاں ایک لڑکی کسی ویٹر کو آرڈر نوٹ کروا رہی تھی۔
خرم کو وصی کی بدلتی کیفیت کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔
"سوہا۔۔۔!"
کسی لڑکی کے زور سے چلّا کے متوجہ کرنے پہ جہاں سوہا نے پلٹ کر اسے ہاتھ ہلا کے جواب دیا۔۔۔ وہیں خرم بھی سارا معاملہ سمجھ گیا۔
"اوہ۔۔۔ تو یہ ہے سوہا!"
اس نے مایوسی سے پہلے وصی کو۔۔۔ پھر سوہا کو دیکھا۔۔۔ وصی کے چہرے پہ اتنی ویرانی تھی کہ خرم کو خوف سا محسوس ہوا۔۔۔
دوسری جانب سوہا کو دیکھنے کے بعد خرم کو پھر سے خوف نے آن گھیرا۔
"کہیں خدانخواستہ یہ لڑکی وصی کی زندگی کی ساتھی بن جاتی۔۔۔ ہمارے گھر کی بہو۔۔۔ ہمارے خاندان کا حصہ۔۔۔ تو؟"
سوہا کے موجودہ حلیے اور انداز کو دیکھنے کے بعد خرم کی یہ سوچ غلط نہیں تھی۔۔۔ ہاں اگر وہ اسے ان دنوں دیکھتا جب وہ وصی کی چاہت کے رنگ میں رنگی تھی۔۔۔ تو تب ضرور کچھ اور سوچتا۔ اس نے وصی کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔
"چلو۔۔۔ گھر چلیں۔۔۔"
وصی کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ خرم نے اس سے کوئی اور سوال نہ کیا۔۔۔ نہ سوہا کے بارے میں، نہ اس کے ملنے کے بارے میں۔۔۔ نہ اس سے الگ ہونے کے بارے میں۔۔۔

○ ○ ○

سوہا کب سے کالج جانا چھوڑ چکی تھی۔۔۔ وہ تو پتا نہیں کیا کیا چھوڑ چکی تھی۔
جینے کی امنگ۔۔۔
جینے کا ڈھنگ۔۔۔
ہر قسم کی امید۔۔۔ ہر قسم کی توقع۔۔۔ بس جیے جا رہی تھی۔۔۔ جیسے خودرو جھاڑیاں بڑھتی جاتی ہیں۔
ریتا اسے دیکھ دیکھ کے کڑھتی رہتی۔۔۔ مگر فی الحال اسے ٹوکنے سے گریز کر رہی تھی۔۔۔ وہ اسے سنبھلنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔۔۔ جانتی تھی۔۔۔ کہ ابھی کسی بھی قسم کی نصیحت یا روک ٹوک اسے برانگیختہ کر دے گی۔
سوہا نے دوبارہ وصی سے ملنے کی کوشش کی نہ کبھی رابطہ کیا۔۔۔ وہ جو خوفزدہ تھا کہ پتا نہیں وہ کیا کچھ کرے گی۔۔۔ منتظر ہی رہا کہ وہ اس کا گریبان تھام کر کوئی سوال کرے۔
وصی تو وصی اس نے تقدیس سے بھی ہر طرح کا تعلق منقطع کر رکھا تھا۔۔۔ اسی لیے اسے اچانک اپنے گھر پہ دیکھ کے حیران رہ گئی۔
"تم؟۔۔۔"
تقدیس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ تو سوہا کو پہچاننے کی کوشش میں بھی ناکام ہو گئی تھی۔ یہ وہ سوہا تو نہیں لگ رہی تھی۔۔۔ جس سوہا سے اس کی دوستی چند مہینوں میں سالوں کے یارانے کا سفر طے کر گئی تھی۔

سوہا تو اس سوہا سے کہیں زیادہ بدحال اور بگڑی ہوئی حالت میں تھی۔۔۔ جس سوہا کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔۔۔ اور جو کچھ اس کی دوستی کی وجہ سے اور کچھ وصی کی محبت اور توجہ کی وجہ سے بتدریج بدلتی گئی تھی۔
اس سوہا نے واپسی کا سفر بھی اتنی ہی تیزی سے طے کیا تھا۔ تباہی کے دہانے تک واپسی۔۔۔
سگریٹ نوشی سے سیاہ پڑے ہونٹ۔۔۔ بکھرے، اجڑے، روکھے۔۔۔ بے رونق بال۔۔۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور متورم پپوٹے۔۔۔ جیسے بے شمار راتوں کے رت جگے کا اعجاز ہوں۔
رنگت جھلسی ہوئی۔۔۔ تقدیس کو حقیقتاً دکھ ہوا۔۔۔
"کیسے آئی ہو؟" سوہا چاہنے کے باوجود لہجہ ایک حد سے زیادہ روکھا نہ کر سکی۔
"یہ کارڈ دینے آئی تھی۔" سات، آٹھ ماہ کے تعطل نے اس دوستی کو کتنا پرتکلف کر دیا تھا۔
"میں وہی سوہا ہوں تقدیس جعفر محمود۔۔۔" سوہا نے تلخی سے کہا اور اپنے کمرے سے لاؤنج کا رخ کرتی ریتا اس نام پر ٹھٹک کر رکی۔
"جسے تم نے ایک بار اپنی بہن کی شادی پہ بلانا گوارا نہیں کیا تھا۔۔۔ اسے اپنے خاندان کی ہتک سمجھی تھی تم۔۔۔ پھر اب کس دل سے بلانے آئی ہو۔۔۔؟ میں وہی تو ہوں۔"
"نہیں سوہا۔۔۔! تم وہ نہیں ہو۔۔۔" تقدیس نے دکھ سے چور چور لہجے میں کہا۔
"بہت بدل گئی ہو تم۔۔۔ پہلے مجھے لگتا تھا لوگ تمہارے بارے میں بکواس کرتے ہیں۔۔۔ تم اندر سے وہ نہیں۔۔۔ جیسی سب کو نظر آتی ہو۔۔۔ اور پھر تم نے ویسا نظر آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔۔۔ لیکن اب تم وہی لگنے لگی ہو۔۔۔ وہی۔۔۔ جیسا سب تمہارے بارے میں کہا کرتے تھے۔"
ریتا سلگ کے رہ گئی۔۔۔ اسے لگا یہ تقدیس نہیں ہے، جو سوہا کے سامنے کھڑی ہے۔۔۔ یہ جعفر محمود ہے۔ جو ریتا کی ذات کے پرخچے اڑا رہا تھا۔
"بہرحال۔۔۔ یہ کارڈ ہے۔۔۔ میری شادی کا۔۔۔ اگر میری خوشیوں میں شامل ہونا گوارا ہو تو آجانا۔۔۔"
"کیوں اپنی خوشیوں کو نظر لگوانی ہے۔۔۔" سوہا نے اس کی پشت پہ زہر اگلا۔۔۔
"آئے گی۔۔۔ کیوں نہیں آئے گی۔۔۔ ضرور آئے گی۔" ریتا جلدی سے آگے بڑھی تو باہر نکلتی تقدیس کو رکنا پڑا۔
"السلام علیکم آنٹی۔۔۔!"
"وعلیکم السلام۔۔۔ یہ بہت عرصے بعد نظر آئی بیٹا۔۔۔!"
"جی۔۔۔ وہ۔۔۔" تقدیس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
"شادی ہو رہی ہے تمہاری۔۔۔" ریتا نے کارڈ پہ نظریں دوڑائیں۔
"مسٹر اینڈ مسز جعفر محمود۔" پر نظریں دوڑاتے ہی دل پہ گھونسا سا لگا تھا۔ بہت مشکل سے وہ مسکرائی۔۔۔ اور کھوکھلے دل سے کہا۔
"مبارک ہو بیٹا۔۔۔! ضرور آئے گی سوہا۔۔۔" سوہا نے جزبز ہوتے ہوئے ریتا کو دیکھا۔
"لیکن ماما۔۔۔!"
"ایسے موقعوں پہ دوست ہی تو رونق بڑھاتے ہیں۔۔۔" ریتا نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔
"آپ۔۔۔ آپ بھی۔۔۔ آئیے گا آنٹی!" محض مروتاً۔۔۔ منہ دیکھے کے لحاظ میں تقدیس نے ریتا کو بھی دعوت دے دی۔۔۔ مگر اس کی ہکلاہٹ اور ہچکچاہٹ اندرونی کیفیت کا پتا دے رہی تھی۔
ریتا یوں مسکرائی جیسے اس کا بھرم بھی رکھ رہی ہو۔۔۔ اور اسے یہ بھی باور کرا رہی ہو جیسے اس کھوکھلی دعوت کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو۔ تقدیس خفت زدہ سی نظریں جھکا گئی۔
"ضرور آتی۔۔۔ دراصل اس دن میری کسی دوست کے ہاں بھی ایک اہم فنکشن ہے۔۔۔ وہ مس کرنا بھی ممکن نہیں۔۔۔ ورنہ ضرور شرکت کرتی تمہاری شادی کے فنکشن میں۔۔۔ ویسے بھی میری بڑی خواہش ہے تمہارے۔۔۔"

اس نے ذرا سا توقف کر کے "تمہارے والد" کو لبوں سے ادا ہونے سے روکا اور فقرہ کچھ یوں مکمل کیا۔
"تمہارے والدین سے ملنے کی۔۔۔"
"تو تم آؤ گی نا سوہا۔۔۔؟" تقدیس نے پوچھا تو سوہا کچھ سخت جواب دیتے دیتے رک گئی۔۔۔ ریتا نے اس کا ہاتھ بہت سختی سے دبایا تھا۔
"کیوں نہیں۔۔۔ میں خود چھوڑ کے جاؤں گی۔" اور اس کے جانے کے بعد سوہا نے بہت الجھ کر کہا تھا۔
"کیوں جاؤں میں وہاں۔۔۔ کس منہ سے اب مجھے بلانے آئی تھی۔۔۔ کیوں اس دوستی پہ پانی کے چھینٹے دینے آئی تھی یہ۔۔۔ ویسے بھی میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا۔۔۔ خصوصاً" ان جیسوں کے ہاں تو بالکل بھی نہیں۔۔۔ دوغلے۔۔۔ منافق لوگ۔۔۔ وہ وصی۔۔۔ اس کی فیملی بھی تو ایسی تھی۔۔۔ اس کی فیملی جیسی۔۔۔ کہاں پسند کریں گے یہ مجھے۔۔۔ بڑے مان سے دعوت دینے آئی ہے۔ تب چھپاتی پھرے گی مجھے۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ جہاں عزت ملے۔۔۔ نہ محبت۔۔۔ وہاں کیا کرنے جاؤں میں۔۔۔ میں لعنت بھی نہیں بھیجنا چاہتی ایسے کھوکھلے شریف زادوں پہ۔۔۔"
"بھیجو۔۔۔ لعنت تو ضرور بھیجو۔" ریتا کے سرد لہجے پہ غصے میں بھری سوہا ٹھٹکی۔
"جن کے پاس تمہارے لیے سوائے ملامت کے کچھ نہ ہو' ان پہ کم از کم لعنت تو بھیجو۔۔۔ تم ضرور جاؤ گی اس کی شادی میں۔۔۔ نہ صرف شادی پہ۔۔۔ بلکہ ہر فنکشن پہ۔۔۔ اور کوئی ضرورت نہیں خود پہ کوئی لبادہ۔۔۔ کوئی نقاب ڈالنے کی۔۔۔ جیسی ہو۔۔۔ ویسے جاؤ۔۔۔ فخر سے بتاؤ سب کو۔۔۔ کہ تم ریتا کی بیٹی ہو۔۔۔ کیا تمہیں اس پہ شرم محسوس ہوتی ہے؟"
"نہیں۔۔۔ شرم تو مجھے وصی اور تقدیس جیسے دوستوں پہ اعتبار کرنے کے خیال سے آتی ہے۔"
"تو اب انہیں شرم سے منہ چھپانے دو۔۔۔ جس دوستی سے انہوں نے دامن جھٹک کر پیچھا چھڑایا ہے۔۔۔ اس چند روزہ دوستی کا مزہ تو چکھنے دو انہیں۔۔۔ وہ ہنگامہ مچانا۔۔۔ وہ طوفان اٹھانا اس کی شادی پہ کہ ساری عمر اسے یاد رہے کہ روکھے منہ کس کو بلانے آئی تھی۔"
بات سوہا کی سمجھ میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کسی کے ساتھ جا رہی ہیں؟" وصی نے چادر اوڑھتی پروین سے پوچھا۔
"حسان کے ساتھ۔۔۔ حسن کے ساتھ جانا چاہتی تھی کہ وہ بڑا ہے۔۔۔ ایسے موقعوں پہ تو ہم کسی وقتوں میں برادری کی ساری عورتیں لے کر جایا کرتے تھے۔۔۔ آخر شگنوں کے گہنے کا ناپ لینا ہوتا تھا۔۔۔ رسم ہوتی ہے یہ بھی۔۔۔ لیکن اماں جان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔۔۔ اب ہر بات پہ انہیں ساتھ لیے لیے پھرنا مناسب نہیں لگتا۔۔۔ رخشندہ بھابی کا ساتھ جانے کا ارادہ تھا۔۔۔ ندا کو بھی بلاوا بھیجا تھا۔۔۔ لیکن ندا کا آج لیڈی ڈاکٹر سے ملنے کا وقت تھا۔۔۔ رخشندہ بھابی ہی کے ساتھ گئی ہے اور حسن۔۔۔ وہ تو ویسے ہی خار کھاتا ہے وہاں جانے کے نام سے' نجانے ماموں نے کون سی بھینس کھولی ہے اس کی۔" وہ پرس میں نوٹ گن کے رکھتے ہوئے بے زاری سے کہہ رہی تھیں۔
"ہما ساتھ جا رہی ہے میرے۔۔۔ اکیلے بھی تو جانا مناسب نہیں لگتا۔"
"میں چلوں ساتھ؟"
وہ بے قراری سے بولا تو پروین چونک گئیں۔۔۔ غور سے اسے دیکھا۔۔۔ وہاں جانے کے لیے ایسے والہانہ پن اور بے تابی کا اظہار اس کی جانب سے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔
"تم کیا کرو گے؟" وہ حیرت اور ناگواری کے دبے دبے اظہار کے ساتھ دریافت کرنے لگیں۔
"وشمہ کی چوڑیوں کا ناپ لینے جا رہے ہیں۔۔۔ تمہاری کیا ضرورت ہے وہاں۔۔۔"
"میں۔۔۔ ویسے ہی۔۔۔ حسان بھی تو جا رہا ہے۔۔۔ اس کے بجائے میں لے چلتا ہوں۔۔۔" پروین نے چند ثانیے بغور اسے دیکھا۔۔۔

ایک عجیب سا اضطراب اس کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا' جسے وہ کوئی نام نہ دے سکیں۔
"چلو۔۔۔
ٹھہرا" اجازت دے کر وہ مڑیں۔۔۔ مگر موڈ آف ہو چکا تھا۔۔۔ ان کا خیال تھا شاید وصی' وشمہ سے ملنے کی تڑپ ساتھ کھنچا چلا آ رہا ہے۔
نہ اتنی تنگ نظر تھیں' نہ دقیانوسی خیالات کی مالک۔۔۔ ویسے بھی اب ایک دو ہفتے میں وشمہ اور وصی دونوں ازدواج میں منسلک ہونے والے تھے۔۔۔ لیکن وشمہ کے معاملے میں ایسی دل میں گرہ پڑی تھی۔۔۔ جو نکلنے کا نہیں لے رہی تھی۔۔۔ بڑے بجھے دل کے ساتھ وہ اس کا ناپ لینے گئیں۔

☼ ☼ ☼

جب سے اس نے سوہا کو اسی پرانے رنگ ڈھنگ میں دیکھا تھا۔۔۔ دل کا عجیب سا حال تھا۔ کسی ایک رات کی اس نے پوری نہیں لی تھی۔ کسی ایک وقت کا کھانا اس نے رغبت سے نہیں کھایا تھا۔
کسی ایک بات پہ بھی اس کے لب کھل کے نہیں مسکرائے تھے۔
ہیں اس کا بھلا کرنے چلا تھا۔۔۔ اسے ڈبو آیا۔۔۔ اس کا ہاتھ تھام کے اسے دلدل میں دھنسنے سے بچانے چلا خود کھائی میں۔۔۔ دونوں ہاتھوں سے دھکا دے آیا۔۔۔ بہت ظلم کیا میں نے اس پہ۔۔۔ بہت ظلم۔۔۔ پتا نہیں اللہ مجھے معاف کرے گا یا نہیں؟۔۔۔ پتا نہیں وہ مجھے معاف کرے گی یا نہیں؟۔۔۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی جو یہ دکھ سہہ جاتی۔۔۔ وہ تو محبت کو ترسی ہوئی۔۔۔ ازل سے پیاسی لڑکی تھی۔۔۔ اس کے آگے بھرا جام رکھ کے۔۔۔ آس لگا کے پھر سے اٹھا لینا۔۔۔ نہیں' یہ نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے۔۔۔ میں اس کی آہ لے کر۔۔۔ اس کی بددعائیں سمیٹ کر کیسے کسی نئے دور میں قدم رکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے ساتھ ساتھ وشمہ کو بھی ان بددعاؤں میں حصے دار بنا رہا ہوں۔"
دن رات ملامت اور خود اذیتی کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔۔۔ سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا۔۔۔ تو سوہا کا چہرہ پتلیوں پہ آ جم جاتا۔
اس سے فرار حاصل کرنے کے لیے کوئی راہ نہ سجھائی دے رہی تھی۔۔۔ پھر جب پروین کو وشمہ کے ہاں جاتے دیکھا تو لگا دھیان بٹانے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو گا۔ وہ جب سے وشمہ سے اس بندھن میں بندھا تھا۔۔۔ سے اس انداز سے سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔۔۔ جیسے کہ اس نازک بندھن کا تقاضا تھا۔۔۔ یہ خیال تو ابھی ابھی ذہن میں آیا تھا کہ سوہا سے ذہن ہٹانے کے لیے وشمہ کا سہارا ابھی بہت ہو سکتا ہے۔ اتنا احساس تو اسے تھا کہ وہ کتنا سرد اور لیا دیا رویہ وشمہ سے روا رکھتا تھا' لیکن وہ ضرور اس کے بارے میں نازک احساسات رکھتی تھی۔
یہ تو اس کی ہر اس نظر سے واضح ہو جاتا تھا جو وہ وصی پہ کبھی ڈالتی تھی۔۔۔ ہاں وصی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے دل میں یہ جذبات منگنی ہو جانے کے بعد پیدا ہوئے ہیں یا پہلے سے ہیں۔۔۔
"جب اس رشتے سے بندھ جانے کے بعد وہ سادہ دل لڑکی مجھ سے محبت کرنے لگ سکتی ہے تو مجھے اس سے محبت کیوں نہیں ہو سکتی۔۔۔؟ ضرور ہو سکتی ہے۔۔۔ میں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔۔۔ کبھی نظر بھر کے اسے دیکھا نہیں۔۔۔ کیا کمی ہے اس میں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ضرور ہو گی۔۔۔ مجھے اس سے محبت ہو گی۔۔۔ میری محبت پہ سب سے پہلا حق اسی کا ہے۔"
ڈرائیونگ کرتا وصی یہ سوچ رہا تھا۔ اور اس کا دل منہ چھپا کے اسی پہ ہنس رہا تھا۔
"محبت کوشش کرنے سے نہیں ہوتی۔۔۔ نہ کسی کو نظر میں رکھنے سے ہوتی ہے۔۔۔ نہ کبھی اس سے ہوتی ہے جس کا حق ہو۔۔۔ محبت تو نقب زن ہے۔۔۔ محبت تو رہزن ہے۔۔۔ یہ ہمیشہ چور راستوں سے آتی ہے۔۔۔ یہ ہمیشہ وہیں اترتی ہے جہاں پہ پل بھر ٹھہرنے کی توقع نہ ہو۔"

☼ ☼ ☼

وشمہ کے پیر زمین پہ نہ ٹک رہے تھے۔۔۔ منگنی کے بعد پہلا موقع تھا کہ وصی یوں آیا تھا۔۔۔ اور پروین تو شاید کبھی

نہ بتاتیں۔۔۔ حسان نے ہنستے ہنستے بتادیا تھا کہ وصی کس طرح اصرار کر کے ساتھ آیا تھا۔۔۔ اور وشمہ کے اندر دور تک پھول ہی پھول کھل گئے تھے۔

اس کا اپنا چہرہ بھی کسی پھول کی مانند کھلا ہوا تھا۔۔۔ پروین نے نظر بھر کے دیکھا تو ان کے اندر کی خفگی جیسے پل بھر میں ڈھل گئی۔

"ماشاءاللہ۔۔۔" وہ زیر لب کہہ کے رہ گئیں۔

اور وصی نے ایک نظر تو کیا۔۔۔ دوسری۔۔۔ تیسری۔۔۔ چوتھی نظر تک ڈال کے دیکھی۔۔۔ وہ دلربا، دلکش سا چہرہ دل میں نہ اترتا تھا، نہ اترا۔۔۔ وہ پتھرائی نگاہیں وشمہ کے سراپے پہ ڈالتا رہا۔۔۔ اور سوہا کی شبیہہ اس کی روح میں شگاف اور دراڑیں ڈالتی رہی۔ وحشت زدہ سا ہو کر وہ چائے کا ایک ہی گھونٹ لینے کے بعد میز پہ پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا بیٹا؟" منزہ جو گاجر کا حلوہ اس کے سامنے کر رہی تھی، حیرت سے پوچھنے لگی۔

"جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میں ابھی آیا۔" وہ فوراً" باہر نکلنے لگا۔

"وصی۔۔۔!" پروین نے پیچھے سے پکارا۔۔۔ مگر وہ ان سنی کرتا باہر نکل چکا تھا۔

پروین نے منزہ کی سوالیہ نظروں سے خائف ہو کر نظریں چرالیں اور کمزور لہجے میں وضاحت پیش کی۔

"کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو گا۔"

منزہ نے انہیں تو کچھ نہ کہا، البتہ کمرے میں موجود وشمہ سے جا کر یہ ضرور کہا۔

"اچھا بھلا بیٹھا تھا وصی۔۔۔ پروین نے نجانے کس بات پہ گھور کے تنبیہہ دیتی نظروں سے دیکھا کہ بے چارہ اٹھ کے ہی چلا گیا۔"

اور وشمہ نے فوراً" یہی سوچا کہ پھپھو کو وصی کا یہاں آنا۔۔۔ خصوصاً" اس سے ملنے کی خواہش لے کر ملنے آنا پسند نہیں آیا۔ اس کے اندر کڑواہٹ پھیل گئی۔

✡ ✡ ✡

تیزی سے کار لے جاتی سوہا کو یونہی وہم سا ہوا کہ فٹ پاتھ پہ کھڑی وہ تقدیس ہے۔۔۔ اسے اچنبھا ہوا۔۔۔ وہ تو ہمیشہ اپنی گاڑی پہ آتی جاتی تھی۔۔۔ دو، دو گاڑیاں بمعہ ڈرائیور کے اس کے باپ نے صرف بیٹیوں کو لانے، لے جانے کی غرض سے رکھ چھوڑی تھیں۔

سوہا نے بریک لگائے اور بیک ویو مرر میں غور سے دیکھا۔۔۔ وہ تقدیس ہی تھی۔۔۔ اس نے کار ریورس کی اور اس کے پاس لے جا کے روکی۔

"تقدیس۔۔۔! کیا کر رہی ہو یہاں؟"

"ہوں۔۔۔" وہ بری طرح چونکی۔۔۔ پھر سوہا کو دیکھ کے اس کی جان میں جان آئی۔

"اوہ۔۔۔ تم۔۔۔"

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟ بس کا ویٹ کر رہی ہو؟"

"نہیں۔۔۔ بس وغیرہ کے روٹ کا کہاں پتا ہے مجھے۔۔۔ رکشہ، ٹیکسی جو بھی مل جائے۔"

وہ کافی نروس اور پریشان لگ رہی تھی۔۔۔ سوہا جو ایسے ہی کسی موقعے کی تلاش میں تھی۔۔۔ زیر لب مسکرائی۔

"کار اور ڈرائیور کہاں گئے تمہارے؟"

"کب سے فون کر رہی ہوں اسے۔۔۔ مگر ڈرائیور کا موبائل نمبر آف مل رہا ہے۔۔۔ دراصل میری بیوٹیشن سے اپائنٹمنٹ تھی۔۔۔ ڈرائیور مجھے ڈراپ کر کے ماما کو ٹیلر کے پاس لے جانے والا تھا، لیکن بیوٹیشن کو کسی وجہ سے پارلر بند کرنا پڑا۔ اس کے گھر میں کوئی ایمرجنسی ہو گئی۔۔۔ کوئی سیریس بات لگ رہی ہے، جب بھی اس نے اسٹاف کو بھی چھٹی دے دی۔"

"گھر پہ فون نہیں کیا؟"

"نہیں۔۔۔ ماما کا تو تمہیں پتا ہے کہ پریشان ہو جائیں گی، اور پاپا کو کیا تو وہ الٹا ڈانٹنے لگیں گے کہ ڈرائیور کو جانے دیا۔"

"بیٹھو۔۔۔ میں ڈراپ کر دیتی ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ میں۔۔۔"

"بیٹھ جاؤ تقدیس! گھبراؤ مت۔۔۔ گھر پہ ہی ڈراپ کروں گی۔"

سوہا نے سنجیدگی سے کچھ ایسے کہا کہ تقدیس شرمندہ ہو کے رہ گئی۔۔۔ اور مزید کچھ کہے بغیر چپ چاپ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

✡ ✡ ✡

"مجھے تو یہ مہندی وغیرہ کی رسمیں فضول لگتی ہیں۔۔۔ مگر امی کا اصرار ہے۔۔۔"

"اعتدال اور توازن کے ساتھ ہوں تو رسمیں بری نہیں ہیں یار۔۔۔!" خرم کے پرانے دوست نے اس سے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔

"امی اور باجیوں کو بھی لانا۔۔۔ رضوانہ باجی اور سدرہ باجی کے کارڈز الگ سے لایا ہوں۔"

"ضرور جناب۔۔۔! آج شام کو ہی بھجوا دوں گا۔"

بات کرتے کرتے اس کی نظر سامنے پلازہ کے پارکنگ میں رکتی کار پر پڑی۔۔۔ وہ کارڈ سے توجہ ہٹا کے وہیں تکنے لگا۔ خرم نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

وہی تھی۔۔۔ اس دن والی لڑکی۔۔۔ جس کا تعارف وصی نے سوہا کہہ کر کروایا تھا۔۔۔ اور جس کے بعد وہ اس طرح گیا تھا کہ چاہنے کے باوجود خرم کوئی اور سوال نہ کر سکا تھا۔

وہ کار سے نکلی۔۔۔ پیر کی ٹھوکر سے دروازہ بند کیا۔۔۔ حسب سابق سگریٹ ہونٹوں میں دبا تھا اور وہ بے حد بے نیازانہ اسٹائل سے کش لگاتی پلازہ کی بیسمنٹ کی جانب جا رہی تھی۔

"ایک تو یہ ہمارے محلے کا گند۔۔۔" خرم کا دوست بے حد مکدر لہجے میں بڑبڑایا۔

"کیا کہا تم نے؟" خرم نے چونک کر استفسار کیا۔

"یہی۔۔۔ واہیات کپڑوں والی۔۔۔ سگریٹ پیتی سیڑھیاں اتر رہی ہے جو۔۔۔"

"تم جانتے ہو اسے؟"

"اسے کون نہیں جانتا۔۔۔ آدھے سے زیادہ شہر واقف ہے اس کی آوار گردیوں سے۔۔۔ طوائف زادی ہے۔"

"واقعی؟" خرم نئے سرے سے الجھ گیا۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وصی جیسے سیدھے سادے لڑکے کی کہانی اس طوائف زادی سے کیسے ٹکرائی۔

"یار ان لوگوں نے اب ہر علاقے میں گند پھیلا رکھا ہے۔ پورا علاقہ تنگ ہے، اس قسم کے ٹولوں سے۔۔۔ شریف اور خاندانی لوگ جائیں تو کہاں جائیں۔۔۔ ہر جگہ یہ گھسے ہوئے ہیں اور اچھی بھلی خاندانی لڑکیوں کو بھی اپنے چکر میں لگائے ہوئے ہیں۔۔۔ اب اسے ہی دیکھ لو۔۔۔ اس کی سہیلی کو۔۔۔ شکل سے سیدھی سادی شریف سی۔۔۔ معصوم لگ رہی ہے۔۔۔ مگر ہے تو اس کے ساتھ۔۔۔ اس کے جیسی ہی ہو گی۔"

خرم نے تب پہلی بار کار کے اندر بیٹھی تقدیس کو ذرا توجہ سے دیکھا۔۔۔ اور اس کے اندر جھماکا ہوا۔۔۔ اس شکل کو وہ کیسے فراموش کر سکتا تھا۔۔۔

یہ صورت تو آج کل دن رات دیکھا کرتا تھا۔۔۔ آنکھوں میں ان گنت سپنے سجا کے۔

تقدیس کی تصویر اسے رخشندہ نے ہی دی تھی۔۔۔ اور پہلی نظر اس پہ ڈالتے ہی وہ ماں کے حسن ظن کا قائل ہو گیا تھا۔ وہ بہت حسین۔۔۔ بہت دلکش نہیں تھی مگر کوئی بات تھی ضرور اس میں۔۔۔ جو سادہ سی مسکراہٹ اور ہنستی آنکھوں والا یہ چہرہ دل میں اترا جاتا تھا۔

اس چہرے کو وہ کیسے نہ پہچانتا۔

"میں کیا کروں گا جا کے؟"

وہ بہت الجھا ہوا تھا۔ ابھی کل شام اس نے تقدیس کو اس کار میں۔۔۔ اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا اور اب تک وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ یہ نظروں کا دھوکا تھا یا کسی قسم کا ابہام اور آج اس کی مہندی کی تقریب تھی۔ رخشندہ اسے ساتھ جانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

"مہندی پر لڑکے کا ساتھ جانا ہمارے ہاں کا رواج ہے بھی نہیں۔۔۔ لیکن صبح ہی سب نے یہ طے کیا ہے کہ نکاح کی ادائیگی آج ہی کر دی جائے۔"

"کیوں۔۔۔؟ میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔" وہ بات بے بات چڑ رہا تھا۔

"خدانخواستہ۔۔۔" رخشندہ دہل گئیں۔

"یہ صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ کل کا فنکشن وقت پہ ختم ہو جائے۔ بارات کے جاتے ہی دوسری چھوٹی موٹی رسمیں ہوں اور کھانے کے فوراً بعد رخصتی۔۔۔"

"امی۔۔۔! میں۔۔۔" خرم بے بس سا ہوا تھا۔ کل سے جس الجھن کا شکار تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا ذکر کس سے کرے۔ کبھی دل چاہتا۔۔۔ وصی کو اعتماد میں لے لے۔ مگر وصی خود اتنا بکھرا بکھرا شکستہ سا نظر آ رہا تھا ان دنوں کہ اس سے سوہا کا ذکر کرنا اس کے زخموں پہ نمک چھڑکنے کے مترادف ہوتا گویا۔۔۔

"چلو شاباش تیار ہو جاؤ جلدی سے۔ اچھا ہے اس بہانے مہندی کا فنکشن بھی وقت پہ ختم ہو جائے گا ورنہ کب ہم وہاں سے واپس آتے کب وہ لوگ آ کے تمہیں مہندی کی رسم کراتے۔۔۔"

"آپ کو صرف وقت کی بچت کی پڑی ہے۔"

"ہاں تو اچھا ہے نا۔۔۔ اتنی تو سردی ہے۔۔۔ چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہیں۔ جلدی تیار ہو جاؤ سب انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔" وہ بے بسی سے راسلک کا کرتا ہاتھ میں لیے اسے دیکھتا رہا۔

سوہا کو یہاں آنے کے بعد یکے بعد دیگرے کئی جھٹکے لگے تھے۔۔۔ پہلا جھٹکا اسے وصی کو دیکھ کے لگا۔۔۔

اسے نہیں پتا تھا کہ تقدیس کی شادی وصی کے خاندان میں ہو رہی ہے۔

دوسرا جھٹکا اسے منزہ کو دیکھ کے لگا۔۔۔ جو وشمہ کے ساتھ فنکشن میں موجود تھی۔

اتنا تو وہ جانتی تھی کہ منزہ میں اور وصی کی ممانی میں کیا رشتہ ہے۔ مگر یہ نہیں پتا تھا کہ یہ رشتہ وصی اور وشمہ کے حوالے سے ایک نیا رخ اختیار کر چکا ہے۔ جیسے ہی کسی کے توسط سے یہ حقیقت اس پہ واضح ہوئی اس کے اندر کی کھولن تیز ابی سی ہو گئی۔

منزہ۔۔۔ جس کی کیفیت عرصے بعد سوہا کو سامنے پا کے عجیب سی ہو رہی تھی۔ اب اس سے چھپتی پھر رہی تھی۔ کہاں تو اسے سامنے پا کے یک بارگی دل اسے گلے لگانے کو مچل رہا تھا اور کہاں اب وہ کتراتی ہوئی نظریں چرا رہی تھی۔ وجہ سوہا کا حلیہ اور دانستہ کی جانے والی حرکتیں تھیں۔۔۔ جن کی خاص تیاری وہ کر کے آئی تھی۔ ریتا کے مشورے سے اس نے اس شادی میں تماشا لگانے کا سوچا ضرور تھا۔ مگر اب وصی۔۔۔ منزہ۔۔۔ اور وشمہ کی وجہ سے وہ صرف تماشا نہیں بلکہ ڈرامہ کرنے کے موڈ میں آ گئی۔

لباس تو وہ پہلے ہی خاصا قابل اعتراض پہن کے آئی تھی۔ سگریٹ کے کش بھی مسلسل لگائے جا رہی تھی۔ کسی معمولی سی بات پر اس نے تقدیس کے بہنوئی یعنی تحریم کے شوہر کا گریبان پکڑ لیا اور ایک کے بعد ایک تھپڑ جڑنے لگی۔

اسے خود بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ بس اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک لاوا سا تھا۔ جو اندر سے ابل ابل کے باہر گر رہا تھا۔

کچھ لوگ حق دق اسے دیکھ رہے تھے۔

کچھ لوگ مزا لینے کے سے انداز میں۔۔۔

خدیجہ یہ جاننے کے بعد کہ یہ تقدیس کی دوست ہے اور اسی کی دعوت پہ آئی ہے۔ اپنے سمدھیانے سے منہ

پانی پھر رہی تھی۔

جعفر محمود کا بس نہ چل رہا تھا اس چند فٹ کی چھوکری کو اٹھوا کے باہر پھینک دے۔۔۔ اس نے سیکورٹی کو بلوا کے انتہائی سخت الفاظ میں کچھ کہا۔

منزہ کی نظریں زمین پر گڑی جا رہی تھیں۔ کیونکہ یہاں موجود سب لوگ نہ سہی۔ مگر چند ایک تو تھے۔ جو جانتے تھے کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔

پروین۔۔۔ ندا اور شوکت جہاں بیگم تاسف کے ساتھ ساتھ شکرانے کا اظہار بھی کر رہی تھیں کہ خدا نے بروقت انہیں ایسا تماشا اپنے گھر میں لگوانے کی ذلت سے بچا لیا۔

اور تقدیس مایوں کے جوڑے میں سر جھکائے بیٹھی اس وقت کو کوس رہی تھی جب پرانی دوستی کے لحاظ میں اسے بلا بیٹھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ماں سے ہونے والی متوقع عزت افزائی کے لیے بھی خود کو تیار کر رہی تھی۔

خرم۔۔۔ ہاتھ میں قلم لیے۔۔۔ نکاح نامہ سامنے رکھے سوچ رہا تھا کہ اب کون سا موقع ہے اس سے بچنے کا۔ کاش اس نے صبح ہی دل کڑا کر کے یہ فیصلہ کر لیا ہوتا تو آج زندگی میں اس لڑکی کو شامل نہ کرنا پڑتا۔۔۔ جو ایسی صحبت کا شکار رہی ہے اور کون جانے۔۔۔ اس کی اپنی ذات میں اس کی اس دوست کے کون کون سے رنگ شامل ہیں۔

ان سب سے الگ۔۔۔ ایک کونے میں کھڑا وصی پتھرائی نظروں سے دو سیکیورٹی گارڈز کو سوہا کو کھینچتے ہوئے ہال سے باہر لے جاتے دیکھ رہا تھا۔

"یہ ہے کون؟"

کسی نے بہت نزدیک کھڑے ہو کر سوال کیا تھا اور منزہ بے ارادہ ہی چند قدم آگے بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ سوال کرنے والے نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اسے لگا۔ جواب وہ دے گی۔

"پتا نہیں، کیسے ماں باپ ہوتے ہیں، پیدا تو شوق سے کر لیتے ہیں، تربیت کرنا بھول جاتے ہیں۔"

اب وہ جہاں کھڑی تھی وہاں ایک عورت بے حد تنفر سے یہ تبصرہ کر رہی تھی۔ بڑے عرصے بعد منزہ کی یادوں پر کسی بھولی بسری آواز نے دستک دی۔

"پتا ہے مونا! ہم اپنی سوہا سے جتنا لاڈ پیار کریں گے اس سے کہیں زیادہ توجہ اس کی تربیت پر دیں گے۔ میں بتاتا ہوں یہ ایسی بنے کہ جو دیکھے وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ وہ۔۔۔ کسی سمجھ دار اور تعلیم یافتہ ماں کی گود سے نکلی ہے۔ میرے گھر والے جو ابھی میرے انتخاب پہ مجھ سے نالاں ہیں، قائل ہو جائیں کہ ایک اچھی نسل کی تکمیل کے لیے ایک اچھی شریک حیات کا ہونا کتنا ضروری ہے۔"

منزہ گھبرا کے کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس کا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا اور ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

پروین نے دور سے اس کی یہ حالت دیکھی۔ مگر اپنے دل میں کسی قسم کا ترحم محسوس نہ کیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ منزہ لو بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔

"ہر کوئی اپنا بویا ہوا کاٹتا ہے۔۔۔ میں تو سمجھتی تھی بھائی کی تربیت ہی خراب ہے۔ یہ نہیں پتا تھا کہ خون بھی گندہ ہے۔ جس نے ان کی گود میں پرورش پائی۔ اس کا بھی ستیاناس کیا اور جسے گود سے دور کیا۔ اس میں بھی اپنا رنگ چھوڑ دیا۔"

اس سے پہلے پروین نے کبھی اس انتہا پہ جا کے منزہ کے خلاف کچھ نہیں سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

دیدبے بے حد خوف زدہ نظروں سے جعفر محمود کو دیکھ رہی تھی جس کا چہرہ ضبط کی کوشش میں نقوش کھو رہا تھا۔ باتوں کی نزاکت کا خیال نہ ہوتا یا وہ اتنے ڈھیر سے سمدھیوں میں نہ گھری ہوتیں تو یقیناً وہ ابھی سارے حساب بے باک کر لیتا۔

مدیحہ نے اسٹیج پہ بیٹھے خرم کی جانب دیکھا۔ جس کا چہرہ خطرناک حد تک سپاٹ تھا۔ اس کا ہاتھ جس میں قلم

تھاما ہوا تھا وہ ساکت تھا۔ نکاح خواں بھی نکاح کی کارروائی روکے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ جعفر نے مدیحہ کی نظروں کے تعاقب میں وہاں دیکھا اور جیسے یک دم ہوش میں آگیا۔ تیزی کے ساتھ وہ اسٹیج کی جانب بڑھا۔

"مولانا۔ آپ نکاح شروع کیجئے۔ یہ تو ایسے ہی۔۔۔"

پہلی بار مدیحہ نے اس کے اکھڑ اور بے نیاز لہجے میں معذرت خواہانہ رنگ گھلتے دیکھا۔

معراج دین خود تین تین بیٹیوں کے باپ تھے، جعفر محمود کے دل کو لاحق خدشات کو اچھی طرح بھانپ سکتے تھے۔ انہوں نے خرم کے کاندھے پہ ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

"بسم اللہ کرو۔۔۔"

اور خرم نے دستخط کردیے۔

○ ○ ○

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے سوہا! تم نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا ہے۔"

ریتا اسے روتا بلکتا دیکھ کے تسلی دے رہی تھی۔

"مجھے تو یہ نہیں پتا کہ مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا گیا ہے۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"اگر پاپا کی ڈیتھ ہوگئی تو کیا یہ میرا قصور تھا؟ ہر ایک کی زندگی سیٹ ہوگئی۔ سب اپنے اپنے مدار میں لوٹ گئے ان کے جانے کے بعد۔۔۔ لیکن ان کے جانے کی سزا میں نے اکیلے بھگتی۔۔۔ کیا ماما کی دوسری شادی میں نے کرائی تھی۔۔۔؟ پھر ان کی خوشیوں کے لیے میری ذات ہی کیوں بھینٹ چڑھائی گئی؟"

"اب۔۔۔ ان سب باتوں۔۔۔ میرا مطلب ہے اس دل دکھانے والے ذکر سے کیا حاصل۔۔۔؟"

ہمیشہ کی طرح یہ معاملہ ایسا تھا جس پہ ریتا بے بس ہوجاتی تھی۔ چاہ کے بھی وہ اس کے دل سے یہ محرومی نہیں نکال پائی تھی' اس کا ادراک اسے بے دست و پا ہونے کا احساس دلا دیتا تھا۔

"حاصل۔۔۔ حاصل۔۔۔ حاصل۔۔۔!" وہ حلق پھاڑ کے چلائی۔ "اس سے پہلے میں نے زندگی میں کیا حاصل کرلیا ہے، جو دل کی ذرا سی بھڑاس نکالنے سے پہلے بھی یہ سوچوں کہ اس سے مجھے حاصل کیا ہوگا۔"

"ہاں۔۔۔ نکال لو دل کی بھڑاس۔۔۔ مگر اتنا تو سوچو تمہاری ماں کا دل تمہاری کرلاہٹ سے مسلا جا رہا ہے۔"

ریتا نے آنکھوں میں آنسو بھر کے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامنا چاہا۔ مگر اس نے بری طرح جھٹک دیا۔

"کوئی نہیں ہے میری ماں۔۔۔ میں کسی کی اولاد نہیں۔"

ایک لمحے کے لیے ریتا کی رگوں میں دوڑتے خون میں ریت سی گھل گئی۔ جمنے لگا وہ شریانوں میں۔۔۔

"سوہا۔۔۔" وہ کراہی۔

"غلط نہیں کہہ رہی میں۔ مجھے اس لفظ سے ہی خوف آنے لگا ہے اب۔۔۔ ماں۔۔۔" اس نے استہزائیہ ہنکارا بھرا۔ "وہ سب حکایتیں۔۔۔ وہ ساری کہانیاں جو ممتا کے متعلق مشہور ہیں۔ سب ایک فریب۔۔۔ ایک جھوٹ لگنے لگی ہیں مجھے۔"

"سوہا۔۔۔! میں۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا تمہارے لیے۔۔۔؟ میری ممتا ایک جھوٹ ہے؟ فریب ہے؟ مجھ سے خوف آتا ہے تمہیں۔۔۔؟"

ریتا کی رنگت زرد پڑتی گئی۔ مگر سوہا کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"مائیں ایسی ہوتی ہیں۔۔۔؟ یہ کرتی ہیں اپنی اولاد کے ساتھ۔۔۔؟ جیسا میری ماں نے کیا۔ صرف اپنے سکھ' اپنے عیش و آرام کے لیے اس نے پہلے مجھے دربدر کیا اس کے بعد اپنے نام نہاد سہاگ' اپنے اس مطلبی خود غرض بے حس شوہر کو خوش کرنے کے لیے میرے حصے کی ساری محبت اس کی بیٹی پہ لٹائی۔ پھر اس بیٹی کو خوش کرنے کے لیے میرا نصیب بھی اس کے نام لکھ دیا۔ آپ کو پتا ہے تقدیس کی شادی جس شخص سے ہو رہی ہے وہ وصی کا کزن ہے فرسٹ کزن۔۔۔"

"وہ۔۔۔!" ریتا اپنے تئیں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔

"اور۔۔۔ اور وہ صرف تقدیس کی مہندی کا فنکشن نہیں تھا' وصی کی مہندی بھی۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے پھر ہچکیاں لینے لگی۔

"اور کسی اور سے نہیں۔۔۔ دشمہ سے۔۔۔ ماما کی لاڈلی بیٹی سے۔" یہ بات شاید ریتا کے گمان سے بھی باہر تھی۔ لیے وہ فوری طور پر کچھ کہہ نہ سکی۔

"میں بھی تو اسی ماں کی اولاد ہوں۔ سگی اولاد۔۔۔ پھر مجھے کیوں ٹھکرایا اس نے اور اس کے خاندان نے اور وہ جس صرف خیرات میں محبت پائی ہے ماما کی۔۔۔ وہ۔۔۔ اسے وہ لوگ سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔۔۔ کیوں؟"

چلا چلا کے اس کے حلق میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔

ضبط کر کر کے اس کے دل پہ داغ پڑ چکے تھے۔

کبھی دل چاہتا۔۔۔ دیواروں سے ٹکریں مارنے لگے۔

کبھی اس کا بس نہ چلتا کہ سامنے ہینگر سے لٹکی شیروانی تار تار کر ڈالے۔

وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ یہ احساس کتنی دیر سے ہوا تھا اور کس برے وقت میں ہوا تھا۔

دشمہ کے ہاتھ میں اس کے نام کی مہندی لگی تھی۔

چند گھنٹوں بعد طلوع ہونے والا سورج ان دونوں کو ایک گہرے رشتے میں باندھنے والا تھا اور وہ۔۔۔ وہ اب سوہا کی ...ت کی تپش میں جھلس رہا تھا۔

"میں نے تم سے اظہار کرنے میں جلدی کی۔ محبت کا اظہار کرنے میں بھی اور محبت کے نہ ہونے کا اظہار ...رنے میں بھی۔ اور محبت کرنے میں دیر کردی۔ اتنی دیر کہ اب اس کا کوئی مداوا نہیں۔"

کہتے ہیں محبت دل کے دروازے پر بار بار دستک نہیں دیتی۔ اس نے سوہا کی دستک کو نظر انداز کیا تھا اور اب ...رت سے دل کے دروازے پہ پڑے اسی قفل کو دیکھ رہا تھا، جس کی چابی اس سے کھو چکی تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔

✡ ✡ ✡

آج شوکت جہاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آج ان کے گھر سے دو دو باراتیں نکل رہی تھیں۔

ایک ان کے سب سے بڑے پوتے کی۔

دوسری ان کے اکلوتے نواسے کی۔

مارے خوشی کے ان کا ضعیف چہرہ دمک رہا تھا۔ ہلکے مونگیا رنگ کے شیفون بریزے کے سوٹ میں وہ کشمیری ...اوڑھے بڑی معتبر لگ رہی تھیں۔

"اماں جان۔۔۔ سردی تو نہیں لگ رہی؟ ہیٹر کے پاس بٹھا دوں؟" آتے جاتے کوئی نہ کوئی پوچھتا رہتا۔

"کہاں کی سردی۔۔۔" ہمیشہ سردی کے آغاز میں ہی سر سے پیر تک گرم کپڑوں میں لد جانے والی شوکت جہاں کو ...ل جنوری کی اس سرد ترین بھیگی ہوئی رات سے بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ بس نثار ہوتی نظروں سے ...بیٹھے خرم اور وصی کی سہرابندی کی رسم ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

"لگتا ہے دونوں دولہاؤں میں جھگڑا ہوا ہے۔" ندا نے اپنی نند سے ہنستے ہوئے کہا۔

"دونوں کے دونوں منہ سجا کے بیٹھے ہیں' خفا خفا سے۔"

ندا کے تبصرے پہ انہوں نے اپنی بے پایاں خوشی کے احساس سے باہر نکلتے ہوئے دھیان لگا کے دیکھا۔ واقعی ...کے چہرے پتھریلے سے لگ رہے تھے۔ جیسے خوش ہونا نہ چاہتے ہوں۔ ناخوش نظر نہ آنا چاہتے ہوں۔ ...خوشی میں انہوں نے یہ خیال تو کیا ہی نہیں کہ جو جوش و خروش گھر کے باقی افراد میں نظر آرہا ہے۔ اس کی ...رمق بھی نہ وصی کے چہرے پہ نظر آرہی تھی نہ خرم کے۔

...بچپن میں لڑا کرتے تھے نا کہ تمہاری نہیں' میری ڈرائنگ اچھی بنی ہے یا یہ کہ تمہاری نہیں' میری

سائیکل زیادہ تیز دوڑتی ہے لگتا ہے رات بھی خوب معرکہ ہوا ہوگا کہ تمہاری نہیں۔ میری دلہن زیادہ خوب صورت ہے۔"

ندا اپنی عادت کے مطابق زیادہ گہرائی میں جانے کے بجائے یہ نتیجہ نکال رہی تھی۔ اس کی نند بھی ہنس دی۔ اور بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ دونوں تو اب کسی خاتون کے ساڑھی باندھنے کے بے ڈھنگے اسٹائل پہ تبصرے کر رہی تھیں لیکن شوکت جہاں کے شاداں و فرحاں چہرے پہ اب تفکر کی گہری لکیریں تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ماشاءاللہ..... کسی کی نظر نہ لگے۔"

منزہ نے وشمہ کی پیشانی چومی جو گہرے سرخ اور سیاہی مائل سبز رنگ کے راجستھانی لہنگے میں دلہن بنی غضب کی خوب صورت لگ رہی تھی۔

"سدا خوش رہو۔" منزہ کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھیگا ہوا تھا۔

وشمہ جانتی تھی کہ یہ دکھ صرف اس سے جدائی کا نہیں ہے' یہ اس جدائی کا رستا ناسور ہے۔ جو جدائی آج سے کئی برس پہلے مقدروں میں لکھی گئی تھی۔ کل کی تقریب میں جو بدمزگی ہوئی تھی' اس کی تفصیل وہ کئی ایک سے سن چکی تھی۔ بس منزہ سے تسلی کے چند بول کہنے کا حوصلہ نہ ہو رہا تھا۔

"ماما.....! آپ رات والی بات سے اب تک اپ سیٹ ہیں؟" اس نے منزہ کے ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو....." منزہ نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں وہ اتنی زیادہ بے بس نظر آئی کہ وشمہ اپنے آنسو روک نہ پائی۔

"کیا کر رہی ہو وشمہ؟ میک اپ خراب ہو جائے گا۔"

"ماما۔ کیا تھا جو آپ آپی کے معاملے میں اتنی جلدی ہار نہ مانتیں..... کیا تھا جو وہ آج ہمارے ساتھ رہ رہی ہوتیں۔"

منزہ چند سیکنڈ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی' پھر آہستہ سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال تم اپنی ساس سے کرنا..... جا تو رہی ہو۔"

آج پہلی بار اس نے پروین کو وشمہ کی پھوپھو نہیں۔ ساس کہا تھا۔ ایک طرح سے وشمہ اور پروین کے درمیان حد بندی قائم کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھے بیڈ پہ اوندھی پڑی تھی۔

بند دروازہ زور سے اور ایک تسلسل کے ساتھ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ ساتھ ایک تواتر سے آتی رینا کی آوازیں۔

"سوہا.....! دروازہ کھولو۔ سوہا میں کہہ رہی ہوں دروازہ کھولو..... سنا نہیں تم نے۔" چلّا کے حکم دیتی رینا..... اچانک ہی منت سماجت پہ اتر آئی۔

"سوہا..... میری جان! میرے بچے..... تمہیں میری قسم ہے یہ دروازہ کھول دو۔ دیکھ میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔ میں روکتی تمہیں گھر سے باہر جانے کو۔ میں خود لے کر جاؤں گی۔ کہاں جاؤ گی؟"

اور پھر کوئی جواب نہ ملنے پہ وہ ایک بار پھر دھمکیوں سے اسے رعب میں لانے لگتی۔

"دروازہ کھولو سوہا ورنہ میں تڑوا دوں گی۔ تمہارے چاچو کو فون کرنے لگی ہوں میں۔"

تھک ہار کے وہ وہیں دروازے کے پاس نیچے بیٹھ کے اونچی آواز میں رونے لگی۔

"سوہا.....! مت امتحان لو میری ممتا کا۔ میرا دل پھٹ رہا ہے' مجھے پتہ ہے تم کچھ کر لوگی۔ تم کچھ نہ کچھ ضرور کرو گی۔" پھر وہ چونک کے اٹھی۔

"نہیں..... میں اس وقت کا انتظار نہیں کروں گی..." وہ پھر سے دروازہ دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگی۔

"میں خالی ہاتھ نہیں ہونا چاہتی۔ میں تمہیں نہیں کھو سکتی سوہا! تم میری ساری زندگی کا حاصل ہو۔ ایک ہی تو چیز کمائی ہے میں نے۔"

ملازم دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی کی نہ ہمت ہو رہی تھی پاس جانے کی۔ نہ ضرورت..... بڑی کوٹھیوں میں ایسے نت نئے ہنگامے دیکھنا ان کے لیے معمول کی بات تھی۔

"صدیق.....!" رینا نے چلّا کے ڈرائیور کو بلایا۔ "جاؤ..... لان کی طرف سے جا کے کھڑکی کا شیشہ توڑ دو....."

صدیق نے دروازہ توڑ کے گرل کے اندر ہاتھ ڈال کے لاک کھولا۔ رینا اب بھی وحشیانہ طریقے سے دروازہ پیٹ رہی تھی' صدیق نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ کھولا تو وہ تیر کی طرح اندر لپکی اور بیڈ پہ اوندھی گری سوہا کو کاندھوں سے پکڑ کر سیدھا کیا۔

اس کے ناک اور منہ سے خون کی لکیریں بہہ رہی تھیں اور چہرے پہ غیر مانوس سی سوجن تھی۔

☼ ☼ ☼

خرم بھاری قدموں کے ساتھ چلتا اس کے پاس آیا۔ جو نارنجی مائل سرخ لہنگے میں ملبوس گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ خرم نے دل کو ٹٹولا۔

کوئی جوش..... کوئی جذبہ..... کوئی احساس..... کوئی لطافت کچھ بھی تو نہ تھا۔

اس نے بڑی سیدھی سپاٹ زندگی گزاری تھی۔ نوعمری اور کالج لائف میں بھی ان چکروں سے دور رہا تھا۔ وجہ اس کے مزاج کی خشکی نہیں تھی۔ صرف یہ تصور تھا کہ وہ محبت میں توحید کا قائل تھا۔ اپنے گھر کے ماحول سے بھی واقف تھا..... اپنی ذمے داریوں کا بھی ادراک تھا اسے۔ کسی بھی بڑھتے ہاتھ کو تھامنے سے پہلے اب یہ خوف لاحق رہتا کہ کہیں اگر وہ اس عہد کے تقاضے نبھانے میں ناکام رہا تو.....؟

اگر اس کے گھر والے اس تعلق کو نہ قبول کر پائے تو.....؟

کسی اور سے محبت کے عہد و پیمان کر کے..... شادی اپنے ماں باپ کی پسند سے کرنا اسے بڑا بزدلانہ فعل لگا کرتا تھا۔ دوسری جانب اپنی محبت کے لیے خاندان اور زمانے سے ٹکرا جانے کے باہمت فعل کے لیے بھی وہ خود کو اہل نہیں پاتا تھا۔

پہلے سے دل پہ کسی اور کا عکس لیے کسی اور کو زندگی میں شامل کرنا اسے بددیانتی لگا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس کی نوبت ہی نہ آنے دی جائے۔ بہت سے قدم اس کی جانب اٹھے۔ بہت سے ہاتھ اس کی جانب بڑھے لیکن اس نے کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ محبت کے لیے سر پہ کفن باندھ لینے والوں میں سے نہیں۔ اس لیے اسے اس قسم کے تعلق کا حصہ بھی نہیں بننا۔ وہ محبت صرف اسے دے گا۔ جو اس کی جائز حق دار بھی ہوگی اور رفیق کار بھی۔

اس لیے تو جب اسے پہلی بار پتا چلا کہ وصی اس رشتے پہ تیار نہیں تھا اور اس کی جذباتی وابستگی کسی اور کے ساتھ تھی لیکن گھر والوں کے نہ ماننے پہ وہ وشمہ سے شادی کر رہا تھا۔ وہ حیرت میں مبتلا تھا کہ کوئی دل میں کسی اور کو بسا کے' زندگی کسی اور کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیسے کر سکتا ہے۔

وہ کورا دل لے کر اپنے جیون ساتھی کو پوری گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہنے کے لیے تیار تھا اور پھر اس گرم جوشی پہ کسی وسوسے نے ٹھنڈے چھینٹے مار دیے۔

وہ بے دلی سے اس کے برابر بیٹھا کوٹ کی جیب سے وہ مخملیں ڈبیہ نکالنے لگا' جو دو دن پہلے ہی رخشندہ کے ساتھ جا کے خریدا تھا۔

ڈبیہ سے کنگن نکالتے ہوئے اسے خیال آیا کہ رونمائی کا تحفہ دیکھنے سے پہلے اس کے تقاضے بھی پورے کرنے ہوں گے۔ سردہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے اس نے بڑی ہی اچٹتی نظر اس کے چہرے پہ ڈالی۔

بظاہر کوئی کمی..... کوئی خامی نہ تھی۔ لیکن جو کمی تھی' اس کا احساس خرم کو بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔

چند منٹ کے تکلیف دہ انتظار کے بعد کچھ بے چین ہو کر تقدیس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔ سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں اس کے لیے صرف اجنبیت تھی۔ سرد مہری تھی۔
اس کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

☼ ☼ ☼

وصی نے بے یقینی سے سیل فون کی اسکرین پہ چمکتے حروف کو دیکھا۔ کل سے اس کا فون مسلسل آف تھا۔ ابھی دراز میں سے نکالتے ہوئے یونہی بے ارادہ ہی آن کر کے دیکھا تو کسی انجان نمبر سے تین پیغامات منتظر تھے۔
"سوہا کو ہاسپٹل لے کر جا رہی ہوں۔ جلدی رابطہ کرو۔" وہ بری طرح چونکا۔
اگلا پیغام جلدی سے نکالا۔
"اس کی حالت نازک ہے۔ اس وقت ڈاکٹرز ہاسپٹل کے ایمر جنسی میں ہوں۔۔۔ جلدی پہنچو۔"
وصی کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اس نے اگلا پیغام بھی نکال لیا تھا مگر ہر لفظ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے پلکیں جھپکیں۔ آنکھوں کے آگے چھائی دھند اوس بن کے ٹپک پڑی۔
"میں سوہا کی ماما ہوں۔"
اب پیغام بھیجنے والے کو اپنا تعارف کروانا یاد آیا تھا۔
"وہ آئی سی یو میں ہے اور شاید تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ خدا کے لیے میری بیٹی کی موت آسان کر دو۔ اسے اس کشمکش سے نکال دو۔۔۔ رینا۔"
وشمہ واش روم سے اپنا بھاری لباس تبدیل کر کے اور زیورات سے نجات حاصل کر کے نکلی تو وصی کو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلتے دیکھا۔
"وصی۔۔۔"
اس نے سارے حجاب اور جھجک بالائے طاق رکھ کے اسے پکارا مگر شاید اس نے سنا ہی نہیں۔۔۔
وشمہ ششدر کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کی شیروانی صوفے پہ پڑی تھی۔ کلاہ میز پہ رکھا تھا۔ جس وقت وہ واش روم جا رہی تھی تب وہ اپنے جوتے اتار رہا تھا۔ وشمہ نے کرسی کے ساتھ رکھے اس کے سلیپرز دیکھے۔
"پتا نہیں۔ وہ ننگے پیر ہی چلا گیا۔ یا پھر۔۔۔؟"
اس کے ساتھ ہی رات کے سناٹے میں کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے اسے پھر سے مخمصے میں ڈال دیا۔ گیٹ کے کھلنے اور پھر بند ہونے کی چر چراہٹ کے دوران ہی دروازے پہ بڑی بے تاب سی دستک بھی ہو چکی تھی۔
وشمہ نے اسی الجھن بھرے انداز میں دروازہ کھولا تو سامنے پروین سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں۔ وہ چڑ سی گئی۔ بجائے اس کے کہ وہ ان سے وصی کے یوں بنا بتائے اٹھ بھاگنے کی وجہ دریافت کرتی۔ وہ اس سے تفتیش کر رہی تھیں۔
"مجھے کیا پتہ۔۔۔"
ظاہر ہے وہ اس کے سوا کیا کہتی مگر پروین مطمئن نہ ہوئیں۔
"تمہیں نہیں پتا ہو گا تو کسے پتا ہو گا۔ یہاں تمہارے علاوہ اور کون تھا اس کے پاس۔"
"میں واش روم میں تھی۔ مجھے نہیں پتا کیا ہوا۔ میں نے صرف جاتے دیکھا تھا۔ میں سمجھی کسی سے کوئی بات کہنے گئے ہوں گے یا کوئی اور کام ہو گا۔"
"کم از کم تم پوچھتیں تو سہی کہ وہ اتنی رات کو اور وہ بھی اس موقع پر کہاں جا رہا ہے؟؟"
ان کی مسلسل جرح سے وہ اکتا رہی تھی۔ کیونکہ یہ سارے سوال تو خود اس کے اندر کلبلا رہے تھے' ان کے جواب کہاں سے دیتی وہ۔
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ گھر سے باہر جا رہے ہیں۔"

"کمال ہے۔۔۔ کہاں جا سکتا ہے وہ اور وہ بھی بغیر مجھے بتائے۔"
ان کی "مجھے بتائے بغیر" والی بات پہ وشمہ اور بھی کبیدہ خاطر ہوئی۔ گویا صرف ان کو بتانا ضروری تھا اور یہی بات قابل اعتراض ہے۔ بھلے بیوی کو بتائے یا نہ بتائے۔
"کوئی فون آیا تھا؟" ادھر پوچھ گچھ ختم ہی نہ ہو رہی تھی' وشمہ کے ماتھے کی شکنوں کو دیکھنے کے باوجود۔
"پتا نہیں۔" اب وہ بھی واضح طور پر منہ بنا کے اکھڑ لہجے میں کہنے لگی۔
"میں نے تو کسی قسم کی رنگ ٹون یا کسی سے فون پہ بات کرنے کی آواز نہیں سنی۔"
"میں فون کر کے پوچھتی ہوں۔" وہ پلٹیں تو وشمہ جتائے بغیر نہ رہ سکی۔
"یہ کام تو آپ کو پہلے کرنا چاہیے تھا۔"
وہ رکیں۔ مڑ کے حیرت سے اسے دیکھا۔
یقین نہ آ رہا تھا کہ چند گھنٹے پہلے بیاہ کر لائی دلہن اور ان کے سامنے پل کے جوان ہونے والی سگی بھتیجی اس بے مروتی سے بات کر سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"سوہا۔۔۔ سوہا۔۔۔! پلیز۔۔۔ پلیز آنکھیں کھولو۔۔۔ سوہا!" وصی اس کا سرد ہاتھ اپنے چہرے سے لگائے آنسوؤں سے بھری سرگوشیاں کر رہا تھا۔
سوہا کا پورا وجود مختلف قسم کی نالیوں اور ٹیوبوں سے جکڑا ہوا تھا۔ آکسیجن ماسک سے چھپا اس کا زرد چہرہ وصی کے دل کو چیرے جا رہا تھا۔
"سوہا! میں وصی تمہارا وصی۔ دیکھو تو سہی۔ میں تمہارے پاس ہوں۔"
وصی نے سوئیوں سے چھلنی اس کا نازک ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔
"مجھے احساس ہو چکا تھا سوہا! کہ جسے میں ہمدردی اور اپنائیت کا رشتہ سمجھ رہا تھا' وہ محبت تھی۔ جسے میں ہنسی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جذبہ ہی کوئی اور تھا۔ میری بزدلی نے میری کم ہمتی نے مجھے یہ اعتراف کرنے نہیں دیا۔ لیکن سوہا! تم انتظار تو کرتیں۔ اتنا یقین تو رکھتیں کہ جلد یا بدیر محبت بالآخر اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ تمہاری محبت نے بھی میرے بھرم کو ایڑیوں تلے مسل کے یہ قبول کروالیا تھا کہ ہاں۔۔۔ ہاں میں ادھورا ہوں تمہارے بغیر۔۔۔"
رینا گلاس ڈور سے چپکی آئی سی یو کے نیم تاریک ماحول میں جھانکتے ہوئے سوہا کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کر رہی تھی۔ وصی کے آنسو اسے یقین دلا رہے تھے کہ سوہا ضرور زندگی کی جانب پلٹ آئے گی۔ کیونکہ اسے پکارنے والا! بہت محبت اور مان سے پکار رہا تھا۔

○ ○ ○

"کہاں ہو تم وصی؟"
اس کا سیل کئی گھنٹوں سے سائلنس پہ تھا۔ رینا کے بہت زور دینے پہ وہ آئی سی یو سے نکلا تو سب سے پہلے فون چیک کیا۔ گھر کے نمبر سے گیارہ مسڈ کالز تھیں۔ اسے اب احساس ہوا کہ شادی کی رات بغیر کسی کو بتائے گھر سے نکلنے پر سب کیا کیا سوچ سکتے ہیں۔۔۔ اس نے متوقع سوالوں کے ممکنہ جوابات کی تیاری کیے بغیر گھر فون ملایا۔
"کہاں ہو تم وصی؟ یہ کیا حرکت ہے۔۔۔ ایک تو بغیر کسی کو بتائے گھر سے نکل گئے' وہ بھی شادی کی پہلی رات۔۔۔ گھر میں اتنے مہمانوں کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر۔۔۔؟ اوپر سے فون بھی نہیں اٹھا رہے۔"
"میں۔۔۔ میں کچھ بزی تھا ماما۔"
"خیر تو ہے وصی۔۔۔ بیٹا بتاتے کیوں نہیں؟" اس کے لہجے میں کچھ ایسی شکستگی تھی کہ پروین کا سارا طیش' سارا غصہ صرف تشویش میں ڈھل گیا۔
"ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا ماما۔۔۔ جلدی میں گھر سے نکلنا پڑا۔۔۔ سوری کسی کو اطلاع نہیں دے سکا۔"

"دوست کا ایکسیڈنٹ۔۔۔؟ کس دوست کا۔۔۔؟"

"آپ نہیں جانتیں اسے۔ نیا دوست ہے۔۔۔ آفس میں ساتھ ہوتا ہے۔" ایک کے بعد ایک جھوٹ بولنا پڑ رہا تھا۔ "نیا دوست ہے تو تم گھنٹوں سے وہاں کیوں بیٹھے ہو۔ یہاں ہم مہمانوں کو کیا جواب دیں گے۔ ابھی تو سب سو رہے ہیں۔ اٹھیں گے تو تمہاری غیر موجودگی کا کوئی تو جواز دینا ہوگا۔ کیا بتائیں گے کہ دولہا نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کے ایک نئے نویلے دوست کی نازبرداریاں کر رہا ہے۔" پروین کی جھنجلاہٹ پھر سے عود کر آئی۔

"امی۔۔۔! رشتہ نیا ہو یا پرانا۔ اس کے تقاضے تو ایک سے ہوتے ہیں ناں۔"

اس نے تھکے ہارے لہجے میں کہا تو وہ چپ سی ہو گئیں۔

"ویسے بھی وہ اس شہر میں اکیلا ہے۔ ایسے وقت میں میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"یوں کرو۔۔۔ میں حسن یا حسان کو بھیجتی ہوں۔ وہ رک جاتے ہیں وہاں۔۔۔ تم گھر آ جاؤ۔"

ان کی پیشکش پہ وہ گھبرا اٹھا۔ حسن سے وہ اب ویسے ہی خائف رہتا تھا۔ حالانکہ ایک وقت میں عمر کے اچھے خاصے فرق کے باوجود اس سے ہی زیادہ قریب تھا۔ لیکن شادی کے بعد (حسن اور ہما کی شادی) دونوں میں ایک عجیب سا فاصلہ اور تکلف آ گیا تھا، جس کی وجہ جاننے سے کم از کم وصی تو قاصر تھا۔ جبکہ حسان کے بڑبولے پن اور پیٹ کے ہلکا ہونے سے ڈرتا تھا وہ۔

"اس کی ضرورت نہیں امی! انہیں کیوں تکلیف دے رہی ہیں آپ۔"

"ضرورت ہے۔۔۔ ابھی تمہارے سسرال والے ناشتہ لے کر پہنچتے ہوں گے۔ کیا جواب دوں گی میں انہیں۔"

"سسرال والے؟" وہ ایسے چونکا جیسے اپنی زندگی کی اس بڑی تبدیلی کو فراموش کر بیٹھا ہو۔

"ہاں۔۔۔ نوید بھائی اور منزہ بھابی!"

"تو پھر۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ خرم بھائی کو بھیج دیجیے۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔۔۔ اس کی بھی تو تمہارے ساتھ ہی شادی ہوئی ہے رات میں اور اس کے بھی سسرال والے آتے ہوں گے وہ تو ہیں بھی غیر لوگ۔۔۔ ان کو مطمئن کرنا اور بھی مشکل ہوگا۔"

"مجھے تو لگتا ہے آپ خود مطمئن نہیں ہیں۔" وہ جھنجلا گیا۔

"ایک معمولی سی بات کو لے کر آپ اتنی پریشان ہو رہی ہیں اور مجھے بھی کر رہی ہیں۔"

"یہ معمولی بات ہے؟"

"کیا لوگوں کے دوست نہیں ہوا کرتے؟ کیا دوستوں پہ مشکل وقت نہیں آیا کرتا؟ کیا ان کی مدد نہیں کی جا سکتی؟ یہ کون سی غیر معمولی بات ہے امی۔ آپ سچ سچ بتا دیجیے گا نوید انکل کو اور اتنا ہی ہے تو یہ مت بتائیے گا کہ میں رات سے یہاں ہوں کہہ دیجیے گا کہ ابھی نکلا ہوں۔"

"لیکن تم ہو کس ہسپتال میں؟"

اب تک وہ دل ہی دل میں جھلاتے ہوئے جھوٹ پہ جھوٹ بولتا چلا جا رہا تھا لیکن اس معاملے میں نہ جھوٹ بولا جا سکتا تھا نہ سچ بتایا جا سکتا تھا۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ امی! شاید سگنلز نہیں آ رہے۔ میں کچھ دیر میں کرتا ہوں۔"

سامنے سے رینا کو آتے دیکھ کے اس نے سیل فون جیب میں ڈالا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے دو ڈسپوزیبل کپ تھے۔

"نہیں۔۔۔ شکریہ۔"

"لے لو۔۔۔ رات بھر کے جاگے ہو۔۔۔ فریش ہو جاؤ گے۔"

"ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔"

"میں جو کہہ رہی ہوں۔۔۔ لے لو۔" یہ استحقاق رینا کے لہجے میں کبھی نہ آتا۔ اگر وہ وصی کے منہ سے سوہا کے

لیے اعتراف محبت سن نہ چکی ہوتی۔

"میری مانو۔۔۔ تو کچھ دیر گھر جا کے آرام کر لو۔"

"جب تک سوہا کو ہوش نہیں آتا۔ میں نہیں جاؤں گا۔"

"جب ہوش آئے گا تب تو جاؤ گے نا؟" اس نے بڑے عجیب انداز میں پوچھا۔

وہ چونک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

رینا کے خشک ہونٹوں پہ ایک ملال میں ڈوبی مسکراہٹ تھی۔

"تمہیں اسے چھوڑ کے جانا ہی ہے وصی۔۔۔! اپنی اس زندگی میں لوٹنا ہی ہے جس کا آغاز تم نے کل رات کیا ہے۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد جاؤ یا اب۔۔۔"

وصی چند سیکنڈ غور سے رینا کے چہرے کو دیکھتا رہا جہاں آس و نراس کے رنگ بکھرے تھے۔

ایک ایسا جواب نہ سننے کی شدت سے تمنا تھی۔ جو اس کی خوش فہمیوں اور خوش گمانیوں کو مسمار کر دیتا۔

ایک ایسا اقرار سننے کی آس تھی، جو اس کی بیٹی کو زندگی کی جانب کھینچ لاتا۔

"نئی زندگی کیا ہے۔ میں نہیں جانتا۔ زندگی کا نیا مطلب، نیا مقصد کیا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں اور وہ ہے سوہا۔"

☆ ☆ ☆

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" حسن بوکھلا گیا۔

"وہ رات سے گھر پہ نہیں ہے؟"

"ہاں۔۔۔ اور ابھی بھی آنے پہ تیار نہیں۔"

پروین جو کچھ دیر پہلے تک صرف پریشان تھیں، بار بار آنسو بہانے اور منتیں مانگنے لگتی تھیں کہ کسی طرح وصی کا پتہ چل جائے۔ اب صرف جھنجلاہٹ اور غصے کا شکار تھیں۔

"بتاؤ بھلا ایسی بھی کیا دوستی یاری جس کے لیے بندہ گھر بار بھلا دے۔ معاملے کی نزاکت کو بھی نہ سمجھے۔ بھلا ہے ہم ایسی ہمدردی اور خدا ترسی سے جس کی وجہ سے زمانے کے آگے تماشا لگ جائے۔"

"ہے کہاں وہ؟"

"بتایا ہی نہیں۔ اوپر سے فون بھی بند کر دیا ہے۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا مت کریں اس کی شادی وشمہ سے۔ جب اس کی مرضی نہیں تو۔۔۔"

"یہ کوئی موقع ہے ایسی بات کرنے کا۔" وہ جز بز ہو کے رہ گئیں۔

اور اس کی کسی بات سے ظاہر نہیں ہو رہا ہے کہ وہ وشمہ کی وجہ سے گھر سے غائب ہے۔ اللہ جانے کون دوست ہے، جس کے سرہانے لگا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا بھی کہ حسن کو بھیج دیتی ہوں اس کے پاس۔۔۔ اگر بے چارہ اتنا ہی زخمی اور لاچار ہے تو۔۔۔ کم از کم تم گھر آ جاؤ۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ الٹا کہہ رہا ہے بھیجنا ہے تو خرم کو بھیجو۔"

"خرم کو؟" حسن بری طرح چونکا۔

(یعنی خرم اصل معاملے سے واقف ہے۔)

"ابھی تمہارے ابو جاگ جائیں گے تو پھر سے سو سو سوالوں کا سامنا کرنے کو میں اکیلی۔۔۔ اللہ جانے کیوں نہیں یہ بچے چین لینے دیتے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکلیں۔۔۔ ظل ہما چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔

"چچی! کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔۔۔ آپ انہیں سمجھائیے گا۔۔۔ کہ وصی اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔۔۔ ضرور کوئی وجہ ہو گی۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

"اس سے زیادہ غیر ذمہ داری اور کیا ہو گی۔۔۔ اور امی نے تو پریشان ہونا ہی ہے۔۔۔ وہ جو بے چاری رات بیاہ کے آئی ہے اس کا حال کیا ہو گا۔۔۔ اس کا سوچا تم نے؟"

حسن کو بار بار صرف وشمہ کی فکر ستائے جا رہی تھی' کہاں تو کل تک وہ وشمہ کے نام سے بلاوجہ خار کھا رہا تھا۔ اس کے اندر کی خجالت اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی کہ جس لڑکی سے اس نے بڑی بے خوفی سے اظہار محبت کھل کے کر دیا تھا۔۔۔ اس کو چپ چاپ چھوٹے بھائی کی بیوی بنا کے لانا پڑ رہا ہے۔۔۔ اور اب اسی وشمہ سے ہمدردی ہو رہی تھی کہ کسی اور کے عشق میں گرفتار وصی گھر والوں کا بدلہ اس معصوم سے لے رہا ہے۔

"وشمہ کے گھر والے چاچی کے اپنے میکے والے ہیں۔۔۔ سمجھ جائیں گے اگر طریقے سے سمجھایا جائے تو۔۔۔ ایسی کوئی۔۔۔"

"تم چپ رہو۔۔۔ کیوں بلاوجہ دخل دے رہی ہو۔" حسن نے ڈپٹ کے کہا تو ظل ہما ناراض نا راض سی کپ اس کے پاس رکھ کے پلٹ گئی۔

✡ ✡ ✡

"تمہاری اس دوست کا نمبر کیا ہے؟"

تقدیس اپنے کھلے لمبے بالوں میں برش کر رہی تھی' جب اسے خرم کی سرد و سنجیدہ آواز سنائی دی۔

"جی؟" اس نے پلٹ کے اسے دیکھا۔

"اسی دوست کا۔۔۔ جو مہندی کی رات اپنی نسل دکھا رہی تھی۔۔۔ اس کی بات کر رہا ہوں میں۔۔۔ اسی طوائف زادی کی۔"

اگرچہ تقدیس کے دل میں بھی سوہا کی اس حرکت کی وجہ سے اس کے لیے بہت سا میل تھا۔۔۔ مگر اپنے شوہر کی زبان سے کسی عورت کے لیے ایسے تذلیل بھرے الفاظ سننا اسے اچھا نہیں لگا۔

اپنے سامنے کھڑا بظاہر خوش شکل' خوش گفتار' تعلیم یافتہ شخص اسے اجڈ اور گنوار سا لگا۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" نہ چاہ کے بھی اس کی ناگواری لہجے سے چھلک گئی۔

"فکر مت کرو۔۔۔ اس سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں جاننا مجھے۔" خرم کے طنزیہ کہنے پہ تقدیس کے اندر ایک خطرے کا الارم سا بجا۔

وہ اندر ہی اندر لرز کے رہ گئی۔۔۔ رات سے جس انہونی کا خدشہ اسے بار بار ہو رہا تھا۔۔۔ وہ سامنے آ کے رہی۔۔۔ اس کا شوہر۔۔۔ اس کی زندگی کا ساتھی۔۔۔ نگاہوں میں اجنبیت اور بے پناہ شکوک و شبہات لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے اس سے کچھ جاننا ضرور ہے' مگر وصی کے بارے میں۔۔۔ جو رات سے گھر سے غائب ہے۔"

تقدیس بھی وصی کے بارے میں جان چکی تھی کہ سوہا کا وہ دوست' جس کی وجہ سے اس نے اس مست ملنگ سی لڑکی میں ان گنت تبدیلیاں آتے دیکھی تھیں۔۔۔ اور جس کے حوالے سے وہ اسے چھیڑا کرتی تھی۔۔۔ وہ رشتے میں اس کا دیور لگتا ہے۔

"غائب ہے؟" اب وہ سمجھی کہ صبح سے گھر میں جو عجیب سی ٹینشن پھیلی ہوئی ہے اس کی وجہ کیا ہے۔

"اور مجھے پکا یقین ہے کہ اسی ڈرامے باز لڑکی نے کوئی چال چلی ہو گی' ہم سب کو پریشان کرنے کے لیے۔"

"نہیں۔۔۔ یہ آپ کا وہم ہے۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیوں؟۔۔۔ بہت اعتماد ہے اپنی سہیلی پہ؟۔۔۔ رگ رگ سے واقف ہو اس کی؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن اس حقیقت سے ضرور واقف ہوں کہ دونوں میں ایسا کوئی تعلق نہیں۔۔۔"

"اتنی رازدار ہو؟" خرم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جبکہ تمہاری امی کل وضاحتیں دے رہی تھیں کہ اس لڑکی سے تمہاری بس دور کی سلام دعا ہے۔" تقدیس کو مزید وضاحتیں دینا' خود کو اور بھی جھوٹا ثابت کرنے کے مترادف لگا۔

وہ سر جھکا کے چپ رہ گئی اور اس کی یہ خاموشی خرم کو اور بھی سلگا گئی۔

"نمبر دو مجھے اس کا۔" تقدیس نے بیڈ سے سیل فون اٹھایا اور سوہا کا نمبر ملا کے خرم کو تھما دیا۔

◆ ◆ ◆ ◆
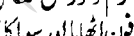
"شکر ہے اللہ کا سوہا کو ہوش تو آیا۔" ریتا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں مگر ڈاکٹر ابھی اس سے ملنے نہیں دے رہے۔" وصی کے لہجے میں بے تابی ہوک رہی تھی۔

"اتنا ہی بہت دل کی تسلی کے لیے کہ ڈاکٹروں کے مطابق خطرہ ٹل گیا ہے۔"

ریتا نے شفقت کے اظہار کے طور پہ اس کا شانہ تھپتھپایا اور وصی کو اس لمس سے گونا گوں سہارا ملا۔

ایک عجیب سا دردِ مشترک دونوں کو کل رات سے یکجا کیے ہوئے تھا۔

ایک ڈور سے بندھے لگ رہے تھے دونوں۔۔۔ اور وہ ڈور تھی سوہا۔

"ورنہ پہلے تو یہی کہہ کر پریشان کر دیا تھا ڈاکٹر امتیاز نے کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر ہوش نہ آیا تو وہ کومے میں جا سکتی ہے۔۔۔ یا برین ہیمبرج کا خطرہ ہے۔ شکر ہے میرے مولا کا جس نے اسے زندگی لوٹا دی۔۔۔ میں تو ڈر کے مارے اصغر کو بھی فون نہیں کر رہی تھی کہ کیسے بتاؤں اسے سوہا کے بارے میں' کیا وجہ بیان کروں اس کے نروس بریک ڈاؤن کی۔۔۔ پردیس میں وہ کتنا پریشان ہو گا یہ سوچ سوچ کر کے۔۔۔"

"آنٹی۔۔۔! آپ اب چاہیں تو انہیں فون کر دیں۔۔۔ بعد میں انہیں گلہ نہ ہو کہ آپ نے بروقت اطلاع نہیں دی۔ بلکہ آپ ایسا کریں کہ کچھ دیر کے لیے گھر چلی جائیں۔۔۔ آرام بھی کر لیں اور انہیں فون پہ مناسب الفاظ میں بتا بھی دیں۔"

"میرے خیال میں گھر جانے کی ضرورت تمہیں ہے۔ تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔"

"میں نے انہیں بتا دیا ہے۔"

"کیا؟" ریتا کے فوراً" پوچھنے پہ وہ نظریں چرا کے رہ گیا۔۔۔ پھر بات بدلی۔

"آپ ہو آئیے۔۔۔ میں تب تک سوہا کے پاس رکتا ہوں۔ آپ آئیں گی تو میں بھی گھر سے ہو آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں ایک دو گھنٹے تک آتی ہوں۔۔۔ فون پہ رابطہ رکھوں گی تم سے۔"

"میرا فون آف ہے آنٹی۔۔۔! بیٹری ختم ہو گئی ہے۔"

"اوہ۔۔۔ ایسا کرو۔۔۔ تم یہ سوہا کا فون رکھ لو۔۔۔ میں اسی پہ کر کے تم سے سوہا کے بارے میں پوچھتی رہوں گی۔"

اس نے فون ریتا کے ہاتھ سے لے لیا اور دوبارہ آئی۔ سی۔ یو کے گلاس ڈور کے سامنے کھڑا ہو گیا' جہاں سوہا کے بیڈ کے گرد تین ڈاکٹرز اور دو نرسیں گھیرا ڈال کے کھڑے تھے۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل کے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح سوہا کی ایک جھلک نظر آ جائے۔۔۔ مگر مایوس ہو کر اس نے ایک گہری سانس بھری اور ہاتھ میں پکڑے سوہا کے سیل فون کو تکنے لگا۔

"کبھی اس نے اسے بڑی بے قراری سے تھاما ہو گا۔ برستی آنکھوں کے ساتھ میرا نمبر ملایا ہو گا۔۔۔ بار بار ملایا ہو گا۔۔۔ چشم تصور سے مجھے کسی اور کے ساتھ ہنستا مسکراتا دیکھ کر کے فون زور سے نیچے پٹخا ہو گا۔"

اس نے یاسیت سے ڈائل نمبروں میں ایک قطار کے ساتھ اپنا نمبر دیکھا۔۔۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ دولہا بنا اپنے ہاتھوں اپنے دل کا خون کر رہا تھا اور فون اس نے آف کر رکھا تھا۔۔۔ شاید بے چینی' مایوسی اور بے بسی کی اس آخری حد نے اسے اس حال کو پہنچایا ہو گا۔

وہ یہ سوچتا ہوا محبت سے سیل فون کی اسکرین پہ مسکراتی سوہا کی تصویر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا' جب ہلکی سی بزر کے ساتھ اسکرین پہ چند ہندسے جگمگانے لگے جن پہ انگریزی حروف میں لفظ "سہیلی" لکھا تھا۔

"شاید سوہا کی کسی دوست کا فون ہے۔" اس نے کال ریسیو کر لی۔

دوسری جانب خرم تھا' جو کسی لڑکی کی آواز کے بجائے وصی کو سن کر بت بن گیا۔۔۔ اسے لگا اس کا وہم اسے بھٹکا رہا ہے۔۔۔ تصدیق کے لیے اس نے دہرایا۔

"وصی؟" اب چپ ہو جانے کی باری وصی کی تھی۔

✡ ✡ ✡

"بات کیا ہے وشمہ؟ تم ہی سچ بتادو... مجھے تو لگ رہا ہے سب کچھ چھپا رہے ہیں۔" منزہ نے اسے اکیلے میں لے جاکر پوچھا۔

"نہیں ماما! ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ خود وصی کے نہ ہونے سے دل برداشتہ تھی۔

"تو کیا وجہ ہے، جو وصی آج کے دن گھر سے غائب ہے۔"

"کسی دوست کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تو بس... جلدی میں نکل گئے گھر سے... کسی کو بتایا تک نہیں۔"

"کیوں؟ کہاں تھے گھر کے سارے لوگ؟" وہ جل کے پوچھنے لگیں۔

"سو رہے تھے؟"

"کیا؟ سو رہے تھے؟ اس وقت تک؟" منزہ کو یہی بتایا گیا تھا کہ بس ان لوگوں کے آنے سے کچھ دیر پہلے وصی مجبوراً نکلا ہے۔ اسے یہی جان کر دل میں کھٹکا سا ہو گیا تھا اور وشمہ سچ بتانے جا رہی تھی۔

"جی... رات کے تین جو بجے تھے۔" وشمہ کے بتانے پہ منزہ گم صم بیٹھی' اسے دیکھتی رہی...

"اور تم نے جانے دیا؟"

"میں کیسے روکتی۔"

"اتنا جھوٹ بولا پروین نے مجھ سے۔"

"کیسا جھوٹ؟"

"اب تو مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ سب اسی کی چال ہے... پہلے وہ تم دونوں کو ایک نہیں دیکھنا چاہتی تھی' اب ایک ہونے نہیں دے گی۔"

"مگر وہ... تو... وصی کا دوست..."

"سب بکواس ہے... سچ ہوتا تو پروین ہم سے یہ جھوٹ کیوں بولتی کہ وہ رات سے نہیں' صرف آدھے گھنٹے سے غائب ہے۔ ضرور اس کے دل کا چور اسے غلط بیانی پہ اکسا رہا ہے۔" وشمہ کے دل میں بھی غبار بھر گیا۔

"جھوٹ انہوں نے بولا... اور چاہے جس وجہ سے بھی بولا... لیکن ماما... آگئے تو وصی ہیں... ابھی تو میں دل کو یہ تسلی دے رہی تھی کہ چلو... کوئی بات نہیں... دوست کو مصیبت میں دیکھ کے نہ رہ سکے ہوں گے... لیکن اب مجھے اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہو رہی ہے کہ میں اتنی... اتنی غیر اہم ہوں ان کے لیے... کہ وہ صرف پھوپھو کے ایک بار کہنے پہ مجھے یوں چھوڑ کے چلے گئے۔"

"نجانے کس دل سے گیا ہو گا وہ... تم اس کے لیے جی چھوٹا نہ کرو... مجبور کیا ہو گا پروین نے... دراصل یتیم بچہ ہے... پروین نے ہاتھوں پہ ڈال رکھا ہے... اس کے احسانوں تلے دبا بے چارہ اور کیا کرتا۔"

"اور اگر ان ہی احسانوں کے بدلے انہوں نے مجھے..."

"نہیں... ایسا نہیں ہونے دو گی تم..." منزہ نے اسے کسی قسم کی بدفال نکالنے سے منع کیا۔

"پروین نے اسے اپنے احسانوں تلے زیر کر رکھا ہے تو تم محبت سے زیر کر لو... سب سے قوی جذبہ یہی ہے۔"

"پھوپھو کا مقابلہ بہت مشکل ہے ماما... انہوں نے تو آپ کے قدم تک اکھاڑنے کے لیے کیا کیا نہ کیا... آپ سے آپی تک کو دور کر دیا۔"

"ہاں... اس کی کوشش یہی تھی کہ میں تمہارے پاپا کی زندگی سے دور ہو جاؤں... عجیب بن تھی... بھائی کا گھر بسا نہیں دیکھ پائی... شاید اسے دوسروں کو ہمیشہ سے احسان تلے دبا کے رکھنے کا شوق ہے... رنڈوے بھائی اور یتیم بھانجی کی خبر گیری کے لیے ہفتے میں ایک آدھ بار اپنی گھر گرہستی سے نکل کر جو احسان عظیم کرتی تھی وہ... میرے آنے کے بعد تمہیں اور نوید کو یہ محتاجی نہ رہی... بس یہ برداشت نہ ہو رہا تھا اس سے... اپنے گھر کے ساتھ ساتھ وہ بھائی کے گھر پہ بھی اپنا سکہ جمانا چاہتی تھی... میری وجہ سے یہ نہ ہو سکا تو میری بیٹی تک کو مجھ سے الگ کر دیا... کہ شاید گھبرا کے میں یہ گھر چھوڑ دوں... مگر میں ثابت قدمی سے جمی رہی... اب یہی ثابت قدمی تم نے دکھانی ہے۔"

☆ ☆ ☆

"آپ کیوں آئے ہیں خرم بھائی؟" وہ اسے دیکھ کے جز بز ہو رہا تھا۔

"یہ سوال مجھے تم سے کرنا چاہیے... تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"سوہا کی حالت اچھی نہیں۔"

"ان بازاری عورتوں کے پاس یہی ہتھکنڈے ہوتے ہیں... اب خود کشی کا ڈراما رچایا ہو گا۔"

"اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا... اور پلیز آپ بغیر سوچے سمجھے اس کے بارے میں غلط الفاظ استعمال نہ کریں۔" اس کے لہجے میں ناگواری کے ساتھ ساتھ ایک بے حد تکلیف دہ التجا بھی تھی۔

"تو اور کیا کہوں کسی طوائف زادی کو..."

"وہ طوائف زادی نہیں ہے۔"

وصی نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ رینا' خرم کے آنے سے پہلے جا چکی تھی... ورنہ اس وقت خرم کے طیش دیکھ کر لگ رہا تھا وہ اس کی موجودگی کا بھی لحاظ نہ کرتا۔

"پاگل ہو چکے ہو تم وصی...! وہ لڑکی کسی بھی طرح ہمارے گھر اور خاندان کے قابل نہیں ہے... کیا تم اتنے اندھے ہو چکے ہو... تمہیں احساس نہیں ہوا کہ قدرت نے تمہارے لیے کتنا بہترین فیصلہ کیا ہے... چاچی کا انتخاب لاجواب ہے... قدر کرو وشمہ کی... ایک پاک باز اور حیادار عورت نعمت ہوتی ہے... تم اس نعمت کی ناقدری کرتے ہوئے ایک ایسی لڑکی کے لیے خوار ہو رہے ہو جس کے اندر نجانے کون سا گندہ خون ہے جو اسے ستا رہا ہے کہ..."

"بس... پلیز خرم بھائی! بس کریں۔" وہ بلبلا اٹھا۔

"آپ کچھ نہیں جانتے... نہ سوہا کے بارے میں... نہ وشمہ کے بارے میں... اس لیے پلیز چپ کر جائیں... وہ اچھی ہے' پاک باز اور حیادار بھی ہو گی' میں مانتا ہوں... لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ اس بن ماں کی بچی میں یہ اوصاف پیدا کرنے والی... اس کی ایسی تربیت کرنے والی عورت کون ہے؟... وہ عورت سوہا کی سگی ماں ہے۔"

"کیا؟" خرم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"جب اس عورت کی ایک بیٹی ہمارے گھر اور خاندان کی عزت بن سکتی ہے تو دوسری کیوں نہیں؟... اس کی رگوں میں کوئی گندہ خون نہیں ہے... وہ بھی ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے' صرف اس کی قسمت اچھی نہیں ہے... نہ اسے باپ کا سایہ مل سکا نہ ماں کی گود... اور جس عورت نے اس کا واحد سہارا بننا چاہا... جس نے اس کی زندگی کی ساری محرومیاں دور کرنی چاہیں... ہاں وہ ضرور ایک طوائف زادی ہے... مگر طوائف وہ بھی نہیں خرم بھائی... وہ بھی شہر کے ایک معزز شخص کی بیوی ہے' آج سے نہیں پچھلے کئی سالوں سے... شاید اس کے کردار کے بہت سے پہلو تاریک ہوں... مگر گھناؤنے ہرگز نہیں... یہ تاریکی بھی اس کے ماحول کی دین ہو گی ورنہ کوئی بری عورت کسی غیر کی اولاد کو یوں کلیجے سے لگا کے نہیں پالتی... میں اس کی ممتا کا گواہ ہوں۔ رات بھر میں نے اس عورت کی جو حالت دیکھی ہے' وہ عورت جو بقول آپ کے ایک طوائف ہے' وہ حالت اگر اس کی ماں کی جگہ موجود ہوتی... تو شاید اس کی بھی نہ ہوتی... اور وہ لڑکی جو اندر ابھی ابھی موت کو شکست دے کر ہانپ رہی ہے اس کا دل کتنا حساس اور نازک ہے' اس کا اندازہ آپ اس سے لگالیں کہ صرف مجھے کھونے کی کسک نے اس کی سانسیں تک روک دی تھیں... پھر کیسے آپ اسے غلط قرار دے سکتے ہیں؟"

"تم صرف کتابی باتیں کر رہے ہو وصی! ایسے قصے صرف فلموں میں دیکھنے کی حد تک بھلے لگتے ہیں... حقیقت یہ ہے کہ کل تم نے اپنے پورے ہوش و حواس میں ایک معصوم اور شریف لڑکی کو قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بناتے ہوئے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا... کیا اس سے انکار کر سکتے ہو؟" وصی لاجواب نظر آنے لگا۔

"اور تم اس پاک رشتے میں بددیانتی کے مرتکب ہو رہے ہو... تمہیں اس وقت جس کے پاس ہونا چاہیے اس کے پاس نہیں ہو' اور جہاں نہیں ہونا چاہیے' وہاں پائے جا رہے ہو' یہ محبت اور توجہ اس کا حق ہے' اس لڑکی کا نہیں۔"

”میں مجبور ہوں خرم بھائی۔۔۔! محبت ذمے داری‘ حق اور اصول سے ماورا چیز ہے۔۔۔ دل ان حد بندیوں کو نہیں مانتا اور ایسا نہیں ہے کہ میں نے کوشش نہیں کی۔۔۔ یہ شادی اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔۔۔ میں نے سوچا تھا۔۔۔ بہت آسان ہے دل کو مار کے بڑوں کی خواہش پورا کرنا۔۔۔ محبت کو دفن کرکے صرف حقوق و فرائض کی جنگ لڑنا۔۔۔ لیکن یہ مجھ سے نہیں ہو پایا۔۔۔ اگر میں اس میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو واقعی آج یہاں نہیں‘ وہاں اس کے پاس ہوتا۔۔۔ لیکن میں ایسا نہیں کر پایا۔۔۔ بلکہ اس لاحاصل کوشش کے نتیجے میں‘ میں نے اس لڑکی کے لیے زندگی کو اور مشکل کر دیا جو پہلے ہی ہچکولے لے رہی تھی۔۔۔ پہلے میں اس کا دل توڑنے کا مجرم تھا۔۔۔ اب تو میں اس کی محبتوں کا قرض دار ہوں خرم بھائی! اسے میری ضرورت ہے۔۔۔ مجھے یہ قرض ادا کر لینے دیں۔۔۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے خرم بھائی۔۔۔! مجھے ساتھ چلنے پہ مجبور مت کریں‘ اس وقت میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے خرم کے سامنے۔

☼ ☼ ☼

ہوش سے بے ہوشی میں جاتے ہوئے جو آخری خیال اس کے ذہن کو چھوا تھا‘ وہ یہ تھا کہ وہ اس زندگی سے اور اس کی تمام آزمائشوں سے آزاد ہو رہی ہے۔

آخری بار آنکھیں بند کرتے ہوئے اسے یقین سا تھا کہ اب یہ آنکھیں دوبارہ نہیں کھلیں گی۔۔۔ اور وہ کوئی منظر کبھی نہیں دیکھ پائے گی۔۔۔ لیکن ہوش کی سرحد پہ قدم رکھتے ہی۔۔۔

آنکھ کھولنے کے اگلے ہی لمحے۔۔۔

وہ اپنی خوش بختی پہ نازاں ہو گئی۔۔۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک بار پھر سانس لے رہی تھی۔۔۔ اس لیے وہ اس کے سامنے سانس لے رہی تھی۔۔۔

اس لیے نہیں کہ اس کی آنکھیں کوئی اور منظر دیکھ رہی تھیں۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اسے دیکھ رہی تھیں۔۔۔

”وصی۔۔۔“ اس کے لبوں نے نامحسوس سی سرگوشی کی۔

”ہاں۔۔۔ وصی۔۔۔ تمہارا وصی۔۔۔“ وصی نے اس کے کپکپاتے ہاتھ گرم جوشی سے دبا کے اسے یقین دلانا چاہا۔

سوہا کی پلکیں سکون سے مل گئیں۔۔۔

اس کے زرد چہرے پہ ہلکورے لیتا اطمینان اور سفید پڑتے ہونٹوں کی مسکراہٹ وصی کے دل سے احساس جرم کو کم کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

”کہاں تھے آپ؟“

پورے دو دن کے بعد وہ گھر لوٹا تو پہلے پروین کی خفگی سہی۔۔۔ جسے خرم نے نجانے کیا کچھ کہہ کر ٹال رکھا تھا۔۔۔ اس کے بعد سراج دین کی ڈانٹ ڈپٹ سنی۔۔۔ شوکت جہاں نے زیادہ کرید تو نہیں۔۔۔ لیکن یہ ظاہر بھی کیا کہ انہیں خرم کے بتلائے بیان پہ کچھ خاص بھروسہ نہیں ہے۔ سب کا سامنا کرنے کے بعد وہ کمرے میں پہنچا تو وشمہ بگڑے تیور لیے‘ آنکھوں میں آنسو بھرے پوچھ رہی تھی۔۔۔

وہ ٹھٹکا۔۔۔ پھر گڑبڑا کے رہ گیا۔

اس صورت حال کے بارے میں تو سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔۔۔ وہ وشمہ کے وجود کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔

”تمہیں کسی نے بتایا نہیں؟“ کچھ سنبھل کے اس نے گول مول بات کی۔

”میں سچ جاننا چاہتی ہوں۔“

”اس گھر میں کوئی جھوٹ نہیں بولتا۔“

اسے حقیقتاً تکلیف ہوئی تھی۔۔۔ کہ غلط بیانی بے شک ہوئی تھی۔۔۔ مگر اس کی جانب سے۔۔۔ پھر اس کی وجہ سے باقی لوگ کیوں نامعتبر قرار دیے جائیں۔

”ایسا کون سا دوست ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے کوئی دو دن گھر آنا بھول جائے۔“

”ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی۔۔۔ ہوتی ہے کسی کسی کے جذبے میں اتنی طاقت کہ وہ دوسرے کو باندھ کے رکھ لے۔“

وصی کے کہنے پہ وہ اپنی تیوریاں درست کرتی اس کے پاس آئی۔

”کیا مجھ میں آپ کو وہ بات نظر نہیں آتی؟“

”مجھے تم ہی نظر نہیں آتیں۔“ وہ خاموش رہا تھا‘ مگر اس کا دل کہہ اٹھا تھا۔

”بتایئے نا۔“ وہ مصر تھی۔۔۔ جواب جاننے کے لیے۔۔۔

”میں تھکا ہوا ہوں۔“

اسے آہستگی سے ایک جانب ہٹاتے ہوئے وہ واش روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔

”تمہاری ساس تو ٹھیک ہے تمہارے ساتھ؟“

مدیحہ شادی کے بعد پہلی بار گھر آئی بیٹی سے بات کر رہی تھی۔۔۔ گویا اپنی تسلی کرنا چاہ رہی تھی۔

”جی۔۔۔ بہت اچھی ہیں۔۔۔ خیال رکھتی ہیں‘ محبت سے بات کرتی ہیں۔“

”اور نندیں؟۔۔۔ بڑی والی تو خیر دور بیاہی ہے‘ ہے بھی سیدھی سادی۔۔۔ ہنسوڑ سی۔۔۔ دوسری تو اسی گھر میں رہتی ہے۔۔۔ دیکھنے میں بڑی سنجیدہ لگتی ہے۔۔۔ ایسے لوگ ہوتے گھنے ہیں۔“

”نہیں ہما۔۔۔ بھی عادت کی بہت اچھی ہے‘ کم گو۔۔۔ مگر نرم خو ہے۔۔۔ بہت ذمے دار۔۔۔ بہت حساس۔۔۔ بہت ت کرنے والی۔۔۔“

”اچھا۔۔۔ اور وہ چھوٹی۔۔۔ وہ کافی تیز لگتی ہے مجھے۔۔۔ ایک تو سب سے چھوٹی۔۔۔ اوپر سے کنواری۔۔۔ بیاہی نند کا ب الگ۔۔۔ اور کنواری کا الگ سوا بھاری۔۔۔ ویسے بیاہی بھی گئی تو ملا کی دوڑ مسجد تک۔۔۔ نیچے چلی جائے گی۔۔۔ اس کی جانب سے کچھ کھٹکا ہے میرے دل میں۔“

”آپ بے کار وہم پال رہی ہیں ماما! تینوں بہت اچھی ہیں۔۔۔ ردا کو تو اپنی پڑھائی کے علاوہ کسی کام میں دلچسپی ہی نہیں۔“

”ہم تو آہی جاتے ہیں نا۔۔۔ اکلوتا بیٹا اور اکلوتا بھائی ہے خرم۔۔۔ اور اکلوتوں کے معاملے میں ماں‘ بہنوں کا دل تنگ ہوتا ہے۔۔۔ اس لیے میں پریشان تھی۔۔۔ اور باقی لوگ۔۔۔ تمہاری دادی‘ ساس۔۔۔ چچی ساس۔۔۔ وغیرہ۔۔۔ اور ہاں وہ تمہاری دیورانی۔۔۔ نئی دلہن۔۔۔ اس کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں تمہارے؟“

”سب لوگ بہت اچھے ہیں ماما! اور وشمہ کے ساتھ بھی تعلقات بس نارمل ہیں۔۔۔ نہ برے۔۔۔ نہ زیادہ دوستانہ‘ یہ اس کی عادت لیے دیے رہنے والی ہے۔“

”اچھا ہے۔۔۔ تم بھی زیادہ بہناپا گانٹھنے نہ بیٹھ جانا۔ کون سا تمہاری سگی دیورانی ہے۔۔۔ سسرال میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے‘ کبھی کبھی بظاہر بہت بے ضرر سا فعل بھی گلے میں کانٹا بن کے اٹک جاتا ہے۔“

وہ چپ چاپ سر جھکائے سنتی گئی۔

”سب کے بارے میں پوچھا ہاں۔۔۔ بس ایک اسی کے بارے میں نہ پوچھا جس کے ساتھ عمر بھر کا ساتھ باندھا ہے میرا۔“

”خرم کب تک آئے گا؟“ مدیحہ کے سوال پہ وہ چونکی۔ ”جی۔۔۔ پتا نہیں۔“

”کیا مطلب؟۔۔۔ تم سے بات نہیں ہوئی اس سلسلے میں؟“

”آپ نے کل سب کو ڈنر پہ بلایا ہے۔۔۔ سب کے ساتھ ہی آئیں گے۔“

”ہاں وہ تو ظاہر ہے۔۔۔ شادی کے بعد تم پہلی بار رات رک رہی ہو میکے میں اس لیے میں نے سوچا سب کی دعوت کر دوں۔۔۔ پھر ان کے ساتھ ہی چلی جانا۔۔۔ لیکن تمہیں خرم کو بھی کہنا چاہیے تھا رات یہاں رکنے کے لیے۔“

"وہ کیا کریں گے رک کر؟" وہ گھبرا اٹھی۔

نئی نئی شادی کے نئے نئے دن تھے۔۔۔ مگر اس کا ساتھ تقدیس کے دل کو اچھوتے جذبات سے مہکانے یا حیا سے بوجھل کرنے کے بجائے ایک عجیب سی گھبراہٹ میں مبتلا کرتا تھا۔

"میں خود کہتی ہوں۔" وہ اٹھیں۔

"رہنے دیں نا' ماما۔۔۔ میں اکیلی آپ کو اچھی نہیں لگتی؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟۔۔۔ لیکن شادی کے بعد بیٹیاں شوہر کے ساتھ کھڑی ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"پلیز ماما! بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

وہ سمجھا نہیں پا رہی تھی کہ ان اوّلین دنوں میں باپ کے سامنے شوہر کے ساتھ رہنا اسے حجاب میں مبتلا کر رہا تھا۔ اور دوسری وجہ اس کے اور خرم کے درمیان سرد تعلقات اور خرم کا تشکوک بھرا رویہ بھی تھا۔۔۔ جس کی بھنک بھی وہ اپنی ماں اور بہن کو نہیں دینا چاہتی تھی۔

"میں صرف ایک رات اور ایک دن یہاں اپنے لیے گزارنا چاہتی ہوں۔۔۔ انہی پرانے دنوں کی یاد میں۔۔۔ پلیز۔"

"ارے۔۔۔ خرم بیٹا۔۔۔ تم؟" مدیحہ نے سامنے دیکھ کے حیرت سے کہا تو تقدیس کرنٹ کھا کے اچھلی۔

وہ لاؤنج کے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"تم اپنا بیگ کار میں ہی بھول گئی تھیں۔۔۔ دینے آیا تھا۔"

"اب آ گئے ہو تو چائے پی کے جانا۔۔۔ میں تقدیس کے پاپا کو بلا کے لاتی ہوں۔" مدیحہ کے اسٹڈی کی طرف جانے پہ تقدیس نے اسی حالت میں کھڑے خرم کو مخاطب کیا۔

"آپ بیٹھیں نا پلیز۔"

"نہیں۔۔۔ چلتا ہوں میں۔۔۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے پرانے دنوں کی یاد میں مُخل ہوا۔۔۔ بے فکر رہو۔۔۔ جتنی دیر تم یہاں ہو' میں نہیں آؤں گا۔۔۔ تم جی بھر کے پرانی یادیں تازہ کرو۔" اس کے بظاہر سادہ الفاظ کے پیچھے جو پھنکار تھی' اس نے تقدیس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا کے رکھ دی۔

⚫ ⚫ ⚫

وہ ابھی ابھی چار گھنٹے اس کے ساتھ گزار کے آیا تھا۔

نہ صرف آج' بلکہ پچھلے چار روز سے وہ آفس سے سیدھا ہاسپٹل چلا جاتا تھا اور آج تو آفس سے بھی دو گھنٹے پہلے نکل آیا تھا۔ آج سوہا کو ڈسچارج جو ہونا تھا۔

اور آج ہی اس کی منزہ کے میکے والوں کے ہاں دعوت بھی تھی۔ یعنی سوہا کے سگے ماموں اور ممانی کے ہاں۔۔۔ سوہا کی زبانی اس کی مشکلات بھری زندگی کی ساری داستان سن چکا تھا اور اس کی طرح اب خود بھی یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کی اس حالت کے ذمے دار جہاں وشمہ کا باپ اور پروین ہیں جنہوں نے سوہا کے معاملے میں اپنے دل کو وسیع نہیں کیا' وہیں منزہ کے بھائی' بھابی بھی تھے جنہوں نے بھانجی کی کفالت سے انکار کرتے ہوئے اسے چچا کے سپرد کر دیا اور ان ہی لوگوں کی وجہ سے اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی تیرہ سال کسی فٹ بال کی طرح اِدھر اُدھر گزارے تھے۔

اسے بھی ان سب سے اتنی ہی نفرت محسوس ہوتی تھی جتنی کہ سوہا کو۔

منزہ اس کی ساس تھی۔ تو نوید مراد سسر۔ لیکن وہ ان کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا انہیں دیکھ کے سوہا کی حالت کے بارے میں گلے کرنے کے لیے اس کا دل پھٹنے لگتا تھا۔

پروین جن کو وہ ماں جتنی عزت دیتا تھا۔ اب ان کے سامنے کم سے کم آتا۔۔۔ مبادا وہ اس کی نظروں کے بدلتے رنگ دیکھ لیں۔

وشمہ جو اس کی شریکِ حیات تھی' اس کی محبت تو اوّل دن سے نہ پا سکی تھی۔۔۔ البتہ ہمدردی یا رعایت کی مستحق بھی نہ بن سکی کیونکہ وہی وہ ہستی تھی جس نے بالواسطہ یا بلاواسطہ سوہا کی حق تلفی کی تھی پھر کیسے وہ وشمہ کے ساتھ' منزہ اور نوید کی ہمراہی میں اس گھر دعوت کھانے چلا جاتا جس گھر میں سوہا کو دو دن روٹی نہ کھلائی جا سکی۔

اسی لیے آج جان بوجھ کے وہ تاخیر سے گھر آیا۔۔۔ ورنہ سوہا کا ڈسچارج تو چھ بجے تک ہی ہو گیا تھا۔۔۔ دو گھنٹے وہ اس کے ساتھ اس کے گھر میں رکا رہا۔

"تم کو ساری میڈیسنز باقاعدگی سے لینی ہیں۔"

اس کا ہاتھ تھامے وہ تاکید کر رہا تھا اور سوہا شرارت بھری آنکھوں کے ساتھ دیکھتی مسکرائے جا رہی تھی۔

"یہ بہت چور ہے دوا کھانے کے معاملے میں۔"

وصی کے سامنے جوس رکھتے ہوئے ربنا نے لقمہ دیا۔

"نہیں' اب یہ دوا بھی وقت پہ لے گی۔ آرام بھی بہت سا کرے گی۔ خوش رہنے کی کوشش بھی کرے گی اور۔۔۔"

"اب میں چلوں؟"

"اتنی جلدی؟"

"کافی دیر ہو گئی۔"

"ہاں۔۔۔ مگر میرے پاس تو ابھی آئے ہو۔۔۔ پہلے وہاں ہاسپٹل میں فارمیلیٹز میں بزی رہے۔ پھر جب سے یہاں آئے ہو' نرس بنے نصیحتیں جھاڑ رہے ہو' کچھ دیر تو بیٹھو۔"

اس کے ترسے ہوئے لہجے پہ وصی کمزور پڑنے لگا۔ دھیرج سے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"امی کے تین بار فون آ چکے ہیں' کہیں جانا تھا۔"

"نہیں جانا ہے نا۔۔۔ تمہیں کیا۔" پروین کے ذکر پہ سوہا کے ماتھے پہ ناگوار بل آئے۔

"میرے ساتھ ہی جانا تھا۔ ایک دعوت میں۔" وہ چور سا بن گیا۔

"شادی کی دعوت؟" سوہا کے لبوں پہ زہریلی مسکراہٹ آئی۔ "تو پھر صرف تمہاری امی ہی تو ساتھ نہیں ہوں گی تمہاری دلہن نے بھی جانا ہو گا۔ دو تین فون اس کے بھی آئے ہوں گے۔"

"سوہا پلیز!" وہ بے چارگی سے بولا۔ "کیوں ذہن پہ بوجھ ڈالتی ہو۔۔۔"

"یہ بوجھ تو اب عمر بھر رہے گا۔۔۔ ذہن پہ بھی اور دل پہ بھی۔"

"تو فی الحال یہ سب مت سوچو۔ میں ابھی تم سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ ایسا کوئی بھی وعدہ جسے جلد بازی میں کر تو لوں مگر پورا کرنے کے لیے سوچنا پڑے' وقت بہت سے فیصلوں کو خود ہی آسان کر دیتا ہے۔"

سوہا نے مطمئن ہوتے ہوئے سر ہلا دیا۔ وصی کی آنکھوں میں یقین کی چمک نے اسے مطمئن کیا تھا۔

"ویسے جانا کہاں ہے؟" وہ نارمل ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تمہارے ماموں کے گھر۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بتانے لگا۔

"میرے ماموں؟" وہ چونکی کتنے ناشناسا سے لگنے لگے تھے یہ لفظ' یہ رشتے اور یاد آتے ہی جیسے پرانے زخموں کے منہ کھلنے لگے۔ خون پھر سے رسنے لگا وہ سب زہریلی یادیں جو ان رشتوں کے حوالے سے وابستہ تھیں۔ وہ سب اس نے وصی کے سامنے دُہرا دیں' وہ تو دل کا بوجھ ہلکا کر کے سبک ہو گئی۔ لیکن جب وصی وہاں سے نکلا تو اس کے سینے پہ پتھر پڑے تھے۔

✡ ✡ ✡

"وصی آئے نہیں اب تک؟"

ہلکے پیازی رنگ کے کام دار زری پوت کے جوڑے میں ملبوس' بڑے سے بھاری کام والے آسمانی دوپٹے کو کندھے پہ ڈالے' سفید اور ہلکے نیلے نگوں والے سونے کے گلوبند اور جھمکوں سے آراستہ' ایک کلائی کو سوٹ

کی ہم رنگ کانچ کی چوڑیوں سے اور دوسری کلائی کو سونے کی جڑاؤ چوڑیوں کے سیٹ سے بھرے وہ نفاست سے میک اپ میں پوری طرح تیار پروین سے کوئی چوتھی بار پوچھ رہی تھی۔
وہ خود وصی کے اب تک نہ آنے اور فون پہ تسلی بخش جواب نہ دینے پہ الجھی ہوئی تھیں' بار بار کے استفسار پہ چڑ گئیں۔
"مجھے کیا پتا' آتا ہوگا۔"
اور پھر ایک نظر اس کی بھرپور تیاری پہ ڈالی۔
شادی کو سولہ سترہ دن ہوئے تھے' ایسا سنگھار انہوں نے بھی ان دنوں میں خوب کیا تھا بلکہ شوکت جہاں نے زبردستی کرایا تھا۔ وہ وقت ہی اور تھے۔ کہیں جانا ہو یا نہ جانا ہو۔ دلہنوں کے لیے ہر وقت سونا لادے رکھنا اور ہار سنگھار کیے رکھنا لازمی تھا۔ موسم ہو یا نہ ہو' سال بھر روز جہیز اور بری کے بھاری جوڑے پہننا بھی ضروری ہوتا تھا۔ لیکن اب وقت بدل گیا تھا۔ انہیں بھی اچھا لگتا تھا کہ گھر کی بہوئیں بن سنور کے' پہن اوڑھ کے رہیں لیکن وشمہ کی یہ عادت ذرا معمول سے ہٹ کے تھی۔
تقدیس بھی اس کے ساتھ بیاہ کے آئی تھی۔
سلیقے سے پہن اوڑھ کے رہتی..... کلائی میں کانچ کی چوڑیاں بھی ہوتیں..... ساتھ سونے کے کنگن بھی..... ہلکا پھلکا سیٹ بھی پہن رکھا ہوتا یا لاکٹ اور ٹاپس تو ہر وقت پہنے ہوتے لیکن میک اپ کے نام پہ لپ اسٹک اور کاجل جہیز میں بھی دو چار بھاری جوڑے تھے۔ باقی سب جدید تراش خراش کے کڑھائی والے یا پرنٹڈ سوٹ۔ بری بھی ظلِ ہما اور ندا نے بنائی تھی۔ ندا کی ابھی ابھی شادی ہوئی تھی اور اسے تجربہ تھا کہ درجنوں کے حساب سے تیار کیے لہنگے اور بھاری کام والے جوڑے کیسے بے کار پڑے رہتے ہیں اور چند ماہ بعد ہی فیشن کے حساب سے پرانے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس نے ہما کے جہیز اور تقدیس کی بری کے لیے خاص یہ اہتمام کیا تھا۔ خود وہ جاب کی وجہ سے شادی کے فوراً بعد ہی سے معمول کے رنگ ڈھنگ میں نظر آنے لگی تھی۔
ظلِ ہما بھی شوکت جہاں کے ٹوکنے کی وجہ سے شام کے اوقات میں مقدور بھر تیار ہو جایا کرتی تھی لیکن وشمہ کے تو رنگ ڈھنگ نرالے تھے۔ وہ ناشتے کے لیے جب کمرے سے نکلتی تو فل میک اپ میں اور سونے کے ایک دو سیٹ پہنے ہوتی..... کہیں جاتے وقت تو حال ہی اور ہوتا جیسے کہ اس وقت تھا۔
"اور کون کون آرہا ہے وہاں؟"
"بس ہم لوگ اور ماما' پاپا۔"
"اچھا۔ میں سمجھی کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہے شاید۔ تمہاری تیاری سے لگا تھا۔"
وشمہ جل کے رہ گئی۔ حالانکہ بہت سادہ انداز میں پروین نے احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ولیمہ کی دلہن کی مانند تیار ہے۔
"پہلی بار جا رہی ہوں ننھیال۔ شادی کے بعد بھی پہلی بار اور ویسے بھی پہلی بار۔ پہلے کسی نے کبھی جانے ہی نہیں دیا۔"
"تمہارے ننھیال نے خود ہی کبھی رابطہ نہیں رکھا..... نہ تمہیں پاس بلانے یا ملنے کی خواہش ظاہر کی..... ورنہ ہم میں سے کبھی کوئی نہ روکتا۔ رہے یہ لوگ تو یہ تمہارے ننھیال والے نہیں بھابی کے میکے والے ہیں۔"
پروین نے ہاتھ میں پکڑا دوپٹہ دوبارہ تہہ کرتے ہوئے ذرا تیز لہجے میں کہا۔
وشمہ بھانپ گئی کہ موڈ خراب ہونے کی وجہ سے پروین کا ساتھ جانے کا ارادہ ملتوی ہو گیا ہے۔ جو پہلے ہی ڈانواں ڈول سا تھا۔ منزہ کے ساتھ عرصے سے سرد خانے کا شکار تعلقات اب بالکل ہی تباہی کے دہانے پہ تھے' کجا کہ وہ اس کے میکے کی کسی دعوت میں شریک ہوتیں۔ لیکن اب معاملہ سمدھیانے کا تھا۔
منزہ کے بھائیوں اور بھابیوں نے صرف وصی اور وشمہ کو نہیں بلکہ اس کے پورے خاندان کو کھانے پہ بلایا تھا۔

...ید اور ثنا گیارہ سال بعد وطن لوٹے تھے۔ اتفاق سے عین شادی کے دن پہنچے تھے۔ شادی کی اور بعد کی مصروفیت ...جہ سے وہ منزہ سے کھل کے مل بھی نہ سکے تھے۔ کچھ منزہ بھی دل میں کھنچاؤ لیے ہوئے تھی جسے ثنا نے محسوس ...یا تھا اور اس کے خیال میں یہ بہترین موقع تھا' منزہ سے اپنے کشیدہ تعلقات سنوارنے کا جس کو بگاڑنے میں ...اور صرف حالات کارفرما رہے تھے۔
...ہی سوچ کر انہوں نے وشمہ کے سارے سسرال کو انوائیٹ کیا تھا..... جو کہ ایک لحاظ سے منزہ کا بھی سسرال ...اس کی نند کا گھرانا..... لیکن یہ بات منزہ کو مسرور کرنے کے بجائے الٹا طیش دلا رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا ...لوگوں سے وہ نفرت کرتی ہے' اس سے ہمدردی اور اپنائیت کا دعویٰ کرنے والے سب لوگ ان سے نفرت ...ں۔ لیکن بعد میں ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو احساس ہوا' یہی موقع ہے اپنے بھائیوں اور بھابیوں کی نظروں سے ...ترحم کے جذبے کو دھونے کا..... جو وہ کئی سالوں سے دیکھتی آرہی تھی۔
...ہ کے فون آتے تو لہجہ شرمندہ شرمندہ سا ہوتا۔ جمشید بات کرتا تو شرمساری اور تاسف کے ملے جلے جذبات ...ساتھ..... جمیل بھائی اور کلثوم بھابی تو خیر سوہا والے معاملے کے بعد اس سے نظر بھی کم ملاتے تھے۔ بس عید' ...برات پہ ملنا جلنا رہ گیا تھا..... منزہ کو ان سب کی ترس بھری نظریں زہر لگا کرتی تھیں۔ اسے لگا آج سالوں کی ...فت کے بعد موقع ملا ہے ان ترحم آمیز نظروں کو رشک بھری نظروں میں بدلنے کا۔
...اس نے وشمہ کو خوب اچھی طرح تیار ہو کر آنے کا کہا۔ جس کا اسے ویسے بھی بہت شوق تھا۔ اور یہ تاکید بھی ...کہ اوّل تو پروین کسی بھی طرح آنے کا ارادہ موقوف کردیں اور اگر آئیں بھی تو اس موڈ کے ساتھ کہ ان کا آنا یا نہ ...ایک برابر ہو۔
"میں نے ہر اس موقع پر اپنا دل کٹتے محسوس کیا ہے وشمہ! جس پہ مجھے خوش ہونا چاہیے تھا۔ اب میرا دل چاہتا ...کہ میں بھی سب کو ان کی روتی بسورتی ہی شکل دکھاؤں..... عید پہ بھی میرے بھائی بھابی مجھ سے ملنے آتے تھے ...یا نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوتی تھی جس میں اپنا بھرم رکھنے کی خاطر بھی جھوٹ موٹ کی ہنسی کا لبادہ تک نہ اوڑھ ...تھی۔ اب میں کھل کے خوش ہونا چاہتی ہوں۔ سب کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں ایک ناکام عورت نہیں ہوں۔ ...ایک بیٹی مجھ سے الگ ہوئی ہے تو دوسری نے اس سے بڑھ کر میری ممتا کی تسکین کی ہے۔ میں سرخرو ہوئی ...ہ۔ میں سب کو فخر سے بتانا چاہتی ہوں۔"
"ایسا ہی ہوگا ماما!" وشمہ نے یقین دلایا تھا اور اب لال بھبھوکا چہرہ لیے دوپٹہ واپس الماری میں رکھتی پروین کے دعوے کو غلط ثابت کرنے جا رہی تھیں۔
"کہاں جا رہی ہیں آپ؟" اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔ پروین رات پہننے والی سوتی شلوار قمیص نکال کر واش روم ...جانب جا رہی تھیں۔
"لباس تبدیل کرنے..... وصی تو اب تک آیا نہیں اور ظاہر ہے تم اس کے بغیر تو جانے والی نہیں..... پتہ نہیں ...ب آتا ہے وہ..... میں اتنی رات گئے تک نہیں جاگ سکتی۔ نہ دیر سے کھایا کھانا ہضم ہوتا ہے مجھے۔"
"...یہ سب آپ وصی کو کہیں نا..... انہیں یاد نہیں کہ ہم نے جانا تھا۔"
"...کتنے فون کروں میں..... بلاوجہ کیوں تنگ کر رہی ہو وشمہ!" اس بار پروین نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔ "گھر سے ...مرد کو سو کام ہوتے ہیں۔ تمہارے پھوپھا کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ تم نے اپنے ہوش میں انہیں کتنی بار ...ے ساتھ اپنے سسرال آتے دیکھا ہے..... دھیرج رکھنا سیکھو۔ زیادہ سوال جواب سے مرد چڑ جاتے ہیں۔"
...انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں پتے کی بات بتانی چاہی مگر وشمہ کے دل میں مزید غبار بھر گیا..... اس نے ...کہ وصی کی حمایت بلاوجہ نہیں کی جا رہی بلکہ ضرور خود کسی نہ کسی کام سے گھر سے باہر پھنسا رکھا ہے' صرف ...اسے جلانے کے لیے۔
...کوئی ضرورت نہیں کڑھ کڑھ کے اپنی صحت خراب کرنے کی۔ میری حالت دیکھو۔ اندر ہی اندر سب

برداشت کر کر کے کئی روگ لگا لیے..... وہ لوگ اچھے رہتے ہیں جو یا تو دل میں آئی ہر بات ہر غبار..... ہر بھڑاس فوراً سے نکال باہر کرتے ہیں' سامنے والا بھلے جو بھی سوچے یا پھر وہ لوگ جو بے حسی کی چادر اوڑھے رہتے ہیں۔"
منزہ کا سکھایا سبق یاد آیا۔ اور وہ چہرے کے تاثرات کو ایک ڈھیٹ سی مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے پلٹی۔
"اوہ..... گجرے منگوائے تھے حسان بھائی سے۔ دیکھوں لائے کہ نہیں۔"
"گجرے؟" پروین کو وحشت ہونے لگی۔ انہیں ذرا اچھی نہیں لگتی تھیں بالوں میں بھاری گجرے لٹکانے والی عورتیں لیکن وشمہ کو کتنا ٹوکتیں اور کس کس بات پہ ٹوکتیں۔ ہاتھ میں پکڑے رات پہننے والے سوٹ کو دیکھ کے ملال اور بڑھ گیا۔ ایک بار بھی تو وشمہ نے اصرار نہیں کیا تھا ساتھ چلنے کو۔
اور وہ جو خود تذبذب میں تھیں کہ غصے میں آ کے دعوت میں نہ جانے کا فیصلہ جلد بازی تو نہیں؟ اب دل ہی دل میں یہ بات پکی کر رہی تھیں کہ اب جو بھی ہے۔ انہیں کہیں نہیں جانا..... کم از کم وشمہ کے ساتھ یا منزہ کے رشتے دار کے ہاں تو ہرگز نہیں۔
وشمہ حسان کے لائے گجرے پنوں کی مدد سے چوٹی پہ ٹانک رہی تھی جب آئینے میں اپنے عکس کے پیچھے اس نے وصی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ رونق سی آ گئی۔
"آ گئے آپ؟..... اتنی دیر۔"
وصی کو اس کے لدے پھندے وجود سے الجھن سی محسوس ہوئی۔ اس کی وہ معصومیت..... وہ سادا سا حسن اب نظر ہی نہیں آتا تھا۔ شاید چہرے کا حسن باطن کے شفاف ہونے سے مشروط ہوتا ہے۔ یہی وشمہ تھی..... جسے پہلے کبھی دیکھتا تھا تو چینی کی مورت جیسی لگا کرتی..... بھولی بھالی..... اور اب جیسے کوئی حسین مگر بے جان' بے کشش مجسمہ۔ پتھر کا مجسمہ۔
اور وہی سوہا جو پہلی ملاقات میں اسے بے حد عام بلکہ سطحی سی لڑکی لگی اور جس کے قریب وہ محض جذبہ ہمدردی کے تحت ہوا تھا۔ ورنہ اس کی ظاہری شخصیت میں ایسا کچھ نہ تھا جو وصی جیسے لڑکے کو متاثر کرتا۔ لیکن اب وہی سوہا اسے ساری دنیا سے پیاری لگتی تھی۔
"آپ کو یاد نہیں تھا' آج ہمیں..."
"یاد تھا۔" مختصر جواب دے کر وصی نے وشمہ کی یہ خوش فہمی بھی توڑ دی جو اسے سہارا دیے ہوئے تھی کہ شاید اسے یہ بات ہی بھول گئی ہو۔
"پھر؟ کوئی کام پڑ گیا تھا ضروری؟"
"ظاہر ہے..... بغیر کسی کام کے تو سڑکوں پہ نہیں پھر رہا تھا۔"
وہ تھکے ہارے انداز میں بیڈ پہ بیٹھ کے شوز اتارنے لگا۔ "بہت تھک گئے ہیں؟"
وصی نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور وہیں آڑا ترچھا لیٹ گیا۔ اسے لیٹا دیکھ کے وشمہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔
"لیٹ کیوں گئے ہیں؟ تیار ہو جائیں نا' دیر ہو رہی ہے۔"
وصی کا دل چاہا' خود کمرے سے نکل جائے یا اسے نکال دے۔ جتنا وہ سوالوں اور تکرار سے بچنا چاہ رہا تھا۔ اتنا ہی وہ زچ کیے دے رہی تھی۔
"گرے سوٹ نکال دیا ہے میں نے..... ساتھ میں یہ والی شرٹ اور ٹائی چلے گی۔"
اب وہ الماری میں سے شرٹ نکال کر دکھا رہی تھی۔
وصی نے مٹھیوں میں بال جکڑ لیے۔
"کیا ہوا..... سر میں درد ہو رہا ہے؟"
وصی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کہ شاید اب ترس کھا کے ہی وہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ دے لیکن.....
"اوہ..... آپ شاور لے لیں..... طبیعت بہتر ہو جائے گی۔ تب تک میں چائے بنا لاتی ہوں اور ساتھ میں ٹیبلٹ کلر بھی۔"

نجات کہیں نہیں تھی' اس لیے ناچار اسے تولیہ لے کر واش روم میں جانا ہی پڑا۔
پروین خود تو نہ گئیں لیکن وصی کو کسی نہ کسی طرح انہوں نے نہ جانے کے ارادے سے باز رکھا جو آخری وقت تک بہانے بناتا رہا۔ پروین نہ گئیں تو شوکت جہاں نے بھی جانا مناسب نہ سمجھا۔ سراج دین ویسے ہی نہ جا رہے تھے۔ ہما کی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے وہ اور حسن پہلے ہی معذرت کر چکے تھے۔
وصی کو بیس منٹ کی ڈرائیو اکیلے وشمہ کے ساتھ کرنے میں اور بھی کوفت کا سامنا کرنا پڑا..... اس کی ساری ادائیں..... ساری باتیں' ساری ان تھک کوششیں ایک ایک کر کے ضائع ہوتی گئیں۔ وہ کسی بے جان چیز کی طرح بیٹھا سامنے دیکھتا کار چلاتا رہا۔ نتیجتاً جمیل کے گھر پہنچنے تک منزہ کی ساری ہدایتوں کو فراموش کر کے وشمہ اپنا موڈ بری طرح خراب کر چکی تھی۔

❖ ❖ ❖ ❖

خرم صرف چار منٹ رکا تھا۔
لیکن ان چار منٹ میں وہ اسے بری طرح ہلا کے رکھ گیا تھا۔
شادی کی اولین رات سے جو خدشہ کسی کیچوے کی طرح تقدیس کے دل پہ سرسرا رہا تھا' آج پھن پھلائے ناگ کی طرح سامنے آ گیا۔
اس کا شریک حیات' اس پہ اعتبار نہیں کرتا تھا۔
اسے اس کی ذات کے حوالے سے بہت سے ابہام تھے۔
اور تقدیس کو نہ تو اس کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی..... نہ اس کے سدباب کا کوئی راستہ سجھائی دے رہا تھا۔
ایک بالکل انجان شخص..... جس سے بے شک ایک گہرا رشتہ قائم ہو چکا تھا لیکن ابھی انہوں نے ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کے عمل سے گزرنا تھا اور وہ پہلے ہی اس کے بارے میں اپنی رائے مستحکم کر چکا تھا..... ایک ایسی رائے جو سراسر غلط فہمی پہ مبنی تھی۔ پہلے دن ہی سے دونوں میں سے کسی نے نہ فاصلوں کو پاٹنے کی کوشش کی تھی' نہ ان غلط فہمیوں اور غلط گمانیوں کی وضاحت کی' اس لیے اسے بے حد دشوار لگ رہا تھا کہ کیسے وہ خرم سے اس موضوع پہ بات کرے۔
اگر وہ محض مہندی کے فنکشن میں سوہا کی جانب سے کیے تماشے کی وجہ سے یہ سب سوچ بیٹھا ہے تو کیا اسے اپنی پوزیشن واضح کرنی چاہیے یا اس کی جانب سے رائی کا پہاڑ بنا لینے پہ اپنی نسوانیت کا وقار اور انا کا پرچم بلند کرتے ہوئے خود بھی خفا ہو جانا چاہیے۔
اگر کسی اور نے اس کے خلاف خرم کے کان بھرے ہیں تو کیا وہ...
"تقدیس!" مدیحہ کی آواز پہ وہ ادھیڑ بن سے نکلی۔
"جی ماما!"
"کیا بات ہے..... کل سے نوٹ کر رہی ہوں تم کچھ کھوئی کھوئی سی ہو۔"
"نہیں ماما! ایسی تو کوئی بات نہیں۔"
اسے مدیحہ کی کھوجتی نظروں سے الجھن ہوئی۔ وہ اپنی پریشانی کا اظہار کسی سے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی..... اپنی ماں سے بھی نہیں۔ اپنی ہی ذات کے ہلکا ہونے کا احساس ہوتا تھا۔
"مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟"
"تحریم آپی کا کوئی فون آیا؟" اس نے ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے بات بدلی۔
"میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے..... سچ سچ بتاؤ..... تمہارے سسرال میں سب ٹھیک ہے نا؟"
"ایسا کچھ نہیں ہے ماما..... پلیز یقین کریں..... وہ تو..." وہ روانی سے بتاتے بتاتے پھر رک گئی۔
"تو کیا خرم؟" وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ ہی گئی تھیں تو اب مکرنے کا فائدہ..... سو وہ خاموشی سے سر جھکا کے رہ گئی۔ وہ کسی کا بھی نام لے لیتی۔ ساس کا' نند کا' دیورانی کا شاید مدیحہ اسے اتنا سنجیدگی سے نہ لیتی۔ لیکن خرم کا نام

ایک پل کے لیے تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا لے آیا۔

"یا میرے خدا۔۔۔! تم۔۔۔ تم بھی۔۔۔" وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔

"میں ہمیشہ ڈرتی تھی کہ میری قسمت کی ہلکی سی پرچھائیں بھی میری کسی بیٹی پہ نہ پڑے۔۔۔۔ میں ہر وقت یہی دعا کرتی تھی۔۔۔ لیکن میں ایک دعا کرنا بھول گئی کہ یا اللہ! میری بچیوں کو ان کے باپ کے اعمال کی سزا نہ دینا۔ لیکن۔۔۔

"خود ساری عمر آوارگیوں میں گزار دی تمہارے باپ نے اور یہ نہ سوچا کہ اس کی اپنی بیٹیوں کے آگے آسکتا ہے یہ سب۔"

"لیکن ماما!" اس نے کہنا چاہا۔

"خرم شادی سے پہلے سے کسی کو چاہتا تھا یا پھر اس نے پہلے سے شادی کر رکھی ہے؟"

"بس ایسے ہی ذرا۔۔۔ ہماری انڈر اسٹینڈنگ۔۔۔ دراصل ہمارے مزاج بہت الگ الگ۔۔۔"

"بس بس رہنے دو تقدیس۔۔۔! یہ مزاج اور انڈر اسٹینڈنگ کی باتیں تو فضول ہی ہوتی ہیں۔ اگر کسی کا دل صاف نہ ہو تو وہ کسی کے ساتھ بھی رشتے کو نبھا نہیں سکتا۔۔۔ میں خود بات کروں گی تمہاری ساس کے ساتھ۔"

"خدا کے لیے ماما! کیوں بات کو بڑھا رہی ہیں؟" وہ گھبرا اٹھی۔

"اب تو آمنے سامنے ہوگی یہ بات ذرا پوچھوں تو سہی ان سے کہ جب ان کے بیٹے کا کسی اور سے چکر تھا تو میری بچی کی زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"یہ دیکھیں ماما۔۔۔! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔۔۔ خدا کے لیے اس بات کو یہیں چھوڑ دیجیے۔۔۔ میں نے بہت غلطی کی جو اپنی ایک ذرا سی پریشانی آپ سے شیئر کرنا چاہی۔۔۔ یہ سوچ کر کہ آپ ایک ماں بن کے ایک دوست کی طرح مجھے کوئی مشورہ دیں گی۔ لیکن آپ نے تو ہمیشہ جذبات میں آ کے بات بگاڑی ہی ہے۔ سنواری نہیں۔ جو حشر آپ نے اپنے اور پاپا کے رشتے کا کیا ہے اب آپ میری زندگی کا کرنا چاہتی ہیں۔"

مدیحہ سن بیٹھی اپنی ہی بیٹی کے منہ سے یہ فردِ جرم سن رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب مستقلاً "پاکستان میں ہی رہوں گا۔"

خرم کے فیصلے نے رخشندہ اور معراج دین کو بے حد مسرور و مطمئن کیا تھا۔۔۔ وہیں ابھی ابھی میکے سے واپس آئی تقدیس کو قدرے حیرت ہوئی۔

ابھی اس دن تو وہ ندا آپی کے شوہر سے یہ ڈسکس کر رہا تھا کہ سرمائے کی کمی کی وجہ سے وہ پاکستان میں فی الحال کاروبار کی پوزیشن میں نہیں ہے اور باپ کے گارمنٹس کے بزنس میں شروع سے اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے دوسری جانب اس کی جو فیلڈ ہے اس میں یہاں اسکوپ نہ ہونے کے برابر ہے۔

شادی سے پہلے رخشندہ نے بھی تقدیس کے گھر والوں سے یہی کہا تھا کہ شادی کے فوراً بعد وہ واپس چلا بھی گیا تو جلد از جلد تقدیس کو پاس بلانے کی کوشش کرے گا۔

اس کے اس اعلان سے ظاہر ہے کہ اس کے ماں باپ اور بہنیں تو خوش ہوئے ہی تھے۔۔۔ اکلوتا بیٹا اور اکلوتا بھائی تھا۔۔۔ اور کئی سال سے پردیس میں بھی تھا۔

ندا نے تو برملا اسے تقدیس کی محبت کا اعجاز کہا۔

"ہاں بھئی۔۔۔ چند دن کی دوری بھی برداشت نہیں ہو رہی ہوگی اب تو۔"

تقدیس اس شریر تبصرے پہ پھیکے پن سے مسکرا دی۔ بعد میں چونک کر رہ گئی جب اکیلے میں خرم نے اس کی تائید کی۔

"میں نے واقعی یہ فیصلہ تمہاری وجہ سے کیا ہے۔"

اس کا لہجہ عام سہی مگر انداز اتنے بے گانہ سے تھے کہ وہ کوئی خوش فہمی بھی نہ بن سکی۔

"پتا نہیں تمہارے پیپرز بننے میں کتنا وقت لگے۔۔۔ میں تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میری بہنیں بہت سیدھی سادی ہیں۔ اور ایک سیدھی سادی زندگی گزاری ہے انہوں نے۔۔۔ میری امی کو تجربہ نہیں ہے تم جیسی لڑکیوں کو ہینڈل کرنے کا اور میں نہیں چاہتا کہ میری غیر موجودگی میں تمہاری وجہ سے میرے گھر والوں کو کوئی پریشانی ہو۔"

سبکی کا اتنا شدید اور تلخ احساس اسے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

"اور ساتھ لے بھی گیا تو کہاں سنبھالتا پھروں گا تمہیں۔۔۔ کام کروں گا یا تمہاری ٹینشن لوں گا۔"

"آ۔۔۔ آپ' آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟"

وہ سفید پڑتا چہرہ اور کپکپاتا وجود لیے پوچھ رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے خرم کو اپنے اندر نمی سی محسوس ہوئی لیکن پھر طبیعت کا شکی پن غالب آگیا۔

"یہ سوال تم اپنے آپ سے کرو۔ جتنا تم خود اپنے آپ کو جانتی ہو میں نہیں جانتا۔"

"آپ مجھے بالکل بھی نہیں جانتے اور نہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

اس نے آنسو صاف کیے اور مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں نہیں جانتی۔۔۔ آپ کس بنیاد پہ میرے کردار کو نشانہ بنا رہے ہیں۔۔۔ یہ محض غلط فہمی ہے یا کسی کی بدنیتی کا شاخسانہ۔۔۔ لیکن آپ کو کوئی بھی رائے بھی قائم کرنے سے پہلے دل کی گواہی تو لینی چاہیے۔"

"میری نظروں کی گواہی کافی ہے۔۔۔ اور آنکھوں دیکھے کو میں جھٹلا نہیں سکتا۔"

بے حد تنفر سے کہتا وہ نکل گیا اور وہ حیران کھڑی دیر تک سوچتی رہی کہ آخر اس کی زندگی کا وہ کون سا لمحہ تھا جو خرم کی نظروں کی پکڑ میں آگیا؟ کون سا ایسا لمحہ "ایسا گمراہ کن لمحہ جس کے بارے میں اسے کچھ یاد نہیں۔

✦ ✦ ✦ ✦

"سوہا سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔"

ثنا کے کہنے پہ منزہ نے اسے جن نظروں سے دیکھا ثنا تو ثنا جمشید بھی شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

"تم تو۔۔۔ میرا مطلب ہے' کبھی کبھی ملنا تو ہوتا ہوگا؟" ثنا نے ہمت کر کے دوبارہ پوچھا۔

"اس کی گنجائش ہی کہاں چھوڑی گئی۔"

اس کے خشک لہجے میں دیے جواب پہ ثنا نے ایک بار پھر ہمت ہار دی۔ وہ دوستی' وہ اپنائیت' وہ بے تکلفی جیسے کسی پچھلے اسٹیشن پہ چھوٹ چکے تھے۔

"سنا ہے "اس کے چچا' چچی نے اسے بہت ناز و نعم سے پالا ہے۔" اس بار جمشید نے سکوت توڑنے میں پہل کی۔

"ہاں۔ کسی کے دل میں تو رحم ڈالنا تھا اللہ نے جسے وہ پیدا کرتا ہے اس کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ بھی بناتا ہے۔"

"دیکھو منزہ! اس وقت جو حالات تھے "ان میں شاید جمیل بھائی نے اپنے لحاظ سے ٹھیک ہی سوچا تھا۔"

"اپنے لحاظ سے۔۔۔ میری اولاد کے بارے میں فیصلہ وہ اپنے لحاظ سے کیسے کر سکتے تھے؟"

منزہ کا برسوں کا رکا شکوہ بڑی تیزی سے لبوں تک آیا۔

"تو تم کر لیتیں۔" سدا کی صاف گو ثنا کے آئینہ دکھانے پہ منزہ کی ساری تیزی ماند پڑ گئی۔

"تم بھی تو تب یہی فیصلہ کرتیں۔۔۔ اور اسے اپنی مجبوری کا نام دے دیتیں تو کیا مجبوریاں دو مردوں کو نہیں ہو سکتیں؟"

"چند سال۔۔۔ اگر صرف چند سال کوئی میرا ساتھ دیتا۔۔۔ میری بیٹی کو قبول کر لیتا تو آج اس کی اور میری زندگی وہ نہ ہوتی جو ہے۔۔۔ صرف چند سال۔۔۔ وہ کوئی غیر نہیں تھی' میری اولاد تھی اور جن سے مجھے تعاون کی امید تھی۔ وہ بھی غیر نہ تھے۔ میرے اپنے بھائی تھے۔ لیکن کسی نے دل وسیع نہ کیا۔ اپنے بچے بھی تو پل رہے تھے اگر وہ بھی۔۔۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں تو یہاں تھا نہیں ورنہ۔۔۔" جمشید نے جواز پیش کرنا چاہا جسے وہ خاطر میں نہ لائی۔

"وہاں رہ کے آپ میری حمایت میں کچھ کہہ تو سکتے تھے جمیل بھائی سے۔ میری پوزیشن جو تھی وہ آپ جانتے ہیں۔ جس گھر میں میری بیٹی کے لیے جگہ نہ نکل رہی تھی' شوہر سے بگاڑ کے میں دوبارہ کیسے وہاں آجاتی۔۔۔ مجھے ہر حال میں وہ چھت چاہیے تھی۔۔۔ جلد یا بدیر میں اتنی گنجائش پیدا کر لیتی کہ سوہا کو اپنے پاس بلا لیتی لیکن اگر جمیل بھائی کا دل تنگ پڑ رہا تھا تو آپ نے کون سا کشادگی کی کوئی راہ دکھلائی۔ اگر سارا مسئلہ اس بچی کے ذرا سے خرچے کا تھا تو وہ آپ وہاں بیٹھے بھی اپنے ذمے لے سکتے تھے لیکن۔۔۔ لیکن کسی نے اس چند روزہ کفالت کی بھی ہمت نہ کی کہ کہیں عمر بھر کا بوجھ سر پہ نہ آن پڑے۔ سوہا یہاں رہتی تو میں کبھی بھی اسے ساتھ لے جاتی۔۔۔ کم از کم اسے ماں کی مجبوری اور محبت کا احساس تو رہتا مگر وہاں تو پکے کاغذوں پہ کارروائی ہوئی۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے سوہا سے دست برداری لکھنی پڑی صرف اور صرف جمیل بھائی کی تنگ دلی کی وجہ سے۔ آج میری بچی کے دل میں میرے لیے سوائے نفرت اور بیزاری کے اور کچھ نہیں۔ مجھے یہ بھی قبول تھا۔ بھلے وہ مجھ سے نفرت کرتی رہتی مگر اس کی اپنی زندگی سنور گئی ہوتی۔۔۔ میرے لیے یہ بھی بہت تھا۔ لیکن کاش' کاش! آپ اس درد کو محسوس کر سکیں جو مجھے سوہا کی بربادی دیکھ کے محسوس ہوتا ہے۔ صرف ناز و نعم سے پال لینا سب کچھ نہیں ہوتا ثنا بھابی! ایک چیز تربیت بھی ہوتی ہے جو صرف ماں اپنی اولاد کو دیتی ہے اور میری سوہا اس سے محروم رہ گئی۔ میں پرائی بیٹی کو تراش تراش کے ہیرا بناتی رہی اور میری اپنی بچی اس وقت راستے کا پتھر بنی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔"

اسے وشمہ کی مہندی کے موقع پہ سکیورٹی گارڈز کا سوہا کو دھکے دے کر نکالنا یاد آ گیا۔۔۔ اور آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔

ثنا اور جمشید ایک دوسرے کی جانب دیکھ کے رہ گئے۔

منزہ سے نظریں ملانے کا حوصلہ تو تھا نہیں۔

* * * *

حسن پروین کے کہنے پہ ظلِ ہما کو ڈاکٹر کی طرف لے جا رہا تھا۔ اسے پچھلے مہینے ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی تھی۔

حسن کے رویے میں بھی فطری طور پہ خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔

"سنیے۔۔۔ ذرا روکیں۔"

ظلِ ہما نے بے ساختہ حسن کا بازو پکڑ کے متوجہ کیا مگر اس کے پوچھنے پہ اب جھجک رہی تھی۔

"بولو نا۔۔۔۔ کچھ بھول آئی ہو گھر پہ!"

"نہیں وہ۔۔۔"

حسن نے اس کی نظروں کے تعاقب میں فٹ پاتھ پہ دیکھا۔ چند ایک ٹھیلے والے کھڑے تھے۔ سب سے نمایاں ہو رہے تھے رنگ برنگے غبارے۔

"غبارہ چاہیے؟"

ہما بے ساختہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

حسن نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ کچھ دنوں سے اسے ہما کے ہر انداز ہر ادا پہ حیرت ہوتی تھی کہ یہ وہی لڑکی تھی جسے زندگی کا ساتھی بنا لینے کے بعد۔۔۔ اور قربت کی انتہائی ساعتوں میں بھی اس نے کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا۔ اب تو جیسے وہ رفتہ رفتہ دل میں اتری جاتی تھی۔

"ابھی سے کیا کرنے ہیں غبارے۔ ابھی تو بہت وقت ہے۔

آپ بھی ناں۔۔۔ میں غباروں کا کب کہہ رہی ہوں۔۔۔ وہ شکر قندی۔۔۔"

"اوہ۔۔۔۔ شکر قندی۔"

حسن نے ڈیش بورڈ سے والٹ اٹھایا اور نکلتے نکلتے پھر رکا۔ ذرا تشویش سے ٹھیلے والے کی شکر قندی پہ منڈلاتی مکھیوں کو دیکھا۔

"نہیں بھئی۔۔۔ یہ ذرا بھی ہائی جینک نہیں ہے۔ تم نے سنا نہیں تھا' اس دن ڈاکٹر نے کیا کہا تھا۔۔۔ کہ اب تمہیں کھانے پینے میں بہت احتیاط کرنی ہے اور اپنی صحت کا خیال رکھنا ہے غذائیت اور طاقت والی خوراک کھانی ہے۔ پھل' دودھ' انڈے گوشت وغیرہ۔۔۔ یہ شکر قندی کون سی سوغات ہے؟"

"میرا دل کر رہا ہے۔ کچھ کھٹ میٹھا' چٹ پٹا کھانے کو۔" اس نے منہ لٹکا لیا۔

"کچی لے چلتے ہیں۔ ابال لینا اور جو الا بلا چاہے اوپر چھڑک کر کھا لینا۔"

اس کی تجویز پہ ہما نے مشفق ہو کر سر ہلا دیا اور ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ ایسی ہی تھی راضی برضا رہنے والی۔

کار دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے حسن کی نظر سڑک کے دوسری جانب گئی۔ اوپن ایئر آئس کریم کارنر میں کونے والی ٹیبل پہ بیٹھا بلاشبہ وصی تھا مگر اس کے ساتھ ایک ہی کپ میں آئس کریم کھاتی وہ ہنستی ہوئی لڑکی وشمہ نہیں تھی۔

حسن کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کے ظلِ ہما نے بھی گردن گھما کے اس کی توجہ کا مرکز تلاشنا چاہا۔ اور اگلے ہی پل وہ بھی ساکت تھی۔

* * * *

"ایسا کب تک چلے گا سوہا؟"

یہ سوال کرنے کا ارادہ وہ کافی دنوں سے کر رہی تھی لیکن ہر بار سوہا کے بگڑتے مزاج اور صحت کا سوچ کر ڈر جاتی تھی۔۔۔ لیکن آج اس کی معمول سے زیادہ چہکتی گنگناہٹ اور پورے بدن سے پھوٹتی مسکراہٹیں دیکھ کے ریحانہ ہمت کر ہی لی۔

"کیا سب؟" وہ انجان بن گئی۔

"یونہی۔۔۔ روز روز کئی کئی گھنٹے تک گھومنا پھرنا۔۔۔ اور پھر۔۔۔ پھر تمہارا اپنے گھر اور اس کا اپنے گھر لوٹ جانا۔"

سوہا جیسے کسی خواب سے چونک کر جاگی۔

"پہلے کی بات اور تھی' اب وہ شادی شدہ ہے سوہا!"

"ماما پلیز!" اسے ہمیشہ یہ سن کر تکلیف ہوتی تھی۔

"میرے نہ کہنے سے سچ بدل تو نہیں جائے گا۔"

"سب سے بڑا سچ میری اور اس کی محبت ہے۔"

"محبت کی بے بسی میں بھی سمجھتی ہوں۔۔۔ یہ ایسی حد بندیاں نہیں مانتی۔ مگر آج کل کی نسل صرف محبت پہ اکتفا کرتی بھی تو نہیں۔۔۔ کیا تمہارے اندر اس کے ساتھ کی خواہش نہیں ہے۔ کیا تمہیں یہ سوچ کر جلن محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اس وقت کسی اور کے ساتھ ہے؟ کیا تم ان سب جذبوں سے ماورا ہو؟" سوہا آہستہ سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری اور وصی کی یہ محبت ایک منطقی انجام چاہتی ہے اور اس کی بیوی کے ہوتے ہوئے۔"

"نہیں ہے وہ اس کی بیوی۔۔۔ کوئی رشتہ نہیں ہے اس کا وصی سے۔۔۔ وصی نے مجھے خود بتایا ہے۔ قسم کھا کے۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ میں مردوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بیویوں سے فیض اٹھانے کے لیے محبت کا ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔۔۔ انڈر اسٹینڈ؟ اور اگر ایسا ہو گیا۔ تو وہ دن دور نہیں جب وہ صرف اس کی بیوی نہیں بلکہ اس کے بچے کی ماں ہو گی۔"

سوہا لرز کے رہ گئی۔

"بیوی کو چھوڑنا اسے اتنا مشکل لگ رہا ہے تو کیا اپنے بچے کی ماں کو چھوڑنا آسان لگے گا؟"

"تو۔۔۔ تو میں۔۔۔ میں کیا کروں ماما؟"

"دو ٹوک بات کرو اس سے... اگر اسے بیوی سے واقعی ذرا سا بھی لگاؤ نہیں تو پس و پیش سے کام کیوں لے رہا ہے؟ تم سے اتنی ہی محبت ہے تو اپنا کیوں نہیں لیتا؟ میری بھی فکر ختم ہوگی۔"

"میں بات کرتی ہوں اس سے۔"

✡ ✡ ✡

حسن نے وصی کو اپنے کمرے میں بلایا تھا... وہ نہیں چاہتا تھا کہ معاملے کی بھنک کسی اور کو پڑے۔ خصوصاً وشمہ کو وہ ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا... یہ ادراک بھی اسے اب ہوا تھا کہ وہ کتنا بھی خود کو بہلانے کی کوشش کرے۔ اس کا دل اب بھی وشمہ کے لیے ایک خاص گوشہ رکھتا تھا۔ جب ہی تو وصی کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر اسے غصہ اسی بات پہ آیا تھا کہ وہ وشمہ کو دکھ پہنچانے کا سبب پیدا کر رہا تھا۔

"آپ نے بلوایا حسن بھائی!"

"ہاں بیٹھو۔ ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

"میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔"

ظلِ ہما شاید جانتی تھی یہاں کس موضوع پہ گفتگو ہونے والی ہے اس لیے اس نے کترا کے نکلنا چاہا۔

"تم کل کس لڑکی کے ساتھ تھے؟"

حسن کے اچانک سوال پہ وصی لمحہ بھر کے لیے گڑبڑایا۔ مگر پھر اس نے کوئی بہانہ یا عذر تراشنے کے بجائے سیدھا جواب دیا۔

"وہ کوئی اور نہیں 'سوہا' ہے۔"

"سوہا... وہ ہے۔" "میں تو سمجھا تھا' وہ اب "تھی" ہو چکی ہے؟" حسن نے تیوریاں ڈال کے پوچھا۔

"وہ پہلے بھی میری زندگی میں خاص مقام رکھتی تھی اور اب بھی۔ اور ایسے رشتے آسانی سے بھلانے کے لیے نہیں ہوتے۔"

"تم ہوش میں تو ہو وصی؟" حسن کو اس سے اس درجہ بے باکی کی امید نہیں تھی۔

"اور وہ جو اب تمہاری زندگی میں شامل ہے۔ اس کا کیا قصور ہے؟ کسی نے زبردستی اسے تمہارے سر نہیں منڈھا تھا۔ تم پورے ہوش و حواس میں اس کے لیے راضی ہوئے تھے جبکہ میں نے تمہارا پورا پورا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا... کوشش کی جاتی تو سب لوگ سوہا کے لیے راضی ہو جاتے... اور وشمہ کی زندگی بھی برباد نہ ہوتی۔ تب تم تھے جس نے قدم پیچھے موڑے تھے اور اب تمہیں خیال آیا ہے محبت ثابت کرنے کا؟"

وہ غصے میں گرج رہا تھا اس بات کا خیال کیے بغیر کہ اس کی آواز باہر تک جا رہی ہے۔

"بعض اوقات محبت اپنا آپ تسلیم کروانے میں کچھ وقت لگا دیتی ہے۔"

"ہوش کرو وصی... یہ وقت ایسی جذباتی اور احمقانہ باتوں کا نہیں ہے۔ یہ ایک زندگی کا سوال ہے۔"

"نہیں... یہ دو زندگیوں کا سوال ہے... میری اور سوہا کی۔"

"اور وشمہ... کیا وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی؟ اس کی زندگی کیا صرف بساط میں بچھے ایک مہرے کی سی ہے؟"

"مجھے اس سے ہمدردی ہے اور میں..."

"وہ صرف ہمدردی کے قابل ہے؟"

حسن اور بھی بپھر گیا... دبا کے رکھی محبت ابھر کے سامنے آ رہی تھی۔

"بے وقوف انسان! وہ چاہے جانے کے 'قدر کیے جانے کے قابل ہے... خوش قسمت ہو تم جسے اتنی اچھی بیوی ملی ہے اور تم کنکر چھان رہے ہو۔"

"آپ کے لیے سوہا کنکر سہی... میرے لیے ہیرا ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

حسن اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔

نہ کوئی بہانہ۔ نہ اس راز کو راز رکھنے کی التجا۔

نہ آئندہ ایسی غلطی نہ دہرانے کا عندیہ۔

ایسا کچھ بھی تو نہ ہوا تھا جیسا حسن نے سوچا تھا۔

"یعنی وہ اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے کہ اب اس کو اس کی بھی پروا نہیں کہ میں یہ بات باقی سب کو بتاتا ہوں یا نہیں۔"

ہما چائے لے کر اندر آئی تو وصی جا چکا تھا' حسن لال بھبھوکا چہرہ لیے بیٹھا تھا۔

"چائے... وصی چلا گیا؟"

"کاش... کاش وشمہ کی اس سے شادی نہ ہوئی ہوتی۔" اس کی بڑبڑاہٹ پہ وہ چونکی۔

"کیا کہا وصی نے؟"

"اندھا ہو رہا ہے وہ اس کے عشق میں۔"

"کوئی کولیگ ہے؟"

"نہیں... وہی جونک... سوہا!"

"سوہا... لیکن وصی نے تو خود اپنی اس خواہش سے دست برداری اختیار کرتے ہوئے وشمہ سے شادی کی ہامی بھری تھی۔"

"آنکھوں میں دھول جھونکی تھی فریبی انسان نے... لیکن ان سب میں اس معصوم لڑکی کا کیا قصور ہے جو بے چاری۔" اسی وقت کوئی دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" وہ چونکا۔

"کچھ نہیں شاید ہوا سے دروازہ زور سے بند ہو گیا۔"

ہما نے یہ نہ بتایا کہ یہ دھماکا اسی معصوم اور بے چاری لڑکی نے کیا ہے۔ جسے وہ ابھی ابھی کچن میں اپنی ساس کے ساتھ الجھتا چھوڑ کے آئی ہے۔ جو نہ صرف اس کی بھی ساس... بلکہ سگی پھوپھی بھی ہے۔

✡ ✡ ✡

وہ بڑے خراب موڈ کے ساتھ کچن میں موجود تھی۔

پچھلے ہفتے ہی شوکت جہاں کے کہنے پہ اس کا ہاتھ کھیر میں ڈلوایا گیا تھا کیونکہ وہ کافی دنوں سے ظلِ ہما کو طبیعت کی خرابی کے باوجود مسلسل پروین کے ساتھ کچن میں مصروف دیکھ رہی تھیں۔

گھر میں کئی نوکر چاکر تھے لیکن کچن کا انتظام شروع سے گھر کی عورتوں کے پاس تھا۔ جب تک ان میں ہمت تھی 'پروین کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں کیونکہ رخشندہ تو بیٹیوں کی ماں تھیں۔ لیکن پروین اکیلی اور پچھلے دس بارہ سالوں سے شوکت جہاں بالکل ہی بستر کی ہو کے رہ گئی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح پروین نے گزارے لائق گھر سنبھالا ہوا تھا۔ البتہ ہما نے آتے ہی سارا انتظام بغیر کسی کے کہے اپنے ہاتھ لے لیا۔ شادی کے آٹھ ہی دن بعد خود ہی میٹھا بنا کے سب کو کھلایا اور تب سے سب کی پسند اور صحت کے لحاظ سے کھانا بنا رہی تھی۔

ادھر کچھ دنوں سے یہ ہونے لگا کہ جہاں مسالہ بھوننے کھڑی ہوئی اور ابکائیاں شروع۔ ادھر دال کو بگھار لگایا ادھر متلی شروع۔ وہ ادھ موئی ہو گئی۔ تب شوکت جہاں نے یہ دو مہینے اس کا داخلہ کچن میں بند کر دیا

وشمہ پہلے تو پرجوش سی ہوئی... لیکن ایک تو اس کے پکائے پہلے پہلے کھانے کو وصی نے دو نوالے کھا کے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس سے دل برا ہوا سو ہوا... اوپر سے منزہ نے بھی اس کی کارگزاری سن کر لیکچر جھاڑ دیا۔

"میری طرح کچن کی ہو کے رہ جاؤ گی۔ پروین میں ساری عادتیں تمہاری دادی والی ہیں۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی جھکنے والے کا سر زمین سے لگانا جانتی ہے۔ میری حالت سے سبق حاصل کرو۔ تم نے تو سب دیکھ رکھا ہے۔ تم بتا رہی ہو کہ وصی تم سے اکھڑا اکھڑا رہتا ہے۔ کچن کی بو بن کے رہ گئیں تو وہ اور دور ہو جائے گا۔ کوئی ضرورت نہیں زیادہ گھر ہستن اور سگھڑ بن کے دکھانے کی۔"

سب کا خیال تھا' کھیر میں ہاتھ ڈلوانے کے بعد وہ معمول کی طرح کچن میں آنا شروع ہو جائے گی۔ مگر ایک دن ..... دو دن۔ تین دن حتیٰ کہ پورا ہفتہ گزر گیا۔ وہ مہمانوں کی طرح عین وقت پہ کھانے اور ناشتے کے لیے ٹیبل تک آتی۔ شرما شرمی میں نہ شوکت جہاں سے کہا گیا نہ پروین سے۔ وہ تو ویسے بھی وشمہ سے الجھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس کی نگاہوں کی بدلحاظی سے بڑا خوف آتا تھا اور وہ اپنی عزت اپنے ہاتھ والے مقولے پہ عمل پیرا تھیں۔

ظلِ ہما نہ بدلحاظ تھی نہ خود غرض۔ اسے اچھا نہ لگتا کہ وہ بستر پہ پڑی رہے اور پروین اکیلی کام کرتے رہیں۔ اس لیے کسی نہ کسی حال میں وہ ہاتھ بٹا ہی دیتی ..... لیکن آج جانے کیسے پروین سے رہا نہ گیا۔ چھٹی کا دن تھا سب گھر موجود ..... سب کا الگ الگ طرح کا ناشتہ بنانے میں ہلکان ہما کا رنگ زرد پڑ رہا تھا۔ آملیٹ کے لیے انڈا پھینٹتے ہوئے وہ بے ساختہ منہ پہ ہاتھ رکھ کے واش روم کی طرف بھاگی تو پروین سے رہا نہ گیا اور انہوں نے آج ہی معاملہ صاف کرنے کا سوچا۔

"وشمہ! ناشتے کے بعد کچن میں آجانا ..... دوپہر کھانے پہ اہتمام ہوگا بریانی تم بنا لینا ..... ساتھ میں سلاد اور رائتہ، مچھلی پہ مسالہ میں نے رات سے لگا رکھا ہے۔ وہ میں تل لوں گی ..... ٹرائفل تو بعد میں ہما بھی بنا لے گی۔ اسے بس مسالوں کی بو سے شکایت ہے۔"

انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں کام بانٹا۔ اولین دنوں میں جب شوکت جہاں نے ان پہ ذمے داریاں ڈالنا شروع کی تھیں تو ایسے ہی دونوں بہوؤں کو طریقے سے کام بتلائے تھے اور دونوں نے خوشی خوشی مل جل کے کیے بھی تھے لیکن وشمہ کے چہرے پہ ناگواری کی تحریر صاف پڑھی جا رہی تھی۔

بریانی کا مسالہ بھونتے ہوئے اس نے ہما کو اندر آتے دیکھا تو بڑے بھولے انداز میں طنز کیا۔

"آپ نے کیسے زحمت کی یہاں آنے کی؟ ..... بریانی کا مسالہ بھن رہا ہے۔ کہیں آپ کو ناگوار نہ گزرے۔"

ہما پہ ٹیڑھی باتیں کم ہی اثر کرتی تھیں۔ وہ سادگی سے مسکرائی۔

"حسن اور وصی کے لیے چائے بنانا تھی۔"

اس نے رائتے میں ڈالنے کی غرض سے ابالنے کے لیے چڑھائے آلو کا برتن اتارا۔

"وصی کو چائے چاہیے تھی تو مجھ سے کہتے۔" وہ حسن کا ذکر گول کر گئی۔

"نہیں' وہ تو دونوں بھائی مل کے بیٹھے ہیں تو میں ...."

"جب کھانا میں اکیلی بنا سکتی ہوں تو دو کپ چائے بنانے میں مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

وشمہ نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے کیتلی لی تو وہ بھونچکا رہ گئی۔

"میں یہاں گرمی میں چولہے کے آگے تین گھنٹے کھڑی رہوں اور آپ چار منٹ میں دو کپ چائے بنا کے وصی کو یہ جتانا چاہتی ہیں کہ اسے اس گھر میں چائے بنا کے دینے والی صرف آپ ہیں۔"

"وشمہ!" پروین کی آواز پہ دونوں چونک کر مڑیں۔

ہما کے حواس باختہ چہرے پہ ایک رنگ آرہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا جبکہ وشمہ پل بھر کے لیے گھبرائی پھر منزہ کے ہاتھ نے جیسے پیٹھ پہ تھپکی سی دی اور وہ ڈھیٹ بن کے چائے کا پانی رکھنے لگی۔

ہما نے کترا کے نکلنا چاہا مگر پروین نے روک دیا۔

"تم چائے بناؤ ہما ..... ! اور وشمہ! تمہیں اتنی تمیز بھی نہیں کہ کسی سے کیسے بات کرتے ہیں ..... ہما تم سے عمر میں بھی بڑی ہے اور رشتے میں بھی۔"

"یہاں کون ہے جو عمر' رشتے اور حیثیت میں مجھ سے بڑا نہیں ہے۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

ہما نے خاموشی سے چائے نکالی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ پیچھے کب دونوں کی بحث نے گرما گرمی اختیار کی ..... کب وشمہ احتجاجاً سارا کام چھوڑ کے دروازہ دھماکے سے بند کرتی نکلی۔ اسے خبر نہ ہوئی۔

☆ ☆ ☆

"ابھی یہ نہیں ہو سکتا سوہا ..... ! میں نے تم سے کہا تھا کہ ابھی مجھ سے کوئی وعدہ مت لو۔ فی الحال مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈالو۔"

وصی نے اس کے مطالبہ کے جواب میں منت کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن وصی! ایسا کب تک چلے گا؟" اس نے ریتا کے الفاظ دہرائے۔ "اب تو مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ وہ چوبیس میں سے بارہ گھنٹے تمہارے ساتھ گزارتی ہے۔ تمہارے گھر والوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں' وہ تمہاری اس بانی کی سگی بھانجی ہے جن کے تم پہ کئی احسانات ہیں۔ تم کبھی بھی کمزور پڑ سکتے ہو اور کچھ نہیں تو ان احسانات کے لے میں ہی خود کو گروی رکھ سکتے ہو۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا سوہا! جو چیز اب میری رہی ہی نہیں' وہ میں کسی اور کو دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ میں ..... میرا دل میرا وجود۔ میرے جذبے سب اب تمہارے نام ہیں۔ یہ میں کسی اور کو کیسے دے سکتا ہوں۔"

"لیکن مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ اس کے نام کے آگے تمہارا نام بھی لگے۔"

"سب ہو جائے گا ..... وہی جو تم چاہتی ہو ..... میری اپنی بھی یہی خواہش ہے لیکن پلیز کچھ دیر انتظار ..... ابھی موقع نہیں آیا۔"

□□□□

"اماں جان! آپ ہی کوئی مشورہ دیں۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔"

تھک ہار کے پروین نے شوکت جہاں سے اپنا مسئلہ بیان کیا جو خود بھی کئی دن سے سارا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

وصی کی وشمہ سے عدم دلچسپی سب پہ عیاں تھی۔ آفس سے سیدھا چھ ساڑھے چھ بجے گھر لوٹ آنے والا وصی اب رات گئے آتا ..... شاید ہی کسی نے اسے کبھی وشمہ سے ضرورتاً یا بلا ضرورت مخاطب ہوتے دیکھا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ وشمہ کا ایسے میں تلخ ہونا سمجھ میں آتا تھا لیکن بالخصوص پروین کے ساتھ ہی کیوں؟ اس کا رویہ ایسا ہے؛ یہ کوئی نہ بھانپ پا رہا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں غلطی سراسر وصی کی ہے ..... حسن بتا رہا ہے پھر سے اسی لڑکی ...."

"یہ ان دونوں کا ذاتی مسئلہ ہے خود نمٹا لیں ..... میری مٹی کیوں پلید کر رہی ہے یہ لڑکی؟"

"ذاتی معاملہ کیسے ہوگا پروین ..... ! کوئی گھر سے بھاگ کر شادی نہیں کی انہوں نے۔ ہم نے کرائی ہے۔ اپنی ذمے داری پہ' اپنی خواہش پہ۔"

"مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ وصی اسے پسند کرتا ہے۔"

"اور یہ غلط فہمی تو وصی نے پہلے ہی دور کر دی تھی کہ وہ وشمہ کو نہیں کسی اور کو پسند کرتا ہے۔"

وشمہ جو کسی کام سے کچن میں جا رہی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھی شوکت جہاں کو پروین سے کہتے سن کر وہیں رک گئی۔

اسے شک تو پہلے سے تھا ..... ظاہر ہے وصی کے تیور بلاوجہ ہی تو ایسے نہ تھے۔ کوئی اپنی نو بیاہتا بیوی کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اس پہ نظر تک نہ ڈالتا ہو' ظاہر ہے کہ اس کے دل و دماغ پہ کسی اور کا ہی راج ہوگا۔

"لیکن اماں جان! جو وہ چاہتا تھا' وہ بھی تو نہیں ہو سکتا تھا۔"

وشمہ اوٹ میں ہو گئی ..... وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے جس کی وجہ سے وصی کو اس کا وجود نظر نہیں آتا۔

"میں تو سب بھلا کے اس کی خواہش پوری کرنے کا بھی سوچ رہی تھی۔ خود چل کے گئی تھی اس منزہ کی اولاد کا ہاتھ مانگنے۔ اس لڑکی کا ہاتھ جو شروع سے میرے لیے ایک مسئلہ بنی رہی۔"

"منزہ کی اولاد!" وشمہ چونکی۔

"دیکھ لیں اس چلتر سوہا کے کرتوت۔ شریف زادی ہوتی تو وصی کی شادی کے بعد ٹھنڈی ہو کر بیٹھ جاتی لیکن ب تو اس کا جادو اور بھی سر چڑھ کے بول رہا ہے۔"

"سوہا ....." وشمہ ہکا بکا رہ گئی۔

"ایک بات کہوں پروین۔۔! تم منزہ سے ذکر کرو۔"
"نہیں اماں جان! اسے تو ہوا بھی نہیں لگنا چاہیے۔ آپ کو نہیں پتا اسے تو موقع چاہیے میرے خلاف نوید بھائی کو بھڑکانے کا۔۔۔ فوراً" وشمہ کی شادی کی ناکامی کا الزام میرے سر دھر دے گی۔ جینا حرام کر دے گی میرا جیسے میں نے جان بوجھ کر وصی۔۔۔"
"نہیں۔۔۔ اس بار ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"
شوکت جہاں کے لہجے میں یقین تھا۔
"یہ الزام وہ تمہارے سر نہیں ڈال سکتی۔ کیونکہ الزام کی زد میں اس کی اپنی بیٹی آ رہی ہے۔ میری مانو تو اس سے بات کرو۔۔۔ وہ اپنی بیٹی کو سنبھالے گی اور سوہا بھی کسی اور کی بات مانے نہ مانے 'ماں کی تو سن ہی لے گی۔"
"لیکن منزہ بھابی۔۔۔ اور اگر انہوں نے اس معاملے میں ڈنڈی ماری؟ وشمہ کے مقابلے میں سوہا کا ساتھ دینا چاہا تو؟" وشمہ بھی ایک بار لرز کے رہ گئی۔
"نہیں پروین! تمہارے منزہ سے اختلاف اپنی جگہ۔۔۔ کچھ باتوں میں تم سچی تو ایک معاملے میں وہ سچی۔"
"وہ کیا؟"
"میں نے اس کی آنکھوں میں وشمہ کے لیے اصل محبت دیکھی ہے۔ دل کی بری نہیں ہے وہ۔۔۔ چلو محبت میں نہ سہی۔ شاید خود غرضی میں ہی سہی وہ معاملہ سنبھال لے۔۔۔ سوہا کی وجہ سے وشمہ کا گھر برباد ہوا تو اس کا اپنا گھر اس عمر میں خراب ہوگا۔"
"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"
پروین متفق نظر آ رہی تھیں۔ ۔۔۔ شکستہ قدموں کے ساتھ پلٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

"نہیں آپا! اس ویک اینڈ پہ تو مشکل ہے۔۔۔ اگر آپ پہلے بتا دیتیں تو شاید پروگرام بن جاتا۔"
تقدیس' تحریم سے فون پہ بات کر رہی تھی۔ جو اس سے یہ ویک اینڈ میکے گزارنے پہ اصرار کر رہی تھی کیونکہ اس کا اپنا پروگرام تھا۔
"نہیں ناں آپا۔۔! بہت مشکل ہے۔ ابھی دو دن پہلے تو ہو کے آئی ہوں۔"
خرم کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر غیر محسوس طریقے سے وہ کچھ محتاط ہو کر بات کرنے لگی۔
خرم یوں بن گیا جیسے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو کہ وہ کیا بات کر رہی ہے اور کس سے کر رہی ہے۔ وہ ٹی وی آن کر کے اس کے پاس ہی نیم دراز ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود تقدیس بے حد نروس ہو گئی۔
"جی۔۔۔ جی۔۔۔ نہیں۔ ہاں' ٹھیک ہے۔ میں' میں بات کروں گی اچھا دیکھتی ہوں۔ نہیں وعدہ نہیں کر سکتی۔ اوکے۔"
مختصر جوابات دے کر اس نے بمشکل تحریم کو ٹالا اور فون بند ہوتے ہی سکون کا گہرا سانس لیتے ہوئے ٹی وی کی جانب دیکھا کہ ایسا کون سا پروگرام آ رہا ہے جو خرم کی توجہ اپنی جانب کھینچے ہوئے ہے۔
"اپنا سیل فون مجھے دینا۔"
خرم کی بات پہ وہ حیران ہوئی۔ بظاہر ٹی وی میں مگن وہ اس سے ہی مخاطب تھا اور اپنا دایاں ہاتھ بھی اس کی جانب بڑھا چکا تھا۔ تقدیس نے چپ چاپ فون اس کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ وہ اندازہ لگا رہی تھی کہ خرم کیا کرنے والا ہے۔ وہ شاید کال ریکارڈ میں یہ چیک کرنے والا ہے کہ وہ کس سے بات کر رہی تھی۔ تحریم کا نمبر اس نے آپا کے نام سے save کر رکھا تھا۔ لیکن بدگمانی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس سے بعید نہیں تھا کہ وہ یہ سوچے کہ شاید کسی اور کے نمبر پہ نام تحریم کا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ اس نمبر پہ کال بیک کر لے۔
بے اعتباری کی سبکی نے تقدیس کو اندر سے کاٹنا شروع کر دیا۔ لیکن خرم نے اس کے سارے اندازوں کے

(بر عکس) فون کا سوئچ آف کیا' سم کارڈ نکالا۔۔۔ جیب میں ڈالا اور فون اپنی سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ڈال کے چابی گھما (دی۔)
حیرت کی شدت میں وہ اس سے کوئی سوال تک نہ کر پائی۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"
وہ جب سے میکے آئی تھی' ایسے ہی گم صم تھی۔
"پروین نے کچھ کہا؟"
وہ تب بھی چپ رہی۔
"وصی سے کوئی جھگڑا؟"
اس نے نہ انکار میں سر ہلایا۔۔۔ نہ اقرار میں۔۔۔
ہر بات منزہ سے شیئر کرنے والی وشمہ نے وصی کے اور اپنے کھوکھلے تعلق کو اب تک راز میں رکھا ہوا تھا۔ اپنی ہی بے عزتی کے خوف سے کتنا رو پیٹ کے اس نے وصی سے اپنی شادی کرائی تھی اور اب اسے یہ سوچ کر ہی شرم آ رہی تھی کہ وہ جس وقت اس کے عشق میں مری جا رہی تھی وہ اس وقت سوہا کی محبت میں ڈوبا ہوا بلکہ اب تک غوطے کھا رہا ہے۔ وہ اپنی محبت کو تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے خود کو یہ سوچ سوچ کر دھوکا (دے) رہی کہ وصی بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی وہ اس سے۔۔۔ لیکن پروین کی چال بازیوں کی وجہ سے اس کے ساتھ ایسا رویہ رکھنے پہ مجبور ہے۔
"کچھ تو ہے جو تم مجھے بتا نہیں رہیں۔"
"آپ بتائیں گی مجھے ایک بات؟"
"پوچھو بیٹا!"
"آپ۔۔۔ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہیں؟"
"یہ کیا سوال ہوا؟"
"پلیز بتائیں۔"
"تمہیں نہیں پتا؟ اور کوئی جانے نہ جانے' تمہیں تو علم ہونا چاہیے کہ میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ اتنا جتنا (ایک) ماں اپنی بیٹی سے کر سکتی ہے۔"
"اور اگر کسی ماں کی دو بیٹیاں ہوں؟"
ایک لمحے کے لیے منزہ کی نظر جھلملا سی گئی۔
"دس اولادوں میں سے بھی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ سب سے پیارا کون ہے؟"
"لیکن۔۔۔ اگر معاملہ دل کو پیارا لگنے سے بہت اوپر ہو؟"
"پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو وشمہ؟" وہ الجھ گئی۔
"ماما! اگر کبھی میں اور سوہا آپی آمنے سامنے ہوں تو آپ کس کا ساتھ دیں گی میرا یا ان کا۔ خاص طور پہ یہ جانتے (ہوئے) کہ میں حق پہ ہوں۔۔۔ اور وہ میرا حق چھین رہی ہیں۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" اب کے منزہ سچ مچ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئی۔
"آپ پلیز جواب دیں' کیا ہوگا آپ کا فیصلہ؟"
"جب ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے تو تم احمقانہ سوال کر کے کیوں مجھے مشکل میں ڈال رہی ہو؟"
"ہے ایسی بات۔" وہ چلا اٹھی۔ "ایسی ہی بات ہے۔۔۔ وصی نے مجھے اب تک قبول نہیں کیا۔۔۔ میں غلط تھی۔

مجھے لگتا تھا جیسے میں اسے چاہتی ہوں۔ وہ بھی مجھے چاہتا ہوگا..... مجھے لگتا تھا۔ محبت محبت کو کھینچتی ہے اور مجھے لگتا تھا اس سے شادی کے بعد مجھے سب کچھ مل جائے گا لیکن، لیکن وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا ماما! اس کے دل میں شادی سے پہلے بھی کوئی اور تھی۔ اب بھی کوئی اور ہے اور وہ کوئی اور نہیں سوہا آپی ہیں۔"

منزہ کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔

● ● ●

"بھئی حد ہوگئی..... جب ضروری فون کرنا ہو، یہ بند ہی ملتا ہے۔" شوکت جہاں نے کوفت سے ریسیور رکھا۔

"پہلے وقت کے وقت بل ادا ہو جاتا تھا..... ابھی بھی اور سارے گھر کے بل جمع ہو جاتے ہیں..... بجلی کے، گیس کے، پانی کے اور تو اور اس واہیات کیبل کے..... بس نہیں ہوتا تو یہ ٹیلی فون کا بل نہیں جمع ہوتا اور ہو بھی کیوں..... سب کے ہاتھوں میں دبا جو رہتا ہے، وہ چھ انچ کا موبائل۔ کسی کو کیا ضرورت ہے جو اس فون کے بل بھرے۔ ایک مجھ بڑھیا کے سوا اور کون گھماتا ہے اس کے نمبر۔"

"کیا ہوا ہے اماں جان؟" رخشندہ نے اوپر سے جھانک کر پوچھا۔

"زبیدہ کی پوتی ہسپتال میں ہے..... بتاؤ بھلا آج کے بچے ذرا ذرا سے ہوتے ہیں اور ہسپتالوں کا منہ دیکھتے پھرتے ہیں۔"

"ارے..... کیا ہوا اسے..... زبیدہ تائی کے ہاں تو یہ پہلی پوتی ہے ناں..... کئی سالوں کے انتظار اور منت مرادوں کے بعد پیدا ہوئی ہے۔"

"یہی تو پوچھنا تھا کہ کیا ہوا معصوم بچی کو..... بھلا چند مہینے کی ننھی سی جان کو کون سے روگ لگ سکتے ہیں۔ مگر یہ فون بند پڑا ہے۔ اس بار پھر کسی نے بل جمع نہیں کرایا۔"

"نہیں اماں جان..... مجھے یاد ہے حسن جمع کروانے جا رہا تھا، تب ہی مجھ سے بھی بل لینے آیا تھا کہ اکٹھے جمع ہو جائیں۔ دو دن پہلے کی بات ہے۔"

"بھول بھال گیا ہوگا۔"

"لیکن ہمارا فون تو..... شاید ویسے ہی کوئی خرابی ہو۔ آپ یہاں سے کرلیں۔"

"لو..... بتاؤ بھلا..... اب میں کہاں سیڑھیاں پھلانگتی آؤں۔" ان کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا تھا۔

"گھر پر کوئی اور نہیں ہے؟..... کسی کے موبائل سے فون کرلیں۔" رخشندہ جانتی تھیں اب جب تک وہ زبیدہ تائی کی پوتی کی خیریت معلوم نہ کرلیں گی..... بات بے بات چڑتی رہیں گی۔

"کون ہوگا..... ؟ پروین ہما کو لے کر درزی کے پاس نکلی ہے، حسن، حسان سب اپنے اپنے دورے پہ نکلے ہیں۔ اے ہاں رخشندہ! اوپر پڑا ہے کسی کا موبائل تو بھجوانا ذرا..... وہ تقدیس تو ہوگی نا..... خرم کی دلہن۔"

"ہاں میں کہتی ہوں۔"

وہ اندر کی جانب مڑیں۔ تقدیس خرم کی قمیص استری کر رہی تھی۔

"تقدیس..... بیٹا! ذرا اپنا موبائل تو دینا۔"

وہ ایسے اچھلی..... جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس کی حالت دیکھ کے رخشندہ بھی گھبرا گئیں۔

"کیا ہوا..... شاید میرے پیچھے سے آکر اچانک پکارنے کی وجہ سے ڈر گئیں۔"

"نہیں، نہیں امی جان! میں تو..... وہ بس ایسے ہی ذرا کسی خیال میں تھی۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے دستک دے کر آنا چاہیے تھا۔ بلاوجہ تمہیں گھبرا دیا۔"

"ایسی بات نہیں امی جان! آپ بیٹھیں ناں۔"

"ظل ہما کی بھی یہی عادت ہے..... ذرا کسی نے اونچی آواز میں پکار لیا۔ یا پیچھے سے اچانک آ کے چونکا دیا۔ وہ یونہی سہم جایا کرتی تھی۔ تمہاری اور بھی بہت سی عادتیں اس سے ملتی ہیں۔"

تقدیس کے پاس، ظاہر ہے کہ مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

"ارے ہاں..... وہ موبائل لینے آئی تھی تمہارا۔"

تقدیس کی مسکراہٹ پھر غائب ہو گئی۔

"جی..... موبائل۔"

"ہاں..... اماں جان کو ایک ضروری فون کرنا ہے..... نیچے کوئی اور ہے نہیں..... بے چاری پریشان ہو رہی ہیں۔ جانو اس عمر میں عادتیں بچوں جیسی ہو جاتی ہیں۔"

"امی موبائل تو....." وہ گھبرا اٹھی۔

جھوٹ بولنے کی نہ عادت تھی..... نہ سلیقہ..... ورنہ سو بہانے تھے، اور کچھ نہیں تو..... بیلنس ختم ہونے کا ہی کہہ سکتی تھی۔ مگر کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنا بھرم کھونے والی تھی۔

"کیا بات ہے..... تم پریشان کیوں ہو رہی ہو؟"

"موبائل تو خرم..... ان کے..... انہوں نے....."

وہ اٹک اٹک کے بتا رہی تھی..... انہوں نے خود ہی مطلب اخذ کر لیا۔

"خرم کے پاس ہے..... حد ہوگئی، اپنا ہے تو سہی اس کے پاس..... تمہارا کس لیے ساتھ لے گیا؟ اب اگر یہیں ضرورت پڑے تو..... ان پی ٹی سی ایل نمبروں کا کیا بھروسا کبھی بند تو کبھی خراب۔ نیچے کا بھی بغیر وجہ کے بند ہے۔"

وہ کمرے سے نکلنے لگیں تو تقدیس نے سکون کا سانس لیا کہ بغیر کسی لمبی تفتیش کے جان چھٹ گئی۔

"جا کے اماں جان کا تو دھیان بٹاؤں..... ورنہ فون کرنے تک ایسے ہی بول بول کے اپنا بلڈ پریشر بڑھاتی رہیں گی بیٹا! تم ذرا پریشر ککر کا دھیان رکھنا..... چھ آٹھ منٹ بعد بند کر دینا۔"

● ● ● ●

منزہ کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔

اسے اپنے سامنے بیٹھی وشمہ نظر آرہی تھی۔ جو مسلسل بول رہی تھی۔ مگر منزہ کو صرف اس کے ہلتے ہونٹ بہتے آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ وہ نہیں سنائی دے رہا تھا جو وہ کہہ رہی تھی، کانوں میں صرف ان لفظوں کی بازگشت گونج رہی تھی جو وہ کچھ دیر قبل کہہ چکی تھی۔

"اگر کبھی میں اور سوہا آپی آمنے سامنے ہوں تو آپ کس کا ساتھ دیں گی..... میرا یا ان کا..... خاص طور پر یہ جانتے ہوئے کہ میں حق پہ ہوں اور وہ میرا حق چھین رہی ہیں۔"

"وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا ماما! اس کے دل میں شادی سے پہلے بھی کوئی اور تھی۔ اب بھی کوئی اور ہے اور وہ کوئی اور نہیں، سوہا آپی ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" منزہ پوری شدت سے چلائی۔

وشمہ کے وجود پہ سکتہ چھا گیا۔

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟" منزہ نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"جی جانتی ہوں ماما! آپ بھی جان لیں کہ یہی حقیقت ہے۔"

"کس نے کہا اور تم نے مان لیا؟ وہ تمہیں بہکانے کی اور میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں وشمہ! میں ان کی کوششوں کو کامیاب بنا رہی ہو؟"

"ایسا نہیں ہے ماما..... کسی نے بطور خاص مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اتفاقاً ان کی باتیں سنی ہیں..... جو وہ بطور یہ کافی عرصے سے مجھ سے چھپا رہے تھے اور وہ نہ بھی بتائیں..... وصی کا رویہ، اس کی لاتعلقی سب خود بتاتی ہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اور ماما! اس کے دل میں جو ہے وہ میں نہیں ہوں۔ وہ سوہا بھی نہیں ہو سکتی۔"

منزہ کے پورے وثوق سے کہنے پہ وشمہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

"کیونکہ وہ میری بیٹی ہے۔"

اس نے ایک پل کی تاخیر کے بغیر کہا۔

وشمہ نے گلہ آمیز نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"اور میں آپ کی بیٹی نہیں؟"

"میرا یہ مطلب..... ؟"

"ان کا اعتبار ہے آپ کو..... آپ کی بیٹی ایسا نہیں کر سکتی' میرا اعتبار نہیں کر رہیں آپ کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔" "تم بات کو دوسرا رنگ دے رہی ہو۔"

"تو آپ کلیئر کر دیں نا! اس بات کو..... جا کے پوچھیں سوہا آپی سے۔"

"میں..... میں پوچھوں؟ مگر کس حق سے وشمہ؟"

اس کے لہجے میں اتنی لاچاری اور بے بسی تھی کہ وشمہ کی ساری تندی بھی ماند پڑ گئی۔

"مجھے کیا حق ہے جو میں اس سے یہ..... یا کوئی بھی اور سوال کروں۔ میں اس کی لگتی کیا ہوں؟ یہ سوال اگر اس نے مجھ سے کر دیا تو کیا جواب ہو گا میرے پاس۔"

"ٹھیک ہے تو آپ میری ماں ہونے کے حق سے ان سے یہ سوال کر سکتی ہیں۔ کیا آپ کا فرض نہیں کہ آپ اپنی بیٹی کی نئی شادی شدہ زندگی میں آنے والی اس رکاوٹ کو دور کریں۔"

"وشمہ.....! یہ سوال تم وصی سے بھی تو کر سکتی ہو؟" منزہ نے اس کا دھیان اپنی جانب سے ہٹایا۔ "کم از کم اور کچھ نہیں تو یہ تو پتا چل جائے گا کہ تمہارے اندر جو غلط فہمیاں پنپ رہی ہیں وہ واقعی صرف غلط فہمیاں ہیں یا خدانخواستہ ان میں کچھ سچائی بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں پوچھ لوں گی اور میں اتنا کہہ دوں ماما! کہ اگر انہوں نے میرے خدشات کی تصدیق کی تو میرا مقدمہ آپ کو لڑنا ہو گا..... صرف آپ کو۔"

وہ اسے کشمکش میں ڈال کے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"خدا تمہارا بھلا کرے..... ذرا ملانا تو زبیدہ کا نمبر۔"

خرم نے گھر آتے ہی جیسے ہی سلام کے بعد پیار لینے کے لیے شوکت جہاں کے سامنے سر جھکایا وہ دعائیں دیتے ہوئے فوراً اپنے مطلب پہ آ گئیں۔

"زبیدہ..... کون زبیدہ؟" وہ کچھ سمجھ نہ پایا۔

"تمہاری بڑی دادی..... زبیدہ تائی..... اماں جان کی خالہ زاد بہن..... وہ جو سرگودھا میں ہوتی ہیں۔"

"اوہ اچھا..... کیا ہوا انہیں؟"

"اسے کچھ نہیں ہوا..... اس کی چار ماہ کی پوتی بے چاری کو۔"

اس سے پہلے کہ وہ لمبی چوڑی تفصیل میں جاتیں..... رخشندہ نے گھبرا کر بات سمیٹی۔

"اماں جان کو ضروری بات کرنا ہے۔ گھر کا نمبر خراب ہے اور موبائل کسی کا....."

بات کرتے کرتے وہ چونکیں..... جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

"ارے ہاں تم تقدیس کا موبائل کیوں لے گئے تھے اس سے؟" پانی پیتے خرم کے گلے میں پھندہ لگ گیا۔

گلاس واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے اس نے ایک ناگوار سی نظر تقدیس کے گھبرائے ہوئے چہرے پہ ڈالی۔

"ٹھیک ہے میں شام کو ہی آپ کے لیے نیا سیٹ اور کنکشن لا دوں گا۔"

"کمال ہے..... میں بات تقدیس کے فون کی....."

"بھئی مجھے کسی نے زبیدہ کا نمبر ملا کے دینا ہے یا نہیں؟"

شوکت جہاں کے اس موضوع سے رخشندہ کی توجہ ہٹانے پہ خرم نے سکون کا سانس لیا۔

"نمبر بتائیں گی دادی جان..... تو تب ہی ملاؤں گا۔"

"یہ رہا نمبر۔" انہوں نے ڈائری نکالی۔

☆ ☆ ☆ ☆

"بی بی..... آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

ملازمہ کے بتانے پہ بیڈ پہ لیٹی کسل مندی سے ٹانگیں جھلاتی سوہا ایک دم الرٹ سی ہوئی۔

"وصی.....!"

"جی نہیں کوئی صاحب اور ان کی بیگم ہیں۔"

"ماما سے ملنے آئے ہوں گے۔"

وہ دوبارہ سستی سے لیٹ گئی۔

"میڈم تو گھر پہ نہیں ہیں..... ویسے بھی انہوں نے آپ سے ملنے کے لیے کہا ہے۔" وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

"نام کیا بتا رہے تھے؟"

"سوہا۔"

"اسٹوپڈ..... میرا نہیں اپنا کیا نام بتا رہے تھے؟"

"میں نے پوچھا نہیں۔"

"عجیب عورت ہو تم..... کہاں ہیں وہ لوگ؟"

"ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔"

"او گاڈ..... ماما کو پتہ چلا کہ تم نے انجان لوگوں کو گھر میں گھسایا ہے تو خیر نہیں..... نہ تمہاری نہ تمہاری اس نئی نوکری کی۔"

"وہ..... بی بی..... وہ لوگ شریف لگ رہے تھے۔"

بے چاری سہم گئی..... چند دن ہوئے تھے یہاں کام کرتے۔

"اونہہ! شریف لگ رہے تھے۔"

وہ کوفت سے پیر پٹختی ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔

"جی۔ میں نے پہچانا نہیں آپ کو؟"

جس طرح وہ لوگ اسے دیکھتے ہی وارفتگی سے کھڑے ہو کر اس کی جانب بڑھے تھے اتنا یقین تو ہو گیا تھا کہ ان کا تعلق وصی کے گھرانے سے نہیں ورنہ وہ ایسا والہانہ پن کیوں جتاتے..... مگر وہ تھے بہرحال انجان اور نا آشنا۔

"بیٹا..... میں جمشید ہوں تمہارا ماموں..... اور یہ تمہاری ممانی ثنا..... یاد نہیں تمہیں۔"

سوہا کے ذہن کے بند دریچوں پہ کسی خوشگوار سی مہک نے دستک دی۔

وہ دن جب وہ منزہ کے ساتھ "نانا گھر" رہنے جاتی تھی۔ جہاں نہ نانا تھے نہ نانی..... ہاں ماموں تھے ممانی تھیں۔ ان کے بچے' ہر وہ دن..... جب وہ ایک غیر معینہ مدت کے لیے ان کے ہاں رہنے آتی منزہ کے ہمراہ۔ پھر وہ رات یاد تھی جب منزہ اسے چھوڑ کے دلہن بن کے کسی کے ساتھ رخصت ہوئی اس کے بعد کے بہت سے اور تکلیف دہ دن..... جمشید اور ثنا کے ساتھ گزارے کوئی لمحات اس کے حافظے میں محفوظ نہیں تھے۔ البتہ ان کا ذکر وہ ماں سے بچپن میں سنتی رہا کرتی تھی۔ اور وہ بھی اچھے الفاظ میں.....

چند ساعتیں ایک ہی بوجھل خاموشی کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ درشتی سے بولی۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"ظاہر ہے۔۔۔ تمہارے ماموں ممانی ہیں ہم۔۔۔ تو تم سے ہی ملنے آئیں گے۔"
ثنا نے اس کے سوال کے روکھے پن کو نظرانداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔
اس بار وہ چاہ کے بھی رکھائی سے پیش نہ آسکی۔

☆ ☆ ☆

"تو تم نے اپنا یہ گن بھی ظاہر کر دیا!" خرم کڑے تیور لیے اس سے پوچھ رہا تھا۔
"جی۔۔۔ کون سا کیا کیا ہے میں نے؟"
ایک مضبوط اور پر اعتماد شخصیت والی لڑکی بے اعتباری کی گرد سے دھندلا کے کمزور پڑ چکی تھی۔
"تم نے امی سے میری شکایت کی؟"
"میں نے نہیں کی۔"
"تو انہیں خواب آیا تھا کہ میں نے تمہارا فون لیا ہے۔"
"میں نے یہ نہیں کہا تھا آپ نے فون لیا ہے۔ صرف اتنا بتایا ہے کہ فون آپ کے پاس ہے۔"
"ایک ہی بات ہے۔" وہ جھنجھلا اٹھا۔
"ایک بات نہیں ہے۔۔۔ بہت فرق ہے۔ فون لے لینے میں۔۔۔ اور ویسے ہی کسی وجہ سے اپنے پاس رکھنے میں۔۔۔ انہیں یہی لگا کہ آپ کو ضرورت تھی اس لیے آپ نے۔"
"مجھے لمبی چوڑی وضاحتیں سننے کی عادت نہیں ہے۔ تم کوئی اور بہانہ بھی بنا سکتی تھیں۔۔۔ میرا نام لینے کی ضرورت کیا تھی؟"
"میں جھوٹ نہیں بولتی۔"
وہ آہستگی سے کہتی پلٹ گئی۔۔۔ مگر انجانے میں خرم کو اس نے تپا کے رکھ دیا۔
"ہونہہ۔۔۔ جھوٹ یہ دھوکے کسی اور کو دینا۔"
"میں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔" وہ تڑپ کے مڑی۔
"پلیز۔۔۔ آپ آج مجھے بتا ہی دیجئے کہ آپ کے اندر کون سی غلط فہمی پنپ رہی ہے؟ کون سی فرد جرم عائد کر رہے ہیں آپ مجھ پہ۔۔۔ آخر میری کون سی حرکت ہے جو گرفت میں آگئی ہے؟"
"آواز آہستہ رکھو۔۔۔ مجھے چلانے والی عورتیں پسند نہیں ہیں۔" وہ غرایا۔
"دیکھیے' جہاں تک بات پسند ناپسند کی ہے' مجھے بھی شک کرنے والے یا عورت کی تذلیل کرنے والے مرد پسند نہیں ہیں' میں بھی تو برداشت۔۔۔"
مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے چہرے پہ خرم کا ہاتھ اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔
"میں جانتا ہوں تمہیں کس قسم کے مرد پسند ہیں لیکن اپنی یہ پسند ناپسند تمہیں شادی سے پہلے اپنے باپ کے سامنے رکھنی چاہیے تھی۔۔۔ تب شرم و حیا کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ لیکن اب اگر نباہ کرنا ہے تو کرو برداشت کیونکہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے نکاح میں آنے والی عورت میری بدنامی کی وجہ بنے' سمجھیں تم۔"
وہ پھنکارتا ہوا باہر نکلا۔۔۔ اور تقدیس اپنے دہکتے گال پہ ہاتھ رکھے سوچتی رہ گئی۔
"تو میں صرف آپ کے نکاح میں آئی عورت ہوں۔۔۔ آپ کی زندگی میں نہیں آئی؟"

☆ ☆ ☆

"ماما! آپ جانتی ہیں آج مجھ سے ملنے کون آیا تھا؟" سوہا کی بات پہ میک اپ صاف کرتی ریتا کا ہاتھ رکا۔
"منزہ؟" اس کے لبوں سے سرسراتا ہوا نام نکلا۔

"نہیں۔۔۔ ان کے بھائی اور بھابی۔۔۔ میرے ماموں ممانی۔"
"کون۔۔۔ وہ جس نے قسم کھا کے کہا تھا کہ وہ نہ خود کبھی تم سے تعلق رکھے گا نہ تمہاری ماں کو رکھنے دے گا۔"
وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔
"کول ڈاؤن ماما! وہ نہیں۔۔۔ دوسرے والے ماموں۔۔۔ آپ نہیں جانتیں' انہیں نہ کبھی ملی ہیں وہ ملک سے باہر ہوتے ہیں ود فیملی۔۔۔ ابھی لوٹے ہیں تو مجھ سے ملنے آگئے۔"
"تم سے کیوں؟ اپنی بہن سے ملنے جاتے۔"
"ظاہر ہے۔۔۔ ان سے بھی ملے ہوں گے۔"
"اور ان کے کہنے پہ تمہیں بہلانے پھسلانے آئے ہوں گے۔"
"پلیز۔۔۔ ماما! آپ کی یہ باتیں مجھے ڈی گریڈ کرتی ہیں۔" اس کے ناگواری سے کہنے پر ریتا ذرا سنبھلی۔
"میرا مطلب صرف یہ تھا۔"
"آپ کا مطلب جو بھی ہو۔۔۔ لیکن مجھے برا لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ مجھ پہ۔۔۔ میری محبت پہ شک کر رہی ہوں۔"
"تم پہ شک تو میں مر کے بھی نہیں کر سکتی میری جان۔"
ریتا نے اس کا ماتھا چوما اور پھر اس کا موڈ خوشگوار کرنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔
"اور کیا کیا باتیں ہوئیں ان سے۔۔۔ کیا کہہ رہے تھے؟ کوئی تحفہ وغیرہ بھی لائے تمہارے لیے۔۔۔ یا؟"
"دل سے پوچھ رہی ہیں؟" وہ ہنسنے لگی۔ "یہ نہ ہو میں بتانے لگوں اور آپ جیلس ہو جائیں۔"
"مت کیا کرو نا جیلس۔۔۔ جب پتا ہے کہ تمہارے معاملے میں میں کمینگی کی حد تک خود غرض ہوں۔ میں صرف ایک شخص سے تمہیں بانٹ سکتی ہوں۔"
"اور وہ کون خوش نصیب ہے؟" وہ سب جانتے ہوئے بھی مسکرائی۔
"وصی اور کون۔"

❀ ❀ ❀ ❀

"وصی۔۔۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنا ہے۔"
وشمہ کے سنجیدگی سے کہنے پہ وہ جوتے اتارتے اتارتے رکا۔
"ہاں پوچھنا ہے کچھ۔"
"پوچھو۔۔۔" وصی کے اندر خطرے کی لال بتی جلنے بجھنے لگی۔
"کیا آپ شادی سے پہلے کسی اور کو پسند کرتے تھے؟" "کسی اور سے شادی کرنا چاہتے تھے آپ؟"
"یہ معلومات تمہیں کس نے دی ہیں؟"
"جس نے بھی دی ہیں۔ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ یہ ٹھیک ہیں یا غلط۔"
"غلط۔" وصی کے اس یک لفظی جواب سے وشمہ کا رکا ہوا سانس بحال کر دیا۔
"جس نے بھی تمہیں یہ معلومات دی ہیں۔۔۔ سراسر غلط ہیں۔ سچ میں تمہیں بتاتا ہوں۔۔۔ میں شادی سے پہلے کسی اور کو پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اب بھی۔۔۔ یعنی شادی کے بعد بھی اسے پسند کرتا ہوں۔"
وشمہ کی سانسیں پھر سے رکنے لگیں۔
"اس سے شادی کرنا چاہتا تھا' میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور جن باوثوق ذرائع سے تمہیں یہ انفارمیشن ملی ہیں' بے شک ان کو بھی اپ ڈیٹ کر دینا کیونکہ قصور ان کا نہیں ان کی معلومات بھی بس یہیں تک محدود تھیں۔۔۔ تازہ ترین حالات۔ سے انہیں باخبر کرنا تمہارا فرض ہے۔ آخر تم ان کی اتنے ارمانوں سے لائی بہو ہو۔"
وشمہ سکتے کے عالم میں کھڑی اسے بولتا دیکھتی رہی اس کا سکتہ تب ٹوٹا جب وہ دھڑ سے دروازہ بند کرتا باہر نکل

گیا۔

اس کے جاتے ہی اس نے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

"دھوکے باز ہو تم..... نہ صرف تم..... بلکہ تمہارے سارے گھر والے سب نے مل کر میری زندگی برباد کی ہے..... سب جانتے تھے تمہارے کرتوتوں کے بارے میں..... لیکن کسی نے میرے بارے میں نہ سوچا..... کسی نے تمہیں نہیں روکا..... چپ چاپ میری زندگی کو تباہ ہوتا دیکھتے رہے..... تم بھی اور یہ سارے لوگ۔"

وہ چیختی جا رہی تھی اور مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کے دروازے پہ مار رہی تھی۔

اس کا یہ ہنگامہ گھر کے کونے کونے تک سیکنڈوں میں پہنچ گیا..... برآمدے میں کبوتروں کو ڈالنے کے لیے باجرہ نکالتی شوکت جہاں تک..... کچن کے اسٹور سے چاولوں کی بوری ملازمہ سے صاف کروانے کی غرض سے نکلواتی پروین تک۔

ٹیرس سے اندر کی جانب مڑتی رخشندہ تک۔

اپنے روم میں ظل ہما کو ملٹی وٹامن کے کیپسول کھلانے پہ اصرار کرتے حسن تک.....

اور تیز تیز قدموں سے چلتے پورچ کی جانب جاتے وصی تک بھی، اور سب ہڑبڑا کے اس کے کمرے کی طرف بھاگ رہے تھے اور وہ تھا..... جو جلد از جلد یہاں سے دور جانا چاہ رہا تھا۔

"آواز نیچی رکھو وشمہ..... کیا شور مچا رکھا ہے؟"

سب سے پہلے پروین وہاں پہنچیں..... اور انہوں نے اس کے اس شور و غل کی وجہ تک دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھا..... شاید اس لیے کہ وصی کے تیور انہیں باور کرا رہے تھے کہ جلد یا بدیر..... یہی ہونے والا ہے۔

"ہاں..... میری آواز دبا دیں آپ..... بلکہ صرف آواز ہی کیوں، میرا گلا دبا دیں آپ..... تاکہ نہ میں رہوں۔ نہ کوئی اس زیادتی کے خلاف آواز اٹھا سکے۔"

"کیا جاہلوں کی طرح چلا رہی ہو؟..... یہ بہو بیٹیوں کا شیوہ ہے کیا؟"

انہوں نے ظل ہما اور حسن کو اپنے کمرے سے نکلتا اور رخشندہ کو سامنے سے ہراساں انداز میں آتے دیکھا تو خفت سے دوچار ہوتے ہوئے آواز دبا کے ڈانٹنے لگیں۔

"خیریت ہے امی..... کیا ہوا ہے؟"

حسن، پروین سے پوچھ رہا تھا مگر تشویش بھری نگاہیں وشمہ پر ٹکی تھیں۔

"کچھ نہیں ایسے ہی بس۔"

"کیا کچھ نہیں..... یہ آپ کے لیے کچھ نہیں ہے..... میرا شوہر مجھے کہہ کے گیا ہے کہ وہ مجھ سے نہیں کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا..... مجھے نہیں، کسی اور کو پسند کرتا تھا اور کرتا ہے۔ وہ صاف صاف اعلان کر کے گیا ہے کہ آج نہیں تو کل وہ اس سے شادی کر کے رہے گا اور آپ مجھے کہہ رہی ہیں کہ میں چپ رہوں اپنی آواز نیچی رکھوں۔"

حسن اس سارے معاملے سے آگاہ تھا۔ اس لیے وصی کا یہ کھلم کھلا اعلان اس کے لیے انکشاف نہیں تھا البتہ رخشندہ ہکا بکا کھڑی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بھئی کوئی بتاتا کیوں نہیں؟"

شوکت جہاں نے آواز دی..... مارے گھبراہٹ کے ان کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے..... اتنا تیز چل کے آنہ سکتی تھیں..... ہما فوراً منظر سے غائب ہوئی۔

"میں دادی جان کو دیکھوں ذرا، پریشان ہو رہی ہیں۔"

"پروین..... یہ سب۔" رخشندہ نے دریافت کرنا چاہا۔

"بتائیے..... بتائیے انہیں چپ کیوں ہیں..... بتائیں آپ نے کون سی دشمنی نکالی ہے میرے ساتھ۔ جب آپ کو سب پتہ تھا تو آپ تب چپ رہیں..... اب مجھے چپ کرانا چاہتی ہیں۔"

"یوں شور مچا کے، تماشا لگا کے کیا حاصل ہوگا..... نکال لیں گے اس مسئلے کا حل..... میں خود بات کروں گی

"ہم سب کریں گے..... ایسا کیسے کر سکتا ہے وصی..... ہم بھلا ہونے دیں گے..... ہمارے خاندان میں ایسے رواج نہیں ہیں بیٹا۔ تم اطمینان رکھو۔" رخشندہ نے بھی تسلی دی۔

"تمہیں ذہن پہ کسی قسم کا بوجھ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے وشمہ۔" حسن کیوں پیچھے رہتا..... وشمہ کے آنسو تو جیسے اسے پھر سے ماضی کی جانب دھکیل رہے تھے۔

"ہم سب مجرم ہیں تمہارے..... تم ٹھیک کہتی ہو..... سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ہم نے وصی کو اس شادی کے لیے مجبور کیا۔"

حسن کے دل گرفتی سے کہنے پہ پروین نے اسے ناگواری سے گھورا۔

"اگرچہ میں نے اپنی سی کوشش کی تھی۔ اور وہ نہ وصی کی ضد پوری کرنے کے لیے تھی نہ اس لڑکی سے ہمدردی میں..... مجھے صرف اس دن کا ڈر تھا۔ اس دن کا جب وہ تمہیں ٹھیس پہنچاتا..... لیکن کسی نے میری بات نہ مانی اور سب سے زیادہ قصوروار ٹھہراؤں گا میں وصی کو۔ اگر وہ اسے بھلا نہیں سکتا تھا۔ اس سے تعلق ختم نہیں کر سکتا تھا تو بے شک جنگ کرتا ہم سے، اسٹینڈ لیتا..... نہ خود کو اس کشمکش میں ڈالتا..... نہ تمہاری زندگی برباد کرتا نہ ہم سب کو تمہارے سامنے شرمندہ کرتا..... بہت بڑی غلطی کی اس نے۔"

"بس کرو اب..... تمہیں کیا پتہ کس کی کتنی غلطی ہے۔"

پروین کو اس کا اتنا زیادہ بولنا ذرا اچھا نہیں لگا جبکہ وشمہ کو حسن کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کی حمایت میں جو تھیں اور جو پروین نے اسے ٹوکا..... تو اسے یہی لگا کہ انہیں وشمہ کی حمایت میں کسی کے دو لفظ بھی برداشت نہیں ہوتے۔

"بہرحال اس حقیقت سے نظر تو نہیں چرائی جا سکتی امی.....! اگر آپ اپنی ذمے داری پہ اپنی بھانجی کو بیاہ کے لائی ہیں تو اب وصی کو مجبور بھی کیجیے اس رشتے کی ذمے داریاں نبھانے کو۔"

"ہاں پروین..... ٹھیک ہے، رشتے ناتے طے کرتے ہوئے ماؤں کو اپنی مرضی اور پسند چلانے کا بڑا چاؤ ہوتا ہے، حق بھی ہے یہ ان کا..... لیکن بات صرف اپنی پسند کی بہو لانے پہ ختم نہیں ہو جاتی..... اس کے بعد بھی ماؤں کے بہت سے فرائض ہوتے ہیں۔" رخشندہ نے ان کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اتنے بہت سارے حمایتی بیان سننے کے بعد وشمہ کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں..... جو پروین کو مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرمانہ احساس میں..... ایک ندامت آمیز خفت میں مبتلا کر رہی تھی..... اس وجہ سے وہ یہ کچھ کہنے پہ مجبور ہو گئیں، جو عام حالات میں شاید کبھی اپنے زبان تک نہ لاتیں۔

"بھابی..... آپ کچھ نہیں جانتیں اور نہ ہی حسن جانتا ہے کہ میں نے اپنے فرائض کس حد تک نبھائے ہیں۔ میں نے وصی کی یہ شادی زبردستی نہیں کرائی مجھے خود زبردستی مجبور کیا گیا اور مجھ پہ یہ دباؤ اپنی اس نام نہاد ماں منزہ کے ذریعے دلوانے والی خود وشمہ تھی۔"

وشمہ ششدر رہ گئی۔ اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ اسے اس طرح سب کے سامنے سبکی کا سامنا کرنا پڑے گا..... وہ آنسوؤں سے بھری ہراساں آنکھیں لیے سب کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"اتنے پریشان کیوں ہو..... جب سے آئے ہو..... دماغ بھی حاضر نہیں ہے تمہارا؟"

سوہا نے اس کے کھوئے کھوئے انداز کو دیکھتے ہوئے گلہ کیا۔

"نہیں..... کچھ خاص نہیں۔" اس نے ٹالنا چاہا..... یوں بھی ذکر چاہے وشمہ کا ہو چاہے پروین کا، سوہا کے غصے ابھار دیتا تھا۔

"کچھ تو ہے..... ہاں اگر تم بتانا نہ چاہو تو۔"

"پلیز..... سوہا! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ..... میں اکیلا کافی نہیں کیا الجھنے کے لیے؟ جو بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔ کیا

ضروری ہے کہ تمہیں بتا کے میں تمہیں بھی پریشان کروں۔"

"وصی! تم مجھے خود سے الگ سمجھنا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔"

"میں تمہیں خود سے نہیں اپنے مسائل سے الگ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارا سب سے بڑا مسئلہ میں ہی تو ہوں۔"

"کاش..... تم اندازہ لگا سکتیں کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ اور کاش میں تمہیں بتا سکتا تم میرے لیے کیا ہو۔"

وصی نے اس کا ہاتھ ہلکے سے سہلایا۔ سوہا کی جھنجلاہٹ ڈھلنے لگی۔

وہ ذرا سا مسکرائی۔

"اپنی بیوی سے چونچیں لڑا کے آئے ہو؟"

وشمہ کا ذکر..... وہ بھی سوہا کی زبانی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ اتنے ہلکے پھلکے انداز میں سو اس کا چونکنا بجا تھا۔

"ایسی بات نہیں۔"

"نہیں..... کچھ کچھ تو میں بھی جانتی ہوں اسے۔ بچپن میں چاہے بہت سیدھی سادی اور بے وقوف جھینپو سی تھی لیکن اتنا اندازہ ہے مجھے کہ میری ماں کی مصلحت آمیز محبت نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔ میری ماں کو اس سے بالکل ویسی ہی محبت ہے..... وصی جیسی محبت میری ماما..... یعنی میری چاچی ربینا کو مجھ سے ہے۔ ایک ڈر ایک خوف میں لپٹی محبت ہر بات ہنس کے سہ جانے والی محبت..... ماں کی خالص محبت نہیں ہے یہ..... ممتا خوف کو نہیں پہچانتی۔ اسے یہ ڈر نہیں ہوتا اس کی اولاد اس کی محبت پہ شک نہ کرے یا اس سے بدظن ہو کر کسی اور کی طرف نہ ہو جائے۔ وہ بلا خوف وخطر اسے روکتی ٹوکتی ہے۔ ڈانٹتی ہے مارتی ہے..... سختی سے کام لے کر بھی اسے سیدھے راستے پہ لاتی ہے۔ اس کے نزدیک اولاد کی ناراضی سے زیادہ اہم اس کی تربیت ہوتی ہے۔ اسے پتہ ہوتا ہے وصی! کہ تربیت میں چوک ہو گئی تو اولاد کا مستقبل اس کی زندگی خراب ہو جائے گی۔ رہا ناراضی کا سوال تو اپنی ماں سے اولاد کب تک ناراض رہے گی۔ آنا تو ماں کی گود میں ہی ہے۔ لیکن یہ جو دوسری قسم کی ممتا ہوتی ہے نا..... وشمہ کی ماما اور میری ماما والی..... یہ بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ اس میں اولاد سے محبت کے دعوے چاہے کتنے ہی بڑے بڑے کیوں نہ ہوں اصلیت یہ ہوتی ہے۔ جو تمہارے سامنے ہے۔ ماما نے مجھے ہر آسائش دی، ہر سہولت فراہم کی..... میری ہر ضد کے آگے گھٹنے ٹیکے مگر کبھی اپنی منوانے کی ہمت نہ کی۔ وجہ صرف وہ خوف تھا کہ کہیں میں انہیں چھوڑ کے وہاں نہ چلی جاؤں۔ تم بتاؤ یہ محبت ہے یا خود غرضی؟ ممتا ہے یا مصلحت؟"

"اس کے باوجود کہ تم اس ممتا اور مصلحت کا فرق جانتی ہو، پھر بھی اپنی سگی ماں سے زیادہ اعتماد تم ماما پہ کرتی ہو، کیوں؟"

"کیونکہ وہ محبت تھی یا خود غرضی..... ممتا تھی یا مصلحت..... مگر میرے لیے وہی ہے۔ جو ڈوبتے کے لیے تنکے کی حیثیت ہوتی ہے۔ مجھے بھی ان کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی انہیں میری اور میں جانتی ہوں میری ہر بات ماننے کے ماما نے میرے اندر جتنی ضد اور جتنی سختی پیدا کی ہے اتنی ہی وشمہ میں بھی ہو گئی ہو گی۔"

"ہاں..... نہ صرف ضد اور سختی بلکہ بدلحاظی بھی..... وہ مامی کے ساتھ ذرا بھی عزت سے پیش نہیں آتی۔"

"اور تمہیں یہ بات بری لگتی ہے؟" سوہا نے چڑتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں..... نہیں..... میرا مطلب تھا۔"

"جب تمہارا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں، تمہیں اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ تو تمہارے اندر اس کے لیے گلے کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟"

"گلہ اس سے نہیں ہے سوہا..... بہرحال گھر کا ماحول تو خراب ہو رہا ہے..... میں چاہے اس رشتے کو کسی نظر سے بھی دیکھوں، سب کے لیے تو اس صورت حال کا ذمے دار میں ہوں۔ سب کا خیال ہے کہ میرے رویے کے ردعمل کے طور پہ وہ اس طرح بی ہیو کر رہی ہے۔"

"تو تم اپنا رویہ بدلنا چاہتے ہو؟"

"فار گاڈ سیک سوہا! مجھے مزید نہ الجھاؤ..... میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

اور حقیقتاً "وہ اس لمحہ سوہا کو اتنا قابل رحم لگا کہ اسے اپنی چبھتی باتوں پہ شرمندگی سی ہونے لگی۔

"سوری وصی..... میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی..... مگر کر دیتی ہوں کب؟ کیسے؟ پتہ ہی نہیں چلتا..... سوری۔"

"اٹس اوکے۔"

"اگر تمہارے اس کے ڈنر یا آؤٹنگ وغیرہ پہ جانے سے تمہاری فیملی تم سے خوش اور مطمئن ہو جاتی ہے..... تو تم جاؤ..... میری پروا مت کرو۔"

"نہیں سوہا! ایسی بات....."

"بلیو می وصی..... میں برا نہیں مانوں گی..... بس تمہاری یہ الجھن یہ شکستگی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو..... بات وہ نہیں ہے۔ اسے تمہارے اور میرے تعلق کے بارے میں پتہ چل گیا ہے اور اس نے گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ مجھے لگا تھا۔ کبھی پتہ چلا بھی اسے تو زیادہ سے زیادہ روئے دھوئے گی ناراض ہو کر اپنے باپ کے گھر چلی جائے گی لیکن اس نے تو اپنا اور میرا تماشا بنا کے رکھ دیا ہے۔"

"انٹرسٹنگ۔"

"تمہیں یہ انٹرسٹنگ لگ رہا ہے؟"

"جو ہوا اچھا ہوا وصی..... میرے خیال میں تمہارے لیے سب سے مشکل مرحلہ یہی تو تھا..... جو خود بخود حل ہو گیا ہے۔"

"حل نہیں ہوا سوہا..... یہی تو پریشانی ہے مجھے۔ گھر جانے کو دل نہیں کر رہا کیسے سب کا سامنا کروں..... ایک ایک کر کے سب لوگ یہ بات جانتے جا رہے ہیں۔"

"تم کیوں چھپانا چاہتے ہو اپنے اور میرے تعلق کو؟"

ابھی ابھی خود سے عہد کیا تھا..... کہ وہ وصی کی پریشانی میں مزید اضافہ نہیں کرے گی لیکن چند ہی منٹ میں سب بھلائے چلا رہی تھی۔

"کیا یہ رشتہ، یہ تعلق اتنا شرم ناک ہے؟"

"تم سمجھتی کیوں نہیں سوہا..... وہ وقت کہ میں پورے اعتماد اور وقار کے ساتھ تمہیں اپنے گھر والوں سے متعارف کراتا..... وہ وقت گزر چکا ہے..... میری اپنی کمزوری کی وجہ سے۔ اب میں ایک شادی شدہ مرد ہو کر اپنی محبت کا اعتراف کس طرح اسی وقار اور اعتماد سے کر سکتا ہوں؟ شرم ناک ہمارا تعلق نہیں ہے، شرم ناک میری یہ شادی شدہ حیثیت ہے۔ تم نہیں..... میں قصور وار ہوں اس سارے قصے میں۔" وہ پھر سے ٹوٹنے لگا تھا۔

سوہا تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

□□□□

"تو وصی نے یہ لحاظ بھی گرا دیا۔"

شوکت جہاں نے ساری روداد سن کر کہا۔

"لحاظ ختم کرنے کا ریکارڈ تو وشمہ نے بنایا ہے اماں جان..... نہ حسن کی موجودگی کا لحاظ..... نہ رخشندہ کا بھرم سب کے سامنے چلا رہی تھی۔"

"تم نے بھی کم غلط نہیں کیا پروین جو بھی ہے، ہے تو نادان بچی..... اس گھر کی عزت..... تمہاری بھانجی بھی..... اور ہماری بہو بھی۔ ایسے سب کے سامنے تمہیں وہ راز بتانا نہیں چاہیے تھا جو کب سے چھپائے چلی آ رہی تھیں۔"

"تو کیا کرتی..... حسن اور بھابی نے اس کی حمایت میں جو مجھے سنانا شروع کیا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ یہی تو تھی جس نے مہینوں میرے گلے پہ چھری رکھی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے نکلوں اس مصیبت سے۔ قمیص اٹھاؤ تو اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے۔ منہ پھاڑ کے کہہ دیتی کہ یہ وشمہ کی مرضی اور پسند ہے تو سب مجھے ہی سناتے کہ اس کے بھائی کی لڑکی خود سے رشتہ بھجوا رہی ہے وہ بھی پھوپھی کو سیڑھی بنا کے..... اور وصی تھا کہ قابو نہ آتا تھا..... ادھر وصی کی بغاوت کا خدشہ..... ادھر یہ ڈر..... کہ یہ بے وقوف نہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کر لے۔ تب کیسے تڑپ رہی تھی۔ اور اب منہ بھر بھر کے الزام ہم سب گھر والوں کو دے رہی ہے کہ ہم نے جانتے بوجھتے اس بندھن میں باندھا ہے..... اتنی جلدی بھول گئی کہ یہ رشتہ میں نے اس کے دباؤ میں آ کے اور اس کی بچکانہ ضد کے آگے مجبور ہو کے ڈالا تھا اور وہ بھی اس کی پھیلائی غلط فہمی کی وجہ سے کہ وہ اور وصی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"اب کیا فائدہ ایک دوسرے کو الزام دینے کا..... یہ اوپر نبٹائے رشتے ہیں۔ تمہارا یا وشمہ کا کیا زور۔"

"اب سوچتی ہوں..... یونہی کڑھ کڑھ کے جینا تھا تو وصی کی ہی مان لیتی۔ اس سوہا پہ ہی راضی ہو جاتی۔ ہم میں سے کوئی ایک تو خوش ہوتا..... میں یا وشمہ نہ سہی..... وصی ہی سہی۔"

"تم سب کچھ اللہ پہ کیوں نہیں چھوڑ دیتیں پروین۔"

"اماں جان..... برا نہ مانیے گا..... کیا آپ اپنی اولاد کی تکلیفوں پہ سارے معاملے اللہ پر چھوڑ دیا کرتی تھیں..... یہ ٹھیک ہے کہ ہونا تو بہرحال وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوگا لیکن مائیں کیسے خود کو باز رکھ سکتی ہیں پریشان ہونے سے۔ کیا میں وصی کی ماں نہیں ہوں؟ کیا میں نے اسے حسن اور حسان سے کم محبت دی ہے؟ کیا اس کی زندگی میں کانٹے ہی کانٹے..... مشکلات ہی مشکلات دیکھ کے مجھے اطمینان ہو سکتا ہے؟"

"دعا کرو..... یہ دل کو سکون دیتی ہے اور دعا ہمیشہ نیک نیتی سے کرو..... کبھی اس چیز کی طلب نہ کرو..... جو تمہیں اپنے لیے اچھی لگے..... ہمیشہ اس چیز کی طلب کرو جو اللہ تمہارے لیے پسند کرے۔ دیکھنا اس دعا کے بعد دل کیسے ٹھہر جاتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"یقین نہیں آتا کہ چچی جان نے جو کچھ کہا ہے' وہ واقعی سچ ہے؟"

ہما نے حسن سے کہا جو خود بھی اب تک مسلسل کشمکش میں تھا۔

"ہاں۔ اگر وہ میری ماں نہ ہوتیں تو یقین کرنا میرے لیے بھی مشکل تھا..... وشمہ تو میرا مطلب ہے اس وقت یعنی شادی سے پہلے تو بہت ہی کم گو' بڑی جھجکتی۔ ہوئی سی ڈیو لڑکی تھی۔ وہ کیسے..... کیسے اس نے یہ سب کیا ہو گا۔ کیسے اپنی سوتیلی ماں کے ذریعے امی کو پریشرائز کیا ہو گا..... ایک خیال آ رہا ہے۔"

"کیا.....؟"

"ہو سکتا ہے امی اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہوں..... میں ان کے بیان کی سچائی پہ شبہ نہیں کر رہا۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے یہ ساری غلط فہمی منزہ ممانی کی پھیلائی ہو۔ وشمہ اس سارے قصے میں سرے سے ملوث ہی نہ ہو اور وہی اس معصوم کا نام لے لے کر امی کو بدظن کر رہی ہوں۔"

"لیکن اس سے منزہ آنٹی کو کیا فائدہ ہوتا؟"

"ایک تو سوتیلے پن کی تسکین ہو جاتی' وشمہ کے سسرال میں اس کے جانے سے پہلے ہی اس کے خلاف کدورت پھیلا کے..... اور دوسرا یہ شادی نہ ہو پاتی تب بھی وشمہ کو بدنام کرنے کا تو اچھا خاصا انتظام ہو چکا تھا ان کی دانست میں۔" "آپ کا قیاس غلط نہیں ہو سکتا تھا اگر۔" اتنا کہہ کے وہ ذرا سا رکی۔

"اگر..... اگر کیا؟"

"اگر وشمہ کا ان کی باتوں..... بلکہ الزامات کے جواب میں ہم سب نے اس کا وہ ردعمل نہ دیکھا ہوتا..... اس کے تاثرات ایسے ہی تھے جو کسی سچ..... کسی شرمناک سچ کے سامنے آ جانے پہ ہوتے ہیں۔ اگر یہ الزام غلط ہوتا تو

اس کی خاموشی میں ایک دکھ' ایک احتجاج ہوتا لیکن اس کی چپ شرمندگی تلے دبی ہوئی تھی۔"

"ہاں..... شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

حسن نے دل پہ پتھر رکھ کے بالآخر وشمہ کا قصور تسلیم کر ہی لیا۔

☼ ☼ ☼

جو کچھ وشمہ کہہ کے گئی تھی۔ وہ منزہ کو ہلا ڈالنے کے لیے کافی تھا..... اگرچہ اسے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ یہ ساری بات حقیقت پر مبنی ہے..... لیکن اس کے باوجود..... اس کی سانسیں تک خشک ہوئے چلی جا رہی تھیں۔ یہ سوچ سوچ کر کہ جس گھر ہستی کو قائم رکھنے کے لیے اس نے اپنی بیٹی تک کی قربانی دی۔ آج وہی بیٹی اس گھر ہستی کے لیے پھر سے سب سے بڑا خطرہ بنی ہوئی ہے۔

"اگر اس بار سوہا کی وجہ سے مجھے کوئی الزام' کوئی طعنہ سننے کو ملا تو میں برداشت نہیں کروں گی۔ اور یہ الزام..... کہ سوہا کی وجہ سے وشمہ کا گھر ٹوٹا..... اس کی شادی شدہ زندگی برباد ہوئی' یہ الزام تو میری زندگی کا سب سے بڑا الزام ہو گا۔"

فون کی گھنٹی پہ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔

"ضرور نوید کا ہو گا....." وہ سستی سے اٹھی۔

اس کے بجھے بجھے رویے سے نوید کل سے ٹھٹکا ہوا تھا اور بات بات پہ اس کی وجہ دریافت کر رہا تھا۔

"ہیلو....." اس نے ایک بار پھر گھسے پٹے بہانے دل میں دہراتے ہوئے کہا..... مگر دوسری جانب اسے ثنا کی ہشاش بشاش آواز سنائی دی۔

"کیسی ہو منزہ؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے بھی زبردستی اپنی آواز میں بشاشت پیدا کی۔

"تمہیں ایک خبر سنانا تھی۔"

"اچھی یا بری؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"آف کورس اچھی خبر بھئی..... بھول گئیں مجھے بری خبریں پھیلانے کا شوق کبھی بھی نہیں رہا۔"

"یہ شوق شاید کسی کو بھی نہیں ہوتا..... قسمت جھولی میں ڈال جاتی ہے یہ ذمے داری کسی کسی کو کہ جاؤ ان بری خبروں کو جی بھر کے خود بھی سہو اور دوسروں کی جھولی میں بھی حسب توفیق ڈالتے جاؤ۔"

"نہیں بھئی..... میں تو دل خوش کرنے والی خبر..... بلکہ خبریں سنا رہی ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں اور جمشید سوہا سے مل کے آئے ہیں۔"

"کیا؟" وہ بھرپور طریقے سے چونکی۔

"سوہا سے؟ مل کے آئے ہیں یا اتفاقاً ملی تھی؟"

"مل کے آئے ہیں بھئی..... اس کے گھر۔"

"اس کے چچا چچی نے ملنے دیا؟"

"روک کے تو دکھاتے۔"

"اور سوہا..... وہ ٹھیک طرح سے ملی؟"

منزہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ نجانے وہ ان سے کس انداز میں پیش آئی اور اسے اب کیا سننے کو ملے۔

"بالکل..... ہاں پہلے پہچان نہیں پائی..... لیکن بعد میں کافی دیر ہماری گپ شپ رہی۔"

"اچھا....." منزہ نے بے یقینی سے کہا۔ اسے سوہا کے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی نہیں تھی۔

"اور ہاں..... پرسوں اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"کیا؟ لیکن وہ..... وہ تو۔" اس بار منزہ بالکل بھی یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ بھلا سوہا کیسے جمیل بھائی کے گھر

جاسکتی ہے۔ ”وہ توان کا نام تک سننے پر تیار نہیں ہوتی۔ چلو آپ دونوں کو تو پھر بھی مانا جاسکتا ہے کہ اس یادداشت میں آپ کے حوالے سے کوئی خوشگوار واقعہ نہیں تو کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی نہیں ہوگا شاید مروّت میں وہ آنے کی حامی بھر بھی لے لیکن وہاں اس گھر میں ناممکن۔“

”بہت اچھی طرح جانتی ہو تم اپنی بیٹی کو..... واقعی وہ وہاں آنے پہ کسی قیمت پر تیار نہیں تھی۔“

”تو پھر.....“

”تو پھر یہ کہ یہ کوئی ہماری انا کا مسئلہ تو تھا نہیں..... نہ ہماری کوئی ضد تھی کہ اسے لازما“ جمیل بھائی کے گھر لانے پہ جھکانا ہے۔ بس ہم ملنا چاہتے ہیں اس سے‘ کچھ اچھا وقت‘ کچھ اچھی باتیں‘ کچھ اپنی لاپروائی کا ازالہ..... کچھ اس کے دل کی کدورت کو کم کرنا..... صرف یہی مقصد ہے اس سے ملنے اور ملتے رہنے کا۔“

”ملنا تو میں بھی چاہتی ہوں اس سے اور ملنے کا ایک مقصد میرے پاس بھی ہے مگر میں جانتی ہوں مجھ سے ملنے کے لیے وہ اتنی آسانی سے نہیں مانے گی۔“

”تمہیں اس سے کچھ کہنا ہے تو مجھے بتادو..... میں کہہ دوں گی۔“

”اتنی آسانی سے کہنے والی بات نہیں ہے۔“

”تم بھی آجاؤ وہاں..... ہم نے ایک فارم ہاؤس میں ملاقات رکھی ہے۔ جمشید کے دوست کا ہے..... یہیں قریب ہی بس آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پہ..... تم کہو تو تمہیں پک کرتے ہوئے چلے جائیں۔“

”نہیں..... نہیں۔“ وہ گھبرا اٹھی۔

”میرا نام سن کے تو وہ فارم ہاؤس میں بھی ملنے پہ تیار نہیں ہوگی اور میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے نہ سہی‘ کم از کم آپ لوگوں سے ضرور ملے۔“

”کوئی بات تو ہے منزّہ..... تمہارا لہجہ بتا رہا ہے۔“

”ہاں..... بات ہے..... مگر جب تک میں کسی نتیجے پہ پہنچ نہیں جاتی کیسے بتاؤں..... اور اگر بالفرض بتا بھی دوں تو اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ کیا آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کرسکیں گی؟“

”ضرور..... تم ایک بار کہہ کے تو دیکھو۔“

”ٹھیک ہے..... میں آج ہی وشمہ سے کہتی ہوں کہ.....“

وہ روانی سے بتاتے بتاتے خود ہی رک گئی۔

”وشمہ..... وشمہ سے کیا کہنا ہے؟“

”نہیں..... کچھ نہیں میں کل فون کرتی ہوں آپ کو؟“

ثنا کا فون بند ہونے پہ اس نے وشمہ کا نمبر ملایا۔

”تمہاری بات ہوئی وصی سے؟“

”کیا خاک بات ہوگی ماما..... دو دن ہوئے میں نے اسے دیکھا تک نہیں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

”کیا..... وہ دو دن سے گھر نہیں آیا؟“

منزہ ایک دم بے چین ہو اٹھی‘ اس وقت نوید مراد کو یہ خبر سنانے کے لیے کہ جس بہن کے سپرد اس نے اپنی اکلوتی بیٹی بڑے ارمانوں کے ساتھ کی تھی۔ اس بہن کے گھر وہ بیٹی اس درجہ ناقدری کا شکار ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس اس سب کا پس منظر یاد آگیا۔ وہ نئے وسوسے کا شکار ہوگئی۔ اگر سوہا والی بات میں ذرا سا بھی سچ نکلا تو زد میں پروین نہیں وہ خود آئے گی۔

”گھر تو آتے ہیں..... مگر اپنے کمرے میں نہیں۔“

”تو کہاں ہوتا ہے؟“

”مجھے کیا پتا؟“ وہ چڑ گئی۔ ”میں تو خود دو دن سے کمرے سے نہیں نکلی۔“

”یہ وقت کمرہ بند کرکے بیٹھنے کا نہیں ہے وشمہ! تم خود کو اکیلا کررہی ہو۔ اس وقت تمہیں زیادہ سے زیادہ حمایت کی ضرورت ہے اور حمایت ہمیشہ مظلوم کے ساتھ ہوتی ہے۔ تمہارے معاملے میں ظلم تمہارے ساتھ ہوا ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں‘ صرف تمہیں منوانا ہے۔ سب سے ایسے کٹ کر‘ الگ ہو کر تم کیا کرلوگی؟ گھر سے بھاگ کر شادی نہیں کی تم نے‘ وہ لوگ بیاہ کرلے کر گئے ہیں..... کیسے چپ چاپ تماشا دیکھ سکتے ہیں وہ کہ تم دو دن سے کمرے میں اکیلی بند پڑی ہو اور وہ تمہارا شوہر اندر جھانک تک نہیں رہا۔“

”ماما..... پھوپھو نے سب کو بتادیا ہے۔“

”کیا..... کیا بتادیا ہے؟“

”یہی کہ..... یہ‘ یہ شادی..... یہ شادی میری پسند اور ضد کے نتیجے میں۔“

”کیا..... مجھے پروین سے اس ہلکے پن کی توقع نہیں تھی۔“

”اب کیا ہوگا ماما..... !میں تو کسی کا سامنا تک کرنے کے قابل نہیں رہی۔“

”ایسا کچھ نہیں کیا تم نے وشمہ..... جو منہ چھپاتی پھرو..... پسند کی شادی کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ شادی ہوئی تو سب کی رضامندی سے ہے..... پورے زمانے کے سامنے..... ہر طرح کے رسم و رواج کے ساتھ۔“

”لیکن مجھے تو بے حد سبکی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر وصی کی پسندیدگی بھی اس رشتے میں شامل ہوتی تو میں سر اٹھا کے اس بات کا مقابلہ کرتی۔ لیکن اب تو سب یہ سمجھ رہے ہیں کہ میری یک طرفہ پسندیدگی کی وجہ سے وصی کو بھی ہار ماننا پڑی اور میں ہی وجہ ہوں۔ اس کی اس حالت کی میں ہی ذمے دار ہوں۔“

”اور تم چپ چاپ سب برداشت کررہی ہو؟ تم نے یا میں نے وصی کو گن پوائنٹ پر تو شادی کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔ نہ پروین کے گلے میں کوئی پھندا ڈالا تھا۔“

”میں چپ رہنے پہ مجبور ہوں ماما! کیونکہ میں کمزور ہوں۔ میری واحد طاقت آپ ہیں۔ لیکن اگر..... اگر سوہا والی باتیں سامنے آئیں تو آپ کی طاقت بھی کھو دوں گی میں۔“

سوہا کے ذکر پہ منزہ کی ساری تندی تیزی ماند پڑ گئی۔

”سنو وشمہ! یہ بات جلد از جلد کلیئر ہونی چاہیے۔“

”اور کس طرح کلیئر کروں میں..... میں نے خود سنا ہے۔ آپ کیوں میرا یقین نہیں کررہیں؟“

”یہ بات بطور خاص تمہیں گمراہ کرنے کے لیے بھی سنائی جاسکتی ہے۔ تم وصی سے معلوم کرو۔“

”وہ میرے سامنے ہی کب آتے ہیں؟“

”تو تم سامنے چلی جاؤ۔“

”میں کیوں..... نہیں مجھ سے نہیں ہوگا یہ..... غلطی پہ وہ ہیں میں نہیں‘ جو جھکوں۔“

”میں تم سے جھکنے کے لیے نہیں کہہ رہی وشمہ..... تم اس کے پاس جاؤ گی..... معافی مانگنے یا منانے نہیں..... اپنے سوال کا جواب لینے اور یہ بہت ضروری ہے۔ جب تک مجھے تسلی نہیں ہوجاتی کہ یہ بات سراسر جھوٹ نہیں ہے میں تمہاری مدد نہیں کرسکتی۔ چاہتے ہوئے بھی نہیں۔“

”اور اگر یہ بات جھوٹ نہ نکلی تو کیا تب آپ میری مدد کریں گی؟“ وشمہ کے سوال نے منزہ کو گنگ کردیا۔

☼ ☼ ☼

”وصی! یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تم نے؟“

دو دن سے چپ چاپ سب برداشت کرتی پروین کا پیمانہ صبر بالآخر لبریز ہوگیا۔

آج پھر رات پونے گیارہ کے قریب گھر لوٹتے ہی وصی بغیر کچھ کھائے پیے ڈرائنگ روم میں چلا گیا تھا..... دو دن سے وہ صوفے پہ ہی بسر کررہا تھا۔

یہ کون سا وقت ہے گھر آنے کا..... پہلے تو تم چھ سوا چھ تک آجاتے تھے۔ حد سے حد تک سات بج جاتے

"میں آفس سے چھ بجے ہی نکلتا ہوں۔"

"اس کے بعد اس کے پاس حاضری دینے جاتے ہو گے۔ وہ کیسے لوگ ہیں؟ اس سے ہی اندازہ لگا لو تم ان کی شرافت اور خاندانی پن کا۔ کوئی کیسے ایک جوان غیر مرد کو اپنی بچی کے پاس آدھی آدھی رات تک بٹھائے رکھنا گوارا کرتا ہے؟"

"میں نسیم کے ہاں تھا۔ کل بھی اور آج بھی' آپ چاہیں تو پتہ کرلیں..... اس کی والدہ سے تو آپ کی بات چیت رہتی ہی ہے۔"

"کیوں کر رہے ہو تم ایسا؟"

اس کے شکستہ لہجے پہ پروین بھی نرم پڑ گئیں۔

"آپ جانتی تو ہیں؟"

"یہ کوئی طریقہ نہیں ہے وصی..... تمہاری وجہ سے ہم سب لوگ اس لڑکی کے سامنے شرمندہ رہتے ہیں۔ تم تو سارا دن گھر پہ ہوتے نہیں۔ مصیبت ہم سب کے لیے ہے' نہ کمرے سے نکلتی ہے نہ کسی سے بات کرتی ہے۔ چوبیس گھنٹے رونا دھونا..... سو سو منتیں کر کے تو اسے کھانا کھلانا پڑتا ہے۔ کبھی ہماڑے لے کر جاتی ہے..... کبھی ردا کو بلواتی ہوں۔ میرے سے تو جایا نہیں جاتا ایسی الزام دیتی نظریں۔ کیا میں یہی سب دیکھنے کے لیے رہ گئی ہوں۔ اوپر سے اپنے ماموں کا مزاج تم جانتے ہو۔ انہیں کسی نہ کسی طرح بھنک نہیں پڑنے دی اب تک' لیکن چلو دو دن تو گزر گئے۔ کب تک چھپاؤ گی کل بھی پوچھ رہے تھے کہ وہ کھانے کے لیے ٹیبل تک کیوں نہیں آئی..... طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنایا..... وہی آج چل گیا کب تک اسے بیمار بتلاتی رہوں گی۔ دیکھنا کل تک یہ اعتراض سامنے آجائے گا کہ بہو ہو کر تین دن سے سلام تک کرنے کیوں نہ نکلی۔ تمہارے ماموں اور گن گن کر اعتراض نہ کریں اور وہ بھی میرے میکے سے وابستہ کسی فرد کے اوپر یہ بھلا ہو سکتا ہے۔"

"مجھے بتائیں..... پھر میں کیا کروں؟" وہ زچ ہو اٹھا۔

"جا کے ہاتھ جوڑوں اس کے آگے..... قسمیں دے دے کر نوالے منہ میں ڈالوں؟ کیا کروں؟"

"اپنی یہ روش ترک کردو خدا کے لیے..... یہ دن بھر غائب رہنا..... آدھی رات کو آ کے بجائے اپنے کمرے کے یہاں گھس جانا۔ آخر وہ بیوی ہے تمہاری۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ کیوں اجنبی مہمان بنے ہوئے ہو۔ وہ غلط کر رہی ہے میں جانتی ہوں لیکن یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ جو کر رہی ہے۔ تمہارے اس عمل کے ردِ عمل کے طور پہ کر رہی ہے۔ تم سدھر جاؤ تو وہ بھی سدھر جائے گی۔"

"میں کیسے جاؤں اس کمرے میں..... مجھے اس کے سوال اس کے آنسو تنگ کرتے ہیں ممانی جان۔"

"یہ سوال اس کے دل میں پیدا کرنے والے بھی تم ہو..... یہ آنسو ان آنکھوں تک لانے والے بھی تم ہو۔ وہ میری بھانجی ہے اس لیے نہیں کہہ رہی..... یقین کرو..... مکمل غیر جانب داری سے کہہ رہی ہوں کہ بہرحال اس ساری صورت حال کے ذمے دار تم ہو۔ اس کا رد عمل بچکانہ اور شدید ضرور ہے۔ مجھے سارے گھر کے سامنے خفت میں بھی مبتلا کر رہا ہے لیکن یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ تم مان کیوں نہیں جاتے؟"

"صرف میرے ماننے سے کیا ہوتا ہے..... چلیں مان لیتا ہوں یہ سب میری غلطی ہے..... اب اس سے کیا حاصل؟"

"غلطی مان لینے کے بعد اگلا مرحلہ اس کو سدھارنے کا ہوتا ہے۔"

"کوئی حل نہیں ہے اس مسئلے کا۔ کم از کم میرے پاس تو نہیں۔ اب اماں جان کو ہی بھیجنا پڑے گا تمہیں سمجھانے کے لیے۔"

وصی نے احتجاجاً سر اٹھا کے دیکھا۔ مگر وہ اپنی کہہ کے جا چکی تھیں۔ وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا..... جتنا کسی کا سامنا کرنے سے بچنا چاہ رہا تھا..... اتنے سوال سر اٹھا اٹھا کے سامنا کرنے پہ مجبور کر رہے تھے اور شوکت جہاں کا سامنا کرنے کے تو محض تصور سے ہی وہ گھبرا اٹھا۔

وہ تھکے تھکے انداز میں صوفے پہ لیٹ گیا۔ بازو موڑ کے آنکھوں پہ رکھ لیا۔ نیند تو آنی نہیں تھی..... مگر کوشش کرتے رہنے میں کیا حرج تھا۔

دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز پہ اس کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو شوکت جہاں کے سوالوں کے لیے تیار کرنے لگا۔

قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی دشمہ کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔

"کب آئے آپ؟"

اس نے فوراً آنکھیں کھولیں..... ایک بالکل بدلے ہوئے روپ میں وہ سامنے تھی..... شادی سے پہلے کبھی کبھار اسے جب بھی دیکھا تھا۔ بڑے سادہ روپ میں دیکھا تھا اور شادی کے بعد سے مسلسل بہت بنے سنورے روپ میں لیکن آج اس کے وجود اور سراپے سے نہ وہ کم عمری کی سادگی کا نکھار نظر آ رہا تھا نہ ہی دلہناپے کا سنگھار

"کھانا کھایا آپ نے؟"

"اور تم نے؟" بے ساختہ وہ پوچھ بیٹھا۔

جواب میں وہ سر جھکا کے انگلیاں مروڑنے لگی۔

"مامی نے بتایا ہے تم کھانا نہیں کھاتیں۔ کسی سے بات نہیں کرتیں۔ کمرے سے نکلتیں کیا ہے یہ سب؟"

وہ نرم لہجے میں پوچھ رہا تھا مگر دشمہ کو یہ سب نیزے کی انی کی طرح چبھ رہا تھا۔ اسے پروین سے نئے سرے سے یہ ہونے لگا جو اس کے آنے سے پہلے ہی اس کی شکایتیں وصی تک پہنچا چکی تھیں۔

"اور آپ جو کچھ کر رہے ہیں..... وہ کیا ہے؟"

منزہ کے سمجھنے بجھانے پہ وہ خود کو شانت کر کے آئی تھی مگر رہ نہ سکی۔

"تم سمجھو..... میرا دماغ خراب ہے۔"

"اور آپ سمجھیں کہ آپ نے میرا بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔"

وصی حیرت سے اسے تکنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ اتنی گم صم اور جھینپی رہنے والی لڑکی اتنے جواب بھی دے سکتی ہے اور وہ بھی ... بلاوجہ۔"

"پھر تو بڑا دھوکا ہوا آپ کے ساتھ..... بے خبری میں مارے گئے آپ' آپ نے تو یہی سوچ کر شادی کی ہو گی میرے ساتھ کہ یہ تو بے زبان ہے..... بے وقوف ہے' کچھ بھی کر لو چپ چاپ برداشت کرے گی۔ مگر ایسا ہوا نہیں اور ہو گا بھی نہیں کیونکہ میں چپ چاپ سب کچھ برداشت کرنے والوں کا حشر دیکھ چکی ہوں۔ میری ماما کی مثال سامنے ہے۔ مجھے ان کی طرح جبر و برداشت اور درگزر کے ریکارڈ نہیں بنانے..... نہ قربانی کی مثالیں پیش کرنی ہیں۔ ہاں ان سب کے بدلے انہیں کوئی عزت و تکریم کے میڈل ملے ہوتے تو شاید میرے اندر بھی یہ لالچ پیدا ہوتا کہ میں بھی یہ سب حاصل کرلوں۔ مگر اتنا سب کرنے کے بعد بھی وہ خالی ہاتھ ہیں۔ ان کی قربانیوں اور صبر کا صلہ تو در کنار..... کوئی کھلے دل سے اعتراف تک نہیں کرتا پھر میں کس آس پہ ان کے نقش قدم پہ چلوں..... مجھے وہی کرنا ہے جو ایک عام انسان کرتا ہے ایک عام انسان اپنا حق چھننے پہ کیا کرتا ہے؟ جانتے ہیں ناں آپ؟ چیختا ہے' چلاتا ہے واویلا کرتا ہے۔ دوسروں کو الزام دیتا ہے۔ خود کو سزا دیتا ہے یہ سب کروں گی میں اور کچھ ملے نہ ملے کم از کم میرے اندر کی گھٹن تو ختم ہو گی۔ یہ احتجاج میرا حق ہے۔ مجھے احتجاج کرنے سے نہیں روک سکتے آپ۔"

"ہاں شاید ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ یہ حق ہے تمہارا۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں تسلیم کر رہا تھا۔

"مجھے بھی تم سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ تم بے حسی کی چادر اوڑھ کے سارا دن ہنستی مسکراتی ایک نارمل نئی نویلی دلہن کا رول پلے کرتی رہو..... صرف میری کوتاہیوں پہ پردہ ڈالنے کے لیے۔"

"تو آپ یہ تو مانتے ہیں کہ آپ سے کوتاہی سرزد ہو رہی ہے۔"

"ہاں..... مانتا ہوں لیکن اس کا ازالہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں..... یہ میرے بس سے باہر ہے۔"

"یہ تو آپ کے بس میں ہے ناں کہ مجھے اس کا نام ہی بتا دیجئے..... جس کے سامنے آپ کو میں نظر نہیں آتی۔"

وصی چند سیکنڈ چپ رہا۔

"اس کا نام جاننے سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔"

"ہونی چاہیے..... آپ سے میرا تعلق ایسا ہے کہ میں سب کچھ جان سکوں۔"

"مجھ سے ہو گا..... مگر اس سے نہیں۔"

وشمہ معنی خیز انداز میں مسکراتی چند قدم آگے بڑھ کے اس کے مقابل آئی۔

"ہو سکتا ہے اس سے بھی کوئی گہرا تعلق نکل آئے۔"

وصی اچانک ہی بے تحاشا اور بے نام سی گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا۔

"ویسے اتنا بتا دوں..... مجھے نام جاننے سے زیادہ اس نام کی تصدیق کرانے میں دلچسپی ہے۔ اتنا تو میں جان چکی ہوں کہ وہ کون ہے لیکن سنی سنائی بات پہ یقین کرنے کے بجائے صرف ایک بار آپ کی زبانی یہ اعتراف سننا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہاری تسلیاں کرانے کا پابند نہیں ہوں۔" وہ درشتی سے بولا۔

"چاہے کسی دل سے بھی سہی۔ مگر بہرحال آپ نے مجھے بیوی تسلیم کیا ہے۔ اللہ رسولؐ کو گواہ بنا کے..... سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اور آپ اس بات کے پابند ہیں کہ میرے اس سوال کا جواب دیں۔"

"مجھے تمہارے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دینا۔" وہ غصے میں میز سے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے بولا۔

"صرف ہاں یا ناں۔"

وہ دروازے کی جانب بڑھتے وصی سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا وہ لڑکی سوہا آپی ہیں؟"

وصی کے قدم دروازے کے پاس رک گئے۔

"کیا وہ لڑکی سوہا آپی ہیں؟"

وشمہ نے اپنا سوال دہرایا۔ اس بار اس کے لہجے میں جارحانہ پن نمایاں تھا۔

وصی نے سوچنے میں صرف ایک لمحہ لگایا۔

یہی وقت تھا اپنے اندر کے اس ندامت بھرے احساس کو دھونے کا کہ وہ سوہا کی محبت کو وہ مقام نہیں دے سکا جس کی وہ حق دار تھی۔ اگر آج اس محبت سے مکر جاتا تو شاید کبھی اس کا دل سوہا کے سامنے سرخرو نہ ہو پاتا۔

"ہاں..... میں سوہا سے محبت کرتا ہوں۔"

اس کے انداز میں تفاخر تھا۔ اس کے اعتراف میں سکون تھا۔ ہلکا پھلکا سا ہو کر وہ باہر نکل گیا اور وشمہ ذہنی طور پر یہ جواب سننے کے لیے تیار ہونے کے باوجود سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

ثنا نے اس سے بچپن کی کسی تلخ یاد کا تذکرہ تک نہ کیا، منزہ کے حوالے سے بھی کوئی بات نہ کی۔ نہ اسے ماں سے ملنے پہ اکسایا نہ منزہ کی جانب سے کسی قسم کی کوئی نصیحت یا صفائی پیش کی اور تو اور رینا کے بارے میں اس سے رتی برابر بدگمانی بھی نہ کی۔ بلکہ جب سوہا نے اس کا ردعمل جاننے کی غرض سے جان بوجھ کر رینا سے اپنے لگاؤ اور قربت کا اظہار کیا، اس کی تعریف کی تو ثنا نے نہ صرف دلچسپی ظاہر کی بلکہ بڑھ چڑھ کر رینا کی خوبیوں کی تائید بھی کی۔ غرض سوہا جو توقعات لے کر ثنا سے ملنے آئی تھی۔ وہ منہ کے بل جا گریں۔

"کتنی خوش اور الگ نظر آ رہی ہے سوہا!" دور بیٹھے جمشید نے ثنا سے کہا۔

"ہاں۔ جب ہم اس سے ملنے گئے تھے تو وہ ویسی ہی تھی جیسی منزہ نے بتایا تھا۔ اکھڑی اکھڑی رہنے والی۔ چڑچڑی بدلحاظ لیکن وہ اس کا اوپری خول تھا۔ دیکھو تو اندر سے کتنی نرم اور محبت کرنے والی ہے۔ بلکہ منزہ کا ماضی۔ ویسی ہاتونی، ویسی ہی معصوم، کتنی گھل مل گئی ہے اپنے بہن بھائیوں سے۔"

"تمہیں منزہ کو بھی بلا لینا چاہیے تھا اس پکنک پہ۔ وہ سوہا کو ہنستے بولتے دیکھ کے خوش ہو جاتی۔"

"لیکن شاید سوہا اسے دیکھ کے خوش نہ ہو پاتی۔ میں سوہا کے اندر جمی برف کو پگھلانا چاہتی ہوں۔ اسے توڑنا نہیں چاہتی۔ برف پگھلنے میں بہت کم وقت لگتا ہے لیکن اس سے پہلے اسے زبردستی منزہ کے گلے باندھنا اسے ماں سے اور متنفر کر دے گا۔"

"لیکن میں دل سے چاہتا ہوں ثنا! کہ اس کا دل ماں کی طرف سے صاف ہو جائے۔ منزہ کی آنکھوں میں اکلوتی اولاد کی نفرت اور بے رخی کا درد سناٹا بن کے ٹھہر گیا ہے، جو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔"

"دھند چھٹے گی جمشید! ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ثنا نے تسلی دی۔

"میرے دل سے یہ بوجھ نہیں جاتا کہ کیریئر بنانے کے چکر میں، روزگار کے بہتر مواقع کے لالچ میں، اولاد کے بہترین مستقبل کی خاطر میں نے کتنی خود غرضی سے کام لیا اور بہن کو ان حالات میں اکیلا زمانے کے تھپیڑے سہنے کے لیے چھوڑ دیا جب اسے ہمارے سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔"

"غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ ہم سے بھی ہوئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ہاں مگر غلطی کا احساس اتنی دیر سے ہو کہ ازالے کی مہلت بھی نہ ملے۔ وہ افسوسناک ہے۔ ہمارے پاس تو ازالے کی گنجائش بھی ہے اور تلافی کا راستہ بھی۔"

اس نے مسکراتے ہوئے سامنے دیکھا جہاں فارم ہاؤس کے سبزہ زار پہ سوہا اس کے صبیح، نشاط اور مہک کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اب تو آپ کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں؟ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے اور وہ بھی کسی دوسرے کی زبانی نہیں۔ بلکہ خود وصی نے میرے سامنے یہ اعتراف کیا ہے۔ اب یہ مت کہیے گا کہ آپ کو ابھی بھی یقین نہیں آ رہا۔"

وشمہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

منزہ کی حالت ایسی تھی جیسے سارے بدن سے کسی نے لہو نچوڑ لیا ہو۔

"پتا نہیں کس بات کا بدلہ لیا ہے سوہا آپی نے مجھ سے۔ میں نے تو کبھی ان کے ساتھ کچھ برا نہیں کیا۔ کبھی برا نہیں چاہا۔ پتا نہیں ماما! کیوں کیا انہوں نے ایسا؟"

منزہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

وشمہ اس معاملے میں سچی تھی۔ اس نے کبھی سوہا کے بارے میں کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ منزہ کس منہ سے بتاتی کہ سوہا نے یہ دشمنی اس کے ساتھ نہیں، اپنی ماں کے ساتھ نکالی ہے۔

"آپ ابھی ان سے بات کریں۔ ان سے پوچھیں۔"

وشمہ نے اسے جھنجوڑا۔

"ہاں..... میں....." منزہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "میں..... ابھی کرتی ہوں بات۔"

مگر اس کے کھوکھلے لہجے سے اس کے ارادے کا بھربھرا پن ظاہر تھا۔

"میرے سامنے بات کریں، انہیں یہاں بلائیں۔"

وشمہ سخت مضطرب ہو رہی تھی۔ بس نہ چل رہا تھا کہ ابھی سوہا سامنے آجائے اور وہ اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کے سارے حساب کتاب کر لے۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اسے یہاں کیسے بلا سکتی ہوں میں؟ سب کو پتا چل جائے گا۔"

"سب کون۔۔۔؟ گھر میں اور کون ہے میرے اور آپ کے علاوہ؟ پاپا تو ہیں نہیں۔ آپ صاف صاف بات کرنے کے لیے انہیں یہاں بلائیں۔"

"وہ نہیں آئے گی وشمہ! بالکل نہیں آئے گی۔"

"تو اٹھیں میرے ساتھ چلیں۔ ہم خود جاتے ہیں اس کے گھر۔ ذرا اس کی آوارہ چچی کو بھی چار باتیں سنا کے آئیں جس کی شہ پہ وہ یہ گل کھلا رہی ہے۔ اسی سے سیکھے ہیں اس نے دوسروں کے شوہر ہتھیانے کے گر۔۔۔"

وشمہ کے زہر میں بجھے الفاظ منزہ کو ان سب تکلیف دہ الفاظ سے کہیں زیادہ شدت سے دردناک محسوس ہوئے جو وہ اب تک سوہا کے بارے میں بہت سے اجنبی لوگوں سے سنتی آئی تھی۔

"وہ اس آوارہ عورت کے زیر تربیت صرف اس لیے رہی وشمہ! کہ تمہیں میری تربیت اور توجہ مل سکے۔"

منزہ نے اسے کچھ یاد دلانا چاہا' مگر وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ بدلحاظی اور زبان درازی کے یہ نئے اسباق بھی اسے خود منزہ نے ہی تو سکھائے تھے۔

"یعنی آپ کا بھی یہ ماننا ہے کہ وہ اس معاملے میں حق بجانب ہے۔ چونکہ میں نے اس کی ماں کی محبت پالی۔ اس لیے اسے پورا حق ہے کہ وہ میرے شوہر پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے۔ آپ اس کا ساتھ دیں گی؟"

"میں کسی کا ساتھ نہیں دے رہی میں تو صرف۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ اچھا ہوا آپ نے فیصلہ سنا دیا کہ آپ کسی کا ساتھ نہیں دے رہیں۔"

وشمہ نے منزہ کی بات درمیان میں سے اچک لی۔

"نہ اس کا۔۔۔ نہ میرا لیکن آپ کو پتا ہے۔ میرا ساتھ نہ دینے کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ درپردہ اپنی بیٹی کا ساتھ دے رہی ہیں۔"

منزہ کو لگا آج سالوں بعد شمشاد بیگم اس کے سامنے کھڑی ہیں۔

"تمہاری بیٹی۔۔۔ تمہاری بیٹی۔"

وہ بے یقینی سے اپنے مقابل تن کے کھڑی وشمہ کو دیکھنے لگی۔ یہ وہ وشمہ نہیں تھی جس کی آنکھوں سے پلکوں کی جھالر شاذ و نادر ہی اٹھا کرتی تھی۔

اب تو ان آنکھوں میں شرارے لپکے مارا کرتے تھے۔

وہ وشمہ۔۔۔ جس کے لب میٹھے بولوں کے شہد ٹپکایا کرتے تھے' اسے منزہ نے ہی زہر میں بجھے تیر نشانے پہ لگانا سکھائے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ یہ نشانہ اس پہ بھی تاک سکتی ہے۔

"میری بیٹی تو تم بھی ہو کیا تمہیں بھی یقین دلانا پڑے گا۔"

اس کے ٹوٹے کرلاتے لہجے پہ وشمہ کی تندی ذرا کی ذرا ماند پڑی۔

"ہاں۔۔۔ ہوں میں آپ کی بیٹی۔۔۔ ماں سمجھتی ہوں آپ کو اور اسی حق سے کہہ رہی ہوں کہ ایک بیٹی کی ماں ہونے کا فرض نبھائیں۔ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا حساب لیں۔ کیوں پیچھے ہٹ رہی ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہے میں سوہا سے بات کروں گی۔"

وہ جانتی تھی کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ مگر پھر بھی اس نے ہامی بھر لی۔

"بات کریں گی نہیں۔۔۔ بات کریں۔۔۔ میرے سامنے۔"

اس کے زور دینے پہ منزہ بھی تڑخ سی گئی۔

"تمہیں میرے کہے کا اعتبار نہیں ہے؟"

"آپ کا ہے۔۔۔ مگر سوہا کا نہیں۔"

پہلی بار اس نے سوہا کا نام بغیر القاب کے ادا کیا۔

گویا اپنے اور اس کے رشتے اور تعلق کے درمیان ایک حد بندی قائم کر دی۔

"ذرا مجھے بھی تو پتا چلے ان کا مؤقف کیا ہے۔ آپ نمبر ملائیں اس کا۔"

اس نے فون منزہ کے آگے دھرا۔

منزہ بے چارگی سے ایک گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

❖ ❖ ❖ ❖

ربنا کی گود میں سر رکھ کے لیٹے وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ ایسی مسکراہٹ ربنا اس کے لبوں پہ تب دیکھ پاتی تھی ب وصی اس کے پاس ہوتا۔ یا مل کے جاتا۔۔۔ مگر دو دن ہوئے وصی بھی آفس کی مصروفیات اور کچھ گھر کی ٹینشن ،وجہ سے آ نہ سکا تھا۔ ربنا کو تشویش تھی کہ اس وجہ سے سوہا پھر سے منفی سوچوں کا شکار نہ بن جائے۔ اس لیے ، نے دل پہ پتھر رکھ کے اسے ماموں' ممانی کے ساتھ پورے دن کے لیے جانے کی اجازت دے دی۔ یہ خدشہ ظر رکھتے ہوئے بھی کہ وہاں ان کے ساتھ منزہ بھی ہو سکتی ہے۔ سوہا کی برین واشنگ کرنے کے لیے۔۔۔ لیکن سوہا ھیان بٹانے کے لیے اور اسے ڈپریشن اور ٹینشن سے دور رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔

اور ربنا کا اندازہ درست تھا۔۔۔ اس پورے دن کی پکنک کے اثرات اس کے مزاج پر بڑے اچھے مرتب ہوئے ے۔ لیکن اس کی حد سے بڑھی خوشی اور طمانیت ربنا کے اندازوں سے بڑھ کے تھی۔

"بہت خوش نظر آ رہی ہو۔۔۔ ایسا بھی کیا دے دیا ہے تمہارے ماموں' ممانی نے تمہیں؟"

ربنا کے لہجے میں تجسس کے ساتھ حسد اور رشک بھی جھلک رہا تھا۔

"وہ۔۔۔ جو اب تک کسی نے نہیں دیا۔"

"کیا؟" وہ چونکی۔

"اعتماد۔۔۔" وہ ربنا کو دیکھ کے مسکرائی۔ "آپ نے مجھے جی بھر کے محبت دی۔۔۔ پھر آسائش دی' میرے منہ سے کلنے والی بات کو مکمل ہونے سے پہلے پورا کیا۔ لیکن ماما! آپ کی یہ بے پناہ محبت بھی مجھے۔۔۔ میری ذات کو وہ اعتماد یں دے سکی' جو اس ایک دن کی قربت نے دیا ہے۔ وہ مجھے اس لیے پیار نہیں دے رہے تھے کہ انہیں میری۔۔۔ مجھے ان کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے اس لیے بھی توجہ نہیں دے رہے تھے کہ میرا ان سے کوئی خون کا رشتہ ہے۔ وئی ایسا احساس نہیں دلایا جا رہا تھا' جس سے لگے کہ یہ محبت' یہ عنایت۔۔۔ یہ اپنائیت' کسی وجہ سے ہے۔۔۔ سب چھ بغیر وجہ کے تھا۔۔۔ بالکل نارمل۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ میں ایک نارمل لڑکی ہوں۔۔۔ ایک نارمل زندگی جی تی ہوں۔۔۔ آپ ہوں۔۔۔ وصی ہو۔۔۔ یا تقدیس جیسی کوئی دوست۔۔۔ سب کی محبت سب کی توجہ ایک ڈر' ایک ف کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔۔۔ مجھے آج پتا چلا ماما! کھل کے جینا کیا ہوتا ہے۔"

اپنی دھن میں وہ ربنا کے بہتے آنسو بھی نہ دیکھ سکی۔

"اور میں اس گمان میں تھی کہ میں نے تمہیں سب کچھ دیا ہے۔ وہ سب جو ایک ماں اپنی اولاد کو دے سکتی ہے۔"

ربنا کے آنسو دیکھ کے سوہا ندامت کے گہرے احساس سے شرابور ہو گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس کے رے سے آنسو صاف کیے۔۔۔ دوسرے سے اس کا ہاتھ تھام کے لبوں تک لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟ آپ نے مجھے وہ سب دیا جو آپ کے بس میں تھا۔۔۔ مگر جو آپ کے پاس خود نہیں وہ آپ مجھے کیسے دے سکتی تھیں۔ یہ رشتے۔۔۔ یہ اعتبار بھرا ماحول۔۔۔ جو آپ کو نہیں ملا۔ آپ کہاں سے لاتیں رے لیے۔۔۔ پتا ہے جب میں ہائی اسکول میں تھی۔۔۔ تب لڑکیوں کے پاس ماموؤں۔۔۔ خالاؤں اور کزنز کے علاوہ

کوئی موضوع ہی نہیں ہوتا تھا بات کرنے کے لیے۔ اور میں ٹکر ٹکر سب کے منہ دیکھا کرتی تھی۔ کل اپنے کزنز کے ساتھ ٹائم پاس کرنے کے بعد مجھے پتا چلا میں نے اپنی ٹین ایج میں اور اپنے بچپن میں کیا چیز مس کی تھی۔۔۔ دل چاہ رہا ہے' پرانے دن لوٹ آئیں اور میں ان میں وہ سارے رنگ بھردوں' بے خودی کے' اپنائیت کے۔ اعتماد کے۔ ان رنگوں کے بغیر میرے بچپن کی البم کتنی ادھوری' کتنی پھیکی ہے۔"

"پرانے دِنوں میں رنگ بھرنے کی فکر چھوڑو۔۔۔ اپنے آنے والے دِنوں کی فکر کرو۔ وصی کو صبح سے ایک بھی فون کیا تم نے؟"

وصی کے ذکر پہ سوہا کی مسکراہٹ بجھ گئی۔

"نہیں۔۔۔ دل نہیں چاہ رہا۔"

"کوئی ناراضی؟ کوئی جھگڑا؟"

"نہیں۔۔۔ میں اس سے ناراض ہو ہی نہیں سکتی۔ ماما! اس کی زندگی میں پہلے کیا کم مشکلیں ہیں' جو میں اپنی ناراضی اس پہ تھوپ کر اسے مزید پریشان کروں۔ میں تو اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کی پریشانیاں کم کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن ڈر جاتی ہوں کہ کہیں اس کی ساری پریشانیوں کی وجہ میں ہی تو نہیں۔"

"اس کی زندگی میں خوشیاں لانے کے لیے تمہارا اس کی زندگی میں شامل ہونا بہت ضروری ہے۔"

"اور میرے اس کی زندگی میں شامل ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کی زندگی میں مجھ سے پہلے موجود سب لوگ نکل جائیں۔ ورنہ وہ میرا وجود برداشت نہیں کر سکیں گے۔ یہ حقیقت وصی بھی جانتا ہے کہ مجھے اپنانے کے لیے اسے بہت سے اپنوں کو غیر بنانا ہوگا۔ اور اس کا حوصلہ وہ کر نہیں پا رہا۔"

"اسے مجبور کرو۔"

"وہی بات میں نے کہا نا۔ ! میں اس کی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی۔ نہیں ڈالنا چاہتی اس پہ کسی قسم کا کوئی دباؤ۔ میں اسے وقت دے رہی ہوں۔ مہلت دے رہی ہوں۔ یہی ہے میرے پاس دینے کے لیے۔۔۔ شاید یہ وقت' یہ مہلت اسے بہتر فیصلہ کرنے میں مدد دے۔"

"مگر اس طرح اس سے کٹ کر؟"

"میں اس سے الگ نہیں ہوں ماما۔ ! ہمارا رشتہ اب رابطے سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔"

اس نے مسکرا کے رینا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے تسلی دی۔

"کیسے بے فکر ہو جاؤں۔۔۔ ماں ہوں تمہاری' فکر تو رہتی ہے' وصی لاکھ اچھا سہی' اس کی آنکھوں میں سچائی بھی دیکھی ہے میں نے اور تمہارے لیے بے لوث محبت بھی۔۔۔ لیکن وقت کا کیا پتا' کب وہ کمزور پڑ جائے' کب مجبور ہو جائے' اپنے رشتوں کے آگے۔"

"اسی بات سے میں بھی ڈرتی ہوں۔ لیکن اس کا کوئی حل میرے پاس ہے نہیں۔ جیسے کوئی کسی کے دل میں زبردستی اپنی محبت نہیں ڈال سکتا۔ ویسے ہی کسی کے دل سے کسی کی محبت زبردستی نکال بھی نہیں سکتا۔ اس کے دل میں اپنے خاندان کی محبت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ کاش! وہ لوگ دل سے مجھے قبول کرلیں۔ کاش! یہ معجزہ ہو جائے۔"

"آمین۔۔۔" رینا نے صدق دل سے کہا۔

"آخر معجزے بھی تو اسی دنیا میں ہوتے ہیں۔ دیکھنا ایک دن وہ بڑی چاہ سے تمہیں مانگنے آئیں گے اور وصی بڑی شان سے تمہیں بیاہ کرلے جائے گا۔"

سوہا نے مسکرا کے آنکھیں موندلیں۔

شاید وہ رینا کے خواب کو خود دیکھنا چاہتی تھی۔

❁ ❁ ❁ ❁

منزہ نے کسی نہ کسی طرح وشمہ کو ٹال ہی دیا۔ وہ سوہا سے بات ضرور کرنا چاہتی تھی' مگر اس کے سامنے نہیں۔

بہت سوچنے کے بعد اس نے ثنا سے مشورہ کرنے کا سوچا۔ ایک وقت تھا وہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اس سے مشورہ لیا کرتی تھی۔ جب رشتوں پہ اعتماد نہ رہا تو اس نے کسی سے بھی مشورہ لینا ترک کردیا۔ لیکن اب وقت نے ثابت کردیا تھا کہ دوراہے پہ کھڑا انسان جو بھی فیصلہ کرتا ہے وہ اسے چوراہے پہ لا کے نصب کردیتا ہے۔ اس نے سوہا کے بارے میں جو فیصلہ کیا۔ وہ اس کے بدترین نتائج بھی بھگت رہی تھی۔

اس نے وشمہ کے بارے میں جو قدم اٹھایا' اس کا انجام بھی بھگت لیا تھا۔

اب وہ خود پہ اعتماد کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ سو ثنا کی طرف چلی آئی۔

"یہ دیکھو۔۔۔ پکنک کی تصویریں' کتنی پیاری لگ رہی ہے سوہا!"

ثنا نے اسے تصویریں دکھانا چاہیں۔ منزہ نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ کھلتے ہوئے گلابی رنگ کے لباس میں کھلکھلا کے بے فکری سے ہنستی اس لڑکی نے ہمیشہ اولاد بن کے اس کے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالنے کے بجائے مشکلات ہی پیدا کی تھیں۔

"کاش اس کا دل بھی اتنا پیارا ہوتا۔"

اس تبصرے پہ ثنا الجھ سی گئی۔

"تم سے ناراض ضرور ہے وہ۔۔۔ اور اس کے کچھ گلے جائز بھی ہیں' مگر اس کے دل میں کدورت نہیں ہے منزہ۔ ! دیکھو تو ہم سب سے گھل مل گئی تھی۔ وہ تو محبت اور اعتماد کو ترسی ہوئی بچی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اتنی ترسی ہوئی کہ اب دوسرے کی محبتیں چھیننے کے درپے ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس نے ہمیشہ پیدا ہونے کے بعد سے لے کر اب تک میری راہ میں کانٹے ہی بوئے ہیں۔ کوئی سکھ نہیں دیا۔ شروع سے لے کر اب تک میرا وجود اس کی مہربانی کے طفیل سولی پہ ٹنگا رہا ہے۔ اسے ماں کی عزت کرنے کی توفیق ہوئی نہ محبت کرنے۔ نہ ہی میری قربانیوں کا اعتراف کرنے کا حوصلہ یہ خود میں پیدا کرپائی۔ لیکن میرے چند ناکردہ گناہوں کی سزا دینے کا کوئی موقع اس نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔"

"ہوا کیا ہے منزہ۔ ! کھل کے بات کرو۔"

"کتنی کھل کے کروں؟ اپنی ہی بیٹی کے کرتوت کھولتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"کیا؟" ثنا ششدر رہ گئی۔

اتنی بڑی بات۔۔۔ ایسے الفاظ۔۔۔ یہ الزام کوئی ماں بے سبب تو اولاد پہ نہیں دھر سکتی۔

وہ سوچ میں پڑ گئی' کیونکہ اس نے سوہا کے اندر ایک بے حد معصوم اور بے ضرر سی لڑکی کو پایا تھا۔۔۔ اس کا ذہن تسلیم نہیں کررہا تھا کہ ایسی لڑکی جو پیار کے دو میٹھے بول سن کر پگھل سکتی ہے' وہ کسی کے لیے اتنے آزار کا سبب بھی بن سکتی ہے اور وہ بھی سگی ماں کے لیے۔

منزہ نے مناسب قطع برید کے ساتھ وشمہ کی ساری شکایت اسے بتادی۔

ثنا سوچ میں پڑ گئی۔

"اب مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔؟ وشمہ کا کہنا ہے کہ میں سوہا سے بات کروں۔ وہ میری ہچکچاہٹ کو جانبداری ٹھہرا رہی ہے' جبکہ خدا گواہ ہے میری ہچکچاہٹ کے پیچھے یہ خوف ہے کہ وہ جو میری ذات کو ذرے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ میری بات کو کیا اہمیت دے گی۔"

"تم اس سے بات کرنا بھی مت۔ میں خود کرلوں گی۔"

"نہیں۔۔۔ ورنہ وہ آپ لوگوں سے بھی متنفر ہو جائے گی۔"

"کیوں ہوگی؟ میں اس کے بھلے کی بات کروں گی۔۔۔ اسے آنے والے خطرے سے آگاہ کروں گی۔ وہ عاقل'

بالغ، باشعور لڑکی ہے۔ کیا اسے اتنی بھی سمجھ نہیں ہوگی کہ کیا بات اس کے لیے نقصان دہ ہے اور کیا فائدہ مند۔۔۔ کون اس کے ساتھ مخلص ہے اور کون نہیں۔"

"اسے اتنی عقل ہوتی تو اس کے دل میں میرے لیے نفرت نہ ہوتی۔"

"یہ نفرت نہیں ہے منزہ! یہ احتجاج ہے۔۔۔ ایک چند ماہ کے بچے کو بھی ماں گود سے اتار کے بستر پر لٹاتی ہے تو وہ احتجاج کے طور پر چلاتا ضرور ہے۔۔۔ ہاتھ پیر پٹخ کے روتا بھی ہے۔ تب تک، جب تک ماں دوبارہ گلے سے نہ لگالے۔ تم نے تو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش سے محروم کیا تھا۔ چاہے مجبوراً ہی سہی۔۔۔ چاہے دل پہ پتھر رکھ کے ہی سہی۔۔۔ اس احتجاج کو بھی تم ایسی ہی کوئی مجبوری سمجھ لو۔"

☼ ☼ ☼

"وصی۔۔۔ بیٹا کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو؟"

بڑے دنوں بعد وہ وقت پہ گھر آیا تھا۔

پروین نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا۔۔۔ وہ چپ رہا۔

"نئی نئی شادی ہوئی ہے تمہاری۔۔۔ ایسے دنوں میں چہرے پہ نکھار آتا ہے۔۔۔ تمہارے چہرے کی تو رونق روٹھ گئی ہے۔ ہنسنا، بولنا بھول گئے ہو۔۔۔ دل کڑھتا ہے تمہیں دیکھ دیکھ کر۔"

"امی۔۔۔! میں۔۔۔ میں بھی ہنسنا چاہتا ہوں۔۔۔ کھل کے سانس لینا چاہتا ہوں۔ خوش رہنا چاہتا ہوں مگر۔۔۔"

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ کیا؟"

"مگر اس کے ہمراہ۔۔۔ جس کی ہمراہی کے میں نے خواب دیکھے ہیں۔"

"پھر وہی ضد۔۔۔" وہ زچ ہوا اٹھیں۔

"تم اچھے بھلے سمجھ دار ہو۔ پھر مان کیوں نہیں لیتے کہ یہ ناممکن ہے۔"

"کیا صرف اسی لیے کہ اس کی پرورش ایک شریف عورت نے نہیں کی۔۔۔ صرف اس لیے کہ اس کے دامن پہ چند ایسے چھینٹے ہیں، جو اس کے کردار کی کجی کی وجہ سے یا کسی گمراہی کی وجہ سے نہیں، بلکہ صرف اس کی لاپروائی اور اپنی ذات سے عدم دلچسپی کی وجہ سے ہوئے۔۔۔ ورنہ وہ بہت اچھی ہے۔ کم از کم وشمہ سے تو بہت اچھی۔۔۔ جس نے ایک شریف عورت کی گود میں پرورش پائی۔۔۔ سات پردوں اور چار دیواری کے اندر پلی بڑھی۔۔۔ مجھے اس کی آنکھ میں وہ لحاظ اور وہ مروّت نہیں ملتا جو سوہا کی آنکھوں میں ہے۔"

"بات صرف اتنی نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ سب سے پہلے سوہا کو مسترد کرنے کی وجہ یہ تھی۔۔۔ لیکن ایسا تو اکثر ہوتا ہے۔ عموماً ماں، باپ کو اولاد کی پسند سے اختلاف ہوتا ہی ہے۔ اعتراض کی بھی کوئی نہ کوئی گنجائش نکل آتی ہے، مگر جو ڈٹ جاتے ہیں وہ بالآخر منوا لیتے ہیں۔ تم نے بھی تو فوراً ہی پسپائی اختیار کرلی تھی۔۔۔ ہم سمجھے کہ تمہیں بھی کوئی خاص خواہش نہیں ہے۔ وشمہ کے معاملے میں مجھے غلط فہمی ضرور ہوئی۔۔۔ کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔۔۔ لیکن یہ بھی تو مانتے ہو کہ تم پہ اس سلسلے میں کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ وہ میری بھانجی ہے، مگر میں نے زبردستی اسے تمہارے سر پہ نہیں تھوپا۔۔۔ تم ایک بار انکار کرتے۔۔۔ کوئی اعتراض کرتے اور ہم لوگ پھر بھی تمہیں اس سے شادی پہ مجبور کرتے، تب تمہارا یہ روّیہ جائز تھا، لیکن وصی! تم ہمیں اور وشمہ کو اس گناہ کی سزا دے رہے ہو جو ہم نے کیا ہی نہیں۔"

دروازے کے اس جانب کھڑی وشمہ اس نیت سے ٹوہ لینے آئی تھی کہ اس کے خلاف وصی کے کان بھرتے ہوئے اپنی پھوپھو کو رنگے ہاتھوں پکڑے گی اور خوب خوب شرمندہ کرے گی، مگر وہ تو اپنے ساتھ ساتھ اس کا مقدمہ بھی لڑ رہی تھیں۔

"میں مانتا ہوں میں غلط ہوں۔ مگر آپ بھی تو مانیں کہ میں مجبور ہوں۔"

"کوئی مجبوری اتنی بڑی نہیں ہوتی جو انسان کو کسی دوسرے انسان۔۔۔ خصوصاً خود سے وابستہ انسان کو دکھ دینے پہ اکسائے۔"

"مجھے وشمہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس ہے، مگر اسے کس نے کہا تھا کہ ہماری محبت کی من گھڑت باتیں پھیلائے۔"

"اس نے کوئی باتیں نہیں پھیلائیں۔۔۔ کوئی لڑکی ایسا کر ہی کیسے سکتی ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری جانب سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔۔۔ یا اس نے محض اپنی یک طرفہ پسندیدگی کا اظہار کیا ہو اپنی ماں سے۔۔۔ بیٹیاں، ماؤں کو اپنی پسند بتلایا ہی کرتی ہیں، مگر منزہ یہ سمجھی ہو کہ تم دونوں کے درمیان کچھ ہے۔ جو بھی ہوا۔۔۔ غلط فہمی کی بنا پہ۔۔۔ لیکن کسی نے کسی کو بندوق دکھا کے شادی پہ مجبور نہیں کیا۔۔۔ وہ اپنی خوشی سے تمہاری زندگی میں آئی۔۔۔ تم اسے خوشی سے بیاہ کر لائے۔۔۔ اب یہ کیا ڈرامہ ہے۔۔۔ شادی کے بعد ہی تمہارا عشق کیوں زور پکڑا؟"

"یہ بات میں آپ کو نہیں سمجھا سکتا۔"

وہ پروین کی جرح کے سامنے لاجواب تھا۔

"تمہیں اس وقت صرف اپنے دل کو سمجھانے کی ضرورت ہے وصی۔! وشمہ بن ماں کی بچی ہے۔۔۔ اس نے زندگی میں کوئی خوشی جھولی بھر کے نہیں پائی۔۔۔ اسے اپنی محبت سے محروم نہ کرو۔"

باہر کھڑی وشمہ کی پلکیں پروین کے لجاجت آمیز لہجے پہ بھیگ گئیں۔

"سوہا نے بھی بہت سی محرومیاں دیکھی ہیں ممانی۔! وہ بھی خوشیوں کے ہنڈولے پہ بیٹھی مزے نہیں لوٹ رہی۔۔۔ میں اسے کیسے ایک اور دکھ دے دوں۔"

"کیا وہ وشمہ پہ سوتن بن کے آنا چاہتی ہے؟"

اس سوال نے وشمہ کو اندر سے کچل کے رکھ دیا۔

"نہیں۔۔۔ سوہا آپ کے اندازوں سے بہت مختلف لڑکی ہے۔۔۔ اگرچہ وشمہ نے دانستہ نادانستہ اس سے زندگی بھر کچھ نہ کچھ چھینا ہی ہے، پھر بھی وہ اسے اس مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

"یعنی وہ تم دونوں کے درمیان سے نکلنے کو راضی ہے؟"

پروین نے امید سے پوچھا۔۔۔ مگر وصی کا جواب مایوس کن تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں نے وشمہ کو اپنے اور سوہا کے درمیان سے نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

وشمہ تو کھڑے کھڑے جی جان سے لرز گئی۔۔۔ پروین بھی ایک ساعت کے لیے سکتے میں آگئیں۔

"وصی۔۔۔! تم اس حد تک جاسکتے ہو؟"

"پتا نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ میں کچھ طے نہیں کرپا رہا۔" اپنے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑے وہ حد درجہ بے بس نظر آرہا تھا۔

پروین کو یک بارگی اس پہ ترس سا آنے لگا، لیکن جانتی تھیں، اس موقع پر نرمی جتانے کا مطلب اسے دلیر کرنا ہے۔ ابھی اس نے صرف فیصلہ کیا ہے۔۔۔ اس فیصلے پہ عملدر آمد کرنے کا حوصلہ نہیں کرپا رہا۔۔۔ اور وہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"جانتے ہو تم کتنی بڑی غلطی کرنے جارہے ہو۔ یہ جو تمہاری حالت ہے نا وصی۔! صرف اس لیے ہے کہ تم نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا۔۔۔ اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے اور آج تم نادانستگی میں وشمہ کے اور ہم سب کے ساتھ یہی کر رہے ہو۔۔۔ ندامت کا یہ بوجھ تمہیں کھل کے جینے نہیں دے رہا۔ نہ تم راتوں کو سو پا رہے ہو، نہ کھانا ڈھنگ سے کھا رہے ہو۔ فرض کرو، اگر تم نے دل کے بے لگام ہونے پہ وشمہ کو طلاق دے بھی دی تو کیا تم خوش رہ پاؤ گے، سوہا کے ساتھ؟ کبھی بھی نہیں۔۔۔ میں نے تمہیں پالا ہے وصی۔! مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی نہیں جانتا۔۔۔ تم ایک معصوم بے قصور لڑکی کے ماتھے پہ داغ لگانے کے بعد مطمئن نہیں رہو گے۔ اور ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔۔۔ سوہا کے اور تمہارے درمیان جو رشتہ ہے وہ کتنا بھی پر خلوص اور سچا کیوں نہ ہو، ہے تو ناپائیدار اور

شرعی و قانونی لحاظ سے کمزور اور بودا۔۔۔ تم دونوں کے راستے الگ ہو بھی گئے تو چند ہی دنوں۔۔۔ مہینوں۔۔۔ یا شاید سال بھر میں، تم بھی بیوی، بچوں میں مگن ہو کر اس درد کو بھلا دو گے۔۔۔ اسے بھی کوئی نہ کوئی نیا زندگی کا ساتھی مل جائے گا۔ لیکن طلاق کے داغ کے بعد ہمارے معاشرے میں لڑکی کے لیے کتنے راستے کھلے ہیں، ان سے تم بھی واقف ہو۔۔۔ اس لیے وصی ایسا کچھ نہ کرنا، جس کے نتیجے میں تمہیں ساری عمر اپنا پیچھا کرتی بددعاؤں سے بچ کر بھاگتے رہنا پڑے گا۔"

وشمہ کے پیر شل ہو گئے، کاندھے ندامت کے بوجھ سے جھک گئے تو وہاں سے ہٹ گئی۔

❖ ❖ ❖ ❖

وہ کافی دنوں کے بعد میکے آئی تھی۔

خرم کے ردِ عمل سے ہر دم اتنی خائف رہتی تھی کہ پاس سے گزرتی ہوا سے بھی بچ کر سمٹ جانے کی کوشش کرتی۔۔۔ کہ نجانے اس پہ بھی کوئی اعتراض نہ ہو جائے۔۔۔ مگر مدیحہ خود اسے لینے آئیں اور رخشندہ نے بھی شفقت سے کہا کہ بہت دنوں سے وہ میکے نہیں گئی۔۔۔ ماں خود لینے آئی ہے تو انکار نہ کرے۔۔۔ وہ خرم کی جانب اجازت طلب انداز میں دیکھنے لگی۔

خرم اندر ہی اندر جز بز ہو رہا تھا، مگر ماں اور ساس دونوں کی موجودگی کے لحاظ کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"اسے کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔ وہ تو یہی کہے گا کہ کیا ضرورت ہے جانے کی۔"

ماں کے اس درست اندازے پہ خرم نے گڑبڑا کے انہیں دیکھا۔ پھر خشمگیں نگاہوں سے تقدیس کو۔۔۔ کہ شاید وہ اس کی ساری باتیں جا کے بتلاتی ہے۔

"یہ عادت ان سب بھائیوں کو ہے۔۔۔ کیا خرم۔۔۔ کیا حسن، کیا وصی۔۔۔ اپنے باپ، چچا پہ پڑے ہیں۔"

وہ ہلکے پھلکے انداز میں ہنس کے بتانے لگیں۔

مدیحہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

"سب ہی مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔۔۔ مجھے دیکھیں۔۔۔ دو بیٹیاں بیاہ چکی ہوں۔ ابھی بھی میکے جانے کے لیے ان کے پاپا سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ پتا نہیں یہ مرد اکیلے رہنے سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں۔"

"اکیلے رہنے سے نہیں۔۔۔ بیویوں کو اکیلا چھوڑنے سے۔" خرم سوچ کے رہ گیا۔

"جاؤ تقدیس! جا کے تیار ہو جاؤ۔۔۔ بے شک ایک رات رہ لینا۔۔۔ کل خرم لے آئے گا۔"

"لیکن امی!" خرم نے احتجاج کرنا چاہا۔

"خرم۔۔۔" انہوں نے نرم انداز میں تنبیہہ کی۔۔۔ بعد میں مدیحہ اور تقدیس کے جانے کے بعد رسان سے سمجھایا۔

"تین، تین بہنوں کے اکلوتے بھائی ہو۔۔۔ میرے بعد میکے کا مان تم ہی بھائی، بھاوج نے رکھنا ہے۔۔۔ بیوی کو میکے جانے سے روکو گے۔۔۔ جا بے جا پابندیاں لگاؤ گے تو کل کو اپنی بہنوں کو کس منہ سے میکے آنے کا بلاوا دو گے۔۔۔؟ تقدیس کس دل سے انہیں قبول کرے گی۔۔۔ نہیں بیٹا! ایسا نہیں کرتے۔۔۔ وہ بھی کسی کی بیٹی ہے۔۔۔ کسی کی بہن ہے۔۔۔ جیسے ہم نے بیٹیاں بیاہ کر بھی ان کا راستہ تکنا نہیں چھوڑا۔ ایسے ہی وہ بھی ترستے ہوں گے۔ اس کی صورت دیکھنے کے لیے۔"

"پتا نہیں اور کون کون ترستا ہو گا اس کے لیے اور کتنا ترستی ہے وہ کسی کے لیے جو فون کر کے اس کو مدد کے لیے بلاتی ہے۔" وہ کڑھ کے رہ گیا۔

اور تقدیس اس کے کہے بغیر یہ سب جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہو گا۔ کیا کیا اندازے اور مفروضے قائم کر رہا ہو گا اس کے بارے میں۔ لیکن اس کے اندر اتنی گھٹن ہو رہی تھی کہ کچھ دیر کے لیے سب کچھ بھلا کے اس نے جانے

کا فیصلہ کر لیا اور کچھ نہیں تو کم از کم چوبیس گھنٹے کے لیے ہی کھل کے سانس لینے کا موقع تو ملے لیکن اس کی رہی سہی سانسیں بھی اٹک کے رہ گئیں، جب اس نے وہی جانا پہچانا سا ماحول وہی شناسا سی کشیدگی اپنے ماں اور باپ کے درمیان موجود پائی۔ جو وہ بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی۔ مگر اب خود پہ پڑی افتاد کے باعث وقتی طور پہ فراموش کر بیٹھی تھی۔

"اسی لیے لائی ہوں میں تمہیں اور تحریم کو بھی بلایا ہے تاکہ بیاہی بیٹیوں کو سامنے دیکھ کے کچھ شرم کر لے بارا باپ۔ جسے بڑھاپے میں ایک بار پھر عشق کا بخار چڑھا ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے امی آپ کو۔۔۔؟"

تحریم نے تو باقاعدہ ناپسندیدگی جتائی۔

"تم نہیں جانتیں۔ میں کب سے اس شخص کے بدلتے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔ بیٹیاں بیاہ کے بجائے ذمہ دار ہونے کے یہ اور لاپرواہ ہو گیا۔ جیسے بھول ہی گیا کہ ابھی تطہیر گھر بیٹھی ہے۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ یہ رنگین مزاجیاں تم دونوں کی زندگی میں کیا زہر گھول سکتی ہیں۔ داماموں کے سامنے کیا منہ لے کر جائے گا۔ کسی بات کا احساس نہیں رہا۔"

وہ رونا دھونا شروع کر چکی تھیں اور تقدیس بے حس و بے حرکت بیٹھی بے تاثر چہرے کے ساتھ سب دیکھ رہی تھی۔ سن رہی تھی۔ تحریم نے مدد طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپی سمجھاؤ ناں ماما کو۔"

تطہیر نے بھی اسے شانے سے ہلایا۔

ہمیشہ وہی تھی جو ایسے موقعوں پہ مدیحہ کی آگ کسی نہ کسی حد تک ٹھنڈی کر دیا کرتی تھی۔ مگر وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔

❖ ❖ ❖

"آپ اتنا خوش کیسے رہ لیتی ہیں ممانی؟"

سوہا نے بڑے رشک اور حیرت سے ثنا کے چمکتے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔

"اس لیے کہ میں سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"سب کو خوش رکھنا تو بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔۔۔ آپ کیسے کر لیتی ہیں یہ؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ میں سب کو خوش کر لیتی ہوں۔ میں نے صرف خوش کرنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے اور کوششیں کبھی کامیاب ہوتی ہیں، کبھی ناکام لیکن مجھے یہ اطمینان تو رہتا ہے کہ میں نے دانستہ کسی کو ناخوش نہیں کیا بلکہ اپنی جانب سے خوشی دینے کی کوشش ہی کی ہے۔"

"لیکن یہ کوشش کبھی کبھی آپ کو مہنگی بھی پڑتی ہو گی؟"

"خوشیاں تو ہوتی ہی مہنگی ہیں۔ چاہے اپنے لیے خریدو چاہے کسی دوسرے کے لیے۔"

سوہا کچھ سوچنے لگی۔

"کہاں گم ہو گئیں؟"

"میں بھی کسی کو خوشی دینا چاہتی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کیسے دوں؟"

"وہ خوشی کوئی خاص ہے۔۔۔؟ یا پھر کسی کو بھی دینا چاہتی ہو یہ خوشی؟"

ثنا نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

ثنا کے ساتھ ہر موضوع پہ بے تکلف بات کرنے والی سوہا نجانے کیوں جھینپ سی گئی۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

وہ کنی کترانے لگی مگر ثنا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔

"تمہاری چچی۔ میرا مطلب ہے تمہاری ماما نے نہیں تمہارے رشتے کی بات وغیرہ چلائی؟"

"نہیں۔۔۔" وہ سر جھکا کے ناخن سے میز کریدنے لگی۔

"تمہاری اپنی کوئی انوالومنٹ؟"

ثنا نے محتاط الفاظ میں پوچھا۔

"آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"مجھے ٹوہ لینے کی عادت نہیں ہے نہ کسی کو کریدنے کی نہ ہی کسی کے ذاتی معاملات میں داخل دینے کی۔ اسی لیے میرے اس سوال کے پیچھے ایسا کوئی مقصد نہیں ہے۔ دراصل تمہاری شادی کی عمر تو ہوگئی ہے اور ایسے موقعوں پر صرف مائیں ہی نہیں، ممانیاں، چچیاں، خالائیں سب متحرک ہو جاتی ہیں۔ میں نے سوچا اگر تم بک نہیں ہو تو میں بھی ارد گرد نظر دوڑاؤں۔"

"نہیں پلیز۔ اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بے تحاشا گھبرا گئی۔

"شاید میرا اندازہ درست ہے۔ کوئی ہے، جو یہ جگہ لے چکا ہے۔"

وہ سر جھکا کے رہ گئی۔ اس صورت حال کا تو سوچا ہی نہیں تھا۔

"کوئی کلاس فیلو؟"

"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔" سوہا ہاتھ مسلنے لگی۔ ثنا کی اپنائیت اور دوستانہ پن اسے کھلنے پہ مجبور بھی کر رہا تھا مگر یہ عجیب سی جھجک بھی گھیر رہی تھی، جس کا سامنا اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

"نام کیا ہے اس کا؟"

ثنا نے ایک اور مشکل آسان کی اور اگلے مرحلے پہ آگئی۔

"نام۔۔۔ وصی۔۔۔"

"کیا کرتا ہے؟"

سوہا کچھ اور کھلی۔ مزید تفصیل بتائی۔

"ہوں۔۔۔ لگتا تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ انتظار کس بات کا ہے۔ وہ بھی اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔ تم نے بھی فائنل ایر کے ایگزامز دے دیے ہیں۔ آگے پڑھنے میں انٹرسٹڈ نہیں ہو۔ میرا خیال ہے اسے اب رشتہ بھیج دینا چاہیے۔"

سوہا چپ رہی۔۔۔ ایک داستان اس کے نقش نقش سے بول رہی تھی مگر ثنا اس کی زبانی سننا چاہتی تھی۔

"کیا ہوا سوہا! بتاؤ؟"

"کچھ نہیں۔" اس گریز کے پیچھے ایک تکرار تھی کہ پوچھو۔ پوچھو مجھ سے۔ میں یہ درد یہ بوجھ اکیلے ڈھوتے ڈھوتے تھک گئی ہوں۔

ثنا نے ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ کے پیار بھرا دباؤ ڈالا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی چھو کر اٹھائی۔

"مجھے اپنی دوست سمجھو سوہا!"

اور اسی ایک رشتے کی آج کل سوہا کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

دوست کی۔۔۔ ہمراز کی۔۔۔

"اس عورت نے میری زندگی عذاب بنا کے رکھ دی ہے۔"

جعفر محمود تنتناتے ہوئے یہاں سے وہاں چکر کاٹ رہے تھے جو کچھ مدیحہ کر رہی تھیں وہ نیا نہیں تھا۔ سالوں سے وہ یہ سب کبھی برداشت کرتے تو کبھی بھڑاس نکال کر نمٹتے آرہے تھے لیکن جو سبکی آج محسوس ہو رہی تھی وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

ان ہی بچیوں کے سامنے دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پہ طعنہ زنی کرتے، الزام تراشیاں کرتے رہے تھے لیکن آج وہ بچیاں اپنے گھر کی تھیں۔ شادی شدہ تھیں۔ ان کے سامنے اپنا آپ ہلکا ہوتے دیکھنا انتہائی ناقابل برداشت تھا۔

"میں نے یا تم نے۔۔۔؟ یہ تم ہو جس کی وجہ سے میں پچھلے تیس سالوں سے جہنم میں جل رہی ہوں۔"

"یہ جہنم تمہارا اپنا دہکایا ہوا ہے۔ تمہارے اپنے شک اور وسوسوں کی آگ ہے جو تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی بھسم کر رہی ہے۔"

"تم اور بھسم۔۔۔ لالیاں ٹپک رہی ہیں چہرے سے۔ عمر آگے کے بجائے پیچھے جا رہی ہے۔ نہ شوخیاں کم ہو رہی ہیں نہ چونچال پن اور ایک میں ہوں وقت سے پہلے بڑھاپا مسلط کر دیا تم نے مجھ پہ۔۔۔ تمہاری رکھوالی کرتے کرتے میرے سر کے سارے بال سفید ہوگئے۔ جھریوں سے بھر گیا میرا وجود۔"

"یہ تمہارے اندر کا زہر ہے جو تمہارے وجود سے ظاہر ہو رہا ہے۔"

"اور یہ تمہارے اندر کی رنگینی ہے، جو تمہارے ان مہنگے سوٹوں، شوخ رنگ کی شرٹوں ٹائیوں اور تیز خوشبو والے پرفیوم سے ظاہر ہو رہی ہے اور آئے دن بدلتی تمہاری جوان اور فیشن ایبل سیکریٹریوں سے بھی۔"

"بکواس بند کرو۔ میری عمر کا نہیں تو گھر آئی بچیوں کا ہی لحاظ کر لو۔ بس کر دو اب میری کردار کشی کرنا۔"

"تمہارا کردار ہے کہاں؟"

"مدیحہ۔۔۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کروں گا۔"

اندر کمرے میں پریشان شکلیں لے کر بیٹھی تینوں بہنیں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

"برداشت تو ہم سے بھی نہیں ہو رہا۔"

تحریم نے بڑبڑا کے کہا۔

"پتا نہیں کیا ضرورت تھی ماما کو ہمیں بلانے کی۔ یہ تماشا دکھانے کے لیے اکٹھا کیا ہے ہمیں۔ شکر ہے میں اکیلی آئی۔ لیکن کل جب میرے اور تقدیس کے شوہر ہمیں لینے آئیں گے تو ان کے سامنے بھی کیا یہی سب ڈرامہ ہوگا۔"

"آپ دونوں انہیں سمجھائیں۔"

تطہیر نے دونوں کو اکسایا۔

"اب کہاں سمجھیں گے یہ۔ ساری عمر گزر گئی یہ سب دیکھتے ہوئے۔" تحریم نے بے زاری سے کہا اور اٹھی۔

"مجھ سے تو نہیں رہا جا رہا اس تناؤ میں۔ لوگ میکے آتے ہیں ہلکا پھلکا ہونے۔ آرام کرنے، یہاں الٹا حساب ہے۔ دل ہی گھٹا ہوا ہے۔ میں تو جا رہی ہوں ڈرائیور کے ساتھ۔"

اس کی لاتعلقی پہ تطہیر نے حیرت سے اسے دیکھا پھر امید بھری نظروں سے تقدیس کو دیکھنے لگی جو صبح سے ایسے ہی ٹھس سی بیٹھی تھی۔

"پلیز تقدیس آپی! تم تو ماما کو سمجھا سکتی ہو۔"

"وہ سمجھیں۔۔۔ نہ سمجھیں۔۔۔ میں سمجھ گئی ہوں۔"

اس تمام عرصے میں یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے کہا۔

"کیا؟" تحریم نے حیرت سے استفسار کیا۔

"یہی کہ یہ مکافات عمل ہے جسے میں بھگت رہی ہوں۔"

وہ دونوں اس کی بات کا مطلب ہی تلاش کرتی رہیں اور وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔

"سب جانتی ہوں میں۔ یہ جو گھر سے باہر دل پھر سے لگنے لگا ہے۔ یہ جو بال نئے سرے سے ڈائی ہونے لگے ہیں۔ یہ سب اس نئی سیکریٹری کے چکر میں ہے۔"

"بکواس بند کرو مدیحہ! اندر بیٹھی ان بچیوں کے بارے میں ہی سوچ لو۔ کیا عزت رہی ہوگی ان کے دل میں باپ کی۔"

"ان کو ان کے باپ کے بارے میں بتانے کے لیے ہی تو بلایا ہے۔ انہیں بھی پتا چلے وہ کس گندے انسان کی

اولاد ہیں۔"

"تم ساری حدیں پار کر رہی ہو۔"

"اور تم کب کے حدیں توڑ کے نکل چکے ہو۔"

"مدیحہ!" وہ گرجے مگر سامنے کھڑی تقدیس کو دیکھ کر رک سے گئے۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر اسے مخاطب کیا۔

"تقدیس۔۔۔! سمجھالو اپنی ماں کو۔ اب میری وہ عمر نہیں رہی کہ میں اس سے زیادہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کر سکوں۔"

"اور میں بھی اس عمر میں سوتنوں کے جلاپے برداشت نہیں کر سکتی۔" مدیحہ بھی چلائیں۔

"لیکن میں تو برداشت کر رہی ہوں۔" اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

دونوں سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

"اور پتا نہیں کتنا عرصہ برداشت کرنا پڑے۔ لیکن کوئی نئی بات نہیں۔ ماں باپ کی غلطیوں کا خمیازہ اولاد ہمیشہ سے بھگتتی آئی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میں بہت دنوں سے خدا سے یہ سوال کر رہی تھی کہ اگر یہ آزمائش ہے میرے اللہ! تو مجھے قبول ہے۔ مجھے ہمت دے کہ میں اس میں ثابت قدم رہ کے سرخرو ہو سکوں اور اگر یہ سزا ہے تو کم از کم میرا گناہ میرے سامنے لے آتا۔ مجھے پتا تو چلے کہ میری یہ سزا کن گناہوں کے بدلے ملی ہے۔ آج میرا وہ گناہ آپ دونوں کی صورت میں میرے سامنے ہے۔"

"یعنی۔۔۔ یعنی تم۔۔۔" جعفر محمود تو حیرت کی شدت سے مغلوب ہو کر کچھ کہہ نہ پائے۔

"کیسی سزا میری جان؟ کیا ہو رہا ہے تمہارے ساتھ؟" مدیحہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہی جو اس گھر میں ہو رہا ہے۔ میں نہیں جانتی۔ بچپن سے ہی یہ جاننے میں ناکام رہی ہوں کہ آپ میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ ایک حق پر ہے اور دوسرا غلطی پر۔ پاپا! اگر ماما کے یہ سارے شکوک صحیح ہیں تو آج میں آپ کی بے احتیاطیوں اور بے ایمانیوں کی سزا بھگت رہی ہوں اور ماما! اگر آپ صرف شک کی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے پاپا پر الزام لگاتی رہی ہیں تو یہ دیکھ لیجیے۔ آپ کا کیا آپ کے سامنے آرہا ہے۔ آج آپ کی بیٹی وہ سب بھگت رہی ہے جو آپ کی وجہ سے کوئی بھگتتا رہا ہے۔ وہی شک۔ وہی بے اعتمادی۔ وہی بے اعتباری۔۔۔ وہی گھناؤنے الزام۔"

کچھ پل کے لیے ایک سکتہ سا ماحول پہ طاری ہو گیا۔ پھر جعفر محمود کی بوجھل آواز نے اس سکتے کو توڑا۔

"تو خرم۔۔۔ تمہیں۔۔۔"

مگر ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ فقرہ مکمل کر پاتے۔

بھربھری مٹی کی طرح ڈھے کر گرتے گرتے انہوں نے صوفے کا سہارا لیا مگر ہاتھ پھسل گیا اور وہ نیچے آن گرے۔

"پاپا۔۔۔!"

تقدیس چلاتے ہوئے ان کی جانب بڑھی۔ مدیحہ کے اندر بھی کچھ بری طرح کپکپا گیا۔

☼ ☼ ☼

"خرم کہاں رہ گئے تھے تم! فون بھی آف تھا؟"

وہ جیسے ہی گھر پہنچا۔ رخشندہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اب وہ کیا بتاتا کہ تقدیس کو جانے سے منع تو نہیں کر سکا تھا مگر یہ توقع ضرور کر رہا تھا کہ وہ اس کی ناراضی اور ناپسندیدگی کا خیال کرتے ہوئے شاید خود ہی جانے کا ارادہ

ترک کر دے۔ مگر وہ جس طرح اٹھ کے فوراً" ہی ماں کے ساتھ چلی گئی' اس پہ وہ سخت سیخ پا ہو گیا۔ دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا جب تقدیس کے میکے کے نمبر سے فون آیا۔ جل کے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ مگر متواتر تیسری بار فون آنے پہ اس نے سیل ہی آف کر دیا۔

"وہ۔۔۔ چارجنگ ختم ہو گئی تھی۔ خیریت۔۔۔؟"

"خیریت کہاں؟ تقدیس کا فون آیا تھا۔ اس کے پاپا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"

"کیا۔۔۔؟ اچانک۔۔۔؟"

اس کے ساتھ ہی اسے تقدیس کے بار بار فون کرنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ دل ہی دل میں وہ قدرے شرمندہ اور متاسف بھی ہوا۔

"کہاں ہیں وہ اب۔۔۔؟ میرا مطلب ہے کس اسپتال میں۔۔۔؟ اور کیسی طبیعت ہے اب؟"

"فی الحال تو خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ آئی سی یو میں ہیں۔ حسن اور تمہارے ابا گئے ہیں اسپتال۔ میں اور پروین تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ چلیں۔۔۔؟"

"چلیے۔۔۔" وہ تھکن اور پژمردگی کے باوجود جانے پہ تیار ہو گیا۔ موقع کی نزاکت ہی ایسی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ شادی شدہ ہے اور تم اتنی سیریس ہو اس کے لیے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ۔۔۔"

"میں سب جانتی ہوں ثامی! لیکن میں اسے تب سے پسند کرتی ہوں جب وہ شادی شدہ نہیں تھا؟"

"تو کیا وہ تمہیں پسند نہیں کرتا تھا؟"

"ہم اچھے دوست تھے۔ میں دوستی سے کچھ بڑھ کے سوچنے لگی تھی۔ وصی کے دل میں بھی میرے لیے کچھ جذبات تھے مگر تب ان میں وہ شدت نہیں تھی جتنی شدت میرے دل میں شروع سے اس کے لیے رہی ہے۔ وہ مخلص تھا اور سچا بھی۔ اسی لیے اس نے اپنے گھر والوں کو میرے لیے رشتہ دے کر بھی بھیجا مگر کچھ خاندانی اختلافات اور کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے اس کے گھر والے راضی نہ ہوئے۔ چونکہ وصی ان کے احسانات تلے دبا ہوا تھا اور کچھ فطری طور پہ بھی شریف اور بامروت اس لیے اسٹینڈ نہیں لے سکا۔ اس نے مجھ سے تعلق منقطع کر لیا اور چپ چاپ اپنے گھر والوں کی پسند سے شادی کر لی۔"

"یہ کہانی یہیں ختم ہو جانی چاہیے تھی سوہا! تمہیں قسمت کے لکھے پہ صبر کر لینا چاہیے تھا۔"

"میں نے کیا ثامی! کیا۔ مگر وصی نہ کر سکا۔ جو شدت میرے دل میں شروع سے تھی وہ اس کے دل میں تب پیدا ہوئی جب اسے مجھے کھونے کا احساس ہوا۔ وہ اب میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"مگر رہ رہا ہے۔"

ثنا کی بات پہ وہ چپ ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ رہ رہا ہے۔۔۔ مگر مجبوراً" اور یہ مجبوری عرصے تک نہیں رہنے والی۔"

"کیا اب اس کے گھر والے مان جائیں گے؟ کیا اب تم انہیں قبول ہو گی۔۔۔ کیا وہ سارے اختلافات اور غلط فہمیاں اب ختم ہو جائیں گی؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے یاسیت سے گہرا سانس بھرا۔

"شاید اور بڑھ جائیں گی۔ غلط فہمیاں بھی اور مجھ سے شکایتیں بھی۔ نفرتیں بھی۔"

"اتنی ڈھیر ساری نفرتوں اور شکایتوں کا ازالہ کیا ایک شخص کی محبت کر سکتی ہے سوہا۔۔۔؟"

"ثنا نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا۔ وہ پہلو بدل کے رہ گئی۔ وصی سے محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں سے چشم پوشی کر لیتی۔ اس کی بہت سی دل موہ لینے والی عادتوں کے ساتھ ساتھ ایک یہ

خامی بھی تھی کہ وہ بے حد کمزور قوتِ ارادی کا مالک تھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے سوہا! کہ تم ایک محبت پہ اکتفا کرتے ہوئے باقی سب کی نفرتیں مول لینے کا بڑا قدم اٹھا بھی لو مگر وہ ایک محبت ہی قدم پیچھے ہٹا لے۔"

ثنا اس کے دل میں کب سے چھپے اس خدشے کو زبان پہ لے آئی جس کے بارے میں اس نے کبھی کھل کے سوچا بھی نہیں تھا۔

"کبھی سوچا تم نے اس بارے میں؟"

وہ نفی میں سرہلاتے ہلاتے رک کر اقرار میں سرہلا گئی۔

"بہت مشکل ہے سوہا! نفرتیں سمیٹ کر جینا۔"

"جانتی ہوں۔ اسی مشکل سے تو اب تک گزرتی آئی ہوں۔"

"تھکی نہیں؟"

"بہت... بہت تھکی ہوں ممانی! تھک کے ٹوٹ گئی ہوں۔"

وہ اس کے گلے لگ کے بکھر کے رونے لگی۔

آج اس نے ثنا سے وہ سب کہا تھا جو وہ کبھی ریتا سے بھی نہیں کہہ پائی تھی۔ اپنے ان خدشات "اس عدم تحفظ" کا ذکر کر کے وہ ریتا کو احساس جرم میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ یہ سب اسی کی وجہ سے ملا تھا اسے۔

"کیسے ہیں اب انکل؟"

خرم نے نرمی سے پوچھا۔ اس کا زرد رنگ دیکھ کے وہ ساری ناراضی بھول گیا تھا۔

"ابھی تک تو...." اس کے پپڑی زدہ خشک ہونٹ پھڑپھڑا کے بس اتنا کہہ پائے۔

"لیکن اچانک یہ ہوا کیسے...؟ وہ تو بہت فٹ رہتے ہیں۔ میں نے کبھی سنا نہیں کہ انہیں ہارٹ پرابلم ہے۔"

"ہمیں بھی نہیں پتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟"

وہ چپ رہی۔ تطہیر نے آگے بڑھ کے خرم کو جواب دیا۔

خرم نے ذرا فاصلے پہ بیٹھی مدیحہ کی جانب دیکھا اور ان کو تسلی دینے ان کی طرف بڑھا۔

"آنٹی! آپ فکر مت کریں۔ انکل اِن شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

اس کے رسمی کلمات کے جواب میں مدیحہ نے کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود شرمسار سا ہو گیا۔ وہ نظریں ہی ایسی طعنہ زن قسم کی تھیں۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہر سکا اور رخشندہ کے ٹوکنے کے باوجود وہاں سے چلا آیا۔ کیونکہ نہ صرف مدیحہ بلکہ اس کی بڑی سالی تحریم کا رویّہ بھی کچھ الجھا دینے والا تھا۔

رخشندہ اور پروین نے البتہ سمدھیانے کا لحاظ کرتے ہوئے اتنی جلدی واپس جانا مناسب نہ سمجھا۔ مدیحہ کا رویّہ ان سے بھی لیا دیا سا تھا لیکن چونکہ خرم کی طرف سے ان کے دل میں کوئی چور نہیں تھا اس لیے انہوں نے اسے صرف شوہر کی حالت اور پریشانی پہ محمول کر کے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔

"تقدیس بیٹا! تم زیادہ ٹینشن نہ لینا۔ بیماری اللہ کی طرف سے آتی ہے اور اللہ ہی سے دعا کرنے سے صحت بھی ملتی ہے۔ دل میں امید بھر کے اللہ کے آگے دامن پھیلاؤ اور اپنی ماں کو بھی حوصلہ دو۔ ایسے ہاتھ پیر چھوڑ کے بیٹھنے سے کچھ نہیں ہو گا۔"

جاتے جاتے رخشندہ نے اس کا ماتھا چوم کر تسلی دی۔

"توبہ... اوپر سے ایسی میٹھی اور اندر سے گھنی۔" تحریم نے ان دونوں کے جانے کے بعد تبصرہ کیا۔

"کیا یہ نہیں جانتی ہوں گی کہ ان کا بیٹا ہماری بہن کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ ایک ہی چھت کے نیچے ہونے والے تماشوں میں سب حصہ دار ہوتے ہیں۔"

تقدیس ایک لفظ نہ بولی۔

نہ ساس کی حمایت میں...

نہ بہن کی تائید میں...

اس کا رواں رواں اس وقت صرف اپنے پاپا کی زندگی اور صحت کے لیے دعاگو تھا۔ جو اس کی جلد بازی کی وجہ سے اس حال تک پہنچے۔ وہ کتنی دیر تک تو اپنی کم ہمتی کو کوستی رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ ضبط کھو بیٹھی اور نجانے کیا کچھ کہہ ڈالا جو وہ دل پہ لے گئے۔

"میں نے یہ سب سوہا سے اس لیے نہیں کہا کہ میں تمہاری طرح کسی دوراہے پہ کھڑی ہوں۔"

ثنا نے اپنی اور سوہا کی گفتگو کی ساری تفصیل منزہ کے سامنے دہرانے کے بعد کہا۔

"نہ اس لیے کہا کہ میری ساری ہمدردیاں وشمہ کے ساتھ ہیں اور اس کا گھر بچانے کی خاطر میں سوہا کو وصی سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ میرا رشتہ صرف سوہا سے ہے اور میں صاف گوئی سے کہوں گی کہ اگر مجھے انتخاب کا موقع ملا تو ظاہر ہے میں سوہا کا ساتھ دوں گی۔ تمہاری طرح میری ممتا بٹی ہوئی نہیں ہے۔ میں تمہیں قصوروار نہیں کہہ رہی۔ ظاہر ہے پیدا کرنے والی اولاد کے ساتھ ساتھ پالنے والی اولاد بھی اتنی ہی پیاری ہو جاتی ہے اور منزہ میں نے سوہا کو اس لیے بھی نہیں سمجھایا کہ اس کی وجہ سے تمہاری زندگی اور ازدواجی رشتے پہ جو خطرات منڈلانے والے ہیں وہ ٹل جائیں۔ بلکہ صرف اس لیے کہ میں چاہتی ہوں اس کی تمام پچھلی محرومیوں اور تشنگیوں کا ازالہ ہو سکے۔ وصی بلاشبہ ایک اچھا انسان ہو گا۔ لیکن اگر وشمہ درمیان میں نہ بھی ہوتی تب بھی میں سوہا کو یہی مشورہ دیتی کہ وصی اس کے لیے بہترین انتخاب نہیں ہے کیونکہ وصی سے اسے محبت مل سکتی ہے وہ اعتماد اور تحفظ نہیں جس کی اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس نے اتنے تھپیڑے کھائے ہیں کہ وہ اس سے زیادہ سہہ نہیں پائے گی۔"

"لیکن... وہ تو ضد پہ اڑی ہے۔"

"تمہیں کیا پتا کہ وہ ضدی ہے یا نہیں۔ تم نے کبھی اس سے بات کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کی؟"

ثنا کے سوال پہ وہ نظریں چرا گئی۔

"تم تو ہمیشہ اس سے خوف زدہ رہی ہو۔ اسی لیے وہ تم سے بھاگتی رہی۔ اسے ریتا جیسی ماں چاہیے تھی۔ جو خود عدم تحفظ کا شکار ہوتے ہوئے اور ایک کمزور حیثیت رکھتے ہوئے اس کے سامنے ڈھال بن سکے۔ وصی کے روپ میں اسے تم ہی ملو گی منزہ! جیسے تم اس سے محبت کرتی ہو مگر اسے اپنانے سے ڈرتی ہو۔ یہی حال وصی کا ہے اور یہ بات میں نے سوہا کو سمجھا دی ہے۔ وہ وصی سے بہت بہتر انسان ڈیزرو کرتی ہے۔"

"مگر وہ بہتر انسان اس کے نصیبوں میں کہاں؟" منزہ رونے لگی۔

"میں نے ریتا کی گود میں اسے ڈال کر اس کا مستقبل خراب کر دیا ہے۔ کون ایک طوائف زادی کی آغوش میں پلنے والی ایسی لڑکی کو اپنائے گا جس کے بارے میں سو سو باتیں مشہور ہیں۔ وصی ہے جو اسے چاہتا ہے مگر میری مجبوری کہ میں اسے یہ رشتہ بنانے کی اجازت بھی نہیں دے سکتی۔ اور کون ہے جو..."

"میں..." ثنا نے جواب دیا تھا۔

● ● ●

دونوں کے قدم جناح پارک کے سبزہ زار پہ ایک ساتھ اٹھ رہے تھے...

دونوں ہی کے قدم سست اور بے ترتیب تھے۔

دونوں کی ہی نظریں اپنے متحرک قدموں پر جمی تھیں۔

دنوں بعد ملنے کے باوجود دونوں کے لبوں پہ ہی ایک دوسرے کو سنانے کے لیے کچھ نہ تھا۔

گم صم... چپ چاپ... اندر ہی اندر الجھتے وہ آدھے گھنٹے سے ایک ساتھ چل رہے تھے، تھکن کا احساس ہو رہا تھا نہ گرمی کا... اور نہ ہی اس ہیبت ناک سکوت کا... ویسے بھی یہ سکوت ان دونوں کے مابین قائم تھا... دونوں کے

اندر تو ایک کہرام بپا تھا... بازگشتیں تھیں' جوان کو جھنجوڑے جا رہی تھیں۔

"تم نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا! اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے اور آج تم نادانستگی میں وشمہ کے اور ہم سب کے ساتھ یہی تو کر رہے ہو' ندامت کا یہ بوجھ تمہیں کھل کے جینے نہیں دے رہا' نہ تم راتوں کو سو پا رہے ہو نہ ڈھنگ سے کھا رہے ہو' فرض کرو اگر تم نے دل کے بے لگام ہونے پہ وشمہ کو طلاق دے بھی دی تو کیا تم خوش رہ پاؤ گے سوہا کے ساتھ' کبھی نہیں... تم ایک معصوم' بے قصور لڑکی کے ماتھے پہ داغ لگانے کے بعد مطمئن نہیں رہو گے اور سوہا کے اور تمہارے درمیان جو رشتہ ہے' وہ کتنا ہی پر خلوص اور سچا کیوں نہ ہو' ہے تو ناپائیدار اور قانونی و شرعی لحاظ سے کمزور اور بودا... تم دونوں کے راستے الگ ہو بھی گئے تو چند ہی دنوں' مہینوں یا شاید سال بھر میں تم بھی بیوی' بچوں میں مگن ہو کر اس درد کو بھلا دو گے' اسے بھی کوئی نہ کوئی زندگی کا نیا ساتھی مل جائے گا' لیکن طلاق کے داغ کے بعد ہمارے معاشرے میں لڑکی کے لیے کتنے راستے کھلے ہیں' ان سے تم بھی واقف ہو' اس لیے وصی ایسا کچھ نہ کرنا' جس کے نتیجے میں تمہیں ساری عمر اپنا پیچھا کرتی بددعاؤں سے بچ کر بھاگنا پڑے۔"

وصی کے قدم لمحہ بھر کو تھمے... لیکن سر جھکا کے اس کے ساتھ چلتی سوہا نے اپنے دھیان میں غور ہی نہ کیا' وہ اپنے اندر کی آوازوں سے بچتی چلی جا رہی تھی۔

"کیا اب اس کے گھر والے مان جائیں گے؟"

"کیا اب تم انہیں قبول ہو گی؟ وہ سارے اختلافات اور غلط فہمیاں اب ختم ہو جائیں گی؟"

"اتنی ڈھیر ساری نفرتوں اور شکایتوں کا ازالہ کیا صرف ایک شخص کی محبت کر سکتی ہے؟"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اس ایک محبت پہ اکتفا کرتے ہوئے باقی سب کی نفرتیں مول لینے کا بڑا قدم اٹھا بھی لو' مگر وہ ایک محبت ہی قدم پیچھے ہٹا لے۔"

"اس سے تمہیں محبت تو شاید مل جائے' مگر وہ اعتماد اور تحفظ نہیں' جس کی تمہیں محبت سے زیادہ ضرورت ہے۔"

وصی حیرت سے خود سے قدم بہ قدم دور جاتی سوہا کو دیکھ رہا تھا' جسے نہ اس کے پیچھے رہ جانے کا احساس تھا' نہ اپنے آگے نکل جانے کا۔

☆ ☆ ☆

"آپ؟" منزہ حیرت کی شدت سے ذرا سنبھل کے بولی۔

"ہاں... میں اپناؤں گی اسے... اور کوئی احسان نہیں کروں گی اس پہ یا تم پہ... کوئی کمی نہیں ہے سوہا میں... میرے خیال میں تو وہ میرے صبیح کے لیے ایک بہترین انتخاب ثابت ہو گی۔"

منزہ کتنی دیر کچھ بول ہی نہ سکی۔

آنسو شکر گزاری کے اظہار کے طور پہ اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

"بس ایک بار صبیح سے بات کر لوں۔"

ثنا کی اگلی بات پہ اس کا خوشی سے پھیلتا دل سکڑ سا گیا۔

"اور اگر صبیح نہ مانا تو..." دل کا خدشہ وہ زبان تک نہ لا سکی۔

"ویسے تو اس نے اس بارے میں سارے اختیارات مجھے سونپ رکھے ہیں' میں جانتی ہوں' میرے انتخاب پہ اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ صرف یہ پوچھنا ہے اس سے کہ وہ ذہنی طور پہ ایک نئے رشتے اور ذمے داری میں بندھنے کے لیے تیار ہے یا نہیں' اگر ہاں تو یہ منگنی وغیرہ کے جھنجٹ رہنے دیتے ہیں اور ڈائریکٹ شادی کر دیتے ہیں' لیکن اگر ابھی وہ اپنا کیریر اسٹیبلش کرنا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے' سال ڈیڑھ سال کی مہلت دے دیتے ہیں

دونوں بچوں کو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال؟" وہ رونے لگی اور ثنا کے ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیے۔

"ارے' یہ کیا کر رہی ہو؟ ابھی یہ سب کرنے کا وقت نہیں آیا' شروع شروع میں لڑکے والوں کو منت کرنی پڑتی ہے' جوتیاں گھسانی پڑتی ہیں لڑکی والوں سے ہاں کہلوانے کے لیے' خاص طور پہ اتنی اچھی اور ہیرا لڑکی کے لیے' ہاں ایک بار شادی ہو لینے دو... پھر میں اصلی لڑکے والی بن کے دکھاؤں گی تمہیں... یہ بھابھی' دوست وغیرہ سب بھول جانا تم' سمجھیں؟ صرف یہ یاد رکھنا کہ تمہاری سمدھن ہوں میں' تمہاری بیٹی کی ساس۔"

وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہی تھی' مگر منزہ مسلسل روئے چلی جا رہی تھی۔

"آپ نے اتنے سالوں میں کبھی بھابھی بن کے نہ دکھایا تو اب میری سمدھن یا سوہا کی ساس کیا بن کے دکھائیں گی۔"

"تم نے مجھے پہلے کچھ بتایا کیوں نہیں خرم کے بارے میں؟"

مدیحہ نے یہ سوال تقدیس سے تب کیا' جب جعفر محمود کی حالت قدرے سنبھل جانے کے بعد اسے آئی۔ سی۔ یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا اور تطہیر نے خود رات وہاں رکتے ہوئے باقی سب کو گھر بھیج دیا۔

"کیا بتاتی' میں خود تو کچھ سمجھ پاتی پہلے' کہ مجھ سے غلطی کب اور کہاں ہوئی؟"

"مسئلہ کیا ہے آخر اس کے ساتھ؟"

"شاید میں ان کا سب سے بڑا مسئلہ ہوں۔"

"میں اس سے بات کرتی ہوں۔"

"نہیں... میں نہیں چاہتی کوئی میری جانب سے صفائیاں پیش کرے' جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو میں گناہ گاروں کی طرح جواز کیوں پیش کروں؟ جب میرے دامن پہ کوئی چھینٹا ہی نہیں تو اپنے بے داغ آنچل کو کس لیے بار بار رگڑ کے دھوؤں' مجھے تب سکون ملے گا جب وہ خود میری بے گناہی کا' میری پاک بازی کا یقین کریں گے۔"

"وہ کوئی ذہنی مریض لگتا ہے تقدیس! ورنہ بغیر کسی وجہ کے' بغیر کچھ دیکھے' کوئی کیسے کسی پہ شک کر سکتا ہے؟ کیسے کسی کے کردار پہ کیچڑ اچھال سکتا ہے؟"

مدیحہ کی بات پہ تقدیس نے بڑی جتاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

مدیحہ اندر ہی اندر شرمندہ سی ہو گئی۔

"ایسے مت دیکھو تقدیس! تمہاری ماں نہ ذہنی مریضہ ہے' نہ اسے تمہارے باپ سے کوئی پرانی دشمنی نکالنی ہے' یہ جس عورت کو تم نے اس دن چلاتے ہوئے دیکھا تھا' تم کیا جانو' اس عورت نے کتنے سال صبر کی سل اپنے سینے پہ رکھ کے گزارے ہیں' جس عورت کو آج تم سائے سے بھی لڑتا اور ڈرتا دیکھ کے ذہنی مریضہ سمجھنے لگی ہو' وہ عورت کبھی اپنے شوہر کے سائے تک کو بھی ترس کے رہ جاتی تھی' اور شوہر' وہ سایہ تو کیا' اپنی محبت' اپنا ساتھ سب باہر لٹا کے اندر سے کھوکھلا ہو کے اس کے پاس آتا تھا' تم نہیں جان سکتیں وہ تکلیف' وہ درد جو ایک عورت تب محسوس کرتی ہے جب اسے یہ معلوم ہو کہ اس کے پہلو میں لیٹا مرد اس کے پاس ہو کے بھی اس کا نہیں ہے۔"

مدیحہ کے آنسو گرنے لگے۔ گزرے سالوں کے کئی اذیت ناک لمحے یاد آ گئے تھے۔

"تو یہ صبر اب کیوں کھو دیا آپ نے؟ اب' جبکہ اب آپ بھی جانتی ہیں کہ اس عمر میں پاپا بھلا کیا کر سکتے ہیں۔"

"ہاں' میں جانتی ہوں اس عمر میں بھلا وہ کیا کر سکتا ہے؟ اب کیا کسی کے عشق کے خمار میں ڈوبے گا' کیا کسی کو اپنے عشق میں پاگل کرے گا؟ کیا کسی سوتن کی تلوار میری گردن پہ لٹکائے گا' لیکن تقدیس! یہ بھی تو ایک تلخ سچائی ہے کہ آج اس کے کچھ نہ کرنے کی وجہ اس کا تائب ہونا نہیں ہے' اس کا پچھتاوا یا ندامت بھی نہیں ہے... بلکہ... اس کا اپنا دل بھر گیا ہے ان رنگینیوں سے' وہ میرے لیے لوٹا' مجھ سے شرمندہ ہو کر ان سب حرکتوں کو

چھوڑتا تو میں قدر کرتی اس کے لوٹنے کی، لیکن اب کیا قدر کروں میں؟ وہ لوٹا نہیں ہے تقدیس! وہ صرف تھک کے رُک گیا ہے، سستا رہا ہے، کیا میں اس کے بڑھاپے اور مردہ دلی کو سمیٹنے کے لیے ہی رہ گئی ہوں؟ کیا میرا اس جوانی اور رعنائی پہ کوئی حق نہیں تھا؟ ہاں، ہاں میں نے صبر کھودیا ہے، میرے اس پچھلے صبر کے پیچھے میرا ڈر چھپا ہوا تھا، طلاق کا ڈر، اپنی بچیوں کو کھودینے کا ڈر، یا پھر ان سے باپ کے سائے کے چھن جانے کا ڈر، اس کے برائے نام ساتھ اور تعلق سے محروم ہوجانے کا ڈر، یہ ڈر مجھے زبان بندی پہ مجبور کرتا تھا، لیکن اب وہ ڈر نہیں رہا، کہاں جائے گا وہ اس عمر میں یہ گھر اور بچے چھوڑ کے، اب میں پچھلے سارے۔۔۔"

"خدا کے لیے ماما۔ پچھلی باتوں کو بھول جائیں۔" تقدیس نے ہاتھ جوڑے۔

"بھولنا ہی پڑے گا، جب اولاد سامنے زخم لیے کھڑی ہو تو کسے یاد رہتا ہے اپنی چوٹیں سہلانا۔"

مدیحہ نے اس کے بندھے ہاتھ کھولے، چومے اور نم آنکھوں سے لگائے۔

"میری بیٹی انمول ہے، میری بیٹی پاک ہے، میری بیٹی میرا فخر، میرا غرور ہے۔ میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ میرے فخر اور میرے غرور پہ انگلی اٹھائے، میں خرم سے بات کرکے رہوں گی، بلکہ اس کے گھر جاکے اس کی والدہ۔۔۔"

"نہیں ماما!" اس نے گھبرا کے بات کاٹی۔

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی، یہ میرا مقدمہ ہے، اسے مجھے خود لڑنے دیں۔"

☆ ☆ ☆

"تمہارے اور تقدیس کے درمیان کچھ گڑبڑ ہے کیا؟"

ندا دو دن میکے رہنے آئی تھی، بھابھی کے والد کی طبیعت کا سن کر ماں کے ساتھ اسپتال انہیں دیکھنے بھی گئی، جو بات رخشندہ نے محسوس نہیں کی، وہ اس نے ذرا ہی دیر میں بھانپ لی اور گھر آکے بھائی کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"تم اس سے اکھڑے اکھڑے کیوں تھے؟"

"تو اسپتال میں کیا اس سے چہلیں کرتا؟"

وہ جھنجلا اٹھا تو ندا کو ہنسی آگئی۔

"بھئی۔ چہلیں کرنے کے دن ہیں تمہارے، کرلیتے۔ اپنی نئی نویلی بیوی سے ہی کرنا تھیں نا، اسپتال میں منع تو نہیں۔"

وہ اس شوخی کا جواب، مسکراہٹ سے دینے کے بجائے وہی سنگین سی سنجیدگی چہرے پہ سجائے کمرے کی جانب بڑھا تو ندا مزید ٹھٹک گئی، اور پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"ناراض ہو اس سے؟"

"نہیں۔"

"وہ ناراض ہے تم سے؟" وہ مسلسل کرید رہی تھی۔

"نہیں بھئی۔۔۔"

"تو گھر کے کسی اور فرد سے شکایت ہے اسے؟"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" اب کے وہ باقاعدہ چڑ گیا۔

"یہی تو پوچھ رہی ہوں، ہو کیا گیا ہے تم دونوں کو۔۔۔ کوئی مسئلہ ہے، کوئی ناراضی ہے، کسی دوسرے سے شیئر نہیں کرنا چاہتے، کسی کو بتانا نہیں چاہتے تو ٹھیک ہے، لیکن آپس میں تو سلجھاؤ، اسے بات کرو، مناؤ۔"

"میرا کیا دماغ خراب ہے، جو غلطی بھی اس کی، مناؤں بھی میں اس کو۔"

غصے اور جھنجلاہٹ میں ایسی بات خرم کے منہ سے نکل گئی جسے ندا نے جھٹ سے پکڑ لیا۔

"کیسی غلطی؟"

"کچھ نہیں۔" نجانے کیوں، جس بات پہ اسے پختہ یقین تھا، اس کا اظہار سوائے تقدیس کے، کسی اور کے سامنے کرنے سے وہ کتراتا تھا۔

وہ جواب دیے بغیر نکل گیا۔ ندا کا مزید رکنے کا پروگرام ہوتا تو وہ ضرور کسی نہ کسی طرح اس سے اگلوا کے رہتی لیکن جاتے جاتے وہ ظل ہما کے کانوں میں یہ بات ضرور ڈال گئی۔

"محسوس تو مجھے بھی کئی بار ہوا، لیکن آپ کی بات اور ہے، آپ بڑی ہیں پوچھ سکتی ہیں خرم بھائی سے، لیکن میں کیا کہتی؟ آپ کو پتا تو ہے ان کے مزاج کا۔"

"تقدیس سے تو بات کرسکتی ہو تم۔۔۔ میں نے تو اسے کم گو ہونے کے باوجود بہت دوستانہ سا پایا ہے، تمہارا دن رات کا ساتھ ہے، تم بتاؤ، کیا وہ برا مانے گی اس بات پہ؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی، مزاج کی تو وہ واقعی اچھی ہے، لیکن اتنی ذاتی بات پوچھنے پہ اس کا ردِ عمل کیا ہو، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ویسے بھی اگر خرم بھائی کے ساتھ واقعی اس کا کوئی پرابلم چل رہا ہے تو وہ ہمیں کیوں بتائے گی، میرا مطلب ہے اپنی نند کو۔۔۔ خرم بھائی کی بہن کو۔"

"تو تم نند بن کے مت پوچھنا، ایک دوست بن کے پوچھ لینا، دراصل ہما! شادی سے پہلے میں زندگی کے ہر معاملے خصوصاً "دوسروں کی زندگیوں، دوسروں کے معاملات کو بڑا سرسری سا لیتی تھی، میرا خیال تھا کہ سب کی اپنی ذاتی زندگی ہے، اچھی یا بری، دوسرے کو بہرحال کوئی حق نہیں اس میں مداخلت کرنے کا، لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ ہر کسی کو اندر سے یہ چاہ ہوتی ہے کہ کوئی ہمارا حال پوچھے، کوئی کہے، تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں، کوئی ضرورت تو نہیں، یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑا حوصلہ دیتی ہیں، دلوں کو باندھتی ہیں؟"

"اچھا۔۔۔ بات کرتی ہوں کسی دن موقع دیکھ کے، ابھی تو وہ اپنے والد کی وجہ سے پریشان ہے۔"

"اور وصی کی سناؤ؟"

ندا کی بات پہ ہما کا دل خلافِ توقع اپنے حال میں مگن رہا، نہ سکڑا، نہ سمٹا، نہ دھڑکنیں منتشر ہوئیں۔ اسے خود اپنی کیفیت غنیمت لگی۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جس کی ذات پاک نے اسے اپنے حال میں مست رہنے، کسی کی وابستگی کو فراموش کرنے اور اپنے شہزاد گھر سے سوفیصد وفادار ہونے کا اہل بنایا۔

"میں کیا سناؤں؟ وصی سے دوستی آپ کی رہی ہے، آپ کو سب پتا ہونا چاہیے۔"

"اب تو تم اس کے گھر کا فرد ہو، اور میں اس گھر سے ہی رخصت ہوچکی ہوں، وصی تو اب فون بھی کبھی کبھار کرتا ہے، ایمان سے دل بھی دکھتا ہے یہ سوچ کر کہ کیا شادی کے بعد رشتے اور تعلق اتنے بدل جاتے ہیں۔"

"وہ بدلا ہے، مگر اس شادی کی وجہ سے نہیں۔"

"ہاں میں جانتی ہوں، امی نے بتایا ہے کہ جو کچھ حماقتیں وہ کرتا پھر رہا ہے، مجھے وصی سے یہ امید نہیں تھی۔ وہ تو بڑا سمجھ دار اور معاملہ فہم لڑکا تھا، کیا ہو گیا ہے اسے؟ شاید عشق اور وہ بھی اندھا عشق ایسے ہی حواس معطل کرتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"وصی سے پتا چلا ہے کہ تقدیس کے والد آج کل اسپتال میں ہیں۔"

سوہا نے یونہی برسبیلِ تذکرہ ریتا سے کہا تھا، مگر اس کا رواں رواں مشتاق ہو گیا۔

"کیوں؟ کیسے؟ کون سے اسپتال؟"

اس کی بے تابی اور اضطراب یہ سلائس پہ جیم لگاتی سوہا نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔

"اتنی تفصیلات کا تو علم نہیں مجھے' وصی نے ایسے ہی باتوں باتوں میں بتایا تھا۔" "تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا' آخر تقدیس تمہاری سب سے قریبی دوست ہے۔"

"ہے نہیں۔۔۔ تھی۔۔۔"

اس نے سلائس واپس پلیٹ میں رکھ دیا' کھانے سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

"بہرحال۔۔۔ یہ وقت ایسا ہے کہ تمہیں' میرا مطلب ہے پرانے تعلق کے لحاظ میں ہی سہی۔۔۔ مگر۔۔۔"

رینا کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ جعفر کے پاس جانے کے لیے وہ کیا جواز پیدا کرے' خود بے شک نہ جا سکے' مگر سوہا کی زبانی ہی اس ستم گر کا حال جان سکے۔

"دیکھوں گی۔۔۔ دراصل۔۔۔" وہ چائے کا گھونٹ بھرتے بھرتے کچھ ہچکچا سی گئی۔ "دراصل بات صرف تقدیس کی نہیں ہے' ہمارے درمیان بے شک دوستی وہ نہیں رہی' مگر ایسی دشمنی بھی بہرحال نہیں ہے کہ میں اس کا سامنا تک کرنے سے کتراؤں' لیکن ماما! آپ تو جانتی ہیں کہ وہ اب کس فیملی کا حصہ ہے' مجھے ان لوگوں کا سامنا کرنے سے خوف آتا ہے۔"

"خوف آتا ہے؟ صرف سامنا کرنے کے خیال سے بھی؟ تو تم ان کے ساتھ زندگی کیسے گزارو گی سوہا؟"

رینا نے تعجب سے سوال کیا۔ وہ دہل کے رہ گئی۔

"زندگی؟"

"چاہے وصی تمہیں لے کر الگ ہو جائے' پھر بھی خاندان سے رابطے تو نہیں ٹوٹتے' عمر بھر تمہیں ان لوگوں کو فیس کرنا ہے' اپنا دل مضبوط کرو سوہا! ایسے تو گزارا نہیں ہونے والا۔"

وہ لاپروائی سے دلیہ کھانے لگی' اور سوہا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

اسے کتنی ہی ایسی یادیں گھیرنے لگیں' جب اصغر کے ساتھ رینا کو خاندان کی کسی نہ کسی خوشی غمی میں شریک ہونا پڑتا' اور وہ وہاں ایسی ہی ڈھٹائی کے ساتھ سر اونچا کیے بیٹھی رہتی' سب کو یاد تھا کہ اصغر کی بیوی' سوہا کی چچی' نصرت کی بہو کوٹھے سے آئی ہے' کوئی اس کی شناخت بھولنے پہ تیار نہیں تھا۔

کوئی اسے اس کی اوقات یاد دلانے میں پیچھے رہ جانے پہ راضی نہیں ہوتا تھا۔

"شاید میں اپنا دل اتنا مضبوط نہ کر سکوں ماما۔"

اس نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے سوچا۔

☼ ☼ ☼

مدیحہ نے سوپ کا چمچہ جعفر کی جانب بڑھایا۔

وہ بے گانے انداز میں منہ پھیر کے رہ گیا۔

مدیحہ کی انگلیاں کپکپا اٹھیں۔

"ضد مت کرو' کھا لو کچھ' ورنہ دوا کیسے لو گے؟"

"دل نہیں چاہ رہا۔" جعفر نے آنکھیں موند لیں۔

مدیحہ نے غور سے اسے دیکھا تو جیسے دل پہ گھونسا سا پڑا۔

"لالیاں ٹپک رہی ہیں تمہارے چہرے پہ' یہ عیاشیاں تمہیں بوڑھا ہونے کب دیں گی' تمہاری جوانی کے دن پتا نہیں کب ختم ہوں گے اور کب مجھے سکون کا سانس نصیب ہو گا۔"

حسد اور جلاپے میں ڈوبے اس کے اپنے الفاظ اسے یاد آئے اور وہ دکھ سے کٹتے دل کے ساتھ اس کا زردی سے ڈوبا چہرہ دیکھنے لگی۔

دو ہی دن میں آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے پڑ چکے تھے' ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تھیں' انگلیوں کی اور پپوٹوں کی ہلکی ہلکی لرزش بتلا رہی تھی کہ اسے اب ان پہ قابو پانے میں بھی کتنی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ باقاعدگی سے شیو کرنے والے کے چہرے پہ سفید غبار سا پھیلا ہوا' اسے اصل عمر سے بھی دس سال آگے کا ظاہر کر رہا تھا۔

مدیحہ نے اس کے سینے پہ بندھے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ نرمی سے رکھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

اس بار نگاہوں میں دل کو چیرتی بے اعتنائی کے بجائے ہلکا سا شکوہ تھا۔

"پلیز۔۔۔ تھوڑا سا سوپ لے لو۔ تطہیر کو میں نے ابھی ابھی گھر بھیجا ہے دو راتوں سے مسلسل یہاں تھی' آرام نہیں ملا اسے اور تحریم کی ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' اس کا گھر جانا بھی ضروری تھا' اور تقدیس تو آپ کو پتا ہے ایک ہی دن کے لیے آئی تھی اور رہنا پڑ گیا۔ ذرا سی دیر کے لیے گھر گئی ہے کپڑے وغیرہ لینے' پھر بھی آتے آتے گھنٹہ ڈیڑھ تو لگے گا' تب تک کیا بھوکے رہو گے؟ میں جانتی ہوں' ناراض ہو مجھ سے' میرے ہاتھ سے کچھ کیسے کھاؤ گے' جبکہ بات تک کرنا گوارا نہیں ہے مجھ سے' لیکن اگر بیٹیاں اس وقت موجود نہیں ہیں تو کچھ دیر کے لیے ناراضگی بھول جاؤ' میری غلطیاں بھی بھول جاؤ' بے شک مجھے معاف بھی مت کرنا' مگر پلیز۔۔۔ پلیز۔۔۔ تھوڑا سا سوپ لے لو۔"

اس کے رقت آمیز لہجے میں نجانے کیا تھا کہ جعفر محمود نے منہ کھول دیا' مدیحہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سوپ کا چمچہ اس کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے۔۔۔ میری کوئی بات تو مانی۔"

"اس حالت میں بھی طعنے دینے سے نہیں چوکیں تم۔"

وہ ہنسنے کی کوشش میں کراہ کے رہ گیا۔

مدیحہ فوراً اس کی کمر سہلانے لگی۔

دل خود بخود اس شخص کے لیے اتنا ہی نرم اور گداز ہو رہا تھا' جیسے شادی کے اولین دنوں میں ہوا کرتا تھا' جب وہ آفس سے گھر لوٹتا' تو اس کی ساری تھکن ہتھیلیوں میں سمیٹنے کو بے تاب رہتی تھی وہ۔ اس شخص کے لیے۔۔۔ پچھلے کئی سالوں سے جس کے لیے نفرت اور بے زاری بھی کم پڑ رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں' مجھ سے غلطی ہوئی' مجھے یہ سب باتیں بیاہی بیٹیوں کے سامنے نہیں کرنی چاہیے تھیں۔"

اس کے نیپکن کو درست کرتے ہوئے مدیحہ نے اپنی غلطی تسلیم کی۔

"نہیں۔۔۔ تمہیں یہ باتیں اب مجھ سے کرنی ہی نہیں چاہئیں۔" جعفر محمود نے تصحیح کی۔ "تم مان کیوں نہیں لیتیں کہ اب وقت وہ نہیں رہا۔"

جواب میں مدیحہ کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا' لیکن وہ اس کی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر چپ ہی رہی۔

"تم میرا اعتبار کیوں نہیں کر لیتیں کہ اب میری زندگی میں تمہارے اور بچیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا۔"

"تم نے کبھی یہ اعتبار دلانے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔۔۔" وہ ہلکا سا گلہ کر بیٹھی۔ "مانا۔۔۔ میں بدگمانیوں میں بہت آگے نکل گئی تھی۔ تم بھی تو مانو کہ کبھی میری انگلی تھام کے مجھے واپس لانے کی کوشش نہیں کی۔۔۔ مانا۔۔۔ شک نے مجھے اندھا اور پاگل کر دیا تھا مگر تم بھی تو مانو کہ اس شک کی دھند سے نکالنے کے لیے تم نے کبھی کوئی کوشش نہیں کی' مانا۔۔۔ میری محبت بے اعتباری کی گرد تلے دب گئی تھی' مگر تم نے اپنی محبت سے اس دبی ہوئی محبت کو ابھارنا نہیں چاہا۔"

جواب میں کئی سیکنڈ جعفر محمود چپ رہا۔

پھر اس کے ہاتھ پہ اپنا سوئیوں اور نالیوں سے جکڑا ہاتھ رکھ کے آہستہ سے کہا۔

"مانا۔۔۔"

اسے الماری سے کپڑے نکالتے دیکھ کے وہ جز بز ہو رہا تھا۔ ہما اس کے ساتھ تھی ورنہ بہت کچھ سنا ڈالتا۔

"یہ والا سوٹ رکھ لو آرام دہ رہے گا۔"

ہما نے کاٹن کا تیسرا سوٹ اس کے بیگ میں رکھا تو وہ کہے بغیر رہ نہ سکا۔

"بس بھی کرو ہما۔! وہ وہاں چھٹیاں گزارنے نہیں جا رہی۔"

"اسپتال میں اپنی صفائی کا بھی خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے بھائی جان۔! دن میں دو بار تو شاور لے کر تمہیں کپڑے ضرور بدلنا ہوں گے تقدیس!"

تقدیس چونکہ اس سے بھی ڈیڑھ برس چھوٹی ہی تھی اس لیے بڑے بھائی کی بیوی ہونے کے باوجود ہما اس کے نام کے ساتھ بھابھی وغیرہ کی وضاحت کرنا عجیب سا محسوس کرتی تھی۔

"اور اپنے آرام کا بھی خیال کرنا۔"

"اتنی فکر ہے تو جانے کیوں دے رہی ہو؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ انکل بیمار ہیں وہ جائیں بھی نا!"

ہما تقریباً "برا مان کے بولی۔

"جا کے کیا کرلے گی ڈاکٹر تو ہے نہیں یہ جو کرنا ہے وہ وہاں ڈاکٹرز کر رہے ہوں گے شام کو میں لے جایا کروں گا ملوانے۔"

وہ اس کے نہ جانے کے جواز پیش کر رہا تھا۔

"مانا کہ وہ وہاں جا کے کچھ نہیں کر سکیں گی؟ لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ یہاں رہ کے کیا کرلیں گی؟ دھیان تو اس کا اپنے ابو میں اٹکا رہے گا' پریشان رہے گی' طرح طرح کے وہم کرے گی' اس سے اچھا ہے وہیں رہے' کم از کم اسے تسلی تو رہے گی اور آنٹی کو بھی بیٹیوں کے ساتھ اور پاس ہونے سے دلی تقویت رہے گی۔"

خرم چپ رہا اور خشمگیں نگاہوں سے پیکنگ میں مصروف تقدیس کو گھورنے لگا جو پہلے ہی چپ تھی۔ تھکان چہرے سے واضح تھی' اس کے باوجود خرم کو لگ رہا تھا کہ وہ میکے جانے' بلکہ اس سے اور اس گھر سے کچھ دن اور دور رہنے کے خیال سے ہونے والی خوشی اور ہیجان کو چھپانے کے لیے پریشان اور پژمردہ ہونے کا ناٹک کر رہی ہے۔

"پیکنگ تو ہو گئی' میری مانو تو اب آئی تو ہو ایک دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد جانا۔۔۔ شکل دیکھو ذرا اپنی۔"

"نہیں' آرام کیا کرنا' میں چلتی ہوں اب۔"

"جانے دو ہما! وہاں اس کا بے چینی سے انتظار ہو رہا ہو گا۔"

اس کے چبھتے لہجے پہ تقدیس نے چونک کر دیکھا۔

"ویسے بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں رکنے سے اسے آرام کی بجائے تکلیف ہی ملے۔"

تقدیس چپ چاپ سینڈل اتار کے بیڈ پہ چڑھ گئی' ہما الجھن بھرے انداز میں دونوں کو دیکھنے لگی۔

"اچھا۔۔۔ میں چائے بھجواتی ہوں تمہارے لیے۔"

نہ تقدیس کی خاموشی سمجھ میں آرہی تھی' نہ خرم کی کٹیلی باتوں کی تہہ میں اتر پارہی تھی وہ۔۔۔ اس لیے باہر نکل گئی۔

"ایک بات تو بتاؤ؟"

خرم نے پھنکارتے لہجے میں کہا تو دروازہ بند کر کے اگلا قدم آگے بڑھاتی ہما نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی۔

"کہیں تمہارے کسی کرتوت کی بھنک تو نہیں پڑ گئی انکل کے کانوں میں اور وہ بے چارے تاب نہ لاتے ہوئے۔۔۔"

تقدیس جو لیٹنے کے لیے تکیہ درست کر رہی تھی۔۔۔ تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔

"غیرت کا ابال بھی دل کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔۔۔ جس بدنامی سے بچنے کے لیے انہوں نے تمہیں سر سے بوجھ کی طرح اتار کے پھینکا تھا' وہی بدنامی تم میکے سے سسرال اور پھر سسرال سے میکے سمیٹ لائی ہو گی۔"

ہما اپنی جگہ سن تھی۔

اور تقدیس کا کئی مہینوں سے طاری اذیت پسند سکتہ بالآخر ٹوٹ گیا۔

"بس کیجیے' خدا کے لیے چپ رہیں۔ میرے باپ کی بیماری کو تو تماشا نہ بنائیں' مجھے فخر ہے کہ ہم تینوں بہنوں نے اپنے کسی عمل سے انہیں کبھی شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ کبھی ان کا سر نہیں جھکنے دیا' اور اس کے لیے مجھے آپ کو گواہی پیش کرنے کی یا آپ سے گواہی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا دل جانتا ہے' میرا رب جانتا ہے اور میرے ماں' باپ جانتے ہیں' میں اپنے ضمیر کے آگے مطمئن ہوں اور وہ مجھ سے مطمئن ہیں۔ مجھے اب اپنے کردار کے بارے میں آپ کو کوئی صفائی نہیں دینا' لیکن آپ بھی کم از کم میرے والدین کے بارے میں ایسی بات کہنے سے پرہیز کیجیے' مجھ پہ آپ کا حق ہے' اگرچہ آپ اس حق کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں' پھر بھی' میں اس حق کو تسلیم کرتی ہوں' لیکن میرے گھر والوں کے بارے میں کسی قسم کی رائے زنی کا حق آپ کو نہیں ہے۔"

⬤ ⬤ ⬤

ہما نے من و عن ساری بات رخشندہ سے کہہ دی۔

وہ بھی بے یقین سی تھیں کہ خرم ایسی ذہنیت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

"خرم بھائی کچھ بھی کہیں' لیکن مجھے تقدیس ایسی نہیں لگتی' ویسے بھی جس کے دل میں چور ہو وہ نظر جھکا کے رہتا ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات نہیں کرتا۔"

"میں جانتی ہوں' یہ عمر ایسے ہی نہیں گزاری میں نے' تقدیس کا انتخاب اپنی اکلوتی بہو کے طور پہ خوب سوچ سمجھ کے کیا تھا میں نے' حیرت ہے کہ خرم کو اس کی آنکھوں میں حیا اور پاکبازی کی وہ جھلک نظر نہیں آتی؟"

"وہ غلط کر رہے ہیں امی! اور انہیں روکنا ہو گا' احساس دلانا ہو گا۔"

"مجھے تو پہلے ہی تاسف ہو رہا ہے کہ اتنے دنوں سے میرے گھر میں یہ سب ہو رہا ہے اور مجھے خبر نہیں۔"

⬤ ⬤ ⬤

رینا اسے اپنے گھر میں دیکھ کے ششدر رہ گئی۔

ثنا کا موڈ البتہ نارمل تھا' ایسے جیسے رینا کے گھر کسی سے ملنے آتے رہنا اس کا برسوں پرانا معمول ہو۔

"کیا ہوا؟ پہچانا نہیں؟" ثنا مسکرائی۔ "بڑی جلدی جلدی بھول جاتی ہیں آپ۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ثنا کے دوستانہ لہجے اور انداز نے رینا کو تلخ سے روک دیا تھا۔

"سوہا تو گھر پہ نہیں۔"

"اچھا۔" وہ اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی' جیسے سوہا کے ہونے نہ ہونے سے اسے خاص فرق نہ پڑتا ہو۔

"ابھی نکلی ہے' آنے میں وقت لگے گا۔"

اب رینا کے صاف جتانے پہ وہ نرمی سے مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ اس سے پھر کبھی مل لوں گی۔ اس بار تو خاص آپ سے ملنے آئی ہوں۔"

"مجھ سے؟ منزہ نے کوئی پیغام بھجوایا ہو گا؟" رینا نے تیکھے چتون کر کے پوچھا۔

جواب میں ثنا ہنس پڑی۔

"پیغام تو میں واقعی لائی ہوں، مگر منزہ نے نہیں بھجوایا۔ وہ اس قسم کے پیغام بھجوانے کی پوزیشن میں نہیں۔ بیٹیوں کی ماں ہے نا' ایسے پیغام تو میں ہی لا سکتی ہوں' اور آپ کے پاس' کیونکہ بہرحال سوہا آپ کی بیٹی ہے' آپ کو ہی مکمل اختیار ہے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا۔"

باوجود اس کے کہ ثنا کی ملائمت سے کی گئی باتیں ریتا کو تقویت کا احساس دلا رہی تھیں۔

باوجود اس کے کہ سوہا کو اس کا فراخ دلی سے اس کی بیٹی قرار دینا اسے فخر میں مبتلا کر رہا تھا' پھر بھی کوئی بے نام، معنی سی الجھن اسے گھیرے جا رہی تھی۔

□□□

رخشندہ جواب طلب انداز میں اس کے سامنے کھڑی تھیں اور خرم کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہاں جائے۔

"جواب دو خرم۔۔۔؟ میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے۔"

"اب میں کیا بتاؤں آپ کو۔" وہ سٹ پٹا گیا۔

"اگر کچھ ہے بتانے کو تو بتاؤ۔"

اس کے پاس جواب میں ایک شرمساری سی خاموشی تھی۔

"کچھ بھی نہیں ہے۔" رخشندہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اور اس کچھ بھی نہ ہونے کی بنیاد پہ تم اپنا گھر اور اس بچی کی زندگی دونوں کو خراب کر رہے ہو۔"

"ایسا نہیں ہے امی۔۔۔ کہ کچھ بھی نہ ہو۔ بے بنیاد عمارت کبھی کھڑی نہیں ہوتی' بس یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا' میں آپ سے اس موضوع پہ کیا بات کروں؟"

"جو بھی تمہارے دل میں ہے' کیا تقدیس کے بارے میں تم جو بھی رائے رکھتے ہو اس کی کوئی مضبوط ٹھوس وجہ ہے تمہارے پاس؟ کوئی ثبوت؟ اس کے ماضی کے حوالے سے؟"

"اس کو مشکوک ثابت کرنے کے لیے سب سے بڑا ثبوت اس کی صحبت ہے امی۔۔۔ انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے اور اس کے حلقہ احباب میں کچھ خاص اچھی شہرت کے حامل۔۔۔"

"میں نے تو اتنے مہینوں میں اس کی کسی بھلی یا بری دوست کو آتے جاتے نہیں دیکھا' اسے تو دوسری لڑکیوں کی طرح فون پہ گھنٹوں چپک کر سہیلیوں سے گپیں لگانے کی بھی عادت نہیں ہے۔"

"جس قسم کی اس کی سہیلیاں ہیں وہ کھلے عام ملنے کے قابل نہیں۔" وہ جل کے بولا۔

"تم مفروضوں کی بنیاد پہ بات کر رہے ہو' اس عمر اور اتنے تجربے کے بعد میں انسان کو پہچاننے میں اتنی بڑی غلطی نہیں کر سکتی۔ میں نے بھی تین' تین بیٹیوں کی پرورش کی ہے اور اس بناء پہ حلفیہ کہہ سکتی ہوں کہ تقدیس کسی بھی طرح کردار و اخلاق کے معیار میں ندا' ہما اور ردا سے کم نہیں۔"

"پلیز امی! بغیر سوچے سمجھے میری بہنوں کو کسی کے ساتھ نہ ملائیں' اور میں مفروضے نہیں گڑھ رہا۔ میں نے تقدیس کو شادی سے پہلے بھی اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا' وہ لڑکی جو ذرا سی بھی اچھی شہرت نہیں رکھتی' اور پھر عین شادی والے دن اس نے جو تماشہ کیا تھا' یاد ہے آپ کو۔"

"کون؟ سوہا؟"

"جی۔۔۔ وہی محترمہ۔۔۔ وہی جو وصی کے گھر کو آگ لگا رہی ہے۔۔۔ وہی جو ایک طوائف کی شہہ اور اس کی تربیت حاصل کر کے پلی ہے۔۔۔ جو دھڑلے سے ڈنکے کی چوٹ پہ ایک شادی شدہ سے عشق لڑا رہی ہے' وہی سوہا۔ آپ کی قابل فخر بہو تقدیس کی گہری دوست۔"

"اوہ تو یہ کھٹک ہے تمہارے دل میں۔۔۔"

انہوں نے ایک گہرا سانس بھرا۔

"پہلی بات تو یہ کہ وہ وہیں واضح ہو گیا تھا کہ تقدیس کی سوہا سے ایسی خاص دوستی نہیں ہے۔"

"اور یہ واضح کس نے کیا تھا؟" خرم نے مکمل بات سنے بغیر سوال اٹھایا۔

"خود تقدیس کے اپنے گھر والوں نے۔۔۔ وہ تو ظاہر ہے کہ بیٹی کے کارناموں پہ پردہ ڈالیں گے۔"

"کیسے کارنامے؟" وہ بھی ضبط کھو بیٹھیں۔

"بغیر کسی واضح اور ٹھوس ثبوت کے تم دھڑا دھڑ میرے سامنے منہ بھر بھر کے ایسے واہیات لفظ اس بچی کے لیے استعمال کیے جا رہے ہو جسے میں اپنی ذمے داری پہ بیاہ کر لائی تھی۔ اللہ سے یہ کہہ کر کہ یا اللہ جس طرح میں اس پرائی بیٹی کو اپنا بنا کے رکھوں گی ویسے ہی میری بچیوں کو ان کے گھروں میں محبت اور سلامتی عطا فرمانا۔ تم نے میری پوری بات سنی کب ہے۔ ہو جاتی ہے کالج میں ہر طرح کی لڑکیوں سے علیک سلیک۔۔۔ بچیاں تو نادان ہوتی ہیں انہیں لوگوں کو جانچنے پرکھنے کی سمجھ آتے آتے آتی ہے۔"

"کیا ہما کالج نہیں گئی؟۔۔۔ کیا ردا نہیں جاتی۔ ان کی تو ایسی اوٹ پٹانگ دوستیاں نہیں ہوئیں میں شروع سے دیکھتا آ رہا ہوں کیسے آپ ان کے اسکول کے زمانے سے ان کی سہیلیوں اور میل جول پہ نظر رکھا کرتی تھیں۔"

"ہر انسان کی سمجھ کا پیمانہ الگ ہوتا ہے۔ ایک ہی ماں کی گود میں پرورش پانے والی بچیاں الگ الگ سمجھ بوجھ اور فطرت لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ ہما ماشاءاللہ شروع سے ایسی رہی ہے کہ مجھے اسے بس اشارتاً کچھ سمجھانا پڑتا تھا۔۔۔ وہ خود محتاط ہو جاتی تھی۔ البتہ ندا۔۔۔ عمر میں ۔ سب سے بڑی ہونے کے باوجود اس کا تجربہ اس میدان میں صفر تھا اور صفر ہے۔ جانتے ہو کالج میں پڑھنے کے نہیں۔۔۔ بلکہ پڑھانے کے دوران وہ ایسا دھوکا کھا چکی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"چونکہ مت۔۔۔ عملی میدان میں آ جانے یا لیکچرر بن جانے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دنیاداری میں بھی ماہر ہو گئی۔ وین لگوا کے دی تھی تب میں نے اسے کالج سے آنے جانے کے لیے اور اس وین میں اس کی دوستی ایک ایسی لڑکی سے ہو گئی جو کسی ماڈلنگ وغیرہ کی کمپنی میں کام کرتی تھی۔۔۔ اور اس کا تعلق بڑے ہی بدنام گھرانے سے تھا۔ ایک بہن تو جعلسازی کے الزام میں جیل کاٹ رہی تھی۔۔۔ ماں نے تیسرا شوہر کر رکھا تھا۔۔۔ چھوٹی بہن کے واہیات ڈانسوں کی سی ڈی بازار میں کھلے عام مل رہی تھی اور وہ بھی یہ نوکری محض ذرا اونچی پارٹیوں سے تعلقات بڑھانے کے لیے کر رہی تھی۔"

"تو۔۔۔ پھر کیسے میرا مطلب؟" وہ بوکھلا کے رہ گیا۔

"کچھ بھی نہیں۔۔۔ دونوں کی علیک سلیک وین تک محدود تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ دوستی گہری ہوتی۔ روابط مضبوط ہوتے ہمیں نے اس لڑکی کے اطوار بھانپ لیے وہ دین سے اتر کر بس پانچ منٹ کے لیے گھر کے اندر پانی پینے آئی تھی۔ میں کھٹک گئی۔ میں نے کچھ سوال کیے ان سے میرے شک کو تقویت ہوئی اس کے بعد وصی کے ذریعے کھنگالا سب کچا چٹھا سامنے آ گیا۔ میرے سمجھانے پہ ندا نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔۔۔ وین بھی بدل لی۔ مگر خود سوچو کیا کسی نے اسے کبھی اس لڑکی کے ساتھ وین میں بیٹھ کر گپیں لگاتے نہ دیکھا ہو گا؟ کیا اس سے ندا کے بارے میں غلط رائے قائم کی جا سکتی ہے؟

خرم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"آج سوہا کی ممانی آئی تھی۔"

ریتا نے اصغر سے ذکر کیا۔

"وہ جو باہر سے آئی ہے۔۔۔ وہ والی؟"

❀ ❀ ❀

"کیا ہمارے درمیان اب صرف چُپ کا رشتہ رہ گیا ہے؟" کئی تکلیف دہ پل خاموش گزارنے کے بعد سوہا نے دریا کے سوکھتے کیچڑ زدہ پانی میں ایک کنکر اچھالتے ہوئے وصی سے پوچھا۔

وہ چونکا اور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

یہ نظریں..... یہ آنکھیں اتنی بے بس..... اتنی لاچار تھیں کہ سوہا کو اس سے خوف محسوس ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر ترس بھی آنے لگا۔

"تم کتنے بدل گئے وصی..... اور شاید اس تبدیلی کی وجہ میں ہوں۔"

وصی نے تردید کی..... نہ تصدیق۔

سوہا بجھ کے رہ گئی۔ شاید وہ وصی کی جانب سے تردید کی منتظر تھی..... کہ وہ کہے۔

"نہیں سوہا..... تم کیوں؟"

یا شاید وہ تصدیق کی منتظر تھی۔ کہ وہ کہے۔

"ہاں تم ہو میری زندگی میں تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ۔ تمہارے آنے سے میری زندگی میں رنگ ہی رنگ بھر گئے ہیں..... خوشیاں ہی خوشیاں بکھر گئی ہیں۔"

لیکن وہ چپ تھا اور اس چپ سے سوہا کا دل کٹ رہا تھا۔

"چلوں میں....." وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے سست سے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"اتنی جلدی.....؟ ابھی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔"

"ممانی کو ہاسپٹل لے کر جانا تھا۔"

"خیریت؟"

"ہاں وہ بھابی کے والد کی طبیعت کا پتہ کرنے جانا تھا۔" اسے بتانے کے بعد وہ چونکا۔ جیسے کچھ یاد آیا ہو۔

"میرا خیال تھا تم بھی گئی ہو گی..... آخر وہ تمہاری اچھی دوست رہی ہیں۔"

"ہاں..... اچھی دوست ٹھیک کہا تم نے۔" وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"اور یہ بھی ٹھیک کہا کہ رہی ہیں۔ وہ اور میں بڑے عجیب حالات میں دوست بنے اور ان سے بھی عجیب حالات میں الگ ہوئے۔ اب تو شاید کوئی وجہ بھی نہیں رہی اس سے ملنے کی۔"

"ہاں..... یہی بہتر ہے کیونکہ اب وہ صرف تمہاری سابقہ دوست نہیں ہیں..... میری بھابھی بھی لگتی ہیں میرے خاندان کا ایک حصہ۔"

وصی کی بے ساختگی سے کہی بات نے سوہا کو شدید دھچکا پہنچایا۔ وہ تو شاید کہنے کے بعد محسوس بھی نہ کر پایا کہ سوہا کی حساسیت پہ اس کا کتنا اثر ہوا ہے لیکن وہ اسی وقت ہسپتال جانے کا ارادہ کر بیٹھی۔

❀ ❀ ❀

"کیا بات ہے؟ آپ ہاسپٹل نہیں گئے آج؟" وصی نے لاؤنج میں لیٹے خرم سے پوچھا۔

"سب آپ کا پوچھ رہے تھے۔"

"روزانہ حاضری لگوانا ضروری ہے کیا؟"

وہ جلا بیٹھا تھا۔ رخشندہ نے کلاس ہی ایسی لی تھی۔

"ہاں..... پہلی بھی آئی تھی مگر سوہا سے ملنے..... خاصا ملنا جلنا رکھ لیا ہے اس نے سوہا سے اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سوہا جو ماں اور اس کے حوالے سے کسی بھی رشتے سے خار کھاتی تھی۔ اس سے ایسے گھل مل گئی ہے جیسے....."

رینا سے بات مکمل نہ ہو سکی تو وہ لب کاٹ کے رہ گئی۔ اصغر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

یہ سانولے رنگ کی تیکھے نقوش والی..... متناسب جسم و قد کی مالک..... عمر چور قسم کی عورت..... جس سے کبھی وہ بے تحاشہ محبت کرتا تھا۔

پھر جس کی حاکمانہ اور منتقمانہ فطرت سے گھبرا کے اس سے کترانے لگا تھا۔

اور پھر ایک وقت تھا جب وہ یہ جان گیا تھا کہ یہ عورت جو پچھلے پندرہ سالوں سے اس کے ساتھ ہے، نہ کبھی اس سے محبت کرتی تھی، نہ کرتی ہے تو وہ اس سے شدید نفرت بھی کرنے لگا تھا۔

لیکن اب کچھ عرصے سے یہی محبت سے بے زاری اور بے زاری سے نفرت میں ڈھلا جذبہ ہمدردی اور ترحم میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

"کیوں دل چھوٹا کرتی ہو؟ صرف یہ سوچ کر کہ تم اس کی سگی نہیں ہو..... وہ سگے ہیں؟ جھلی وہ ہماری سگی بیٹی بھی ہوتی تو ہم اس کے سگے ہمیشہ تو نہیں رہنے والے تھے۔"

"کیا مطلب؟" وہ الجھی۔

"کبھی بیٹیاں بھی حق جتانے کے لیے ہوتی ہیں؟ یہ تو فرض نبھانے کے لیے ہوتی ہیں..... میں جانتا ہوں سگا چچا ہونے کے باوجود شاید مجھے سوہا سے اتنی شدید محبت نہیں ہے۔ جتنی تجھے ہے مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ تو شاید زندہ ہی سوہا کے لیے ہے لیکن رینا میری رانی! اب وقت آ گیا ہے کہ تو اپنے دل کو مار لے..... سوہا کو کتنا عرصہ اور گود میں چھپا کے رکھے گی؟"

"میں اسے منزہ کے پاس نہیں جانے دوں گی۔ کبھی نہیں، نہیں ہے وہ سوہا کی ماں، وہ ایک خود غرض عورت ہے۔ اس نے سوہا کی تب پروا نہیں کی جب سوہا کو اس کی ضرورت تھی تو اب کیا کرے گی۔ میں نہیں جانے دوں گی اسے منزہ کے پاس۔"

"کون کہہ رہا ہے کہ اسے منزہ کے پاس جانے دے اور منزہ بھی اب اسے تجھ سے واپس لے کر کیا کرے گی اب وہ وقت آ گیا ہے جب حق دار کو امانت سونپی جانی ہے۔ اسے رخصت کرنے کا وقت۔ اب وہ تیرے میرے پاس رہے یا منزہ کے پاس..... کرنا تو اسے رخصت ہی ہے۔"

رینا گم صم سی اسے دیکھنے لگی۔

"اسی لیے سمجھا رہا ہوں..... آہستہ آہستہ دل پکا کرنا شروع کر دے ورنہ بعد میں تکلیف ہو گی۔"

"میں..... مجھے پتہ ہے سوہا نے چلے جانا ہے لیکن میں وہ نہیں ہونے دوں گی جو منزہ چاہتی ہے۔ اس کی سازش جان گئی ہوں میں۔ وہ سوہا کو ہمیشہ کے لیے اپنی مٹھی میں کرنا چاہتی ہے۔"

"پھر سے بھرجائی کا خوف؟" وہ جھنجلا اٹھا۔

"اب سوہا کی شادی میں بھرجائی کہاں سے آ گئی؟"

"تمہاری اسی چالاک سازشی بھرجائی نے اپنی بھرجائی کو یعنی سوہا کی ممانی کو یہاں کس لیے بھیجا تھا..... جانتے ہو؟"

اصغر سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"سوہا کا رشتہ مانگنے۔"

"سوہا کا رشتہ؟"

"ہاں..... اپنے بیٹے کے لیے۔"

"آخر آپ کے سسر ہیں وہ...... جانا تو چاہیے۔"
"تمہارا سسر ہسپتال جائے گا تو دیکھ لیں گے تم کتنے پھیرے لگاتے ہو؟"
خرم نے وصی اور شمہ کے رشتے کی کڑواہٹ پہ چوٹ کی...... وصی کچھ دیر تو بول ہی نہ سکا...... خرم سے اس ہلکے پن کی توقع نہ تھی۔ اس کا ردِ عمل دیکھ کے خرم بھی شرمسار سا ہو گیا۔ اپنے رویے کی بدصورتی اور الفاظ کی کراہیت کا احساس ہوا تو معذرت کرنے لگا۔
"سوری یار...... دراصل پہلے ہی امی نے اس ٹاپک پہ لیکچر دے دے کر پریشان کیا ہوا تھا...... اوپر سے تم بھی۔"
"کوئی بات نہیں...... لیکن بولنے سے پہلے اتنا تو سوچ لیں کہ آپ کس کے بارے میں کیا بات کر رہے ہیں۔ مجھے واقعی اپنے سسر سے کوئی خاص جذباتی وابستگی نہیں ہو گی۔ مگر شمہ کو اپنے والد...... اور ممانی کو اپنے بھائی سے تو ہو گی۔ اگر وہ سن لیتیں تو کتنا برا لگتا انہیں۔"
پھر اس کے پاس بیٹھ کر دوستانہ انداز میں پوچھا۔ "مسئلہ کیا ہے؟"
خرم کچھ دیر اسے دیکھتا رہا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس سے شیئر کرے یا نہیں۔

پھر آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں...... کوئی مسئلہ نہیں۔ تم سناؤ کچھ فیصلہ کیا یا نہیں؟"
"کس بارے میں؟"
"یہ جو دو کشتیوں پہ سوار ہو تم...... اس کا کوئی فیصلہ تو کرنا ہو گا...... یا لٹکائے رکھو گے دونوں کو۔"
"بعض فیصلے زندگی خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ میں بھی نہیں جانتا...... میری زندگی کا یہ موڑ مجھے کہاں لے کر جانے والا ہے...... میں نے خود کو حالات اور تقدیر کے سپرد کر دیا ہے۔"
"یہ تو شکست کا اظہار ہے۔"
"ہاں...... میں بری طرح شکست کھا چکا ہوں۔ دل اور ضمیر دونوں کے ہاتھوں...... نہ دل کو سمجھانے میں کامیاب ہو پا رہا ہوں کہ وہ سوہا سے دست بردار ہو جائے نہ ضمیر کو سُلا پا رہا ہوں کہ وہ ممانی کی توقعات کو توڑنے کی ہمت کر لے۔"
"سوہا......" خرم کچھ کہتے کہتے رکا...... پھر اچانک بات مکمل کر ڈالی۔
"سوہا اور تقدیس تو گہری دوست ہیں ناں؟...... تم کہو تو میں تقدیس سے بات کروں...... سوہا کو کچھ سمجھائے؟"
"اسے کیا سمجھانا ہے؟" وہ حیران ہوا۔
"وہ مجھے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر رہی...... نہ کسی قسم کا کوئی دباؤ ڈال رہی ہے۔ آپ سب اسے غلط سمجھ رہے ہیں...... اس نے تو مجھ سے کہیں پہلے شکست تسلیم کر لی تھی۔"
"پھر بھی...... میں تقدیس سے۔"
وہ گھما پھرا کے بات کو وہیں لا رہا تھا۔
"یہ ایک اور غلط فہمی ہے آپ کی...... بھابی کی کبھی بھی سوہا سے ایسی دوستی نہیں رہی کہ وہ اس کے فیصلوں یا جذبات پہ اثر انداز ہوں۔ مجھ سے ملنے سے کچھ ہی دن پہلے دونوں کی کالج میں دوستی ہوئی تھی...... سوہا اور بھابی ایک دوسرے سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنے میں اور سوہا۔ لیکن میرے معاملے میں محبت کا کرشماتی پس منظر تھا جو انسان کو سامنے والے کی سب خامیاں، تمام کمیاں بھلا دینے پہ مجبور کر دیتا ہے۔ وہاں صرف دوستی تھی محبت دو مخالف فطرتوں کے لوگوں میں آسانی سے پنپ جاتی ہے لیکن دوستی صرف ہم مزاج لوگوں کی نبھ پاتی ہے۔ اس لیے یہ وقتی شناسائی کچھ ہی دنوں میں ختم ہو گئی تھی۔ کچھ بھابی کے گھر کا ماحول بھی کافی سخت تھا۔ سوہا اس بات سے ہرٹ بھی ہوئی لیکن......"

بات کرتے کرتے اس نے خرم کو دیکھا جہاں سوچ کی گہری پرچھائیاں چہرے پر نظر آ رہی تھیں۔
"کیا ہوا؟"
"ہوں کچھ نہیں۔" وہ چونکا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔
"اس سے پہلے کہ امی ایک اور لیکچر دینے آ جائیں، سوچ رہا ہوں کہ انہیں لے کر ہسپتال کا چکر لگا ہی لوں۔"
وصی مسکرایا۔
"نیک خیال ہے۔ ممانی ان کے انتظار میں وہیں رک گئی تھیں۔ ان کو بھی ساتھ لیتے آیئے گا۔"

❀ ❀ ❀

سوہا فروٹ باسکٹ اور بوکے لے کر روم میں داخل ہوئی تو جعفر محمود کو سوپ پلانے کے بعد نیپکن سے ان کا چہرہ صاف کرتی تقدیس نے ٹھٹک کر اسے دیکھا...... کچھ ایسا ہی دھچکا سوہا کو بھی لگا۔
کیونکہ تقدیس کے چہرے کی شادابی جیسے کسی نے نچوڑ کے رکھ دی تھی...... آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے، پژمردگی۔ سوہا کتنی ہی دیر اسے اور وہ سوہا کو تعجب سے دیکھے گئی۔ جعفر محمود کے مخاطب کرنے پہ دونوں چونکیں۔
"تقدیس...... یہ کون ہیں بیٹا؟"
"یہ...... یہ میری......"
سوہا کی نظریں اس نامکمل اور جھجکتے ہوئے تعارف پہ جھک گئیں۔
"یہ میری دوست ہیں...... سوہا۔"
اس کے ہمت کر کے کہہ دینے پہ سوہا کی نظریں ایک بار پھر اٹھیں اور اسے مشکور انداز میں تکنے لگیں۔
"اچھا...... اچھا۔"
یقیناً جعفر محمود کے حافظے سے اس دن غصے میں بپھری اور مہمانوں کے سامنے تماشا کرتی اس لڑکی کی شکل محو ہو چکی تھی۔
رخشندہ بڑے مطمئن انداز میں خرم کے ساتھ ہسپتال میں داخل ہوئیں...... انہیں لگ رہا تھا کہ شاید ان کے سمجھانے کا اثر ہوا ہے خرم پہ جب ہی وہ انہیں لے آیا ہے۔ اندر پروین کو بڑے سنجیدہ تاثرات لیے دیکھا تو ٹھٹک کر پوچھا۔
"خیریت پروین؟"
"فی الحال تو خیریت ہے...... شکر ہے یہ آفت وصی کے جانے کے بعد آئی ہے۔"
"کیسی آفت؟" وہ گھبرا گئیں۔
"وہی سوہا۔"
خرم بھی بھرپور طریقے سے چونکا۔
"وہی آئی ہوئی ہے اندر...... تقدیس کے ساتھ وزیٹر روم میں بیٹھی ہے۔" خرم کے اعصاب تن گئے۔

"سوہا...... اور اندر...... تقدیس کے ساتھ۔" اس نے زہریلے انداز میں سوچا اور ایک جتاتی ہوئی نظر ماں پہ ڈالی جو ابھی کچھ دیر قبل کہی باتوں پہ اب خود نادم سی ہو کر نظر چرا رہی تھیں۔
وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھا۔
"خرم! رکو۔" انہوں نے گھبرا کے پکارا...... مگر وہ نہ رکا۔

آج وہ سارے بھرم چاک کرنا چاہتا تھا۔

❂ ❂ ❂

"ایک عرصے بعد تم نے مجھے دوست کہا' مجھے اچھا لگا۔" سوہا کے مسکرا کے کہنے پہ تقدیس نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری دوست ہونے کی بڑی بھاری قیمت چکائی ہے میں نے سوہا!"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں' تم بتاؤ' کیسے پتا چلا میرے پاپا کے بارے میں۔"

"ظاہر ہے... وصی سے۔"

"سوہا! ایک بات کہوں۔"

"نہیں رہنے دو۔"

اس نے بغیر فوراً منع کر دیا تو تقدیس حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔

"کیونکہ میں جانتی ہوں تمہیں کیا کہنا ہے۔" وہ کرب سے مسکرائی۔

"تم مجھے مخلصانہ مشورہ دینا چاہتی ہو کہ میں وصی کو بھول جاؤں' مجھے غیر جانبدارانہ انداز میں سمجھانا چاہتی ہو کہ میں اور وصی الگ دنیاؤں کے باسی ہیں' مجھے اس حقیقت سے روشناس کرانا چاہتی ہو کہ ہم کبھی ایک نہیں ہو سکتے' یا کبھی ہو بھی جائیں تو زندگی ویسی خوشگوار اور سبک نہیں ہوگی' جس کے خوش کن تصور ہم دونوں نے باندھ رکھے ہیں' مجھے خبردار بھی کرنا چاہتی ہو کہ یہ ساتھ... یہ تعلق مجھے سوائے رسوائی اور خواری کے کچھ نہیں دے گا' ہے نا؟ یہی کہنا ہے نا تمہیں تقدیس؟"

وہ چپ کی چپ رہ گئی۔

"پھر بہتر ہے کہ تم یہ سب مت کہو' کیونکہ میں ان تمام تلخ حقیقتوں سے پہلے ہی واقف ہوں۔"

"واقف ہو تو سنبھل کیوں نہیں جاتیں؟"

"کبھی کوئی خود بھی سنبھلا ہے اس خاندان میں تقدیس؟ جب تک کہ کوئی سنبھالنے والا ہاتھ آگے نہ بڑھے۔ تمہاری چند روزہ دوستی نے مجھے کیسا سہارا دیا تھا اس دلدل سے نکلنے کا' جس میں' میں ان فرینڈز کی وجہ سے دھنستی جا رہی تھی' جن کی تمام تر بے راہ روی کے باوجود کوئی ان پہ انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ ان کا تعلق ایسی فیملی سے نہیں تھا جیسا میرا تھا۔ ان کے باپ جاگیردار' سرمایہ کار اور وہ بھی پشت در پشت سے چلے آ رہے تھے' میرے باپ کی طرح تکا لگا کے نو دولتیے نہیں تھے۔ ان کی مائیں بھی میری ماما کی طرح سیاہ پس منظر نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی تمام حرکتوں پہ پردہ ڈالنے کے لیے ان کے خاندان کا حوالہ کافی تھا' یہ تم تھیں' جس نے میرے اندر کی اس سوہا کو باہر نکالا' وہ سوہا' جسے اس کی ماں منزہ اور مرحوم باپ مظہر نے بڑے ارمانوں سے پالنے کے خواب دیکھے تھے۔ لیکن پھر تم نے بھی چند ہی دنوں بعد ہاتھ کھینچ لیا' ایک وصی تھا' جس نے میرے اندر لگن پیدا کی کہ میں کسی دوسرے کے لیے' کسی کی خوشی کی خاطر اپنی اصلاح کروں' خود کو سنواروں' اور میں نے کوشش بھی کی'

لیکن اب وہ بھی گھبرانے لگا ہے' تھکنے لگا ہے۔"

"وہ اس دنیا میں اکیلا ہوتا' یا تم اس کی اکیلی محبت ہوتی تو وہ نہ تھکتا' نہ گھبراتا' مگر اس سے وابستہ دوسرے بہت سے رشتے ایسے ہیں جو اسے تھکنے پہ مجبور کر رہے ہیں۔"

"اور تم... تم تقدیس؟"

"میں تو اس سے بھی کمزور ہوں سوہا! میں ایک لڑکی ہوں۔ میں کتنا بھی تمہارے بارے میں دوسروں کو صفائیاں دے لوں' تمہاری دوستی اور تم سے تعلق مجھے کٹہرے میں کھڑا رکھے گا' اور جو غلطی تم نے میری شادی کے موقع پر کی تھی وہ تو..."

"میں اس پہ واقعی شرمندہ ہوں' وہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی' سب سے بھیانک غلطی... اس وقت جذبات میں اندھی ہو کر میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس سے میں اپنے لیے تو گڑھا کھود ہی رہی ہوں' تمہارے لیے بھی مشکلات پیدا کر دوں گی' اس واقعے کے بعد سب نے تم سے پوچھا تو ہوگا میرے بارے میں؟"

"سب کا تو پتا نہیں' ہاں مگر ایک شخص ہے' جس کے نہ سوال ختم ہوتے ہیں نہ اندیشے۔"

اس کے بے حد کرب سے کہنے پہ سوہا چونکی۔ "کیا مطلب؟ کون؟"

"کوئی نہیں' بس ایسے ہی۔" وہ کترا گئی۔

"تم اب جاؤ سوہا! تم آئیں' پاپا کی خیریت دریافت کی' مجھے اچھا لگا' لیکن برا مت ماننا' میں نہیں چاہوں گی کہ آئندہ کبھی ہماری ملاقات ہو۔"

"اور میں اگرچہ یہ چاہتی ہوں کہ ہمیشہ ہماری ملاقات رہے' اس کے باوجود تمہاری خواہش کا احترام کروں گی' اور پتا ہے میں ایسا کیوں چاہتی ہوں' کیونکہ آج احساس ہوتا ہے کہ وہ چند دن جو میں نے تمہاری دوستی کے ساتھ گزارے' ان چند دنوں میں' میں کتنی خالص اور بے ریا رہی' شاید محبت کا اثر تھا۔"

"ہاں' محبت اچھے یا برے اثرات ڈالتی تو ہے' جیسے تمہاری محبت نے مجھ پہ ڈالے۔"

تقدیس کی نظروں کے سامنے وہ تکلیف دہ دن گزر گئے' جب خرم نے اس محبت کے حوالے سے اس پہ تکلیف دہ الزامات لگائے تھے۔

"جانے دو یار! میری محبت نے کیا اثر ڈالنا ہے کسی پہ' تم پارس ہو' تم تو پتھر کو سونا بنا سکتی ہو' مگر میں' بھلا کبھی لوہے کے ٹکڑے سے سونے کو بھی زنگ لگتا ہے؟"

سوہا نے رشک بھرے لہجے میں کہا۔

"تم ان لڑکیوں میں سے ہو تقدیس! جن کو کوئی بھی اپنی زندگی کا ساتھی بنا کے فخر محسوس کرے' جن کا کردار' جن کا ماضی' میرے کردار اور ماضی کی طرح داغ دار نہیں ہے۔ جن کی شخصیت میں کوئی جھول نہیں ہے' جن کے دامن میں کوئی چھید نہیں ہے' کوئی ایک بھی ندامت بھرا لمحہ' پچھتاوے کی ایک ہلکی سی پرچھائیں' تم کتنی خوش قسمت ہو تقدیس! تمہارا ضمیر اپنے کسی فعل یا عمل کے لیے بوجھل نہیں ہے' خوش قسمت ہو تم تقدیس' خوش قسمت' اور وہ شخص خوش قسمت ترین' جس کی زندگی میں تم شامل ہو' اور میں' میں نہ خود اتنی خوش نصیب بن سکی' نہ میں وصی کو وہ خوش قسمت ترین شخص بنا سکتی ہوں۔"

یاسیت سے کہتی وہ جانے کے لیے پلٹی' اور اپنے پیچھے اندر آتے خرم کو دیکھ کے لمحے بھر کے لیے رکی' پھر آگے بڑھ گئی' لیکن تقدیس کی تو گویا اوپر کی سانس اوپر' اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

❂ ❂ ❂

"تجھے بات تو کرنی چاہیے سوہا سے۔" اصغر نے رینا کو اکسایا۔

"نہیں' کوئی فائدہ نہیں' اس نے کون سا ماننا ہے۔"

"پھر بھی... بچیوں کے پیغام آئیں تو ان تک پہنچانا' ان کی مرضی جاننا تو چاہیے۔"

"تمہیں بڑی سمجھداریاں سوجھ رہی ہیں۔" رینا نے طنز بکھارا۔

”بس میں نے کہہ دیا نا۔۔۔ مجھے اس سے کچھ نہیں جاننا۔۔۔ نہ کچھ بتانا ہے۔۔۔ یہ میرا اور میری بیٹی کا معاملہ ہے، تم الگ رہو اس سے۔“

”سوہا میری بھی کچھ لگتی ہے ریتا!“ اصغر نے کڑے تیور اختیار کیے۔ ”بیٹی نہ سہی، بھتیجی تو ہے، اور وہ بھی منہ بولی نہیں، سگی، خون کا رشتہ ہے میرا اس سے۔“

کتنی دیر ریتا کچھ کہہ نہ سکی۔ پھٹی پھٹی بے یقین نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”تم۔۔۔ تم مجھے طعنہ دے رہے ہو؟ مجھے یہ جتلا رہے ہو کہ میرا اور سوہا کا رشتہ خون کا نہیں ہے، میں اس کی سگی نہیں ہوں، وہ میری منہ بولی بیٹی ہے۔“

”یہ میں طعنہ نہیں دے رہا، یہ تم ثابت کر رہی ہو، اگر ماں ہو۔۔۔ تو ماں کا فرض نبھاؤ، اس کے لیے ایک اچھے خاندان کے اچھے، شریف، برسرروزگار لڑکے کا رشتہ آیا ہے، اسے بتاؤ، اس کی مرضی معلوم کرو، اگر وہ انکار کرے تو اسے سمجھاؤ، اسے راضی کرنے کی کوشش کرو۔“

”واہ، ابھی صرف اس تک بات پہنچانے کا حکم سنا رہے تھے، اب راضی کرنے کی ذمے داری بھی سونپی جا رہی ہے، کل کو کہو گے، زبردستی اسے لال جوڑا پہنا کے رخصت بھی کر دو، اچھا فرض نبھا رہے ہو سگے چچا ہونے کا، نکلے نہ تم بھی پینڈو کے پینڈو، میں سوہا کے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی۔“

”کیسا ظلم کوڑھ مغز عورت۔۔۔!“

اصغر کے کوڑھ مغز کہنے پہ وہ تلملا کے رہ گئی۔

”اچھا۔۔۔ میں کوڑھ مغز ہوں، اور تم کیا ہو؟ وہی روایتی جاہل مرد، بیٹی کے رشتے کو انا کا مسئلہ بنا رہے ہو، بس نہیں چل رہا کہ اسے کسی راہ چلتے کے ہاتھ تھما دو، یہ ظلم نہیں ہے تو کیا ہے؟ میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہونے دوں گی، سنا تم نے؟“

”میں اس کے ساتھ زبردستی کرنے کا نہیں کہہ رہا، لیکن وہ بچی ہے، نادان ہے، اسے زندگی کا نہ تجربہ ہے، نہ لوگوں کی پرکھ، اگر ہم اس کے بڑے بن کے اسے کسی کے بارے میں بتائیں گے نہیں کہ کون اس کے لیے اچھا ہے اور کون برا، تو اسے کیا پتا چلے گا، اور مجھے لگتا ہے یہ رشتہ اس کے لیے بہترین ہے۔“

”خاک بہترین ہے، وہ ملک سے باہر چلی جائے گی، مجھ سے دور ہو جائے گی۔“

”بیٹیاں چاہے اگلے محلے بیاہی جائیں، دور تو ہو ہی جاتی ہیں، اور اگر تمہیں اس سے واقعی ماں والی سچی محبت ہے تو اپنے بارے میں نہیں، اس کے بارے میں سوچو، یہ سوچ کر مت گھبراؤ کہ تمہارا کیا بنے گا، یہ سوچو کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے، ملک سے دور جانا تو اس کے لیے اچھا ہے، یہاں کیا رکھا ہے اس کے لیے، تمہارا حوالہ، ماں کے ٹوٹتے رشتے کی کڑواہٹ، دور رہے گی تو سب بھلا کے جلدی سیٹ ہو جائے گی، اور جڑیں تو اس کی بھی ادھر ہیں، اس لڑکے کی بھی ہو جائیں گے، کچھ سالوں بعد ادھر شفٹ جیسے اس لڑکے کے ماں، باپ وطن لوٹ آئے ہیں۔“

ریتا سوچ میں پڑ گئی۔

اصغر نے نرمی سے اس کے کاندھے کے گرد بازو پھیلا کے اسے اپنے نزدیک کیا۔

اور یہ قربت شاید عرصے بعد اس نے بخشی تھی۔

ریتا نے بنا کسی مزاحمت کے اس کے کاندھے پہ سر ٹکا کے آنکھیں موند لیں۔

اور یہ سپردگی بھی اس نے عرصے بعد اصغر کو سونپی تھی۔

Q Q Q

پروین کچن میں کام کر رہی تھیں۔

ہما کا بی پی بے حد لو تھا۔ پروین نے اسے زبردستی کچن میں آنے سے روکا تھا۔ گرمی بھی تو بے حد تھی، اوپر سے لوڈشیڈنگ نے مت مار رکھی تھی۔ وہ اس کا پورا پورا خیال رکھتیں، پھر بھی ہما ڈنڈی مار لیتی اور گھر کے کسی نہ کسی کونے میں کچھ نہ کچھ کرتی پائی جاتی۔

”پھوپھو۔۔۔“ وشمہ کی مدھم آواز پہ وہ مڑیں۔۔۔

وہ شرمسار سا چہرہ لیے کچن کے دروازے پر کھڑی انگلیاں مسل رہی تھی۔

”کوئی کام ہے تو بتا دیں۔۔۔“

پروین اس کے پسپا لہجے، اور اس پیشکش پہ جی بھر کے حیران ہوئیں، مارے حیرت کے کتنی دیر کچھ کہہ بھی نہ سکیں۔

”کیا بنا رہی ہیں؟“ وہ آگے بڑھی۔

”کریلے گوشت، ماش کی دال اور بینگن کا بھرتہ۔“

”ماش کی دال مجھ سے ڈھیلی بنتی ہے، کریلے گوشت تو بنانے نہیں آتے، بھرتہ میں بنا دوں؟“

”ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے بنا لو۔“

وہ مصالحانہ انداز میں بولیں، جب وشمہ خود سے پیش قدمی کر رہی تھی تو وہ کیوں اکڑی رہتیں۔

”سب سے پہلے کیا کرتے ہیں؟“

وشمہ کے پوچھنے پہ پروین کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”میں سمجھی شاید یہ بنانا آتا ہے۔“

وشمہ خجل سے انداز میں مسکرا دی۔

”آؤ۔۔۔ میں بتاتی ہوں، بلکہ ساتھ ساتھ کریلے اور دال بھی دیکھتی جاؤ، اچھی طرح سیکھ لو کیسے بناتے ہیں، میں روز روز کچن میں نہیں آنے والی، لوگ باتیں کریں گے کہ وہ دو، دو بہوئیں ہوتے ہوئے پروین خود جتی رہتی ہے، میرا کیا ہے، میرے حصے تو ہمدردیاں آئیں گی لوگوں کی، باتیں تم لوگوں کو سننا ہوں گی۔“

وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتی پیاز کاٹنے لگیں۔

”چلو۔۔۔ ہما کی تو مجبوری ہے، اسے رعایت مل سکتی ہے، ویسے بھی گرمی میں اسے آنے بھی نہیں دیتی کچن میں، پسینہ آنے سے اس کا بی پی لو ہو جاتا ہے اور حالت خراب ہو جاتی ہے، لیکن پھر بھی وہ رات کو کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹا دیتی ہے، اب تم سیکھ ہی لو تو اچھا ہے۔“

”آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤں گی، ویسے مجھے پیکٹ والے، مسالوں سے سب بنانا آتا ہے، بریانی، قورمہ، اچار گوشت، کڑھائی گوشت، بنا کے کھلاؤں گی آپ کو، بالکل پرفیکٹ بنتا ہے، مگر کریلے گوشت اور بھرتے وغیرہ کے مسالوں والے پیکٹ ہی نہیں ملتے۔“

پروین نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے بھرتے کا دہی پھینٹتے باتیں کرتے دیکھ رہی تھیں، عرصے بعد آج وہ وہی معصوم سی الھڑ سی وشمہ لگ رہی تھی۔

”ویسے مجھے دوسرے کچھ اور کھانے بھی بنانے آتے ہیں، مسالے کے پیکٹ کے علاوہ، جیسے مونگ مسور کی دال، آلو کی بھجیا، مکس پکوڑے، دہی بڑے، فروٹ چاٹ، ڈرم اسٹکس، سبزی کا پلاؤ، اور۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ فروٹ ٹرائفل اور شاہی ٹکڑے بھی۔“

”ارے واہ! تمہیں تو بہت کچھ آتا ہے۔“

پروین نے حوصلہ افزائی کی خاطر سراہا۔
"آٹا گوندھنا نہیں آتا مگر روٹی اچھی بنا لیتی ہوں۔"
"ٹھیک ہے' آج بنا کے دکھاؤ' آٹا ہما صبح صبح گوندھ لیتی ہے' پراٹھوں کا بھی اور چپاتیوں کا بھی۔"
"پھوپھو!" وہ جھجکی۔
"ہاں۔۔۔ بولو۔۔۔ اور کیا بنانا آتا ہے؟"
وہ مہارت سے کریلے بھونتے اور دوسرے چولہے پہ دال میں مسالا ڈالتے پوچھ رہی تھیں۔
"وہ۔۔۔ پھوپھو۔۔۔ سوری۔"
پروین نے ہاتھ روک کے اسے دیکھا' دھلے دھلے معصوم کم عمر چہرے پہ شرمساری کی لالی تھی۔
"کس بات کے لیے؟"
"سب باتوں کے لیے پھوپھو۔۔۔ ساری بدتمیزیوں' ساری بدگمانیوں' ساری غلط فہمیوں کے لیے۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔
سچے موتیوں جیسے شفاف آنسوؤں سے۔
پروین نے بے اختیار محبت سے اس کے گال تھپتھپائے۔
وہ پروین کے گلے لگ گئی۔

* * *

"سنیے۔۔۔ آج ڈاکٹر سے اپائنٹ منٹ ہے' لے جائیں گے؟" ہما نے فون پہ حسن سے کہا۔
"نہیں۔" حسن نے چھوٹتے ہی کہا' پھر ہنس پڑا۔
"عجیب باتیں کرتی ہو' کیوں نہیں لے کر جاؤں گا؟"
"نہیں۔۔۔ یہ مطلب تھا۔" وہ جھینپ گئی۔
"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"
صبح وہ گھر سے نکلا تو ہما بی پی لو ہونے کی وجہ سے کچھ نڈھال سی تھی۔
"جی۔۔۔ ٹھیک ہوں اب۔"
"کھا پی رہی ہو یا۔۔۔؟"
"جی۔۔۔ بالکل۔۔۔ ایک آپ گھر سے چلے بھی جاتے ہیں تو کیا ہوا؟ یہاں بہت سے لوگ ہیں زبردستی کھلانے والے۔۔۔ دادو ہیں۔۔۔ چچی ہیں۔۔۔ امی ہیں۔۔۔ اور پتا ہے آج مجھے ملک شیک کس نے لا کے اصرار کے ساتھ پلایا؟"
"حسان مونو نے؟"
"نہیں۔"
"تو۔۔۔ تو پھر رداست نے؟"
"نہیں۔۔۔ ان سے بھی بڑا معجزہ۔"
"آسمان سے اترا تھا ملک شیک کا گلاس؟"
"نہیں جناب۔۔۔ وشمہ بنا کے لائی تھی' اپنے ہاتھوں سے۔"
"ہاتھوں سے۔۔۔ چھی چھی۔"
"میرا مطلب ہے بلینڈر میں۔" وہ کھلکھلا کے ہنسی۔

"یہ کیسے بھئی؟"
وشمہ کے ذکر پہ اب حسن کو کسی خلش کا احساس نہیں ستاتا تھا' وقت نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس کے لیے جو سب سے بہترین تھا' تقدیر نے وہی منتخب کیا تھا۔
"آج کل اس میں کافی مثبت تبدیلیاں دیکھی جا رہی ہیں' چچی کے ساتھ بھی اس کا رویہ بدلا ہے۔"
"اچھی بات ہے۔" حسن نے اسے سرسری سا لیا۔
"تم وقت پہ تیار رہنا۔۔۔ ڈاکٹر کا ٹائم سات بجے کا ہے' میں ٹھیک سوا چھ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ بس ہارن دوں گا' نکل آنا۔ ٹریفک بہت ہوتا ہے اس ٹائم' دیر نہ ہو جائے۔"
"ٹھیک ہے' میں تیار رہوں گی۔"
"کس رنگ کے کپڑوں میں؟" وہ شوخ ہوا۔
"جو آپ کہیں۔"
"اوں۔۔۔ آسمانی۔۔۔ اور پلیز۔۔۔ ہمیشہ کی طرح وہ اپنی پسندیدہ کافی کلر کی لپ اسٹک مت لگا لینا۔۔۔ کتنی بار کہا ہے مجھے تمہارے ہونٹوں پہ گلابی لپ اسٹک اچھی لگتی ہے' اچھی بھلی کھلی کھلی رنگت کو تم کافی کلر لگا کے عجیب پُراسرار سا بنا لیتی ہو۔"
اس کے عجیب و غریب اعتراض پہ وہ دیر تک ہنستی رہی۔ فون بند کرنے کے بعد بھی۔
الماری میں سے ہینگ کیا ہوا ہلکا آسمانی گلابی بارڈر والا سوئس لان کا سوٹ نکالتے ہوئے ایسے ہی اسے پل بھر کو خیال آیا۔ گزرے دنوں میں جب اسے بھنک پڑی تھی کہ وصی کو سیاہ رنگ بے حد بھاتا ہے تو وہ کتنے ہی سوٹ اس رنگ کے بنا بیٹھی تھی' حالانکہ رخشندہ چڑا کرتی تھیں بن بیاہی بچیوں کے سیاہ رنگ میں ملبوس رہنے پہ' لیکن وہ مکمل لباس نہ سہی' ہر لباس میں اس رنگ کا تڑکا ضرور لگاتی' اور پھر بہانے بہانے سے وصی کے سامنے آتی' مگر کبھی اس نے نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا تھا۔
ہما کا دل بوجھل سا ہو گیا۔
وصی کی یاد سے نہیں' بلکہ اپنی اس رائیگاں ریاضت سے۔
"کتنی بے مقصد لٹائی میں نے وہ توجہ' وہ محبت' ایک ایسی ہستی پہ' جسے نہ میری پروا تھی' نہ اب اس کی ہے' جو اس توجہ اور محبت کی اصل حق دار ہے۔ کاش میں نے اپنے جذبے سینت کر رکھے ہوتے' لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ شکر ہے اس ذات پاک کا جس نے مجھے بے اختیار ہونے سے روکا اور آج میری نظر نہ وصی کے سامنے شرمسار ہے' نہ اپنے شوہر کے سامنے گناہ گار۔ رہی یہ دل کی خلش تو اس کی تلافی میں حسن کو اپنی مکمل وفا اور محبت دے کر مٹا ڈالوں گی۔ اور ایک بار پھر اللہ پاک کا شکر کہ وصی کے معاملے میں' میں نے گستاخی کا ارتکاب کرتے ہوئے اپنے رب سے کوئی گلہ نہیں کیا' احتجاج نہیں کیا' کیونکہ شاید میرے رب کے اسی فیصلے میں میرے لیے بہتری تھی۔"
اس کے سامنے وصی کا وہ رویہ بھی تھا' جو وہ وشمہ کے ساتھ روا رکھتا تھا' اور حسن کا التفات بھی جو اس کے نصیب میں آیا تھا۔

* * *

"کیا ممانی نے ایسا کہا؟" سوہا ششدر رہ گئی۔
"ہاں۔۔۔ وہ اپنے بیٹے۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔"
"طبیح۔"

"ہاں... صبیح... اس کے لیے تمہارا رشتہ مانگ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر ریتا نے بغور اس کے تاثرات جانچنا چاہے۔ وہاں صرف حیرت تھی۔ نہ غصہ، نہ غم، نہ خوشی۔ خیر، خوشی کے تاثرات کی تو ریتا کو توقع بھی نہ تھی وصی کے بارے میں وہ اس کے شدید جذبات سے آگاہ جو تھی، لیکن غصہ ضرور متوقع تھا، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ سوہا سنتے ہی پھٹ پڑے گی۔

"ممانی کو یہ کیا سوجھی؟"

"ان کی ہمت کیسے ہوئی، مجھ سے پوچھے بغیر یہ کام کرنے کی؟"

"میرے لیے کیا صبیح ہی رہ گیا ہے؟"

"وصی کے ہوتے ہوئے کوئی اور... ناممکن۔"

لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

وہ حیرت جو فوری ردِعمل کے طور پہ ریتا نے اس کے چہرے پہ دیکھی تھی، اب وہ حیرت بھی کہیں نہیں تھی۔ سپاٹ تاثرات کے ساتھ وہ اپنے ایئر رنگز اتار رہی تھی، ریتا اس کے قریب آئی۔

"تم ملی ہو صبیح سے؟"

"ہوں... ملی تو ہوں۔"

"کیسا ہے؟" ریتا نے ٹٹولا۔

"بس... ٹھیک ہے... شاید ٹھیک سے زیادہ اچھا ہو... یا شاید ٹھیک بھی نہ ہو۔"

سوہا نے عجیب الجھا الجھا سا جواب دیا۔

"میں نے کون سا اسے جانچنے والی نظر سے دیکھا تھا۔ ویسے بھی مجھے پتا کہاں چلتا ہے کہ کون اچھا ہے، کون برا، اب تو خود پہ مجھے ذرا سا بھی اعتماد نہیں رہا ماما۔"

ریتا کو بے اختیار اصغر کے الفاظ یاد آگئے۔

"وہ ناسمجھ ہے، کم عمر ہے اور ناتجربہ کار بھی۔ اسے فیصلے کا مکمل اختیار دینے کی ضرورت بھی کیا ہے، اسے کیا پتا انسانوں کو کیسے پرکھتے ہیں۔"

ریتا اسے اب نیل پالش لگاتے دیکھ رہی تھی، چند منٹ تک اس کی جانب سے کسی بات کا انتظار کرتے رہنے کے بعد اس نے اکتا کے پوچھا۔

"تم خود انکار کرو گی یا میں؟"

"انکار؟ کس کو؟" وہ حیران ہوئی۔

"تمہاری ممانی کو..." ریتا نے جل کے کہا۔ "کمال ہے، اتنی دیر سے یہی تو بتا رہی ہوں میں۔"

"لیکن انکار میں کروں یا آپ... وجہ کیا بتائیں گی، کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔"

سوہا کے جواب نے ریتا کو گنگ کر دیا۔

چند لمحے بعد وہ سنبھل کے بولی۔

"وصی... میرا مطلب ہے وہ وجہ کافی نہیں؟"

"کس کس کو وہ وجہ بتائی جائے ماما؟" سوہا نے تلخی سے سوال کیا۔ "اور کس منہ سے بتائی جائے۔ وہ وجہ دروازے پہ میرے لیے بارات لے کر نہیں کھڑی۔"

ریتا نے اس کے لہجے کی تلخی کو بھی محسوس کیا اور اس کی آنکھوں سے جھلکتی مایوسی کو بھی۔

اور فوراً "اندازہ" لگالیا۔

"یعنی تمہیں اپنی ممانی کا پیش کردہ یہ رشتہ منظور ہے؟"

وہ جھجکتے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"نہیں... میں نے یہ نہیں کہا... اگر فوری انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے تو فوری اقرار کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور پہلے مجھے ان سے وجہ دریافت کرنی ہے، اس رشتے کو بھیجنے کی۔"

❁ ❁ ❁

ثناء اس کی بات سن کر دیر تک ہنستی رہی۔

"عجیب ہو تم... یہ کیا سوال ہوا بھلا؟ بھئی کسی لڑکے کی ماں جب کسی لڑکی کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ بھیجتی ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اسے وہ لڑکی بطور اپنی بہو کے پسند ہے۔"

"لیکن مجھ میں پسند کرنے والی کیا بات ہے؟"

"ارے... اتنی قنوطیت؟ کیا کبھی غور سے آئینہ نہیں دیکھا؟"

"دیکھا ہے... اور جانتی ہوں... دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہوں، لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ لوگ اپنی بہوئیں پسند کرتے ہوئے صرف شکلیں نہیں دیکھتے۔"

"یہ میں بھی جانتی ہوں بی بی! سمجھدار..." ثناء نے اس کے سر پہ پیار بھری ہلکی سی چپت لگا کے کہا۔

"اور میں نے بھی سب دیکھا ہے... کس بات کی کمی ہے تم میں... ہاں گھرداری میں تھوڑا پھوہڑ ہو، خیر چلتا ہے۔ سب میکے سے سیکھ کے نہیں آتیں، کچھ میری طرح ہوتی ہیں سسرال آ کے ساس، نندوں کے طعنے کھاتے ہوئے ان سے ہی سیکھ کر ان کی احسان مند ہوتی ہیں... تم مجھ پہ گئی ہو۔ میرا نام روشن کرو گی۔ ویسے بھی صبیح کھانے پینے کا ایسا خاص شوقین نہیں ہے، لاپروا بھی بہت ہے، اپنے پاپا جیسا نہیں ہے جو ذرا سی الماری بے ترتیب ہونے پہ گھر سر پہ اٹھالیں، دونوں میں خوب نبھے گی۔"

"آپ مجھے بہلا رہی ہیں ممانی۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"تم کیا دو، تین سال کی بچی ہو جسے میں لالی پاپ دے کر بہلاؤں گی؟"

"یہ آپ مجھے لالی پاپ ہی تو دے رہی ہیں ممانی! میں نے آپ کو ممانی سمجھ کے نہیں دوست جان کے آپ سے اپنے راز شیئر کیے تھے، اس لیے نہیں کہ آپ مجھ پہ ترس کھا کے اس طرح..."

"کس نے کہا... میں تم پہ ترس کھا رہی ہوں... پاگل ہو تم... کیا کوئی شخص ہمدردی میں اتنا بڑا فیصلہ کر سکتا ہے؟"

"تو پھر... پھر انہوں نے کہا ہو گا آپ سے۔"

"کس نے؟"

ثناء کے سوال پہ وہ نظر چرا گئی۔

"معزہ کے بارے میں کہہ رہی ہو؟"

ثناء نے اس کے جھکے ہوئے سر سے خود اندازہ لگالیا۔

"یہاں بھی تم غلط ہو... اتنا بڑا فیصلہ کوئی ماں محض کسی کی فرمائش پہ بھی نہیں کرتی۔ صبیح کے لیے میرے دل میں کچھ ارمان بھی ہیں، اور ایک ماں ہونے کے ناتے میری کچھ ذمے داریاں بھی ہیں، میں جذبات میں آکے کیے فیصلے پہ صبیح کی زندگی کا فیصلہ کیوں کروں گی۔"

"تو پھر... آپ... آپ تو سب جانتی ہیں۔"

"کیا؟ کیا جانتی ہوں میں؟" ثناء نے الٹا سوال کیا۔
"یہ ایسی اہم بات نہیں' اور تمہیں بھی کوئی ضرورت نہیں اسے اہمیت دینے کی۔ اگر صبیح میں کوئی کمی ہے؟ اسے ناپسند کرنے کی کوئی وجہ ہے تمہارے پاس' تو میں تمہاری مرضی کا احترام کروں گی' اور اگر وہ لڑکا' اس کی وجہ سے تم انکار کر رہی ہو تو بہت غلطی کرو گی' سوہا... بالفرض وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر گھر والوں کی مخالفت مول لے کر تم سے شادی کر بھی لیتا ہے تو تمہاری زندگی آسان نہیں ہوگی۔ پہلے سے بھی مشکل ہوگی۔ اور اپنے لیے آسانیاں چننا... مشکلوں اور کٹھنائیوں سے بچ کر چلنا خود غرضی نہیں ہے' تمہیں پورا حق ہے اپنے لیے ایسی راہ چننے کا جس میں تمہارے لیے خوشیاں ہوں محبت اگر خوشی کے ساتھ بندھی ہو تو سکھ دیتی ہے' ورنہ نہیں۔"

❁ ❁ ❁

"گئی ہے وہ اپنی ممانی کے پاس۔" ریتا نے اصغر کو اطلاع دی۔
"اس کی ممانی ایک سمجھ دار عورت ہے' وہ اسے منا لے گی۔"
"ہاں... ایک میرے علاوہ سب ہی عورتیں سمجھ دار ہیں میں تو کوڑھ مغز ہوں۔" ریتا جل کے بڑبڑائی۔
اصغر نے مسکرا کے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔
"اب لگتا ہے تم میری بیوی ہو... اصغر بھٹی کی بیوی۔ یعنی بیگم اصغر بھٹی' جلتی کڑھتی' بڑبڑ کرتی' ورنہ پہلے تو میم صاحب بنی رہتی تھیں' اب میرے جوڑ کی لگ رہی ہو۔"
اس نے ریتا کے اس نئے حلیے پہ چوٹ کی۔
وہ ساری نزاکت' وہ ساری بناوٹ' جیسے دل اوب سا گیا تھا ہر چیز سے' کتنے ہی دن ہو گئے تھے وہ سادہ سی شلوار قمیص میں ہی گھر میں پھرتی رہتی' بلکہ آدھا دن تو نائٹ ڈریس میں گزار دیتی۔
بالوں کی اسٹریکنگ اور کٹنگ کو بھی توجہ کی ضرورت تھی' لیکن وہ انہیں الٹا سیدھا لپیٹ کے جوڑے کی شکل دیے ہوئے تھی' کبھی اس کے ناخنوں سے نیل پالش نہیں اتری تھی' اور اب کتنے ہی دنوں سے آدھے رنگے' آدھے پھیکے ناخن لیے وہ گھوم رہی تھی۔

اصغر کو اس کا سادہ گھریلو روپ بے حد بھا رہا تھا۔
"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' دل ہی نہیں چاہتا بننے سنورنے کو۔"
اس نے وجہ بیان کی۔
"سوہا والے معاملے کو دل پہ لے رہی ہو تم... کتنا سمجھا رہا ہوں کہ اللہ پہ چھوڑ دو' وہ سوہنا جو کرے گا۔ بہتر کرے گا' اولاد قبضہ جمانے کے لیے نہیں ہوتی' اور خدا کے واسطے اپنے دل سے اب یہ خوف نکال دو کہ کوئی اسے تم سے چھین لے گا' جا کے دیکھ... ان سب جاننے والے' ملنے والوں کو جا کے دیکھ... جن کے چھ' چھ' سات' سات بچے ہیں۔ بڈھا' بڈھی اکیلے بیٹھے تصویریں دیکھ رہے ہوتے ہیں' البموں میں... بیٹیاں اپنے گھر اور بچوں میں مگن... شروع شروع میں لگتے ہیں میکے کے چکر' پھر بچوں کے بڑے ہونے پہ چھٹیوں میں آئیں تو آئیں... بیٹے بیٹیوں سے بھی زیادہ بے دید اور طوطا چشم ہوتے ہیں' بیویوں کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ بھلا اولاد بھی کوئی سینے سے لگا کے رکھنے والی چیز ہے' ہاں! اس عمر میں کام آتا ہے تو صرف زندگی بھر کا ساتھی' اسے سینے سے لگا کے رکھو تو بڑھاپے میں کام آئے گا۔"
وہ دل پہ ہاتھ رکھ کے جھلکتا شوخی سے کہہ رہا تھا' نہ چاہتے ہوئے بھی ریتا کو ہنسی آ گئی۔
"پی رکھی ہے کیا؟"

"اب کہاں؟ کب کی چھوڑ دی' پتا نہیں تم میرا اعتبار کیوں نہیں کرتیں۔" وہ اچانک شوخی سے یاسیت پہ اتر آیا۔
ریتا کے دل میں کسک سی جاگی' وہ کیا بتاتی' اس نے مدت ہوئی کسی پہ بھی اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔
نجانے اعتبار کر لینے کے بعد جو سکون ملتا ہے' وہ کیا ہوتا ہوگا۔
"اچھا... میری قسم کھاؤ' پھر اعتبار کر لوں گی۔"
"واقعی؟ تمہاری قسم... تمہارے سر کی قسم... میں نے پینا پلانا... سٹہ بازی' ڈونیسر کا سیمنٹ بنانا سب چھوڑ دیا ہے' تمہاری قسم' اپنی مری ماں کی قسم' اور اپنی اس بیٹی کی آئندہ زندگی کی خوشیوں کی قسم!"
"بس بس... میں نے یقین کر لیا۔" ریتا کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔
"اب ایک بات کا یقین اور کر لو کہ سوہا کی ماں نے اس کے لیے رشتہ نیک نیتی سے ہی بھیجا ہے' اس کے لیے بے کار کی بدگمانیاں اور وہم دل میں نہ لاؤ' اندر ہی اندر گھل گھل کے تم نے اپنی حالت کیا کر لی ہے۔"
"تمہیں تو بڑی پسند آ رہی ہے میری یہ حالت۔"
"مجھے تو سیدھی سادی... گھریلو گھریلو بیوی بیوی سی ضرور اچھی لگ رہی ہے' مگر یہ پیلی رنگت' آنکھوں کے نیچے حلقے' نہ بھئی' یہ نہیں چلیں گے' مجھے بیگم ہٹی کٹی چاہیے' رعب داب والی' کچھ کھایا پیا کر' جان بنایا کر۔"
"کچھ کھانے پینے کو جی نہیں کرتا' بھوک مر گئی ہو جیسے' کمزوری محسوس بھی ہوتی ہے' مگر کھانے کی جانب طبیعت ہی راغب نہیں ہوتی۔"
"ڈائٹنگ کر کر کے تو نے بھوک کا سوا ستیاناس کر لیا ہے۔"
"شاید ٹھیک کہتے ہو' ہاتھوں' پیروں میں سے جان نکلتی محسوس ہوتی ہے۔"
"مانتی نہیں ہے' مگر بڈھی ہو گئی ہے تو۔"
اصغر نے چھیڑا تو برا مان گئی۔
"تم سب کو چھوڑ سکتے ہو... مگر یہ حرکت نہیں۔"

"ارے... ناراض کیوں ہوتی ہے' مذاق کر رہا تھا میں' اچھا اب نہیں کرتا' بیٹھ تو سہی' میں ڈاکٹر سے ٹائم لے دیتا ہوں' کل دکھا لینا۔"
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔"
"نہیں' لاپروائی اچھی نہیں' وہ بھی اس عمر میں۔" وہ دوبارہ شوخی پہ اترا' پھر ریتا کے گھورنے پہ کان پکڑ کے ہنسنے لگا۔
"نہیں نہیں... میرا مطلب ہے... میری عمر اب وہ نہیں رہی کہ میں تمہاری صحت کی فکریں اٹھاتا پھروں... کل میں خود لے کر جاؤں گا تمہیں ڈاکٹر کے پاس۔"
ریتا کچھ کہنے والی تھی کہ سامنے سے آتی سوہا کو دیکھ کے چپ ہو گئی اور کھوجتی نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ جو ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔
"کہاں سے آ رہی ہے میری رانی بیٹی؟"
اصغر کے پوچھنے پہ وہ نارمل انداز میں بتانے لگی۔

"ممانی سے ملنے گئی تھی۔"
"خیریت تھی؟" اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔
"جی... بالکل۔" اصغر کو جواب دینے کے بعد اس نے ریتا کو مخاطب کیا۔

"ماما... کل آپ مجھ سے پوچھ رہی تھیں نہ کہ انکار آپ کریں گی' یا میں؟"
ربنا کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ وہ بمشکل سر ہلا پائی۔
"نہ آپ انکار کریں گی' نہ میں۔"
مختصر اور مبہم جواب میں بہت بڑا اشارہ چھپا تھا' اس سے پہلے کہ خوشی سے مسکراتا اصغر اس سے تفصیل سے کوئی بات کرتا' وہ اٹھ کے اندر چلی گئی۔
اصغر نے ربنا کی جانب دیکھا' اس کی توقع کے برعکس وہاں مکمل سکون کی کیفیت تھی۔
شاید ربنا کے دل میں اصغر کی باتیں اتر گئی تھیں۔

❂ ❂ ❂

سب کچھ غیر متوقع ہی ہوتا جا رہا تھا۔
ثنا کا صبیح کے لیے اس کا رشتہ دینا تو غیر متوقع تھا ہی' سوہا کا مان جانا اور بھی غیر متوقع تھا۔
لیکن سب سے حیران کن بات رہی' وصی کا ردِعمل۔
وہ نہ حیران ہوا' نہ غم زدہ' نہ اس نے سوہا سے کوئی شکوہ کیا' نہ وعدے یاد دلائے۔
"میں خوش ہوں سوہا! کہ تم نے اپنے لیے ایک بہترین فیصلہ کیا۔ میں یہ سوچ کر خوش ہوں کہ جو خوشیاں میں تمہیں دینا چاہتا تھا وہ تمہیں ملنے والی ہیں' میں خوش ہوں کہ جو مقام میں تمہیں دلانا چاہتا تھا' وہ مقام تمہیں ملنے جا رہا ہے۔ میں نہ سہی' کوئی اور سہی' محبت کا دامن اتنا تو وسیع ہوتا ہی ہے کہ وہ محبوب کی خوشی میں خوش ہو لے۔ محبت میں پا لینا ہی سب کچھ نہیں ہے سوہا! محبت میں دل کا سکون بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میں تمہیں پا لیتا' مگر ساری عمر تم سے شرمندہ رہتا کہ تمہیں نہ عزت دلا سکا' نہ محبت دے سکا' تو کیا میرے دل کو سکون ملتا؟ اب تم کسی اور کی ہونے جا رہی ہو' لیکن مجھے یہ سکون رہے گا کہ تم جہاں ہو' جس کے بھی ساتھ ہو' خوش ہو۔"
"وصی! تمہیں مجھ سے کوئی گِلہ نہیں؟ زندگی کی خوشیوں پہ تمہارا بھی تو حق تھا' اور میری وجہ سے تم کتنا عرصہ اس خوشی سے محروم رہے' میں نے محبت میں اپنا دامن اتنا وسیع کیوں نہیں کیا' جتنا تم کر رہے ہو' میری محبت اتنی فراخ دل کیوں نہ ہو سکی' جتنی تمہاری ہے۔ میں تو تمہیں وشمہ سے قریب دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ میری وجہ سے تم نے اپنی زندگی عذاب بنائے رکھی' کتنی تکلیف دی تمہیں' کتنی اذیت۔"
"بھول جاؤ سب کچھ' اور مجھے بھی۔"
"نہیں وصی! تکلیف دہ باتوں کو بھول جانا اچھا ہے' وہ میں بھول جاؤں گی' مگر تمہیں نہیں۔ تمہیں تو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی' تمہاری یاد مجھے یاد دلاتی رہے گی کہ محبت کیسے کی جاتی ہے' کیسے نبھائی جاتی ہے' اور محبت میں وسعت اور فراخ دلی کیسے پیدا کی جاتی ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔"
"میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا' مگر ہر وقت' ہر پل نہیں' صرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے سمے۔"
وصی نے مسکرا کے کہا۔

❂ ❂ ❂

منزہ' پروین کے پاس بیٹھی تھی۔
آج مزاج میں وہ طنطنہ ناپید تھا' پروین نے بھی یہ بات محسوس کر لی' پروین کا اپنا مزاج ایسا نہیں تھا کہ بلاوجہ

کدورت سنبھالے پھرتیں۔ منزہ کے تاؤ دلانے پہ وہ بھی کبھی کبھی تنخ ہو جایا کرتیں' مگر جب مدِمقابل ہی پسپائی پہ آمادہ ہو تو وہ کیا کرتیں' سو بڑے سبھاؤ اور اخلاق سے مہمان داری نبھائے جا رہی تھیں' کچھ یہ بھی تھا کہ وشمہ کے بدلتے رویے نے ان کے گلے دور کر دیے تھے۔
"وشمہ آئی نہیں ابھی تک؟"
اسے بیٹھے آدھا گھنٹہ ہو رہا تھا' وشمہ کو خبر تھی مگر وہ ملنے نہیں آئی تھی۔
"آئی ہو گی' دوپہر کو سونے کی عادی ہے' میں نے اسے جگایا تھا' ظاہر ہے نہانے چلی گئی ہو گی' تیار ہونے میں اتنا وقت تو لگتا ہے' لو آ گئی وشمہ۔"
وشمہ کچھ سنجیدہ' کچھ ناراض ناراض سی اندر آئی' منزہ اسے گلے لگانے آگے بڑھی' وشمہ کے انداز میں موجود واضح تکلف اور گریز کو پروین تک نے محسوس کر لیا اور بہانے سے وہاں سے چلی گئیں۔
"تم بیٹھو' میں ذرا میٹھا دیکھ لوں' ٹھنڈا ہونے رکھا ہے' مانے یا نہیں۔"
"ناراض ہو اپنی ماں سے؟" منزہ نے اس کے ہاتھ تھامے۔
"نہیں' ناراض نہیں ہوں۔"
"پھر؟ فون پہ بھی بات نہیں کرتیں۔"
"کیا بات کروں؟ ایک بات کی تھی آپ سے' لیکن پھر احساس ہوا جو بات کسی کے بس میں نہ ہو' اسے منوانے کی کوشش کرنا فضول ہے۔"
"اور اگر کوئی اس ناممکن کو ممکن کر دکھائے تو؟"
"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔
"میں نے یہی خوش خبری تمہیں سنانے کے لیے فون کیا تھا' اگر تم! خیر' خوش خبری آ کے سنائیں تو زیادہ بھلی لگتی ہے' خوش ہونے والے کے چہرے کی مسکراہٹ بھی تو دیکھنے کو ملتی ہے۔"
منزہ نے وشمہ کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا۔
"سوہا کا رشتہ طے ہو گیا ہے' میرے بھائی کے بیٹے سے' اور سوہا نے اپنی خوشی اور مرضی سے ہاں کی ہے۔ وصی کی رضامندی اور مشورے کے ساتھ' دونوں یہ جان گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے۔ سوہا شادی کے بعد بیرون ملک جا رہی ہے۔"
"ماما!"
مارے خوشی اور تشکر کے وشمہ سے کچھ نہ کہا گیا' وہ منزہ سے لپٹ گئی۔

❂ ❂ ❂

آج سوہا کی شادی تھی۔
تقدیس میرون ساڑھی میں جانے کے لیے تیار تھی۔ خرم اس کے نیکلس کا ہک لگاتے ہوئے پیار سے کہہ رہا تھا۔
"تم نے اپنی دوست کے لیے تحفہ کیا لیا؟"
"قدرت نے اسے جو تحفہ دے دیا ہے اس کے بعد سارے تحفے ہیچ ہیں۔"
"پھر بھی تمہیں بھی اپنی طرف سے کچھ دینا چاہیے۔"

"آپ رو دے رہے ہیں۔"
"میں؟"
"ہاں، مجھے وہاں لے کر جا رہے ہیں، اپنی خوشی سے، یہ اس کے لیے تحفہ ہی ہو گا۔"
"شرمندہ مت کرو یار! غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔"
"اوں ہوں۔۔۔ انسانوں سے نہیں، مردوں سے۔"
"کیا مطلب؟ مرد انسان نہیں ہوتے؟"
وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔
"اس بحث میں مت پڑیں، ورنہ دیر ہو جائے گی۔"
خرم محبت سے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھنے لگا۔
جو وہ اس دن اس کی اور سوہا کی گفتگو نہ سنتا تو بے اعتباری کی یہ دھند نہ چھٹتی۔

❁ ❁ ❁

وشمہ نے حیرت اور رشک کے ملے جلے تاثر کے ساتھ وصی کو دیکھا، جو آئینے کے سامنے کھڑا پرفیوم اسپرے کر رہا تھا۔ وہ دونوں بھی شادی پہ انوائٹڈ تھے اور وشمہ کو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وصی جو سوہا کے لیے اتنا سنجیدہ تھا، کس دل سے جانے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔
"آپ کو کچھ ہو نہیں رہا؟" وہ پاس آ کے پوچھنے لگی۔
"ہاں، ہو رہا ہے۔"
"کیا؟"
"سر میں درد۔"
"پریشانی سے؟" وہ سمجھی سوہا کی شادی کا غم وہ جتنا چھپانے کی کوشش کر رہا ہے، وہ سر میں درد کی صورت ظاہر ہو ہی گیا۔
"نہیں، تمہارے سوالوں سے، جتنی پوچھ گچھ تم کر رہی ہو، وہی وقت تیار ہونے میں لگاؤ، تو ہم وقت پہ پہنچ جائیں گے۔"
"پھر بھی۔۔۔ آپ کتنا بھی چھپائیں، ایسا ہو نہیں سکتا کہ آپ کو کوئی دکھ نہ ہو۔"
"دکھ؟ یار! تم مجھے اتنا کم ظرف سمجھتی ہو کہ میں کسی پُرخلوص سے دوست کی زندگی کے نئے سفر پہ اداس یا دکھی ہوں گا؟ میں خوش ہوں، بہت خوش، اور تم کو بھی خوش نظر آنا چاہیے، نہ صرف خوش، بلکہ بہت خوبصورت بھی، چلو، جلدی سے لیپا پوتی کرواؤ اپنے چہرے کی۔"
اس نے وشمہ کی چھوٹی سی ناک دبائی۔

❁ ❁ ❁

دلہن بنی سوہا نے اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے نظر اٹھا کے دیکھا۔ رینا اور منزہ ایک ساتھ بیٹھی محبت لٹاتی نظروں سے اس کے دلہناپے سے سجے روپ کو دیکھ رہی تھیں۔ اصغر خوشی اور ذمے داری دونوں سنبھالتا مبارک بادیں وصول کر رہا تھا۔ ثناء اس پہ سے روپے نچھاور کر کر کے بانٹ رہی تھی۔ وصی اور وشمہ، پروین کے برابر بیٹھے کوئی اہم مسئلہ

ڈسکس کر رہے تھے شاید۔ تینوں کے چہرے کتنے مطمئن تھے۔ تقدیس، خرم کی کسی بات پہ مسکرا رہی تھی، پھر سوہا نے گردن گھما کے اپنے برابر بیٹھے صبیح کو دیکھا۔
"یہ سب تمہاری وجہ سے ہے، تم میری زندگی میں اس لیے آج سب مطمئن اور خوش ہیں، شکر ہے میں ان گلیوں کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوئی، جن کے راستے نہ میری منزل تک جاتے ہیں نہ کسی اور کو خوشی دے سکتے ہیں۔"